وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعٰلمین

سیرت سیّد البشر ﷺ

حصہ دوم

پروفیسر چودھری غلام رسول چیمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سیرت سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم

حصہ دوم

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (الصف ۶۱:۹)

وہی ذات ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ سب دینوں پر غالب کرے اگرچہ مشرک بُرا منائیں۔

سیرت سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم

(دورِ حاضر کا مذہب اور دنیا کے مسائل کا واحد ذریعہ)

حصہ دوم

(دین کامل)

مصنف

پروفیسر (ر) غلام رسول چیمہ

ایم۔اے، ایل ایل بی

PUBLISHERS

چوہدری غلام رسول اینڈ سنز پبلشرز

الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور فون: 042-37233909-37243055
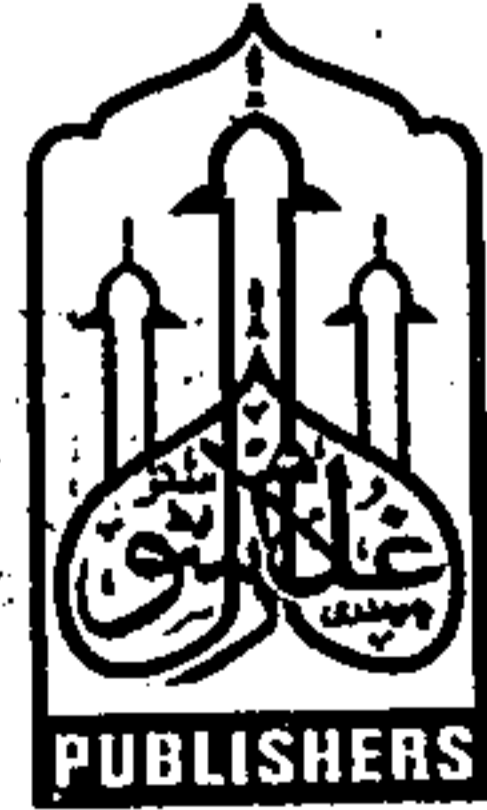
نام کتاب : سیرت سید البشر ﷺ (حصہ دوم)

مصنف : پروفیسر (ر) غلام رسول چیمہ۔ ایم اے۔ ایل ایل بی

کمپوزنگ : رفاقت علی/ تاج کمپوزنگ سنٹر

ناشر : چوہدری غلام رسول اینڈ سنز پبلشرز

پریس : اے۔وائی پرنٹرز، آؤٹ فال روڈ لاہور فون:37151047

اشاعت : 2011ء

قیمت : -/820 روپے

:نوٹ:

قارئین سے درخواست ہے کہ ہماری تمام تر کوشش (اچھی پروف ریڈنگ معیاری پرنٹنگ) کے باوجود اس بات کا امکان ہے کہ کہیں کوئی لفظی غلطی یا کوئی اور خامی رہ گئی ہو تو ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں اس غلطی یا خامی کو دور کیا جائے۔ شکریہ (ادارہ)

چوہدری غلام رسول اینڈ سنز پبلشرز
الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور فون:042-37233909-37243055

انتساب!

محترمہ والدہ مرحومہ

اور

ہمشیرہ زبیدہ افضل مرحومہ

کے نام

تقدیم

سیرت سید البشر ﷺ کا دوسرا حصہ قارئین کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس حصہ میں انسانی ضابطہ حیات کے تمام شعبوں پر تفصیلاً قرآن اور حدیث وسنت کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کر کے ہی انسان اور قومیں ترقی کر سکتی ہیں۔ تمام انبیاء علیہم السلام انسان کی مادی اور روحانی زندگی سنوارنے کے لیے آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت کے تحت انسانی ضابطہ حیات کو قرآن مجید میں مکمل شکل دے دی ہے۔ اب رہتی دنیا تک یہ ضابطہ قانون انسانوں کی راہنمائی کے لیے قائم رہے گا اور اس کی تفسیر اور تفصیل ہر زمانہ کے تقاضوں کے مطابق علماء کرام بیان کرتے رہیں گے۔ اور انسان اور اقوام عالم اسی قانون پر کاربند ہو کر ہی منزل مقصود پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے خاکسار کو قرآنی ضابطہ حیات پر لکھنے اور قارئین کے سامنے پیش کرنے کی توفیق دی ہے۔ اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ یہ قارئین ہی فیصلہ کریں گے۔ کوشش یہ کی گئی ہے۔ قرآن مجید، حدیث اور سنت کے علاوہ اسلام کے مستند مشاہیر کے افکار کو بھی پیش نظر رکھا جائے اور قارئین کے سامنے پیش کیا جائے۔ یہ الٰہی فیصلہ ہے کہ مسلمان قرآن اور سنت سے تمسک اور تعلق پیدا کر کے ہی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ کام محض رضا الٰہی کے حصول اور آخرت کے زادِ راہ کے لیے کیا ہے اللہ تعالیٰ میری اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے۔

سیرت کا تیسرا حصہ (جز اوّل) بھی پبلشر کے حوالے کر دیا ہے۔ تیسرے حصے میں مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات ہیں۔ اعتراضات کے جوابات مزید دو حصوں پر مشتمل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ مجھے توفیق دے۔ یہ بہت مشکل اور نازک موضوع ہے۔

والسلام

خاکِ پائے محمدؐ

غلام رسول

15- کریم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فہرست

شکار، مال غنیمت، ورثہ، ہبہ، وصیت، بیت المال سے مالی امداد، رکاز) انفرادی حصول حقوق ملکیت کے شرعی حدود و قیود، حصول دولت کے ناجائز ذرائع (ربا (سود) شرعاً ناجائز بیوع (دھوکہ کی بیع)، ناجائز شرائط، بیع پر بیع، تناجش کی ممانعت، بیع حبل الحبلہ کی ممانعت، ملامسہ، بیع منابذہ، بیع الحصاۃ، بیع محفلہ ومصراۃ، جو چیز اپنے پاس نہ ہو، اس کی بیع نہ کی جائے، خریدی ہوئی چیز اٹھانے سے پہلے اس کو فروخت نہ کیا جائے، مضطر (ضرورت مند) کی بیع، پھلوں کی بیع پختگی سے پہلے ناجائز ہے، باغ کو چند سالوں کے لیے ٹھیکے پر دینے کی ممانعت، شہری کا دیہاتی سے سامان، منڈی آنے سے پہلے خرید کی ممانعت، تجارتی قافلہ سے منڈی میں آنے سے پہلے ہی خریدنے کی ممانعت، حرام چیزوں کی خرید وفروخت کی ممانعت)

انفرادی ملکیت کی حد بندی، جاگیرداری اور اسلام، مزارعت، مساقات، بڑی بڑی صنعتیں، قرآن اور سرمایہ داری، ریاست کی اجتماعی ملکیت، ذرائع آمدنی (زکوٰۃ صدقات، خمس، مال رکاز، عشر، فی، خراج، جزیہ عشور، کراء الارض وقف، ضرائب، لقطہ، لاوارث ترکہ، کاروبار کے منافع، نشوونمائے مملکت النوائب)

تقسیم دولت، تقسیم دولت کی راہیں، زکوٰۃ کے معنی اس کی حقیقت اور اس کی اہمیت، طوعی انفاق، عشر (زمین کی زکوٰۃ) وراثت، وصیت، وقف، کفارات، عیدالفطر، نفقات، عفو (ضرورت سے زائد خرچ کرنا)

اسلام اور تقسیم دولت (۲) (منافع، لگان، اجارہ، محنت، صرف دولت، تحلیل وحرام کے احکام، صرف دولت کے اصول، صرف دولت کی ناجائز صورتیں، اسراف اور تبذیر کی ممانعت، مال ضائع کرنے کی ممانعت، عیش وعشرت کی ممانعت مضرت رساں استعمال ملکیت کی ممانعت اپنے اور متعلقین کے گزارہ کے لیے کافی نہ ہونے کی صورت میں خیرات سے ممانعت، فاترالعقل اور نابالغ کو انتظام مال سپرد کرنے کی ممانعت، اسلام میں مالیات کی فراہمی کے طریقے، (شراکت، مضاربت اسلامی معیشت میں مالیات کی فراہمی کے مزید طریقے (بیع سلم)، بیع مرابحہ وتولیہ، بیع موجل، کرایہ داری

باب ا

علم اور ذرائع حصول علم

کامل علم کا ذریعہ وحی الٰہی ہے۔ اسلام نے حصول علم پر بہت زور دیا ہے تمام موجودات پر انسان کی فضیلت صرف صاحب علم ہونے کی وجہ سے ہے۔اس لیے ملائکہ کے لیے باعث مسجود بنا۔ اور انسانی تہذیب کی ترقی کا سبب ہی علم ہے۔ اسلام نے صرف دین کا علم حاصل کرنے کی تلقین نہیں کی بلکہ زندگی کے ہر شعبہ کا علم حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ جو معاشرہ کے مفاد میں ہو اور خدا تعالیٰ کی رضا کا موجب ہو۔ ارشاد الٰہی ہے۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (الزمر ۳۹:۹) کہہ دیجئے کیا علم والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں۔

اَلَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ وَعَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ (العلق ۹۶:۴،۵) جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

عَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْکَ عَظِيْمًا (النساء ۴:۱۱۳) ہم نے تم کو ان سب چیزوں کی تعلیم دی جن کو تم نہیں جانتے تھے۔ خدا کا فضل آپ پر عظیم ہے۔

قُلْ رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (طٰہٰ ۲۰:۱۱۴) (آپ یہ دعا کیجئے) اے پروردگار میرا علم اور کر۔

رسول کریم ﷺ حصول علم کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی ہے کہ جو شخص علم کی تلاش میں چلتا ہے میں اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہوں اور علم کی زیادتی عبادت کی زیادتی سے بہتر ہے۔ (البیہقی فی شعب الایمان) اَفْضَلُ الْعِبَادَةِ طَلَبُ الْعِلْمِ (کنوز الحقائق حرف الہمزہ) بہترین عبادت علم کا طلب کرنا ہے۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ (سنن ابن ماجہ باب فضل العلماء) ہر مسلمان پر علم حاصل کرنا واجب ہے۔

حصول علم کے ذرائع

علم کے درجات: حصول علم کے ذرائع بیان کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ یہ بتایا جائے کہ قرآن نے علم کو تین اقسام پر قرار دیا ہے علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ کیونکہ علم کے ذرائع کا تعلق انھیں اقسام سے ہے۔ مثلاً ایک شخص دور سے دھواں دیکھتا ہے تو اس کا ذہن خود آگ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کیونکہ دھواں اور آگ لازم ملزوم ہیں۔ جب آگے بڑھتا ہے اور آگ کے شعلے دیکھ لیتا ہے تو اس کا علم عین الیقین میں بدل جاتا ہے۔ جب آگ کی تپش اپنے وجود سے محسوس کرے تو اس علم کا نام حق الیقین ہے۔

حصول علم کے ذرائع

ا۔ فطرت انسانی میں حصول علم کی استعداد: اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی میں حصول علم کی استعداد اور قوت رکھ دی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا (البقرہ ۲:۳۱) اور آدم کو سب کے سب نام سکھائے یہاں آدم سے مراد کل نسل انسانی ہے۔ اسماء کی تعلیم دینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب چیزوں کی صفات یا خواص سیکھنے کی استعداد انسان کی فطرت کے اندر رکھ دی ہے گویا اس نے انسان کو سکھا ہی دی ہیں۔ ہر جاندار مخلوق میں کچھ ایسی نوعی خصوصیات ہوتی ہیں جو دوسری انواع میں نہیں پائی جاتیں۔ انہی خصوصیات سے ایک نوع کا دوسری نوع سے امتیاز ہوتا ہے۔ مثلاً مچھلی کے بچے میں پانی میں تیرنے کی خصوصیت اس کی فطری اور طبعی ہے۔ اس کو کوئی دوسرا نہیں سکھاتا۔ اسی طرح پرندے کا بچہ ہے اس کو نہ کوئی اڑنا سکھاتا ہے اور نہ دانا چگنا۔ اڑنے اور دانہ چگنے کی خصوصیات اس کے اندر ہی پائی جاتی ہیں۔ جس کا اظہار خود بخود کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان میں حصول علم کی استعداد رکھی ہے اس کے ساتھ اشیاء میں بھی خصوصیات پیدا کر دی ہیں تاکہ انسان اپنی ودیعت کردہ علمی استعداد سے اشیاء کی خصوصیات کو ظاہر کرے۔ گویا فطرت میں ودیعت کردہ علمی استعداد حصول علم کا پہلا ذریعہ ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے حصول علم کا سرچشمہ اور منبع ہے یہ ذریعہ انسان کو علم الیقین تک پہنچاتا ہے۔

حواس: اللہ تعالیٰ نے حصول علم کے لیے حواس خمسہ باصرہ، سامعہ، شامہ اور ذائقہ اور حاسہ دیے ہیں۔ دیکھ کر اشیاء کی ہیئت معلوم کرتے ہیں۔ سن کر آواز پہنچانتے ہیں۔ قوت شامہ کے ذریعے خوشبو اور بدبو معلوم کرتے ہیں۔ قوت ذائقہ کے ذریعے سے مٹھاس، نمکین اور دیگر مزوں پر اطلاع پاتے ہیں۔ اور قوت لامسہ سے حرارت اور برودت کا احساس ہوتا ہے۔ حواس خمسہ انسان کو عین الیقین کے مرتبہ میں پہنچاتے ہیں۔ کیونکہ حواس خمسہ اور معلوم چیزوں کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا۔ مثلاً جب آنکھ نے آگ کا شعلہ دیکھ لیا تو اس کا علم، عین الیقین تک پہنچ گیا ہے کیونکہ قوت باصرہ اور شعلہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے۔ اسی طرح جب قوت شامہ کے ذریعے خوشبو اور بدبو محسوس کر لی تو قوت شامہ اور معلوم چیز (خوشبو اور بدبو) کے درمیان کوئی روک نہیں۔ اسی طرح دیگر حواس کے ذریعے معلوم کی ہوئی چیزوں کا حال ہے ان حواس اور معلوم چیزوں کے درمیان کوئی روک نہیں۔ اس کا نام عین الیقین ہے کیونکہ حواس خمسہ کے ذریعہ بغیر کسی واسطے کے چیزوں کا علم حاصل کیا گیا ہے۔

عقل: یہ وہ نعمت ہے جو صرف انسان کو عنایت ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں قوت عقل کو استعمال کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ عقل سے کام نہ لینے والوں کو کالانعام قرار دیا ہے۔ "افلا تعقلون" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ پھر رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ دِیْنُ الْمَرْءِ عَقْلُهٗ وَمَنْ لَا دِیْنَ لَهٗ لَا عَقْلَ لَهٗ (کنوز الحقائق حرف وال) انسان کا دین اس کی عقل ہے جس کا کوئی دین نہیں اس کو عقل نہیں۔

فرمایا یَتَفَاضَلُ النَّاسُ بِالْعَقْلِ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ (کنوز الحقائق حرف الیاء) حسب عقل لوگوں کی دنیا اور آخرت میں باہم فضیلت ہوگی۔

عقل بھی انسان کو علم الیقین تک پہنچاتی ہے۔ مثلاً جب ایک انسان دور سے دھواں دیکھتا ہے تو اس کی عقل آگ کا استدلال کرتی ہے کیونکہ دھوئیں اور آگ میں ملازمت تامہ ہے لیکن عقل دھوکا بھی کھا سکتی ہے کہ وہ دھواں نہ ہو بلکہ غبار ہو۔ اس طرح نظام تکوینی سے اللہ تعالیٰ کی ہستی پر یقین کر لیا جاتا ہے۔ یقین بھی ابتدائی یقین یعنی علم الیقین ہے کہ عقل نے انسان کو صرف اس مرتبہ تک پہنچایا ہے کہ اس نظام کا کوئی چلانے والا ہونا چاہیے۔ اس مرتبہ تک نہیں پہنچایا کہ واقعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض صاحب عقل بھی نظام تکوینی سے ہستی باری تعالیٰ کا استدلال کر نہیں پاتے۔

وجدان: (اشراق) یہ وہ ذریعہ حصول علم ہے جو حواس اور عقل کی مدد کے بغیر ان دیکھی حقیقتوں کا یقین دلاتا ہے۔ اس واسطہ سے حصول علم کے لیے ریاضت اور تزکیہ نفس ضروری ہے۔ تزکیہ نفس سے انسان کے اندر ایک نور پیدا ہو جاتا ہے۔ جو ان دیکھی حقیقتوں سے آگاہی بخشتا ہے۔ کہتے ہیں کہ گوتم بدھ نے وجدان سے ہی اللہ تعالیٰ کی ہستی کی آگاہی حاصل کی تھی۔ اس طرح مفکر اور محقق جب غور و فکر میں ڈوب جاتے ہیں تو باطنی روشنی سے اپنا ہدف پا لیتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ انسان وجدان کے ذریعے حق الیقین تک پہنچ جائے۔ یہ ذریعہ بھی انسان کو صرف دوسرے مرتبہ یعنی عین الیقین تک پہنچاتا ہے۔ انسان وجدان کے ذریعہ حاصل کیے ہوئے علم میں دھوکا کھا سکتا ہے اور التباس کا شکار ہو سکتا ہے۔

وحی: اسلام کے نزدیک کامل علم کا ذریعہ صرف وحی الٰہی ہے جو انسان کو حق الیقین تک پہنچاتی ہے۔ یہ ذریعہ حصول علم تخلیق آدم سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ اس پر بحث تفصیل سے کی جاتی ہے۔

وحی کی لغوی بحث: وحی کے معنی لغت میں حسب ذیل ہیں۔

الوحی الاشارۃ الکنایۃ والرسالۃ والکلام الخفی و کل ما القیۃ الی غیر یعنی وحی کے معنی اشارہ کرنا، لکھنا، پیغام دینا، دل میں ڈالنا، چھپا کر بولنا، جو کچھ کسی دوسرے کے خیال میں ڈالا جائے۔

کسائی عرب کا محاورہ لکھتا ہے۔ وحیت الیہ بالکلام و اوحیہ الیہ ھو ان یکلم بکلام تخفیۃ من غیرہ یعنی کسی سے اس طرح کلام کرو کہ اس کو دوسروں سے چھپاؤ۔

ابو اسحاق لغوی کہتا ہے۔ اصل الوحی فی اللغۃ کلھا اعلام فی خفاء یعنی وحی کا اصل مفہوم تمام لغت میں چھپا کر اطلاع دینا ہے۔

مفردات میں امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔ اصل الوحی الاشارۃ السریعۃ لتضمن السرعۃ قیل امر وحی ذاک یکون بالکلام علی سبیل الرمز والتعریض وقد یکون بصوت مجرد عن الترکیب و باشارۃ ببعض الجوارح و بالکتابۃ یعنی وحی کے اصل معنی ہیں اشارہ سریعہ اسے سرعت کی وجہ سے کہا جاتا ہے امر وحی یعنی جلد ظاہر ہونے والی بات اور یہ کبھی تو گفتگو سے ہوتی ہے کبھی اشاروں، کنایوں میں محض آواز صوتی ہے۔ جو حروف، الفاظ کی ترکیب و ربط سے خالی ہوتی ہے۔ کبھی اعضاء کے اشاروں سے ہوتی ہے اور کبھی تحریر کے ذریعے سے۔

اقرب الموارد میں ہے۔

وحی الیہ اشارہ (اشارہ کیا)
وحی و اوحی الکتاب کتب (لکھا)
وحی الیہ الکلام کلمۃ خفیا (آہستہ بولا)
وحی الرجل اسرع (تیزی اختیار کی)
وحی الذبیحہ ذبحھا ذبحا وحیا (سرعت کے ساتھ ذبح کر دیا)
وحی اللہ فی قلبہ الھمہ (الہام کیا)
وحی اللہ ارسل اللہ رسولا (رسول بھیجا)

مذکورہ بالا معانی کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے لفظ کے معنی میں سرعت، اشارہ اور اخفا کا مفہوم مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

لفظ وحی کا استعمال قرآن مجید میں: قرآن مجید میں وحی کا استعمال دو طرح پر ہوا ہے اول لفظ وحی کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف ہے۔ دوم غیر اللہ کی طرف۔ موحی الیہ کی رعایت سے وحی کے معانی جدا جدا ہیں۔

۱۔ ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ وَھِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَھَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْھًا قَالَتَا اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ فَقَضٰھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا (حٰمٓ سجدہ ۴۱:۱۱،۱۲) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا سو اسے اور زمین کو کہا آ جاؤ خوشی سے یا ناخوشی سے انھوں نے کہا۔ ہم دونوں خوشی سے حاضر ہوتے ہیں پس اس نے سات آسمان دو دن میں بنائے اور ہر آسمان میں اس کا امر وحی ہے۔

۲۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَھَا وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَھَا وَ قَالَ الْاِنْسَانُ مَالَھَا یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَھَا بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَھَا (الزلزال ۹۹:۱......۵) جب زمین اپنا ہلانا ہلائی جائے گی اور زمین اپنا بوجھ باہر نکال پھینکے گی اور انسان کہے گا اسے کیا ہوا ہے؟ اس دن وہ اپنی سب خبریں (زبان حال) سے بیان کر دے گی کیونکہ تیرے رب نے اس کے لیے وحی کی ہے۔

پہلی مثال میں خدا کا آسمان اور زمین سے کلام کرنا اور آسمانوں کی طرف اپنی وحی بھیجنا ظاہر کرتا ہے کہ ایک قسم کی ایسی وحی بھی ہے جس کے ذریعہ قوانین الٰہیہ اس وسیع کائنات میں کام کرتے ہیں۔

دوسری آیت میں اس انقلاب عظیم کو بھی ایک قسم کی وحی قرار دی ہے جو زمین پر لایا جاتا ہے۔

۳۔ وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا (نحل ۱۶:۶۸) اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ پہاڑوں میں گھر بنا۔ اس آیت میں شہد کی مکھی جو عمل اپنی طبعی حس سے کرتی ہے اس کو وحی کا نام دیا ہے۔

۴۔ اِذْ یُوْحِیْ رَبُّکَ اِلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیْ مَعَکُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (الانفال ۸:۱۲) جب ترا رب فرشتوں کو وحی کرتا تھا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں۔ سو جو ایمان لائے ان کو ثابت قدم رکھو۔ اس آیت میں وحی فرشتوں کو کی گئی ہے۔

۵۔ مسیح کے حواریوں کے لیے وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ (المائدہ ۵:۱۱۱) اور جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔

۶۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف۔ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْهِ فَاَلْقِیْهِ فِی الْیَمِّ وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ اِنَّا رَآدُّوْہُ اِلَیْکِ وَجَاعِلُوْہُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (القصص ۲۸:۷) اور موسیٰ کی ماں کو ہم نے وحی کی کہ اسے دودھ پلا پھر جب اس کے متعلق تجھے خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور نہ ڈرنا اور نہ غم کرنا ہم اسے تیری طرف واپس لائیں گے اور مرسلوں میں سے بنائیں گے۔

پانچویں اور چھٹی مثال میں وحی غیر نبی کو کی گئی ہے جس سے مراد وحی ولایت اور مبشرات ہیں۔

وہ آیات جن میں غیر اللہ کی طرف وحی کی گئی ہے۔

۱۔ رسول۔ اَوْحٰٓی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُکْرَۃً وَّعَشِیًّا اشارہ سے کہا کہ صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے رہو۔

۲۔ فرشتے۔ وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآیِٔ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ (الشوریٰ ۴۲:۵۱) اور کسی بشر کے لیے میسر نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی سے یا پردہ کے پیچھے سے یا رسول بھیجے۔ پس اپنے حکم سے جو چاہے وحی کرے۔

۳۔ شیطان۔ وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِهِمْ لِیُجَادِلُوْکُمْ (الانعام ۶:۱۲۱) یعنی بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں وحی کرتے ہیں کہ وہ تم سے جھگڑتے رہیں۔

وحی کی اصطلاحی تعریف: وحی کی انتہائی اعلیٰ صورت کے لحاظ سے اس کے اصطلاحی معنی یہ ہیں۔ الکلمة الالهية تلقى الى انبيائه و اولياه وحى (راغب) یعنی وحی وہ کلمہ الٰہیہ ہے جو اس کے انبیاء اور اس کے اولیاء پر نازل ہوتا ہے۔

پس وحی قادر و توانا خدا کا اپنے برگزیدہ بندے کے ساتھ یا اس کے ساتھ جس کو برگزیدہ کرنا چاہتا ہے مکالمہ ومخاطبہ کا نام ہے۔

وحی کی اقسام: وحی کی حسب ذیل اقسام ہیں۔

وحی فطری: فطری وحی جیسے شہد کی مکھی اپنی طبعی حس سے چھتہ بنا کر اس میں شہد جمع کرتی ہے۔ اسی طرح دیگر حیوانات کے کارنامے بھی اسی قسم کی وحی حیوانات سے مختص ہیں۔ قرآن مجید میں ہے۔ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا (النحل ۱۶:۶۸) اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ پہاڑوں میں گھر بنا۔

وحی ایجادی: جب کوئی شخص کسی چیز کی ایجاد پر اپنی تمام توجہ مبذول کر دیتا ہے۔ تو قدرت الٰہی سے اس شخص کے ذہن پر اس چیز کا نقشہ مرتسم ہو جاتا ہے تو وہ موجد اپنی مطلوبہ کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ وحی اور الہام عام انسانوں کو ہوتا ہے۔ چاہے وہ مومن ہوں یا غیر مومن۔ ارشاد الٰہی ہے۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۲۰) ہم سب کو مدد دیتے ہیں ان کو بھی اور ان کو بھی (مومن اور غیر مومن) تیرے رب کی عطا ہے اور تیرے رب کی عطا کبھی نہیں رکتی۔

وحی الابتلاء: وحی الابتلاء بعض اوقات ہلاکت اور تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ وحی الابتلاء ہر شخص کو نہیں ہوتی جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ جسمانی طور پر اندھے گونگے بہرے پیدا ہوتے ہیں اس طرح بعضوں کی روحانی قوتیں کالعدم ہوتی ہیں لیکن بعض لوگ اس قسم کے بھی ہوتے ہیں وہ قدرت کی طرف سے ایسا دماغ اور فطری استعدادیں لے کر پیدا ہوتے ہیں کہ ان کو سچی خوابیں اور سچے الہام ہوتے ہیں۔ لیکن ان کو خدا کے قرب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اگر تحقیق و تدقیق سے کام لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ایسی خوابوں میں فاسق، فاجر، کافر، ملحد، زانی مرد اور زانیہ عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ لیکن وہ اس روشنی اور نور سے بالکل محروم ہوتے ہیں جو مقربین اور اہل اللہ کی تمام دنیاوی الائشوں کو بالکل بھسم اور نیست و نابود کر دیتا ہے۔

دنیا میں بے شمار ایسے آدمی ہو گزرے ہیں جن کو اپنے الہاموں اور خوابوں پر ناز تھا جب ان کی نجی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا۔ وہ ایسے افعال قبیحہ میں مبتلا تھے۔ جن کی سنگینی خود گناہوں کو لرزہ براندام کر دیتی ہے۔ اگر ان کے بداعمال کی سیاہی دنیا میں پھیلا دی جائے تو دنیا سے نیکی کا نور بھی دب جائے۔ وہ ہر وقت شیطانی طاقتوں اور حدیث النفس سے مغلوب رہتے تھے۔ ان کی وہ سچی خوابیں اور الہام کسی روحانی وجاہت، بزرگی اور قرب الٰہی پر صاد نہیں ابن سیرینؒ بہت بڑے معبر ہو گزرے ہیں اُن کے پاس ایک شخص نے بیان کیا کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کے استین میں چڑیاں گھستی اور نکل جاتی ہیں۔ آپ نے تعبیر کی کہ یہ شخص قاتل ہے جب اس کے گھر کی تلاشی لی گئی۔ تو بے شمار مقتولوں کی ہڈیاں نکلیں۔ اس طرح ایک شخص نے دیکھا کہ وہ انڈوں کی زردی چھوڑ دیتا ہے۔ آپؒ نے تعبیر کی کہ یہ چور ہے۔ اس قسم کے لوگوں کی سچی خوابیں آنے کے دو وجوہ ہیں ایک یہ کہ وہ انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے کی حجت ہیں اگر وہ سچی خوابوں کی حقیقت سے بالکل ناآشنا ہوں تو وہ خدا کے سامنے یہ عذر کر سکتے ہیں کہ ان کو نبوت کی حقیقت کا علم نہ تھا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عنایت ازلی نے انسانی فطرت میں قرب الٰہی کے حصول کے لیے تخم ریزی کی ہے بعضوں کو سچی خوابیں اور الہام اس وجہ سے ہو جاتے ہیں کہ ان کو معلوم ہو سکے کہ ان کے لیے آگے قدم رکھنے کے لیے ایک کھلا روحانی میدان ہے جس کو طے کر کے قرب الٰہی حاصل کر سکتے ہیں اگر ان پر سچی خوابوں کا دروازہ بند ہو جائے تو وہ بیج جو خدا نے اپنے ہاتھ سے انسان کی فطرت میں بویا ہے بالکل ضائع ہو جاتا ہے۔

وحی الابتلاء کے ضمن میں ایک اور گروہ بھی ہے جن کو سچی خواب اور الہام ہوتے ہیں ان کا خدا سے کچھ تعلق بھی ہے وہ اپنی اصلاح نفس کے لیے کوشش کرتے ہیں اور خدا کے قرب کی طرف قدم مارتے ہیں۔ ایک سطحی قسم کی نیکی کی تاثیر ان میں پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے ایک محدود دائرہ تک رویاء صالحہ کے انوار ان میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر ظلمت تاریکی اور ابتلاء سے خالی نہیں ہوتے۔ وہ تقویٰ کی باریک راہوں سے نابلد ہوتے ہیں۔ راست بازی اور قلبی طہارت سے خالی ہوتے ہیں ان کے دل کے پردوں میں تکبر، نخوت، عجب، دنیا پرستی اور نفس پرستی مضمر ہوتی ہے۔ شیطان ان کے دروازے پر کھڑا ہوتا ہے۔ ذرا سی لغزش کے وقت ان کے گھر کے اندر داخل ہو جاتا ہے ان کو ہلاکت اور بربادی کے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔ ہاں اگر خدا کا فضل ان کے شامل حال ہو جائے تو وہ پردے میں ہی اس دنیا سے گزر جاتے ہیں تو گند اپنی جگہ پر ہی ساکن رہتا ہے ذرا تیز ہوا کا جھونکا آ جائے تو پانی کی لہریں ہی گند کو پانی کی سطح کے اوپر لے آتی ہیں اور گند ظاہر ہو جاتا ہے۔

وحی الاصطفاء: وحی الاصطفاء کے دائرہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو خدا کی محبت اور عشق کی آگ میں داخل ہو کر گناہوں کی آلائشوں کو بالکل جلا دیتے ہیں وہ اکمل اور اتم طور پر خدا تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں ان کی اللہ تعالیٰ سے قرب اور تعلق کی یہ نشانی ہوتی ہے وہ خدا کی صفات کا مظہر بن جاتے ہیں۔ اپنے اوپر ایک موت وارد کر لیتے ہیں ایسی روحانی زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جو بالکل پہلی زندگی سے مغائر ہوتی ہے یہ لوگ روشنی کے اس ارفع مینار پر کھڑے ہوتے ہیں جہاں تاریکیوں اور ظلمتوں کا گزر نہیں ہوتا۔ وہ لوگ شیطان کی گرفت سے آزاد ہوتے ہیں۔ نہ ان پر نفس امارہ غالب آ سکتا ہے نہ حدیث النفس اور نہ شیطان اپنے وساوس ان کے قلوب میں ڈال سکتا ہے۔ وہ بالکل خدا کی آغوش میں ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت ۲۹:۶۹) اور جو لوگ ہمارے لیے محنت اٹھاتے ہیں ہم یقیناً انھیں اپنے راستوں پر چلائیں گے۔

وحی الاصطفاء کی اقسام: وحی الاصطفاء کی دو قسمیں ہیں۔

وحی نبوت یا متلو: یہ وحی، وحی شرعی بھی کہلاتی ہے صرف انبیاء علیہم السلام سے مختص ہے۔ شرعی اصطلاح میں وحی نبوت کی تعریف یہ ہے کلام الله المنزل علی نبی من انبیائه (عمدہ القاری شرح صحیح بخاری ص ۱۸ ج ۱ ادارہ الطباعۃ العامرہ استنبول ۱۳۰۸ھ مصنفہ بدرالدین العینی) اللہ کا وہ کلام جو اس کے کسی نبی پر نازل ہو۔

رسول کریم ﷺ کی بعثت سے قبل وحی نبوت ضرورت کے مطابق ایک قوم یا علاقہ کے لیے کسی ایک نبی پر نازل ہوئی تھی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا انسانی عقل نے ترقی کی اور اقوام کے میل جول میں تمام جغرافیائی رکاوٹیں ختم ہو گئیں اور تمام دنیا سمٹ کر ایک کنبہ کی شکل اختیار کر گئی۔ وحدت نسل انسانی کے لیے ایک عالمگیر وحی کی ضرورت تھی۔ وہ وحی قرآن مجید کی شکل میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوئی۔ یہ وہ کتب ہے جس میں بنی آدم کی روحانی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی غرض کہ ہر قسم کی ضروریات کے لیے مجمل اور مفصل تعلیم موجود ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا۔ ''فاران ہی کے پہاڑ سے جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔'' (استثناء ۳۳:۲)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں مگر تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو سچائی کی راہ دکھائے گا۔ (یوحنا ۱۶:۱۱)

وحی نبوت تدریجاً رسول کریم ﷺ پر نازل ہو کر قرآن کریم کی شکل میں مکمل ہو چکی ہے جیسا کہ قرآن مجید کی یہ آیت ظاہر کرتی ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (المائدہ ۵:۳) یعنی آج میں نے تمھارے لیے دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے۔

وحی غیر متلو: وحی نبوت کے علاوہ جو وحی نبی پر نازل ہوتی ہے۔ وہ وحی غیر متلو کہلاتی ہے اور شیطانی تحریکات و اثرات سے بالکل منزہ ہوتی ہے۔ نبی اس وحی کی روشنی میں شریعت کے اصول کی تشریح کرتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ الی اوتیت الکتاب و مثله یعنی مجھے کتاب اور اس کی مثل دی گئی ہے۔ کتاب سے مراد وحی متلو یعنی قرآن مجید اور مثل سے مراد وحی غیر متلو یعنی قرآن مجید کے مجملات، متشابہات اور فروع کی توضیح و تشریح ہے۔ وحی متلو کا یہ خاصہ ہے۔ اس کے ساتھ تین چیزیں ضروری ہوتی ہیں۔

اوّل۔ مکاشفات صحیحہ: اس کی مثال رسول کریم ﷺ کو اس دنیا میں کشفی رنگ میں بہشت اور دوزخ کا نظارہ دکھایا ہے۔ قرآن مجید میں جنت اور دوزخ کی خبر ہے۔ کشف نے اس خبر کو معائنہ و مشاہدہ میں بدل دیا اس طرح آپ کی گذشتہ انبیاء علیہم السلام سے ملاقاتیں ہوئیں یہ بھی کشفی رنگ میں ہوئیں۔

دوم۔ رویا صالحہ: رویا صالحہ کے ذریعے علم استعارات وحی یاب پر کھل جاتا ہے اور علم تعبیر میں مہارت پیدا ہوتی ہے اس وجہ سے نبی کمالات اور معاملات یقینیہ کی طرف تیزی سے ترقی کرتا ہے۔

سوم وحی خفی و تفہیمات الٰہیہ کے نام سے موسوم ہوتی ہے اس کو وحی غیر متلو کہا جاتا ہے۔ صوفی اس کو وحی خفی اور وحی قلب کے نام سے پکارتے ہیں اس وحی کی غرض یہ ہوتی ہے کہ وحی متلو کے بعض مجملات اور اشارات نبی پر کھل جائیں مثلاً نماز کا حکم قرآن مجید میں موجود ہے لیکن جس رنگ میں آج مسلمان ادا کرتے ہیں اس کا ذکر کہیں بھی قرآن مجید میں نہیں ملتا۔ قرآن مجید کے اس مجمل حکم کو وحی خفی نے رسول کریم ﷺ پر کھول دیا۔

وحی ولایت: جب یہ غیر متلو وحی غیر نبی کو ہو گی تو اس وحی کو وحی ولایت کہیں گے۔ اولیاء کرام اس وحی سے مختص ہوتے ہیں۔ وحی کی یہ قسم کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتی علم کلام کا یہ عام مسئلہ ہے۔ وَالْاِلْهَامُ لَيْسَ بِحُجَّةٍ عِنْدَ الشَّرْعِ ولی کا الہام شرعی قانون نہیں بن سکتا۔

وحی ولایت جاری ہے: اللہ تعالیٰ نے انسان کو حواس ظاہری کے مقابل حواس باطنی عطا کیے ہیں حواس ظاہری کو کام میں لانے کے لیے قدرت نے خارج میں ہر قسم کا سامان مہیا کیا ہوا ہے تو پھر یہ کیوں کر خیال کیا جا سکتا ہے کہ حواس باطنی پہلے تو انسانوں میں موجود تھے اب مفقود ہیں اور ان کی تربیت کا سامان ختم ہو چکا ہے وحی ولایت کے ختم کرنے کے ساتھ یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ انسان میں حواس باطنی مفقود ہو چکے ہیں لیکن یہ خلاف واقعہ چیز ہے۔ انسان کے اندر حواس باطنی جیسے پہلے موجود تھے۔ اب بھی موجود ہیں جب انسان کے اندر حواس باطنی موجود ہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی تربیت اور پرورش کے لیے وحی ولایت کا دروازہ کھلا ہے اور نسل انسانی اللہ تعالیٰ کی اس نعمت سے ہمیشہ متمتع ہوتی رہے گی۔ قرآن مجید اور حدیث دونوں سے اجرائے وحی ولایت کی تصدیق ہوتی ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (یونس ۱۰:۶۳) جو ایمان لائے اور تقویٰ کرتے ہیں ان کے لیے دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں خوش خبری ہے اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں یہ بڑی بھاری کامیابی ہے۔

البشریٰ جو ایک متقی انسان کو اس زندگی میں دی جاتی ہیں۔ رسول کریم ﷺ کی حدیث کی رو سے وہ رویا صادقہ ہیں حدیث صحیح میں اس کی تصریح موجود ہے رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ (بخاری ۹۱:۷) نبوت میں سوائے مبشرات کے کچھ باقی نہیں رہا۔ صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے دریافت کیا یارسول اللہ ﷺ مبشرات کیا ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا رویا صالحہ (بخاری ۹۱:۵) بخاری میں ابوسعید خدری سے روایت ہے۔ اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَ اَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ رویا صالحہ نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے قرآنی آیت اور احادیث اس بات پر کافی ثبوت بہم پہنچاتی ہیں کہ ولایت وحی اپنی ادنیٰ صورت میں جاری ہے۔ ہاں وحی نبوت جو جبرائیل امین نبی پر لاتا ہے قیامت تک بند ہے۔

قرآن مجید میں خدا تعالیٰ کی بے شمار صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان صفات میں خدا تعالیٰ کا کلام کرنا بھی صفت ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ (الشوریٰ ۴۲:۵۱) اور کسی بشر کے لیے یہ میسر نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی سے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفات دیکھنا، سننا، مجیب اور باسط وغیرہ ہیں اسی طرح قرآن مجید کی رو سے کلام کرنا بھی اس کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت بھی معطل نہیں ہو سکتی۔ اس سے نقص لازم آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تمام نقائص سے پاک، منزہ اور تمام خوبیوں کی جامع ہے۔ اگر مبشرات کا دروازہ بند تسلیم کر لیا جائے تو انسان کی پیدائش کی غرض و غایت یہ ہے کہ وہ اپنی روحانی استعدادوں کو زندہ رکھے روحانی زندگی اس وقت تک میسر نہیں آ سکتی جب تک وہ مبشرات اور رویا صالحہ کے پانی سے سیراب نہ ہو۔

اولیاء کرام کے تجربات: حضرت عمرؓ ایک دفعہ مسجد نبوی میں خطبہ دے رہے تھے۔ دوران تقریر میں فرمایا "یاساریۃ الجبل" اے ساریہ پہاڑ کی جانب مڑ جاؤ۔ تقریر میں یہ بے ربط جملہ سن کر سامعین حیران تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد حضرت ساریہ محاذ جنگ سے واپس آئے تو انھوں نے حضرت عمرؓ سے عرض کی یاامیر المومنین! ہم ایک جگہ کفار کی فوج میں گھر گئے تھے۔ بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی میں نے آپ کی آواز کے مشابہ ایک آواز سنی جو یہ کہہ رہی تھی۔ "اے ساریہ پہاڑ کی جانب مڑ جاؤ" ہم نے اس آواز پر لبیک کہا اور پہاڑ پر چڑھ گئے اور فتح ہوئی آپ نے فرمایا ہاں آواز میں نے ہی دی تھی۔

امت محمدیہ کے تمام اولیاء کرام و علماء عظام اس بات کے قائل ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی کامل اتباع سے انسان اللہ تعالیٰ کے مکالمات و مخاطبت سے مشرف ہو جاتا ہے۔ کتاب فتح ربانی کی ۵۳ ویں مجلس میں لکھا ہے کہ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے کسی نے سوال کیا کہ انبیاء علیہم السلام کی طرف خدا تعالیٰ کا جبرائیل فرشتہ آتا ہے اور اولیاء کی طرف اس کا کون رسول آتا ہے جواب میں فرمایا ان کا بھی بلاواسطہ وہی رسول ہے۔ (فتح ربانی مطبوعہ مصر مجلس ۵۳)

وحی ولایت کی حقیقت: اولیاء کرام کو ہونے والی وحی ولایت پہلے عالم برزخ میں آنحضرت ﷺ کی روح مبارکہ پر متجلی ہوتی ہے اس کا عکس اولیاء کے قلوب پر پڑتا ہے۔

وحی نبوت اور وحی ولایت کا شرعی مقام

وحی نبوت کا مقام: وحی نبوت پر ایمان لانا جزو ایمان ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (البقرہ ۲:۴) اور جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (البقرہ ۲:۲۸۵) رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب کی طرف سے اتارا گیا اور مومن بھی سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے وحی نبوت (کتاب) پر ایمان لانا دینی فریضہ ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وحی الٰہی اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان سچا تعلق پیدا کرتی ہے۔ دوسری حکمت یہ ہے تا کہ بنی آدم میں اتحاد کا رشتہ قائم ہو جائے۔

وحی ولایت کا شرعی مقام: وحی ولایت کسی کے لیے قابل حجت نہیں اور نہ اس کا اتباع فرض ہے۔ علم کلام کا عام مسئلہ ہے۔ وَالْاِلْهَامُ لَيْسَ بِحُجَّةٍ عِنْدَ الشَّرْعِ وحی کا الہام شرعی قانون نہیں بن سکتا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے مختلف مواقع پر یہ بحث کی ہے کہ اگر کسی مقام پر کسی ولی کا الہام ظاہراً حکم شرعی کے خلاف ہو تو فتویٰ ظاہر شریعت کے مطابق ہوگا۔ علامہ الشاطبی فرماتے ہیں کہ اگر کشف الہام یا خواب کے ذریعے کوئی ایسی بات معلوم ہو جو قرآن وسنت کے معروف احکام کے مطابق نہیں ہے تو اس کے تقاضے پر عمل کرنا کسی کے نزدیک جائز نہیں۔ (الاعتصام ص ۳۵۱ فما بعد ج ۱ مطبعۃ المنار مصر ۱۳۳۱ھ بحوالہ البلاغ جمادی الاول ۱۳۹۳ھ شمارہ ۵)

وحی نبوت ہر شخص پر کیوں نازل نہیں ہوتی: وحی نبوت وہبی امر ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (الانعام ۶:۱۲۴) اللہ خوب جانتا ہے کہ رسالت (وحی نبوت) کو کہاں رکھتا ہے۔

کفار انکار نبوت میں ایک وجہ یہ بیان کرتے تھے۔ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ (الانعام ۶:۱۲۴) ہم تو ایمان نہیں لائیں گے جب تک وہی وحی نبوت ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی تو اللہ تعالیٰ نے اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ کہہ کر ان کے باطل خیال کی تردید کر دی ہے۔ متذکرہ صدر آیت کے علاوہ وحی نبوت کے وہبی امر ہونے پر یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کا ذکر صفت رحمانیت کے تحت کیا ہے صفت رحمانیت اجر بلا عمل کی متقاضی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس صفت کے تحت مادی زندگی کے لیے ہوا، چاند، سورج، ستارے، زمین، پہاڑ، درخت، پانی وغیرہ پیدا کیے ہیں اسی طرح وحی نبوت بھی وہبی ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (الرحمٰن ۵۵:۱،۲) یعنی وہ ہستی رحمان ہی ہے جس نے قرآن جیسی کتاب کا علم دینوی اور روحانی زندگی کی تکمیل کے لیے دیا ہے۔

کلام الٰہی تین صورتیں: قرآن کریم کی رو سے اللہ تعالیٰ کی انسان کے ساتھ ہم کلامی کی تین صورتیں ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (الشوریٰ ۴۲:۵۱) اور کسی بشر کے لیے میسر نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی سے یا پردہ کے پیچھے سے یا رسول بھیجے پس اپنے حکم سے جو جی چاہے وحی کرے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے کلام کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں۔

۱۔ وَحْيًا۔ ۲۔ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ۔ ۳۔ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ۔

صورت اول میں وحی سے مراد مسلمہ طور پر ''القائی الروح'' لیا گیا ہے کیونکہ وحی کے معنی اشارہ سریعہ کے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سرعت کے ساتھ ایک خیال بغیر کسی غور وفکر کے اچانک دل میں ڈال دیا جاتا ہے وہ ایک نیا علم ہوتا ہے جو دل میں بجلی کی سرعت کے ساتھ آتا ہے اور اسرار الٰہیہ سے پردہ اٹھا دیتا ہے۔ تمام پوشیدہ حقیقتیں سامنے آجاتی ہیں۔ جس طرح تاریک کمرہ میں روشن چراغ آجائے تو کمرہ کی تمام تاریکی کافور ہو جاتی ہے اور ہر ایک نشیب و فراز سامنے نظر آنے لگتا ہے اس کو وحی خفی کہتے ہیں یہ وحی کی ادنیٰ صورت ہے اس میں نبی اور غیر نبی دونوں شامل ہوتے ہیں۔

وحی کی دوسری صورت ''مِنْ وراء حجاب'' ہے یعنی پس پردہ اس میں رویاء کشف اور الہام شامل ہیں اس صورت میں انسان کو علم حواس باطنی کے ذریعے خارج سے آتا ہے۔ واضح طور پر محسوس تو کرتا ہے مگر متکلم اور نظارہ دکھانے والے کو نہیں دیکھتا اس صورت میں بھی نبی اور غیر نبی دونوں شامل ہیں۔

وحی کی تیسری صورت اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ہے یعنی جبرائیل امین کے ذریعے وحی انسان کو پہنچائی جاتی ہے۔ اس کا نزول بھی خارج سے حواس باطنی پر ہوتا ہے لیکن اس وحی کے لیے حواس سامعہ اور حواس باصرہ مخصوص ہیں۔ یہ وحی انبیاء علیہم السلام پر ہی نازل ہوتی ہے۔ غیر نبی اس میں شامل نہیں ہوتا یہ وحی کی اعلیٰ ترین واضح اور بین یقینی صورت ہے۔ قرآن مجید اور دوسری کتب سماوی اس وحی اعلیٰ کی حامل ہیں۔ اس وحی کو وحی متلو بھی کہتے ہیں۔ یعنی وہ وحی جو الفاظ میں پڑھی جاتی ہے اس کو وحی نبوت بھی کہتے ہیں اور قرآنی اصلاح میں اس کو کتاب کہتے ہیں۔ کتاب اس وجہ سے کہ وہ ایک شاہی فرمان کی حیثیت رکھتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے نبی پر نازل ہوتا ہے تا کہ نبی اسے بنی آدم تک پہنچا دے اور لوگ اس فرمان کے مطابق زندگی گزاریں۔

نزول وحی کے طریقے: رسول کریم ﷺ پر مختلف طریقوں سے وحی نازل کی جاتی تھی۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حارث بن ہشام نے رسول کریم ﷺ سے پوچھا کہ آپ ﷺ پر وحی کس طرح سے آتی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔

اَحْيَانًا يَاْتِيْنِيْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ اَشَدُّهٗ عَلَيَّ فَيُفْصَمُ عَنِّيْ وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ وَاَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلًا فَيُكَلِّمُنِيْ

فَاَعِی مَایَقُوْلُ (صحیح بخاری ج ۱ اصح المطابع کراچی) یعنی کبھی تو ایسے آتی ہے جیسے گھنٹی کی آواز اور مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے۔ پھر وہ حالت مجھ سے جاتی رہتی ہے اور میں اس سے محفوظ کر لیتا ہوں جو وہ فرشتہ کہتا ہے اور کبھی فرشتہ انسان کی شکل میں میرے پاس آتا ہے اور مجھ سے بات کرتا ہے میں اس کا کہا یاد کر لیتا ہوں۔ اس حدیث میں رسول کریم ﷺ پر نزول وحی کے دو طریقے بیان کیے گئے ہیں۔

ا۔ صلصلة الجرس. پہلا طریقہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کو اس قسم کی آواز سنائی دیتی تھی۔ جیسی گھنٹیاں بجنے سے پیدا ہوتی ہے۔ صلصلة دراصل اس آواز کو کہتے ہیں جو لوہے کے ایک ٹکڑے کو دوسرے پر مارنے سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس کا اطلاق ہر اس آواز پر کیا جانے لگا جس میں جھنجھناہٹ ہو چنانچہ شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔ **الصلصلة فی الاصل صوت وقوع الحدید علی بعض ثم الطلق علی کل صوت له طنین** (فتح الباری ج ۱ ص ۱۶، ج ۸ ص ۴۳۶) وحی کی آواز کو صلصلة الجرس سے تشبیہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح گھنٹے کی آواز صوت محض کی صورت میں سنائی دیتی ہے اور اس کا کوئی مبداء اور مقطع نہیں ہوتا اس طرح وحی کی اس آواز کا جس کو نبی سنتا ہے کوئی مقطع اور مبداء نہیں ہوتا۔ اس بناء پر یہ آواز مرکب نہیں بلکہ بسیط ہوتی ہے۔ (فتح الباری ج ۱ ص ۱۹)

صلصلة الجرس (گھنٹی کی آواز) سے کیا مراد ہے اس بارے میں مختلف مسالک ہیں۔

ا۔ حضرت امام بخاری فرماتے ہیں کہ یہ خدا کی آواز ہوتی ہے جو تمام فضا میں گونج جاتی ہے چنانچہ وہ اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں۔ **اِذَا تکلم الله بالوحی** جب اللہ تعالیٰ وحی کے ساتھ کلام کرتا ہے۔

۲۔ ابن حجر عسقلانی کا یہ مسلک ہے کہ یہ آواز فرشتہ وحی کے پروں کی ہوتی ہے۔ حدیث نبویہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فرشتوں کے پروں سے اس قسم کی آواز آتی ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **اذا قضی الله الامر فی السماء ضربت الملائکة باجنحتها خضعانًا لقوله کانه سلسلة علی صفوان فاذا فزع عن قلوبهم قالوا ماذا قال ربکم قالوا للذی قال الحق وهو العلی الکبیر** (فیض الباری ج ۱ ص ۱۹۱) جب اللہ تعالیٰ آسمان میں حکم صادر فرماتے ہیں تو فرشتے خوف کی وجہ سے اپنے پر پھڑ پھڑانے لگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا کلام اس طرح سنائی دیتا ہے جیسے پتھر پر ایک زنجیر کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پس جب ان کے دلوں سے خوف اور گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا حکم صادر فرمایا ہے وہ (مقربین) کہتے ہیں کہ حق بات کا حکم صادر ہوا اور وہ بلند اور بزرگ ہے۔

۳۔ ابن حجر عسقلانی نے کہا اور روایت نقل فرمائی ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں۔ **اذا تکلم الله بالوحی اهل السموات صلصلة کصلصلة السلسلة علی الصفوان فیفزعون و یرون انه من امر الساعة** (فتح الباری ج ۸ ص ۴۳۶) جب اللہ تعالیٰ کوئی وحی فرماتے ہیں تو اہل سموات اس کو اس طرح سنتے ہیں جس طرح لوہے کی زنجیر ایک صاف پتھر پر پڑنے سے آواز آتی ہے۔ پس وہ (فرشتے) (اللہ تعالیٰ کے جلال کے باعث) ہیبت زدہ ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ قیامت کے متعلق کوئی حکم ہے۔

تیسرا مسلک یہ ہے کہ یہ فرشتہ کی زبان کی آواز ہوتی ہے۔ کئی شارحین اور جید محدثین اس کے بھی قائل ہیں۔

۴۔ علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ یہاں تشبیہ آواز کے ترنم میں نہیں بلکہ اس کے تسلسل میں ہے کہ جس طرح گھنٹی کی آواز مسلسل ہوتی ہے اور کسی جگہ ٹوٹتی نہیں اسی طرح وحی کی آواز بھی مسلسل ہوا کرتی تھی (فتح الباری مصنفہ حافظ ابن حجر ص ۱۶ ج ۱ المطبعۃ البہیۃ ۱۳۴۸ھ بحوالہ البلاغ ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ جون ۱۹۷۳ء جلد ۷ شمارہ ۴)

۵۔ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری نے شیخ اکبر حضرت محی الدین عربی سے نقل کر کے اس تشبیہ کا جو مطلب بیان کیا ہے وہ مذکورہ بالا تمام توجیہات سے زیادہ لطیف ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ یہ تشبیہ صرف دو اعتبار سے دی گئی ہے ایک تو آواز کے تسلسل کے اعتبار سے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے اس اعتبار سے کہ گھنٹی جب مسلسل بج رہی ہو تو عموماً سننے والے کو اس کی آواز کی سمت متعین کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ اس کی آواز ہر جہت سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور باری تعالیٰ چونکہ جہت اور مکان سے منزہ ہے اس لیے کلام الٰہی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی آواز کسی ایک سمت سے نہیں آتی۔ بلکہ ہر جہت سے آتی ہے اس کیفیت کا صحیح ادراک تو بغیر مشاہدہ کے ممکن نہیں لیکن اس بات کو عام ذہنوں کے قریب لانے کے لیے آنحضرت ﷺ نے اسے گھنٹیوں کی آواز سے تشبیہ دی ہے۔ (فیض الباری ص ۱۹، ۲۰ جلد ۱ قاہرہ ۱۳۵۷ھ بحوالہ البلاغ ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ جلد ۷ شمارہ ۴)

عصر جدید میں وحی کی اس صورت میں جو آواز سنائی دیتی ہے اس کو سمجھنا چنداں مشکل نہیں۔ تار گھر سے جب پیغام کسی دوسرے شہر میں بھیجا جاتا ہے تو الفاظ کو ٹک ٹک کی آواز سے ادا کیا جاتا ہے تار کو وصول کرنے والا کلرک جو اس فن سے واقف ہوتا ہے۔ اس الفاظ کو سن کر الفاظ میں لکھتا جاتا ہے لیکن ایک عام آدمی کے نزدیک جو اس فن سے نابلد ہوتا ہے وہ ٹک ٹک کی آواز بے معنی ہوتی ہے اس طرح وحی کی آواز کو جب کوئی دوسرا سن لیتا ہے تو اس کی کیفیت اپنے

الفاظ میں بیان تو کر سکتا ہے لیکن اس بسیط اور بے جہت آواز کلام الٰہی کو اخذ نہیں کر سکتا یہ کلام صرف یہی سمجھ سکتا ہے مولانا انور شاہ صاحب کشمیری فرماتے ہیں:
وصلصلة الجرس ههنا كنقرات التلقراف لاداء الرسالة (مشکلات القرآن ص ۱۴۴) گھنٹہ کی آواز ٹیلیگراف کی ٹک ٹک کی طرح ہے جو پیغام رسانی کے لیے کی جاتی ہے۔ وحی کی یہ صورت جس کو حدیث میں صلصلۃ الجرس کے الفاظ میں تعبیر کیا گیا ہے۔ رسول کریم ﷺ پر زیادہ اشد اور اثقل ہوتی تھی حدیث میں آتا ہے۔ احیاناً یاتینی مثل صلصلة الجرس وهو اَشَدُّهٗ عَلَیَّ (بخاری جلد ۱ ص ۳، ۴۵۷) کبھی تو وحی ایسے آتی جیسے ایک گھنٹہ کی آواز آتی ہے اور یہ مجھ پر سخت ہوتی تھی۔ قرآن مجید نے اسے قولاً ثقیلاً (وزنی کلام) کہا ہے اس صورت میں وحی اشد اور اثقل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ کو مادیت سے منقطع ہو کر کلی طور پر عالم روحانی کی طرف منتقل ہونا پڑتا تھا تاکہ سامع (آنحضرت ﷺ) اور حامل وحی (جبرائیل علیہ السلام) میں مناسبت سماع پیدا ہو جائے چونکہ اس وقت آپ کی جہت بشری اور جہت ملکوتی میں تصادم پیدا ہوتا تھا اس وجہ سے وحی کی یہ صورت آپ ﷺ پر اثقل اور شدید تر ہوتی تھی۔

۲۔ تمثیل ملک: وحی کی دوسری صورت جو اس حدیث میں بیان کی گئی ہے یہ ہے کہ فرشتہ انسانی شکل میں آپ ﷺ کے پاس آ کر پیغام الٰہی پہنچاتا وحی کی اس صورت میں آپ ﷺ کوئی خاص دشواری اور بوجھ محسوس نہ کرتے۔ چنانچہ صحیح ابوعوانہ کی ایک روایت میں ہے آپ ﷺ نے وحی کی اس صورت کا ذکر کر کے فرمایا وهوا هونه علی (الاتقان ج ۱ ص ۴۶) اور یہ صورت میرے لیے سب سے زیادہ آسان ہوتی ہے۔ حضرت عائشہؓ کی مذکورہ بالا حدیث میں تو وحی کے صرف دو طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن دوسری احادیث میں اس کے علاوہ بھی کئی طریقے بیان ہوئے ہیں۔ علامہ حلیمی نے لکھا ہے کہ رسول کریم ﷺ پر وحی چھیالیس مختلف طریقوں سے نازل ہوتی تھی۔ (فتح الباری مصنفہ حافظ ابن حجر ج ۱ ص ۱۶) لیکن حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ انھوں نے حامل وحی (جبرائیل علیہ السلام) کی مختلف صفات کو وحی کے مختلف طریقے شمار کر کے تعداد چھیالیس تک پہنچا دی ہے۔ ورنہ تعداد اتنی نہیں۔ (فتح الباری مصنفہ ابن حجر ج ۱ ص ۱۶)
دوسری احادیث میں وحی کے جو طریقے بیان ہوئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۳۔ فرشتہ کا اصل شکل میں آنا: وحی کا تیسرا طریقہ یہ تھا کہ حضرت جبرئیل امین بغیر کسی انسانی شکل اختیار کیے اپنی اصل صورت میں وحی نبوت لے کر رسول کریم ﷺ کے پاس آتے تھے۔

۴۔ رویائے صالحہ: وحی کا چوتھا طریقہ رویائے صالحہ تھا رسول کریم ﷺ کو نزول قرآن سے قبل سچے خواب نظر آتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں اول مابدی رسول الله ﷺ من الوحی الرویا الصالحة فی النوم فکان لایری روياء الاجاءت مثل فلق الصبح (صحیح بخاری جلد ۱ ص ۲) پہلے جو وحی آنحضرت ﷺ پر شروع ہوئی۔ وہ حالت خواب میں سچا رویا تھا سو آپ ﷺ جو خواب دیکھتے تھے صبح کی روشنی کی طرح اس کی سچائی ظاہر ہو جاتی تھی۔ یہ وحی غیر متلو تھی۔ وحی متلو کے نزول کا آغاز آیت اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ سے ہوا تھا۔

۵۔ کلام الٰہی: اللہ تعالیٰ کسی فرشتہ یا آواز کے توسط کے بغیر براہ راست نبی کے دل پر وحی نازل فرماتے جیسے اللہ تعالیٰ نے شب معراج میں رسول کریم ﷺ کی طرف وحی فرمائی۔ ارشاد الٰہی ہے۔ ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی (النجم ۵۳: ۸۔۱۰) پھر قریب ہوا اور بہت قریب ہوا۔ سو وہ دو کمانوں کے قریب ہوا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قریب ہوا۔ سو اس نے اپنے بندے کی طرف وحی کی جو وحی کی۔

۶۔ نفث فی الروع (بات کا دل میں ڈال دینا): حضرت جبرائیل علیہ السلام کسی بات کو آپ ﷺ کے قلب مبارک میں القا کر دیتا تھا چنانچہ ایک روایت میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ اِنَّ رُوْحَ القدس نفث فی روعی (الاتقان ج ۱ ص ۴۶) روح القدس (جبرائیل علیہ السلام) نے میرے دل میں بات ڈال دی اور مستدرک کی روایت میں یہ الفاظ میں اِنَّ جِبْرَائِیْلَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَلْقٰی فِیْ رُوْعِیْ اِنَّ اَحَدًا مِنْکُمْ لَنْ یَخْرُجَ مِنَ الدُّنْیَا حَتّٰی یَسْتَکْمِلَ رِزْقَہٗ (مستدرک الحاکم کتاب البیوع ج ۲ ص ۴) جبرائیل علیہ السلام نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ تم میں سے کوئی دنیا سے نہیں جائے گا۔ جب تک اپنا رزق پورا نہ کرے۔ یہ وحی، وحی غیر متلو تھی۔

۷۔ اللہ تعالیٰ کا بلاواسطہ کلام فرمانا: اللہ تعالیٰ کسی فرشتہ کے بغیر نبی سے کلام کرتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ کَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا۔ (النساء ۴: ۱۶۴)

۸۔ اللہ تعالیٰ کا بغیر حجاب کے کلام کرنا: حضرت ابن القیم اس طریقہ وحی کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔ هی تکلیم الله له کفاحا من غیر حجاب یعنی وہ طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نبی سے بغیر حجاب کے کلام فرمائے۔
اس کے ساتھ علامہ صاحب یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ وحی کا یہ طریقہ تمام امت کے نزدیک مسلمہ نہیں بلکہ اس کے قائل وہ علماء ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ

رسول کریم ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا۔ روایت باری تعالیٰ کی کیفیت کے بارے میں سلف اور خلف میں اختلاف ہے بعض علماء کا یہ عقیدہ ہے کہ رسول کریم ﷺ نے اپنی آنکھ سے خدا کو دیکھا جیسا کہ حضرت کعب فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے اپنی رویئت اور کلام کو محمد ﷺ اور موسیٰ علیہ السلام پر تقسیم فرما دیا۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دو مرتبہ کلام کیا اور محمد ﷺ نے دو مرتبہ اللہ کو دیکھا۔ (ابن کثیر ج ۴ ص ۲۵۰)

حضرت عبداللہ بن عباس کا مسلک بھی یہی ہے۔

اس کے برعکس بعض علماء کا یہ مسلک ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی رویئت اپنی روحانی آنکھ سے کی تھی اور ان مادی آنکھوں سے نہیں کی تھی۔ جیسا کہ محمد بن کعب نے رسول کریم ﷺ کے بعض اصحاب سے نقل کیا ہے کہ ہم نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا آپ ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا آپ ﷺ نے فرمایا۔ لم اراہ بعینی و رَأَیْتُہٗ بفوادی مرتین ثم تلاثم دنا فتدلی ان آنکھوں سے نہیں بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھا ہے پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ثم دنی فتدلی. (پھر وہ بہت زیادہ قریب ہوا)

علامہ ابن کثیر نے ایک اور روایت نقل فرمائی ہے کہ صحابہ نے رسول کریم ﷺ سے دریافت فرمایا کیا آپ ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا ہے آپ ﷺ نے فرمایا رایتہٗ بفوادی مرتین ثم قراء ما کذب الغواد مارای (ابن کثیر ج ۴ ص ۲۵۰) میں نے اس کو اپنے دل سے دو مرتبہ دیکھا پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ماکذب الغواد مارای (دل نے دیکھا غلط نہیں دیکھا) اس مسئلہ میں حضرت عائشہ کا یہ مسلک ہے کہ رسول کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا وہ قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کرتی ہیں۔ لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وھو یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ آنکھ اس کا احاطہ نہیں کرسکتی اور وہ آنکھ کو پا سکتا ہے۔ حضرت عائشہ کا قول کے معنی بھی اسی قدر ہو سکتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو ان آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ قلب سے دیکھنا یا کشف یا رویاء میں دیکھنا اس کے خلاف نہیں۔

پس حق یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ نے اللہ کو اپنے قلب سے دیکھا اور بعض حدیثوں میں رویاء میں دیکھنے کا ذکر ہے اور یہ آیت لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ کے خلاف نہیں۔

۹۔ کتابت کے ذریعے وحی: وحی کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لکھی ہوئی چیز موحی الیہ پر کشف کی حالت میں ظاہر کر دیتا ہے۔

۱۰۔ تفہیم غیبی: بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو کسی مشکل ترین عقدہ کے حل کا غیب سے فہم عنایت کر دیتا ہے جس تک دوسرے شخص کی فکر و نظر رسائی نہیں کر سکتی۔ دراصل یہ القاء فی القلب اور نفث فی الروع ہی کی ایک قسم ہے۔ یہ وہ خاص فہم ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا۔ ارشاد الٰہی، وَدَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْکُمٰنِ فِی الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِیْہِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَکُنَّا لِحُکْمِہِمْ شٰہِدِیْنَ فَفَہَّمْنٰہَا سُلَیْمٰنَ وَکُلًّا اٰتَیْنَا حُکْمًا وَّعِلْمًا (الانبیاء ۲۱: ۷۸، ۷۹) اور داؤد اور سلیمان کو جب وہ کھیتی کے معاملہ میں فیصلہ کرنے لگے۔ جب اس میں لوگوں کی بکریاں رات کو چر گئیں اور ہم ان کے فیصلے کے گواہ تھے۔ سو ہم نے وہ (فیصلہ) سلیمان کو سمجھا دیا اور سب کو ہم نے فہم اور علم دیا ہے۔ علامہ الشیخ علاؤ الدین بن محمد بن ابراہیم اپنی تفسیر خازن میں فَفَہَّمْنٰہَا سُلَیْمٰنَ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں یعنی یہ فیصلہ ہم نے اس کو سکھایا اور ہم نے اس کو الہام کیا۔ (خازن ج ۴ ص ۲۴۶) ایسا ہی علامہ بغوی نے تفسیر معالم التنزیل میں لکھا ہے (بغوی علی ہامش الخازن ج ۴ ص ۲۴۶) علامہ علاؤ الدین بعض اہل علم کا قول نقل کر کے فرماتے ہیں کہ تفہیم غیبی دراصل وحی ہی ہوتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام نے یہ فیصلہ وحی ہی سے کیا تھا۔ (خازن ج ۴ ص ۲۴۶) یہ وحی وحی غیر متلو ہے۔ اس میں غیر نبی بھی شامل ہوتے ہیں۔

وحی الٰہی کے اترنے کی جگہ: قرآن مجید میں یہ امر واضح ہے کہ وحی الٰہی کے اترنے کی جگہ انسانی قلب ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ قُلْ مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّہٗ نَزَّلَہٗ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰہِ (البقرہ ۲: ۹۷) کہہ جو کوئی جبریل کا دشمن ہے بے شک اس نے اللہ کے حکم سے تیرے دل میں اتارا۔

وحی الٰہی قلب پر کیوں نازل ہوتی ہے: انسان کے دو حصے ہیں ایک تو وہ حصہ جو قدرت کی ہدایت کے مطابق بے اختیار اور بغیر قوت ارادی کے چل رہا ہے مثلاً ہمارے جسم کا اندرونی نظام وغیرہ انسان کا دوسرا حصہ قلب ہے جو انسان کو دنیا کی تمام اشیاء سے امتیاز بخشتا ہے جس کے تحت انسان علم حاصل کر کے تمام کائنات کا حاکم بنتا ہے کیونکہ انسانی عقل ادراک اور شعور کا مرکز ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے دل کو حصول علم کے لیے حواس ظاہری اور حواس باطنی عطا فرمائے ہیں۔ ہم حواس ظاہری سے سن کر، دیکھ کر، چھو کر، چکھ کر علم حاصل کرتے ہیں۔ پھر اس علم کو قلب میں منتقل کر دیتے ہیں۔ پھر قلب عقل و شعور کے سامنے پیش کرتا ہے اور عقل صحت اور عدم صحت کا حکم نافذ کرتی ہے اسی طرح حواس ظاہری کے مقابل پر حواس باطنی ہیں۔ حس باصرہ کے بالمقابل باطنی آنکھ، حس سامعہ کے بالمقابل باطنی کان حواس ذائقہ، شامہ اور لامسہ کے بالمقابل باطنی حواس ذائقہ شامہ اور لامسہ ہیں۔ جب انسان کا دل تمام دنیاوی کدورتوں اور غلاظتوں سے

پاک صاف ہوتا ہے بدن کے ساتھ مشغول رہنے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے متصل ہو جاتا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ اس کے مطہر قلب پر وحی نازل کرتا ہے اور انسان کے باطنی حواس، حواس ظاہری کی طرح نظارے دیکھتے ہیں۔ ذائقے چکھتے ہیں۔ خوشبو سونگھتے ہیں آوازیں سنتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں چونکہ اللہ تعالیٰ نے صرف انسان کے دل کو ہی باختیار اور بارادہ بنایا ہے۔ وہ صحیح علم حاصل کر کے اس کے مطابق عمل کرے یا نہ کرے۔ اس وجہ سے یہ ضروری تھا کہ خدا تعالیٰ قلب کو اپنی وحی کے لیے جائے نزول بناتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو یہی گرامی نعمت گراں قدر عنایت ہوئی ہے جو دوسری مخلوق کو نہیں ملی۔

انسانی قلب پر وحی کا نزول کس طرح ہوتا ہے؟: وحی الٰہی ایک علم ہے جو انسان کے مقصد حیات کو پورا کرنے کے لیے اس کی راہنمائی کرتا ہے چونکہ یہ علم باطن سے تعلق رکھتا ہے اس لیے براہ راست قلب کے حواس باطنی پر پڑتا ہے جب اس علم کا نزول قلب کی حس باصرہ پر ہوتا ہے تو وحی ایک نظارہ کی شکل میں ہوتی ہے۔ جسے کشف اور رویاء کہتے ہیں جب قلب کی حس سامعہ پر اس کا نزول ہوتا ہے تو موحی الیہ ایک عجیب خوش ذائقہ چیز کی حلاوت اور لذت زبان پر محسوس کرتا ہے جب قلب کی قوت شامہ پر اس کا نزول ہوتا ہے تو ایک عجیب خوشبو کا احساس ہوتا ہے جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کے پیرہن سے خوشبو محسوس کی اور فرمایا اِنِّی لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (یوسف ۱۲:۹۴) یقیناً میں یوسف کی خوشبو پاتا ہوں اگر مجھے بہکا ہوا نہ سمجھو۔

یہ قلب کی باطنی قوت شامہ کا احساس تھا۔ اس طرح جب قلب کی قوت لامسہ پر اس کا نزول ہوتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کسی کلام نے آ کر اس کے دل کے پردوں کو چھوا ہے وہ الفاظ دل کے باطنی کانوں کو سنائی دیتے ہیں۔ یہ عجیب وغریب کا احساس ہوتا ہے جس کی لذت اور کیفیت وہی بیان کر سکتا ہے جو صاحب حال اور روحانی کوچہ سے آشنا ہوتے ہیں۔ جن کے حواس باطنی گناہوں، دنیاوی الائشوں، تکبر ونخوت کی دبیزوں سے ناکارہ ہو چکے ہوں۔ وہ اس الٰہی سر کو نہیں سمجھ سکتے۔

قلب پر نزول وحی کے متعلق تین اہم امور: قلب پر نزول وحی کے متعلق تین اہم امور کا جاننا ضروری ہے۔

ا۔ حواس ظاہری کا تعطل: جب خدا تعالیٰ انسان کے حواس باطنی پر وحی نازل کرتا ہے تو حواس ظاہری اس وقت معطل ہو جاتے ہیں تاکہ عالم ظاہر کے محرکات وتاثرات سے عالم باطن کے محرکات وتاثرات خلط ملط نہ ہو جائیں۔

۲۔ ایک ہی وقت میں متعدد حواس پر وحی کا نزول: بعض اوقات وحی کا نزول ایک ہی وقت میں کئی حواس باطنی پر ہوتا ہے یعنی قلب ایک ہی وقت میں دیکھتا بھی ہے سنتا بھی ہے اور چکھتا بھی ہے۔

۳۔ باطنی وظاہری حواس میں اشتراک: انسان کے حواس باطنی اور ظاہری میں ایک حس مشترک ہے کہ انسان باطن کی ہر ایک حس کو اسی طرح محسوس کرتا ہے جس طرح وہ ظاہر کی حس کو محسوس کرتا ہے۔ مثلاً وحی کے وقت کسی انسان کی باطن کی آنکھ کام کر رہی ہو اور ظاہری آنکھ اس وقت معطل ہو۔ پھر بھی باطن کی آنکھ کے احساس کی کیفیت اسی طرح ہوگی جس طرح ظاہری آنکھ سے دیکھنے کے وقت ہوتی ہے۔ حس مشترک کی وجہ سے موحی الیہ یوں محسوس کرتا ہے کہ اس کے اندر کوئی آنکھ ہے جس سے وہ دیکھ رہا ہے اس طرح دوسرے حواس کا معاملہ ہے غرض کہ یہ حس مشترک باطن کے حواس کو بھی ظاہری حواس کے رنگ میں پیش کرتی ہے۔ بعض اوقات موحی الیہ کو مغالطہ لگ جاتا ہے کہ آیا جو نظارہ اس نے دیکھا ہے عالم ظاہر کا ہے یا عالم باطن کا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب آگ کی روشنی دیکھی تھی وہ باطنی نظارہ تھا لیکن حس مشترک نے اس قدر غلبہ اختیار کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یوں محسوس کیا کہ وہ ظاہری آنکھ سے آگ کی روشنی دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ باطنی آنکھ سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن عالم باطن کی آواز نے اس مغالطہ کو دور کر دیا۔

وحی عقل کی رہبر ہے

وحی کی ضرورت: انسان کی عقل کوتاہ اور ناقص ہے اس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں پر وحی نازل کی تاکہ یہ آسمانی نور انسان کی عقل کی راہبری کرے۔ قرآن مجید میں آدم علیہ السلام کا واقعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کی عقل فطری کمزوری کی وجہ سے شیطانی وسوسہ سے مغلوب ہوگئی اور وہ سکون قلب کی جنت سے محروم ہو گئے جب حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے وحی کے ذریعے کچھ کلمات سیکھے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی رحمت کے سایہ میں لے لیا جو اس میں نقص تھا۔ دور ہو گیا۔ گویا فطری کمزوری کا علاج وحی الٰہی سے کیا گیا بندہ کی روحانی ربوبیت کا سامان وحی الٰہی میں ہے اگر عقل کے ذریعے ہی انسان کو اپنی تمام مشکلات کی گرہ کشائی کرنا پڑتی تو وہ عقل کی کمزوری کی وجہ سے ٹھوکریں کھا کر ہلاکت کے اتھاہ گڑھے میں گرا پڑا رہتا۔

دنیا کے بڑے بڑے فلاسفہ نے برملا عقل کو کوتاہ بینی اور فکر کی نارسائی کا واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے سقراط کا یہ مقولہ مشہور ہے۔ ''ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں، جانتے۔''

انگلستان کا مشہور فلسفی ڈیوڈ ہیوم واضح الفاظ میں اقرار کرتا ہے کہ ''انسان ذی عقل مخلوق ہے اور اس لحاظ سے علم اس کی خاص دماغی غذا ہے۔ لیکن ساتھ ہی انسانی عقل و فہم کے حدود اتنے تنگ ہیں کہ اس باب میں اس کو وسعت و اذعان دونوں حیثیات سے بہت ہی کم اپنے فتوحات سے تشفی نصیب ہو سکتی ہے۔'' (ہیومن انڈر اسٹینڈنگ مصنفہ ڈیوڈ ہیوم بحوالہ فہم انسانی ص ۵ مترجم پروفیسر عبدالباری)

دیمقراطیس کا قول ہے ''کوئی بات سچ نہیں اور اگر ہے تو ہم کو معلوم نہیں۔'' (لیوس کی سوانحی تاریخ فلسفہ بیاگر وفکل ہسٹری آف فلاسفی ص ۱۰۷ بحوالہ فہم انسانی ص ۱۱)

جب انسان کی عقل ناقص ہے تو وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ انسان جو اپنی عقل کے ناخن تدبیر سے پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی کرے گا وہ صحیح ہوں گے۔ فلسفہ یونان کے جو بنیادی نظریے تھے وہ صدیوں تک دنیا میں مقبول اور رائج رہے آخر آج موجودہ فلسفہ یورپ نے ان کو بالکل باطل قرار دیا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ آج جو فلسفہ عقل کے زور سے جن نظریات کی عمارت تعمیر کر رہے ہیں وہ مستقبل میں بھی قائم و دائم رہے گی۔

پس وحی الٰہی زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کی راہنمائی کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ ہر قسم کی لغزشوں اور ٹھوکروں سے محفوظ و مصئون رہ کر جادہ صواب پر گامزن رہے۔ اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے سورہ فاتحہ میں یہ دعا سکھائی ہے۔ جس کو ہر ایک مسلمان پنجگانہ نماز میں دہراتا ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت دے راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام کیا) یہاں انعام سے مراد نور وحی ہے جو لوگ نور وحی سے منور ہوتے تھے وہی جادہ صواب پر گامزن ہوتے ہیں۔ ان کی اقتداء ہی لغزشوں سے محفوظ رکھتی ہے اور منزل مقصود تک پہنچاتی ہے۔

شاید کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ پھر عقل انسانی کا فائدہ کیا جب زندگی کے تمام شعبوں میں مکمل طور پر راہنمائی نہیں کر سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی عنایت اور نعمت ہے۔ جس طرح خدا کے دوسرے حواس مثلاً قوت سامعہ، قوت لامسہ، قوت ذائقہ اور قوت باصرہ نعماء عظمیٰ میں سے ہیں اسی طرح انسانی عقل بھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی حواس ایک حد کے اندر محدود ہیں۔ انسان کی آنکھ ایک حد تک دیکھ سکتی ہے جو چیز اس کی حد سے باہر ہوگی اس کو دیکھ نہیں سکے گی اور اگر کوئی فیصلہ صادر کرے گی تو غلطی کا قوی امکان ہے اسی طرح روحانیت کے بے شمار معاملات ہیں جو انسان کی عقل سے بالاتر ہیں ان کا احاطہ کرنا انسان کی عقل سے بعید تر ہے اور عقل کا ٹھوکر کھا جانے کا احتمال ہے ایسے معاملات میں وحی الٰہی کا عقل کی دست گیری کرنا لازمی اور لابدی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسے امور میں مدد اور دست گیری نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت پر زد پڑتی ہے اور قیامت کے روز انسان اپنی لغزشوں کے بارے میں حق بجانب ٹھہرے گا جب باریک در باریک نہاں درنہاں امور سے متعلق اس کی رسائی ہی نہیں تھی پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی راہنمائی ہی نہیں کی۔ تو پھر اس کا حساب کتاب کیسا؟

جس طرح ایک انسان اپنی قوت باصرہ کی مدد کے لیے خوردبین اور دوربین باریک اور دور کی اشیاء دیکھنے کے لیے استعمال میں لاتا ہے وہ آلے انسان کی قوت باصرہ کو اس کی حد سے پرے کی اشیاء کو دیکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ اسی طرح وحی الٰہی عقل انسانی کو اس کی حد سے باہر نکال کر ایسے امور کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے جو اس سے بالاتر ہوتے ہیں۔ پس وحی عقل کے خلاف نہیں ہے بلکہ عقل کے لیے ایک روشنی کا مینار ہے تاکہ انسان اُن چیزوں کا بھی احاطہ کر سکے جو اس کی عقل سے بالاتر ہیں یہاں مناسب سمجھتا ہوں کہ خلاف عقل اور بالا از عقل سے متعلق کچھ عرض کروں۔

خلاف عقل اور بالا از عقل میں فرق: آج کل عقلیت پسند اور نیچریوں کی یہ عادت ہے کہ جو امر ان کی محدود عقل میں نہ آئے تو اس کو خلاف عقل قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔ اوّل تو عقل کے لحاظ سے لوگ مختلف ہوتے ہیں۔ اگر ایک فطین آدمی کوئی مسئلہ بیان کرے تو اس سے فروتر عقل والا آدمی اس وجہ سے انکار کر دے کہ وہ مسئلہ اس کی عقل میں نہیں آتا تو کوئی اس انکار کو معقول نہیں کہہ سکتا عقل کے لحاظ سے لوگوں میں طبعی فرق کی وجہ سے یہ ممکن ہے کہ ایک مسئلہ کسی ایک کے نزدیک معقول ہو لیکن دوسرے کے نزدیک غیر معقول ہو۔ آج کم علمی کی وجہ سے غیر معقول نظر آ رہا ہے۔ وہ کل علم کی روشنی کی وجہ سے معقول نظر آئے۔ پس کسی امر کا اس وجہ سے انکار کر دینا کہ وہ کسی کی عقل میں نہیں آتا خود کم عقلی پر دلالت ہے۔

جب بے تار کی برقی ایجاد ہوئی تو معلوم نہیں کہ کتنے سائنس دانوں نے اس ایجاد کو غیر معقول کہا ہوگا جب تجربے نے اس کی صحت پر مہر ثبت کر دی تو تمام سائنس دان یقین کر گئے۔

مناسب طریقہ یہی ہے کہ جب کوئی کسی کے سامنے بالا از عقل امر بیان کرے تو فوراً اس کی تردید نہ کر دے بلکہ اس کو حوالہ خدا کرے۔ اس امر کے سمجھنے کی سعی بلیغ کرے۔

ہاں اگر کوئی امر اصول متعارفہ کے خلاف بیان کیا جائے تو اس کو خلاف عقل قرار دے کر رد کر دے۔ مثلاً کوئی یہ کہے کہ فلاں زمانہ میں سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہوا یا کوئی یہ کہے کہ دو اور دو چار نہیں بلکہ پانچ ہوتے ہیں تو پھر انکار کرنا ہی عین عقل ہے اس بحث سے یہ نکلتا ہے کہ کوئی امر اصول متعارفہ اور مسلمات عقلی کے خلاف ہو تو وہ خلاف عقل قرار دیا جائے گا اگر اصول متعارفہ اور مسلمات عقلی کے خلاف تو نہیں لیکن سمجھ میں نہیں آیا تو وہ امر بالا از عقل کے تحت آئے گا خلاف عقل اور بالا از عقل کے درمیان فرق کرنا ہر عقل مند آدمی کا کام ہے ورنہ علمی ترقی ہی رک جائے گی کہ جو بھی کوئی چیز عقل کی حد کے اندر نہ آئی تو اس کو خلاف عقل قرار دے کر رد کر دیا تو اس طرح محنت اور کوشش کا جذبہ بالکل سرد پڑ جائے گا۔

دوسری ضرورت: انسان کی طبعی فطرت ہے کہ وہ اپنے جیسے بشر کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتا ہاں انسان اس کا فرمانبردار بن کر نقش قدم پر چلے گا جس کے متعلق اس کا ایمان ہو کہ وہ ایسی قادر اور توانا ہستی سے تعلق رکھتا ہے اور وہ عظیم ہستی اس کی پشت پر ہے اس کے انکار سے دین اور دنیا میں خسران اور گھاٹا ہے اور ایمان لانے سے فلاح۔ اس امر کو واضح کرنے کے لیے ایک مثال پیش کرتا ہوں شیخ الرئیس بوعلی سینا کا ایک طالب علم خادم تھا جو شیخ الرئیس کے فلسفہ اور علم سے بہت متاثر تھا اور وہ تعجب کیا کرتا تھا کہ ان کا مخدوم محمد مصطفیٰ ﷺ کے دین کو کیسے مانتا ہے جبکہ وہ خود ان سے علم حکمت میں بڑھا ہوا ہے۔ اس خیال کا اظہار وہ کئی دفعہ بوعلی سے بھی کر چکا تھا۔ شیخ اس سے روگردانی کر لیتا اور ڈانٹ دیتا۔ ایک مرتبہ دونوں اصفہان کے شہر میں ٹھہرے ہوئے تھے رات کو سخت سردی تھی۔ اور برف باری ہو رہی تھی۔ شیخ الرئیس نے صبح کے وقت اپنے خادم کو جگایا اور وضو کے لیے پانی طلب کیا۔ اس پر اس نے سخت سردی اور صبح نہ ہونے کا عذر تراشا اس کے بعد بوعلی سینا نے صبح کی اذان کے وقت جگایا اور پانی طلب کیا۔ اس وقت بھی برف باری کا عذر کیا۔ اتنے میں موذن نے کہا۔ "اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰہِ" شیخ نے اپنے خادم سے کہا۔ سنو موذن کیا کہتا ہے اس نے کہا وہ کہہ رہا ہے۔ اَشْھَدُاَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰہ شیخ الرئیس نے اس کی گمراہی کو دور کرنے کا موقع غنیمت جانا اور کہا دیکھو تم مرے خادم ہو۔ پھر تم مجھے سب سے زیادہ پسند کرتے ہو اور سب سے زیادہ میری عزت اور احترام کرتے ہو۔ یہاں تک کہ تم مجھے رسول کریم ﷺ سے بھی افضل گردانتے ہو اور میرا ان کی پیروی کرنا ناپسند کرتے ہو۔ ان تمام باتوں کے باوجود میرا حکم بجا لانے کے سلسلے میں سردی اور برف باری کا بہانہ تراشتے ہو۔ مگر یہ موذن علی الصبح برف باری اور سردی کے عالم میں مسجد کی طرف آیا ہے اور مینار پر چڑھا ہے اور محمد عربی کی رسالت کا بلند آواز سے اقرار کیا ہے۔ یہ ایمان اور یقین کا محکم جذبہ ہے جس نے محمد عربی ﷺ کی غلامی کی مضبوط زنجیروں کو جکڑ دیا ہے۔ اس مثال سے قارئین وحی الٰہی کی حکومت اور علم وحکمت کا فرق سمجھ جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے وحی کے نزول کا سلسلہ اس وجہ سے جاری کیا تھا تاکہ لوگ ایک برتر علیم وخبیر اور قادر وتوانا ہستی کا کلام سمجھ کر اس پر عمل کریں اور ذہنی اور عملی انتشار سے بچ جائیں۔ موحی الیہ پر ایمان لا کر وحدت اور اتحاد کی لڑی میں منسلک ہو جائیں۔

تیسری ضرورت: انسان کی فطرت اس قسم کی ہے کہ جس ہستی کی عظمت کا احساس اس کے دل میں پیدا ہو جائے۔ اس کے خلاف دل میں خیالات ہی پیدا نہیں ہوتے اور اس کے ہر حکم کی فرمانبرداری کرنے اور اس کے رنگ میں رنگین ہونے کی سعی بلیغ کرتا ہے وحی الٰہی انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت پیدا کرتی ہے جس کی وجہ سے انسان خدا کی صفات میں رنگین ہونے کی کوشش کرتا ہے حتیٰ کہ وہ اس زمین کی چھاتی پر چلتا پھرتا مظہر خدا بن جاتا ہے اس کی عمدہ مثال رسول کریم ﷺ کا وجود باجود اور آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ ہیں جو اس دھرتی پر چلتے پھرتے مظہر خدا تھے۔ قرآنی وحی کا سب سے بڑا معجزہ ہے اس نے صحابہ کے دلوں سے گناہوں کی میل کو اس طرح دھو دیا کہ ان سے خدا کی صفات منعکس ہونے لگیں۔

چوتھی ضرورت: سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت "رب العالمین" بیان ہوئی ہے اس صفت میں ضرورت وحی کی طرف اشارہ ہے۔ رب کے معنی تاج العروس اور لین نے پیدا کرنا، پرورش کرنا، کمال تک پہنچانا، تنظیم وتکمیل دینا لکھے ہیں۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ رب وہ ذات ہے جو تدریجاً ایک چیز کو کمال تک پہنچاتی ہے۔ پس اسم رب کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر مخلوق کو اپنے کمال تک پہنچائے۔ جسمانی ربوبیت کے لیے عالم مادی میں ہر قسم کی چیز پیدا کر دی ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہمارا وجود گوشت اور ہڈیوں کا ڈھانچہ ہی نہیں بلکہ اس میں ایک لطیف چیز روح بھی مقید ہے ان کا کمال صرف جسم کی پرورش تک محدود نہیں بلکہ وہ اخلاق ہیں جس طرح جسمانی ربوبیت کے لیے خارج میں ہر قسم کا سامان مہیا کیا ہے۔ اس طرح روح کی پرورش کے لیے عالم روحانی میں وحی الٰہی ہے جو انسان کی روح کی صفائی اور کمال کا ذریعہ ہے۔

پانچویں ضرورت: جس طرح انسان کے جسم کے امراض ہیں اور ان کا علاج اللہ تعالیٰ نے خارجی دنیا میں پیدا کیا ہے۔ اس طرح روحانی امراض ہیں جن سے انسان کی روح میں نقص لازم آتا ہے۔ اس روحانی امراض کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے وحی الٰہی کا سلسلہ جاری کیا ہے یہی بات قصہ آدم علیہ السلام میں بیان ہوئی ہے جب آدم علیہ السلام سے لغزش سرزد ہوئی اور وہ اطمینان قلب سے محروم ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بیماری کو دور کرنے کے لیے چند

کلمات سکھائے یہ وحی الٰہی تھی قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (البقرہ ۲:۳۷) پھر اس (آدم علیہ السلام) نے اپنے رب سے (کچھ) باتیں سیکھیں پس اس سے اس پر (رحمت سے) توجہ کی بے شک وہ (رحمت) سے توبہ کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

وحی الٰہی نے اس روحانی بیماری کا علاج کر دیا اور وہ دوبارہ اطمینان قلب کی دولت سے متمتع ہو گئے۔ اس قصہ آدم میں اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے۔ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ ۲:۳۸) پھر اگر میری طرف سے تمھارے پاس ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا۔ نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ ہبوط انسانی کا علاج وحی الٰہی ہے جو نسل انسانی میں وقتاً فوقتاً آتی رہے گی۔ اس کی پیروی سے انسان روحانی امراض سے نجات پائے گا۔ اور انسان اس ارفع مقام تک پہنچ جائے گا۔ جہاں سے روحانی ہبوط نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنَّ عِبَادِىْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (الحجر ۱۵:۴۲) کہ میرے بندوں پر تیرا غلبہ نہیں۔

یہ وہی بندے ہیں جو وحی الٰہی کی اتباع کرتے ہیں۔

وحی اور عقل کا تعلق (وحی ذریعہ علم)

چھٹی ضرورت: اللہ تعالیٰ نے روحانی حقائق سمجھانے کے لیے اس مادی دنیا کی مثالیں قرآن مجید میں بیان کی ہیں۔ وحی اور عقل کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ اس باریک راز کو بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (الطارق ۸۶:۱۱.....۱۴) آسمان گواہ ہے جو (مینہ کو) لوٹاتا ہے اور زمین جو (پودوں سے) پھٹ پڑتی ہے یہ یقیناً فیصلہ کی بات ہے اور یہ بیہودگی نہیں۔

ان آیات میں السَّمآء اور الارض (آسمان اور زمین) کے تعلق کو ظاہر کیا ہے کہ جب اوپر (السَّمآء) سے بارش ہوتی ہے تو زمین سے روئیدگی ظاہر ہو جاتی ہے۔ گویا السَّمآء اور الارض (آسمان اور زمین) زوجیت کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔ آسمان اور زمین کا باہمی تعلق ظاہر کرنے کے بعد وحی (قرآن) کا ذکر کیا ہے اور اس کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ فصل ہے یعنی پوشیدہ چیز کو کھول کر بیان کر دیتا ہے۔ پوشیدہ چیز کو ظاہر کرنا ہی علم کہلاتا ہے۔ گویا وحی (قرآن) کو حامل علم قرار دیا ہے۔ جس طرح آسمان سے بارش برسنے کی وجہ سے زمین ہری بھری ہو جاتی ہے۔ اپنی پوشیدہ زرخیزی کو ظاہر کر دیتی ہے۔ اور زمین کی تہہ کے نیچے جو پانی گہرائی میں ہوتا ہے وہ اوپر آ جاتا ہے۔ یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ اگر بارش نہ ہو تو زمین اپنی طبعی خاصیت زرخیزی سے محروم ہو جاتی ہے اور زمین کی سطح پر روئیدگی ظاہر نہیں ہوتی اور پانی مزید گہرائی میں چلا جاتا ہے۔ گویا زمین مردہ ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں وحی کو آسمانی پانی سے تشبیہ دی کہ جس طرح بارش زمین کی زندگی کا باعث ہے اسی طرح وحی عقل کی روشنی کا باعث ہے۔ وحی کی روشنی سے ہی عقل اپنے جوہر ظاہر کرتی ہے اگر اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے ذریعے وحی نازل نہ کرتا تو عقلمندوں کی عقلیں مردہ ہو جاتیں۔ ان سے علم کے سوتے نہ پھوٹتے۔ دنیا میں جو بھی علم کی رعنائیاں نظر آ رہی ہیں۔ وہ وحی ہی کی بدولت ہیں۔

وحی اور علم: حصول علم کے تمام ذرائع انسان کو زیادہ سے زیادہ عین الیقین (علم کا دوسرا درجہ) تک پہنچاتے ہیں اور علم کے مخفی درمخفی پہلوؤں پر کامل روشنی نہیں ڈالتے۔ یہ ذرائع وحی کے ذریعہ حاصل کردہ علم کو آگے بڑھانے کا موجب ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کی رو سے ہر قسم کے علم کا ذریعہ صرف وحی ہے۔ وحی کے ذریعے ہی اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم کی نعمت سے نوازا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا. (البقرہ ۲:۳۱) اللہ تعالیٰ نے (وحی کے ذریعے) تمام چیزوں کے نام سکھا دیے۔ یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ انسانی ضرورت کے لیے جس قسم کے علم کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے اس کو وحی کے ذریعے سکھا دیا ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ اَلَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (العلق ۹۶:۴، ۵) جس نے آدمی کو قلم کے ذریعے سکھایا انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا۔ یہ آیت بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ حصول علم کا سب سے بڑا ذریعہ وحی ہے۔ جس کا آغاز ابتداء آفرینش سے ہو گیا تھا۔ انسان تسخیر کائنات کے لیے جو کچھ بھی کر رہا ہے۔ وہ سب وحی الٰہی کی بدولت کر رہا ہے اور وحی کی روشنی میں ہی انسانی عقل آگے بڑھی ہے اور طبعی ضرورتوں کی تکمیل ہو رہی ہے۔ علم کی جتنی بھی شاخیں ہیں۔ وہ وحی کی بدولت ہی وجود میں آئی ہیں۔ اگر انسانی عقل کو وحی کی روشنی میسر نہ ہوتی تو اندھیروں میں ہی بھٹکتی رہتی۔

اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے علم کے تمام رستے کھولے ہیں۔ جن پر چل کر انسان نے انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی کے تمام مسائل کو حل کیا ہے۔ عائلی زندگی میں رشتوں کی حلت و حرمت کا بنیادی مسئلہ ہے اگر اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے سے آگاہی نہ کرتا اور انسان کو اپنی عقل سے کام لے کر اس گرہ کی کشائی کرنا پڑتی تو گرہ کشائی نہ کر پاتا۔ اس طرح زندگی کے دیگر مسائل ہیں جن کی راہنمائی وحی ہی نے کی ہے۔ خصوصاً علم الٰہیات تو بالکل ہی انسان کے دوسرے ذرائع حصول علم یعنی عقل، وجدان، حواس وغیرہ سے باہر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام پر وحی نازل کر کے ماوراء علم الٰہیات سے آگاہ کیا تو

انسان اَن دیکھی حقیقتوں سے واقف ہوا۔

تاریخ بتاتی ہے انسانی عقل نے ٹھوکریں کھائیں اس کی سب سے بڑی ٹھوکریں غیر اللہ کی پرستش ہے اپنے ہی ہاتھ سے تراشیدہ بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہونا کون سی عقلمندی ہے۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے۔ انسان ان کے سامنے جھکا۔ اس طرح سورج چاند ستارے جو انسان کے خادم ہیں ان کو اپنا معبود بنایا۔ اس گمراہی سے انسان کو وحی نے ہی نکالا اور راہ مستقیم پر چلایا۔ وحی کے ذریعہ علم کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا۔ رسول کریم ﷺ پر قرآن مجید کی شکل میں پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس میں مادی و روحانی علوم جمع کر دیئے گئے ہیں جو انسان کے دیگر ذرائع علوم کی راہبری کرتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی شان میں فرمایا۔ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینہ ۹۸:۳) اس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں۔ مفسرین کے نزدیک کتب قیمہ سے مراد وہ تمام علوم ہیں جو اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء علیہم السلام پر وحی کے ذریعے نازل کیے تھے۔ اور یہی قرآن مجید کا معجزہ ہے کہ اس میں علوم اولین و آخرین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قرآن مجید وحی نبوت کی تکمیل ہے جہاں تک وحی ولایت اور وحی ایجادی کا تعلق ہے اس کا سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔

وحی کی یہ اقسام (وحی ولات اور وحی ایجادی) وحی نبوت کے انوار ہیں۔ یا وحی نبوت کی تفہیم کا ذریعہ ہیں۔ احادیث وحی غیر متلو (وحی ولایت) ہی ہیں۔ جن کی روشنی میں قرآن مجید کو سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی نبوت نازل فرما کر رسول کریم ﷺ کو اس کی تفہیم دی۔ اسی تفہیم کو آپ ﷺ نے بیان فرما دیا۔ جس کو اسلامی اصطلاح میں حدیث کہا جاتا ہے۔

مذاہب عالم پر مختصراً تبصرہ

محققین نے مذہب کی تعریف مختلف الفاظ اور پیرایوں میں کی ہے۔ کوئی بھی ایک جامع تعریف پر متفق نہیں۔ لہٰذا مختلف محققین کی بیان کردہ تعریفات پر بحث کرنا لاحاصل[1] ہے۔ اسلام نے مذہب کے لیے دین کا لفظ استعمال کیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (ال عمران ۳:۱۹) یعنی اسلام ہی خدا کے نزدیک حقیقی دین ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ (الصف ۶۱:۹) وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے۔ فرمایا اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ ۵:۳) آج میں نے تمہارا دین تمھارے لیے کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمت کو تم پر پورا کر دیا ہے اور تمہارا دین اسلام ہونے پر راضی ہوں۔

امام راغب نے دین کے الفاظ کے معنی اور تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔ الطاعة والجزاء استعیر للشریعة والدین کالملة یقال اعتباراً بالطاعة و الانقیاد للشریعة (مفردات) دین کے معنی اطاعت اور جزا کے ہیں اس کا اطلاق شریعت پر بھی ہوتا ہے دین اور ملت مترادف ہیں شریعت پر اس کا اطلاق ان معنوں میں ہے کہ شریعت کی اطاعت اور اس کے سامنے اپنی گردن انقیاد خم کرنا لازم ہے۔

بخاری میں ہے الدِّیْنُ اَلْجَزَاءُ فِی الْخَیْرِ وَالشَّر یہاں دین سے مراد نیکی اور بدی کا بدلہ ہے۔

گویا اللہ تعالیٰ کے احکام اور اطاعت کا نام دین ہے۔

قرآنی تعریف: اگر قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے تو دین کی تعریف پر پہنچنا کوئی مشکل نہیں اور دین کی تعریف ان الفاظ میں کی جا سکتی ہے۔

دین ان ہدایات اور احکام کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے اپنے بندوں کے لیے بھیجے جن پر گامزن ہو کر انسان اس دنیا اور آخرت کے گیسو سنوار سکتا ہے۔

گویا دین (مذہب) انسان کی روح اور جسم کے تمام اقتضاءت کو پورا کرنے کا نام ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (البقرہ ۲:۲۰۱) اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

قرآن مجید نے مذہب کے مفہوم کو لفظ دین کے علاوہ ملت، سبیل، شریعت، ہدایت، صراط اور طریق کے الفاظ میں بھی بیان کیا ہے۔ یہ تمام الفاظ راستہ روش اور راہنمائی کے معنوں میں مشترک ہیں۔

قرآنی تخیل دین: دین کے متعلق قرآنی تخیل لفظ ''اسلام'' میں مضمر ہے اسلام کے لغوی معنی صلح کے اندر داخل ہونا ہیں امام راغب فرماتے ہیں اسلام کے معنی سلم میں داخل ہونا اور سلام اور سلم دونوں کے معنی صلح کے ہیں (مفردات) یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں صلح کے معنی میں مستعمل ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً (البقرہ ۲:۲۰۸) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو سارے کے سارے صلح میں داخل ہو جاؤ۔

مسلم وہ ہے جو خدا اور خدا کے بندوں سے صلح کرے۔ خدا سے صلح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کے احکام اور قوانین پر گامزن ہو یہ بات ہمارے تجربہ اور مشاہدہ میں ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز مقررہ قوانین کے تابع ہے اور ہر چیز کی فلاح اور کامیابی قوانین کی اطاعت سے وابستہ ہے کائنات کی کوئی چیز بھی قوانین مقررہ سے سرمو انحراف نہیں کر سکتی۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ (الملک ۶۷:۳،۴) جس نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر پیدا کیا تو رحمان کی پیدائش میں کوئی اختلاف نہ دیکھے گا۔ پھر نظر کو لوٹا کیا تو کوئی بگاڑ دیکھتا ہے پھر نظر بار بار لوٹا نظر تری طرف تھک کر واپس آ جائے گی۔

---

[1] میں نے ''مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ'' میں مختلف محققین کی تعریفات پر بحث کی ہے قارئین وہ پڑھ کر استفادہ کر سکتے ہیں۔

جان کلیوی لینڈ پی ایچ ڈی ماہر ریاضی و کیمیا لکھتا ہے کہ جب سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے اس وقت سے یہ مقررہ قوانین کی پابندی کر رہی ہے (خدا موجود ہے مترجم عبدالحمید صدیقی ص ۵)

جب علیم وخبیر ہستی نے دنیا کی ہر چیز کو ایک قانون اور ضابطہ کے ماتحت کر دیا ہے تو یہ لازمی امر تھا کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے قوانین بناتی۔ جس پر چل کر انسان فلاح و کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے سو یہ قوانین اللہ تعالیٰ مختلف ادوار میں مختلف انبیاء علیہم السلام پر نازل کرتا رہا ہے ان قوانین کی آخری اور مکمل شکل قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ ۵:۳) آج میں نے تمہارا دین تمھارے لیے کامل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی ہے اور تمھارے لیے اسلام کو تمہارا دین پسند کیا ہے۔

قرآن مجید جملہ صحف سابقہ کا جامع ہے۔ اس میں وہ تمام قوانین بیان کر دیے گئے ہیں جو مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتے رہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینہ ۹۸:۳) اس (قرآن) میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں۔

پس اللہ تعالیٰ سے صلح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان ان تمام احکام اور قوانین کا جواء اپنی گردن پر رکھ لے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نازل فرمائے ہیں۔

بندوں سے صلح کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان اپنے دوسرے بھائی سے نیک سلوک کرے ان کو نقصان نہ پہنچائے۔ پس دین کا اساسی تصور اللہ تعالیٰ کے قوانین کی اطاعت اور بندگان خدا سے محبت ہے۔

مذہب کی غرض و غایت: مذہب فطری چیز ہے اس لیے مذہب کی غرض و غایت بھی فطرت کے اقتضاءات کو پورا کرنا ہے فطرت کے اقتضاءات دو قسم کے ہیں روحانی اقتضاء اور مادی اقتضاء، روحانی اقتضاء اللہ تعالیٰ کی ہستی کے اردگرد گھومتا ہے کیونکہ خدا کی ہستی کا شعور انسان کی فطرت میں رکھا ہوا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ (الزخرف ۴۳:۹) اور اگر تو ان سے سوال کرے کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تو ضرور کہیں گے کہ انھیں غالب علم والے نے پیدا کیا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا (الاعراف ۷:۱۷۲) اور جب تیرے رب نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے، ان کی اولاد پیدا کی اور ان کو اپنے اوپر گواہ ٹھہرایا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں انھوں نے جواب دیا ہاں ہم گواہ ہیں۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں خدا کی ہستی کا شعور انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ مذہب اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلائل و براہین کے ذریعے محکم ایمان پیدا کرتا ہے ایمان کے آب زلال سے ہی روحانی زندگی کا شجر سرسبز اور شاداب رہ سکتا ہے۔

اگر تمام مذاہب کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ خدا کی ہستی کا تصور ہر مذہب میں پایا جاتا ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ مذہب کی غرض و غایت اللہ تعالیٰ کی ہستی پر یقین پیدا کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر جتنا زیادہ یقین اور ایمان ہوتا ہے انسان اتنا ہی بدیوں سے دور رہتا ہے اور نیکیوں کی طرف رغبت کرتا ہے کیونکہ حقیقی معرفت ہی انسان کو گناہوں کی آلائشوں سے پاک کرتی ہے۔ اس کی یوں مثال سمجھئے کہ اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو کہ اس بل میں سانپ ہے تو وہ اس میں ہاتھ نہیں ڈالے گا کہ سانپ اس کو ڈس لے گا۔ اس طرح کوئی شخص وہ دودھ نہیں پیے گا جس کے متعلق اس کو یقین ہو کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے۔

پس مذہب کی غرض و غایت اللہ تعالیٰ پر یقین محکم پیدا کرنا ہے۔

فطرت کی دوسری اقتضاء مادی ہے جس میں خاندان، معاشرہ، ریاست اور بین الاقوامی امور شامل ہیں۔ مذہب ان تمام اداروں کے متعلق کامل تعلیم دیتا ہے جس سے انسان کی زندگی نہایت ہی خوشگوار اور عمدہ بن جاتی ہے۔ ان امور پر اس کتاب میں مفصل بحث ہوگی۔

مذہب کی افادیت

توحید قائم کرنا: اگر مذاہب عالم کا عمیق نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات قاری پر اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ مذہب کی اساس توحید باری تعالیٰ ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام نے توحید اور خداشناسی کی تعلیم دی۔ قرآن مجید میں آتا ہے وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ. (الانبیاء ۲۱:۲۵) اور تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف ہم ہی وحی کرتے تھے کہ میرے سوائے کوئی معبود نہیں سو میری ہی عبادت کرو۔

انسانی عظمت وشرف: توحید کا لازمی نتیجہ انسانی عظمت ہے جب ایک انسان اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک تسلیم کر لیتا ہے تب وہ دنیا کی ہر غلامی سے نجات پا جاتا ہے اور اس کو ساری کائنات پر برتری حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۷۰) اور یقیناً ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی ہے اور ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سواری دی اور ان کو اچھی چیزوں سے رزق دیا اور ہم نے ان کو بہتوں پر جنھیں ہم نے پیدا کیا ہے بڑی فضیلت دی ہے۔

زمین، آسمان، چاند، سورج، دریا، سمندر غرض کہ کائنات کی ہر چیز انسان کی آسائش اور انتفاع کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وہی ذات ہے جس نے سب کچھ زمین میں ہے تمھارے لیے پیدا کیا۔

اتحاد نسل انسانی: عقیدہ توحید انسانی نسل کے اتحاد کے کونے کا پتھر ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر اتحاد کی عمارت استوار کی جا سکتی ہے۔ قرآن مجید میں خدا کو رب العالمین کہا گیا ہے۔ یعنی تمام اقوام کا رب، عربی زبان میں رب کے معنی ایک چیز کو تدریجاً ترقی دے کر اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ (امام راغب) اللہ تعالیٰ کی اپنی صفت ربوبیت کے تحت دنیا کی تمام اقوام کی روحانی اور جسمانی پرورش کرتا ہے گویا تمام قومیں خدا تعالیٰ کی عیال ہیں وہ سب کی خبر گیری کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے واضح کہا ہے۔ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً (البقرہ ۲:۲۱۳) یعنی سب ایک ہی قوم ہیں رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ (بیہقی کتاب الایمان) ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔

مذہب کی اساس توحید ہی یہ سبق دیتی ہے کہ تمام بنی آدم کو اتحاد اور محبت کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہیے۔

مساوات: عقیدہ توحید سے مساوات کا سبق ملتا ہے اور تفریق بین الناس اور اونچ نیچ کا مسئلہ پامال ہوتا ہے۔ عقیدہ توحید ہی پامال شدہ لوگوں کو اٹھا کر بڑوں کے دوش بدوش کھڑا کرتا ہے۔ اسلام نے نسلی، قومی، لسانی اور لونی امتیازات کو ختم کر کے حسن عمل اور اخلاق حمیدہ کو وجہ تکریم قرار دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات ۴۹:۱۳) معزز وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے۔

انسانی مساوات کا مسئلہ اسلام کی رو سے اس قدر اہم ہے کہ رسول کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو اہم باتیں بیان کی تھیں ان میں یہ مسئلہ بھی بیان فرمایا۔ اس خطبہ کے الفاظ ہیں۔ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَىٰ عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَىٰ عَرَبِيٍّ وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَىٰ أَسْوَدَ وَلَا لِأَسْوَدَ عَلَىٰ أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوَىٰ (مسند احمد) لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے بے شک تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو کالے پر اور کالے کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

رواداری: توحید باری تعالیٰ کا پیغام بنی نوع انسان کے ہر طبقے تک پہنچایا گیا بناء بریں وہ ہر ایک سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہر مذہبی کتاب اور ہر رسول کو تسلیم کیا جائے اور مذہب کے نام پر خون خرابہ نہ کیا جائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (البقرہ ۲:۲۵۶) دین کے بارے میں کسی طرح کا جبر نہیں۔

لَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ (الانعام ۶:۱۰۸) اور ان کو گالی نہ دو جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں۔

امن عالم: عقیدہ توحید امن عالم کا ضامن ہے کیونکہ عقیدہ توحید عالمگیر اخوت انجاد، محبت اور مساوات کو جنم دیتا ہے اور نفرت، عداوت اور تعصب کو بالکل ختم کرتا ہے جب دشمنی اور تعصب دنیا کی قوموں سے مٹ جائے تو دنیا میں امن قائم کرنا مشکل نہیں رہتا۔ امن عالم کے خرمن کو اس وجہ سے آگ لگی ہوئی ہے کہ نسلی، لسانی اور لونی تعصبات کی اندھی چل رہی ہے۔

تزکیہ نفس: انسان کی اخلاقی ترقی کے لیے عقیدہ توحید بڑی طاقت ہے اسی وجہ سے ہر مذہب نے خدا کو ایک ماننے پر بہت زور دیا ہے انسان کے اندر جو اخلاقی بلندی اور کمال اوج نظر آ رہا ہے وہ خدائے واحد پر ایمان لانے کا ہی ثمرہ ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات اور اسماء بیان ہوئے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ (بنی اسرائیل ۱۷:۱۱۰) اس کے سب نام اچھے ہیں "حسنیٰ" کے لفظ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ وہ ذات ہے جو تمام صفات حسنہ کا جامع اور تمام عیوب سے منزہ ہے ان صفات کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے اندر انہی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اور انہی صفات کے تحت اپنی زندگی بسر کرے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ تَخَلَّقُوْا بِأَخْلَاقِ اللّٰهِ یعنی اللہ کے اخلاق اختیار کرو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں ایمان باللہ کا ذکر آیا ہے۔ وہاں اعمال صالحہ بجا لانے کا بھی ذکر کیا گیا ہے گویا ایمان باللہ، عمل صالح کے بغیر بے سود ہے۔

تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ ہر نبی نے اپنے اپنے وقت میں عقیدہ توحید کی بناء پر اپنی اپنی قوم کو قعر مذلت سے نکال کر اخلاق حسنہ کے ایسے بلند مینار پر کھڑا کر دیا جو تصور میں نہیں آ سکتا۔

علوم کی ترقی: عقیدہ توحید علوم وسائنس کی ترقی کا ضامن ہے عقیدہ توحید نے انسان کو یہ سبق دیا کہ وہ اشرف المخلوقات ہے اور کائنات کی ہر چیز انسان کی آسائش اور انتفاع کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اس سبق نے انسان کو کائنات کی ہر چیز کو مسخر کرنے کی طرف توجہ دلائی اور انسان کائنات کے عناصر کے خواص معلوم کرنے لگ گیا جس سے مختلف علوم اور سائنس نے ترقی کی۔

انسانی فلاح: انسانی فلاح کے دو پہلو ہیں۔ ایک روحانی اور دوسرا مادی۔ مذہب ہی ایک ایسی قوت ہے جو انسان کی روحانی اور مادی فلاح کا ضامن ہے اور وہ اصول مقرر کیے ہیں جن پر چل کر انسان کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ روحانی فلاح کا تعلق عبادت الٰہی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ (مومنون ۲۳:۱۔۲) مومن یقیناً کامیاب ہیں جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔

اگر مذہبی دنیا کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ہر مذہب میں عبادت الٰہی کا تصور پایا جاتا ہے۔ دنیا میں جتنے مصلح اور نبی آئے ہیں ہر ایک نے عبادت الٰہی پر زور دیا ہے کیونکہ عبادت ہی وہ پانی ہے جس سے گناہوں کی آگ ٹھنڈی ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل ۱۶:۳۶) ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجا کہ اس کی عبادت کرو اور جھوٹے معبودوں سے بچو۔

عبادت الٰہی صرف انسان کی روح اور دل کی پاکیزگی کا موجب ہی نہیں بلکہ اس کا معاشرہ پر گہرا اثر پڑتا ہے کیونکہ عبادت انسان کے اخلاق سنوارتی ہے۔ کسی کام میں مواظبت اور مداومت اختیار کرنے کا سبق دیتی ہے۔ انسان میں ہمدردی اور اخوت کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ عبادت سے انسان کی قوت عملیہ کو جلا ملتا ہے۔ یہی وہ امور ہیں جو ایک صحت مند معاشرہ کے لیے ضروری ہیں پس عبادت چند الفاظ کی رٹ اور چند حرکات کی نمائش نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک حقیقت ہے اور اس کا نتیجہ اخلاقی ارتقاء اور فلاح ہے۔

مادی فلاح کا تعلق انسان کی دنیاوی زندگی سے ہے یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب کی کتاب میں دنیاوی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اصول بیان ہوئے ہیں قرآن مجید تو ان اصولوں کو بڑی شرح وبسط کے ساتھ بیان کرتا ہے مثلاً انسان کے باہمی تعلقات اس کی عائلی، عمرانی اور سیاسی زندگی، مناکحت، طلاق، ورثہ، تقسیم دولت، سرمایہ، محنت، عدالت، فوجی تنظیم، جنگ وصلح قرضے، معاہدات، غربا، یتامیٰ، بیوگان کے بارے میں تعلیمات اور قوانین اور دوسرے بے شمار مسائل پر روشنی ڈالتا ہے۔ جن پر عمل پیرا ہونے سے انسان خوشگوار زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

عقل کی راہنمائی: انسان کی عقل کوتاہ اور ناقص ہے۔ اگر انسان کو اپنی عقل سے ہی زندگی کی تمام گتھیاں سلجھانی پڑتیں اور دنیاوی زندگی بہتر بنانے کے لیے تمام اصول وضع کرنے پڑتے تو عقل کے نقص کی وجہ سے انسان قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا۔ مذہب نے انسان کی عقل کی راہنمائی کے لیے عائلی، عمرانی، سیاسی اور اقتصادی اصول وضع کر دیے ہیں تاکہ انسان ان اصولوں کی روشنی میں زندگی کے ہر قسم کے مسائل کو حل کر سکے۔ اگر انسان کے سامنے وہ اصول نہ ہوتے تو وہ ہلاکت اور بربادی کے گڑھے میں گر جاتا مذہب عقل کے لیے ایک روشنی کا مینار ہے۔ اس روشنی میں ہی چل کر عقل اچھے نتائج پیدا کر سکتی ہے اور مشکل گتھیاں سلجھا سکتی ہے۔ جادہ صواب سے بھٹکنے سے بچ سکتی ہے۔

حیات بعد الموت کی اطلاع: انسان اللہ تعالیٰ کی ہستی پر یقین کامل کائنات کے محکم نظام پر نظر دوڑا کر پیدا کر سکتا ہے اور انسان کی فطرت میں خدا کی ہستی کا تصور بھی موجود ہے مگر جزا وسزا اور حیات بعد الموت کا علم سوائے مذہب کے کہیں سے حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ انسان کی عقل ماوراء زندگی سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی معرفت وحی کے ذریعے حیات بعد الموت سے متعلق آگاہی کی ہے۔ حیات بعد الممات دنیاوی زندگی پر بہت خوشگوار اثر انداز ہوتی ہے۔ جب ایک انسان کو یقین کامل ہو جاتا ہے کہ ایک دن خدا کے سامنے حاضر ہوگا اور اس کے اعمال کا حساب کتاب ہوگا۔ اچھے اعمال والے کو اچھا بدلہ دیا جائے گا جبکہ برے اعمال والے کو برا بدلہ تو اس یقین سے انسان اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصولوں کے تحت زندگی بسر کرنے کی کوشش کرے گا۔ جس سے معاشرتی زندگی پرامن اور خوبصورت بن جاتی ہے گویا حیات بعد الممات کا پھندہ انسان کو اس دنیا میں جادہ صواب پر چلانے کا ذریعہ ہے۔

ہندومت

ہندومت کے ہادی

ہندومت: لفظ ''ہندو'' ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جو دریائے سندھ کی وادی میں آباد تھے۔ لفظ ہندو ہندوستانی ادب اور اہل ہنود کی کتب مقدس میں کہیں نہیں ملتا۔ یہ لفظ پہلی مرتبہ ایرانیوں نے استعمال کیا تھا جو کہ ہمالیہ کے شمال مغربی دروں سے گزرتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ مذہبی اور

اخلاقی انسائیکلوپیڈیا کے مطابق ہندوستان میں مسلمان کی آمد سے قبل اہل ہند اس لفظ سے ناآشنا تھے۔

آریا کہتے ہیں ہندو بمعنی غلام یہ سنسکرت کا لفظ نہیں بلکہ فارسی کا لفظ ہے جس کے معنی چور غلام وغیرہ ہیں۔ یہ نام ہمارے مخالفین اور دشمنوں نے رکھا ہے۔ اس وجہ سے دیانند جی بانی آریا سماج اور پنڈت لیکھرام نے اس نام کے خلاف بڑے غصے کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے ہمیں ہندو نام ترک کر کے آریا کہلانا چاہیے۔ (کلیات آریا مسافر مصنفہ پنڈت لیکھرام)

نیو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ۲۰: ۵۸۱ کے مطابق...... ۱۸۳۰ء میں برطانوی مصنفین نے ہندوستان کے تمام تر عقائد کے حامل لوگوں کو ہندو کا نام دیا تھا...... ان لوگوں میں مسلمان اور وہ لوگ شامل نہ تھے۔ جنھوں نے عیسائی مذہب اختیار کر رکھا۔

مذکورہ بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ لفظ ''ہندو'' ۱۹ ویں صدی میں بطور مذہبی اصطلاح کے انگریز مصنفین کی تصنیفات میں استعمال ہونا شروع ہوا ہے۔ اس لیے ہندو مفکرین ہندومت کی بجائے ''سناتن دھرم'' (دوامی مذہب) یا ''ویدک دھرم'' (وید کا مذہب) کہلانا پسند کرتے ہیں۔

اب ہندومت ان عقائد کے حامل لوگوں کے لیے مستعمل ہے جو ویدوں کے ماننے والے ہیں۔ یہ کوئی الہامی نام نہیں ہے۔

اوتار: اوتار کے لفظی معنی ''نیچے آنا'' یا ''نیچے نزول کرنا'' کے ہیں لیکن اصطلاح میں ''خدا تعالیٰ کا جسمانی حالت میں زمین پر نزول فرمانا ہے۔ ہندو مذہب میں اللہ تعالیٰ تین روپوں میں ظاہر ہوا۔ ۱۔ برہما۔ یہ ذات عالم کی خالق ہے اور اس کا درجہ سب سے اعلیٰ ہے۔ ۲۔ وشنو۔ یہ ذات اشیاء کی حفاظت اور بقا کی ذمہ دار ہے۔ ۳۔ تیسری ذات شیو ہے۔ جو مخلوقات کو تباہ کرنے والی ہے۔ ہندومت کے عقیدے کے مطابق وشنو نے مختلف ادوار میں دس روپ دھارے ہیں تاکہ راکششوں اور بدکرداروں کو نیست و نابود کرے اور حق کا بول بالا ہو۔ یہی روپ اوتار کہلاتے ہیں۔

۱۔ متسیہ اوتار مچھلی کی صورت
۲۔ کورم اوتار کچھوے کی صورت
۳۔ وارہ اوتار سور کی صورت میں
۴۔ نرسنگھ اوتار آدھا انسان اور آدھا شیر کی شکل میں
۵۔ وامن اوتار (بونے کی شکل میں) وامنہ پست قامت کو کہتے ہیں۔
۶۔ پرش رام اوتار (پرشرام کی صورت میں)
۷۔ راما اوتار (رام کی صورت میں)
۸۔ کرشنا اوتار (کرشن کی صورت میں)
۹۔ بدھا اوتار (گوتم بدھ کی صورت میں)
۱۰۔ کل جگ اوتار (کل جگ کے آخری دور میں ہندوؤں کے دشمنوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے بھادوں کی تیسری تاریخ کو شکل پچھ میں شہر سنبھل جسا نامی برہمن کے گھر میں کلکی اوتار ظاہر ہوگا۔ وہ ایک برہمن ہوگا۔ جو دنیا سے فتنہ و فساد کو ختم کر دے گا۔ ملیچھوں کا غلبہ ختم ہو جائے گا اس کے بعد ہندوؤں کا عہد زریں شروع ہوگا۔

ہندوؤں کے نزدیک ایک وشنو نو روپ دھار چکا ہے اور دسواں روپ باقی ہے اور ہندو اس کے انتظار میں ہیں۔
مذکورہ اوتاروں میں دو اوتار رام چندر جی اور کرشن جی مہاراج مشہور ہیں ان کے مختصر حالات قلمبند کیے جاتے ہیں۔

رام چندر جی: رام چندر جی وشنو اوتاروں میں سے ساتویں اوتار ہیں۔ ان کا ذکر مشہور رزمیہ نظم رامائن میں کیا گیا ہے۔ رام چندر جی اجودھیا کے راجہ دسرتھ کے سب سے بڑے بیٹے تھے عقل و فہم اور نیکی میں بڑھے ہوئے تھے راجہ دسرتھ نے ان کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ لیکن ان کی سوتیلی ماں کیکئی نے اپنے بیٹے بھرت کو ولی عہد مقرر کرانے کی کوشش کی۔ اور رام چندر کے خلاف سازشیں شروع کر دیں آخر کار بادشاہ سے بھرت کو ولی عہد مقرر کرانے میں کامیاب ہوگئی اور رام چندر جی کو جلاوطن ہونا پڑا۔

رام چندر کی شادی اودھ کی راجکماری سیتا سے ہو چکی تھی۔ جلاوطنی کے زمانہ میں وفادار بیوی اور بھائی لکشمن ان کے ہمراہ تھے۔ بعد میں سیتا کو لنکا کے راجہ راون نے اغوا کر لیا۔ ہنومان کی مدد سے چندر جی نے لنکا پر حملہ کیا اور راون کو قتل کر کے سیتا کو واپس لائے۔ دسہرے کا تہوار اس کی یاد میں منایا جاتا ہے۔
رامائن میں رام چندر جی کو بہترین انسان وفادار بیٹا اور مثالی خاوند جبکہ سیتا کو وفاشعار بیوی اور لکشمن کو جان نثار بھائی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ہندوؤں میں رام چندر جی، سیتا، لکشمن اور ہنومان کی بہت توقیر اور عزت ہے۔

کرشن جی مہاراج: کرشن جی مہاراج متھرا میں پیدا ہوئے۔ جو دریائے جمنا کے کنارے پر واقع ہے ان کے والد کا نام واسدیو اور والدہ کا نام دیوکی ہے۔ اس وقت متھرا کا حکمران راجہ کنس تھا۔ جس کی رعایا اس کے ظلم وستم سے تنگ آئی تھی۔ کسی نجومی نے اسے بتایا کہ اس کی بہن دیوکا آٹھواں لڑکا اس کا قاتل ہوگا۔ اس نے فوراً اپنے بہنوئی کو مار ڈالنے کا قصد کیا لیکن منت سماجت کے بعد اس شرط پر رہائی ہوئی کہ وہ اپنے ہر لڑکے کو قتل کرنے کے لیے بادشاہ کے سپرد کر دے گا۔

چنانچہ راجہ نے بہن اور بہنوئی دونوں کو قید کر ڈالا دیوکی کے بطن سے سات لڑکے پیدا ہوئے جو راجہ کے حوالے کر دیے گئے تھے اس بے رحم نے سب معصوم بچوں کو قتل کر دیا جب آٹھواں بچہ کرشن جی مہاراج پیدا ہوئے تو واسدیو فوراً اسے کپڑے میں لپیٹ کر محل سے نکل پڑا۔ اور گوکل کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں اس کا دوست نند جی رہتا تھا وہ شیر فروش فرقہ کا سردار تھا۔ اس کی بیوی جسودھا تھی، واسدیو نے اپنے فرزند کو نند جی کے حوالے کیا جس وقت واسدیو اپنے بچے کو لے کر گوکل پہنچے تو نند جی کے ہاں بھی لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ وہ اپنے دوست کی لڑکی کو لے کر متھرا روانہ ہو گیا، تیسرے روز راجہ کنس کو معلوم ہوا کہ اس کی ہمشیرہ کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے۔

جسودھا نے کرشن جی مہاراج کی خوب دیکھ بھال کی۔ کرشن جی مہاراج نے بڑے ہو کر گوکل کے رہنے والوں کو اندر دیوتا کی پرستش سے روکا اور توحید کا سبق دیا۔ اعمال حسنہ بجالانے کی تلقین کی۔ اپنے پاک نظریات کی بناء پر اہلیان گوکل میں ہر دلعزیز ہو گئے۔ راجہ کو بھی علم ہو گیا کہ سری کرشن جی نند کے فرزند نہیں بلکہ اس کی ہمشیرہ کے بیٹے ہیں تو وہ خوف زدہ ہوا۔ اب مہاراجہ کو قتل کرانا بھی آسان نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے پاکیزہ نظریات کی وجہ سے تمام قلمرو کے محبوب بن چکے تھے۔ قلمرو کا ہر شخص ان کے لیے اپنی جان قربان کرنے کو تیار تھا۔ اب راجا نے کرشن جی مہاراج کو دغا سے قتل کرانے کا ارادہ کر لیا۔

ایک شخص اکرور متھرا میں رہتا تھا۔ اس کے سری کرشن جی مہاراج کے ساتھ نہایت دوستانہ تعلقات تھے۔ راجہ نے اکرور کو بلا کر کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ کرشن جی میری ہمشیرہ کا بیٹا ہے میں پسند نہیں کرتا کہ وہ گوالوں میں زندگی بسر کرے۔ تم جاؤ اور اس کو محل میں لے آؤ تا کہ وہ شہزادوں کی طرح زندگی بسر کرے۔

اکرور پیغام لے کر گوکل پہنچا اور اس نے کرشن جی مہاراج کو اس بات کی طرف مائل کیا کہ وہ متھرا میں جا کر راجا کے پاس زندگی بسر کرے چنانچہ کرشن جی اپنے دوست اکرور کے ساتھ متھرا چل پڑے۔

راجہ نے کرشن جی کا تزک و احتشام کے ساتھ استقبال کیا اور مختلف تفریحات کا انتظام کیا۔ ان کھیلوں میں مکابازی بھی تھی اس میں کرشن جی کو شامل ہونے کی دعوت دی۔ اور مکا زنوں سے راجا نے خفیہ طور پر کرشن جی کو ہلاک کرنے کے لیے کہہ دیا تھا لیکن آپ ژرف نگاہی سے تاڑ گئے تھے۔ سری کرشن جی نے نہایت ہی آسانی سے مکہ باز کو ہلاک کر دیا پھر راجہ کنس پر حملہ کیا اور اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا، آخر کار لوگوں نے متفقہ طور پر سری کرشن جی کو تخت پر بٹھایا سری کرشن جی مہاراجہ نے پھر کہن سال راجہ اگرسین کو جسے راجا کنس نے قید خانہ میں ڈال رکھا تھا طلب کیا اور اس کو تخت پر بٹھا دیا۔ یکا یک سری کرشن جی مہاراج کی طبیعت میں انقلاب برپا ہوا انھوں نے سندی من رشی کے مکان پر الٰہیات، سیاست مدن اور اصول حکمت کی تعلیم دینی شروع کر دی۔ ان علوم کے ساتھ انھوں نے تیر اندازی سپہ گری اور جنگی فنون میں بھی مہارت حاصل کر لی۔

سری کرشن جی کی عدم موجودگی میں راجہ جراسندہ نے متھرا پر چڑھائی کی۔ راجا کی دو بہنیں کنس کے نکاح میں تھیں۔ اپنے بہنوئی کا بدلہ لینے کے لیے راجا نے متواتر اٹھارہ حملے کیے۔ ہر دفعہ شکست کھائی۔ اٹھارویں دفعہ راجا جراسندہ نے طاقت ور شودر کالیا ہن کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ جب سری کرشن جی مہاراج کو راجا جراسندہ کے لشکر جرار کی خبر پہنچی۔ تو وہ متھرا آئے لیکن کرشن جی کو مقابلے کے لیے سکت نہ تھی وہ ساتھیوں سمیت متھرا چھوڑ کر دوار میں آباد ہو گئے۔ پھر اکیلے متھرا پہنچنے کالیا ہن کو قتل کیا۔ پھر بعد میں حملہ آور ہو کر جراسندہ اور اس کے حلیف راجاؤں کو قتل کر کے فتح پائی۔

غرض کہ چند ہی سالوں میں سری کرشن جی سب حکمرانوں پر فوقیت لے گئے۔

کرشن جی مہاراج کا ایک ہی مشن تھا وہ یہ کہ مظلوموں کی مدد کرنا۔ چنانچہ دوسری اہم لڑائی کوروں اور پانڈوں کے درمیان لڑی گئی۔ پانڈو مظلوم تھے۔ انھوں نے کرشن جی مہاراج سے کوروں سے اپنی سلطنت کے حصول کے لیے مدد طلب کی کرشن جی مہاراج نے مدد دی۔ فتح پائی۔ جب دونوں فوجیں آمنے سامنے تھیں۔ تو پانڈو خاندان کے ایک فرد ارجن نے محض سلطنت کی خاطر اپنے ہی قریبی رشتے داروں سے لڑنا اور ان کو قتل کرنا معیوب جانا۔ کرشن جی مہاراج جو ارجن کے رتھ بردار تھے۔ نے ارجن کو ایک خطبہ دیا اور خطبہ کے درمیان ارجن نے بہت سے سوالات کیے۔ کرشن جی مہاراج نے دلائل کے ساتھ ارجن کو قائل کیا کہ حق و انصاف کی خاطر لڑنا ہر کھشتری کا کام ہے۔ چنانچہ ارجن دلائل سن کر لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ جنگ مہابھارت ۱۸ دن مسلسل جاری رہی آخر کار پانڈو فتح یاب ہوئے۔

وفات: کوروؤں اور پانڈوؤں کی لڑائی کے بعد کرشن جی مہاراج اپنے تمام خاندان کے ساتھ پرواسش یاترا کے لیے گئے۔ اس متبرک مقام پر دینی رسوم ادا کیں۔ وہاں شراب نوشی کا دور چلا اور نشے کی وجہ سے قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ سری کرشن جی مہاراج ان بے کفن نعشوں پر نگاہ ڈال کر ایک طرف چل دیے۔ ایک جنگل میں پہنچ کر ایک درخت کے نیچے سو گئے۔ وہاں سے ایک شکاری کا گزر ہوا۔ اس نے دور سے گھنے درختوں میں دیکھ کر یہ سمجھا کوئی شکار ہے اس نے نشانہ لگایا اور سری کرشن جی مہاراج کو ابدی نیند سلا دیا۔

سری کرشن جی مہاراج اعلیٰ درجے کے مدبر، افضل راہنما، کامل فلسفی مظلوموں کے حامی تھے۔ ان کا مطمح نظر بدی کو مٹانا اور نیکی کو فروغ دینا تھا۔

مذہبی کتب: ہندو اپنی مذہبی کتب کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ا۔ شرتی، یعنی کانوں۔ سے سنا جسے مکاشفہ کہا جاتا ہے۔ ۲۔ سمرتی یعنی باپ دادوں کی طرف سے پہنچا۔ جسے حدیث یا روایت کہنا چاہیے۔

شرتی کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

ا۔ وید۔ ۲۔ اپنشد

وید کا مصدر ود ہے۔ جس کے معنی ہیں جاننا، سوچنا، موجود ہونا، غور کرنا اور حاصل کرنا ہیں۔ لفظ وید معروف کتب کے لیے ان کتابوں میں استعمال نہیں کیا گیا یہ وہ لٹریچر ہے جو تقریباً دو ہزار سال کے عرصہ میں ہندیوں نے مختلف علوم و رسوم سے متعلق جمع کیا اس کا نام وید رکھ دیا۔

وید بلحاظ تقسیم چار ہیں۔ رگ وید، یجر وید اور سام وید قدیم تصور کی جاتی ہیں۔

ان کو ''ترائی ودیا'' کہا جاتا ہے۔ یعنی تین ویدیں۔ (علوم ثلاثہ کا نام دیا جاتا ہے)

رگ وید۔ رگ کے معنی حمد و ثناء اور مدح و تعریف ہے۔ اس میں ایک ہزار ستائیس، ایک ہزار اٹھائیس بھجن ہیں۔

یجر وید۔ یجر کے معنی بھینٹ چڑھانا، قربانی پیش کرنا ہے۔ اس میں زیادہ تر قربانیاں پیش کرنے کے منتر ہیں۔

سام وید۔ سام کے معنی برابر ہے۔ اس میں راگ اور گیت ہیں۔ اس کے منتر شعری اوزان کے مطابق ہیں۔ اس لیے سام وید کہا جاتا ہے۔

اتھر وید۔ اتھر کے معنی آخری ہے۔ اس کے اور باقی ویدوں کے درمیان ایک زمانہ کا فرق ہے۔ لہٰذا اسے اتھر وید کہا جاتا ہے۔ یہ وید جادو کے علم پر مشتمل ہے۔

مزید براں ویدوں کو زمانہ اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے مزید چار بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

ا۔ سمہت، گیتوں کا مجموعہ

۲۔ برہمن پوجا پاٹ کے طریقے

۳۔ ارنیک یوگ لینے کے طریقے

اپنشد ویدوں کی تصنیف و تدوین کے بارے میں محققین کا اختلاف ہے مسٹر بال گنگا دھر تلک کے نزدیک تصنیف کا زمانہ ۴۰۰۰ ق۔م، مسٹر ہاگ کے نزدیک ۲۴۰۰ ق۔م اور پروفیسر میکس ملر کے نزدیک زمانہ زیادہ سے زیادہ ۱۲۰۰ ق۔م ہے۔ مزید براں یہ بھی معلوم نہیں کہ وید کن رشیوں پر نازل ہوئے۔

۴۔ اپنشد فلسفہ کے اسرار رموز۔ کلمہ اپنشد اوپا (upa) (جس کے معنی نزدیک کے ہیں ''نی'' (Ni) جس کا مطلب ہے ''نیچے'' شد (جس کا مطلب ہے بیٹھنا) سے مرکب ہے اس لیے اپنشد کا مطلب ہے ''طالب علموں کا اپنے استاد کے قریب بیٹھنا۔'' ''استاد کے قریب بیٹھنا تاکہ اس سے پوشیدہ علوم کی تعلیم حاصل کر سکے ایک اور ترجمے کے مطابق اپنشد کا مطلب ہے کہ ''برہما کا علم جس کی بدولت جہالت کی تاریکی ختم ہوتی ہے۔

اپنشد کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ ہندو روایات میں ان کی تعداد ۱۰۸ ہے۔ ۱۰ بنیادی اپنشد ہیں جبکہ کچھ لوگ ۱۸ تصور کرتے ہیں۔

اپنشدوں کے شعراء اور مصنفین میں سے مشہور یجنواکی مرد اور گارگی عورت ہیں۔ گارگی کو تاریخ عالم میں اولین فلسفی خاتون ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یجنواکی ایک چرب زبانی خطیب تھا اس کے ہم مذہب اس کو عیار تصور کرتے تھے۔ اور اسے شریعت میں بدعتیں اختراع کرنے والا عالم قرار دیا گیا۔ اپنے باغیانہ اور نئے (بدعتی) افکار کے باعث اپنی مسلمہ حیثیت منوالی۔ ایک عرصہ تک کوئی چیلنج نہ کر سکا۔ یہ خطبات ۸۰۰ ق۔م اور ۵۰۰ ق۔م کے درمیان مرتب ہوئے ہیں۔

پران: پران کے معنی قدیم کے ہیں۔ ہندوؤں میں مستند اور سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتابیں ہیں۔ وید جس قدر کم یاب اور عسیر الفہم ہیں۔ پران اسی قدر زیادہ دست یاب اور سہل الفہم ہیں۔ پران تعداد میں ۱۸ اٹھارہ ہیں ان میں آٹھ لاکھ سے زیادہ اشعار ہیں۔ ان میں دنیا کی تخلیق کی تاریخ درج ہے۔ ابتدائی آریائی قبائل کی تاریخ اور ہندوؤں کے خداؤں کی زندگی کا تذکرہ درج ہے۔ پران تقریباً ۱۳۰۰ ق۔م میں لکھے گئے تو کچھ ۱۵۰۰ء میں لکھے گئے۔ مشہور پران یہ

ہیں۔ وشنو پران، وایو پران، براہماوے ورتا پران، بھاوشیہ پران، شیو پران براہمند پران، برہد دھرما پران، وشنو کلکی پران۔

دو رزمیہ نظمیں رامائن اور مہا بھارت

رامائن: ہندوؤں میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے رامائن کو اولاً تلسی داس جی نے لکھا اس میں تقریباً ۲۴۰۰۰ شلوک ہیں۔ اس کتاب میں بعد میں آنے والے شاعروں نے بھی اضافے کیے ہیں اس میں رام چندر کی جلاوطنی اور راون کے ساتھ لڑائی کا ذکر ہے۔ لڑائی کا سبب لنکا کے راجہ راون کا رام چندر جی کی بیوی سیتا کا اغوا تھا۔ رام چندر جی نے بیوی کو ظالم راون سے نجات دلانے کے لیے لنکا پر حملہ کر دیا اور شکست دے کر سیتا کو راون کی غلامی سے نجات دلائی۔ اس رزمیہ نظم میں رام چندر جی کو بہادر انسان وفادار بیٹا، مثالی خاوند اور سیتا کو وفادار بیوی اور لکشمن کو جان نثار بھائی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مصنف رامائن بالمیک شاعر نے ان تمام واقعات کو نہایت خوبصورت کے ساتھ بیان کیا۔

مہا بھارت: (بھگوت گیتا) اس میں کوروں اور پانڈوں کی لڑائی کا ذکر ہے کرشن جی مہاراج مظلوم پانڈوؤں کے طرف دار تھے اور ظالموں سے مظلوموں کا حق دلایا۔

ہندو ادب میں مہا بھارت سب سے طویل تالیف ہے اس میں دو لاکھ پندرہ ہزار اشعار ہیں یہ کتاب تقریباً ۲۵۰۰ ق۔م میں بیاس جی نے مرتب کی۔ اس میں ۴۰۰ء تک تقریباً آٹھ سو تک مختلف شاعروں نے اضافے کیے۔ بھگوت گیتا کے معنی کلام ربانی ہے مہا بھارت کا آخری حصہ ہے جو کرشن جی اور ارجن کے درمیان مکالمہ اور مخاطبہ کی صورت میں۔

ہر دور کے لیے سبق: رامائن اور مہا بھارت دونوں کتب میں ہر دور کے لیے ایک پیغام ہے کہ استحصالی قوتوں کے خلاف مظلوموں کی مدد کرنی چاہیے۔ اگر ہر دور میں اس پیغام پر عمل کیا جائے تو دنیا میں کوئی بھی استحصالی قوت اپنا قدم نہ جما سکے اور مزاحمتی قوت کے سامنے اس کو سرنگوں ہونا پڑے۔

قانون کی کتب: ہندوؤں کے مجموعہ قوانین کو دھرم سترا اور دھرم شاستر کہتے ہیں۔ لفظ دھرم جس کا ترجمہ قانون کیا جاتا ہے اصل میں اس سے زیادہ وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ مثال کے طور پر ستروں میں خاندانی فرائض خصوصاً مذہبی اور اخلاقی قوانین درج ہیں۔ دھرم سترا انفرادی اور اجتماعی زندگی کا تذکرہ ساتھ ساتھ کرتے ہیں۔ وہ خاندانی رسوم کی اہمیت بتاتے ہیں۔ اس کے برعکس دھرم شاستر میں صرف قانون ہی موضوع ہے۔

منو کا مجموعہ قوانین جدید ہندو قانون کی اساس ہے سترا سن عیسوی سے پہلے تصنیف ہوئے۔ اور شاستر سن عیسوی کی پہلی صدی میں مرتب ہوئے۔ منو کوشل خاندان سے بادشاہ تھا۔ اس نے ہندو دھرم کے لیے ۸۸۰ ق۔م میں قانون وضع کیا۔ اسے منوسمرتی کہتے ہیں۔

اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو منو کا قانون ہندوؤں کی مذہبی کتب خصوصاً رامائن اور مہا بھارت کے فلسفہ کے خلاف ہے۔ منو معاشرہ میں تقسیم پیدا کر کے غریب طبقے شودروں کے استحصال کی تعلیم دیتا ہے جبکہ رامائن اور مہا بھارت (بھگوت گیتا) استحصالی اور ظالم قوتوں کو نیست و نابود کرنے کی تعلیم دیتی ہیں۔

ہندو فلسفے: یہ ایک تاریخی مسلمہ حقیقت ہے کہ ارض ہند فلسفہ کے تولید کی ماں ہے اور ہندی فلسفہ یونانی فلسفہ سے بھی قدیم ہے۔ اور فیثا غورث، پارمینڈس اور افلاطون مابعد الطبیعیات ہند سے متاثر ہے۔ تھیلز (Thales) اناکسمندر (Anaximander) اناکسیمانس (Anaximenes) ہرکلیٹس (Heraclitus) اناغورث اور امپیڈوکلس (Empedocles) ہندی فلسفہ کو مقدم جانتے تھے۔ (Six systems Muller)

وکٹر کاؤزن (Victor Cousin) نے تو ارض ہند کو عالی ترین فلسفہ کی آماجگاہ تسلیم کیا ہے۔ (Das Gupta 406)

یہ ایک حقیقت ہے کہ علم وہاں ہی نشوونما پاتا ہے جہاں ذہنی آزادی ہو۔ دلیل کا جواب دلیل سے دیا جاتا ہو۔ جہاں بھی دلیل کا جواب ضرب سوط، قید و بند یا لسانی تیر و سنان (تکفیر بازی) سے دیا جاتا ہے۔ وہاں سے علم مٹ جاتا ہے۔ جس قدیم دور میں ارض ہند میں فلسفہ کی ترویج ہوئی۔ اس زمانہ میں مہاراجے حکماء کے قدر دان تھے۔ حکماء کے درمیان مباحثے کرواتے جیتنے والے کو انعام و اکرام سے نوازتے۔ راجے مہاراجے مباحثات میں خود حصہ لیتے۔ فلاسفر کے سامنے انکساری کی ایک تصویر بنے رہتے۔ معاشرہ میں سب سے عالی مرتبت فلاسفر ہوتا تھا۔ قوم کا بطل جلیل تصور کیا جاتا ہے۔

علم کی جڑ آزادی فکر ہے۔ جب بھی آزادی فکر پر پہرے بٹھا دیے جائیں گے۔ شجر علم خشک تنا بن جائے گا۔ جس ملک سے علم مٹ جاتا ہے وہ ملک زوال کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جاتا ہے۔[1]

---

[1] عالم اسلام کے حکمرانوں کی خدمت میں عرض ہے کہ ملک بیرونی مالی مدد سے ترقی نہیں کرتے بلکہ علم کی دولت سے ترقی کے راستہ پر گامزن ہوتے ہیں۔

ہندی فلسفہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ آستک (Astika) اور ناستک (Nastika) آستک اثباتی ہے اور ناستک نفی پر مبنی ہے۔ آستک کے چھ مذاہب (Schools of thought) ہیں جبکہ ناستک بدھ مت، جین مت اور چالو واک فرقے شامل ہیں ان کو الگ مذہب نہیں بلکہ ہندو فرقے قرار دیا جاتا ہے ناستک فلسفہ والے نہ ویدوں کو غلطی سے پاک خیال کرتے ہیں اور نہ انھیں بطور سند تسلیم کرتے ہیں۔

آستک کے چھ مذہب

فلسفہ نیایہ: اس فلسفہ کا بانی گوتم (گوتاما) سمجھا جاتا ہے (یہ گوتم بدھ نہیں بلکہ ایک فلاسفر اور مفکر ہے) اس کی تصنیف نیائے سوترا (NyayaSutra) ہے جو پانچ جلدوں میں ہے۔ یہ ایک منطقی مذہب ہے۔ نیایہ طریقہ استدلال سکھاتا ہے تاکہ انسان اپنے اعمال کا احتساب کر کے برے کاموں سے محفوظ ہو کر نجات حاصل کرے۔ فلسفہ نیایہ خدا کو علت العلل اور نگہبان سمجھتا ہے اور وہی اشیاء کو نیست و نابود کرنے والا ہے۔ خدا کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ کوئی انتہا۔ اسی فلسفہ نے ہند میں تحقیق و تفکر کی راہیں وا کی تھیں اور علم و حکمت کی روشنی پھیلی تھی۔

فلسفہ ویشسکا (Vaishesika): اس کا بانی کناد (Kanada) سمجھا جاتا ہے جو تیسری صدی قبل مسیح میں تھا۔ اس نے ویشیشک سوتر لکھی ہے جو اہم ترین کتاب ہے۔ جس طرح گوتم ہند کا ارسطو ہے اسی طرح کناد دیمقراطس ہے فلسفہ ویشسکا میں طبیعیاتی اور مابعد الطبیعیاتی مسائل پر بحث کی گئی ہے اس میں مادہ اور روح کی تفریق تسلیم کی گئی ہے مادہ غیر فانی، غیر مرئی اور بے صورت ذرات پر مشتمل ہے انھیں کی ترکیب سے کائنات کی تخلیق ہوتی ہے۔

فلسفہ سانکھیہ (Sankhya): یہ فلسفہ سب سے پرانا تقریباً ۱۸۰۰ اور ۵۵۰ ق۔م کے درمیان وجود میں آیا اس فلسفہ کا بانی کپیلا نامی فلاسفر تھا۔ اس کی تصنیف کا نام تت وساس (Tataivasmase) ہے یہ کتاب بہت مختصر اور ادق تھی اس لیے کپیلا نے خود اس کی شرح لکھی۔ اس کے بعد اس کے شاگرد اسوری (Asuri) اور آسوری کے شاگرد پنکا سیکھا (Panca Sikha) نے اس کی شرح لکھی۔ یہ نظام فلسفہ گوتم بدھ اور مہاویر سے قبل رائج ہوا تھا۔ سانکھی کائنات کو دو مستقل اور متبائن اجزاء میں تقسیم کرتا ہے۔ روح یا پروشہ (Parusha) ۲۔ پراکرتی (Prakiriti) یعنی وہ قوت جو خود تو کچھ نہیں کر سکتی مگر ذی حیات اور ذی قوت (پراکرتی) پیدا کرتی ہے۔ وہ قوت جو عالم مادیات کی علت العلل اور تولید کنندہ ہے۔ سانکھی یہ تعلیم دیتا ہے کہ پروشہ یعنی روح بہت سے ہیں اور وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں۔ اس لیے اس فلسفہ کو انفرادیت بھی کہا جاتا ہے۔ اس فلسفہ کے مطابق حقیقی خالق کوئی نہیں ہر چیز کی پیدائش پرا کرتی اور روح سے ہوتی ہے دنیا قدیم ہے کبھی پیدا نہیں ہوتی نہ ہی کبھی فنا ہونے والی ہے۔

فلسفہ یوگ: اگرچہ یوگ کی ابتداء وادی سندھ کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ لیکن یہ فلسفہ پتنجلی سے منسوب ہے جس کی تصنیف یوگ سوترا (Yoga Sutra) ہے۔ جسے پتنجلی سوتر بھی کہتے ہیں اس فلسفہ سے ہندوستان کے تمام مذاہب متاثر ہوئے فلسفہ سنکھیہ نظری ہے اور فلسفہ یوگ عملی یوگا کے معنی مربوط کرنا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ وہ زائد از عمل ہے جو ایک سنیاسی مافوق الفطرت قدرت اور ادراک کے حصول کے لیے اپنے آپ کو مادی قیود اور جھمیلوں سے الگ کر کے ضبط نفس کی خاطر کرتا ہے اور یہی نجات کا ذریعہ ہے۔ اس فلسفہ میں خدا کا تصور پایا جاتا ہے۔

فلسفہ میماسا (Mimasa): اس فلسفہ کا بانی جے منی ہے یہ انسان کو راہ عمل دکھاتا ہے اس فلسفہ کے مصنفوں نے وید کی عظمت اور حقانیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور حد سے زیادہ مبالغے سے کام لیا ہے ان کا یہ نظریہ ہے۔ کہ وید خود بخود مقدس مفکروں کی زبان پر جاری ہو گئے اور ان کو الوہیت کا مرتبہ دیا وہ اس طرح ان کا یہ نظریہ بھی ہے کہ وید مقدس اور ہر نقص سے پاک ہیں۔ اس وجہ سے ان تعلیم پر بے چوں و چرا عمل کرنا چاہیے اور ان کے بتائے طریقے کے مطابق مذہبی رسوم ادا کرنی چاہیے۔ اس میں انسان کی بھلائی ہے اس سے انسان کو بہشت ملے گا۔ اس فلسفہ کی رو سے وید کا علم روح اور جسم کو متحد رکھتا ہے جب روح جسم سے جدا ہو جائے تو وہ علم کی محتاج نہیں رہتی۔

فلسفہ ویدانت: ویدانت کے معنی ہیں ویدوں کا آخری حصہ (ان کا نچوڑ) اس کی بنیاد اپنشدوں پر ہے۔ یہ فلسفہ اخلاقی اور روحانی امور پر بہت زور دیتا ہے اس وجہ سے اس فلسفہ کو ہندو تصوف کہا جاتا ہے۔

اس فلسفہ کی بنیاد برہماستر (مصنفہ باداریان Badarayana) پر ہے تقریباً ایک ہزار سال بعد گونند بالا نے ان ستروں کی بنیاد پر اصول باطنی مرتب کیے اور شنکر اچاریہ نے انہی کی بنیاد پر اپنی مشہور تصنیف "ودانت" تحریر کی اور ہند کا مشہور فلسفی کہلایا۔ فلسفہ ویدانت کا مرکزی نقطہ وحدۃ الوجود ہے یعنی خدا ہر چیز میں موجود ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے نزدیک عالم کی ہر چیز قابل پرستش ہوئی اور خدا کی احدیت ختم ہوگئی۔ اس وجہ سے اس فلسفہ کو ماننے والے

یہ کہتے ہیں کہ ہم غیر اللہ کی پرستش نہیں کرتے بلکہ خدا کی ہی پوجا کرتے ہیں کیونکہ تمام اجرام، اجسام اور اصنام میں خدا موجود ہے۔

تعلیمات: اگر تمام مذاہب عالم کا بنظر عمیق مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ذات باری تعالیٰ کا عقیدہ تمام مذاہب میں امر مشترک ہے اسلام پہلا وہ دین ہے جس نے اس امر مشترک کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا نُوْحِيْ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء ۲۱:۲۵) اور تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف ہم (یہی) وحی کرتے تھے کہ میرے سوائے کوئی معبود نہیں سو میری ہی عبادت کرو۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُوْلًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل ۱۶:۳۶) اور یقیناً ہم نے ہر ایک قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچو۔

اسلام ہی وہ دین حق ہے جس نے اس راز سے پردہ اٹھایا کہ دنیا کی ہر قوم کی طرف نبی آتے رہے ہیں اور وہ ایک ہی گروہ تھے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر ۳۵:۲۴) کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔ پھر فرمایا وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس ۱۰:۴۷) ہر قوم کے لیے رسول ہے۔

لہٰذا تمام انبیاء علیہم السلام کا ایک مشترکہ یہی پیغام تھا کہ اللہ ایک ہے۔ اس اصول کو سامنے رکھ کر ہندوؤں اور دیگر مذاہب کی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں کسی نہ کسی رنگ میں توحید کی روشنی نظر آ جاتی ہے۔

رگ وید: ''مذہبی بزرگ خدا کو کئی ناموں سے پکارتے ہیں۔ (رگ وید ۱:۱۶۴:۴۶) رگ وید میں اللہ تعالیٰ کی کئی صفات بیان کی گئی ہیں۔ رگ وید کی دوسری شبدھ کے تیسرے شعر میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ''براہما'' بیان کی گئی ہے جس کے معنی خالق کے ہیں۔

یجروید: اس کا کوئی عکس نہیں۔ (یجروید ۳۲:۳)

''وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا۔ وہی ہماری عبادت کا مستحق ہے اس کا کوئی عکس نہیں اور یقیناً اس کی شان سب سے بلند ہے وہ خود کو سورج وغیرہ میں قائم رکھ سکتا ہے۔ شاید وہ مجھے نقصان نہ پہنچائے یہی میری دعا ہے وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا اور ہماری عبادت کے لائق ہے۔'' (یجروید، دیوی چند ایم اے صفحہ ۳۷۷) ''جو قدرتی مظاہر کی پوجا کریں گے اندھیرے میں داخل ہوں گے۔'' (یجروید ۴۰:۹)

اتھروید: بے شک خدا عظیم ہے۔ (اتھروید ۵۸:۲)

سوریا تو یقیناً عظیم ہے ادیتیا تو عظیم ہے چونکہ تو عظیم ہے تیری عظمت کی تعظیم کی جاتی ہے بیشک جو عظیم ہے اے خدا۔ (Atharveda Samhiti vol 2 William Dmight Whutney P 910)

اپنشد: ''وہ صرف ایک ہے کسی کے بغیر۔'' (چندوگیا اپنشد ۶:۲:۱)

''نہ ہی اس کے ماں باپ ہیں اور نہ ہی کوئی خدا۔'' (سویت سواترا اپنشد ۶،۹) (حصہ دوم صفحہ ۲۶۳)

''اس جیسا کوئی نہیں ہے۔'' (سویت سواترا اپنشد باب ۴:۱۹)

''کوئی اس جیسا نہیں، جس کا نام عظمت والا ہے۔''

(The Principal Upanishad by S.Radhakr ishnan page 736,737)

''اس کا پیکر نظر نہیں آتا، کوئی اسے آنکھوں سے نہیں دیکھتا جو اسے دل اور دماغ سے دیکھتے ہیں وہ ان کے دل میں رہ کر انھیں لافانی بنا دیتا ہے۔ (سویت سواترا اپنشد ۴:۲۰)

بھگوت گیتا: ''وہ جن کی عقل پر مادی خواہشات کے پردے پڑے ہوئے ہیں وہ نقلی خداؤں کو پوجتے ہیں۔ (گیتا باب نمبر ۷ آیت ۲۰) [1] یہ ایک حقیقت ہے۔ جب کسی مذہب میں خدا کا تصور موجود ہو تو لازمی طور پر ان میں فرشتوں اور حیات بعد الممات کا بھی تصور ہوگا کیونکہ ملائکہ اور حیات بعد الممات کا تصور توحید کے ساتھ لازم ہے۔ اس لیے یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ملائکہ اور حیات بعد الممات کا تصور ہندومت کی کتب میں پایا جاتا ہوگا لیکن کتب میں تحریف و تبدل سے ملائکہ اور حیات بعد الممات کا تصور دھندلا گیا ہے لیکن تصور موجود ہے۔ اتھروید میں ہے یہ برہمنوں کو کھلانے پلانے اور خیرات کرنے سے حاصل ہوتی ہے

[1] خدا کے تصور کے بارے میں حوالہ جات مذاہب عالم میں تصور خدا مصنف ڈاکٹر ذاکر نائک سے ماخوذ ہیں۔

اس میں گھی کے تال، شہد کی لہریں، بہتی ہوئی شراب، دودھ کی نہریں، دہی کے تالاب، نیلوفر کے حوض، لونڈے اور عورتوں کے جھنڈ، بہشتیوں کو ملیں گے۔

(اتھرویدکانڈ ۴ سوکت ۳۴)

گیتا میں ہے ایک کلپ کے خاتمے پر سب چیزیں میری طرف پلٹتی ہیں اور (دوسرے) کلپ کے آنے پر میں انھیں پھر نکالتا ہوں۔

(نواں ادھیائے شلوک ۷)

تریموتی (تثلیث): جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے جدید ہندومت میں ہمہ اوستی کا نظریہ موجود ہے۔ اس نظریہ کے مطابق مظاہر قدرت کی عبادت خدا کی عبادت ہے۔ اس وجہ سے ہندومت میں معبودوں کی کثرت کا تصور داخل ہو گیا۔ ویدک دھرم کی غیر مقبولیت کے پیش نظر برہمنوں نے یہ محسوس کیا کہ ویدک دھرم دیوتاؤں میں بنیادی تبدیلی کرنی چاہیے چنانچہ اس احساس کے نتیجہ میں ہندودھرم میں تین بڑے خدا مقرر کیے گئے۔ براہمہ، شیو، وشنو، ان کو ہی تیری مورتی یعنی تین شکلیں کہتے ہیں۔ ان کے تحت بے شمار دیوتا اور دیویاں مقرر کی گئیں۔

براہمہ: یہ دیوتا عالم کا خالق اور کائنات کا نقطہ آغاز تصور کیا جاتا ہے ہندو تثلیث میں برہما کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔

وشنو: ہندوؤں کا دوسرا دیوتا وشنو ہے یہ ویدی معبود ہے۔ منتروں میں اسے ''معبود الشمس'' ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کی اہمیت دیوتا شیو کی نسبت زیادہ ہے یہ اشیاء کی حفاظت اور بقا کا ذمہ دار ہے۔

شیو: یہ دیوتا اشیاء کو تباہ و برباد کرنے والا ہے۔

مکتی کے تین طریقے: ہندومت کے تمام فرقوں کا مرکزی مسئلہ نجات ہے ہندوؤں کے نزدیک نجات کے حصول کے تین طریقے ہیں۔ راہ عمل، راہ علم، راہ ریاضت، یہ تینوں راستے ایک دوسرے سے الگ نہیں تمام ہندو فرقے ان طریقوں کو تسلیم کرتے ہیں ابتداء زمانہ میں راہ علم پر بہت زور دیا گیا پھر راہ عمل کی اہمیت بڑھی آخری زمانے میں راہ ریاضت پر زیادہ زور دیا جانے لگا اور اس کی اہمیت سب راہوں پر غالب آ گئی۔

ذات پات کی تقسیم اور برہمنوں کا تفوق: ہندوؤں میں انسانیت سوز ذات پات کا امتیاز ہے۔ جس ہندو مصلح نے بھی اس امتیاز کو مٹانے کی کوشش کی وہ ناکام ہوا کیونکہ ذات پات کا امتیاز ہندوؤں کی گھٹی میں رچا بسا ہے۔

وید میں لکھا ہے برہمن پر ماتما کے منہ سے کشتری بازوؤں سے ویش رانوں سے اور شودر پاؤں سے پیدا ہوا ہے۔ (رگوید، یجروید، اتھروید)

برہمن: ہندوؤں کے نزدیک برہمن سب ذاتوں سے افضل ہے۔ اور وہ کل کائنات کا بادشاہ ہے اس کا کام شاستر کی حفاظت کرنا ہے۔

کشتری: اس کا کام ملک کا دفاع تھا۔ یہ طبقہ ہندو معاشرہ میں دوسرے درجے پر تھا۔

ویش: اس طبقہ کا کام زراعت، تجارت اور صنعت کو فروغ دینا تھا۔ اس کا معاشرہ میں تیسرا درجہ تھا۔

شودر: شودر ہندو معاشرہ میں ذلیل ترین طبقہ تھا ان کے لیے مندر سکول، کنویں اور چشمے الگ ہو گئے اور اس راہ پر نہیں چل سکتے تھے۔ جس راہ پر اعلیٰ ذات کا ہندو چل رہا ہو۔ اس ذات کا کام اعلیٰ ذاتوں کی خدمت گزاری تھا۔

ہندومت کے مقبولہ و مروجہ عقائد

مسئلہ نیوگ: ہندومت میں مرد اور عورت کے باہمی جنسی تعلق کا ایک طریقہ ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی عورت کا شوہر مر جائے تو اس بیوہ کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہیں ہے اگر وہ چاہے تو کسی مرد سے ہم بستر ہو کر اولاد پیدا کرے اور اپنی شہوت کو تسکین دے۔ اس باہمی جنسی تعلق کو صرف یہیں تک محدود نہیں کیا بلکہ ایک شوہر والی عورت کو بھی اجازت دے دی ہے کہ اگر اس کے شوہر سے اولاد پیدا نہ ہو۔ تو وہ کسی دوسرے مرد سے ہم بستر ہو کر نطفہ لے لے اور اولاد حاصل کر لے وہ عورت دس مردوں سے علیحدہ علیحدہ ہم بستر ہو کر نطفہ لے سکتی ہے اس طرح جو اولاد پیدا ہو گی۔ وہ اس خاوند کی ہو گی جس کی ہم بستری سے اولاد پیدا نہیں ہوئی۔

سوامی دیانند جی نے نیوگ پر اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش میں تفصیل سے بحث کی ہے اور اس کو جائز قرار دیا ہے۔

مادہ و روح کا ازلی و ابدی ہونا: سوامی دیانند جی نے اللہ تعالیٰ کی طرح مادہ اور روح کو ازلی ابدی قرار دیا ہے۔ ستیارتھ پرکاش کے صفحہ ۲۷۴ پر مذکور

ہے کہ جب سوامی دیانند سے سوال کیا گیا کہ ازلی کس کو کہتے ہیں اور کتنی اشیاء ازلی ہیں تو جواب دیتے ہیں کہ تین چیزیں ازلی ہیں پرمیشور، جیو اور پراکرتی۔

اس عقیدہ سے اللہ تعالیٰ کی صفت ازلیت و ابدیت، وحدانیت اور خالقیت پر زد پڑتی ہے۔ اس عقیدہ کا رد ''مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ'' میں کیا گیا ہے۔ قارئین اس کتاب سے استفادہ کریں۔

عقیدہ تناسخ: تناسخ کو سنسکرت میں اواگون کہا جاتا ہے۔ تناسخ کے ماننے والے اس کے یہ معنی لیتے ہیں۔ گناہوں اور نیکیوں کے باعث بار بار جنم لینا اور مرنا۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ روحوں کی تعداد محدود ہے اللہ تعالیٰ نئی روح پیدا نہیں کرسکتا اس وجہ سے ہر روح کو اس گناہ کی وجہ سے اواگون کے چکر میں ڈال رکھا ہے۔ اور ہر گناہ کے بدلے میں روح ایک لاکھ چوراسی ہزار مرتبہ مختلف شکلوں میں جنم لیتی ہے۔ سور، کتے، بلے وغیرہ کی مختلف شکلیں کسی انسان کے بداعمالی کی وجہ سے روح نے اختیار کی ہوتی ہیں۔ اس کا عقلی، نقلی رد ''مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ'' میں مطالعہ کیجئے۔

جین مت

جین مت کی روایت کے مطابق مہاویر [1] چوبیسویں تیرتھنکر (رشی کامل یارسول) ہیں۔ ان کا اصلی نام وردھمان تھا۔ وہ پٹنہ سے ۲۷ میل شمال سے ویشالی کے مقام پر ۵۴۰ ق۔م میں شاہی خاندان میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام سدھارتھ تھا۔ جوگنڈا پور اور تیرسالہ کے قبیلے جناتیر کا سردار تھا۔ ان کی والدہ ایک کشتری خاتون تھی جو ویسالی اور مگدھ کے حکمران خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ مہاویر نے ۱۹ سال کی عمر میں شہزادی ایشودھا سے شادی کی۔ کچھ عرصہ ہنسی خوشی متاہلانہ زندگی بسر کی جب تیس سال کی عمر میں قدم رکھا تو دنیا ترک کردی اور پرسوناتھ کا مسلک اختیار کرلیا۔ بارہ سال برہنگی کی حالت میں راہبانہ زندگی بسر کی۔ تقریباً چھ سال تک وہ ایک بھکشو ''گوسالہ'' کی معیت میں رہا لیکن گوسالہ نے اسے چھوڑ دیا اور خود اجویکا ایک نئے عقیدہ کی داغ بیل ڈالی۔ ریاضت کے تیرھویں سال مہاویر نے ایک غیر معروف بستی جو بھاکا گرام میں ڈیرہ لگایا اور بیالیس سال کی عمر میں ان کو حقیقی گیان حاصل ہوا۔ اور تیس سال تک اپنے مشن کی تبلیغ کی۔ ۷۲ سال کی عمر میں جنوبی بہار کے ایک مقام پاوا ۴۸۶ ق۔م میں وفات پائی۔

کتب: چوتھی صدی میں پاٹلی پتر میں مقدس کتب کو ازسرنو مرتب کرنے کے لیے ایک کونسل قائم کی گئی۔ اس کونسل نے بارہ انگس ''کتابیں'' مرتب کیں۔ پانچویں یا چھٹی صدی میں ولبھائی ضلع گجرات میں دوسری کونسل قائم کی گئی۔ جس نے جین مت کے تمام اصولوں کو مدون کیا اور کتابوں کی شکل میں مرتب کیا۔ ان میں انگس ایک مکمل صحیفہ ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کتب مدون کی گئیں۔ مثلاً اپانگہ، میولہ اور سوترا وغیرہ تعلیمات جس دور میں مہاویر پیدا ہوئے اس وقت سب سے اہم مسئلہ نروان کا تھا۔ مہاویر نے نرواں کے حصول کے لیے دو طریقے سلبی اور ایجابی بیان کیے۔

سلبی طریقہ: نروان حاصل کرنے کے لیے انسان اپنے دل سے ہر قسم کی خواہشات اور آرزوئیں نکال دے۔ خواہشات ہی غم سے دوچار کرتی ہیں۔ جب خواہشات ہی نہ ہوں گی تو روح قلبی مسرت سے ہمکنار ہوگی۔ قلبی مسرت اور راحت ہی نروان ہے۔

ایجابی مہاویر کے نزدیک نروان کے حصول کا ایجابی طریقہ یہ ہے کہ انسان کے عقائد، علم اور عمل درست ہوں۔ انھیں تین رتن کہا جاتا ہے۔

اعمال کی درستگی کی بنیاد پانچ باتوں پر رکھی۔

اہمسہ: کسی ذی روح کو تکلیف نہ دی جائے۔

ستیام: ہمیشہ راستی کو اپنا شعار بنایا جائے۔

استیام: چوری سے اجتناب کیا جائے۔ حلال روزی کمائی جائے۔

برہمچاریام: عفت پاکدامنی کی زندگی بسر کی جائے۔

اپری گراہہ: حواس خمسہ پر مکمل طور پر غلبہ اور فتح ہونی چاہیے۔

فلسفہ الٰہیات: جینی اواگون اور مکتی میں اعتقاد رکھتے ہیں۔ لیکن مکتی کے بارے میں ان کا عقیدہ ہندوؤں سے مختلف ہے ان کے نظریہ کی رو سے جب کوئی روح گناہ کرتی ہے تو وہ بوجھل ہوکر نیچے کی طرف ڈوبنے لگتی ہے حتیٰ کہ وہ اس قدر بوجھل ہوجاتی ہے کہ ساتویں دوزخ میں جاگرتی ہے جو روح مطہر ہو جاتی

[1] اس تیرتھنکر کا زمانہ آٹھویں صدی ق۔م ہے۔ جین مت کا حقیقی بانی اسی کو سمجھتے ہیں۔

ہے وہ ہلکی پھلکی ہو کر اوپر کو صعود کرتی ہے اور چھبیس بہشتوں میں سے ایک میں قرار کرتی ہے جب وہ بہت ہی لطیف اور تمام الائشوں سے منزہ ہو جاتی ہے تو چھبیسویں بہشت میں پہنچ جاتی ہے تب اسے نروان حاصل ہو جاتا ہے۔

جینی مادہ اور روح کو ابدی مانتے ہیں جو روح مکتی پا جاتی ہے وہ پیدائش اور موت کے چکر میں نہیں آتی۔ کرموں سے نجات پا جانے کا نام مکتی ہے جو مکتی حاصل کر لیتا ہے وہ پرمیشور (خدا) ہو جاتا ہے چوبیس تیر تھنکروں نے مکتی حاصل کی اس لیے وہ پرمیشور ہیں۔ اس کائنات کا کوئی خالق نہیں وہ ایسے پرمیشور کے وجود کے قائل نہیں۔ جسے قدیم اور خالق کہا جا سکے۔

فرقے: مہاویر سوامی کے زمانہ سے ہی جینوں کے دو فرقے رہے ہیں۔ ایک تو سراوک یا گرہستھ جو اہلی زندگی بسر کرتے ہیں اور جین مذہب کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں۔ دوسرے شرامن یا سادھو جو راہبانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور جماعت بنا کر جین مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔

بدھ مت

گوتم بدھ ۵۶۸ ق۔م [1] میں شمالی ہند کے علاقہ نیپال میں ساکیہ قبائل کی راجدھانی کپل وستو میں پیدا ہوئے ان کے والد شدھو دھن وہاں کے راجہ تھے اور ان کی والدہ کا نام مایا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت شاہی طریقے پر ہوئی اور سولہ سال کی عمر میں جسودھا سے شادی ہوئی۔ جس سے ایک بچہ راہل پیدا ہوا۔ ۲۹ سال کی عمر میں دل میں ایک روحانی انقلاب برپا ہوا۔ گھر بار چھوڑ کر راج گڑھی جو مگدھ کا دارالحکومت تھا، پہنچے۔ پہاڑوں کی غاروں میں درویشوں کے ساتھ راہبانہ زندگی گزاری۔ الترنامی درویش کے مرید بن گئے۔ جب اس درویش کی صحبت سے اطمینان قلب نصیب نہ ہوا تو ایک اور عابد زاہد درویش ادرک نامی کی طرف گئے۔ ان دونوں درویشوں نے ہندو مذہب کا فلسفہ سکھایا۔ اس کے بعد گوتم بدھ نے نفس کشی کے لیے چلوں اور ریاضتوں کا قصد کیا اور چھ سال تک سخت ریاضتیں کیں جسم کانٹے کی طرح خشک ہو گیا لیکن پھر بھی قلبی نور میسر نہ ہوا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ ریاضتیں بے سود ہیں اور کھانے پینے تک لگ پڑے اور ان کے پانچ مصاحب ان سے الگ ہو گئے لیکن گوتم نے حق کی تلاش نہ چھوڑی اور ایک بڑ کے درخت کے نیچے مراقبہ میں بیٹھ گئے۔ اور یہیں ان کو کئی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جس میں کامیاب نکلے اور اپنے نفس امارہ پر مکمل فتح حاصل کر لی اور وہ گوہر عرفان مل گیا جس کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ اس کے بعد اپنے مشن کی اشاعت کے لیے اردگرد کے علاقوں میں گئے۔ آپ کی تعلیمات کا محور بت پرستی سے پرہیز اور ذات پات کی تمیز کا رد تھا۔ لوگ جوق در جوق ان کے حلقہ عقیدت میں آنے لگے اور ان کی بیوی اور بیٹا بھی مرید بن گئے۔ انھوں نے بہار اودھ اور نیپال میں ۴۵ سال تک اپنے مشن کی تبلیغ کی بالآخر نارا نامی مقام پر (گورکھپور کے علاقے میں) اپنی سالگرہ کے دن اسی سال کی عمر ۴۸۸ ق۔م میں وفات پائی۔

بدھ مت کی کتب: یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بدھ نے اپنے پیچھے لکھی ہوئی کتابیں نہیں چھوڑیں۔ وفات کے بعد سینکڑوں سال بعد تک مدون نہیں ہوئیں۔ بدھ مت کے مشہور دو فرقے ہیں دونوں کی الگ الگ کتب ہیں۔

ہنائنا فرقہ کی کتب: ہنائنا فرقہ کے تمام بنیادی اصول اور عقائد غالباً تیسری کونسل میں طے ہوئے تھے۔ لیکن یہ بھی دو صدی بعد تک لکھے نہ گئے تھے۔ یعنی بدھ کی وفات کے تقریباً چار سو پچاس سال سے زیادہ عرصہ بعد پالی زبان میں لکھے گئے تھے۔ یہ تی پتا کا یا تر پتا کا (تین ٹوکرے) پر مشتمل ہیں۔ ان کے الگ الگ نام ہیں۔

۱۔ وینہ پتا کا، جس میں وہ ضوابط درج ہیں جو پروہتوں کے لیے بدھ نے مقرر کیے۔
۲۔ ستا پتا کا یہ بدھ کے ملفوظات اور واعظوں پر مشتمل ہے۔
۳۔ ابھی دھما پتا کا، اس میں بدھ مت کا دینی فلسفہ اور نفسیات ہے۔

فرقہ مہاین کی کتب: دی مندسترا۔ ۲۔ لنکا وترا سترا۔ ۳۔ قانون کامل کا پدم۔ (The lotus of the parfect Law) ۴۔ سورنگما سترا۔ ۵۔ سکھاوتی یوہا سترا۔ ۶۔ بیداری ایمان (The awakening of the faith)

تعلیمات: گوتم بدھ نے مریدوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا۔ درویش اور دنیا دار۔ ہر دو کے لیے الگ الگ عمل کی تعلیم دی۔
درویشوں کے گروہ کے لیے جو قانون منضبط کیا تھا۔ وہ چھ حصوں میں منقسم تھا۔

---

[1] تاریخ پیدائش میں مورخین کا اختلاف ہے۔

مراقبے: مراقبہ کو ہندی مذاہب میں سادھی بھی کہا جاتا ہے۔ تمام ذہنی قوتوں کو کسی ایک نقطہ پر مرکوز کرنے کا نام مراقبہ ہے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب انسان کی ذہنی قوتیں ایک جگہ مرکوز ہو جاتی ہیں تو اس کی صلاحیتوں میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے اور نور بصیرت بڑھ جاتی ہے۔ جس سے وہ ان مخفی حقائق سے آگاہ ہو جاتا ہے جن تک عام آدمی کی رسائی نہیں ہوتی۔ بدھ مت میں مخفی حقائق سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے مراقبہ لازمی ہے۔ صحیح مراقبہ میں پانچ رکاوٹیں ہیں ان کا دور کرنا ضروری ہے وہ یہ ہیں۔ ا۔ نفسانی خواہش۔ ۲۔ دشمنی اور بغض۔ ۳۔ سستی۔ ۴۔ دماغی پریشانی۔ ۵۔ شک اور بے یقینی ان کی جگہ ان کی متضاد کیفیات پیدا کرنا ضروری ہے۔ ا۔ قلبی اطمینان۔ ۲۔ محبت آمیز مسرت۔ ۳۔ چستی۔ ۴۔ ذہنی سکون۔ ۵۔ یکسوئی۔

مراقبے چار ہیں۔ پہلا مراقبہ جسمانی کثافت پر، دوسرا مراقبہ پُرجوش حس کی پیدا کی ہوئی برائیوں پر، تیسرا مراقبہ خیالات کے عدم استقلال پر، چوتھا مراقبہ ہستی کی حالتوں پر ہے۔

چار بلیغ کوششیں: پہلی کوشش برائیوں کی پیدائش کو روکنے کے لیے، دوسری کوشش موجودہ برائیوں کو دور کرنے کے لیے، تیسری کوشش غیر موجود نیکی پیدا کرنے کے لیے، یعنی نیک بننے کی کوشش، چوتھی کوشش پیدا کی ہوئی نیکی کو ترقی دینے کے لیے۔

چار دینداری (ولایت) کے راستے: دیندار (ولی) بننے کی خواہش۔ ۲۔ دیندار بننے کے لیے ضروری جدوجہد۔ ۳۔ دیندار بننے کے لیے دل کی ضروری تیاری۔ ۴۔ دیندار بننے کے لیے تحقیقات حس کے ذریعے سیدھی یا اولیائی مافوق الفطرت قوتیں حاصل کی جاسکتی ہیں۔

پانچ اخلاقی طاقتیں: ایمان، تہمت، حافظہ، تصور، الہام (باطنی دانش)

سات دانشیں: ہمت، حافظہ (سوچ)، تصور (استغراق)، تحقیقات۔

صحیح علم (عقیدہ) صحیح ارادہ، صحیح کلام (گفتگو)، صحیح عمل، حلال کمائی، صحیح کوشش، نیک خیال، سچا دھیان (غور وفکر)

دکھ سے بچنے کے لیے آٹھ طریقے: گوتم بدھ نے دکھ اور تکلیف سے بچنے کے لیے آٹھ اعلیٰ طریقے بیان کیے ہیں وہ یہ ہیں۔ ا۔ صحیح علم (صحیح نظریہ)، ۲۔ صحیح ارادہ۔ ۳۔ راست گوئی۔ ۴۔ درست رویہ۔ ۵۔ درست روزی۔ ۶۔ درست کوشش۔ ۷۔ درست تفکر۔ ۸۔ درست مراقبہ۔

گوتم بدھ نے اعلیٰ اور ارفع ہشت پہلو راست کو دو انتہائیں یعنی تن پروری اور تعذیب نفس کی درمیانی راہ کو قرار دیا ہے۔ ان دو حدوں سے الگ رہ کر انسان درمیانی راہ پر چل کر نور ازل تک رسائی کر سکتا ہے۔ گوتم بدھ کے نزدیک نور ازل کے حصول کا نام نروان ہے۔ یہ درمیانی راستہ چار خاص اصولوں سے نکالا گیا ہے۔ ا۔ تکلیف۔ ۲۔ اسباب تکلیف۔ ۳۔ انسداد تکلیف۔ ۴۔ طریقہ انسداد تکلیف۔

ا۔ انسانی زندگی دکھوں اور مصائب سے بھری ہوئی۔ ۲۔ ان دکھوں کا سبب خواہشات ہیں۔ ۳۔ خواہشات سے اپنے آپ کو بچایا جا سکتا ہے۔ ۴۔ اس کے لیے نہ تو سخت ریاضت کی ضرورت ہے اور نہ عیش پرستی بلکہ درمیانی راستہ اختیار کرنا چاہیے وہ درمیانی راستہ مذکورہ آٹھ اصول ہیں۔ جب ایک انسان ان اصولوں کو اپناتا ہے تو اس کو چار مراحل میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلا مرحلہ، جب چار ارفع اور اعلیٰ اصول تکلیف، اسباب تکلیف، انسداد تکلیف، طریقہ انسداد تکلیف معلوم ہو جاتے ہیں تو وہ فلسفہ بدھ کا پیروکار ہو جاتا ہے ان اصولوں کا علم حسب ذیل ذرائع سے ہوتا ہے۔

ا۔ نیکوں کی صحبت۔ ۲۔ مذہبی قانون کا سننا۔ ۳۔ محققانہ غور وخوض۔ ۴۔ نیکی کی مشق کرنا۔

دوسرا مرحلہ: جب انسان نفس امارہ اور غلط قسم کی دینی رسوم سے نجات حاصل کر لیتا ہے اس مرحلہ میں شہوانی جذبات اور مغالطہ کافی حد تک دور ہو جاتا ہے۔

تیسرا مرحلہ: اس مرحلہ میں دل سے دنیاوی خواہشات کی میل اور نفس پرستی، حسد، بغض کافی حد تک دور ہو جاتا ہے۔ اور شیطان کے پنجہ سے نجات حاصل کر چکتا ہے۔

چوتھا مرحلہ: یہ وہ مرحلہ ہے جب انسان کو مکمل طور پر گیان اور معرفت حاصل ہو جاتا ہے۔ طمانیت قلب کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے اور دنیا کی تمام اشیاء سے مستغنی ہو جاتا ہے۔

دوسرا گروہ دنیاداروں کا ہے۔ اس کے گروہ کے لیے چند اخلاقی نصائح دیے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ ا۔ کسی جانور کو قتل نہ کریں۔ ۲۔ نہ خود چوری کریں اور نہ کسی کو چرانے دیں۔ ۳۔ زنا کاری نہ کریں۔ ۴۔ ہر قسم کے دروغ گوئی سے اجتناب کریں۔ ۵۔ مسکرات اور نشی اشیاء کے استعمال سے خود بھی پرہیز کریں اور دوسروں کو بھی شراب نہ پلائیں۔ گوتم بدھ ان اخلاقی نصائح کے ساتھ معاشرتی فرائض بھی بیان کیے۔ جن پر ایک پیروکار کا چلنا ضروری ہے۔

گوتم بدھ کے متعلق عموماً محققین کی یہ رائے ہے کہ گوتم بدھ کے فلسفہ میں خدا فرشتوں قیامت اور حیات بعد الموت کا ذکر نہیں۔ یہ غلط ہے کہ ایک بدھ کہلانے والا خدا کے تصور سے کیسے بیگانہ ہوسکتا ہے۔ گوتم بدھ فرماتے ہیں۔ "خدا (ایسا تا) پر ایمان لاؤ۔ اور اس کی ہستی کا اقرار کرو کیونکہ وہی اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کی جائے۔ (دھوبی کا کتبہ)

فرشتوں کے متعلق عقیدہ: اشوک اپنے چھوٹے سنگی کتبہ میں لکھتا ہے "میرے مذہب میں پورے جوش وخروش سے کام کرنے کی وجہ سے میری مملکت کے طول وعرض میں وہ لوگ جو دیوتاؤں سے اپنا تعلق توڑ چکے تھے۔ دوبارہ انھوں نے دیوتاؤں سے اپنا تعلق جوڑ لیا۔ یہ سعی وکاوش اور جدوجہد کا ثمرہ ہے۔"

قیامت کے متعلق عقیدہ: اشوک قیامت کا قائل تھا۔ سنگی کتبہ چہارم میں لکھا ہے۔ "بادشاہ کے بیٹے، پوتے اور پڑپوتے بھی دھرم کی پابندی کو تا قیامت ترقی دیتے رہیں گے۔" "میری اولاد اور جانشین اگر تا قیامت میرا اتباع کریں تو وہ قابل ستائش کام کریں گے۔ لیکن جو اس فرض کا ایک جزو بھی ترک کر دے گا۔ وہ فعل قبیح کا مرتکب ہوگا (سنگی کتبہ پنجم) اشوک کا قیامت کا قائل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے یہ عقیدہ گوتم بدھ کی تعلیم سے حاصل کیا ہے گوتم بدھ کی تعلیم کا سب سے بڑا مبلغ اشوک تھا۔

سنگی کتبہ دہم میں لکھتا ہے۔ "میری جتنی مساعی ہیں وہ عقبی کے لیے وقف ہیں تا کہ لوگ قید گناہ سے آزاد ہو جائیں۔

سکھ مت

لاہور کے پاس تحصیل شرق پور کے گاؤں تلونڈی میں ۱۴۶۶ء میں مہتہ کالو چند کھتری کے گھر نانک پیدا ہوئے ان کے والدین نے پہلے ایک پنڈت سے ہندی پڑھوائی پھر ایک معلم ملا قطب الدین سے فارسی پڑھی لیکن نانک نے ابتدائی اسباق کے سوا کچھ زیادہ نہ پڑھا۔ پڑھائی کی طرف بالکل توجہ نہ دی۔ ہر وقت سوچ بچار کے سمندر میں مستغرق رہتے جب نانک کی بہن نواب دولت خان لودھی کے دیوان جے رام سے بیاہی گئی تو اس نے اپنی ذاتی کوشش سے نانک کو نواب کے خیرات خانے میں ملازم کرادیا نانک یہاں ۱۴۹۹ء تک ملازم رہے تیس سال کی عمر میں ملازمت چھوڑ دی اور تلونڈی کے ایک مسلمان مردانہ اور بھائی بالا کو ساتھ لے کر تیرتھوں، خانقاہوں اور مقدس مقامات کی زیارت کی۔ سادھوں اور صوفیوں کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ اب یہ بات تاریخی لحاظ سے ثابت کی جا چکی ہے کہ بابا گرو نانک صاحب دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے اور اسلام کے دیگر ارکان کے علاوہ حج بھی کیا۔ گورو بابا نانک صاحب کے مسلمان ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ان کا چولا ہے جس پر قرآن مجید کی آیات لکھی ہوئی ہیں۔

سکھ مت کے مقدس صحائف "گرنتھ" تعداد میں دو ہیں۔ ایک پانچویں گرو ارجن دیو نے مرتب کیا اور دوسرا گرو گوبند سنگھ نے۔ گرنتھ کو بالعموم آدی گرنتھ کہتے ہیں۔ گورو بابا نانک کی تعلیمات ادی گرنتھ میں شامل ہیں۔ گورو بابا نانک صاحب توحید، رسالت محمدی کے قائل تھے۔ قرآن مجید کو ہدایت کا سرچشمہ قرار دیتے تھے۔ پنج وقت نماز گزار تھے۔

اسلام کے بعد دنیا کے جتنے مذاہب ہیں۔ ان میں سکھ مت ہی توحید کا قائل ہے۔ کسی مذہب میں تثلیث ہے کسی میں ثنویت اور کسی میں مظاہر پرستی ہے۔
گورو بابا نانک صاحب امن، اخوت، مساوات، رواداری کے علم بردار تھے۔

چینی مذاہب

چھٹی صدی ق۔م تک چین مذہبی اور سماجی اعتبار سے دیوالیہ تھا اس ظلمت اور گمراہی کے دور میں تین عظیم مذہبی رہنما لاوزے (Lao-Tze) کنگ فوئزو (Kung Fuizu) اور کنفیوشس (Confucious) ہوئے ان کے مذہبی نظریات ایک دوسرے کی تردید نہیں بلکہ تکمیل تھے۔

تاؤازم: تاؤازم کے بانی لاوزے ہیں۔ ۶۰۴ ق۔م میں تشو (Tchu) کے صوبہ میں پیدا ہوئے۔ لاؤزے کے لفظی معنی ہیں "بوڑھا فلسفی" یا "بوڑھا لڑکا" وہ کافی عرصہ تک شاہی کتب خانہ کا مہتمم رہا۔ بعدازاں مستعفی ہوکر لنگ پو (Lingpo) کی پہاڑیوں میں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ لاؤزے کی منزل حکیم بننا تھا۔ جب اس منزل پر پہنچ گئے تو انھوں نے ایک چھوٹی سی کتاب "تاؤتے چنگ (Tao-te-ching)" (راستہ اور اس کی قوت) لکھی۔ جو دوحصوں پر مشتمل ہے یہ کتاب اچھی زندگی گزارنے کے لیے راہنمائی کرتی ہے۔

تاؤازم کی تعلیمات: تاؤتی چنگ (Tao-te-ching) میں اہم ترین لفظ تاؤ ہے اس کے متعدد معانی بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً خدا، آفاقی عقل کل، بے علت وجود یا علت العلل، امن کا راستہ، بولنا اور گفتگو کرنا، اصول وقانون۔

تاؤ کی صفات: اس کا وجود ہمیشہ سے ہے۔۲۔ تاؤ ہر جگہ موجود ہے۔۳۔ تاؤ کی ذات سے تمام کائنات کی عظمت اور شان و شوکت قائم ہے۔۴۔ چاند اور سورج اپنے مدار پر اس وجہ سے گھومتے ہیں ننھے ننھے کیڑوں کو زندگی بخشنے والا ہے۔۵۔ تاؤ کا جسم نہیں وہ ایک لطیف چیز ہے۔۶۔ تاؤ غیر متحرک ہے۔ بایں ہمہ تمام کا خالق اور رازق ہے۔۷۔ وہ ناقابل تقسیم ہے۔

لاؤزے کے نزدیک سب سے بہترین وہ شخص ہے جو بنی آدم سے محبت کرے اور کسی سے نفرت نہ کرے۔

لاؤزے سفلی خواہشات اور جذبات پر غلبہ پانے پر بہت زور دیتا ہے۔

لاؤزے حیات بعد الممات کا قائل ہے وہ اس کو خوشگوار تبدیلی قرار دیتا ہے۔

کہتا ہے ''موت ہر ذی حیات پر لازمی آئے گی اس وجہ سے اس سے ڈرنا نہیں چاہیے۔'' (دنیا کا مذہبی نظام ص ۸۱)

کنفیوشس ازم: کنفیوشس کا اصل نام کنگ چن تھا۔ اس کی پیدائش موضع کوفو (Chufu) سلطنت موجودہ صوبہ Shanlung ۵۵۱ ق۔م میں ہوئی۔ باپ کا نام شیولیان تھا جو ایک ضلع کا حاکم تھا۔ کنفیوشس بڑھاپے کی اولاد تھا۔ تین سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ انیس سال کی عمر میں شادی کی۔ جس سے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ چار سال بعد بیوی کو طلاق دے دی۔ سب سے پہلے حکومت کے مال خانہ میں ملازمت کی۔ ایک سال کے اندر ہی اپنی کارکردگی کی بناء پر زراعت اور جانوروں کے چراہوں کا نگران مقرر کر دیا گیا۔ دوران ملازمت تاریخ ادب، شاعری اور سیاست کے متعلق خوب مطالعہ کیا۔ جب ستائیس سال کا ہوا تو والدہ کا انتقال ہو گیا اور ملازمت سے استعفیٰ دے کر تعلیم و تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا اور جلد ہی اپنی زاد بوم لیو (Lu) میں ہزاروں شاگردوں کا ہادی بن گیا۔ اس کی تعلیم اور رشد و ہدایت کا اتنا چرچا ہو گیا کہ صوبہ ''لو'' کے وزیر اعظم نے بستر مرگ پر اپنے بیٹے کو وصیت کی تھی کہ وہ کنفیوشس سے تعلیم حاصل کرے۔

اس زمانہ میں ریاست کے تین مقتدر خاندانوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ انجام کار وہ امیر جس کی ملازمت میں کنفیوش تھا شہر بدر کر دیا گیا۔ کنفیوشس اس کے ساتھ قریبی صوبے ٹسی (Tsi) میں چلا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ واپس لو (Lu) میں آ گیا۔ ۵۱ سال کی عمر میں شہر چنگ ٹو (Chung To) کا قاضی بنا دیا گیا۔ نہایت دیانت داری سے کام کیا۔ حاسدوں کی وجہ سے امیر اور کنفیوشس کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ کنفیوشس کو تمام اختیارات سے محروم کر کے شہر بدر کر دیا گیا۔ ۴۹۰ ق۔م میں سرگردانی کا دور شروع ہوا۔ غریب الوطنی میں زندگی بسر کی۔ اکثر اسے اپنی جان کا خطرہ درپیش رہا۔ جب ڈیوک گائی (GAE) لو (Lu) کی حکومت پر قابض ہوا تو اس نے ۴۸۳ ق۔م میں کنفیوشس کو اپنے شہر میں واپس بلا لیا۔ اصلاح اور تعلیم کا سلسلہ از سر نو شروع کیا۔ ۴۷۸ ق۔م میں وفات پائی۔

کتب: کنفیوشس ازم کی متعدد کتب ہیں۔ ان میں سے لن یو (Lunyu) یعنی اینلکٹس (Analects) اہم ترین ہے۔ ایک اور کتاب کنفیوشس کی طرف منسوب ہوتی ہے یہ انتساب محل نظر ہے اس کا نام علم عظیم (Great learning) ایک اور کتب بنام تعلیم آدمی (Doctrine to the men) کنفیوشس کے پوتے ٹسز (Tsesze) کے نام سے منسوب ہے لیکن حقیقتاً وہ لی چی (Li-chi) اور مین شش (Mencious) کی کتابوں کا اکتیسواں باب ہے ان کے علاوہ پانچ اور اہم کتابیں ہیں جو قدیم روایات کے مطابق کنفیوشس کی ادارت میں لکھی گئی وہ یہ ہیں۔

شوچنگ (Shu-Ching) ۲۔ شی چنگ (Shih-Ching) ۳۔ لی چی (Li-Chi) ۴۔ یی چنگ (Yi-ching) ۵۔ چون چن (Ch'un-Chin)

تعلیمات

اللہ تعالیٰ کے متعلق نظریہ: کنفیوشس کا قول ہے ''پندرہ سال کی عمر میں مجھے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ تیس سال کی عمر میں مجھے کردار کی پختگی حاصل ہو گئی۔ چالیس سال کی عمر تک سب ذہنی الجھنوں پر غلبہ پا لیا اور پچاس سال کی عمر میں خدا کا عرفان حاصل کر لیا (اینلیکٹس) (Analects) چینی زبان کے دو الفاظ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ہستی کے تصور کو ظاہر کرتے ہیں شنگٹی (Shangti) یعنی حاکم مطلق اور ٹی ین (T-ien) یعنی آسمان، کنفیوشس نے اپنی تقریروں میں ٹی ین کے لفظ کو استعمال کیا ہے۔ ٹی ین خدا کی پروردگاری اور لامحدودیت پر دلالت کرتا ہے اینلیکٹس سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ کنفیوشس نے ایسے زمانے میں خدائے واحد کا نام سربلند کیا جب کہ چین میں فطری مظاہر، ارواح خبیثہ اور باپ دادوں کی ارواح کی پرستش کا رواج تھا۔

اخلاقیات: کنفیوشس نے اخلاقیات پر بہت زور دیا ہے وہ کہتا ہے کہ سارے اعمال کا دار و مدار خلوص نیت پر ہے اور بلند کردار آدمی کی یہ نشانی ہے کہ اس کے قول و عمل میں مطابقت ہوتی ہے۔

کنفیوشس نے انسان کے پانچ اہم بنیادی تعلقات پر زور دیا ہے جو روایتی طور پر پہلے سے ہی چین میں موجود تھے۔

۱۔ بادشاہ اور رعایا۔ ۲۔ باپ اور بیٹا۔ ۳۔ بڑا اور چھوٹا بھائی۔ ۴۔ میاں بیوی۔ ۵۔ دوست دوست۔

کنفیوشس نے نظام سلطنت کے متعلق حسب ذیل اصول بتائے ہیں۔

۱۔ بادشاہ خود اپنے عمل سے رعایا کے لیے اچھی مثالیں قائم کرے۔ ۲۔ حکومت بغیر عوام الناس کی حمایت کے قائم نہیں رہ سکتی۔ ۳۔ حکمران طبقہ اور رعایا اپنے اپنے فرائض خلوص سے سرانجام دیں۔ ۵۔ عوام سے ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے جو خود اپنے لیے پسند نہ کریں۔ ۶۔ عہدوں پر ایماندار اور دیانت دار آدمیوں کو مقرر کیا جائے۔

سلطنت درست کرنے کا طریقہ: قدماء جب چاہتے تھے کہ ساری سلطنت میں نیکی پھیل جائے تو سب سے پہلے اپنی ریاست کو درست کرتے تھے۔ ریاست کو درست کرنے سے پہلے اپنے خاندان کو درست کرتے تھے۔ خاندان کو درست کرنے سے پہلے وہ خود اپنے تئیں درست کرتے تھے۔ اپنے تئیں درست کرنے سے پہلے وہ اپنے دلوں کو درست کرتے تھے۔ اپنے دلوں کو درست کرنے کے لیے وہ اپنے خیالات میں خلوص پیدا کرتے تھے۔ اپنے خیالات میں خلوص پیدا کرنے سے پہلے وہ اپنا علم بڑھاتے تھے اور اشیاء کے علم بڑھانے کے لیے اشیاء کی ماہیت کی تحقیقات میں مصروف ہو جاتے تھے۔

جب اشیاء کی ماہیت معلوم ہوگئی تو پھر علم مکمل ہو جاتا ہے۔ جب علم مکمل ہو جاتا ہے تو ان کے خیالات میں خلوص پیدا ہو جاتا ہے۔ خیالات کے بعد دل میں بھی خلوص آ جاتا ہے اور جب دل درست ہو جاتے ہیں تو خود وہ درست ہو جاتے ہیں۔ جب وہ درست ہو جاتے ہیں تو ان کا خاندان درست ہو جاتا ہے جب ان کے خاندان درست ہو جاتے ہیں تو ان کی ریاست درست ہو جاتی ہے اور جب ریاستیں درست ہوئیں تو ساری سلطنت درست ہو جاتی ہے۔ (فلسفہ اسلام مصنفہ آغا محمد سلطان مرزا دہلوی ۱۵۲)

ان دو پیراگراف میں کنفیوشس کے تمام فلسفہ کا نچوڑ آ جاتا ہے۔

جاپان کا مذہب شنٹوازم (Shintoism)

لفظ شنٹو چینی زبان کے دو لفظوں شن اور ٹو سے مرکب ہے جن کا مطلب ہے دیوتاؤں کا ڈھنگ یا طور و اطوار۔

شنٹوازم کی خصوصیات: شنٹوازم کثرت پرستی، مظاہر پرستی، اباء پرستی، شاہ پرستی اور ہیرو پرستی کا مذہب ہے۔

پانچویں صدی عیسوی قبل جاپان میں تحریر کا رواج نہ تھا۔ اس لیے شنٹوازم زبانی روایات پر مبنی تھا۔ آٹھویں صدی میں ان روایات کو جمع کیا گیا۔ دو کتابیں یاسو مارو (Yasu Maro) نے دو ضخیم جلدوں میں تالیف کیں۔ ایک کا نام ''کوجی کی'' (Kojiki) یعنی قدیم حالات کی کہانی، اور دوسری کا نام ''نی ہوں گی'' (Nihongi) ہے یعنی تاریخ جاپان۔

ان کے ہاں خدا کے لیے لفظ کامی (Kami) ہے۔ لیکن ان کتابوں میں ان تمام چیزوں کو کامی کہا گیا ہے جن کی وہ پوجا کرتے ہیں۔

تعلیمات: جاپان میں کثرت پرستی کے دور میں بعض ایسے مفکر پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے اس کثرت کے پس پشت ایک قوت واحدہ کے وجود پر زور دیا چنانچہ شنٹو مصنف ازاوانا گاہڈے (Izawa-Naa Ghede) کہتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ بیک وقت آٹھ سو کروڑ دیوتا ہونے کے باوجود ایک ہی ہے۔ یہی زمین و آسمان کا عظیم ترین اصل ہے۔ کائنات کی تمام اشیاء اسی ایک ذات میں موجود ہیں۔ شرائی ساون (Shirai Soin) رقمطراز ہے ''باری تعالیٰ ہی قادر مطلق ہے۔ یہ انسانی الفاظ سے ماوراء ہے۔ یہ فہم سے بالاتر ہونے کے باوجود ہر شے میں جاری ساری ہے جہاں تک شنٹو اخلاقیات کا تعلق ہے۔ یہ خلوص خود ایثاری، روح و بدن کی پاکیزگی اور صفائی پر زور دیتا ہے۔ یہ پاکیزگی جسمانی طہارت کے علاوہ خود تمام تر اچھائی کی علامت ہے نیکی پاکیزگی ہے اور بدی ناپاکی ہے۔ دیوتا بداعمالی ہے۔ اس کی ناپاکی کے باعث متنفر ہیں۔

شنٹوازم میں اباؤ اجداد کی جانب سے عائد کردہ فرائض انجام دینے ریاست کے احکامات پر عمل کرنے، اپنے کام میں سستی نہ کرنے دوسرے شخص کے غصے میں آنے پر بھی غصے میں آنے اپنی شخصیت کے حدود جاننے اور دنیا کو ایک بڑا خاندان قرار دینے پر زور دیا گیا ہے۔

زرتشت (ایرانی مذہب)

ایرانی مذہب: زرتشت کے زمانہ کے بارنے میں محققین کا شدید اختلاف ہے زمانہ حال کے بعض محققین کی رائے کے مطابق وہ ۶۶۰ ق۔م میں پیدا ہوئے

اور ۵۸۳ ق۔م میں انتقال کیا۔ مغربی ایران کے رہنے والے تھے۔ ان کی جائے پیدائش شہر رے ہے۔ ان کے والد کا نام پورا اشاسپ تھا۔ خاندان سپتم میں سے تھے۔ قوم کے مجوسی تھے۔ فارسی میں اس کو مغ کہتے ہیں۔ جس کے معنی جادوگر کے ہیں۔ زرتشت نے اپنے زمانہ کے مشہور استاد حکیم بزاکرزا سے تعلیم حاصل کی۔ حصول علم کے بعد اپنے آپ کو مفلوک الحال لوگوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ بیس سال کی عمر میں گھربار کو خیرباد کہہ کر سیالان پہاڑ میں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ تیس سال کی عمر میں گوہر مطلوب نصیب ہوا۔ تو پھر عوام کی طرف لوٹے۔ کئی سالوں تک عوام نے ان کی آواز پر کان نہ دھرا۔ پھر بلخ کے بادشاہ گشتاسپ سے ملنے گئے۔ ان کو توحید کا پیغام دیا۔ بادشاہ کے درباری علماء سے مناظرہ کیا۔ تین دن اور تین رات جاری رہا۔ آخرکار بادشاہ نے زرتشت کی تعلیم کو قبول کر لیا۔ اس کے بعد یہ مذہب تیزی سے ترقی کرنے لگا۔

کتب: قدیم ایرانیوں کی مذہبی کتب میں دو دفتر اہم ہیں۔ ایک دساتیر اور دوسرے ژندواوستا۔ ان کتب کے دو دو حصے ہیں۔ خوردہ دساتیر اور کلاں دساتیر۔ ۲۔ خوردہ اوستا اور کلاں اوستا۔ اوستا کے پانچ حصے ہیں۔ یاسنا، گاتھا، وسپرو، دیندیداد، یاشت، ان میں سے پہلے دو حصے خاص طور پر اہم ہیں۔ پہلا عبادت، یا قربانی سے متعلق ہے دوسرا حمد و مناجات الٰہی دو کو ژند اور مہاژند بھی کہتے ہیں۔

تعلیم: زرتشت پکا موحد تھا۔ ان کے خدا کا نام اہورمزد تھا۔ اہور کے معنی مالک اور مزد کے معنی دانش یا روشنی کے ہیں گویا وہ خدا نور ہے۔

یاسنا میں خدا کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔ وہ تمام چیزوں کا خالق ہے (۴۵/۶) اس نے پانی درخت اور کل چیزوں کو پیدا کیا۔ (۵۱/۷) وہ تمام عالم کا پیدا کرنے والا۔ ۵۰/۱۱) وہ انسانی ارواح کا خالق ہے۔ (۳۱/۱۱) اس کے قبل کچھ بھی نہ تھا۔ (۲۸/۵) وہ بزرگ ترین ہستی ہے۔ (۴۴/۷) وہ بہترین ہے۔ (۲۶/۸) وہ غیر متغیر ہے۔ (۳۱/۷) وہ رحیم ہے۔ (۲۸/۵) وہ پاکیزہ ترین ہستی ہے۔ (۴۴/۷) وہ پاکیزگی کا منبع ہے۔ (۴۳/۳) وہ خود مختار ہے۔ (۴۳/۱) وہ تمام ہستیوں کا مالک ہے۔ (۲۸/۷) وہ عاقل ہے۔ (۲۹/۶) وہ سب کچھ جانتا ہے۔ (۴۶/۱۹) وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ (۳۳/۱۳) وہ تمام رازوں کو جاننے والا ہے۔ (۳۳/۱۳) وہ کل بالوں سے واقف ہے۔ (۳۱/۵)

ثنویت: یہ تو واضح ہے کہ زرتشت ایک موحد شخص تھا اور انہی نے توحید کا پرچار کیا لیکن بعض محقق اس کی طرف ثنویت (دو خداؤں کا تصور) منسوب کرتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے ہر مذہب میں مرور زمانہ سے نظریات اور عقائد میں ملونی ہوتی رہی ہے۔ ورنہ ہر مصلح اور نبی نے توحید کا ہی درس دیا ہے۔ زرتشت کی طرف ثنویت منسوب کرنا غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ ہر مذہب میں دو قوتوں یا دو سرچشموں کا ذکر ہے۔ خیر کا سرچشمہ (خیر کی قوت) شر کا سرچشمہ (شر کی قوت) اسلام نے ان دونوں سرچشموں یا قوتوں کا نام ملائکہ اور شیطان (ابلیس) رکھا ہے۔ فرشتے نیکی کا سرچشمہ ہیں اور شیطان شر کا سرچشمہ۔ زرتشت نے ان قوتوں کو اہور مزدا اور اہرمن بالترتیب نور اور ظلمت کا نام دیا ہے۔ یعنی انسان کی نیکیاں اہور مزدا کی تخلیق ہیں اور برائیاں اہرمن کی۔ گویا فرشتہ اور شیطان زرتشت کی اصطلاح میں اہور مزدا اور اہرمن ہیں۔ زرتشت نے یہ بھی بتایا ہے کہ اہور مزدا کی پیروی سے جنت حاصل ہوگی اور اہرمن کے اتباع سے جہنم، یزداں کی پیروی کے اخلاقی تعلیم کے تین اصول ہیں۔ نیک خیالات، نیک اقوال اور نیک افعال۔ بالآخر نیکی (حق) کی جیت ہوگی اور شر (باطل) کو شکست ہوگی۔

اخلاقی تعلیم: افکار کی پاکیزگی، زرتشت نے افکار کی پاکیزگی پر بہت زور دیا ہے کیونکہ انسانی اعمال افکار اور خیالات کے تابع ہوتے ہیں۔ اگر انسان کے افکار میں پاکیزگی آ جائے تو اعمال میں درستی خود بخود آ جاتی ہے۔

راستی: زرتشت کی اخلاقی تعلیم میں راستی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

صفائی: زرتشت نے صفائی پاکیزگی کو بہت اہمیت دی ہے اوستا میں پاکیزگی اور صفائی کو وسیع معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جو جسمانی صفائی کے علاوہ اقوال اور اعمال کی پاکیزگی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔

خیرات: زرتشت نے مالی امداد (خیرات) پر بہت زور دیا ہے۔ ان کا قول ہے "جو شخص مالدار ہو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے فاضل مال کے ذریعے دوسروں کی مدد کرے اور اعلیٰ تعلقات کے قیام کے لیے عمدہ کام انجام دے۔

محنت: زرتشت محنت اور کوشش کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

زرتشت رہبانیت کا شدید مخالف ہے اور شادی کو ضروری قرار دیتا تھا۔

مانوی مذہب

مانی طیغون کے شہر ۲۱۵ء میں پیدا ہوا۔ اس کے والد کا نام فتق تھا جو یہودی مراقہ مغتسلہ کا پیروکار تھا۔ ابن ندیم کی روایت کے مطابق ۱۲ سال کی عمر میں (۲۲۸/۹ عیسوی) پہلی وحی ہوئی۔ بقول مانی یہ وحی ملک جنان النور یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی۔ وحی لانے والے فرشتے کا نام ''التوم'' تھا جس کے لفظی معنی ''قرین'' ہیں پہلی وحی کے ذریعے مندرجہ ذیل مقالات دیے گئے۔ ۱۔ آج سے تم اپنی قوم سے علیحدہ ہو جاؤ۔ ۲۔ ان سے ایک طرف ہو جاؤ۔ ۳۔ پاکیزہ روی اختیار کرو۔ ۴۔ شہوات ترک کردو۔ ۵۔ جب تک تم کم سن ہو اس وقت تک نہ اپنے مذہب کا اظہار کرو اور نہ تبلیغ۔

پہلی وحی کے آنے کے ۱۲ سال بعد یعنی ۲۴۰/۱ء میں جب ان کی عمر ۲۴ سال تھی مانی کو دوسری وحی ہوئی۔ اس دفعہ یہ حکم ہوا ''دیکھو وقت آ گیا ہے کہ اپنے مذہب کا اظہار کرتے ہوئے تبلیغ شروع کر دی جائے۔'' فرشتے نے مانی سے یہ بھی کہا۔ ''اے مانی میں اپنی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو سلام کہتا ہوں آپ کو اس راہ میں بے حد مشقت برداشت کرنا پڑے گی۔''

اثار الباقیہ میں بیرونی نے مانی کی کتاب شاہ پورگاں سے مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے۔ مختلف زمانوں میں خدا کے نبی انسانوں کو حکمت اور نیک اعمال کی تلقین کرتے آئے ہیں۔ ایک زمانہ میں بدھ نے ہندوستان میں یہ پیغام دیا دوسرے زمانے میں زرتشت نے ایران میں عیسیٰ نے مغربی علاقے میں اس آخری زمانے میں وحی اور خدمت میرے (مانی کے) ذریعے بابل کے شہر میں نازل ہوئی۔ مانی نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی جس کی تبلیغ اس نے شاہپور اول کے عہد سے ۲۴۰ء میں شروع کی۔ شاہپور کے مانی کے ساتھ تعلقات بہت اچھے تھے اور شاہپور کا بھائی مانی کا مربی تھا لیکن ایرانی کاہنوں اور زرتشتیوں نے شدید مخالفت کی اس کے نتیجہ میں ملک چھوڑنا پڑا اس نے وسط ایشیا، چین اور ہندوستان کا سفر اختیار کیا۔ پھر ترکستان آیا یہاں اس نے ایک سنسان وادی میں خلوت اختیار کی۔ اور ایک کتاب ''ارژنگ یا ارتنگ'' تیار کر لی۔ اس کتاب کو لے کر ایران آیا۔ اب اسے نمایاں کامیابی ہوئی۔ شاہ پور کی وفات کے بعد (۲۷۲ء) اس کا لڑکا ہرمز د اول تخت نشین ہوا اس نے مانی سے متعلق اپنے باپ کی پالیسی اختیار کی۔ وہ ۲۷۳ء میں فوت ہو گیا۔ ہرمزد کی وفات کے بعد بہرام اول تخت نشین ہوا۔ بہرام نے مانی اور اس کے متبعین پر سختیاں کرنا شروع کر دیں۔ مانی نے وطن سے بھاگ جانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ ۲۷۷ء میں مانی کو گرفتار کر کے بہرام کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے اس کی کھال کھنچوا کر بھس کر دیا۔ مانی کی کھال کا پتلا ایک عرصہ تک شہر شاہ پور کے پھاٹک پر عبرت کے لیے رکھ دیا۔

مانی کی سات تصنیفات ہیں چھ سریانی زبان میں اور ایک پہلوی میں آخری کا نام شاہ پورگان ہے جو شاہ پور سے معنون ہے۔ یہ کتاب بادشاہ شاہ پور کے لیے تصنیف کی گئی تھی۔ ۱۹۰۴ء میں قان می کاق محقق نے طرفان (وسط ایشیا) سے بعض مانوی صحائف برآمد کیے یہ ایک خاص خط میں لکھے ہیں۔ جو اپنے موجد کے نام پر مانوی کہلاتا ہے۔

مانی کی طرف بھی ثنویت (دو خدا) منسوب کی گئی ہے۔ خالق خیر اور خالق شر۔ یہ منسوب کرنے والوں کی کم فہمی کا نتیجہ ہے اور اس کے نزدیک دو ازلی اور ابدی عناصر ہیں۔ یعنی نور اور ظلمت۔ دونوں دست و گریباں ہیں۔ ظلمت کے حملے سے بچنے کے لیے مجاہدہ، عبادت اور ریاضت ضروری ہے۔

دس احکام: مانی کے دس احکام ہیں۔ ۱۔ بت پرستی۔ ۲۔ جھوٹ۔ ۳۔ لالچ۔ ۴۔ قتل وخون۔ ۵۔ زنا۔ ۶۔ جادو یا اس طرح کے منتر جنتر۔ ۸۔ مذہب کے متعلق شکوک و شبہات کا شکار ہونے۔ ۹۔ کاروبار میں سستی اور بے پروائی سے پرہیز اور اجتناب۔ ۱۰۔ دن میں چار (یا سات) دفعہ نماز ادا کی جائے۔ ابن ندیم نے مانویوں کی نماز کے چند الفاظ نقل کیے ہیں۔

۱۔ ہمارا ہادی نور کا سفیر مبارک ہے اس کے محافظ فرشتے مبارک ہیں اس کے منور ملائکہ کی مدح ہو۔
۲۔ مانی، اے منور ہستی تو قابل ستائش ہے۔ ہمارے ہادی، نور کے سرچشمے، حیات کی شاخ، اے شجر عظیم جو کہ سراپا شفا ہے۔
۳۔ میں سربسجود ہوتا ہوں کہ حمد کرتا ہوں کل دیوتاؤں کی نورانی فرشتوں کی کل تجلیات کی سب ملائکہ کی جن کا منبع خداوند تعالیٰ ہے۔
۴۔ میں سر جھکاتا ہوں اور مدح کرتا ہوں گروہ ملائکہ کی اور منور دیوتاؤں کی جنھوں نے اپنی دانش سے تاریکی میں نفوذ کر کے اسے زیر کیا اور دفع کیا۔
۵۔ میں سجدہ کرتا ہوں اور تمجید کرتا ہوں رب ذوالجلال کی۔ ہستی عظیم اور سراپا نور کی۔ (خدا اور تصور خدا تاریخ مذاہب کی روشنی میں از علامہ نیاز فتح پوری ص ۱۷۱)

کام میں سستی نہ کرنے، دوسروں کے غصے میں آنے پر غصے میں نہ آنے اپنی شخصیت کے حدود جاننے اور دنیا کو ایک بہت بڑا خاندان قرار دینے پر زور دیا گیا ہے۔

یہودیت

یہود کی وجہ تسمیہ عہد نامہ عتیق کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے۔ اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام، اسحاق کے دو بیٹے تھے جن میں سے بڑے کا نام عیسو تھا جو اسماعیل کا داماد تھا۔ چھوٹے کا نام یعقوب تھا۔ انہی کا دوسرا نام اسرائیل تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل اسرائیل کے نام پر بنی اسرائیل علیہ السلام کہلائی۔ اسرائیل کے بارہ بیٹے تھے جن میں سے بڑے کا نام یہود اور سب سے چھوٹے کا نام بن یامین تھا۔ ملک فلسطین کے ایک حصے کا نام یہودیہ تھا۔ جہاں یہودا اور بن یامین کی نسل آباد ہوئی۔ اس لیے اس علاقہ کے رہنے والے یہود کہلائے۔ تمام یہود نسلی لحاظ سے بنی اسرائیل ہیں۔ لیکن تمام بنی اسرائیل یہود نہیں۔ گو بعد کے زمانہ میں یہود اور بنی اسرائیل ہم معنی الفاظ استعمال ہونے لگے عرف عام میں بنی اسرائیل کو یہود سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ کوئی ۱۵۰۰ ق۔م بتاتا ہے اور کوئی ۱۰۰۰ ق۔م حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نسب چند واسطوں سے حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد کا نام عمران اور والدہ کا نام یوکابد پر تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ایسے وقت میں ہوئی جب رعمسیس ثانی فرعون مصر تھا جو بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کر دیتا تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کے والدین سخت پریشان ہوئے اس پریشانی کے وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کے دل میں القا کیا کہ ایک تابوت بنا کر اس بچہ کو اس میں رکھ کر دریا میں ڈال دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ہدایت خداوندی کے تحت ایسا ہی کیا۔ صندوق تیرتا ہوا شاہی محل کے کنارے آ لگا۔ فرعون کے گھرانے کے آدمیوں نے اس صندوق کو کنارہ سے اٹھا لیا اور بچہ کو محل میں لے گئے فرعون نے بچہ کو قتل کرنا چاہا لیکن فرعون کی بیوی نے کہا کہ بچے کو قتل نہ کرو یہ بچہ میرے اور تیرے لیے آنکھ کی ٹھنڈک ہے۔ بچہ کسی عورت کا دودھ نہیں پیتا تھا۔ چنانچہ موسیٰ کی ہمشیرہ جو صندوق کے پیچھے پیچھے گئی تھی اس نے آل فرعون کو یہ کہا کہ میں تمہیں ایک ایسی دایہ کا پتہ بتاتی ہوں جو اس بچہ کی خدمت کے لیے نہایت ہی موزوں ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی والدہ کی نشان دہی کی اور اجازت چاہی کہ وہ اس کو لے آئے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیرہ گھر آئیں اور والدہ کو لے گئیں۔ اس طرح بچہ اپنی والدہ کی آغوش تربیت میں آ گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گو شاہی محل میں پرورش پائی لیکن ان کی بیدار آنکھیں جو بنی اسرائیل پر ظلم وستم ہو رہے تھے۔ دیکھ رہی تھیں۔ چنانچہ ایک دفعہ کسی راستہ پر جا رہا تھا ایک مصری ایک اسرائیلی کو زدوکوب کر رہا تھا۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدد کے لیے بلایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام مدد کے لیے آگے بڑھے اور مصری کو منہ پر طمانچہ مارا۔ مصری اس ضرب سے جان بحق ہو گیا۔ حسن اتفاق سے اگلے دن اسی راستہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام جا رہے تھے کیا دیکھتے ہیں کہ وہی اسرائیلی کسی قبطی سے جھگڑ رہا ہے اور قبطی غالب ہے اسرائیلی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر مدد کے لیے بلایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھے اور مصری کو اس کے ظلم سے باز رہنے کو کہا اور دوسری جانب اسرائیلی کو بھی جھڑکا۔ مصری نے شور مچانا شروع کر دیا کہ کل تم نے ایک شخص کو قتل کیا تھا۔ آج مجھے قتل کرنا چاہتے ہو اس سے حکام کو خبر ہو گئی۔ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا کسی آدمی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکام کے فیصلہ کی خبر دے دی چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھاگ کر مدین چلے گئے۔ جب موسیٰ علیہ السلام مدین پہنچے تو ایک کنویں پر لوگ اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے دو عورتیں بھی تھیں جو اپنی بکریوں کو روکے رکھی تھیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا ہم اس وقت تک پانی نہیں پلا سکتیں جب تک تمام چرواہے اپنے جانوروں کو پانی نہ پلا لیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا کچھ عرصہ کے بعد ایک لڑکی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی اور کہا کہ اس کا باپ بلا رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام شیخ کبیر کے پاس گئے۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جانوروں کو چرانے اور پانی پلانے کے لیے اس شرط پر ملازم رکھ لیا کہ اگر وہ آٹھ سال تک کام کرتا رہے گا تو وہ اپنی لڑکی کی شادی تم سے کر دے گا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شیخ کبیر کی درخواست قبول کر لی۔ اس کے بعد مقررہ مدت ختم ہونے پر اپنی لڑکی کی شادی کر دی۔ شادی کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی کے ساتھ مصر کی طرف روانہ ہو پڑے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر جا رہے تھے تو راستہ میں اللہ تعالیٰ نے خلعت نبوت سے نوازا اور بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ استبداد سے نجات دلانے کا حکم دیا۔ چنانچہ حکم خداوندی کے تحت حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس گئے۔ ایک خدا ماننے کی دعوت دی اور بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دینے کے لیے کہا۔ دربار میں ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کے علماء کے ساتھ مناظرے مباحثے ہوتے رہے جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام غالب رہے۔ آخرکار خدا کے حکم سے ایک رات حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکل پڑے جب فرعون کو علم ہوا تو لشکر لے کر ان کے پیچھے چل پڑا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم بنی اسرائیل کو لے کر بحرہ قلزم کے کنارے پہنچے تو کنارہ سے پانی ہٹا ہوا تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس خشک راستہ پر چل دیے اور بحرہ قلزم عبور کر گئے جب فرعون نے بھی تعاقب میں وہی راستہ اختیار کیا تو پانی چڑھ آیا۔ اور فرعون اور ان کا لشکر غرق ہو گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات زندگی سے اللہ تعالیٰ کی ایک سنت کا پتہ چلتا ہے وہ یہ ہے کہ جب کسی ظالم کے ظلم کی انتہا آخری حد تک پہنچ جاتی ہے تو اس کے زوال اور بربادی کی ساعت قریب آجاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مظلوم کی مظلومیت کی تاریک رات سے نجات کا اجالا ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ دنیا کی قوموں کے عروج وزوال میں یہی سنت کام کرتی نظر آرہی ہے۔

موجود دور میں اسی سنت کی روشنی میں مقتدر ملکوں کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ مقتدر ملک اپنے ظلم وستم کی انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے مظلوم بے بس نظر آتے ہیں اور ہر حریت پسند ملک اور اشخاص کو عبرت کا نشان بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ حکم عدولی کرنے والے ملک کو پتھر کے دور کی یادگار بنانے کی تہدید سناتے ہیں۔ اب کوئی نجات دہندہ پیدا ہونے والا ہے جو مظلوم اقوام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرے گا اور ظالموں کی طاقت پر ایسی ضرب موسوی لگائے گا جو ان کی تباہی اور زوال پر منتج ہوگی۔ اور ان کی طاقت کا بیڑہ بحرہ قلزم میں غرق کر دے گا۔

کتب: بائبل دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصے کا نام عہد نامہ عتیق ہے اور دوسرے کا نام عہد نامہ جدید۔ یہودی لوگ عہد نامہ عتیق کو مانتے ہیں مگر عیسائی عہد نامہ جدید کو مانتے ہیں۔ عہد نامہ عتیق کے دو نسخے ہیں ایک عبرانی زبان میں مسورہ (یعنی روایتی نسخہ) کہلاتا ہے دوسرا یونانی نسخہ جسے نسخہ سبعیتہ کہا جاتا ہے۔ یہودی لوگ عبرانی نسخہ کو مستند تسلیم کرتے ہیں۔ عیسائی یونانی نسخہ کو مانتے ہیں۔ اصل یونانی نسخہ میں ۱۹ کتابیں مسورہ سے زائد ہیں جو رومی اور یونانی کلیسا میں پڑھی جاتی ہیں مگر پروٹسٹنٹ نے انھیں بائبل سے خارج کر دیا ہے۔ (ہسٹری آف دی انگلش بائبل ص ۱۳)

عبرانی نسخہ (مسورہ) تین حصوں پر مشتمل ہے۔ ۱۔ تورات۔ ۲۔ عیم۔ ۳۔ کتیم۔

عہد نامہ عتیق: اس میں ۳۹ کتب ہیں۔

۱۔ تورات: اس میں پانچ کتابیں ہیں جنھیں کتب موسیٰ کہا جاتا ہے۔ پیدائش، خروج، احبار، گنتی، استثناء بعض کے نزدیک چھٹی کتاب یعنی یشوع بھی توراۃ میں شامل ہے)

۲۔ پرانے انبیاء کی کتب: اس حصہ میں چھ کتب شامل ہیں یعنی یشوع، قاضیوں، ایک سموئیل دو سموئیل ایک سلاطین اور دو سلاطین۔

۳۔ متبرک تحریرات: اس میں تیرہ کتب ہیں۔ روتھ، ایک تواریخ، دو تواریخ، عزرا، نحمیاہ، استر، ایوب، زبور، امثال، سلیمان کی کتاب غزلیات سلیمان، نوحہ برمیاہ اور دانیال۔

۴۔ بعد کے انبیاء کی کتب: تین ہیں یعنی یسعیاہ، یرمیاہ اور حزقیل کی کتب

۵۔ چھوٹے انبیاء کی کتب: اس فہرست میں بارہ کتب ہیں۔ ہوسیا، جول، آموس، عبیدیا، یونس، میکاہ، نحوم، حبقوق، صفنیہ، ہگائی، ذکریا اور ملا کی کتاب پس عہد نامہ عتیق کی مسلمہ کتب ۳۹ ہیں ان کے علاوہ چودہ کتب اور ہیں جو صرف یونانی عہد نامہ میں شامل ہیں جن کو خفیہ تحریرات کہتے ہیں۔

تورات کی تدوین اور اس پر آسمانی بلائیں: تمام مسیحی علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ توریت پندرہ سو برس قبل مسیح لکھی گئی۔ پہلے وہ ایک جلد میں مدون ہوئی لیکن مسیحی علماء کے نزدیک جب بہتر علماء نے ۲۸۴ ق۔م میں توریت کو عبرانی زبان سے یونانی زبان میں نقل کیا تو اس ایک کتاب کو پانچ مختلف کتابوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پیدائش خروج، احبار، گنتی، استثناء، باب اور آیات کی تفصیل ۱۲۴۰ء میں کارڈنل ہوگو نے کی۔ یہ تقسیم ناقص ہے کیونکہ کہیں کہیں معانی کے لحاظ سے اس تفصیل میں باہمی ربط کا فقدان نظر آتا ہے۔

پہلی بربادی: مسیحی علماء کے نزدیک توریت کی پہلی گمشدگی ۶۹۸ قبل مسیح بادشاہ یہودیہ کے عہد میں ہوئی۔ تقریباً ۷۵ برس گمشدگی کے بعد ۶۲۴ ق۔م بادشاہ یوسیاہ کے عہد میں کاہنوں کے سردار خلقیاہ نے اعلان کیا کہ اس نے ہیکل یروشلم میں توریت پائی ہے جس پر وقت کے بادشاہ نے اس کتاب کو پڑھوایا تو گھبرا کر اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ (دوم سلاطین باب ۲۲ آیات ۸ تا ۱۱)

ایک تحقیق یہ ہے کہ ۹۷۱ ق۔م رحعام شاہ یہود کی سلطنت کے پانچویں سال سیق شاہ مصر نے جب یروشلم پر حملہ کیا اور ہیکل اور یہودی بادشاہ کا گھر لوٹا اس وقت توریت ضائع ہو گئی۔ اس حساب سے توریت تین سو برس تک لوگوں کی نظر سے اوجھل رہی۔

بہر حال توریت اس لمبے عرصہ میں گم رہی اور جب سردار خلقیاہ نے اس کے دوبارہ مل جانے کا اعلان کیا اس وقت یہود میں سے کوئی بھی ایسا انسان موجود نہیں تھا جو حتمی طور پر اس امر کی تصدیق کرتا کہ حاصل شدہ کتاب توریت ہی ہے۔

دوسری بربادی: تقریباً چھ سو برس ق۔م بخت نصر بابل کے بادشاہ نے سلطنت یہود پر حملہ کیا اور بے رحمی سے یہود کو قتل کیا جو قتل سے بچ گئے ان کو قیدی بنا کر بابل میں لے گیا۔ یہ لوگ بابل میں ستر برس اسیر رہے جب وہاں سے آزاد ہوئے تو وہ اپنی زبان بھول چکے تھے اس تباہی کا واقعہ دوم تواریخ باب ۳۶ میں درج ہے۔

توریت کی ازسرنو ترتیب: جب بنی اسرائیل اسیری سے نجات پا کر واپس آئے کچھ سکون نصیب ہوا تو انھوں نے توریت کو ازسرتو ترتیب دینے کی طرف توجہ دی چنانچہ عزرا نبی نے اس کام کو سرانجام دیا۔

کیٹو (Kitto) اپنے انسائیکلو پیڈیا آف بلیکل لٹریچر میں لکھتا ہیں ''یہاں تک کہا جاتا ہے کہ عزرا نے تمام عہد عتیق کو محض حافظہ کی مدد سے ازسرنو تحریر کیا کیونکہ ان کتابوں کے تمام نسخے تغافل شعاری کی وجہ سے معدوم ہو چکے تھے۔

تیسری بربادی: ۱۷۰ ق۔م میں انطاکیہ کے یونانی بادشاہ انیٹونیس نے یہودیوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے یروشلم پر بار بار حملے کیے۔ ہیکل کو بے حرمت کیا مقدس صحیفوں کو جلا دیا اور یہود کو تہ تیغ کیا۔ (مفتاح الکتاب مطبوعہ مرزا پور ص ۱۳۴، ۱۳۵)

اس تباہی کے بعد جب یہوداہ مقابیس نے ۱۶۵ ق۔م میں ہیکل کی مرمت شروع کی اس وقت اس نے توریت کی نقل کہیں سے مہیا کر کے ہیکل میں رکھی۔

چوتھی بربادی: ۷۰ء میں طیطس (ٹائیٹس) شہزادہ روم نے یروشلم پر حملہ کر کے اسے پیوند خاک کر دیا ہیکل کو بالکل مسمار کر دیا۔ گیارہ لاکھ یہودیوں کو تہ تیغ کیا ہزاروں کو قیدی بنا کر فروخت کیا۔ شہر اور ہیکل کی اس قیامت خیز تباہی میں توریت آگ کی نذر ہوگئی۔

پانچویں بربادی: طیطس کے حملے کے تقریباً ۶۵ سال بعد قیصر ہڈرین کے عہد میں یہودیوں نے اپنی طاقت جمع کر کے رومیوں کے ساتھ پھر ایک مقابلہ کیا۔ مگر شکست کھائی۔ پانچ لاکھ کے قریب آدمی قتل ہوئے۔ بقیہ لوگ شہر سے نکال دیے گئے۔ یروشلم کے کھنڈرات میں بھی ان کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ بیت المقدس کو پیوند خاک کر دیا پھر اس کی جگہ پیڑ دیوتا کا ایک مینار بنا دیا اور کوہ کلوری پر وینس دیوی کی مورتی رکھ دی اور شہر کا نام بدل کر ایلیا رکھ دیا۔

چھٹی بربادی: ۴۰۰ء کے قریب جبکہ رومیوں پر شمال کی طرف سے حملہ آور وحشی قوموں نے غلبہ حاصل کر لیا۔ تو موسویت اور مسیحیت کو تباہ و برباد کر دیا چونکہ یہ اقوام بت پرست تھیں اس وجہ سے جہاں جہاں ان کا غلبہ ہوتا گیا وہاں مکتوبات صحیفے مدرسے، کتب خانے، نذر آتش ہوتے گئے اور تمام پرانے مذاہب کی بیخ کنی ہوگئی۔ وحشی اقوام کی طرف سے توریت پر چھٹی تباہی نازل ہوئی۔

ساتویں بربادی: ۶۱۳ء میں شاہ ایران خسرو پرویز نے یروشلم پر چڑھائی کر کے نوے ہزار آدمی قتل کیے۔ اور تمام گرجوں اور متبرک مکانوں کو پیوند خاک کر دیا۔ توریت پر سات بار تباہی آئی تو کون یقین سے کہہ سکتا ہے کہ توریت تحریف وتبدل سے پاک ہے یہی وجہ ہے کہ تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ بائبل تحریف شدہ ہے۔ چنانچہ پادری ڈمیلو کتاب گنتی کی تفسیر میں لکھتا ہے۔ ''پانچ کتابیں جو اسفار خمسہ موسیٰ سے منسوب ہیں کسی اور شخص نے لکھ کر موسیٰ سے منسوب کیں۔

پال (Leslte paul) لکھتا ہے ''عہد نامہ عتیق اور جدید سائنٹیفک اصطلاح میں خدا کے الفاظ نہیں ہیں یہ تو صرف اس انسانی کوشش کا ریکارڈ ہیں جو خدا تک پہنچنے کے لیے کی گئی اس لیے یہ خدا کے متعلق انکشافات ہیں خدا کی وحی نہیں ہیں۔ (The Annihilation of Man)

چرچ مشن پاکستان کی شائع کردہ کتاب ''روحوں کو آزماؤ'' کے ص ۱۹، ۲۰ پر لکھا ہے۔ ''درحقیقت تاریخوں کی صحت تاریخی تفصیلات اور سائنس کے اصول ونظریات سے بائبل مقدس میں غلطیاں، متضاد بیانات اور نامکمل علم پایا جاتا ہے یہ غلطیاں زیادہ اہم مسائل جیسے خدا کا ذہن اور خدا کی مرضی وغیرہ میں نظر آتی ہے۔'' (مسیحی رسالہ المائدہ لاہور ۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء)

تعلیمات: ہر نبی نے توحید کا پیغام دیا اور دین کی اساس ہی توحید ہے لیکن مرور زمانہ سے ہر قوم نے توحید کے آب مصفا کو شرک کی ملونی سے مکدر کر دیا۔

عہد عتیق میں اللہ تعالیٰ کے بیسوں اسماء وصفات کا ذکر آتا ہے ان میں سب سے زیادہ یہودہ نام کو عظمت اور فضیلت دی گئی ہے۔ یہ بائبل میں ۶۸۲۳ مرتبہ آیا ہے۔

بائبل نے غیر اللہ کی پرستش کو سختی سے منع کیا ہے چنانچہ بائبل میں آتا ہے۔

''میرے حضور تیرے لیے دوسرا خدا نہ ہوئے۔'' (خروج ۲۰: ۳)

''خداوند آسمان پر سے دیکھتا ہے وہ سارے بنی آدم پر نگاہ کرتا ہے وہ اپنی سکونت کے مقام سے زمین کے سب باشندوں کو تا کتا ہے۔''

(زبور ۲۳ آیات ۱۳۔۱۴)

''تو خداوند اپنے خدا کا نام بے فائدہ مت لے کیونکہ جو اس کا نام بے فائدہ لیتا ہے خداوند اسے بے گناہ نہ ٹھہرائے گا۔'' (خروج ۲۰، استثناء ۵: ۱۶)

موسوی احکام عشرہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احکام عشرہ میں حقوق العباد کے متعلق نہایت ہی عمدہ تعلیم دی گئی ہے۔

چنانچہ لکھا ہے ''تو اپنے ماں باپ کو عزت دے تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز ہووے تو خون مت کر، تو زنا مت کر، تو چوری مت کر تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی نہ دے، تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر، تو اپنے پڑوسی کی جورو اس کے غلام، اس کی لونڈی، اس کے بیل، اس کے گدھے اور اس کی کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ مت کر۔'' (استثناء ۵: ۲۲، خروج ۲۰: ۱۲ تا ۱۷)

عہد نامہ عتیق میں انبیاء علیہم السلام پر اس قسم کے گندے اور فحش الزام لگائے گئے ہیں جن کا مطالعہ بھی ذوق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ چنانچہ حضرت نوح کے متعلق پیدائش باب ۹ آیت ۱۹ تا ۲۵ میں شراب کے نشہ میں برہنگی کا ذکر ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق پیدائش ۱۹ آیت ۳۱ تا ۳۸ میں اپنی بیٹیوں سے زنا کا ذکر ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق سموئیل دوم باب ۱۱ آیت ۲ تا ۵ میں اوریا کی بیوی سے ناجائز صحبت کرنے کا ذکر ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق سلاطین اول باب ۱۱ آیت ۱ تا ۶ میں اللہ تعالیٰ سے برگشتگی کا ذکر ہے۔

اس قسم کے فحش ادب سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بائبل میں مرور زمانہ سے تحریف و تبدل ہوتا رہا ہے۔

عیسائیت

عموماً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمری کے مصادر اناجیل اربعہ قرار دی جاتی ہیں لیکن اناجیل کے متعلق آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کے مصنف کون کون تھے؟ کیونکہ ہر انجیل کے عنوان پر ''بقول متی'' یا ''حسب بیان متی'' درج ہے اور ''مصنفہ متی'' کہیں نہیں لکھا۔ بعض کا خیال ہے کہ تیسری انجیل واقعی لوقا کی لکھی ہوئی ہے لیکن خود لوقا کا یہ بیان ہے کہ ''میں ان بیانات کا عینی شاہد نہیں ہوں بلکہ جس طرح مجھ سے قبل اور بہت سے آدمیوں نے یسوع کے حالات قلمبند کیے ہیں اس طرح میں بھی کہتا ہوں۔''

علماء مسیحیت نے یہ اقرار کرنا شروع کر دیا ہے کہ عیسائیت کے ابتدائی دور میں ہی جعلی انجیلیں دوسرے کے ناموں پر شائع ہونا شروع ہو گئی تھیں چنانچہ رومن تواریخ کلیسا مطبوعہ مرزاپور ۱۸۵۶ء صفحہ ۹۰ پر لکھا ہے۔

''بہت سی مسیحی کتابیں خود لکھ کر کسی حواری مسیح یا حواری مسیح کے کسی خادم یا کسی بڑے اسقف کے نام سے مشہور کر دیتے تھے۔ ایسی جعلی کاروائیاں تیسری صدی عیسوی سے شروع ہوئیں اور کئی برس تک جاری رہیں۔ یہ نہایت ہی خلاف حق اور قابل شرم حرکت تھی۔''

پادری موشیم اپنی تاریخ کلیسا مطبوعہ ۱۸۶۰ء جلد دوم باب دوم صفحہ ۳۶ پر رقمطراز ہے۔ ''متعدد وجوہ ایسے تھے جن کے باعث ضرورت محسوس ہوئی کہ پہلی صدی میں تمام مروجہ انجیلوں کو ایک نسخہ میں جمع کر دیا جائے۔ دنیا میں بہت سی ایسی تحریریں پھیل گئی تھیں جن پر پاک پیغمبروں کے نام بطور مصنفین درج کر دیے گئے تھے اس قسم کے غیر یقینی مصادر پر کلی طور پر اعتماد کر کے کسی شخصیت کی صحیح سوانح عمری نہیں لکھی جا سکتی۔''

اسی طرح اگر ان روایات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے جن میں حضرت مسیح علیہ السلام کی سوانح عمری بیان ہوئی ہے تو وہ بھی متضاد امور کا پلندہ معلوم ہوتی ہے۔ کنواری کے پیٹ میں پیدا ہونا اور مر کر دوبارہ زندہ ہونا حضرت مسیح علیہ السلام کی سوانح عمری کے خاص دو واقع ہیں لیکن ان دونوں باتوں کے متعلق جو روایات اور شہادتیں اناجیل میں موجود ہیں ان میں شدید اختلاف ہے۔

کنواری کے حاملہ ہونے کا ذکر صرف متی اور لوقا میں موجود ہے مرقس میں نہیں ہے۔ مزید براں متی اور لوقا نے یسوع کو کنواری کا بیٹا بنانے کے باوجود اس کا شجرہ نسب بھی درج ہے۔

وفات اور احیاء ثانیہ سے متعلق انجیل مرقس اور انجیل متی میں اختلاف ہے۔ انجیل کی تاریخی کمزوری اور متضاد بیانات کی وجہ سے بعض محققین نے حضرت مسیح علیہ السلام کی ہستی سے انکار کر دیا ہے۔ تولین (Tulane) یونیورسٹی کے پروفیسر ڈبلیو بی اسمتھ نے بھی اپنی کتاب (Ecoedeus) میں مسیح کی تاریخی حیثیت سے انکار کیا ہے۔ اسی طرح جرمن پروفیسر ڈریوز (Drews) فرانسیسی ڈاکٹر کوچو (Couchow) پراسپر الفاریق (Prosper Alfaric) وٹوریس ماشیورو (Vittoris Machioro) وغیرہ محققین نے یسوع مسیح کی ہستی کو محض ایک فرضی ہستی قرار دیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اتنے بڑے مذہب کے بانی کو محض ایک فرضی ہستی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قرآن مجید کا عیسائیت پر یہ ایک بڑا احسان ہے کہ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور کسی حد تک ان کے حالات زندگی محفوظ ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کو ایک تاریخی شخصیت قرار دیتا ہے۔ دور حاضر میں بعض محققین نے نئے زاویے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات زندگی کے متعلق تحقیق کی ہے۔ ان میں سے پاکستان کے خواجہ نذیر احمد ایڈووکیٹ مرحوم کی کتاب ''جیسز آن ہیون آن ارتھ'' ہے۔ اسی طرح جرمن اور یورپ کے محققین ہیں جنھوں نے تاریخی مصادر کی چھان بین کر کے اپنی تحقیق تاریخ کے صفحات پر رقم کی ہے۔ ایک قاری ان کے تاریخی نتائج سے اختلاف تو کر سکتا ہے لیکن محنت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

تاریخ ولادت: کینن فیرر نے اپنی کتاب ''حیات مسیح'' میں اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ مسیح کی تاریخ ولادت کا کہیں پتہ نہیں چلتا انجیل سے صرف یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس رات گڈریے بھیڑوں کو لیے ہوئے بیت اللحم کے کھیتوں میں موجود تھے لیکن انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں کرسمس ڈے کے آرٹیکل پر لکھنے والے نے اس پر ایک نہایت عمدہ تنقید کی ہے وہ لکھتا ہے کہ دسمبر کا مہینہ تو ملک یہودیہ میں سخت بارش کا مہینہ ہے۔ ان دنوں میں کس طرح بھیڑیں یا گڈریے کھلے آسمان تلے رہ سکتے ہیں۔ اس کے مقابل چار صدیوں تک ۲۵ دسمبر تاریخ ولادت مسیح نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ۵۳۰ء میں سیتھا کا ایک راہب ڈایونیس اکسیگز نام جو منجم بھی تھا۔ تاریخ ولادت مسیح کی تحقیق اور تعین کے لیے مقرر ہوا۔ سو اس نے حضرت مسیح کی تاریخ ولادت ۲۵ دسمبر مقرر کی کیونکہ مسیح سے پانچ چھ صدی قبل ۲۵ دسمبر ایک مقدس تاریخ تھی۔ بہت سے سورج دیو اس تاریخ پر یا اس سے ایک دو دن بعد پیدا ہونا تسلیم کیے جا چکے تھے۔ سو راہب نے آفتاب پرست اقوام میں عیسائیت کو مقبول بنانے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تاریخ ولادت ۲۵ دسمبر مقرر کر دی۔ قرآن مجید کی سورت مریم پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کو دردِ زہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت کی کہ کھجوروں کے تنے کو ہلا تا کہ ان پر تازہ پکی کھجوریں گریں اور وہ اس کو کھائیں اور چشمہ کا پانی پی کر طاقت حاصل کریں اب فلسطین میں موسم گرما کے وسط یعنی جولائی اگست میں ہی کھجوریں ہوتی ہیں اس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت مسیح کی ولادت جولائی اگست کے کسی دن میں ہوئی تھی اور ۲۵ دسمبر کی تاریخ غلط ہے متی کی انجیل کے مطابق احتیاط سے حساب لگایا جائے تو حضرت مسیح کی پیدائش کا زمانہ ۸ اور ۶ ق م کے درمیان ہے۔

جائے پیدائش: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے متی کی انجیل بیت اللحم کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش بتایا ہے۔ لوقا ۱۶:۴ میں لکھا ہے کہ یسوع کا اپنا شہر ناصرہ تھا۔ جہاں وہ پیدا ہوئے اور پرورش پائی۔ بائبل کی انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ مسیح بیت اللحم جوڈا میں نہیں بلکہ ناصرہ میں پیدا ہوئے۔

اصل حقیقت یہ ہے گلیلی کے علاقہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ جس کو یہودی کتب میں نام بیتھلیہن الناصرہ (Bethlehen-En-Nosiryyah) لکھا۔ یہ گاؤں ناصرہ (Nazareth) سے سات میل شمال مغرب کی جانب واقع تھا۔ اس گاؤں میں حضرت مریم اور ان کی بہن کا آبائی مکان تھا۔ جب حضرت مریم حاملہ ہوئیں تو وہ بیت اللحم کے قصبہ سے آ کر اس مکان میں اپنی بہن کے پاس آ گئیں تا کہ پہلوٹھی کا بچہ جن سکیں۔ (یوحنا ۱:۴۶، ۷:۴۰ تا ۴۳ اور ۵۲)

آپ کی پیدائش کے بارہ میں عیسائیوں کے قدیم فرقوں میں بھی بعض فرقے اختلاف رکھتے ہیں۔ بعض کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کنواری مریم کے بطن سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ ان کے باپ کا نام یوسف نجار تھا۔ انجیل متی میں ہے ''اور یعقوب سے یوسف پیدا ہوا۔ یوسف سے جو مریم کا شوہر تھا یسوع پیدا ہوا جو مسیح کہلایا۔'' (متی باب ۱:۱۶)

جمہور عیسائیوں اور مسلمانوں کا مرجحہ اور مقبولہ عقیدہ یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت اعجازی رنگ میں بن باپ ہوئی۔

تیس سال کی عمر میں انھوں نے یوحنا سے بپتسمہ لیا۔ یوحنا ایک نبی اور یسوع کے رشتہ کا بھائی تھا۔ بپتسمہ لینے کے بعد یسوع نے بیابان میں عبادت کرنا اور روزے رکھنے شروع کر دیے۔ آخر حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کا حکم پا کر لوگوں کی اصلاح کے لیے میدان عمل میں آ گئے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ غلط الزامات لگا کر یہودی حکومت نے صلیب دینے کا ارادہ کر لیا۔ صلیب دیے جانے پر بھی شدید اختلاف ہے۔ عیسائی کہتے ہیں یسوع مسیح کو صلیب پر چڑھایا گیا اور صلیب پر ہی انھوں نے جان دی۔ دفن کے تیسرے دن بعد زندہ ہوئے اور آسمان پر چڑھے۔ اب وہ اپنے باپ کے دائیں طرف بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کی صلیبی موت ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے۔ اسی طرح مسلمانوں میں اختلاف ہے۔ جمہور مسلمان علماء کا یہ عقیدہ ہے کہ یسوع مسیح کو صلیب دیے جانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھا لیا۔ بعض علماء نے (سرسید، محمود شلتوت مصری وغیرہ) کا یہ خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب پر فوت نہیں ہوئے اور نہ آسمان پر اٹھائے گئے بلکہ طبعی موت مرے ہیں۔ گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمری اختلافات سے پُر ہے۔ تاریخ ولادت میں اختلاف، جائے پیدائش پر اختلاف رفع اور عدم رفع میں اختلاف۔

اناجیل سے یہ بات عیاں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت صرف بنی اسرائیل کی طرف تھی چنانچہ انھوں نے خود اپنے شاگردوں سے کہا۔
''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔''
(متی باب ۱۰: ۵، ۶)

کتب (عہد نامہ جدید): عہد نامہ جدید میں ستائیس کتابیں شامل ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ متی کی انجیل۔ ۲۔ مرقس کی انجیل۔ ۳۔ لوقا کی انجیل۔ ۴۔ یوحنا کی انجیل۔ ۵۔ رسولوں کے اعمال۔ ۶۔ پولس رسول کا خط رومیوں کو۔ ۷۔ پولس رسول کا پہلا خط کرنتھوں کو۔ ۸۔ پولس رسول کا دوسرا خط قرنتیوں کو۔ ۹۔ پولس رسول کا خط گلتیوں کو۔ ۱۰۔ پولس رسول کا خط افسیوں کو۔ ۱۱۔ پولس رسول کا خط فلپیوں کو۔ ۱۲۔ پولس رسول کا خط کلسیوں کو۔ ۱۳۔ پولس رسول کا دوسرا خط تھسلنیکیوں کو۔ ۱۴۔ پولس رسول کا دوسرا خط تھسلنیکیوں۔ ۱۵۔ پولس رسول کا پہلا خط فلپیوں کو۔ ۱۶۔ پولس رسول کا دوسرا خط تمطاؤس کو۔ ۱۷۔ پولس رسول کا خط ططس کو۔ ۱۸۔ پولیس رسول کا خط فلیموں کو۔ ۱۹۔ عبرانیوں کا خط۔ ۲۰۔ یعقوب کا خط۔ ۲۱۔ پطرس کا پہلا خط۔ ۲۲۔ پطرس کا دوسرا خط۔ ۲۳۔ ۲۷۔ یوحنافقیہہ کے تین خطوط و مکاشفات اور یہوداہ کا ایک خط۔

اس منتخب مجموعہ کو پوپ گلاسیوس (۴۹۲ءلغایت ۴۹۶ء) نے باضابطہ طور پر سند قبول عطا کی۔ اور عیسائیوں میں آج تک یہی مجموعہ مروج ہے۔

انجیل اربعہ: انجیل متی، عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق متی کی انجیل سب سے پرانی ہے یہ انجیل اصل میں عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی۔ لارڈنر نے اوریجن کے تین اقوال اپنی کتاب میں لکھے ہیں۔ جن سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ انجیل عبرانی زبان میں لکھی گئی۔ یوسی بیس اور اتھناسیس اور سرل اور جروم سب اس امر پر متفق ہیں کہ یہ کتاب عبرانی زبان میں لکھی گئی ہارن صاحب نے اپنی تفسیر میں تیئس (۲۳) علماء کے نام تحریر کیے ہیں جو اس امر کے قائل تھے کہ متی انجیل دراصل عبرانی زبان میں تھی۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی جلد ۱۹ میں ہے۔
''عہد جدید کی سب کتابیں یونانی میں لکھی گئیں الا انجیل متی اور نامہ عبرانیاں جن کا عبرانی زبان میں لکھا جانا بہ دلائل متیقن ہے۔''
بعض محققین کا یہ خیال ہے کہ جس حصہ کا مولف حواری متی تھا وہ حصہ اسی زمانہ میں ضائع ہو گیا تھا۔ اب جو کچھ ہمارے ہاتھوں میں ہے اس کے مولف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ عہد تالیف میں بھی اختلاف ہے۔ بعض مورخ عہد تالیف ۶۱ء اور ۶۵ء کے درمیان قرار دیتے ہیں جبکہ پروفیسر ہارنک کی تحقیق کے مطابق اس کا زمانہ تالیف ۸۰ء اور ۱۰۰ء کے درمیان ہے۔ اس انجیل کا زمانہ تالیف ۶۱ء ہو یا ۱۰۰ء تاریخ میں اس انجیل کا نشان ۱۷۳ء سے پہلے نہیں ملتا۔

انجیل مرقس: بعض مورخین کا یہ خیال ہے کہ سب سے قدیم انجیل مرقس کی انجیل ہے۔ جس کا ذکر یوسی بیس (م ۳۴۰ء) نے اپنی تاریخ کلیسا میں کیا ہے۔ یوسی بیس لکھتا ہے کہ مرقس ایک یہودی الاصل یونانی تھا پہلے پال اور برنباس کا رفیق تھا اور پھر ان سے علیحدہ ہو کر پطرس حواری کی خدمت میں رہنے لگا۔ لیکن ۶۴ء میں قیصر نیرو نے جب پطرس کو عیسائیوں کے قتل عام میں شہید کر ڈالا تو مرقس نے اس حادثہ کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کی سیرت لکھی۔

اسکاٹ صاحب اپنی رومن تفسیر کے صفحہ ۲۴۰ پر لکھتے ہیں۔
''یہ بھی ٹھیک نہیں کہ کس وقت یہ صحیفہ لکھا گیا مگر گمان غالب ہے کہ اس کی تصنیف ۵۶ء اور ۶۳ء کے درمیان ہوئی۔ سب متفق طور پر کہتے ہیں کہ شہر روم میں اس کی تصنیف ہوئی۔''

انجیل لوقا: لوقا انطاکیہ کا رہنے والا ایک طبیب اور غیر یہودی مورخ تھا۔ اس سے دو کتب منسوب ہیں ایک انجیل لوقا دوسری رسولوں کے اعمال، بقول مصنف مفتاح الکتاب لوقا نے انجیل ۶۳ء کے قریب اور اعمال ۶۴ء کے قریب لکھے۔

انجیل یوحنا: بعض عیسائی علماء اسے حواری یوحنا کی طرف منسوب کرتے ہیں جو تاریخی لحاظ سے غلط ہے۔ یہ بات تحقیق سے ثابت ہے کہ جو دو سگے بھائی یوحنا اور جیمس پسران زبیدی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری تھے پاپیاس کی روایت کے مطابق یہود نے دونوں کو ۶۰ء اور ۷۰ء کے مابین شہید کر ڈالا تھا۔
اس انجیل کا مولف اور جامع ایک دوسرا یوحنا ہے جو افیوس واقع ایشیاء کوچک کا رہنے والا تھا اور پہلی صدی کے آخر میں گزرا تھا۔ مکاشفات یوحنا کا بھی یہی مصنف ہے۔ اس انجیل کے سن تالیف میں اختلاف ہے اس کی تاریخ ۶۸ء سے لے کر ۱۰۰ء تک بیان کی جاتی ہے اور مکاشفات کی تاریخ تصنیف ۹۵ء اور ۹۶ء اور ۹۷ء بیان کی جاتی ہے۔
اس انجیل میں یونان کے فلسفہ الٰہیات کی چاشنی موجود ہے۔ خاص طور پر یہودی فلسفی فائلو (Philo) کے فلسفیانہ خیالات کی آمیزش بہت ہے۔ جس

کی بہترین مثال اس انجیل کا ابتدائی فقرہ ہے۔ جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلام بتلایا گیا ہے۔

''ابتداء میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔''

عہد نامہ جدید کے متعلق اندرونی، بیرونی اور تاریخی شہادتیں موجود ہیں یہ مصنفین کی یاداشتوں کا مجموعہ ہیں۔ پھر اناجیل میں باہمی تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ مزید براں ان کتابوں کے مصنفین کے بارہ میں بھی اختلاف ہے کہ آیا یہ کتب انہی مصنفین کی ہیں۔ اناجیل درحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح حیات ہیں جنھیں ان روایات کی رو سے مرتب کیا گیا ہے جو اس زمانہ میں رائج تھیں۔

انتخاب کا نرالا طریقہ: جب کلیسا کے مختلف فرقوں میں شدید اختلافات پیدا ہوئے تو اختلافات کو دور کرنے کے لیے ایک کونسل شاہنشاہ قسطنطین کے زیر اہتمام ۳۲۵ء کو منعقد ہوئی۔ اس کونسل میں دو ہزار اڑتالیس مندوبین شامل ہوئے۔ اس دور کا مذہبی ادب اکٹھا کیا انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی تحقیق کی رو سے ۳۴ اناجیل تھیں۔ کونسل کے مندوبین کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ ۱۷۳۰ مندوبین کو باہر نکال دیا گیا بقیہ ۳۱۸ بھی کسی متفقہ فیصلہ پر جمع نہ ہو سکے کہ مختلف فرقوں کی اناجیل میں سے کسے منتخب کیا جائے۔ بالآخر ایک رات تمام کتب کو فرش پر بکھیر دیا گیا۔ صبح آ کر دیکھا تو کچھ کتابیں اور خطوط وغیرہ میز کے اوپر پڑے ہوئے تھے تو ان کو مقدس کو سمجھ کر منتخب کر لیا گیا چنانچہ اس کونسل کی روئیداد میں مذکور ہے۔

''جو کچھ ان تین سو پادریوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کر لیا، اسے خدا کی خوشنودی سمجھ لینا چاہیے، بالخصوص اس لیے کہ ان قابل ہستیوں کے دل میں روح القدس سما رہا تھا جس نے انھیں خداوند کی مرضی کی طرف راہ نمائی کر دی۔

(Historical aspect of the Council of Nicaea by Rev. issac boyle and The Apocryphal New Testament دیباچہ ص ۱۴)

تعلیمات

تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا محور توحید باری تعالیٰ ہے۔ یہی محور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تھا۔ انھوں نے توحید ہی کی تعلیم دی جیسا کہ اناجیل سے بھی ثابت ہے۔ تثلیث کا عقیدہ بعد کا گھڑا ہوا ہے۔

انجیل متی میں لکھا ہے ''پھر ابلیس (یسوع کو) ایک اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی سب سلطنتیں اور ان کی شان و شوکت اسے دکھائی اور اس سے کہا کہ اگر تو جھک کر مجھے سجدہ کرے تو یہ سب کچھ تجھے دے دوں گا۔ یسوع نے اس سے کہا؟ شیطان دور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تم خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔'' (متی باب ۴: ۱۰، ۱۱)

ایک فقیہ نے یسوع سے پوچھا کہ سب حکموں میں اول کون سا ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ اول یہ ہے کہ اے اسرائیل سن! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔ (مرقس ۱۲: ۲۸)

خدا کی صفات: ''ازلی بادشاہ یعنی غیر مرئی واحد خدا'' (تمتھیس ۱: ۱۷) ''ان دیکھی صفتیں یعنی اس کی ازلی قدرت اور الوہیت دنیا کی مختلف چیزوں کے ذریعے سے صاف نظر آتی ہے۔ (رومیوں ۲۰/۱) ''اس سے مخلوقات کی کوئی چیز چھپی نہیں بلکہ جس سے ہم کو کام ہے اس کی نظروں میں سب چیزیں کھلی اور بے پردہ ہیں۔'' (عبرانیوں ۱۳/۴) وہ قادر مطلق ہے اس کے کام صاف بڑے اور عجیب ہیں۔'' (مکاشفہ ۱۵/۳) ''وہی تمجید اور عزت اور قدرت کے لائق ہے کیونکہ اس نے ساری چیزیں پیدا کیں۔'' (۱۴/۴) ''وہ انسانوں کا روز قیامت میں حساب کرے گا۔'' (رومیوں باب ۲ آیات ۵، ۶) ''خدا کی حمد ہو جو رحمتوں کا باپ ہے۔'' (کرنتھیوں ۱/۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وعظ: ۱۔ مبارک ہیں وہ جو غریب ہیں، کیونکہ ان کے لیے آسمان کی بادشاہت ہے۔ ۲۔ مبارک ہیں وہ جو دکھ سہتے ہیں کیونکہ انھیں راحت ملے گا۔ ۳۔ مبارک ہیں وہ جو کمزور ہیں کیونکہ وہ زمین کی میراث پائیں گیں ۴۔ مبارک ہیں وہ جو سچائی کے لیے بھوکے اور پیاسے ہیں کیونکہ ان کو تسکین ملے گی۔ ۵۔ مبارک ہیں وہ جو دردمند ہیں کیونکہ انھیں رحم حاصل ہوگا۔ ۶۔ مبارک ہیں وہ جن کا دل پاکیزہ ہے کیونکہ وہ خدا دیکھیں گے۔ ۷۔ مبارک ہیں وہ جو امن پسند ہیں کیونکہ انھیں خدا کے بیٹے کہا جائے گا۔ ۸ مبارک ہیں وہ جو سچائی کی خاطر مصلوب کیے جاتے ہیں کیونکہ آسمان کی بادشاہت ان کی ہے۔ ۹۔ مبارک ہو تم جب آدمی تم پر میرے حوالے سے ظلم کرے اور ہر قسم کی بری بات کہتے ہیں۔ ۱۰۔ خوش اور مسرور ہو کیونکہ آسمان میں تمہارا انعام بہت عظیم ہے کیونکہ آدمیوں نے تم سے پہلے آنے والے نبیوں کو بھی قتل کیا۔

''میرے حضور تیرے لیے دوسرا خدا نہ ہوئے۔'' (خروج ۲۰:۳)

''خداوند آسمان پر سے دیکھتا ہے وہ سارے بنی آدم پر نگاہ کرتا ہے وہ اپنی سکونت کے مقام سے زمین کے سب باشندوں کو تاکتا ہے۔''

(زبور ۲۳ آیات ۱۳۔۱۴)

''تو خداوند اپنے خدا کا نام بے فائدہ مت لے کیونکہ جو اس کا نام بے فائدہ لیتا ہے خداوند اسے بے گناہ نہ ٹھہرائے گا۔'' (خروج ۲۰، استثناء ۵:۱۶)

موسوی احکام عشرہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احکام عشرہ میں حقوق العباد کے متعلق نہایت ہی عمدہ تعلیم دی گئی ہے۔

چنانچہ لکھا ہے ''تو اپنے ماں باپ کو عزت دے تا کہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز ہووے تو خون مت کر، تو زنا مت کر، تو چوری مت کر تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی نہ دے، تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر، تو اپنے پڑوسی کی جورو اس کے غلام، اس کی لونڈی، اس کے بیل، اس کے گدھے اور اس کی کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ مت کر۔'' (استثناء ۵:۲۲، خروج ۲۰:۱۲ تا ۱۷)

عہد نامہ عتیق میں انبیاء علیہم السلام پر اس قسم کے گندے اور فحش الزام لگائے گئے ہیں جن کا مطالعہ بھی ذوق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ چنانچہ حضرت نوح کے متعلق پیدائش باب ۹ آیت ۱۹ تا ۲۵ میں شراب کے نشہ میں برہنگی کا ذکر ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق پیدائش ۱۹ آیت ۳۱ تا ۳۸ میں اپنی بیٹیوں سے زنا کا ذکر ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق سموئیل دوم باب ۱۱ آیت ۲ تا ۵ میں اوریا کی بیوی سے ناجائز صحبت کرنے کا ذکر ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق سلاطین اول باب ۱۱ آیت ۱ تا ۶ میں اللہ تعالیٰ سے برگشتگی کا ذکر ہے۔

اس قسم کے فحش ادب سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بائبل میں مرور زمانہ سے تحریف و تبدل ہوتا رہا ہے۔

عیسائیت

عموماً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمری کے مصادر اناجیل اربعہ قرار دی جاتی ہیں لیکن اناجیل کے متعلق آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کے مصنف کون کون تھے؟ کیونکہ ہر انجیل کے عنوان پر ''بقول متی'' یا ''حسب بیان متی'' درج ہے اور ''مصنفہ متی'' کہیں نہیں لکھا۔ بعض کا خیال ہے کہ تیسری انجیل واقعی لوقا کی لکھی ہوئی ہے لیکن خود لوقا کا یہ بیان ہے کہ ''میں ان بیانات کا عینی شاہد نہیں ہوں بلکہ جس طرح مجھ سے قبل اور بہت سے آدمیوں نے یسوع کے حالات قلمبند کیے ہیں اس طرح میں بھی کہتا ہوں۔''

علماء مسیحیت نے یہ اقرار کرنا شروع کر دیا ہے کہ عیسائیت کے ابتدائی دور میں ہی جعلی انجیلیں دوسرے کے ناموں پر شائع ہونا شروع ہو گئی تھیں چنانچہ رومن تواریخ کلیسا مطبوعہ مرزاپور ۱۸۵۶ء صفحہ ۹ پر لکھا ہے۔

''بہت سی مسیحی کتابیں خود لکھ کر کسی حواری مسیح یا حواری مسیح کے کسی خادم یا کسی بڑے اسقف کے نام سے مشہور کر دیتے تھے۔ ایسی جعلی کاروائیاں تیسری صدی عیسوی سے شروع ہوئیں اور کئی برس تک جاری رہیں۔ یہ نہایت ہی خلاف حق اور قابل شرم حرکت تھی۔''

پادری موشیم اپنی تاریخ کلیسا مطبوعہ ۱۸۶۰ء جلد دوم باب دوم صفحہ ۳۶ پر رقمطراز ہے۔ ''متعدد وجوہ ایسے تھے جن کے باعث ضرورت محسوس ہوئی کہ پہلی صدی میں تمام مروجہ انجیلوں کو ایک نسخہ میں جمع کر دیا جائے۔ دنیا میں بہت سی ایسی تحریریں پھیل گئی تھیں جن پر پاک پیغمبروں کے نام بطور مصنفین درج کر دیے گئے تھے اس قسم کے غیر یقینی مصادر پر کلی طور پر اعتماد کر کے کسی شخصیت کی صحیح سوانح عمری نہیں لکھی جا سکتی۔''

اسی طرح اگر ان روایات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے جن میں حضرت مسیح علیہ السلام کی سوانح عمری بیان ہوئی ہے تو وہ بھی متضاد امور کا پلندہ معلوم ہوتی ہے۔ کنواری کے پیٹ میں پیدا ہونا اور مر کر دوبارہ زندہ ہونا حضرت مسیح علیہ السلام کی سوانح عمری کے خاص دو واقع ہیں لیکن ان دونوں باتوں کے متعلق جو روایات اور شہادتیں اناجیل میں موجود ہیں ان میں شدید اختلاف ہے۔

کنواری کے حاملہ ہونے کا ذکر صرف متی اور لوقا میں موجود ہے مرقس میں نہیں ہے۔ مزید براں متی اور لوقا نے یسوع کو کنواری کا بیٹا بنانے کے باوجود اس کا شجرہ نسب بھی درج ہے۔

وفات اور احیاء ثانیہ سے متعلق انجیل مرقس اور انجیل متی میں اختلاف ہے۔ انجیل کی تاریخی کمزوری اور متضاد بیانات کی وجہ سے بعض محققین نے حضرت مسیح علیہ السلام کی ہستی سے انکار کر دیا ہے۔ تولین (Tulane) یونیورسٹی کے پروفیسر ڈبلیو بی اسمتھ نے بھی اپنی کتاب (Ecoedeus) میں مسیح کی تاریخی حیثیت سے انکار کیا ہے۔ اسی طرح جرمن پروفیسر ڈریوز (Drews) فرانسیسی ڈاکٹر کوچو (Couchow) پراسپر الفاریق (Prosper Alfaric) وٹوریس ماشیورو (Vittoris Machioro) وغیرہ محققین نے یسوع مسیح کی ہستی کو محض ایک فرضی ہستی قرار دیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اتنے بڑے مذہب کے بانی کو محض ایک فرضی ہستی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قرآن مجید کا عیسائیت پر یہ ایک بڑا احسان ہے کہ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور کسی حد تک ان کے حالات زندگی محفوظ ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کو ایک تاریخی شخصیت قرار دیتا ہے۔ دور حاضر میں بعض محققین نے نئے زاویے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات زندگی کے متعلق تحقیق کی ہے۔ ان میں سے پاکستان کے خواجہ نذیر احمد ایڈووکیٹ مرحوم کی کتاب ''جیسز آن ہیون آن ارتھ'' ہے۔ اسی طرح جرمن اور یورپ کے محققین ہیں جنھوں نے تاریخی مصادر کی چھان بین کر کے اپنی تحقیق تاریخ کے صفحات پر رقم کی ہے۔ ایک قاری ان کے تاریخی نتائج سے اختلاف تو کر سکتا ہے لیکن محنت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

تاریخ ولادت: کینن فیرر نے اپنی کتاب ''حیات مسیح'' میں اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ مسیح کی تاریخ ولادت کا کہیں پتہ نہیں چلتا انجیل سے صرف یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس رات گڈریے بھیڑوں کو لیے ہوئے بیت اللحم کے کھیتوں میں موجود تھے لیکن انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں کرسمس ڈے کے آرٹیکل پر لکھنے والے نے اس پر ایک نہایت عمدہ تنقید کی ہے وہ لکھتا ہے کہ دسمبر کا مہینہ تو ملک یہودیہ میں سخت بارش کا مہینہ ہے۔ ان دنوں میں کس طرح بھیڑیں یا گڈریے کھلے آسمان تلے رہ سکتے ہیں۔ اس کے مقابل چار صدیوں تک ۲۵ دسمبر تاریخ ولادت مسیح نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ۵۳۰ء میں سیتھا کا ایک راہب ڈایونیس اکسیگز نام جو منجم بھی تھا۔ تاریخ ولادت مسیح کی تحقیق اور تعین کے لیے مقرر ہوا۔ سو اس نے حضرت مسیح کی تاریخ ولادت ۲۵ دسمبر مقرر کی کیونکہ مسیح سے پانچ چھ صدی قبل ۲۵ دسمبر ایک مقدس تاریخ تھی۔ بہت سے سورج دیو اس تاریخ پر یا اس سے ایک دو دن بعد پیدا ہونا تسلیم کیے جا چکے تھے۔ سو راہب نے آفتاب پرست اقوام میں عیسائیت کو مقبول بنانے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تاریخ ولادت ۲۵ دسمبر مقرر کر دی۔ قرآن مجید کی سورت مریم پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کو دردزہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت کی کہ کھجوروں کے تنے کو ہلا تا کہ ان پر تازہ پکی کھجوریں گریں اور وہ اس کو کھائیں اور چشمہ کا پانی پی کر طاقت حاصل کریں اب فلسطین میں موسم گرما کے وسط یعنی جولائی اگست میں ہی کھجوریں ہوتی ہیں اس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت مسیح کی ولادت جولائی اگست کے کسی دن میں ہوئی تھی اور ۲۵ دسمبر کی تاریخ غلط ہے متی کی انجیل کے مطابق احتیاط سے حساب لگایا جائے تو حضرت مسیح کی پیدائش کا زمانہ ۸ اور ۶ ق م کے درمیان ہے۔

جائے پیدائش: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے متی کی انجیل بیت اللحم کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش بتایا ہے۔ لوقا ۱۶:۴ میں لکھا ہے کہ یسوع کا اپنا شہر ناصرہ تھا۔ جہاں وہ پیدا ہوئے اور پرورش پائی۔ بائبل کی انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ مسیح بیت اللحم جوڑا میں نہیں جبکہ ناصرہ میں پیدا ہوئے۔

اصل حقیقت یہ ہے گلیلی کے علاقہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ جس کو یہودی کتب میں نام بیتھلیہن الناصرہ (Bethlehen-En-Nosiryyah) لکھا۔ یہ گاؤں ناصرہ (Nazareth) سے سات میل شمال مغرب کی جانب واقع تھا۔ اس گاؤں میں حضرت مریم اور ان کی بہن کا آبائی مکان تھا۔ جب حضرت مریم حاملہ ہوئیں تو وہ بیت اللحم کے قصبہ سے آ کر اس مکان میں اپنی بہن کے پاس آ گئیں تا کہ پہلوٹھی کا بچہ جن سکیں۔ (یوحنا ۱:۴۶،۷:۴۰ تا ۴۳ اور ۵۲)

آپ کی پیدائش کے بارہ میں عیسائیوں کے قدیم فرقوں میں بھی بعض فرقے اختلاف رکھتے ہیں۔ بعض کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کنواری مریم کے بطن سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ ان کے باپ کا نام یوسف نجار تھا۔ انجیل متی میں ہے ''اور یعقوب سے یوسف پیدا ہوا۔ یوسف سے جو مریم کا شوہر تھا یسوع پیدا ہوا جو مسیح کہلایا۔'' (متی باب ۱:۱۶)

جمہور عیسائیوں اور مسلمانوں کا مروجہ اور مقبولہ عقیدہ یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت اعجازی رنگ میں بن باپ ہوئی۔

تیس سال کی عمر میں انھوں نے یوحنا سے بپتسمہ لیا۔ یوحنا ایک نبی اور یسوع کے رشتہ کا بھائی تھا۔ بپتسمہ لینے کے بعد یسوع نے بیابان میں عبادت کرنا اور روزے رکھنے شروع کر دیے۔ آخر حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کا حکم پا کر لوگوں کی اصلاح کے لیے میدان عمل میں آ گئے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ غلط الزامات لگا کر یہودی حکومت نے صلیب دینے کا ارادہ کر لیا۔ صلیب دیے جانے پر بھی شدید اختلاف ہے۔ عیسائی کہتے ہیں یسوع مسیح کو صلیب پر چڑھایا گیا اور صلیب پر ہی انھوں نے جان دی۔ دفن کے تیسرے دن بعد زندہ ہوئے اور آسمان پر چڑھے۔ اب وہ اپنے باپ کے دائیں طرف بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کی صلیبی موت ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے۔ اسی طرح مسلمانوں میں اختلاف ہے۔ جمہور مسلمان علماء کا یہ عقیدہ ہے کہ یسوع مسیح کو صلیب دیے جانے سے قبل اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھا لیا۔ بعض علماء نے (سرسید، محمود شلتوت مصری وغیرہ) کا یہ خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب پر فوت نہیں ہوئے اور نہ آسمان پر اٹھائے گئے بلکہ طبعی موت مرے ہیں۔ گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمری اختلافات سے پُر ہے۔ تاریخ ولادت میں اختلاف، جائے پیدائش پر اختلاف رفع اور عدم رفع میں اختلاف۔

نجات اعمال پر ہے: ہر نبی نے نجات حاصل کرنے کے لیے ایمان اور خدا کے احکام کی پابندی پر زور دیا ہے۔ اس اصول کی تبلیغ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اعمال صالحہ کے بجا لانے پر بہت زور دیتے ہوئے فرمایا۔

''جب تم میرے کہنے پر عمل نہیں کرتے تو کیوں مجھے خداوند خداوند کہتے ہو جو کوئی میرے پاس آتا اور میری باتیں سن کر ان پر عمل کرتا ہے میں تمھیں جتاتا ہوں کہ وہ کس کی مانند ہے۔ وہ اس آدمی کی مانند ہے۔ جس نے گھر بناتے وقت زمین گہری کھود کر چٹان پر بنیاد ڈالی۔ جب رو آئی تو دھار اس گھر پر زور سے گری مگر اسے ہلا نہ سکی...... لیکن جو سن کر عمل میں نہیں لاتا وہ اس آدمی کی مانند ہے جس نے زمین پر گھر کو بے بنیاد بنایا جب دھار اس پر زور سے گری تو وہ فی الفور گر پڑا۔ وہ گھر بالکل برباد ہوا۔ (لوقا باب ۶ آیات ۴۶......۴۹)

عیسائیت کے مروجہ عقائد

تثلیث: تثلیث کا عقیدہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کا گھڑا ہوا ہے جب عیسائی لوگ دوسری اقوام سے ملے تو انھوں نے توحید کی بجائے تثلیث کا عقیدہ اختیار کر لیا۔ تثلیث کا عقیدہ کئی اقوام میں رائج تھا۔ قدیم مصریوں میں ہر مندر میں تین بت ہوا کرتے تھے۔ دیوتا، دیوی اور ان کا بچہ، لیکن یہ تینوں تثلیث فی التوحید کی صورت میں ہوتے تھے۔ قدیم مصریوں کی مشہور تثلیث اوسریز، آئسیس اور ان کے بیٹے ہورس ہوتی تھی۔ اس سے مسیحی تثلیث لی گئی۔ جس کا مفہوم عیسائیت میں باپ بیٹا اور روح القدس ہے۔

اس عقیدہ کی تشریح و توضیح میں عیسائی فضلاء میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں باپ، بیٹے اور روح القدس کے مجموعہ کا نام خدا ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ص ۴۹۷ ج ۲۲ مقالہ تثلیث (Trinity))

بعض کہتے ہیں کہ باپ بیٹا اور کنواری مریم وہ تین اقنوم ہیں جس کا مجموعہ خدا ہے۔ (نوید جاوید ص ۳۵۶ بحوالہ پادری سیل صاحب)

۲۔ کفارہ: کفارہ موجودہ عیسائیت کی عمارت کا بنیادی پتھر ہے اس کے لفظی معنی ڈھانکنے اور چھپانے کے ہیں۔ اصطلاح میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ یسوع مسیح نے صلیب پر جان دے کر تمام بنی آدم کے گناہوں کو چھپا لیا ہے اور ان کے لیے نجات کا موجب بن گئے ہیں جو ان پر ایمان لائے گا تو اس کے گناہوں کے بوجھ کی ذمہ داری حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہوگی عیسائیوں کے نزدیک ہر انسان پیدائشی گناہگار ہے آدم اور حوا نے جو گناہ کیا وہ وراثتاً ہر شخص کی فطرت میں چلا آ رہا ہے جس کی وجہ سے ہر شخص گناہگار ہے۔ عیسائیوں کے نزدیک نیک اعمال نجات کا موجب نہیں ہو سکتے۔ اگر اللہ تعالیٰ بندے کے گناہ توبہ اور استغفار سے معاف کر دے تو اس کا یہ رحم اس کے عدل کے خلاف ہے۔ خدا رحیم ہے اس کا رحم چاہتا ہے کہ انسان سزا سے بچ جائے۔ پھر وہ عادل بھی ہے۔ عدل کا یہ تقاضا ہے کہ سزا ضرور دی جائے۔ اب رحم اور عدل ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ بندے کی نجات کا ہونا ضروری ہے بندوں کی نجات دلانے کے لیے ایک صورت یہ نکالی کہ خدا کا بیٹا یسوع مسیح جو تمام گناہوں سے پاک اور معصوم ہے لوگوں کے تمام گناہوں کو اپنے اوپر لے کر جان کی قربانی دے اور سارے لوگوں کے لیے نجات کا ذریعہ ہے۔

۳۔ عقیدہ حلول مجسم: حلول و تجسیم کا نظریہ انجیل یوحنا میں ملتا ہے۔ ''ابتداء میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ اور کلام خدا تھا۔ یہی ابتداء میں خدا کے ساتھ تھا۔ (یوحنا ۱:۱، ۲) اور کلام مجسم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا جیسا باپ کے اکلوتے کا جلال۔ (یوحنا ۱:۱۴)

عیسائی مذہب میں ''کلام'' ابن اللہ سے تعبیر ہوتا ہے جو خود مستقل خدا ہے۔ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی صفت کلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انسانی جامہ میں اوتار لیا تاکہ بنی نوع انسان پر اپنی محبت ظاہر کرے اور اسے ازلی عذاب سے نجات دے۔

مختصراً یوحنا کے الفاظ کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لباس میں لوگوں کی نجات کے لیے نازل ہوا ہے۔ حلول کا عقیدہ دنیا کے دوسرے مذاہب میں بھی موجود ہے۔ وہی عقیدہ عیسائیوں میں رائج ہوا ہے۔

دوسرے مذاہب کی موجودگی میں اسلام کی ضرورت

پہلی ضرورت: تکمیل شریعت: اسلام سے پہلے جس قدر مذاہب آئے وہ سب قومی اور محدود ضروریات کے مطابق تھے ان کا پیغام اپنے اندر عالمگیر حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ قرآن مجید میں نوح علیہ السلام کے متعلق آتا ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوحًا اِلٰی قَوْمِهٖ (اعراف ۷:۵۵) ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ حضرت ہود علیہ السلام کے متعلق آتا ہے: اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا (اعراف ۷:۶۵) قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ حضرت صالح علیہ السلام کے متعلق آتا ہے۔ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صَالِحًا (اعراف ۷:۷۳) ثمود قوم کی طرف ان کا بھائی صالح نبی بن کر آیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے متعلق آیا: وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا (اعراف ۷:۸۵) مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوسٰی بِاٰیٰتِنَا اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَکَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (ابراہیم ۱۴:۵) اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنی طرف نکالے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول تھے۔ (آل عمران ۳:۴۹)

اگر مذاہب عالم کی کتب کا معالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل عیاں ہو جائے گی کہ کسی کتب نے بھی عالمگیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ویدوں کو لیجئے۔ نہ تو خود وید نے عالمگیر الہام ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور نہ کسی وید بھاسکر نے وید کی تعلیم کو عالمگیر قرار دیا۔ اگر وید کی تعلیم عالمگیر ہوتی تو ضروری تھا کہ اس کی تعلیم کی اشاعت اور تبلیغ ہندوستان کی چار دیواری سے باہر ہوتی، اور وید کے ماننے والے دنیا کی دوسری اقوام تک اس کے پیغام کو پہنچانا ضروری سمجھتے۔ لیکن اس کے بر عکس ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں شودر وید کا کلام سننا تو درکنار وید کی شکل دیکھنے سے محروم رہا۔ منوجی کے قول کے مطابق ایک شودر برہمن کے منہ سے وید کو سن لے تو اس کو قتل کر دینا ضروری ہے۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ وید کی تعلیم عالمگیر نہیں تھی، بلکہ صرف ایک قوم کے لیے تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قوم تو اب تک انجیل میں لکھا ہوا ہے۔

''میں صرف بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کے لیے آیا ہوں، پس میں بچوں کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈال سکتا۔'' (متی: ۱۵ باب)

پہلے انبیاء علیہم السلام کا پیغام ربانی لے کر صرف ایک ہی قوم کی طرف آنا زمانہ اور فطرت انسانی کے مطابق تھا۔ نزول قرآن مجید سے قبل دنیا کے ممالک ایک دوسرے سے الگ تھلگ تھے، ذرائع رسل و رسائل مفقود تھے، اس وجہ سے قومیں ایک دوسرے سے بالکل بے خبر تھیں۔ دوسرے انسان کا ذہن ایک عالمگیر شریعت کو اٹھانے کے قابل ہی نہیں تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ضرورت کے مطابق مختلف وقتوں میں پیغام بھیجتا رہا۔ جب دنیا رسل و رسائل اور ذرائع آمدورفت کی وجہ سے ایک کنبہ کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی تو ایک مکمل شریعت کی ضرورت پڑی جو بنی نوع انسان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرے۔ سو اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے رسول کریم کو اسلام کی تعلیم دے کر بھیجا، قرآن مجید نے یہ دعویٰ کیا ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ ۵:۳) آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی ہے، دین اسلام تمہارے لئے پسند کیا ہے۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں آتا ہے: فِیْهَا کُتُبٌ قَیِّمَةٌ (البینہ ۹۸:۳) اس میں (قرآن میں) قائم رہنے والی کتابیں ہیں۔

دوسری ضرورت: مذہبی اختلافات کا فیصلہ۔ اسلام سے پہلے مذاہب اختلافات کا شکار بن چکے تھے اب ضروری تھا کہ تمام مذہبی اختلافات کا فیصلہ ہوتا۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان تمام اختلافات کا فیصلہ کرنے کے لیے رسول کریم ﷺ پر قرآن مجید بحیثیت حکم نازل کیا ارشاد الٰہی ہے، وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتَابَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ وَهُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (النحل ۱۶:۶۴) اور ہم نے تجھ پر کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ تو ان کے لئے وہ باتیں کھول کر بیان کرے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور وہ ان لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں۔

جب ہم مذاہب عالم کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کو اختلافات کے بھنور میں پھنسا ہوا پاتے ہیں۔ یہودی مذہب میں فریسیوں کا یہ اعتقاد تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی راست بازی سے راست باز ٹھہر کر نجات پا جائیں گے قرآن مجید میں آتا ہے: وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِکَ

اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (البقرہ۲: ۸۰۔۸۲) اور کہتے ہیں کہ سوائے گنتی کے دنوں کے ہمیں آگ نہیں چھوئے گی کہہ تم نے اللہ سے کوئی اقرار لیا ہے تو اللہ اپنے اقرار کے خلاف نہیں کرتا بلکہ اللہ پر وہ بات بناتے ہو جو تم نہیں جانتے، ہاں جو بدی کماتا ہے اور اس کی برائیاں اسے گھیر لیتی ہیں وہی آگ والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے۔

ان آیات میں ان کے باطل عقیدہ کی تردید کر دی ہے کہ کسی نبی کی راست بازی سے راست باز ٹھہر کر کوئی نجات نہیں پا سکتا بلکہ نجات کا دارومدار عمل ہے۔ بَلٰی مَنْ كَسَبَ سَیِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓــٴَـتُهٗ فَاُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ یعنی برے اعمال کی سزا کو کسی نیک آدمی کی راست بازی دور نہیں کر سکتی۔ برے اعمال کی سزا ضرور انسان کو گھیر لیتی ہے۔

اسی طرح یہود نے عزیر کو خدا کا بیٹا بنا لیا تو اللہ تعالیٰ نے عقیدہ ابنیت کی پرزور تردید کی۔ ارشاد الٰہی ہے: وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا لَقَدْ جِئْتُمْ شَیْــٴًـا اِدًّا تَكَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (مریم۱۹: ۸۹۔۹۱) اور کہتے ہیں کہ رحمٰن نے بیٹا بنا لیا ہے یقیناً تم ایک خطرناک بات کر گزرے ہو، قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ جائے اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں کہ وہ رحمٰن کے لئے بیٹے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اگر عیسائیت کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی اختلافات ہی اختلافات نظر آتے ہیں۔ رومن کیتھولک تین خداؤں کے سوا حضرت مریم کو بھی معبودیت کے تخت پر بٹھاتے ہیں اور پوپ کو مصؤن عن الخطا گردانتے ہیں۔ پروٹسٹنٹ صرف باپ بیٹا روح القدس تک ہی الوہیت کو جائز سمجھتے ہیں اور پوپ کو مصؤن عن الخطاء نہیں مانتے۔ پھر پروٹسٹنٹ فرقہ کے اندر بے شمار اختلافات ہیں۔

عشاء ربانی کے نظریہ کے تحت بعض کے نزدیک شراب اور روٹی حلق کے نیچے اترتے ہی مسیح کا خون اور گوشت بن جاتی ہے۔ اسی طرح عشاء ربانی میں شامل ہو کر مسیح سے توصل پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح کفارہ کے عقیدہ نے مسیحیوں کو گناہ کی زندگی میں دھکیل دیا ہے۔

قرآن مجید نے عقیدہ تثلیث کو باطل قرار دیا ہے، ارشاد الٰہی ہے: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَیْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (النساء۴: ۱۷۱) پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مت کہو کہ خدا تین ہیں اس عقیدہ سے باز آ جاؤ یہی تمہارے لئے بہتر ہے اللہ صرف ایک ہی معبود ہے۔

اسی طرح عیسیٰ اور مریم کے خدا ہونے کی تردید کی۔ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (المائدہ ۵: ۱۱۶) اور جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ بن مریم کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوا دو معبود بنا لو۔

کفارہ کی تردید یوں کی: وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الانعام ۶: ۱۶۴) یعنی کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکے گا۔

قرآن مجید نے ہندو مذہب کے مشرکانہ عقیدہ کی کئی جگہ پرزور الفاظ میں تردید کی، ارشاد الٰہی ہے: اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْــٴًـا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (ال عمران ۳: ۶۴) یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

عقیدہ تناسخ کا رد: یہ عقیدہ ہندوؤں کا ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے خدا گناہ معاف نہیں کر سکتا اس وجہ سے ایک انسان کو اپنے برے اعمال کی سزا بھگتنے کے لئے مختلف جونوں میں تبدیل ہونا پڑتا ہے۔ قرآن مجید نے "مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ" (جزا و سزا کے دن کا مالک ہے) میں اس عقیدہ کا رد کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے لفظ ملک کی بجائے لفظ مالک اس لیے اختیار کیا ہے کہ ملک محدود اختیارات کا حاکم ہوتا ہے، وہ کسی مجرم کو چھوڑ نہیں سکتا۔ مالک کے اختیارات وسیع ہیں جسے چاہے معاف کر دے پس خدا تعالیٰ جزا و سزا کے دن جسے چاہے معاف کر سکتا ہے۔ پھر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفت غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ (۴۰: ۳) بیان کی گئی ہے۔ یعنی اللہ گناہوں کو معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔

روح و مادہ کی ابدیت اور ازلیت کا عقیدہ: یہ عقیدہ بھی ہندوازم کا ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے خدا کی صفات میں شرک لازم آتا ہے قرآن مجید نے صرف ایک جگہ نہیں بلکہ بے شمار جگہ پر ہر قسم کے شرک کا رد کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْــٴًـا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (ال عمران: ۶۴) یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کو رب العالمین کہا ہے۔ رب کا لفظ استعمال کر کے یہ بتایا ہے کہ اللہ کی ذات اور صفات میں کوئی شریک نہیں، وہ مادہ اور روح کا بھی رب ہے اس وجہ سے یہ خدا کی کسی صفت میں شریک نہیں ہو سکتے۔

تیسری ضرورت: کتب سابقہ کی غلطیوں کی اصلاح: لوگوں نے سابقہ کتب سماوی میں بعض ایسی غلط باتیں شامل کر دی تھیں جو مذہب کی روح

کے سراسر منافی تھیں۔ قرآن مجید نے ان غلطیوں کی اصلاح کی۔ مثلاً بائبل میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین جھوٹ بولے تھے، حضرت لوط علیہ السلام اپنی ہی بیٹیوں سے سے فعل شنیع کے مرتکب ہوئے، حضرت ہارون علیہ السلام نے بچھڑے کا ایک بت بنایا، حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریا کی بیوی سے زنا کیا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی بیویوں کو خوش کرنے لے لئے بتوں کی پوجا کی۔

قرآن مجید نے فرداً فرداً تمام انبیاء علیہم السلام کا ذکر انتہائی تعریفی الفاظ میں کیا ہے، اور اصولی طور پر عصمت انبیاء علیہم السلام کے متعلق فرمایا:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْ اِلَیْهِ اَنَّهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ لَا یَسْبِقُوْنَهُ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ. (الانبیاء ۲۵، ۲۶، ۲۷)

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّغُلَّ (ال عمران ۳:۱۶۱) کسی نبی کی شان نہیں کہ وہ خیانت کرے۔

یہ دونوں آیات عصمت انبیاء علیہم السلام پر محکم دلیل ہیں کہ انبیاء علیہم السلام وہی کرتے ہیں اور وہی کہتے ہیں جو اللہ کی طرف سے وحی ہو، ان کی زندگی وحی الٰہی کے مطابق گزرتی ہے۔

چوتھی ضرورت: سابقہ کتب سماوی کے برحق ہونے کی تصدیق اور حفاظت: قرآن مجید کے نزول سے قبل ہر نبی کی بعثت قومی سطح پر ہوتی تھی اس وجہ سے ان پر جو وحی نازل ہوتی تھی وہ بھی اسی قوم کے ساتھ مخصوص ہوتی تھی۔

اس طرح ہر قوم صرف اپنے آپ کو ہی وحی کی نعمت عظمٰی سے مستفیض سمجھتی تھی دوسروں کو محروم۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہر قوم میں تنگ نظری اور تعصب کا مرض پیدا ہوگیا۔

اسلام آیا تو اس نے نہ صرف پہلی وحیوں کو برحق قرار دیا بلکہ ان پر ایمان لانا ضروری قرار دیا اور کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوسکتا جب تک وہ پہلی کتب پر ایمان نہ لائے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَ اٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ وَ لَا تَکُوْنُوْا اَوَّلَ کَافِرٍ بِهٖ (بقرہ:۴۱) اور پس اس پر ایمان لاؤ جو میں نے اتارا اس کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے اور تم اس کے پہلے منکر نہ بنو۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَ اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْکِتٰبِ وَ مُهَیْمِنًا عَلَیْهِ فَاحْکُمْ بَیْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ الخ (مائدہ: ۴۸) اور ہم نے تیری طرف کتاب حق کے ساتھ اتاری اور جو اس سے پہلی کتب کی تصدیق کرتی ہے اور ان پر محافظ ہے اور ان کے درمیان ان کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتارا ہے۔

قرآن مجید پہلی کتب کا مصدق دو لحاظ سے ہے: ایک تو اس لحاظ سے کہ قرآن تمام کتب سماوی کو من جانب اللہ مانتا ہے۔ دوسرا اس لحاظ سے مصدق ہے کہ پہلی کتب میں قرآن مجید اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشگوئیاں تھیں، قرآن مجید نے ان پیشگوئیوں کو پورا کر کے ان کتب کو سچا ٹھہرایا ہے۔

پانچویں ضرورت: گم شدہ توحید کو قائم کرنا: قرآن مجید کے نزول سے قبل دنیا سے توحید کا چراغ جو مختلف انبیاء علیہم السلام نے مختلف زمانوں اور مختلف جگہوں میں روشن کیا تھا بجھ چکا تھا۔ ہندو مذہب میں تینتیس کروڑ دیوتا بن چکے تھے بدھ مذہب میں خدا کی ہستی کا تصور خرافات، توہمات اور قیاسات کے نیچے دب کر گم ہو چکا تھا۔ زرتشت مذہب میں خالق خیر و خالق شر دو معبود یزدان اور اہرمن کے نام سے پوجے جاتے تھے۔ یہودیوں نے عیسائیت کے نقش قدم پر چل کر حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنا دیا تھا۔ عیسائیت تثلیث کے چکر میں پھنسی ہوئی تھی۔ غرض کہ تمام دنیا کسی نہ کسی رنگ میں شرک کے مرض میں مبتلا تھی۔ سو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعے توحید کی بجھی ہوئی شمع کو ازسرِنو جلایا اور تاریک دلوں کو خدا کی توحید سے منور کیا اور شرک کے پودے کو جڑ سے اکھیڑ پھینکا۔

چھٹی ضرورت: تکمیل انسانیت: سابقہ مذاہب کی کتب سماوی میں انسانی قویٰ کی نشوونما و تربیت کے لئے افراط اور تفریط پائی جاتی ہے۔ یہودی مذہب انتقامی جذبہ کو زیادہ ابھارتا ہے اور عیسائیت جذبہ رحم کی اس رنگ میں تربیت کرتی ہے کہ غصہ جو انسان کا طبعی جذبہ ہے بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ عیسائیت کی تعلیم کی رو سے اگر کوئی کسی عیسائی کے ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی اس کی طرف کر دینا چاہئے۔ یہ حال ہندو اور بدھ مذہب وغیرہ کا ہے۔ اس وجہ سے تکمیل انسانیت کیلئے ایک ایسے دین کی ضرورت تھی جو انسانی قوتوں کو اعتدال پر نشوونما کرے، سو اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو نازل کیا۔

اسلام میں افراط اور تفریط کا رنگ نہیں ہے بلکہ اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی گئی ہے۔ قرآن مجید انتقام کی بھی تعلیم دیتا ہے لیکن مناسب موقع پر، قرآن مجید انفاق فی سبیل اللہ کی تعلیم دیتا ہے لیکن تبذیر سے روکتا ہے۔ قرآن مجید رحم کی بھی تعلیم دیتا ہے لیکن مناسب موقع پر غرض کہ اسلام نے انسانی قویٰ کی نشوونما اعتدال پر کر کے انسانیت کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔

ساتویں ضرورت: نسل انسانی کی وحدت کی لڑی میں منسلک کرنا: اللہ تعالیٰ کی توحید کا یہ تقاضا ہے کہ نسل انسانی کو وحدت کی لڑی میں منسلک کر دیا جائے۔ اس تقاضا کو اسلام نے پورا کیا۔ اسلام سے پہلے کسی مذہب نے بھی نسل انسانی کی وحدت کا نظریہ پیش نہیں کیا۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے وحدت نسل انسانی کا نظریہ پیش کیا ارشاد الٰہی ہے: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس ۱۰:۱۹) سب لوگ ایک ہی امت ہیں لیکن وہ آپس میں جھگڑتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ فَذَرْهُمْ فِیْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ (المومنون ۲۳:۵۲، ۵۳، ۵۴) یہ تمہاری قوم ایک ہی قوم ہے اور میں تمہارا رب ہوں، سو مجھ ہی سے ڈرو۔ مگر انہوں نے اپنے معاملہ کو آپس میں قطع کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، ہر گروہ اس پر خوش ہے جو ان کے پاس ہے، سو ایک وقت تک انہیں اپنی جہالت کی نیند میں چھوڑ دے۔

اسلام نے وحدت نسل انسانی کو ختم کرنے والے تمام تعصبات کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے۔

مذہبی تعصب: مذہبی تعصب کو ختم کرنے کے لئے یہ تعلیم دی کہ تمام کتب اور رسل اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں۔ وہ تمام قابلِ احترام اور معزز ہستیاں ہیں۔ اسی وجہ سے ایک مسلمان ہونے کے لئے سابقہ کتب سماوی اور تمام رسل پر ایمان لانا فرض قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (۲:۲۸۵) ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

دوسری جگہ آتا ہے: كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (۲:۲۸۵) مومن سب اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔

اسلام صرف دوسرے مذاہب کے انبیاء علیہم السلام کو ہی صرف سچا نہیں مانتا بلکہ یہ تعلیم بھی دیتا ہے کہ تمام مذاہب میں نیک آدمی پائے جاتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِی الْخَيْرٰتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۳:۱۱۳......۱۱۴) یعنی اہل کتاب سب برابر نہیں ہیں، اہل کتاب میں سے ایک جماعت حق پر ہے جو اللہ کی آیات کو رات کی گھڑیوں میں پڑھتے اور سجدے کرتے ہیں، وہ اللہ اور آخری دن پر ایمان لاتے ہیں نیکی کے کرنے کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور نیکی کرنے میں جلدی کرتے ہیں، وہی لوگ نیکوں میں سے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَمِمَّنْ خَلَقْنَاۤ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (الاعراف ۷:۱۸۱) اور ان میں سے جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے ایک جماعت ہے جو حق کی راہ بتاتے ہیں اور اسی پر انصاف کرتے ہیں۔

مذہبی تعصب کو بالکل ختم کرنے کے لئے قرآن مجید نے تمام مذاہب کو ایک مشترکہ امر یعنی توحید پر جمع ہونے کی دعوت دی ہے کیونکہ تمام مذاہب کی بنیاد توحید پر ہی قائم ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء ۲۱:۲۵) تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف ہم نے یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں سو میری عبادت کرو۔

اگر تمام مذاہب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہر مذہب میں خدا کا تصور موجود ہے یہ ایک الگ امر ہے کہ مرور زمانہ سے مذاہب کے اس تصور میں انسانی خیالات کی آمیزش ہوتی چلی گئی ہے۔

قرآن مجید نے اس مرکزی نقطہ کو سامنے رکھ کر یہ دعوت دی: يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْــًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران ۳:۶۴) کہہ اے اہل کتاب اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان امر مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

قومی لونی لسانی تعصّبات: وحدت نسل انسانی کے لیے قومی، لونی اور لسانی تعصبات نہایت ہی خطرناک ہیں۔ ان تعصبات نے دنیا کی اقوام میں منافرت اور مخاصمت کی آگ بھڑکا دی ہوئی ہے۔ قرآن نے ان تعصبات کو ختم کرنے کی نہایت ہی اعلیٰ پیرایہ میں تعلیم دی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (الحجرات ۴۹:۱۳) یہ خطاب تمام دنیا کو ہے۔ اے لوگو! غور کرو تم ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہونے کی وجہ سے ایک ہی نسل کے افراد ہو تمہاری شاخیں اور قبیلے ہیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، خدا کو کسی قوم کا فرد عزیز نہیں ہاں خدا کو صرف وہ عزیز ہے جس کے دل میں خوف الٰہی ہو اور نیک عملی زندگی بسر کر کے نوع انسانی کی خدمت کرے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا: لا فضل لعربی علی عجمی ولا فضل لعجمی علی عربی و لا لا بیض علی اسود و لا لا سود علی ابیض الا بتقوی (زاد المعاد ص ۳۲ ج ۴) کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت ہے نہ کسی گورے کو کسی کالے پر تفوق ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر فضیلت ہے ہاں اگر فضیلت ہے تو صرف تقویٰ کی وجہ سے۔

دوسری جگہ قرآن مجید میں آتا ہے: وَ مِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَ اَلْوَانِکُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ (روم: ۳۰: ۲۲) اس کے نشانوں میں سے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں میں اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں علم رکھنے والوں کے لئے نشان ہے۔

یہ تمام آیات قومی، لسانی اور لونی تعصبات کی جڑ پر تبر رکھ کر کاٹ رہی ہیں۔

قرآن مجید نے اس نظریہ کو عملی رنگ میں نماز اور حج کی عبادت میں پیش کیا ہے جہاں تمام انسان بلا تفریق قوم و ملت ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو کر وحدت نسل انسانی کی تصویر پیش کر رہے ہوتے ہیں۔

عصر حاضر کا انسان قومی تعصبات کے بدنتائج اور عواقب کو دیکھ کر خود اس نظریہ سے بیزار نظر آتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر ہکسلے نے 1947ء میں لکھا تھا:

"قومیت پرستی اخلاقی تباہی کا موجب ہے کیونکہ یہ عالمگیریت کے تصور کے منافی اور ایک خدا کے انکار پر مبنی ہے اور انسان کی قیمت بحیثیت انسان کچھ نہیں سمجھی۔ دوسری طرف یہ تفرقہ انگیزی کا موجب ہے۔ انانیت اور تکبر پیدا کرتی ہے۔ باہمی نفرت بڑھاتی ہے اور جنگ کو نہ صرف ضروری قرار دیتی ہے بلکہ مقدس ٹھہراتی ہے۔"

ڈاکٹر "GAULD" نے اپنی کتاب "MAN NATURE AND TIME" میں لکھتا ہے: "اب جو چیز بالکل فطری نظر آتی ہے یہ ہے تمام نوع انسانی کی ایک منظم برادری قائم کی جائے۔"

یہ ہے اسلام کے زندہ مذہب اور سچا ہونے کا ثبوت جس نظریہ تک انسان کا ذہن اب پہنچا ہے اس نظریہ کو قرآن نے چودہ سو سال قبل بیان کر دیا تھا۔

آٹھویں ضرورت: اللہ تعالیٰ کے ارادۂ ازلی کی تکمیل کرنا: خدا کا وہ ارادہ جس سے اشیاء پیدا کرتا ہے اس کی تکمیل ایک ضروری امر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا ہے کہ بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے وحی نازل کرے سو وحی وقتاً فوقتاً ضرورت کے مطابق نازل ہوتی رہی۔ اس ارادہ کی تکمیل کے لئے یہ ضروری تھا کہ اسلام اپنی مکمل صورت میں قرآن کی شکل میں نازل ہو۔ اگر قرآن مجید نازل نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کا ارادہ ازلی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات میں نقص لازم آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تمام نقائص سے منزہ اور تمام خوبیوں کی جامع ہے اس وجہ سے اسلام کا مکمل صورت میں آنا ضروری تھا۔

اسلام میں دوسرے مذاہب اور اہل مذاہب کی حیثیت

اس موضوع پر بحث کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس بارے میں اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب اور اہل مذاہب کا عقیدہ اور طرز عمل کیا رہا ہے اس کے بعد ہی اسلام کی رواداری کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

تمام مذاہب کے طرز عمل پر بحث تو طویل ہو جائے گی اس لئے دنیا کے صرف تین بڑے مذاہب یہودیت، عیسائیت اور ہندو دھرم کے عقیدہ اور طرز عمل کو زیر بحث لایا جائے گا، یہودیت اور نصرانیت ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں اور ایک دوسرے کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (البقرہ ۲: ۱۱۳) اور یہود کہتے ہیں کہ عیسائی کسی سچائی پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں یہود کسی سچائی پر نہیں حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں۔

یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ مفتری سمجھتے ہیں اور عیسائی یہود کو گمراہ اور قابل نفرت تصور کرتے ہیں۔ ان دونوں کی عداوت کی داستان سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں جب عیسائیوں کے ہاتھ میں عنان حکومت آتی تو وہ یہودی کو نیست و نابود کرنے میں کوئی وقیقہ فروگذاشت نہ کرتے۔ یہودی کا لفظ عیسائی دنیا میں دشنام کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

عہد عتیق میں انبیاء علیہم السلام پر اس قسم کے گندے اور فحش الزامات لگائے گئے ہیں جن کا مطالعہ ذوق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ اس قسم کی اخلاق سوز باتیں پڑھ کر ایک قاری یہود کے عقیدہ اور طرز عمل سے بخوبی آشنا ہو جاتا ہے۔

یہود غیر یہود کو (GENTILE) بے دین اور کافر کہتے ہیں اور اپنے آپ کو خدا کی چہیتی اور لاڈلی قوم سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ ۵: ۱۸) یعنی ہم خدا کے فرزند اور اس کے چہیتے ہیں۔

ہندو دوسرے مذاہب والوں کو ملیچھ اور چنڈال سمجھتے ہیں البیرونی قدیم ہندوؤں کی مذہبی رواداری سے متعلق لکھتا ہے:

''ہندو دین میں ہم سے کلی مغائرت رکھتے ہیں۔ دوسرے مذہب والوں کو یہ لوگ ملیچھ یعنی ناپاک سمجھتے ہیں اور ان سے ملنا جلنا، شادی بیاہ کرنا، ان کے قریب جانا، ان کے ساتھ بیٹھنا اور کھانا پینا ناجائز سمجھتے ہیں۔ جس میں کسی دوسری قوم کی آگ یا پانی سے کام لیا گیا ہو اس چیز کو ناپاک سمجھتے ہیں اور اس کی اصلاح کی کوئی شکل نہیں ہے، گونجس چیز پاک چیز سے مل کر پاک ہو سکتی ہے۔ لیکن ہندوؤں میں جو شخص ان میں سے نہیں ہے اور ان میں داخل ہونا یا ان کے مذاہب کو قبول کرنا چاہتا ہے اس کو اجازت نہیں ہے اور یہ صورت حال انسانیت کے ہر رشتے کو توڑ دیتی ہے۔

یہ لوگ رسم و رواج اور عادات و خصائل میں ہم سے اس درجہ اختلاف رکھتے ہیں کہ اپنے بچوں کو ہم سے اور ہماری وضع ولباس وغیرہ سے ڈراتے ہیں اور ہم لوگوں کو شیطان کی طرف منسوب کرتے ہیں اور شیطان کو خدا کا مخالف اور دشمن قرار دیتے ہیں اگرچہ اس کی نسبت ہم لوگوں (مسلمانوں) کی جانب کی جاتی ہے، لیکن اس سے دوسری قومیں بھی مستثنیٰ نہیں ہیں وہ سب کو شیطان سمجھتے ہیں۔

ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ملک صرف انہی کا ملک ہے۔ انسان صرف انہی کے قوم کے لوگ ہیں، بادشاہ صرف انہی کا بادشاہ ہے، مذہب صرف انہی کا مذہب ہے علم صرف وہی ہے جو ان کے پاس ہے، یہ لوگ بہت تعلّی کرتے ہیں اور جو کچھ تھوڑا بہت علم ان کے پاس ہے اس کو بہت سمجھتے ہیں اور اپنی خود پسندی کی وجہ سے جاہل رہ جاتے ہیں، ان کے اہل علم نہ صرف دوسروں بلکہ اپنی قوم کے نااہل لوگوں سے بھی علم چھپاتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان کے شہروں کے سوا دوسرے شہر ہی نہیں ہیں اور نہ ان کے شہروں کے علاوہ کہیں انسان بستے ہیں اور نہ ان کے علاوہ کسی کے پاس علم ہے اگر ان سے کہا جائے کہ خراسان اور فارس میں بھی علم ہے تو اس کو غلط سمجھیں گے۔ (کتاب الہند ملخصا)

یہ تو قدیم ہندوؤں کا نقطہ نگاہ ہے جو ہندومت کے بانی سوامی دیانند نے اسلام پر اپنی مشہور کتاب ستیارتھ پرکاش میں جس قدر ناروا اور دلخراش حملے کئے ہیں وہ ناقابل بیان ہیں۔

اسلام کی تعلیم: اسلام ایک ایسا دین ہے جس کا خدا صرف مسلمانوں کا خدا نہیں بلکہ سب جہانوں کا خدا ہے۔ سب کی ربوبیت اسی کے ذمہ ہے۔ قرآن مجید کی پہلی سورۃ "فاتحہ" میں آتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ یعنی سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو جہانوں کا پالنے والا ہے، یعنی اسلام کا رب صرف اہل عرب کا ہی رب نہیں بلکہ ہندوستان، ایران، شام، انگلستان، امریکہ، روس اور دنیا کے تمام ممالک کے رہنے والوں کا رب ہے جس نے جسمانی ربوبیت کے سامان ہر قوم کو دیے ہیں اسی طرح روحانی ربوبیت کے سامان سے بھی کسی قوم یا ملک کو خالی نہیں رکھا۔ قرآن مجید نے اس بات کو کئی جگہ بیان کیا ہے ارشاد الٰہی ہے:

وَ اِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ (فاطر ۳۵: ۲۴) یعنی ہر امت میں نذیر (ڈرانے والے) آتے رہے ہیں۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد ۱۳: ۷) یعنی ہر قوم کی طرف ہدایت دینے والے آئے ہیں۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے: لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس ۱۰: ۴۷) یعنی ہر امت کی طرف رسول آئے ہیں۔

پھر فرمایا: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَیْكَ وَ مِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَیْكَ (المومن ۴۰: ۷۸) یعنی ہم نے تجھ سے پہلے لوگوں کو ہدایت کے لیے رسول بھیجے ہیں ان میں سے بعض رسولوں کا ہم نے تجھ پر ذکر کیا ہے اور بعض کا ذکر نہیں کیا۔

پس قرآن مجید کی یہ آیات ہر مسلمان کی نگاہ میں شری مہاراج کرشن، رام چندر، بدھ، زرتشت اور کانفیوشش قابل تکریم اور تعظیم ٹھہراتی ہیں۔ اسی وجہ سے تمام مسلمانوں نے انہیں اپنی اپنی قوم کے ہادیان برحق سمجھا ہے۔

مسلمانوں کو تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (۲: ۲۸۵) اور ہر ایک خدا پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا اور ہم خدا کے رسولوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ ان سے انکار کرنا کفر اور ضلالت قرار دیا ہے۔

وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا (نساء ۴: ۱۳۶) اور جو شخص خدا کا اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا انکار کرتا ہے وہ گمراہی میں دور نکل گیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلموں کو مسجد میں ٹھہراتے ان کو ان کے طریقے پر مسجد میں عبادت کرنے کی اجازت دے دیتے۔ ایک مرتبہ نجران کے عیسائیوں کا وفد مدینہ آیا۔ آنحضرت کی خدمت میں مسجد میں حاضر ہوا۔ اس وقت ان کی نماز کا وقت آ گیا تھا۔ اس لئے انہوں نے مسجد میں ہی نماز شروع کر دی۔ بعض مسلمانوں نے روکنا چاہا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع کر دیا اور فرمایا نماز پڑھ لینے دو چنانچہ عیسائیوں نے مسجد نبویؐ کے اندر نماز پڑھی۔
(زادالمعاد اول ص ۵)

دین میں جبر نہیں: اسلام کسی دوسرے مذہب کے آدمی کو جبر سے مسلمان بنانے کا حامی نہیں، اس کا یہ واضح اعلان ہے کہ دین میں جبر نہیں۔ لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ. (بقرہ ۲: ۲۵۶)

دین میں زبردستی منوانا نہیں، ہدایت کی راہ گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ (الکہف ۱۸: ۲۹) کہہ دو کہ حق (اسلام) تمہارے رب کی طرف سے آ چکا ہے، پس جو چاہے قبول کرے جو چاہے انکار کرے۔

تبلیغ حکمت اور دانائی کے ساتھ کرنی چاہئے، ارشاد الٰہی ہے: اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (نحل ۱۶: ۱۲۵) اپنے رب کے راستہ کی طرف دانائی اور اچھی اچھی باتوں کے ذریعے بلاؤ اور بہت پسندیدہ طریقے سے بحث کرو۔

مذاہب کے باطل معبودوں کو بھی برا کہنے کی ممانعت کی ہے: لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ (انعام ۶: ۱۰۸) جو لوگ خدا کے سوا دوسرے معبودوں کی پرستش کرتے ہیں ان کو گالی گلوچ اور برا بھلا نہ کہو یہ لوگ بھی نادانی سے خدا کو برا کہنے لگیں گے۔

اسلام کا مقام دیگر مذاہب میں

جیسا کہ پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ اسلام نے تمام مذاہب کا سرچشمہ وحی الٰہی کو قرار دیا ہے۔ جہاں تورات کا ذکر کیا ہے تو اس کے متعلق یہ فرمایا ہے: فِیْهَا هُدًی وَّنُوْرٌ (مائدہ ۵: ۴۴) یعنی اس میں ہدایت اور نور ہے۔ جب تمام مذاہب سچے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرار دیئے جائیں تو پھر ہر مذہب والا کہہ سکتا ہے کہ ہمارے پاس ہماری کتاب موجود ہے، اس میں سچائی اور ہدایت کا سامان بھی ہے تو پھر ہم اسلام اور اس کی کتاب کو کیوں مانیں۔

جہاں اسلام نے دوسرے مذاہب کو اللہ کی جانب سے قرار دیا ہے تو وہاں اپنا بھی ایک ایسا ارفع مقام بیان کر دیا ہے جس کی وجہ سے دوسرے تمام مذاہب کے لوگوں کو اسلام کا ماننا ضروری ہو جاتا ہے۔ وہ ارفع مقام یہ ہے کہ اسلام تمام نبیوں کا موعود دین ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ

النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّ حِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَ لَتَنْصُرُنَّہٗ قَالَ ءَ اَقْرَرْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْھَدُوْا وَ اَنَا مَعَکُمْ مِّنَ الشّٰھِدِیْنَ (سورۃ آل عمران: ۳:۸۱) اور جب اللہ نے نبیوں کے ذریعے سے عہد لیا کہ جو کچھ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت سے دیا ہے پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہے تو تم نے ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہوگی۔ کہا کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرے عہد کا بوجھ لیتے ہو۔ انہوں نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں۔ کہا پس گواہ رہو اور میں تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔

اس مضمون کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے: وَاِنَّہٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ (الشعراء ۲۶:۱۹۶) اور بے شک یہ پہلوں کی کتابوں میں بھی ہے۔

یہ دونوں آیات ظاہر کرتی ہیں کہ اسلام تمام انبیا علیہم السلام کا موعود دین ہے اور اس کے متعلق ہر مذہب کی کتب میں پیشگوئیاں موجود ہیں۔

یہ مناسب ہوگا کہ مذاہب عالم کی کتب سے وہ پیشگوئیاں اور بشارات درج کی جائیں، جن میں بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر موجود ہے۔

بشارات کے متعلق ایک اصولی بحث

۱۔ بشارات کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ خواب کا سا مضمون رکھتی ہیں۔ عام طور پر عوام پر مشتبہ رہتی ہیں اور خواص پر بھی کبھی قرائن سے اور کبھی اس نبی کے ظہور کے وقت جس کی نسبت وہ بشارات ہیں یا اس کے اور دلائل سے ثبوت نبوت کے بعد اور اس مبشر نبی کی تفسیر سے ظہور پاتی ہیں۔ عیسائی نکتہ خیال سے تو جس کی نسبت بشارت ہو کبھی کبھی وہ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ یوحنا خود ایلیا ہونے سے انکار کرتا ہے حالانکہ مسیح علیہ السلام اسے ایلیا قرار دیتے ہیں (دیکھو ا:۲۷، متی ۱:۱۴ اور ۱:۱۷)

۲۔ بشارات میں بالعموم نام صفاتی ہوتے ہیں ذاتی نہیں۔ یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان کی قیمت اس کی صفات کے لحاظ سے ہوتی ہے نہ کہ اس کے ذاتی نام کے لحاظ سے۔ جیسے حضرت مسیحؑ کا ذاتی نام یسوع ہے، اس نام کی پیشگوئی کتب سابقہ میں نہیں پائی جاتی، مسیحؑ کے نام کی پیشگوئیاں موجود ہیں۔

۳۔ بشارات میں مقامات اور ملکوں کے نام بھی صفاتی ہوتے ہیں۔

۴۔ بشارات کی مدت سے انسانوں کی مدت مراد نہیں ہوتی۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ یعنی اللہ کے ہاں ایک دن تمہارے شمار سے ہزار برس ہوتا ہے۔

ہندوؤں کے نزدیک بھی برہما کا اور انسانوں کا سال گنتی کے لحاظ سے الگ الگ میعاد کا ہوتا ہے۔

۵۔ کسی بشارت کا کوئی حصہ عقل اور علم کے خلاف ہوگا تو وہ نا قابل قبول ہوگا۔

۶۔ بشارت کا افسانوی حصہ واقعات کی تعبیر کے مطابق قبول کیا جائے گا۔

۷۔ کسی نبی کے متعلق دوبارہ دنیا میں مبعوث ہونے کی بشارت سے مراد اس نبی کی صفات پر کسی دوسرے نبی کا مبعوث ہونا ہے۔ لوقا ۱:۱۷ میں مسیح نے ایلیا کے دوبارہ آنے کی تشریح اسی طرح کی اور جناب کرشن فرماتے ہیں کہ ہم کسی اور شکل میں حسب ضرورت اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں۔

۸۔ اگر کسی مقدس کتاب کی بشارت میں ایک ہی ہستی کے متعلق دو جہتیں ہوں گی تو اس کی ایک ہی جہت قابل قبول ہوگی۔ کیونکہ الہامی کتب تحریف کی وجہ سے کم و بیش اپنی اصلیت ضائع کر چکی ہیں۔ نیز یہ امر خود کتاب کی صداقت کے خلاف ہے کہ وہ ایک ہی ہستی کے متعلق دو مخالف و متضاد خیال رکھتی ہو۔

پارسی مذہب میں نوید آنحضرت ﷺ: زرتشتی مذہب جسے عوام پارسی مذہب کے نام سے جانتے ہیں ایران کا قدیم مذہب ہے۔ اب اس مذہب کو آتش پرست اور مجوسی دین بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی مذہبی کتب ژندی اور پہلوی دو زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ قدیم ایرانیوں کی مذہبی کتب میں دو دفتر اہم ہیں۔ ایک کا نام دساتیر اور دوسرے کا نام اوستا یا ژنداوستا ہے۔ ان کتب کے دو حصے ہیں: خورد دساتیر اور کلاں دساتیر۔ ۲۔ خورد اوستا اور کلاں اوستا۔ انہی دو کو ژند اور مہا ژند کہتے ہیں۔

جناب زرتشت کو خدا تعالیٰ نے مخاطب کر کے ژنداوستا کی کتاب ژنداوستا فروردیں یشت ۱۳ میں فرمایا:

اس کا نام فاتح مہربان اور اسی کا نام ''استوت ارینا'' (تعریف کیا گیا یا محمد) ہوگا۔ وہ رحمت کا مجسمہ ہوگا کیونکہ وہ تمام جہاں کے لئے رحمت ہوگا۔ وہ حاشر ہوگا اس لئے کامل انسان اور روحانی انسان ہونے کی وجہ سے وہ تمام لوگوں کی ہلاکت کے برخلاف مبعوث ہوگا۔ وہ مشرک لوگوں اور ایمان دار لوگوں کی اصلاح کرے گا۔ یعنی مشرکین، بت پرست اور زرتشتی مذہب کے پیروؤں کی بدیوں کی اصلاح کرے گا۔'' (جیمس ڈارمیسٹر مترجم ژنداوستا کا اس آیت پر نوٹ

فروردین یشت ۲۸ آیت ۱۲۹)

دنیا میں ایک ہی عظیم الشان رسول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے ہیں جن پر یہ پیش گوئی لفظاً لفظاً صادق آتی ہے۔ وہ تمام صفات جو اس بشارت میں بیان کی گئی ہیں وہ آپ کی ذات مقدس میں پائی جاتی ہیں۔ آپ کا فاتح مہربان ہونا فتح مکہ کے دن کو ظاہر ہوا۔ اپنے خونخوار دشمنوں کو لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (یوسف ۱۲: ۹۲) کہہ چھوڑ دیا۔ آپ ﷺ کا نام محمد ﷺ۔ آپ ﷺ کا رحمۃ للعالمین ہونا، جبکہ آپ ﷺ سے قبل تمام انبیاء صرف اپنی اپنی قوم کے لئے رحمت تھے۔ آپ ﷺ کا حاشر ہونا یعنی آپ ﷺ کے قدموں پر دنیا کی تمام قوموں کا اکٹھا ہونا، بت پرستوں کی اصلاح کرنا۔ یہ صرف رسول کریم ﷺ کی خصوصیات ہیں۔

مہاتما بدھ کی پیشگوئی: مہاتما بدھ کی ایک پیشن گوئی میتیا (METTEYYA) کی آمد پر مشتمل ہے چنانچہ "چکاوتی سنگھ ناد" ستنا ڈی ۳:۶۔۷ میں لکھا ہے۔

ترجمہ: بھائیو: اس وقت دنیا میں ایک اعلیٰ ہستی مبعوث ہوگی۔ اس کا نام برگزیدہ میتیا ہوگا۔ کامل معرفت والا۔ حکمت، نیکی اور سرور مطلق والا۔ تمام عالمین کا عالم بےنظیر۔ ہدایت کے متمنی لوگوں کا ہادی۔ ملائکہ اور انس کا معلم۔ ایک بدھ اعظم جیسا میں اس وقت ہوں۔ وہ خود کامل طور پر جانے گا اور دیکھے گا۔ گویا کہ یہ کائنات اس کی رو برو اپنی ساری ارواح عرفا جن وشیاطین برہموں کشتریوں، ویشوں (علماً اہل سیاست اور کاروباری لوگوں) کے ساتھ موجود ہے۔ جیسا کہ میں برائی العین اسے دیکھ اور جان رہا ہوں۔ صداقت اپنی اصل پیاری کامل اپنی اٹھتی ہوئی خوبصورتی میں ہوگی اور اعلیٰ زندگی کی معرفت مع اپنے کمال و صفائی اصلی روح اور الفاظ دونوں کی وساطت سے ظاہر کی جائے گی۔ جیسا کہ میں اب ظاہر کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہزاروں صحابہ کی جماعت ہوگی جیسا کہ میرے ساتھ چند سو کی جماعت ہے (بدھ کی کتب مقدسہ جلد ۴ صفحہ ۷۳، ۷۴)

لفظ میتیہ کے معنی سنسکرت اور پالی لغت میں: جس طرح اس نام کا تلفظ مختلف کتابوں میں مختلف ہے اسی طرح اس کے معنی میں بھی خفیف سا اختلاف ہے۔

- الف۔ میتر یا کے معنی سنسکرت لغت میں مہربان، دوست یا رؤف الرحیم کے ہیں۔ (سنسکرت انگلش ڈکشنری مولفہ مونیر ولیم صفحہ ۱۸۱)
- ب۔ بودھی ستو کا نام اور آئندہ آنے والے بدھ کا نام جو موجودہ دور عالم کا پانچواں بدھ ہوگا۔ (بدھ ازم مذکورہ صفحہ ۱۸۱)
- ج۔ یہ لفظ میتری سے ہے۔ جس کے معنی دوستی، خیر خواہی کے ہیں۔ (کتاب مذکور صفحہ ۱۲۸)
- د۔ معلم محبت ہے۔ رحمۃ للعالمین۔ اقرب فی المودۃ۔
- ہ۔ پالی لغت میں اس کے معنی دوستی، رحم، رحمت، محبت، شفقت، ہمدردی، مخلوق کی خیر خواہی ہیں (پالی ڈکشنری مصنفہ ولیم سٹیڈ)

اس پیشگوئی میں میتیہ کا لفظ قابل غور ہے جس کے معنی مہربان دوست یا رؤف الرحیم ہیں۔ قرآن مجید نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس صفت کا حامل قرار دیا ہے جس کی شہادت آپؐ کی سوانح زندگی میں موجود ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

- الف۔ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانبیاء ۲۱: ۱۰۷) آپ کو تمام قوموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔
- ب۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل ۳: ۱۵۹) سو اللہ کی رحمت سے تو ان کے لئے نرم ہے اور اگر تو سخت کلام سخت دل ہوتا تو تیرے اردگرد سے بکھر جاتے۔
- ج۔ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (۹: ۱۲۸) یقیناً تمہارے پاس تمہی میں سے ایک رسول آیا ہے تمہارا تکلیف پانا اس پر شاق گزرتا ہے وہ تمہارے لئے بھلائی کا خواہش مند ہے مومنوں پر مہربان رحم کرنے والا ہے۔

میتیہ کے دوسرے معنی معرفت، حکمت، نیکی وعلم، تعلیم وہدایت میں کمال رکھنے والے کے ہیں۔ یہ تمام صفات رسول کریمؐ میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

قرآن مجید کے متعلق پیشگوئی: مہاتما بدھ کے اصل الفاظ کا ترجمہ کتب مقدسہ جلد ۴ صفحہ ۴۷ پر یوں دیا ہے:

The truth lovely in consummation will be proclaimed both in the spirit and in the letter.

"پیغام حق اپنی دلنواز تکمیل اور روز افزوں خوبصورتی میں جان اور حروف دونوں میں شائع کیا جائے گا"

اس ایک جملہ میں قرآن مجید کے اکثر خصائص بیان کردیئے ہیں جو دنیا کی کسی کتاب کو میسر نہیں۔

۱۔ وہ پیغام حق ہے۔

۲۔ قلوب پر اثر انداز ہونے والا ہے۔

۳۔ اس کی صداقت روز بروز کھل کر سامنے آئے گی۔

۴۔ حفاظ کے سینوں میں محفوظ رہے گا۔

۵۔ احاطہ تحریر میں آ کر اس کا ایک ایک حرف محفوظ ہو جائے گا۔

اہل ہنود کی کتب مقدسہ میں پیشگوئی: مہر دیاس ہندوؤں کے ایک بڑے مرتاض اور صفا کیش رشی مانے جاتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی تالیف ۱۸ مجلدات پر ان ہیں۔ ان پرانوں کے ۱۸ سمندر ہیں۔ ایک بڑے پایہ کی کتاب بھوشیہ پران ہے جس میں آئندہ کی خبریں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے پرتی سرگ پر ۳ کھنڈ ۳ ادھیاء ۳ شلوک ۵ تا ۸ میں یہ بشارت موجود ہے۔

پیش گوئی کا ترجمہ: ایک ملیچھ یا اجنبی ملک اور زبان کا معلم روحانی اپنے صحابہ کے ساتھ آئے گا اس کا نام محمد ہو گا۔ راجہ بھوج نے اس مہا دیو (ملائک سیرت) عرب کے رہنے والے کو آب رودگنگا اور پنچ گویہ سے غسل کرا کے (یعنی گناہوں سے پاک ٹھہرا کر) دلی ارادت سے نذر و نیاز پیش کر کے اس کی تعظیم کی اور کہا میں تیرے حضور جھکتا ہوں۔ اے فخر نسل انسانی عرب کے رہنے والے! شیطان کے مارنے کے لئے بہت سی طاقت مہیا کرنے والے دشمن ملیچھوں سے محافظت کئے گئے ہو۔ اے پاک ہستی مطلق اور سرور کامل کے مظہر میں تیرا غلام ہوں مجھ کو اپنے قدموں میں آیا ہوا جانئے۔

اس بشارت کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اس بشارت میں حضور کا نام محمد ﷺ صاف بتا دیا ہے۔

۲۔ ملک عرب کا آپ کو رہنے والا بتایا ہے۔ (لفظی معنی مرد ستھل کے ریگ زار کے ہیں)

۳۔ آپؐ کے صحابہؓ کا ذکر خصوصیت سے کیا، شاید ہی دنیا میں کوئی اور نبی آیا ہو گا۔ جس نے اپنے پیروکار کو اپنے رنگ میں اتنا رنگین کیا ہو۔

۴۔ وہ گناہوں سے پاک فرشتہ سیرت ہو گا۔

۵۔ ہندوستان کا راجہ اس سے دلی عقیدت رکھے گا۔

۶۔ آپ کی دشمنوں سے حفاظت ہو گی۔

۷۔ آپ ہر قسم کی بدی کو مٹانے والے ہوں گے۔

۸۔ آپ خدا کے مظہر اتم ہوں گے۔

۹۔ مہرشی اپنے آپ کو آپ کے قدموں میں آیا ہوا قرار دیتا ہے۔

۱۰۔ آپ کو فخر نسل انسانی بتایا ہے۔

یہ بشارت اس قدر صاف اور واضح ہے جس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں۔

اتھروید میں رسول کریم ﷺ کی بشارت: کنتاپ سوکت کا پہلا منتر آنحضرت ﷺ کا اسم مبارک۔

ترجمہ: یہ سنو اے لوگو! ایک قابل تعریف تعریف کیا جائے گا۔ اے کورم ہم نے دشمنوں کے بیچ میں ساٹھ ہزار اور نوے ہزار لئے ہیں۔" یہ ترجمہ پنڈت راجہ رام صاحب پروفیسر ڈی اے وی کالج نے کیا ہے۔

"اے لوگو! یہ احترام سے سنو لوگوں میں تعریف والا انسان تعریف کیا جائے گا۔ اے زمین پر خوش خرامی کرنے والے بادشاہ ساٹھ ہزار نوے دشمنوں کو اکھاڑ پھینکنے والے بہادروں میں ہم پاتے ہیں۔" اتھروید کانڈ ۲۰ سوکت ۱۲۷ منتر) یہ ترجمہ پنڈت کھیم کرن الہ آبادی نے کیا ہے۔

اس بشارت کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ آپ کا نام محمد ﷺ ہو گا۔

۲۔ وہ شہزادۂ امن ہو گا۔

۳۔ دشمنوں کی کثرت میں خدا اس کی حفاظت کرے گا۔

یہ تینوں امور رسول کریم ﷺ کی ذات اقدس میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔

سام وید میں احمد ﷺ رسول اللہ کی بشارت: ترجمہ: احمد ﷺ نے اپنے رب سے پُر حکمت شریعت کو حاصل کیا، میں سورج کی مانند (اس سے) روشن ہو رہا ہوں (پرپاٹھک ۲ کھنڈ ۶ کا منتر ۸) اس بشارت میں مندرجہ ذیل امور کا ذکر ہے:

ا۔ حضور کا نام احمد ہے۔

ب۔ آپ کو شریعت دیئے جانے کا ذکر ہے۔

ج۔ شریعت کے ساتھ حکمت ملنے کا بھی اظہار ہے۔

د۔ اس بشارت کو دیکھتے وقت رشی آفتاب رسالت کے نور سے منور ہو رہا ہے۔

تورات مقدس میں مثیل موسیٰ کی پیشگوئی: موسیٰ کی پانچویں کتاب استثناء باب ۱۸ آیات ۱۷ تا ۲۲ میں ملاحظہ کریں۔

''میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے کہوں گا وہ سب ان سے کہے گا اور ایسا ہوگا کہ جو میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا، نہ سنے گا، تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔ لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے گا اور اگر تو دل میں کہے میں کیونکر جانوں کہ یہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں تو جان رکھ کہ جب نبی کچھ خداوند کے نام سے کہے اور وہ جو اس نے کہا ہے پورا نہ ہو، یا واقع نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی بلکہ نبی نے گستاخی سے کہی تو اس سے مت ڈر۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک کسی نبی نے ایسا دعویٰ نہیں کیا جیسا کہ بشارت میں مذکورہ ہے اور یہودی برابر موسیٰ جیسے ایک نبی کو آمد کے منتظر چلے آتے تھے۔

چنانچہ یوحنا ۱: ۱۹۔۲۳ میں ہے کہ لوگوں نے یوحنا بپتسمہ دینے والے سے دریافت کیا کہ تو مسیح ہے تو اس نے کہا: نہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ کیا تو الیاس ہے تو اس نے کہا: نہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ کیا تو وہ نبی ہے تو اس نے کہا: نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہود کو ایک مسیح کی آمد کا انتظار تھا اور ایک الیاس کی دوبارہ آمد کا۔ تیسرے کسی ''وہ نبی'' کا جس کی اس قدر شہرت تھی وہاں نام لینے کی بھی ضرورت نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ مسیح اور الیاس کی دوبارہ آمد کے سوائے جو بشارت یہود میں مشہور تھی وہ صرف مثیل ہی کی تھی جو استثناء میں مذکور ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسیح کے ظہور سے پہلے یہودی انبیاء کے منتظر تھے: ایک مسیح کا ایک الیاس کی دوبارہ آمد کا ایک مثیل موسیٰ نبی کا اب حضرت عیسیٰ نے مسیح ہونے کا دعویٰ کیا۔ حضرت یحییٰ الیاس کی دوبارہ آمد کے مصداق قرار پائے مگر ''وہ نبی'' کے مثیل ہونے کا دعویٰ نہ حضرت مسیح نے کیا، اور نہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے۔ ان کے بعد بنی اسرائیل میں سلسلہ نبوت ختم ہو جاتا ہے۔ اور بنی اسماعیل میں حضرت رسول کریم ﷺ نے دعویٰ نبوت کیا اور مثیل موسیٰ ہونے کا دعویٰ کیا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (المزمل ۷۳: ۱۵) ترجمہ یعنی ہم نے تمہاری طرف ایسا رسول ﷺ بھیجا ہے جو تم پر گواہ ہے جیسا کہ فرعون کی طرف بھیجا۔

قرآن مجید نے بار بار یہ دعویٰ کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مثیل موسیٰ ہیں۔

دس ہزار قدوسیوں والی پیش گوئی: ''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لئے تھی۔'' (استثنا)

سینا سے آنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہے جو سینا سے نکلا۔ سعیر سے جس کے پاس بیت لحم اور ناصرہ ہے حضرت مسیح علیہ السلام ظاہر ہوئے۔

وہ کونسا فاران ہے جس میں سے خدا ظاہر ہوا۔ جہاں سے مسیح کے بعد رسول نکلا۔ اس پر روشن شریعت نازل ہوئی۔ وہ کون سا دین ہے جو فاران سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل گیا۔ وہ مکہ کی وادی غیر ذی زرع ہے جہاں ایک امی نبی پر خدا کی آخری مقدس شریعت نازل ہوئی اور تمام دنیا میں پھیل گئی۔

دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آنے والا ایک ہی انسان دنیا کی تاریخ میں ہے یعنی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جو دس ہزار مقدس انسانوں کے ساتھ فاتحانہ شان میں مکہ میں داخل ہوئے۔

انجیل مقدس میں رسول کریم ﷺ سے متعلق نوید احسن: ایک اور تمثیل سنو: ایک گھر کا مالک تھا جس نے انگورستان لگایا اور اسے چاروں طرف سے گھیرا اور اس میں حوض کھودا اور برج بنایا اور اسے باغبانوں کو ٹھیکہ پر دے کر پردیس چلا گیا اور جب پھل کا موسم قریب آیا تو اس نے اپنے نوکروں کو پکڑ کر کسی کو پیٹا اور کسی کو قتل کر دیا اور کسی کو سنگسار کیا۔ پھر اس نے اور نوکروں کو بھیجا جو پہلوں سے زیادہ تھے اور انہوں نے ان کے ساتھ بھی اسی طرح کیا۔ آخر اس نے اپنے بیٹے کو ان کے پاس یہ کہہ کر بھیجا کہ وہ میرے بیٹے کا لحاظ کریں گے۔ جب باغبانوں نے بیٹے کو دیکھا تو آپس میں کہا کہ یہی وارث ہے اسے قتل کر کے اس کی میراث پر قبضہ کر لیں اور اسے پکڑ کر باغ سے باہر نکالا اور قتل کر دیا۔ پس جب باغ کا مالک آئے گا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔

انہوں نے اس سے کہا: ان برے آدمیوں کو بری طرح ہلاک کرے گا اور باغ کا ٹھیکہ اور باغبانوں کو دے گا جو موسم پر اس کو پھل دیں (متی ۲۱: ۴۳)

باغ لگانے والا خداوند بنی اسرائیل ہے (یسعیاہ ۵ باب ۲۔۳)

انگور بنی اسرائیل کی قوم ہے ۸ زبور، ۹ تاکستان یروشلم ہے غزل الغزلات ۸ باب ۱۳ یسعیاہ ۵ باب ۳۔۵۔۱۷)

اور موسم پر ایک نوکر باغبانوں کے پاس بھیجا تا کہ وہ اس انگور کے باغ کا پھل اس کو دیں لیکن باغبانوں نے اس کو پیٹ کے خالی ہاتھ پھیرا۔
(تفسیر دیکھو یرمیاہ ۲۷ باب ۲۵، ۲۸)

پھر اس نے دوسرے نوکر کو بھیجا، انہوں نے اس کو پیٹ کر اور بے عزت کر کے خالی ہاتھ پھیرا۔ تفسیر: یہ شخص اوریا تھا۔ یرمیاہ ۲۶ باب ۲۳۔ یہ اس لئے کہ متی ۲۱ باب ۳ میں مار ڈالنا لکھا ہے۔ پھر اس نے تیسرے کو بھیجا انہوں نے اسے گھائل کر کے نکال دیا۔ تفسیر ۲ تاریخ ۲۴ باب ۲۱۔ تب باغ کے مالک نے اپنے بیٹے (یہ مسیح ہیں) کو بھیجا شاید اسے دیکھ کر دب جائیں۔

جب باغبانوں نے بیٹے کو دیکھا تو آپس میں کہا کہ یہی وارث ہے، اسے قتل کر کے اس کی میراث پر قبضہ کر لیں اور اسے پکڑ کر باغ سے باہر نکالا اور قتل کر دیا۔

یہاں بیٹے سے مراد صلح کار کے ہیں۔ بیٹے کا لفظ کتب مقدسہ میں وسیع معانی میں استعمال ہوا ہے۔ متی ۵ باب ۹ لکھا ہے: مبارک وے جو صلح کار ہیں کیونکہ خدا کے فرزند کہلائیں گے اور مسیح صلح کا شاہزادہ ہے۔

مار ڈالا سے مراد سخت ایذائیں ہیں۔

آخر کار باغ کا مالک آئے گا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا کرے گا۔ انہوں نے اس سے کہا ان برے آدمیوں کو بُری طرح ہلاک کرے گا اور باغ کا ٹھیکہ اور باغبانوں کو دے گا جو موسم پر اس کو پھل دیں گے۔

مالک خود آئے گا۔

بیٹے کے قتل کے بعد باغبانوں کو سزا دینے کے لئے مالک خود آئے گا یعنی خدا خود آئے گا۔ اس سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آمد ہے۔ خدا کے آنے سے مراد وہ شخص کامل ہے جو الوہیت کا مظہر اتم ہے، اس میں تمام صفات الٰہیہ ظلی طور پر بدرجہ اتم پائی جائیں۔

باغ کا ٹھیکہ اور باغبانوں کو دے گا سے مراد یہ ہے کہ نبوت بنی اسرائیل سے چھین کر بنی اسماعیل کو دے دی جائے گی۔ متی ۲۱ باب ۴۳ میں ہے۔ اس لئے میں تمہیں کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جاوے گی اور ایک قوم کو جو اس کے پھل لاوے دی جائے گی۔

مذکورہ بالا انگورستان کی تمثیل کے بعد ایک اور تمثیل اس کی تشریح میں بیان کی:

”کیا تم نے یہ نوشتہ نہیں پڑھا کہ وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا وہ کونے کا سرا ہوا۔ یہ خدا کی طرف سے ہوا اور ہماری نظروں میں عجیب ہے۔“
(مرقس ۱۲: ۵، ۱۱)

”جو اس پتھر پر گرے گا چور ہو جائے گا پر جس پر وہ گرے اسے پیس ڈالے گا۔“ (متی ۲۱: ۴۴، ۴۵) ”پھر وہ کیا ہے؟ جو لکھا ہے کہ وہ پتھر جسے راج گیروں نے رد کیا وہی کونے کا سرا ہوا ہر ایک جو اس پتھر پر گرے چور ہو گا اور جس پر وہ گرے اسے پیس ڈالے گا“
(لوقا ۲۰: ۱۷، ۱۸)

معماروں سے مراد بنی اسرائیل ہیں جو ہمیشہ اپنے بنی اسماعیل کو رد کرتے رہے۔ آخر کار ان میں سے ہی رسول کریم صلہ اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ جو کونہ کا پتھر ہے جس سے نبوت کی عمارت کی تکمیل ہوئی۔

تمثیلی زبان میں حضرت مسیح علیہ السلام نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ بیٹے کو صلیب دیئے جانے کے بعد خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک اور مامور ظاہر ہو گا جو کونے کا پتھر کہلائے گا۔ عبری میں لفظ پنہ ہے جو کونے کے پتھر کے معنی دیتا ہے لیکن لغت میں اس سے مراد شہر کی عمارت کی زمین کی حفاظت کے برج کا وہ محافظ پتھر ہے جو سب کی حفاظت کرتا ہے۔ چنانچہ سلاطین دوم ۱۴: ۱۳، یرمیاہ ۳۱: ۴۰، سلاطین اوّل ۷: ۳۴، ایوب ۳۸: ۹، تواریخ دوم ۲۸: ۲۴ اور ۲۶: ۱۵ میں یہ لفظ انہیں معنوں میں استعمال ہوا ہے اور صفنیاہ ۳: ۶ میں قوموں کی حفاظت کا پتھر معنی دیتا ہے۔ ان معنوں کے علاوہ یہ سب کے سردار، سب پر حکمران اور سب کے محافظ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ دیکھو یشوع ۲۰: ۲، سموئیل ۱۴: ۳۸، یسعیاہ ۱۹: ۱۳، زکریا ۱۰: ۴)

ان معنوں کی بناء پر کونے کا پتھر رسول کریم صلہ اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جس نے تمام انبیاء علیہم السلام اور مذاہب کی تصدیق کی اور تمام کو من جانب اللہ قرار دیا۔

اس بشارت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ پتھر جس پر گرے گا وہ بھی چور چور ہو جائے گا اور جو اس پتھر پر گرے گا وہ بھی چور چور ہو جائے گا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بشارت بھی آپ کی ذات بابرکات سے پوری ہوئی کہ جنہوں نے آپؐ کے ساتھ مقابلہ کیا وہ بھی ہلاک ہوئے اور جن کے ساتھ آپؐ نے مقابلہ کیا وہ ہلاکت کے گڑھے میں گرے۔

احمد ﷺ کی آمد کے متعلق بشارت: حضرت مسیحؑ نے اپنی جدائی کی خبر دیتے ہوئے اپنے غمگین حواریوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

۱۵۔ اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو میرے حکموں کو مد نظر رکھو۔

۱۶۔ میں باپ سے دعا کروں گا اور وہ تمہیں ایک دوسرا فارقلیط دے گا جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔

۱۷۔ روح حق جسے دنیا حاصل نہیں کر سکتی، کیونکہ وہ اسے نہیں دیکھتی اور نہ اسے جانتی ہے (مگر تم اسے پہچانو گے کیونکہ وہ تم میں ہمیشہ رہے گا)

۱۸۔ میں تمہیں یتیم نہ چھوڑوں گا، میں تمہارے پاس آؤں گا۔ (یوحنا باب ۱۴: ۱۸، ۱۹) مگر جب فارقلیط آئے گا جسے میں تمہارے پاس باپ کے پاس سے بھیج دوں گا روح حق جو باپ سے آئے گی وہ میری شہادت دے گی (یوحنا باب ۱۵ آیت ۲۶)

۷۔ تاہم میں تمہیں سچ کہتا ہوں میرا جانا ہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط تمہارے پاس نہ آئے گا۔ اگر میں جاؤں تو میں اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔

۸۔ جب وہ آئے گا تو وہ دنیا کو گناہ، نیکی اور عدالت سے ملزم گردانے گا۔

۹۔ گناہ سے اس لئے کہ انہوں نے مجھے نہیں مانا۔

۱۰۔ صداقت سے اس لئے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے اب نہ دیکھو گے۔

۱۱۔ عدالت سے اس لئے کہ دنیا کا سردار آزمایا جائے گا۔

۱۲۔ میری اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو میں تمہیں کہنا چاہتا ہوں، مگر تم میں ابھی ان کی برداشت نہیں۔

۱۳۔ البتہ جب وہ روح حق آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی طرف رہنمائی کرے گی۔ کیونکہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گی مگر جو کچھ وہ سنے گی وہی کہے گی اور وہ تمہیں آئندہ کی خبریں دے گی۔ (یوحنا باب ۱۶، آیات ۷۔۱۳)

لفظ فارقلیط پر بحث: فارقلیط کا صحیح ترجمہ پیراکلیٹوس ہے۔ یہ یونانی لفظ ہے جس کے معنی احمد ہیں سیل نے قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ عبرانی لفظ فارقلیط کے معنی احمد ہیں۔ مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ مسلمانوں نے انجیل برنباس میں تحریف کر کے پاراکلیٹ کو پری کلیوطاس بنا دیا ہے جس کے معنی ستودہ یعنی احمد ہیں۔

پس عیسائیوں کے اپنے اقرار کے مطابق فارقلیط کے معنی احمد ہیں جس کے متعلق مسیحؑ نے اپنے بعد آنے کی بشارت دی تھی۔ فارقلیط والی بشارت کو پڑھ کر کئی نیک دل راہب دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

قرآن مجید میں بھی آتا ہے: وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰۃِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ فَلَمَّا جَآءَھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا ھٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (الصف ۶:۶۱) اور جب عیسیٰ بن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا رسولؐ ہوں۔ میں تصدیق کرتا ہوں تو راۃ میں سے اس کو جو میرے سامنے ہے اور بشارت دیتا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہے۔ سو جب وہ ان کے پاس کھلے دلائل لے کر آ گیا تو انہوں نے کہا یہ ایک صریح جادو ہے۔

انجیل یوحنا میں فارقلیط (احمد) سے متعلق جتنی نشانیاں بیان ہوئی ہیں وہ سب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود سے پوری ہوتی ہیں اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ بشارت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے۔

جب یہ واضح ہو گیا کہ اسلام دین موعود ہے جس کے متعلق تمام سابقہ انبیاء علیہم السلام نے پیشگوئیاں کی تھیں تو اس سے منطقی طور پر حسب ذیل باتیں مستنبط ہوتی ہیں جن سے تمام مذاہب عالم میں دین اسلام کو ایک ارفع مقام حاصل ہو جاتا ہے۔

۱۔ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔

۲۔ دین اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔

۳۔ دین اسلام کے بعد کوئی نیا دین نہیں آئے گا۔

اسلام کی عالمگیریت: جیسا کہ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ابتداء میں سب اقوام عالم ایک دوسرے سے الگ تھلگ پڑی ہوئی تھیں اور ان کی ذہنی اور روحانی استعدادیں بھی اتنی نہیں تھیں کہ وہ ایک مکمل شریعت برداشت کر سکتیں۔ تو اس وجہ سے یہ ضروری تھا کہ ہر ایک قوم میں الگ الگ نبی آتے اور ان کی استعدادوں اور ضرورتوں کے مطابق الگ الگ شریعت لاتے۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ شریعت کو نامکمل چھوڑ رہے ہیں۔ انجیل یوحنا باب ۱۶: صفحہ ۷، ۸، ۱۲، ۱۳ میں لکھا ہے۔

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ تسلی دہندہ تمہارے پاس نہ آوے گا۔ مجھے تم سے اور باتیں بھی کہنی ہیں مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔"

یہ ضروری تھا کہ انسانی استعدادیں ارتقائی منازل طے کر کے بلوغت کو پہنچ جائیں اور اس قابل ہو جائیں کہ وہ مکمل شریعت کو برداشت کر سکیں، اور وقت آ جائے کہ تمام اقوام عالم آپس میں ملنا شروع کر دیں۔ تو یہ ضروری تھا کہ اس وقت ایک ایسا رسول آئے جو عالمگیر شریعت لائے، جو ہر قوم اور ہر زمانہ کے لئے ہو تا کہ اقوام عالم کی باہمی منافرت اور مغائرت دور ہو کر ایک عالمگیر اخوت قائم ہو جائے اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ ہر نبی اپنی قوم سے یہ عہد لیتا کہ جب وہ موعود نبی عالمگیر اخوت قائم ہو جائے۔ اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ ہر نبی اپنی قوم سے یہ عہد لیتا کہ جب وہ موعود نبی عالمگیر شریعت لائے تو اس کو ضرور ماننا اور اس موعود نبی کی مدد کرنا۔ اگر ہر نبی اس موعود نبی کی بشارت نہ دیتا تو اس کی امت یہ عذر کر سکتی تھی کہ وہ اپنے قومی مذہب کو ترک نہیں کر سکتی۔

دنیا میں کوئی ایسی کتاب نہیں اور نہ مذہب جس نے عالمگیر ہونے کا دعویٰ کیا ہو، سوائے اسلام کے قرآن مجید میں آتا ہے:
وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (سبا ۳۴: ۲۸) اور اے محمدؐ! ہم نے تم کو سارے لوگوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، لیکن اس بات کو اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

ایک دوسری آیت ہے: قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا ۨ الَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (اعراف ۷: ۱۵۸) اے نبی کہہ دیجئے کہ میں تم سب لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (انبیاء ۲۱: ۱۰۷) ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

کان کل نبی یبعث الی قومہٖ خاصۃ وبعثتُ الی کل احمر واسود (مسلم باب المساجد) ہر ایک نبی اپنی خاص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں تمام سرخ اور سیاہ اقوام کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

یہ آیات اور حدیث اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔

دین اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے: دین اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس کی مقدس کتاب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے، ارشاد الٰہی ہے: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (مائدہ ۵: ۳) آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے تمہارا دین اسلام ٹھہرا کر راضی ہوا ہوں۔

اسلام کے مکمل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ انسان کی زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی راہنمائی کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ (الانعام ۶: ۳۸)

یعنی نوع انسان کی ضرورت کی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس میں بیان نہ ہوئی ہو۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ (۹۸: ۳) اس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں۔

یعنی اس قرآن میں تمام کامل صداقتیں اور علوم اول و آخرین جمع ہیں۔

دین اسلام کے بعد کوئی نیا دین اور نبی نہیں آئے گا: دین اسلام کا کامل ہو جانا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ سلسلہ نبوت ترقی اور ارتقاء کی تمام منازل طے کر چکا ہے، اب مزید ترقی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس طرح اکمال دین خاتم نبوت ہے نبوت کے ختم ہونے کے بارے میں قرآن مجید میں آتا ہے: مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (احزاب ۳۳: ۴۰) محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسولؐ

اور خاتم النبیین ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاتم النبیین کی تفسیر ذیل کے ارشادات میں فرمائی ہے۔

۱۔ انا خاتم النبیین لا نبی بعدی. میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد ہوئی نبی نہیں۔

۲۔ ان النبوة والرسالة قد انقطعت فلا نبی بعدی ولا رسول. نبوت اور رسالت کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے اب میرے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ کوئی رسول۔

۳۔ مثلی ومثل الانبیاء کمثل رجل بنیٰ بیتاً فاحسنه و اجمله الاموضع لبنة فجعل الناس یطو فون حوله و یتعجبون هلا و ضعت هذه البنة انا هذه البنة و انا خاتم النبیین یعنی میری اور دوسرے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے مکان بنایا ہو اور اس کو ہر لحاظ سے خوبصورت کیا ہو، ہاں صرف ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی گئی ہو لوگ اس مکان کے گرد گھومنے لگے اور تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے کہ یہ آخری اینٹ کیوں نہیں لگائی وہ آخری اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔

قرآن مجید کے اوّل مفسر رسول کریم ﷺ ہیں اور وہی مہبط وحی ہیں۔ جس آیت کی تفسیر آپ کی زبان مبارک سے نکلی ہے وہ صحیح ہے اور اس کو نہ ماننا دائرہ اسلام سے خارج ہونا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے خاتم النبیین کی تفسیر لا نبی بعدی بیان کی ہے جس کے معنی ہیں میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ لا نفی جنس کا ہے جس نے نبوت کے اجراء کی ہر لحاظ سے نفی کی ہے۔

یہ کہنا کہ بغیر شریعت کے نبی آ سکتا ہے، یہ نبوت کی حقیقت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ نبی میں ایک امتیازی خصوصیت پائی جاتی ہے وہ یہ کہ جبرئیل علیہ السلام کا وحی نبوت لے کر اس پر نازل ہونا۔ وحی نبوت کا نازل ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ شریعت ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ کیونکہ وحی نبوت احکام الٰہیہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ اسلام کی موجودگی میں نئے احکام الٰہیہ کے نازل ہونے کی گنجائش ہی نہیں کیونکہ قرآن مجید دین اسلام کو اکمل قرار دیتا ہے۔

پس جو شخص نبوت کے جاری ہونے کا قائل ہے وہ دراصل اسلام کو کامل دین نہیں سمجھتا۔ پس دین اسلام کامل ہو چکا ہے۔ اب زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس کی راہنمائی یہ دین نہ کرتا ہو۔ اس دعویٰ اور اعلان کے ہوتے ہوئے اجرائے نوبت کا قائل ہونا، پھر مدعی نبوت کے ماننے کو جزو ایمان قرار دینا اور دنیا کے تمام مسلمانوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینا نہایت ہی افسوس ناک اور نقصان دہ امر ہے۔ اجرائے نبوت کے عقیدہ سے صرف امت اسلامیہ کا اتحاد ہی پارہ پارہ نہیں ہوتا بلکہ اسلام کا ہی تختہ الٹتا ہے۔

وحدت الادیان

اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت ربوبیت کے تحت جس طرح ہر قوم کو اس کی جسمانی پرورش کے لیے خوراک بہم پہنچائی اسی طرح اس نے ہر ایک قوم میں اس کی روحانی اور اخلاقی نشوونما اور ترقی کے لئے انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ (فاطر ۳۵:۲۴) یعنی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔ پھر فرمایا: وَ لِکُلِّ اُمَّةٍ رَسُوْلٌ (یونس ۱۰:۴۷) ہر قوم کے لئے رسول ہے۔ وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَسُوْلاً (النحل ۱۶:۳۶) اور یقیناً ہم نے ہر قوم کے لئے ایک رسول بھیجا۔

تمام انبیا علیہم السّلام ایک ہی روحانی چشمہ سے سیراب ہو کر ضرورت کے مطابق احکام الٰہیہ لے کر آتے رہے ہیں۔ ان احکام الٰہیہ کی آخری اور تکمیلی شکل اسلام ہے۔ احکام الٰہیہ کی تین شاخیں ہیں۔ توحید، عبادت اور معاملات۔ یہ وہ تین امور ہیں۔ جن کی انبیاء علیہم السلام زمانہ کے تقاضے کے مطابق اپنی اپنی قوم میں تبلیغ اشاعت کرتے رہے اور یہی وہ امور ہیں جن پر تمام مذاہب حقہ کا اتفاق ہے۔ جزئیات احکام میں ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب اختلاف ہوسکتا ہے۔ لیکن دین کے اصل اصول میں سر مو اختلاف نہیں۔ اس نظریہ کو قرآن مجید میں اس طرح واضح کیا گیا ہے۔ شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَ مَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ کَبُرَ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَیْهِ ط اَللّٰهُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَهْدِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ (الشوریٰ ۴۲:۱۳) اس نے تمہارے لئے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس کا نوحؑ کو حکم دیا تھا اور جو ہم نے تیری طرف وحی کی اور جس کا ہم نے ابراہیمؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا کہ دین کو قائم رکھو، اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ مشرکوں پر وہ دین گراں ہے جس کی طرف تم ان کو بلاتے ہو۔ اللہ اپنے لئے جسے چاہتا ہے، چن لیتا ہے اور اسے اپنی طرف ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرح رجوع کرتا ہے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین وہی ہے جو نوحؑ کا تھا ابراہیمؑ کا تھا موسیٰ کا تھا عیسیٰؑ کا تھا۔ اسی وحدت کو قرآن مجید نے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْـًٔا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (آل عمران ۳:۶۴) کہہ اے اہل کتاب اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے ۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں بعض بعض کو اللہ کو چھوڑ کر رب نہ بنائے۔ اور اگر وہ پیٹھ پھیر لیں تو کہو تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔

اگر تم مذاہب عالم کا بنظر عمیق مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔ ذات باری کا عقیدہ تمام مذاہب عالم میں امر مشترک ہے اللہ تعالیٰ نے اس امر مشترک کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْۤ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء ۲۱:۲۵) اور تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف ہم (یہی) وحی کرتے تھے کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں سو میری عبادت لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل ۱۶:۳۶) اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور جھوٹے معبودوں سے بچو۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ اَنَا اَوْلَی النَّاسِ بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَالْاَنْبِیَاءُ اِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ اُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰی وَ دِیْنُهُمْ وَاحِدٌ (صحیح بخاری کتاب الانبیاء) میں سب لوگوں سے عیسیٰ بن مریم سے دنیا اور آخرت میں قریب ہوں تمام انبیاء آپس میں علاتی بھائی ہیں کہ ان کی مائیں جدا جدا ہیں اور دین ایک ہے۔

باب ۲

اسلامی تعلیمات کے مآخذ

قرآن مجید

قرآن مجید کی تعریف: قرآن مجید کی جامع مانع تعریف یہ ہے کہ "قرآن وہ کلام معجز ہے جسے آنحضور ﷺ پر نازل کیا گیا ہے۔ جسے صحیفوں میں لکھا جاتا ہے جو آپ سے بتواتر منقول ہے اور جس کی تلاوت عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ (علوم القرآن ڈاکٹر صبحی الصالح ص ۳۰)

نزول قرآن: قرآن مجید تقریباً تیئس (۲۳) سال کے عرصہ میں نجماً نجماً رسول کریم ﷺ پر نازل ہوتا رہا۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (محمد ۲:۴۷) "اور جو اس پر ایمان لایا جو محمد پر نازل کیا گیا اور وہ اپنے رب کی طرف سے حق ہے۔ رسول کریم ﷺ غار حرا میں عبادت میں منہمک تھے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام رسول کریم ﷺ پر قرآن کی سورۃ علق کی پہلی پانچ آیات لے کر نازل ہوئے۔ تو اس پیغام ربانی کو لے کر کانپتے ہوئے گھر تشریف لائے۔ حضرت خدیجہؓ سے فرمایا کہ مجھ پر کپڑا اوڑھ دو۔ ذرا سکون آیا تو آپ نے تمام ماجرہ سنایا اور کہا خَشِيْتُ عَلٰی نَفْسِيْ "مجھے اصلاح دنیا کی ذمہ داری کے بوجھ سے ڈر لگتا ہے۔ تو حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دی اور ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں انھوں نے کہا کہ یہ وہ ناموس ہے جو موسیٰ پر نازل ہوا تھا۔ یہ رمضان کی ایک خاص رات کو اتارا گیا۔ ارشاد الٰہی ہے: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (البقرہ ۱۸۵:۲) "رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا۔" اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (۱:۹۷) "ہم اسے عزت والی رات میں اتارا ہے۔" اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (الدخان ۳:۴۴) "ہم نے اسے برکت والی رات میں اتارا۔" قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا۔ ارشاد الٰہی ہے: فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۵۸:۴۴) "سو ہم نے اسے تیری زبان (عربی) میں آسان کر دیا تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔"

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (الزخرف ۳:۴۳) "ہم نے اسے عربی زبان میں بنایا تاکہ تم سمجھو۔"

یہ کتاب سب کی سب ایک دفعہ نہیں بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوئی اور جونہی قرآن مجید کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو اس کو احاطہ تحریر میں لایا جاتا اور حفظ کرلیا جاتا۔ ارشاد الٰہی ہے: وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰی مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا (۱۰۶:۱۷) "اور قرآن مجید کو ہم نے جدا جدا کر دیا ہے تاکہ تو ٹھہر ٹھہر کر لوگوں پر پڑھے اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا۔"

حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے وحی نبوت (پیغام شریعت' احکام خداوندی) حاصل کر کے رسول کریم ﷺ کے قلب مطہر پر اتارا۔ ارشاد الٰہی ہے: فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ ۹۷:۲) "اس نے اللہ کے حکم سے اس کو تیرے دل پر اتارا۔"

(قرآن مجید کو دوسری سماوی کتب پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ قرآن مجید میں ہی یہ بتا دیا گیا ہے کہ کب اتارا گیا۔ کس پر اتارا گیا۔ اس کتاب کا نام کیا ہے اور کس زبان میں اتارا گیا اور قرآن مجید کا مہبط (اترنے کی جگہ) کیا ہے۔ کسی سماوی کتب میں ان باتوں کا علم نہیں ملتا۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن وحی الٰہی کی بہترین شکل ہے۔

تدوین وحفاظت قرآن مجید: تدوین اور حفاظت قرآن مجید کے تین ادوار ہیں۔ ۱۔ عہد رسالت ۔۲۔ عہد صدیقی ۔۳۔ عہد عثمانی۔

عہد رسالت: قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر ۹:۱۵) "یعنی ہم نے ہی ذکر (قرآن مجید) اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔"

دوسری جگہ آتا ہے: اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (القیمۃ ۱۷:۷۵) "یعنی اس کتاب کا جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔"

یہ دونوں آیات ظاہر کرتی ہیں کہ قرآن مجید کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ پر ہے۔ قرآن مجید کی حفاظت دو طریقوں سے ہوئی ہے۔ ایک زبانی یاد کرنے سے دوسری کتابت سے اور یہی دو طبعی اور قدرتی طریقے ہیں رسول کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں ہی کثیر صحابہ سارا قرآن مجید حفظ کر چکے تھے۔ مہاجرین میں سے مشہور حفاظ' خلفاء راشدین' حضرت طلحہؓ حضرت سعد حضرت ابن مسعود حضرت حذیفہؓ حضرت سالم حضرت ابو ہریرہؓ حضرت عبداللہ بن سائب'

حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت ام سلمہؓ انصار میں سے حضرت عبادہ بن صامت، حضرت معاذ، ابوحلیمہ، مجمع بن جاریہ، فضالہ بن عبید، مسلمہ بن مخلدؓ۔

جن مہاجرین اور انصار صحابہ اور امہات المومنین کے اسماء گرامی کا ذکر کیا گیا ہے۔ انھوں نے قرآن کریم کو یاد کیا اور رسول کریم ﷺ کو سنایا اس طرح وہ رسول کریم ﷺ کے براہ راست شاگرد تھے اور آپؐ ان کے استاد محترم تھے۔

اور جن لوگوں نے قرآن مجید کو خود یاد کیا اور رسول کریم ﷺ کو نہیں سنایا۔ ان کی تعداد بے شمار ہے۔

صحابہ کا قرآن مجید سے شغف: صحابہ کرام کا شغف قرآن مجید سے حد سے بڑھا ہوا تھا۔ قرآن مجید کا پڑھنا اور سننا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ بخاری اور مسلم نے ابوموسیٰ اشعری سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''جب اشعری (حضرت ابوموسیٰ اشعری کے ہم قبیلہ) لوگ رات کو اپنے گھروں میں داخل ہوتے ہیں۔ تو میں ان کی آواز پہچان لیتا ہوں۔ وہ رات کے وقت جب اپنے گھروں میں قرآن پڑھتے ہیں تو میں ان کے گھروں کو پہچان لیتا ہوں۔ اگرچہ دن کے وقت میں ان کے یہاں کبھی نہیں گیا۔ (مناہل العرفان للزرقانی ج ۱ ص ۳۱۳)

صحابہ کرام ایک دوسرے کو قرآن کریم سناتے اور یاد کرتے تھے تاکہ فرضی اور نفلی نمازوں میں شب و روز روانی سے اس کی تلاوت کر سکیں۔ رسول کریم ﷺ صحابہ کو حفظ قرآن کی ترغیب دیتے۔ حضرت عثمانؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ''تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن سیکھتا ہے اور سکھاتا ہے۔'' اور آپ اس شخص کو نماز میں امام بناتے تھے۔ جس کو سب سے زیادہ قرآن مجید حفظ ہوتا۔

جب کوئی شخص ہجرت کر کے مدینہ پہنچتا تو رسول کریم ﷺ کسی صحابی کے سپرد کر دیتے جو اسے قرآن پڑھاتا۔ مسجد نبوی میں تلاوت قرآن کا یہ عالم تھا کہ مسجد گونج جاتی تھی۔ یہاں تک کہ آپ نے آہستہ آہستہ تلاوت کا حکم دیا تاکہ ایک دوسرے کی تلاوت میں خلل اندازی نہ ہو۔ (مناہل العرفان ج ۱ ص ۲۳۴)

قرآن مجید پڑھانے میں صحابہ کرام میں سات حضرات نے خصوصی شہرت پائی تھی۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ عثمان بن عفان۔ علی بن ابی طالب، ابی بن کعب، زید بن ثابت، عبداللہ بن مسعود ابو الدرداء ابوموسیٰ اشعریؓ۔

کتابت: قرآن مجید عہد رسالت میں ہی احاطہ تحریر میں آچکا تھا۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی۔ تو رسول کریم ﷺ کسی کاتب وحی کو بلاتے اور اس آیت کو اس کی جگہ (جہاں اللہ تعالیٰ نے تفہیم دی ہوئی ہوتی تھی) پر لکھوا دیتے تھے۔ اس طرح قرآن مجید آپ کی حیات طیبہ میں ہی لکھا جا چکا تھا۔ ایک حدیث میں آتا ہے: قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْقُرْاٰنُ فِي الْعَسَبِ وَالْقِضَمِ ''یعنی رسول کریم ﷺ اس وقت دنیا سے اٹھائے گئے جبکہ قرآن مجید کھجور کے پتوں پر لکھا جا چکا تھا۔''

کاتبین وحی: رسول کریم ﷺ نے حسب ذیل کاتبین وحی مقرر فرماتے تھے۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت معاویہ، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابی بن کعب، حضرت خالد بن ولید، حضرت ثابت بن قیسؓ۔

حاکم نے مستدرک میں حضرت زید بن ثابت سے روایت ہے کہ زید بن ثابت نے کہا کہ ہم عہد رسالت میں ''رقاع'' سے قرآن جمع کیا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کہتے ہیں۔ جَمَعْتُ الْقُرْاٰنَ فَقَرَاْتُ بِهٖ كُلَّ لَيْلَةٍ فَبَلَغَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِقْرَاْهُ فِيْ شَهْرٍ (مسند احمد) ''میں نے رسول کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں ہی سارا قرآن جمع کر لیا تھا اور ایک رات میں سب پڑھ جاتا تھا۔ آپ کو علم ہوا تو فرمایا ایک مہینہ میں ختم کیا کرو۔

رسول کریم ﷺ کے عہد مبارک میں جن چیزوں پر قرآن مجید لکھا جاتا تھا۔ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ عسیب: کھجور کی شاخوں کا وہ حصہ جو تنے سے متصل ہوتا ہے۔ اس میں کافی کشادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس حصہ کو شاخ سے الگ کر لیا جاتا تھا۔ پھر ان کو خشک کر کے ان پر لکھا جاتا تھا۔

۲۔ لخفہ: ہر معمولی پتھر کو نہیں کہتے بلکہ بالاتفاق اہل لغت نے لکھا ہے کہ سفید رنگ کی پتلی پتلی چوڑی چوڑی تختیاں پتھر سے بنائی جاتی تھیں۔

۳۔ کتف: اونٹ یا بکری کے مونڈھے کے پاس کی گول اور چوڑی ہڈی کو کہتے ہیں۔

۴۔ ادیم: باریک کھال سے دباغت کے عمل سے تیار ہوتا ہے۔

۵۔ قتب: اونٹ کے کجاوہ میں چھوٹی چھوٹی تختیاں استعمال ہوتی تھیں۔ ان کو کہتے ہیں۔

عہد صدیقی: قرآن مجید رسول کریم ﷺ کے عہد مبارک میں مدون ہو چکا تھا اور بے شمار حفاظ کے سینوں میں محفوظ تھا۔ بے شمار افراد کے پاس قرآن مجید کے لکھے ہوئے نسخے موجود تھے' امام بن حزم نے لکھا ہے کہ خلیفہ اول ابوبکرؓ کے زمانہ میں کوئی ایسا شہر نہیں تھا۔ جہاں لوگوں کے پاس کثرت سے قرآن مجید کے لکھے ہوئے نسخے نہ ہوں اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مسلمانوں کے پاس قرآن مجید کے لکھے ہوئے نسخے ایک لاکھ سے کم نہ تھے۔ (کتاب الملل والنحل)

عہد صدیقی میں کتابی صورت میں ایک مستند نسخہ مرتب کرنے کی ضرورت اس وقت پیش آئی۔ جب حفاظ لڑائیوں میں کثرت سے شہید ہو رہے تھے۔ قرآن لکھا ہوا موجود تو تھا لیکن اس کے اجزاء منتشر تھے۔ سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور حضرت ابوبکرؓ سے کہا: بخاری میں زید بن ثابت سے روایت ہے۔

''مجھے ابوبکرؓ نے جنگ یمامہ کے بعد بلوا بھیجا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ عمر بن الخطاب ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ابوبکرؓ نے فرمایا کہ عمر میرے پاس آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ جنگ یمامہ میں قرآن کے بہت سے قراء شہید ہوئے ہیں اور مجھے خطرہ محسوس ہوا ہے کہ اگر اسی طرح دوسری لڑائی میں قراء شہید ہوتے رہے تو بہت سا قرآن ہاتھوں سے جاتا رہے گا۔ لہٰذا میری رائے ہے کہ آپ قرآن کو جمع کرنے کا حکم دیں تو میں نے عمرؓ کو جواب دیا کہ ہم اس کام کو کس طرح انجام دیں۔ جسے رسول کریم ﷺ نے نہیں کیا۔ تو عمرؓ نے کہا: خدا کی قسم یہ نہایت ضروری اور بہتر کام ہے اور عمرؓ مجھ سے اس معاملہ میں اصرار اور بحث کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے کو اس کام کے لیے کھول دیا اور میری بھی وہی رائے ہوگئی جو عمرؓ کی ہے۔''

حضرت زید بن ثابت کہتے ہیں کہ ابوبکرؓ نے مجھے مخاطب ہو کر فرمایا:

تم جوان اور زیرک ہو ہم تم پر کسی طرح کی تہمت نہیں لگا سکتے۔ نیز تم رسول کریم ﷺ کے عہد میں کاتب وحی تھے۔ لہٰذا تم پورے قرآن کو ایک جگہ جمع کرنے میں لگ جاؤ۔ خدا کی قسم اگر وہ مجھے کسی پہاڑ کو منتقل کرنے کی تکلیف دیتے تو مجھ پر اس قدر گراں نہ گزرتا جتنا قرآن کے جمع کرنے کی ذمہ داری کا بار گراں' جس کا انھوں نے حکم دیا۔ میں نے کہا کہ آپ دونوں کس طرح وہ کام کرنا چاہتے ہیں جسے رسول کریم ﷺ نے نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اللہ نے میرا سینہ اس کام کے لیے کھول دیا۔ جس کے لیے اس نے ابوبکرؓ اور عمرؓ کے سینوں کو کھول دیا تھا۔ چنانچہ قرآن کو کھجور کے درخت کی چھالوں سے اور پتھر کی تختیوں سے اور لوگوں کے سینوں سے جمع کرتا رہا۔ البتہ یہ سورہ توبہ کا آخری حصہ مجھے صرف ابوخزیمہؓ انصاری کے پاس سے ملا اور ان کے سوا کسی اور کے پاس سے وہ مجھے نہ ملا۔ یعنی لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ختم سورہ براء تک۔ پس یہ صحیفے ابوبکر کے پاس ان کی وفات تک رہے' پھر عمرؓ کے پاس ان کی وفات تک رہے پھر حفصہؓ کے پاس آ گئے۔ حضرت علی کا ارشاد ہے۔ اللہ تعالیٰ ابوبکرؓ پر رحم فرمائے وہ پہلے شخص تھے جس نے قرآن کو کتابی صورت میں جمع کیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے اہتمام سے تدوین قرآن کا کام ایک سال کی مدت میں تکمیل پایا۔ حضرت زید بن ثابت نے قرآن مجید کو کس طرح کاغذ کے ٹکڑوں' کھجور کی ٹہنیوں' پتھر کی سلوں چمڑے کے ٹکڑوں اور کجاوہ کی لکڑی سے جمع کیا؟ حضرت علیؓ فرماتے ہیں حضرت زید بن ثابت نے قرآن کا جو نسخہ کتابی شکل میں تیار کیا۔ وہ پہلے حضرت ابوبکرؓ کے پاس رہا۔ جب آپ نے وفات پائی۔ تو وہ نسخہ حضرت عمرؓ کے پاس آ گیا۔ آپ کی شہادت کے بعد یہ صحیفہ ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر کی تحویل میں آ گیا۔ (البرہان ج ۱ ص ۲۳۹)

حضرت ابوبکر کے جمع کردہ قرآن مجید پر پوری امت مسلمہ کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ اس کو تواتر کا درجہ حاصل ہے حضرت ابوبکرؓ کے جمع کردہ قرآن اور عہد رسالت میں مرتب قرآن کے درمیان کامل یک رنگی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

عہد عثمانی: رسول کریم ﷺ نے سہولت کے لیے عرب کے ہر قبیلہ کو اپنے اپنے لہجہ اور رسم الخط میں پڑھنے اور لکھنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ عثمانی عہد میں اختلاف قرات کی وجہ سے نومسلم عجمیوں میں ایک فتنہ کھڑا ہوا۔ جس کا ذکر احادیث میں آتا ہے۔ حضرت امام بخاری نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے۔

''حذیفہؓ بن الیمانؓ حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے انھوں نے ارمینیہ کی فتح میں اہل شام کے ساتھ اور آذربیجان کی فتح میں اہل عراق کے ساتھ جہاد میں شرکت کی تھی' وہاں ان دونوں علاقوں کے مسلمانوں کا قرات قرآن میں اختلاف دیکھ کر گھبرا گئے' پس جب وہ حضرت عثمانؓ کے پاس آئے تو کہا اے امیرالمومنین! اس امت کی خبر لیجیے قبل اس کے کہ وہ کتاب اللہ میں اس طرح اختلاف کرنے لگیں۔ جس طرح یہود اور انصاری نے اختلاف کیا تو حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ ہمارے پاس صحیفے ارسال کر دیں تاکہ ہم اس کی نقلیں مصاحف میں کر لیں۔ پھر آپ کو اصل صحیفے واپس کر دیں گے تو حضرت حفصہؓ نے ان صحیفوں کو حضرت عثمانؓ کی خدمت میں بھیج دیا اور حضرت عثمان نے زید بن ثابتؓ عبداللہ بن زبیرؓ سعید بن العاصؓ اور عبدالرحمٰن بن الحارثؓ کو حکم دیا تو ان لوگوں نے اس کو مصاحف میں نقل کیا حضرت عثمانؓ نے (زیدؓ بن ثابتؓ کے سوا بقیہ) تینوں قریشی اصحاب سے کہا تھا کہ جب تم لوگ اور

زید بن ثابتؓ قرآن کے کسی لفظ میں اختلاف کرو تو اس کو لغت قریش میں لکھنا کیونکہ قرآن انھیں کی زبان میں نازل ہوا ہے تو انھوں نے ایسا ہی کیا۔ یہاں تک جب اصل مسودات مصاحف میں نقل کر لیے گئے۔ حضرت عثمانؓ نے اصل صحیفوں کو حضرت حفصہؓ کے پاس بھیج دیا اور جو مصاحف نقل کرائے تھے ان میں ایک ایک نسخہ مملکت کے ہر علاقے میں بھیج دیا اور حکم دیا کہ اس کے سوا جس صحیفہ یا مصحف میں قرآن لکھا ہوا ہے جلا دیا جائے حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ جس وقت ہم مصحف لکھ رہے تھے تو سورۃ احزاب کی ایک آیت (اصل صحیفوں) میں ہمیں نہ ملی۔ جسے میں رسول کریم ﷺ کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا تو ہم نے اس کی تلاش کی خزیمہؓ بن ثابتؓ انصاری کے پاس لکھی ہوئی پائی اور وہ آیت "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَاعَاهَدُوْا اللّٰهَ عَلَيْهِ" تھی "چنانچہ ہم نے اس کو اسی سورۃ میں مصحف میں شامل کر لیا۔" (صحیح بخاری کتاب فضائل القرآن)

غیر مسلموں کی شہادتیں: سر ولیم میور اپنی تصنیف "لائف آف محمد" کے دیباچہ میں لکھتا ہے۔ "اس بات کی تسلی بخش اور قابل اطمینان اندرونی اور بیرونی شہادت موجود ہے کہ قرآن اس وقت بھی ٹھیک اسی شکل و صورت میں محفوظ و مامون ہے جس حالت میں حضرت محمد (ﷺ) نے اسے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔" (دیباچہ لائف آف محمد ص ۲۵)

"نیو یونیورسل انسائیکلوپیڈیا" میں "قرآن" کے عنوان سے مقالہ درج ہے۔ اس میں لکھا ہے۔ یہ کتاب پیغمبر محمد (ﷺ) پر ان کی زندگی کے آخری تیئس سال میں اور مدینہ میں نازل ہوتی رہی اور مسلمانوں کے عقیدہ میں کلام الٰہی ہے۔ بہ خلاف حدیث کے جو مجموعہ کلام رسول (ﷺ) ہے۔ قرآن پیغمبر کی زندگی میں ہی اور انہی کی زیر ہدایت و نگرانی ضبط تحریری میں آ گیا تھا اور ان کے صحابیوں نے اسے حفظ یاد کر لیا تھا اور یہ معمول آج تک جاری ہے چنانچہ صدہا مسلمان کلام پاک کے حافظ ہیں اور اسے سارے کا سارا دہرا سکتے ہیں۔ بغیر کسی غلطی کے اس کتاب کا دعویٰ ہے کہ اس میں تمام کتب آسمانی کے حقائق آ گئے ہیں اور یہ کہ آخری اور نا قابل تغیر کتاب ہے نیز یہ کہ نوع انسان کے لیے وہ جامع ترین دستور العمل ہے اور اسلام یعنی دین فطرت کی آخری توضیح ہے اور یہی دین ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ اور سارے قدیم انبیاء کا رہ چکا ہے۔ اس کی عبارت کا غیر منحرف ہونا مسلّم ہے۔

جرمن کے مشہور مستشرق نولڈکی نے لکھا ہے۔

"یورپ کے جن جن مصنفین نے اب تک اس امر کی زبردست کوشش کی ہے کہ قرآن میں تحریف ثابت کریں۔ وہ اپنی سعی اور جدوجہد میں حیرت انگیز طور پر ناکام ثابت ہوئے ہیں۔" (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ قرآن)

مشہور مستشرق ہرٹ وگ ہرشفیلڈ اپنی کتاب "New researches into the composition and exegesis of the Quran" میں لکھتا ہے "عہد حاضر کے نقاد اس پر متفق ہیں کہ قرآن کے موجودہ نسخے اس اصلی نسخے کا ہو بہو عکس ہیں جسے (حضرت) زیدؓ نے لکھا تھا اور قرآن کا متن بعینہٖ وہی ہے۔ جسے محمد نے (لکھا کر) دیا تھا۔"

سر جان ہمرٹن کے زیر اہتمام یونیورسل انسائیکلوپیڈیا شائع ہوا تھا۔ اس میں قرآن کے عنوان سے جو مقالہ درج ہے اس میں تحریر ہے۔ "اس کی عبارت کا غیر محرف ہونا مسلّم ہے۔"

معنوی حفاظت: اللہ تعالیٰ نے جس طرح قرآن مجید کے الفاظ و ترتیب کی حفاظت کی ہے۔ اس طرح اس مقدس صحیفہ کو تحریف معنوی سے محفوظ کر رکھا ہے۔

ائمہ اسلام نے قرآن مجید کی اجمالی مقامات کی تفسیر احادیث نبوی کی مدد سے کی اور قرآن مجید کو تحریف معنوی سے محفوظ رکھا۔ متکلمین نے قرآنی تعلیمات کو عقل کے ساتھ تطبیق دے کر فلسفیانہ اعتراضات کے جوابات دیے۔ جب بھی کوئی غلط عقیدہ پیدا ہوا تو علماء کرام نے قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں اس غلط عقیدہ کی اصلاح کی۔ خلق قرآن کا غلط عقیدہ پیدا ہوا تو احمد بن حنبل و دیگر علمائے نے اس کو رد کیا۔

اسلامی قانون میں قرآن مجید کا مقام: قرآن مجید اسلامی شریعت کا اصل الاصول اور مرجع اول ہے۔ اس میں تمام کلی قواعد اور ان کی بہت سی تفصیلات مذکور ہیں۔

قرآن مجید کے اوّلین ماخذ ہونے کے دلائل

پہلی دلیل: تمام علماء امت کا اس بات پر اتفاق اور اجماع ہے کہ قرآن مجید اسلامی تعلیمات کا اولین ماخذ ہے۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے۔ قرآن مجید کے آغاز میں ہی اس بات کا اعلان ہے: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں۔ شک و شبہ سے بالا ہونے کے کئی دلائل ہیں۔ ایک دلیل یہ ہے: اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (البقرہ ۲:۲۳) "اگر تمھیں

اس پر جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے شک ہے تو اس کی مانند ایک سورت تو لاؤ۔"

لَا رَیْبَ ہونے کے ساتھ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کتاب محفوظ ہے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّانَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر۱۵:۹) بے شک ہم نے ہی ذکر (قرآن) نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

لہٰذا اوّل ماخذ ہونے کی یہ دلیل ہے کہ قرآن مجید شک وشبہ سے بالا ہے اور محفوظ ترین کتاب ہے۔

دوسری دلیل: قرآن مجید اوّلین اور آخرین کے علوم کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ نَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (النحل ۱۶:۸۹) "یعنی ہم نے تم پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جو تمام چیزوں کو واضح بیان کرنے والی ہے۔"

دوسری جگہ آتا ہے: فِیْهَا کُتُبٌ قَیِّمَةٌ (البینہ ۹۸:۳) "اس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں یعنی اس میں تمام کامل صداقتیں اور علوم اولین وآخرین درج ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے: مَافَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ (انعام ۶:۳۸) "ہم نے (قرآن) میں بیان کرنے سے کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ یعنی قرآن مجید میں سب علوم خدمت دین کے لیے بطور خارق عادت ومعجزہ بیان ہوئے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ مُهَیْمِنًا عَلَیْهِ (۵:۴۸) "سابقہ کتب کی تعلیمات کا محافظ ہے۔"

اسی لیے امام ابن حزم کہتے ہیں کہ "اس (قرآن) میں فقہ کے تمام ابواب موجود ہیں۔ یعنی فقہ کا کوئی باب ایسا نہیں۔ جس کی اصل اس میں موجود نہ ہو اور سنت نے اس کی وضاحت نہ کر دی ہو۔"

گویا قرآن مجید علوم کا ایک ذخار ہے۔ اس وجہ سے قرآن مجید کو علماء نے تعلیمات اسلامی کا اول ماخذ قرار دیا ہے۔

تیسری دلیل: قرآن مجید ایک واحد کتاب ہے جس نے مکمل ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ ۵:۳) "آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے تمہارا دین اسلام ٹھہرا کر راضی ہوا ہوں۔"

علماء نے قرآن مجید کو اسی وجہ سے اسلامی تعلیمات کا اوّل ماخذ قرار دیا ہے کہ یہ اکمل کتاب ہے۔

چوتھی دلیل: قرآن مجید وہ کتاب ہے جو تمام تنازعات اور اختلافات کا فیصلہ کرتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ "یعنی قرآن مجید تمام تنازعات کا فیصلہ کرتی ہے اور یہ بے سود اور بے کار نہیں ہے۔ یعنی ہم نے اس کتاب کو اس لیے نازل کیا ہے۔ تاکہ جو اختلاف پیدا ہوئے۔ ان سب کو دور کرے۔ پس قرآن مجید اس وجہ سے اسلامی تعلیمات کا اول مصدر و ماخذ ہے کہ اس میں تمام اختلافات کا حل موجود ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ وَهُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (النحل ۱۶:۶۴) اور ہم نے تجھ پر کتاب صرف اس لیے کہ نازل کی ہے کہ تو ان کے لیے باتیں کھول کر بیان کرے۔ جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں۔

پانچویں دلیل: قرآن مجید وہ کتاب ہے انسان جو سفلی خواہشات اور شکوک وشبہات کی وجہ سے تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرتا ہے۔ جہالت کی وادی میں سرگردان پھرتا رہتا ہے۔ اس کی ہدایت کے لیے قرآن مجید اتارا گیا ہے تاکہ انسان کو معرفت کامل کا نور عطا کرے اور اس کو منزل مقصود تک پہنچائے۔ ارشاد الٰہی ہے: الٓرٰ کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ "ہم نے تیری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے۔ جو (جہالت کی) تاریکی سے نکال کر (علم کی روشنی کی طرف لاتی ہے۔)"

ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے: هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (البقرہ ۲:۲) "یہ کتاب متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔ یعنی یہ کتاب متقیوں کو منزل مقصود تک پہنچانے والی ہے۔ ایک اور جگہ قرآن کو هُدًی لِّلنَّاسِ کہا ہے۔ یعنی قرآن مجید لوگوں کے لیے ہدایت کا موجب ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید اصول وکلیات کی کتاب ہے۔ جزوی قوانین کی تفصیل بہت کم ہے۔ علامہ شاطبی فرماتے ہیں۔ قرآن مجید مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے اور یہ جامعیت اسی وقت ہو سکتی ہے۔ جبکہ اس میں کلیات بیان ہوئے ہوں کیونکہ شریعت اس کے نزول کے بعد کامل ہو گئی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا ہے۔ الخ" (الموافقات المسالۃ الخامسۃ ج ۳ ص ۲۶۷)

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں۔ "قرآن حکیم میں احکام شرعیہ اکثر کلی طور پر بیان ہوئے ہیں۔ جہاں جزئی طور پر تفصیل ہے وہ کسی حکم کلی کے تحت ہے۔" (الموافقات صفحہ ۲۶۶)

گویا قرآن مجید انسانی ہدایت وراہنمائی کی آخری کتاب ہے۔ اس بناء پر اس کی تعلیمات کا ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرنا لازمی امر ہے۔

چھٹی دلیل: خدا کی طرف سے نازل کردہ: قرآن مجید کے نزول سے قبل دنیا کی کسی قوم کے پاس اس کے مذہب کی کتاب اصلی حالت میں موجود نہیں تھی۔ پھر جب ان کتب کی تعلیمات پر نظر دوڑائیں تو وہ انسانوں کی ضروریات کو پورا نہیں کرتیں نہ ان کتب کا دعویٰ ہے کہ ان میں موجود تعلیم ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرے گی۔ اس کے برعکس جب قرآن مجید پر نظر دوڑائیں تو قرآن دعویٰ کرتا ہے کہ یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاِنَّهٗ لَتَنۡزِيۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِيۡنُ عَلٰى قَلۡبِكَ لِتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِيۡنَ (الشعراء ۲۶:۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴) ''اور بے شک اس قرآن کو پروردگار عالم نے نازل کیا ہے اور اس کو روح الامین نے تیرے دل پر اتارا تاکہ تو ڈرانے والوں میں سے ہو۔''

ساتویں دلیل: محفوظ کتاب: دوسری کتب مذاہب کے برعکس قرآن مجید ایک محفوظ کتاب ہے۔ جس شکل وصورت میں رسول کریم ﷺ پر نازل ہوئی۔ اسی صورت میں بغیر کسی تحریف وتبدل کے محفوظ چلی آ رہی ہے۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ (الحجر ۱۵:۹) ''ہم نے ہی قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔''

آٹھویں دلیل: دعویٰ کے ساتھ دلیل: پہلی کتب میں اگر کسی چیز کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ تو اس کے ساتھ دلیل نہیں دی۔ قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جو ہر بات دلیل سے تسلیم کراتا ہے اور ہر دعویٰ کے ساتھ دلیل دیتا ہے۔ شروع میں ہی لَا رَيۡبَ فِيۡهِ کہہ کر یہ بات ثابت کر دی ہے یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں اور دعویٰ بغیر دلیل نہیں کرتی۔ اگر کسی چیز کا دعویٰ کرتی ہے تو ساتھ دلائل دیتی ہے۔ جب یہ دعویٰ کیا کہ اس میں کوئی شک نہیں تو ساتھ ہی اس کی یہ دلیل دی۔ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا (البقرہ ۲:۲۳، ۲۴) ''اور اگر تمہیں شک ہو اس بات پر کہ جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو اس جیسی کوئی سورت بنا لاؤ اور اپنے گواہوں کو بلاؤ سوائے اللہ کے اگر تم سچے ہو۔ پس اگر تم نے اس کی مثل پیش نہ کی اور یاد رکھو کہ ہرگز کبھی نہ کر سکو گے۔

نویں دلیل: عدم اختلاف: قرآن مجید سے پہلے کا جتنا بھی مذہبی ادب ہے۔ وہ اختلاف سے پاک نہیں۔ صرف قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جو اختلاف سے پاک ہے۔ اختلاف سے پاک کلام وہی ہو سکتا ہے۔ جو ایک علیم وخبیر ہستی کی طرف سے نازل ہوا۔ ارشاد الٰہی ہے: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ وَلَوۡ كَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَيۡرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوۡا فِيۡهِ اخۡتِلَافًا كَثِيۡرًا (نساء ۴:۸۲) ''پھر کیا وہ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے۔ اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں ضرور اختلاف کرے۔''

احکام قرآن مجید: قرآن مجید ان تمام احکامات پر مشتمل ہے جو انسانی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ ان کی تقسیم حسب ذیل ہے۔

عقائد کے متعلق احکام: جیسے ملائکہ، کتب، رسل اور یوم آخرت پر ایمان۔

اخلاقیات سے متعلق احکام: وہ احکام جو اخلاق حسنہ اور اخلاق قبیحہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی احکام تعمیر انسانیت کے لیے لازمی ہیں۔

۳۔ مکلفین کے اقوال وافعال سے متعلق عملی احکام: ان احکام کی دو اقسام ہیں۔ عبادات۔ معاملات۔

عبادات: نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، ان عبادات کو حقوق اللہ بھی کہا جاتا ہے۔ عبادات میں انفرادی اور اجتماعی فوائد ہیں۔

معاملات: یہ وہ احکام ہیں جو شخصی قانون اور تمام قانون کے تحت آتے ہیں۔ ان احکام کا مقصد فرد کا فرد کے ساتھ تعلق، فرد کا جماعت سے تعلق اور جماعت کا جماعت سے تعلق استوار کرنا ہے۔ یہ حقوق العباد کہلاتے ہیں۔ معاملات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

عائلی معاملات: یہ وہ احکام ہیں جن کا تعلق خاندان یا شخصی مسائل سے ہے۔

مالی یا دیوانی معاملات: ان احکام کا تعلق مالی معاملات سے ہے اسے مدنی قانون بھی کہا جاتا ہے۔ جدید اصطلاح میں دیوانی قانون کہا جاتا ہے۔

فوجداری معاملات: یعنی جرائم اور ان کی سزا کے متعلق احکام۔

حکومتی معاملات: حاکم اور عوام (رعایا، محکوم) کے مابین تعلقات اور حقوق وفرائض کے متعلق احکام۔

بین الاقوامی معاملات: ایک مملکت کے دوسری مملکتوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت اور حقوق وفرائض سے متعلق احکام۔

معاشی معاملات: ریاست کی آمدنی، اخراجات اور دیگر معاشی امور کے متعلق احکام۔

احکام کے استخراج کے اصول: قرآن مجید میں احکام کے استخراج کے اصول بھی بیان کیے ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

عدم حرج: احکام ایسے ہوں جن میں آسانی اور سہولت ملحوظ رکھی گئی ہو ایسی تنگی اور دشواری نہ ہو جو انسانی طاقت سے باہر ہو، ارشاد الٰہی ہے۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ۲:۱۸۵) اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے مشکل نہیں چاہتا۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں احب الدين الى الله الحنيفية السمحة (صحیح بخاری کتاب الایمان باب الدین یسر) اللہ کو سب سے زیادہ پسند آسان دین حنیف ہے۔

قلت تکلیف (تیسیر): عدم حرج کا لازمی نتیجہ قلت تکلیف ہے تو وہ قوانین ایسے نہیں ہونے چاہئیں کہ لوگوں کی ہمتیں ان پر عمل کرنے سے جواب دے دیں۔ نہ وہ اس قسم کے قانون ہوں جو لوگوں کے مزاج کے منافی ہوں۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ لاضرر ولاضرار في الاسلام یعنی اسلام میں نہ تو کسی کو تکلیف دینا ہے اور نہ خود تکلیف اٹھانا ہے۔ (ابن ماجہ کتاب الاحکام باب من بنی فی حقہ ملیضر بجارہ)

ارشاد الٰہی ہے۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (النساء۴:۲۸) اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کرے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

- رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ (البقرہ۲:۲۸۶) اے ہمارے رب ہم سے وہ بوجھ نہ اٹھوا جس کی ہم میں طاقت نہیں۔

تدریج: اسلام نے عرب معاشرہ میں بدرسوم اور عادات کی پختگی کے پیش نظر عوام کی اصلاح کے لیے تدریجاً احکام نازل کیے تاکہ مسلمانوں کو ان کے چھوڑنے میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو شراب کو حرام کیا تو تدریجاً جوا حرام کیا تو تدریجاً، قرآن مجید کا یہ انداز مجتہدین کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ کسی برائی کو دور کرنے کے لیے قانون بنائیں تو پہلے اس بری رسم کے بدمضرات اور نتائج سے لوگوں کی آگاہ کریں اس کے بعد اس رنگ میں برائی کے استیصال کے لیے قوانین بنائیں۔ جن سے معاشرہ میں اضطراب پیدا نہ ہو۔ لوگ آسانی سے اس حکم پر عمل کرنے کو تیار ہو جائیں۔

نسخ: نسخ کے دو مطلب ہیں ایک تو یہ کہ پہلا حکم بالکل ختم کر دیا جائے۔ دوم، حالات کے مطابق پہلے حکم میں کسی قسم کی ترمیم وتوضیح کر دی جائے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَانَاتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا (بقرہ۲:۱۰۶) ہم اپنے پہلے احکام میں سے کوئی حکم منسوخ نہیں کرتے یا فراموش ہونے نہیں دیتے جب تک اس جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم نازل نہ کر لیں۔

یہاں نسخ سے مراد یہ نہیں کہ قرآن کی کسی آیت نے دوسری آیت کو منسوخ کر دیا ہے اس جگہ آیت سے مراد پہلی شرائع ہیں جیسا کہ ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں لکھا ہے۔ اِنَّمَا الذكر فِيْهَا من النسخ فانما المراد به نسخ الشرائع الانبياء المتقدمين آیت میں نسخ کا ذکر ہے اس سے مراد سابق انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں کا نسخ ہے۔

ابو مسلم اصفہانی کی بھی یہی رائے ہے۔

یہ آیت علماء کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ قانون وضع کرتے وقت وہ ملکی حالات کے پیش نظر پہلے کے وضع کیے قانون بدل سکتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں نسخ کی دوسری قسم یہ ہے کہ مصلحت کی رعایت سے یا فساد کے اندیشہ سے کوئی حکم دیا جائے پھر ایسا زمانہ آ جائے کہ اس میں یہ مقصود نہ رہ جائے تو وہ حکم بدل جائے گا۔ (حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۱۲)

دوسرا ماخذ سنت

سنت کے لغوی معنی: شریعت اسلامی کا دوسرا ماخذ سنت اور حدیث ہے۔ سنت کے معنی لغت میں طریقہ قاعدہ یا کسی کام کا ڈھب یا زندگی کا اسلوب ہے۔ قرآن مجید اور کتب حدیث میں بھی یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً قرآن میں سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ کے الفاظ آئے ہیں۔ جن کے معنی ہیں لوگوں کا طریقہ اور اسلوب زندگی۔

ایک اور جگہ قرآن مجید میں لفظ سنن (جمع سنت) استعمال ہوا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (النساء۴:۲۶) ''اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے لیے کھول کر بیان کر دے اور تم کو ان کی راہیں دکھائے جو تم سے پہلے تھے۔ حدیث میں بھی لفظ سنت' طریقہ' قاعدہ

زندگی کے اسلوب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔تم اگلوں کی سنت کے قدم بقدم پیروی کرو گے۔'' اس حدیث میں سنت بمعنی طریقہ یا قاعدہ استعمال ہوا ہے۔

اصطلاحی معنی: لیکن اصطلاحی معنوں میں سنت رسول کریم ﷺ کے افعال اور اعمال پر بولا جاتا ہے۔ جو ہم تک تواتر کے ساتھ پہنچے ہیں۔

سنت علمائے اصول کے نزدیک: ''شرع اسلام میں سنت کے لفظ کا اطلاق ان تمام امور پر ہوگا جو نبی کریم ﷺ سے منقول ہیں۔ اسی طرح ان دلائل پر بھی جو نبی کریم ﷺ سے قولاً یا عملاً ثابت ہوئے لیکن وہ قرآن نہیں۔ (الاحکام فی اصول الاحکام ۱/۲۴۱)

حدیث: حدیث کے معنی ہیں قول یا بات۔ لیکن اصطلاحی معنی ہیں رسول کریم ﷺ کے اقوال۔

سنت یا حدیث کی اقسام: سنت یا حدیث کی تین اقسام ہیں۔ یا تو قول ہوسکتا ہے جو آپ نے کسی مسئلہ کے متعلق فرمایا ہو یا فعل یعنی آپ نے کوئی کام یا عمل کیا ہو یا تقریر یعنی کسی دوسرے شخص نے آپ کے سامنے کوئی کام کیا ہو اور آپ نے سکوت اختیار کیا ہو۔ یہ سکوت آپ ﷺ کی رضامندی اور پسندیدگی پر دلالت کرتا ہو۔

حجیّت سنت

سنت رسول کریم ﷺ کے اعمال اور افعال کا نام ہے۔ جس کی اطاعت اور اتباع لازمی اور جزو ایمان ہے اور اتباع رسول میں ہی مسلمانوں کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ جب تک مسلمان اتباع رسول کو لازم نہیں پکڑتے۔ ترقی کے راستہ پر گامزن نہیں ہو سکتے۔

پہلی دلیل: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (آل عمران ۳:۳۱) ''کہو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے لیے تمھارے گناہوں کو معاف کردے گا اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

دوسری دلیل: قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ (آل عمران ۳:۳۲) ''کہو اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔ پھر اگر وہ پھر جائیں تو اللہ انکار کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔''

تیسری دلیل: وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (آل عمران ۳:۱۳۲) ''اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

چوتھی دلیل: اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ (آل عمران ۳:۱۷۲) ''وہ جنھوں نے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کی۔ اس کے بعد جو انھوں نے زخم کھایا۔ جنھوں نے ان میں سے احسان کیا اور تقویٰ کیا۔ ان کے لیے بڑا اجر ہے۔''

پانچویں دلیل: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (النساء ۴:۵۹) ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول ﷺ کی اور اپنے میں سے صاحب امر لوگوں کی اطاعت کرو۔ پھر اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہو۔ یہ بہتر اور انجام کار اچھا ہے۔

چھٹی دلیل: مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء ۴:۸۰) ''جو شخص رسول ﷺ کی اطاعت کرتا ہے۔ وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔''

ساتویں دلیل: وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا (النساء ۴:۶۱) ''اور جب ان کو کہا جاتا ہے کہ اس کی طرف آؤ جو اللہ نے اتارا اور رسول کی طرف آؤ تو منافقوں کو دیکھے گا کہ وہ تجھ سے (کینا) ہٹتے ہوئے رکتے ہیں۔

آٹھویں دلیل: وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الخ (الاعراف ۷:۱۵۷،۱۵۸) ''اور میری رحمت سب چیزوں پر حاوی ہے۔ میں اس کو ان لوگوں کے لیے لکھوں گا جو پرہیزگاری کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ لوگ جو میرے رسول نبی امی کی پیروی کرتے ہیں۔''

نویں دلیل: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ''یہ اللہ کی حدیں

ہیں اور جو حکم مانے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا اللہ اسے ایسا باغات میں داخل کرے گا۔ جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

دسویں دلیل: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۲۱:۳۳) ''بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تمھارے لیے پیروی کا بہترین نمونہ ہے۔'' قرآن مجید میں اطاعت رسول ﷺ سے متعلق بے شمار آیات ہیں۔ صرف دس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حجیت سنت (از روئے حدیث)

۱۔ رسول کریم ﷺ نے خود کتاب اور سنت کو ایک حکم میں رکھ کر امت مسلمہ کو ان پر چلنے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا: اِنِّىْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوْا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِىْ. ''یعنی میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں۔ جب تک تم انھیں تھامے رہو گے۔ گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ اللہ کی کتاب اور میری سنت ہے۔ اس حدیث میں سنت سے مراد اتباع رسول ﷺ ہے یعنی جو تعلیم رسول کریم ﷺ نے دی ہے۔ اس کی پیروی کی جائے۔

۲۔ جس نے میری سنت سے محبت کی۔ اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے کی وہ جنت میں میرے ہمراہ ہوگا۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

۳۔ آپ کا ارشاد ہے۔ ''میری سب امت جنت میں داخل ہو گی سوائے اس کے جو انکار کرے۔ حاضرین نے عرض کیا۔ یارسول اللہ ﷺ کون انکار کرنے والا ہے۔ فرمایا جس نے میری اطاعت کی۔ وہ جنت میں داخل ہوگا۔ جس نے نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔ (بخاری)

۴۔ من احب سنتی فقد احبنی ومن احبنی کان معی فی الجنة. (مشکوٰۃ المصابیح باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ص ۳۰)

صحابہؓ کا عمل: صحابہ کرامؓ کے عمل سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سنت رسول ﷺ کو دین کا ایک ضروری اور اہم جز سمجھتے تھے۔ ترمذی، ابو داؤد، دارمی، بیہقی اور ابن سعد، ابن عبدالبر نے روایت کی ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو ان سے دریافت کیا کہ اگر تمھارے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہو تو کیسے فیصلہ کرو گے؟ انھوں نے جواب دیا کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ پوچھا اگر کتاب اللہ میں اس کا ذکر نہ ہو تو؟ انھوں نے جواب دیا۔ ''پھر میں سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ اگر سنت رسول ﷺ میں نہ پاؤ تو؟ انھوں نے جواب دیا تو پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ رسول کریم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے ان کا سینہ ٹھونکا اور فرمایا: ''حمد ہے اس خدا کے لیے جس نے اللہ کے رسول کے فرستادہ کی رائے کو اللہ کے رسول کی مرضی سے موافق کر دیا۔'' (سنن ابی داؤد کتاب الاقضیہ، باب الاجتہاد والرائی فی القضاء ۳/۳۰۳)

اس طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ ﷺ صحابہ کرام کو سر منڈوانے اور احرام کھول دینے کا حکم دیا مگر انھوں نے ذرا تامل کیا۔ آپ پر یہ چیز شاق گزری۔ آپ نے خود پہلے سر منڈوایا اور احرام کھولا، تب صحابہ کرامؓ نے فوراً آپ کی اتباع میں سر منڈوا دیے اور احرام کھول دیے۔

امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ایک مرتبہ سونے کی انگوٹھی پہنی تو لوگوں نے بھی سونے کی انگوٹھیاں پہن لیں۔ پس نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے سونے کی انگوٹھی لی ہے پھر سونے کی انگوٹھی اتار کر پھینک دی اور آپ نے فرمایا کہ میں اسے کبھی نہیں پہنوں گا۔ صحابہ جن کے پاس سونے کی انگوٹھیاں تھیں سب نے اتار کر پھینک دیں۔ (صحیح بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ باب اقتداء افعال النبی ﷺ)

ابو داؤد، ابن عبدالبر نے روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود ایک دفعہ نماز جمعہ کے لیے مسجد کی طرف آ رہے تھے۔ رسول کریم ﷺ خطبہ دے رہے تھے۔ ان کے کان میں آواز پڑی۔ ''بیٹھ جاؤ'' حضرت ابن مسعود اس وقت مسجد کے دروازے میں تھے۔ سنتے ہی بیٹھ گئے۔ نبی کریم ﷺ نے جب آپ کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ''اے ابن مسعود آگے آ جاؤ۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود اور ایک خاتون کا سبق آموز واقعہ ہے۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ کے پاس ایک عورت آئی اور کہا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ تم فلاں فلاں باتیں کہتے ہو کہ گودنا لگانے والی اور جو بدن پر گودنا لگاتی ہو ان پر لعنت کی گئی ہے حالانکہ میں نے قرآن کے دونوں لوحوں کے درمیان جو کچھ ہے سب پڑھا ہے۔ اس میں ایسی کوئی بات نہیں ملی جو تم کہتے ہو۔ آپ نے اس عورت سے کہا کہ جاؤ اور قرآن مجید کو پھر سے بنظر عمیق پڑھو۔ وہ تعمیل حکم کے بعد دوبارہ حاضر ہوئی اور کہا، مجھے قرآن مجید سے وہ باتیں نہیں ملیں جو آپ سے مجھے پہنچتی ہیں۔ تب ابن مسعود نے اسے سمجھایا کہ کیا تم نے یہ نہیں پڑھا۔ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (۵۹:۷) ''جو کچھ تمھیں رسول دے اسے لے لو اور جس سے تمھیں روکے اس سے رک جاؤ۔'' اس عورت نے کہا ہاں! یہ تو پڑھا ہے۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا: فَهُوَ ذَاكَ ''پس یہی وہ بات ہے۔''

حضرت ابوبکرؓ کے نزدیک حدیث اور سنت کی اہمیت

حضرت ابوبکرؓ کے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو آپ سب سے پہلے کتاب اللہ میں اس کا حکم ڈھونڈتے۔ اگر وہاں سے نہ ملتا تو سنت رسول اللہ ﷺ میں اس کی نظیر ڈھونڈتے۔ آپ کو سنت رسول معلوم کرنے کے لیے لوگوں میں اعلان بھی کرانا پڑتا تا کہ اگر کسی کو حضور ﷺ کا کوئی عمل یا فیصلہ اس مسئلہ کے متعلق یاد ہو تو بتائے۔ لوگ جمع ہوتے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی احادیث بیان کرتے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ فیصلے کرتے تھے اور اظہار تشکر کے طور پر یہ الفاظ فرماتے "خدا کا شکر ہے کہ ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ہمارے نبی کی باتیں یاد رکھتے ہیں۔ علامہ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین جلد ۴ ص ۱۲۰ پر لکھا ہے۔ ابوبکر صدیقؓ کی زندگی میں نص کی خلاف ورزی کی ایک مثال بھی نہیں ملتی۔ آپ نے خلیفہ بننے کے بعد سب سے پہلے یہ اعلان کیا: اَطِیْعُوْنِیْ مَااَطَعْتُ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَاِنْ عَصَیْتُ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَلاَ طَاعَۃَ لِیْ عَلَیْکُمْ۔ "میری اطاعت کرو۔ جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہوں لیکن اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر فرض نہیں ہے۔"

حضرت عمرؓ اور سنت رسول: حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے دوران قاضی شریح کو لکھا: "اگر تم کوئی حکم کتاب اللہ میں پاؤ تو اس کے مطابق فیصلہ کرو اور اس کی موجودگی میں کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ دو۔ اگر کوئی ایسی بات آ جائے۔ جس کا حکم کتاب اللہ میں نہ ہو تو آنحضرت ﷺ کی سنت کے مطابق حکم دو اور اگر معاملہ ایسا ہو کہ جس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ سنت رسول میں تو اس کا فیصلہ اسے قانون کے مطابق کرو جس پر اجماع ہو چکا ہے۔ (اعلام الموقعین مصنفہ حافظ ابن قیمؒ)

فرمایا آئندہ ایسے لوگ پیدا ہوں گے۔ جو قرآنی متشبہات کے متعلق تم سے جھگڑیں گے ایسی صورت میں سنتوں کے ذریعہ ان پر حجت قائم کرنا۔ (کتاب المیزان للشعرانی) آپ نے فرمایا میں اس لیے گورنروں کو بھیجتا ہوں کہ وہ تمہارا دین اور نبی کی سنت سکھائیں۔

اہمیت سنت از روئے عمل فقہاء کرام: امت مسلمہ میں جتنے فقہاء گزرے ہیں ان سب نے اپنے فکر کی بنیاد قرآن سنت وحدیث پر رکھی ہے۔ کسی نے بھی سنت وحدیث سے ہٹ کر صرف قرآن کو ہی اپنا مرجع و ماویٰ نہیں سمجھا۔ سب نے قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث وسنت کو اپنے فکر کے لیے ضروری ماخذ ومصدر قرار دیا ہے۔ تمام فقہاء کا یہ عمل اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ حدیث وسنت اسلام کی عمارت کا ایک مضبوط ترین ستون ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: اِیَّاکُمْ وَالْقَوْلَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ بِالرَّاْءِ وَعَلَیْکُمْ بِاتِّبَاعِ السُّنَّۃِ فَمَنْ خَرَجَ مِنْھَا ضَلَّ (قواعد الحدیث ص ۲۳)
"اللہ کے دین کے معاملہ میں رائے اور قیاس سے بچو اور سنت کی پیروی کو اپنے اوپر لازم کرلو۔ جو سنت سے نکلا وہ گمراہ ہوا۔"
"اگر سنتیں نہ ہوتیں تو ہم سے کوئی بھی قرآن مجید کا فہم حاصل نہ کر سکتا۔" (کتاب المیزان)

امام مالک فرماتے ہیں: ہر شخص کی بات کو اختیار بھی کیا جا سکتا ہے اور چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔ سوائے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قول کو بہرحال اپنانا ہی پڑے گا۔ "جس نے رسول اللہ ﷺ کی حدیث کو رد کیا۔ وہ ہلاکت و تباہی کے کنارے پر پہنچ گیا۔" (کتاب المناقب ابن الجوزی ص ۱۸۲)

حضرت امام شافعی کا ارشاد ہے۔ "مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب کسی پر رسول اللہ ﷺ کی سنت واضح ہو جائے تو پھر اس کے لیے کسی قول کی وجہ سے اس کو چھوڑنا جائز نہیں۔ (اعلام الموقعین ج ۲)

سنت مجملات کی تشریح ہے: مشہور حدیث ہے: اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْکِتَابَ وَمِثْلَہٗ "یعنی رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے کتاب اور اس کی مثل دی گئی ہے کتاب سے مراد قرآن مجید اور مثل سے مراد وہ حدیث یا سنت ہے جو قرآن مجید کے مجملات۔ متشبہات کی توضیح وتشریح ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں نماز کا حکم ہے۔ رسول کریم ﷺ نے اس کے اوقات طریق ادا اور آداب وغیرہ سکھائے اسی طرح حلال وحرام کی وضاحت سنت نبوی سے ہوئی ہے۔ مثلاً فتح خیبر کے موقع پر پالتو گدھے اور درندوں کے گوشت کے حرام ہونے کا اعلان کیا۔

رسول کریم ﷺ کی وضاحت اور تشریح کے بغیر بعض اوقات احکام سمجھنے میں غلطیاں ہوسکتی ہیں اس کی بعض مثالیں صحابہ کرام میں ملتی ہیں۔ جب وضو کے لیے پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کا حکم آیا تو ایک صحابی کو تیمم کے طریقہ کا علم نہیں تھا۔ وہ ایک دفعہ پانی نہ ملنے کی صورت میں مٹی میں جا کر لوٹنے لگانے لگا۔ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ سنایا تو آپ نے اس صحابی کو تیمم کا طریقہ سکھایا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی خوبصورت توجیہہ: حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ کے ساتویں مبحث باب ۵ میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہاں صرف اس بحث کا مغز بیان کر دیا جاتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کی سنت کے دو پہلو ہیں ایک طبعی اور دوسرا تشریعی طبعی پہلو کا تعلق اس وقت کے خصوصی ماحول سے تھا۔ اس کی اتباع واجب نہیں۔ تاہم رسول کریم ﷺ کی محبت کے پیش نظر کوئی مسلمان اس پہلو کی پیروی کرتا ہے تو اسے محبت کا اجر ضرور ملے گا۔ تشریعی پہلو کا تعلق تبلیغ رسالت سے ہے اس میں آپ کا اتباع واجب ہے۔ آپ نے خود اس میں تمیز فرمادی ہے آپ نے فرمایا: اِنِّی تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ اَنْ تَمَسَّکْتُمْ بِہٖ لَنْ تَضِلُّوْا کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّتِیْ "یعنی میں نے تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں جب تک تم انھیں پکڑے رہو گے گمراہ نہیں ہوں گے۔ وہ اللہ کی کتاب اور میری سنت ہیں۔ آپ نے اس سنت کا ذکر کیا ہے۔ جس پر عمل کرنا واجب ہے۔" دیگر امور کے بارے میں فرمایا: اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ "یعنی تم اپنے دنیوی کاموں کو بہتر جانتے ہو۔"

قرآن مجید کے احکام کی تفصیل یا تشریح کرنے کے لحاظ سے دو اقسام ہیں۔

ایک وہ احکام جن کا ذکر اپنی تفصیلات و تشریحات سمیت خود قرآن مجید میں آ گیا ہے۔ وہ سنت کے محتاج نہیں اور سنت صرف ان کی تاکید و تائید کرتی ہے۔ جیسے قذف، لعان، روزے وغیرہ کا وجوب اور اس کے رمضان میں ہونے سے متعلق احکام۔ دوسرے وہ احکام جن کی تشریح سنت کرتی ہے۔ مثلاً اسلام کے دو بڑے اصول نماز اور زکوٰۃ ہیں اور یہ دونوں مکی اور مدنی وحی میں بار بار ملتے ہیں۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (نماز قائم کرو) قرآن کا حکم ہے مگر اس کی تفصیلات رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمائیں۔ اسی طرح اٰتُوا الزَّکٰوۃَ (زکوٰۃ دو) قرآن کا حکم ہے جو بار بار قرآن مجید میں آتا ہے۔ مگر اس کی ادائیگی اور اس کے جمع کرنے کے قواعد و ضوابط رسول کریم ﷺ نے مرتب فرمائے یہاں صرف دو مثالیں بیان کی جاتی ہیں۔ لیکن چونکہ اسلام انسانی کاروبار کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ سینکڑوں امور کی تفصیل حضرت رسول کریم ﷺ کو اپنے فعل یا اپنی زبان سے دینی پڑتی تھی۔ لہٰذا قانون سازی کے لیے قرآن مجید کے ساتھ سنت کی ضرورت ہوتی ہے۔

علامہ شاطبی کا بیان: علامہ شاطبی نے مذکورہ مفہوم کو درج ذیل انداز میں بیان کیا ہے۔ "سنت اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے قرآن حکیم ہی کی طرف رجوع ہونے والی ہے۔ وہ (سنت) قرآن حکیم کے مجمل کی تفسیر ہے۔ یا مشکل کا بیان ہے اور یا مختصر کی تشریح ہے۔" (الموافقات للشاطبی ج ۴ المسالۃ الثالثۃ)

قرآن و سنت میں باہم تعلق: قرآن اور سنت کے باہمی تعلق کو سمجھنے کے لیے تین باتوں کا خیال کرنا چاہیے۔

۱۔ سنت میں کوئی ایسی چیز اس طرح بیان کی گئی ہو جو قرآن مجید میں بیان کی گئی ہو۔ ایسی چیز ...... میں سنت قرآن کریم کے لیے "موید" کہلاتی ہے مثلاً قرآن مجید میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے فرض ہونے کا ذکر ہے۔

رسول کریم ﷺ نے بھی ان عبادات کو فرض قرار دیا ہے تو اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ قرآن مجید نے ان عبادت کو فرض قرار دیا ہے۔ سنت نے اس کی تائید کر دی ہے۔

۲۔ سنت، قرآن مجید کے کسی حکم کی عملی شکل بیان کرے۔ تو ایسی صورت میں سنت قرآن مجید کے لیے بیان کا درجہ رکھتی ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا ذکر ہے۔ رسول کریم ﷺ نے ان عبادات کو عملی شکل میں بیان کر دیا گویا قرآن مجید کے مجملات کی تفصیل سنت میں آ گئی۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ (القیامہ ۷۵:۱۹) ہمارے ذمہ اس کا بیان ہے۔ یعنی قرآن مجید میں جو احکام نازل ہوئے ہیں ان کے وضاحت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہے رسول کریم ﷺ وحی خفی کے ذریعہ ان مجمل احکام کی وضاحت کر دیتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْہِمْ وَیُعَلِّمُہُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (آل عمران ۳:۱۶۴) لوگوں پر اس کی آیات کی تلاوت کرے گا ان کو پاک کرے گا اور ان کو کتاب سکھائے گا اور حکمت بھی۔

محدثین اور مفسرین نے حکمت سے سنت مطہرہ قرار دیا ہے۔ جس کے ذریعے قرآن مجید کے احکام کو عملی شکل میں دیکھیں گے۔

۳۔ سنت کسی ایسے حکم پر مشتمل ہو جس کا ذکر قرآن مجید میں موجود نہ ہو۔ مثلاً حرکات بشریہ، جسم کی حرکت وغیرہ۔ چلنا پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا وغیرہ اس کا اتباع ضروری نہیں یا امور عادیہ یعنی ایسے افعال جو رسول کریم ﷺ کی عادت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی اتباع بھی ضروری نہیں اسی طرح ایسے امور جو جبلت اور فطرت سے تعلق رکھتے ہوں مثلاً کھانے، پینے سے متعلق آپ کی سنت وغیرہ۔

تدوین

دور اول: آپ کے اقوال و افعال کا ایک دوسرے کو پہنچانا رسول اللہؐ کی زندگی میں: آپ ﷺ کے اقوال و افعال آپ ﷺ کے زمانے میں ہی دوسروں تک پہنچانا لازمی تھا۔ رسول کریم ﷺ جو کچھ فرماتے اور جو کچھ کرتے خود اس کو دوسروں تک پہنچانے کی نصیحت فرماتے تھے۔ چنانچہ مدینہ کے ابتدائی ایام میں جب قبیلہ ربیعہ کا وفد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کی آخری وصیت ان کو یہ تھی کہ ''ان باتوں کو یاد رکھو اور ان کو بھی پہنچا دو۔ جن کو تم پیچھے چھوڑ آئے ہو۔'' (المشکوٰۃ المصابیح)

ایک دوسرے موقع پر بھی آپ نے ایسی نصائح ارشاد فرمائی۔ فرمایا اپنے لوگوں کے پاس جاؤ اور ان کو ان باتوں کی تعلیم دو۔ (بخاری ۳:۲۵) ایک اور روایت سے ثابت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر مسلمان کو ایک دوسرے کی جان و مال و عزت کی حرمت کی نصیحت فرماتے ہوئے رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''وہ جو یہاں موجود ہے اس کو جو یہاں موجود نہیں ہے۔ پہنچا دے۔'' (بخاری ۳:۳۷) پھر اس امر کے متعلق تاریخی شہادت موجود ہے کہ جب کوئی گروہ اسلام قبول کرتا۔ آنحضرت ﷺ ان کے پاس ایک یا ایک سے زیادہ مبلغ بھیجتے جو ان کو صرف قرآن مجید کی ہی تعلیم نہیں دیتے تھے بلکہ ان کو بتاتے تھے کہ احکام قرآنی کی کس طرح سے عملی طور پر اتباع کرنی چاہیے۔ یہ بات بھی تاریخی طور پر ثابت ہے کہ لوگ رسول کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے اور آپ سے درخواست کرتے کہ ان کے ہاں معلم بھیجے جائیں۔ جو ان کو کتاب و سنت کی تعلیم دیں اور آپ کے صحابہ خوب جانتے تھے کہ اگر قرآن مجید میں کسی امر کی تصریح نہ ہو تو حضور ﷺ کی سنت پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ روایت ہے کہ جب معاذ بن جبل کو آنحضرت ﷺ نے یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو آپ نے ان سے دریافت کیا کہ معاملات کو کس طرح نمٹاؤ گے۔ انھوں نے جواب دیا کہ کتاب اللہ سے پھر دریافت کیا اگر کتاب اللہ میں کوئی صراحت نہ ہو۔ تو پھر؟ انھوں نے جواب دیا۔ سنت رسول اللہؐ سے۔ (سنن ابی داؤد کتاب الاقضیہ باب الاجتہاد والرائی فی القضاء ۳/۳۰۳) مذکورہ بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول کریم ﷺ کے اقوال و افعال آپ کی زندگی میں ہی دوسروں تک پہنچائے جاتے تھے۔ ان اقوال اور افعال پر آپ کی زندگی میں ہی عمل کیا جانے لگا تھا اور آپ کی سنت کو مذہبی امور میں مشعل ہدایت تسلیم کر لیا گیا تھا۔

اہل مغرب کا یہ عام خیال ہے کہ سنت کی ضرورت کا احساس رسول کریم ﷺ کی زندگی کے بعد پیدا ہوا۔ مذکورہ واقعات اس خیال کو غلط قرار دیتے ہیں۔

حدیث کا رسول کریم ﷺ کی زندگی میں معرض تحریر میں آنا: جہاں صحابہ کرام رسول کریم ﷺ کے اقوال اور افعال پر عمل پیرا ہو جاتے تھے تو دوسری طرف ان کو اپنے حافظوں میں نیز کاغذ پر محفوظ کر لینے کا اہتمام کر لیتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ جب انصار میں سے ایک شخص نے رسول کریم ﷺ سے شکایت کی کہ جو کچھ وہ حضور سے سنتا ہے اس کو یاد نہیں رکھ سکتا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کو اپنے دائیں ہاتھ کی مدد لینا چاہیے۔ (یعنی قلم کا استعمال کرنا چاہیے) (ترمذی ابواب العلم باب ماجاء فی الرخصۃ فیہ)

دوسری مشہور روایت عبداللہ بن عمرو سے ہے کہ فرماتے ہیں کہ ''میں جو کچھ رسول کریم ﷺ سے سنتا تھا لکھ لیتا تھا تاکہ میں اس کو یاد رکھ سکوں۔ (کسی شخص نے اعتراض کیا) میں نے رسول کریم ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا ''لکھ لیا کرو'' کیونکہ میں جو کچھ کہتا ہوں۔ حق ہے۔ (سنن ابو داؤد کتاب العلم، مسند ابن حنبل احادیث نمبر ۶۵۱۰، ۶۸۰۲، ۶۹۳۰، ۷۰۱۸، ۷۰۲۰ نیز ابن سعد) اس کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ کی ایک اور روایت ہے۔ ''مجھ سے زیادہ نبی کریم ﷺ کی احادیث کو کوئی محفوظ نہیں رکھتا تھا۔ سوائے عبداللہ بن عمرو کے کیونکہ وہ لکھ لیا کرتا تھا اور میں نہیں لکھتا تھا۔ (بخاری ۳:۳۹ کتاب العلم باب کتابۃ العلم) انس ابن مالک کا بیان ہے کہ حضرت ابو بکر نے ان کے لیے صدقات کے قوانین تحریر کیے۔ (بخاری ۲۴:۳۰) حضرت علیؓ کے پاس ایک قول رسول کریم ﷺ کا تحریر کردہ موجود تھا۔ (بخاری ۳:۳۹) فتح مکہ کے وقت آپ نے خطبہ پڑھا جب خطبہ ختم ہوا۔ تو یمن کے لوگوں میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور اس نے رسول کریم ﷺ سے درخواست کی کہ یہ خطبہ اس کے لیے لکھوا دیا جائے۔ اس پر حضرت نبی کریم ﷺ نے ایسا کرنے کا حکم دیا۔ (بخاری ۳:۳۹)

ان روایات سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے۔ ایک طرف جب کہ احادیث کو یاد رکھا جاتا تھا۔ تو دوسری طرف موقع بہ موقع حسب ضرورت ان کو لکھ بھی لیا جاتا تھا۔

حدیث عموماً عہد رسول میں کیوں لکھی نہ جاتی تھی: امر واقعہ یہ ہے کہ عموماً حضرت نبی کریم ﷺ کے عہد میں اقوال لکھے نہیں جاتے تھے۔ حافظہ ہی ان کے تحفظ کا بڑا ذریعہ تھا۔ بعض اوقات حضور نے منع بھی فرمایا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے جبکہ ہم

حدیث لکھ رہے تھے۔ آپ نے پوچھا کیا ہے جو تم لکھ رہے ہو۔ ہم نے عرض کیا کہ حدیث جو ہم حضور ﷺ سے سنتے ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ''کیا خدا کی کتاب کے علاوہ کوئی اور کتاب؟ اب اس خاص واقعہ پر رسول کریم ﷺ نے جو حدیث کے لکھنے پر اظہار ناراضگی اور ناپسندیدگی فرمائی ہے۔ اس کی وجہ یہ خوف تھا کہ کہیں حدیث قرآن سے خلط ملط نہ ہو جائے۔ ورنہ حدیث کے لکھنے میں کچھ مضائقہ یا غلطی نہ تھی۔ فتح مکہ کے وقت ایک شخص کی درخواست پر آپ خود حدیث لکھ دینے کا حکم دیتے ہیں۔

آپ نے خطوط بھی تحریر فرمائے۔ معاہدات بھی معرض وجود میں آئے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا کبھی یہ مقصد نہ تھا کہ قرآن مجید کے علاوہ کسی چیز کا لکھنا ناجائز تھا۔ جیسا کہ روایت بالا سے بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ جس بات کی آپ کو فکر تھی وہ یہ تھی کہ اگر احادیث کو بھی قرآن مجید کی طرح لکھا گیا۔ تو دونوں آپس میں خلط ملط ہو جائیں گے اور اس سے قرآن مجید کے متن کی صحت میں خرابی آنے کا اندیشہ ہوسکتا ہے۔ جب صحابہ میں قرآن مجید اور اقوال رسول میں تمیز کرنے کا ملکہ پختہ ہوگیا اور آپ نے سمجھ لیا کہ آپ حدیث اور قرآن میں تخلیط نہ ہوگی تو آپ نے لکھنے کی اجازت دے دی جیسا کہ احادیث سے واضح ہے۔

علم کو محفوظ رکھنے کے لیے حافظے پر اعتماد کیا جا سکتا ہے: سنت اور حدیث کو محفوظ رکھنے کے لیے حافظہ پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ صحابہ نے قرآن مجید کو حفظ یاد کیا۔ پھر اسی حافظہ کی مدد سے بھی قرآن مجید کو احاطہ تحریر میں لانے میں مدد ملی۔ عربوں کا حافظہ حیرت انگیز طور پر مضبوط تھا۔ وہ لاتعداد چیزوں کا علم اپنے حافظوں میں رکھ سکتے تھے۔ یہ ان کا حافظہ ہی تھا۔ جس میں قبل اسلام کے دلکش نظمیں بغیر کسی تغیر کے زندہ اور محفوظ چلی آتی تھیں۔ اسلام سے قبل تحریر کا رواج بہت شاذ تھا اور تمام ضروری امور سے متعلق حافظے پر ہی اعتماد کیا جاتا ہے۔ ایک شخص سینکڑوں نہیں ہزاروں اشعار اپنے حافظے سے پڑھ سکتا تھا۔ ان اشعار کے پڑھنے والے ان اشخاص کے نام بھی یاد رکھتے تھے۔ جن کے ذریعے وہ اشعار ان تک پہنچے۔ اصمعی جو بعد کے زمانہ کے راوی ہیں کہتے ہیں کہ بلوغت سے پیشتر انھوں نے بارہ ہزار اشعار زبانی یاد کر لیے تھے۔ ابو ضمضم کے متعلق اصمعی کہتا ہے۔ ایک ہی نشست میں وہ ایک سو شاعر کے اشعار پڑھ دیتا تھا۔ شعبی اپنے متعلق کہتا ہے کہ اس کو اس قدر اشعار زبانی یاد تھے کہ ان کو لگا تار ایک مہینے تک پڑھ سکتا تھا۔

رسول کریم ﷺ کے صحابہ میں سے کئی ایک ایسے تھے جن کو قبل اسلام نظموں کے ہزاروں اشعار نوک زبان تھے۔

غرض کہ رسول کریم ﷺ کے اقوال کو یاد کر کے دوسروں تک پہچانے میں کوئی ایسی انہونی بات نہیں جس پر اعتراض کیا جا سکے۔ علم کو محفوظ رکھنے کے لیے حافظے پر اعتماد کیا جاتا رہا ہے اور وہی حافظہ علم سنت اور حدیث کو محفوظ رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوا ہے۔ پھر یہ بھی امر واقع ہے کہ رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد یہ علم تحریراً اور قولاً دوسروں تک پہنچنا شروع ہوگیا۔ بڑے بڑے صحابہ کے گھر اس علم کی اشاعت کے لیے درس گاہیں بن گئے۔

دوسرا دور: صحابہ کرام کے عہد میں تدوین حدیث: تدوین وحفاظت حدیث کا یہ دور رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں احادیث کی شہرت عام شروع ہوگئی۔ خلفاء نے کوئی فیصلہ کرنا ہوتا تو پہلے قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے اگر قرآن سے واضح حکم نہ ملتا تو حدیث کی طرف رجوع کرتے اس طرح حدیث عام شہرت پکڑ جاتی۔

قبیصہ کی روایت ہے کہ ایک فوت شدہ شخص کی دادی حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئی اور ترکہ سے حق کا دعویٰ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اللہ کی کتاب سے اور نہ سنت رسول سے آپ کا حق ملتا ہے۔ لیکن جب دوسروں (صحابہ کرام) سے اس کے متعلق دریافت کیا تو مغیرہ نے گواہی دی کہ حضرت رسول کریم ﷺ نے دادی کو چھٹا حصہ دیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان سے ایک گواہ طلب کیا اس پر محمد بن مسلم نے مغیرہ کے بیان کی تصدیق کی اس بناء پر حضرت ابوبکرؓ نے دادی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ (ترمذی ۹:۲۷ سنن ابی داؤد ۵:۱۸)

مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات کی وجہ سے اس قسم کے واقعات ہر روز ظہور پذیر ہوتے تھے۔ تو لازماً خلفاء کو یا صحابہ کرام کو حدیث نبوی کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ جس سے حدیث ایک ہاتھ سے نکل کر عوام کا ورثہ بن جاتی۔

صحابہ کرام کا تدوین حدیث میں سعی عمل: صحابہ کرام نے خود بھی فرمان نبوی لِيُبَلِّغَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ حضار غائب کو یہ اقوال پہنچا دے) کی وجہ سے حدیث کی عام اشاعت کی۔ صحابہ کے گھر حدیث کے لیے درس گاہیں بن گئے۔ حضرت ابوہریرہؓ کے آٹھ ہزار شاگرد تھے۔ اسی طرح حضرت عائشہؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت انسؓ بن مالک، حضرت زید بن ثابتؓ حضرت ابوسعید خدری اور حضرت جابر بن عبداللہ کے گھر حدیث کی درس گاہیں تھیں ان درس گاہوں کے علاوہ خلفاء راشدین نے احادیث کی اشاعت اور تعلیم کے لیے صحابہ کرام کو دوسرے ملکوں میں بھیجا۔

عہد صحابہ میں حدیث کے کتابی نسخے: ۱۔ حضرت ابوہریرہ کا کتابی نسخہ۔ ۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرو کا صحیفہ صادقہ۔ ۳۔ حضرت انس بن مالک کا تحریری نسخہ۔ ۴۔ صحیفہ جابر بن عبداللہ۔ ۵۔ حضرت عبداللہ بن عباس کا تحریری نسخہ۔ ۶۔ عبداللہ بن عمر کا نسخہ۔ ۷۔ اوائل بن حجر کا تحریری نسخہ۔ ۸۔ سمرہ بن جبیر کا نسخہ۔ ۹۔

سعد بن عبادہ کا صحیفہ۔۱۰۔ حضرت علی کا نسخہ۔۱۱۔ صحیفہ عمرو بن حزم۔

تیسرا دور: تابعین کا دور ہے اکابر تابعین نے احادیث کی تدریس کے لیے درس گاہیں قائم کیں تمام لوگ درسگاہوں کی طرف رجوع کرتے تھے جواہر پاروں سے جھولیاں بھر بھر کر واپس وطنوں کو لوٹتے تھے۔ اس دور میں لکھنے کا عام رواج ہو چکا تھا۔ لوگ درس گاہوں میں جاتے حدیثوں کو لکھ لیتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مدینہ کے گورنر ابوبکر بن محمد بن حزم کو لکھا۔ انظر ما کان من حدیث رسول اللّٰہ ﷺ فاکتبہ فانی خفت دروس العلم بعد ذهاب العلماء ولا تقبل الا لحدیث رسول اللّٰہ ﷺ ولیفشوا العلم و لیجلسوا حتی یعلم من لا یعلم فان العلم لا یهلک حتی یکون سراً و کذالک کتب الی عماله فی امهات المدن الاسلامیة یجمع الحدیث (جامع بیان العلم جلد ا صفحہ ۷۳) یعنی رسول کریم ﷺ کی احادیث کو احتیاط وحزم سے لکھ لو مجھے اندیشہ ہے کہیں علم (حدیث) مٹ نہ جائے اور علماء فوت نہ ہو جائیں اور رسول کریم ﷺ کے فرمان کے بغیر کسی کا قول قبول نہ کر۔ چاہیے کہ علماء علم پھیلائیں مجالس قائم کریں تاکہ جو شخص نہیں جانتا وہ بھی جان جائے کیونکہ علم اگر پوشیدہ ہو جائے (یعنی صرف چند لوگوں کے ہاتھ میں رہ جائے) تو فنا ہو جاتا ہے اس طرح آپ نے مملکت اسلامیہ کے بڑے بڑے شہروں کے والیوں کو حدیث جمع کرنے کے احکام صادر فرمائے۔

چوتھا دور: اس دور میں احادیث کے تحریری مجموعے منظر پر عام پر آنے شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے جس شخص نے حدیث کی کتاب لکھی۔ وہ امام عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج (م ۱۵۰) ہیں بعض کے نزدیک ربیع بن صبیح (م ۱۶۰) نے سب سے پہلے حدیث کی کتاب لکھیں۔

ایک اور روایت کی رو سے سعید بن ابی عروبہ (م ۱۰۶)

ان محدثین کے علاوہ حسب ذیل علماء نے علمی حدیث کی خدمت سرانجام دی۔

مدینہ میں محمد بن اسحاق (م ۱۵۱ھ) امام مالک بن انس (م ۱۷۹ھ) کوفہ میں سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ) شام میں امام اوزاعی (م ۱۵۶ھ) یمن میں معمر بن راشد (م ۱۵۳ھ) خراسان میں عبداللہ بن مبارک (م ۱۸۱ھ) مصر میں لیث بن سعد (م ۱۷۵ھ) رے میں جریر بن عبدالحمید واسط میں ہشیم بصرہ میں امام حافظ حماد بن مسلمہ بن دینار (م ۱۶۷ھ)

پانچواں دور: پانچواں دور علم حدیث کا سنہری دور کہلاتا جس میں احادیث کی کتابی شکل میں تدوین کی تکمیل ہوئی اہل سنت والجماعت کے چھ معتبر کتاب حدیث اس دور میں مرتب ہوئیں۔

الجامع الصحیح (صحیح بخاری) مولفہ حضرت محمد اسماعیل (۱۹۴ھ......۲۵۶ھ) ۲۔ صحیح مسلم مولفہ حافظ مسلم بن حجاج (۲۰۴ھ......۲۶۱ھ) ۳۔ سنن ابی داؤد مصنفہ ابوداؤد سلیمان بن اشعث السجستانی (۲۰۲......۲۷۵ھ) ۴۔ جامع ترمذی مولفہ ابوعیسیٰ محمد بن موسیٰ (۲۰۹ھ......۲۷۹ھ) ۵۔ سنن ابن ماجہ مولفہ ابوعبداللہ محمد بن یزید قزوینی (۲۰۹ھ......۲۷۳ھ) ۶۔ نسائی مولفہ ابوعبدالرحمٰن بن شعیب (۲۱۴ھ......۳۰۳ھ)

اگر پانچوں ادوار پر غور کیا جائے تو روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گا کہ پہلے دور سے لے کر پانچویں دور تک ایک طبعی تسلسل چلا آ رہا ہے۔ جیسے ایک زنجیر کے حلقے ہوتے ہیں ہر حلقہ کا تعلق دوسرے سے ہوتا ہے۔ اس طرح تدوین حدیث کے ادوار کا تعلق ایک دوسرے سے ہے۔ پانچویں دور میں پہلے چار ادوار کے مواد حدیث کو کتابی شکل دے دی گئی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ پانچویں دور میں مولفین نے احادیث جمع کرنا شروع کی ہیں۔ جمع پہلے ہی تھیں۔

تیسرا ماخذ اجماع

اجماع کے لغوی معنی: اجماع جمع سے مشتق ہے جس کے معنی اکٹھا کرنا یا اکٹھا ہونا ہے۔

اصطلاحی معنی: رسول کریم ﷺ کی امت کے اہل حل وعقد کا کسی معاملہ میں اتفاق اور اتحاد کر لینے کا نام اجماع ہے۔ (منہاج الاصول للبعداوی الکتاب الثالث فی الاجماع)

اجماع کی ضرورت و اہمیت: گو قرآنی کلیات اور نبوی تشریحات اپنے اپنے رنگ میں جامع ہونے کے باوجود ہر دور کی جزئی اور فروعی مسائل کی تفصیل سے خالی ہیں۔ نئے حالات کے تقاضے کے مطابق ان فروعی مسائل کا حل ضروری ہوتا ہے جیسا کہ حضرت عمر کے دور میں مفتوحہ اراضی کا مسئلہ پیش آیا۔ جب کہ اس سے قبل مفتوحہ اراضی مجاہدین میں بھی تقسیم کی جاتی تھی لیکن ملکی اور قومی حالات کے پیش نظر مشورہ سے الگ راہ متعین کر کے مفتوحہ اراضی کو حکومت کی ملکیت قرار دے دیا گیا۔ یہ فیصلہ بھی قرآن مجید اور تشریحات نبوی کی روح کے مطابق تھا۔ دین اسلام ایک فطرتی اور آسان دین ہے۔ اس لیے ہر دور کے مسائل کو

حل کرنے کی راہیں اس میں موجود ہیں اس لیے اسلام نے ہر زمانے کے مجتہدین اور فقہاء کو یہ اجازت دی ہے کہ ملکی مسائل کو قرآن مجید اور تشریحات نبوی کی روشنی میں حل کر لیں۔

اجماع کے واجب ہونے کے دلائل

پہلی دلیل: قرآن مجید کی رو سے: قرآن مجید میں آتا ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ (النساء۴:۵۹) ''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور جو تم میں سے حاکم (اولوالامر) ہیں۔

وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا (النساء۴:۱۱۵) ''جو شخص اللہ کے رسول کی مخالفت کرے گا۔ جب کہ ہدایت ظاہر ہو گئی اور مومنوں کی راہ ترک کر کے دوسرا راستہ اختیار کرے گا تو ہم اسی کا رخ ادھر پھیر دیں گے۔ جدھر وہ چلے اور اسے جہنم میں ڈالیں گے اور برا ٹھکانہ ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں کہ اس آیت سے مسلمانوں کے اجماع کی اتباع کا وجوب ثابت ہے۔ امام شافعی نے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ (المستصفی ۲/۱۷۵)

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ (البقرہ۲:۱۴۳) ''اور اسی طرح ہم نے تمہیں درمیانی امت (اعلیٰ امت) بنایا تا کہ تم لوگوں کے لیے سچائی کی گواہی دینے والے ہو۔''

''تنظیم شوریٰ'' اجماع کی ایک شکل ہے: اجماع کے بارے میں سب سے زیادہ اہم اور مستند ثبوت اور دلیل تنظیم شوریٰ ہے۔ جس میں تمام دینی اور ملکی امور پر بحث ہوتی ہے اور قرآن اور حدیث کی روشنی میں کسی فیصلہ پر پہنچا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد رسول کریم ﷺ کے عہد میں پڑ گئی تھی۔ رسول کریم ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کوئی قومی اور ملکی سطح کا کام ہوتا تو صحابہ کرام کو اکٹھا کر کے مشورہ کیا کرتے تھے جیسا کہ جنگ بدر جنگ احد اور جنگ خندق وغیرہ میں آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔

رسول کریم ﷺ نے یہ کام قرآن مجید کی واضح نص کے تحت کیا تھا۔ ارشاد الٰہی ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَی اللّٰهِ (آل عمران۳:۱۵۹) ''معاملات میں آپ ان سے مشورہ کر لیجئے پھر جب مشورہ کے بعد کسی بات کا عزم کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کیجئے۔

یہ آیت اجماع کی اصلیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول کریم ﷺ صحابہ کرام سے تمام اہم معاملات میں مشورہ کیا کرتے تھے۔ دوسری جگہ آتا ہے: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ (الشوریٰ۴۲:۳۸) ''ان کا کام مشورہ سے ہوتا ہے۔''

ارشاد الٰہی ہے۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران۳:۱۰۳) اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور باہم تفرقہ نہ کرو۔

ایک اور مقام پر آتا ہے۔ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْهِ مِنْ شَیْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَی اللّٰهِ (الشوری۴۲:۱۰) اور جس بات میں تم باہم اختلاف کرو تو اس کا فیصلہ اللہ ہی کے ذمہ ہے۔

ان دونوں آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس مسئلے پر امت کے لوگ متفق ہو جائیں وہ مسئلہ برحق ہوگا۔ (المستصفی ۲/۱۷۴)

ارشاد ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ. (النساء۴:۵۹) اے ایمان والو تم اللہ کی پیروی کرو اور رسول ﷺ اور حاکم کی پیروی کرو۔ اگر تم کسی معاملے میں اختلاف کرو تو اس امر کو اللہ اور رسول ﷺ کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس مسئلہ پر امت کے لوگ متفق ہو جائیں وہ مسئلہ برحق ہے اس لیے اس آیت میں حاکم کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔

دوسری دلیل: حدیث کی رو سے: درج ذیل کی احادیث بھی اجماع کی ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَجْمَعُ اُمَّتِیْ عَلٰی ضَلَالَةٍ (ترمذی ابواب الفتن) ''میری امت ضلالت پر جمع نہ ہوگی۔''

مَا رَاٰهُ الْمُسْلِمُوْنَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ حَسَنٌ (الاشباہ والنظائر القاعدہ السادسۃ العادۃ محکمۃ) ''جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔''

ترمذی کی حدیث میں یَدُ اللّٰهِ مَعَ الْجَمَاعَةِ یعنی جماعت کے ساتھ اللہ کی تائید اور نصرت ہے۔

اَلْزِمُوْا الْجَمَاعَةَ فَمَنْ شَذَّ مِنَ الْجَمَاعَةِ شَذَّ فِی النَّارِ جماعت کو لازم پکڑلو کیونکہ جو جماعت سے الگ ہوا آگ میں علیحدہ رہے ہیں۔

من فارق الجماعة شبراً فمات ميتة جاهلية (صحیح مسلم ۳/۱۴۷۷، حدیث ۱۸۴۹) جو شخص مسلمانوں کی جماعت سے ایک بالشت بھی الگ ہوا وہ جاہلیت کی موت مرا۔ فرمایا۔ فمن اراد ان يفرق امر المسلمين وهم جميع فاضربوا بالسيف كائن من كان (صحیح مسلم ۳/۱۴۷۹، حدیث ۱۸۵۲، سنن ابی داؤد ۵/۱۲۰) جو شخص مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنا چاہتا ہے جبکہ وہ سب ایک مسئلہ پر جمع ہو گئے ہوں اسے قتل کر دو۔ خواہ کوئی ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَجْمَعُ اُمَّتِي او قال امه محمد على ضلالة ويد الله على الجماعة ومن شذشذ في النار (جامع ترمذی کتاب الفتن ۴/۴۵۵ حدیث ۲۱۶) بے شک اللہ تعالیٰ میری امت کو یا فرمایا محمد ﷺ کی امت کو گمراہی پر اکٹھا نہیں کرے گا جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے جو شخص الگ ہوا وہ جہنم میں الگ ہو کر جا پڑے گا۔

فرمایا ان امتي لا تجمع على ضلالة فاذا رايتم اختلافا فعليكم بالسواد الاعظم (سنن ابن ماجہ حدیث ۳۹۵) بے شک میری امت گمراہی پر اکٹھی نہیں ہو سکتی جب تم کسی مسئلہ پر اختلاف دیکھو تو واضح اکثریت کے ساتھ ہو جاؤ۔

تیسری دلیل: از روئے عمل صحابہ: تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ خلفاء راشدین کسی ملکی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے اکابر صحابہ کو بلاتے ان سے مشورہ لیتے پھر طے شدہ فیصلہ پر عمل کرتے۔ یہ طے شدہ فیصلہ اجماعی تصور کیا جاتا تھا۔

بغوی نے میمون بن مہران سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے جب مقدمات پیش ہوتے تو وہ کتاب اللہ کے ذریعے ان کا فیصلہ فرماتے۔ اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ ملتا تو سنت رسول کے مطابق فیصلہ فرماتے لیکن اگر وہاں بھی کوئی مسئلہ نہ ملتا تو مسلمانوں کو جمع فرماتے اور ان سے معلوم کرتے کہ تمھیں رسول کریم ﷺ کی کوئی حدیث معلوم ہے اگر ان میں سے کسی کو کوئی حدیث معلوم ہوتی تو اسے بیان کرتا اور اگر اس مسئلہ میں کوئی حدیث دست یاب نہ ہوتی تو اہل علم کو جمع فرماتے اور ان سے مشورہ فرماتے جب وہ کسی امر پر اتفاق فرماتے تو حضرت ابوبکرؓ اس کے مطابق فیصلہ فرماتے یہی حضرت عمرؓ کا طریقہ کار تھا جب انھیں کتاب وسنت میں کوئی مسئلہ نہ ملتا تو ابوبکرؓ کے فیصلے پر بھی فیصلہ فرماتے اور اگر ابوبکرؓ کا فیصلہ بھی دست یاب نہ ہوتا تو علمائے صحابہ کو جمع فرماتے اور ان کے متفقہ رائے معلوم کر کے فیصلہ فرماتے جیسا کہ نماز جنازہ میں چار تکبیرات پر اسی طرح تعین ہوا۔ شراب کی حد اسی کوڑے اس طرح معین فرمائی۔ سرزمین عراق کی تقسیم میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ حضرت عمرؓ دوسروں کو بھی اسی کی ہدایت فرماتے حتیٰ کہ جو حکم نامہ آپ نے شریح کو تحریر فرمایا اس میں اصول فقہ کے یہ چاروں اصول بالترتیب مندرجہ ہیں۔ جسے امام شعبی نے شریح سے نقل کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

عَنْ شُرَيْحٍ اَنَّهٗ كَتَبَ اِلٰى عُمَرَ لِيَسْئَالَهٗ فَكَتَبَ اَنْ اقْضِ بِمَا فِی كِتَابِ اللّٰهِ فَاِنْ لَمْ يَكُنْ فِی كِتَابِ اللّٰهِ فَبِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ فَاِنْ لَمْ يَكُنْ فِی كِتَابِ اللّٰهِ وَلَا فِی سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم فَاقْضِ بِمَا قَضٰى بِهِ الصَّالِحُوْنَ فَاِنْ لَمْ يَكُنْ فِی كِتَابِ اللّٰهِ وَلَا فِی سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم وَلَمْ يَقْضِ بِهِ الصَّالِحُوْنَ فَاِنْ شِئْتَ فَتَقَدَّمْ اَیْ اِجْتَهِدْ بِرَأْيِكَ) وَاِنْ شِئْتَ فَتَاَخَّرْ (اَیْ لَمْ تَجْتَهِدْ) وَلَا اَرَى التَّاَخُّرَ اِلَّا خَيْرًا لَّكَ وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ (نسائی ج ۲ ص ۳۰۳) شریح نے حضرت عمر کی خدمت میں کچھ سوالات لکھ کر بھیجے حضرت عمرؓ نے انھیں جواب لکھا کہ کتاب کے مطابق فیصلہ کرو۔ اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں موجود نہ ہو تو رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر وہ کتاب اللہ میں بھی موجود نہ ہو اور نہ سنت رسول ﷺ میں وہ مسئلہ پایا جاتا ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کرو جو نیک لوگوں نے کیا اور اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ اور سنت رسول میں نہ ہو اور صالحین نے بھی کوئی فیصلہ نہ کیا ہو تو تیری مرضی ہے چاہے تو آگے بڑھ یعنی اپنی رائے سے اجتہاد کر اور چاہے پیچھے ہٹ جا یعنی کوئی فیصلہ نہ کر اور دوسروں پر چھوڑ دے اور میں تیرے لیے پیچھے ہٹنا زیادہ پسند کرتا ہوں اور تم پر سلام؟

امام نسائی نے صالحین یعنی صحابہ کبار کے متفقہ فیصلے کو اجماع سے تعبیر فرمایا ہے اور اس حدیث پر یہ سرخی لگائی ہے۔ اَلْحُكْمُ بِاتِّفَاقِ اَهْلِ الْعِلْمِ اتفاق اہل علم کے ساتھ فیصلہ کرنا۔

حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کے ساتھ امام نسائی نے عبداللہ بن مسعود کا فیصلہ بھی نقل فرمایا ہے اس کا مفہوم یہی ہے۔

عبداللہ بن مسعود کے فیصلے کو امام نسائی نے عبدالرحمٰن بن یزید اور حریث بن ظہیر کے ذریعہ نقل کیا ہے ہم ذیل میں عبدالرحمٰن بن یزید کی روایت پیش کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں۔

قَالَ اَكْثَرُوْا عَلٰى عَبْدِ اللّٰهِ ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ اِنَّهٗ قَدْ اَتٰى عَلَيْنَا زَمَانٌ لَسْنَا نَقْضِیْ وَلَسْنَا هُنَالِكَ ثُمَّ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ قَدَّرَ عَلَيْنَا اَنْ بَلَغْنَا مَاتَرَوْنَ فَمَنْ عُرِضَ لَهٗ مِنْكُمْ قَضَاءٌ بَعْدَ الْيَوْمِ فَلْيَقْضِ بِمَا فِی كِتَابِ اللّٰهِ فَاِنْ جَاءَهٗ اَمْرٌ لَيْسَ فِی كِتَابِ اللّٰهِ فَلْيَقْضِ بِمَا قَضٰى بِهٖ نَبِيُّهٗ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِنْ جَاءَ هُ أَمْرٌ لَيْسَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ وَلَا قَضَى بِهٖ نَبِيُّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلْيَقْضِ بِمَا قَضَى بِهِ الصَّالِحُوْنَ فَإِنْ جَاءَ هُ أَمْرٌ لَيْسَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ وَلَا قَضَى بِهٖ نَبِيُّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَا قَضَى بِهِ الصَّالِحُوْنَ فَلْيَجْتَهِدْ رَايَهُ وَلَا يَقُوْلُ وَإِنِّي أَخَافُ فَإِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَ ذَالِكَ أُمُوْرٌ مُشْتَبِهَاتٌ فَدَعْ مَايُرِيْبُكَ إِلٰى مَالَا يُرِيْبُكَ قَالَ أَبُوْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ هٰذَا الْحَدِيْثُ حَدِيْثٌ جَيِّدٌ جَيِّدٌ. یعنی عبدالرحمٰن بن یزید کہتے ہیں ایک روز عبداللہ بن مسعود کے پاس لوگوں نے بہت ہجوم کیا عبداللہ نے فرمایا ہم پر وہ زمانہ بھی آیا جب ہم نہ کوئی فیصلہ کرتے تھے اور نہ فیصلہ کرنے کے اہل تھے پھر اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے یہ بات مقدر فرمائی کہ ہم اس منزل پر پہنچے جس پر تم دیکھ رہے ہو تو آج کے بعد جس کے سامنے کوئی مسئلہ درپیش ہو وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرے لیکن اگر ایسا مسئلہ ہو جس کا ذکر کتاب اللہ میں نہ ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کرے جو نبی کریم ﷺ نے فرمایا لیکن اگر مسئلہ ایسا ہے کہ نہ تو کتاب اللہ میں ہے اور نہ سنت رسول میں تو پھر جو صالحین نے فیصلہ کیا ہے اس کے مطابق فیصلہ کرے۔ لیکن اگر نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ سنت رسول میں اور نہ صالحین نے اس کے مطابق کوئی فیصلہ کیا ہو تو اپنی رائے سے اجتہاد کرے اور یہ نہ کہے کہ میں فیصلہ کرنے سے ڈرتا ہوں۔ اس لیے کہ حلال بھی ظاہر اور حرام بھی ظاہر اور حلال وحرام کے مابین بہت سے مشتبہ امور ہیں تو تجھے جو شے شک میں ڈالے اسے ترک کردے اور وہ شے اختیار کر جو مشکوک نہ ہو (امام نسائی فرماتے ہیں یہ حدیث بہت عمدہ ہے)

سعید بن المسیب حضرت علی سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ بعض اوقات ہمارے سامنے ایسے معاملات پیش آتے ہیں جن کا ذکر کتاب وسنت میں موجود نہیں آپ نے فرمایا ایسی صورت میں عالم اور عابد مسلمانوں کو جمع کرو اور ان سے مشورہ کرو اور کسی ایک کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔

مذکورہ آیات اور احادیث سے یہ صریح معلوم ہوتا ہے کہ جس مسئلہ کا ذکر کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ میں نہ ہو اس میں اجماع سے فیصلہ کیا جائے۔

انعقاد اجماع کی شرائط: اجماع پر اس زمانہ کے تمام مجتہدین نے صریح الفاظ کے ساتھ اتفاق کیا ہو۔ اس شرط پر تمام علماء کا اتفاق ہے لیکن اختلاف اس بات پر ہے۔ آیا اجماع کے منعقد ہونے اور اس کے تحت حجت شرعیہ ہونے کے لیے اس زمانے کا ختم ہو جانا بھی شرط ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ اکثر شوافع اور اشاعرہ کی یہ رائے ہے کہ نہ تو اجماع کے انعقاد کے لیے ایسا ہونا شرط ہے اور نہ ہی اس کے حجت ہونے کے لیے۔ جب کسی مسئلہ پر مجتہدین کا اتفاق ہو جائے تو وہ اجماع پایہ حجت کو پہنچ جاتا ہے۔ زمانہ کا انقراض لازمی نہیں۔

اس کے برعکس امام احمد بن حنبل اور علامہ ابوبکر بن فورک کا یہ مسلک ہے کہ اجماع کے انعقاد کے لیے اس دور کا انقراض ضروری ہے۔

(کشف الاسرار ۲/۲۴۴ الاحکام فی اصول الاحکام ۱/۳۶۶)

امام شافعی کے بعض شاگرد مثلاً علامہ ابو اسحاق اسفرائنی کا یہ مسلک ہے کہ اگر مجتہدین نے قول اور فعل سے کسی مسئلہ پر اتفاق کرلیا ہے تو ایسی صورت میں اس زمانے کا انقراض اجماع کے منعقد ہونے کی شرط نہ ہوگا اگر بعض مجتہدین نے صراحت کے ساتھ اظہار بیان کر دیا ہے اور بعض نے سکوت اختیار کرلیا ہے تو اس صورت میں زمانے کا انقراض شرط ہوگا۔

بعض علماء کا یہ مسلک ہے کہ عہد کے انقراض کی شرط اس وقت لازمی ہے جب اجماع کسی قیاس پر مبنی ہو۔ یہی امام الحرمین جوینی کا مذہب ہے۔

(کشف الاسرار ۳/۲۴۴، الاحکام فی اصول الاحکام ۱/۳۶۶)

صحیح مسلک یہی ہے کہ اجماع کے انعقاد اور حجت ہونے کے لیے زمانہ کا ختم ہونا لازمی نہیں۔ جب کسی مسئلہ پر مجتہدین اتفاق کرلیں تو اجماع مکمل ہو گیا اور اب وہ اجماع لوگوں کے لیے حجت بن گیا ہے۔ بصورت دیگر اگر انقراض عہد کو شرط قرار دیا جائے تو اس کی بناء پر اجماع کا مکمل ہونا کبھی لازم نہیں آئے گا۔ اس شرط کی رو سے صحابہ کرامؓ کا زمانہ جب تک نہ گزر جائے گا اجماع مکمل نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ صحابہ کرامؓ کے دور میں مجتہدین تابعین کو بھی اس اجماع کی مخالفت کا حق حاصل ہو جائے گا۔ پھر تابعین کے زمانے میں تبع تابعین کو بھی مخالفت کا حق حاصل ہوگا۔ اس طرح اس کے بعد کے لوگوں کو اس طرح یہ چکر جاری رہے گا اور نتیجہ یہ نکلے کہ کوئی اجماع مکمل ہی نہ ہوگا۔

اجماع کی اقسام

ا۔ اجماع صریح: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ تمام علماء جن کا اجتہاد معتبر ہے کسی مسئلہ پر اس طرح متفق اور متحد ہوں کہ ان میں سے ہر ایک اپنے قول یا فعل کے ذریعہ اپنی رائے کا اظہار کرے۔

اجماع سکوتی: بعض اہل نظر علماء کے اتفاق سے کوئی بات شائع ہو جائے اور دوسرے اہل نظر علماء وفقہاء خاموش رہیں۔
یہ اجماع اسی وقت قابل اعتبار ہوگا جب کہ اظہار رائے کی عام طور پر آزادی ہوگی۔

اجماع کے فیصلوں کا شرعی حکم: اسلام کے قانونی نظام میں اجماع کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کا فیصلہ نہایت مستند اور واجب العمل مانا جاتا ہے اور اس کی مخالفت جائز نہیں ہوتی جیسا کہ اصول میں ہے "جب مجتہدین نے کسی زمانہ میں کسی حکم کا استنباط یا اس پر اتفاق کیا ہو۔ اس زمانہ والوں پر اس کا قبول کرنا واجب ہے۔ اس کی مخالفت جائز نہیں کیونکہ یہ اتفاق اس حکم پر بطور دلیل کے ہے۔" (توضیح تلویح الاجماع)

اجماع کے افراد کا علمی اور عملی حیثیت سے معیار

۱۔ قرآن مجید میں حکمت وبصیرت کا درجہ حاصل ہو۔ صرف ترجمہ وتفسیر بیان کر لینا کافی نہیں۔
۲۔ سنت اور حدیث نبوی پر کامل دسترس رکھتا ہو اور علوم حدیث پر کامل نگاہ ہو۔ روایت اور درایت کے اعتبار سے حدیث کی صداقت پرکھ سکتا ہو۔
۳۔ صحابہ کرام کے حالات زندگی پر اس کی نظر ہو اور ان کے اجماع سے واقف ہو۔
۴۔ قیاس کے ذریعہ استنباط کے اصول اور قواعد معلوم ہوں۔
۵۔ قوم کے مزاج، حالات کے تقاضوں، عادات وخصائل سے واقف ہونا ضروری ہے۔
۶۔ جدید رجحانات اور تقاضوں سے بخوبی واقف ہو۔

عملی حیثیت: عملی حیثیت سے مراد یہ ہے کہ وہ تقویٰ کی باریک راہوں پر چلنے والے ہوں۔ ماموارت پر عمل کرنے والے ہوں اور منہیات سے مجتنب رہتے ہوں۔

دراصل فسق وفجور بدعات کا اثر انسان کے قلب وعقل پر پڑتا ہے۔ اس کی وجہ سے فراست ایمانی، حق وباطل میں تمیز کرنے کی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے مجتہد کا ماموارت پر عمل کرنا اور منہیات سے باز رہنا ضروری ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (الانفال ۸:۲۹) "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تو وہ تمہارے لیے حق باطل میں فرق کر دے گا۔

اجماع کی وسعت: اجماع کے دائرہ اور وسعت کے متعلق فقہاء کا اختلاف ہے حضرت امام مالک صرف اہلیان مدینہ (مدینہ کے رہنے والوں) کی رائے کو ہی معتبر سمجھتے تھے۔ حضرت امام احمد بن حنبل اور داؤد ظاہری صحابہ کے اجماع کو معتبر خیال کرتے تھے۔ (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۴)

زیدیہ اور امامیہ (شیعی فرقوں) کے نزدیک اہل بیت کا اجماع حجیت ہے۔ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں انی تارک فیکم ما ان تمسّکتم به لن تضلوا کتاب اللّٰه و عترتی. (المسند ۵/۱۸۹ مجمع الزوائد ۱/۱۷۰ جامع ترمذی ۹/۳۴۳)

جمہور علماء کا یہ مذہب ہے کہ اجماع کی حد بندی درست نہیں ہے بلکہ کسی زمانہ میں تمام مجتہدین کا کسی فیصلہ پر اتفاق کر لینا اجماع ہے۔ اس بارہ میں اختلاف ہے کہ آیا اجماع مجتہدین کی اکثریت سے واقع میں آتا ہے۔ یا کل مجتہدین کے اتفاق سے؟ فقہاء کی اکثریت تو یہی کہتی ہے کہ ایک زمانے کے تمام مجتہدین کا ایک رائے پر اتفاق کر لینا ہی اجماع ہے مگر بعض فقہاء یہ کہتے ہیں کہ اکثریت کی رائے سے اجماع واقع ہو جاتا ہے جیسا کہ امام غزالی فرماتے ہیں۔ اِنَّهُ یَنْعَقِدُ مَعَ مُخَالَفَةِ الْاَقَلِّ "یعنی اجماع اقلیت کے اختلاف کے باوجود بھی واقع ہو جاتا ہے۔"

دوم اجتماع کے بارے میں جو دلائل دیے گئے ہیں وہ مطلق اور عام میں ان سے کسی جماعت کی تخصیص ثابت نہیں۔

کیا اجماع سے اختلاف کرنا معصیت ہے: عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ جس مسئلہ پر اجماع ہو جائے تو اس سے اختلاف کرنا معصیت ہے۔ یہ سراسر غلط ہے۔ رسول کریم ﷺ نے دیانت دارانہ اختلاف رائے کو رحمت قرار دیا ہے دیانت دارانہ اختلاف رائے میں ہی کسی قوم کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ ذہنی قوی کی صلاحیتیں اختلاف رائے سے ہی نشوونما پاتی ہیں۔

اقلیت کی مخالفت: اگر کسی دور میں کسی مسئلہ پر مجتہدین کی اکثریت تو موافق ہو۔ مگر اقلیت مخالف ہو تو کیا اجماع مکمل ہو جائے گا۔ اس بارے میں حسب ذیل نظریے ہیں۔

۱۔ مجتہدین کی اکثریت کا یہ خیال ہے کہ ایسی صورت میں اجماع منعقد نہیں ہوتا۔

۲۔ امام محمد بن جریر طبری، علامہ ابوبکر رازی علامہ ابوالحسین معتزلی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک اجماع کا انعقاد درست ہوتا ہے۔

۳۔ بعض مجتہدین کے نزدیک جولوگ اقلیت میں ہیں اگر ان کی تعداد حد تواتر تک پہنچتی ہے تو اس صورت میں اجماع کا انعقاد مکمل نہیں۔ اور اکثرین کے اجتہاد کا اعتبار نہیں ہوگا۔ اگر ان کی تعداد حد تواتر سے کم ہو تو اس صورت میں ان کی مخالفت کا کوئی اعتبار نہیں اور اجماع کا انعقاد ہو جائے گا۔

۴۔ علامہ ابوعبداللہ جرجانی فرماتے ہیں اگر مجتہدین نے مخالف مجتہد کے قول کی گنجائش تسلیم کر لی ہو تو اقلیت کی مخالفت کا اعتبار ہوگا۔ جیسے کہ عول کے مسئلہ میں حضرت عبداللہ بن عباس کی مخالفت، اگر مجتہدین کی اکثریت نے مخالف اقلیت کی مخالفت کا اعتبار نہیں کیا اور اقلیت کی رائے کو رد کر دیا ہے جیسے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کا متعہ اور ربا الفضل کی حرمت سے انکار تو ایسی صورت میں مخالفت قابل اعتبار نہیں ہوگی۔

(الاحکام فی اصول الاحکام ۱/۳۳۶ تا ۳۴۳)

تنسیخ اجماع: جب اجماع سے اختلاف کرنا جائز ہے تو ایک اجماع دوسرے اجماع کی تنسیخ بھی کر سکتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ مجلس کوئی فیصلہ صادر کرے تو وہی مجلس دوبارہ دوسرے وقت میں پہلے حکم کو منسوخ کر دے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ فقہاء کی دوسری جماعت پہلے فیصلے کے خلاف فیصلہ دے کر منسوخ کر دے۔

چنانچہ فخر الاسلام علی بن محمد البزدوی کی یہی رائے ہے کہ ایک اجماع خواہ وہ قطعی ہو دوسرے اجماع کی رو سے منسوخ ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر صحابہ کسی فیصلہ پر متفق ہوں اور بعد میں متفقہ طور پر اپنا فیصلہ تبدیل کر دیں تو یہ جائز ہے۔

اجماع کا فیصلہ کسی حد تک زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ حالات اور تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ تو اجماع کے فیصلے میں تبدیلی لازمی آئے گی۔ اگر ایسا اقرار نہ دیا جائے تو اسلامی شریعت انسانوں کے لیے رحمت کی بجائے زحمت بن جائے گی۔ اسلامی قانون کی یہی خوبی ہے کہ اس میں لچک ہے۔ جولوگ اس کے قائل نہیں ہیں وہ دراصل اسلامی فقہ کو جامد بنانا چاہتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کی مثال ہمارے سامنے ہے رسول کریم ﷺ کے عہد مبارک میں مال غنیمت اور مفتوحہ اراضی کے متعلق اور قانون تھا۔ جب حضرت عمرؓ کے دور میں مفتوحہ ممالک کی اراضی کی تقسیم کا وقت آیا تو انھوں نے رائے لی۔ آخر کار بڑی بحث وتمحیص کے بعد مفتوحہ اراضی کی تقسیم پہلے قانون سے ہٹ کر کی گئی اور مفتوحہ اراضی حکومت کی ملکیت قرار دی گئی۔ صرف ایک مثال نہیں کئی مثالیں ہیں طوالت کے خوف سے صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ ایک دور کے اجماع کو دوسرے دور کے اجماع سے تبدیل کیا جا سکتا ہے اسی میں امت مسلمہ کی علمی ترقی کا راز مضمر ہے۔

کیا اجماع کتاب وسنت کے کسی نص کو منسوخ کر سکتا: ماضی میں فقہاء کا ایک گروہ بھی تھا جن کا یہ نظریہ تھا کہ اجماع سے کتاب وسنت منسوخ ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ امام ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں ایک گروہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جیسے بعض حنفی اور مالکیٔ اہل کلام اور فقہاء جیسے عیسیٰ بن ابان وغیرہ جو کہتے ہیں کہ اجماع سے کتاب وسنت منسوخ ہو سکتے ہیں۔ پھر امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں۔

ہم ان حضرات کی بات کی یہ تاویل کیا کرتے تھے کہ ان کی مراد یہ ہے کہ اجماع سے کسی ناسخ نص کا پتہ چلتا ہے لیکن بعض لوگوں نے ہمیں بتایا کہ وہ لوگ خود اجماع کو ناسخ (کتاب وسنت کو منسوخ کرنا) جانتے ہیں۔ اگر ان کی مراد واقعی یہ ہے تو یہ ایک ایسا قول ہے۔ جس سے مسلمانوں کے لیے جائز قرار پاتا ہے کہ وہ اپنے نبی کے بعد اپنے دین میں جو چاہیں تبدیلی کر لیں۔ جیسا کہ نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ نے ان کے علماء کے لیے جائز قرار دیا ہے کہ جس چیز کو حرام ٹھہراتے ہیں۔ وہ کوئی مصلحت سمجھیں اسے حرام قرار دے دیں اور جس چیز کے حلال ہونے میں وہ کوئی مصلحت دیکھیں اسے حلال قرار دے دیں۔ لیکن اسلام میں ایسا نہیں ہو سکتا اور نہ صحابہ کرام اسے اپنے لیے جائز سمجھتے تھے۔ (اصول الفقہ ابن تیمیہ ص ۳۲۸)

اجماع کے اختیارات کی وسعت: متذکرہ الصدر بحث سے یہ بات عیاں ہوگئی ہے کہ ایک اجماع' دوسرے اجماع سے منسوخ ہو سکتا ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اجماع کے اختیارات کی وسعت کیا ہے۔ مختلف فقہاء کے اقوال و آراء سے حسب ذیل امور سامنے آتے ہیں۔

۱۔ زمانہ کے حالات اور تقاضوں کی مناسبت سے نئے قوانین وضع کرنا۔

۲۔ پرانے اجماعی فیصلے جو مصلحت کے تابع تھے اور نئے دور کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ حالات اور مصلحت کے پیش نظر پرانے اجماع میں ترمیم و تنسیخ کرنا۔

۳۔ معاشرتی حالات کے لحاظ سے احکام الٰہی کو مقدم و موخر کرنا۔

۴۔ وہ احکام جو عرب کے مقامی حالات رسم و رواج اور خصائل و عادات کے مطابق نازل ہوئے تھے۔ ان کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے جدید حالات

اور تقاضوں کے پیش نظر ان احکام کو نئے قالب میں ڈھالنا۔
۵۔ وہ احکام جو وقتی تقاضا اور مصلحت کے تحت ہیں۔ نئے حالات اور تقاضوں کے مطابق ان میں مناسب ترمیم کرنا۔
۶۔ رسول کریم ﷺ کے اصحاب جن احکام میں مختلف الرائے ہیں معقول دلیل کی بناء پر ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا۔
۷۔ فقہاء کی مختلف رایوں میں وقتی تقاضوں کی مناسبت سے کسی ایک رائے کو ترجیح دینا۔

دور حاضر میں اجماع کا انعقاد: موجودہ دور میں تمام دنیا ایک گاؤں کی شکل اختیار کر گئی ہے لہٰذا دور حاضر میں اجماع کا انعقاد آسان ہو گیا ہے۔ مسائل پر اجماع حاصل کرنے کے لیے حسب ذیل امور کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔
۱۔ تمام اسلامی ممالک کا جید علماء وفقہاء پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا جائے۔
۲۔ ان کا ایک مرکزی دفتر ہو۔
۳۔ پیش آمدہ مسائل پر غور وفکر کر کے اپنے فیصلے شائع کر دیں۔
۴۔ حکومتیں ان فیصلوں کو عملی جامہ پہنائیں۔

اس کی دوسری شکل بھی ہو سکتی ہے کہ ہر اسلامی ملک میں علماء اور فقہاء پر مشتمل اپنا ادارہ ہو جو پیش آمدہ مسائل پر غور وخوض کرتے رہیں۔ گاہے بگاہے اسلامی ممالک کے ان اداروں کے نمائندوں کے اجلاس ہوں۔ وہ پیش آمدہ مسائل کی چھان پھٹک کریں اور اپنے فیصلے صادر کریں۔ حکومتیں ان فیصلوں کو اپنے اپنے ملک میں نافذ کریں۔

چوتھا مآخذ قیاس

لغوی اور اصطلاحی مفہوم: قیاس کے لغوی معنی ناپنا یا کسی چیز سے مقابلہ کرنا یا کسی چیز سے مقابلہ کر کے موازنہ کرنا ہے۔ فقہ کی اصطلاح میں دو مسئلوں میں اتحاد علت کی وجہ سے جو حکم ایک مسئلہ کا ہے۔ وہی حکم دوسرے مسئلہ کا قرار دینا۔

اَلْحَقُ اَمْرَ بِاَمْرٍ فِیْ الْحُکْمِ الشَّرْعِیْ لِاَتِّحَادِ بَیْنَهُمَا فِی الْعِلَّةِ ''ایک مسئلہ کا دوسرے مسئلے کے ساتھ شرعی حکم میں مل جانا جب دونوں مسئلوں میں ایک ہی علت پائی جاتی ہو۔''

وضاحت: قیاس کی تعریف کی وضاحت یہ ہے کہ شریعت کے تمام احکام کا دار و مدار مخصوص اغراض اور مصالح پر ہے وہی اغراض اور مصالح ان احکام کی علت ہیں۔ جب ایک حکم کی علت دوسرے حکم میں پائی جائے تو پہلے کا حکم دوسرے پر لگا دیا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں شراب حرام ہے اور حرمت کی وجہ نشہ ہے۔ اب جو بھی نشہ آور اشیاء ہوں گی۔ ان سب پر شراب کا حکم صادر کر کے حرام قرار دیا جائے گا۔

قیاس کو اسلامی مآخذ ماننے میں اختلاف: قیاس کو فقہ اسلامی (شریعت اسلامیہ) کا ماخذ ماننے میں مذاہب اسلامی میں اختلاف ہے۔ شیعہ امامیہ داؤد ظاہری اور ان کے پیروکار قیاس کو تسلیم نہیں کرتے۔ جبکہ جمہور فقہاء اور شیعہ زیدیہ کے نزدیک قیاس قابل قبول ہے۔ مخالفین قیاس اس کی عدم ضرورت پر حسب ذیل دلائل دیتے ہیں۔

پہلی دلیل: قرآن مجید میں آتا ہے: وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتَابَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (النحل ۱۶:۸۹) ''یعنی ہم نے تجھ پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے۔ جس میں ہر چیز واضح طور پر بیان کر دی ہے۔'' مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ (الانعام ۶:۳۸) ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی۔ ''یعنی ہر چیز کا ذکر ہم نے قرآن میں کر دیا ہے۔''

تَفْصِیْلَ کُلِّ شَیْءٍ (یوسف ۱۲:۱۱۱) ''(قرآن مجید میں) ہر چیز کی تفصیل ہے۔''

قیاس کو ماخذ نہ ماننے والے ان آیات کی روشنی میں کہتے ہیں کہ جب قرآن میں تمام امور صراحت کے ساتھ مذکور ہیں تو پھر قیاس چہ معنی دارد۔

دوسری دلیل: مخالفین قیاس کا جواز پیش کرنے والوں کے سامنے یہ حدیث پیش کرتے ہیں۔ اعظمهم فتنة علی امتی قوم یقیسون الا مور برایهم فیحلون الحرام الحلال ''یعنی میری امت کے لیے سب سے بڑا فتنہ یہ ہوگا کہ بعض لوگ ایسے ہوں گے۔ جو مسائل کا فیصلہ اپنی رائے سے کریں گے۔ وہ حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیں گے۔

جواز قیاس کے لیے دلائل

دلیل اوّل: از روئے قرآن: قرآن مجید میں آتا ہے: وَتِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا یَعْقِلُهَا اِلاَّ الْعَالِمُوْنَ (عنکبوت ۲۹:۴۳) ''ہم نے یہ مثالیں لوگوں کے لیے بیان کی ہیں اور انھیں صرف اہل علم ہی سمجھتے ہیں۔

فَاعْتَبِرُوْا یَاُوْلِی الْاَبْصَارِ پس عبرت حاصل کرو اے آنکھوں والو۔

ان آیات میں مسلمانوں کو دنیا کے حالات دیکھ کر نئے مسائل حل کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تعلیم کے ساتھ حکمت کی تعلیم بھی رسول کریم ﷺ کی بعثت کی غرض تھی۔ ارشاد الٰہی ہے: وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ (۱۵۹:۳) ''وہ رسول کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

دوسری دلیل: از روئے حدیث: اَنَا اَقْضِیْ بَیْنَکُمْ بَالرَّایِ فِیْمَا لَمْ یَنْزِلْ فِیْهِ وَحْیٌ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں جن امور سے متعلق وحی نازل نہیں ہوتی ان کا فیصلہ میں اپنی رائے سے کرتا ہوں۔

نبی کریم ﷺ نے ابن مسعود سے فرمایا: اَقْضِ بِالْکِتَابِ وَالسُّنَّةِ اِذَا وَجَدْتَهُمَا فَاِذَا لَمْ تَجِدِ الْحُکْمَ فِیْهِمَا اِجْتَهِدْ رَایَکَ ''یعنی جب تم قرآن اور سنت میں کوحکم پاؤ تو اس کے مطابق فیصلہ کرو اور قرآن وسنت میں حکم نہ پاؤ تو اپنی رائے سے اجتہاد کرو۔

معاذ بن جبل والی حدیث مشہور ہے کہ جب ان کو یمن کا قاضی مقرر کیا گیا تو ان سے رسول کریم ﷺ نے دریافت کیا کہ تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ تو جب معاذ بن جبل نے جواب دیا کہ قرآن کی رو سے پھر آنحضرت ﷺ نے دریافت کیا اگر وہ حکم قرآن میں نہ پاؤ تو؟ انھوں نے جواب دیا اس وقت سنت کی روشنی میں فیصلہ کروں گا۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا۔ اگر سنت میں وہ حکم نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ نے جواب دیا اپنی رائے سے۔ اس جواب کو رسول کریم ﷺ نے بہت پسند فرمایا اور اجازت دی۔

نبی کریم ﷺ جب حجۃ الوداع پر تشریف لے گئے تو آپ سواری پر سوار تھے۔ لوگ آپ سے مسائل دریافت فرماتے۔ ایک حدیث میں آیا ہے۔

عَنْ اِبْنَ عَبَّاسٍ اَنَّ رَجُلاً سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنَّ اَبِی اَدْرَکَهُ الْحَجُّ وَهُوَ شَیْخٌ کَبِیْرٌ لَا یَثْبُتُ عَلٰی رَاحِلَتِهٖ وَاِنْ شَدَدْتُهُ خَشِیْتُ اَنْ یَمُوْتَ اَفَاُحُجُّ عَنْهُ قَالَ اَرَایْتَ لَوْکَانَ عَلَیْهِ دَیْنٌ فَقَضَیْتَهُ اَکَانَ مُجْزِئًا قَالَ نَعَمْ قَالَ فَحُجَّ عَنْ اَبِیْکَ وَ فِی رِوَایَةٍ قَالَ فَدَیْنُ اللّٰهِ اَحَقُّ۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا یا رسول اللہ! میرے باپ پر حج فرض ہو گیا ہے لیکن وہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے سواری پر ٹھہر نہیں سکتا اگر میں اسے سواری پر باندھتا ہوں تو مجھے ڈر ہے کہ وہ مر نہ جائے۔ کیا میں اس کی جانب سے حج کر سکتا ہوں آپ نے فرمایا اگر اس پر قرض ہوتا اور تو اسے ادا کرتا تو کیا وہ ادا نہ ہوتا اس نے عرض کیا ضرور ادا ہوتا۔ آپ نے فرمایا تو تو اپنے باپ کی جانب سے حج کر اور ایک روایت میں ہے کہ اللہ کا قرض ادائیگی کے زیادہ لائق ہے۔

ایک اور حدیث میں بجائے باپ کے والدہ کا ذکر ہے اسی طرح ایک واقعہ امام نسائی نے بعد الموت کا بھی ذکر کیا ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَمَرَتِ امْرَاءَةُ سِنَانِ بْنِ سَلَمَةَ الْجُهَنِیِّ اَنْ یَسْئَالَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ اُمَّهَا مَاتَتْ وَلَمْ تَحُجَّ اَفَیُجْزِئُ عَنْ اُمِّهَا اَنْ تَحُجَّ عَنْهَا قَالَ نَعَمْ لَوْکَانَ عَلٰی اُمِّهَا دَیْنٌ فَقَضَتْهُ عَنْهَا اَلَمْ یَکُنْ یُجْزِئُ عَنْهَا فَلْتَحُجَّ عَنْ اُمِّهَا۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ سنان بن سلمہ الجہنی کی بیوی نے سنان کو حکم دیا کہ نبی کریم ﷺ سے دریافت کرے کہ ان کی ماں کا انتقال ہو گیا ہے اور انھوں نے حج نہ کیا تھا تو کیا اگر میں ان کی جانب سے حج کروں وہ کافی ہو جائے گا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کیوں نہیں کیا اگر ان کی ماں پر قرض ہوتا اور وہ اسے ادا کرتی تو کیا ادا نہ ہوتا اس طرح اپنی ماں کی جانب سے حج بھی کرے۔

مذکورہ واقعات میں قیاس کا ایک ہی اصول کام کر رہا ہے اور حضور ﷺ ہر موقع پر اسی قیاس سے فتویٰ صادر فرما رہے ہیں۔

ایک اور حدیث ہے جس میں لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلاَّ وُسْعَهَا (اللہ کسی نفس کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔ عَنِ ابْنَ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ بِرَجُلٍ وَهُوَ یَطُوْفُ بِالْکَعْبَةِ یَقُوْدُهُ اِنْسَانٌ بِخَزَامَةٍ فِی اَنْفِهٖ فَقَطَعَهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِیَدِهٖ فَقَالَ اِنَّهٗ نَذْرٌ ثُمَّ اَمَرَهٗ اَنْ یَقُوْدَهٗ بِیَدِهٖ ابن عباس فرماتے ہیں کہ ان کا گزر ایک ایسے شخص پر ہوا جو خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا اور اس کی ناک میں ایک نکیل پڑی ہوئی تھی۔ جسے آدمی کھینچ رہا تھا۔ حضور ﷺ نے وہ نکیل اپنے سے ہاتھ کاٹ دی اور فرمایا یہ نذر ہے پھر کھینچنے والے کو حکم دیا کہ ہاتھ سے کھینچو۔

تیسری دلیل: از روئے اقوال صحابہ: تمام صحابہ قیاس کرنے کے بارے میں متفق ہیں حضرت عمر نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو لکھا تھا۔ اِعْرِفِ الْاَمْثَالَ وَالْاَشْبَاهَ وَقِسِ الْاُمُوْرَ عِنْدَکَ یعنی امثال ونظائر کو پہچان اور سمجھ پھر مسائل کو ان پر قیاس کر۔

محاکمہ: دونوں گروہوں کے فقہاء کے دلائل کو سامنے رکھ کر محاکمہ کیا جائے تو وہ فقہاء جو قیاس کرنے کے حامی ہیں۔ وہ صائب اور صحیح نظر آتے ہیں۔ قرآن مجید میں تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (قرآن تمام امور کی وضاحت کرتا ہے اور تَفْصِیْلَ کُلِّ شَیْءٍ (قرآن مجید میں ہر چیز کی تفصیل ہے) کے الفاظ آئے ہیں ان سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید میں تمام قواعد کلیہ اصول دین بیان کر دیے ہیں۔

جہاں رسول کریم ﷺ کی اس حدیث کا تعلق ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ بعض علماء اپنی رائے سے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیں گے۔ اس حدیث میں صحت مند قیاس کی نفی نہیں کی گئی۔ بلکہ اس رائے اور قیاس کی مذمت کی گئی ہے۔ جو قرآنی اصول کے خلاف ہو گی۔ یعنی قرآن اور حدیث میں واضح طور پر حلال اور حرام چیزوں کا ذکر ہے جو بھی ان کے خلاف قیاس کرے گا وہ قیاس مذموم ہو گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جمہور صحابہ تابعین و تبع تابعین اور تمام ائمہ کا یہی فتویٰ ہے کہ قرآن مجید حدیث (سنت) اور اجماع تینوں شرعی دلائل میں سے کوئی دلیل موجود نہ ہو تو پھر مجتہدین اس مسئلہ پر قیاس کر سکتے ہیں اور ہر زمانہ کے لوگ اس امر پر متفق رہے ہیں۔ بجز چند فرق باطلہ جیسے روافض خوارج اور فرقہ ظاہریہ ان تینوں فرقوں کے مجتہدین کو ائمہ مسلمین کوئی اہمیت نہیں دیتے نہ ان کی کوئی دلیل تسلیم کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قیاس اسلامی فقہ کا ایک اہم ماخذ ہے اور علما نے اس ماخذ کو تسلیم کیا ہے۔

قیاس کے ارکان: ۱۔ اصل (مقیس علیہ جس پر قیاس کیا جائے) ۲۔ فرع (مقیس جس چیز کو قیاس کیا جائے) ۳۔ حکم جو قیاس کے بعد لگایا گیا ہے۔ ۴۔ علت وہ مشترک وصف جو اصل اور فرع (مقیس علیہ اور مقیس) میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً شراب اصل ہے۔ بھنگ۔ فرع۔ نشہ وصف مشترک اور حرام حکم ہے۔

حدیث میں آتا ہے من ابتاع طعاماً فلا یبعه حتی یستوبه (جامع ترمذی ۲۴۲/۱) جو شخص طعام خریدے وہ اس وقت تک نہ بیچے جب تک کہ وصول نہ کرے یہ حدیث ظاہر کرتی ہے کہ غلہ کو قبضہ سے پہلے اس کو آگے بیچنا ناجائز ہے۔ یہاں حرمت کی وجہ قبضہ کا نہ ہونا ہے۔ لہٰذا غلہ کے علاوہ دیگر تمام اشیاء جو خرید میں قبضے میں نہیں آتیں ان کی فروخت بھی ناجائز ہو گی جو علت حرمت غلہ کو آگے فروخت کرنے میں پائی جاتی ہے وہی علت دوسری اشیاء میں پائی جاتی ہے لہٰذا تمام اشیاء پر یہی حکم لاگو ہو گا کہ خریدنے کے بعد جب تک ان کو قبضہ میں نہ کر لیا جائے آگے فروخت کرنا ناجائز ہے۔

قیاس کی اقسام

قیاس جلی: ایسا قیاس جس میں فرع کا اصل کے ساتھ الحاق ایسا واضح ہو کہ مشترک علت کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ جیسے یتیم کا مال ناحق کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ یتیم کا مال تباہ کر دینا بھی اس طرح ناجائز اور ممنوع ہے۔ مال تباہ کرنا، ناحق کھانے کے ساتھ ملحق ہونا، بالکل واضح ہے۔ لہٰذا علت کی طرف توجہ کی بھی ضرورت نہیں۔ ایسے قیاس کو قیاس جلی کہتے ہیں۔

قیاس خفی: جس میں فرع کا اصل کے ساتھ الحاق اتنا واضح نہ ہو بلکہ علت کی ضرورت پڑتی ہو۔ مثلاً بھنگ کو شراب پر محمول کر کے حرام قرار دی گئی ہے بھنگ فرع ہے اور شراب اصل۔ بھنگ کا الحاق شراب کے ساتھ واضح نہیں۔ تو شراب کی حرمت کی علت ''نشہ'' معلوم کرنی پڑی۔ وہی علت ''نشہ'' بھنگ میں موجود ہونے کی وجہ سے بھنگ کو بھی حرام قرار دیا گیا۔

دوسری تقسیم: قیاس میں کبھی حکم اصل بعینہ فرع میں جاری کیا جاتا ہے اور کبھی حکم اصل سے ملتا جلتا حکم جاری کیا جاتا ہے۔

پہلی قسم (حکم اصل بعینہ فرع میں جاری کرنا) کی مثال یہ ہے کہ حدیث میں بلی کے جوٹھے کو پاک قرار دیا گیا ہے اس کی علت گھروں میں بلی کی کثرت سے آمد و رفت ہے اس علت کی وجہ سے گھروں میں بکثرت آنے جانے والے دیگر جانوروں کے جوٹھے کو بھی پاک قرار دے دیا جائے گا۔

دوسری قسم (حکم اصل بعینہ فرع میں جاری نہ کرنا) کی مثال یہ ہے بلی کی بکثرت آمد و رفت کی وجہ سے اس کے جوٹھے کے حکم میں تخفیف کی گئی ہے ایسے ہی گھر میں کام کاج کرنے والے خدام کی کثرت سے آمد و رفت کی وجہ سے گھر میں داخل ہونے کے وقت اجازت لینے کے حکم میں تخفیف کر دی گئی ہے۔ خلوت اور آرام کے اوقات کے علاوہ بغیر اجازت آ سکتے ہیں۔ (اصول اشاشی ص ۹۶)

تیسری تقسیم: قیاس علت: قیاس علت یہ ہے کہ علت کی بناء پر حکم اصل کو فرع میں جاری کیا جائے جیسے شراب حرام ہونے کی علت سکر ہے۔ اسی علت کی وجہ سے تمام نشہ آور اشیاء کو حرام قرار دے دیا جاتا ہے۔

قیاس دلالت: علت کی بجائے علت کی علامت کی بناء پر اصل کا حکم فرع میں جاری کیا جائے۔ مثلاً کسی شیرہ کو بدبودار ہونے یا جھاگ چھوڑنے کی وجہ سے

حرام کہنا، بدبودار ہونا یا جھاگ چھوڑنا شراب حرام ہونے کی علت تو نہیں البتہ علت یعنی نشہ آور ہونے کی علامت ہے۔

قیاس شبہ: یہ ہے کہ فرع کو اصل کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت حاصل ہونے کی وجہ سے اصل کا حکم فرع میں جاری کیا جائے کہ فرع کو اصل کے ساتھ کافی زیادہ مشابہت حاصل ہے اور یہ نہ دیکھا جائے کہ حکم اصل کی علت بھی فرع میں موجود ہے یا نہیں مثلاً علماء شافعیہ کے نزدیک بغیر نیت وضو نہیں ہوتا وہ وضو کو تیمم پر قیاس کرتے ہیں کہ جیسے بغیر نیت کے تیمم نہیں ہوتا ویسے ہی وضو نہیں ہوتا۔ اس قیاس کی بناء صرف یہ ہے کہ وضو کو تیمم کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت حاصل ہے دونوں طہارت کا ذریعہ ہیں یہ دیکھے بغیر تیمم میں نیت ضروری ہونے کی علت کیا ہے اور وہ علت وضو میں بھی موجود ہے یا نہیں صرف مشابہت کی بناء پر علت کو دیکھے بغیر قیاس کرنا ہی شبہ کہلاتا ہے۔

شرائط

۱۔ جس اصل اور نص سے علت لی جا رہی ہے اور اس علت کی وجہ سے جو حکم لگایا گیا ہے۔ وہ خاص حالات اور واقعات پر مبنی نہیں ہونا چاہیے۔ مثلاً حدیث میں آتا ہے۔ مَنْ شَهِدَلَهٗ خُزَيْمَةُ فَهُوَ حَسْبُهٗ "یعنی خزیمہ جس کے حق میں گواہی دے وہ اس کے لیے کافی ہے اس سے یہ قانون نہیں بنایا جا سکتا کہ دعویٰ کے ثبوت کے لیے ایک شخص کی شہادت کافی ہے یہ حکم خاص خزیمہ کے لیے ہے۔" (توضیح ص ۳۰۸)

۲۔ علت ایسا وصف ہو جو شرعاً قابل اعتبار ہو اور بالکل واضح اور معین ہو۔ (الاحکام لامدی جلد ۳ ص ۱۲ اور اس کے بعد)

۳۔ جو حکم قیاس سے استنباط کیا جائے اس کی وجہ سے نص کے حکم میں تبدیلی نہ واقع ہونی چاہیے۔

۴۔ جو حکم قیاس سے استخراج کیا جائے اس کی نوعیت نص کے احکام کے ماحصل کی ہونی چاہیے کسی نص کے محض الفاظ پر قیاس کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی (توضیح ص ۳۰۹ مختصر جلد ۲ ص ۲۰۹)

قیاس کا دائرہ وسعت: قیاس کا دائرہ اثر اجماع سے کہیں زیادہ وسیع ہے کیونکہ ایک زمانہ کے تمام فقہاء کا ایک مسئلہ پر متفق ہونا مشکل ہے۔ بخلاف قیاس کے کیونکہ اس میں تمام فقہاء کا اتفاق شرط نہیں بلکہ ہر مجتہد کتاب اور سنت کی روشنی میں ہر مسئلہ میں قیاس کر سکتا ہے۔

کتاب اور سنت میں ہر قسم کی جزئیات اور تفاصیل موجود نہیں ہر زمانہ میں نئے نئے مسائل ابھرتے چلے آ رہے ہیں۔ نئے ابھرنے والے مسائل کا حل ضروری ہے اس لیے نئے پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے قیاس ضروری ہے اس لیے اسلام نے ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے قیاس کا دروازہ کھول دیا ہے حضرت امام شافعی کے شاگرد امام مزنی فرماتے ہیں۔ عہد نبوی سے لے کر ہمارے اس دور تک تمام فقہاء نے زندگی کے ان سارے معاملات میں قیاس سے کام لیا ہے جن کے لیے دینی احکام کے اثبات و اظہار کی ضرورت پڑی اور اس مدت کے تمام علماء کا اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ حق کی نظیر حق ہوتا ہے اور باطل کی نظیر باطل کسی شخص کے لیے یہ زیبا اور جائز نہیں کہ وہ قیاس سے انکار کرے۔ قیاس کا مآل و مفاد اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ان امور میں کتاب و سنت کے متشابہ اور اس کے مثل ہے۔ جس سے کتاب و سنت خاموش ہیں اور جب نظیر حق حق ہوتا ہے تو قیاس جو حق کا نظیر ہے وہ بھی حق ہوگا۔

(اسلامی قانون نمبر چراغ راہ صفحہ ۲۶۸ جلد اوّل)

معروف

معروف: فقہاء نے معروف کی یہ تعریف کی ہے۔ "قول یا عمل میں جمہوری عادت کا نام ہے۔" معروف کا دوسرا نام تعامل اور عادت بھی ہے۔

قرآن مجید نے متعدد معاملات میں معاشرہ کے دستور اور رواج کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اَلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ ۲:۱۸۰) (تم پر فرض کیا گیا ہے) والدین اور قرابت داروں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کرنا۔

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ ۲:۲۳۳) اور بچے والے کے ذمے بچوں کی ماؤں کا دستور کے مطابق کھانا اور کپڑا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء ۴:۶) اور جو غریب ہو تو وہ دستور کے مطابق اپنا خرچ لے۔

ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے۔ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَالَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْتَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً مَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ ۲:۲۳۶) اور اگر تم عورتوں کو اس صورت میں طلاق دو کہ نہ ان کو ہاتھ لگایا اور نہ ان کے لیے متعین مہر مقرر کیا ہو تو ان کے مہر کے باب میں تم پر کوئی گناہ نہیں البتہ ان کو دستور کے مطابق دے دلا کر رخصت کرو۔ صاحب استطاعت اپنی استطاعت کے مطابق اور غریب اپنی

استطاعت کے مطابق۔

عُرف اور احادیث مبارکہ: حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ ہندہ بنت عتبہ نے اپنے خاوند حضرت ابوسفیان کے بارے میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ وہ اخراجات میں جزرسی سے کام لیتے ہیں۔ تو کیا یہ ہوسکتا ہے کہ میں ان کی لاعلمی میں کچھ لے لیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا **خذی ما یکفیک وولدک بالمعروف** یعنی جتنا تیرے اور بچوں کے لیے کافی ہو دستور کے مطابق لے لو۔

علامہ عینی اس پر فرماتے ہیں "معلوم ہوا کہ عرف ایک معتبر اور جاری عمل ہے۔" (عمدۃ القاری ۱۲/۱۷) امام بخاری نے اپنی صحیح میں کتاب البیوع میں عرف کے حوالے سے مستقل باب ان الفاظ سے باندھا ہے۔ "**باب من اجزی امر الا مصار علی ما یتعارفون بینھم فی البیوع والاجارة والمکیال والوزن وسننھم علی نیاتھم ومذاہبھم المشھور**" یعنی خرید وفروخت، اجارہ اور ناپ توپ اور ان کے طور طریقوں میں ہر شہر کے لوگوں کے عرف، ان نیتوں اور ان کے مشہور طریقوں پر حکم دیا جائے گا۔

ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ ابن المنیر وغیرہ کا کہنا ہے کہ اس باب کے قائم کرنے سے امام بخاری کا مقصد یہ بتانا تھا کہ عرف پر اعتماد کرنا حدیث سے ثابت ہے۔ (فتح الباری ۴/۴۰۵، ۴۰۶) رسول کریم ﷺ غلام کے بارے میں فرماتے ہیں۔ **للمملوک طعامہ کسوتہ بالمعروف ولا یکلف من العمل الاما یطیق.** (موطا امام مالک ص۶۴۰) غلام کا کھانا اور اس کا کپڑا عام معروف طریقے پر دیا جائے اور ایسے کام پر نہ لگایا جائے جس کے کرنے کو طاقت نہیں علامہ زرقانی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "معروف کا مطلب یہ ہے کہ بغیر کمی یا زیادتی اس طرح کا کھانا اور کپڑا دیا جائے جس طرح کہ اس جیسے دوسرے غلاموں کو دستور کے مطابق ملتا ہے۔ (شرح موطا امام مالک ۴/۳۹۵، ۳۹۶)

حدیث میں آتا ہے۔ **نَھٰی عَنِ الرُّسُوْمِ الْفَاسِدَةِ وَاَمَرَ بِالصَّالِحَةِ** (حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۲۴) رسول کریم ﷺ نے بُری رسموں سے منع فرمایا اور اچھی رسموں کے قبول کرنے کا حکم فرمایا۔ ایک اور موقع پر عبداللہ بن مسعود نے فرمایا۔ **مَارَاٰہُ الْمُسْلِمُوْنَ حَسَنًا فَھُوَ عِنْدَ اللّٰہِ حَسَنٌ وَمَا رَاٰہُ الْمُسْلِمُوْنَ قَبِیْحًا فَھُوَ عِنْدَ اللّٰہِ قَبِیْحٌ** یعنی جس کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے اور جس کو وہ برا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی برا ہے۔

معروف کی قسمیں

معروف کی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔ معروف خاص۔ ۲۔ معروف عام۔

معروف خاص: جو کسی خاص علاقہ یا خاص طبقہ میں رائج ہو۔

معروف عام: جو عام لوگوں میں رائج ہو اور کسی خاص طبقہ اور علاقہ کے ساتھ مختص نہ ہو۔

معروف کا شرعی حجت بننے کے لیے حسب ذیل شرائط کا حامل ہونا ضروری ہے۔

عرف قرآن وسنت کے حکم کے خلاف نہ ہو: عرف عام ہو یا خاص اگر وہ نص قطعی قرآن اور حدیث کے مخالف ہو تو اس کی چند صورتیں ہیں۔

۱۔ یہ کہ عرف پر عمل کرنے سے نص قطعی کو ترک کرنا لازم آتا ہے تو اس صورت میں عرف کو ترک کیا جائے گا مثلاً کسی علاقے میں ربا اور شراب نوشی لوگوں کا تعامل ہے تو ربا اور شراب نوشی جائز نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ دونوں چیزوں کو قطعی نص نے حرام کیا ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ عرف نص قطعی کی عمومیت میں سے کسی ایک جزء کے لحاظ سے مخالف ہو امام ابو یوسف کے نزدیک اس عرف پر عمل کیا جائے گا کیونکہ عرف میں عمل کرنے سے نص قطعی کو ترک کرنا لازم نہیں آتا۔ نص کے عمومی حکم کو مخصوص کرنا لازم آتا ہے عرف سے نص عام کو خاص کرنا جائز ہے مثلاً حدیث میں رسول کریم ﷺ نے بعض چیزوں کو وزنی شمار کر کے اس کا حکم بیان فرمایا مگر اب وہ کیلی (ناپ سے بیچی جانے والی چیزیں) بن گئی ہیں۔ یا آپ نے کیلی ہونے کی وجہ سے ان کا حکم صادر فرمایا تھا اور اب وہ کسی علاقے میں وزنی بن گئی ہیں تو ان چیزوں کی خرید وفروخت میں عرف کی وجہ سے حکم کی تبدیلی ضروری ہوئی۔ مثلاً رسول کریم ﷺ نے گندم جو اور نمک کو کیلی قرار دیا اور سونا اور چاندی کو وزنی یعنی گندم اور جو کی خرید وفروخت کیل سے کرنی چاہیے اور سونا اور چاندی کو وزن سے اب اگر کسی علاقے میں لوگ سونا چاندی کو کیل کر کے فروخت کریں اور گندم اور جو کو وزن سے یہ عمل حدیث کے خلاف نہ ہوگا کیونکہ رسول کریم ﷺ کا ارشاد مبارک عرب قوم کے تعامل کے اعتبار سے تھا کیونکہ عرب میں گندم کی بیع وشرا کیل سے کی جاتی تھی اور سونا اور چاندی کی وزن سے۔ اس لیے رسول کریم ﷺ نے عرب کے تعامل کے پیش نظر فرمایا تھا۔ پس معلوم ہوا کہ حدیث مذکور کی علت عوام کا تعامل تھا۔ لہٰذا جس جگہ پر یہ تعامل اور عرف تبدیل ہو جائے۔ تو وہاں حدیث کے اعتبار سے مسئلہ بھی

تبدیل ہو جائے گا۔

اسی طرح حدیث میں ہر اس چیز کی بیع وشرا کو ناجائز قرار دیا ہے جو بائع کے پاس نہ ہو لیکن لوگوں کے تعامل سے موچی کے جوتے کی بیع موجود نہ ہونے سے پہلے جائز ہے کیونکہ اس صورت میں حدیث کا ترک کرنا لازم نہیں تھا بلکہ حدیث کی تخصیص لازم آتی ہے۔

۳۔ عرف اگر قیاسی حکم کے خلاف ہو تو قیاس چھوڑ کر عرف (رسم و رواج) پر عمل کیا جائے گا خواہ عرف خاص ہو یا عام (مجموعہ رسائل عابدین ص ۱۱۶)

۴۔ اگر عرف کا اختلاف کسی نص قطعی سے نہیں بلکہ علماء نے حکم لوگوں کے تعامل اور عرف کے اعتبار سے دیا تھا لیکن کسی دوسرے زمانہ میں عوام کا تعامل اور عرف تبدیل ہو جاتا ہے تو عرف کے بدل جانے سے حکم میں بھی تبدیلی آ جائے گی کیونکہ وہ حکم مدت عرف کی بقا تک تھا۔ جب عرف میں تبدیلی آ جائے گی تو حکم بھی بدل جائے گا اگر وہ فقیہی جس نے لوگوں کے تعامل کے پیش نظر حکم صادر کیا تھا وہ تبدیل شدہ زمانہ میں ہو تو وہ لازمی طور پر موجود لوگوں کے تعامل کو مدنظر رکھ کر حکم میں تبدیلی کرے گا۔

۵۔ عرف غالب اور عام ہو غالب سے مراد یہ ہے وہ عرف اکثر جگہ پایا جاتا ہے اس کے خلاف کوئی دوسرا دستور بہت کم ملتا ہو۔ عام وہ عرف ہوتا ہے جو لوگوں کے درمیان مشہور ہو۔

۶۔ معاشرے میں اس عرف کا پورا کیا جانا ضروری تصور کیا جاتا ہو۔

۷۔ معاملہ کرنے والوں نے عرف کے خلاف کوئی شرط عائد نہ کی ہو۔ فقہاء نے یہ اصول مقرر کیا ہے **لاعبرة لدلالة مقابلة التصريح** یعنی تصریح کے مقابلے میں کوئی دلالت قابل اعتبار نہیں۔ مثلاً کسی جگہ عرف میں مزدور کی اجرت کے لیے آٹھ گھنٹے ہیں لیکن مستاجر اجیر سے یہ طے کر لیتا ہے کہ وہ اتنی مزدوری پر ظہر سے مغرب تک کام کرے اب اس شرط کے سبب مستاجر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اجیر کو آٹھ گھنٹے کام کرنے پر مجبور کرے اس شرط کی بناء پر مزدور سے کام ظہر سے مغرب تک ہی لیا جائے گا۔

فقہاء کے احکام میں جو اکثر اختلافات نظر آتے ہیں وہ اسی سبب سے تھے۔ ایک فقیہی نے اپنے دور میں تعامل کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ دیا۔ جب وہ حالات تبدیل ہو گئے تو دوسرے فقیہی نے اپنے دور کے تعامل کے پیش نظر حکم صادر کر دیا۔ دونوں فقہاء کی آراء میں اختلاف لازمی ہے۔

عرف کے اعتبار سے خالص دنیوی قانون کی مقرر کردہ شرائط

۱۔ معقولیت: عرف کا معقول ہونا ضروری ہے اس وجہ سے قانونی مقولہ ہے "رسم بد" قابل منسوخی ہے۔

۲۔ لوگ عرف (رسم و رواج) کو اپنے عقیدہ میں واجب قرار دیتے ہوں اور اگر عرف کو فعل اختیاری کی حیثیت حاصل ہے تو پھر اس عرف کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

۳۔ عرف کو ملکی قانون موضوع کے مطابق ہونا چاہیے یعنی پارلیمنٹ کے وضع کردہ قانون اور عرف میں مطابقت اور موافقت ہونا ضروری ہے۔

۴۔ عرف کا مدت مدید اور زمانہ دراز تک جاری رہنا ضروری ہے کیونکہ جو عرف مدت مدید سے جاری و ساری ہو تو وہ عرف لوگوں کے اذہان میں راسخ ہو چکا ہوتا ہے اور وہ تمدن اور معاشرت کا حصہ بن چکا ہوتا ہے۔

۵۔ مطابقت قانون: اگر عرف پرانا نہ ہو تو اس میں اور قانون عام میں مغایرت نہیں ہونی چاہیے۔ اس شرط کا تعلق رسم جدیدہ سے ہے۔

(اصول قانون جلد اصفحہ ۲۳۸ تا ۲۵۲ مصنفہ سر جان سائمنڈ)

عرف بطور حجت کی وجہ: اسلام نے عرف کو حجت اس لیے قرار دیا ہے کہ معاشرہ میں رسم و رواج اور عادات یونہی رواج نہیں پا جاتے ان کے پیچھے عدل و انصاف، اخوت ہمدردی کے اصول کارفرما ہوتے ہیں دنیا کے ہر خطے میں عرف، قانون سازی میں بطور ماخذ رہا ہے۔ قدیم یونان میں جنگ اور امن کے قواعد ان عادات سے اخذ کیے گئے تھے۔ جنھیں یونان کی ریاستوں نے اپنایا ہوا تھا۔ دور حاضر میں بھی عرف کو قانون سازی میں بہت اہمیت حاصل ہے۔

استحسان

استحسان: لغت میں استحسان کے معنی ہیں کسی چیز کو اچھا سمجھنا لیکن فقہ کی اصطلاح میں تعریف یہ ہے۔

۱۔ **قطع المسئلة عن نظائرها بما هو اقوی۔** (کتاب التحقیق)

یعنی کسی مسئلہ کے حکم کو قوی وجہ سے اس کے نظائر سے الگ کر لینا۔

۲۔ قیاس کو ترک کر کے اس چیز کو اختیار کر لینا جو لوگوں کے لیے زیادہ موافق ہے۔ (السرخسی المبسوط ۱۰/۱۴۵)

استحسان کی اہمیت اور ضرورت

ہر دور کے تقاضے الگ ہوتے ہیں اور نئے نئے مسائل ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ بسا اوقات تمام تقاضوں اور نئے مسائل کا حل قاعدہ اور قانون میں ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ قیاس اپنی وسعت اثر کے باوجود نئے مسائل کا حل ڈھونڈنے میں ناکام رہتا ہے۔ ان حالات میں فقہاء نے مسلمانوں کی مصلحت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر یا ملکی ضرورت کو مدنظر رکھ کر ایک اصول مقرر کر دیا کہ ضرر رساں پہلو ترک کر کے مفید پہلو اختیار کر لیا جائے تاکہ الٰہی حکمت کے ساتھ ہم آہنگی ہو اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کا راستہ ہموار ہو سکے۔

حسب ذیل تصریحات سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔

الاستحسان ترک القیاس والاخذ بما ھوا وفق للناس. (المبسوط صفحہ ۱۴۵)

استحسان قیاس کو ترک کر کے اس امر کو اختیار کرنے کا نام ہے جو لوگوں کی فلاح و بہبود کا زیادہ ضامن ہو۔

الاستحسان طلب السھولة فی الاحکام فیما یبتلی فیه الخاص والعام. (المبسوط صفحہ ۱۴۵) استحسان ان امور میں سہولت طلب کرنا ہے۔ جن میں خاص و عام سب مبتلا ہیں۔

الاخذ بالسعة و ابتغاء الدعة (المبسوط) استحسان وسعت کو اختیار کرنے اور فراخی کو طلب کرنے کا نام ہے۔

ان سب تصریحات کا ماحصل یہ ہے کہ فلاح و بہبود کی بناء پر مشکل اور ضرر رساں پہلو کو چھوڑ کر آسان اور راحت والا پہلو اختیار کیا جائے۔ یہ طریقہ الٰہی حکمت کے عین مطابق ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ ۲:۱۸۵) اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمھارے لیے تنگی نہیں چاہتا۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ ۲:۲۸۶) اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ خیر دینکم الیسر. (حدیث) تمہارا اچھا دین یسر ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاذؓ کو یمن بھیجتے وقت ارشاد فرمایا۔ یسرا ولا تعسراً و بشراً ولا تنفراً و تطاوعاً. (صحیح بخاری کتاب الادب ۳/۳۹۹) لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا۔ مشکل میں نہ ڈالنا اور خوش خبری سنانا اور نفرت نہ دلانا بلکہ شوق دلانا۔

استحسان کی قسمیں: استحسان کی چار قسمیں۔

۱۔ استحسان بالنص ۲۔ استحسان اجماع

۳۔ استحسان ضرورت ۴۔ استحسان قیاسی

استحسان ضرورت: "استحسان ضرورت" اس وقت واقع ہو گا جب کسی حکم پر عمل کرنے سے دشواری پیدا ہوتی ہو اور ضرر رساں اور غیر منصفانہ پہلو زیادہ عیاں ہو۔ بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود مجروح ہوتی ہو۔ ایسی حالت میں الٰہی حکمت کے مطابق اس حکم کو چھوڑنا ضروری ہے۔ آسانی اور سہولت اور فلاح و بہبود کی خاطر دوسری راہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے وہ حکم عبادات سے تعلق نہ رکھتا ہو بلکہ امور دنیا سے تعلق رکھتا ہو۔ ۲۔ مصلحت عامہ شریعت کی منشاء کے مطابق ہو۔

استحسان قیاسی: استحسان قیاسی کبھی ظاہری قیاس کی رو سے کسی مسئلہ کا ایک حکم ہوتا ہے۔ اس پر عمل کرنے سے دشواری پیش آتی ہے یا ضرر رساں ثابت ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہری قیاس کے خلاف زیادہ قوی اور صحت مند قیاس کی بناء پر کسی دوسرے حکم کو ظاہر کرنے کا نام استحسان قیاسی ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص نے زرعی زمین کو وقف کیا تو وقف میں حقوق ارتفاق مثلاً پانی دینے کا حق، گزرنے کا حق اور پانی گزارنے کا حق وغیرہ کا ذکر نہیں کیا تو کیا یہ حقوق معاہدہ وقف میں خود بخود شامل ہو جائیں گے۔ قیاس ظاہری کا تقاضا یہ ہے کہ یہ حقوق وقف میں شامل نہیں ہوں گے کیونکہ عقد وقف کو معاہدہ بیع پر قیاس کیا جائے گا۔ بیع معاہدہ میں جب تک کسی چیز کا ذکر نہ کیا جائے وہ چیز ازخود معاہدے میں شمار نہیں کی جاتی بیع اور وقف کے درمیان جو قدر مشترک ہے وہ مالک سے چیز کی ملکیت کا اخراج ہے۔ لہٰذا حقوق ارتفاق کا ذکر جب تک وقف میں ذکر نہیں کیا جاتا اس وقت تک وقف میں شمار نہ ہوں گے۔ قیاس خفی کا تقاضا یہ ہے کہ وقف کو اجارہ پر قیاس کیا جائے وقف اور اجارہ میں جو مشترک قدر ہے وہ چیز سے فائدہ حاصل کرنا ہے۔ اس چیز کی ملکیت نہ وقف میں حاصل ہوتی ہے اور نہ اجارہ میں یہ قیاس خفی ہے، جس کے مطابق حقوق ارتفاق وقف کے حکم میں شامل ہوں گے خواہ ان کا ذکر کیا گیا ہے یا کہ نہیں۔ کیونکہ جس چیز کو وقف کیا گیا ہے اس کی غرض

یہ ہے کہ اس سے فائدہ حاصل کیا جائے۔ حقوق ارتفاق کے بغیر یہ فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا لہٰذا استحسان کے طور پر حقوق ارتفاق وقف میں شامل ہوں گے۔

استحسان بالنص (سنت): کسی مسئلہ کا قیاسی حکم چھوڑ کر اس کے خلاف اس حکم پر عمل کیا جائے جو نص سے ثابت ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہے "میں نے اس کا سارا مال صدقہ کیا" تو قیاس کی رو سے اس کا سارا مال صدقہ تصور کیا جائے گا کیونکہ مال کا لفظ مطلق بعد عام ہے۔ لیکن قرآن مجید کی نص وارد ہو جانے کی وجہ سے استحساناً اس کے مال سے وہی مال صدقہ تصور کیا جائے گا جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے ارشاد الٰہی ہے۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (التوبہ:۱۰۳) تم ان کے اموال سے صدقہ لو۔ پس اس شخص کے قول سے مراد اس کے کل مال میں سے صرف مال زکوٰۃ کا صدقہ ہوگا۔ یعنی اس کے مال پر جتنی زکوٰۃ بنتی ہے۔ وہی لی جائے گی سارا مال نہیں لیا جائے گا۔

استحسان اجماع: کسی مسئلہ کا قیاسی حکم ترک کر کے اس کے خلاف اس کا وہ حکم اختیار کرلیا جائے جس پر اجماع منعقد ہوا ہو۔

استحسان کی یہ دو قسمیں (نص اور اجماع) درست نہیں اس لیے جو حکم سنت میں موجود ہو اور جس مسئلہ پر اجماع ہو اس کو استحسان نہیں کہا جا سکتا کیونکہ استحسان ظاہری قیاس کو چھوڑ کر اس حکم کو اختیار کرنے کا نام ہے جو لوگوں کی فلاح و بہبود کا ضامن ہو اور لوگوں کی ضرورتوں کے زیادہ موافق ہو۔ فقہاء یہ اس وقت راستہ اختیار کرتے ہیں جب سنت اور اجماع خاموش ہوں۔

استصلاح یا مصالح مرسلہ

فقہاء کی اصطلاح میں صرف ضرورت اور مصلحت عامہ کو اساس بنا کر مسائل استنباط کرنے کا نام استصلاح یا مصالح مرسلہ ہے۔

تعریف یہ ہے۔ بناء الاحكام الفقهية على مقتضى المصالح المرسلة یعنی مصالح مرسلہ کی اقتضاء پر احکام و مسائل کی اساس قائم کرنا۔

حضرت امام غزالیؒ نے مصلحت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مصلحت حصول منفعت یا دفع ضرر کا نام ہے۔ یقیناً حصول منفعت اور دفع مضرت مقاصد خلق میں سے ہے اور انسانوں کی بھلائی اس میں ہے کہ یہ مقاصد حاصل ہوں۔ لہٰذا مصلحت سے ہماری مراد یہ ہے کہ شریعت کے مقاصد کا تحفظ کیا جائے انسانوں سے متعلق شریعت کے پانچ مقاصد ہیں وہ یہ ہیں کہ ان کے دین، جان، عقل اور مال کا تحفظ کیا جائے لہٰذا جس چیز سے ان پانچوں مقاصد کا تحفظ ہوتا ہے وہ مصلحت ہے اور جس چیز سے ان اصولوں کو ضرر پہنچتا ہے وہ مفسدہ ہے ایسے مفسدہ کو دور کرنا مصلحت کہلاتا ہے۔

(المستصفیٰ من علم الاصول ۱/۲۸۶، ۲۸۷)

مرسلہ مصالح کی شرائط: فقہاء نے مصالح مرسلہ سے کام لینے کی حسب ذیل شرائط مقرر کی ہیں۔

۱۔ مسئلہ عبادات سے تعلق نہ رکھتا ہو بلکہ امور دنیا سے تعلق رکھتا ہو۔

۲۔ مصلحت عامہ شریعت کی منشاء کے مطابق ہو۔

۳۔ یہ مصالح ان مصالح کے مشابہ ہوں جن کو شریعت میں اولیت حاصل ہو۔
وہ پانچ ہیں۔ ۱۔ حفظ دین۔ ۲۔ حفظ نفس۔ ۳۔ حفظ عقل۔ ۴۔ حفظ نسل۔ ۵۔ حفظ مال۔

۴۔ ان مصالح کے حصول کا یقین کامل ہو۔ ۵۔ قومی مصلحت سے ان کا تعلق ہو۔

مصالح مرسلہ سے امام مالکؒ نے زیادہ کام لیا ہے۔

مصالح مرسلہ کے دلائل

۱۔ شریعت اسلامی کی بنیاد ہی بنی نوع انسان کی فلاح پر ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے قانون سازی میں مصلحت عامہ کو خاص ملحوظ رکھا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ مَاجَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج ۲۲:۷۸) اللہ نے دین میں تمہارے اوپر کوئی تنگی نہیں کی۔
لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا. (البقرہ ۲:۲۸۶) اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔
يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ. (البقرہ ۲:۱۸۵) اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

۲۔ صحابہ کرام بھی مصالح کا اعتبار کرتے تھے۔ مثلاً کتابت قرآن، خلافت کے لیے طریقہ انتخاب، جمعہ کی نماز میں دو اذانیں، اسلامی حکومت کی محکمہ جاتی اور تقسیم وغیرہ ایسے امور تھے کہ صحابہ کرام نے محض مصلحت عامہ کے پیش نظر انھیں انجام دیا تھا۔

استدلال

استدلال مصدر ہے اِسْتَدَلَّ سے جس کے معنی ہیں کہ اس نے دلیل تلاش کی اور حاصل کر لی لیکن فقہی اصطلاح میں اس کی تعریف یہ ہے کہ استدلال ایسی دلیل کو کہتے ہیں جو نہ نص ہو۔ نہ اجماع اور نہ قیاس۔ **هو دليل ليس بنصٍ ولا اجماع ولا قياس.**

(الاحکام فی اصول الاحکام ۴/۴۶۱ ارشاد الفحول ۲/۲۴۵)

استدلال کی اہم اقسام: ا۔ ایک حکم کا دوسرے حکم کے ساتھ بغیر کسی خاص علت کے متعلق ہونا۔ **التلازم بين الحكمين من غير تعين علة.**

۲۔ استصحاب الحال: استصحاب کے لغوی معنی باقی رکھنے کے ہیں۔ اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ اس امر کو تسلیم کر لینا کہ جو حالت پہلے تھی۔ وہ اس وقت تک قائم ہے جب تک اس کے خلاف ثابت نہ کیا جائے۔

مثلاً امام شافعیؒ کے نزدیک مفقود الخبر اس وقت تک زندہ متصور ہوگا۔ جب تک اس کی موت ثابت نہ کی جائے۔ اس وقت تک نہ اس کی جائیداد ورثاء میں تقسیم ہوگی۔ نہ اس کو ایسے مورث کی جائیداد سے محروم رکھا جائے گا۔ جو اس کی غیر حاضری میں فوت ہوا۔

۳۔ استدلال بالقیاس المنطقی: یہ ایسا قول ہے جو چند جملوں سے مرکب ہو جنھیں مان لینے کے بعد اس کے نتیجے کا تسلیم کرنا بھی ضروری ہو جائے۔ جیسے بیع ایک معاملہ ہے اور ہر معاملے کا جزو اعظم رضا مندی ہے۔ دونوں جملوں کی صداقت کو مان لینے کے بعد اس نتیجہ کو بھی تسلیم کرنا ضروری ہے کہ بیع کا جزو اعظم رضا مندی ہے۔

قسم اوّل کی چار قسمیں ہیں

ا۔ جب تعلق دو مثبتہ قضیوں میں ہو۔ مثلاً کہ جو شخص جائز طلاق دینے کا مجاز ہے۔ وہ بطور جائز ظہار بھی کر سکتا ہے۔

۲۔ جب تعلق دو منفی قضیوں میں ہو۔ مثلاً اگر وضو بغیر نیت کے جائز ہے تو تیمم بھی بغیر نیت کے جائز ہے چونکہ تیمم بغیر نیت کے جائز نہیں۔ اس لیے وضو بھی بغیر نیت کے جائز نہیں ہو سکتا یہ حنفیوں کا رد ہے۔

۳۔ جب تعلق ایک مثبت اور ایک منفی قضیہ میں ہو۔ مثلاً جو امر جائز ہے وہ ممنوع یا حرام نہیں ہو سکتا۔

۴۔ جب تعلق ایک منفی اور ایک مثبت قضیہ میں ہو مثلاً جو جائز نہیں وہ ممنوع ہے۔

استدلال کا وسعت اثر: استدلال استنباط شرعی کے لحاظ سے ان تمام استدلالوں پر حاوی ہے جو قیاس کی حد میں داخل نہیں ہوتے قاضی عضد کا مقولہ ہے کہ حنفیوں کا مسئلہ استحسان اور مالکیوں کا مسئلہ مصالح مرسلہ دونوں استدلال کے تحت آ جاتے ہیں۔

اسلام سے ماقبل شرائع

فقہ اسلامی کا ماخذ گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں بھی ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ **اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ (الانعام ۶: ۹۰)** یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت کی ہے۔ ان کی ہدایت کی پیروی کر۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ **ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا** ہم نے آپ کو وحی بھیجی کہ آپ ملت ابراہیم کی پیروی کیجیے۔

مسند احمد بن حنبل میں ایک روایت ہے۔ **يعمل فى الاسلام بفضائل الجاهلية** یعنی اسلام میں جاہلیت کی اچھی باتوں پر عمل کیا جاتا تھا۔

رسول کریم ﷺ کا طرز عمل تھا کہ ''اگر کسی بات کے متعلق براہ راست وحی نہ آتی تو آپ اہل کتاب کے طور طریقوں پر عمل کرنا پسند فرماتے تھے۔''

اسی وجہ سے محدثین نے فرمایا ہے۔ **وان شرع من قبلنا يلزمنا مالم ينقض الله بالا نكار.** (عینی ۲) یعنی پہلی شریعتوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔ جب تک وحی الٰہی کی طرف سے اس پر نکیر نہ کی جائے۔

اسلام سے ماقبل شرائع سے استفادہ زمانہ کے تقاضوں پر مبنی ہے۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ رسول کریم ﷺ کے عہد مبارک میں ماقبل کی شریعتوں سے استفادہ ہوا ہے۔

تعامل

تعامل سے مراد رسول کریم ﷺ کے اصحاب کا عمل ہے۔ فقہاء نے مسائل کے استنباط کے وقت اس سے بہت استفادہ کیا ہے۔ اصحاب وہ لوگ ہیں

جنھوں نے براہ راست رسول کریم ﷺ سے تعلیم حاصل کی ہے۔ ان سے بڑھ کر مزاج شناس نبوت کون ہو سکتا ہے۔ ان کی رائے اور عمل کے مقابلہ میں کسی کی رائے اور عمل کو اہمیت نہیں دی جا سکتی اس وجہ سے فقہاء نے رسول کریم ﷺ کے اصحاب کے قول و عمل کو فقہ اسلامی کا ماخذ قرار دیا ہے قرآن اور حدیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ. (التوبہ ۹:۱۰۰) مہاجرین اور انصار میں سے جو لوگ سبقت کرنے والے سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں اور وہ لوگ جنھوں نے راست بازی کے ساتھ ان کی اتباع کی۔ ان سب سے اللہ راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

اس آیت کریمہ میں رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کا جملہ تعامل صحابہ کرام کو ماخذ قرار دینے پر روشنی ڈالتا ہے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين تمسكوا ابها وعضوا عليها بالنواجذ. (ابوداؤد، ترمذی) تم لوگ میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑو۔ مضبوطی کے ساتھ اس پر جمے رہو اور مضبوطی کے ساتھ اسے پکڑے رکھو۔

ایک اور روایت ہے۔ وما انا عليه و اصحابي. (ترمذی) جس راستہ پر میں اور میرے اصحاب ہیں وہی حق ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے ایک موقع پر فرمایا۔

"رسول کریم ﷺ کے اصحاب ہیں۔ جو دل کی نیکی علم کی گہرائی اور تکلف کی کمی میں اس امت کے افضل ترین لوگ ہیں۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت اور اپنے دین کے قائم کرنے کے لیے چن لیا ہے تم لوگ ان کے فضل کو پہچانو۔ ان کے نقش قدم پر چلو اور ان کے اخلاق اور ان کی سیرت کو جہاں تک ہو سکے مضبوطی کے ساتھ پکڑو۔ یہی لوگ ہدایت مستقیم پر ہیں۔" (مشکوٰۃ کتاب الاعتصام)

فقہاء کا مسلک: صحابہ کرام کے تعامل کے بارہ میں فقہاء کا مسلک اصول فقہ میں مذکور ہے۔ يجب اجماعاً فيما شاع فسكتوا مسلمين ولا يجب اجماعاً فيما ثبت الخلاف بينهم. (توضیح و تلویح جلد ۲ ص ۱۷) جو بات تمام صحابہ میں مشہور ہو اور جس کو انھوں نے تسلیم کر لیا ہو۔ اس کا اتباع واجب ہے اور جس میں کچھ اختلاف ہو اس میں واجب نہیں۔

ملکی قانون

فقہ اسلامی کا ماخذ "ملکی قانون" ہے۔ تاریخ سے یہ بات واضح ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ان قوانین کو معمولی اصلاح کے بعد قبول فرمایا جو عرب میں رائج تھے۔ مثلاً عرب میں حسب ذیل قوانین رائج تھے۔

۱۔ مدعی سے دعویٰ کے ثبوت کے لیے گواہ طلب کیے جاتے تھے اگر گواہ نہ ہوتے اور مدعا علیہ انکار کرتا تو مدعا علیہ کو قسم دی جاتی تھی۔
اسلامی فقہ کا بھی یہ مسلمہ اصول ہے۔ البينة على المدعي واليمين على من انكر. گواہ مدعی کے ذمہ ہیں اور قسم انکار کرنے والے کے ذمہ ہے۔

۲۔ تملیک جائیداد کی مختلف صورتیں تھیں۔ بیع، ہبہ، رہن، اجارہ وغیرہ ان کو قائم رکھا۔

۳۔ بیع کی مختلف شکلیں رائج تھیں۔ بیع سلم، مرابحہ، تولیہ وغیرہ۔
ان میں سے فساد کی تمام صورتوں کو باطل کر دیا اور صحیح صورتوں کو رواج دیا۔

۴۔ وصیت کا دستور۔

۵۔ زمین کو بٹائی پر دینے کا رواج تھا۔

حضرت عمرؓ نے بہت سے قوانین مفتوحہ ممالک کے باقی رکھے۔ مثلاً عراق، شام، مصر کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے بہت حد تک رومی، یونانی اور ایرانی قانون لگان و مال گزاری کو باقی رکھا۔ ظلم و زیادتی کی صورتوں کی اصلاح و ترمیم کر دی۔

عصر حاضر میں اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت

اجتہاد کے لغوی اور اصطلاحی معنی: اجتہاد جَهَدَ سے مشتق جس کے معنی ایک شخص کا انتہائی درجہ تک کوشش کرنا ہے لیکن شرعی اصطلاح میں اس انتہائی کوشش کو کہتے ہیں۔ جو ایک مجتہد (فقیہ) کتاب اور سنت کی روشنی میں شرعی حکم معلوم کرنے کے لیے کرتا ہے۔

پہلی دلیل: اجتہاد از روئے قرآن مجید: قرآن مجید نے مذہبی اور دنیاوی امور میں عقل سے کام لینے پر بہت زور دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَالَّذِيْنَ

جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (عنکبوت ۲۹:۶۹) ''جو لوگ ہمارے معاملہ میں جدوجہد کرتے ہیں۔ ہم ان کے لیے اپنی طرف سے اور راستے کھول دیتے ہیں۔ یعنی ان کی مزید ہدایت کریں گے)

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (ص ۳۸:۲۹) ''یہ کتاب ہم نے تیری طرف اتاری ہے برکت والی ہے تاکہ وہ اس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ عقل والے نصیحت حاصل کریں۔''

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد ۴۷:۲۴) ''تو کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان دلوں پر ان کے تالے لگے ہوئے ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (جاثیہ ۴۵:۱۳) ''اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنی جانب سے تمھارے کام میں لگا دیا ہے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ. (نساء ۴:۵۹) ''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں ان کی بھی اور اگر کسی امر میں تم (اور صاحب امر) آپس میں جھگڑ پڑو تو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اسی طرح ارشاد الٰہی ہے: ''کیا تم نہیں سوچتے؟'' ''کیا تم نہیں سمجھتے'' ''کیا تم کو عقل نہیں ہے'' ''ان میں ان لوگوں کے لیے نشانات ہیں جو غور کرتے ہیں۔'' ''ان میں ان لوگوں کے لیے نشانات ہیں جو سمجھتے ہیں۔'' اس کے برعکس وہ جو اپنے قوائے عقلیہ سے کام نہیں لیتے انھیں حیوانات سے تشبیہ دی ہے اور انھیں بہرے گونگے اور اندھے کہا گیا ہے۔ فرمایا وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (البقرہ ۲:۱۷۱) ''اور ان لوگوں کی مثال جو کافر ہوئے ایک شخص کی مثال کی طرح ہے کہ وہ اسے آواز دے رہا ہو۔ جو بجز پکار اور آواز کے کچھ نہیں سنتا۔ بہرے گونگے اور اندھے ہیں سو وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔

پھر فرمایا لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (الاعراف ۷:۱۷۹) ''ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں لیکن وہ ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ چار پایوں کی طرح ہیں بلکہ زیادہ گمراہ ہیں۔''

پھر فرمایا اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (الانفال ۸:۲۲) ''اللہ کے نزدیک سب جانداروں سے بدتر وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔'' پھر فرمایا: اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (الفرقان ۲۵:۴۴) ''کیا تو خیال کرتا ہے کہ ان میں سے اکثر سنتے ہیں یا عقل سے کام لیتے ہیں۔ وہ صرف چار پایوں کی طرح ہیں۔ بلکہ وہ رستے سے اور بھی دور بھٹکے ہوئے ہیں۔

دوسری دلیل: حدیث کی رو سے اجتہاد کا وجوب: قرآن اور حدیث کی روح کے مطابق قوت فیصلہ (عقل) کو کام میں لایا جائے۔ مندرجہ ذیل حدیث اسلام میں اجتہاد کی اساس سمجھی جاتی ہے۔ حضرت معاذ بن جبل سے مروی ہے کہ جب مجھے رسول اللہ ﷺ نے یمن بھیجا تو فرمایا اگر تمھارے سامنے کوئی فیصلہ پیش آ جائے تو کس طرح فیصلہ کرو گے۔ انھوں نے جواب دیا جو کتاب اللہ میں ہے۔ میں اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ ہو۔ انھوں نے کہا جو رسول نے فیصلہ کیا۔ اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا وہ معاملہ اس میں بھی نہ ملے تو پھر کیا کرو گے۔ انھوں نے کہا۔ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوتاہی نہ کروں گا۔ (سنن ابوداؤد۔ ابی داؤد کتاب الاقضیہ باب الاجتہاد والرائی فی القضاء ۳/۳۰۳ الترمذی عن معاذ بن جبل)

عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس تھا۔ آپ کے پاس دو شخص آئے۔ آپ نے فرمایا ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔ آپ کے سامنے یہ جرأت نہیں کر سکتا۔ آپ نے فرمایا۔ اجتہاد کرو اگر تم صاحب الرائے ہو تو دس نیکیاں ملیں گی اور اگر خطا کیا تو ایک نیکی۔

تیسری دلیل: وجوب از روئے عمل صحابہ: علامہ سیوطی نے اپنی کتاب تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ جب کوئی مسئلہ حضرت ابوبکر کے سامنے پیش ہوتا تو پہلے کتاب اللہ کا تفحص کرتے اگر وہاں سے مسئلہ کا حل نہ ملتا تو سنت رسول کی طرف رجوع کرتے۔ اگر وہاں سے نہ ملتا تو صحابہ کو جمع کرتے اگر کسی کو سنت رسول کا علم ہوتا تو وہ بتا دیتا۔ آپ خدا کا شکر بجا لاتے اگر صحابہ میں سے کسی کو بھی سنت رسول کا علم نہ ہوتا تو پھر بہترین اشخاص کا انتخاب کرتے اور ان سے رائے لیتے اور کثرت رائے سے فیصلہ صادر فرماتے۔ (تاریخ الخلفاء ص ۴۰)

حضرت عمرؓ بھی اس قاعدے کے پابند تھے جب کسی مسئلہ کا حکم قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ میں نہ پاتے تو جید اور صاحب علم صحابہ کو بلاتے اور ان

سے پوچھتے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اس مسئلہ کے بارے میں کوئی فیصلہ دیا ہے اگر حضرت ابوبکر کا فیصلہ مل جاتا تو اس کے مطابق عمل کرتے اگر حضرت ابوبکرؓ کے فیصلوں سے کوئی مدد نہ ملتی تو صاحب علم صحابہ کو جمع کر کے ان سے مشورہ طلب فرماتے جب وہ کسی رائے پر متفق ہو جاتے تو حضرت عمر اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے۔ (اعلام الموقعین ۱/۴۹،۵۰)

حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰ اشعری کو خط لکھا۔ اس کے مندرجات سے بھی یہی راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ آپ نے لکھا۔ ''اگر کوئی قضیہ ایسا پیش آ جائے کہ اس کے بارے میں قرآن اور سنت میں کچھ نہ پاؤ تو پھر غور وخوض کر کے اپنے فہم سے کام لو اور ان حالات میں امور کا قیاس کرو اور مثالوں کو پہچانو، پھر جو چیز اللہ کی محبت کے زیادہ قریب اور حق کے زیادہ نزدیک نظر آئے اس پر اعتماد کرو۔ (اعلام الموقعین ۱/۴۹،۵۰)

حضرت عمرؓ نے قاضی شریح کو لکھا۔

''جب تم اللہ کی کتاب میں کوئی چیز پاؤ تو اس کے مطابق فیصلہ کرو اور کتاب اللہ کے سوا کسی اور طرف متوجہ نہ ہو اگر تمھارے پاس ایسا مسئلہ آ جائے جو کتاب اللہ میں موجود نہ ہو تو سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق فیصلہ کرو۔ اگر کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہو جو نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ سنت رسول ﷺ میں ہو۔ تو اس کے مطابق فیصلہ کرو جس پر لوگوں کا اجماع ہو۔ اگر تمھیں کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہو جو نہ کتاب اللہ میں ہو۔ نہ سنت رسول ﷺ میں ہو، نہ ہی اس بارے میں تم سے پہلے کسی نے رائے دی ہو تو اگر تم اپنی رائے سے اجتہاد کرنا چاہتے ہو کرو اور اگر تم اس مسئلہ کو متاخر کرنا چاہتے ہو تو متاخر کرو اور میں سمجھتا ہوں کہ متاخر کرنا تمھارے لیے بہتر ہے۔'' (اعلام الموقعین ۱/۳۹)

حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا ''تم میں سے جس کے سامنے کوئی مقدمہ آئے تو کتاب کے مطابق اس کا فیصلہ کرے۔ اگر کتاب اللہ میں نہ پائے تو نبی اکرم ﷺ کے حکم کے مطابق اس مقدمہ کا فیصلہ کر دے۔ اگر کوئی ایسا مسئلہ آ جائے جس کے بارے میں کتاب اللہ میں کچھ نہ ہو اور نہ ہی نبی کریم ﷺ نے اس بارے میں فیصلہ صادر فرمایا تو صالحین کے فیصلہ کے مطابق حکم دے۔ اگر اس معاملہ میں کتاب اللہ سنت رسول ﷺ اور صالحین سے کوئی فیصلہ نہ ملے تو اپنی رائے سے اجتہاد کرے۔ (اعلام الموقعین ۱/۵۱)

مجتہدین کے اوصاف

۱۔ مجتہد کے لیے یہ ضروری ہے کہ مزاج شریعت سے اچھی طرح واقف ہو۔ یہ مزاج قرآن مجید اور حدیث پر وسیع اور گہری نظر رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔
۲۔ مجتہد عاقل بالغ ہو تا کہ وہ قرآن مجید اور حدیث کے منشاء کو سمجھ سکے۔
۳۔ نئے اور ابھرتے ہوئے احوال وحوادث جو جدید احکام وضع کرنے کے مقتضی ہوتے ہیں۔ ان کا جاننا ضروری ہے۔
۴۔ عربی زبان کا ماہر ہو۔
۵۔ اجماعی مسائل سے واقف ہو تا کہ اجتہاد کرتے وقت ہر دور کے مجتہدین کا اجماع اس کے سامنے ہو اور مجتہد فیصلے کرتے وقت ٹھوکر نہ کھائیں کیونکہ پچھلے ادوار کے اجماعی فیصلے کے بعد آنے والے مجتہدین کے لیے چراغ راہ ہیں۔
۶۔ صحابہ اور تابعین کے اقوال جو احکام کے سلسلہ میں ان سے منقول ہیں آگاہ ہو۔
۷۔ فقہاء سلف کے اقوال اور آراء کا علم رکھتا ہو۔
۸۔ ذہین اور تیز فہم ہو تا کہ قیاس کے ذریعہ احکام کے علل اور اسباب معلوم کر سکے۔
۹۔ متقی ہو تا کہ لوگ فتویٰ پر عمل کرنے کے لیے اس پر اعتماد کر سکیں۔

مجتہدین کے مدارج

۱۔ مجتہد فی الشرع: وہ مجتہدین عظام جو کسی مسلک کے بانی ہوں اور جنھوں نے اجتہاد کرنے کے قواعد وضوابط وضع کیے ہیں۔ مثلاً اہل سنت والجماعت کے چاروں مسالک کے بانی حضرت امام ابوحنیفہ حضرت امام مالک حضرت امام شافعی حضرت امام احمد بن حنبل اور شیعہ مسلک کے بانی حضرت امام جعفر صادق ہیں۔

۲۔ مجتہد فی المذہب: جو کسی مسلک کا مقلد ہو۔ لیکن وہ اپنے امام سے اصولی یا فروعی مسائل میں اختلاف رکھتا ہو۔ مثلاً مذہب حنفی میں امام ابو یوسف اور امام محمد ہیں۔

۳۔ مجتہد فی المسائل: وہ مجتہد مراد ہے جو صرف فروعی مسائل میں اپنے امام سے اختلاف رکھتا ہو۔ مثلاً مذہب شافعی میں حضرت امام غزالیؒ اور حنفی میں

امام طحاوی۔

۴۔ مجتہد مقید: وہ مجتہد مراد ہے جو اپنے امام کی پوری تقلید کرے۔ اصولی اور فروعی اصول میں اختلاف نہ کرے لیکن یہ ضروری ہے وہ احکام سے کما حقہٗ واقف ہو۔

اجتہادی رائے کی شرعی حیثیت: اجتہاد ایک رائے ہے جو کتاب اور سنت کے اشارات پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کی حیثیت نص کی سی نہیں اس میں غلطی کا بھی امکان ہے اجتہادی رائے سے اختلاف کی بناء پر کسی کو کافر و فاسق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کسی بزرگ فقیہی نے اختلاف کی بناء پر کسی کو کافر قرار نہیں دیا۔

مسلمانوں میں تقلید اور جمود کی وجوہات: چوتھی صدی کے بعد مسلمانوں میں تقلید اور جمود کا دور شروع ہوتا ہے۔ سقوط بغداد کے بعد تمام سنی فقہاء اس بات پر متفق ہو گئے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے علماء کے اجتہادی قوتوں پر جمود آ گیا۔ انھوں نے مفصل اور طویل کتب کے مختصرات اور مختصرات کی شرح لکھنے پر اکتفا کیا۔ مختلف فقہی مسالک کے مقلد اکابر علماء پیدا ہوئے۔ جنھوں نے اپنے اپنے امام کی فقہ کی تقلید کی اور یہی وہ دور ہے جس میں علم کی روشنی مدہم ہونا شروع ہوئی۔ بدعات اور خرافات نے معاشرہ میں جگہ لے لی اور شریعت کی اصل روح مفقود ہو گئی۔

ا۔ معتزلہ کی تحریک اور اس کے بداثرات سے بچنے کی کوشش: عباسیہ دور میں اعتزال (عقلیت پسندی) کی تحریک اٹھی اس وجہ سے بے شمار غیر اسلامی مباحث چھڑ گئے۔ (مثلاً خلق قرآن کا مسئلہ حدیث کا مقام وغیرہ) ایک طرف علماء ربانی نے معتزلہ علماء کے دلائل و براہین سے مقابلہ کیا اور ان کے غلط دلائل قرآن اور سنت کی روشنی میں رد کیے۔ دوسری طرف اسلامی معاشرہ کو ان بحثوں کے بدنتائج سے بچانے کے لیے ضابطہ قانون سخت بنا دیا۔ یونانی علوم کی روشنی میں اسلامی مسائل اور مباحث کو حل کرنے کی سعی اور کوشش کو بری نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اس طرح فقہاء کی اجتہادی قوتیں مردہ ہونے لگیں۔

۲۔ سقوط بغداد اور سیاسی انتشار: بغداد پر ہلاکو خان کے حملے سے فقہاء اور علماء مایوسی کا شکار ہو گئے۔ اس حالت قنوطیت نے علماء کی قوت فکریہ کو سلب کر لیا اور وہ اپنے دور کے مسائل کو علمی اور عملی لحاظ سے حل کرنے کی بجائے مختلف فقہی مسالک کے پیروکار بن گئے اور ان کی فقہوں کو پڑھانے میں اپنی عمریں صرف کر دیں اور نئے مسائل حل کرنے کی طرف توجہ نہ دی۔

۳۔ تصوف کے اثرات: سیاسی انحطاط کی وجہ سے اسلام کے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی گوشے بالکل سرد پڑ گئے اور علماء نے زندگی کے ظاہری پہلوؤں سے بالکل بے اعتنائی برت لی۔ جلوت سے خلوت میں چلے گئے۔ گوشہ نشینی میں زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی۔

عصری تقاضوں سے بے خبری: جب علماء نے عملی زندگی چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کر لی تو وہ عصری تقاضوں سے بالکل غافل ہو گئے۔ نئے ابھرتے ہوئے تقاضوں سے بے خبری کی وجہ سے علماء میں اجتہاد کی صلاحیت نہ رہی۔

۵۔ وضعی قوانین کی مداخلت: مغرب کے لادینی اثرات کی وجہ سے مسلمان حکومتوں نے اپنے اجتماعی اور سیاسی زندگی کے ہر گوشے میں وضعی قوانین داخل کر لیے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی معاشرہ قرآن اور سنت کی روح سے معریٰ ہو گیا اور اسلامی قانون کا تعلق عملی زندگی سے منقطع ہو گیا۔

۶۔ علماء کی تنگ نظری: اسلامی معاشرہ مختلف فقہی گروہوں میں بٹ گیا۔ اس تقسیم نے ان کے اندر تعصب بلکہ عناد اور دشمنی کے جذبات پیدا کر دیے۔ ہر گروہ نے صداقت اور حقانیت کو اپنے مسلک کے اندر خیال کیا اور دوسرے فقہاء کی اجتہادی آراء کو صرف ترک ہی نہ کیا بلکہ لغو قرار دیا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ علماء کے اندر وسعت نظر اور ژرف نگاہی ختم ہو گئی اور اجتہاد کی اہلیت ختم ہو گئی۔

۷۔ اخلاق کی پستی: فقہاء اور علماء اخلاقی پستی کا شکار ہو گئے۔ وہ بادشاہوں کے دربار سے وابستہ ہو گئے ان کی رضا جوئی کے لیے فتویٰ دینے لگے۔ لوگ ان کی دین فروشی کی وجہ سے ان سے متنفر ہو گئے اور اپنے گزرے ہوئے فقہاء کی تقلید میں بھلائی سمجھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جس آدمی کے اخلاق ہی قابل اعتماد نہ ہوں۔ دین کے بارہ میں اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

۸۔ اسلامی علم کا زوال: سیاسی انحطاط کے ساتھ ہی اسلامی علوم کا زوال شروع ہو گیا۔ ایسے لوگوں کا پیدا ہونا کم ہو گیا۔ جو اجتہاد کے ذریعہ نئے مسائل کو حل کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ اس سے علم فقہ کی ترقی رک گئی۔ علماء کے اجتہادی قوتوں کے سوتے خشک ہو گئے۔

اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے: عصر حاضر میں یہ بات کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ یہ خیال سراسر غلط اور بے بنیاد ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ قرآن مجید

نے عقل کو استعمال کرنے کی اجازت دی۔ صحابہ کرام نے ملکی مسائل کو حل کرنے کے لیے اجتہاد سے کام لیا۔ تابعین نے اجتہاد کا دامن تھامے رکھا۔ قرآن مجید کے اسرار و رموز کو سمجھا اور قرآن اور حدیث کی روشنی میں مسائل حل کیے۔ بعد میں آنے والی نسلوں نے ابھرتے ہوئے مسائل کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں حل کیا۔ فقہاء نے بھی اندھی تقلید سے منع فرمایا۔ ابن قیم نے ابوحنیفہؒ اور ابو یوسفؒ سے روایت کی ہے: لَا يَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ يَقُوْلَ بِقَوْلِنَا حَتّٰى يَعْلَمَ مِنْ اَيْنَ قُلْنَا ''کہ کسی کو یہ جائز نہیں کہ وہ ہمارے قول کی پیروی کرے جب تک وہ یہ جان نہ لے کہ ہم نے کس بناء پر کہا ہے۔''

حضرت امام مالک حضرت امام شافعی اور حضرت احمد بن حنبل سب اس امر پر متفق ہیں کہ اندھی تقلید ٹھیک نہیں ان فقہاء کا عمل خود اس امر پر دلیل ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ اگر رسول کریم ﷺ کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہوتا تو یہ بزرگ ہستیاں کبھی بھی اجتہاد سے کام نہ لیتیں۔ یہ تمام بزرگ ایک دوسرے کے بعد گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنے پیش رووں سے علمی اختلاف کیا اور زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق مسائل کو حل کیا اجتہاد قانون سازی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اگر اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا جائے تو شریعت اسلامی ملکوں کے لیے ایک رحمت کا موجب بن جائے گی۔ اجتہاد کا دروازہ بند کرنا ذہنی پستی کی علامت ہے۔ مسلمان علمی پستی کا اس وقت شکار ہوئے جب انھوں نے اجتہاد اور حریت فکر پر پابندی عائد کر دی۔

دور حاضر میں اجتہاد کی اہمیت وضرورت: متذکرہ الصدر بحث سے یہ بات عیاں ہوگئی ہے کہ اجتہاد رسول کریم ﷺ کے دور سے لے کر سقوط بغداد تک جاری رہا۔ اس کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا لیکن اس تاریک دور میں بھی بعض ممالک میں ایسے نامور علماء فقہاء اور فلاسفہ پیدا ہوئے۔ جنھوں نے اسلام کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا۔ اجتہاد پر زور دیا۔ جس سے تفقہ کی شمع جلتی رہی۔ ان نامور علماء و فلاسفہ میں سے امام رازی ابن سینا' ابن رشد' ابن طفیل' کندی' فارابی' امام ابن تیمیہ' امام ابن قیم محقق طوسی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قریب کے ماضی دور میں بڑی بڑی نامور ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔ جنھوں نے مسلمانوں کو محض تقلید پسندی سے نکالنے کی کوشش کی اور نئے ابھرتے ہوئے مسائل کو حل کرنے کے لیے اجتہاد کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا۔ ان میں سے علامہ جمال الدین افغانی مفتی عبدہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین علی شریعتی سر سید احمد خان، مولوی چراغ علی' مولانا عبید اللہ سندھی' سید امیر علی علامہ عنایت اللہ مشرقی، علامہ محمد اقبال شامل ہیں۔ گو ان تمام صاحب نظر اشخاص کے نظریات سے بکلی اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں بھی مذکورہ اشخاص کے خیالات میں زیغ اور کجی آئی تو مقلدین نے قرآن اور حدیث کی روشنی میں اس غلط خیال کو رد کیا۔

مذکورہ مفکرین کے نظریات پر طوالت کے خوف سے بحث نہیں کی جا سکتی۔ بہرحال ان مفکرین نے اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا ہے۔ آج اجتہاد کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا جاتا ہے تو یہ ان کے روشن افکار کی وجہ ہے ہندوستان میں مولانا احمد رضا اور علماء دیوبند نے علم فقہ کی خدمت کی اور مسئلہ اجتہاد کو آگے بڑھایا۔

موجودہ دور کے نئے مسائل: ۱۔ حکومت میں عوام کی شراکت۔ ۲۔ عوام کے حقوق و فرائض۔ ۳۔ عورت کی امور زندگی میں شمولیت اور اس کا دائرہ کار۔ ۴۔ مسئلہ ربو۔ ۵۔ سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام اور اس کی تحدید۔ ۶۔ بیرونی غیر مسلم طاقتوں کا تغلب اور بعض اسلامی ممالک کے ہوائی اڈوں پر قبضہ۔ ۷۔ جہادی قوتوں کو منظم کرنا۔ ۸۔ بین الاقوامی مالیاتی اداروں کا اسلامی ممالک پر اقتصادی غلبہ اور اس سے نجات کی راہیں۔ ۹۔ تعلیمات قرآن کے فروغ کا ٹھوس منصوبہ۔ ۱۰۔ مخالفان اسلام کے اعتراضات کے جوابات۔ ۱۱۔ کرایہ اور بٹائی جائز ہے یا ناجائز۔ ۱۲۔ سب سے اہم مسئلہ امریکہ اور عالم اسلام ہے اس وقت صورت حال یہ ہے کہ خلیج کے علاقے میں قریباً ۲۰ ہزار بحری اور بری اور فضائی فوج تعینات ہیں۔ بحرین میں امریکی سنٹرل کمانڈ کے بحری بازو کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ قطر میں فضائیہ کا ایک حصہ مقیم ہے۔ ترکی میں امریکی فضائی قوت کا ایک مرکز ہے۔ سعودی عرب میں بری فوج کا ایک موثر حصہ برسر عمل ہے پاکستان کے ہوائی اڈے امریکہ کے پاس ہیں۔ افغانستان اور عراق پر بین الاقوامی اصولوں کو نظر انداز کر کے تسلط جما لیا ہے اور عالم اسلام کی سب سے بڑی دولت ''تیل'' پر قابض ہے۔ سستے داموں ''عربی دولت'' کو یورپ کے کارخانوں میں استعمال کر رہا ہے۔ نیز دیگر علاقائی اور بین الاقوامی مسلم ممالک کے مسائل وغیرہ۔ مذکورہ مسائل میں سے بعض مسائل بین الاقوامی ہیں اور بعض علاقائی بہرحال یہ تمام مسائل اسلامی حکومتیں مل بیٹھ کر ہی حل کر سکتی ہیں۔

مسائل کے حل کی راہیں

۱۔ حل کرنے کے لیے جرأت دانشمندی اور قرآن اور حدیث سے قلبی لگاؤ ضروری ہے۔

۲۔ جن مسائل میں ائمہ یا ان کے شاگردوں کے متفقہ اجتہادات موجود ہوں۔ انھیں من وعن اپنا لیا جائے۔

۳۔ جن امور میں ائمہ اور ان کے شاگردوں میں اختلاف اجتہاد ہے وہاں زمانہ کی ضرورت کی مطابق کسی ایک رائے کو ترجیح دی جائے۔

۴۔ جن امور میں ائمہ نے کوئی اجتہاد نہ کیا ہو۔ وہاں ائمہ کے ہی مقرر کردہ قواعد وضوابط کے تحت استنباط مسائل کیے جائیں۔

۵۔ جہاں ائمہ میں اختلاف ہو وہاں استحسان اور مصالح مرسلہ کے تحت مسائل کو حل کیا جائے (استحسان اور مصالح مرسلہ فقہ اسلامی کے دو ماخذ ہیں۔ ان دونوں اصطلاحوں کا مفہوم یہ ہے کہ مسئلہ کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں معاشرہ کی بہتری اور بھلائی میں حل کیا جائے)

مسائل کے حل کے لیے فقہ کی تشکیل نو کرنا پڑے گی۔ جب تک فقہ کی تشکیل نو نہیں ہوگی۔ مسائل حل نہیں ہوں گے۔ فقہ کی تشکیل نو کے لیے یہ ضروری ہے کہ فقہ قدیم کے پورے پھیلاؤ پر تحقیقی نظر دوڑائی جائے اور کوشش کی جائے تا کہ اس کی اصل بنیادوں مصادر اور اصول کا پتہ چل سکے۔ پھر اس پھیلاؤ کو سامنے رکھ کر نئی فقہ کی بنیاد ڈالی جائے اور اس نئی فقہ کی روشنی میں تمام مسائل حل کیے جائیں۔

دوم۔ فقہ کی تشکیل نو کے لیے یہ ضروری ہے کہ کتاب وسنت کی وہ تصریحات اور مقامات جو فقہی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کو ان تمام فروع سے الگ کر کے ایک جگہ جمع کر لیا جائے۔ پھر اس کے بعد ان تصریحات کی روشنی میں اصلی ماخذوں پر فقہ جدید کی تدوین کی جائے۔

سوم۔ جس طرح فقہاء نے قرآن مجید اور حدیث کی روشنی میں چھوٹے چھوٹے کلیات بنائے تھے یہ تقریباً سو کے لگ بھگ ہیں۔ نئے مسائل کے حل کے لیے اسی طرح کے نئے کلیات بھی بنائے جا سکتے ہیں۔ پھر ان کلیات پر مسائل کو چسپاں کر کے حل کر لیا جائے۔ کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ جب تک اس کے پاس ایک ایسا دستور ہو۔ جو وقت کے تقاضوں کے مطابق نئے مسائل کو حل کر سکے۔ ورنہ قوم زمانہ کی رفتار کے مطابق نہ چل سکے گی اور قوم پیچھے رہ جائے گی۔ زمانہ کے تقاضا کے مطابق نیا آئین اجتہاد کی روشنی میں ہی بنایا جا سکتا ہے۔

اجتہاد کا جاری رہنا اس لیے بھی ضروری ہے تا کہ علماء اور دانشور قوم کو حالات کے مطابق چلا سکیں۔

اجتہاد کی ایک اہم ضرورت: ایک مسلم معاشرہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرے۔ اگر کسی معاملہ میں خدا اور اس کے رسول کی تعلیمات میں کوئی واضح حکم نہ ہو تو پھر اسلامی روح کے مطابق درپیش مسئلہ کو حل کر کے ان پر عمل کیا جائے تو اس طرح مسلم معاشرہ اسلام کی تعلیمات سے وابستہ رہے گا۔ اگر اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا تو مسلم معاشرہ نئے مسائل کو اسلام کی روشنی میں نہ حل کر کے اسلامی تعلیمات سے دور ہو جائے گا۔ اسلامی تعلیمات سے دور ہونا گھاٹے اور خسران کا راستہ ہے۔

باب ۳

ایمانیات و بنیادی عقائد

اسلام کے تعلیم کے لحاظ سے دو بڑے حصے ہیں ایک اعتقادی اور دوسرا عملی۔ اعتقادی حصہ کو اصول ایمان یا اجزائے ایمان کہا جاتا ہے۔ عملی حصے سے مراد وہ تعلیم ہے جس کے مطابق ایک مسلمان زندگی بسر کرتا ہے۔

عقیدہ ایمان کا مفہوم: عقیدہ کا لفظ عقد سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں "گرہ لگانا" "دو چیزوں کو باندھنا" "مضبوط اور پکا کرنا" عہد و پیمان کرنا۔ یہ لفظ تصور اور نظریے سے بلند تر ہے۔ یہ لفظ اسلامی اصطلاح میں اسلام کی اساس اور بنیاد کو قولاً و فعلاً تسلیم کر لینے کا نام ہے جس پر تمام افعال اور اعمال کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ عقیدہ کا لفظ قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

قرآن مجید میں لفظ عقیدہ کی بجائے لفظ "ایمان، استعمال کیا گیا ہے یہ لفظ اپنے اندر زیادہ وسعت اور گہرائی رکھتا ہے۔ دین اور شریعت کی اصطلاح میں ایمان اس کو کہتے ہیں کہ صدق دل سے ان سب باتوں کو حق تسلیم کیا جائے اور قبول کیا جائے جو پیغمبر اسلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچائے اور بتلائے۔

پس کسی آدمی کے مومن ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ان سب باتوں کو حق جانے جن کی اطلاع اللہ تعالیٰ کے رسول نے دی اگر ان میں سے کسی ایک چیز کو بھی کسی نے انکار کیا تو وہ دائرہ ایمان سے خارج ہے۔

اسلام میں عقیدہ (ایمان) کا مقام: انسان کے تمام افعال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں۔ خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں۔ جس قسم کے عقائد ہوں گے اسی رنگ میں ہمارے خیالات اور جذبات رنگین ہوں گے۔ اگر خیالات اور جذبات اچھے عقائد میں رنگین ہوں گے تو اعمال بھی درست ہوں گے۔ اگر خیالات اور جذبات غلط عقائد میں رنگین ہوں گے تو اعمال بھی خراب اور برے صادر ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے ایمان کا ذکر ہمیشہ عمل صالح کے ذکر سے پہلے کیا ہے ایمان کے بغیر کسی عمل کو قابل قبول نہیں سمجھا جاتا کیونکہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادے اور خیالات میں اخلاص نہیں پایا جاتا۔ جس پر حسن عمل کا دار و مدار ہے۔ قرآن مجید نے نیک عقیدہ اور ایمان کی مثال اس شجر طیبہ (پاک درخت) سے دی ہے۔ جس کا تناور درخت دل کی سرزمین میں اُگتا ہے۔ اس کی جڑیں گہری جمی ہوئی ہیں کیونکہ ان کی بنیاد وہم و قیاس پر نہیں بلکہ حق پر ہوتی ہے۔ اور اس سے نیک اعمال مضبوط کردار اور پاکیزہ اخلاق کی جو شاخیں پھوٹتی ہیں وہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچتی ہیں یہ ایسا درخت ہے جو ہر آن اپنے پھل دیتا ہے وہ پھل دنیا اور آخرت میں فلاح ہے۔

قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (ابراہیم ۱۴:۲۵) کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ (پاکیزہ بات) کی کیسی مثال بیان کی ہے۔ جیسے ایک اچھی قسم کا درخت ہو۔ جس کی جڑ زمین میں مضبوط ہو اور شاخیں آسمان میں پہنچی ہوئی ہوں اور وہ ہر وقت اپنے پروردگار کے حکم سے پھل دے رہا ہے۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں اسلامی تعلیمات بےثمر نہیں بلکہ اللہ کے حکم سے مثمر رہتی ہیں۔ وہ ثمر کیا ہے وہ انسان کا اس دنیا اور آخرت میں فلاح پانا ہے جس کا ذکر آغاز قرآن میں ہی قرار دیا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (بقرہ ۲:۲......۵) متقیوں کے لیے ہدایت ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور اس سے جو ہم نے ان کو دیا خرچ کرتے ہیں اور جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں اور یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں۔

ان آیات میں انسانی زندگی کا مقصد فلاح اور اس کے حصول کے طریقے بیان کر دیے ہیں۔

بنیادی عقائد: قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ (البقرہ ۲:۱۷۷) بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو اللہ کو اور یوم آخر کو اور فرشتوں کو اور (اللہ کی نازل کردہ) کتابوں اور نبیوں کو مانے۔

قرآن مجید میں سورۃ النساء آیت ۱۳۶ میں عقائد کا ذکر ہے۔

حدیث میں اجزائے ایمان کا ذکر اس طرح آیا حضرت عمرؓ سے ایک طویل حدیث مروی ہے کہ ایک آنے والے شخص نے (جو درحقیقت حضرت جبرائیل علیہ السلام تھے) حضور ﷺ سے پوچھا ایمان کیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا "ایمان یہ ہے کہ تم اللہ کو اس کے فرشتوں کو اور اس کی نازل کردہ کتابوں اور اس کے رسول کو اور آخرت کو حق جانو اور حق مانو۔" (صحیح مسلم)

لہٰذا قرآن مجید اور حدیث کی رو سے اجزائے ایمان پانچ ہیں۔

۱۔ ایمان باللہ۔ ۲۔ ایمان بالملئکۃ۔ ۳۔ ایمان بالکتب۔ ۴۔ ایمان بالرسل اور۔ ۵۔ ایمان بالآخرۃ۔

ایمان باللہ

اللہ تعالیٰ کی ہستی کیا ہے؟: دنیا کے جتنے مذاہب ہیں سب نے ایک خدا کی تعلیم ہے۔ لہٰذا قرآن مجید میں جن انبیاء علیہم السلام کا ذکر آیا ہے۔ سوائے قرآن سب نے اللہ پر ایمان لانے کی تعلیم دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل ۱۶:۳۶) اور یقیناً ہم نے ہر ایک قوم میں ایک رسول بھیجا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچو۔

مرور زمانہ سے امتوں میں توحید کے ساتھ شرک کی ملونی آتی چلی گئی ایک خدا کے ساتھ کئی کئی خداؤں کی پوجا کی جانے لگی۔ بانیان مذاہب کو الٰہی درجہ دے دیا گیا ہندوؤں نے کرشن اور رام چندر جی کو دیوتا تسلیم کر لیا گیا۔ بدھ مت نے گوتم بدھ کو اوتار مان لیا۔ زرتشتیوں نے دو خدا اہرمن اور یزداں تسلیم کر لیے۔ یہودیوں نے حضرت عزیر کو ابن اللہ مان لیا۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ، حضرت مریم اور روح القدس کو تین خدا مان لیے تینوں کو ایک اور ایک کو تین قرار دیا اور اس کا نام تثلیث رکھا۔

مذہب کی دنیا میں اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کے سامنے جامع اور اکمل رنگ میں خدا کا تصور پیش کیا۔ اسی تصور کو مٹانے کے لیے رسول کریم ﷺ کو ہر قسم کی دنیاوی ترغیبات دی گئیں۔ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے متبعین کو ان ایذاؤں کا نشانہ بنایا گیا جن کو پڑھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن رسول کریم ﷺ اس نئے ایمان کی روشنی کو پھیلانے کے لیے ایسی مستحکم چٹان پر کھڑے تھے جہاں سے دنیاوی ترغیبات اور مصائب آپ ﷺ کے پائے استقلال میں ذرا بھر بھی لغزش پیدا نہ کر سکے۔ آپ ﷺ کے عزم صمیم کا وہ جواب عکاسی کرتا ہے جو آپ ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کو اس وقت دیا جب انھوں نے مخالفین کی دھمکیوں سے خائف ہو کر آپ ﷺ کو نئے ایمان کی تبلیغ سے روکنا چاہا۔ آپ ﷺ نے فرمایا "اے چچا اگر آپ قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو بے شک میری معاونت سے دست کش ہو جائیں۔" پھر فرمایا "اے مہربان چچا! خدا کی قسم اگر چہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند رکھ دیں اور کہیں کہ اس کے عوض میں ندائے حق چھوڑ دوں۔ مجھے منظور نہیں ہوگا۔ اگر مجھے اس راہ میں ہلاکت نظر آئے تو میں پیچھے نہیں لوٹوں گا۔" چنانچہ ایمان باللہ کا وہ چراغ جو مختلف انبیاء علیہم السلام نے مختلف ادوار میں روشن کیا تھا وہ الحاد اور شرک کی طوفانی ہواؤں سے گل ہو چکا تھا یا اس تاریک رات میں اس طرح ٹمٹما رہا تھا جس سے صرف چند سعید روحیں ہی روشنی حاصل کرتی ہوں گی آپ ﷺ نے اس تاریک رات میں نئے ایمان باللہ کا چراغ روشن کیا۔ جس نے دنیا کے گوشہ گوشہ کو منور کر دیا۔

قرآن مجید میں ایمان باللہ ہی وہ محور ہے جس کے اردگرد تمام اسلامی تعلیمات گھومتی ہیں۔ قرآن مجید کا کوئی صفحہ نکال لو۔ اس میں ایمان باللہ کا ذکر ہوگا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ (النساء ۴:۱۳۶) مومنو! اللہ پر ایمان لاؤ۔

مومنوں کو اللہ ایمان لانے کا حکم دینے سے مراد یہ ہے کہ جن حقیقتوں کو انھوں نے مانا ہے ان کو دل کی گہرائی سے مانا جائے اور ایمان باللہ کے تمام تقاضے پورے کیے جائیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّھَدَآءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ (الحدید ۵۷:۱۹) اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے یہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔ ایک اور جگہ آتا ہے۔ وَمَا لَکُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ (الحدید ۵۷:۸) اور تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے۔

ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے۔ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَ نَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ (مائدہ ۵:۸۳،۸۴) وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے اور وہ کہتے ہیں آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے۔ اسے کیوں نہ مانیں جبکہ اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں نیک لوگوں میں شامل کرے۔
وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (العصر ۱۰۳:۱......۳) قسم ہے زمانہ کی انسان گھاٹے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو حق پر جمے رہنے اور صبر سے کام لینے کی تاکید کرتے رہے۔

حقیقی ایمان کیا ہے؟: اللہ پر زبان سے یہ اقرار کر لینا کہ میں اللہ پر ایمان لایا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے۔ ایمان باللہ کی حقیقی روح کو سمجھنے کے لیے مومنوں کو ان الفاظ میں مخاطب کیا۔ یٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (النساء ۴:۱۳۶) مومنو! اللہ پر ایمان لاؤ۔

حقیقی ایمان باللہ انسان سے اپنے پر موت وارد کرنے کا فدیہ مانگتا ہے۔ وہ موت کیا ہے؟ خدا تعالیٰ کے احکام پر کامل طور پر عمل کرنا، خواہ اس کو احکام خداوندی کی تعمیل کے لیے آگ کے انگاروں پر سے گزرنا پڑے۔ قرآن مجید میں احکام الٰہیہ پر عمل پیرا ہونے کو اطاعت الٰہی کہا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے یٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (النساء ۴:۵۹) اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔

ایک دوسری آیت میں کامل اطاعت الٰہی کو صبغۃ اللہ کے الفاظ سے پکارا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً اللہ کا رنگ اختیار کرو اللہ کے رنگ سے بہتر کون سا رنگ ہوسکتا ہے۔

جب ایک انسان کامل طور پر اطاعت احکام خداوندی کا جوا اپنی گردن پر رکھ لیتا ہے تو وہ کامل طور پر اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگین ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جب لوہے کے ٹکڑے کو آگ میں رکھا جائے تو وہ ٹکڑا آگ کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ آگ میں پڑے رہنے سے آگ کی تاثیر لوہے کے ٹکڑے میں آ گئی ہے اسی طرح جب ایک انسان کامل طور پر اطاعت الٰہی اختیار کر لیتا ہے تو اس پر اللہ کی صفات کا رنگ چڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کی صفات میں رنگین ہو جاتا ہے تو وہ اس وقت ایمان باللہ کے تقاضے پورا کر رہا ہوتا ہے اور حقیقی مومن کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔

قرآن مجید اور حدیث میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء (صفات) بیان ہوئے ہیں۔ ان پر سیر حاصل بحث کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ دلائل قاطع سے ہستی باری تعالیٰ ثابت کی جائے۔ گو قرآن مجید ان دلائل سے بھرا پڑا ہے لیکن ان میں سے صرف تین دلائل سپرد قلم کیے جاتے ہیں۔

دلائل ہستی باری تعالیٰ

کائنات کی گواہی: اللہ تعالیٰ کی ہستی پر کائنات کی تخلیق ایک بین دلیل ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات پر گہری نظر ڈالنے کی دعوت دی ہے کیونکہ اس نظام میں اللہ تعالیٰ کی ہستی کے دلائل و براہین پنہاں ہیں۔ دنیا اور مافیہا کی تخلیق خود اس بات پر شاہد ہے کہ اس کائنات کا کوئی نہ کوئی خالق ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (البقرہ ۲:۲۹) وہی ذات ہے جس نے سب کچھ جو زمین میں ہے تمہارے فائدہ کے لیے پیدا کیا ہے۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو ٹھیک سات آسمان بنائے اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (ابراہیم ۱۴:۱۰) کیا خدا کی نسبت کوئی شک ہوسکتا ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے

ہمارا مشاہدہ اور تجربہ بتا رہا ہے کہ کوئی مصنوع بغیر صانع کے نہیں ڈاکٹر آئنسٹائن کہتا ہے۔

"میرا مذہب کیا ہے؟ اس نہایت ہی اعلیٰ ہستی کے آگے عاجزانہ تعریف جس کے بے شمار کرشموں سے چند ایک ہم اپنے کمزور اور محدود حواس سے معلوم کر سکتے ہیں جب میں عالم کائنات کے حیران کن نظاروں اور لا انتہا وسعت کو دیکھتا ہوں تو دل گواہی دیتا ہے کہ اس کا بانی خدا ہے۔

(ب) تمام کائنات ایک ضابطہ اور قانون کے تحت چل رہی ہے کہیں بھی کوئی رخنہ نہیں کائنات کا یہ نظم اور اس کی ترتیب خود اس امر کی شاہد ہے کہ اس کے پیچھے ایک مدبر ہستی ہے جو اس کائنات کو ایک نظام، ترتیب اور ضابطہ کے ساتھ چلا رہی ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً (البقرہ ۲:۲۲) وہی ذات ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو عمارت بنایا۔

عمارت کہنے سے مراد یہ ہے کہ سب کچھ ایک نظام اور ترتیب کے ماتحت ہے جیسے ایک عمارت میں ترتیب ہوتی ہے اگر اینٹیں چونا، لوہا اور دوسرا سامان عمارت بغیر ترتیب کے ادھر ادھر پڑا ہوا ہو اس کو عمارت نہیں کہہ سکتے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آسمان اور زمین کو بنانے والی ایک مدبر اور بالارادہ ہستی

ہے اور اس وجہ سے اس کائنات میں ایک نظام اور ترتیب پائی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ اس مضمون کو اور واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَاتَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (الملک ۶۷: ۳،۴) جس نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر پیدا کیا تو رحمان کی پیدائش میں کوئی اختلاف نہیں پائے گا پھر نظر کو لوٹا کیا کوئی خلل اور بگاڑ دیکھتا ہے پھر نظر کو بار بار لوٹا نظر تیری طرف حسرت سے تھک کر واپس آ جائے گی۔

(ج) اسی مضمون کو دوسری جگہ دوسرے پیرائے ہیں۔ بیان فرمایا۔ لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (الانبیاء ۲۱: ۲۲) اگر ان دونوں (زمین و آسمان) میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتا تو دونوں بگڑ جاتے۔ یعنی اگر اس کائنات کے نظام کو ایک سے زیادہ بنانے والے اور چلانے والے ہوتے تو نظام عالم میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ایک اپنے رنگ اور طریق پر چلاتا تو دوسرا اپنے حسب منشا اور قانون کے مطابق چلاتا تو اس طرح نظام عالم بگڑ جاتا۔ مختلف خدا ہوں تو مختلف قانون ہوں گے جو بگاڑ کا ذریعہ ہے۔

(ج) کائنات میں ہر چیز جوڑا جوڑا تخلیق کی گئی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا (الزخرف ۴۳: ۱۲) جس نے سب چیزوں میں جوڑے پیدا کیے۔

سائنس کی تحقیق نے یہ امر ثابت کر دیا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کا جوڑا ہے اگر ایک چیز اثر انداز ہو رہی ہے تو دوسری اثر پذیر۔ کائنات کی اشیاء میں قوت متاثرہ محض اتفاق نہیں بلکہ ایک منصوبہ اور منشاء کے مطابق ہے جو ایک مدبر حکیم اور علیم ہستی کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔

دوسری دلیل فطرت انسانی کی گواہی: انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ کی ہستی کا شعور موجود ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی شَهِدْنَا (الاعراف ۷: ۱۷۲) اور جب تیرے رب نے بنی آدم یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی نسل نکالی اور ان کو اپنے وجود پر گواہ کے طور پر ٹھہرایا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا ضرور ہم گواہ ہیں۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (العنکبوت ۲۹: ۶۱) اگر تو ان سے پوچھے کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور سورج اور چاند کو کام میں لگایا ہے تو وہ ضرور کہیں گے اللہ ہے۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ اللہ کی ہستی کا احساس انسان کی فطرت میں داخل ہے ثبوت اس کا یہ ہے کہ اقوام عالم اس امر پر متفق ہیں کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے۔ یہ اتفاق فطری شہادت ہے۔

انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ کی ہستی کے احساس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جب کوئی انسان مصائب اور آلام کے گرداب میں پھنس جاتا ہے اور اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں پاتا ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے تو اس کا اندرونی احساس بیدار ہو جاتا ہے اور آستانہ الوہیت پر گر جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس گرداب سے نکلنے کے لیے دعا کرتا ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ (حٰمٓ السجدہ ۴۱: ۵۱) اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں تو وہ منہ پھیر لیتا ہے اور پہلو پھیر لیتا ہے اور جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو وہ لمبی چوڑی دعا میں لگ جاتا ہے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ سکھ آرام انسان کی فطرت پر غفلت وارد کر دیتا ہے۔ جس وجہ سے انسان اللہ سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور جب مصیبت اس پر وارد ہوتی ہے تو اس کا فطری نور چمک اٹھتا ہے اور اپنے حقیقی مولا اور پروردگار کی طرف رجوع کرتا ہے مصائب میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ انسان کی فطرت میں عبادت اور اطاعت الٰہی کا جذبہ ودیعت شدہ ہے۔

تیسری دلیل: وحی الٰہی کی شہادت: اللہ تعالیٰ کے وجود پر سب سے روشن اور واضح دلیل وحی الٰہی ہے جس سے یقین کے افق سے شک وشبہ کے تمام بادل چھٹ جاتے ہیں اور حقیقت پردہ مکنون سے ظاہر ہو جاتی ہے وحی ایک عالمگیر تجربہ ہے۔ تمام اقوام عالم کی طرف انبیاء علیہم السلام راہنمائی اور ہدایت کے لیے آتے رہے ہیں تمام انبیاء علیہم السلام نے وحی کے ذریعہ خدا کے وجود کا اقرار کیا۔ پھر اس صداقت پر اس مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہوئے کہ مصائب اور تکالیف کے سخت طوفان بھی ان کے پاؤں میں لغزش پیدا نہ کر سکے۔

پہلے دونوں دلائل انسان کو "چاہیے" کے مقام پر پہنچاتے ہیں۔ یعنی اس کائنات کا خالق ہونا چاہیے لیکن وحی الٰہی انسان کو "ہے" کے مقام پر پہنچا دیتی ہے یعنی اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ نبی اللہ تعالیٰ سے "انا الموجود" کی آواز سنتا ہے۔ جس طرح کسی اوٹ کے پیچھے کوئی آدمی موجود ہو اور وہ نظر نہ آ رہا ہو تو انسان اس آدمی کی موجودگی، عدم موجودگی کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا ہو سکتا ہے جب وہ شخص آواز دے گا تو تمام شبہات کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔

یہی حالت اللہ تعالیٰ کے وجود کی ہے وہ نہاں درنہاں ہے۔ وہ انسانی کے ظاہری حواس کی گرفت سے بہت ارفع ہے۔ انسان کی عقل اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ جب یہ مخفی ہستی کسی منتخب انسان سے ہمکلام ہوتی ہے تو انسان حق الیقین کے مرتبہ تک پہنچ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے ''انا الموجود'' کی آواز صرف ایک شخص نے ہی نہیں سنی بلکہ ہر قوم کے ہادیوں نے یہ آواز سنی اور پھر اس کی تبلیغ کی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم میں کسی نہ کسی رنگ میں اللہ کی ہستی کا تصور پایا جاتا ہے یہ اجماع اس بات پر دلیل ہے کہ خدا موجود ہے۔ پھر انا الموجود کی گواہی دینے والے صادق القول ہیں۔

سب سے آخری وحی صادق القول حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ پر نازل ہوئی۔ وہ وحی خود اللہ تعالیٰ کی ہستی پر شاہد ناطق ہے۔ قرآن مجید (وحی الٰہی) کی صرف تین ایسی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں جو بین طور پر وجود باری تعالیٰ پر دلالت کرتی ہیں۔ ا۔ پیش گوئیاں ۲۔ ظاہر خوبی۔ باطنی خوبی۔

انہی اوصاف کی وجہ سے قرآن مجید بے مثل ہے۔ اور بے مثل ہونے کی وجہ سے عربی کے فصحاء و بلغاء کو یہ چیلنج دیا ہے کہ اگر تم اس کتاب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں سمجھتے تو اس کی مانند کوئی کتاب بنا لاؤ۔ ارشاد الٰہی ہے۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (بنی اسرائیل ۸۸:۱۷) کہہ دے کہ اگر انس و جن جمع ہو جائیں اور کوشش کریں کہ اس قرآن کی مثل بنا لائیں تو وہ ہرگز ہرگز اس کی مثل نہ بنا سکیں گے۔ خواہ وہ ایک دوسرے کے ظہیر و مددگار بن جائیں۔ سورہ بقرہ میں منکرین کو صرف ایک سورہ کے مانند کلام پیش کرنے کا چیلنج دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا (البقرہ ۲:۲۳،۲۴) اگر تمھیں اس امر میں شک ہو کہ جو ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا ہے تو تم اس کی مانند کوئی سورہ بنا لاؤ۔ اور اپنے گواہوں کو بلاؤ۔ اگر تم سچے ہو پس اگر تم نے اس کی مثل پیش نہ کی یاد رکھو کبھی نہ کر سکو گے۔

قرآن مجید وہ معجزہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے وجود پر شاہد ناطق ہے۔ قرآن مجید کے معجزہ ہونے کے دلائل ''مصادر اسلام'' کے باب میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ پیشگوئیوں میں سے صرف چند پیشگوئیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جو اس کے من جانب اللہ ہونے کے دلائل قاطع ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہستی پر واضح دلائل ہیں۔ قرآن مجید نے فرعون کی لاش کے متعلق یہ خبر دی تھی کہ وہ موجود ہے یہ اس زمانہ کی خبر ہے جب کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ فرعون کی لاش محفوظ و مصئون ہو گی۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (یونس ۹۲:۱۰) ہم تیرے بدن کو بچا دیں گے تاکہ تو ان کے لیے جو تیرے پیچھے ہیں نشان ہو اور یقیناً بہت سے لوگ ہمارے نشانوں سے بے خبر ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابل پر جو فرعون تھا اس کا نام رعمیسس ثانی تھا۔ انسائیکلوپیڈیا آف بری ٹانیکا میں مضمون ''ممی'' کے تحت لکھا ہوا ہے کہ رعمیسس ثانی کی لاش مصالح کے ذریعہ محفوظ ہے۔

یہ غیب کی خبر آج سے چودہ سو سال قبل عرب کے ایک امی رسول حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کو وحی کے ذریعے دی گئی۔ اس وقت تک کوئی نہیں جانتا تھا کہ فرعون کی لاش کہیں محفوظ ہے نہ امی رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس کوئی ذرائع تھے کہ معلوم کر سکیں کہ فرعون کی لاش کہیں محفوظ ہے۔

دوسری پیشگوئی: رسول کریم ﷺ نے جب دعویٰ نبوت کیا تو ان کی کمزوری اور کسمپرسی کی حالت پر تاریخ گواہ ہے۔ اپنے اور بیگانے سب مخالف ہیں۔ کسی طرف سے بھی کامیابی کی کرن نظر نہیں آتی۔ خال خال جو کچھ سعید روحیں دائرہ اسلام میں داخل ہوتی تھیں وہ بھی ظلم و ستم کا تختہ مشق بن جاتی تھیں۔ گویا چاروں طرف تاریکی کے بادل چھائے ہوئے تھے حتیٰ کہ عدوان اسلام آپ کی جان لینے کے لیے تل گئے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ آپ کی جان کی حفاظت کا وعدہ کرتا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ ۶۷:۵) اے رسول جو کچھ تیرے پروردگار سے تیری طرف اتارا گیا ہے پہنچا دے اور اگر تو ایسا نہ کرے تو تُو نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا اور اللہ تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ یہ پیشگوئی اس وقت کی گئی جب چاروں اطراف میں جان لینے کے خطرات منڈلا رہے تھے۔ پھر جان سے مار دینے کے لیے دارالندوہ میں مشاورت ہوتی ہے یہ اقرار پاتا ہے کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک نوجوان آپ ﷺ کے گھر کا محاصرہ کرے۔ جب آپ ﷺ گھر سے باہر نکلیں تو تمام نوجوان آپ ﷺ پر جھپٹ پڑیں اور قتل کر دیں تاکہ آپ ﷺ کے قتل کا قصاص کسی ایک شخص پر نہ پڑے۔ اس حصار سے اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت میں لے کر بچاتا ہے۔ آپ ﷺ اللہ کی حفاظت میں رات کی تاریکی میں پہرہ سے نکلتے ہیں اور حضرت ابوبکر کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ حضرت ابوبکر کو ساتھ لے کر غار ثور میں پناہ لے لیتے ہیں۔ جب صبح علم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ گھر سے محفوظ نکل گئے ہیں تو دوبارہ پکڑ لینے پر ایک بھاری انعام کا اعلان کرایا جاتا ہے۔ ماہر کھوجیوں کی معاونت سے آپ ﷺ کا تعاقب کیا جاتا ہے۔ کھوجی پاؤں کے نشانوں پر چلتے ہوئے غار ثور کے دروازے پر پہنچ جاتا ہے۔ یہاں پھر خدا کی قدرت جلوہ نما ہوتی ہے۔ غار کے منہ پر مکڑی جالا بن دیتی ہے۔ حضرت ابوبکر دشمنوں کے پاؤں دیکھ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کسی نے جھک کر غار کے اندر دیکھ لیا تو اس کی نظر ہم پر پڑ جائے گی اور گھبراہٹ کے

آثار چہرہ پر ظاہر ہیں اس خطرناک حالت میں اللہ کا نبی نہایت سکون اور اطمینان سے کہتا ہے۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا غم نہ کیجئے اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ دشمنوں سے جان کی حفاظت کا وعدہ جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے کیا تھا۔ ہر لمحہ اور ہر قدم پر آپ کی جان کی حفاظت کے لیے فرشتوں کو مقرر دیا ہوا ہے اور کسی کا ہاتھ آپ ﷺ تک نہیں پہنچ پاتا۔ پھر جنگیں ہوئیں۔ آپ ﷺ دشمن کے نرغے میں آ جاتے ہیں۔ دشمن کی ہر ممکن یہ کوشش ہے کہ آپ ﷺ کا خاتمہ کر دیں لیکن وہاں بھی خدا کی نصرت کام آتی ہے اور دشمن کا ہاتھ آپ ﷺ تک پہنچ نہیں پاتا۔ سم قاتل دے کر آپ ﷺ کی زندگی ختم کرنے کا منصوبہ بنایا جاتا ہے وہاں بھی خدا کی قدرت جلوہ نما ہوتی ہے اور اپنا ہاتھ کھانے سے کھینچ لیتے ہیں۔ پھر یہود مکان کی چھت سے جان لینے کے لیے پتھر گرانے کا منصوبہ تیار کرتے ہیں وہاں بھی اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرماتے ہیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ تمام اتفاقات ہیں۔ نہیں! نہیں یہ اتفاقات نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے جو جان کی حفاظت کا کیا تھا۔ "وَاللّٰہ یعصمک من الناس" اپنی پوری تابانی اور قدرت کے ساتھ جلوہ گر ہے اور دشمن کا ہاتھ آپ ﷺ تک نہیں پہنچ پاتا۔

یہ ہے اللہ تعالیٰ کی "انا الموجود" کی جلوہ نمائی جو وحی کے ذریعہ آپ کو مطلع کیا گیا تھا۔

تیسری پیشگوئی: مصائب و آلام سے پُر حالات میں صرف "واللّٰہ یعصمک من الناس" کا وعدہ نہیں کیا گیا تھا بلکہ ایک اور بھی ناقابل یقین پیشگوئی کے رنگ میں وعدہ دیا گیا تھا کہ اس شہر مکہ سے رات کی تاریکی میں کسمپرسی اور مظلومیت کی حالت میں جا رہے ہو ایک دن آئے گا کہ تم فاتحانہ رنگ میں اس شہر میں داخل ہوں گے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ (قصص ۲۸:۸۵) جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے وہ یقیناً تجھے لوٹ کر آنے کی جگہ واپس لائے گا۔

رسول کریم ﷺ ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ جا رہے تھے تو جحفہ کے مقام پر یہ آیت نازل ہوئی اور آیت میں لفظ معاد سے مراد مکہ ہے۔ کس بے سروسامانی اور قلت تعداد کی حالت میں یہ پیشگوئی کی جا رہی ہے کہ کس شان اور عظمت کے ساتھ ۸ ہجری کو یہ پیشگوئی پوری ہوتی ہے کہ آپ ﷺ دس ہزار قدسیوں کے جلو میں مکہ میں فاتحانہ رنگ میں داخل ہوتے ہیں۔ کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ محض الکل بچو ہے۔ یا تک بندی ہے نہیں نہیں۔ یہ ایک قادر مطلق کی وعدہ وفائی ہے جس نے کافی عرصہ پہلے اپنے بندے محمد مصطفےٰ ﷺ سے وعدہ کیا تھا کہ آج جس شہر سے تمھیں نکالا جا رہا ہے اس شہر میں فاتحانہ رنگ میں تمہارا داخلہ ہوگا۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ کی جلوہ نمائی۔ جو ایک شخص کو خدا کی ہستی پر حق الیقین کے مرتبہ تک پہنچاتی ہے۔

چوتھی پیشگوئی: وَاِنْ کَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَکَ مِنَ الْاَرْضِ لِیُخْرِجُوْکَ مِنْھَا وَاِذًا لَّا یَلْبَثُوْنَ خِلٰفَکَ اِلَّا قَلِیْلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۷۶) اور اس سرزمین میں تجھے خفیف بنا کر نکال دینے لگے ہیں اور اس صورت میں یہ بھی تیرے پیچھے تھوڑی دیر ہی رہیں گے۔

دوسری جگہ ہجرت کے بعد دشمنوں کی تباہی کے لیے ایک سال کی مدت مقرر کر دی ارشاد الٰہی ہے۔ قُلْ لَّکُمْ مِّیْعَادُ یَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْہُ سَاعَۃً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ (سبا ۳۴:۳۰) کہہ تمہارے لیے ایک دن کی میعاد ہے اس سے تم ایک گھڑی پیچھے نہیں رہ سکتی اور نہ بڑھ سکتی ہے۔

یوم (دن) الہامی کتابوں میں نبوت کا ایک دن یعنی سال بھی مستعمل ہوتا ہے۔ لغات عرب اس کے شاہد ہیں اور عیسائی علماء بھی مقر ہیں۔

اس آیت کریمہ میں عالم الغیب اللہ تعالیٰ نے عدوان اسلام کی تباہی کی ایک سال کی میعاد مقرر کر دی ہے یہ پیشگوئی ہجرت کے پورے ایک سال بعد ۶۲۳ء میں پوری ہوئی جب غزوہ بدر میں سب معاندین تباہ ہوئے۔

چوتھی پیشگوئی: ہجرت کے پانچویں سال تمام عرب کے مختلف قبائل سلطنت مدنی کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے لیے مدینہ پر چڑھ آئے۔ یہ وہ حالت تھی باہر دشمن اپنے پورے ساز و سامان سے ڈیرے جمائے ہوئے ہے اندرون شہر منافق اور یہود آستین کے سانپ بنے ہوئے ہیں۔ دشمن سے ساز باز کیے ہوئے اس خطرناک صورت حال کا نقشہ قرآن مجید میں ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِذْ جَآءُوْکُمْ مِّنْ فَوْقِکُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْکُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ الظُّنُوْنَا ھُنَالِکَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا (احزاب ۳۳:۱۰،۱۱) جب وہ تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے تم پر چڑھ دوڑے اور جس وقت تمہاری آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آ گئے اور طرح طرح کے ظن اللہ کی نسبت تم کرنے لگے۔ اس وقت مومن سخت بلا اور مصائب میں ڈالے گئے۔

اس واقعہ کے نتیجے کی خبر پہلے دے دی گئی تھی کہ جب دشمن چاروں طرف سے مدنی ریاست کو تباہ کرنے کے لیے چڑھ دوڑے گا تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی مدد کرے گا اور اپنی قدرت کاملہ کا اظہار کرے گا۔ اور عدوان اسلام ناکام و نامراد رہیں گے اور شکست خوردہ ہوں گے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ جُنْدٌ مَّا ھُنَالِکَ مَھْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ (ص ۳۸:۱۱) یہ بھی ایک شکست خوردہ لشکر اگلے لشکروں سے ہے۔

بتایا گیا ہے جس طرح پہلے انبیاء علیہم السلام کے مقابل پر دشمن کے لشکر آئے لیکن خائب و خاسر رہے اس طرح یہ احزاب بھی جو اکٹھے ہو کر مدنی

ریاست کو تباہ کرنے کے لیے چڑھ دوڑے ہیں ناکام و نامراد ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ اَمْ یَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِیْعٌ مُّنْتَصِرٌ سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ یُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ (قمر۵۴:۴۴،۴۵) کیا کہتے ہیں کہ ہم بدلہ لینے والی جماعتیں ہیں۔ عنقریب یہ سب لوگ شکست دیے جائیں گے بخاری میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی۔ یہ پیشگوئی ہجرت کے پانچویں سال جنگ احزاب میں دشمنوں کی ناکامی کی صورت میں پوری ہوئی۔ جب وہ رات کی تاریکی میں مدینہ کا محاصرہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔

مکی زندگی میں ہی اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کے سامنے کفار سے معرکوں کا نقشہ پیش کر دیا تھا کہ اس شہر مکہ سے ہجرت کرنا ہوگی۔ اس کے بعد کفار مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے چڑھ دوڑیں گے۔ ان معرکوں میں کفار خائب و خاسر رہیں گے اور ان کی طاقت ختم ہو جائے گی اور اسلام غالب آ جائے گا۔

یہ پیشگوئی ایک قادر مطلق عالم الغیب ہستی پر واضح قاطع دلیل ہے۔

پانچویں پیشگوئی: قرآن مجید میں صرف معرکوں میں مسلمانوں کی کامیابی کی پیشگوئیاں نہیں کی گئیں بلکہ اسلام کے اکناف عالم میں پھیل جانے کی بھی پیشگوئیاں قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا (النور۲۴:۵۵) اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں خلیفہ بنائے گا۔ جیسا کہ انھیں خلیفہ بنایا جو ان سے پہلے تھے اور وہ ان کے لیے ان کے دین کو جو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے مضبوطی سے قائم کرے گا اور وہ ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا کہ وہ میری عبادت کریں گے اور کسی کو میرا شریک نہ ٹھہرائیں گے۔ یہ پیشگوئی صحابہ کے حق میں پوری ہے کہ کس طرح مشرق و مغرب شمال اور جنوب کی دوریوں میں فاتحانہ رنگ میں گئے اور یہ پیشگوئی اپنی پوری تابناکی کے ساتھ پوری ہوئی۔ کب کوئی تک بندی سے اس قسم کی پیشگوئی کر سکتا ہے ہرگز نہیں یہ ایک عالم الغیب ہستی کی طرف سے ہے۔ جس کی نظیر نہیں ملتی۔

قرآن مجید جو آخری وحی الٰہیہ ہے اس میں ہی صرف پیشگوئیاں نہیں بلکہ پہلی کتب سابقہ میں (گو ان میں تحریف ہو چکی ہے) پیشگوئیاں پائی جاتی ہیں۔ طوالت سے بچنے کے لیے صرف تورات کی ایک پیشگوئی جو رسول کریم ﷺ سے متعلق ہے درج کی جاتی ہے جس سے ایک عالم الغیوب ہستی کا موجود ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ تورات میں آتا ہے۔ ''خداوند سینا سے آیا۔ سعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا۔ اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔ (استثناء ۳۳:۲) سینا سے آنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہے جو سینا سے نکلا۔ سعیر سے جس کے پاس بیت لحم اور ناصرہ ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام ظاہر ہوئے جن پر سلسلہ انبیاء بنی اسرائیل ختم ہوا۔ اس کے بعد کی تمام پیشگوئی رسول کریم ﷺ سے متعلق ہے۔ خداوند فاران کی چوٹیوں سے جلوہ گر ہوا۔

عرب کے قدیم جغرافیہ نگار اور بعض مسیحی علماء کی تحقیقات سے یہ ثابت ہے کہ ''فاران'' مکہ معظمہ کے پہاڑوں کا نام ہے چنانچہ تورات سامری کا ترجمہ جسے ارکونن نے ۱۸۵۱ء میں شائع کیا۔ اس میں پیدائش ۲۱:۲۱ کے ترجمہ میں فاران کو حجاز میں بتایا ہے۔ ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں وسکن بریة فاران (الحجاز) واخذت له امه امراء ة من ارض مصر (تکوین ۲۱:۲۱) اسماعیل بیابان فاران واقع حجاز میں سکونت پذیر ہوا اور اس کی ماں نے اس کے لیے مصر سے ایک عورت لی۔ اس ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ فاران حجاز ہے۔

حبقوق نبی نے اس پیشگوئی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ''خدا جنوب سے اور وہ جو قدوس ہے کوہ فاران سے آیا۔'' (حبقوق ۳:۳)

یہاں صاف طور پر فاران کا جنوب میں ہونا بیان کیا گیا ہے اور حجاز شام کے جنوب میں ہے۔

۲۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آمد: دس ہزار قدوسیوں کی معیت نہ صرف فاران کے جائے وقوع کے متعلق فیصلہ کر دیتی ہے بلکہ پیشگوئی کے اصل مصداق کی ناقابل تردید شہادت ہے۔ دنیا کی تاریخ میں دس ہزار قدوسی فتح مکہ کے وقت صرف رسول کریم ﷺ کے ساتھ ثابت ہیں۔

اس کے داہنے ہاتھ میں آتشی شریعت ہوگی۔

یہ پیشگوئی کا آخری حصہ ہے عبرانی اور عربی دونوں زبانوں میں یمین (داہنے ہاتھ) کا محاورہ برکت بندگی۔ حکومت طاقت کا اظہار ہے اس کے داہنے ہاتھ میں آتشی شریعت ہوگی یعنی اسے مذہبی جنگ کرنے پڑیں گے۔

رسول کریم ﷺ کے متعلق پیشگوئی صرف تورات میں ہی نہیں ہے بلکہ دنیا کی تمام مذہبی کتب میں پائی جاتی ہیں جن پر علماء کرام نے بہت کام کیا۔ (سب سے بہترین کام عبدالحق ودیارتھی کا ہے۔ موصوف کی کتاب کا نام ''میثاق النبیین'' ہے۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سیرت پر بہترین کام ہے۔ اب یہ کتاب دائرہ اشاعت سے

باہر ہے اگر کوئی اشاعتی ادارہ اس کتاب کو شائع کر دے تو بہت خدمت ہوگی۔)

ظاہری خوبی: وحی الٰہی کی ظاہری خوبی اس کی عبارت میں فصاحت و بلاغت، نزاکت، لطافت و ملائمت، شیرینی اور حسن ترتیب پائی جاتی ہے اس کی مثل کوئی دوسرا شخص بنانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اس کی سب سے بڑی مثال قرآن مجید ہے۔ عہد رسول کریم ﷺ سے لے کر آج تک کے تمام فصحاء و بلغاء اس کتاب کے ظاہری حسن کے مقابل گنگ ہیں۔

باطنی خوبی: باطنی خوبی سے مراد یہ ہے اس میں ایسی روحانی تاثیر ہوتی ہے جو ہر سننے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہے گناہوں کی آگ کو سرد کرتی ہے اور ساتھ ہی نیکی کرنے کی زبردست قوت پیدا کرتی ہے۔ قرآن مجید کے نزول سے قبل عرب قوم اپنے گناہوں کی وجہ سے جس پستی کے گڑھے میں گری ہوئی تھی۔ تاریخ اس پر شاہد ناطق ہے۔ وہی قوم جو گناہوں میں لذت محسوس کرتے تھے وہی گناہوں کو چھوڑ کر نیکی کے راستہ پر چل پڑے وہ لوگ جو بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے تھے۔ وہی لوگ قرآن مجید کی روحانی تاثیر کی وجہ سے رات کے پچھلے حصہ میں باوضو ہو کر خدائے واحد کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ گویا وہ مردہ حالت سے نکل باوقار حیات نو پا گئے اور عرب سے نکل کر اکناف عالم پر چھا گئے۔ یہ کس کی برکت تھی۔ اسی وحی الٰہی (قرآن مجید) کی جو ایک قادر مطلق خدا کی طرف سے نازل کردہ تھی۔ قرآن مجید کا بے مثل اور بے عدیل معجزہ ہونا ظاہر کرتا ہے کہ کوئی قادر مطابق خدا موجود ہے۔

اسماء الٰہیہ (صفات): قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (الاعراف ۷:۱۸۰) اور اللہ کے سب اچھے نام ہیں سو ان کے ساتھ ان کو پکارو۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (بنی اسرائیل ۱۷:۱۱۰) کہہ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو پکارو جس نام سے پکارو، اس کے سب نام اچھے ہیں۔

وہ نام حسب ذیل ہیں۔

اللّٰہ. الرَّحْمٰنُ. الرَّحِيْمُ. اَلْمَلِکُ. اَلْقُدُّوْسُ. السَّلَامُ. اَلْمُؤْمِنُ. اَلْمُهَيْمِنُ. اَلْعَزِيْزُ. اَلْجَبَّارُ. اَلْمُتَكَبِّرُ. اَلْخَالِقُ. اَلْبَارِئُ. اَلْمُصَوِّرُ. اَلْغَفَّارُ. اَلْقَهَّارُ. اَلْوَهَّابُ. الرَّزَّاقُ. اَلْفَتَّاحُ. اَلْعَلِيْمُ. اَلْقَابِضُ. اَلْبَاسِطُ. اَلْخَافِضُ. الرَّافِعُ. اَلْمُعِزُّ. اَلْمُذِلُّ. السَّمِيْعُ. اَلْبَصِيْرُ. اَلْحَكَمُ. اَلْعَدْلُ. اللَّطِيْفُ. اَلْخَبِيْرُ. اَلْحَلِيْمُ. اَلْعَظِيْمُ. اَلْغَفُوْرُ. الشَّكُوْرُ. اَلْعَلِيُّ اَلْكَبِيْرُ. اَلْحَفِيْظُ. اَلْمُقِيْتُ. اَلْحَسِيْبُ. اَلْجَلِيْلُ. اَلْكَرِيْمُ. الرَّقِيْبُ. اَلْمُجِيْبُ. اَلْوَاسِعُ. اَلْحَكِيْمُ. اَلْوَدُوْدُ. اَلْمَجِيْدُ. اَلْبَاعِثُ. اَلشَّهِيْدُ. اَلْحَقُّ. اَلْوَكِيْلُ. اَلْقَوِیُّ. اَلْوَلِیُّ. اَلْحَمِيْدُ. اَلْمُحْصِی. اَلْمُبْدِی. اَلْمُعِيْدُ. اَلْمُحْيِ. اَلْمُمِيْتُ. اَلْحَیُّ. اَلْقَيُّوْمُ. اَلْوَاجِدُ. اَلْمَاجِدُ. اَلْوَاحِدُ. الصَّمَدُ. اَلْقَادِرُ. اَلْمُقْتَدِرُ. اَلْمُقَدِّمُ. اَلْمُؤَخِّرُ. اَلْاَوَّلُ. اَلْاٰخِرُ. اَلظَّاهِرُ. اَلْبَاطِنُ. اَلْوَالِیُ. اَلْمُتَعَالِی. اَلْبَرُّ. التَّوَّابُ. اَلْمُنْتَقِمُ. اَلْعَفُوُّ. الرَّؤُفُ. مَالِکُ الْمُلْکِ. ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ. اَلْمُقْسِطُ. اَلْجَامِعُ. اَلْغَنِیُّ. اَلْمُغْنِیُّ. اَلْمُعْطِی. اَلْمَانِعُ. اَلضَّارُّ. اَلنَّافِعُ. النُّوْرُ. اَلْبَدِيْعُ. اَلْبَاقِی. اَلْوَارِثُ. الرَّشِيْدُ. الصَّبُوْرُ.

مذکورہ اسماء حسنہ قرآن مجید میں انہی الفاظ میں بعینہ موجود ہیں اور جو موجود نہیں ان کے مادے اور مشتقات پائے جاتے ہیں۔

صفات الٰہیہ پر نظام جسمانی کا مدار: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جن ننانوے صفات کا ذکر آیا ہے انہی صفات کا ظہور اس کائنات میں ہے۔ کہیں صفت ربوبیت کا ظہور ہے کہیں صفت رحمانیت اور صفت رحیمیت کا ظہور ہے۔ کہیں صفت غفاریت جلوہ گر ہے کہیں صفت رؤفیت جلوہ افروز۔ تمام کائنات کی پیدائش صفت خالقیت اور بدیعت کا عکس ہے۔ انہی صفات کے ذریعہ معرفت الٰہیہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ننانوے اسماء کا بار بار ذکر کیا ہے تاکہ انسان خدا کے حسن اور احسان پر اطلاع پائے اور اس کے دل میں خدا کی محبت پیدا ہو کیونکہ انسان کی فطرت میں ہے کہ جب بھی کوئی حسین چیز دیکھتا ہے تو اس کا دل اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس طرح جب کسی انسان پر کسی کا احسان ہوتا ہے تو انسان طبعی طور پر اپنے محسن سے محبت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات اللہ تعالیٰ کے حسن اور احسان کو ظاہر کرتی ہیں۔ قرآن مجید میں دو الگ کی صفات بیان ہوئی ہیں۔ تشبیہی اور تنزیہی، تشبیہی وہ صفات ہیں جو استعارہ کے طریق پر انسان کی صفات کی ہم شکل نظر آتی ہیں مثلاً سمیع، بصیر، علیم وغیرہ۔ انسان سماعت کے لیے کان اور ہوا کا محتاج ہے۔ بصارت کے لیے آنکھ اور روشنی کا۔ علم کے لیے حواس اور عقل کا۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہے اور اپنی صفات کے ظہور کے لیے کسی چیز کا محتاج نہیں۔ اسماء میں اشتراک محض انسان کو صرف اللہ کی معرفت دینا مقصود ہے۔ یہ اشتراک بلا کیف ہے۔ یعنی یہ اشتراک محض نام میں ہے کیفیت میں نہیں۔ انسان اشتراکی صفات کی کہنہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے قرآن مجید میں آتا ہے۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (الشوریٰ ۴۲:۱۱) اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔ یہاں مثل بمعنی صفت ہے یعنی اس کی صفت جیسی کوئی صفت نہیں اور اس میں یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ اللہ کی صفات میں ایسی باتیں نہ کی جائیں جن کے ساتھ انسان کی صفات کو بھی بیان کیا جاتا ہے

لیکن یہ صفات اس طرح کی نہیں جس طرح انسان میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا انسان کی صفات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری قسم تنزیہہ ہے۔ تنزیہہ کے معنی پاک کرنا ہے۔ علم الکلام کی اصطلاح میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ مخلوق کی صفات کا اثبات خدا کی ذات میں نہیں کیا جا سکتا اور ابن عربی اس سے درائیت مراد لیتے ہیں۔[1] جیسا کہ صفت صمد اور الفاظ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ظاہر کرتے ہیں۔

تشبیہی صفات کی تین اقسام ہیں۔ صفات جمالی، صفات جلالی اور صفات کمالی۔

صفات جمالی: وہ صفات ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کا رحم و کرم وعفو ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً اَلرَّحِيْم بار بار رحم کرنے والا۔ اَلْوَدُوْد بہت پیار کرنے والا۔ اَلرَّحْمٰن بے حد رحم کرنے والا۔ بغیر مانگے اور بغیر محنت عطا کرنے والا۔ الرب پرورش کرنے والا۔ اَلْوَهَّاب عطا کرنے والا۔

صفات جلالی: جن سے اللہ تعالیٰ کا جلال جبروت حکومت اور غلبے کا اظہار ہو۔ مثلاً اَلْجَبَّار ''جبروت والا'' اَلْعَزِيْز'' غالب جس پر کوئی دسترس نہ پائے۔ اَلْمُنْتَقِمْ ''سزا دینے والا'' برائیوں کی جزا دینے والا۔ شَدِيْدُ الْعِقَاب ''سخت سزا والا''۔ اللہ تعالیٰ کے جلالی ناموں سے ایک شبہ ہو سکتا ہے اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (آل عمران) بے شک اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ یہ صفات اپنے اندر احسان کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ یہ صفات انسان کو بدی کے ارتکاب سے روکتی ہیں کیونکہ بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں جو خوف سے مانتی ہیں۔ دنیا میں جتنے بھی دستور ہیں ان سب میں قانون کو توڑنے والوں کے لیے سزائیں مقرر کی ہیں اگر سزائیں مقرر نہ کی جائیں تو دنیا فساد کا گھر بن جائے۔ جرائم روکنے کے لیے ضروری ہے کہ سزائیں مقرر کی جائیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان انسانوں کو جو اللہ کے قوانین کو توڑتے ہیں انھیں جلالی صفات سے ڈرایا ہے۔

صفات کمالی: جن صفات نے اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ بلندی کمالات کی جامعیت اور ہر قسم کے اوصاف حسنہ اور محامد عالیہ کا ثبوت ملتا ہے مثلاً اَلْوَاحِدُ (ایک) اَلْاَحَدُ (ایک) اَلْحَيُّ (ہمیشہ زندہ اور دوسروں کو زندہ بخشنے والا) اَلْبَاقِي (جس کو ہمیشہ بقا ہو) اَلْحَكِيْمُ (حکمت والا)

ذات اور صفات: جس طرح اللہ تعالیٰ کی تشبیہی اور تنزیہی صفات کے بارے حکماء اسلام کا اختلاف تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے باہمی تعلق کے بارے میں اختلاف ہے۔ شیخ الاسلام ابن عربی کے نزدیک ذات اور صفات عین یکدیگر ہیں اور صفات کا ظہور تجلیات کی صورت میں ہوتا ہے جو عالم اور اس کے اشیاء میں ہے۔ (شرح فصوص قاشانی ص ۱۴۳ متن نصوص)۔

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی صفات الٰہیہ کو زائد علی الذات گردانتے ہیں۔ (مکتوبات دفتر سوم مکتوبات ۲۶، ۱۰۰، ۱۱۰)

مجھے دونوں شیوخ کے نظریات پر ناقدانہ بحث کرنا مقصود نہیں۔ دراصل یہ اختلاف دونوں شیوخ کے روحانی مدارج میں اختلاف کی وجہ سے نظر آتا ہے۔ جس کا مختصر تذکرہ مسئلہ وجودیت اور شہودیت کے ضمن میں کیا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات اللہ تعالیٰ کی ذات میں بالقوہ ہمہ وقت موجود ہیں اور بالفعل اسی وقت ہوتی ہیں۔ جب وہ ارادہ کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ یعنی وہ کرنے والا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ یعنی اس کا امر یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔

محض اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہی اس چیز کو نیست سے وجود میں لے آتا ہے۔ اسلام کا خدا قادر مطلق خدا ہے۔ وہ اپنے ارادہ سے نیست سے ہست اور ہست سے نیست کر سکتا ہے۔

بعض تشبیہی صفات کی تاویل: حکماء اسلام کا اس بارہ میں بھی اختلاف ہے۔ خصوصاً حضرت امام احمد بن حنبل امام رازی اور ابوالحسن اشعری وغیرہ لیکن تاویل کو ناجائز بھی نہیں سمجھتے۔ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں۔ فَلِهٰذَا التَّحْقِيْقِ الْمَتِيْنِ مَذْهَبُنَا اِنَّ بَعْدَ اَقَامَةِ الدَّلَالَةِ الْقَطِيْعَةِ عَلٰى اِن حمل اللفظ عَلٰى الظَّاهِرِ مَحَالٌ لَا يَجُوْزُ الْخَوْضُ فِي تَعْيِيْنِ التَّاوِيْلِ (تفسیر کبیر ج ۲ ص ۹۶، ۹۷) اس واضح تحقیق کے بعد ہمارا مذہب یہ ہے کہ یقینی دلیل قائم کرنے کے بعد کہ لفظ کا ظاہری معنی پر محمول کرنا محال ہے۔ تاویل کی تعیین میں غور و فکر نہیں کرنا چاہیے۔ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کی تفسیر میں رقمطراز ہیں۔

ان نقطع بكونه تعالىٰ متعاليا عن المكان والجهة ولا نخوض فى تاويل الاية على التفصيل بل نفوض علمها الى الله وهو الذى قراناه فى تفسير قوله وما يَعْلَمُ تَاوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ. وهذا المذهب هو الذى نختاره ونقول به ونعمد عليه. (تفسیر کبیر ج ۴ ص ۳۳۴) ہم یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مکان اور جہت سے پاک ہے لیکن باوجود اس کے ہم آیت کی تاویل میں غور و فکر نہیں کرتے بلکہ اس

[1] عہد بنو عباس میں اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں شدید اختلافات رہے ہیں، دو مشہور کلامی گروہ تھے۔ اشعری اور معتزلہ

کے علم کو بحوالہ خدا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر مایعلم تاویلہ الا اللّٰہ والراسخون فی العلم یقولون امنا بہ ہم نے یہی طریقہ پسند کرتے ہیں اس کے قائل ہیں اور اس پر اعتماد رکھتے ہیں۔ امام غزالیؒ الجام العوام میں لکھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں قیاس اور تفریع سے کام نہیں لینا چاہیے۔ (ص ۱۶)

باوجود متشابہات کی تاویلات کرنے کے حق میں نہیں تھے لیکن اس کو ناجائز بھی خیال نہیں کرتے تھے۔ سب سے زیادہ مخالف امام احمد بن حنبل تھے لیکن تین حدیثوں کی تاویل کی ہے۔ حجر اسود زمین میں خدا کا ہاتھ ہے۔

۲۔ ''مجھ کو یمن کی طرف سے خدا کی خوشبو آتی ہے۔'' ''جو شخص مجھ کو یاد کرتا ہے میں اس کا ہم نشین ہوتا ہوں۔'' حدیث میں ہے ''قیامت کے دن سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران بادل کی شکل میں آئیں گی۔'' امام احمد بن حنبل نے ان سورتوں کو پڑھنے والے کا ثواب مراد لیا ہے۔ یہ واضح تاویل ہے۔

علماء ربانی نے اس دور کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر تشبیہی صفات کی تاویل کرنے سے گریز کیا تھا۔ اس دور میں صفات الٰہیہ پر کئی فرقے معرض وجود میں آ گئے تھے۔ دوراز کار تاویلات کرنی شروع کر دی تھیں۔ جو گمراہی کا باعث تھا۔ ان حکماء ربانی نے سلف کا طریقہ اختیار کیا لیکن اس ناپسندیدگی کے باوجود تاویل کو ناجائز قرار نہیں دیا ساتھ تاویل سے کام لینے والے پر تکفیر نہیں کی۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں محکمات اور متشابہات آیات میں ہیں۔ حکماء اسلام نے قرآن مجید میں ان ہر دو اقسام کی آیات پائے جانے کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اور یہی قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کی علامت ہے۔ جس کی نظیر کوئی دوسرا نہیں لا سکتا۔

''ید'' کی تاویل: قرآن مجید میں ایک لفظ ''ید'' اللہ تعالیٰ کے لیے آتا ہے۔ جس کے معنی ہاتھ کے ہیں۔ لیکن عربی زبان میں لفظ ''ید'' بطور استعارہ نعمت حفاظت اور ملک کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ ''ید'' آیا ہے۔ وہاں نعمت یا حفاظت کے ہیں (امام راغب) نہایہ میں ید کے معنی دفاع اور حفاظت کے آئے ہیں اس کی تائید میں ایک حدیث بیان کی ہے۔ لَا یَدان لِاَحَدٍ بِقِتَالِھِمْ یعنی کسی شخص کو ان (یاجوج ماجوج) سے لڑنے کی طاقت نہیں ہوگی۔

''وجہ'' کی تاویل: وجھ کے معنی منہ کے ہیں چونکہ وجھ سب سے پہلے سامنے آنے والی چیز ہے۔ ظاہر بدن میں سب سے اشرف ہے اس لیے ہر سامنے آنے والی اور ہر اشرف چیز پر اور اس کے آغاز پر اس کا استعمال ہوتا ہے اور بسا اوقات وجھ کہہ کر ذات یعنی خود وہ چیز مراد لی جاتی ہے اور اس کے معنی توجہ بھی ہیں۔ (امام راغبؒ)

قرآن مجید میں جو آتا ہے۔ کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَهٗ (القصص ۲۸:۸۸) ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس (اللہ تعالیٰ) کی ذات کے۔

حضرت امام رازی نے یہ تاویل کی ہے کہ تمام حیز اور جہت ایک دن فنا ہو جائیں گے صرف خدا کی ذات باقی رہ جائے گی۔

حضرت ابن عباس سے بھی اس کی یہی تفسیر روایت کی گئی ہے کہ ہر زندہ چیز مرنے والی ہے یعنی باقی سب زندوں پر موت آنے والی ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی ذات ہے جس پر موت نہیں آ سکتی۔

قرآن مجید میں بھی ''وجھ'' کو ذات کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ. (طٰہٰ ۲۰:۱۱۱) زندہ قائم خدا کے سامنے بڑے بڑے سردار ذلیل ہو جائیں گے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ نَطْمِسُ وُجُوْھًا (النساء ۴:۴۷) ہم ان کے سرداروں کو مٹا دیں گے۔

ان دونوں آیات میں وجوہ کے معنی چہرے مراد نہیں بلکہ سردار اور اشراف ہیں وجھ القوم یعنی قوم کے سردار۔ وفلان وجھہ القوم کعینھم وراسھم. (امام راغب)

عربی میں وجھ کا لفظ صرف چہرہ کے لیے ہی استعمال نہیں ہوتا بلکہ اشراف کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اس لیے جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف استعمال ہوگا تو اس کے معنی اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہے۔

کشف ساق کی تاویل: کشف ساق کے الفاظ قرآن مجید میں دو جگہ استعمال ہوئے ہیں ملکہ سبا کے متعلق وَکَشَفَتْ عَنْ سَاقَیْھَا (النمل ۲۷:۴۴) دوسری جگہ القلم ۶۸:۴۲ میں یہ الفاظ ہیں۔ ''یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ. یُکْشَفُ فعل مجہول کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ فاعل کا ذکر نہیں۔ عربی زبان ساق کے معنی پنڈلی کے ہیں۔ لیکن عربی محاورہ میں کشف ساق شدید امر کے ظاہر ہونے پر بولا جاتا ہے۔ صحابہ اور تابعین نے یہی معنی کیے ہیں کہ امر شدید ظاہر ہوگا۔ حضرت ابن عباس سے بھی یہ معنی مروی ہیں کہ سخت امر کھل جائے گا۔ حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ زمانہ جاہلیت میں یہ لفظ انہی معنی میں مستعمل تھا۔

استوا علی العرش کی حقیقت: قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (الاعراف

۷:۵۴) تمہارا پروردگار وہ خدا ہے جس نے زمین آسمان کو چھ دن میں پیدا کیا پھر اس نے عرش پر قرار پکڑا۔

یہ آیت بھی قرآن مجید کے مشکلات اور متشابہات میں شامل ہے بعض معترضین نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کے بارے میں قرآنی روح کو بالائے طاق رکھ کر اللہ کے جسم ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

بعض مفسرین نے استویٰ علی العرش سے مراد نفاذ امر لیا ہے کیونکہ استویٰ کے بعد علیٰ آیا ہے جو غلبہ اور استیلا پر دلالت کرتا ہے۔امام راغب نے استویٰ علی العرش سے مراد غلبہ سلطان اور مملکت لیا ہے۔

اس طرح شیخ اکبر ابن العربی نے بھی فتوحات مکیہ میں عرش کے معنی بادشاہی اور ملک کیے ہیں۔

لہٰذا استویٰ علی العرش کے معنی نفاذ امر ہے اس کی تائید خود قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے سورہ یونس میں آیا ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یہاں استویٰ علی العرش کی وضاحت خود یدبر الامر سے فرمادی یعنی تدبیر امور کرتا ہے۔

اگر استویٰ علی العرش پر تشبیہی اور تنزیہی صفات کی روشنی میں غور کیا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی تنزیہی صفت ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ ذوالعرش المجید گویا اللہ تعالیٰ کے کمال علو کو عرش کے لفظ سے تعبیر کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی تشبیہی صفات کے اظہار (یعنی کائنات کی تخلیق) کے بعد پھر تنزیہی صفات کے ثابت کرنے کے لیے مقام تنزہ اور تجرد کی طرف رخ کیا جو وراء الوراء تنزہ اور تقدس کا مقام ہے۔ قرآنی اصطلاح میں اس کو عرش کہا گیا۔ جس کی کہنہ انسانی عقل سے بلند ترین ہے۔

''استویٰ علی العرش'' کی دوسری توجیہی کی رو سے یہ ایک تنزیہی صفت ہے دونوں تاویلات عربی زبان اور قرآن مجید کی روح کے مطابق ہیں۔ دونوں تاویلات اللہ تعالیٰ کی صفت کمالیہ کو ظاہر کرتی ہیں۔

اس طرح وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (اس کا علم آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے) کے متعلق غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ اس کو کوئی مادی چیز خیال کیا جاتا ہے۔ لفظ کرسی کے معنی علم کے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے یہی معنی کیے ہیں۔ (تفسیر بیضاوی ۲:۲۵۵) ابن جریر کے نزدیک کرسی کا اصل مفہوم علم ہے۔ جس صحیفہ میں علم کی بات لکھی ہوئی ہو اس کو کراستہ کہا جاتا ہے اس وجہ سے علماء کو کراسی (کرسی کی جمع) کہا جاتا ہے۔ زمخشری نے قطرب سے ایک ضرب المثل بیان کی ہے۔ خیر هذا الحیوان الاناسی و خیر الاناسی الکراسی (تاج العروس) حیوانوں میں سے سب سے بہتر انسان ہیں اور انسان میں سب سے بہتر علماء۔

دنیا میں خدا تعالیٰ کے عرش کو چار اور قیامت میں آٹھ فرشتوں کے اٹھانے کی حقیقت

ہر زبان میں استعارات، کنایات سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ زبان کا حسن ہیں۔ جتنے استعارات اور کنایات عمدہ انداز میں کسی نثری عبارت میں بیان کیے جائیں گے وہ عبارت اتنی ہی فصاحت و بلاغت کی بلندیوں کو چھوئے گی۔

عربی ام الالسنہ ہے۔ اس کے الفاظ میں بہت ہی وسعت ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آخری کلام عربی زبان میں نازل فرمایا۔ جو اپنے اندر معجزاتی رنگ لیے ہوئے ہے۔ جس طرح لفظ عرش اللہ تعالیٰ کے مقام علو کے لیے استعارہ ہے اس طرح چار فرشتوں کا عرش کو اٹھانا بھی ایک استعارہ ہے۔ کائنات رب، رحمٰن، رحیم اور مالک یوم الدین چار صفات الٰہیہ کی مظہر ہے۔ کائنات میں خدا کا کوئی فعل ان چار صفات سے باہر نہیں اور یہ چاروں صفات خدا تعالیٰ کی پوری صورت کو دکھلاتی ہیں اس لیے ان صفات کو ام الصفات کہا گیا ہے۔ ان صفات پر چار ملائکہ موکل ہیں۔ جو دنیا میں ان صفات کی جلوہ نمائی اللہ کے حکم سے کر رہے ہیں چونکہ اللہ تعالیٰ کے ان چار صفات کی جلوہ نمائی چار فرشتوں کے ذریعے ہو رہی ہے۔ اس لیے کنایہ کے طور پر ان کو حاملین عرش کہا گیا ہے۔

یہ چاروں صفات اللہ تعالیٰ کے نہاں در نہاں وجود پر شاہد ناطق ہیں اور یہی چار صفات عالم آخرت میں دو چند ہو جائیں گی۔ یعنی ان کا ظہور دو چند ہو جائے گا تو کنایہ کی زبان میں یہ کہا گیا ہے کہ آخرت میں بجائے چار کے آٹھ فرشتے اٹھائیں گے۔

<u>عقیدہ توحید:</u> قرآن مجید کا محور اور عمود ایمان باللہ ہے اور ایمان باللہ کے کونے کا پتھر توحید ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات، صفات اور افعال میں یکتا، بے مثل، بے عدیل ماننا۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (النحل ۱۶:۶۰) اللہ کی صفت نہایت بلند ہے وہ غالب حکمت والا ہے۔
دوسری جگہ آتا ہے وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (اعراف ۷:۱۸۰) اور اللہ کے سب نام اچھے ہیں اور ان کے ساتھ اس کو پکارو۔
شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (آل عمران ۳:۱۸) اللہ گواہی دیتا ہوں کہ

اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور صاحب علم بھی انصاف پر قائم ہو کر۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں غالب حکمت والا ہے۔
اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (البقرہ ۲:۲۵۵) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے۔
ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (بقرہ ۲:۱۶۳) تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ رحمان اور رحیم ہے۔
اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا۔ اِنَّنِیْۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ (طٰہٰ ۲۰:۱۴) صرف میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری ہی عبادت کرو۔
نبی کریم ﷺ سے فرمایا۔ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (محمد ۴۷:۱۹) پس جان لے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔
هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (الحشر ۵۹:۲۲) وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ غیب اور حاضر جاننے والا ہے۔ وہی بے انتہا رحم والا بار بار رحم کرنے والا ہے۔
قرآن مجید میں توحید پر جامع مانع الفاظ میں ایک پوری سورۃ اخلاص ہے۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (اخلاص ۱.....۴) کہہ دیجئے کہ وہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا اور کوئی بھی اس کا ہمسر نہیں حدیث میں اسلام کی عمارت کے پانچ ستونوں میں پہلا ستون لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) قرار دیا ہے۔

قرآن مجید میں توحید کے مراتب: توحید کا پہلا مرتبہ صرف یہ ہے کہ غیر اللہ کی عبادت نہ کی جائے یہ مرتبہ عوام کے لیے ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچنا چاہتے ہیں۔
دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ انسان اپنے تمام کاموں میں فاعل حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہی کو سمجھے اور ظاہری اسباب پر ہی تکیہ کر کے شرک فی الصفات کا مرتکب نہ ہو۔ یہ مرتبہ خواص کے لیے ہے۔
تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ جب انسان اللہ کی محبت میں اپنے آپ کو فنا کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بن جاتا ہے اور اس کے افعال سے اللہ تعالیٰ کی صفات کا ظہور ہوتا ہے یہ مرتبہ خاص الخواص کے لیے ہے جو اللہ کے سائے کے نیچے اپنی زندگی بسر کر کے قرب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔
توحید کا یہ مرتبہ بہت ہی مجاہدات اور نفس کی سرکش اونٹنی کو ذبح کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے جب انسان اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ شیطان کے حملوں سے محفوظ ہوتا ہے کیونکہ وہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے جوار میں زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔ جہاں شیطان کا گزر تک نہیں۔

توحید کی اقسام: توحید کو چار اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ توحید فی الذات: اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات میں یکتا اور لاشریک تسلیم کرنا جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (اخلاص ۱۱۲:۱) کہہ دیجئے کہ اللہ ایک ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِیْمًا (النساء ۴:۴۸) اور جس نے خدا کا شریک ٹھہرایا اس نے بڑا جھوٹ گھڑا اور سخت گناہ کی بات کی۔

۲۔ توحید فی الصفات: اللہ تعالیٰ کو اس کی صفات میں یکتا اور لاشریک سمجھنا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (شوریٰ ۴۲:۱۱) اس کی مثل کوئی شے نہیں۔ خدا کی صفات میں کوئی چیز برابر نہیں ہو سکتی اللہ تعالیٰ اپنی صفات میں بے مثل بے عدیل ہے۔

۳۔ توحید فی العبادت: اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ ۲:۲۱) اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور ان کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں تا کہ تم میں خدا خوفی پیدا ہو۔ سورہ فاتحہ میں آتا ہے۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ہم صرف تری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔

۴۔ توحید فی الافعال: اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں یکتا ہے اس کے افعال کی یکتائی اللہ کے وجود پر دلالت کرتی ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انسان کو کائنات میں غور وفکر کی دعوت ہے۔
ارشاد الٰہی ہے۔ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ (النمل ۲۷:۸۸) یہ کائنات اس اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو مضبوط (نظام) پر بنایا ہے۔
پھر ارشاد ہے۔ مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ (ملک ۶۷:۳) تو رحمٰن کی پیدائش میں کوئی اختلاف

نہیں پائے گا۔ پھر نظر کو لوٹا (کیا) کوئی خلل اور بگاڑ دیکھتا ہے۔

شرک کا رد: اللہ تعالیٰ نے جہاں توحید الٰہی کے ہر گوشہ کی وضاحت کی ہے وہاں ہر قسم کے شرک کی تردید کی ہے کیونکہ شرک تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے۔

شرک کا مطلب اللہ تعالیٰ کی الوہیت سے انکار نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ساتھ کسی اور کو بھی اِلٰہ بنانے کا نام شرک ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مختلف انداز اور طریقوں سے تردید کی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (لقمان ۱۳:۳۱) یعنی شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدِ افْتَرٰٓی اِثْمًا عَظِیْمًا (النساء۴:۴۸) اور جس نے اللہ کا شریک ٹھہرایا اس نے بہت بڑا جھوٹ گھڑا۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ قُلْ سَمُّوْھُمْ اَمْ تُنَبِّئُوْنَہٗ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی الْاَرْضِ اَمْ بِظَاھِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ (الرعد۱۳:۳۳) اور لوگوں نے اللہ کے کچھ شریک ٹھہرا رکھے ہیں ان سے کہہ دیجئے ذرا ان کے نام تو بتاؤ یا پھر تم خدا کو ایسی بات بتانا چاہتے ہو جسے وہ اپنی زمین میں خود نہیں جانتا یا تم لوگ بس یونہی جو منہ میں آیا کہہ دیتے ہو۔

وَمَنْ یَّدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ لَا بُرْھَانَ لَہٗ بِہٖ (المومنون۲۳:۱۱۷) اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارتا ہے تو اس کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (الحج۲۲:۳۱) اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا۔

آسمان سے مراد فطرت کی بلندی ہے یعنی شرک انسان کو فطرت کی بلندیوں سے نیچے گرا دیتا ہے اور وہ مخلوقات کے سامنے سر نیاز جھکانے لگتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (النساء۴:۴۸) بے شک اللہ تعالیٰ اس جرم کو معاف نہیں کرتا کہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے علاوہ جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہے معاف کر دیتا ہے۔

شرک کی مختلف صورتیں قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (آل عمران ۳:۶۴) کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

اس آیت میں شرک کی تین صورتیں بیان کر کے ان کی نفی اور تردید کی ہے۔

۱۔ خدا کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کی جائے۔
۲۔ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔
۳۔ کسی دوسرے کو اپنا رب نہ ٹھہرایا جائے۔

شرک کی چوتھی صورت سورہ فرقان میں بیان ہوئی ہے کہ انسان اپنی خواہشات کو معبود نہ بنائے۔ ارشاد الٰہی ہے اَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰہُ (الفرقان ۲۵:۴۳) کیا تو نے اسے دیکھا جو اپنی خواہش کو معبود بناتا ہے۔

قرآن مجید نے جہاں شرک کو ظلم عظیم قرار دے کر شرک کا رد کیا ہے وہاں مذاہب عالم کے مشرکانہ عقائد کا بھی رد کیا ہے جو رائج تھے۔

عقیدہ ثنویت کا رد: یہ عقیدہ زرتشت مذہب کا ہے وہ دو خدا اہرمن اور یزدان کے قائل تھے۔ اس کے رد میں قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَقَالَ اللّٰہُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰھَیْنِ اثْنَیْنِ اِنَّمَا ھُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ (النحل۱۶:۵۱) اور اللہ نے کہا دو معبود مت بناؤ اکیلا ہی معبود ہے۔

عقیدہ تثلیث کا رد: یہ عقیدہ عیسائیوں کا ہے اس کے رد میں قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَۃٌ اِنْتَھُوْا خَیْرًا لَّکُمْ اِنَّمَا اللّٰہُ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ (النساء۴:۱۷۱) پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مت کہو تین (خدا) ہیں اس عقیدہ سے رک جاؤ تمہارے لیے بہتر ہے اللہ صرف ایک ہی معبود ہے۔

عقیدہ ابنیت کا رد: یہ یہود اور عیسائیت کا عقیدہ ہے۔ یہود نے عزیر کو اللہ کا بیٹا بنا لیا ہے اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔ اس کے رد میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَا یَنْبَغِیْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا (مریم۱۹:۹۲) خدائے رحمان کی یہ شان نہیں کہ وہ بیٹا بنائے۔

روح و مادہ کی ابدیت کے عقیدہ کا رد: یہ عقیدہ ہندو مذہب کا ہے اس کی رو سے خدا کی صفات میں شرک لازم آتا ہے۔ سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کو رب العالمین کہا گیا ہے رب کا لفظ استعمال کر کے یہ بتایا ہے کہ اللہ کی ذات اور صفات میں کوئی شریک نہیں وہ مادہ اور روح کا بھی رب ہے۔ اس وجہ سے یہ کسی صفات میں شریک نہیں ہو سکتے۔

اللہ کی ایک صفت الاوّل ہے جس کا مطلب یہ ہے کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ازلی نہیں ہوسکتی اور تمام اشیاء اس کی تخلیق ہیں اور اس نے ہی ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔ پیدا کی ہوئی چیز اللہ کے ساتھ اول الاوّل نہیں ہوسکتی۔

وحدت الوجود اور وحدت الشہود: وحدت الوجود اور وحدت الشہود دو تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ وحدت الوجود کے امام صوفیاء میں سے شیخ اکبر ابن عربیؒ ہیں جبکہ وحدت الشہود کے امام حضرت مجدد الف ثانیؒ ہیں۔ نظریہ وحدت الوجود شیخ اکبر کے علم کلام کا عمود اور محور ہے اور جید علماء نے وحدت الوجود پر سخت الفاظ میں تنقید کی ہے۔ یہاں تک کہ حضرت شیخ اکبر پر کفر کا فتویٰ لگانے سے بھی نہیں رکے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب ایک لفظ خاص مفہوم میں مستعمل ہوتا آ رہا ہو۔ وہی لفظ علم کی کسی دوسری شاخ میں پہلے مفہوم سے ذرا ہٹ کر دوسرے مفہوم میں استعمال ہو۔ تو وجہ نزاع بن جاتا ہے۔ یہی سبب شیخ اکبر کے کلام میں وحدت الوجود کی اصطلاح کے ساتھ ہوا ہے اسلامی ادب میں توحید کا مفہوم یہ لیا جاتا تھا کہ اللہ وہ ہستی ہے جو وراء الوراء ہے اور جس کی ذات اور صفات اور افعال میں کوئی شریک نہیں۔ کائنات اسی کی تخلیق ہے۔ انسان عبد ہے اور وہ معبود۔ جب اس مفہوم کو بدل دیا جائے اور موجودات کو محض عدم قرار دے کر کہا جائے کہ اللہ ہی اللہ ہے اور کوئی چیز نہیں اور وہ موجودات اور کائنات میں ساری ہے اور اس کی نسبت موجودات اور کائنات کے ساتھ عینیت کی نسبت ہے تو کلامی نزاع شروع ہو جائے گا۔ اسلام میں تقریباً تمام نزاع کسی لفظ کے متداول معنیٰ کو چھوڑ کر دوسرے مفہوم میں استعمال کرنے کی وجہ سے ہوئے ہیں۔ خصوصاً تصوف میں صوفیاء کرام نے اپنے روحانی منازل کے تحت الفاظ کے متداول معانی ترک کر کے الفاظ کی اچھوتی اور بلیغ تعبیر کی ہے وحدۃ الوجود (ہمہ اوست) کی اصطلاح اسی زمرہ میں آتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صوفیاء کرام اپنی روحانی منازل کو الفاظ کا جامہ پہنا رہے ہوتے ہیں۔ جب صوفیاء کرام کی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ سلوک کے تین منازل ہیں۔ وجودیت ظلیت اور عبدیت۔ سلوک کی پہلی منزل میں سالک کو وحدت الوجود کا کشف حاصل ہوتا ہے یعنی خدا اور انسان اور عالم میں امتیاز مٹ جاتا ہے۔ سالک خدا کی محبت میں اتنا گم ہو جاتا ہے کہ اس کی نظر میں اللہ کی ذات کے سوا کچھ اور ہے ہی نہیں۔ ہر جہت اور سمت میں اللہ ہی اللہ نظر آتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ ایک لوہے کے ٹکڑے کو آگ میں ڈال دیا جائے تو کچھ وقت کے بعد وہ ٹکڑا آگ کی شکل اختیار کر جاتا ہے اور آگ اور لوہے میں امتیاز مٹ جاتا ہے حقیقت میں لوہا کا ٹکڑا الگ چیز ہے اور آگ الگ۔ لیکن آگ کے غلبے نے ٹکڑے کو دوسری شکل دے دی ہے۔ یہی حالت ایک سالک کی ہے۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ میں داخل ہوتا ہے تو اللہ کی محبت اس پر اس قدر غلبہ حاصل کر لیتی ہے تو اس کی نظر میں ماسوا اللہ معدوم ہو جاتا ہے ہر طرف اللہ ہی اللہ نظر آتا ہے۔ اس حالت غلبہ کو جاننا کوئی مشکل نہیں شیخ مصلح الدین شیرازی نے خوب کہا ہے۔

نہ از چینم حکایت کن نہ از روم + کہ دارم دلستانے اندریں بوم
چو روئے خوب او آید بیادم + فراموشم شود موجود و معدوم

حضرت شیخ اکبر کی روحانی منزل کا یہ مقام تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں اتنے گم ہو گئے کہ اللہ کی ذات کے سوا سب کچھ بھول گئے۔ منصور کی طرح انا الحق کہہ دیا اور تمام عالم میں اللہ کو ساری قرار دے دیا۔ دراصل یہ ایک روحانی مقام ہے جہاں اللہ کی محبت میں اپنے وجود کو ختم کر دیا جاتا ہے بھلا یہ ہوسکتا ہے کہ شیخ اکبر جیسا موحد آدمی ماسوا اللہ کو اللہ قرار دے دے۔ دراصل یہ ایک روحانی مقام ہے۔ صرف اتنی بات ضرور ہے کہ شیخ اکبر پہلی سلوک کی منزل وجودیت پر قناعت کر گئے اور دوسری منزل میں قدم نہ رکھا۔ دوسری سلوک کی منزل ظلیت کی ہے جہاں سالک خدا اور مخلوق کے درمیان امتیاز کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی ذات جاری ساری نہیں بلکہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی صفات کا ظل ہیں اور تمام مخلوقات اور موجودات کو اللہ کی صفات کا اظلال قرار دیتا ہے اور انہی اظلال سے خدا کی ہستی ظاہر ہوتی ہے کیونکہ اصل ہوگا تو ظل ہوگا۔ اگر اصل نہیں تو ظل کہاں۔ اصل اور ظل لازم ملزوم ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ حضرت علاء الدولہ سمنانی اور حضرت ابوالحسن خرقانی اور حضرت مجدد الف ثانی اسی مرتبہ پر فائز تھے جن کی کتب میں توحید شھودی (ہمہ از اوست) کی جھلک آتی ہے اور توحید وجودی پر ناقد نظر آتے ہیں۔

تیسرا مقام عبدیت کا ہے یہ ولایت کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔ جہاں خدا اور مخلوقات جدا جدا نظر آتے ہیں۔ تصوف میں اس مقام کی دوسری اصطلاح فرق بین الجمع ہے۔ ولی اپنے پہلے دونوں مکشوفات کو محض ایک کیفیت سمجھتا ہے اور ان کو مبنی بر حقیقت نہیں سمجھتا اور یہ سمجھنا شروع کر دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی انسانی قوائے عقلیہ اور کشفیہ کی دسترس سے بالاتر ہے وہ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہستی ہے۔ صاحب ولایت اس مقام پر پہنچ کر یہ کہتا ہے کہ ایمان بالغیب ہی حق ہے۔ سو وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں کوئی فرق نہیں اور نہ تناقض ہے۔ یہ محض روحانی منازل کی کیفیات ہیں۔ جب ایک سالک ایک منزل سے نکل کر دوسری روحانی منزل میں قدم رکھتا ہے تو وہ پہلی کیفیت کو چھوڑ دیتا ہے اسی طرح جب دوسری حالت سے گزر کر تیسری حالت میں داخل ہوتا ہے تو دوسری حالت کو ترک کر دیتا ہے۔

یہ روحانی منازل محض اتباع رسول ﷺ سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس لیے امت مسلمہ کو خیرالامم قرار دیا گیا ہے اسلام کو ایک زندہ دین رسول کریم ﷺ کو زندہ نبی اور اسلام کے خدا کو زندہ خدا کہا گیا ہے اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو خدا نمائی کا وسیلہ ہے اور اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو تمام سابقہ مذاہب کی سچائیوں کا مجموعہ ہے اور ان کی سچائیوں پر گامزن ہونے سے فلاح حاصل ہوتی ہے۔

فلسفہ ایمان باللہ

ایمان باللہ کی ایک طرف علمی حیثیت ہے۔ جس کا ذکر کیا جا چکا ہے تو دوسری طرف یہ عقیدہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اثرانداز ہوتا ہے۔ جس کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

عظمت انسان: عقیدہ ایمان باللہ انسان کو عظمت کے بلند مینار پر کھڑا کرتا ہے اور یہی ایمان باللہ کا درخشندہ پہلو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کائنات میں اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرہ۲:۳۰) اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

پھر فرشتوں کو اپنے نائب کی فرمانبرداری کا حکم دیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ (البقرہ۲:۳۴) اور جب ہم فرشتوں سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو۔ پس انھوں نے فرمانبرداری کی سوائے ابلیس کے۔

اللہ تعالیٰ کی نیابت کی وجہ سے اس کو فضیلت دی گئی اور وہ مسجود ملائکہ ہوا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَھُوَ فَضَّلَکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ اس نے تم کو مخلوقات پر فضیلت دی ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (التین ۹۵:۴) یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰھُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ رَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰھُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۷۰) ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سواری دی اور ان کو اچھی چیزوں سے رزق دیا۔ اور ہم نے ان کو بہتوں پر جنھیں ہم نے پیدا کیا بڑی فضیلت دی ہے۔

اس فضیلت کی وجہ سے انسان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ سوائے اللہ کے کسی کی عبادت اور فرمانبرداری نہ کرے کیونکہ کائنات کی ہر چیز اس کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ خادم کے سامنے مخدوم کا جھکنا اس کی ذلت ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے۔ یہ ایمان باللہ اس کو عظمت اور فضیلت کا احساس دلاتا ہے اس احساس فضیلت کی وجہ سے ساری کائنات کو اپنا خادم سمجھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی یہی حکم ہوتا ہے کہ وہ اس کے سوا کسی کے سامنے نہ جھکے اور نہ کسی کو اپنا مسجود بنائے۔ یہی احساس فضیلت انسان کی روحانی اور مادی ترقی کا ذریعہ ہے۔

تزکیہ نفس: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات اور نام بیان ہوئے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْهُ بِهَا یعنی اسماء حسنی صرف اللہ ہی کے ہیں اللہ کو انھی ناموں سے پکارو۔ ''حسنی'' کے لفظ میں یہ بتایا گیا ہے اللہ وہ ذات ہے جو تمام صفات حسنہ کی جامع اور تمام عیوب سے منزہ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر اس کی سی صفات پیدا کرے اور انھی صفات کے تحت اپنی زندگی بسر کرے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً اللہ کا رنگ اختیار کرو اور اللہ کے رنگ سے بہتر کوئی رنگ نہیں۔ اللہ کا رنگ اختیار کرنے کا مطلب اللہ کی صفات میں رنگین ہونا ہے۔ اگر کوئی خدا کی صفات کے برعکس زندگی بسر کرتا ہے وہ الحاد فی الاسم ہے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔ وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِهٖ سَیُجْزَوْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ اور ان لوگوں سے انحراف کرو جو اللہ کے اسماء سے انحراف کرتے ہیں وہ اپنے کیے ہوئے کی جزاء پالیں گے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے جو خدا کی صفات کے ظل کے نیچے زندگی بسر نہیں کرتے وہ خدا کی صفات سے انحراف کرتے ہیں۔ ایمان باللہ کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ انسان اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات کا رنگ پیدا کرے۔ یہی تزکیہ نفس ہے۔ اس کا نام خلق علی صورۃ اللہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے اور اللہ کی نیابت کا بھی یہی مفہوم ہے کہ وہ اللہ کی صفات کا اظہار کرے۔ اگر انسان الحاد فی اسماء کا مرتکب ہوتا ہے۔ تو وہ اپنی پیدائش کی غرض و غایت کی نفی کرتا ہے۔

خودداری و عزت نفس: جو شخص اللہ تعالیٰ پر سچے دل سے ایمان لاتا ہے تو وہ اس کو تمام طاقتوں اور قدرتوں کا سرچشمہ سمجھتا ہے۔ نفع و نقصان پہنچانے والا تسلیم کرتا ہے وہ کسی مخلوق کے سامنے گردن نہیں جھکاتا۔ نہ ہی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے نہ ہی اس کا دل کسی کے رعب و جلال سے مرعوب ہوتا ہے اس طرح ایمان باللہ انسان میں خودداری اور عزت نفس پیدا کرتا ہے۔

یہ وصف اللہ تعالیٰ کی صفت المعز کا ظل ہے۔ اللہ تعالیٰ کو المعز ماننے والا اپنی عزت نفس سے کبھی دست کش نہیں ہو سکتا۔

عجز و انکساری: ایمان باللہ انسان کے اندر عجز و انکساری پیدا کرتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (الفرقان ۲۵:۶۳) رحمٰن کے بندے زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اور بازو کو اس کے لیے جھکا جو مومنوں میں سے تیری پیروی کرتا ہے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی بھیجی ہے کہ خاکساری اختیار کرو تاکہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور کوئی کسی کے مقابل میں فخر نہ کرے۔" (ابوداؤد کتاب الادب باب فی المواخات)

وصف عجز و انکساری اللہ تعالیٰ کی صفت الحلیم کا ظل ہے فرقان کی آیت ۶۳ میں عباد کی اضافت الرحمٰن کی طرف ہے اس کے بعد اَلَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا کے الفاظ آئے ہیں جو عباد الرحمٰن کا وصف ہے۔

قناعت و بے نیازی: ایمان باللہ انسان کو قناعت و بے نیازی کا سبق دیتا ہے۔ مال و دولت کے حصول کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرنے سے روکتا ہے دنیا میں بعض معاشرتی برائیوں کا سرچشمہ ناجائز ذرائع سے حصول دولت ہے۔ اس طرح معاشرہ میں معاشرتی تفاوت پیدا ہوتا ہے جس سے عداوت جنم لیتی ہے اور معاشرہ کا امن برباد ہوتا ہے۔ قناعت اور بے نیازی اختیار کرنے میں اللہ تعالیٰ کی صفات الغنی اور الصمد انسان کی راہنمائی کرتی ہیں۔

اجتماعی اثرات

مساوات: عقیدہ ایمان باللہ مساوات کا سبق دیتا ہے مسئلہ ذات پات کو جڑ سے کاٹ دیتا ہے پامال شدہ لوگوں کو اٹھا کر بڑوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیتا ہے ایمان باللہ کی عملی شکل نماز اور حج کے موقع پر ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ اکبر کی آواز پر مسجد میں پانچ دفعہ نماز کے وقت لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور ایک امام کے پیچھے امیر غریب، شاہ و گدا، صغیر و کبیر صف باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہر قسم کے امتیازات مٹ جاتے ہیں۔ اس طرح حج کے موقع پر دنیا کے ہر کونے سے مسلمان مکہ میں جمع ہوتے ہیں اور ایک ہی لباس میں ملبوس ہو کر مناسک حج ادا کرتے ہیں۔ گورے کالے کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ غریب و امیر کی تقسیم ختم ہو جاتی ہے۔ ہر قسم کا طبقہ بغیر کسی امتیاز کے مناسک حج ادا کرتا ہوا نظر آتا ہے مساوات کا اس قسم کا نظارہ دنیا کے کسی اجتماع میں نظر نہیں آتا۔

قرآن مجید میں مساوات انسانی کا سبق ان الفاظ میں دیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (الحجرات ۴۹:۱۳) اے لوگو! ہم نے تمھیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو تو تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے اللہ جاننے والا خبردار ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول کریم ﷺ نے خطبہ دیا جس میں اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ اَيُّهَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ اِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى (مسند احمد) لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔ اسلام نے سب سے پہلے دنیا میں مساوات کا زریں سبق دیا۔ اسی سبق سے نسلی، لسانی، قومی امتیازات مٹ جاتے ہیں۔ یہی تفرقات عالمی امن قائم ہونے میں روک بنے ہوئے ہیں اگر یہ تفرقات مٹ جائیں تو دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے اور یہ مساوات اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت للعالمی کا پرتو ہے کہ تمام انسانیت اللہ کی نظر میں برابر ہے اور بموجب حدیث اللہ کی عیال ہے۔ ایک کنبہ کے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ کسی میں تفریق نہیں سربراہ کنبہ تمام عیال کی ربوبیت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

اخوت و اتحاد: اللہ تعالیٰ کی صفت الاحد وحدت انسانی کا سبق دیتی ہے اسلام سے قبل انسانیت ملکی، قومی، لونی، لسانی اور نسبی تعصبات اور تفریقات میں بٹی ہوئی تھی۔ ہر قوم دوسری قوم کو اپنا دشمن تصور کرتی تھی اور ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتی تھی۔ اسلام نے یہ نعرہ بلند کیا کہ کل روئے زمین کے انسان ایک ہی اصل سے نہیں۔ اس نعرہ نے تعصبات اور تفریقات کی زنجیروں کو کاٹا اور اخوت اور اتحاد کی لڑی میں منسلک کر دیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً (النساء ۴:۱) اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو۔ جس نے ہم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اس سے جوڑا پیدا کیا اور دونوں سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس ۱۰:۱۹) سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ (بیہقی کتاب الایمان) ساری مخلوق عیال اللہ ہے۔
فرمایا اِنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ اِخْوَةٌ (احمد، ابوداؤد) انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔
اخوت بین الناس کی تعلیم اللہ تعالیٰ کی صفت احدیت کا پرتو ہے۔

رواداری: ایمان باللہ رواداری کا سبق دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہر آسمانی کتاب اور ہر پیغمبر کو مانا جائے ارشاد الٰہی ہے۔ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (البقرہ ۲:۱۷۷) جو اللہ اور آخرت کے دن اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (آل عمران ۳:۸۴) کہہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہم پر اتارا گیا اور اس پر جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے اور ہم اس کے فرمانبردار ہیں۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ ۲:۲۸۵) رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب سے اس کی طرف اتارا گیا اور مومن بھی سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں ہم اس کے رسولوں میں کسی میں کچھ تفرقہ نہیں کرتے۔

اسلام اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ قوت اور طاقت سے دین کی اشاعت کی جائے اور لوگوں کو جبراً دین منوایا جائے۔ دین کا اختیار کرنا لوگوں کی رضا و رغبت پر چھوڑ دیا گیا ہے اسلام محض مذہبی اختلاف کی بناء پر ایک دوسرے کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ ۲:۲۵۶) کہ دین میں کوئی جبر نہیں۔

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (یونس ۱۰:۹۹) کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن بن جائیں۔

اسلام تمام ادیان کی عبادت گاہوں کو قابل احترام سمجھتا ہے اور ان کی حفاظت اور مدافعت کی تعلیم دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (الحج ۲۲:۴۰) اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے نہ ہٹاتا رہتا تو یقیناً راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے گرادی جاتیں اسلامی تہذیب صرف جبر نہ کرنے اور دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت کرنے کی ہی تعلیم نہیں دیتی بلکہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر عقائد کی بناء سب وشتم کی اجازت نہیں دیتی ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام ۶:۱۰۸) اور ان لوگوں کو گالی نہ دو جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں کہ وہ زیادتی کر کے بے علمی سے اللہ کو گالی دیں۔

اسلام محض مذہبی اختلاف کی وجہ سے دوسروں سے نیکی اور صلہ رحمی میں حائل ہونے سے منع کرتا ہے اسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ مسطح جو حضرت ابوبکرؓ کی خالہ یا ہمشیرہ کا بیٹا تھا۔ تشہیر افک میں ملوث تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اس کی مالی امداد کیا کرتے تھے۔ افک میں ملوث ہونے کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ نے امداد کرنا چھوڑ دی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا (النور ۲۴:۲۲) اور تم میں سے بزرگی اور وسعت والے یہ قسم نہ کھائیں کہ وہ غریبوں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہیں دیں گے اور چاہیے کہ معاف کریں اور درگزر کریں۔

خُلق رواداری، اللہ کی صفات المومن، الودود کا پرتو اور ظل ہے۔

آزادی: ایک انسان اپنی طبعی کمزوریوں کی وجہ سے اپنی خواہشات، مال و منال اولاد اور جھوٹے خداؤں کے سامنے سرنگوں ہو کر غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیتا ہے۔ جو شخص ایمان باللہ کی حقیقی دولت سے مالا مال ہوتا ہے وہ ہر قسم کی غلامی سے نجات، حاصل کر لیتا ہے نہ خواہشات کا غلام ہوتا ہے۔ نہ مال و دولت کا غلام ہوتا ہے نہ اولاد کی محبت کا غلام ہوتا ہے نہ صاحب اقتدار اور طاقت ور آدمی کا غلام ہوتا ہے۔ نہ مظاہر قدرت کا غلام ہوتا ہے جونہی خدا کی محبت انسان کے دل میں جاگزین ہوتی ہے۔ غیر اللہ کی محبت سے اس کا دل خالی ہو جاتا ہے وہ آزادی اور حریت کے بلند مقام پر کھڑا ہوتا ہے۔

ماسوا اللہ کی غلامی انسان کے اندر دنائیت، ذلت، گراوٹ اور شکستگی پیدا کر دیتی ہے۔ ان خصائص رزیلہ سے بچنے کے لیے ایمان باللہ کے حصار میں آنا ضروری ہے جو معاشرہ ایمان باللہ کی دولت سے متمتع ہو جاتا ہے۔ وہ ہر قسم کی غلامی کی زنجیروں کو کاٹ دیتا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے عربوں کو ایمان باللہ کا

درس دے کر ہی ماسوی اللہ کی غلامی سے نجات دلائی تھی۔

آزادی کا وصف اللہ تعالیٰ کی صفات اَلْمُعِزُّ، الرافع، السَّلام اور اَلْعَلِی کا پرتو ہے۔ اور یہ صفات ہر قسم کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا درس دیتی ہیں۔

شجاعت: جو قوم اللہ تعالیٰ کو ہی حقیقی مالک پروردگار اور مقتدر اعلیٰ سمجھتی ہے وہ شجاعت کے وصف سے متصف ہو جاتی ہے۔ کسی شخص یا قوم کو دنیا میں سربلند اور معزز رہنے کے لیے وصف شجاعت کا حامل ہونا ضروری ہے۔ تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ وہی قومیں سربلند ہوئیں جو بہادر تھیں۔ آگے بڑھ کر موت کو اپنے سینہ پر لگاتی تھیں۔ اور یہ بھی تاریخ بتاتی ہے۔ دنیا میں سب سے بڑھ کر موحد ہی بہادر تھے۔ انبیاء کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ کن کن مصائب سے دوچار ہوئے لیکن ان کے پائے استقلال میں لغزش تک نہ آئی۔ انسان کے اندر شجاعت کا جذبہ ایمان باللہ سے پیدا ہوتا ہے۔ موحد ماسوی اللہ سے ڈرنے کو شرک سمجھتا ہے۔ اس لیے رسول کریم ﷺ نے فرمایا ”جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے دنیا کی ہر چیز اس سے ڈرتی ہے۔“

وصف شجاعت، اللہ تعالیٰ کے صفات العزیز اور القوی کا ظل ہے اللہ تعالیٰ کو عزیز اور قوی جاننے والا کوئی شخص بزدل نہیں ہوسکتا۔

مخلوق سے ہمدردی: ایمان باللہ مخلوق خدا سے ہمدردی اور شفقت سے پیش آنے کی تعلیم دیتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ (القصص ۲۸:۷۷) اور لوگوں سے بھلائی کر جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا اور زمین میں فساد کا خواہش مند نہ بن اللہ تعالیٰ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔

علوم کی ترویج: جب تک انسان مظاہر کائنات کے سامنے سرنگوں رہا ہے اس وقت تک اشیائے کائنات سے کوئی فائدہ حاصل نہ کرسکا کیونکہ جس عنصر کو مخدوم اور آقا سمجھا جائے اس سے فائدہ کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے جب انسان نے خدا کا یہ پیغام سنا کہ تمام کائنات انسان کی خادم ہے اور اس کے لیے بنائی گئی ہے۔ اسی دن سے انسان کائنات کے عناصر کے خواص معلوم کرنے لگ گیا ہے۔ جس نے علوم جدیدہ کی بنیاد ڈالی ہے۔ علوم کی ترویج و اشاعت اللہ تعالیٰ کے صفات علیم وخبیر الباری اور الخالق کے تحت آتی ہے۔

امن عالم کا قیام: ایمان باللہ دنیا میں امن و آشتی کا پیغامبر ہے کیونکہ یہ عقیدہ دلوں سے نفرت، کدورت اور عداوت کو ختم کرتا ہے ہر قسم کے تعصبات کو مٹا دیتا ہے۔ اخوت محبت شفقت اور مذہبی رواداری کی تعلیم دیتا ہے۔ جب دنیا سے دشمنی ختم ہو جائے اور اس کی جگہ اخوت لے لے تو دنیا میں حقیقی امن قائم ہوسکتا ہے۔ یہی تعلیم اسلامی تہذیب کا محور ہے۔ اسلام ایک طرف دنیا سے دشمنی کو ختم کرتا ہے اور دوسری طرف انسانی عظمت اور اخوت کو فروغ دیتا ہے اس طرح امن عالم کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے رسول کریم ﷺ نے مسلمان کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرا شخص محفوظ رہے۔ رسول کریم ﷺ کی اس تعریف کے مطابق مسلمان اسلامی تہذیب کا نمونہ ہوتا ہے جس کے قول اور عمل سے نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں ہوسکتا۔

دنیا میں قیام امن کا ذریعہ صرف عقیدہ ایمان باللہ ہے۔ اللہ کی ربوبیت عامہ، رحمانیت، رحیمیت، السلام، المومن اور دیگر صفات ہیں۔ یہ تمام صفات دنیا میں محبت پیار سے رہنے کی درس دیتی ہیں اور عداوت کو مٹاتی ہیں۔ اگر تمام دنیا اللہ تعالیٰ کی صفات کے تحت زندگی بسر کرنا شروع کردے تو دنیا میں امن قائم ہو جائے گا۔

صفات الٰہیہ سے سلطنت کا قیام: اجتماعی زندگی کی انتہا قیام سلطنت ہے۔ نظام سلطنت کو احسن رنگ میں چلانے کے لیے سورہ فاتحہ کی چار صفات رب العالمین رحمٰن رحیم اور مالک یوم الدین ہیں۔ ان چار صفات کو ام الصفات کہا گیا۔ صفت رب حکمران کو ہر قسم کے تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر رعایا کی ربوبیت عامہ کی تعلیم دیتی ہے۔ خدا رب العالمین ہے۔ وہ کسی خاص قوم کا رب نہیں۔ اس کا فیضان ہر کس و ناکس کے لیے جاری ہے۔ ہر شخص اس سے بہرہ مند ہو رہا ہے۔ اس طرح حکمران کی عطا کسی مخصوص طبقہ کے لیے نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس کا فیض ربوبیت ہر ایک تک یکساں پہنچنا چاہیے۔ غرض کہ اللہ کی صفت ”رب“ ہر قسم کے تعصب مٹانے کی تعلیم دے رہی ہے۔

صفت رحمانیت فلاحی مملکت کا تصور پیش کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کے لیے اس کی حیات بے مثل کے لیے ہوا، پانی، آگ، سورج اور ہر قسم کی اشیاء پیدا کردی ہیں۔ یہ تمام نعمتیں کسی جاندار چیز کے عمل کے نتیجہ میں پیدا نہیں کی گئیں بلکہ اپنی صفت رحمانیت کے تحت پیدا کردی ہیں۔ یہ صفت حکمران سے یہ تقاضا کرتی ہے کہ عوام کی سہولت اور آرام کے لیے بغیر مطالبہ کے ہر قسم کے اسباب مہیا کرے۔

صفت رحیمیت حکمران کو یہ درس دیتی ہے کہ ہر محنت کرنے والے کی محنت کا بدلا پورا پورا دیا جائے۔ پسند اور ناپسند کو سامنے نہ رکھا جائے اگر بدلہ

دینے میں پسند اور نہ پسند کو پیمانہ بنایا جائے تو کارکنان سلطنت میں بددلی اور بے چینی پیدا ہوگی جس سے نظام سلطنت ہی تباہ ہو جائے گا۔ اگر سلطنتوں کے زوال پر نظر دوڑائیں کہ ایک وجہ یہ بھی نظر آئے گی کہ وہ کارکنان سلطنت کو محنت کی بجائے اپنی پسند اور نہ پسند کی بناء پر ترقی دیتی تھیں جس سے محروم کارکنان میں بددلی پیدا ہوتی رہی اور سلطنت کے کاموں میں وہ غفلت اور لاپروائی برتنے لگے۔ جس سے سلطنت کی عمارت زمین بوس ہوگئی۔

صفت مالک یوم الدین سلطنت میں سزا کا تصور پیش کرتی ہے۔ اگر کوئی شخص سلطنت کے قوانین کی پیروی نہیں کرتا تو اصلاح کے لیے اس کو سزا دی جانی چاہیے۔ اور اس سزا میں انتقام کا بدلہ نہ ہو۔ جیسا کہ عموماً دیکھنے میں آتا ہے کہ حکمران اپنے حریف کو قانون کی آڑ میں انتقام کا نشانہ بناتے ہیں۔

دیدار الٰہی

یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے۔ جس پر علماء اسلام کا اختلاف ہے۔ اشاعرہ اور حنابلہ رویتِ باری تعالیٰ کے قائل ہیں جبکہ معتزلہ قائل نہیں معتزلہ کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے فلسفہ کی بنیاد مادی فلسفہ پر رکھی ہے۔

قرآن مجید کا بنظر تعمق مطالعہ کرنے والا شخص بخوبی جانتا ہے کہ معرفت الٰہی کے لیے اس کائنات میں دو نظام چل رہے ہیں۔ مادی نظام اور روحانی نظام دونوں نظام متوازی چل رہے ہیں۔

مادی نظام کی سمجھ بوجھ کے لیے حواس خمسہ دیے ہوئے ہیں جن کا تعلق قلب سے ہے۔ آنکھ، کان، ناک اور جلد محض ذرائع ہیں جس سے مختلف چیزوں کے احساسات عالم ظاہر سے قلب کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

اس ظاہری نظام کے بالمقابل دوسرا باطنی (روحانی) نظام ہے اس نظام کا تعلق بھی قلب سے ہے۔ مگر عالم روحانی کے نظارے اور آوازیں دیکھنے اور سننے کے لیے ظاہری اعضاء کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ملائکہ کی وساطت سے قلب پر نزول ہوتے ہیں۔ جب اللہ کی طرف سے آواز کی شکل میں پیغام دینا مقصود ہو تو آواز قلب کے باطنی کان پر پڑتی ہے تو سننے والا وہ آواز سن رہا ہوتا ہے جب نظارہ دکھانا مقصود ہو تو وہ روحانی نظارہ اس کی باطنی آنکھ پر پڑ رہا ہوتا ہے تو دیکھنے والا اسے دیکھ رہا ہوتا ہے اس طرح کوئی مزا چکھانا مقصود ہو تو روحانی زبان پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ چکھنے والا شیریں لذت محسوس کر رہا ہوتا ہے ان تمام باتوں کے تجربات اور مشاہدات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کی زندگی سے حاصل ہوتے ہیں۔ وحی نبوت جو الفاظ میں انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتی ہے اس کا واضح ثبوت ہے۔ جب ہم اللہ تعالیٰ کی آواز کو باطنی (روحانی) کان سے سماعت کے قائل ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کے دیدار کا کیوں کر انکار ہو سکتا ہے کہ اس محبوب حقیقی کا دیدار اپنی روحانی استعداد کے مطابق باطنی آنکھ سے نہ کر پائیں۔

جس طرح انسان کے ظاہری اعضاء کی استعداد بڑھانے کے لیے خارج میں اصول اور قانون مقرر ہیں۔ اسی طرح باطنی اعضاء کی نشوونما اور استعداد بڑھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اصول اور قانون مقرر کر دیے ہیں۔ وہ ہیں ایمان باللہ کے ساتھ احکام الٰہی کی پیروی کرنا۔ احکام الٰہی کی وضاحت قرآن مجید میں کر دی گئی ہے۔ جب انسان اللہ پر صدق دل سے ایمان لے آتا ہے اور اس کے احکام کے تحت اعمال صالح بجا لاتا ہے تو اللہ تعالیٰ انسان کی باطنی آنکھ میں وہ قوت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کر سکے۔ اس کے باطنی کان میں وہ قوت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آواز سن سکے۔ اس کی زبان میں وہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ روحانی پھلوں کی لذت محسوس کر سکے۔

جب قرآن مجید اور احادیث کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ رویت باری تعالیٰ برحق ہے۔ رسول کریم ﷺ کو معراج میں دیدار الٰہی کا شرف حاصل ہوا۔ قرآن مجید میں آتا ہے وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (النجم ۵۳: ۸-۱۴) پھر وہ قریب ہوا اور بہت قریب ہوا۔ سو وہ دو کمانوں کا وتر ہوا۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قریب سو اس نے اپنے بندے کی طرف وحی کی جو وحی کی۔ جو اس نے دیکھا وہ دل نے جھوٹ نہیں کہا تو کیا تم اس سے اس پر جھگڑتے ہو جو وہ دیکھتا ہے اور اس نے اسے ایک اور نزول کے وقت بھی دیکھا سدرۃ المنتھیٰ کے پاس۔

معراج کے وقت یہ آیات رویت باری تعالیٰ پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کے بعد آتا ہے۔ مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (آیت ۱۷) آنکھ پھری نہیں اور نہ حد سے بڑھی۔

یہ آیت واضح کر رہی ہے کہ رسول کریم ﷺ کی باطنی آنکھ نے جمال الٰہی کا نظارہ کیا اور وہ ٹیڑھی نہیں ہوئی تھی۔ گویا وہ نظارہ بالمشافہ تھا۔ روحانی آنکھ اللہ تعالیٰ کے جمال کا مشاہدہ کر رہی تھی۔

اسی طرح مسند احمد بن حنبل اور ترمذی کی روایت ہے جو حضرت معاذؓ سے روایت ہے آپ ﷺ نے فرمایا۔ اِنِّي قُمْتُ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّيْتُ فَاِذَا اَنَا

بِرَبِّی فِی اَحْسَنِ صُوْرَۃٍ فَرَاَیْتُ وَضَعَ کَفَّہٗ بَیْنَ کَتِفِی حَتّٰی وَجَدْتُ بَرْداً وَاَنَا مُلّہٗ بَیْنَ صَدْرِی یعنی میں رات کے وقت اٹھا اور نماز پڑھی۔ تب ناگہاں میں نے اپنے رب کو احسن صورت میں دیکھا...... تب میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے کندھے کے درمیان رکھا۔ یہاں تک کہ میں نے اس کی انگلیوں کی ٹھنڈک اپنے سینہ میں محسوس کی۔

قرآنی آیات اور حدیث ظاہر کرتی ہیں کہ اس دنیا میں دیدار الٰہی ہوسکتا ہے لیکن باطنی آنکھ کے ذریعے یعنی روحانی انداز میں۔ اسی طرح قیامت کے دن بھی دیدار الٰہی ہوگا۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ اِنَّکُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّکُمْ مِثْلَ ھٰذَا الْقَمَرِ لَا تَضَاعُوْنَ فِی رُؤْیَتِہٖ فَاِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَا تُغْلَبُوْا عَلٰی صَلٰوۃٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَصَلٰوۃٍ قَبْلَ غُرُوْبِھَا فَافْعَلُوْا یعنی تم قیامت میں اپنے پروردگار کو اس چاند کے دیکھنے کی طرح دیکھو گے۔ تمہیں اپنے رب کے دیکھنے میں کوئی مزاحمت اور روک نہ ہوگی جہاں تک ہو سکے سورج طلوع ہونے سے پہلے کی نمازوں اور سورج غروب ہونے سے پہلے کی نمازوں میں غفلت نہ کرو۔ مغلوب نہ ہو جاؤ۔ خدا کی ہدایت کے مطابق ان کو ادا کرو۔

حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ بینا اَھْلُ الْجَنَّۃِ فِی اَنْفُسِھِمْ اِذْ سَطَعَ لَھُمْ نُوْرٌ فَرَفَعُوْا رُؤُسَھُمْ فَاِذَا الرَّبُّ قَدْ اَشْرَفَ عَلَیْھِمْ مِنْ فَوْقِھِمْ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَھْلَ الْجَنَّۃِ قَالَ وَذٰلِکَ قَوْلُ اللّٰہِ سَلَامٌ قَوْلاً مِنْ رَبِّ الرَّحِیْمِ قَالَ فَلْیَنْظُرُ اِلَیْھِمْ وَ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْہِ حَتّٰی یَحْتَجِبَ عَنْھُمْ وَیَبْقٰی نُوْرُہٗ وَبَرَکَتُہٗ عَلَیْھِمْ فِی دِیَارِھِمْ (مسند امام اعظم) کہ جنتی لوگ اپنے خیال میں ہوں گے ان کے لیے اچانک ایک نور چمکے گا پس وہ اپنے سر اٹھائیں گے تو ناگہاں اللہ تعالیٰ ان پر جلوہ فرمائے گا اور ان کو فرمائے گا کہ اے اہل جنت السلام علیکم پھر فرمایا کہ یہ ہی فرمانا اللہ کا کہ خدائے رحیم کی طرف سے سلام پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف دیکھے گا اور وہ خدا کی طرف دیکھیں گے پس وہ جنت کی کسی چیز کی طرف التفات نہ کریں گے۔ جب تک وہ اللہ کو دیکھتے رہیں گے یہاں تک کہ بالآخر ان سے حجاب ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کا نور اس کی برکت ان سے گھروں میں رہے گا۔

قرآن مجید اور احادیث کی رو سے رویت باری تعالیٰ برحق ہے لیکن بلاکیف۔ لیکن یہ رویت ان جسمانی آنکھوں سے نہیں ہوگی بلکہ سب روحانی نظارے ہیں جن کو روحانی بصارت سے نظارہ کیا جاسکتا ہے۔

ایمان بالملئکۃ

لغت عرب میں لفظ ملَک، الوک یا الوکہ سے مشتق ہے۔ ملائکہ اس کی جمع ہے۔ جس کے معنی فرشتہ کے ہیں۔ چونکہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے فیوض اور انعامات انسانوں تک پہنچانے کے لیے وسائط ہیں اور رسالت کا کام انجام دے رہے ہیں۔ اس لیے ان کو ملائکہ کہتے ہیں۔ گویا ملائکہ وہ روحانی اور نورانی خارجی ہستیاں ہیں جو کائنات میں اللہ تعالیٰ کے افعال کے ظہور کے وقت کام کرتی ہیں۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفات اور دیدار الٰہی کے بارے میں علماء کرام کا اختلاف ہے۔ اسی طرح ملائکہ کے بارے میں بھی ہے۔ معتزلہ اور نیچری ملائکہ کا خارج میں کوئی وجود تسلیم نہیں کرتے بلکہ قدرت کی مختلف قوتوں کو ہی ملائکہ کا نام دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض سر برآوردہ صوفیا رومی اور ابن العربی جیسے بھی انسان کی اندرونی ملکوتی قوتوں کو ہی ملائکہ کہتے ہیں۔ مولانا رومی نے اس کی یہ مثال دی ہے کہ انسان خواب میں دیکھتا ہے کہ کوئی شخص اس سے بات کر رہا ہے حالانکہ وہ کوئی دوسرا شخص نہیں ہوتا بلکہ خود وہی انسان ہوتا ہے۔ خواب میں اس کو الگ نظر آتا ہے چنانچہ دفتر سوم میں فرماتے ہیں۔

چیز دیگر ماند اما گفتنش — یا تو روح القدس گوید نے منش
نے تو گوئی ہم بگوش خویشتن — بے من و بے غیر اے من ہم تو من
ہمچو آں وقتے کہ خواب اندر روی — توز پیش خود بہ پیش خود شوی
بشنوی از خویش پنداری فلاں — باتو اندر خواب گفت است آں نہاں

مولانا عبدالعلی بحرالعلوم ان اشعار کی شرح میں لکھتے ہیں۔

پس جبرئیل کہ مشہود رسل علیہم السلام ست و وحی از جانب حق سبحانہ میرساند آں حقیقت جبرائیلہ ست کہ قوتے از قوائے رسل بود متصور شدہ در عالم مثال بہ صورتے کہ مکنوں بود در رسل مشہودمی شود و مرسل می گردد و پیغام حق میرساند، پس رسل مستفیض از خود اند، نہ از دیگرے۔ پس ہر چہ کہ رسل مشاہدہ می کنند مخزوں درخزانہ جناب ایشاں بود وہمچنیں عزرائیل کہ بوقت موت مشہودے شود میت را آں ہموں حقیقت عزرائیلیہ است کہ قوتے از قوائے میت است کہ متصور شدہ بہ صورتے در عالم برزخ مشہودے شود میت را، وایں صورت ہم مکنوں بود در میت و بہ ایں مشیر ست قول اللہ تعالیٰ، قل یتوفکم ملک الموت الذی وکل بکم بگو اے محمد ﷺ وفات مے دہد شمارا آں ملک الموت کہ سپرد کردہ شدہ است بہ شما یعنی در شما ست قوتے از قوائے شما شدہ و در قبر کہ منکر نکر مشہود خواہند شد از ہمیں قبیل است (شرح عبدالعلی بحرالعلوم بر مثنوی جلد ۳ صفحہ ۵۶ مطبوعہ نولکشور)

پس جبرائیل جو انبیاء علیہم السلام کو نظر آتے ہیں اور خدا کی طرف سے وحی لاتے ہیں وہ حقیقت جبرائیلہ ہے جو انبیاء کی قوتوں میں سے ایک قوت کا نام ہے یہی قوت صورت بن کر عالم مثال میں انبیاء کو محسوس ہوتی ہے اور خدا کی طرف سے قاصد بن کر پیغام لاتی ہے تو انبیاء اپنے آپ سے مستفیض ہوتے ہیں۔ نہ کسی اور سے جو کچھ ان کو نظر آتا ہے وہی ہے جو خود ان کے خزانہ میں مخزون تھا۔ اسی طرح عزرائیل جو موت کے وقت مردہ کو نظر آتے ہیں وہ درحقیقت عزرائیلیہ ہے جو مردہ کے قوای میں سے ایک قوت ہے وہی صورت بن کر عالم برزخ میں مردہ کو نظر آتی ہے اور یہ صورت بھی مردہ میں پہلے ہی سے مخفی تھی۔ قرآن مجید کی اس آیت میں قل یتوفاکم الایۃ اس کی طرف اشارہ ہے یعنی کہہ دے اے محمد ﷺ کہ وہ ملک الموت تمہاری جان نکالتا ہے جو تم پر متعین کیا گیا ہے یعنی تم ہی میں ایک قوت ہے منجملہ اور قوی کے، اور قبر میں جو منکر نکیر نظر آئیں گے وہ بھی اسی قسم کی بات ہے۔

مولانا نے اس کے بعد ابن العربی کی یہ عبارت فصوص الحکم سے نقل کی ہے۔

فای صاحب کشف شاھد صورۃ تلقی الیہ مالم یکن عندہ من المعارف و تمنحہ مالم یکن مثل ذالک فی یدہ فتلک الصورۃ عینہ لاغیرہ فمن شجرۃ نفسہ جنی ثمرہ غرسہ. جب کسی صاحب کشف کو کوئی صورت نظر آئے جو ایسے معارف وعلوم القا کرتی ہے جو پہلے اس کو حاصل نہ تھے تو یہ خود اس کی صورت ہے اور کوئی غیر نہیں ہے، اس نے اپنے ہی نفس کے درخت سے پھل چنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ایک اٹل قانون ہے کہ ہمارے قوی اور اجسام کو اللہ تعالیٰ کا فیض کسی توسط سے پہنچتا ہے مثلاً ہماری آنکھوں کو روشنی بخشتا ہے مگر وہ روشنی سورج کی توسط سے ملتی ہے ہمارے کان شنوائی کے لیے ہوا کے محتاج ہیں جو آواز کو ہمارے کانوں تک پہنچا دیتی ہے پھر اللہ تعالیٰ نے ہمارے قویٰ میں فیض کے

قبول کرنے کی استعدادیں بھی بخشی ہیں۔ لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ ہمارے قویٰ کو انسانیت کی کل چلانے کے لیے خارجی مددوں و معاونوں کی ضرورت ہے۔

قرآن مجید سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ انسانیت کی تربیت اور تکمیل کے لیے کائنات میں دو متوازی نظام چل رہے ہیں ایک مادی نظام دوسرا روحانی نظام۔ ان ہر دو نظاموں کو چلانے کے لیے خارج میں وسائط اور ذرائع پیدا کیے ہیں۔ وہی وسائط ملائکہ ہیں۔

کائنات میں سورج، چاند، ستارے، ہوا، بادل وغیرہ انسان کی تربیت اور تکمیل کے لیے کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ درپردہ ملائکہ کے کام ہیں۔ اس مادی نظام کے چلانے والی خارجی قوتوں کو سفلی ملائکہ کہا جاتا ہے۔ جبکہ باطنی اور روحانی عالم میں ارادہ الٰہیہ کے تحت انسانی روح کی تزکیہ اور نشوونما کے لیے جو عناصر افعال انجام دے رہے ہیں ان کو علوی ملائکہ کہا جاتا ہے۔ وحی لانا اور انسانوں کے دل میں نیکیوں کی تحریک پیدا کرنا عالم باطن اور ملاء اعلیٰ سے تعلق ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْواً فَالْحٰمِلٰتِ وِقْراً وَالْجٰرِيٰتِ يُسْراً فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْراً (الذاریات ۵۱:۱.....۴) یعنی ان ہواؤں کی قسم جو سمندروں سے بخارات کو جدا کرتی ہیں پھر ان ہواؤں کی قسم جو ان بوجھل بخارات کو اپنے اندر لے لیتی ہیں۔ پھر ان ہواؤں کی قسم جو بادلوں کو منزل مقصود تک پہنچانے کے لیے چلتی ہیں پھر ان فرشتوں کی قسم جو درپردہ ان تمام امور کو سرانجام دینے والے ہیں۔

ان آیات میں اوّلاً بادلوں کے برسنے کا سبب بیان کیا ہے پھر آخر میں فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْراً لا کر تمام حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ اس مادی سلسلہ کو چلانے والا ایک روحانی سلسلہ ہے جو ملائکہ کے نام سے موسوم ہے۔ انہی کو فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْراً (۷۹:۵) کہا ہے یعنی معاملہ کی تدبیر کرنے والے۔

ایمان بالملئکۃ کی اہمیت: قرآن مجید میں آتا ہے۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (البقرہ ۲:۲۸۵) رسول پر ایمان لایا جو اس کے رب سے اس کی طرف اتارا گیا اور مومن (بھی) سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ ہم اس کے رسولوں میں سے کسی میں کچھ تفرقہ نہیں کرتے اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔ اے ہمارے رب تیری بخشش چاہیے اور تیری طرف ہی لوٹنا ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلاً بَعِيْداً (النساء ۴:۱۳۶) جو شخص اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور آخری دن کا انکار کرے وہ گمراہی میں دور نکل گیا۔

ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ (البقرہ ۲:۹۸) جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرائیل اور میکائیل کا دشمن ہے تو اللہ ان کافروں کا دشمن ہے۔

حدیث جبرائیل میں ایمان کے متعلق رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَتُؤمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ (بخاری ومسلم) تو خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں اور روز آخرت پر ایمان لائے اور تو قدر کے خیر اور شر پر ایمان لائے۔

ملائکہ کے کام

۱۔ وحی لانا: فرشتہ (حضرت جبرائیل) انبیاء علیہم السلام پر وحی لاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ كَمَا اَوْحَيْنَا اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْراً (النساء ۴:۱۶۳) بے شک ہم نے تیری طرف وحی کی۔ جیسے ہم نے نوح اور اس سے پچھلے نبیوں کی طرف وحی کی اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف وحی کی اور ہم نے داؤد کو زبور دی۔

۲۔ روح القدس (جبرائیل) علیہ السلام انبیاء کی تائید کرتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (البقرہ ۲:۸۷) اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد ہم نے پے بہ پے رسول بھیجے اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو کھلے دلائل دیے اور روح القدس کے ساتھ تائید کی۔

۳۔ مومنین کی مدد کرنا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (المجادلہ ۵۸:۲۲) تو ان لوگوں کو جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہیں۔ ایسا نہ پائے گا کہ وہ اس سے دوستی رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے اور گو وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے کنبے کے لوگ۔ انہی کے دلوں کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی روح سے ان کی تائید کرتا ہے۔

۴۔ مومنین کے دشمنوں کو تباہ کرتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ

اَلَنْ یَّکْفِیَکُمْ اَنْ یُّمِدَّکُمْ رَبُّکُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُنْزَلِیْنَ (آل عمران ۳:۱۲۳،۱۲۴) اور یقیناً اللہ نے تم کو بدر میں مدد دی جب تم کمزور تھے۔ پس اللہ کا تقویٰ کرو تاکہ تم شکر گزار بنو۔ جب تو مومنوں سے کہتا تھا کہ کیا یہ تمھارے لیے کافی نہیں کہ تمہارا رب تین ہزار اتارے ہوئے فرشتوں سے تمہاری مدد کرتا تھا۔

۶۔ لوگوں کے اعمال لکھتے ہیں ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ (الانفطار ۸۲:۱۰، ۱۱) اور یقیناً تم پر حفاظت کرنے والے ہیں معزز لکھنے والے۔

۷۔ جان قبض کرتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ طَیِّبِیْنَ (النحل ۱۶:۳۲) جن کی جانیں فرشتے قبض کرتے ہیں (درانحالیکہ) وہ پاک ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ (النحل ۱۶:۲۸) جن کی جانیں فرشتے قبض کرتے ہیں (درآنحالیکہ) وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ (النساء ۴:۹۷) بے شک وہ لوگ جن کی فرشتے جان قبض کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں۔

۸۔ قیامت کے دن لوگوں کی شفاعت کریں گے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَکَمْ مِّنْ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْئًا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَرْضٰی (النجم ۵۳:۲۶) اور کتنے فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ کام نہیں دیتی مگر اس کے بعد کہ اللہ جسے چاہے اور پسند کرے اجازت دے۔

۹۔ قوانین قدرت ملائکہ کی وساطت سے ظہور میں آتے ہیں۔ ان کے اس کام کی وجہ سے ان کو رسل کہا جاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ (الحج ۲۲:۷۶) اللہ فرشتوں میں سے رسول چنتا ہے اور انسانوں میں سے اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

الفاظ "وَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا" اور "فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا" ظاہر کر رہے ہیں کہ درپردہ نظام کائنات کو چلانے والی یہی غیر مرئی ہستیاں ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ملائکہ کا کام مادی اور روحانی نظام کو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکم سے چلانا ہے اور تمام کائنات کی یہی روح ہیں اور نظام کائنات چل رہا ہے جب اللہ کے حکم سے نظام کائنات چلانے سے رک جائیں گی تو یہ تمام نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ گویا یہ نظام کائنات کے لیے بمنزلہ روح کے ہیں جس طرح جسم سے روح کا تعلق ختم ہو جاتا ہے تو جسم مردہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح جب یہ روح کائنات سے لے لی جائے گی تو یہ کائنات جسد مردہ کی طرح ہو جائے گی۔ اس کائنات کی صف لپیٹ لی جائے گی۔

فرشتوں کا مستقر: فرشتوں کا مستقر اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ہے وہ اس مستقر سے اللہ تعالیٰ کی مشیت، ارادے اور احکام کو لفظ کن (ہو جا) سے انجام دے رہے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کا حکم پا کر لفظ "کن" (ہو جا) کہتے ہیں۔ وہ کام انجام پا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ وَّ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ (الصفت ۳۷:۱۶۴، ۱۶۵) اور ہم میں سے کوئی نہیں مگر اس کے لیے معلوم مقام ہے اور ہم صفیں باندھنے والے ہیں۔

مفسرین نے اس قول کو ملائکہ کا قول مراد لیا ہے کہ ملائکہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ان کا مستقر معلوم ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین کردہ ہے اور ایک نظام کے تحت دست بستہ اللہ کے احکام کو بجا لا رہے ہیں۔

ملائکہ اپنے شخصی وجود کے ساتھ کام سرانجام دینے کے لیے انسانوں کی طرح چلتے پھرتے نہیں ہیں۔ مثلاً عزرائیل لوگوں کی جانب قبض کرنے کے لیے مشرق، مغرب، شمال اور جنوب میں چلتا پھرتا نہیں ہے۔ وہ اس قسم کی حرکات وسکنات سے پاک ہے۔ وہ اپنے ہی مستقر پر قائم رہ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجا لا رہا ہے۔

فرشتوں کا نزول ویسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا نزول عرش سے سماء الدنیا کی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزول سے عرش خالی نہیں ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ کا اقتدار اعلیٰ عرش پر قائم دائم ہے اللہ تعالیٰ کے نزول سے مراد اللہ تعالیٰ کے انوار ہیں جو آسمان سے نازل ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن کوئی انسان اس کہنہ اور کیفیت کو جان نہیں سکتا۔ قرآن مجید اور احادیث میں فرشتوں کا انسانی شکل میں متشکل ہو کر نازل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ یہ محض ایک روحانی نظارہ ہوتا ہے جو نبی اپنی باطنی (روحانی) آنکھ سے فرشتے کو خلق جدید میں پاتا ہے جیسا کہ حضرت جبرائیل کا دحیہ کلبی کی شکل میں ظاہر ہونا۔ یہ خلق جدید محض اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے ظہور میں آتی ہے اس کا تعلق مادی جسمانیات سے نہیں بلکہ اس کا تعلق روحانیات سے ہے محض وحی الٰہیہ کو پیغام پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے۔

ابلیس، شیطان و جن: قرآن مجید میں اس سرکش غیر مرئی مخلوق کے لیے یہ تین نام آتے ہیں۔ ابلیس، بلس سے مشتق ہے اور ابلاس اس حزن یعنی غم کو کہتے ہیں۔ جو نہایت شدت ناامیدی سے پیدا ہو (مفردات امام راغب) پس ابلیس کو ابلیس اس کی شدت ناامیدی کی وجہ سے کہا ہے جو وہ رحمت الٰہی سے رکھتا ہے۔

لفظ شیطان لغت عرب میں شطن، شطون یا شیط سے مشتق ہے جن کے معنی بالترتیب مذکور قصداً مخالفت کرنا، دور ہونا اور ہلاک ہونا ہیں جو انسان عمداً بدخواہشات کا پیرو رہتا ہے اور رحمت الٰہی سے دور ہو کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے اس لیے ایسی چیز جو انسان کو رحمت الٰہی سے دور کرنے کی باعث ہو اس کو شیطان کہتے ہیں۔ صراح میں لکھا ہے۔ كُلُّ عَاتٍ مُتَمَرِّدٍ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ وَالدَّوَابِّ فَهُوَ شَيْطَانٌ یعنی جن، انسان اور چارپایوں میں سے جو سرکش ہو وہ شیطان ہے۔

جن: لفظ جَنَّ سے مشتق ہے جس کے معنی چھپا ہوا ڈھکا ہوا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رات نے اس کو ڈھانپ لیا۔ جنین اس بچے کو کہتے ہیں جو رحم مادر میں ہے جنۃ ڈھال کو کہتے ہیں جو انسان کو تلوار کے مقابل میں ڈھانپ لیتی ہے۔ جنوں جب انسان کی عقل ڈھانپ لی جائے یعنی اس پر بیماری کا ایسا پردہ پڑ جائے تو اس کو ڈھانپ لے۔ جنۃ وہ باغ جس کے درخت زمین کو ڈھانپ لیتے ہیں یا وہ بہشت جو انسان کی نظر سے اوجھل ہے۔

عربی زبان میں لفظ جن وسیع معنی میں مستعمل ہے حدیث میں جن کا لفظ باریک سے باریک جراثیم کے متعلق بھی استعمال ہوا ہے جو بغیر خوردبین کے نظر نہیں آتے۔

عرب بڑے بڑے لوگوں کو جن کہتے تھے۔ لغت کی کتاب قاموس میں لکھا ہے۔ جن الناس بالکسر و جنانهم بالفتح معظهم یعنی انسانوں میں جن بڑے آدمی کو کہتے ہیں۔

شیطان و جن کی پیدائش: جس طرح فرشتوں کی پیدائش نور سے ہوئی تھی اسی طرح شیطان و جن کی پیدائش "نار" آگ سے ہوئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَالْجَانَّ خَلَقْنَٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّمُوْمِ (الحجر ۱۵:۲۷) اور جنوں کو ہم نے اس سے پہلے تیز آگ سے پیدا کیا۔

فرمایا وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَارٍ (الرحمٰن ۵۵:۱۵) اور جنوں کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا۔

فرمایا۔ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ (الاعراف ۷:۱۲) اس (شیطان) نے کہا میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے (آدم) کو مٹی سے پیدا کیا۔

مفسرین نے شیطان کی پیدائش نار اور آدم کی پیدائش طین کی تاویلات و تشریحات نہایت ہی بلیغ انداز میں کی ہیں۔ ان کا بیان کرنا لاطائل ہے۔

حقیقت شیطان: اللہ تعالیٰ کا قدیم سے ضدین کا قانون چلا آتا ہے۔ دن کے مقابلہ پر رات اور نور کے مقابلہ میں تاریکی پیدا کر رکھی ہے اس طرح انسان کے لیے نورانی مخلوق کے مقابلہ میں ظلماتی مخلوق بنائی ہے۔ ضدین سے انسان کو ایک کی خوبی اور دوسرے کی برائی دکھا دی ہے نورانی مخلوق داعی الی الخیر ہے اور ظلماتی مخلوق داعی الی الشر ہے۔ داعی الی الخیر کا نام روح القدس ہے اور داعی الی الشر کا نام ابلیس یا شیطان ہے۔ دونوں انسان کے قرین اور مصاحب ہیں۔ روح القدس انسان کو نیکی کے راستہ کی ہدایت کرتی ہے جبکہ شیطان برائی کے راستہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے مگر کسی بات پر جبر اور اکراہ نہیں جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا یعنی خدا بدی کا بھی الہام کرتا ہے اور نیکی کا بھی بدی کا الہام کا ذریعہ شیطان ہے جو بدخیالات دلوں میں ڈالتا ہے اور نیکی کے الہام کا ذریعہ روح القدس ہے جو نیک اور پاک خیالات دل میں ڈالتا ہے چونکہ اللہ تعالیٰ علت العلل ہے اس لیے یہ دونوں الہام اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر لیے۔

اگر اللہ تعالیٰ صرف داعی الی الشر (شیطان) پیدا کرتا اور داعی الی الخیر (فرشتہ) نہ ہوتا تو انسان کو سزا کیسی کیونکہ اس کو نیکی کے راستہ کی ہدایت ہی نہیں کی گئی اس طرح اگر صرف داعی الی الخیر (فرشتہ) پیدا کیا جاتا تو جزا اور انعام کیسا کیونکہ اس کے سامنے تو بدی کا راستہ ہی نہیں جس کی وجہ سے راہ ہدایت سے بھٹک سکے۔ انسان کو دونوں راستوں کی راہنمائی کر کے اس کو یہ آزادی دے رکھی ہے کہ جونسا چاہے راستہ اختیار کرے۔ ساتھ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ یہ بھی بتا دیا کہ اگر وہ نیکی کا راستہ اختیار کرے گا تو وہ اس قسم کے انعامات حاصل کرے گا۔ اگر بدی کا راستہ اختیار کرے گا تو اس قسم کی سزا پائے گا۔ گویا انسان کی ترقی کے لیے نوری اور ناری ہستیاں پیدا کی ہیں ان کے بغیر انسان ترقی کے راستہ پر قدم مار ہی نہیں سکتا۔ مسلم کی روایت ہے رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔

مامنکم احد الا وقد وکل به قرینه من الجن و قرینه من الملئکة قالوا وایاک یارسول الله قال ایای ولا کن الله اعاننی علیه فلا یامرونی الا بخیر کوئی تم میں سے ایسا نہیں کہ جس کے ساتھ ایک ساتھی جن کی نوع میں سے اور ایک مصاحب فرشتوں میں سے موکل نہ ہو۔ صحابی نے عرض کی کہ یارسول اللہ آپ ﷺ بھی فرمایا ہاں میں بھی۔ پر خدا نے میرے جن کو میرے تابع بنا دیا ہے وہ مجھے بجز نیکی کے کچھ نہیں کہتا۔

رسول کریم ﷺ نے یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انصاف کے ترازو میں برابری رکھنے کے لیے داعی الی الشر اور داعی الی الخیر پیدا کر دیے ہیں۔ اب انسان کا یہ کمال ہے کہ وہ داعی الی الشر کے راستہ پر گامزن نہ ہو بلکہ بھلائی کی طرف بلانے والے کی طرف منہ کرے اور اسی کی ہدایت پر چلے۔ یہی ارتقاء کا راستہ ہے اور اسی میں اس کی فلاح ہے۔

فلسفہ ایمان بالملائکہ

قرآن مجید کی رو سے ملائکہ پر ایمان لانا جزو ایمان ہے اور ایمان بالملائکہ انسان کو اس کی فضیلت، عزت نفس اور خودداری کا سبق یاد دلاتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا نائب ہے۔ اس نے اس کی ترقی کے لیے روحانی اور مادی دو نظام قائم کیے ہیں۔ یہ دونوں نظام اللہ تعالیٰ کے حکم سے درپردہ ملائکہ چلا رہے ہیں۔ اس لیے انسان پر فرض ہے کہ وہ شکر گزاری کے طور پر صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے ہی سرنگوں ہو۔ ماسوا اللہ کے سامنے سرنگوں ہونا اللہ تعالیٰ کی نیابت اور انسانی عظمت کے منافی ہے۔ اسی طرح ایمان باللہ کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان کی اور ہر قوم دوسری قوم کی تحریم و تکریم کرے کیونکہ زمین پر ہر شخص اللہ تعالیٰ کا نائب اور واجب الاحترام ہے۔ جو شخص بھی دوسرے کی رداء احترام چاک کرتا ہے وہ گویا ایمان باللہ کے تقاضے کی خلاف ورزی کرتا ہے اگر لوگ صدق دل سے ملائکہ پر ایمان لے آئیں تو دنیا سے فساد مٹ جاتا ہے اور دنیا کے ہر گوشہ میں امن قائم جاتا ہے۔

ایمان بالکتب

یہاں کتاب سے مراد وحی متلو ہے جو ہر نبی پر نازل ہوتی تھی۔ وحی متلو (کتاب) اور نبوت لازم ملزوم ہیں۔
کتاب احکام الٰہی کا وہ مجموعہ ہے جو اللہ تعالیٰ ہر نبی کے دور کے تقاضے کے مطابق ان پر نازل کرتا رہا ہے۔ وہ احکام انسان کی مادی اور روحانی ترقی کا ذریعہ تھے۔ انسان نے اپنے تمدن کی بنیاد اپنی عقل سے قائم نہیں کی تھی بلکہ اس کی بنیاد وحی الٰہی ہے۔
قرآن مجید میں کتب سماوی کو تین ناموں سے پکارا ہے۔ صحیفہ، زبور، کتاب اسلام نے کتب سماوی پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (البقرہ ۲:۴) جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا۔
دوسری جگہ آتا ہے۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (البقرہ ۲:۲۸۵) رسول اس پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب سے اس کی طرف اتارا گیا اور مومن بھی سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (النساء ۴:۱۳۶) اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لاؤ اور جو کتاب اس نے اپنے پیغمبر پر نازل کی اور جو کتابیں اس سے پہلے نازل کیں فرمایا۔ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (المائدہ ۵:۴۸) ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان کی محافظ ہے۔

فرمایا كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ (البقرہ ۲:۲۱۳) سب لوگ ایک ہی جماعت ہیں پس اللہ نے نبیوں کو بھیجا۔ خوش خبری دینے والے ڈرانے والے اور ان کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب اتاری۔ پھر ایک اور جگہ فرمایا۔ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْا بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ (آل عمران ۳:۱۸۳) پھر اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو تجھ سے پہلے بھی رسول جھٹلائے جا چکے ہیں جو کھلے دلائل اور صحیفے اور روشن کتاب لائے تھے۔
قرآن مجید میں صرف تین کتب کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔
تورات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی۔ انجیل جو عیسیٰ علیہ السلام کو دی گئی اور زبور جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔
ویسے تمام انبیاء علیہم السلام کو احکام الٰہیہ دے گئے تھے جیسا کہ یہ الفاظ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ظاہر کرتے ہیں۔

تمام کتب سماوی کی تعلیم ایک تھی: قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یونس ۱۰:۳۷) اور یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ کے سوا اوروں کا افتراء ہو بلکہ یہ اس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے ہے اور آسمانی تعلیم کی تفصیل ہے۔ اس میں شک نہیں ہے جہانوں کے رب کی طرف سے ہے۔
دوسری جگہ آتا ہے۔ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (القصص ۲۸:۵۱) اور ہم اپنا کلام ایک دوسرے سے ملتا ہوا انھیں پہنچاتے ہیں تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ اس آیت کریمہ میں بیان کیا گیا ہے کہ وحی کہیں ہوئی ہو۔ کسی پر نازل ہوئی ہو۔ وہ ایک ہی ہے۔ وہ ایک دوسرے کی مصدق اور موید ہیں اور سب کی غرض انسان کی مادی اور روحانی زندگی کو سنوارنا تھا۔ گویا ایک ہی چشمہ سے جاری ہونے کی وجہ سے سب کی تعلیم ایک ہی ہے۔

کتب سماوی: مذاہب عالم کے باب میں کتب سماوی کا ذکر گزر چکا ہے۔

قرآن مجید: قرآن مجید کے نزول، تدوین اور ذرائع حفاظت کے متعلق تفصیلی بحث ''مصادر اسلام'' کے باب میں گزر چکی ہے۔ یہاں قرآن مجید کے چند مزید پہلوؤں پر بحث کی جاتی ہے۔

خصائص قرآن، قرآن مجید ایک زندہ کتاب ہے

اعجاز قرآن

قرآن مجید کا بے مثل ہونا: قرآن مجید وہ کتاب ہے جس نے ہر پہلو سے بے مثل اور بے عدیل ہونے کا دعویٰ کیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِہٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ ظَھِیْرًا (بنی اسرائیل ۸۸:۱۷) کہہ دے اگر انس و جن جمع ہو جائیں اور کوشش کریں کہ اس قرآن کی مثل بنا لائیں تو وہ ہرگز اس کی مثل نہ بنا لاسکیں گے خواہ وہ ایک دوسرے کے ظہیر و مددگار بن جائیں۔

سورہ بقرہ میں منکرین کو صرف ایک سورہ کے مانند کلام پیش کرنے کا چیلنج دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ وَادْعُوْا شُھَدَآءَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا (بقرہ ۲:۲۳،۲۴) اگر تمھیں اس امر میں شک ہو کہ جو ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا تو تم اس کی مانند کوئی سورۃ بنا لاؤ اور اپنے گواہوں کو بلاؤ اگر تم سچے ہو۔ پس اگر تم نے اس کی مثل پیش نہ کی اور یاد رکھو کبھی نہ کر سکو گے۔

یہ دونوں آیات مجید کا بے مثل ہونا ظاہر کرتی ہیں۔

دلائل اعجاز: قرآن مجید کن کن پہلوؤں کے لحاظ سے معجزہ ہے ان کا احاطہ انسانی طاقت سے باہر ہے صرف چند ایک اعجازی پہلوؤں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

علمی لحاظ سے معجزہ: قرآن مجید دقائق علمیہ کا خزانہ ہے جن کو بوجہ فارق عادت ہونے کے علمی اعجاز کہنا چاہیے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِہٖ مَدَدًا (الکہف ۱۰۹:۱۸) کہہ اگر سمندر میرے رب کے کلمات کے لیے سیاہی بن جائیں تو سمندر ختم ہو جائے گا۔ قبل اس کے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں۔ گو ہم اسی جیسا اور اس کی مدد کو لائیں۔

ارشاد الٰہی ہے۔ مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ (انعام ۳۸:۶) اس کتاب (قرآن مجید) سے کوئی دینی اور مادی ضرورت باہر نہیں رہی بلکہ جمیع حقائق اور ضروریات انسانیہ اور معارف دینیہ پر مشتمل ہے۔

پھر ایک اور جگہ فرمایا۔ وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (النحل ۸۹:۱۶) یعنی ہم نے یہ کتاب (قرآن مجید) تجھ پر نازل کی ہے تمام (مادی اور روحانی) امور کو کھول کر بیان کرتی ہے یعنی تمام انسانی امور سے متعلق تعلیمات کو کھول کر بیان کرتی ہے۔

پھر فرمایا یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَھَّرَۃً فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ (البینہ ۳:۹۸) (رسول) جو پہلے صحیفے پڑھتا ہے جس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں۔ یعنی قرآن مجید وہ پاک اوراق ہیں جس میں تمام آسمانی کتب لب لباب اور خلاصہ بھرا ہوا ہے۔ آغاز قرآن مجید میں ہی ارشاد الٰہی ہے۔ الٓمّٓ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (البقرہ ۱:۲) یہ وہ کتاب ہے جس کو علم و خبیر ہستی نے نازل کیا ہے جس کا علم جہل و نسیان سے پاک ہے۔ اس لیے یہ وہ کتاب شک و شبہ سے بالاتر ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کا علم انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے اندر طاقت رکھتا ہے اس لیے یہ کتاب متقین کے لیے ایک مکمل ہدایت اور علمی ضابطہ حیات ہے۔

علماء اور فلاسفہ کے نزدیک جب تک کسی کتاب کے علل اربعہ کامل نہ ہوں وہ کتاب کامل نہیں کہلا سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیات میں علل اربعہ کا ذکر ہے۔ وہ چار علل یہ ہیں۔ علت فاعلی، علت مادی، علت صوری اور علت غائی۔

الٓمّٓ کا لفظ علت فاعلی کے کمال کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اَنَا اللّٰہُ اَعْلَمُ یعنی میں اللہ خوب جانتا ہے۔ یہ لفظ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہ کتاب عالم الغیب کی طرف سے نازل کی گئی ہے پس چونکہ علیم خدا اس کتاب کا علت فاعلی ہے اس لیے اس کتاب کا فاعل (خدا) ہر فاعل سے زبردست اور کامل ہے۔

علت مادی کی طرف یہ فقرہ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ اشارہ کر رہا ہے یعنی وہ کتاب ہے جس نے خدا کے علم سے خلعت وجود پہنا ہے۔ خدا کا علم کامل ترین ہے لہٰذا یہ کتاب علمی لحاظ سے اکمل ہے علت صوری کی طرف الفاظ لَا رَیْبَ فِیْہِ اشارہ کر رہے ہیں یعنی یہ کتاب ہر غلطی اور شک و شبہ سے پاک ہے۔ اسمیں شک و شبہ کیسے ہوسکتا ہے کہ یہ کتاب علیم و خبیر ہستی کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔ اس لیے وہ ہر عیب سے مبرا اور پاک ہے۔

علت غائی کے کمال کی طرف الفاظ ھدی للمتقین اشارہ کر رہے ہیں۔ یہ کتاب متقین کو منزل مقصود تک پہنچاتی ہے دوسری جگہ اس کتاب کو ھدی للناس قرار دیا ہے۔

قرآنی علوم کو چار موٹے موٹے عنوانات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے۔

(الف) روحانی علوم جن میں خدا کی توحید اور اس کی صفات کا علم، تعلق باللہ کا علم، ملائکہ کا علم، مبداء و معاد کا علم، اخلاق فاصلہ کا علم اور عبادات کا علم شامل ہے۔

(ب) معاشرتی علوم جن میں عمرانیات، علم سیاست، علم اقتصاد، علم قانون، علم تمدن، علم ہندسہ، علم نفس اور علم مناظرہ وغیرہ شامل ہیں۔

(ج) سائنسی علوم جن میں فضائیات، علم کیمیاء، علم طبیعیات، علم نباتات، علم طبقات الارض، علم الجبال، علم الحیوان، علم ہیئت اور علم طبابت وغیرہ شامل ہیں۔

(د) علوم لسانیہ جس میں صرف نحو، معانی بیان وغیرہ کے علوم شامل ہیں۔

قرآن مجید میں یہ سب علوم خدمت دین کے لیے بطور فارق عادت بیان ہوئے ہیں جن سے بڑے بڑے دقیق مسائل حل کیے جاسکتے ہیں خاص طور پر ہستی باری تعالیٰ ثابت کرنے کے لیے یہ علوم دست بستہ کھڑے نظر آتے ہیں۔

امور محتاج الاصلاح کے لحاظ سے معجزہ: اس سے مراد وہ امور کفر، بے ایمانی، شرک اور بدعملی مراد ہیں۔ جن کو لوگوں نے بجائے عقائد حقہ اور اعمال صالحہ اختیار کر رکھا ہو۔ قرآن مجید کے نزول سے قبل اہل عرب ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے۔ جن سے قوم کا نجات پانا محال نظر آتا تھا۔ یہ حالت صرف اہل عرب کی ہی نہیں تھی بلکہ تمام عالم ہر قسم کی گمراہی کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔ اس گمراہی اور ظلمت کے زمانہ میں قرآن مجید نے عربوں کو ہر قسم کی بدی سے نجات دلا کر با اخلاق اور باخدا انسان بنایا اور ہر قسم کی بدرسوم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔

موسیو سیڈیو فرانسیسی لکھتا ہے اسلام کو جو لوگ وحشیانہ مذہب کہتے ہیں انھوں نے قرآن مجید کی تعلیم کو نہیں دیکھا، جس کے اثر سے عربوں کی تمام بری اور معیوب عادتوں کی کایا پلٹ ہوگئی۔ (بحوالہ تاریخ احزان مصنفہ مولانا عبدالقیوم ندوی ص ۱۷)

مسٹر ٹامس کار لائل انگلستان کا فاضل اپنی کتاب ''لیکچرز آن ہیروز'' میں لکھتا ہے۔ اسلام قوم عرب کے حق میں گویا تاریکی میں روشنی کا آنا ہے۔ عرب کا ملک پہلے پہل اس کے ذریعہ زندہ ہوا۔

فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ: قرآن مجید اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے اس کا اعتراف نہ صرف مسلمانوں کو ہے بلکہ مخالفین کو بھی۔ نزول قرآن مجید کے وقت عرب میں بے شمار فصیح اللسان خطیب اور شاعر تھے۔ جن کی زبان آوری مسلمہ تھی۔ سب فصحاء و بلغاء قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کے سامنے اپنے آپ کو ضعیف اور پست سمجھنے لگ پڑے ان کے بلغاء کو قرآن کی فصاحت و بلاغت کا اعتراف کرنا پڑا لبید مجموعہ قصائد ''سبعہ معلقہ'' کا شاعر تھا جب وہ مسلمان ہوا تو اس نے شعر کہنے ترک کر دیے اور کہا کرتا تھا۔ ''جب خدا نے مجھے سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران سکھائی ہے تو اب مجھے شعر کہنا موزوں نہیں۔ پاپولر انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے۔

''قرآن کی زبان بلحاظ لفظ عرب نہایت فصیح ہے اس کی انشائی خوبیوں نے اب تک بے مثل اور بے نظیر ثابت کیا ہے۔''

''قرآن مجید اثر ڈالنے، یقین دلانے کی طاقت فصاحت و بلاغت اور تراکیب و بندش الفاظ میں بے نظیر ہے اور دنیائے سائنس کے تمام شعبوں کی حیرت انگیز ترقی کا باعث ہے۔ (ہرش فیلڈ نیو ریسرچز صفحہ ۸، ۹)

''یہ امر کہ عرب کے بہترین مصنف بھی قرآن کی خوبیوں کے برابر کوئی چیز پیدا کرنے پر قادر نہ ہوئے کوئی تعجب کی بات نہیں۔ (Palmer Introduction P.58)

جارج سیل لکھتا ہے ''قرآن کریم بے شبہ عربی زبان کی سب سے بہتر اور سب سے مستند کتاب ہے کسی انسان کا علم ایسی معجزانہ کتاب نہیں لکھ سکتا یہ مردوں کو زندہ کرنے سے بڑھا ہوا معجزہ ہے۔''

ڈاکٹر موریس فرانسیسی لکھتا ہے ''قرآن کی سب سے بڑی تعریف اس کی فصاحت و بلاغت ہے مقاصد کی خوبی اور مطالب کی خوش اسلوبی کے اعتبار سے قرآن کو تمام آسمانی کتابوں پر فوقیت ہے۔''

قوت تاثیر کے لحاظ سے معجزہ: قرآن مجید کے الفاظ میں خارق عادت تاثیر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِنَ الْاَنْبَآءِ مَافِيْهِ مُزْدَجَرٌ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ (قمر ۵۴: ۴، ۵) اور یقیناً ان کو (قرآن کے ذریعہ) وہ باتیں پہنچ چکی ہیں جن میں تنبیہ ہے۔ یہ قرآن دل تک پہنچ جانے والی دانائی ہے مگر ڈرانا کسی کام نہ آیا۔

اس قوت تاثیر سے ڈر کر مخالفین لوگوں کو قرآن مجید کے سننے سے روکتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ جب کوئی مسلمان قرآن پڑھ کر سنانے لگے تو شور کرو۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (حٰمٓ السجدہ ۴۱: ۲۶) یعنی کفار نے کہا کہ اس قرآن کو سنا نہ کرو اور اس کے پڑھنے کے وقت شور وغل کیا کرو شاید تم غالب آجاؤ۔

حضرت عمرؓ کا اسلام لانے کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ گھر سے جو رسول کریم ﷺ کو قتل کرنے کے لیے نکلتے ہیں اپنی بہن کے گھر سے قرآن مجید کی

آیات سن لیتے ہیں تو ان کے دل میں قرآن کی صداقت اور حقانیت میخ کی طرح گڑ جاتی ہے اور رسول کریم ﷺ کی اطاعت کا جوا اپنی گردن پر رکھ کر باہر نکلتے ہیں۔ سیدھا رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور دائرہ اسلام میں داخل ہو کر اشاعت قرآن کا عہد کرتے ہیں۔ سبعہ معلقہ کا شاعر لبید سورۃ بقرہ کی چند آیات پڑھ کر بے اختیار بول اٹھا کہ خدا اور اس شخص کے سوا جس پر وحی نازل ہوئی ہے کوئی ایسا کلام نہیں کر سکتا۔ اور دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے جارج سیل مشہور مستشرق نے بھی لبید کے ایمان لانے کے واقعہ کی تصدیق اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں کی ہے۔

خالد بن عتبہ، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت طفیل بن عمرو اور بے شمار صحابہ تھے جنھوں نے قرآن مجید کی چند آیات سنیں اور وہ مسلمان ہو گئے۔

جان ریسک جرمن فلاسفر کہتا ہے ''جبکہ قرآن پیغمبر ﷺ کی زبان سے منکر سنتے تھے تو بے تاب ہو کر سجدے میں گر جاتے تھے اور مسلمان ہو جاتے تھے۔'' (بحوالہ تاریخ القرآن مصنفہ عبدالقیوم ص ۱۷)

جارج سیل لکھتا ہے ''قرآن مجید کا طرز بیان دلکش اور اس میں روانی ہے اور بہت سے مقامات پر خصوصاً اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی عظمت و شان اور جلال کا ذکر ہے۔ اس کا طرز بیان اور بھی دلکش اور شاندار اور بلند پایہ ہے۔ وہ (ﷺ) اس قدر کامیاب ہوا اور اس نے اپنے سامعین کے قلوب کو اس قدر مسخر کیا کہ کئی مخالف یہ خیال کرنے پر مجبور تھے کہ یہ گویا کسی جادو یا سحر کا اثر ہے۔ (Sale preliminary)

عدم اختلاف کے لحاظ سے معجزہ: قرآن مجید تیئس برس دکھ اور سکھ کے مختلف اوقات میں نازل ہوتا رہا۔ یہ ایک ایسے شخص پر نازل ہوا جو محض امی تھا۔ رسول کریم ﷺ کو اس قدر مختلف حالات زندگی میں سے گزرنا پڑا کہ منصوبہ باز شخص ان حالات میں ایک حالت پر قائم ہی نہیں رہ سکتا اس کے نظریات اور عقائد بدلتے رہتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ پر ایک وہ وقت آیا جب اپنی قوم کی اصلاح اور بہتری کے لیے غار حرا میں آہ و بکا کیا کرتے تھے۔ پھر رداء نبوت اوڑھ کر میدان عمل میں آ گئے تو چاروں طرف سے مخالفت کے بادلوں میں گھر گئے کیا اپنے اور کیا بیگانے سبھی جان لیوا بن گئے۔ آخر کار مکہ معظمہ سے ہجرت کرنا پڑی اور مدینہ چلے گئے ان کے سر پر سیادت کا تاج رکھ دیا گیا ایک چھوٹی سی ریاست کی بنیاد پڑ گئی۔ ریاست اور صحابہ کی جانوں کی حفاظت کے لیے میدان جنگ میں اترنا پڑا تمام قبائل مخالف ہو گئے۔ مدینہ میں یہود ریشہ دوانیوں میں مصروف ہو گئے۔ منافقوں کی ایک جماعت پیدا ہو گئی۔ آپ ﷺ ان پرخطر حالات میں اسلام کی کشتی کو سلامتی کے ساتھ پار اتارنے کے لیے کوشاں رہے۔ آخر وہ وقت آ گیا مخالفت کے بادل چھٹ گئے۔ دشمن مغلوب ہوئے۔

کیا کوئی انسان یہ بات ذہن میں لا سکتا ہے کہ اس قسم کے مختلف حالات میں انسان ایک ہی حالت پر قائم رہے اور جو وہ کلام پیش کرے اس میں اختلاف نہ ہو۔ یہ انسانی طاقت سے تو باہر ہے ہاں! اختلاف سے پاک کلام وہی ہو سکتا ہے جو ایک علیم و خبیر ہستی کی طرف سے نازل ہو۔ قرآن مجید میں بھی منافقوں اور مخالفوں کو مخاطب کر کے کہا ہے۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (النساء ۴:۸۳) پھر کیا وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے۔ اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں ضرور اختلاف پاتے۔

غیب کی خبروں کا اعلان کرنے کے لحاظ سے معجزہ: قرآن مجید غیب کی خبروں سے بھرا پڑا ہے۔ رسول کریم ﷺ امی تھے۔ ماضی کے حالات سے بالکل نابلد تھے۔ پھر اس دور میں ماضی کے حالات معلوم کرنے کے بھی کوئی ذرائع نہ تھے۔ قرآن مجید ماضی کے واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ مثلاً انبیاء علیہم السلام کے واقعات اور سرکش قوموں کی تباہی کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ بعض وہ خبریں جو مستقبل سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً فرعون کی لاش کے متعلق خبر کہ وہ محفوظ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (یونس ۱۰:۹۲) سو آج ہم تیری لاش کو محفوظ رکھیں گے تاکہ تو ان کے لیے جو تیرے پیچھے ہیں نشان رہے اور بہت سے لوگ ہمارے نشانوں سے بے خبر ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابل پر جو فرعون تھا اس کا نام رعمیسس ثانی تھا۔ انسائیکلوپیڈیا بری ٹانیکا میں مضمون ممی کے تحت لکھا ہے۔ رعمیسس ثانی کی لاش آج تک ان لاشوں میں محفوظ ہے جو مسالح کے ذریعے رکھی جاتی ہیں۔ آج اس پیشگوئی کو پورا ہوتے ہوئے دیکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قرآن مجید خدائے عالم الغیب کا ہی کلام ہے۔

اسی طرح قرآن مجید نے بائبل میں تحریف و تغیر کا دعویٰ اس وقت کیا جب دنیا علمی حیثیت سے ناآشنا تھی آج تمام محققین نے اس امر کا اعتراف کر لیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ. (بقرہ ۲:۷۵) پس کیا تم امید رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے اور ان میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اللہ کے کلام کو سنتا ہے پھر سمجھ لینے کے بعد اس کو بدل دیتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے۔

پادری ویری اخبار نور افشاں لدھیانہ جلد ۲ نمبر ۲۸ صفحہ ۱۲۳ کالم ۳ مورخہ ۶ جولائی ۱۸۷۴ء میں لکھتا ہے۔

''جعلی انجیلوں کے موجود ہونے سے ہم ناواقف نہیں ہیں بلکہ جن جعلی انجیلوں کا ہارن صاحب نے اپنی تصنیف میں حوالہ دیا ہے وہ ہمارے پاس موجود ہیں ان کو بعض بدعتی عیسائیوں نے مروج کرنا چاہا تھا مگر وہ اپنے فاسد ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔

پادری موشیم اپنی تاریخ کلیسا مطبوعہ ۱۸۶۰ء جلد دوم صفحہ ۳۶ پر لکھتا ہے۔

متعدد وجوہ ایسے تھے جس کے باعث ضرورت محسوس ہوئی کہ پہلی صدی عیسوی میں مروجہ انجیلوں کو ایک نسخہ میں جمع کر دیا جائے۔ دنیا میں بہت سی ایسی تحریریں پھیل گئی تھیں جن پر پاک پیغمبروں کے نام بطور مصنفین درج کر دیے گئے تھے۔

ہارن صاحب اپنی تفسیر بائبل مطبوعہ لندن ۱۸۲۲ء جلد دوم صفحہ ۳۳۱ پر لکھتا ہے۔

بلاشبہ بعض تحریفیں جان بوجھ کر ان لوگوں نے کی ہیں جو دین دار، پرہیزگار اور راہب تھے۔ غضب یہ ہے کہ بعد میں انہی تحریفات کے سچا ہونے پر اصرار کیا جاتا تھا تاکہ اپنے مطلب کو قوت دیں یا اپنے پر کوئی اعتراض نہ آنے دیں۔

یاجوج ماجوج (عیسائی اقوام) کی ترقی کے متعلق پیشگوئی سورہ کہف میں موجود ہے جو روز روشن کی طرح پوری ہوئی ہے۔ اسی پیشگوئی کے پورا ہونے کا وقت آن پہنچا ہے۔ عیسائی اقوام کے ظلم وستم اپنی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔ وہ اندھے اور مست ہاتھی کی طرح اسلامی ممالک روندتے چلے جا رہے ہیں۔ اس ظلم و ستم کی تاریک رات میں مسلمان بیداری کی کروٹ لے رہے ہیں اب وہ وقت دور نہیں کہ یہ جارح اقوام اپنے ہی تکبر وغرور کی آگ میں جل کر راکھ ہو جائیں گی۔ اور قرآن مجید کی صداقت کا سورج ہر طرف ضوء پاشی کرتا ہوا نظر آئے گا۔ اور یہی اقوام اسلام کے دامن میں پناہ لیں گی۔

قوت دلائل کے لحاظ سے معجزہ: قرآن مجید کا نام بینہ ہے جس کے معنی ہیں واضح اور کھلی دلیل ارشاد الٰہی ہے۔ فَقَدْ جَآءَکُمْ بَیِّنَۃٌ مِنْ رَّبِّکُمْ (الانعام ۶:۱۵۷) یقیناً تمھارے پاس تمھارے رب کی دلیل آ چکی ہے۔

قرآن مجید کا قاری آسانی سے یہ جان سکتا ہے کہ قرآن مجید دعویٰ کو دلائل و براہین قاطعہ کے منواتا ہے اور تمام دعاوی، دلائل سے واضح کیے ہیں مخالف ایک بھی ایسا دعویٰ دکھا نہیں سکتا جس کو دلیل سے واضح نہ کیا ہو۔ قرآنی دلائل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ خصم اس دلیل کو رد نہیں کر سکتا۔ قرآنی دلائل اپنے اندر اعجازی قوت رکھتے ہیں۔

معجزات تصرفات خارجیہ: قرآن مجید میں تصرفات خارجیہ بھی بکثرت درج ہیں۔ یہ معجزات قرآن مجید کے جمال کے لیے بطور زیور ہیں اور قرآن مجید کے حسن کو دوبالا کر رہے ہیں۔ ایک معجزہ شق قمر کا ہے جو رسول کریم ﷺ کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اپنا قادرانہ تصرف دکھلایا اور چاند کو دو ٹکڑے کر دیا۔ دوسرے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا سے زمین پر کیا۔ ایک سخت قحط سات برس تک ڈالا۔ لوگوں نے ہڈیوں کو پیس کر کھایا۔ پھر ابوسفیان کی التجا پر رسول کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے قحط دور کرنے کی دعا کی اور قحط سالی ختم ہو گئی۔ تیسرے اللہ تعالیٰ کا وہ تصرف ''وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ'' یعنی اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو شر کفار سے محفوظ رکھنے کے لیے ہجرت کے موقعہ پر دکھایا۔ یعنی جب کفار مکہ نے رسول کریم ﷺ کو قتل کرنے کے لیے دارالندوہ میں مشاورت کی۔ تو علیم خبیر ہستی نے اس ناپاک ارادہ کی خبر دے دی۔ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دے دیا۔ پھر اسی بے بسی اور بے چارگی کی حالات میں یہ بشارت دی۔ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی الْمَعَادِ (وہ ذات جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے تجھے فتح و نصرت سے واپس لائے گا۔)

عدوان اسلام نے رسول کریم ﷺ کو ختم کر دینے کی نیت سے رات کے وقت چاروں طرف گھر کا محاصرہ کر لیا۔ تب اپنے عزیز حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لٹایا اور دشمنوں کی آنکھوں پر نیند کا پردہ ڈال کر اپنے جان نثار ساتھی حضرت ابوبکرؓ کے گھر جاتے ہیں جو پہلے مصاحبت کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے گھر سے نکل کر غار ثور میں جاتے ہیں کسی دشمن نے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ امر خارق عادت دکھلایا کہ اللہ تعالیٰ نے کبوتر کا جوڑا بھیج دیا جس نے اس رات غار کے دروازہ پر آشیانہ بنا دیا اور انڈے بھی دے دیے اسی طرح اذن الٰہی سے مکڑی نے اس غار کے منہ پر جالا بن دیا۔ جب دشمن غار کے منہ پر پہنچا تو رسول کریم ﷺ دشمن کے پاؤں دیکھ رہے ہیں اور حضرت ابوبکرؓ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اگر ذرا بھی جھک کر غار کے اندر دیکھیں تو پکڑے جائیں گے۔ اس وقت اپنے غار کے ساتھی حضرت ابوبکرؓ کو ان الفاظ میں تسلی دیتے ہیں۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (غم نہ کیجیے اللہ ہمارے ساتھ ہے) دشمن دھوکا کھا کر واپس لوٹ جاتے ہیں اور اعلان کر دیتے ہیں جو محمد ﷺ اور ابوبکرؓ کو پکڑے گا اس کو سو اونٹ انعام دیے جائیں گے۔ سراقہ نے یہ خبر پا کر فلاں راستہ پر فلاں قبیلہ کے رہگذر جا رہے ہیں اس راستہ کی طرف اپنا باد رفتار گھوڑا ڈال دیا۔ سراقہ نے آپ ﷺ کو دیکھ لیا تو لالچ میں اپنے گھوڑے کو مہمیز کیا۔ جب سراقہ قریب پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے پھر امر خارق عادت دکھلایا۔ گھوڑے کے چاروں سم زمین میں گھس گئے اور وہ گر پڑا۔ پھر رسول کریم ﷺ سے امان مانگ کر اور عفو تقصیر کروا کر واپس لوٹنے لگا تو رسول کریم ﷺ نے کشفی حالت میں اللہ تعالیٰ سے علم پا کر بتایا سراقہ! اس وقت تیری کیا حالت ہو گی جب تیرے ہاتھوں میں

کسریٰ کے شاہی کنگن پہنائے جائیں گے۔ یہ پیشگوئی حضرت عمرؓ کے دور میں پوری ہوئی۔ جب ایران فتح ہوا تو کسریٰ کا تاج اور زیورات فاروق اعظم کے سامنے رکھے گئے سراقہ کو بلایا گیا اور اس کے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن پہنائے گئے۔ اس اعجازی حفاظت کے سایہ میں جب رسول کریم ﷺ مدینہ پہنچ گئے تو دشمن نے رسول کریم ﷺ کو صفحہ ہستی سے نابود کرنے کے لیے ہجرت کے دوسرے سال مدینہ پر لشکر کثیر کے ساتھ حملہ کر دیا۔ یہاں پھر تصرف اعجازی نے رنگ دکھایا کہ رسول کریم ﷺ نے مٹھی کنکریوں کی پھینکی تو میدان جنگ میں ایک اعجازی صورت پیدا ہوئی کہ تمام عدوان اسلام اپنے انجام بد کو پہنچے اور ان کی لاشیں انہی مقامات پر گریں جن کی پہلے رسول کریم ﷺ نے نشان دہی کر دی تھی۔ رسول کریم ﷺ کا ہر معرکہ معجزہ تصرف خارجیہ تھا۔ وہ بے بسی کے عالم میں مکہ سے نکالا ہوا شخص تمام عرب پر غالب آ گیا۔ (ﷺ) اور تیس سال کے کم عرصہ میں ان کے خلفاء فتوحات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ایک عالم پر فتحیاب ہوئے۔ شام مصر ایران کی سلطنتیں ان کے قدموں کے نیچے تھیں۔ ان تمام فتوحات کے پیچھے فساد اور قتل و غارت کی بو نہیں آتی بلکہ اصلاح بین الناس اور مظلومین کی اعانت نظر آتی ہے۔ وہی علاقے جو رعایا کے لیے دوزخ تھے۔ وہ ان کے لیے جنت بن گئے۔ ان فتوحات میں ایک مثال نہیں ملتی کہ کسی کو اکراہاً و جبراً مسلمان بنایا ہو۔ ان ممالک کے اسلام قبول کرنے کی پیشگوئی قرآن مجید میں پائی جاتی ہے۔ دنیا کے تمام مورخین اور صاحب بصیرت اور دانشمند لوگوں نے گواہی دی ہے کہ جس تیزی سے اسلامی سلطنت دنیا میں پھیلی ہے۔ اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی اور ظاہر ہے جس امر کی دنیا میں نظیر نہ پائی جائے اس کو خارق عادت کہا جاتا ہے۔ غرض قرآن مجید میں تصرفات خارجیہ کا ذکر بطور خارق عادت بہت جگہ آیا ہے۔

۲۔ نسل انسانی کی وحدت کا پیغام: قرآن مجید ہی ایک ایسی آسمانی کتاب ہے جو نسل انسانی کی وحدت کا پیغام دیتی ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔
كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس ۱۰:۱۹) سب لوگ ایک ہی امت ہیں لیکن وہ آپس میں اختلاف کرتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (المومنون ۲۳:۵۲) یہ تمہاری قوم ایک ہی قوم ہے اور میں تمہارا رب ہوں سو مجھ سے ہی ڈرو۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ اِنَّ الْعِبَادَ كُلُّهُمْ اِخْوَةٌ کہ تمام انسان بھائی بھائی ہیں اور یہی پیغام سورہ فاتحہ کی آیت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (سب تعریفیں اس اللہ کی ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے) میں دیا گیا ہے۔

تمام آسمانی کتب کا مطالعہ کر لیجئے کہ ان میں نسلیت اور قومیت کا ذکر ہے کیونکہ ہر نبی اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ لہٰذا ان کے پیغام میں قومیت کی ہی جھلک نظر آنا لازمی امر ہے۔ رسول کریم ﷺ کا پیغام عالمگیر ہے اس لیے آپ نے تمام اقوام عالم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کا پیغام دیا ہے۔

۳۔ اکمل ہونے کا دعویٰ: سماوی کتب میں سے قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جس نے مکمل ہونے کا دعویٰ کیا ہے، ارشاد الٰہی ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ ۵:۳) آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے۔ تمہارا دین اسلام ٹھہرا کر راضی ہوا ہوں۔

اکمل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کتاب کی تعلیم زندگی کے ہر شعبہ کی راہنمائی کرتی ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔ مَا فَرَّطْنَا فِى الْكِتٰبِ مِنْ شَىْءٍ (الانعام ۶:۳۸) ہم نے کتاب (قرآن مجید) میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی۔ یعنی نوع انسانی کی ضرورت کی کوئی ایسی چیز نہیں جو اس میں بیان نہ ہوئی ہو۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینہ ۹۸:۳) اس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں یعنی قرآن مجید میں بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے علوم اوّلین و آخرین درج ہیں۔

۴۔ تکریم انسانیت: جو بلند مقام قرآن مجید نے انسان کو دیا ہے کسی دوسری کتاب نے نہیں دیا قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْۤ اٰدَمَ اور ہم نے نوع انسان کو قابل تکریم بنایا ہے۔

اس کے برعکس ہندو اچھوتوں کو انسانیت کا درجہ دینے کو تیار نہیں۔ یہود غیر یہود کو بے دین کافر کہتے ہیں۔ انجیل غیر بنی اسرائیلوں کو کتا اور سور کا نام دیتی ہے غرض کہ ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک غیر اقوام بے دین، ملیچھ سور اور کتے ہیں قرآن مجید کا دنیا پر یہ ایک بڑا احسان ہے کہ اس نے تمام انسانوں کو انسانیت کے دائرہ میں داخل کر کے سب کو قابل تکریم قرار دیا ہے۔

۵۔ قرآن مجید پہلی کتب سماوی کا مصدق ہے: قرآن مجید ہی ایک ایسی آسمانی کتاب ہے جو پہلی سماوی کتب کی تصدیق کرتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (بقرہ ۲:۴۱) یعنی ایمان لاؤ جو میں نے اتارا اس کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے۔ اس آیت میں بنی اسرائیل کی کتب کی تصدیق ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ (المائدہ ۵:۴۸) قرآن مجید اس سے قبل تمام کتب منزلہ کی

تصدیق کرتا ہے۔

۶۔ قرآن مجید پہلی شرائع کو منسوخ کرتا ہے: قرآن مجید میں آتا ہے۔ مَانَنسَخْ مِنْ ایَةٍ اَوْ نُنسِهَانَاْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا اَوْ مِثْلِهَا (البقرہ ۲:۱۰۶)
یعنی جو پیغام ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسا لے آتے ہیں۔
اس آیت کے سیاق و سباق سے ظاہر ہے کہ یہاں شرائع سابقہ کے متبعین مخاطب ہیں اس وجہ سے آیت سے مراد شرائع سابقہ ہیں آیت کا لفظ رسالت اور پیغام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

۷۔ عالمگیر ہونے کا دعویٰ: کسی آسمانی کتاب نے عالمگیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ایک تو وجہ یہ ہے کہ تمام سابقہ کتب کسی ایک قوم کی راہنمائی کے لیے آئی تھیں۔ دوم جس زمانہ میں وہ کتب نازل ہوئی تھیں وہ عالمگیر دعویٰ کا مقتضی نہیں تھا جب قرآن نازل ہوا۔ ایک تو اس نے عالمگیر ہونے کا دعویٰ کیا دوم وقت بھی اس کا تقاضا کرتا تھا کہ کوئی ایسی کتاب نوع انسانی کی ہدایت کے لیے نازل ہو۔ جو عالمگیر ہو تا کہ تمام نوع انسانی کو ایک قوم کی طرح بنا دے۔
قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِيْنَ (یوسف ۱۲:۱۰۴) یہ کتاب تمام جہانوں کے لیے نصیحت ہے۔
دوسری جگہ آتا ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا ۳۴:۲۸) اے رسول! ہم نے تجھے تمام لوگوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

۸۔ قرآن مجید میانہ روی کی تعلیم دیتی ہے: قرآن مجید اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ فاتحہ میں راہ اعتدال پر چلنے کی دعا سکھائی ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (فاتحہ ۶۔۷) اے خدا ہمیں سیدھا راستہ دکھا ان لوگوں کا راستہ جس پر تیرے انعام ہوئے ان لوگوں کا راستہ نہ دکھا جن پر تیرا غضب ہوا اور گمراہ ہوئے۔ غیر المغضوب علیھم سے مراد بموجب حدیث یہود ہیں۔ جنھوں نے نبی کا انکار کر کے تفریط کی راہ اختیار کی۔ ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں۔ جنھوں نے معصوم بندہ کو خدا کا رتبہ دے دیا اور افراط کا راستہ اختیار کیا ایک مسلمان کو افراط اور تفریط کے راستہ سے بچ کر صراط مستقیم یعنی درمیانی راستہ پر چلنے کی دعا سکھائی۔ اس وجہ سے امت مسلمہ کو امت وسطیٰ کہا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (البقرہ ۲:۱۴۳) اور اس طرح ہم نے تم کو امت وسطیٰ بنایا ہے۔ امت وسطیٰ سے مراد ایسی جماعت ہے جو افراط اور تفریط سے پاک ہونے کی وجہ سے ارفع سے ارفع مقام پر پہنچی ہو۔

۹۔ پہلی کتب کے اجمال کو کھولتا ہے: پہلی کتب سماوی میں جو اجمال اور ابہام رہ گیا تھا۔ قرآن مجید ان کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یونس ۱۰:۳۷) اور یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ کے سوا اوروں کا افتری ہو اس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے ہے اور کتاب کی تفصیل ہے جس میں کوئی شک نہیں جہانوں کے رب کی طرف سے ہے۔ اس آیت میں قرآن مجید کی دو شانیں بیان ہوئی ہیں۔

ا۔ تصدیق بین یدیہ۔ ۲۔ تفصیل کتاب

دوسری جگہ آتا ہے۔ الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ (الحجر ۱۵:۱) میں اللہ دیکھنے والا ہوں یہ کتاب کی آیات ہیں اور قرآن کی جو کھول کر بیان کرنے والا ہے۔
قرآن کے ساتھ مبین کی صفت لا کر یہ ظاہر کیا گیا ہے یہ ان تمام باتوں کو کھول کر بیان کرنے والا ہے جو پہلی کتب میں اجمال کے طور پر بیان ہوئی تھیں۔ مثلاً مسئلہ معاد، صفات الٰہیہ، رویت باری تعالیٰ نعماء جنت و سزا دوزخ وغیرہ۔

۱۰۔ دعویٰ کے ساتھ دلیل: قرآن مجید کسی دعویٰ کو بغیر دلیل کے نہیں منواتا اس وجہ سے شروع میں ہی قرآن مجید نے لَا رَيْبَ کہہ کر قارئین کی توجہ اس طرف پھیر دی ہے کہ دعویٰ کے ساتھ دلائل و براہین ہوں گے جس کی وجہ سے شک و ابہام کی گنجائش نہیں رہے گی۔ یہ کتاب انسانی فطرت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر قسم کے دلائل دیتی ہے تا کہ شک و شبہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے مثلاً قرآن مجید نے اللہ کی ہستی منوانی ہے تو انسانی فطرت کو مدنظر رکھ کر تین قسم کے دلائل پیش کرتا ہے۔

ا۔ مادی دلیل کائنات سے اخذ کی گئی ہے۔
۲۔ داخلی دلیل نسل انسانی کا داخلی تجربہ ہے کیونکہ ہر انسان کے اندر ایک روشنی ہے جو اس کو بتاتی ہے کہ اس سے اوپر ایک غالب ہستی ہے۔

۳۔ روحانی دلیل، وحی الٰہیہ سے اخذ ہوتی ہے جب انسان نیک راہوں پر چل کر خدا سے مشرف کلام ہوتا ہے۔
دوسری کتب مذاہب اپنے پیش کردہ دعاوی کے ثبوت کے لیے انسانوں کی محتاج ہوتی ہیں۔

۱۱۔ عقائد باطلہ کا رد: قرآن مجید میں آتا ہے۔ مَا اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِیۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِیۡهِ وَهُدًی وَّ رَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ (النحل ۱۶:۶۴) ہم نے اس کتاب کو تجھ پر اس لیے نازل کیا ہے تا کہ جو عقائد باطلہ عقول ناقصہ کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں ان سب کا رد کیا جائے۔ ایمان داروں کے لیے ہدایت اور رحمت کا موجب ہے۔

فلسفہ ایمان بالکتب: کتب سماوی پر ایمان لانے میں یہ راز مضمر ہے کہ کتب سماوی اللہ تعالیٰ کے احکام کی حامل ہوتی ہیں۔ جن پر عمل کر کے انسان اپنی دنیوی اور اخروی زندگی سنوار سکتا ہے۔

ایمان بالرسل

مسئلہ نبوت بھی علم کلام کے مسائل میں سے اہم اور متنازع مسائل میں سے ہے۔ نبوت کی تعریف اور ماہیت میں حکماء کا اختلاف ہے۔

رسول اور نبی: انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا اصول دین میں شامل ہے۔ رسول، رسالت سے مشتق ہے۔ رسالۃ کے معنی ہیں پیغام اور رسول کے لفظی معنی ہیں پیغامبر، قاصد۔ لفظ رسالۃ میں بھیجنے والے پیغام لے جانے والے اور جس کی طرف پیغام ہے کا مفہوم شامل ہے۔ گویا یہ لفظ پیغام رسانی کے لیے مستعمل ہے۔

اصطلاحی معنی میں رسالت کا معنی محض پیغام نہیں بلکہ اللہ کا پیغام ہے اور رسول کا مطلب صرف پیغامبر نہیں بلکہ اللہ کا پیغام لانے والا ہے۔

لفظ نبی بناء سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ کسی بڑی افادیت کا اعلان جو کسی چیز کا علم دے۔ (مفردات امام راغب) امام راغب نے یہ بھی لکھا ہے کہ لفظ نباء ایسی اطلاع یا ایسے علم پر استعمال ہوتا ہے جو کذب و افتراء کے تمام امکانات سے پاک ہو۔

بعض لغت نویسوں کے نزدیک نبی کا لفظ نبوۃ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی رفعت یعنی بلندی ہیں نبی کو اس کے بلند مقام کے لحاظ سے نبی کہا گیا ہے۔ (امام راغب) نبوت، سفارت ہے یعنی پیغام رسانی اللہ اور اس کی مخلوق میں سے ذی العقول کے درمیان۔ (امام راغب) قاموس میں ہے۔ کہ نبی اللہ تعالیٰ کے متعلق خبر دینے والے کو کہتے ہیں۔ جس کی مزید تشریح تاج العروس میں یوں کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی توحید کی خبر دیتا ہے جس پر اسرار غیبیہ کھولتا ہے۔ (تاج العروس)

قرآن مجید میں نبی اور رسول بطور الفاظ متبادلہ مستعمل ہوئے ہیں۔

اصطلاحی مفہوم: اسلامی اصطلاح میں نبی اور رسول وہ مطہر اور برگزیدہ ہستیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان سفارت کا کام انجام دیتی ہیں اور ان کو اللہ کی رضا کی راہوں پر چلاتی اور پہنچاتی ہیں۔

گویا یہ مطہر ہستیاں خدا کا نمائندہ اور ترجمان ہوتی ہیں جو وحی الٰہی کے ذریعہ احکام خداوندی کو بندوں تک پہنچاتی ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم ۵۳:۳،۴) وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا بلکہ وہی کہتا ہے جو اس کی طرف وحی کی جاتی ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖ (المائدہ ۵:۱۱۷) میں نے ان سے اس کے سوا کچھ نہیں کہا۔ جس کا آپ نے مجھے حکم دیا ہے۔

نبوت کی ضرورت: اسلامی نقطہ نگاہ سے انسانی زندگی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی بندگی اور فرمانبرداری ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی بندگی اور فرمانبرداری کے لیے پیدا کیا ہے۔

اب انسان اس بات کا محتاج ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کیا ہے؟ وہ کن کاموں کی اجازت دیتا ہے اور کن کی ممانعت کرتا ہے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو براہ راست یہ شرف نہیں دیتا کہ وہ اس سے ہم کلام ہو پس ہماری اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اس نے رسالت کا سلسلہ قائم فرمایا جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہماری ضرورت کے لیے سورج اور چاند زمین ہوا اور پانی وغیرہ پیدا کیے ہیں جن سے ہم مادی زندگی کے لیے فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ اسی طرح انسانی ضرورت کے لیے نبوت کا نظام قائم فرمایا کہ وہ اپنے منتخب بندوں کے ذریعے عام انسانوں تک اپنی ہدایت اور اپنا قانون پہنچایا کرے گا۔ اگر یہ مطہر ہستیاں دنیا میں نہ آتیں تو صراط مستقیم کا پانا اور صراط مستقیم پر چلنا ایک ممتنع اور محال امر ہو جاتا ہے۔

کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ انسان اپنی عقل سے بھی راہ ہدایت پا سکتا ہے سلسلہ انبیاء کی کیا ضرورت تھی۔ انسان کی عقل کوتاہ اور ناقص ہے۔ دنیا کے حکماء نے عقل کی کوتاہ بینی کا اقرار کیا ہے۔ سقراط کا مقولہ ہے۔ ''ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے۔'' اگر انسان کو اپنی عقل سے زندگی کی تمام گتھیاں سلجھانی پڑتیں اور دنیاوی زندگی بہتر بنانے کے لیے تمام اصول وضع کرنے پڑتے تو عقل کے نقص کی وجہ سے انسان قدم بقدم ٹھوکریں کھاتا۔

اللہ تعالیٰ نے عقل کی راہنمائی کے لیے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے عائلی، عمرانی، سیاسی، اقتصادی اور روحانی اصول وضع کیے ہیں تاکہ انسان ان اصولوں کی روشنی میں زندگی کے ہر قسم کے مسائل کو حل کر سکے اگر انسان کے سامنے وہ اصول نہ ہوتے تو وہ ہلاکت اور بربادی کے گڑھے میں گر جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل کی نعمت سے نوازا ہے اور قرآن مجید میں اس کو عقل سے کام لینے کی بار بار تاکید کی ہے لیکن عقل محدود ہے۔ اس کی راہنمائی کے لیے انبیاء کا

سلسلہ جاری کیا۔ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ انسان کی عقل ہوتے ہوئے بھی کسی راہنما کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ بھی راہنمائی کے بغیر نہیں چلتا جب زندگی کے ہر شعبہ میں راہنما کی ضرورت ہے تو پھر نبی کی ضرورت سے کیوں کر انکار ہوسکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے وحی پا کر زندگی کے گزارنے کے لیے ہر قسم کے اصول وضع کر دے تا کہ ان اصولوں کی روشنی میں چل کر انسان اپنی زندگی کے راستے متعین کر سکے۔ مثلاً عائلی زندگی میں حلال و حرام رشتوں کا تعین اگر انسان کو خود کرنا پڑتا تو عائلی زندگی کے پہلے قدم پر ہی ٹھوکریں کھا کر گر پڑتا۔ اور انسانوں میں رشتوں کی حلت و حرمت پر اختلاف پیدا ہو جاتا۔ اسی طرح زندگی کے لیے اکل و شرب نہایت ہی اہم چیز ہے۔ اگر انسان کو اکل و شرب کے جائز اور ناجائز ہونے کا فیصلہ کرنا پڑتا۔ تو وہ ٹھوکریں کھاتا۔ انبیاء نے اللہ تعالیٰ سے وحی پاک حلال و حرام غذاؤں کا تعین کیا۔ اب بھی جس قوم میں حرام چیز کو حلال سمجھ کر کھایا جا رہا ہے۔ طب نے بتا دیا ہے کہ وہ جسمانی صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ یہ عمرانی زندگی کی ابتدائی چیزیں۔ وہاں بھی عقل صحیح فیصلہ نہیں کر پائی۔ جو انسان کی روحانی زندگی کے لیے ارفع چیزیں ہیں وہ تو انسانی عقل کے دائروں سے ہی باہر ہیں جہاں انسانی عقل رسائی نہیں کر سکتی۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی صفات، بعث بعد الموت، نعماء جنت، عقاب جہنم، حور و غلمان، ملائکہ اور دیگر مابعد الطبیعیاتی امور ایسے ہیں جو انسانی عقل سے بہت دور ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی معرفت وحی کے ذریعہ ان امور کی اطلاع دی۔

قرآن مجید کی رو سے ایمان بالرسل کی اہمیت: ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (النساء ۴:۱۳۶) اور جس خدا اور فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور قیامت کا انکار کیا۔ وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ ۲:۲۸۵) ہر ایک خدا پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا ہم اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ (بقرہ ۲:۱۳۶) ہم ان (رسولوں) میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کا پیغام نبی لاتے ہیں۔ اس لیے طبعی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پیغام کے حامل پر ایمان لایا جائے۔ دوم پیغمبر کا کام صرف پیغام پہنچانا ہی نہیں ہوتا بلکہ اس پیغام کی وضاحت اور اس پر عمل کر کے بھی دکھانا ہوتا ہے۔ اور نبی ہی اپنی قوم کے لیے عملی نمونہ ہوتا ہے اور یہی ہستیاں لوگوں کے دلوں میں نیکی کا انقلاب پیدا کرتی ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل ۱۶:۴۳) اور ہم نے آپ ﷺ سے پہلے تمام رسول آدمی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم وحی بھیجتے ہیں اہل کتاب سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔

انسان کو رسول بنانے کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (النحل ۱۶:۴۴) ہم نے آپ ﷺ کی طرف یہ قرآن نازل کیا ہے تا کہ آپ ﷺ لوگوں کو وہ تعلیم کھول کھول کر بیان کر دیں جو ان کے لیے نازل کی گئی تا کہ وہ لوگ غور و فکر کریں۔

رسالت وہبی ہے: رسالت اور نبوت وہبی چیز ہے یہ کسی کے اعمال کے نتیجہ میں نہیں ملتی جس طرح جسمانی ربوبیت کے لیے سورج چاند، ہوا، زمین اور پانی وغیرہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کا نتیجہ ہیں کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ اشیاء اس کے کسی عمل کے نتیجہ میں پیدا کی گئی ہیں اسی طرح نبوت کا انعام ہے جو کسی کے عمل کے نتیجہ میں نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نبوت کا ذکر صفت رحمانیت کے تحت آتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (الانعام ۶:۱۲۴) اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ منصب رسالت کس کو بخشے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ رحمان وہ ذات ہے جس نے قرآن مجید سکھایا۔ اس آیت میں تعلیم قرآن کو اللہ کی صفت رحمانیت کے تحت بیان کیا گیا ہے اور رحمٰن وہ ذات ہے جو انسان کی زندگی کے لیے اس کی سعی کے بغیر ہر قسم کی چیزیں مہیا کرتا ہے۔ قرآن مجید بھی انسانی فلاح کا ضامن ہے اس لیے اس کی تعلیم کو صفت رحمانیت کے تحت لایا گیا ہے۔ نبوت سعی یا دعا سے نہیں ملتی۔

ہر قوم کی طرف رسول آئے: اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر قوم کی طرف رسول بھیجے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس ۱۰:۴۷) یعنی ہر امت کے لیے رسول بھیجا گیا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر ۳۵:۲۴) ہر امت میں ڈرانے والا گزر چکا ہے۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد ۱۳:۷) ہر قوم کی طرف رہنما آیا۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (المومن ۴۰:۷۸) اور ہم نے یقیناً تم سے پہلے بہت سے رسول بھیجے ان میں کچھ وہ ہیں جن کا ذکر ہم نے تجھ سے کر دیا ہے اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا تجھ سے ذکر نہیں کیا۔

رسول کریم ﷺ کی بعثت سے قبل تمام انبیاء علیہم السلام مخصوص قوموں اور علاقوں کے لیے بھیجے گئے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق آتا ہے لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ (الاعراف ۷:۵۹) ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔

حضرت ہود علیہ السلام کے متعلق آتا ہے۔ وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا (الاعراف ۷:۶۵) اور عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا (الاعراف ۷:۷۳) اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح آئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے متعلق آتا ہے۔ وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا اور اہل مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب آئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق آتا ہے۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَکَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (ابراہیم ۱۴:۵) ہم نے موسیٰ کو نشانیاں دے کر بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق آتا ہے۔ رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل کی طرف رسول بنائے گئے۔

تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی گروہ ہیں: تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی چشمہ الوہیت سے سیراب ہوکر دنیا کے تمام لوگوں کے دلوں کی کھیتیوں کو سیراب کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور ایک ہی مشن اور کام کی وجہ سے تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی گروہ سے ہیں ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُکُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء ۲۱:۹۲) یہ تمہاری امت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں سو تم میری ہی عبادت کرو۔

اور تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی پیغام لائے ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل ۱۶:۳۶) اور البتہ ہم نے ہر امت کے لیے ایک رسول بھیجا اور یہ پیغام دیا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔

جب تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی جماعت ہیں اور ایک ہی پیغام لے کر آتے ہیں تو اس وجہ سے اسلام نے رسولوں کے درمیان تفریق کو کفر قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ (البقرہ ۲:۱۳۶) ہم ان میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔

خصائص نبوت (انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات)

۱۔ نبوت وہبی چیز ہے: رسالت و نبوت وہبی چیز ہے یہ کسی کے اعمال یا دعا کے نتیجہ میں نہیں ملتی جس طرح جسمانی ربوبیت کے لیے سورج، چاند، ہوا، زمین، پانی وغیرہ پیدا کیے ہیں کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ یہ اشیاء اس کے کسی استحقاق کے نتیجہ میں پیدا کی گئی ہیں۔ اسی طرح نبوت بھی ایک انعام ہے جو کسی کے علم، عمل اور دعا کے نتیجہ میں نہیں ملتا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (الانعام ۶:۱۲۴) اللہ ہی جانتا ہے کہ منصب رسالت کس کو بخشے۔

۲۔ نبوت عالمگیر حیثیت رکھتی ہے: قرآن مجید سے یہ امر مسلمہ ہے کہ نبوت عالمگیر حیثیت رکھتی ہے دنیا میں کوئی ایسی قوم نہیں جس میں نبی نہ آیا ہو۔

ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ (فاطر ۳۵:۲۴) ہر امت میں ڈرانے والا گزر چکا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ لِکُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس ۱۰:۴۷) ہر امت کے لیے رسول بھیجا گیا ہے۔

۳۔ عصمت: انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں کسی نبی سے دانستہ یا نادانستہ گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ ان کی عصمت ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا ہوتی ہے۔ امام راغب عصمۃ الانبیاء کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ حفظه اياهم اوّلاً بِمَا خَصَّهُمْ به من صفاء الجوهر ثم بما اولاهم من الفضائل الجسمية والنفسيّة ثم بالنصرة و بتثبيت اقدامهم ثم بانزال السكينة عليهم و بحفظ قلوبهم بالتوفيق. یعنی عصمت انبیاء سے یہ مراد ہے ان کا محفوظ رکھنا ہے اول تو اس جوہر کے صفا پیدا کرنے کے لیے جس سے انبیاء کو مخصوص کیا گیا ہے یعنی پیدائشی گناہ سے پاک ہوتے ہیں پھر جسمانی اور روحانی فضائل دینے سے۔ پھر ان کو نصرت اور ثابت قدمی عطا کرنے سے پھر ان پر سکینت نازل کرنے سے اور ان کے قلوب کی حفاظت سے اور ان کو توفیق عطا کرنے سے۔ یہ تمام باتیں عصمت میں شامل ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی لوگوں کی اصلاح ہے ان کا یہ منصب عالیہ ہی اس بات کا مقتضی ہے کہ وہ گناہوں کی آلائشوں سے پاک ہوں۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنانا ہوتا ہے وہ اللہ کی نگرانی میں پرورش پاتا ہے اور قولاً یا فعلاً اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف قدم نہیں اٹھاتا۔ یہی مقام عصمت ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ (الانبیاء ۲۱:۲۵......۲۷) اور تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف ہم وحی کرتے ہیں کہ

میرے سوا کوئی معبود نہیں سو میری ہی فرمانبرداری کرو اور کہتے ہیں کہ رحمٰن نے بیٹا بنا لیا ہے وہ پاک ہے بلکہ وہ معزز بندے ہیں اور بات میں اس سے آگے نہیں بڑھتے اور اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

پھر ایک دوسری جگہ آتا ہے۔ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ (آل عمران ۳:۱۶۱) اور کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے۔

اس آیت کریمہ میں لفظ غل وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔ غل صرف مال میں خیانت کرنے پر ہی بولا نہیں جاتا بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو انسان کو استعدادیں دی ہیں ان کو غلط استعمال پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے گویا کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو اس کو استعدادیں دے رکھی ہیں ان کو غلط جگہ پر استعمال کرے۔ کسی استعداد کو غلط جگہ پر استعمال سے ہی گناہ سرزد ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں ہر نبی کی الگ الگ تعریف کی گئی ہے۔

بائبل میں بھی عصمت انبیاء کی شہادت ملتی ہے۔ نوح علیہ السلام کے متعلق آتا ہے نوح مرد راستباز اور اپنے زمانہ کے لوگوں میں بے عیب تھا۔ (پیدائش ۶/۹) پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق آتا ہے کہ خدا نے ان سے کہا "تو میرے حضور میں چل اور کامل ہو" (پیدائش ۱۷/۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا "تو اپنے مالک خدا کے ساتھ کامل ہوگا" (استثناء ۱۸/۱۳) بائبل میں ہے "مبارک ہیں وہ جو کامل رفتار ہیں اور جو خداوند کی شریعت پر عمل کرتے ہیں۔...... ان سے ناراستی نہیں ہوتی۔ وہ اس کی راہوں پر چلتے ہیں۔" (زبور ۱۹/۱......۹) پھر یہ الفاظ آتے ہیں۔ "اس کے خدا کی شریعت اس کے دل میں ہے وہ اپنی روش میں پھسلے گا نہیں۔" (زبور ۳۷/۳۱) انجیل میں حضرت زکریا اور اس کی بیوی دونوں کو معصوم قرار دیا گیا اور دونوں خدا کے حضور راست باز اور خداوند کے سب احکام وقوانین پر بے عیب چلنے والے تھے۔ (لوقا ۱/۶) حضرت یحییٰ کے متعلق کہا گیا ہے کہ "وہ اپنی ماں کے بطن سے ہی روح القدس بھر جائے گا۔" (لوقا ۱/۱۵)

لہٰذا عصمت انبیاء کا عقیدہ قرآن مجید اور بائبل دونوں پر مبنی ہے۔

۴۔ ایمان ضروری ہے: ہر نبی کی رسالت اور نبوت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (البقرہ ۲:۲۸۵) سب اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (البقرہ ۲:۱۷۷) لیکن بڑا نیک وہ ہے جو ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں اور کتابوں اور نبیوں پر۔

اسلام نے اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانا رسولوں پر ایمان لانے سے وابستہ کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول ہی لوگوں کو توحید کا سبق دیتا ہے اور وہی اللہ کا چہرہ دکھلاتا ہے اور وہی اللہ کی صفات کا مظہر ہوتا ہے اور وہی مابعد الطبیعات کے مسائل کھولتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے پیغام لانے والوں پر ایمان لانا لازمی ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان تبھی مکمل ہو سکتا ہے کہ اس کے رسولوں پر ایمان لایا جائے۔

۵۔ قابل اطاعت: اللہ تعالیٰ نے رسول کی اطاعت لازمی قرار دی ہے ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء ۴:۶۴) اور ہم جس رسول کو بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

دوسری جگہ نبی کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء ۴:۸۰) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

ارشاد الٰہی ہے۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (الشعراء ۱۳۱) اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ نبی کے علاوہ خواہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کتنا ہی مقرب ہو اس کی اطاعت کرنا بدعت اور گمراہی کا موجب ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا حامل نہیں ہوتا۔ قرآن مجید نے صرف حاملین احکام خداوندی کی اطاعت ہی لازمی قرار دی ہے مسلمانوں میں ایک تفرقہ کی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے غیر منصوص من اللہ کو مطاع بنا لیا ہے۔

۶۔ اسوہ تقلید: نبی اپنی دعوت کا مکمل نمونہ ہوتا ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَا اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَا اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ (ہود ۱۱:۸۸) میں نہیں چاہتا کہ تمہاری مخالفت کر کے وہ کام کروں جس سے میں تمھیں روکتا ہوں۔

دوسری جگہ آتا ہے قُلْ اِنَّمَا اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ (الاعراف ۷:۲۰۳) میں صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب سے میری طرف وحی کی جاتی ہے۔

سورہ احزاب میں کہا گیا ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب ۳۳:۲۱) تمھارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے۔

ایک اور جگہ آتا ہے۔ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ (الحدید ۵۷:۲۵) ہم ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری ہے۔ یہاں میزان سے مراد اسوہ ہے۔ رسول کا کتاب پر عمل کر کے دکھانا گویا ایک میزان قائم کر دینا ہے۔

انسان بالطبع نمونہ کا محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس انسانی احتیاج کو نبی کو نمونہ بنا کر پورا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو وحی نبی پر نازل کرتا ہے اس کو عملی شکل دینے کے لیے اس کی ہدایت کر دیتا ہے۔ تو نبی اس ہدایت کی روشنی میں اس پر عمل کرتا ہے تا کہ لوگ اس کے عمل کی پیروی کریں۔

۷۔ نبی اللہ کا ترجمان ہوتا ہے: رسول دین کے معاملے میں اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتا۔ نبی براہ راست اللہ تعالیٰ کے ترجمان ہوتے ہیں اور وہی کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر وحی کی جاتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم ۵۳:۳،۴) اور نہ وہ خواہش نفس سے بولتا ہے یہ صرف وحی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے۔

۸۔ بشریت: انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے ترجمان اور پیغمبر ہونے کے ناطے عام انسانوں سے بلند اور رفیع الشان ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ سب انسان ہوتے ہیں کیونکہ انسان ہی انسان کے لیے نمونہ ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے ہر نبی نے اپنی بشریت کا اعلان کیا ہے تا کہ لوگ اپنی کج فہمی اور کوتاہ بینی کی وجہ سے اس کے معجزات اور خارق عادت امور دیکھ کر اس کو مقام الوہیت نہ دے دیں۔ تاریخ بتاتی بھی یہی ہے کہ بعض قوموں نے اپنے نبیوں کو درجہ الوہیت دے دیا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (الکہف ۱۸:۱۱۰) میں صرف تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (ابراہیم ۱۴:۱۱) بلاشبہ ہم تمہاری ہی طرح انسان ہیں۔

ایک اور مقام پر آتا ہے۔ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۹۵) کہہ اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چلتے پھرتے تو ضرور ہم ان پر آسمان سے فرشتے رسول بنا کر بھیجتے۔

۹۔ شارح احکام الٰہی (کتاب اللہ): اللہ تعالیٰ نبی پر زمانہ کے تقاضا کے مطابق احکام (کتاب) نازل کرتا ہے۔ نبی ان احکام کی وضاحت ویجھی کے ذریعہ قولاً و فعلاً کرتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل ۱۶:۴۴) تیری طرف ذکر بھیجا ہے تا کہ تو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دے۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ جہاں نبی کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام لوگوں تک پہنچائے۔ وہاں اس کا یہ بھی فرض ہے کہ ان احکام کی تعبیر لوگوں پر واضح کرے۔ اس لیے نبی کو معلم بھی کہا گیا ہے۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ تبیان کے بجائے تعلیم کا لفظ آیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران ۳:۱۶۴) بلاشبہ اللہ نے مومنوں پر احسان کیا ہے کہ انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انھیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے۔ ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کے فرائض منصبی کے ضمن میں ہر نبی کے فرائض بیان کیے ہیں کہ ہر نبی کے وہی فرائض تھے جو رسول کریم ﷺ کے بیان کیے گئے ہیں۔ ان فرائض میں سے ایک فرض تعلیم کتاب و حکمت ہے کیونکہ تمام انبیاء علیہم السلام فرائض کی ادائیگی میں ایک ہی جیسے حکم میں داخل ہیں۔

۱۰۔ قانون ساز: نبی جہاں انسان کی روحانی زندگی کے لیے وحی الٰہیہ کے ذریعے اصول وضع کرتا ہے تا کہ انسان ان اصولوں پر چل کر قرب الٰہی حاصل کر سکے۔ ویسے ہی معاشرتی زندگی کی بہتری کے لیے قانون سازی کرتا ہے۔ لہٰذا پہلا قانون ساز نبی ہی تھا جس نے روحانی زندگی کے اصول وضع کرنے کے ساتھ معاشرتی زندگی کو سنوارنے کے لیے قانون وضع کیے۔ دنیا کے تمام دستور (آئین) دو الفاظ کے اردگرد گھومتے ہیں۔ ''کر'' ''نہ کر'' یعنی دستور میں کچھ ایسی دفعات ہوتی ہیں جو اوامر پر مشتمل ہوتی ہیں اور کچھ منہیات پر مبنی ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ احکام بھی انہی دو شقوں پر حاوی ہیں۔ جن پر نبی قانون سازی کرتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف ۷:۱۵۷) وہ ان کو بھلی باتوں (جو معاشرتی زندگی کے لیے بہتر ہوں) کا حکم دیتا ہے اور منکرات (جو معاشرتی زندگی کے لیے مضر ہوں) سے روکتا ہے اور ان کے لیے طیبات حلال کرتا ہے اور خبائث (ناپاک چیزیں) کو حرام کرتا ہے اور ان سے ان کا بوجھ اتارتا ہے وہ طوق جو ان پر تھے۔

اس آیت کریمہ میں قانون سازی کے دو اصول وضع کر دیے ہیں یعنی معروف کو رائج کرنا اور منکرات سے باز رکھنا۔ تمام طیبات چیزیں معروف کے تحت آئیں گی اور تمام خبائث منکرات کے تحت آئیں گی۔ نبی انہی دو اصولوں پر قانون سازی کرتا ہے۔ دور حاضر کے تمام دستور بھی انہی دو اصولوں کے اردگرد گھومتے ہیں اور بہترین دستور وہی ہے جو معروف (بھلائیوں) کو رائج کرے اور منکرات سے روکے۔ اور یہی دو اصول انسانوں کی گردن سے ہر رسوم کی غلامی کا

طوق اتارتے ہیں اور بہتر زندگی گزارنے کا رستہ بتاتے ہیں۔

۱۱۔ حکم: نبی اپنے دور کا حکم ہوتا ہے۔ اور یہ منصب اور مقام اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت کردہ ہے اس کی حکم عدولی مستوجب سزا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰکَ اللّٰہُ (النساء۴:۱۰۵) یقیناً ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری ہے تاکہ تو لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرے جو اللہ نے تجھے علم دیا ہے۔

گو اس آیت میں مخاطب رسول کریم ﷺ ہیں چونکہ ہر نبی کتاب لے کر آتا ہے اس وجہ سے ہر نبی اس کے کتاب کی روشنی میں لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَاَنْزَلَ مَعَھُمُ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ. (البقرہ۲:۲۱۳) ان کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ لوگوں میں ان باتوں کا فیصلہ کرے جس میں وہ باہم اختلاف کرتے تھے۔ اس آیت کریمہ میں تمام انبیاء کو حکم قرار دیا ہے۔

۱۲۔ نبی، صاحب کتاب ہوتا ہے: اسلام کی رو سے نبی وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ جبرائیل کے ذریعے وحی نبوت نازل کرتا ہے۔ وحی نبوت کو ہی وحی متلو اور کتاب کہا جاتا ہے۔ نبی اور وحی نبوت (کتاب) لازم ملزوم ہیں۔ اسلام کی رو سے ہر نبی کو کتاب دی گئی ہے۔ اگر کسی شخص پر جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ایک حکم لے کر نازل ہوا ہے۔ وہ نبی ہے وہ ایک حکم بھی کتاب ہی کہلائے گا۔ یہی نبی کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ یہی خصوصیت دیگر مقربین سے ممتاز کرتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید۵۷:۲۵) ہم نے رسولوں کو دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔

دوسری جگہ آتا ہے فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ وَاَنْزَلَ مَعَھُمُ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ (البقرہ۲:۲۱۳) پس اللہ نے نبیوں کو بھیجا خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے اور ان کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ لوگوں میں ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں وہ باہم اختلاف کرتے تھے۔ مذکورہ آیت میں الفاظ وَاَنْزَلَ مَعَھُمُ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ واضح کرتے ہیں کہ ہر نبی صاحب کتاب ہوتا ہے اور اسی کے ذریعے لوگوں میں فیصلہ کرتا ہے۔

بغیر کتاب (وحی متلو، وحی نبوت) کے نبی کا تصور قرآنی تعلیم کے خلاف اور گمراہ کن ہے۔

خصائص (رسول کریم ﷺ)

عالمگیر بعثت: دنیا میں رسول کریم ﷺ کی بعثت سے قبل جتنے بھی انبیاء علیہم السلام گزرے ہیں وہ سب ایک قوم کی طرف آتے رہے ہیں۔

کتاب خروج باب سوم میں ہے "اب دیکھ بنی اسرائیل کی فریاد مجھ تک آئی اور میں نے وہ ظلم جو مصری ان پر کرتے تھے۔ دیکھا ہے پس اب تو جاؤ میں تجھے فرعون کے پاس بھیجتا ہوں میرے لوگوں کو جو بنی اسرائیل ہیں مصر سے نکال۔ (آیات ۹، ۱۰)

کتاب استثناء میں ہے "موسیٰ علیہ السلام نے ہم کو ایک شریعت فرمائی جو کہ یعقوب کی جماعت کی میراث ہو۔" (باب ۳۲ درس ۴)

یہ حوالے ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور تورات صرف بنی اسرائیل کی طرف تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق انجیل ظاہر کرتی ہے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کی طرف آئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں۔ "میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا" (انجیل ۲۴:۵)

بدھ مذہب کی تاریخ پر غور کریں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ انھوں نے ہندوجاتی کے سوا کبھی اپنے عروج کے زمانہ میں بھی کسی قوم تک اپنے مذہب کی تعلیم کو نہیں پہنچایا اور کسی غیر مذہب کے پیروکار کو داخل مذہب خود نہیں کیا۔ ہندو مذہب میں وید کی تعلیم و قرأت کا کام صرف برہمن کے ساتھ مخصوص ہے اگر وید کی تعلیم تمام لوگوں کے لیے ہوتی تو پھر صرف برہمن کے لیے کیوں قرأت وید مخصوص کر دی جاتی۔ ہندو قوم میں کبھی کوئی نصرانی، یہودی یا مغربی نسل کا شخص رشی یا مہارشی بلکہ کسی مندر کا پجاری بھی نہیں بنایا گیا۔ ان امور کے علاوہ یہ بات بھی ظاہر کرتی ہے کہ رسول کریم ﷺ کی بعثت سے قبل کے تمام انبیاء علیہم السلام صرف اپنی اپنی قوم کی طرف آتے رہے۔

مختلف اقوام کے مسلمہ انبیاء علیہم السلام نے کسی دوسرے نبی کے متعلق یہ نہیں بتایا کہ وہ صادق تھے یا کاذب کیونکہ جب کسی ایسی قوم کو دعوت دی جائے جو کسی نبی کی پیرو ہو تو لازمی طور پر اس قوم کے نبی کی صداقت زیر بحث آئے گی۔ تمام مذاہب کی کتب کا مطالعہ کریں تو کسی کتاب میں بھی کسی نبی کے متعلق یہ ذکر نہیں آئے گا کہ وہ صادق تھا یا کاذب۔

اگر قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ آپ ﷺ کی بعثت اپنے اندر عالمگیریت کا رنگ رکھتی ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ (سبا ۳۴:۲۸) ہم نے تجھے جملہ انواع انسانی کے لیے بھیجا ہے۔

پھر فرمایا یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا (الاعراف ۷:۵۸) کہہ اے لوگو! میں تم سب لوگوں کی طرف اللہ کا نبی ہو کر آیا ہوں۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ کَانَ النَّبِیُّ یُبْعَثُ اِلٰی قَوْمِہٖ خَاصَّۃً وَبُعِثْتُ اِلَی النَّاسِ کَآفَّۃً مجھ سے پہلے نبی صرف اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے لیکن میں تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

۲۔ سراج منیر: روحانی عالم میں رسول کریم ﷺ سراج منیر ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا (الاحزاب ۳۳:۴۵) اے نبی ہم نے تجھے گواہ بنا کر بھیجا ہے اور خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن ہونے والا سورج۔

اس آیت میں اشارہ ہے کہ اس آفتاب عالمتاب کے طلوع کے بعد ان روشنیوں کی کوئی ضرورت نہیں رہی جو پہلے مختلف ملکوں اور مختلف قوموں کو روشن کیا کرتی تھی۔ وہ روحانی چراغ ایک وقت کے لیے روشن ہوئے اور اندھیروں کو اجالے میں تبدیل کیا۔ طلوع آفتاب کے بعد کسی چراغ کی ضرورت نہیں رہی۔

رسول کریم ﷺ کو سراج منیر کہنے میں یہ حکمت بالغہ ہے کہ جو شخص بھی اپنے شیشہ قلب کو صاف کر کے رسول کریم ﷺ کی روحانی شعاعوں کے سامنے رکھے گا تو اس کے اندر اس روحانی آفتاب کی روشنی منعکس ہو جائے گی اور جتنا زیادہ آئینہ قلب صاف ہوگا اتنی ہی زیادہ نور کی لہریں اس میں منعکس ہوں گی۔

گویا دنیا میں اب صرف روحانی منبع ایک ہی ہے۔ وہ رسول کریم ﷺ کی ذات گرامی ہے انہی کی ذات سے اتصال پیدا کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ موعود اقوام عالم: قرآن مجید نے دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ظہور کا وعدہ تمام انبیاء علیہم السلام کو دیا گیا تھا اور پھر ہر ایک نبی کے ذریعہ سے اس کی امت سے یہ عہد لیا گیا کہ تمھارے پاس ایک ایسا نبی آئے گا جو پہلے تمام انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرے گا۔ اس پر ایمان لانا، ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ قَالُوْآ اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ (ال عمران ۳:۸۱) اور جب اللہ نے نبیوں کے ذریعہ سے عہد لیا کہ جو کچھ میں نے تمھیں کتاب اور حکمت سے دیا ہے پھر تمھارے پاس وہ رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمھارے پاس ہے تو تم نے ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہوگی کہا کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرے عہد کا بوجھ لیتے ہو۔ انھوں نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں کہا پس گواہ رہو اور میں تمھارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔

میثاق النبیین سے مراد پہلے انبیاء علیہم السلام کا اپنی امتوں سے نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کا عہد ہے۔ تمام امت اس پر متفق ہے ابن جریر نے حضرت علیؓ سے یہ روایت ہے۔ لَمْ يَبْعَثِ اللّٰهُ تَعَالٰى نَبِيًّا اٰدَمَ فَمَنْ بَعْدَهٗ اِلَّا اَخَذَ عَلَيْهِ الْعَهْدَ فِىْ مُحَمَّدٍ ﷺ یعنی آدم سے لے کر آخر تک اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی مبعوث نہیں کیا جس سے محمد ﷺ کے متعلق عہد نہ لیا ہو۔ اور یہی صحیح ہے۔

حضرت امام رازی نے لکھا ہے۔ المراد ان الانبیاء کانوا یاخذون المیثاق من اممھم بانه اذا بعث محمد فانه یجب علیھم ان یومنوا به وان ینصروه وھذا قول کثیر من العلماء. یعنی اس (میثاق) سے مراد یہ ہے کہ انبیاء اپنی اپنی امتوں سے یہ عہد لیتے رہے ہیں۔ جب محمد مصطفیٰ ﷺ کی بعثت ہو تو ان پر واجب ہے کہ وہ ان پر ایمان لائیں اور ان کی مدد کریں۔ کثیر علماء کا یہی قول ہے۔

اس موضوع پر علماء کرام نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن سب سے مفصل اور عمدہ کتاب عبدالحق ودیارتھی کی کتاب ''میثاق النبیین'' ہے۔ قارئین اس کی طرف رجوع کریں۔

۴۔ مصدق (تصدیق رسل عالم): رسول کریم ﷺ کی ایک امتیازی نشان تصدیق رسل عالم ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ (ال عمران ۳:۸۱) یعنی اس کی تصدیق کرتا جو پہلی قوموں کے پاس ہے رسول کریم ﷺ تاریخ عالم میں ایک ہی رسول ہیں۔ جنھوں نے اپنے سے پہلے دنیا کے تمام رسولوں پر لانا ضروری قرار دیا ہے۔ قرآن مجید کے آغاز میں ہی یہ فرمایا یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (بقرہ ۲:۴) جو کچھ تم سے پہلے نازل ہو چکا ہے اس پر ایمان لاتے ہیں پھر بار بار فرمایا۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (کہ ہم کسی رسول کے درمیان تفریق نہیں کرتے)

۵۔ الوہیت کا مظہر اتم: رسول کریم ﷺ مظہر اتم الوہیت ہیں۔ ان کا کلام خدا کا کلام ان کا ظہور خدا کا ظہور، ان کا آنا خدا کا آنا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل ۱۷:۸۱) کہ حق آیا اور باطل بھاگ گیا۔ اور باطن نے بھاگنا ہی تھا حق سے مراد اللہ تعالیٰ، قرآن کریم اور رسول کریم ﷺ ہیں۔ پھر فرمایا مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم ۵۳:۳،۴) وہ (نبی کریم ﷺ) اپنی خواہش سے نہیں بولتے۔ یہ صرف وحی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے۔

اس آیت کریمہ میں آپ ﷺ کے کلام کو وحی سے تعبیر کیا ہے ایک اور آیت میں ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح ۴۸:۱۰) اور جو لوگ تیری بیعت کرتے ہیں گویا وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں۔ خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کی ذات کو مجازی طور پر اپنی ذات قرار دیا ہے۔ اس طرح ایک اور آیت ہے۔ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال ۸:۱۷) یعنی تو نے نہیں چلایا لیکن اللہ تعالیٰ نے چلایا جبکہ تو نے چلایا۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر میں رسول کریم ﷺ کا مٹھی بھر کنکریوں کا پھینکنا اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

۶۔ عطائے کوثر: قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (الکوثر ۱۰۸:۱) یعنی ہم نے تجھے کوثر عطا کی۔ امام فخر الدین رازی نے خیر کثیر کے تحت بہت سی اشیاء کا ذکر کیا ہے از الجملہ امت محمدیہ ہے ایسی نبوت کاملہ اور ریاست عامہ اور ہدایت جامعہ پہلے کسی کو عطا نہیں ہوئی۔

۲۔ کوثر سے مراد اسلام ہے۔ ۳۔ کوثر سے مراد کثرت امت ہے۔ ۴۔ کوثر سے مراد قرآن مجید ہے۔ ۵۔ کوثر سے مراد وہ اخلاق حمیدہ، فضائل کثیرہ اور محامد جمیلہ ہیں جو رسول کریم ﷺ کے وجود باجود میں پائے جاتے ہیں۔ اس لیے قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم ۶۸:۴) اے رسول ﷺ تو یقیناً خلق عظیم پر ہے۔ ''لفظ عظیم'' محاورہ عرب میں اس چیز پر بولا جاتا ہے جس کو اپنا نوعی کمال پورا پورا حاصل ہو کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
انچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

۷۔ حصول منتہائے کامیابی: قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے۔ هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (الجمعہ ۶۲:۲) یعنی اللہ وہ ذات پاک ہے جس نے اَن پڑھوں میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جوان پر اس کی آیات پڑھتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اگر چہ وہ اس سے قبل کھلی گمراہی میں تھے۔

اس آیت کریمہ میں رسول کریم ﷺ کے چار عظیم الشان کام بیان کیے گئے ہیں۔ ۱۔ تلاوت آیات۔ ۲۔ تزکیہ نفوس۔ ۳۔ تعلیم کتاب۔ ۴۔ تعلیم حکمت۔ رسول کریم ﷺ نے ان کاموں کو نہایت کامیابی سے انجام دیا جبکہ ان مقدس کاموں کے سرانجام دینے میں ہر قسم کی رکاوٹیں موجود تھیں۔ مستشرقین کو بھی اس امر کا اعتراف ہے کہ رسول کریم ﷺ نہایت کامیاب مصلح تھے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا اف بری ٹینکا میں لفظ قرآن کی بحث کے نیچے یہ اعتراف کیا ہے۔

''دنیا کی تمام مذہبی شخصیتوں میں سب سے زیادہ کامیاب حضرت محمد ﷺ ہیں۔''

میور لکھتا ہے۔ ''بسا اوقات جب ایک ایسے شخص کے ہاتھوں چند نتائج رونما ہوں جو بظاہر اس کی اپنی طاقت سے بالاتر دکھائی دیں۔ تو ان کے ظہور کی وجہ سے بعض کے نزدیک یہ ہوتی ہے کہ گرد وپیش کے چند اسباب ایسے پیدا ہو گئے۔ جن کا لازمی نتیجہ وہ نتائج ہیں۔ حضرت محمد ﷺ پیدا ہوئے اور سارا عرب ایک جدید اور روحانی مذہب کے رنگ میں رنگا جاتا تھا۔ ایسے لوگ قیاس کرتے ہیں کہ عرب حضرت محمد ﷺ کی آمد کے وقت اصلاح کے لیے بے قرار تھا اور اسے قبول کرنے پر ہمہ تن امادہ لیکن جب ہم عرب کے عہد ماضی پر غور ڈالتے ہیں تو اسلام سے پہلے زمانہ کی تاریخ اس قیاس کی تردید کرتی ہے۔''

یہ ہے میور کی شہادت کہ باوجود ایک متعصب مستشرق ہونے کے وہ یہ شہادت دیتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کی بعثت سے قبل تمام عرب ایسی گمراہی کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔ جس کی اصلاح ناممکن نظر آتی تھی۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ رسول کریم ﷺ کی قوت قدسیہ نے عربوں میں ایک عظیم روحانی انقلاب برپا کر دیا جس کی نظر دنیا میں نہیں ملتی۔

۸۔ محفوظ کتاب: تاریخ اس بات پر شاہد ناطق ہے کسی نبی کا صحیفہ محفوظ نہیں۔ نہ ہی اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ صرف قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جو محفوظ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت اپنے ذمہ لی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر ۱۵:۹) یعنی ہم نے ہی ذکر (قرآن مجید) اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (القیمۃ ۷۵:۱۷) یعنی اس کتاب کا جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔

یہ دونوں آیات ظاہر کرتی ہیں کہ قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔

قرآن مجید کی حفاظت دو طریقوں سے ہوئی ہے۔ ایک زبانی یاد کرنے سے دوسرے کتابت سے اور یہی دو طبعی اور قدرتی طریقے ہیں۔ رسول کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں ہی کثیر صحابہ کرام سارا قرآن مجید حفظ کر چکے تھے۔ قرآن مجید کی کتابت رسول کریم ﷺ کے عہد میں مکمل ہو چکی تھی۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو رسول کریم ﷺ کاتبین وحی میں سے کسی کو بلاتے اور لکھوا دیتے تھے اس طرح رسول کریم ﷺ کے عہد میں قرآن مجید احاطہ تحریر میں آ گیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں حضرت زید بن ثابتؓ نے کتابی صورت میں ایک مستند نسخہ مرتب کیا جس کو اسلامی دنیا میں نشر کر دیا گیا رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد وہی قرآن نسلاً بعد نسل کتابت کی شکل مسلمانوں میں رائج ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ مسلمان سعادت کے طور پر زبانی بھی یاد کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ہر دور میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں مسلمان قرآن مجید کو اپنے سینہ میں محفوظ کرتے چلے آ رہے ہیں۔

قرآن مجید کی حفاظت صرف لفظی ہی نہیں بلکہ معنوی بھی ہے۔ ہر دور میں ہزاروں علماء ربانی ہو گزرے ہیں۔ جنھوں نے قرآن مجید کے اسرار و معارف کے جواہر صفحہ قرطاس پر بکھیرے ہیں اور قیامت تک علماء ربانی پیدا ہوتے رہیں گے۔ جب کبھی بھی کوئی غلط مسئلہ رائج ہوا۔ علماء ربانی نے قرآن مجید سے ہی اس کا رد کیا تو اس طرح قرآن مجید لفظی اور معنوی طور پر محفوظ چلا آ رہا ہے۔ قرآن مجید کے محفوظ ہونے کی شہادت غیر مسلموں نے بھی دی ہے چنانچہ سر ولیم میور اپنی تصنیف ''لائف آف محمد'' کے دیباچہ میں لکھتا ہے ''اس بات کی تسلی بخش اور قابل اطمینان اندرونی اور بیرونی شہادت موجود ہے کہ قرآن مجید اس وقت بھی ٹھیک اسی شکل وصورت میں محفوظ و مامون ہے جس حالت میں (حضرت) محمد ﷺ نے اس دنیا میں پیش کیا تھا۔ (دیباچہ لائف آف محمد ص ۲۵)

جرمن کے مشہور مستشرق نولڈ یکی نے لکھا ہے ''یورپ کے جن جن مصنفین نے اب تک اس امر کی زبردست کوشش کی ہے قرآن مجید میں تحریف ثابت کریں وہ اپنی سعی اور جدوجہد میں حیرت انگیز طور پر ناکام ثابت ہوئے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹینکا زیر لفظ قرآن)

۹۔ تکمیل دین: رسول کریم ﷺ ایک اکمل دین لے کر آئے اور وہ دین تا قیامت لوگوں کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ ۵:۳) آج کے دن میں نے تمھارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام کو دین کی حیثیت سے میں نے تمھارے لیے پسند کیا ہے۔

قرآن مجید کے اس عقیدہ کے مطابق دین عہد بعہد دنیا کی عمر کے ساتھ مختلف انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں مکمل ہوتا رہا اور یہ دین رسول کریم ﷺ کے ہاتھ سے اپنے کمال کو پہنچا ہے۔

۱۰۔ وحدت نسل انسانی کا داعی: جب رسول کریم ﷺ موعود اقوام عالم ٹھہرے۔ ایک اکمل دین لے کر آئے اور سابقہ انبیاء علیہم السلام کی سچائی کے مصدق اور کتب کو منزل من اللہ قرار دیتے ہیں۔ پھر ایک مسلمان کے لیے یہ لازمی عقیدہ قرار دیا گیا ہے۔ کہ پہلے گزرے ہوئے نبیوں اور کتب پر ایمان اور کوئی شخص اس وقت تک دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ پہلے انبیاء اور کتب کا سچا ہونے کا اقرار نہ کرے۔ یہی عقیدہ اخوت بین الناس قائم کرتا ہے قومی تباغض اور تحاسد اور تنافر کو دور کرتا ہے کیونکہ جب کسی مذہب کا فرد اسلام کو قبول کرے گا تو وہ اپنے نبی اور کتاب کو بھی سچا گردانتے ہوئے اسلام میں داخل ہوگا۔ اس کے دل میں یہ خیال پیدا نہیں ہوگا کہ وہ اپنے نبی کو جھٹلا رہا ہے اور کتاب کو غلط قرار دے رہا ہے۔

پہلے انبیاء علیہم السلام نے افراد کو اکٹھا کر کے ایک قوم بنائی۔ رسول کریم ﷺ نے تمام قوموں کو اکٹھا کر کے نسل انسانی کی وحدت کی بنیاد ڈالی ہے اور دین اسلام کی بنیاد ٹھہرایا یہ راز اتنا بلند تھا کہ بغیر خدا کی وحی کے اس کا انکشاف قلب انسانی پر نہ ہو سکتا تھا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس ۱۰:۱۹) اور سب لوگ ایک ہی قوم ہیں لیکن وہ باہم جھگڑتے ہیں۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ اِنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ اِخْوَةٌ (اخرجہ احمد، ابوداؤد) تمام بندے بھائی بھائی ہیں۔ فرمایا۔ اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ (بیہقی کتاب الایمان) ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔

پھر قومی، لسانی اور لونی تعصب کی زنجیروں کو کاٹتے ہوئے حجۃ الوداع کے موقعہ پر فرمایا کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، کالے کو سرخ پر اور سرخ کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔

اس نظریاتی تعلیم کے ساتھ عملی رنگ میں بھی عالمگیر اخوت کی بنیاد کو نماز اور حج کے عبادات کے ساتھ مضبوط کر دیا۔ یہ دو ایسی عبادات ہیں۔ جن میں عملی رنگ میں عالمگیر اخوت ظاہر ہوتی ہے۔

۱۱۔ محفوظ سنت: رسول کریم ﷺ کی سنت اقوال اور زندگی گزارنے کے طریقے محفوظ ہیں یہ وہ خصوصیت ہے کہ جس میں آپ تمام انبیاء علیہم السلام اور پیشوایان مذاہب میں یکتا ہیں۔ آپ ﷺ کی لائی ہوئی کتاب کی طرح آپ ﷺ کی سنت اور اقوال بھی محفوظ ہیں جس سے ہم زندگی کے ہر شعبے میں راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ پیدائش سے لے کر وفات تک جتنے لوگوں نے آپ کے حالات زندگی دیکھے آپ ﷺ کے اقوال سُنے آپ ﷺ کی تقاریر سُنیں۔ ایک ایک فعل اور ایک ایک بات صفحہ قرطاس پر محفوظ ہے۔ آپ ﷺ کی سنت کی حفاظت کا سلسلہ حضور کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا آپ ﷺ کی زندگی میں ہی صحابہ نے آپ کے اقوال لکھنے شروع کر دیے تھے۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کے گھر تشہیر اور اشاعت سنت و حدیث کے لیے درسگاہیں بن گئے تھے۔ اکناف عالم سے لوگ مکہ اور مدینہ کا رخ کر کے اور صحابہ سے اقوال رسول ﷺ سے آگاہی حاصل کرتے یہ سلسلہ جاری رہا آخر کار تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں اہل سنت والجماعت کی چھ کتب (بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور نسائی) مشہور ہوئیں۔ صحاح ستہ کے علاوہ بھی کئی مستندات اور مصنفات شائع ہوئی ہیں۔ اسی طرح شیعہ فرقہ کی چار کتب ہیں۔ ان سب کتب میں مصنفین نے سنت رسول کو محفوظ کر دیا تھا۔ اس خصوصیت کا اقرار مستشرقین نے بھی کیا ہے باسورتھ اسمتھ لکھتے ہیں۔ "یہاں (سیرت محمدی) پورے دن کی روشنی ہے جن میں محمد ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو روز روشن کی طرح نمایاں ہے۔" (باسورتھ اسمتھ کتاب سیرت محمد ص ۱۰۸)

۱۲۔ مکمل سوانح: رسول کریم ﷺ کی بعثت سے قبل جتنے انبیاء علیہم السلام اور مصلحین ہو گزرے ہیں ان کی زندگی کے حالات ہم تک صحیح ذرائع سے نہیں پہنچے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کے بے شمار پہلو پردہ تاریک میں پڑے ہوئے ہیں۔ فارس کے مصلحان دین صرف شاہنامہ کے ذریعہ روشناس ہوئے ہیں۔ وید کے ملہم کون تھے کیسے تھے، کہاں تھے ان کا چال چلن کیا تھا کب ہوئے؟ تاریخ میں معمہ بنے ہوئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے متعلق موجودہ تورات بتاتی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تین سو سال بعد احاطہ تحریر میں آئی۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی وہ مقدس اور برگزیدہ ہستی ہے جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ احاطہ تحریر میں لایا گیا۔ سنت کی حفاظت بھی تاریخ پیغمبر علیہ السلام کا حصہ ہے۔

تین اہم خصوصیات

۱۴۔ خاتم النبیین: حضرت محمد ﷺ کو خاتم النبیین کیوں قرار دیا اور سلسلہ نبوت کیوں مسدود کیا۔ قرآن مجید اور تاریخ عالم اس بات پر شاہد ہے کہ ابتدائے آفرینش سے سلسلہ نبوت جاری ہوا۔ ہر دور کی ضرورت کے مطابق اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام پر احکام نازل فرماتا رہا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (البقرہ۲:۲۱۳) اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو بھیجا خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے اور ان کے ساتھ کتاب (احکام الٰہی) اتاری۔ لوگوں کی ان باتوں کا فیصلہ کریں جن میں باہم اختلاف کرتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا پھر ہم نے اپنے رسول پے در پے بھیجے۔ ایک اور جگہ آتا ہے۔ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ اور ان کے بعد ہم نے اپنے رسول بھیجے۔

رسول کریم ﷺ کی بعثت سے قبل جو سلسلہ انبیاء علیہم السلام جاری تھا۔ دراصل وہ احکام الٰہی کی تکمیل کا ذریعہ تھا اور شریعت محمدی ﷺ کا ہی ایک حصہ تھا۔ جب انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی جو غرض تھی وہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مقدس اور مطہر ذات میں اپنے کمال کو پہنچ کر پوری ہوگئی تو اس کے بعد کسی نبی کے آنے کی ضرورت بھی باقی نہ رہی گویا انبیاء علیہم السلام صرف احکام الٰہی لانے کے لیے مامور تھے جب احکام الٰہی کی تکمیل ہوگئی تو اس کے بعد کسی نبی کے آنے کی ضرورت بھی باقی نہ رہی۔

گویا انبیاء علیہم السلام صرف احکام الٰہی لانے کے لیے مامور تھے۔ جب احکام الٰہی پایہ تکمیل کو پہنچ گئے تو نبوت کی ضرورت خود بخود ختم ہو جاتی ہے چونکہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر احکام الٰہی پایہ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں جیسا کہ تکمیل دین کے ذیلی عنوان میں بتایا جا چکا ہے۔ اس لیے رسول کریم ﷺ کو خاتم النبیین ٹھہرے۔ یعنی آپ ﷺ پر کمالات نبوت ختم ہیں اور آپ ﷺ مجمع جمیع کمالات انبیاء ہیں۔ نبوت کا کوئی درجہ اور کوئی مقام ایسا نہیں جو کسی نبی کو ملا ہو۔ لیکن آپ کو حاصل نہ ہوا ہو۔ اس لیے اب آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب ۳۳:۴۰) محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کا باپ نہیں ہے۔ لیکن اللہ کے رسول اور نبیوں کو ختم کرنے والے ہیں۔

رسول کریم ﷺ نے اس آیت کی تشریح مختلف پیرایوں میں کی ہے فرمایا اِنَّ الرِّسَالَةَ وَالنُّبُوَّةَ قَدِ انْقَطَعَتْ فَلَا رَسُوْلَ بَعْدِيْ وَلَا نَبِيَّ (ترمذی کتب الرویا) رسالت اور نبوت منقطع ہو چکی ہے سو میرے بعد نہ کوئی رسول ہوگا اور نہ کوئی نبی۔

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَتْ بَنُوْا اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ وَاِنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَسَيَكُوْنُ خُلَفَاءُ فَيَكْثُرُوْنَ (بخاری کتاب الانبیاء و باب ذکر بنی اسرائیل) نبی کریم ﷺ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کی اصلاح کی نگرانی انبیاء کرتے تھے۔ جب ایک نبی گزر جاتا تو اس کے پیچھے دوسرا نبی آ جاتا اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور خلیفے ہوں گے اور بہت زیادہ ہوں گے۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا اَوَّلُ الْاَنْبِيَاءِ اٰدَمُ وَاٰخِرُهُمْ مُحَمَّدٌ (کنز العمال ج ۶ ص ۱۲۰) تمام انبیاء سے پہلے آدم تھے اور سب سے آخر میں محمد ﷺ ہیں۔

پھر فرمایا اَنَا اٰخِرُ الْاَنْبِيَاءِ وَاَنْتُمْ اٰخِرُ الْاُمَمِ (سنن ابن ماجہ باب فتنۃ الدجال) میں آخر الانبیاء ہوں اور تم سب سے آخری امت ہو۔

فرمایا۔ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَاَبَاكُمْ وَاحِدٌ وَدِيْنَكُمْ وَاحِدٌ وَنَبِيَّكُمْ وَاحِدٌ وَلَا نَبِيَّ بَعْدِيْ (کنز العمال) اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے تمہارا باپ ایک ہے تمہارا دین ایک ہے اور تمہارا نبی ایک ہے اور میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔

قرآن مجید اور رسول کریم ﷺ کی احادیث کا مطالعہ کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ذیل کے اسباب ہیں جن کے پیدا ہونے سے اہل دنیا کو نبی کی ضرورت پڑتی تھی۔

۱۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب دنیا سے بالکل مفقود اور ناپید ہو جائے۔ ۲۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب محرف و مبدل ہو جائے۔ ۳۔ جب احکام الٰہی میں سے کوئی حکم کسی قوم یا زمانہ سے مخصوص ہونے کی وجہ سے قابل تنسیخ ہو۔ یا ابھی کوئی نیا حکم آنا ہو۔ ۴۔ جبکہ الگ الگ امتوں اور الگ ملکوں کے لیے علیحدہ علیحدہ نبی آ گئے ہوں۔ اور ساری دنیا کے لیے ابھی کوئی نبی نہ آیا ہو۔ ۵۔ جبکہ شریعت مکمل نہ ہوئی ہو اور ابھی اس کی تکمیل ہونی ہو۔ ۶۔ جبکہ کتاب اللہ کے ساتھ ہمیشہ تک محفوظ رہنے کا اللہ تعالیٰ کا وعدہ نہ ہوا ہو۔ ۷۔ نبی کا روحانی فیض بند ہو جائے۔

یہ ہیں وہ اسباب جن کی وجہ سے انبیاء کے آنے کی ضرورت رہتی تھی چونکہ محمد مصطفیٰ ﷺ پر یہ سب امور مکمل ہو چکے ہیں ان میں سے کسی ایک امر کی بھی کمی نہیں اس لیے رسول کریم ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

ختم نبوت کی حکمت الٰہیہ: ختم نبوت، توحید الٰہیہ کا تتمہ ہے۔ توحید الٰہیہ کا مقصد نسل انسانی کو اتحاد کی لڑی میں پرونا ہے۔ رسول کریم ﷺ کی بعثت سے قبل قومی نبی آئے تھے۔ رسول کریم ﷺ کی عالمگیر بعثت کی وجہ سے قومی نبی کا تصور ختم ہو گیا اور اس کی جگہ عالمگیر نبی نے لے لی اور اتحاد نسل انسانی کا تصور وَكَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً (البقرہ ۲:۲۱۳) (لوگ ایک ہی جماعت ہیں) پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ یہ عالمگیر اتحاد ختم نبوت واقعہ ہونے سے ہی ہو سکتا ہے اگر سلسلہ نبوت جاری رہے تو اقوام عالم مزید گروہوں میں تقسیم ہوں گی۔ اور انتشار پیدا ہوگا۔ اتحاد نسل انسانی کا تصور عنقا ہو جائے گا۔

اجرائے نبوت کا عقیدہ صرف مسلمانوں میں انتشار کا باعث ہی نہیں بلکہ دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے میں ایک زبردست رکاوٹ ہے۔

۱۵۔ معراج: (روحانی ترقی کی انتہاء) امت مسلمہ میں معراج کی نوعیت و کیفیت کے بارے میں اختلاف ہے وہ ایک جزوی اختلاف ہے۔ علماء کے ایک طبقے کا یہ نظریہ ہے کہ معراج مادی جسم کے ساتھ ہوا دوسرا طبقہ جسمانی تو قرار دیتا ہے لیکن جسم کی نوعیت میں اختلاف ہے۔ اس کا یہ نظریہ ہے وہ نورانی جسم تھا۔ حضرت عائشہ کا بھی یہی نظریہ تھا۔ چنانچہ آپ فرماتی ہیں۔ مَا فَقَدَتْ جَسَدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اور اکثر صوفیاء کرام کا بھی یہی مذہب ہے چنانچہ حضرت امام غزالی علیہ السلام اور حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی یہی رائے ہے۔

انسانی نفس کے دو حصے ہیں ایک حیوانی جو جذبات حیوانی پر مشتمل ہے اور دوسرا ملکوتی جو اخلاق فاضلہ کا مرکز ہے۔ جب انسان اپنے جذبات بہیمیہ کی سرکش اونٹنی کو مجاہدات سے اللہ کے تابع بنا لیتا ہے تو وہ اس وقت روحانی پرواز شروع کر دیتا ہے۔ یہی قرآن مجید کا اصول ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا جو ہماری رضا کے بارے میں کوشش کرتا ہے یقیناً ہم اس رستہ کی راہنمائی کر دیتے ہیں۔ اور منزل مقصود تک پہنچا دیتے ہیں اسی ہدایت یافتہ نفس کو ہی نفس مطمئنہ کہا گیا ہے۔

رسول کریم ﷺ کی روحانی پرواز اسی قرآنی اصول کے تحت ہوئی۔ رسول کریم ﷺ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ ﷺ روحانیت کے آخری مقام تک جا پہنچے جہاں کسی انسان کا پہنچنا محال اور ناممکن ہے۔

معراج مسجد حرام سے شروع ہوا۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ حضرت آدم ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تمام کمالات آپ ﷺ کے وجود میں تھے۔ پھر وہاں سے بیت المقدس گئے اور انبیاء کی امامت کرائی۔ اس میں یہ اشارہ تھا کہ تمام انبیاء کے کمالات آپ ﷺ کے وجود میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد تمام روحانی بلندیوں کو طے کرتے ہوئے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے۔ پھر مرتبہ قاب قوسین پایا۔ اس میں یہ اشارہ تھا آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی صفات کے کامل مظہر ہیں۔ اور یہ وہ روحانی مقام ہے جس تک کسی شخص کی رسائی نہیں۔ غرض معراج سے یہ بتانا مقصود تھا کہ رسول کریم ﷺ خیر الاولین والآخرین ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی " معراج کے بارے میں فرماتے ہیں۔ سَالْتُ رَبِّي عَنِ الْمِعْرَاجِ فَقِيْلَ لِي الْمِعْرَاجُ عُرُوْجٌ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سِوَايَ وَكَمَالُ الْعُرُوْجِ مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى.

۱۶۔ شفاعت: شفاعت، شفع سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں ایک چیز کو ایسا بنانا کہ وہ جوڑے کا ایک بن جائے۔ (تاج العروس) ایک چیز کو اس کے مشابہ سے ملا دینا۔ (مفردات امام راغب)

شفاعت شریعت اسلامی میں ایک مسلّمہ مسئلہ ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ بعض گناہ ایک انسان کے پاک لوگوں کے ساتھ تعلق کی وجہ سے معاف کرائے جائیں گے اسلام کی اصل تعلیم یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے افعال کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا نہ ایک کی ذمہ داری کو دوسرا ادا کر سکتا ہے شفاعت کا مسئلہ اس اصول کو باطل قرار نہیں دے سکتا اور اس کے معنی یہ نہیں کہ جس کی سفارش چل گئی وہ بچ گیا۔

درحقیقت شفاعت اللہ تعالیٰ کی صفات رحمانیت اور غفوریت کی عملی شکل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان صفات کے تحت اپنے عاصی بندوں کے گناہ معاف کرنا چاہتا ہے۔

قرآن مجید کی رو سے شفیع چار ہیں اللہ، فرشتے، انبیاء اور مومن اور حقیقی شفیع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو ارحم الراحمین ہے انسانوں کے لیے اس قدر رحیم و کریم ہے کہ وہ ان عاصیوں کو بھی ایک دن مغفرت کی چادر میں لپیٹ لے گا۔ جنھوں نے کبھی بھی کوئی نیکی کا کام نہیں کیا۔ حدیث میں آتا ہے۔ شَفَعَتِ الْمَلٰئِكَةُ وَشَفَعَ النَّبِيُّوْنَ وَشَفَعَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَلَمْ يَبْقَ اِلَّا اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ فَيَقْبِضُ قَبْضَةً مِنَ النَّارِ يُخْرِجُ مِنْهَا قَوْمًا لَمْ يَعْمَلُ خَيْرًا قَطُّ یعنی اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ فرشتوں نے بھی شفاعت کی۔ نبیوں نے بھی شفاعت کی۔ مومنوں نے بھی شفاعت کی اور سوائے ارحم الراحمین کے کوئی باقی نہیں رہا۔ پس وہ آگ میں سے ایک مٹھی بھرے گا اور ایسے لوگوں کو باہر نکالے گا۔ جنھوں نے کبھی بھلائی نہیں کی۔

شفاعت کے ضمن میں یہ ایک اہم نکتہ یاد رکھنا چاہیے یہ کہ شفاعت کا آغاز اس دنیا سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جب ایک نبی دنیا میں آتا تھا تو وہ

اپنی قوم کا شفیع ہوتا تھا۔ وہ اپنی دعاؤں، نفس قدسیہ اور تعلیمات ربانی سے ان کی اصلاح کرتا تھا اور آگ سے بچاتا ہے۔ اسی طرح ہر نبی پر ایمان لانے والے انسانوں کے خیر خواہ اسی فریضہ کو انجام دیتے چلے آرہے ہیں۔ قرآن مجید میں اس کی بہترین مثال حضرت لقمان ہیں۔ جنھوں نے اپنے بیٹے کو راہ ہدایت بتا کر نار جہنم سے بچایا۔ حضرت لقمان کی نصائح صرف اپنے بیٹے کے لیے ہی نہیں تھیں بلکہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی مشعل راہ تھیں۔ ملائکہ بھی شفیع ہیں جو انسانوں کے دلوں میں نیکی کی تحریک پیدا کر کے دوزخ کی آگ سے بچاتے ہیں۔

رسول کریم ﷺ کی شفاعت کا عمل اس دنیا سے شروع ہوا تھا۔ جب پہلے انبیاء علیہم السلام کی شفاعت کو رسول کریم ﷺ کی شفاعت کے مقابل پر رکھ کر دیکھا جائے تو پہلے نبیوں کی شفاعت آپ ﷺ کی شفاعت کے مقابل میں ماند پڑ جاتی ہے۔ آپ ﷺ نے چند سالوں میں ہی ہر قسم کی برائیوں میں پھنسی ہوئی قوم کو نیکی کے راستہ پر چلا کر باخدا قوم بنا دیا اس قوم نے رات کی تاریکیوں میں اٹھ کر آستانہ الوہیت پر سر جھکا دیے منکرات کا لباس اتار کر نیکیوں اور خیرات کا نورانی لباس پہن لیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کے دلوں کو یک لخت ایسا مبدل کر دیا کہ وہ جہالت کے بعد معارف دینی سے مالا مال ہو گئے اور دنیا کی محبت سے ایسا دل اچاٹ ہوا۔ خدا کی خاطر اپنے گھروں، اپنے مالوں، اپنے عزیزوں اور اپنی جان کے آراموں کو چھوڑ دیا۔ رسول کریم ﷺ کی دعاؤں اور قوت قدسیہ سے ایک عظیم انقلاب برپا ہوا۔ اور یہ آپ ﷺ کی دعاؤں اور آپ ﷺ کی شفاعت کا ہی اثر تھا۔ کہ آپ ﷺ کے غریب صحابہ کو تختوں کا مالک بنا دیا قیصر و کسریٰ کے تاج اور خزانے ان کے قدموں کے نیچے تھے۔ یہ شفاعت رسول کریم ﷺ کے دور اول کی ہے۔ اس شفاعت کو شفاعت صغریٰ کہا جاتا ہے۔

شفاعت کا دوسرا دور روز محشر شروع ہوگا جب اللہ تعالیٰ شفاعت سے عاصیوں کے گناہوں کو معاف کرے گا۔ وہاں بھی انبیاء ملائکہ اور مومن اللہ کے اذن سے اپنے روحانی قریبیوں کی شفاعت کریں گے۔ لیکن شفاعت کبریٰ رسول کریم ﷺ کے ذریعے ہی عمل میں آئے گی۔ جب عاصی رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گے تو آپ ﷺ اپنے رب سے اذن حاصل کریں گے اور آپ ﷺ کو اذن دی جائے گی اور عاصیوں کی شفاعت کریں گے اور اللہ تعالیٰ اس شفاعت کو قبول فرمالیں گے۔ یہی وہ منصب عالیہ اور مقام محمودہ ہے جس کی طرف یہ اشارہ کرتی ہے۔ عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا جس طرح اس دنیا میں رسول کریم ﷺ کی شفاعت کا عمل مادی، اخلاقی اور روحانی انقلاب پیدا کرنے میں عظیم الشان تھا۔ دیگر انبیاء علیہم السلام کی شفاعت آپ ﷺ کی شفاعت کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے اسی طرح رسول کریم ﷺ کی شفاعت کو قیامت کے دن اسی قدر اہمیت حاصل ہوگی کہ وہ لوگ جنھوں نے زندگی بھر نہ فرشتوں کی آواز نہ انبیاء کی آواز اور نہ صالح بندوں کی آواز پر کان دھرا۔ وہ سب لوگ آپ ﷺ کی شفاعت سے بخشے جائیں گے۔

مذکورہ بحث سے شفاعت کا مفہوم یہی واضح ہوتا ہے کہ اصل غرض اللہ تعالیٰ کا عاصیوں پر اپنا فضل اور رحم کرنا مقصود ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک یا دوسرا سامان پیدا کر دیا۔ الغرض شفاعت صرف فرشتوں، مومنوں اور انبیاء علیہم السلام کی ان دعاؤں کا نام ہے جو بنی نوع انسانوں کی نجات اور بخشش کے لیے کرتے ہیں۔ یہی دعا رسول کریم ﷺ نے اس دنیا میں کی اور صحابہ کی زندگی بدل دی اور ایک مادی، روحانی اور علمی انقلاب برپا کر دیا یہی دعا آپ ﷺ اللہ کے اذن سے روز محشر اللہ کے حضور کریں گے۔ اللہ تعالیٰ عاصیوں کے گناہ معاف کر دے گا۔ جس طرح رسول کریم ﷺ اس دنیا میں رحمۃ للعالمین تھے۔ اسی طرح روز محشر بھی رحمۃ للعالمین ثابت ہوں گے۔ اس طرف قرآن مجید کی یہ آیت اشارہ کر رہی ہے۔ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ہم نے تجھے تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ لفظ عالمین ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی رحمت کا دروازہ صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں کھولا ہوا بلکہ ہر انسان کے لیے آپ باعث رحمت ہیں۔

گویا شفاعت ''رحمۃ للعالمین'' کا ایک نظارہ ہے۔ جس میں مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ رسول کریم ﷺ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہر مسلمان کا وجود بلاتمیز رنگ و نسل اور قوم و ملت ہر شخص کے لیے باعث رحمت ہونا چاہیے۔ اسی طریقے سے دنیا میں امن و سلامتی پیدا ہو سکتی ہے۔

شفاعت کبریٰ کا مستحق صرف رسول کریم ﷺ کی ذات ہو سکتی ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ ہی دو مقامات لاہوت اور ناسوت کے مظہر اتم ہیں۔ لاہوتی مقام کا مظہر اتم ہونے سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ اس روحانی مقام پر فائز ہیں۔ جس پر کوئی دوسرا شخص فائز نہیں۔ اس مقام کو قرآن مجید کے مقام محمود سدرۃ المنتہیٰ اور قاب قوسین کہا ہے۔ اس لیے آپ ﷺ کو مظہر اتم الوہیت قرار دیا گیا ہے۔ یہ دعویٰ سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مقام رسول کریم ﷺ کے سوا کسی دوسرے نبی کو میسر نہیں ہوا۔ مقام ناسوت سے مراد یہ ہے کہ وہ بشری لوازم کو ساتھ رکھے اور مخلوق کی محبت ہمدردی اور شفقت میں اپنی جان گزار کر دے۔ جس سے بڑھ کر ممکن نہ ہو۔ گویا مقام لاہوت خدا سے واصل ہونے کا نام ہے اور مقام لاہوت مخلوق میں داخل ہونے کا اس طرح آپ ﷺ قوس الوہیت اور قوس عبودیت کا وتر ہیں۔ اس عظمت کا شخص ہی شفاعت کبریٰ کا مستحق ہو سکتا ہے۔

خصوصیات نبویہ از احادیث مصطفویہ: صحیحین میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اُعْطِیْتُ خَمْسًا لَمْ یُعْطَهُنَّ اَحَدٌ قَبْلِی. نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِیْرَةَ شَهْرٍ جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُوْرًا فَاَیُّمَا رَجُلٍ مِنْ اُمَّتِی اَدْرَكَتْهُ الصَّلٰوةُ فَلْیُصَلِّ وَاُحِلَّتْ لِیَ الْمَغَانِمُ وَلَا

تُحِلَّ لِاَحَدٍ مِنْ قَبْلِي وَأُعْطِيْتُ الشَّفَاعَةَ وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً.

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے۔ وَفُضِّلْتُ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ اس حدیث میں أُعْطِيْتُ بِجَوَامِعِ الْكَلِمِ نمبر ۱ پر اور نمبر ۲ میں نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ اور نمبر ۳ احلت لِي الغنائم نمبر ۴ پر جُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِداً وَطَهُوراً نمبر ۵ أُرْسِلْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً ہیں نمبر ۶ پر خُتِمَ بِيَ النَّبِيُّوْنَ.

صحیحین کی ایک روایت حضرت ابو ہریرہ کی ہے اس میں جوامع الکلم اور نصرت بالرعب کے بعد خزائن الارض کی مفاتیح کا خواب میں حضور کے سامنے رکھا جانا تحریر ہے۔

ان روایات میں حسب ذیل آٹھ امور بنتے ہیں۔

۱۔ نصرت بالرعب۔ ۲۔ روئے زمین کا مسجد اور طہور ہونا۔ ۳۔ مغانم کا حلال ہونا۔ ۴۔ عطائے منصب شفاعت۔ ۵۔ بعثت عامہ۔ ۶۔ جوامع الکلم کا عطا کیا جانا۔ ۷۔ ختم نبوت۔ ۸۔ خزائن الارض کی مفاتیح کا خواب میں دیا جانا۔

فلسفہ ایمان بالرسل: تمام رسولوں، نبیوں پر ایمان لانے کا فلسفہ یہ ہے کہ تمام قومی، لونی، نسلی اور لسانی امتیاز کو ختم کر کے وحدت نسل انسانی کی لڑی میں اپنے آپ کو پرو لیا جائے اور یہی تعلیم دنیا میں قیام امن کا ذریعہ ہے۔

ایمان بالآخرۃ

آخرت کے لغوی اور اصلاحی معنی: اخر کے معنی ''آخری'' ہیں۔ لفظ اخرۃ اسی ''آخر'' کی مونث ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ ''الدار'' کے ساتھ بطور صفت استعمال ہوا ہے اور ''دار'' کا لفظ مونث ہے۔ اس لیے صفت بھی ''اخرۃ'' بھی مونث ہے اور یوں الدار الاخرہ کا معنی ''آخری گھر'' ہوئے۔

اسلامی اصطلاح میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ ''مرنے کے بعد دوسری زندگی اور اس میں ملنے والا ٹھکانہ۔''

قرآن مجید میں اس مفہوم کو مختلف پیرایوں میں مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے کہیں الیوم الاخر کا لفظ آیا ہے کہیں صرف لفظ ''الاخرۃ'' استعمال کیا ہے اور کہیں ''یوم البعث'' (جی اٹھنے کا دن اور کہیں ''یوم الحسر ۃ'' (حسرت کا دن) اور کہیں ''یوم الخروج'' (نکلنے کا دن) اور کہیں ''یوم القیامۃ'' (کھڑے ہونے کا دن) اور کہیں ''یوم الحق'' (برحق دن) وغیرہ بیس کے قریب ناموں سے اس دن کا ذکر آیا ہے۔

قرآن مجید میں بیس سے زائد مقامات پر ''دنیا اور آخرت'' کا یکجا ذکر ہوا ہے اس کے علاوہ عقیدہ آخرت کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرنے کے لیے ''ثواب الاخرۃ'' (آخرت کا ثواب) ''اجر الاخرۃ'' (آخرت کا اجر) دارالاخرۃ (آخرت کا گھر) عذاب الاخرہ (آخرت کا عذاب) ''حرث الاخرۃ'' (آخرت کی کھیتی) نکال لآ خرہ (آخرت کی ذلت) وغیرہ کی تراکیب کثرت سے استعمال ہوئی ہیں۔

اہمیت: قرآن مجید اور حدیث میں ایمان بالآخرۃ پر بہت زور دیا گیا ہے۔ سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کو مالک یوم الدین یعنی اللہ تعالیٰ جزا و سزا کے دن کا مالک ہے۔ سورۃ بقرہ کے آغاز میں ہی متقیوں کی یہ صفت بیان کی گئی ہے۔ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ (البقرہ۲:۴) آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔

ایک اور جگہ آتا ہے۔ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (البقرہ۲:۶۲) جو ایمان لایا اللہ پر اور آخری دن پر اور عمل کیے نیک پس ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (توبہ۹:۱۸) جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لاتا۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرَةِ (توبہ۹:۴۵) جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لاتے ہیں۔

یوم آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ (النحل ۱۶:۲۲) تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے سو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل انکاری ہیں اور وہ تکبر کرتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ. اور جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ سیدھی راہ سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں۔

ایک جگہ منکرین قیامت کا انکار ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اَءِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ایک ہو کر رہ جائیں گے تو قیامت کو پھر ہمیں اور ہمارے آباؤ اجداد کو اٹھا کر کھڑا کر دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس انکار کے رد کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے۔ اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ (ق:۵۰:۱۵) ہم اول بار پیدا کرنے میں ماندہ ہو گئے کہ دوبارہ پیدا نہیں کر سکیں گے۔ از سر نو پیدا کرنے کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

پھر ایک جگہ اس انکار کا جواب ان الفاظ میں دیا۔ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَیِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ پھر اس کے بعد تم سب مر جاؤ گے اور پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

ایک اور جگہ فرمایا۔ وَاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ لَّا رَیْبَ فِیْهَا وَاَنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ قیامت ضرور آنے والی ہے۔ اس میں ذرا بھر شک نہیں اور خدا ضرور ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔

اہمیت از روئے حدیث: حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے۔ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَارِزًا یَوْمًا لِلنَّاسِ فَاَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ مَا الْاِیْمَانُ قَالَ الْاِیْمَانُ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَبِلِقَائِهٖ وَرُسُلِهٖ وَتُؤْمِنُ بِالْبَعْثِ (کتاب الایمان) نبی کریم ﷺ ایک دن باہر لوگوں میں بیٹھے تھے تو ایک آدمی آیا اور کہا ایمان کیا ہے۔ فرمایا ایمان یہ ہے کہ تو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے لقاء اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور موت کے بعد جی اٹھنے پر ایمان لائے۔

حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا لَا یُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى یُؤْمِنَ بِاَرْبَعٍ یَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنِّیْ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

بَعَثَنِی بِالْحَقِّ وَیُؤْمِنُ بِالْمَوْتِ وَیُؤْمِنُ بِالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَیُؤْمِنُ بِالْقَدْرِ (ترمذی) کوئی بندہ مومن نہیں ہوسکتا جب تک چار باتوں پر ایمان نہ لائے۔ ایک اس بات کی شہادت دے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں محمد اللہ کا رسول ہوں۔ اللہ نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے مرنے پر ایمان لائے۔ موت کے بعد جی اٹھنے پر ایمان لائے تقدیر پر ایمان لائے۔

دو زندگیوں میں باہمی تعلق: انسان کی دو زندگیاں ہیں۔ ایک دنیاوی زندگی دوسری اخروی زندگی۔ دونوں زندگیوں کا اس میں گہرا تعلق ہے اور لازم ملزوم ہیں۔ اخروی زندگی کے دو مرحلے ہیں پہلے مرحلے کا نام برزخ ہے اور دوسرے کا نام حشر۔

اخروی زندگی کی اساس اسی دنیا میں رکھی جاتی ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عبودیت اختیار کرنا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ میں نے جن وانس کو اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ میری عبودیت اختیار کریں۔ عبودیت کیا ہے الٰہی دستور پر عمل پیرا ہونا۔ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام پر گاہے بگاہے ضرورت کے مطابق اپنا دستور نازل کرتا رہا ہے تاکہ انسان اس کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے۔ اس لیے اس دنیا کو عالم کسب کا نام دیا جاتا ہے۔ الٰہی آئین پر عمل کرنے اور نہ کرنے کا تعلق تینوں عالموں یعنی عالم کسب، عالم برزخ اور عالم حشر (بعث) سے ہے اس تعلق سے بحث کرنا مقصود ہے۔ یہ بحث علم الکلام کی بہت اہم اور مشکل ترین ہے۔ علماء کے اس بارہ میں اختلافات ہیں۔ اختلافات کا جنم لینا ایک قدرتی امر ہے کیونکہ عالم برزخ اور عالم بعث کا تعلق امور غیب سے ہے۔ امور غیب متشبہات سے تعلق رکھتے ہیں۔

جنت اور دوزخ کا آغاز: جنت اور دوزخ کا آغاز اس دنیا سے ہو جاتا ہے۔ جب ایک انسان اللہ کے آئین پر حرف بحرف عمل کرتا ہے اور اس کی رضا کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتا ہے۔ اس کے دل پر نیکی اس قدر غالب آ جاتی ہے۔ شیطانی خواہشات کا اس کے دل میں گزر تک نہیں ہوتا۔ دنیا کی محبت اس کے دل سے بالکل سرد ہو جاتی ہے اور اپنے کامل خلوص اور وفا سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر لیتا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اپنی رضا کے پھل کھلاتا ہے اس کا دل انوار الٰہیہ کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ وہ کامل وفا اور فرمانبرداری اور خلوص سے دستور الٰہیہ کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ اپنے خلوص کے مصفی آئینہ سے اللہ تعالیٰ کا چہرہ دیکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے شیریں اور لذیذ کلام سے سیراب ہوتا ہے۔ عرش پر اس کی دعائیں سنی جاتی ہیں۔ یہی کسب عالم کا بہشت ہے۔ گویا بہشتی زندگی کا آغاز اس دنیا سے شروع ہو جاتا ہے وہ ان تمام روحانی نعمتوں سے متمتع ہوتا ہے جو بہشت موعودہ میں ملیں گی۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (رحمان ۵۵:۴۶) یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے خائف ہے۔ اس کے لیے دو بہشت ہیں ایک یہی دنیا اور دوسری آخرت۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (البلد ۹۰:۲۷.....۳۰) اے اطمینان پانے والے نفس اپنے رب کی طرف لوٹ آ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ سو میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

نفس مطمئنہ سے مراد وہ نفس ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ اس لیے اس نفس کے لیے راضیۃ مرضیۃ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مطمئنہ، نفس کا تیسرا درجہ ہے۔ پہلا درجہ امارہ ہے۔ جب نفس انسانی شیطانی وساوس اور برے خیالات کے طوفان میں گھرا ہوا ہوتا ہے۔ جب وہ اس حالت سیئہ پر نادم ہوتا ہے تو اس کا نفس دوسرے درجہ میں ترقی پاتا ہے وہ لوامہ کی حالت ہے۔ اس درجہ میں انسان کا نفس اللہ تعالیٰ کے آئین شکنی پر نادم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس کی مدد طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دست گیری کرتا ہے اور اس کو گناہوں کی دلدل سے نکالتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی دست گیری سے انسان تیسرے درجہ مطمئنہ میں داخل ہوتا ہے۔ اس درجہ میں برائیوں کی آگ سرد ہو جاتی ہے اور نیکیوں کا نور فروزاں ہوتا ہے تو وہ دنیاوی جنت میں داخل ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی روحانی نعمتوں سے فیض یاب ہوتا ہے۔ گویا انسان اس دنیا میں اپنے لیے جنت پیدا کرتا ہے۔ اس کو اپنے ساتھ لے کر جائے گا۔

یہی حالت دوزخ کی ہے کہ اس کا آغاز بھی اس دنیا سے ہوتا ہے۔ انسان کی دستور شکنی۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی جہنمی زندگی کا نام ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔ وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِیْلًا یعنی جو شخص اس جہاں میں اندھا ہے وہ آنے والے جہاں میں بھی اندھا ہوگا۔ بلکہ اندھوں سے بھی بدتر۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے احکام سے روگردانی اور چشم پوشی کو اندھا پن قرار دیا ہے اور یہی روگردانی انسان کے دل میں دوزخ کی آگ بھڑکاتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ (الھمزہ ۱۰۴:۶، ۷) اللہ تعالیٰ کی جلائی ہوئی آگ جو دلوں پر چڑھتی ہے۔

چونکہ تمام نیکیوں اور برائیوں کا مرکز دل ہوتا ہے یہیں سے نیکی کے چشمے پھوٹتے ہیں اور یہیں سے برائی کے چشمے۔ اس لیے مذکورہ آیت میں اللہ کی

جلائی ہوئی آگ کا مرکز دل قرار دیا ہے۔ انہی لوگوں کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ سَلٰسِلَ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِیْرًا۔ ہم نے کافرین (احکام الٰہی کی نافرمانی کرنے والے) کے لیے زنجیریں اور طوق گردن اور فروختہ آگ تیار کر دی ہے۔

مذکورہ بحث سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ جنت اور دوزخ کا آغاز اسی عالم کسب سے ہو جاتا ہے۔ برزخ اور عالم حشر کے جنت اور دوزخ دنیاوی زندگی کے جنت اور دوزخ کے اظلال اور آثار ہوں گے۔ جو زیادہ نمایاں شکل میں نمودار ہوتے چلے جائیں گے۔

عالم برزخ: برزخ لغت عرب میں اس حالت کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان واقع ہو سو چونکہ یہ زمانہ عالم کسب (نشاۃ اولیٰ) اور عالم بعث میں واقع ہے۔ اس لیے اس کا نام برزخ ہے۔ اس زندگی کا نام قبر کی زندگی ہے اور قبر سے مراد اس دنیا کی قبر مراد نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا تیار کردہ روح کے لیے ٹھکانہ ہے۔ جہاں اس کو اس کے اعمال کے مطابق ایک نیا جسم عطا کیا جائے گا۔ اگر انسان ایمان اور نیک اعمال کے ساتھ گیا ہے تو نورانی جسم عطا کیا جائے گا۔ اگر اعمال سیئہ کے ساتھ گیا ہے تو ظلماتی جسم عطا کیا جائے گا۔ غرض یہ جسم جو اعمال کی کیفیت سے ملتا ہے یہی عالم برزخ میں نیک و بد کی جزا و سزا کا موجب ہے۔

عالم برزخ کا قرآن مجید میں ذکر ہے ارشاد الٰہی ہے۔ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ تو جب ان میں سے ایک کو موت آتی ہے۔ کہتا ہے میرے رب مجھے لوٹا دو تاکہ میں اس میں جسے چھوڑ آیا ہوں اسے اچھے کام کروں۔ ہرگز نہیں وہ ایک بات ہے جسے وہ کہے گا اور ان کے سامنے ایک روک ہے اس دن تک کہ وہ اٹھا جائیں گے۔

اس حالت کو قبر کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ پھر قبر میں ڈالتا ہے پھر جب چاہے گا۔ اسے اٹھا کھڑا کرے گا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ (عادیات ۱۰۰:۹) وہ قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔

اِنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ (حج:۷) اللہ انہیں اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔

جب انسان موت کے بعد دوسری حالت میں داخل ہوتا ہے جس کو اصطلاح میں برزخ اور قبر کہا جاتا ہے تو اس کے اعمال صالحہ اور اعمال سیئہ کی تاثیرات کا ظہور شروع ہو جاتا ہے۔ جو جسمانی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ جبکہ عالم کسب میں ان اعمال کی تاثیرات اور کیفیات مخفی تھیں۔ گویا عالم برزخ انسان کی روحانی ترقی کی دوسری منزل ہے۔ اس حالت میں انسان عالم کسب کی نسبت زیادہ نمایاں شکل میں جنتی اور دوزخی تاثیرات محسوس کرے گا۔ جیسا کہ قرآن مجید اور احادیث سے ثابت ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (مومن ۴۰:۴۵، ۴۶) فرعون کے لوگوں کو برے عذاب نے آ لیا۔ آگ ہے جس پر وہ صبح اور شام پیش کیے جائیں گے اور جس دن (آخری) گھڑی آ جائے گی (کہا جائے گا) فرعون کے لوگوں کو سخت عذاب میں داخل کرو۔

اس آیت میں فرعونیوں کو دو عذابوں کے دینے کا ذکر ہے پہلے عذاب کی کیفیت یہ بیان کی ہے۔ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا (برا عذاب وہ آگ ہے جس پر ان کو صبح و شام پیش کیا جائے گا) دوسرا عذاب اس وقت ہوگا جب یوم حشر ہوگا۔ اس دن ان کو سخت عذاب میں داخل کیا جائے گا۔ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ اس سے معلوم ہوا کہ عالم برزخ میں کسی نہ کسی رنگ میں عذاب اور ثواب کی کیفیت نمایاں ہوگی اور اس کا پورا ظہور یوم حشر کو ہوگا۔ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَیْنِ ثُمَّ یُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِیْمٍ (توبہ ۹:۱۰۱) ہم ان کو دو بار عذاب دیں گے پھر وہ بڑے عذاب کی طرف لوٹا دیے جائیں گے۔

حدیث میں آتا ہے اِذَا مَاتَ اَحَدُكُمْ عُرِضَ عَلَیْهِ مَقْعَدُهٗ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِیِّ اِنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ النَّارِ فَمِنْ اَهْلِ النَّارِ فَیُقَالُ لَهٗ هٰذَا مَقْعَدُكَ حَتّٰى یَبْعَثَكَ اللّٰهُ اِلٰى یَوْمِ الْقِیَامَةِ (صحیح بخاری) جب انسان مرجاتا ہے تو صبح و شام اس کا ٹھکانہ اس پر پیش کیا جاتا ہے اگر جہنمی ہے تو وہ جہنمی میں سے ایک ہے کہا جاتا ہے قیامت کے دن جی اٹھنے تک تیری یہی جگہ ہے۔

رسول کریم ﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے تو فرمایا اِنَّهُمَا یُعَذَّبَانِ وَمَا یُعَذَّبَانِ فِیْ كَبِیْرٍ ثُمَّ قَالَ بَلٰى اَمَّا اَحَدُهُمَا فَكَانَ یَسْعٰى بِالنَّمِیْمَةِ وَاَمَّا الْاٰخَرُ لَا یَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهٖ (صحیح بخاری) ان دونوں کو عذاب دیا جا رہا ہے۔ کسی بڑے گناہ کی وجہ سے نہیں ایک چغل خوری کرتا تھا اور دوسرا اپنے پیشاب کے چھینٹوں سے اجتناب نہیں کرتا تھا۔

رسول کریم ﷺ عذاب قبر سے بچنے کی دعا سکھائی ہے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْۤ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْیَا وَالْعَذَابِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ (صحیح بخاری) اے خدا میں عذاب قبر، عذاب نار (جہنم)، زندگی اور موت کی آزمائشوں اور مسیح الدجال کے فتنہ سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

گویا عالم برزخ میں برے اور اچھے دونوں قسم کے اعمال کی تاثیرات زیادہ نمایاں شکل میں نمودار ہوں گی۔

عالم برزخ کی مدت: عالم برزخ کی مدت کو عالم کسب (دنیا) کی مدت پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ان امور سے تعلق رکھتا ہے جو انسانی حواس سے باہر ہیں۔ انسانی عقل ان کا احاطہ نہیں کر سکتی ان امور کو انسانی عقل سے پوشیدہ رکھنا ہی بہتر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ (الروم ۳۰:۵۵،۵۶) جب وہ گھڑی آئے گی مجرم قسمیں کھائیں گے۔ وہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ٹھہرے اس طرح الٹے پھر جاتے تھے اور وہ جنھیں علم اور ایمان دیا گیا ہے کہیں گے تم اللہ کے حکم کے مطابق جی اٹھنے کے دن تک ٹھہرے رہے۔

یہ آیت عالم برزخ میں ٹھہرنے پر تو روشنی ڈالتی ہے لیکن عالم برزخ کی مدت ظاہر نہیں کرتی۔ مجرموں کا قول ٹھہرنے کے متعلق ایک ساعت ہے جبکہ صاحب ایمان مجرموں سے یہ کہتے ہیں کہ ان کا عالم برزخ میں قیام یوم حشر تک تھا۔ قرآن مجید اور احادیث میں عالم برزخ کی مدت کا تعین نہیں کیا گیا لہٰذا اس پر بحث کرنا لاحاصل ہے۔

عالم برزخ میں عذاب وثواب کی نوعیت و کیفیت: عالم برزخ میں عذاب وثواب کی نوعیت اور کیفیت انسان کے اعمال سیۂ اور اعمال حسنہ سے تعلق رکھتی ہے اعمال ہی مختلف شکلیں اختیار کریں گے۔ اگر کسی پر قوت سبعی غالب ہوگی تو اس کو درندے کاٹتے ہوئے نظر آئیں گے اگر کوئی بخیل ہے تو اس کو سانپ بچھو کاٹتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ جیسا کہ رسول کریم ﷺ نے معراج میں مختلف گناہگاروں کو مختلف عذاب میں مبتلا دیکھا، اعمال حسنہ والا شخص اپنے اعمال کے نتائج کو مختلف شکلوں میں پائے گا۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ اَلْمُؤْمِنُ فِيْ قَبْرِهٖ فِيْ رَوْضَةٍ خَضْرَآءِ وَيرحَبُ لَهٗ قَبْرُهٗ سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا يُضِيْ حَتّٰى يَكُوْنَ كَالْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ وَقَالَ عَذَابُ الْكَافِرِ فِيْ قَبْرِهٖ يُسَلِّطُ عَلَيْهِ تِسْعَةً وَتِسْعُوْنَ تِنِيْنًا هَلْ تَدْرُوْنَ مَا التِّنِيْنُ (هي) تِسْعَةٌ تِسْعُوْنَ حَيَّةً لِكُلِّ حَيَّةٍ سَبْعَةُ رُؤُسٍ يَخْدِشُوْنَهٗ وَيَلْهَسُوْنَهٗ وَيَنْفُخُوْنَ فِيْ جِسْمِهٖ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ مومن کو جب قبر میں رکھا جاتا ہے تو اس کو سبز باغ میں داخل کیا جاتا ہے اور اس کی قبر ستر گز کشادہ کی جاتی ہے اس میں چودھویں رات کے چاند کی طرح روشنی ہو جاتی ہے اور فرمایا کہ کافر پر اس قبر میں ننانوے اژدھے مسلط کر دیے جاتے ہیں تم جانتے ہو کہ اژدہا کیا ہے وہ ننانوے سانپ ہیں ہر ایک سانپ کے سات سر ہوتے ہیں اس کو کاٹتے ڈستے اور اس کے جسم میں پھنکاریں یوم حشر تک مارتے رہتے ہیں۔

مومن کو سبز باغ میں داخل کرنا اور اس کی قبر کا کشادہ اور روشن ہونا اس کے اعمال حسنہ کا نتیجہ ہے اسی طرح سانپ اور بچھو اخلاق مذمومہ کی شکلیں ہیں۔ سانپوں کی اس خاص تعداد سے بھی تعجب نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ان سانپوں اور بچھوؤں کی تعداد اخلاق سیۂ کبر، ریا، حسد، کذب، نفاق وغیرہ کی تعداد کے موافق ہوتی ہے یہ صفات اصول ہیں اور ان کے فروعات بھی ہیں جن کی تقسیم ان صفات کے مطابق ہوتی ہے وہی اصول اور فروعات سانپ اور بچھو ہو جاتی ہیں۔ جس شخص میں جو صفت زیادہ شدت سے پائی جائے گی۔ اس کا ڈسنا اژدہا کی مانند ہوتا ہے جو کمزور صفت ہو اس کا کاٹنا بچھو کی طرح ہوتا ہے جو درمیانی قوت کی صفت ہوگی اس کا دکھ سانپ کے کاٹنے کی طرح ہوگا۔ یہ سب انسان کے اپنے اعمال کے نتائج ہیں۔ کہیں باہر سے نہیں آئے بلکہ انسان کے دل میں ہی اخلاق سیۂ کے آثار جمے ہوئے تھے وہ اپنی اشکال پر سانپ اور درندے بن کر عالم برزخ میں اس کی روح کو کاٹتے ہیں اور اس کے جسم اور روح کو ایذا پہنچتی ہے۔ جس شخص کے اعتقادات درست اور اعمال اچھے ہیں وہ سکھ اور راحت میں ہوں گے۔ انسان کو اس کا تجربہ اس زندگی میں بھی ہوتا ہے۔ وہ خواب میں خوش کن باتوں سے راحت اور لذت محسوس کرتا ہے اور ایذا رسانی والی باتوں سے دکھ محسوس کرتا ہے۔ اس طرح برزخی ایذا اور راحت اس انداز سے ہے اللہ تعالیٰ نے امور غیب پر اطلاع پانے کے لیے انسان کو مختلف راستوں کی اطلاع دی ہے انہی میں سے ایک خواب کی حالت میں دکھ اور سکھ پانا ہے اسی طرح رسول کریم ﷺ کے بے شمار مکاشفات ہیں۔ جن میں حضور ﷺ نے عالم برزخ میں دکھ اور سکھ کی کیفیات کو دیکھا اور صحابہ کرام کو بتایا۔ اس طرح بے شمار صلحاء نے بھی عالم برزخ کے مکاشفات میں نظارے دیکھے ہیں۔ ان کو تسلیم کر لینا ہی انسان کی بہتری کا موجب ہے۔

انسانی زندگی کا اعلیٰ اور ارفع مقصد: اسلامی نقطہ نگاہ سے انسان ایک اعلیٰ اور ارفع مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس ارفع مقصد کی وجہ سے اس کو خلیفۃ اللہ کہا گیا ہے۔ اس ارفع مقصد کے حصول کے لیے دوسری مخلوقات کے برعکس وہ عقل کی نعمت سے نوازا گیا ہے اس کی ہدایت کے لیے انبیاء علیہم السلام دستور الٰہی لے کر آتے رہے تاکہ اس کا قدم صراط مستقیم پر جما رہے اور روحانی منازل طے کرتا چلا جائے۔ اس لیے دستور الٰہی میں انسان کو بار بار یہ یقین دہانی کرائی گئی ہے اس کی پیدائش عبث نہیں بلکہ وہ اعلیٰ روحانی مقاصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی توجہ اس طرف ہونی چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (القیمۃ ۷۵:۳۶) کیا انسان خیال کرتا ہے کہ وہ مہمل چھوڑ دیا جائے گا۔

یہی وجہ ہے اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اس نے انسان کو اعلیٰ مقام دینے کے لیے پیدا کیا ہے۔ اسی طرح اسی مقصد کے حصول

کے لیے موت کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يُّحْیِۦَ الْمَوْتٰى (۷۵:۴۰) کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کرے۔

دوسری جگہ مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ (التین ۹۵: ۱......۶) یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا ہے۔ پھر ہم اسے ذلیل سے ذلیل حالت کی طرف بھی لوٹا دیتے ہیں مگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کرتے ہیں ان کے لیے ایسا اجر ہے جو ختم نہیں ہوتا۔

الفاظ ''احسن تقویم'' میں انسان کی دوسری مخلوقات کے مقابل صرف اچھی جسمانی ساخت ہی مراد نہیں بلکہ وہ استعداد بھی مراد ہے جو انسان میں تعلق باللہ کے لیے رکھی گئی ہے۔ جو کسی دوسری مخلوق میں نہیں ہے جو شخص اس استعداد کو بروئے کار نہیں لاتا وہ اسفل سافلین کے مقام پر گر جاتا ہے۔ جو اس استعداد کو کام میں لا کر ایمان اور اعمال صالحہ کے زیور سے اپنے آپ کو آراستہ کرتا ہے ان کے لیے غیر منقطع اجر ہے۔ اس غیر منقطع اجر کا تعلق ہی اخروی زندگی سے ہے۔ یہی روحانی ارتقاء ہے۔ گویا وہ روحانی ارتقاء اس دنیا سے شروع ہوتا ہے اس کا کمال عالم معاد میں ہوگا۔ عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ دنیا میں ہر چیز اپنی پیدائش کا قصد کو پورا کر رہی ہے۔ سورج، چاند، ستارے، ہوا، پانی، چرند پرند وغیرہ اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اور اپنی تخلیق کا مقصد پورا کر رہے ہیں تو پھر کیا انسان کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں۔ یقیناً عقل یہی فیصلہ کرتی ہے کہ انسان جو کائنات کی ہر چیز کا مخدوم ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی ارفع مقصد ہے۔ وہ ہے اس دنیاوی زندگی کے بعد اعلیٰ زندگی بسر کرنا۔ یہ مقصد اخروی زندگی سے ہی پورا ہو سکتا ہے گویا اخروی زندگی ہی انسانی زندگی کے ارفع مقصد کو پورا کرتی ہے۔

صفات الٰہیہ اور ارتقاء انسانی: ارتقاء انسانی قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ننانوے صفات کا ذکر ہے۔ ان میں سے ایک صفت ''رب'' ہے رب کے معنی ہیں ایک چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف نشوونما دینا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے کمال کو پہنچ جائے (مفردات امام راغب) گویا اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو تدریجا ایک چیز کو اپنے کمال تک پہنچاتی ہے۔

انسان کی روحانی نشوونما کا آغاز اس عالم کسب سے شروع ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت ''ربوبیت'' کے تحت وہ روحانی نشوونما عالم معاد میں اپنے کمال کو پہنچے گی۔ جب اس کو دیدار الٰہی نصیب ہوگا۔ انسان کی روحانی نشوونما کا کمال دیدار الٰہی ہے۔ اس کا تجربہ اس دنیا میں بھی صاحب کمال لوگوں نے کیا ہے جیسا کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے اس تجربہ کا ذکر احادیث میں پایا جاتا ہے۔ اس طرح دیگر صفات بھی اپنی پوری شان میں جلوہ گر ہوں گی اور انسان ان صفات کے تحت اپنے کمال کو پہنچے گا۔ اور اپنے رب کی ذات سے واقف ہو جائے گا۔ عالم معاد میں روحانی ترقیات غیر متناہی ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ نُوْرُهُمْ یَسْعٰى بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ یعنی جو لوگ (دنیا میں) ایمان لائے۔ ان کے (ایمان کا) نور قیامت کے دن ان کے آگے اور ان کی داہنی طرف دوڑتا ہوگا اور وہ یہی کہیں گے۔ اے ہمارے رب ہمارے نور کو کمال تک پہنچا اور اپنی مغفرت کے اندر لے لے تو ہر چیز پر قادر ہے۔

اس آیت میں اَتْمِمْ کا لفظ ترقیات غیر متناہیہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور یہی روحانی ارتقاء ہے جو عالم معاد سے وابستہ ہے۔

نیکی اور بدی کی جزا و سزا: الٰہی دستور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر مشتمل ہے۔ اور یہی دو امور زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہیں۔ انہی سے انسان کی مادی اور روحانی ترقی وابستہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام انہی امور کی تعلیم و تبلیغ کے لیے مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ انہی دو امور پر عمل کرنے اور عمل نہ کرنے کی وجہ سے جزا و سزا ہے۔ جس کا سلسلہ اس دنیا سے شروع ہو کر اخروی زندگی تک ممتد ہے۔ اور اخروی زندگی میں عامل کی جزا و سزا کھل کر سامنے آ جائے گی۔ نیکی اپنا نتیجہ ظاہر کر دے گی اور بدی اپنا نتیجہ۔ قرآن مجید میں نیکی اور بدی کے نتائج کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ (الزلزال ۹۹: ۷، ۸) تو جو کوئی ایک ذرہ کے وزن کے برابر بھلائی کرتا ہے اسے دیکھ لے گا اور جو کوئی ایک ذرہ کے وزن کے برابر بدی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔

نیکی اور بدی کے ثمرات اور نتائج کا یہ اصول غیر متبدل ہے۔ رسول کریم ﷺ نے ان آیات کو الجامعہ الفاذہ کا نام دیا ہے۔ (بخاری) یعنی جو اصول ان میں بیان ہوا ہے وہ جامع ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ (یوسف ۱۲: ۹۰) اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ہم اس کا اجر ضائع نہیں کرتے جو اچھا عمل کرتا ہے۔

اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ (آل عمران ۳: ۱۹۵) کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو

ضائع نہیں کرتا مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے سے ہو۔

علت اور معلول، سبب اور مسبب کا قانون دنیا کی ہر چیز میں پایا جاتا ہے۔ اس پر دنیا کا نظام چل رہا ہے۔ مثلاً جو شخص مقوی اور صحت یاب غذا کھاتا ہے تو وہ صحت سے فیض یاب ہوگا اور جو زہر کھائے گا تو وہ موت سے ہم آغوش ہوگا۔ علت اور معلول کے اصول کے تحت ہر عمل کا نتیجہ لازمی ہے۔ جو اخروی زندگی کا متقاضی ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر نیکی اور بدی کا نتیجہ تو اس دنیا میں ظاہر نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص رات کو اٹھ کر اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے یا ایک شخص اپنے مال میں سے غرباء مساکین کی مدد کرتا ہے۔ یہ دونوں عمل نیکی کے ہیں۔ لیکن ان کا نتیجہ عامل کے سامنے نہیں آتا۔ اسی طرح کوئی شخص بدی کا ارتکاب کرتا ہے لیکن بدنتائج سے بچا رہتا ہے لیکن الٰہی قانون کے تحت تو لازمی ہے کہ ہر نیک اور بدعمل کا نتیجہ ظاہر ہو اس لیے منطقی طور پر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس زندگی کے بعد بھی ایک اور زندگی ہے جہاں ہمارے عمل کا نتیجہ نکلے گا۔

بعث بعد الموت کا عربوں کا انکار اور قرآنی دلائل: بعث بعد الموت بھی ان امور میں سے ہے۔ جس کا عربوں نے شدت سے انکار کیا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ ءَ اِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ (ق ۵۰:۳) کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو اٹھائیں جائیں گے) یہ لوٹ کر آنا دور ہے۔

قَالُوْا اِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (اسرائیل ۱۷:۴۹) اور کہتے ہیں کیا ہم ہڈیاں اور چورا ہو جائیں گے تو کیا نئی پیدائش کے لیے اٹھائے جائیں گے۔

مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ (یٰسین ۳۶:۷۸) ان سڑی گلی ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا۔

وَقَالُوْا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ (الانعام ۶:۲۹) اور انھوں نے کہا کہ یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔

قیامت پر قرآنی دلائل

پہلی دلیل: انسان پیدائش سے قبل کچھ نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا ہے۔ گویا انسان کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو بہترین صورت دی جب اللہ تعالیٰ پہلی دفعہ عدم سے وجود میں لانے پر قادر ہے تو دوبارہ مرنے کے بعد وجود میں کیوں نہیں لا سکتا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى (القیامہ ۷۵:۳۶.....۴۰) کیا انسان خیال کرتا ہے کہ وہ یونہی بیکاری چھوڑ دیا جائے گا۔ کیا وہ منی کا ایک نطفہ نہ تھا جو ڈالی جاتی ہے۔ پھر وہ ایک لوتھڑا تھا۔ سو اسے پیدا کیا پھر ٹھیک بنایا تب اس کو جوڑا یعنی نر اور مادہ کیا اللہ اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کرے۔

ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عجیب در عجیب طریق سے پیدا کیا ہے تو کیا وہ دوسری زندگی نہیں بنا سکتا۔ جب خدا ایک زندگی دے سکتا ہے تو دوسری زندگی بھی دے گا۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ (الروم ۳۰:۲۷) اور وہی ہے جو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر اسے دوبارہ پیدا کرتا ہے۔ اور یہ اس پر بہت آسان ہے۔

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ (الحج ۲۲:۵) اے لوگو! اگر تمھیں جی اٹھنے میں شک ہے تو (غور کرو) ہم نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا۔

اگلی آیت نمبر ۶ میں بیان کیا۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲۲:۶) یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے کہ وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

دوسری دلیل: اللہ تعالیٰ نے زمین پیدا کی۔ آسمان بنایا اس میں پہاڑ پیدا کیے۔ خشک زمین میں سے بادلوں سے مینہ برسا کر روئیدگی نکالی۔ جب اللہ تعالیٰ اس قسم کی چیزیں پیدا کرنے پر قادر ہے تو اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیوں کر دشوار ہو سکتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ (ق

۶:۵۰......۱۱) تو کیا وہ اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھتے ہم نے اسے کس طرح بنایا ہے اور اسے زینت دی اور اس میں کوئی نقص نہیں اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑ ڈالے اور اس میں ہر قسم کی خوبصورت چیزیں اگائیں۔ ہر ایک رجوع کرنے والے بندہ کے لیے اس میں سوجھ اور نصیحت ہے اور ہم نے بادل سے برکت والا پانی اتارا پھر ہم نے اس کے ساتھ باغ لگائے اور دانہ جو کاٹا جاتا ہے اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا گابھا تہہ بہتہ ہے بندوں کے لیے رزق ہے اور اس کے ساتھ ہم مردہ بستی کو زندہ کرتے ہیں اس طرح نکلنا ہوگا۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ پہلی پیدائش جو عدم سے وجود میں لانا تھا اگر اس میں اللہ کی قدرت کاملہ عاجز اور درماندہ نہیں تو دوسری پیدائش کیوں کر نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے دوسری نئی پیدائش ظہور میں لائے گا۔

بعثت بعد الموت سائنسی علوم کے مطابق ہے: جیسا کہ پہلی آیات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ عرب دوبارہ جی اٹھنے کو انوکھا اور اَن ہونا خیال کرتے تھے کہ کس طرح گلی سڑی ہڈیاں دوبارہ ایک نئی زندگی حاصل کر لیں گی۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا ہے کہ وہ پہلے نیست تھے۔ نیست سے ہست (وجود) میں آئے۔ یعنی ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت میں۔ دور حاضر میں ارتقاء کا قانون اسی اصول پر مبنی ہے کہ ہر چیز بہتری طرف رواں دواں ہے اسی قانون کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان کیا ہے کہ موجودہ موجودات کی جگہ ایک نئی کائنات وجود میں آ جائے گی اور پرانا نظام ایک اعلیٰ نظام میں بدل جائے گا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (ابراہیم ۴۸:۱۴) جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی۔

گویا قانون ارتقاء کے تحت موجودہ ادنیٰ نظام کائنات اعلیٰ نظام کائنات میں بدل جائے گا اس اعلیٰ نظام کے ساتھ انسانی زندگی کا اعلیٰ اور ارفع ہونا وابستہ ہے جن کا احاطہ ہمارے موجودہ حواس نہیں کر سکتے۔

مرنے کے بعد روح کو نیا جسم کا ملنا: ایک اہم سوال یہ ہے کہ آیا مرنے کے بعد حشر جسمانی ہوگا یا روحانی۔ دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ اگر حشر جسمانی ہوگا تو یہی جسم ہوگا یا کوئی نیا۔ یہ سوالات علم کلام کے اہم موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں علماء کرام نے بہت بحثیں کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ روح اور جسم لازم ملزوم ہیں۔ روح بغیر جسم کے نہیں رہ سکتی۔ جسم ہی روح کی ماں ہے۔ روح نطفہ میں ایک مخفی نور ہوتا ہے جو رحم مادر ہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت سے نشوونما پاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے روح کی پہلی پیدائش جسم میں کی ہے تو اس کا یہی ارادہ معلوم ہوتا ہے کہ روح کی دوسری پیدائش بھی جسم کے ذریعے ہی ہو۔ اسی دوسری پیدائش کو قرآن مجید میں خلق جدید کہا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَقَالُوْٓا ءَ اِذَا کُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا (بنی اسرائیل ۴۹:۱۷) کیا ہم ہڈیاں اور چورا چورا ہو جائیں گے تو کیا ہم نئی پیدائش کے لیے اٹھائے جائیں گے فرمایا: اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ (ق ۱۵:۵۰) تو کیا ہم پہلی پیدائش میں تھک گئے ہیں؟ بلکہ وہ نئی پیدائش کے متعلق شبہ میں ہیں۔

الفاظ ''خلق جدید'' ظاہر کرتے ہیں دوسری پیدائش اس مادی جسم میں نہیں ہوگی بلکہ وہ کسی اور رنگ میں ہوگی۔ ہوگی جسمانی اور وہ جسم نیا ہوگا۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ (بنی اسرائیل ۹۹:۱۷) کیا وہ غور نہیں کرتے کہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ اس بات پر قادر ہے کہ ان جیسے پیدا کرے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ بعث بعد الموت میں یہ جسم نہ ہوگا بلکہ اس کی مثل ہوگا مثلھم میں ضمیر ھم آسمانوں اور زمینوں کی طرف انھیں بلکہ انسانوں کی طرف ہے۔

لہٰذا بعث بعد الموت کے بعد جو جسم روح کو ملے گا وہ جسم اس جسم کی قسم سے نہیں ہوگا بلکہ نور سے یا تاریکی سے ہوگا۔ انسان جس قسم کے اعمال کیے ہوں گے انہی اعمال کے نور یا ظلمت سے جسم تیار ہوں گے یہی نورانی یا ظلماتی جسم خلق جدید ہیں[1]

یہ بھی الٰہیات کا ایک اہم اور ادق موضوع ہے اور علماء کرام کے زیر بحث رہا ہے۔ عالم آخرت، دنیوی زندگی کے اظلال و آثار ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَکُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ کِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا (بنی اسرائیل ۱۴:۱۷) ہر انسان کے اعمال کو ہم نے اس کی گردن میں ڈال رکھا ہے اور ہم کو اس کے لیے قیامت کے دن ایک کتاب نکالیں گے جسے وہ کھلا ہوا پائے گا۔

اس آیت میں نیک اور بد اعمال اور ان کے نتائج کا ایک پُر حکمت فلسفہ بیان کیا ہے یہ قرآنی اصول ہے کہ ہمارے ہر عضو کے فعل کا نقش قائم رہتا ہے اور یہی اعمال نامہ ہے جو قیامت کے دن انسان کے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ یَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰی مِنْکُمْ خَافِیَةٌ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ

[1] یہ یاد رکھنا چاہیے میں نے جو نظریہ بیان کیا ہے اس کی بنیاد اہل مکاشفہ کے مکاشفات پر ہے۔ یہ ایک دقیق راز ہے جو عقل سے حل نہیں ہو سکتا علم معاد کا حصول مکاشفات ہیں جیسا کہ احادیث سے ظاہر ہے کہ رسول کریم ﷺ نے جنت و دوزخ کے نظارے پاک مکاشفات کے ذریعے کیے۔

بِيَمِينِهٖ فَيَقُولُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ فَهُوَ فِیْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ فِیْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ مَآ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِيَهْ هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِيَهْ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ (الحاقہ ۶۹:۱۸......۳۲) اس دن تم پیش کیے جاؤ گے تمہاری کوئی پوشیدہ بات چھپی نہ رہے گی۔ سو جس کی کتاب (اعمال نامہ) اس کے دائیں ہاتھ میں دی جائے گی تو وہ کہے گا لو میری کتاب (اعمال نامہ) پڑھو۔ میں جانتا تھا کہ میرا حساب مجھے ملے گا۔ سو وہ خوشی کی زندگی میں ہوگا۔ بلند باغ میں جس کے میوے قریب ہیں خوش گواری سے کھاؤ اور پیو۔ اس کا بدلہ جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کیا اور جس کی کتاب (اعمال نامہ) اس کے بائیں ہاتھ میں دی جائے گی تو وہ کہے گا اے کاش میری کتاب مجھے نہ دی جاتی اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے اے کاش! (وہ موت) کام تمام کرنے والی ہوتی۔ میرے مال نے مجھے کام نہ دیا میری سلطنت مجھ سے جاتی رہی۔ اسے پکڑو پھر اسے طوق پہناؤ۔ پھر اسے دوزخ میں داخل کردو۔ پھر ایک ایسی زنجیر میں جس کی ناپ ستر ہاتھ ہے اسے جکڑ دو۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (الجاثیہ ۴۵:۲۹) یہ ہماری کتاب (اعمال نامہ) تمہارے بارے میں حق کے ساتھ بولتی ہے ہم لکھ لیتے تھے جو کچھ تم کرتے تھے فرمایا۔ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (الکہف ۱۸:۴۹) اور کتاب رکھی جائے گی تو تو مجرموں کو اس سے جو اس میں ہے ڈرتے ہوئے دیکھے گا۔ اور وہ کہیں گے ہم پر افسوس! یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ چھوٹی بات کو پیچھے چھوڑتی ہے نہ بڑی کو۔ مگر اسے محفوظ کرلیا ہے جو کچھ انھوں نے کیا تھا حاضر کئے جائیں گے۔ اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ قرآن مجید میں صرف افراد کے اعمال نامہ کا ہی ذکر نہیں بلکہ قوموں کے اعمال نامے کا بھی ذکر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (الجاثیہ ۴۵:۲۸) اور تو ہر ایک امت کو گھٹنوں کے بل دیکھے گا۔ ہر ایک امت اپنی کتاب کی طرف بلائی جائے گی۔ آج تمھیں وہی بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے تھے۔

فرمایا فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ (الانبیاء ۲۱:۹۵) پس جو کوئی اچھے کام کرے اور وہ مومن ہو تو اس کی کوشش کی ناقدری نہ ہوگی اور ہم اس کے لیے لکھ لیتے ہیں۔

قرآن مجید میں اعمال کے حساب کتاب کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے۔ حقیقت میں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اخروی زندگی میں ہمارے اعمال کے نتائج واضح طور پر ظاہر ہو جائیں گے اور کسی کو شک وشبہ کرنے کی گنجائش نہیں رہے گی۔ مجازات اور استعارات کا استعمال قرآن مجید کی اعجازی صورت ہے۔ جو فصاحت و بلاغت کا حصہ ہے جس کی نظیر پیش کرنا محال ہے۔

المیزان: اعمال کے حساب کتاب کے لیے قرآن مجید میں لفظ المیزان بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ہم قیامت کے دن کے لیے انصاف کے میزانوں کو رکھیں گے۔

ساتھ ہی الموازین القسط کی وضاحت کر دی۔ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ (الانبیاء ۲۱:۴۷) پس کسی شخص پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔ اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی عمل ہوگا ہم اسے لے آئیں گے اور ہم حساب کرنے والے کافی ہیں۔

یعنی اللہ کے نزدیک اعمال کا حساب کتاب ایسا ہوگا اور ایسا انصاف ہوگا۔ رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی عمل حساب کتاب سے باہر نہیں رہے گا۔

گویا انسانوں کے اعمال کے وزن سے مراد انصاف ہے۔ دوسری جگہ یہ بیان کیا۔ اَلْوَزْنُ يَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ (الاعراف ۷:۸) اور وزن اس دن حق ہے۔

ان الفاظ کی مزید وضاحت کر دی۔ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ (الاعراف ۷:۸،۹) پس جس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا پس وہی کامیاب ہونے والے ہیں اور جس کی نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہوگا پس وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور وہ ہماری آیتوں کے بارے ناانصافی کرتے تھے۔

قرآن مجید میں ''الوزن'' ''المیزان'' کے الفاظ وسیع معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ رسولوں کے بارے میں آتا ہے۔ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ (ہم ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری)

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ آسمان کو بلند کیا اور میزان رکھی۔

ان دونوں جگہوں میں کسی مفسر نے وہ ترازو مراد نہیں لیا جس سے اشیاء تولی جاتی ہیں بلکہ ہر جگہ اس کے معانی الگ الگ ہیں۔ اسی طرح اعمال کے ساتھ جہاں المیزان کا لفظ آیا ہے تو اس سے مراد صرف عدل ہے جو روز محشر کو ہوگا۔ عدل و انصاف کی تعبیر اور تفسیر لفظ میزان سے کی ہے۔ اس موضوع کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (الزلزال ۹۹:۸،۷) جو کوئی رائی کے دانہ کے برابر نیکی

کرے گا اس کے نتیجہ کو دیکھ لے گا اور جو کوئی رائی کے دانے کے برابر بدی کرے گا وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔ یَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَراً وَّ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗ اَمَداً بَعِيْداً (آل عمران ۳:۳۰) جس دن ہر شخص جو کچھ اس نے نیکی کی ہے موجود پائے گا اور جو کچھ اس نے بدی کی ہے آرزو کرے گا کہ اس کے اور اس کے درمیان لمبا فاصلہ ہوتا وہی موضوع اعمال کے حساب کتاب کا ہے لیکن بیان کرنے کا پیرایہ الگ ہے۔ ان آیات میں بھی عدل و انصاف قائم کرنا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ اپنی صفت عدل کے ساتھ ہر شخص پر اس کے اعمال نیک و بد کی مقدار ظاہر کر دے گا۔ پس اس صفت عدل کو میزان و وزنی اعمال سے تعبیر کیا ہے۔

نفخ صور: نفخ صور کے متعلق تین اقوال ہیں۔ صور ایک آلہ ہے جب اس کو پھونکا جائے گا تو ایک بلند آواز پیدا ہوگی یہ دنیا کی تباہی و بربادی اور اعادہ اموات کی علامت قرار دیا ہے۔ رسول کریم ﷺ سے روایت ہے وہ ایک آلہ ہے جس میں پھونکا جائے گا۔

دوسرے صورت کی جمع ہے یعنی جب صورتوں میں روحیں پھونکی جائیں گی۔ اس لیے یہ لفظ (صور) بفتح واؤ ہے حسن کا یہی قول ہے۔ صور کا پھونکنا ایک استعارہ ہے جس کا مقصد مردوزن کا اٹھانا اور جمع کرنا ہے۔

تمام دنیا میں صور کا پھونکا جانا لوگوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی علامت ہے۔ فوجوں میں سپاہیوں کو ایک جگہ جمع کرنے کے لیے صور پھونکا جاتا ہے۔ گویا بعث بعد الموت کو استعارہ کے رنگ میں نفخ صور کے الفاظ نے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی "مشیت" "کن فیکون" کی عملی تفسیر ہے۔ موجودہ عالم کو نیست و نابود کرنے اور ایک نیا عالم معرض وجود میں لانے کے لیے اللہ تعالیٰ فرشتے کے ذریعہ حکم صادر کرے گا تو ایک نیا عالم وجود میں آ جائے گا۔ یہ نفخ صور پرانی دنیا کو بدل کر ایک نیا عالم وجود میں لانے کا نشان ہے۔ انقلاب عظیم کے وقت کائنات ذرہ ذرہ اس باطنی بگل کی آواز سنے گا۔

بہشت اور دوزخ میں جزا و سزا کی نوعیت اور کیفیت: یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بہشت اور دوزخ کی ابتداء اس دنیا سے ہی شروع ہو جاتی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ جو اپنے رب سے خائف ہے اس کے لیے دو بہشت ہیں ایک یہی دنیا اور دوسری آخرت۔

دوزخیوں کے متعلق آتا ہے وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا جو شخص اس دنیا میں (روحانی) اندھا ہے اور آخرت میں بھی (روحانی) اندھا ہوگا۔

یہ دونوں آیات ظاہر کرتی ہیں کہ بہشت اور دوزخ کی بنیاد اخلاق حسنہ اور اخلاق سیئہ کی روشنی میں اس دنیا میں پڑ جاتی ہے۔ گویا بہشت اور دوزخ اس دنیا کے ایمان اور اعمال کے اظلال اور آثار ہیں بہشت انسان کے اس دنیا کے ایمان اور عمل کا نتیجہ اور ظل ہے اور دوزخ انسان کے اعمال سیئہ ظل اور نتیجہ گویا اعمال حسنہ اور اعمال سیہ متشکل ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔ وہی بہشت اور دوزخ ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یعنی جو لوگ ایمان لاتے اور نیک عمل بجا لاتے ہیں ان کے لیے جنت ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو باغ سے مشابہت دی ہے جس کے نیچے اور نہروں کو اعمال صالحہ سے جس طرح جو تعلق باغ کا نہروں سے ہے کوئی باغ پانی کے بغیر نہ پھل دیتا ہے اور نہ سرسبزہ رہ سکتا ہے۔ اسی طرح ایمان اور اعمال حسنہ کے درمیان رشتہ ہے ایمان بغیر اعمال صالحہ کے زندہ ایمان نہیں اور نہ اعمال صالحہ بغیر ایمان کے کوئی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایمان اس وقت فائدہ مند ہے جب اس کے ساتھ اعمال صالحہ ہوں اور اعمال صالحہ اس وقت مثمر ہوں گے جب اس کے ساتھ ایمان کی دولت ہو۔ بہتر نتیجہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ ہوں اور اعمال صالحہ کے ساتھ ایمان ہو۔ متقیوں کو بہشت میں نعماء الٰہی دودھ شہد اور ہر قسم کے پھل حور و غلماں دیا جانے کا وعدہ ہے بلکہ قرآن مجید میں آتا ہے جس چیز کی خواہش کریں گے ان کو مل جائے گی۔ قرآن مجید میں آئندہ زندگی کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ وہ محض بطور مثال کے بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ (محمد ۴۷:۱۵) اس جنت کی ایک مثال ہے جس کا وعدہ متقیوں کو دیا جاتا ہے اس میں پانی کی نہریں ہیں جو بگڑ کر بدبودار نہیں ہوتا اور دودھ کی نہریں ہیں جس کا مزہ نہیں بدلتا اور شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے باعث لذت ہے صاف کیے ہوئے شہد کی نہریں ہیں۔ اور ان کے لیے اس میں ہر قسم کے پھل ہیں اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے۔

مذکورہ آیت میں لفظ مثل ظاہر کرتا ہے کہ جنت کی نعماء بطور مثال بیان ہوئی ہیں۔ جنت کی نعماء اور اس دنیا کی نعماء میں صرف نام کا اشتراک ہے۔ ابن عباس سے ابن کثیر میں روایت ہے۔ لایشبه شی مما فی الجنة ما فی الدنیا الا فی الاسماء یعنی جو چیزیں جنت میں ہیں وہ دنیا کی کسی چیز سے سوائے نام کے مشابہت نہیں رکھتیں۔

قرآن مجید میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے ارشاد الٰہی ہے۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (السجدہ ۳۲:۱۷) بس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔

صحیح بخاری میں اسی آیت کی تفسیر میں رسول کریم ﷺ نے فرمایا قَالَ اللّٰهُ اَعْدَدْتُ لِعِبَادِی الصَّالِحِيْنَ مَالَا عَيْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ (بخاری) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کیا ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے سنا ہے نہ کسی شخص کے دل پر وہ گزرا۔

سورہ محمد کی آیت میں نعماء جنت کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے۔ وہ بھی ظاہر کرتی ہیں کہ صرف ناموں میں اشتراک ہے کیفیت اور اوصاف نہیں ہے۔ دوزخ میں ایذا اور دکھ دینے والی مختلف چیزوں کا جو ذکر کیا گیا ہے۔ وہ بھی انسان کے اعمال سیئہ اور بداعتقادات کے آثار اور شکلیں ہوں گی۔ دوزخ کی دنیا کی ایذا اور دکھ دینے والی چیزوں میں بھی صرف ناموں میں اشتراک ہے۔ کیفیت اور وصف میں نہیں ہے۔ قرآن مجید اور احادیث سے یہ واضح ہے کہ جس قسم کا عمل رذیلہ اور بدعقیدہ ہوگا اسی کی مناسبت سے اس کو سزا دی جائے گی۔

دنیا میں ہم دیکھتے ہیں۔ جس قسم کی بیماری ہوتی ہے اس بیماری کی مناسبت سے علاج کیا جاتا ہے وہی علاج اس بیماری کو شفا دیتا ہے اس طرح آخرت میں جس قسم کی بدعملی اور بداعتقادی کا مرض ہوگا۔ اس کی مناسبت سے اس کا علاج کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے قرآن مجید اور احادیث میں دکھ دینے والی چیزوں کو مختلف ناموں سے بیان کیا گیا ہے۔ کہیں آگ میں ڈالنے کا ذکر ہے کہیں ابلتا ہوا اور کہیں شدید ٹھنڈا پانی پلانے کا ذکر ہے۔ کہیں اژدھا سانپ اور بچھوؤں کے ڈسنے کا ذکر ہے۔ کہیں پیپ اور دھونی اور زقوم بطور خوراک دیے جانے کا۔ کہیں گردن میں طوق اور پاؤں میں بیڑیاں پہنائے جانے کا۔ یہ تمام مختلف ایذا رساں چیزیں انسان کے مختلف روحانی امراض کا علاج ہیں۔

قرآن مجید میں قیامت کے نام: قرآن مجید میں قیامت کے متعدد نام آئے ہیں۔ جو نام کثرت سے آیا ہے۔ وہ ''الاخرۃ'' ہے جس کے معنی ہیں آئندہ کی زندگی یہ لفظ قرآن مجید میں سو دفعہ آیا ہے۔ اس کے بعد لفظ ''یوم القیامۃ'' (قیامت کا دن) یہ ستر دفعہ آیا ہے۔ اس کے بعد الساعۃ (گھڑی) چالیس دفعہ آیا ہے۔ اس کے بعد ''یوم الآخر'' (جزا و سزا کا دن) آیا ہے اس کے بعد یوم الفصل (فیصلہ کرنے کا دن) چھ دفعہ آیا ہے۔ یوم الحساب (حساب کا دن) پانچ دفعہ باقی نام یوم الفتح (فیصلہ کا دن) یوم التلاق (ملاقات کا دن) یوم الجمع (اکٹھا ہونے کا دن) یوم الخلود (ہمیشہ رہنے کا دن) یوم الخروج (باہر نکلنے کا دن) یوم البعث (جی اٹھنے کا دن) یوم الحسرۃ (افسوس کا دن) یوم التناد (بلانے کا دن) یوم الازفۃ (وہ دن جو نزدیک آ رہا ہے) یوم التغابن (نقصانات کے ظاہر ہونے کا دن) القارعۃ (سخت مصیبت) الغاشیۃ (چھا جانے والی مصیبت) الصاخہ (بہرہ کر دینے والی مصیبت) الحاقۃ (بڑی صداقت) الواقعہ (بڑا واقعہ) یہ سب نام ''قیامت'' کے اسرار و رموز کو ظاہر کرتے ہیں۔

دوزخ کے مختلف نام: قرآن مجید میں دوزخ کے سات نام بیان کیے گئے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ دوزخ کے سات طبقے ہیں۔ جو نام کثرت سے آیا ہے وہ جہنم ہے گویا دوزخ کے لیے اسم عرفہ جہنم کے معنی بڑی گہرائی ہے ''ھاویہ'' (غار یا گہری جگہ) جحیم (جلنا، آگ روشن کرنا) سقر (آگ جلانا) سحر (مصیبت) تلظی (آگ کا شعلہ) حطامہ (کسی چیز کو توڑنا) ہر لفظ دوزخ میں عذاب کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔

لقاء اللہ: لقاء اللہ کے معنی ہیں اللہ سے ملنا۔ لقاء اللہ انسان کی روحانی معراج ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ يٰاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰی رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ (الانشقاق ۸۴:۶) اے انسان تو سخت کوشش کر کے اپنے رب کی طرف پہنچنے والا پھر اسے ملنے والا ہے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اتصال باللہ ایک محنت طلب معاملہ ہے اور مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا جو لوگ ہمارے راستہ میں جہاد کرتے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ سے ملنے کے لیے کوشش کرتے ہیں) ہم ان کو اللہ تک پہنچنے کے راستہ کی راہنمائی کر دیتے ہیں اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ سے روحانی تعلق قائم کرنے کے لیے مجاہدہ کو ضروری قرار دیا ہے۔

جیسا کہ پہلے یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ بہشت اور دوزخ کی جزا و سزا کا آغاز اس دنیا سے ہو جاتا ہے صرف آخرت میں اس کا ظہور نمایاں ہو کر سامنے آ جائے گا۔ لقا الٰہی کی اساس بھی اس دنیا میں قائم ہوتی ہے اس نعمت کے حصول کا راستہ بتانے کے لیے ہی اللہ تعالیٰ نے دنیا میں رسول بھیجے تھے۔ وہ انسانوں کو اس راستہ پر چلاتے تھے جن پر چل کر اللہ تعالیٰ کا دیدار کر لیتے ہیں۔ وہ کیا راستہ ہے وہ ہے اللہ کی صفات میں رنگین ہونا۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنے اعمال کے ساتھ عملی جامہ پہنانا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک روحانی تعلق قائم ہو جاتا ہے انسان کے نفسانی اور سفلی جذبات پر موت طاری ہو جاتی ہے اور دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ روشن ہو جاتی ہے جو ہوا و ہوس اور غیر اللہ کی محبت کو بھسم کر دیتی ہے۔ ایک نئی روحانی زندگی شروع ہو جاتی ہے اور انسان اپنی

روحانی سماعت سے اللہ تعالیٰ کا کلام سنتا ہے۔ اور روحانی بصارت سے خدا کا دیدار کرتا ہے اور خدا کی مغفرت کے پھل کھاتا ہے اس کو اسلامی اصطلاح میں لقاء الٰہی کہا گیا ہے۔ یہی وہ نعمت ہے جو رسول کریم ﷺ کو اعلیٰ اور اکمل صورت میں شب معراج کو حاصل ہوئی جس کا ذکر قرآن مجید کی ان آیات میں ہے۔ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (النجم ۵۳:۷......۱۴) اور وہ بلند انتہائی مقامات پر ہے پھر قریب اور بہت قریب ہوا۔ سو وہ دو کمانوں کا وتر ہوا۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قریب سو اس نے اپنے بندے کی طرف وحی کی جو وحی کی جو اس نے دیکھا وہ دل نے جھوٹ نہیں کہا تو کیا تم اس سے اس پر جھگڑتے ہو جو وہ دیکھتا ہے اور اس نے اسے ایک اور نزول کے وقت بھی دیکھا سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔

پھر فرمایا مَا زَاغَ الْبَصَرُ مَا طَغٰى (۱۷) آنکھ پھری نہیں اور نہ حد سے بڑھی۔

یہ لقاء الٰہی کی اعلیٰ اور اکمل صورت ہے۔ ہر متقی اپنی اپنی روحانی استعداد کے مطابق اس دنیا میں لقاء الٰہی سے فیض یاب ہوتا ہے۔ قیامت کے دن یہی روحانی لقاء اہل تقویٰ کے سامنے روشن صورت میں نمایاں ہو جائے گی۔

ان کے اعمال صالحہ کے نتیجہ میں واضح اور روشن صورت میں نمایاں ہوگی جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ اللّٰهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَداً (الکہف ۱۸:۱۱۰) پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہے تو چاہیے وہ اچھے عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے گویا لقاء الٰہی کی بنیاد اعمال صالحہ ہیں۔ یہی انسانی زندگی کا اعلیٰ مقصد اور منتہا ہے اور یہی انسانی زندگی کا معراج ہے۔

جو لوگ اس دنیا سے اعمال صالحہ کی دولت لے کر نہیں جائیں گے وہ لقاء الٰہی سے محروم کر دیے جائیں گے اور ان کی روح کو پاکیزہ کرنے کے لیے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ كَلَّا اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ (المطففین ۸۳:۱۴......۱۶) ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے بداعمال کا زنگ ہے۔ ہرگز نہیں۔ وہ اپنے رب سے اوجھل ہوں گے۔ (لقاء الٰہی سے محروم ہوں گے) پھر وہ دوزخ میں داخل ہوں گے۔

جنت اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی جگہ ہے اور دوزخ اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے محرومی کی جگہ جنت میں جہاں اعمال صالحہ کے نتیجہ میں بے شمار نعمتیں ملیں گی۔ وہاں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی نعمت عظمیٰ بھی نصیب ہوگی۔ اس ملاقات کی کیفیت اور نوعیت کیا ہوگی اس کو احادیث میں مختلف تشبیہات سے واضح کیا گیا ہے لیکن اس کی کیفیت اور کہنہ کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہر انسان پر صرف یہ لازم ہے کہ وہ لقاء الٰہی کی امید رکھے جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے انکار کرتے ہیں وہ عذاب الٰہی کے سزاوار ہیں ارشاد الٰہی ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (العنکبوت ۲۹:۲۳) اور جو لوگ اللہ کی آیتوں اور اس کی ملاقات کا انکار کرتے ہیں وہ میری رحمت سے مایوس ہیں ان کے لیے دردناک دکھ ہے پھر فرمایا۔ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (یونس ۱۰:۱۱) سو جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے ہم ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتے چھوڑ دیتے ہیں۔

حور و غلمان کا تصور: بہشت میں نعماء الٰہی میں سے ایک نعمت حور ہے۔ حور ایک تو احور کی جمع ہے جو مرد پر بولا جاتا ہے۔ دوسری حوراء کی جمع ہے جو عورت پر بولا جاتا ہے۔ گویا لفظ حور جمع کے لحاظ سے مرد اور عورت دونوں پر بولا جاتا ہے۔

حور کے اصل معنی سفیدی ہیں جو صفائی اور پاکیزگی کی علامت ہے لفظ احور اس مرد کے لیے بولا جاتا ہے جس کی آنکھوں کی سفیدی غایت درجہ کی ہو اور سیاہی بھی غایت درجہ کی اور ساتھ پاکیزہ اخلاق کا مالک بھی ہو۔ اسی طرح لفظ حوراء اس عورت پر بولا جاتا ہے جس کی آنکھوں کی سفیدی اور سیاہی غایت درجہ کی ہو اور پاکیزہ اخلاق کی مالک بھی ہو۔ احور اور حوراء دونوں الفاظ مرد اور عورت کی ظاہری اور باطنی حسن کو ظاہر کرتے ہیں۔ دوم بہشت کی نعماء مرد اور عورت دونوں کے لیے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ (المومن ۴۰:۴۰) جو نیکی کرتا ہے مرد ہو، عورت اور وہ مومن ہو تو وہی بہشت میں داخل ہوں گے۔

فرمایا وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْراً (النساء ۴:۱۲۴) اور جو نیک کام کرے خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یہی جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرہ بھر ظلم نہ کیا جائے گا۔

یہ دونوں آیات ظاہر کرتی ہیں کہ مرد اور عورت دونوں اعمال کے نتائج کے لحاظ سے برابر ہیں جس طرح صالح مرد کے لیے جو نعمائے جنت ہیں وہی نعماء عورت کے لیے بھی ہیں۔

اب چند ان آیات کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں "حور" بطور نعمت کے ذکر کیا گیا ہے واضح ہو جائے گا کہ اس نعمت سے مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ...... وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ (الدخان ۴۴:۵۱......۵۵) متقی امن کی جگہ میں

ہوں گے باغوں اور چشموں میں...... ہم انہیں خوبصورت حوروں کے ساتھی بنا دیں گے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ نَعِيْمٍ...... مُتَّكِئِيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ (الطور ۵۲: ۱۷...... ۲۰) متقی باغوں اور نعمتوں میں ہیں...... بچھے ہوئے تختوں پر تکئے لگائے ہوئے اور ہم انہیں خوبصورت حوروں کے ساتھی بنا دیں گے۔

قرآن مجید میں زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ کے الفاظ ہیں۔ لفظ حور میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں اور کہیں بھی زَوَّجْنٰهُمْ حوراء نہیں آیا۔ لہٰذا یہ واضح ہوتا ہے کہ حور بہشت کی نعمت ہے جو مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں ہے۔ دونوں آیات میں لفظ متقین ہیں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ اس طرح ایک اور آیت وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ...... حُوْرٌ عِيْنٌ (الواقعہ ۵۶: ۱۰...... ۲۱) اور آگے بڑھنے والے سب سے آگے ہیں وہی مقرب ہیں نعمتوں والے باغ میں...... اور خوبصورت حوریں۔

اس آیت میں السابقون السابقون میں بھی مرد اور عورت دونوں شامل ہیں دونوں جنت میں ہوں گے وہاں بطور نعمت حور عین ان کے ساتھی ہوں گے۔ آخر میں یہ الفاظ ہیں جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (الواقعہ ۵۶: ۲۴) (یہ اس کا) بدلہ (ہے) جو وہ عمل کرتے تھے۔

گویا یہ نعماء جنت، اہل جنت (مرد و زن) کے اعمال کی جزاء ہیں۔ اور ان کے اپنے پاکیزہ اعمال ان نعماء کی شکل میں متمثل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے یہ ذکر کیا گیا ہے لفظ حور پاکیزگی اور طہارت کا مفہوم اپنے اندر لیے ہوئے ہے اس لیے انسان کی اپنی پاکیزگی اور طہارت ہی حور کی شکل اختیار کرے گی۔

پہلے بھی یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ جنت کی نعمتیں وہ نعمتیں جن کو اس دنیا کی نعمتوں پر قیاس نہیں کرنا چاہیے صرف نام میں اشتراک ہے۔ ان کی نوعیت اور کیفیت کوئی نہیں جانتا۔ جنت کی ''حور'' کو اس دنیا کی عورتوں کی مانند جاننا کھلی جہالت ہے۔

بعض مفسرین نے حور سے مراد اس دنیا کی نیک صالحہ بیویاں مراد لی ہیں۔ وہ جنت میں اپنے خاوندوں کی ساتھی ہوں گی۔ لیکن جنت میں جنسی تعلق کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا ہے۔

ولدان و غلامان: ولدان، ولد کی جمع ہے جس کے معنی بچہ یا بیٹا ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ (الواقعہ ۵۶: ۱۷) ان پر ہمیشہ ایک حالت میں رہنے والے لڑکے پھر رہے ہوں گے یعنی ان میں استحالہ نہیں ہوگا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ (الطور ۵۲: ۲۴) اور ان کے آس پاس ان کے غلام پھرتے ہوں گے گویا کہ وہ پوشیدہ موتی ہیں۔ ولدان اور غلامان بھی حور کی طرح جنت کی ایک نعمت ہیں کیونکہ بچے بھی خوبصورتی اور پاکیزگی کی علامت ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے غلمان اور ولدان سے صالح لوگوں کی وہ اولاد مراد لی ہے جو بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ صالحین کی اولاد کو جنت میں ان سے ملا دے گا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (الطور ۵۲: ۲۱) ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے۔

دوزخ بطور علاج

کیا دوزخی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے؟ یہ مسئلہ بھی حکماء میں متنازع ہے اگر قرآن مجید اور احادیث کا مطالعہ کیا جائے تو یہ متنازعہ مسئلہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ دوزخ کا عذاب دائمی نہیں۔

دلیل اوّل۔ صفات الٰہیہ: اللہ تعالیٰ کی بعض صفات اس بات کا متقاضی ہیں کہ دوزخ کا عذاب دائمی نہ ہو۔ پہلی صفت ''رب'' وہ ذات ہے جو تدریجاً ایک چیز کو اپنے کمال تک پہنچاتی ہے۔ پھر رب کی اضافت عالمین کی طرف یعنی تمام جہانوں کا رب۔ یعنی ان کو درجہ کمال تک پہنچانے والا۔ کسی مشرک اور موحد کی تخصیص نہیں کی گئی کہ اللہ تعالیٰ صرف موحدین کا رب ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عام ہے۔ کوئی تخصیص نہیں کافر، فاسق، ظالم اور مسلمان، ہندو، عیسائی، یہود، غرض کہ ہر انسان اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے متمتع ہو رہا ہے اور اپنا مادی کمال حاصل کر رہا ہے۔ قیامت کے دن بھی اللہ تعالیٰ کی یہ صفت اپنی کمال شکل میں ظاہر ہوگی اور ہر شخص اس صفت کے زیر سایہ روحانی کمال حاصل کرے گا جو لوگ جنت میں جائیں گے۔ وہ تدریجاً مزید روحانی مراتب حاصل کرتے چلے جائیں گے۔ ایک روحانی مقام سے دوسرے روحانی مقام پر ترقی کرتے چلے جائیں گے۔ اس طرح جو جہنم میں جائیں گے ان کو اس وجہ سے دوزخ میں ڈالا جائے گا کہ دنیا میں روحانی ترقی حاصل کرنے کے لیے جو خامیاں رہ گئی تھیں۔ ان کی اصلاح کی جائے دراصل جہنم روحانی امراض کی اصلاح کی جگہ ہے۔ جب اصلاح ہو جائے تو خدا کی صفت ربوبیت کے تحت انسان روحانی راستہ پر گامزن ہو جائے گی اور روحانی کمال حاصل کرے۔ قرآن مجید کی رو سے ہر شخص کا

روحانی کمال لقاء الٰہی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ یٰاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ (الانشقاق ۸۴:۶) اے انسان تو سخت کوشش کر کے اپنے رب کی طرف پہنچنے والا پھر اسے ملنے والا ہے۔

اصل آیت میں بھی لفظ انسان لا کر موحد اور غیر موحد کی تخصیص ختم کر دی ہے۔ ہر شخص خدا سے ملنے والا ہے جو لوگ خدا کی ملاقات کے منکر ہیں ان کو دوزخ کی آگ میں ڈالا جائے گا تا کہ اس کی روحانی مرض کا علاج ہو جائے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ اُولٰٓئِکَ مَاْوٰهُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (یونس ۱۰:۷،۸) جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر راضی ہیں اور اس پر مطمئن ہو گئے ہیں اور وہ جو ہماری آیتوں سے غافل ہیں ان کا ٹھکانہ آگ ہے اس کا بدلہ جو وہ کماتے تھے۔

آگ کا ٹھکانہ ان کے اپنے ہی کسب کا نتیجہ ہے اور یہ آگ بھی روحانی مدارج کے حصول کا ذریعہ ہے وہ آگ انسان کی روحانی امراض کی اصلاح کے لیے ہے جیسا کہ بعد میں بیان کیا جائے گا یہ ٹھکانہ ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کے ساتھ صفت رحیمیت اور غفوریت ملایا جائے تو یہ مسئلہ مزید واضح ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت رحیم کو بہت ہی اہمیت وعظمت دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام ۶:۱۲) اس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (انعام ۶:۱۲) تمھارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔

فرمایا رَبُّکُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ (الانعام ۶:۱۴۷) تمہارا رب بہت وسیع رحم والا ہے۔

فرمایا رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (الاعراف ۷:۱۵۶) میری رحمت ہر شے پر حاوی ہے۔

فرمایا رَبَّنَا وَسِعْتَ کُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا (المومن ۴۰:۷) ہمارے رب تیری رحمت اور علم ہر چیز پر پھیلا ہوا ہے۔

فرمایا اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّکَ وَلِذٰلِکَ خَلَقَهُمْ (ھود ۱۱:۱۱۹) مگر جس پر تیرا رب رحم کرے اور اسی کے لیے اس نے انھیں پیدا کیا۔ یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے رحم کے لیے پیدا کیا ہے ابن کثیر میں حضرت ابن عباس کا قول منقول ہے۔ لِلرَّحْمَةِ خَلَقَهُمْ وَلَمْ یَخْلُقْهُمْ لِلْعَذَابِ یعنی رحمت کے لیے پیدا کیا ہے عذاب کے لیے پیدا نہیں کیا اور حدیث میں آتا ہے۔ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ (بخاری) میری رحمت غضب پر سبقت لے گئی ہے یہاں دو نتیجے نکلتے ہیں کہ ہر انسان کو رحم کے لیے پیدا کیا ہے۔

آخر کار سب پر رحم ہوگا۔ انہی میں دوزخی بھی ہوں گے ان پر رحم یہی ہے کہ اصلاح مرض کے بعد ان کو دوزخ سے باہر نکال لیا جائے۔ پھر حدیث میں اللہ تعالیٰ کے رحم کا غضب پر غالب آنے کا ذکر ہے۔ دوزخ خدا کی ناراضی کا نتیجہ ہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ کی رحمت، غضب الٰہی پر غالب آ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی ناراضی ختم ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ دوزخیوں کو اپنی رحمت کے دامن میں لے لے گا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (الزمر ۳۹: ۵۳) اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ سبھی گناہ بخش دیتا ہے ہاں وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی بے پایاں وسعت رحمت کا ذکر ہے جس میں ہر ہندو شامل ہے۔ کہ تمام گناہگار اللہ تعالیٰ کی بخشش کی چادر میں آ جائیں گے اور ان کو صاف کر دیا جائے گا جیسا کہ آنے والے دلائل سے واضح ہو جائے گا۔

دوسری دلیل: دوزخ میں رہنے والے اور جنت میں رہنے والوں کے لیے قرآن مجید میں جو الفاظ لیے گئے ہیں وہ ظاہر کرتے ہیں کہ دوزخ میں قیام عارضی ہے۔

دوزخیوں کے متعلق آتا ہے۔ قَالَ النَّارُ مَثْوٰکُمْ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّکَ حَکِیْمٌ عَلِیْمٌ. (انعام ۶:۱۲۸) کہے گا آگ تمہارا ٹھکانہ ہے اس میں رہو گے مگر جو اللہ چاہے بے شک تیرا رب حکمت والا علم والا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّشَهِیْقٌ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ (ھود ۱۱:۱۰۶، ۱۰۷) سو جو بدقسمت ہیں وہ آگ میں ہوں گے۔ ان کے لیے اس میں چیخنا اور چلانا ہوگا اس میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین ہیں مگر جو تیرا رب چاہے کیونکہ تیرا رب جو چاہے کر گزرے۔

دونوں آیات میں مَاشَآءَ رَبُّکَ کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی جب تک اللہ تعالیٰ چاہے۔ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں دوزخ میں دوزخیوں کا قیام اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق ہے جب چاہے گا ان کو وہاں سے نکال لے گا۔ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے قرآن مجید میں سعادت مند لوگوں کا ذکر کیا ہے اور ان کی عطا کو غیر مجذوذ قرار دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ (الاعراف ۱۱:۱۰۸) اور وہ جو خوش قسمت ہیں وہ جنت میں ہوں گے۔ اسی میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین ہیں مگر جو تیرا رب چاہے یہ بخشش غیر منقطع ہے۔ دونوں آیات پر غور کریں تو حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ جہنم کی سزا کے ساتھ مَاشَآءَ رَبُّکَ کے الفاظ لا کر مضمون کو ختم کر دیا ہے۔ یعنی سزا

اس وقت تک رہے گی جب تک اللہ چاہے اس سے ظاہر ہوتا ہے نہ وہ اس حالت سے باہر نکالے جاسکتے ہیں اور جنت کی عطاء کے ساتھ غیر مجذوذ کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ یعنی اللہ کی یہ عطا غیر منقطع ہوگی۔

کفارہ کا جہنم میں ہمیشہ رہنے کی غلط فہمی لفظ ابد سے واقع ہوئی ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا (الجن ۷۲:۲۳) جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

عربی زبان میں لفظ ''ابد'' مدۃ طویلۃ'' ایک لمبی مدت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ''ابد'' سے مراد کوئی ایسا زمانہ مراد نہیں جو غیر منقطع

دوسری جگہ دوزخیوں کے متعلق لٰبِثِيْنَ فِيْهَا اَحْقَابًا یعنی جہنم میں برسوں رہیں گے۔ لفظ ''احقاب'' بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس میں برسوں تک رہیں گے۔ یہ لفظ بھی ظاہر کرتا ہے کہ دوزخیوں کا دوزخ میں قیام برسوں تک ہوگا لیکن غیر منقطع نہیں ہوگا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول اَوْ اَمْضِىَ حُقُبًا کہ میں برسوں چلتا رہوں گا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ ہرگز مطلب نہیں تھا کہ وہ ابدالآباد غیر منقطع زمانہ تک چلتے رہیں گے۔

جہنمیوں کے لیے الفاظ ''ابد'' اور احقاب ایک لمبے عرصے کے لیے استعمال ہوئے ہیں نہ کہ غیر معینہ عرصہ کے لیے۔

تیسری دلیل: ان قرآنی آیات کی تفسیر حدیث شفاعت بھی کرتی ہے۔ حدیث میں ہے۔ شَفَعَتِ الْمَلَائِكَةُ وَشَفَعَ النَّبِيُّوْنَ وَشَفَعَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَلَمْ يَبْقَ اِلَّا اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ فَيَقْبِضُ قَبْضَةً مِنَ النَّارِ فَيُخْرِجُ مِنْهَا قَوْمًا لَمْ يَعْمَلُوْا خَيْرًا قَطُّ یعنی اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ فرشتے بھی شفاعت کر چکے اور نبی بھی شفاعت کر چکے اور مومن بھی شفاعت کر چکے اور اب ارحم الراحمین (سب سے زیادہ رحم کرنے والا) باقی رہ گیا ہے پس ایک مٹھی دوزخ سے بھرے گا اور اس سے ان لوگوں کو باہر نکال دے گا جنھوں نے کبھی کوئی نیکی نہ کی تھی۔

اب یہ حدیث صاف واضح کرتی ہے کہ پہلے فرشتے نبی اور ملائکہ شفاعت کریں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ جو ارحم الراحمین ہے دوزخ سے مٹھی بھرے گا اور ایسے لوگوں کو دوزخ سے نکال لے گا جنھوں نے کبھی کوئی بھلائی کی ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مٹھی سے کون باہر رہ سکتا ہے۔ اَلْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ (الزمر ۳۹:۶۷) اور زمین سب قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔

الفاظ ارحم الراحمین ظاہر کر رہے ہیں کہ اللہ کی رحمت کا دروازہ صرف عاصی مومنوں کے لیے ہی نہیں وا ہوگا بلکہ جمیع عصاۃ کے لیے ہوگا۔ اس کی رحمت کی چادر کے نیچے عاصی مومن اور غیر مومن سب آجائیں گے اور دوزخ سے نکال لیے جائیں گے۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے۔ حَتّٰى اِذَا هُذِّبُوْا ونقوا اُذِنَ لَهُمْ فِىْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ (بخاری باب القصاص یوم القیمۃ) جہاں تک کہ گنہگار چھٹ جائیں گے اور پاک صاف ہو جائیں گے تب ان کو جنت میں داخل ہونے کے اجازت ملے گی۔ یہ حدیث صاف ظاہر کرتی ہے کہ دوزخ شفاخانہ ہے جب گناہ گاروں کی تطہیر ہو جائے گی تو وہاں سے نکال لیے جائیں گے۔

چوتھی دلیل: اکابر صحابہ کا بھی یہ مسلک تھا کہ دوزخ دوزخیوں کے لیے عارضی مقام ہے اور ایک وقت آئے گا جبکہ دوزخ فنا ہو جائے گا حضرت عمرؓ کا قول ہے۔ لَوْ لَبِثَ اَهْلُ النَّارِ فِى النَّارِ كَقَدَرِ رَمْلِ عَالِجٍ لَكَانَ لَهُمْ عَلٰى ذٰلِكَ يَوْمٌ يُخْرَجُوْنَ فِيْهِ یعنی اگر اہل دوزخ دوزخ میں اتنی مدت بھی رہیں۔ جیسے ریت کے انبار پر انبار تو بھی ایک دن ان پر آئے گا۔ جس میں وہ نکال لیے جائیں گے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا قول ہے۔ سَيَاْتِىْ عَلٰى جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَا يَبْقٰى فِيْهَا اَحَدٌ جہنم پر ایک وقت آئے گا کہ اس میں کوئی بھی باقی نہ رہے گا۔ ابن مسعود کا قول ہے۔ لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى جَهَنَّمَ زَمَانٌ تُخْفَقُ اَبْوَابُهَا لَيْسَ فِيْهَا اَحَدٌ وَذٰلِكَ بَعْدَ مَا يَلْبَثُوْنَ فِيْهَا اَحْقَابًا یعنی دوزخ پر ایک ایسا وقت آئے گا اس کے دروازے کھٹکھٹائیں گے اس میں کوئی ہوگا۔ اور اس کے بعد ہوگا جو اس میں احقاب تک رہ چکے ہوں گے۔

ابن عمر اور ابن العاص کا قول بھی ہے۔ لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى جَهَنَّمَ يَوْمٌ تَصْفَقُ فِيْهَا اَبْوَابُهَا لَيْسَ فِيْهَا اَحَدٌ جہنم پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ اس کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ اس قسم کے اقوال ابن عباسؓ ابن عمرؓ، جابرؓ اور ابوسعید سے مروی ہیں۔ ایسے ہی اقوال تابعین سے بھی ہیں۔ حضرت امام ابن تیمیہ اور ابن قیم کا بھی یہی مسلک ہے۔ (شفاء العلیل ص ۲۵۵ تا ۲۶۴ اور حادی الارواح ص ۱۶۷ تا ۲۳۵) شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کے متبعین کا یہ نظریہ ہے کہ وہ دوزخ میں ہی راحت اور لذت محسوس کرنے لگ جائیں گے۔

پانچویں دلیل: عاصیوں کی زندگی محدود ہے اور اگر دوزخ کو عاصیوں کے لیے ہمیشہ کے لیے جائے قیام قرار دے دیا جائے تو محدود گناہوں والی زندگی کو غیر محدود زندگی والی زندگی میں بدلنا اللہ تعالیٰ کے عدل کے خلاف ہے۔ عدل کا یہ تقاضا ہے کہ گناہ کی محدود زندگی کی سزا محدود عرصہ تک ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے

بندوں پر ظلم نہیں کرتے۔ اہل جنت کی زندگی کو غیر موزوں اور غیر ممنون قرار دے کر ہمیشہ کی زندگی قرار دیا ہے۔ دوم جنت اچھے اعمال کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ کے فضل سے ملتی ہے۔

اسلامی تعلیم کی رو سے دوزخ روحانی امراض کے لیے علاج کی جگہ ہے۔ ہر روحانی مریض صحت یاب ہو کر وہاں سے فارغ ہوتا چلا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا یہی تقاضا ہے اور جس اعلیٰ مقصد کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے اس کا بھی یہی تقاضا ہے۔ وہ اعلیٰ مقصد لقاء الٰہی ہے۔ ہر شخص اپنی روحانی استعداد کے مطابق اس نعمت سے متمتع ہوگا۔

عقیدہ آخرت کے برکات

بامقصد زندگی کا شعور: آخرت پر ایمان لانے سے بامقصد زندگی گزارنے کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بیکار پیدا نہیں کیا۔ جیسا کہ کفار خیال کرتے تھے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمھیں بیکار پیدا کیا گیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے۔

جب انسان کی زندگی بامقصد ہے تو اس مقصد کی تکمیل تبھی ممکن ہے۔ جب اس کے بارے میں باز پرس ہو۔ اگر انسان کے اعمال کا مواخذہ نہ ہو تو خیر و شر اور نیکی اور بدی کا فطری امتیاز ختم ہو کر رہ جائے گا اور انسانی زندگی عبث ہوگی۔ انسان اور حیوان کی زندگی سے تمیز اٹھ جائے گی۔ جس طرح حیوان پیدا ہوتا ہے۔ چار دن کھا پی کر مر جاتا ہے۔ اگر انسان کی زندگی بھی اسی طرح ہو تو وہ خلیفۃ اللہ کیوں کر کہلا سکتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور احکام الٰہی کا نزول بیکار ثابت ہوگا۔

باز پرس کا خوف: جب تک محاسبہ اور مواخذہ کا خوف نہ ہو تو نہ نیکی کی طرف رغبت پیدا ہوتی ہے اور نہ برائی سے نفرت۔ مجرم محاسبہ کے خوف سے جرم کا ارتکاب کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔

مواخذہ انسان کے لیے ایک تازیانہ ہے جس کی ضرب سے انسان راہ مستقیم سے بھٹکتا نہیں ارشاد الٰہی ہے۔ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ (رعد۱۳:۲۱) اور (ایمان والے) اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور بری طرح حساب لیے جانے سے خوف کھاتے ہیں۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ (البقرہ۲:۲۲۳) اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جان لو کہ تمھیں اس کے پاس حاضر ہونا ہے۔

انسان کے دل میں جتنا یوم آخرت کا یقین پختہ ہوگا اور اتنا ہی زیادہ اس کے دل و دماغ پر باز پرس کا خوف مستولی ہوگا اور وہ برائیوں سے بچے گا اور نیکیوں کی طرف راغب ہوگا اور وہ ہمہ وقت اپنی عاقبت سنوارنے کی فکر میں رہے گا۔

بے آمیز احکام الٰہیہ کی اطاعت: اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کے احکام پر عمل پیرا ہو کر زندگی گزارے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ میں نے جن و انس کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کے احکام پر عمل پیرا ہونے کا نام ہے۔ احکام الٰہیہ پر عمل پیرا ہونا اس وقت بارآور ثابت ہوتا ہے جب نیت صاف ہو۔ اور صرف اللہ ہی کی خاطر بجالائے جائیں اور ان میں غیر اللہ کی ملونی کا شائبہ تک نہ ہو اگر انسان اپنی کسی ذاتی غرض اور دکھاوے کے لیے عمل کرے گا تو اس کا کوئی پھل نہیں ملے گا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (الکہف۱۸:۱۱۰) پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہے تو چاہیے اچھے عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات پر حق الیقین رکھنے والے پر دو باتیں لازم ہیں اوّل اعمال صالحہ بجالانا۔ دوم اعمال صالحہ کو غیر اللہ کی ملونی سے پاک صاف رکھنا۔ قیامت کے دن حساب کتاب کا تصور ہی بے آمیز احکام الٰہیہ کی اطاعت کا موجب ہے۔ بے آمیز احکام الٰہی کی اطاعت معاشرتی لحاظ سے بہت سودمند ہے انسان کے دل میں اوروں کے لیے محبت، ہمدردی، غمگساری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ دنیا طلبی غصب و نہب لوٹ کھسوٹ حرص و لالچ کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ اس طرح معاشرہ میں امن، اخوت، مساوات اور نظم و ضبط کی فضا پیدا ہوتی ہے۔

احساس ذمہ داری: جزا و سزا اور محاسبہ کا خوف انسان کے اندر احساس ذمہ داری کو پیدا کرتا ہے جب کسی انسان کو یہ معلوم ہو کہ اس فرض کی ادائیگی میں جزا ہے اور عدم ادائیگی میں سزا تو وہ شخص فرض کی ادائیگی کو اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے۔ اور کوتاہی سے کام نہیں لیتا۔ قیامت پر ایمان انسان کو یہی یاد دلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حقوق و فرائض بیان کیے ہیں۔ ان پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا حساب قیامت کے دن ہوگا۔ ادائیگی کی صورت میں جنت کی نعماء کا وارث ہوگا اور

عدم ادائیگی کی صورت میں دوزخ میں جائے گا جو ایک بدترین ٹھکانہ ہے۔ اس طرح ایمان بالقیامتہ سے انسان کے اندر حقوق وفرائض کی ادائیگی کا احساس بیدار رہتا ہے اور دنیا کا کارخانہ اس احساس سے چل رہا ہے۔ اگر انسان کے اندر سے احساس ذمہ داری ختم ہو جائے تو دنیا کا تمام نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ گویا احساس ذمہ داری انسان کی مساعی کے لیے ایک تازیانہ ہے۔ جس کی ضرب سے انسان میدان عمل میں بھاگتا پھرتا ہے۔

خدا خوفی: ایمان بالآخرۃ انسان کے دل میں خدا خوفی اور تقویٰ پیدا کرتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ (البقرہ ۲:۲۲۳) اللہ سے ڈرو اور جان لو تم اس سے ملنے والے ہو۔

ایک دفعہ دو صحابیوں کے درمیان کسی چیز کے متعلق جھگڑا تھا۔ رسول کریم ﷺ نے فریقین کی باتیں سن کر ایک کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ پھر فرمایا: میں بھی ایک انسان ہوں۔ مدعی اور مدعا علیہ میں سے ممکن ہے کوئی زیادہ چرب زبان اور اپنا دعویٰ خوبی کے ساتھ بیان کرنے میں اس کے حق میں فیصلہ دے دوں لیکن درحقیقت وہ چیز اس کی نہ ہو تو گویا میں اس کے گلے میں آگ کا طوق ڈال رہا ہوں۔ یہ سن کر فریقین پر یہ اثر ہوا کہ دونوں رونے لگے اور ہر ایک اپنا حصہ دوسرے کو دینے لگا۔ (سنن ابی داؤد کتاب الاقضیہ)

حضرت عمرؓ جو نیکیوں کے مجسم تھے اور ان صحابہ میں شامل تھے جن کو رسول کریم ﷺ نے اس دنیا میں ہی جنت کی بشارت دی تھی۔ ان کی خدا خوفی کا یہ عالم تھا ایک دفعہ انھوں نے کہا۔ اگر رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد میرے اچھے اور برے اعمال برابر ہوں۔ تو میں بھی خوش ہوں اگر جنت نہ ملے تو پروا نہیں مگر الٰہی دوزخ نہ ملے۔ (صحیح بخاری)

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے قبر کا ذکر کیا اور موت کے بعد عذاب کا حال بیان کیا تو صحابہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ (سنن نسائی کتاب الجنائز باب تعوذ من القبر)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ (الحج ۲۲:۱......۲) اے لوگو اپنے رب سے ڈرو اس گھڑی کا زلزلہ ایک بڑی چیز ہے جس دن تم اسے دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی (خوف سے) اسے چھوڑ دے گی۔ جسے دودھ پلاتی تھی۔ ہر حمل والی اپنا حمل ڈال دے گی اور تو لوگوں کو نشہ میں دیکھو گے لیکن وہ نشہ میں نہ ہوں گے بلکہ خدا کا سخت عذاب ہوگا۔

جب یہ آیات اتریں اور رسول کریم ﷺ نے صحابہ کو سنائیں اور ان کی تفسیر بیان کی تو ان کے چہروں کا رنگ بدل گیا (صحیح بخاری تفسیر سورہ حج جلد دوم) اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے (جامع ترمذی تفسیر سورہ حج)

ایمان بالآخرۃ بطور نعمت عظمیٰ: جیسا کہ پہلے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان بالآخرۃ اخلاق کو سنوارنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ بھی ایمان بالآخرۃ کی ایک نعمت ہے۔ لیکن قیامت کے دن سب سے بڑی نعمت لقاء الٰہی ہے۔ مرنے کے بعد جو صالحین جنت میں جائیں گے۔ ان کی روحانی قوتیں نشوونما پائیں گی اور جو عاصی جہنم میں جائیں گے۔ ان کی گناہوں سے زنگ آلود قوتیں نار جہنم سے صاف ہو جائیں گی اور ان کو بھی طہارت کے بعد جہنم سے نکال لیا جائے گا اور جنت میں داخل کیا جائے گا اس طرح تمام لوگ لقاء الٰہی کی نعمت سے مستفید ہوں گے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ (البقرہ ۲) اللہ سے ڈرو اور جان لو یقیناً تم اس سے ملاقات کرنے والے ہو۔

ملاقات کی کیفیت کیا ہوگی اور اس کی نوعیت کیا ہے۔ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن لقاء الٰہی یقینی ہے یہی انسانی زندگی کا مقصد ہے اس مقصد کی تکمیل قیامت کے دن ہوگی۔

فلسفہ ایمان بالآخرۃ: ایمان بالآخرۃ اپنے اندر یہ حکمت لیے ہوئے ہے کہ انسان کو ایک دن اپنے اعمال کے نتائج کا سامنا کرنا ہوگا وہی اعمال اس کی خوش بختی اور بدبختی کا سبب ہوں گے گویا ایمان بالآخرۃ انسان کو نیک اعمال بجا لانے کی ترغیب دیتا ہے اور اعمال سیئہ کے ارتکاب سے روکتا ہے۔ انسان کی حقیقی فلاح اور تکمیل نیکی کے راستہ پر گامزن ہونے میں ہی ہے۔ اور یہی فطری تقاضا ہے۔

ایمان بالقدر

تقدیر کے معنی حسب لغت عرب اور محاورہ قرآن کسی چیز کا اندازہ اور حقدار ٹھہرانا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيْراً (الفرقان ۲:۲۵) اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ پھر اس کے لیے ایک اندازہ ٹھہرایا۔

اِنَّ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (القمر۵۴:۴۹) ہم نے ہر چیز کو ایک انداز سے پیدا کیا ہے۔

وَكُلُّ شَيْءٍ بِمِقْدَارٍ (الرعد۱۳:۸) ہر ایک چیز اس کے ہاں اندازہ سے ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى الَّذِي خَلَقَ فَسَوّٰى وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدٰى (الاعلی ۸۷:۱......۳) اپنے رب بہت بلند کے نام کی تسبیح کر۔ جس نے پیدا کیا پھر ٹھیک بنایا جس نے اندازہ لگایا اور راہ دکھائی۔

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْراً (الطلاق ۶۵:۳) اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

ان تمام آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اپنی تقدیر کے تحت پیدا کیا اور وہ چیز اس دائرہ میں رہ کر کام کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بعض اجرام فلکی اور موجودات ارضی کا ذکر کیا ہے جو تقدیر کے بندھن میں جکڑی ہوئی ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ وَلَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (یٰس ۳۶:۳۸......۴۰) اور سورج اپنے مقرر رستے پر چلتا رہتا ہے یہ غالب علم والے کا اندازہ ہے اور چاند کے لیے ہم نے کئی منزلیں مقرر کر دیں یہاں تک کہ وہ پھر پرانی سوکھی ٹہنی کی طرح ہو جاتا ہے نہ تو سورج کی قدرت ہے کہ وہ چاند کو پالے۔ اور نہ رات دن سے آگے نکلنے والی ہے اور سب اپنے اپنے دائرے میں چل رہے ہیں۔

جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَا اَقْوَاتَهَا (حٰمٓ السجدہ ۴۱:۱۰) اور اس نے اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس میں برکت دی اور اس کی خوراکوں کا اندازہ کیا۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ (المومنون ۲۳:۱۸) اور ہم نے بادلوں سے ایک اندازہ سے پانی اتارا۔ پھر اسے زمین ٹھہرایا۔

وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ (المزمل ۷۳:۳۰) اور اللہ تعالیٰ رات دن کا اندازہ کرتا ہے۔

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلاً (فاطر ۳۵:۴۳) سو تو اللہ کے طریق (قانون) میں کوئی تبدیلی بنائے گا اور نہ تو اللہ کے طریق کو ٹلتا ہوا جائے گا۔

یہی محکم قانون (تقدیر مبرم) ہے۔ جس کے تحت نظام فلکی اور نظام ارضی چل رہے ہیں۔ اگر یہ تقدیر ٹل جائے یا تبدیلی واقع ہو جائے تو نظام کائنات کی درہم برہم ہو جائے گا۔

قرآن مجید کی زبان میں اسی عالمگیر محکم قانون کو تقدیر کہا گیا ہے تقدیر الٰہی دو قسم کی ہے۔

<u>تقدیر مبرم:</u> وہ تقدیر (قانون) جسے کوئی ٹال نہیں سکتا نہ اس میں کوئی کمی بیشی کی جا سکتی ہے جیسا کہ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آگ کو پیدا کیا۔ اس میں تقدیر (الٰہی قانون) کام کر رہی ہے کہ وہ جلائے۔ پانی پیدا کیا ہے اس میں یہ تقدیر کام کر رہی ہے کہ وہ پیاس بجھائے۔ حیوانات اور نباتات کے لیے باعث زندگی بنے۔ سورج پیدا کیا ہے۔ اس میں یہ تقدیر کام کر رہی ہے کہ وہ روشنی دے اور گرمی پہنچائے۔ غرضیکہ دنیا کی ہر تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر کام کر رہی ہے یہ وہ تقدیر ہے جس کو تقدیر مبرم کہتے ہیں یعنی اٹل قانون۔ اگر یہ قانون اٹل نہ ہوتے تو دنیا کا تمام نظام درہم برہم ہو جاتا۔ مثلاً کبھی آگ جلاتی اور کبھی نہ جلاتی پانی بھی پیاس بجھاتا کبھی نہ بجھاتا۔ کبھی سورج گرمی دیتا اور کبھی نہ دیتا تو اس طرح دنیا کا نظام ہی ختم ہو جاتا۔ یہ ایک عالمگیر تقدیر یا قانون الٰہی ہے جو دنیا کی تمام اشیاء میں جاری و ساری ہے۔

<u>تقدیر معلق:</u> تقدیر معلق سے مراد وہ تقدیر ہے جو ٹل سکے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے یہ اندازہ اور قاعدہ بنا دیا ہے کہ انسان جب کبھی صحیح اسباب استعمال کرے گا تو نتیجہ صحیح نکلے گا اگر غلط اسباب سے کام لے گا تو نتیجہ غلط نکلے گا اسی اندازہ (اصول) کا نام تقدیر معلق ہے اسی تقدیر (قانون) کے تحت تمام سعی و عمل و ترقیات کا ظہور

ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی وَاَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰی (نجم ۵۳:۳۹،۴۰) اور کہ انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہی جو وہ کوشش کرتا ہے اور کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی۔ وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَہٗ (نساء ۴:۱۱۰) اور جو شخص بدی کرے (قانون کو توڑے) یا اپنی جان پر ظلم کرے۔

صحیح رستہ اختیار کرنے والے کے متعلق ارشاد الٰہی ہے۔ مَنْ صَالِحًا فَلِنَفْسِہٖ (حٰمٓ السجدہ ۴۱:۴۶) جو کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اپنی جان کی بھلائی کے لیے ہے۔

وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْھَا وَمَا رَبُّکَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (۴۱:۴۶) اور جو کوئی برا کرتا ہے (غلط راستہ اختیار کرتا ہے) تو اس کا وبال اس پر ہے اور تیرا رب بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں۔

اس تقدیر (قانون) کو معلق اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا ٹل جانا انسان کی سعی، اسباب کی کیفیات پر مبنی ہے۔ مثلاً ایک بیمار ہے اس کا علاج غلط ہو رہا ہے تو وہ موت کے منہ میں چلا جائے گا اگر اس کا صحیح علاج ہو رہا ہے تو صحت یاب ہو جائے گا یا کوئی شخص اپنے مقصد کے حصول کے لیے صحیح راستہ پر گامزن ہے تو اپنے مقصد کو پالے گا۔ جو غلط راستہ پر ہے وہ اپنے مقصد کو کھو دے گا۔ یہ ایک تقدیر تھی جو اسباب کے ساتھ وابستہ تھی۔ جب صحیح اسباب مل گئے ٹل گئی اگر اسباب غلط ہیں یا غلط راستہ اختیار کیا تو نہ ٹلی۔

اللہ تعالیٰ کی تقدیر مبرم کا انسان کے افعال سے کوئی تعلق نہیں۔ صرف تقدیر معلق کا تعلق ہے کہ کامیابی اور حصول مقصد کے لیے صحیح راستہ اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ نے صحیح راستہ کی بھی نشان دہی انبیاء علیہم السلام کی معرفت کر دی ہے۔ انسان کو کلی اختیار دیا ہے کہ چاہے صحیح راستہ اختیار کرے چاہے غلط۔ جزا و سزا انہی راستوں پر گامزن ہونے میں ہے۔ اگر صحیح راستہ اختیار کرے گا تو جزا کا مستحق ہوگا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (بقرہ ۲:۳۸) جو میری ہدایت پر چلا نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ فَمَنِ اتَّبَعَ ھُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی (طٰہٰ ۲۰:۱۲۳) جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ تکلیف میں پڑے گا۔

اگر غلط راستہ اختیار کرے گا تو سزا پائے گا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ (بقرہ ۲:۳۹) اور جنھوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی لوگ آگ والے ہیں۔ وہ اس میں رہیں گے۔

وَمَآ اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ (النساء ۴:۷۹) اور جو دکھ تجھے پہنچتا ہے وہ تیرے ہی نفس سے ہے۔

قرآن مجید میں اس موضوع کو کثرت سے بیان کیا گیا ہے کہ انسان کو جو کچھ نقصان پہنچتا ہے وہ اس کے اپنے عمل کا نتیجہ ہی ہوتا ہے اور عمل کرنے میں وہ مختار ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ مَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (کہف ۱۸:۲۹) سو جو کوئی چاہے ایمان لائے اور جو کوئی چاہے انکار کرے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَھَدَیْنٰھُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰی عَلَی الْھُدٰی (حٰمٓ السجدہ ۴۱:۱۷) اور رہے ثمود تو ہم نے انھیں رستہ دکھایا پر انھوں نے اندھا رہنے کو ہدایت پر ترجیح دی۔

ایک غلطی کا ازالہ: قرآن مجید میں بعض مقامات پر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی (خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ) اس قسم کے الفاظ جو اللہ تعالیٰ کی طرف ہیں کہ اللہ نے ایسا کیا ہے۔ اس سے بعضوں کو یہ شک گزرتا ہے کہ جب اللہ ہی نے خود ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے تو ان کا کیا قصور۔ دراصل اس قسم کی غلطی قرآن مجید کے اسلوب کو نہ جاننے کی وجہ سے لگتی ہے۔ دراصل مہر کا لگنا انسان کے ہی اپنے افعال سیہ کا نتیجہ ہے۔ جب انسان اتنی برائیاں کرتا ہے اور اس کے دل سے برائی کا احساس ہی ختم ہو جاتا ہے۔ تو اس کے نتیجہ میں قرآنی محاورہ کے مطابق کہا جاتا ہے کہ اس کے دل پر مہر لگ گئی ہے حقیقت میں مہر کا لگنا اس کے اپنے اعمال رزیلہ کے نتیجہ میں ہے۔ اس کی وضاحت دوسری جگہ کر دی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ بَلْ طَبَعَ اللّٰہُ عَلَیْھَا بِکُفْرِھِمْ (نساء ۴:۱۵۵) اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر مہر لگا دی۔ یعنی مہر کا سبب کفر ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (مطففین ۸۳:۱۴) ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے عملوں کا زنگ ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ ایک گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ نقطہ اس کے دل پر پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر اگر اس سے توبہ کرے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر پھر گناہ کرے تو ایک اور نقطہ لگ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آخرکار دل سیاہ ہو جاتا ہے۔

فلسفہ تقدیر الٰہی: تقدیر الٰہی پر ایمان لانے کا یہ مطلب ہے کہ ان تمام اسباب کو استعمال میں لایا جائے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی ترقی کے لیے پیدا کیے ہیں۔ گویا ایمان بالقدر انسان کے سامنے ہر قسم کی ترقی کے راستے کھولتا ہے۔

باب ۴

عبادات

(ارکان اسلام)

عبادت انتہا درجہ کے تذلل اور انکساری کا نام ہے اور اس کا حق دار وہی ہو سکتا ہے جس کی فضیلت انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ جس کے سوا دوسرے کی عبادت جائز نہیں۔ (امام راغب)

تاج العروس میں یہ معنی بیان ہوئے ہیں۔ عبادت وہ اطاعت ہے جس کے ساتھ خضوع یعنی عاجزی ہو۔

پس عبادت اپنے آپ کو پوری عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری کا نام ہے اور عبادت ہی انسانی زندگی کا مقصود ہے ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات ۵۱:۵۶) میں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے دوسری جگہ آتا ہے۔ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ ۲:۲۱) اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

اس آیت کریمہ میں لفظ ''رب'' عبادت کے لیے مخصوص کیا ہے اس لفظ سے عبادت کی حکمت واضح ہو جاتی ہے۔ رب وہ ذات ہے جو تدریجاً ایک چیز کو اپنے کمال تک پہنچاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا۔ عبادت انسان کو اپنے کمال تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

جب انبیاء علیہم السلام کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ سب انبیاء علیہم السلام نے توحید کے ساتھ عبادت بجالانے کی تعلیم دی ہے۔

نوح علیہ السلام: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ اِنِّىْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ (ہود ۱۱:۲۵، ۲۶) اور بے شک ہم نے نوح علیہ السلام کو اس قوم کی طرف بھیجا اس نے کہا میں تمھارے لیے کھلا کھلا ڈرانے والا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ مجھے ڈر ہے کہ تم پر دردناک عذاب آنے والا ہے۔

ہود علیہ السلام: وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ (ہود ۱۱:۵۰) اور قوم عاد کی طرف ان کا بھائی ہود بھیجا اس نے کہا! اے میری قوم صرف اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں تم دوسروں کو خدا مان کر صرف بہتان لگا رہے ہو۔

صالح علیہ السلام: وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (ہود ۱۱:۶۱) اور قوم ثمود کی طرف ان کا بھائی صالح بھیجا اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

شعیب علیہ السلام: وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (ہود ۱۱:۸۴) اور مدین والوں کی طرف ان کا بھائی شعیب بھیجا اس نے کہا اے میری قوم اللہ ہی کی عبادت کرو تمھارے لیے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔

موسیٰ علیہ السلام: وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْۤ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ (البقرہ ۲:۸۳) اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ وعدہ لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

عیسیٰ علیہ السلام: مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِىْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبَّكُمْ (المائدہ ۵:۱۱۷) اے میرے پروردگار میں نے تو انھیں وہی کچھ کہا جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ ہی کی تم عبادت کرو جو میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے۔

رسول کریم ﷺ نے بھی کفار کے بتوں کی پرستش سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِىَ دِيْنِ (کافرون) اے کافرو! میں اس کی عبادت نہیں کروں گا جس کی تم

عبادت کرتے ہو اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور نہ میں کبھی اس کی عبادت کرنے والا ہوا۔ جس کی تم عبادت کرتے تھے اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو۔ جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ تمھارے لیے تمہارا بدلہ ہے اور میرے لیے میرا بدلہ ہے۔

اس سورۃ میں رسول کریم ﷺ کا بتوں کی عبادت سے بیزاری کا اظہار اور عبادت الٰہی کا اعلان ہے۔

سورۃ فاتحہ کے الفاظ "اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ" معبودان باطلہ کی نفی اور ایک خدا کی عبادت کا اقرار ہیں۔

رسول کریم ﷺ کی بعثت سے قبل خدا کی عبادت کا تصور ہی مٹ چکا تھا۔ تمام مذاہب عبادت کے حقیقی اور الہامی تصور سے غافل ہو چکے تھے۔ یہود صرف سبت کے دن تورات کے حکم کے مطابق تعطیل کو ہی بڑی عبادت سمجھتے تھے۔ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت مریم اور مسیحی اولیاء کی تصویروں مجسموں کے سامنے سجدہ ریز تھے۔ ہندو نہ صرف بتوں کی پوجا کرتے تھے بلکہ مظاہر قدرت کے سامنے بھی گرے ہوئے نظر آتے تھے۔ عرب کو تو بت پرستی کا گھر کہنا چاہیے گویا ہر مذہب کے لوگ شرک اور الحاد کی دلدل میں دھنسے ہوئے تھے۔ جو لوگ غیر اللہ کی عبادت سے متنفر تھے۔ وہ رہبانیت کا لباس اوڑھ کر دنیا کو خیر باد کہہ چکے تھے اور ہر قسم کی دنیاوی آرام اور عیش کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیا تھا۔

اسلام نے عبادت کے فرسودہ تصور پر خط تنسیخ کھینچ کر ایک ایسا نظام عبادت پیش کیا۔ جس کے پیچھے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو سنوارنے کے لیے ایک عظیم فلسفہ ہے۔ یہی وہ فلسفہ ہے جس پر قرون اولیٰ کے مسلمان گامزن ہوئے اور دنیا کی قیادت وسیادت حاصل کی۔ پھر اسی ربانی فلسفہ سے انقطاع کی بنا پر تنزل کی اتھاہ گہرائیوں میں گرے، اور گرے پڑے ہیں۔ مسلمان اس تنزل کی گہرائیوں سے اس وقت تک نکل نہیں سکے جب تک وہ فلسفہ عبادت کو اپنی زندگیوں کا حصہ نہیں بناتے۔

اسلام کا فلسفہ عبادت کیا ہے؟ انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ربانی تعلیمات کے مطابق گزارنا۔ اسلامی عبادت کے بے شمار اجزاء ہیں۔ انہی اجزاء پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے اور یہی اجزاء انسانی زندگی کے لیے مشعل راہ ہیں۔

نماز

ارکان، رکن کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ستون۔ گویا ارکان اسلام سے مراد شہادت توحید، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج مراد لیے جاتے ہیں۔ توحید پر عقائد اسلام کے باب میں بحث گزر چکی ہے۔ اس باب میں بقیہ چار ارکان پر بحث کی جائے گی۔ بحوائے حدیث انہی کو بنائے اسلام بھی کہا جاتا ہے۔

الصلوٰۃ (نماز): الصلوٰۃ، صلی آگ جلانے پر بولا جاتا ہے اور آگ میں داخل ہونے پر بھی یصلی النار الکبری یصلون سعیراً۔ صلوٰۃ کے اصل معنی دعا اور برکت دینا ہیں چنانچہ صَلَّیْتُ عَلَیْہِ کے معنی ہیں۔ دَعَوْتُ لَہٗ یعنی میں نے اس کے لیے دعا کی۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَصَلِّ عَلَیْہِمْ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ (التوبۃ ۹:۱۰۳) بے شک تیری دعا ان کے لیے موجب تسکین ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ (الاحزاب ۳۳:۵۶) اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیْہِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّہِمْ ان پر ان کی طرف سے برکتیں ہیں۔ قرآن مجید میں جائے عبادت پر بھی صلوٰۃ کا لفظ بولا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا (الحج ۲۲:۴۰) اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ نہ ہٹاتا رہتا تو یقیناً راہبوں کی کوٹھریاں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے گرا دی جائیں۔

قرآن مجید میں جہاں مدح یا تحریص کے مقام پر نماز کا ذکر آیا ہے وہاں لفظ اقام یا اس کے ت کو استعمال کیا ہے۔ جیسے یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ، مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ، اَقِمِ الصَّلٰوۃَ، اقام کا مادہ قوم ہے۔ اَقَامَ الامر کے معنی ہیں کام کو درست اور صحیح حالت میں رکھنا۔ اللہ تعالیٰ کا لفظ اقام یا اس کے ت لفظ صلوٰۃ کے ساتھ ذکر کرنے سے یہ مطلب ہے کہ نماز اس کے آداب اور شرائط کے ساتھ ادا کی جائے۔

نماز کے آداب و شرائط: ۱۔ طہارت (جسم اور کپڑا اور جگہ) قرآن مجید میں آتا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ (المدثر ۷۴:۱......۵) اے چادر اوڑھنے والے اٹھ اور ڈرا اور اپنے رب کی بڑائی کر اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ اور ناپاکی کو چھوڑ دے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں مفتاح الصلوٰۃ الطھور (سنن ابی داؤد کتاب الطھارۃ باب فرض الوضو) نماز کی کنجی طہارت ہے۔

نجاست دو طرح کی ہے ایک ظاہری اور دوسری جو نظر نہ آئے مثلاً ریح کا خارج ہونا۔ اسلام نے ہر دو نجاست کو نماز کے قائم کرنے کے لیے دور کرنے کا حکم دیا ہے۔ ظاہری نجاست کی تفصیل فقہ کی کتب میں مذکور ہے لیکن ہر شخص نجاست (گندگی) کے مفہوم سے واقف ہے۔ اس لیے اگر کپڑا اور جگہ ظاہری نجاست سے آلودہ ہو تو اس کا صاف کر لینا ضروری ہے۔ ریح کا خارج ہونا بھی باطنی نجاست میں شامل ہے۔ اس لیے اس نجاست کو دور کرنے کا طریقہ اسلام نے وضو قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ (المائدہ ۵:۶) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم نماز کے لیے اٹھو۔ تو اپنے منہ اور کہنیوں تک دھو لیا کرو اور اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک اپنے پاؤں (دھو لیا کرو)

اس آیت کریمہ میں وضو کے لیے چار باتوں کا ضروری قرار دیا ہے۔ ۱۔ منہ کا دھونا۔ حدیث میں اس کی تفصیل یہ ہے۔ پیشانی کے بالوں سے لے کر ٹھوڑی تک دھونا۔ ۲۔ دونوں ہاتھوں کا کہنیوں سمیت دھونا۔ ۳۔ سر کا مسح کرنا یعنی ہاتھوں کو پانی سے تر کر کے سر پر پھیرنا۔ کم سے کم چوتھائی سر کا مسح وضو کے لیے کفایت کرتا ہے۔ ۴۔ دونوں پاؤں کا ٹخنوں سمیت دھونا۔

کتب فقہ میں سنن اور مستحبات وضو پر احادیث کی روشنی میں کافی بحث کی گئی ہے قارئین کسی بھی فقہ کی کتاب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہاں سنن اور مستحبات وضو کو زیر بحث لانا باعث طوالت ہے۔ اصل مقصد نماز کے لیے طہارت کا حصول ہے۔ اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

نقص وضو کی صورت میں ہر نماز سے پہلے وضو کرنا لازمی ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔ لا تقبل صلوٰۃُ من احدث حتّٰی یَتَوَضّا (صحیح بخاری کتاب الوضو باب لاتقبل الصلوۃ بغیر طھور) یعنی بے وضو شخص کی نماز قبول نہیں ہوگی۔

نواقض وضو: ۱۔ پاخانہ یا پیشاب کرنا۔ ۲۔ ریح کا خارج ہونا۔ ۳۔ خون یا پیپ کا جسم سے اتنا نکلنا کہ بہنے لگے۔ ۴۔ منہ بھر قے کرنا۔ ۵۔ سہارے کے ساتھ یا لیٹ کر سونا۔ ۶۔ بے ہوش ہو جانا۔ ۷۔ نماز میں قہقہہ لگا کر ہنسنا۔ ۸۔ ہتھیلی اور انگلیوں کے ساتھ شرم گاہ کو ہاتھ لگانا رسول کریم ﷺ نے فرمایا مس ذکرہ فلا

یصل حتی یتوضا (سنن الترمذی) جو اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگائے وضو کیے بغیر نماز نہ پڑھے۔

تیمم: اگر کوئی شخص کسی مجبوری کے تحت وضو نہ کر سکے تو یُسر کے طور پر اسلام نے تیمم کی اجازت دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ (النساء۴:۴۳) اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی بیت الخلاء سے آیا ہو یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو پھر تم کو پانی نہ ملے تو پاک مٹی کا قصد کرو پھر اپنے مونہوں اور ہاتھوں پر مسح کر لو۔

اس آیت میں تیمم کو وضو کا قائم مقام قرار دیا ہے۔ وضو اور غسل اعلیٰ درجہ کی تطہیر ہے اس کے ساتھ ادنی درجہ کی تطہیر کا بھی ذکر کر دیا ہے جو تیمم کے ساتھ حاصل ہوتی ہے کیونکہ پانی اور مٹی دونوں پاک کرنے والی چیزیں ہیں۔

مسح کے طریق میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک دو دفعہ مٹی پر ہاتھ مارنا چاہیے پہلی دفعہ منہ پر پھیرے اور دوسری دفعہ کہنیوں تک ہاتھوں پر اور بعض نے ہاتھوں کو کفوں تک لیا ہے۔ دو دفعہ ہاتھ مارنے کی روایات ضعیف ہیں اور احادیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک ہی دفعہ ہاتھ مارنے اور صرف کفین تک ہاتھ پھیرنے کا خود طریقہ بتایا ہے چنانچہ حضرت عمارؓ نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے ایک کام (سریہ) کے لیے بھیجا تو مجھے جنابت ہوئی اور پانی نہ ملا تو میں مٹی میں لوٹا جس طرح چار پایا لوٹتا ہے واپس آ کر میں نے نبی کریم ﷺ سے یہ ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ تجھے صرف اتنا ہی کافی تھا کہ ایسا کرتا اور اپنے ہاتھ کو ایک دفعہ زمین پر مارا پھر اسے جھاڑا پھر اس کے ساتھ مسح کیا دائیں ہاتھ کی پیٹھ بائیں سے یا بائیں کی پیٹھ پر داہنے ہاتھ سے پھر دونوں کے ساتھ اپنے منہ پر مسح کیا۔ (بخاری ۸:۷)

اس حدیث میں رسول کریم ﷺ نے مسح کا طریقہ یہ بیان کیا ہے کہ پہلے دونوں ہاتھ پاک مٹی پر مارے پھر زائد مٹی کو پھونک دے یا ویسے جھاڑ دے پھر دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی پیٹھ پر اور بائیں کی ہتھیلی کو دائیں ہاتھ کی پیٹھ پر پھیرے (کہنیوں تک نہیں) پھر دونوں ہاتھوں کو منہ پر پھیرے۔

رسول کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ اَلصَّعِيْدُ وَضُوْءُ الْمُسْلِمِ وَاِنْ لَّمْ يَجِدِ الْمَآءَ عَشْرَ سِنِيْنَ (سنن النسائی و صحیح ابن حبان) پاک مٹی مسلمان کے لیے وضو کا کام کرتی ہے چاہے وہ دس سال پانی نہ پائے۔

فلسفہ نظافت و طہارت: یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تمام حکماء اس بات پر متفق ہیں کہ ظاہر کا باطن پر اثر پڑتا ہے مثلاً جب کوئی شخص باغ میں سیر کے لیے جاتا ہے تو ماحول کی خوبصورتی، دلکشی اور رعنائی اس کے قلب پر وارد ہوتی ہے تو اس کے چہرہ سے انبساط اور خوشی کے آثار ہویدا ہو جاتے ہیں اگر کسی غلاظت سے پُر جگہ سے گزرے تو اس کے دل پر اس کا ناگوار اثر پڑتا ہے تو ناپسندیدگی اور تنفر کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں ہو جاتے ہیں۔

جگہ اور کپڑے صاف رکھنے اور وضو کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ ظاہری نظافت اور طہارت دل پر اثر انداز ہو اور دل میں جذبات فرحت پیدا ہوں جو خدا کی محبت کو مہمیز کریں۔ نمازی دلجمعی اور فرحت جان سے خدا کے سامنے جھکے۔ حقیقی قلبی طہارت ہو اور نمازی خدا کے رنگ میں رنگین ہو جائے ارشاد الٰہی ہے۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (بقرہ۲:۱۳۸) اللہ کا رنگ اور اللہ کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہے ہم اس کی عبادت کرنے والے ہیں۔

گویا عبادت کا مقصد ہی الٰہی رنگ اختیار کرنا ہے۔ رسول کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ سب سے اہم اور اعظم طہارت دل کا پاک کرنا ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے ظاہری طہارت (جگہ کپڑے کا صاف ہونا اور وضو کرنا) لازمی قرار دیا ہے۔ وضو کرنے کے بعد مسلمانوں کو جو دعا پڑھنے کی نصیحت کی ہے اس پر غور کیجئے تو فلسفہ طہارت واضح ہو جائے گا۔ وہ دعا یہ ہے۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ اے اللہ! مجھے اپنی طرف خالص رجوع کرنے والوں اور پاک رہنے والوں میں سے بنا اے اللہ! تو پاک ہے میں شہادت دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں تجھ سے ہی بخشش چاہتا ہوں اور تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔

غسل جنابت میں بھی یہی دعا سکھائی گئی ہے اس دعا کے بعد یہ فقرہ کہا جاتا ہے اب غسل پورا ہوا۔ یعنی ظاہر اور باطن مل کر پورا ہوا جب مذاہب عالم کی کتب کی طرف رجوع کیا جائے تو ان میں بھی اسی فلسفہ کے تحت ظاہری صفائی کی تعلیم دی گئی ہے احبار ۱۵ باب ۱۸ اور ۱۱ باب ۱۵ میں ہے کہ "جریان والا کپڑے دھووے اور غسل کرے شام تک ناپاک ہے اور جس پر وہ سوار ہو اور جو کوئی اس کی سواری کو چھوئے وہ بھی ناپاک۔

خروج ۱۹ باب ۱۰ میں ہے "اور خدا نے موسیٰ سے کہا کہ لوگوں کے پاس جا اور انھیں پاک اور ان کے کپڑے دھلوا اور تیسرے دن تیار رہیں کہ خداوند تیسرے دن لوگوں کی نظر میں کوہ سینا پر اُتر آئے گا۔"

۲۔ باجماعت ادا کرنا: قرآن مجید نے جہاں نماز کا حکم دیا ہے۔ تو اس کے ساتھ اقامت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ، اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ اقامت کے لفظ میں جماعت کا مفہوم پایا جاتا ہے پھر صریح طور پر حکم دیا ہے وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (۲:۴۳) اور جھکنے والوں کے ساتھ جھکے رہو اسلام

میں باجماعت نماز ادا کرنے کی یہاں تک تاکید ہے کہ اگر میدان جنگ میں بھی ہوں اور نماز باجماعت ادا کی جاسکتی ہو تو نماز باجماعت ادا کریں۔

احادیث میں بھی نماز باجماعت کی سخت ترین تاکید پائی جاتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں نے ارادہ کیا کہ حکم دوں کہ لکڑیاں لائی جائیں پھر نماز کا حکم دوں کہ اس کے لیے اذان دی جائے پھر کسی کو حکم دوں کہ وہ لوگوں کی امامت کرے اور خود ان لوگوں کی طرف جاؤں جو (مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے) نہیں آئے تو ان کے گھروں کو ان پر جلا دوں (بخاری ۲۹:۱۰) اس سے ظاہر ہے کہ نماز باجماعت ادا کرنا کتنا ضروری ہے۔

اس طرح ابوداؤد سے روایت ہے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی بستی میں یا جنگل میں تین شخص ہوں اور وہاں جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھی جائے تو ان پر شیطان غالب ہوتا ہے پس جماعت کو اپنے اوپر لازم کرلو۔ بھیڑیا صرف اس بکری کو کھاتا ہے جو ریوڑ سے دور ہو۔

(مشکوٰۃ ۲۳:۴ بروایت ابوداؤد)

اس سے معلوم ہوا آبادی ہو یا جنگل جہاں بھی تین آدمی ہوں نماز باجماعت پڑھیں بلکہ بخاری کی ایک حدیث ہے کہ دو آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئے جو سفر کا ارادہ رکھتے تھے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اِذَا اَنْتُمَا خَرَجْتُمَا فَاَذِّنَا ثُمَّ اَقِيْمَا ثُمَّ لِيَؤُمَّكُمَا اَكْبَرُكُمَا (بخاری ۱۸:۱۰) جب تم دونوں نکلو تو اذان دو پھر اقامت کہو پھر تم میں سے بڑا تمہاری امامت کرائے۔

۳۔ خشوع وخضوع: خشوع وخضوع فرمانبرداری عاجزی کی حالت کا نام ہے۔ ظاہری حالت میں خشوع وخضوع نام ہے خائف اور سکون کا آنکھ کا نیچے رکھنے کا، سر جھکانے کا، باطنی حالت یہ ہے کہ جب نمازی خدا کے حضور کھڑا ہو تو اس کے دل پر اللہ کی محبت اس قدر مستولی ہو کہ اس کی روح آستانہ الوہیت پر پانی کی طرح بہہ نکلے۔ گویا اس کے تمام جذبات سفلیہ پر موت وارد ہو جائے گویا وہ پاک روح کے ساتھ خدا کو دیکھ رہا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ اَلَّذِيْنَ هُمْ فِىْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ (المومنون ۲:۲۳) وہ لوگ جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں۔

اس کے برعکس نماز کی روح سے غافل نمازیوں کے متعلق آتا ہے۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ (الماعون ۱۰۷:۴،۵) پس ان نمازیوں کے لیے ہلاکت ہو جو اپنی نماز سے غافل ہیں جو ریاکاری سے پڑھتے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ نماز کی حقیقت سے غافل ہو کر نماز پڑھنا ریاکاری ہے۔ نماز کی حقیقت خاشعون کے لفظ میں بتا دی ہے۔

۴۔ نمازی ظاہری اور باطنی برائیوں سے رک جائے: قرآن مجید میں آتا ہے وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (عنکبوت ۴۵:۲۹) اور نماز کو قائم رکھ، نماز بے حیائی اور برائی سے روک دیتی ہے اور اللہ کا یاد کرنا یقیناً سب سے بڑھ کر ہے۔

اگر ایک شخص نماز ادا کرتا ہے لیکن برائیوں سے باز نہیں آتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس اللہ کی عظمت اور محبت سے معمور نہیں ہوا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا ہے کہ ایسی نماز دکھاوے کی نماز ہے۔ نماز کا حقیقی ادب یہی ہے کہ انسان فحشاء اور منکر کو ترک کر دے کیونکہ فحشاء اور منکر نہ صرف انسانی روح کی موت کا ذریعہ ہیں بلکہ انسانی تمدن کے لیے بھی مہلک ہیں۔

۵۔ التزام اور دوام سے پڑھنا: قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (معارج ۲۳:۷۰) جو اپنی نماز دوام اور باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (معارج ۳۴:۷۰) اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔

۶۔ استقبال قبلہ: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (بقرہ ۱۴۴:۲) تو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر اور جہاں کہیں بھی تم ہو منہوں کو اس کی طرف پھیرو۔

بیت اللہ کو ایک بڑے واعظ توحید حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا۔ یہی وہ موحد ہے جس کو توحید کی خاطر اپنے وطن کو خیرباد کہا۔ پھر مکہ میں توحید کا چشمہ کرنے کے لیے اللہ کا گھر تعمیر کیا۔ اس کی نسل سے ایک نبی کامل حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کو بھیجا وہ ایک مکمل شریعت لے کر ظاہر ہوئے جس نے اسی پیغام توحید کو زندہ کیا۔ پس نماز میں استقبال قبلہ میں یہی حکمت ہے کہ نمازی کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ قربانیاں آجائیں جو انھوں نے توحید کے پیغام کو پھیلانے کے لیے کی تھیں۔ گویا تصوری زبان میں استقبال بیت اللہ نمازی کو پکا موحد بننے اور توحید کے پھیلانے میں ہر قسم کی مصائب اور تکالیف اٹھانے کا پیغام دے رہا ہے۔ یہی امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ دنیا میں صرف ایک خدا کی عبادت ہو۔

۷۔ فہم و تدبر: نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے مفہوم کی طرف دل بکلی متوجہ ہو۔ ارشاد الٰہی ہے۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (النساء۴:۴۳) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم حالت نشہ میں ہو۔ یہاں تک کہ جو تم کہو اس کو سمجھو۔

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ سکر کی حالت میں نماز نہ پڑھی جائے سکر شراب پینے یا کوئی نشہ آور چیز استعمال سے جو حالت کسی انسان پر وارد ہو جاتی ہے وہ ہے اسی طرح رسول کریم ﷺ نے اونگھ کو بھی سکر کی حالت قرار دیا ہے آپ نے فرمایا اِذَا نَعَسَ اَحَدُکُمْ وَھُوَ یُصَلِّی فَلْیَنْصَرِفْ وَلْیَنَمْ حَتّٰی یَعْلَمَ مَا یَقُوْلُ جب تم میں سے کسی کو اونگھ آ جائے جب وہ نماز پڑھ رہا ہو۔ چاہیے کہ واپس جائے اور سوئے یہاں تک کہ جو کچھ کہتا ہے اسے اس کی حقیقت معلوم ہو۔

حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَاتَقُوْلُوْن سے نماز کی علت نمائی معلوم ہوتی ہے کہ نماز کے لیے حضور قلب کی ضرورت ہے۔ حضور قلب سکر اور اونگھ کی حالت میں میسر نہیں ہوتا۔ اس لیے سکر کی حالت میں نماز نہ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

سوم ان الفاظ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر مسلمان کو نماز اور چند سورتیں جو نماز میں پڑھی جاتی ہیں کے معنی اور مفہوم معلوم ہونے چاہئیں۔ جو لوگ صرف نماز کے الفاظ رٹ لیتے ہیں وہ کسی رنگ میں حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْن کے تحت آ جاتے ہیں۔

۸۔ قنوت: لغت میں قنوت کے معنی ہیں اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری۔ ۲۔ خاموش رہنا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ قُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ (بقرہ۲:۲۳۸) اور اللہ کے سامنے عجز اور خاموشی سے کھڑے ہو جاؤ۔

اس آیت کے نزول سے قبل ناز میں باتیں کر لیا کرتے تھے۔ جب یہ آیت اُتری تو رسول کریم ﷺ سے باتیں کرنے سے منع فرما دیا۔

۹۔ اوقات مقررہ پر ادا کرنا: ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (النساء۴:۱۰۳) مومنوں پر نماز وقت مقررہ پر فرض ہے۔

مذاہب عالم کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شریعت دوسوی اور شریعت عیسوی میں کوئی وقت نماز کا مقرر نہ تھا۔ بعد میں قسیسین اور راہبوں نے عبادت کے اوقات مقرر کیے۔ اسی طرح دیگر مذاہب کا حال ہے۔ صرف بانی اسلام حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ ہی ایک ایسے پیغمبر ہیں جنھوں نے نماز کے اوقات مقرر کیے۔ کیونکہ کسی عمل پر مداومت اختیار کرنے کے لیے اوقات کا تعین ضروری ہے جس کام کے لیے وقت کا تعین نہ ہو وہ بلا ناغہ انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے اسلام نے نماز کے اوقات مقرر کر دیے تاکہ انسان نماز کی ادائیگی میں سستی سے کام نہ لے۔ پنجگانہ نماز کے اوقات عین فطرت انسانی کے مطابق ہیں۔ پابندی اوقات میں ایک قدرتی روحانی تاثیر ہے کہ جب نماز کا وقت آتا ہے تو انسان کے دل میں بے اختیار الٰہی فریضہ ادا کرنے کے لیے جذب و میلان پیدا ہو جاتا ہے اور وہ مسجد کی طرف لپکتا ہے۔ گویا پانچ مرتبہ انسان کے روحانی قویٰ حرکت میں آتے ہیں اور انسان کے قلب و دماغ پر اللہ تعالیٰ کا تصور مستولی ہو جاتا ہے۔ جس وجہ سے ان تمام برائیوں سے دور رہتا ہے جو انسان کی روحانی اور تمدنی زندگی کے لیے سم قاتل ہوتی ہیں۔

۱۰۔ ستر عورت: ارشاد الٰہی ہے۔ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف ۷:۳۱) اے آدم کی اولاد ہر نماز کے وقت اپنی زینت سے آراستہ ہو جایا کرو۔

مردوں کے لیے کم از کم سے ناف سے گھٹنے تک اور عورتوں کے لیے پیشانی سے لے کر پاؤں تک ستر ضروری ہے۔

۱۱۔ اخلاص: ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْھَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ (اعراف ۷:۲۹) اور تم ہر نماز کے وقت اپنے آپ کو سیدھا رکھو اور خدا کو اخلاص کے ساتھ پکارو۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ (الزمر ۳۹:۲،۳) سو اللہ کی ایسی عبادت کر کہ فرمانبرداری اسی کی ہو۔ قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ (زمر ۳۹:۱۱) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اس کی عبادت اس کے لیے فرمانبرداری کو خالص کرتا ہوا کروں یہ باطنی ادب ہے۔ جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ عبادت خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہونی چاہیے اس میں کسی قسم کے شرک کی ملونی نہیں ہونی چاہیے شرک صرف یہی نہیں کہ شجر و حجر اور اجرام فلکی وغیرہ کی پوجا کی جائے۔ غیر اللہ کے علاوہ دل میں کسی کا خوف بھی شرک ہے۔ غربت اور فقر کی وجہ سے کسی شخص کو اپنا پالن ہار ماننا بھی شرک ہے۔ حتیٰ کہ اپنی خواہشات کا غلام ہونا بھی شرک کی ایک مخفی قسم ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔ اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰہُ (فرقان ۲۵:۴۳) کیا تو اس نے اسے دیکھا جو اپنی خواہش کو اپنا معبود بناتا ہے۔

نماز یہ تقاضا کرتی ہے کہ انسان کو تمام غیر اللہ کی نفی کر کے خدا کے حضور آنا چاہیے۔ اگر کسی انسان کا دل کسی قسم کے شرک سے زہر آلودہ ہے تو وہ

نماز کے حقیقی ادب سے ناآشنا ہے اس کی نماز حقیقی روح سے خالی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (روم ۳۰:۳۱) اور نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ بنو۔

گویا نماز شرک کی ضد ہے۔ اخلاص کا مفہوم بھی یہی ہے کہ انسان کا دل ہر قسم کے شرک کی ملونی سے پاک ہو۔

نماز کی اہمیت از روئے قرآن مجید: نماز اسلام کی عبادت کا پہلا رکن ہے جو نابالغ اور مجنون وغیرہ کے علاوہ ہر مسلمان پر فرض ہے۔ یہی وہ عبادت ہے جو کسی حالت حتیٰ میدان جنگ میں ساقط نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا تو وہ بیٹھ کر پڑھ لے۔ اگر بیٹھ کر بھی پڑھ نہیں سکتا تو وہ لیٹ کر پڑھ لے۔ یہ بھی سکت نہیں تو اشاروں سے ادا کرے۔ اسلام میں توحید کے بعد سب سے زیادہ تاکید اقامت صلوٰۃ کی ہے۔ یہ وہ رکن ہے جس کی تعلیم تمام انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی امتوں کو دی۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکہ کی بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑتے ہیں تو اس کی غرض یہ بتاتے ہیں۔ رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (ابراہیم ۱۴:۳۷) ہمارے رب میں نے اپنی اولاد کو تیرے عزت والے گھر کے پاس بے آب و گیاہ وادی میں بسایا ہے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم کریں۔

پھر حضرت ابراہیم اپنے اور اپنی ذریت کے لیے دعا کرتے ہیں۔ رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ (ابراہیم ۱۴:۴۰) میرے رب مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق آتا ہے۔ وَکَانَ یَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ وَکَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِیًّا (مریم ۱۹:۵۵) وہ اپنے پیروؤں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھے۔ حضرت شعیب کو اس کی قوم ان الفاظ میں مطعون کرتی ہے۔ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (ہود ۱۱:۸۷) اے شعیب کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم اسے چھوڑ دیں جس کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ اسرائیلی نبیوں اور ان کی نسل کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاَوْحَیْنَا اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءَ الزَّکٰوۃِ وَکَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ (الانبیاء ۲۱:۷۳) اور ہم نے ان کی طرف نیکیوں کے کرنے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی اور وہ ہماری عبادت کرنے والے تھے۔ حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں۔ یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ (لقمان ۳۱:۱۲) میرے پیارے بیٹے نماز قائم کرو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (طٰہٰ ۲۰:۱۴) میرے ذکر کے لیے نماز قائم کر۔

بنی اسرائیل کو حکم ہوا۔ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (یونس ۱۰:۸۷) اور نماز قائم کرو۔

حضرت زکریا کے متعلق آتا ہے۔ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِکَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ (آل عمران ۳:۳۹) پھر فرشتوں نے اسے پکارا جبکہ وہ عبادت گاہ میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں۔ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا (مریم ۱۹:۳۱) اور مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب تک میں زندہ ہوں۔

جب رسول کریم ﷺ کو خلعت نبوت ملی تو اس وقت تمام مذاہب نماز کی حقیقت سے غافل ہو چکے تھے۔ سورہ مریم میں تمام انبیاء علیہم السلام کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا (مریم ۱۹:۵۹) پھر ان کے ناخلف جانشین ہوئے۔ جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور نفسانی خواہشات کی پیروی کی۔ سو وہ ہلاکت کو پالیں گے۔

اضاعت الصلوٰۃ سے مراد ترک نماز بھی ہے اور نماز کے ظاہری ارکان کو ادا کرتے ہوئے نماز کی روح سے غافل ہونا بھی مراد ہے۔ اضاعت الصلوٰۃ کا نتیجہ ہلاکت اور تباہی ہے حقیقی نماز ہی روحانی اور مادی ترقی کا پیغام لیے ہوئے۔

اسلام نے حقیقی روح کے ساتھ نماز ادا کرنے کا حکم دیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ الٓمّٓ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ...... اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (بقرہ ۱......۳)

میں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں یہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں متقیوں کے لیے ہدایت ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور اس سے جو ہم نے ان کو دیا خرچ کرتے ہیں...... یہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں۔

اقامت الصلوٰۃ کو ذریعہ فلاح قرار دیا ہے فلاح کیا ہے فلاح کے معنی ہیں ظفر و ادراک بُغْیَۃ (امام راغب) یعنی کامیاب اور مطلوب کو پالینا۔ گویا نماز انسانی فلاح کا ذریعہ ہے کیونکہ حقیقی نماز ہی انسان کی مخفی استعدادوں کی آبیاری کرتی ہے جو نشوونما پا کر انسانی ترقی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

فرمایا: حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی (بقرہ ۲:۲۳۸) نماز کی حفاظت کرو اور نماز وسطیٰ کی۔

دوسری جگہ مومنین کی یہ علامت بیان کی ہے وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (انعام ۶:۹۲) وہ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔
اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ (معارج ۷۰:۲۳) جو اپنی نماز پر قائم ہیں۔
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (معارج ۷۰:۳۴، مومنون ۲۳:۹) اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔
محافظت نماز سے مراد صرف اوقات اور ارکان کی حفاظت ہی نہیں فرمایا بلکہ ہر ایک فحشا اور منکر سے بچنا بھی ہے۔
اُتْلُ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (العنکبوت ۲۹:۴۹) پڑھ جو تیری طرف کتاب سے وحی کیا گیا ہے اور نماز قائم کر۔ بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روک دیتی ہے۔
اگر کوئی شخص ادائیگی نماز کے ساتھ فحشا و منکرات کو ترک نہیں کرتا تو گویا وہ اپنی نماز کی حفاظت نہیں کر رہا۔ حفاظت نماز میں فحشاء اور منکرات کو ترک کرنا شامل ہے۔ فحشا اور منکرات کا مرتکب ہونے والا وَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (ماعون ۱۰۷:۴،۵) ہلاکت ہو ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نماز سے غافل ہیں) کے زمرہ میں شامل ہوتے ہیں ان کی نمازیں محض دکھاوے کے لیے ہیں جیسا کہ فرمایا اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَاءُوْنَ یہ لوگ محض دکھاوا کی نماز پڑھتے ہیں۔ دکھاوے کی نماز کی ایک علامت یہ ہے۔ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (ماعون:۷) وہ خیرات کو روکتے ہیں۔
فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ (بقرہ ۲:۲۷۷) اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور نماز قائم کی۔
فرمایا۔
وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتَابِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ (الاعراف ۷:۱۷۰) اور وہ لوگ جنھوں نے کتاب الٰہی کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور نماز قائم کی اور ان اصلاح کرنے والوں کا اجر ہم کبھی ضائع نہ کریں گے۔
فرمایا يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (البقرہ ۲:۱۵۳) اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد چاہو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کی رو سے صبر اور نماز نزول رحمت الٰہی میں اعانت کیا کرتے تھے۔ اِنَّهُمَا اى الصَّبْرُ وَالصَّلٰوةُ مَعُوْنَتَانِ عَلٰى رَحْمَةِ اللّٰهِ.
فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ ۲:۲۷۷) بے شک وہ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے نماز قائم کی اور زکوۃ دی ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس اجر ہے اور ان پر نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔
فرمایا اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (الانفال ۸:۳) وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں۔

نماز کی اہمیت از روئے حدیث: عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَرَاَيْتُمْ لَوْ اَنَّ نَهْرًا بِبَابِ اَحَدِكُمْ يَغْتَسِلُ فِيْهِ كُلَّ يَوْمٍ خَمْسًا مَا تَقُوْلُ ذٰلِكَ يُبْقِيْ مِنْ دَرَنِهٖ قَالُوْا لَا يُبْقِيْ مِنْ دَرَنِهٖ شَيْئًا قَالَ فَذٰلِكَ مَثَلُ الصَّلَوٰتِ الْخَمْسِ يَمْحُو اللّٰهُ بِهَا الْخَطَايَا (بخاری ۶:۹) حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرماتے تھے بتاؤ اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر نہر ہو اور وہ اس میں روز پانچ دفعہ نہائے تو کیا کہتا ہے اس کی میل سے کچھ چھوڑ دے گا۔ صحابہ نے کہا کہ اس کی میل سے کچھ نہیں چھوڑے گا۔ فرمایا پس یہ پانچ نمازوں کی مثال ہے خدا ان کے ذریعہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

یہ حدیث اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (العنکبوت ۲۹:۴۹) کی وضاحت ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح پانی میں بار بار نہانے سے انسان کے جسم سے میل صاف ہو جاتی ہے اور جسم پاک ہو جاتا ہے اسی طرح پانچ دفعہ نماز پڑھنے سے انسان کا دل گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔
حضرت علیؓ سے روایت ہے۔ فِي الصَّلٰوةِ مُنْتَهِيَ وَ مُزْدَ جِرٌ عَنْ مَعَاصِي اللّٰهِ یعنی نماز معاصی سے باز رکھنے کا ذریعہ ہے۔
احمد بن حنبل میں ایک حدیث سے حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت عرض کی کہ فلاں شخص رات کو نمازیں پڑھتا ہے جب صبح ہوتی تو چوری کرتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس چیز کو کہہ رہے ہو یعنی نماز، یہی چیز اس کو اس سے روک دے گی۔

فرمایا: خَمْسُ صَلَوٰتٍ افْتَرَ ضَهُنَّ اللّٰهُ تَعَالٰى مَنْ اَحْسَنَ وَضُوْهُنَّ وَ صَلَّاهُنَّ لِوَقْتِهِنَّ وَاَتَمَّ رُكُوْعَهُنَّ وَخشوعهن، كَانَ لَهٗ عَلَى اللّٰهِ

عَهْدٌ اَنْ يَغْفِرَ لَهُ وَمَنْ لَّمْ يَفْعَلْ فَلَيْسَ لَهُ عَلَى اللّٰهِ عَهْدٌ اِنْ شَاءَ غَفَرَلَهُ وَاِنْ شاء عذبه (ابو داؤد حدیث نمبر ۴۲۵، مسند احمد بن حنبل) یہ پانچ نمازیں ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر فرض کیا ہے جس نے ان کے لیے اچھے طریقے سے وضو کیا۔ پھر انھیں وقت پر ادا کیا پھر پورے خشوع وخضوع سے اس کے سامنے جھکا۔ اس کے لیے اللہ کا عہد ہے کہ وہ اس کو بخش دے گا۔ جس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے لیے اس کا کوئی عہد نہیں اللہ چاہے اس کو بخش دے چاہے اس کو عذاب دے۔

فرمایا اَلصَّلٰوةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِيْنَ (شرح سنن ابن ماجہ ج ا ص ۳۳) نماز مومنوں کی معراج ہے۔

چونکہ نماز دل کی پاکیزگی کا ذریعہ ہے اس لیے پاکیزہ دل ہی آخرت میں تجلیات الٰہی کے نظارے دیکھ سکتا ہے۔ رویت باری تعالیٰ کرسکتا ہے یہی انسان کی معراج ہے۔ یہ معراج نماز کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہے۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلٰوةِ (مسلم کتاب الایمان باب اطلاق اسم الکفر علی تارک الصلوٰۃ) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندہ کے اور کفر کے درمیان ترک نماز ہی فاصلہ ہے۔

عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ الْعَهْدُ الَّذِيْ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ تَرْكُ الصَّلٰوةِ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ (احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارے اور اسلام قبول والے لوگوں کے درمیان نماز کا عہد ہے پس جو کوئی نماز چھوڑ دے تو گویا اس نے کفر کیا۔

اس مضمون کی دوسری کتب میں ہے۔ اس میں بھی اس قسم کی تاکید اور تنبیہ کی گئی ہے۔ فَمَنْ تَرَكَهَا مُتَعَمِّدًا فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْمِلَّةِ (طبرانی، ترغیب للمنذری) جس جان بوجھ کر نماز ترک کی تو وہ ہماری ملت سے خارج ہوگیا۔

علماء کرام نے ترک نماز کے متعلق بہت بحثیں کی ہیں۔ امام احمد بن حنبل جیسے عالم اور محدث نے ترک نماز کو کفر اور ارتداد قرار دیا ہے لیکن صحیح راستہ وہی ہے یہ عمل دون الکفر کے ضمن میں آتا ہے کہ نماز چھوڑنے سے ایک مسلمان دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو جاتا بلکہ اس نے اسلام نے ایک اہم حکم کی نافرمانی کی تو یہاں کفر سے مراد حقیقی کفر نہیں بلکہ لفظ کفر لغوی معنی ''انکار'' میں استعمال ہوا ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بن عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ ذَكَرَ اَمْرَ الصَّلٰوةِ يَوْمًا فَقَالَ مَنْ حَافَظَ عَلَيْهَا كَانَتْ لَهُ نُوْرًا وَ بُرْهَانًا وَنَجَاةً يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمَنْ لَّمْ يُحَافِظْ عَلَيْهَا لَمْ يَكُنْ لَّهُ نُوْرًا وَّلَا بُرْهَانًا وَّلَا نَجَاةً وَّكَانَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَعَ قَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَاُبَىِّ بْنِ خَلَفٍ (احمد بن حنبل دارمی، البیہقی فی شعب الایمان) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن آپ نماز کے بارے میں ذکر فرما رہے تھے فرمایا جو بندہ نماز کی حفاظت کرے گا۔ وہ قیامت کے دن اس کے لیے نور ہوگی۔ دلیل ہوگی اور اس کے لیے ذریعہ نجات بنے گی اور جو بندہ اس کی حفاظت نہ کرے گا تو وہ اس کے لیے نور نہیں بنے گی نہ اس کے لیے دلیل ہوگی اور نہ اس کے لیے ذریعہ نجات بنے گی۔ وہ قیامت کے دن قارون، فرعون ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔

عَنْ اَبِي ذَرٍّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ زَمَنَ الشِّتَاءِ وَالْوَرَقُ يَتَهَافَتُ فَاَخَذَ بِغُصْنَيْنِ مِنْ شَجَرَةٍ قَالَ فَجَعَلَ ذَالِكَ الْوَرَقُ يَتَهَافَتُ قَالَ فَقَالَ يَا اَبَا ذَرٍّ قُلْتُ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنَّ الْعَبْدَ الْمُسْلِمَ لَيُصَلِّي الصَّلٰوةَ يُرِيْدُ بِهَا وَجْهَ اللّٰهِ تَتَهَافَتُ عَنْهُ ذُنُوْبُهُ كَمَا تَهَافَتُ هٰذَا الْوَرَقُ عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ (مسند احمد بن حنبل) حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن سردی کے موسم میں باہر تشریف لے گئے اور درختوں سے پتے جھڑ رہے تھے آپؐ نے ایک درخت کی دو ٹہنیوں کو پکڑا اور (ہلایا) تو اس کے پتے جھڑنے لگے پھر آپ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا اے ابوذر! میں نے عرض کیا حاضر ہوں یارسول اللہ! آپ نے ارشاد فرمایا جب مومن بندہ اللہ کی رضا کے لیے نماز پڑھتا ہے تو اس کے گناہ ان پتوں کی طرح جھڑ جاتے ہیں۔

عَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ اِمْرَءٍ مُسْلِمٍ تَحْضُرُهُ صَلٰوةٌ مَكْتُوْبَةٌ فَيُحْسِنُ وُضُوْءَ هَا وَخُشُوْعَهَا وَرُكُوْعَهَا اِلَّا كَانَتْ كَفَّارَةً لِمَا قَبْلَهَا مِنَ الذُّنُوْبِ مَالَمْ يُؤْتِ كَبِيْرَةً وَذَالِكَ الدَّهْرَ كُلَّهُ (مسلم)

حضرت عثمان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مسلمان آدمی فرض نماز کا وقت آنے پر اس کے لیے اچھی طرح وضو کرے پھر خشوع اور مکمل رکوع اور سجود کے ساتھ نماز ادا کرے تو وہ نماز اس کے واسطے پچھلے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا۔ جب تک کہ وہ کسی کبیرہ گناہ مرتکب نہ ہوا ہو اس طرح یہ بخشش عمر بھر رہے گی۔

فرمایا اَوَّلُ مَايُحَاسَبُ النَّاسُ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ اَعْمَالِهِمُ الصَّلٰوةُ (سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰۃ) جبکہ سنن نسائی میں ان الفاظ کا اضافہ ہے۔

فَاِنْ صَلَحَتْ فَقَدْ اَفْلَحَ وَاَنْجَحَ وَاِنْ فَسَدَتْ فَقَدْ خَابَ وَخَسِرَ (سنن النسائی کتب الصلوٰۃ باب المحاسبہ علی الصلوات) پس اگر نماز درست طریقہ سے پڑھی تو وہ بندہ فلاح اور نجات پا گیا اور نماز صحیح آداب کے ساتھ نہ پڑھی تو وہ خسارہ پانے والا ہو۔

عَنْ اَبِی الدَّرْداءِ قَالَ اَوْصَانِی خَلِیْلِی اَنْ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ شَیْئًا وَّ اِنْ قُطِّعْتَ وَحُرِّقْتَ وَلَا تَتْرُکْ صَلٰوۃً مَّکْتُوْبَۃً مُتَعَمِّداً فَمَنْ تَرَکَھَا مُتَعَمِّداً فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْہُ الذِّمَّۃُ وَلَا تَشْرَبِ الْخَمْرَ فَاِنَّھَا کُلِّ شَرٍّ (ابن ماجہ کتاب الفتن باب الصبر علی البلاء) حضرت ابودرداء سے روایت ہے کہ میرے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ وصیت فرمائی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اگرچہ تمھارے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں اور تمھیں آگ میں جلا دیا جائے اور جان بوجھ کر فرض نماز نہ ترک کرنا، جس نے عمداً نماز چھوڑی تو اس کے بارے میں میری ذمے داری ختم ہوگئی اور شراب کبھی نہ پینا کیونکہ یہ ہر برائی کی چابی ہے۔

فرمایا اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ فَمَنْ تَرَکَھَا فَقَدْ ھَدَمَ الدِّیْنَ (البیہقی شعب الایمان ج ۲ صفحہ ۲۹) نماز دین کا ستون ہے پس جس نے اس (رکن) کو چھوڑا گویا اس نے دین کو گرا۔

فرمایا رَاسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ عَمُوْدُہُ الصَّلٰوۃُ (ترمذی جلد ۲ باب الایمان) دین کی اصل اسلام (توحید اور رسالت کا اقرار) اور اس کا ستون نماز ہے۔

فرمایا بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَھَادَۃُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰہِ اِقَامُ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءُ الزَّکٰوۃِ وَالْحَجُّ وَصَوْمُ رَمَضَانَ (بخاری کتاب الایمان ۱:۲)

سابقہ کتب سماوی کی رو سے اہمیت: قرآن مجید کی رو سے انبیاء علیہم السلام کی اساسی تعلیم نماز کا ذکر گزر چکا ہے جب سابقہ کتب الہامی کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی نماز کا ذکر ملے گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کے تحت اس شعبہ کی تکمیل کی ہے۔ امت مسلمہ اس پر عمل پیرا ہے۔

نیز یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن مجید میں نماز کو بعض جگہ ذکر الٰہی تسبیح وتحمید کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ اسی طرح سابقہ کتب میں نماز کو ذکر کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

یہاں نماز کی اہمیت کے پیش نظر چند حوالے بائبل سے درج کیے جاتے ہیں۔ اور ''اضحٰق'' نے وہاں قربان گاہ بنائی اور خدا کا نام لیا (پیدائش ۲۶:۲۵)

''پر میں تو خداوند کو پکاروں گا اور خداوند مجھے بچائے گا صبح وشام اور دوپہر کو میں فریاد کروں گا اور نالہ کروں گا اور میری آواز سن لے گا (زبور ۵۵:۱۶، ۱۷) ''جب تیری قوم اسرائیل تیرا گناہ کرنے کے باعث اپنے دشمنوں سے شکست کھائے اور پھر تیری طرف رجوع لائے اور تیرے نام کا اقرار کر کے اور اس گھر کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے اور تجھ سے مناجات کرے تو تو آسمان پر سے سن کر اپنی قوم بنی اسرائیل کا گناہ معاف کرنا اور ان کو اس ملک میں جو تو نے ان کے باپ دادا کو دیا پھر لے آنا۔ (سلاطین ۸:۳۳،۳۴)

''جب دانیال کو معلوم ہوا کہ نوشتہ پر دستخط ہو گئے تو وہ اپنے گھر آیا اور اپنی کوٹھڑی کا دروازہ جو بیت المقدس کی طرف تھا کھول کر اور دن میں تین مرتبہ گھٹنے ٹیک کر اپنے پروردگار کے حضور میں اسی طرح نماز پڑھتا اور تسبیح وتحمید کرتا رہا جس طرح پہلے کرتا تھا۔ (دانیال ۶:۱۰)

''اور میں نے خداوند کریم کی طرف رخ کیا اور نماز اور دعاؤں کے ذریعے سے اور روزہ رکھ کر اور ٹاٹ اوڑھ کر اور راکھ پر بیٹھ کر اس کا طالب ہوا۔ (دانیال ۹:۳)

''اور لوگوں کو رخصت کر کے (یسوع) تنہا نماز پڑھنے کے لیے پہاڑ پر چڑھ گیا اور جب شام ہوئی تو وہاں اکیلا تھا۔'' (متی ۱۴:۲۳)

''اس وقت یسوع ان کے ساتھ گتسمنی نام ایک جگہ میں آیا اور اپنے شاگردوں سے کہا یہیں بیٹھے رہنا جب تک کہ میں وہاں جا کر نماز پڑھ لوں۔'' (متی ۲۶:۳۶) ''پھر ذرا آگے بڑھا اور سجدہ ریز ہوا اور نماز پڑھتے ہوئے یوں دعا کی کہ اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے۔ (متی ۲۶:۳۹)

''اور وہ صبح سویرے اٹھ کر نکلا اور ایک ویران جگہ میں گیا اور وہ اس جگہ نماز پڑھتا رہا۔'' (مرقس ۱:۳۵)

اور ان سے کہا تم سوتے کیوں ہو۔ اٹھو اور نماز پڑھو تا کہ آزمائش میں نہ پڑو۔'' (لوقا ۲۲:۴۶)

''پطرس اور یوحنا نماز کے وقت یعنی دن کی نویں گھڑی میں ہیکل کو جا رہے تھے۔ (اعمال ۳:۱)

''اور اس پر غور کر کے اس یوحنا کی ماں مریم کے گھر آیا جو مرقس کہلاتا ہے وہاں بہت سے آدمی جمع ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔'' (اعمال ۱۲:۱۲) اور سبت کے دن ہم شہر کے دروازے کے باہر ندی کے کنارے گئے جہاں نماز کا معمول تھا اور بیٹھ کر ان عورتوں سے جو اکٹھی ہوئی تھیں کلام کرنے لگے۔'' (اعمال ۱۶:۱۳)

''اور آدھی رات کے قریب پولس اور سیلاس نماز پڑھ رہے تھے اور اللہ کی تسبیح کر رہے تھے اور قیدی (ان کی تسبیح ومناجات) سن رہے تھے۔'' (اعمال ۱۶:۲۵)

''اس نے یہ کہہ کر گھٹنے ٹیکے اور سب کے ساتھ نماز پڑھی (اعمال ۲۰:۳۶)

ہیئت نماز: اسلام نے ہیئت نماز کی جو تعلیم دی ہے وہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے، یعنی قیام، رکوع، سجدہ، قعدہ، دنیا کے تمام خطوں میں تعظیم وتکریم کے یہی طریقے ہیں۔ یا کسی کے سامنے تعظیم وتکریم کے لیے قیام کیا جاتا ہے پھر قیام کی دوشکلیں ہیں۔ سیدھے کھڑا ہونا یا ہاتھ باندھ کر بعض علاقوں میں جھک کر ادب بجالایا جاتا ہے۔ بعض ایسے بھی خطے ہیں جہاں بزرگوں کے سامنے سجدہ سے اپنی فرمانبرداری کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس طرح بعض ایسے بھی حصے ہیں جہاں پر دوزانو ٹیک کر اظہار تکریم کیا جاتا ہے۔ یہی فطری قواعد اور طرق ہیں جن سے اظہار عاجزی اور انکساری کیا جاتا ہے اسلام نے نماز میں بزرگ و برتر ہستی اللہ کے سامنے اپنی فرمانبرداری کے اظہار کے لیے ان تمام فطری طرق کو جمع کر دیا ہے۔ جن سے انسانی فطرت کی عکاسی ہوتی ہے۔ اسلامی ہیئت نماز ان تمام اصولوں اور مسلمہ خوبیوں پر حاوی ہے جو دنیا کے مذاہب میں فرداً فرداً موجود ہیں اور نیازمندی کے تمام آداب اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ جب سابقہ کتب سماوی کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی نماز میں انہی اعمال کا ذکر ملتا ہے۔

اسلام نے نماز ادا کرنے کے طرق اور ادعیہ پڑھنے کی تعلیم دی ہے وہ یہ ہے رفع یدین، یعنی دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر اٹھا کر تکبیر (اللہ اکبر) کہنا یہ گویا اس بات کا اظہار ہے کہ بندہ تمام دنیا سے منقطع ہو کر ایسی ہستی کے سامنے آیا جو سب سے بڑی ہے۔ ان الفاظ سے بندہ کے دل میں اللہ کی ہستی کا تصور مرتسم ہوتا ہے۔

قیام: رفع یدین کے بعد نمازی یا تو اپنے ہاتھ سینے پر باندھ لیتا ہے یا بعض احادیث کے مطابق ہاتھ کھلے چھوڑ دیتا ہے۔ آغاز میں یہ دعا پڑھی جاتی ہے۔

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ (ترمذی، ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب ۲۰ من رای الاستفتاح بسبحانک) پاک ہے تو اے اللہ اور تیری ہی تعریف ہے اور تیرا نام برکت والا ہے اور تیری شان بلند ہے اور تیرے سوا کوئی موجود نہیں۔

بعض احادیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حسب ذیل دعا مروی ہے۔ اَللّٰھُمَّ بَاعِدْ بَیْنِی وَبَیْنَ خَطَایَایَ کَمَا بَاعَدْتَ بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اَللّٰھُمَّ نَقِّنِی مِنَ الْخَطَایَا کَمَا یُنَقَّی الثَّوْبُ الْاَبْیَضُ مِنَ الدَّنَسِ اَللّٰھُمَّ اغْسِلْ خَطَایَایَ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرْدِ (بخاری ومسلم) اے اللہ! میرے اور میری خطاؤں کے درمیان اتنا بُعد کر دے جتنا بُعد تو نے مشرق اور مغرب کے درمیان کر دیا ہے اور اے اللہ مجھے خطاؤں سے ایسا پاک وصاف کر دے جیسا کہ سفید کپڑا میل کچیل سے پاک صاف کر دیا جاتا ہے اور اے اللہ میری خطاؤں کو پانی سے اور برف سے اور اولے سے دھو ڈال۔

یہ دعا نماز کے فلسفہ ''فحشاء ومنکرات سے دوری'' کی عکاسی کرتی ہے کہ کس طرح اس کا بندہ اپنی خطاؤں سے لرزاں وترساں ہے اور اپنے دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ سے ملتجی ہے کہ وہ اس کی خطاؤں کو معاف کر دے۔

مندرجہ بالا دعا کے بعد یہ الفاظ پڑھے جاتے ہیں۔ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ یعنی میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس کے بعد سورہ فاتحہ پڑھی جاتی ہے جو تمام قرآن مجید میں عطر اور خلاصہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّالِّیْنَ. آمین۔ اللہ بے انتہا رحم کرنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے وہ جزا وسزا کے دن کا مالک ہے ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت کر راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام کیا نہ ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا۔

سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد قرآن مجید سے کم سے کم تین آیات پر مشتمل سورت پڑھی جاتی ہے۔ یہاں چند سورتیں ترجمہ اور مختصر تشریح کے ساتھ درج کی جاتی ہیں۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ o اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ o اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَھُمْ فِی تَضْلِیْلٍ o وَاَرْسَلَ عَلَیْھِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ تَرْمِیْھِمْ بِحِجَارَۃٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ o فَجَعَلَھُمْ کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ o

اللہ بے انتہا رحم والے اور بار بار رحم کرنے والے کے نام سے شروع کرتا ہوں کیا تو نے غور نہیں کیا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ کیا ان کی (بری) تدبیر کو اکارت نہیں کیا اور ان پر غول کے غول پرندے بھیجے جو ان پر سخت پتھر مارتے تھے سو انھیں کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔

تشریح: اس سورۃ میں اصحاب فیل کے واقع کی طرف اشارہ کیا ہے جنھوں نے خانہ کعبہ کو تباہ کرنا چاہا تھا۔

ابرہہ جو یمن کا عیسائی گورنر شاہ حبش کی طرف سے تھا۔ اس نے صنعاء میں ایک عالی شان گرجا اس مقصد کے لیے بنایا کہ اہل عرب بجائے خانہ کعبہ کے اس گرجے میں جمع ہوا کریں اور اس طرح انھیں دائرہ عیسائیت میں داخل کر لیا جائے مگر اہل عرب اس عظیم الشان گرجا کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ تو آخر ابرہہ

نے خانہ کعبہ کو گرا دینے کے لیے مکہ معظمہ پر چڑھائی کر دی۔

یہ واقعہ اس سال کا ہے جس سال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ اس سال کا نام تاریخ عرب میں عام الفیل ہو گیا۔ عربوں میں یہ رواج تھا جس سال کوئی اہم واقعہ ہوتا اس کے نام پر اس سال کا نام رکھ دیتے تھے اس لشکر میں کئی ہاتھی تھے اور ابرہہ محمود نامی ہاتھی پر سوار تھا جب لشکر مکہ پہنچا تو عبدالمطلب نے مکہ کو خالی کرا دیا۔ سب لوگ قریب کی پہاڑیوں پر چلے گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابرہہ نے عبدالمطلب کے اونٹ پکڑ لیے تھے۔ جب عبدالمطلب نے ابرہہ سے اونٹ واپس کرنے کا مطالبہ کیا تو ابرہہ نے تعجب سے پوچھا کہ تم خانہ کعبہ کو نہ گرانے کی درخواست نہیں کرتے۔ عبدالمطلب نے جواب دیا۔ انی انا رب الابل وان للبیت ربا لیمنعہ، میں اونٹوں کا مالک ہوں اور خانہ کعبہ کا رب بھی ہے جو اس کی حفاظت کرے گا جب مکہ کو خالی کیا گیا تو اس وقت عبدالمطلب نے کعبہ کے دروازے کی کنڈی کو پکڑ کر کہا تھا۔ لاھم ان المرء یمنع رحلہ فامنع رحالک لا یغلبن صلیبھم و محالھم ابداً محالک۔ اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ انسان اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے سوائے خدا! تو اپنے گھر کی حفاظت کر۔ ان کی صلیب اور ان کی طاقت تیری طاقت پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتی۔

چنانچہ ابرہہ اور اس کا لشکر خانہ کعبہ تک پہنچنے سے پہلے ہی تباہ و برباد ہو گیا۔ قرآن مجید میں جو بھی واقعہ بیان ہوا ہے اس کے پیچھے ایک پیش گوئی ہے۔ اس واقعہ میں مسلمانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی کمزوری اور ادبار کی حالت میں اسلام دشمن طاقتیں اسلام کو ختم کرنے کی کوشش کریں گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کے منصوبے ناکام بنا دے گا۔ اللہ تعالیٰ خود اس دین کا محافظ ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ o

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ o اٖلٰفِھِمْ رِحْلَۃَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ o فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ ھٰذَا الْبَیْتِ الَّذِیْٓ اَطْعَمَھُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّ اٰمَنَھُمْ مِّنْ خَوْفٍ o

ترجمہ میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے انتہا رحم کرنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

قریش کے مانوس کرنے کے لیے۔ انھیں سردی اور گرمی کے سفر سے مانوس کرنے کے لیے پس انھیں چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انھیں بھوک میں کھانا دیا اور خوف سے امن دیا۔

تشریح: اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے قریش پر احسان جتایا ہے کہ اس ابرہہ اور اس کے لشکر کو تباہ و برباد کر دیا ہے تا کہ وہ اپنی تجارت میں لگے رہیں اس سورت میں دو سفروں کا ذکر کیا ہے۔ عربوں کا ایک تجارتی قافلہ موسم گرما میں شام کو جاتا تھا اور سردیوں میں یمن کیونکہ شام کا ملک سرد تھا اور یمن گرم، یہ تجارت قریش کے لیے ذریعہ معاش تھی۔ اس پر ان کا گزر بسر ہوتا تھا۔ دوم خانہ کعبہ ان کی حفاظت کا سبب تھا کیونکہ قریش اس کے متولی تھے اور انھیں کوئی نہیں چھیڑتا تھا۔ تمام عرب جنگوں کا گھر تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوتے تھے لیکن حرم کعبہ میں ایک دوسرے کے دشمن بھی ہتھیار رکھ دیتے تھے کوئی کسی کو گزند نہیں پہنچاتا تھا جبکہ تمام عرب جائے فساد ہے اور حرم کعبہ جائے امن۔ کہ وہ اسی رب کی عبادت کریں۔

اللہ تعالیٰ نے ان دو احسانوں "دفع جوع اور قیام امن" کو جتا کر قریش کو یہ ہدایت دی ہے کہ وہ صرف رب بیت اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا کفران نعمت ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ o فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ o اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ o

ترجمہ: میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے انتہا رحم والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے ہم نے تجھے کوثر دی۔ سو تو اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر جو تیرا دشمن ہے وہ قطع نسل رہے گا۔

تشریح: مفسرین نے کوثر کے کئی معنی کیے ہیں۔ کوثر ہر شے کی کثرت پر بولا جاتا ہے۔ بعض نے کوثر سے مراد قرآن مجید لیا ہے۔ بعض نے امت کثیر، بعض نے جنت کی نہر۔ بعض نے خیر کثیر لیکن خیر کثیر میں ہی تمام معانی آ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مختص کی ہے۔ ہر نبی کسی ایک چیز یا چند سے مختص تھا لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ ذات ہے جو ہر قسم کی خیر سے مختص کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خیر کثیر عطا کیے جانے کی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین کی ہے کہ وہ نماز پڑھیں اور قربانی کریں اس میں ایک تو امتیوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جب کسی کو اللہ تعالیٰ کسی نعمت سے نوازے تو اللہ کی شکر گزاری کے طور پر اللہ کو کثرت سے یاد کرے اور قربانی دے۔ قربانی سے مراد ہر قسم کی قربانی یعنی جانی، مالی مراد ہے۔

اس سورۃ میں ایک عظیم الشان پیشگوئی کی گئی ہے یہ مکی دور کی سورت ہے۔ جب ہر طرف سے مخالفتوں کے طوفان اٹھے ہوئے تھے۔ کوئی ظاہر بین رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کے متعلق کہہ نہیں سکتا اس اندھیرے اور تاریک دور میں پیشگوئی کی گئی ہے کہ دشمن جتنا چاہیں اسلام کو مٹانے کی کوشش

کریں لیکن اللہ تعالیٰ اس دین کو کامیاب کرے گا اور تیرے ذکر کو بلند کرے گا اور تیرا دشمن ناکام و نامراد رہے گا۔ اس مختصر سورت میں ہر دور کے لیے یہ خوشخبری دی ہے کہ جب بھی اسلام اور رسول کریم کے ذکر کو مٹانے کی کوشش کی جائے گی تو اللہ تعالیٰ دشمنوں کے ارادوں اور تدبیروں کو ناکام کر دے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَo لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُo وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْo وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِo

ترجمہ: میں شروع کرتا ہوں اس اللہ کے نام سے جو بے انتہا رحم والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

کہہ اے کافرو! میں اس کی عبادت نہیں کروں گا جس کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور نہ میں کبھی اس کی عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم عبادت کرتے تھے اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ تمھارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔

تشریح: جس طرح پہلے تمام انبیاء علیہم السلام نے توحید کے ساتھ عبادت کی تعلیم دی ہے۔ اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سابقہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کو پایہ تکمیل پہنچایا ہے۔ اس سورت میں ایک خدا کی عبادت بجا لانے اور شرک سے دور رہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے۔ میں کبھی بھی تمھارے معبودان باطلہ کے سامنے سر نہیں جھکاؤں گا کیونکہ خدا کے سوا کسی دوسرے کے سامنے جھکنا انسانی عظمت کے خلاف ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کو بتایا ہے کہ انھوں نے نبوت سے نوازے جانے سے پہلے بھی کسی بت کی پرستش نہیں کی۔ نہ اب کریں گے۔ نہ مستقبل میں۔ میرا دین توحید کا دین ہے جو ہر قسم کی خیر اور بھلائی کا ذریعہ ہے اور تمہارا دین شرک ہے جو ہر قسم کا شر اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ خدا تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ خیر ہی باقی رہتا ہے۔ شر مٹ جاتا ہے۔ اس لیے میں وہی راستہ اختیار کروں گا جو خیر کا ہے اور باقی رہنے والا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِo

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُo وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًاo فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًاo

ترجمہ میں شروع کرتا ہوں اس اللہ کے نام سے جو بے انتہا رحم والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

جب اللہ کی مدد اور فتح آ گئی اور تو نے لوگوں کو دین میں فوج در فوج داخل ہوتے دیکھ لیا تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور اس کی حفاظت مانگ وہ رجوع برحمت کرنے والا ہے۔

تشریح: اس سورۃ کا نزول ترمذی اور بیہقی کی روایت کے مطابق حجۃ الوداع میں ایام التشریق کے وسط میں ہوا۔

اس سورۃ میں فتح اور نصرت سے مراد مکہ کی فتح مراد ہے۔ جب عرب دائرہ اسلام میں جوق در جوق داخل ہونا شروع ہو گئے تھے اور کفر کی تاریکی کافور ہو گئی تھی۔ دشمنوں کی تدبیریں ناکام ہو چکی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس فتح مبین کے نتیجہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کی کہ وہ کثرت سے اللہ کی تسبیح کریں۔ استغفار کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدوں کو پورا کیا ہے حضرت عائشہ کی روایت صحیح بخاری میں ہے کہ اس سورت کے نزول کے بعد آپ ہر نماز میں **سبحانک اللھم ربنا و بحمدک اللھم اغفرلی** پڑھا کرتے تھے۔

اس میں مسلمانوں کے لیے بھی یہ سبق ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو کوئی کامیابی دے تو وہ شکرانے کے طور پر اللہ تعالیٰ کی کثرت سے تسبیح اور استغفار کرے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبَّتْ يَدَاۤ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّo مَاۤ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَo سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍo وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِo فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍo

ترجمہ: میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے انتہا رحم والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ خود بھی ہلاک ہو گیا اس کا مال اس کے کسی کام نہ آیا جو اس نے کمایا تھا۔ وہ جلد شعلوں والی آگ میں داخل ہوگا اور اس کی عورت (بیوی) بھی جو لکڑیاں چننے والی تھی۔ اس کے گلے میں کھجور کی چھال کی رسی ہے۔

تشریح: یہ سورۃ ابولہب سے متعلق ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چچا تھا۔ اسلام کا شدید دشمن تھا۔ ابولہب اس کی کنیت تھی۔ اس سورۃ میں ابولہب کی ہلاکت اور نامرادی کا ذکر کیا گیا ہے۔ آپ کے رشتے داروں میں سے سب سے زیادہ مخالف ابولہب تھا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم باہر خصوصاً حاجیوں کو اسلام کا پیغام پہنچانے کے لیے جاتے تو یہ شخص آپ کے پیچھے نکلتا اور کہتا کہ یہ کذاب ہے۔ ساتھ ہی پتھر اٹھا اٹھا کر مارتا۔ آپ لہولہان ہو جاتے اس طرح اس کی بیوی ام جمیل آپ کے راستہ میں کانٹے بچھا دیتی تاکہ آپ اندھیرے میں نکلیں تو زخمی ہوں۔ قتادہ سے روایت ہے بخیل ہونے کی وجہ سے خود باہر سے لکڑیاں

اٹھا کر لاتی تھی۔

اس سورہ میں خاوند بیوی (ابولہب اور ام جمیل) کی ہلاکت کی خبر دی گئی ہے کہ باوجود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی عزیز ہونے کے جن کی مخالفت کی وجہ سے ہلاک ہو گئے اور ام جمیل کی ہلاکت بھی لکڑی کے گٹھے کا رسہ گردن میں پڑ جانے کی وجہ سے ہوئی اور ابولہب جنگ بدر کے سات دن بعد وبائی بیماری کی وجہ مر گیا اور اس کے گھر کے لوگ بھی اس کے پاس نہ تھے اور آخر حبشیوں سے اٹھوا کر دفن کرا دیا گیا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌo اَللّٰهُ الصَّمَدُo لَمۡ يَلِدۡ وَلَمۡ يُوۡلَدۡo وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌo

ترجمہ: (میں شروع کرتا ہوں) اللہ کے نام سے جو بے انتہا رحم والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

کہہ اللہ (تعالیٰ) ایک ہے۔ اللہ (تعالیٰ) بے نیاز ہے نہ اس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔

تشریح: اس سورہ کا نام اخلاص ہے۔ کھوٹ سے پاک چیز کو اخلاص کہا جاتا ہے کیونکہ اس سورۃ میں توحید باری تعالیٰ کو ہر قسم کے شرک سے خالص کر کے بیان کیا۔ اس لیے اس سورۃ کا نام اخلاص ہے۔ توحید باری تعالیٰ وہ عمودی مسئلہ ہے۔ جس کو ہر نبی نے اپنی تعلیمات کی اساس بنایا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی توحید الٰہی کو قائم کرنا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی توحید کو ہی اپنی تعلیمات کی بنیاد قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں اس موضوع کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ توحید کو دلائل قاطعہ کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔ کہیں کائنات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس کا نظام ایک صانع کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔ کہیں وحی کو وجود باری تعالیٰ پر ایک محکم دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہ دلیل ہے جو انسان کو تمام شکوک سے نکال کر حق الیقین کے مقام پر کھڑا کر دیتی ہے۔

سورہ اخلاص میں توحید کی ہر قسم کا اثبات اور شرک کی ہر قسم کی نفی کی گئی ہے۔ قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ میں توحید فی الذات کا اثبات اور شرک فی الذات کی نفی کی گئی ہے یعنی اللہ اپنی ذات میں ایک ہی ہے اور نہ اس کا کوئی ساجھی نہیں۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ میں توحید فی الصفات کا ذکر اور شرک فی الصفات کی تردید کی گئی ہے۔ یعنی سب کائنات اس کی پیدا کردہ ہے کوئی چیز اس سے مستغنی نہیں تو پھر کوئی دوسرا کیونکر اس کی ذات میں شریک ہو سکتا ہے۔ لَمۡ يَلِدۡ وَلَمۡ يُوۡلَدۡ یہ الفاظ صمد کی وضاحت کر رہے ہیں جب کائنات کی ہر چیز اس کی مخلوق ہے تو وہ خود کسی کا بیٹا یا کسی کا باپ کیسے ہو سکتا ہے۔ بیٹا ہونا یا باپ ہونا صفت ''الصمد'' کے خلاف ہے اس میں عیسائیوں کے عقیدہ ابنیت کا بھی رد کیا گیا ہے۔ وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ میں توحید فی العبادت کی وضاحت اور شرک فی العبادت کی نفی بیان ہوئی ہے۔ جب کوئی چیز اس کی ہمسر نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی نظیر ہے نہ کوئی چیز اس کے برابر ہے تو دوسری چیزوں کی عبادت کیوں کی جائے۔

کیونکہ یہ سورۃ توحید کے اہم مضمون پر مشتمل ہے جو قرآن مجید کا عمود ہے کہ اس لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سورۃ کو ثلث القرآن بھی کہا ہے اور اساس القرآن بھی۔ کیونکہ توحید اصول دین کی بنیاد ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِo مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَo وَمِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ وَمِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِo وَمِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَo

ترجمہ: (میں شروع کرتا ہوں) اللہ کے نام سے جو بے انتہا رحم والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

کہہ میں صبح کے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔ ہر چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی اور تاریک رات کے شر سے جب اندھیرا چھا جائے اور گرہوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے اور حسد کرنے والے کی شر سے جب وہ حسد کرے۔

تشریح: اس سورۃ میں چار چیزوں سے پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے اول ہر اس چیز کے شر سے جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی چیزیں پیدا کی ہیں ان میں منافع بھی ہیں اور مضرات بھی۔

مثلاً آگ یا پانی حتیٰ کہ زہر بھی۔ یہ چیزیں انسان کے لیے نفع بخش ہیں۔ بعض اوقات یہ چیزیں نقصان کا موجب بھی بن جاتی ہیں۔ دوسرے اندھیرے کے شر سے بچنے کی دعا سکھائی ہے کیونکہ تاریکی انسان کے لیے شر کا موجب ہوتی ہے تاریکی میں ہی چور وغیرہ گھروں میں نقاب زنی کرتے ہیں اور بعض اوقات تاریکی میں چلنا موجب اذیت بن جاتا ہے۔

تاریکی سے جہالت اور لاعلمی کی تاریکی بھی مراد ہو سکتی ہے۔ تیسرا ان بدروحوں کے شر سے پناہ مانگنے کے لیے کہا گیا ہے جو عقد یعنی صلہ رحمی کے رشتے کو توڑنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ جس سے معاشرتی بدامنی پیدا ہوتی ہے اور فساد پھیلتا ہے۔ جب ایک انسان معاشرہ میں خوش حال اور پرامن زندگی بسر کرنا

شروع کر دیتا ہے تو حاسد بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو بدتدبیروں سے فساد کی آگ بھڑکا دیتے ہیں۔ یہ چاروں شر انسان کی روحانی اور تمدنی زندگی کے لیے خطرناک ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں چاروں شر سے محفوظ رہنے کی دعا سکھائی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم.

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ o مَلِكِ النَّاسِ o اِلٰهِ النَّاسِ o مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ o اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ o مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ o

ترجمہ: میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے انتہا رحم کرنے والا بار بار رحم کرنے والا ہے۔

کہہ میں لوگوں کے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔ لوگوں کے بادشاہ کی۔ لوگوں کے معبود کی پیچھے ہٹ جانے والے کے وسوسہ کی شر سے جو لوگوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے جنوں اور انسانوں میں سے۔

تشریح: یہ سورۃ پہلی سورۃ الفلق کی تکمیل کرتی ہے۔ آغاز سورہ میں اس کی تین صفات رب، ملک اور الہ کا ذکر کیا ہے۔ الہ محبوب حقیقی، انسان کو تلقین کی گئی ہے کہ خناس (شیطان) کے وسوسوں سے بچنے کے لیے اس اللہ کی پناہ میں آؤ جو رب ہے ملک ہے اور الہ ہے خناس یعنی شیطان تین طریقوں سے گمراہ کرتا ہے کہ بندہ اللہ کے علاوہ دوسروں کو اپنا رب یعنی پالن ہار سمجھ لے۔ دوسرا اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو حقیقی حکمران تصور کرے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے تیسرا مادی چیزوں یعنی مال و دولت جاہ وحشمت اور متاع دنیا کو اپنا مطلوب اور محبوب سمجھ لے۔ یہ تینوں باتیں شرک کے اجزاء ہیں جو انسانیت کی توہین اور ذلت کا موجب ہے۔ مسلمانوں کے تنزل کی وجوہ بھی تینوں باتیں ہیں کہ وہ اپنے حقیقی رب مالک اور الہ کو بھول کر جھوٹے رب مالک اور الہ پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔

اسلام کے پہلے رکن کا ذکر تورات میں آتا ہے۔ ''پر ابرہام (ابراہیم) ہنوز خدا کے سامنے کھڑا رہا۔ (پیدائش ۱۸:۲۲) لیکن تورات میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قیام کی حالت میں کن الفاظ سے پکارا۔

رکوع: رکوع کے معنی جھکنا کے ہیں۔ اللہ اکبر کہہ کر نمازی رکوع میں جاتا ہے۔ اس حالت میں نمازی سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم (پاک ہے میرا رب جو بہت بڑا ہے) تین مرتبہ پڑھتا ہے۔

تورات میں ہے۔ ''اور (ابراہیم) زمین تک ان کے آگے جھکا اور بولا اے خداوند'' (پیدائش ۱۸......۲)

قیام بعد از رکوع: نمازی رکوع کی حالت سے قیام کی حالت میں آتا ہے اور دونوں ہاتھ کھلے رہتے ہیں اور سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ (خدا اس کی سنتا ہے جو اس کی تعریف کرتا ہے) کے الفاظ پڑھے جاتے ہیں اور ساتھ ہی رَبَّنَا لَكَ الْحَمْد (اے ہمارے رب سب تعریف تیرے لیے ہے) کے الفاظ کہے جاتے ہیں۔

سجدہ: سجدہ کے معنی ہیں زمین پر پیشانی رکھنا۔ یہ عاجزی کی آخری حد ہے اس کے بعد نمازی اللہ اکبر کہہ کر سجدہ میں گر جاتا ہے اس حالت عاجزی میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی (پاک ہے میرا رب جو بہت بلند ہے کے الفاظ تین بار دہرائے جاتے ہیں یہ ہیت دو دفعہ اختیار کی جاتی ہے۔

مصلّی تکبیر کہہ کر سجدہ سے سر اٹھاتا ہے اور جلسہ کی ہیت میں دو زانو ہو جاتا ہے اس وقت یہ دعا پڑھی جاتی ہے۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَاهْدِنِیْ وَعَافِنِیْ وَارْزُقْنِیْ وَاجْبُرْنِیْ وَارْفَعْنِیْ (ابو داؤد کتاب الصلوۃ باب الدعا بین السجدتین) اے خدا مجھے بخش دے مجھ پر رحم فرما اور میری راہنمائی فرما کر منزل مقصود تک پہنچا دے اور مجھے رزق عطا فرما۔ میرے معاملات درست کر دے اور مجھے بلندی عطا کر۔

تورات میں سجدہ کا ذکر: ''تب لوگوں نے ان کا یقین کیا اور یہ سن کر خداوند نے بنی اسرائیل کی خبر لی اور ان کے دکھوں پر نظر کی انھوں نے اپنے سر جھکا کر سجدہ کیا۔ (خروج ۴:۳۱)

تب ابراہیم نے اپنے جوانوں سے کہا کہ تم یہیں گدھے کے پاس ٹھہرو میں اور یہ لڑکا دونوں ذرا وہاں تک جاتے ہیں اور سجدہ کر کے پھر تمھارے پاس لوٹ آئیں گے۔ (۲۲:۵) زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام خدا سے کہتے ہیں۔

''اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کروں گا۔ (زبور ۵:۷)

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں مصنف مضمون ''الصلوۃ'' کے تحت لکھتا ہے ''اسلامی نماز اپنی ترکیب میں بہت حد تک یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے مشابہ ہے۔'' (جلد ۴ صفحہ ۹۶)

قعدہ اولیٰ: دو رکعتیں ختم ہونے کے بعد نماز پڑھنے والا دو زانو ہو کر بیٹھتا ہے۔ یہ قعدہ اولیٰ کہلاتا ہے اس میں یہ دعا پڑھی جاتی ہے۔

اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلٰوتُ وَالطَّیِّبَاتُ السَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ السَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔

تمام قولی، بدنی اور مالی عبادتیں اللہ ہی کے لیے ہیں اے نبی تجھ پر سلام ہو اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکات ہوں سلام ہو ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

مغرب کی نماز میں تین اور دیگر نمازوں کی چار رکعات کے بعد آخری قعدہ میں تشہد کے بعد درود پڑھا جاتا ہے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

اے خدا! درود بھیج محمد پر اور آل محمد پر جس طرح تو نے درود بھیجا ابراہیم پر اور آل ابراہیم پر بے شک تو تعریف کیا گیا اور بزرگی والا ہے اے اللہ! تو برکت بھیج محمد پر اور آل محمد پر جس طرح تو نے برکت بھیجی ابراہیم پر اور آل ابراہیم پر بے شک تو تعریف کیا گیا ہے اور بزرگی والا ہے۔

اس کے بعد احادیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دعائیں مروی ہیں وہ پڑھی جاتی ہیں ایک دعا یہ ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا کَثِیْراً وَّلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْلِیْ مَغْفِرَۃً مِّنْ عِنْدِکَ وَارْحَمْنِیْ اِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۔

اے اللہ بے شک میں نے اپنی جان پر بہت ظلم کیا اور تیرے سوا کوئی گناہوں کو بخش نہیں سکتا پس مجھے بخش دے اپنی خاص مغفرت سے اور مجھ پر رحم فرما بے شک تو ہی بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس کے بعد دائیں بائیں سلام پھرا جاتا ہے اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ (سلام ہو تم پر اور اللہ کی رحمت) کے الفاظ کہہ نمازی نماز سے باہر آتا ہے۔

نماز وتر میں تیسری رکعت کے بعد یہ دعا پڑھی جاتی ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُکَ وَنَسْتَغْفِرُکَ وَنُوْمِنُ بِکَ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْکَ وَنُثْنِیْ عَلَیْکَ الْخَیْرَ وَنَشْکُرُکَ وَلَا نَکْفُرُکَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ اَللّٰھُمَّ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَلَکَ نُصَلِّیْ وَنَسْجُدُ وَاِلَیْکَ نَسْعٰی وَنَحْفِدُ وَنَرْجُوْ رَحْمَتَکَ وَنَخْشٰی عَذَابَکَ اِنَّ عَذَابَکَ بِالْکُفَّارِ مُلْحِق۔

اے اللہ! ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں اور تیری بخشش چاہتے ہیں اور تجھ پر ایمان لاتے ہیں اور تجھ پر توکل کرتے ہیں اور تیری تعریف کرتے ہیں اور تیرا شکر کرتے ہیں اور تیری ناشکری نہیں کرتے ہم علیحدہ ہو جاتے ہیں اور چھوڑ دیتے ہیں اس کو جو تیری نافرمانی کرتا ہے اے اللہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تیری ہی نماز پڑھتے ہیں اور تیرے آگے سجدہ کرتے ہیں اور تیری طرف دوڑتے ہیں اور تیری خدمت میں حاضر رہتے ہیں اور ہم تیری رحمت کے امیدوار ہیں اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں بے شک تیرا عذاب کفار کو پہنچنے والا ہے۔

سجدہ سہو: اگر نمازی غلطی کر جائے تو نماز کے اختتام پر تسلیم سے پہلے سجدہ سہو کرنا ضروری ہے۔ سجدہ سہو دو سجدوں پر مشتمل ہے۔ اگر امام سے غلطی سرزد ہو جائے تو وہ بھی مقتدیوں کے ساتھ سجدہ سہو کرے۔

قرآنی اور کتب سابقہ کی ادعیہ کا جائزہ: تمام کتب ساوی میں ادعیہ سکھائی گئی ہیں تورات کی دعا یہ ہے ”خداوند خداوند خدائے رحیم اور مہربان، قہر کرنے میں دھیما اور شفقت اور وفا میں غنی، ہزاروں پر فضل کرنے والا، گناہ اور تقصیر اور خطا کار کا بخشنے والا لیکن وہ مجرم کو ہرگز بری نہیں کرے گا بلکہ باپ دادا کے گناہوں کی سزا ان کے بیٹوں اور پوتوں کو تیسری اور چوتھی پشت تک دیتا ہے۔ (خروج ۳۴: ۶۔۷)

زبور کی دعا: ”اے خداوند اپنا کان جھکا مجھے جواب دے کیونکہ میں مسکین اور محتاج ہوں میری جان کی حفاظت کر کیونکہ میں دین دار ہوں۔ اے میرے خدا، اپنے بندے کو جس کا توکل تجھ پر ہے بچا لے۔ یارب مجھ پر رحم کر کیونکہ میں دن بھر تجھ سے فریاد کرتا ہوں۔ یارب اپنے بندے کی جان کو شاد کر دے کیونکہ میں اپنی جان تیری طرف اٹھاتا ہوں۔ اس لیے کہ تو یارب نیک اور صاف کرنے کو تیار ہے اور اپنے سب دعا کرنے والوں پر شفقت میں غنی ہے۔

اے خداوند میری دعا پر کان لگا اور میری منت کی آواز پر توجہ فرما میں اپنی مصیبت کے دن تجھ سے دعا کروں گا کیونکہ تو مجھے جواب دے گا۔ یارب معبودوں میں تجھ سے کوئی نہیں اور تیری صفتیں بے مثال ہیں۔ یارب سب قومیں جن کو تو نے بنایا آ کر تیرے حضور سجدہ کریں گی اور تیرے نام کی تمجید کریں گی کیونکہ تو بزرگ ہے اور عجیب وغریب کام کرتا ہے تو ہی واحد خدا ہے۔

اے خداوند مجھ کو اپنی راہ کی تعلیم دے میں تیرے راستہ میں چلوں گا میرے دل کو یک سوئی بخش تاکہ تیرے نام کا خوف مانوں، یارب میرے خدا، میں پورے دل سے تیری تعریف کروں گا میں ابد تک تیرے نام کی تمجید کروں گا کیونکہ مجھ پر تیری بڑی شفقت ہے اور تو نے میری جان کو پاتال کی تہ سے نکالا

ہے۔ اے خدا، مغرور میرے خلاف اٹھے اور تندخو جماعت میری جان کے پیچھے پڑی ہے اور انھوں نے تجھے اپنے سامنے نہیں رکھا لیکن تو یارب رحیم و کریم خدا ہے۔ قہر کرنے میں دھیما اور شفقت و راستی میں غنی میری طرف متوجہ ہو اور مجھ پر رحم کر۔ اپنے بندے کو اپنی قوت بخش اور اپنی لونڈی کے بیٹے کو بچا لے مجھے بھلائی کا کوئی نشان دکھا تا کہ مجھ سے عداوت رکھنے والے اسے دیکھ کر شرمندہ ہوں کیونکہ تو نے اے خداوند میری مدد کی اور مجھے تسلی دی۔ (۸۶:۱......۱۷)

انجیل کی دعا: ''اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور جس طرح ہم نے اپنے قرض داروں کو معاف کیا ہے تو بھی ہمارے قرض ہمیں معاف کر اور ہمیں آزمائش میں نہ لا بلکہ برائی سے بچا کیونکہ بادشاہت اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیرے ہی ہیں آمین۔ (متی ۶:۹......۱۳)

تقابلی جائزہ: جب مذکورہ ادعیہ اور سورہ فاتحہ کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے۔ سابقہ کتب کی ادعیہ صرف گناہوں کی مغفرت پر زور دیتی ہیں۔ عیسائیوں کی دعا میں روٹی کی بھی التجا ہے۔ جبکہ سورہ فاتحہ میں صراط مستقیم پر گامزن ہونے کی۔ یہ ایک مسلمہ قاعدہ ہے کہ صراط مستقیم ہی انسان کو منزل مقصود تک پہنچاتا ہے۔ انسان کی منزل مقصود کیا ہے اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بننا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً اللہ کا رنگ اختیار کرو اللہ کے رنگ سے بہتر کیا چیز ہو سکتی۔ اللہ کا رنگ اختیار کرنے کا مطلب اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنانا ہے۔ جب ایک انسان خدا کے رنگ میں رنگ جاتا ہے تو وہ گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے اور گناہ اس سے سرزد نہیں تھے۔

عبادات الٰہیہ کے حصے: نماز کے دو حصے ہیں۔ فرض، سنت، جو حصہ باجماعت ادا کیا جاتا ہے وہ فرض کہلاتا ہے جو انفرادی طور پر ادا کیا جاتا ہے۔

فرض اور سنتوں کی تعداد حسب ذیل ہے۔

نماز فجر: دو رکعات سنت اور دو رکعات فرض۔

نماز ظہر: چار رکعات سنت اور چار رکعات فرض پھر دو رکعات سنت۔

نماز عصر: چار رکعت فرض۔

نماز مغرب: تین رکعت فرض۔ دو رکعت سنت۔

نماز عشاء: چار رکعت فرض۔ دو رکعت سنت اور تین وتر۔

وتر عشاء کی نماز کے ساتھ بھی پڑھے جا سکتے ہیں اور نماز تہجد کے ساتھ بھی اور نماز تہجد آٹھ نفلوں اور تین وتروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ آٹھ نفل دو دو کر کے چار دفعہ پڑھنے چاہئیں۔

فرض نماز باجماعت ادا کرنے کی تلقین: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی سنت سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے باجماعت نماز ادا کی۔ پھر باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے معبد بھی تعمیر کیے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کو دو حصوں میں بانٹ دیا ایک وہ حصہ جو باجماعت ادا کیا جاتا ہے اس کو فرض قرار دیا دوسرا حصہ سنت اور نفل جو انفرادی طور پر ادا کیا جاتا ہے۔ دونوں حصے اپنے اندر حکمتیں رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے جب ہجرت فرما کر مدینہ گئے۔ مدینہ میں جانے سے پہلے قباء میں قیام کیا اور سب سے پہلے مسجد تعمیر کی۔ جب مدینہ میں آئے تو بھی مسجد کی تعمیر کا کام سب سے پہلے سرانجام دیا۔ اس سے باجماعت نماز ادا کرنے کی شدت معلوم ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید اور احادیث نے باجماعت نماز ادا کرنے پر بہت زور دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (البقرہ ۲:۴۳) اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور جھکنے والوں کے ساتھ جھکو۔

قرآن مجید میں جہاں نماز کا حکم دیا ہے اس کے ساتھ لفظ اقامت استعمال رکھا ہے اور اقامت کے لفظ میں باجماعت نماز ادا کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے پھر صریح طور پر حکم دیا ہے۔ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ یعنی نماز پڑھنے والوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کریں۔ سورۃ فاتحہ میں آتا ہے۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے مدد طلب کرتے ہیں۔ یہاں جمع کا صیغہ لا کر باجماعت ادا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

نماز باجماعت یہاں تک ضروری قرار دی ہے کہ مسلمان میدان جنگ میں بھی ہوں۔ تو واقعے کی مناسبت سے نماز باجماعت پڑھنے کا حکم ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ واذا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ (النساء ۴:۱۰۲) اور جب تو ان کے درمیان ہو پھر ان کے لیے نماز قائم کرے تو چاہیے کہ ان میں ایک گروہ تیرے ساتھ کھڑا ہو اور چاہیے کہ وہ اپنے ہتھیار اپنے ساتھ لے رکھیں۔ پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو وہ تمہارے پیچھے ہو جائیں اور چاہیے کہ ایک دوسرا گروہ جنھوں نے نماز نہیں پڑھی آئے پھر وہ تیرے ساتھ نماز ادا کریں اور وہ اپنا بچاؤ اور اپنے ہتھیار پکڑے رکھیں۔

اہمیت از روئے حدیث: احادیث میں بھی نماز باجماعت کی سخت ترین تاکید پائی جاتی ہے۔

عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَالَّذِیْ نَفْسِی بِيَدِهٖ لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ اٰمُرَ بِحَطَبٍ لِيُحْطَبَ ثُمَّ اٰمُرَ بِالصَّلٰوةِ فَيُؤَذَّنُ لَهَا ثُمَّ اٰمُرَ رَجُلًا فَيَؤُمَّ النَّاسَ ثُمَّ اُخَالِفَ اِلٰى رِجَالٍ فَاُحَرِّقَ عَلَيْهِمْ بُيُوْتَهُمْ (بخاری ۲۹:۱۰) حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں نے ارادہ کیا کہ حکم دوں کہ لکڑیاں لائی جائیں پھر نماز کا حکم دوں کہ اس کے لیے اذان دی جائے پھر کسی شخص کو حکم دوں کہ وہ لوگوں کی امامت کرے اور میں لوگوں کی طرف جاؤں۔ (جو باجماعت نماز ادا کرنے نہیں آئے) ان کے گھروں کو ان پر جلا دوں۔ فرمایا۔ عَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ ثَلَاثَةٍ فِی قَرْيَةٍ وَّلَا بَدْوٍ لَا تُقَامُ فِيْهِمُ الصَّلٰوةُ اِلَّا قَدِ اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَعَلَيْكَ بِالْجَمَاعَةِ فَاِنَّمَا يَاْكُلُ الذِّئْبُ الْقَاصِيَةَ (مشکوٰۃ ۲۳:۴ بروایت ابوداؤد)

ابودرداء سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی بستی میں یا جنگل میں تین شخص ہوں اور وہاں جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھی جائے تو ان پر شیطان غالب ہوتا ہے۔ پس جماعت کو اپنے اوپر لازم کرلو۔ بھیڑیا صرف اسی بکری کو کھاتا ہے جو ریوڑ سے دور ہو۔ فرمایا۔

عَنْ مَالِكٍ قَالَ اَتٰى رَجُلَانِ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُرِيْدُ انِ السَّفَرَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَنْتُمَا خَرَجْتُمَا فَاَذِّنَا ثُمَّ اَقِيْمَاثُمَّ لِيَؤُمَّكُمَا اَكْبَرُ كُمَا (بخاری ۱۸:۱۰) مالک سے روایت ہے کہ دو آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے جو سفر کا ارادہ رکھتے تھے۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم دونوں نکلو تو اذان دو پھر اقامت کہو۔ پھر تم میں سے بڑا تمہاری امامت کرائے۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ صَلٰوةُ الْجَمَاعَةِ تَفْضُلُ صَلٰوةَ الْفَذِّ بِسَبْعٍ وَّعِشْرِيْنَ دَرَجَةً (بخاری ۳۰:۱۰) ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز باجماعت اکیلے کی نماز پر ستائیس درجے فضیلت رکھتی ہے۔ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ فَاِنَّ تَسْوِيَةَ الصُّفُوْفِ مِنْ اَقَامَةِ الصَّلٰوةِ (بخاری ۷۴:۱۰) انس سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنی صفوں کو درست کرو کیونکہ صفوں کو درست کرنا نماز کے قائم کرنے سے ہے۔

عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهِ وَسَلَّم قَالَ لَوْيَعْلَمُ النَّاسُ مَا فِی النِّدَآءِ وَالصَّفِّ الْاَوَّلِ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا يَسْتَهِمُوْا عَلَيْهِ لَا اسْتَهَمُوْا (بخاری ۹:۱۰) ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اگر لوگ جانتے کہ اذان اور صف اول میں کیا اجر ہے تو پھر اس کے قرعہ اندازی کرنے کے سوا کوئی وجہ ترجیح نہ پاتے۔

اوقات نماز: اسلام نے نماز کے اوقات مقرر کر دیے ہیں اگر کوئی مجبوری نہیں تو انہی اوقات میں نماز ادا کرنا لازمی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا (النساء ۱۰۳:۴) نماز مومنوں پر مقررہ اوقات پر فرض کی گئی ہے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ (ہود ۱۱۴:۱۱) اور دن کے دونوں حصوں میں اور پہلی رات نماز کو ادا کرو کیونکہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں یہ نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے نصیحت ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (بنی اسرائیل ۷۸:۱۷) سورج کے ڈھلنے سے شروع کر کے رات کے اندھیرے تک نماز کو قائم رکھ اور صبح کو قرآن کی تلاوت کا بھی خاص اہتمام کیجئے۔ بے شک بوقت صبح تلاوت قرآن سے حضور قلب میسر ہوتا ہے اور رات کے کچھ حصے میں اس قرآن کے ساتھ جاگتا رہ یہ تیرے لیے نفل کے طور پر ہے امید ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود (بڑی تعریف کا مقام) پر کھڑا کرے۔

اوقات نماز کے متعلق وحی الٰہی کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے خود فرمائی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَمَّنِی جِبْرَئِيْلُ عِنْدَ الْبَيْتِ مَرَّتَيْنِ فَصَلّٰى بِیَ الظُّهْرَ حِيْنَ زَالَتِ الشَّمْسُ وَكَانَتْ قَدْرَ الشِّرَاكِ وَصَلّٰى بِیَ الْعَصْرَ حِيْنَ صَارَ ظِلُّ كُلِّ شَیْءٍ مِّثْلَهٗ وَصَلّٰى بِیَ الْمَغْرِبَ حِيْنَ اَفْطَرَ الصَّائِمُ وَصَلّٰى بِیَ الْعِشَآءَ حِيْنَ غَابَ الشَّفَقُ وَصَلّٰى بِیَ الْفَجْرَ حِيْنَ حَرُمَ الطَّعَامُ وَالشَّرَابُ عَلَى الصَّائِمِ فَلَمَّا كَانَ الْغَدُ صَلّٰى بِیَ الظُّهْرَ حِيْنَ كَانَ ظِلُّهٗ مِثْلَهٗ وَصَلّٰى بِیَ الْعَصْرَ حِيْنَ كَانَ ظِلُّهٗ مِثْلَيْهِ. وَصَلّٰى بِیَ الْمَغْرِبَ حِيْنَ اَفْطَرَ الصَّائِمُ وَصَلّٰى بِیَ الْعِشَآءَ اِلٰى ثُلُثِ الَّيْلِ وَصَلّٰى بِیَ الْفَجْرَ فَاَسْفَرَ ثُمَّ الْتَفَتَ اِلَیَّ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ هٰذَا وَقْتُ الْاَنْبِيَآءِ مِنْ قَبْلِكَ وَالْوَقْتُ مَابَيْنَ هٰذَيْنِ الْوَقْتَيْنِ (مشکوٰۃ ۱:۴ بروایت ابوداؤد، ترمذی)

جبرئیل نے دو دفعہ خانہ کعبہ کے پاس میری امامت کی۔ مجھے ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جبکہ سورج ڈھل چکا تھا اور سایہ تسمہ کے برابر تھا اور مجھ کو عصر کی نماز پڑھائی جبکہ ہر چیز کا سایہ اس کی مانند ہو چکا تھا اور مغرب کی نماز اس وقت پڑھائی جب روزہ دار روزہ کھولے اور عشاء کی نماز اس وقت پڑھائی جب

ہر چیز کا اس کی مثل ہو چکا تھا اور عصر کی اس وقت پڑھائی جب سایہ ہر چیز کا سایہ کا دوچند ہو چکا تھا اور مغرب کی اس وقت جب روزہ دار روزہ افطار کرتا ہے اور عشاء کی نماز تہائی رات گزرے پڑھائی اور فجر کی نماز اس وقت پڑھائی جب روشنی ہوئی۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئے پس کہا اے محمد یہ ان انبیاء کا وقت ہے جو تجھ سے پہلے تھے اور ہر نماز کا وقت ان وقتوں کے درمیان ہے۔

سرخی غائب ہوئی اور فجر کی اس وقت پڑھائی جب روزے دار پر کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے پھر جب دوسرا دن ہوا تو ظہر کی نماز مجھ کو اس وقت پڑھائی جب سایہ

اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ پہلے انبیاء علیہم السلام کے اوقات نماز کی ہی تجدید ہوئی ہے کہ ظہر کا ابتدائی وقت زوال آفتاب کے بعد شروع ہوتا ہے اور آخری وقت وہ ہے جب ایک چیز کا سایہ اس کے برابر ہو جائے اور یہی نماز عصر کا وقت ہے اور اس کا آخری وقت سایہ کے دومثل ہونے تک ہے۔ مغرب کا وقت سورج کا غروب ہو جانا جب تک مغرب کی سرخی غائب نہ ہو جائے اس کا وقت رہتا ہے۔ نماز عشاء کا وقت جب مغرب کی سرخی غائب ہو جائے اور اس کا وقت نصف شب تک رہتا ہے۔

ممنوعہ اوقات نماز: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اوقات نماز کی تفصیل بیان فرمائی ہے وہاں آپ نے ممنوعہ نماز بھی بیان کر دیے ہیں۔ وہ تین ہیں (۱) جب سورج نکل رہا ہو۔ (۲) نصف النہار (۳) جب سورج غروب ہو رہا ہو۔ فرمایا لَا تَحَرَّوْا بِصَلَاتِكُمْ طُلُوعَ الشَّمْسِ وَلَا غُرُوبَهَا (بخاری ۹:۳۰) کہ اپنی نماز میں تم طلوع آفتاب اور اس کے غروب کا قصد نہ کرو۔ یہ اوقات سورج پرستوں کے تھے اس لیے منع فرمایا تا کہ ان کے ساتھ مشابہت نہ ہو۔

نمازوں کا جمع کرنا: حالت سفر میں ظہر اور عصر کی نمازیں جمع کی جا سکتی ہیں اور اسی طرح مغرب اور عشاء جمع کی جا سکتی ہیں (بخاری ابواب ۱۸ تقصیر الصلوٰۃ باب ۱۳ الجمع فی السفر) سفر کے علاوہ بارش کی حالت میں یہ نمازیں جمع کی جا سکتی ہیں۔ مسلم کی ایک حدیث کی رو سے ایسی حالت میں بھی نمازیں جمع کی جا سکتی ہیں جب نہ بارش ہو اور نہ سفر۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَمَعَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ وَالْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ بِالْمَدِينَةِ فِي غَيْرِ خَوْفٍ وَلَا مَطَرٍ وَفِي حَدِيثِ وَكِيعٍ قَالَ قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ لِمَ فَعَلَ ذَالِكَ قَالَ كَيْلَا يَحْرُجَ اُمَّتَهُ (مسلم کتاب الصلوٰۃ باب جواز الجمع الخ) ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر اور عصر اور مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کیں اور جب کہ اس وقت نہ تو کوئی خوف تھا اور نہ بارش اور جب ابن عباس سے اس کے متعلق پوچھا گیا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اس لیے کہ آپ کی امت مشکل میں نہ پڑے۔

آپ نے یہ نمازیں مدینہ میں پڑھی تھیں۔

نماز قصر: قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ (النساء ۴:۱۰۱) اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نماز کو کم لو۔

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْكُمْ فَاقْبَلُوا صَدَقَتَهُ (صحیح بخاری ومسلم) یہ تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خیرات ہے تم اس خیرات کو قبول کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق چار رکعت والی نمازیں دو رکعت پڑھی جائیں گی دو اور تین رکعت والی نمازوں میں کوئی قصر نہیں چنانچہ فجر اور مغرب کی نمازیں ویسے ہی پڑھی جائیں گی۔ تمام نمازوں کی سنتیں ساقط ہو جاتی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قصر کی کوئی مسافت متعین نہیں فرمائی۔

روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے اڑتالیس میل کے سفر پر نماز قصر کی جبکہ صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۴۳ میں ہے۔ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ إِذَا خَرَجَ مَسِيْرَةَ ثَلَاثَةِ الْمِيَالِ أَوْ ثَلَاثَةِ فَرَاسِخَ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تین میل یا نو میل کے سفر پر نکلتے تو دو رکعت پڑھتے۔

اس وجہ سے فقہاء کرام میں مسافت کے تعین پر اختلاف ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مسعود میں سفر کی نوعیت اور تھی جبکہ دور حاضر میں سفر کی نوعیت بالکل ہی بدل گئی ہے قصر کا حکم امت کو محض تنگی سے بچانے کے لیے ہے۔ لہٰذا دور حاضر میں سفر کی مسافت وہی مسافت شمار کی جائے گی جو باعث تنگی ہے اور اس سفر میں ہی نماز قصر ہوگی۔

اوقات نماز میں حکمت: اگر کسی کام کے لیے وقت کا تعین نہ کیا جائے۔ تو اس کام کے انجام دینے میں کوتاہی اور کسل برتا جاتا ہے۔ اس لیے فطرت انسانی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ کام سرانجام دینے کے لیے وقت مقرر کیا جائے۔ دوم پابندی اوقات میں ایک قدرتی تاثیر ہے کہ وقت معینہ آنے پر انسانی قلب بے اختیار اس فریضہ کو ادا کرنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور روحانی قویٰ میں ذکر الٰہی کا ذوق وشوق بیدار ہو جاتا ہے جونہی اذان کی آواز کان میں پڑتی ہے تو مسلمان کام کاج چھوڑ کر مسجد کی طرف چل دیتا ہے۔

سابقہ انبیاء علیہم السلام کی نماز کی تجدید و تکمیل: کتب سابقہ اور تاریخ اس بات کی شاہد ہیں کہ تمام امتیں نماز گزار ہیں لیکن یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ وہ اپنی اپنی نمازوں کی ہیت اور ضبط اوقات بھول چکی ہیں۔ امتوں کے مجتہدین اور قسیسین کی مجلسیں منعقد ہوئیں تا کہ نماز کی ہیت اور اوقات مقرر کریں۔ اس طرح مجتہدین نے عجیب وغریب طریقے نکالے۔ جن کا تعلق ان کے نبی کے طریقہ نماز سے نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت کے مطابق عرب میں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین بنا کر بھیجا تا کہ پہلے انبیاء علیہم السلام کی ناقص اور ادھوری تعلیم مکمل کرے۔ سو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی ہدایت کے تحت نظام نماز کو ازسرِنو منضبط کیا اور آج تک امت مسلمہ میں وہی طریقہ نماز رائج ہے جو آج سے چودہ سو سال قبل ایک امی رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو سکھایا۔ اگر یہ کہا جائے کہ آپؐ نے پہلے انبیاء علیہم السلام کے طریقہ عبادت کو رائج کیا ہے تو غلط نہ ہوگا۔

نوافل: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے الہٰی ہدایت کے مطابق نماز کو دو حصوں میں منقسم کیا۔ ایک فرض دوسرا نفل، فرض نماز کے لیے ہر مسلمان مکلف ٹھہرایا ہے اور نفلی نماز کے متعلق فرمایا۔ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْراً فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ (البقرہ ۲:۱۵۸) اور جو شخص شوق سے نیکی (عبادت) کرتا ہے تو اللہ بڑا قدر دان جاننے والا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ بھی یہی ہے کہ آپ نے فرض نماز کے ساتھ نوافل بھی ادا کیے اور اس کی تاکید بھی فرمائی اور صحابہ کرام اس پر عامل رہے۔ نفل نماز ایک تو فرض نماز کے ساتھ ادا کی جاتی مثلاً جب نمازی وضو کر کے مسجد میں داخل ہو تو وہ دو نفل نماز ادا کرے اس نفلی نماز کو تحیۃ الوضو کہا جاتا ہے۔ اسی طرح سوائے فجر کی نماز کے ہر فرض نماز کے دو نفل ادا کیے جاتے ہیں۔ چاشت کے وقت دو رکعت نماز بطور نفل ادا کرنا بھی سنت نبوی ہے۔ لیکن جن نوافل کا ذکر قرآن مجید میں ہے وہ صرف تہجد ہے ارشاد الٰہی ہے۔ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْداً (بنی اسرائیل ۱۷:۷۹) اور رات کے کچھ حصے میں اس کے ساتھ جاگتا رہ یہ تیرے لیے نفل کے طور پر ہے امید ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود (بڑی تعریف کا مقام) پر کھڑا کرے۔

يٰاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلاً نِّصْفَهٗ اَوِانْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلاً اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلاً (المزمل ۷۳:۱......۴) اے اوڑھنے والے! رات کو قیام کر سوائے تھوڑے حصہ کے یعنی اس کا آدھا یا اس سے کچھ کم کر یا اس سے بڑھا اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلاً (۷۳:۶) بے شک رات کا اٹھنا قیام میں مضبوط تر اور قول میں درست ہے۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے۔ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّ اِحْدٰى عَشْرَةَ رَكْعَةً كَانَتْ تِلْكَ صَلٰوتَهٗ تَعْنِي بِاللَّيْلِ فَيَسْجُدُ السَّجْدَةَ مِنْ ذٰلِكَ قَدْرَ مَايَقْرَاُ اَحَدُكُمْ خَمْسِيْنَ اٰيَةً قَبْلَ اَنْ يَّرْفَعَ رَاْسَهٗ يَرْكَعُ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلٰوةِ الْفَجْرِ ثُمَّ يَضْطَجِعُ عَلٰى شِقِّهِ الْاَيْمَنِ حَتّٰى يَاْتِيَهُ الْمُؤَذِّنُ لِلصَّلٰوةِ (بخاری ۱:۱۴) کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم گیارہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے یہ آپ کی نماز تھی یعنی رات کی نماز تو اس میں اتنی دیر تک سجدہ کرتے۔ جتنی دیر میں تم میں سے کوئی پچاس آیتیں پڑھے اس سے پہلے کہ اپنا سر اٹھائیں (اس کے بعد) دو رکعتیں صبح کی نماز سے پہلے بڑھتے پھر اپنی دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے یہاں تک کہ موذن نماز کے لیے بلانے کو آیا۔

عَنْ مَسْرُوْقٍ قَالَ سَاَلْتُ عَائِشَةَ عَنْ صَلٰوةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاللَّيْلِ فَقَالَتْ سَبْعٌ وَّ تِسْعٌ وَاِحْدٰى عَشْرَةَ سِوٰى رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ مسروق سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز کے بارہ میں دریافت کیا تو کہا صبح کی دو رکعتوں کے علاوہ سات اور نو اور گیارہ تھیں۔

رات کے پچھلے حصہ میں اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تنہائی گھڑیوں میں بندے کی دعاؤں کو سنتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ يَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَتَعَالٰى كُلَّ لَيْلَةٍ اِلَى السَّمَآءِ الدُّنْيَا حِيْنَ يَبْقٰى ثُلُثُ الَّيْلِ الْاٰخِرُ يَقُوْلُ مَنْ يَّدْعُوْنِي فَاَسْتَجِيْبَ لَهٗ مَنْ يَّسْاَلُنِي فَاُعْطِيَهٗ مَنْ يَّسْتَغْفِرُنِي فَاَغْفِرَلَهٗ (بخاری ۱۹:۱۴) ہمارا رب برکتوں والا اور بلند ہر رات کو قریب کے آسمان کی طرف نزول فرماتا ہے جب رات کی آخری تہائی رہ جاتی ہے فرماتا ہے کہ کون مجھ سے دعا مانگتا ہے کہ میں اسے قبول کروں کون مجھ سے سوال کرتا ہے کہ میں اسے دوں، کون مجھ سے بخشش مانگتا ہے کہ میں اسے بخشوں۔

حکمت نماز تہجد: سورۃ مزمل کی آیت ۶ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلاً میں نماز تہجد کی دو وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ قوت عمل کی مضبوطی اور کلام میں قوت تاثیر کا زیادہ ہونا۔ یہی دو امور تبلیغ کے لیے ضروری ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود تہجد ایک اختیاری نماز کے، اپنے اوپر لازمی قرار دے لی تھی۔ اسی طرح صحابہ کرام نے بھی۔ اگر باریک بینی سے غور کیا جائے تو مسلمانوں کی ترقی کا راز اسی اصلاح نفس کرنے والی نماز تہجد میں مضمر ہے جو قوم رات کو اپنے خالق حقیقی کے سامنے اپنی کوتاہیوں کی بخشش

کے لیے دعائیں مانگتی ہو اور دن کو خدا کی ہدایت کے مطابق اپنے دنیاوی کاموں میں مشغول رہتی ہے۔ اس قوم سے دنیا کی کوئی طاقت مقابلہ نہیں کر سکتی نماز تراویح بھی نماز تہجد میں شامل ہے اس کا ذکر روزے کے باب میں آئے گا۔

نماز جمعہ: نماز جمعہ کی فرضیت کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ (الجمعۃ ۶۲:۹) اے ایمان والو جب جمعہ کے دن نماز کے لیے بلایا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف جلدی آ جاؤ اور کاروبار کو چھوڑ دو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مَنْ تَرَكَ ثَلٰثَ جُمَعٍ تَهَاوُنًا بِهَا طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قَلْبِهٖ (مشکوۃ ۴:۴۳ بروایت ابوداؤد) جو شخص تین جمعوں کو سستی کی وجہ سے ترک کرے اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دے گا۔

فرمایا۔ اَلْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ فِي الْجَمَاعَةِ اِلَّا اَرْبَعَةً عَبْدٌ مَمْلُوْكٌ اَوِامْرَاَةٌ اَوْ صَبِيٌّ اَوْ مَرِيْضٌ (سنن ابی داؤد حدیث مرسل) جمعہ جماعت کے ساتھ ہر مسلمان پر حق اور واجب ہے۔ البتہ چار قسم کے لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں مملوک غلام عورت بچہ اور بیمار۔

جمعہ کے دن یہ نماز نماز ظہر کا بدل ہے۔ پہلے موذن اذان دے پھر امام منبر پر کھڑے ہو کر نصیحت کے لیے دو خطبے دے، پہلے خطبہ کے بعد دوسرا خطبہ شروع کرنے سے قبل امام چند لمحوں کے لیے بیٹھے۔ جب دوسرا خطبہ ختم ہو جائے تو امام منبر سے نیچے اتر آئے تو موذن اقامت کہے اور امام لوگوں کو دو رکعت نماز بالجہر پڑھائے۔

جمعہ کے لیے شہر ہونا ضروری نہیں جیسا کہ عام خیال کر لیا گیا تھا۔ پہلا جمعہ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کے جمعہ کے بعد پڑھا گیا عبدالقیس کی مسجد میں تھا۔ وہ بحرین میں جواثی نامی گاؤں میں تھی۔ (بخاری ۱۱:۱۱)

نماز عیدین: اسلام میں دو بڑے تہوار ہیں جو عید کہلاتے ہیں۔ ایک ماہ رمضان کے بعد یعنی یکم شوال کو اور دوسرا مناسک حج ادا کرنے کے بعد یعنی ۱۰ ذی الحجہ کو دونوں عیدیں چاند کے حساب سے ہوتی ہیں رمضان کے بعد والی عید عیدالفطر کہلاتی ہے اور حج کے بعد والی عید الاضحیٰ کہلاتی ہے۔ ان تہواروں پر مسلمانوں پر لازم ہے کہ طلوع آفتاب کے بعد زوال سے پہلے اجتماعی نماز کا اہتمام کریں۔ عیدین دو رکعتوں پر مشتمل ہیں۔ دو رکعتوں میں قرأت بالجہر ہوگی۔ ان نمازوں میں زائد تکبیریں کہی جاتی ہیں۔ ثقہ احادیث کے مطابق زائد تکبیروں کی تعداد سورہ فاتحہ سے پہلے سات تکبیریں پہلی رکعت میں اور پانچ تکبیریں دوسری رکعت میں کہی جاتی ہیں۔ (ترمذی ابواب العیدین باب فی التکبیر الخ) اس بارہ میں اختلاف بھی ہے بعض ائمہ کہتے ہیں کہ چار تکبیریں پہلی رکعت میں ہیں اور تین دوسری رکعت میں موخرالذکر رکوع جانے سے پہلے۔ یہ ثقہ نہیں۔ (زاد المعاد لابن قیم نمبر ۱ ص ۱۲۴)

نماز کے بعد امام حاضرین کو وعظ و نصیحت خصوصاً صدقہ و خیرات اور قربانی کے لیے دو خطبے دے گا پہلے خطبے کے بعد اور دوسرا خطبہ شروع کرنے سے قبل امام چند لمحوں کے لیے بیٹھے گا۔

عیدین میں نہ اذان ہے اور نہ اقامت۔

نماز جنازہ: ''جنازہ'' جیم بکسرہ اور جیم بالفتح پڑھا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہیں مردہ لاش جو تابوت میں رکھی ہو۔ یہ لفظ جنز سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں اس نے چھپایا۔ بعض کے نزدیک جنازہ (جیم بکسر) کے معنی ہیں تابوت اور جنازہ (جیم بالفتح) کے معنی ہیں مردہ لاش یا اس کے برعکس معنی ہیں (لینز عربیک لکسی کان)

غسل میت: مسلمان نابالغ ہو یا بالغ جب فوت ہو جائے تو اسے غسل دینا ضروری ہے۔ سوائے اس شخص کے جو میدان جنگ میں شہید ہو۔ آپ کا فرمان ہے۔ لَا تُغَسِّلُوْهُمْ (مسند احمد) ان کو غسل نہ دو غسل کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے جو اعضا وضو میں دھوئے جاتے ہیں انھیں پہلے صاف کیا جاتا ہے پھر سارے جسم کو غسل دیا جاتا ہے۔ (بخاری کتاب الجنائز باب غسل المیت و وضوئه) پانی میں ایسی چیز ڈال لینی چاہیے جس سے میت کے جسم کی کثافتیں دور ہو جائیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پانی میں بیری کے پتے ڈالے جاتے تھے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم) دور حاضر میں کثافتوں اور غلاظتوں کو دور کرنے کے لیے بہترین صابون ہیں ان کا استعمال کیا جائے۔ حدیث نبوی سے یہ ظاہر ہے کہ میت کو غسل وتر (طاق) تین پانچ یا سات دفعہ دینا چاہیے۔ (بخاری باب ما یستحب ان یغسل وتیرا) یہ تعداد میت کی کثافتوں کو دور کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔ چونکہ طاق عدد اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے اس لیے اس کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ آخر میں کافور بھی ڈال لیا جائے تو بہتر ہے۔

اگر میت کو غسل دینا ممکن نہ ہو تو اسے تیمم کرانا چاہیے ابوداؤد میں ایک مرسل حدیث ہے ''جب کوئی عورت فوت ہو جائے مردوں کے سوا اس کے ساتھ کوئی عورت نہ ہو، یا مرد عورتوں کے ساتھ تھا فوت ہو جائے اور کوئی مرد نہ ہو۔ تو اس صورت میں ان کو تیمم کرا کر دفن کر دیا جائے اور یہ دونوں اس شخص کے حکم میں ہیں جس کے پاس پانی موجود نہیں ہے۔ (البیہقی)

غسل کے بعد میت کو کفن پہنایا جائے مرد ہے تو تین چادریں اور عورت ہے تو پانچ چادریں جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یمن کے تین سوتی سفید بُنے دھوئے ہوئے کپڑوں میں کفنایا گیا۔ (بخاری ۲۳:۱۸)

نماز جنازہ: نماز جنازہ میں حصہ لینا ہر ایک مسلمان کے ذمہ دوسرے مسلمان کے ذمہ فرض قرار دیا گیا ہے۔فقہاء نے نماز جنازہ کو فرض کفایہ قرار دیا ہے۔نماز جنازہ کے لیے بھی وضو کرنا لازمی ہے نماز پڑھتے ہوئے جنازہ کو سامنے رکھا جاتا ہے۔امام جنازہ کے درمیان میں قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہوتا ہے۔عموماً یہ دستور ہے کہ کم از کم تین صفیں بنائی جاتی ہیں۔لیکن امام بخاری کی رائے کے مطابق دو یا تین یا اس سے زیادہ صفیں بنائی جاسکتی ہیں۔(بخاری کتاب الجنائز باب من صف صفین او ثلثة علی الجنازة الخ) اگر تعداد کم ہو تو ایک ہی صف باندھی جاسکتی ہے۔

نماز جنازہ کی چار تکبیرات ہیں: پہلی تکبیر کے بعد سورة فاتحہ یا حمد وثنا پڑھی جاتی ہے دوسری تکبیر کے بعد درود ابراہیمی پڑھا جاتا ہے۔تیسری تکبیر میں دعا جنازہ پڑھی جاتی ہے وہ یہ ہے اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَمَیِّتِنَا وَشَاھِدِنا وغَائِبِنَا وَصَغِیْرِنَا وَکَبِیْرِنَا وَذَکَرِنَا وَاُنْثٰنَا اَللّٰھُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَهٗ مِنَّا فَاَحْیِهٖ عَلَی الْاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّیْتَهٗ مِنَّا فَتَوَفَّهٗ عَلَی الْاِیْمَانِ اَللّٰھُمَّ لَا تُحْرِمْنَا اَجْرَهٗ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَه. (مشکوٰۃ ۵:۵ بروایت ابوداؤد)

اے اللہ! ہمارے مردوں کی، حاضروں کی اور غائبوں کی چھوٹوں کی اور بڑوں کی مردوں کی اور عورتوں کی سب کی مغفرت فرما۔اے اللہ جس کو تو ہم میں سے زندہ رکھے اس کو اسلام پر زندہ رکھ اور جس کو تو وفات دے تو اس کو ایمان کی حالت میں وفات دے۔اے اللہ اس میت کے اجر سے ہمیں آخرت میں محروم نہ رکھ اور اس کے بعد کسی آزمائش میں نہ ڈال۔

ایک اور دعا یہ مروی ہے۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْهُ وَعَافِهٖ وَاعْفُ عَنْهُ وَاَکْرِمْ نُزُلَهٗ وَسِّعْ مُدْخَلَهٗ وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّهٖ مِنَ الْخَطَایَا کَمَا نَقَّیْتَ الثَّوْبَ الْاَبْیَضَ مِنَ الدَّنَسِ (مسلم جلد ۲ کتاب الجنائز) اے اللہ! اس بندہ کی مغفرت فرما۔اس پر رحمت فرما۔اس کو عافیت دے اس کو معاف فرمادے اور اس کی مہمانی معزز فرما۔اس کے داخل ہونے کی جگہ کو وسیع کر اور اس کو پانی اور برف اور اولوں سے نہلا دے اور اس کو خطاؤں سے پاک کر جس طرح سفید کپڑا میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے۔

چوتھی تکبیر کے بعد سلام پھیر لیا جاتا ہے۔نماز جنازہ کے بعد میت کو قبر میں اتارا جاتا ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مندرجہ ذیل الفاظ مروی ہیں۔ بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَعَلٰی سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ (ترمذی ابواب الجنائز باب مایقول اذا دخل المیت القبر) اللہ کے نام سے اور اللہ کے ساتھ اور رسول اللہ کی سنت کے مطابق۔

- اس کے بعد قبر میں مٹی ڈال دی جاتی ہے پھر مرنے والے کے لیے دعا مغفرت کی جاتی ہے اور لوگ واپس لوٹ آتے ہیں۔

بچے کی نماز جنازہ میں تیسری تکبیر کے بعد یہ دعا پڑھی جاتی ہے۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا فَرَطًا وَسَلَفًا وَذُخْرًا وَاَجْرًا (بخاری کتاب الجنائز ۲۳:۱۵)
اے اللہ اس کو ہماری آخرت کے لیے خوشی کا موجب بنا اور بطور ایک پہلے جانے والے کے اور ایک خزانہ بنا اور اجر بنا۔

اسلام میں نماز جنازہ غائبانہ بھی جائز ہے حدیث میں ہے کہ جس دن نجاشی کا انتقال ہوا اس دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کرایا پھر صحابہ کے ساتھ نماز کی جگہ پر پہنچے صفیں باندھیں اور نماز میں چار تکبیرات کہیں۔(بخاری ۲۳:۴)

نجاشی شاہ حبش تھا جو آپ کی دعوت اسلام پر مسلمان ہو گیا تھا۔آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔

تجہیز وتکفین اور تدفین کے تمام اعمال میت کی تکریم وتحریم کے لیے ہیں۔پسماندگان صبر وشکیب کے ساتھ دنیا سے رخصت ہونے والے کے لیے مغفرت کی دعائیں مانگتے ہیں اور یہ وہ اعمال ہیں جو کسی مذہب میں نہیں گو نماز جنازہ سابقہ انبیاء علیہم السلام کے مذاہب میں ضروری قرار دی گئی ہے اسلام نے اس نماز کی بھی تجدید اور تکمیل کی ہے۔

متفرق نمازیں

نماز کسوف: کسوف سورج گرہن کو کہتے ہیں۔ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسوف کے موقعہ پر دو رکعت نماز ادا کی۔یہ کسوف اس دن تھا جس دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اٹھارہ ماہ کا بچہ ابراہیم فوت ہوا۔یہ نماز معمول نمازوں سے ادائیگی میں مختلف ہے اس کی ہر رکعت میں دو قیام اور دو رکوع تھے۔پہلے قیام کے بعد عام نمازوں کی طرح رکوع کیا گیا۔اگرچہ دیر تک رہا۔اس کے بعد پھر قیام کیا گیا جس میں قرآن کا ایک حصہ تلاوت کیا گیا۔اس کے بعد پھر دوسرا رکوع کیا گیا۔جس سے اٹھنے کے بعد عام نمازوں کی طرح سجدہ بجالایا گیا۔قراۃ بالجھر تھی۔(بخاری کتاب الکسوف باب الصدقة فی الکسوف باب الجھر

بالقراۃ فی الکسوف)

احادیث میں یہ بھی ذکر آتا ہے کہ آپ نے نماز کے بعد خطبہ دیا جس میں استغفار اور صدقات کی تلقین کی۔ اس خطبہ میں ابراہیم کی وفات کا ذکر کیا اور فرمایا سورج اور چاند گرہن کسی کی وفات کی وجہ سے نہیں لگتے (بخاری الکسوف باب لاتنکسف الشمس لموت احد ولالحیاتہ)

نماز استسقا: استسقا کے معنی ہیں پانی مانگنا۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک موقعہ پر ایک لمبے عرصے تک بارش نہ ہوئی ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جبکہ آپ مسجد میں جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے عرض کی۔ یارسول اللہ! اللہ کے حضور باران رحمت کے لیے دعا فرمائیں کیونکہ انسان وحیوان امساک باراں سے مر رہے ہیں آپ نے خطبہ میں دعا فرمائی۔ (بخاری کتاب الجمعہ باب الاستسقائی الخطبۃ یوم الجمعہ)

دوسرے موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو کھلے میدان میں لے گئے اور ابر رحمت کے لیے دعا فرمائی۔ دو رکعت نماز باجماعت ادا کی۔ قرأت بالجہر کی۔ جس وقت آپ نے قبلہ کی طرف رخ کیا تو اپنی چادر کو پلٹ کر اوڑھا۔

بعض علماء چادر کو پلٹنا اتفاقیہ سمجھتے ہیں اور بعض نماز کا حصہ حضرت ابن عباس سے روایت ہے۔ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم يعنى فِي الْاِسْتِسْقَاءِ مُتَبَذِّلاً مُتَوَاضِعًا مُتَخَشِّعًا مُتَضَرِّعًا (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ ونسائی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز استسقاء کے لیے نکلے آپ معمولی لباس پہنے ہوئے تھے اور انکساری اور عاجزی کے ساتھ جا رہے تھے۔

نماز استخارہ: استخارہ کے معنی ہیں خیر چاہنا اور دعائے استخارہ کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو کوئی کام درپیش ہو تو وہ خدا سے اس میں بھلائی مانگے اگر وہ کام اس کے بھلائی کا موجب ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سامان پیدا کر دے اگر وہ کام اس کے لیے شر کا موجب ہے تو اللہ اس سے پھیر دے۔ نماز استخارہ کی دو رکعت نماز ہوتی ہے جس میں یہ دعا کی جاتی ہے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْتَخِيْرُكَ بِعِلْمِكَ وَاَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَاَسْاَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيْمِ فَاِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ اَللّٰهُمَّ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ خَيْرٌ لِي فِي دِيْنِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ اَمْرِي اَوْ قَالَ عَاجِلِ اَمْرِي وَاٰجِلِهٖ فَاقْدُرْهُ لِي وَيَسِّرْهُ لِي ثُمَّ بَارِكْ فِيْهِ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِي فِي دِيْنِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ اَمْرِي اَوْ قَالَ فِي عَاجِلِ اَمْرِي وَاٰجِلِهٖ فَاصْرِفْهُ عَنِّي وَاصْرِفْنِي عَنْهُ وَاقْدُرْ لِي الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ ثُمَّ اَرْضِنِي بِهٖ قَالَ يُسَمِّي حَاجَتَهٗ (بخاری ۱۹:۲۵) اے اللہ میں تیرے علم کی بدولت تجھ سے بھلائی کا طلب گار ہوں اور تیری قدرت کی بدولت تجھ سے طاقت چاہتا ہوں اور تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو اپنے فضل عظیم سے مجھے دے کیونکہ تو ہی صاحب قدرت ہے اور میں نہیں اور تو ہی جانتا ہے اور میں نہیں جانتا کہ یہ کام میرے لیے میرے دین اور میری معاش اور میرے انجام کار کے لیے یا کہا میرے کام کے لیے فوراً اور آئندہ کے لیے اچھا ہے تو میرے لیے مقدر کر اور آسان کر دے پھر اس میں برکت ڈال اور اگر تو جانتا ہے یہ کام میرے لیے میرے دین اور میری معاش اور میرے انجام کار کے لیے یا کہا میرے کام کے لیے فوراً اور اور آئندہ کے لیے برا ہے تو اسے مجھ سے پھیر دے اور مجھے اس سے پھیر دے اور میرے لیے بھلائی مقدر کر۔ جہاں ہو۔ پھر مجھے اس سے خوش کر دے فرمایا اور اپنی حاجت کا نام لے۔

نماز تسبیح: حضرت عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب سے فرمایا اے عباس۔ اے میرے چچا! کیا میں آپ کو ایک گراں بہا ہدیہ دوں۔ کیا میں آپ کو ایک خاص بات بتاؤں؟ کیا میں آپ کے دس کام کروں؟ جب آپ اس کو کریں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کے سارے گناہ بخش دے گا۔ اگلے بھی اور پچھلے بھی پرانے بھی اور نئے بھی دانستہ اور غیر دانستہ ہونے والے بھی چھوٹے بھی اور بڑے بھی چھپے ہوئے بھی اور علانیہ ہونے والے بھی (وہ عمل صلوۃ التسبیح ہے) اس کا طریقہ یہ ہے "آپ چار رکعت نماز پڑھیں اور ہر رکعت میں سورہ فاتحہ اور دوسری سورت پڑھیں پھر جب آپ پہلی رکعت میں قرأت سے فارغ ہو جائیں تو قیام ہی کی حالت میں پندرہ دفعہ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ "کہیں۔ پھر اس کے بعد رکوع کریں اور رکوع میں بھی یہی کلمہ دس مرتبہ پڑھیں۔ پھر رکوع سے اٹھ کر قومہ میں بھی یہی کلمہ دس دفعہ دہرائیں۔ پھر سجدہ میں چلے جائیں اور اس میں بھی یہی کلمہ دس مرتبہ کہیں۔ پھر سجدے سے اٹھ کر جلسہ میں یہی کلمہ دس دفعہ پڑھیں پھر دوسرے سجدہ میں یہی کلمہ دس دفعہ کہیں۔ پھر دوسرے سجدے کے بعد قیام سے قبل یہ کلمہ دس دفعہ دہرائیں چاروں رکعات اس طرح پڑھیں اور اس ترتیب سے ہر رکعت میں یہ کلمہ پچھتر دفعہ دہرائیں۔

پھر فرمایا میرے چچا اگر آپ سے ہو سکے تو روزانہ یہ نماز پڑھا کریں اگر بلاناغہ نہ پڑھ سکیں، تو ہر جمعہ کے دن پڑھ لیا کریں اور اگر آپ یہ بھی نہ کر پائیں تو سال میں ایک دفعہ پڑھ لیا کریں اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم زندگی میں ایک دفعہ پڑھ ہی لیں (سنن ابی داؤد۔ سنن ابن ماجہ، دعوات کبیر للبیہقی)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز تسبیح کی ترغیب ثابت ہے اکثر صلحاء کا بھی اس پر عمل رہا ہے۔

فلسفہ نماز

نماز انفرادی اور اجتماعی ترقی کے دروازے کھولتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلوٰتِهِمْ خَاشِعُوْنَ (مومنون ۲۳:۱) مومن یقیناً کامیاب ہو گئے جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔

فَلَحَ کے معنی شق کے یعنی پھاڑنا ہے زمین میں ہل چلانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اس لیے کسان کو فلاح کہتے ہیں اور فلاح کے معنی ظفر و ادراک بغیۃ ہیں (مفردات امام راغب) یعنی کامیابی اور مطلوب و مقصود کو پا لینا۔ جس طرح ہل چلانے سے زمین کی مخفی طاقتیں اور اصلی جوہر باہر نکل آتا ہے اس طرح نماز سے انسان کی مخفی استعدادیں اور طاقتیں ظاہر و باہر ہو جاتی ہیں قوائے انسانی میں ایک نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔

فلاح کا تعلق دنیا اور آخرت دونوں سے ہے دنیا میں فلاح بھی اچھی اور قابل قدر چیزوں کے حصول پر بولا جاتا ہے اور آخرت میں بھی لقاء الٰہی سے تعبیر ہوتی ہے چونکہ فرد کی ترقی قوم کی ترقی پر مقدم ہے اس لیے پہلے فرد کی ترقی پر بحث کی جاتی ہے۔

فرد کی ترقی: انسان کی ترقی کا انحصار اخلاق حسنہ اور تعمیر سیرت پر ہے۔ افراد کے بااخلاق ہونے سے ہی اجتماعی زندگی میں حسن اور رعنائی ظاہر ہوتی ہے۔ قومی ترقی کے در وا ہوتے ہیں۔ گویا قومی ترقی کا انحصار افراد کے باکردار ہونے پر ہے۔ نماز فرد کو صاحب سیرت بناتی ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (العنکبوت ۲۹:۴۵) یعنی نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔

فحشاء کا تعلق ظاہری برائیوں اور منکر کا قلبی برائیوں سے ہے۔ اب ایک عقلی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی نماز میں وہ کیا راز ہے جس سے ایک انسان فحشاء و منکر سے رک جاتا ہے۔ اسلامی نماز کا گہرائی میں جا کر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی طریقہ نماز انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ نمازی کا قیام، رکوع، سجدہ جلسہ وغیرہ سب خدا کی عظمت کے اظہار کا پرتو ہیں۔ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس چیز کی عظمت کا احساس انسان کے دل میں بیٹھ جاتا ہے انسان اس عظمت کی روح سے منافی کوئی کام نہیں کرتا۔ انسان کے دل میں والدین کی عظمت کا احساس ہوتا ہے تو اس وجہ سے وہ اپنی گردن پر ان کی اطاعت کا جوا ڈالے رکھتا ہے کسی پیر کی عظمت کا احساس ہے تو وہ پیر کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ ان کے خلاف نہیں جاتا ہے یہی حالت اللہ تعالیٰ کی ہے جب انسان کے دل میں خدا کی عظمت اور کبریائی کوٹ کوٹ کر بھر دی جائے تو انسان خدا کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ نماز ایک ایسا ہتھیار ہے جو انسان کے دل میں خدائی عظمت کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے۔ سورہ فاتحہ کی پہلی چار صفات رب رحمان، رحیم اور مالک یوم الدین ہی انسان کے دل میں عظمت پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں جب ایک انسان ان صفات کی گہرائی میں اترتا ہے تو اس کا دل خدا کی عظمت اور کبریائی سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا برائیوں سے بچنے کا اصلی گر نماز میں پایا جاتا ہے۔ اس لیے قرآن مجید میں یہ آیا ہے کہ نماز فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے۔ اِنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَرَاَيْتُمْ لَوْ اَنَّ نَهْرًا بِبَابِ اَحَدِكُمْ يَغْتَسِلُ فِيْهِ كُلَّ يَوْمٍ خَمْسًا مَاتَقُوْلُ ذٰلِكَ يُبْقِيْ مِنْ دَرَنِهٖ قَالُوْا لَا يُبْقِيْ مِنْ دَرَنِهٖ شَيْئًا قَالَ فَذٰلِكَ مَثَلُ الصَّلَوٰتِ الْخَمْسِ يَمْحُو اللّٰهُ بِهَا الْخَطَايَا (بخاری ۶:۹) انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرماتے تھے۔ بتاؤ اگر تم میں سے کسی کے دروازہ پر نہر ہو اور وہ اس میں ہر روز پانچ دفعہ نہائے تو کیا کہتا ہے کہ اس کے جسم پر میل رہ جائے گی۔ انھوں نے کہا اس کی میل کچیل باقی نہیں رہے گی فرمایا پس یہ پانچ نمازوں کی مثال ہے اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے گناہوں کو مٹاتا ہے۔

جب اس دعویٰ (نماز فحشاء و منکر سے روکتی ہے) کی صداقت کا عملی مظاہرہ دیکھنا ہو تو صحابہ کرام کا نمونہ ہمارے سامنے ہے وہ قوم جو ہر قسم کی برائی میں مبتلا تھے۔ جب وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو ہر قسم کی برائی سے تائب ہو گئے۔ جس کا اعتراف اعدائے اسلام بھی کرتے ہیں۔

فرض شناسی: فرد کی ترقی کا دوسرا سبب فرض شناسی ہے۔ نماز فرض شناسی اور احسن طریق سے کام سرانجام دینے کا سبق دیتی ہے۔ جس طرح سپاہیوں میں فرض شناسی پیدا کرنے کے لیے دن رات کئی دفعہ بگل بجا کر مقررہ جگہ پر اکٹھا کیا جاتا ہے اس سے پریڈ کرائی جاتی ہے۔ یہ صرف فرض شناسی کا جذبہ اجاگر کرنے کے لیے کیا جاتا ہے ایک سطح بین شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ان اجتماعی قواعد کا جنگ سے کیا تعلق لیکن تجربے اور مشاہدے نے یہ بات پایہ یقین تک پہنچا دی ہے کہ سپاہیوں کی اجتماعی پریڈ لڑائی کی تیاری کے لیے نہایت ضروری ہے اسی طرح مسلمانوں کو دن میں پانچ دفعہ مسجد میں آنے کے لیے اذان دی جاتی ہے کہ وہ تمام کام چھوڑ کر اللہ کے حضور کھڑے ہو جائیں اللہ کے حضور پانچ دفعہ حاضری انسان کے اندر فرض شناسی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔

ضبط نفس: فرد کی ترقی کا تیسرا ذریعہ ضبط نفس ہے۔ نفس کا بے لگام ہونا انسان کی تباہی کا باعث ہے۔ نظم و ضبط ہی انسان کو راہ مستقیم پر چلاتا ہے اگر کارخانہ قدرت پر نگاہ ڈالیں تو صاف معلوم ہوتا ہے تمام کارخانہ قدرت ایک ضبط کے تحت چل رہا ہے۔ اگر یہ نظم و ضبط نہ ہو تو تمام کائنات کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اسی طرح دنیا میں جتنے بھی ادارے ہیں ان سب نظم و ضبط میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جب بھی کسی ادارے کا نظم و ضبط ڈھیلا پڑا وہ ادارہ تباہ و برباد ہو گیا۔ گویا ہر

چیز کے قیام کے لیے نظم وضبط ضروری ہے۔ نماز انسان کو نظم وضبط کا درس دیتی ہے۔ سردی ہو گرمی ہو بارش ہو کسی قسم کا موسم ہو جب موذن اذان دیتا ہے۔ تو موسمی حالات خراب ہونے کے باوجود بندہ وضو کر کے مسجد کی طرف چل دیتا ہے۔ پھر وہ امام کے پیچھے کھڑے ہو کر انہی حرکات وسکنات کی پیروی کرتا ہے جو امام کرتا ہے اور اپنی مرضی کی حرکات وسکنات سے رک جاتا ہے اور اپنے نفس کو اسلام کے بتائے ہوئے قواعد کا پابند بنا لیتا ہے اور اس طرح اس بندے کا سرکش نفس نظم وضبط کا پابند بن جاتا ہے۔ یہ نظم وضبط کسی فرد کی ترقی کا باعث ہے۔

اگر کوئی نمازی نماز کے قواعد وضوابط کو چھوڑ کر اپنی مرضی کے قواعد وضوابط وضع کرے تو اس کی نماز ضائع ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید نے پہلی امتوں کی اسی خرابی کا ذکر کیا ہے کہ انھوں نے عبادت کے الٰہی طریقوں کو چھوڑ کر اپنے نفس کی پیروی شروع کر دی تھی۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (مریم ۱۹:۵۹) پھر ان کے بعد خلف جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور نفسانی خواہشات کی اتباع کی۔ سو وہ ہلاکت کو پالیں گے۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ نماز نمازی کو نظم وضبط میں لا کر اتباع شہوات سے روکتی ہے۔

قوت عملیہ کو فعّال بنانا: اللہ تعالیٰ نے تمدنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے انسان کو قوائے عملیہ عطا کیے ہوئے ہیں۔ یہی قوائے عملیہ انسانی ترقی کا ذریعہ ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں جو بھی ترقی نظر آتی ہے وہ ان قوائے عملیہ کو کام میں لانے کا نتیجہ ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى (النجم ۵۳:۳۹) انسانوں کے لیے کچھ نہیں مگر وہی جو کوشش کرتا ہے۔

نماز انسان کی قوت عملیہ کو جلا دینے اور حرکت وفعل میں لانے کا بہترین سبب ہے کیونکہ سستی اور کاہلی نماز کے آداب اور شرائط کے ہی منافی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے لَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى (توبہ ۹:۵۴) یعنی منافق لوگ نماز میں سستی اور کاہلی کی حالت میں آتے ہیں۔ نماز نمازی کی قوت عملیہ کو مہمیز کرتی ہے تو وہ چوق و چوبند ہو کر میدان عمل میں آ جاتا ہے۔ صحابہ کا نمونہ سامنے ہے۔ ان کی جاہلی زندگی کا بھی مطالعہ کیجیے پھر ان کی اسلامی زندگی کا مطالعہ کیجیے تو فرق نمایاں نظر آتا ہے۔ جاہلی زندگی بے کار نظر آتی ہے اور وہی زندگی جب نماز کے اصول کے نیچے آتی ہے تو وُہ کارآمد بن جاتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ علاوہ دیگر اسباب کے نماز بھی صحابہ کی زندگیوں کو کارآمد بنانے کا سبب ہے۔ میدان جنگ میں بھی رات کو مجاہد خدا کے سامنے سجدہ ریز ہیں اور صبح کو دشمن کی کثیر فوج پر اس قوت سے حملہ کرتے ہیں کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔

مواظبت کا درس: کسی فرد کی ترقی کا ایک سبب اپنے کام میں مواظبت اور دوام اختیار کرنے میں ہے۔ نماز اس سنہری اصول کی تعلیم دیتی ہے۔ قرآن مجید میں اقامت صلوٰۃ کی ایک شرط یہ بیان کی ہے۔ اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (معارج ۷۰:۲۳) جو اپنی نمازوں کو مداومت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَحَبُّ الْعَمَلِ اِلَى اللّٰهِ اَدْوَمُهٗ وَاِنْ قَلَّ (ابوداؤد باب مایؤمر به من القصد فی الصلوٰۃ) اللہ کے نزدیک محبوب ترین عمل وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے خواہ وہ کم ہی ہو۔ ویسے بھی کامیابی کے لیے کام میں مواظبت اور دوام لازمی ہے کوئی طالب علم کامیابی کی منازل طے نہیں کر سکتا جب تک اپنی پڑھائی میں دوام اختیار نہیں کرتا۔ اس طرح زندگی کے دوسرے شعبے ہیں۔ ان کی ترقی کام کی مواظبت اور ہمیشگی میں پوشیدہ ہے۔

پنجگانہ نمازیں مداومت کا ہی درس دیتی ہیں اور یہی درس انسان کی ترقی کے لیے مشعل راہ ہے۔

وقت کی پابندی: کام میں مواظبت وقت کی پابندی کا بھی تقاضا کرتی ہے۔ کام میں اسی وقت مداومت ہوگی۔ جب انسان وقت کا پابند ہوگا۔ نماز انسان کو وقت کا پابند بناتی ہے کیونکہ نماز کی ادائیگی کے لیے وقت کی پابندی لازمی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (النساء ۴:۱۰۳) مومنوں پر نماز وقت مقررہ پر فرض ہے۔

انسان طبعاً آرام اور راحت کی طرف مائل ہو جاتا ہے اس لیے اس کو اوقات کا پابند بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے لیے جبراً اوقات کار مقرر کر دیے جائیں۔ اس اصول کے تحت ہر شعبے اور ادارے میں اوقاف کار مقرر ہیں۔ نماز کے اوقات مقرر ہیں جو شخص مقررہ اوقات پر مسجد میں باجماعت نماز ادا کرتا ہے۔ وہ خود بخود اوقات کار کا عادی ہو جاتا ہے اور وہ اپنی زندگی کے دیگر امور بھی باقاعدہ سرانجام دے گا۔

صحت: فرد کی ترقی کا دار و مدار صحت پر بھی ہے۔ ضابطہ نماز میں انسان کے لیے حفظان صحت کے اصول مقرر کر دیے گئے ہیں۔ نماز پڑھنے سے پہلے جسم اور اعضاء کا پاک صاف ہونا ضروری قرار دیا ہے جو انسان کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ وضو ضروری قرار دیا ہے۔ وضو، وضا سے مشتق ہے جس کے معنی خوبصورتی کے ہیں۔ اگر حالت جنابت میں ہے تو اس کو غسل کرنا لازمی ہے۔ قضائے حاجت سے متعلق احادیث میں خاص احتیاطوں کی تاکید کی ہے تاکہ جسم کے کسی حصہ پر غلاظت نہ رہ جائے۔ انسان کو بہت سے امراض گندے منہ کی وجہ سے لاحق ہو جاتے ہیں۔ صاف منہ کئی عوارض سے محفوظ رکھتا ہے۔ منہ اور دانت کی صفائی

کے لیے صرف کلی ہی کافی نہیں بلکہ آپؐ نے مسواک کے متعلق بہت ہی تاکید فرمائی۔ صرف امت پر تنگی کے خوف سے اس کو وضو کا حصہ قرار نہیں دیا۔ فرمایا لَوْلَاۤ اَنْ اَشُقَّ عَلٰی اُمَّتِی لَاَمَرْتُھُمْ بِالسِّوَاکِ عِنْدَ کُلِّ وُضُوْءٍ (بخاری ۳۰:۲۷) اگر مجھے اپنی امت پر تنگی کا خوف نہ ہوتا تو ہر وضو کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا، فرمایا اَکْثَرْتُ عَلَیْکُمْ فِی السِّوَاکِ (بخاری ۱۱:۸) میں نے مسواک کے بارے میں تم سے بار بار کہا ہے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو یا دن کو جب بھی سوتے پھر جاگتے تو وضو سے پہلے مسواک کرتے۔ (مشکوٰۃ ۳:۳ بروایت ابوداؤد)

اسی طرح حفظانِ صحت کے لیے صبح خیزی بہت ضروری ہے صبح کی نماز اس ضابطے کو نہایت خوبی سے پورا کرتی ہے۔

گویا نماز میں ان تمام ضوابط کا خیال رکھا گیا ہے جو صحت کے لیے ضروری ہیں۔

اجتماعی (قومی) ترقی کے اسباب: قومی ترقی کا پہلا سبب نظم جماعت اور اتحاد ہے۔ نماز تمام ملکی، قومی، لونی، لسانی، نسبی اختلافات اور تعصبات کو مٹا کر اتحاد کی سلک میں منسلک کر دیتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران ۳:۱۰۳) اللہ کی رسی کو تھامے رکھو اور جدا نہ ہو جاؤ۔

حبل اسے کو کہتے ہیں اور استعارۃً ہر ایک ایسے سبب پر بولا جاتا ہے جس سے کسی چیز کی طرف پہنچ سکیں استعیر للوصل ولکل ما یتوصل بہ الی شیء (مفردات امام راغب) علماء نے حبل اللہ سے مراد قرآن یا دین بھی لیے ہیں کیونکہ یہ اتحاد امت کا ذریعہ ہے اسی طرح نماز بھی جماعتی تنظیم کا درس دیتی ہے۔ اس پر بھی حبل اللہ کا لفظ بولا جا سکتا ہے۔ نماز میں مسلمان ایک امام کے پیچھے صف باندھ کر ایک دوسرے سے کندھا کندھے ملا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوں کی درستی پر بہت زور دیا ہے فرمایا۔ سَوُّوْا صُفُوْفَکُمْ فَاِنَّ تَسْوِیَۃَ الصُّفُوْفِ مِنْ اِقَامَۃِ الصَّلٰوۃِ (بخاری ۱۰:۷۴) مسلم کی ایک حدیث ہے ایک دفعہ کسی ایک نمازی کا سینہ صف سے آگے نکلا ہوا پایا تو آپ نے فرمایا عِبَادَ اللّٰہِ لَتُسَوُّنَّ صُفُوْفَکُمْ اَوْ لَیُخَالِفَنَّ اللّٰہُ بَیْنَ وُجُوْھِکُمْ اللہ کے بندو! اپنی صفوں کو سیدھا رکھو ورنہ اللہ تعالیٰ تمھارے رخ ایک دوسرے کے مخالف کر دے گا۔

مسجد میں پنجگانہ نماز نے مسلمانوں کے دلوں سے کھوٹ اور عداوت نکال کر اتحاد کی ایک لڑی میں پرو دیا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ بِنِعْمَتِہٖ اِخْوَانًا وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا (ال عمران ۳:۱۰۳) اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب تم باہم دشمن تھے پھر اس نے تمھارے دلوں کو جوڑ دیا تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تم کو اس سے بچا لیا۔

آگ کا گڑھا کیا ہے۔ وہ ہے عربوں میں باہمی نسلی اور نسبی دشمنی۔ اس دشمنی کی وجہ سے تباہی کے گڑھے میں گرے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تباہی کے گڑھے سے نکال کر اتحاد کی مضبوط چٹان پر لا کھڑا کیا۔ اتحاد امت کے جہاں اور بھی کئی ذرائع اور اسباب ہیں وہاں نماز ایک اہم ذریعہ ہے۔ جب مسلمانوں کے دلوں سے ہر قسم کی عداوت نکل گئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بھائی ہونے کا لقب دیا فرمایا۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (الحجرات ۴۹:۱۰) مومن بھائی بھائی ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اتحاد ملی کو دیکھ کر فرمایا اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے پھر کبھی آپ نے مسلمانوں میں نظم و ضبط پیدا کرنے کے لیے مسلمانوں کے اتحاد کو ایک جسم سے تشبیہ دی اور فرمایا تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ فِی تَرَاحُمِھِمْ وَتَوَادِّھِمْ وَتَعَاطُفِھِمْ کَمَثَلِ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَکٰی عُضْوٌ تَدَاعٰی لَہٗ سَائِرُ جَسَدِہٖ بِالسَّھَرِ وَالْحُمّٰی (بخاری کتاب الادب) تو مومنوں کو ایک دوسرے سے رحم اور محبت اور مہربانی میں ایسے دیکھے گا جیسا بدن میں ایک عضو بیمار ہو جائے تو سارے اعضا بخار اور بیداری میں اس کے شریک ہو جاتے ہیں۔

کبھی آپ نے ایک عمارت سے تشبیہ دی ہے۔ فرمایا اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ کَالْبُنْیَانِ یَشُدُّ بَعْضُہٗ بَعْضًا (بخاری کتاب الادب) مومن دوسرے مومن کے لیے ایسا ہے جیسا کہ عمارت کا ایک جزو دوسرے جز کو قوت دیتا ہے۔

یہ دونوں مثالیں مسلمانوں کے نظم جماعت اور اتحاد کے انتہائی درجہ کو ظاہر کرتی ہیں اور یہی وہ اتحاد تھا۔ جس نے مسلمانوں کو پستی کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال کر انتہائی عروج تک پہنچا دیا۔ اب مسلمانوں کی پستی کی وجہ یہی ہے کہ وہ ایک جسم کی طرح نہیں وہ ایک عمارت کی طرح نہیں بلکہ بکھرے ہوئے اعضاء اور منتشر روڑے اینٹوں کی طرح ہیں۔ کبھی دشمن افغانستان کو قہری طاقت سے روندھتا ہے اور کبھی عراق کو کبھی لبنان پر آتشی آہنی گولے برسا کر زمین کو انسانی خون سے سرخ کر رہا ہے۔ دشمن نے صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا ہوا ہے۔ مغرب کے تھنک ٹینک مسلمانوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن قرار دے رہے ہیں لیکن مسلمان باہمی مناقشت کی وادی میں سرگرداں بھٹک رہے ہیں۔ کسی کا بھی قبلہ درست نہیں۔ ملی اور دینی غیرت نابود ہو چکی ہے۔

یہ تفرقہ اور انتشار واضح کر رہا ہے کہ مسلمانوں کی نمازیں بے کیف اور حقیقی روح سے خالی ہیں۔ دور حاضر میں یہ ضروری ہے کہ ہم فلسفہ نماز کو سمجھیں اور اتحاد کی سلک میں منسلک ہو جائیں اور دشمن کے سامنے پوری قوت کے ساتھ بنیان مرصوص بن کر کھڑے ہو جائیں۔

مساوات: قومی ترقی کا اہم سبب مساوات ہے جس قوم میں طبقاتی تقسیم ہو وہ کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتی۔ اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے انسانی مساوات کا سبق دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (الحجرات ۴۹:۱۳) اے لوگو! ہم نے تمھیں مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے شریف وہ ہے جو سب سے پرہیزگار ہے اللہ جاننے والا خبردار ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیا جس میں اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا یٰاَیُّهَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدِ عَلٰى اَحْمَرِ اِلَّا بِالتَّقْوٰى (مسند احمد) لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔

اسلام صرف سماجی مساوات کی ہی تعلیم نہیں دیتا بلکہ عدالتی معاملات میں بھی مساوات کی تعلیم دیتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔
اَقِيْمُوْا حُدُوْدَ اللّٰهِ فِي الْقَرِيْبِ وَالْبَعِيْدِ وَلَا يَاْخُذُكُمْ فِي اللّٰهِ لَوْمَةُ الْاٰئِمِ (مشکوٰۃ کتاب الحدود) اللہ کی حدیں بلاتمیز دور و نزدیک سب پر جاری کرو اور کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہ کرو۔

عہدِ نبوی میں ایک اونچے خاندان کی عورت نے چوری کی۔ کچھ لوگوں کو خیال آیا کہ اگر اس کو سزا ہوگئی تو جگ ہنسائی ہوگی حضرت اُسامہ کو آمادہ کیا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عورت پر حد ساقط کرنے کے لیے کہے۔ جب حضرت اسامہ حضور کی خدمت میں گئے اور اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے لب کشائی کی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ اُمَمٌ كَانُوْا يُقِيْمُوْنَ الْحَدَّ عَلَى الْوَضِيْعِ وَيَتْرُكُوْنَ الشَّرِيْفَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ فَاطِمَةُ فَعَلَتْ ذٰلِكَ لَقَطَعْتُ يَدَهَا (بخاری اقامۃ الحد علی الوضیع والشریف) تم میں سے پہلے والے اس وجہ سے ہلاک ہوئے کہ وہ سزا نیچے لوگوں کو دیتے تھے۔ اور بڑوں کو چھوڑ دیتے تھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

اسلام قانونی مساوات کے ساتھ سیاسی مساوات کی بھی تعلیم دیتا ہے کہ ہر شخص بلا امتیاز مذہب و ملت و رنگ و نسل ملکی نظام میں حصہ لے سکتا ہے اور ہر ایک کو ترقی کے برابر کے حقوق حاصل ہوتے ہیں اسلام کا مشاورتی نظام اس طرف راہنمائی کرتا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ ۴۲:۳۸) ان کا کام اس میں مشورہ ہوتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (آل عمران ۳:۱۵۸) (ملکی) معاملات میں ان سے مشورہ لے۔
آپ فرماتے ہیں۔ مَاشَاوَرَ قَوْمٌ اِلَّا هُدُوْا (کنوز الحقائق حدیث ۸۷ طبرانی) یعنی جس قوم نے ملکی معاملات میں باہمی مشورہ سے کام لیا وہ قوم فلاح پاگئی۔

مسلمانوں میں ہر قسم کی مساوات پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ نماز ہے۔ مسلمان پانچ دفعہ مسجد میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ ایک امام کے پیچھے امیر و غریب شاہ و گدا، چھوٹے بڑے سب دست بستہ صف باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اس صف بندی سے ہر قسم کے امتیازات مٹ جاتے ہیں اگر ایک غریب بوسیدہ کپڑوں والا پہلے مسجد میں آیا ہے تو وہ پہلی صف میں بیٹھے گا اور بادشاہ یا امیر بعد میں آتا ہے تو وہ بعد کی صف میں بیٹھے گا۔ یہ نہیں ہوگا۔ بادشاہ یا امیر غریب پھٹے پرانے کپڑوں والے کو اٹھا کر اس کی جگہ پہلی صف میں بیٹھے۔

ہمدردی و مواساۃ: باہمی ہمدردی اور مواساۃ قومی تعمیر میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جب نمازی مسجد میں آتے ہیں تو ہر ایک کی امارت اور غربت ایک دوسرے پر عیاں ہو جاتی ہے۔ غریب کو دیکھ کر امیر آدمی کے دل میں مواساۃ کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اس طرح امیر و غریب ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید نے تو ایک مسلمان کا وصف ہی یہ بیان کیا ہے کہ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر ۵۹:۹) وہ اپنے آپ پر انھیں (غریبوں کو) مقدم رکھتے ہیں گو انھیں تنگی ہی ہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مسعود میں یہی ہوتا تھا جب بھی کوئی صاحب حاجت مسجد میں آتا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے تحت صحابہؓ اپنے صاحب حاجت بھائی کی حاجت روائی کرتے۔ اصحاب صفہ کی تو گزر اوقات ہی اصحاب ثروت پر تھی۔ اکثر صحابہؓ نماز سے فارغ ہو کر ان لوگوں کو اپنے گھروں میں لے جاتے ان کو کھانا کھلاتے۔

نماز اور انفاق لازم ملزوم ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (بقرہ۳۲) وہ نماز قائم کرتے ہیں اور جو ہم نے ان کو دیا ہے۔ خرچ کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اکثر نماز اور زکوٰۃ کا ذکر اکٹھا آیا ہے۔ مسجد میں ہر روز پانچ دفعہ اجتماع ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

تعاون: انسان مدنی الطبع ہے۔ اس لیے معاشرتی زندگی تعاون کے بغیر چل ہی نہیں سکتی ہر شخص ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ جس معاشرہ میں ایک دوسرے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے تعاون کی شمع روشن ہے اس معاشرہ میں لوگ خوش حال اور پُرامن زندگی گزاریں گے۔ اسلام کی بھی یہی تعلیم ہے۔ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور عدوان پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

اس آیت میں تعاون کی حدود بھی مقرر کر دی ہیں۔ وہ ہیں بر اور تقویٰ۔ مسجد ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں مسلمان پانچ دفعہ اکٹھے ہوتے ہیں۔ اس اجتماع سے یہ پتا چل جاتا ہے کہ کون دوسرے کے تعاون اور مدد کا محتاج ہے۔ تعاون سے باہمی محبت اور الفت بڑھتی ہے۔ غل اور عداوت ختم ہوتی ہے اور تمدنی زندگی میں نکھار اور حسن پیدا ہوتا ہے اور قوم ترقی کی راہ پر چل پڑتی ہے۔

اطاعت امیر: قومی ترقی کا بڑا سبب اطاعت امیر ہے ارشاد الٰہی ہے۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (نساء ۵۹:۴) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے صاحب امر کی اطاعت کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اِسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاِنِ اسْتُعْمِلَ حَبْشِيٌّ كَاَنَّ رَاْسَهٗ زَبِيْبَةٌ (بخاری ۱:۵۴) سنو اور اطاعت کرو اگرچہ ایک حبشی حاکم بنا دیا گیا ہو جس کا سر گویا کہ کشمش کا دانہ ہے۔

اطاعت امیر کے ساتھ اطاعت کی حدود بھی مقرر کر دی فرمایا السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ حَقٌّ مَالَمْ يُؤْمَرْ بِالْمَعْصِيَةِ فَاِذَا اُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ (بخاری ۱۰۸:۵۶) سننا اور اطاعت کرنا لازمی ہے جب تک (اللہ کی) نافرمانی کا حکم نہ دیا جائے پس جب اللہ کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو نہ سننا ہے اور نہ فرمانبرداری کرنا ہے۔

نماز مسلمانوں کو اپنے امیر کی اطاعت کا سبق دیتی ہے۔ مقتدیوں کو یہ حکم ہے کہ وہ اپنے امام کے ہر فعل کی پیروی کریں یہاں تک کہ اگر کوئی مقتدی امام سے پہلے رکوع میں چلا جاتا ہے یا رکوع سے پہلے سر اٹھا لیتا ہے یا سجدہ میں پہلے چلا جاتا ہے یا سجدہ سے پہلے سر اٹھا لیتا ہے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کے متعلق فرمایا کہ قیامت کے روز وہ گدھے کی صورت میں اٹھایا جائے گا۔ امام کی اطاعت کا تو یہاں تک حکم ہے کہ امام نماز میں کسی رکن میں سہو کر جائے تو بھی صرف سبحان اللہ کا لفظ بولنا ہے اگر اس کو اپنے سہو کا احساس ہو جاتا ہے تو فبہا ورنہ مقتدیوں کو یہی حکم ہے وہ امام کی اس غلطی کی بھی پیروی کریں۔ بعد از اں سجدہ سہو بجا لائیں۔

مرکز سے وابستگی: قومی ترقی کا ایک راز مرکز سے وابستگی ہے جس قوم کا ایک مرکز نہ ہو یا کوئی قوم اپنے مرکز سے علیحدگی اختیار کر لے تو وہ قوم تنزل کے راستہ پر چل پڑتی ہے۔ نماز میں تمام مسلمانوں کو قبلہ رخ کھڑا ہونے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (بقرہ ۱۴۴:۲) سو تو اپنے منہ کو مسجد حرام کی طرف پھیر دے اور جہاں کہیں تم ہو اپنے مونہوں کو اس کی طرف پھیر دو۔

عمومی مجالس: دور حاضر میں تجربہ کے بعد دقیقہ شناس اس بات پر پہنچے ہیں کہ کلب بنائے جائیں۔ انجمنیں قائم کی جائیں اور وقت کی ضروریات کے مطابق قوم کو بیدار کرنے کے لیے تقاریر کی جائیں۔ گویا انجمنوں کا قیام قومی ضرورت کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے پھر اس قسم کی انجمنیں قائم کرنے کے لیے بے شمار دقتیں پیش آتی ہیں۔ پیسہ بھی خرچ ہوتا ہے لیکن پھر بھی پورے فوائد حاصل نہیں کیے جا سکتے۔

اسلام نے آج سے چودہ سو سال قبل عمومی مجالس کے قیام کا بندوبست کر دیا تھا۔ ہر روز یہ پانچ وقت مسلمان مسجد میں جمع ہوتے ہیں۔ ہفتہ کے بعد جمعہ کے دن جامعہ مسجد میں مسلمانوں کا اکٹھ ہو جاتا ہے۔ سال میں دو دفعہ عیدین کے موقع پر ایک کھلے میدان میں جمع ہو جاتے ہیں۔ امام وقت کے تقاضہ کے مطابق خطاب بھی کرتا ہے پھر صاحب استطاعت مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ زندگی میں ایک دفعہ فریضہ حج ادا کریں۔ اس طرح تمام اکناف عالم سے حج کے موقع پر مسلمان بیت اللہ میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح قومی زندگی قائم رکھنے کے لیے عمومی مجالس کا انتظام کر دیا گیا ہے جن میں زندگی کا رنگ بھر جاتا ہے۔ دوسری انجمنوں کی طرح نہ تو ٹکٹ جاری کیے جاتے ہیں اور نہ اشتہار شائع کیے جاتے ہیں۔ اسلام کی قائم کردہ عمومی مجالس وہ ہیں جہاں وقت مقررہ پر لوگ مجالس میں شریک ہو جاتے ہیں۔ دوسری انجمنیں ہزاروں کروڑوں روپے خرچ کر کے وہ فوائد حاصل کر نہیں پاتیں جو اسلامی مجالس سے حاصل ہو جاتے ہیں۔ یہ عمومی مجالس بھی قومی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ ہیں۔

زکوٰۃ

زکوٰۃ کے معنی: زکوٰۃ کا لفظ زکا سے مشتق ہے کھیتی میں نمو آنے یا اس کے بڑھنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اسے زکوٰۃ اس وجہ سے کہا گیا ہے اس سے قومی مال بڑھتا ہے یا اس سے تزکیہ نفس ہوتا ہے۔

اسلامی اصطلاح میں زکوٰۃ وہ مال ہے جو نصاب کے تحت امراء سے لیا جاتا ہے اور سورہ توبہ کی آیت ۶۰ کی رو سے خرچ کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں زکوٰۃ کے لیے دو اور الفاظ استعمال ہوئے ہیں صدقہ اور انفاق فی سبیل اللہ۔

صدقہ، صدق سے مشتق ہے جس کے معنی سچائی اور خلوص کے ہیں گویا زکوٰۃ کو صدقہ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ معطی کے ایمان میں سچائی اور خلوص کی چمک پیدا کرتی ہے جس سے اس کا باطن روشن ہو جاتا ہے۔ دوم صدقہ کا لفظ معطی کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ اپنا مال خلوص اور صدق دل سے دے۔

انفاق فی سبیل اللہ کے الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ غربا اور محتاجوں کو دینا گویا اللہ تعالیٰ کو دینا ہے۔

زکوٰۃ کی حقیقت: اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے اور اس کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے اللہ تعالیٰ کی اَن گنت صفات میں سے ایک صفت ربوبیت ہے۔ یہ صفت انسان سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق صفت ربوبیت کا اظہار کرے اسلام نے وہ اظہار زکوٰۃ خیرات اور صدقات کی صورت میں بیان کیا ہے۔ زکوٰۃ دراصل اللہ کی صفت ربوبیت کا ظلی اور مجازی طور پر اظہار ہے۔

اہمیت از روئے قرآن مجید: ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِنْ خَیْرٍ تَجِدُوْہُ عِنْدَ اللّٰہِ ھُوَ خَیْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا (المزمل ۷۳:۲۰) نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ اللہ تعالیٰ کو اچھا قرضہ دو جو کچھ بھلائی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے ہاں اس سے بہتر اور ثواب میں برتر پاؤ گے۔

اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ (المائدہ ۵:۵۵) جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور رکوع کرنے والے ہیں۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً تُطَھِّرُھُمْ وَتُزَکِّیْھِمْ بِھَا (التوبہ ۹:۱۰۳) ان کے مالوں سے صدقہ لے کر انھیں پاک کیجیے اور ان کا تزکیہ کیجیے۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ (البقرہ ۲:۳) جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ (البقرہ ۲:۱۹۵) اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اور اپنے ہاتھوں کو اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِنَ الْاَرْضِ (البقرہ ۲:۲۶۷) اے ایمان والو! پاک مالوں میں سے خرچ کرو جو تم کماتے ہو اور جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالا۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خُلَّۃٌ وَّلَا شَفَاعَۃٌ وَالْکٰفِرُوْنَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (البقرہ ۲:۲۵۴) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ اس میں سے جو ہم نے تم کو دیا ہے خرچ کرو اس سے پہلے کہ وہ دن آ جائے جس میں نہ خرید و فروخت ہو گی اور نہ دوستی اور نہ ہی کوئی سفارش کام آئے گی اور کافر ہی ظالم ہیں۔

خرچ نہ کرنے (زکوٰۃ نہ دینے) پر تنبیہ: وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (توبہ ۹:۳۴) وہ لوگ جو سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک عذاب کی خبر دے۔

زکوٰۃ پہلے انبیاء علیہم السلام کی امتوں میں: نماز کی طرح زکوٰۃ بھی پہلی امتوں پر فرض تھی۔ اس لیے زکوٰۃ کو حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ (المعارج ۷۰:۲۴) کہا۔ یعنی یہ وہ حق (فرض عبادت) ہے کہ جس کا پہلی امتوں کو علم ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ضروری اصلاحات کے ساتھ امت مسلمہ میں جاری کی۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اپنے گھر والوں کو نماز کی تاکید کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرنے کی بھی تلقین کرتے تھے۔ کَانَ یَاْمُرُ اَھْلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ وَکَانَ عِنْدَ رَبِّہٖ مَرْضِیًّا (مریم ۱۹:۵۵) وہ اپنے گھر والوں (ساتھیوں) کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھے۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے نماز اور زکوٰۃ دونوں کی پابندی کا عہد لیا ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآئِيْلَ...... وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرہ ۲:۸۳) اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا...... اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ پھر بنی اسرائیل سے وعدہ فرمایا "میں تمھارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم کرو گے اور زکوٰۃ دو گے۔" (مائدہ ۵:۱۲) پھر بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام کے متعلق آتا ہے۔ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ (الانبیاء ۲۱:۷۳) اور ہم نے ان کو بھلائی کے کام کرنے نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وحی کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے متعلق فرمایا وَاَوْصٰنِىْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا (مریم ۱۹:۳۱) مجھے نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے جب تک میں زندہ ہوں۔

تمام سابقہ انبیاء علیہم السلام کو مجموعی رنگ میں عبادت یعنی نماز اور زکوٰۃ کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (البینہ ۹۸:۴،۵) اور انھیں یہی حکم دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اس کے لیے فرمانبرداری کو خالص کرتے ہوئے راست رو ہوں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ یہی ٹھیک دین ہے۔

کتب سابقہ میں زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم: بائبل میں زکوٰۃ کا ذکر اس طرح آتا ہے اور زمین کی پیداوار کا سارا عشر خواہ وہ زمین کے بیج کا ہو یا درخت کے پھل کا ہو۔ خداوند کا ہے اور خداوند کے لیے پاک ہے اور اگر کوئی اپنے عشر سے چھڑانا چاہے تو اس کا پانچواں حصہ اس میں اور ملا کر اسے چھڑائے اور گائے بیل اور بھیڑ بکری یا جو جانور چرواہے کی لاٹھی کے نیچے سے گزرتا ہو۔ ان کا عشر یعنی دس پیچھے ایک جانور خداوند کے لیے پاک ٹھہرے۔" (احبار ۲۷:۳۰،۳۱)

گنتی میں ہے۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا تو لادیوں سے اتنا کہہ دینا کہ جب تم بنی اسرائیل سے اس عشر کو لو جسے میں نے ان کی طرف سے تمہارا موروثی حصہ کر دیا ہے تو تم اس عشر کا عشر خداوند کے حضور اٹھانے کی قربانی کے لیے گزارنا۔" (۱۸:۲۵،۲۶)

استثنا میں ہے۔

تو اپنے غلے میں سے جو سال بہ سال تیرے کھیتوں میں پیدا ہو عشر ادا کرنا۔ (۱۴:۲۲)

"تین تین برس کے بعد تو تیسرے برس کے مال کا سارا عشر نکال کر اسے اپنے پھاٹکوں کے اندر اکٹھا کرنا، تب لادی جس کا تیرے ساتھ کوئی حصہ یا میراث نہیں اور پردیسی اور یتیم اور بیوہ عورتیں جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہوں۔ آئیں اور کھا کر سیر ہوں تاکہ خداوند تیرا خدا تیرے سب کاموں میں، جن کو تو ہاتھ لگائے، تجھ کو برکت بخشے۔" (۱۴:۲۸،۲۹)

"اور جب تو تیسرے سال جو عشر کا سال ہے اپنے سارے مال کا عشر نکال چکے تو اس لادی اور مسافر اور یتیم اور بیوہ کو دینا تاکہ وہ اسے تیری بستیوں میں کھائیں اور سیر ہوں۔" (۲۶:۱۲)

انجیل میں آتا ہے۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس کہ پودینے اور سونف اور زیرے پر تو عشر دیتے ہو پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے اے اندھے راہ بتانے والو جو مچھر کو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔

(متی ۲۳:۲۳،۲۴)

"اگر کوئی دولت مند ہیکل کے خزانہ میں اپنی زکوٰۃ کی بڑی رقم ڈالے اور اس کے مقابلہ میں کوئی غریب بیوہ خلوص دل سے دو دمڑی ڈالے تو اس کی زکوٰۃ کا رتبہ اس دولت مند کی زکوٰۃ سے کہیں بڑھ کر ہے۔" (لوقا ۲۱:۱)

"مال اپنے لیے آسمان پر جمع کر جہاں کیڑا نہ مورچہ خراب کرے نہ چور سینہ دے۔ جہاں مال ہے وہاں دل ہے۔" (متی ٦ باب ۲۰،۲۱)

اہمیت از روئے حدیث: بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ (بخاری ۱:۲) اسلام کی بنیاد پانچ امور پر ہے اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یقیناً محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

حضرت معاذ بن جبل کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بطور گورنر بھیجا تو آپ نے ان سے کہا۔ اُدْعُهُمْ اِلٰى شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِكَ فَاَعْلِمْهُمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدِ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوٰتٍ فِىْ كُلِّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ فَاِنْ اَطَاعُوْا لِذٰلِكَ فَاَعْلِمْهُمْ اَنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِىْ اَمْوَالِهِمْ تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَآئِهِمْ وَتُرَدُّ فِىْ فُقَرَآئِهِمْ (بخاری ۱:۳۴) انھیں دعوت دو کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوائے کوئی معبود نہیں

اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں تو اگر وہ اسے مان لیں تو انھیں بتاؤ کہ اللہ نے دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ یہ بھی مان لیں تو انھیں بتاؤ کہ اللہ نے ان کے مالوں میں ان پر زکوٰۃ فرض ٹھہرائی ہے جو ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے محتاجوں کو دی جائے گی۔

مذکورہ حدیث میں صدقہ کا لفظ زکوٰۃ کے لیے بولا گیا ہے۔ اس لیے اس کے آگے الفاظ آئے ہیں۔ تُوْخَذُ مِنْ اَغْنِیَائِھِم (ان کے مالداروں سے لیا جائے گا) ظاہر کرتے ہیں کیونکہ زکوٰۃ امراء سے لی جاتی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی کے استفسار پر عبادت کی ترغیب اور شرک سے اجتناب کی نصیحت فرمائی اور فرمایا۔ تُقِیْمُ الصَّلٰوۃَ الْمَکْتُوْبَۃَ وَتُوَدِّی الزَّکٰوۃَ .... کہ تو فرض نماز قائم کر اور فرض زکوٰۃ دے۔ آپؐ نے روزوں کا بھی ذکر کیا۔

فرمایا۔ اُمِرت اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْھَدُوْا اَنْ لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ وَیُقِیْمُوْا الصَّلَاۃَ وَیُؤْتُوْا الزَّکٰوۃَ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِکَ عَصَمُوْا مِنِّی دِمَاءَ ھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ اِلاَّ بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُھُمْ عَلَی اللّٰہِ (مسلم جلد ا کتاب الایمان) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان لوگوں سے لڑائی کروں۔ یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں جب وہ ایسا کرلیں گے تو اسی وقت مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ پاسکیں گے۔ سوائے اسلام کے حق کے اور ان کا حساب اللہ پر ہوگا۔

حضرت جریر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ بَایَعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ وَالنُّصْحِ لِکُلِّ مُسْلِمٍ (صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ باب وجوب الزکوٰۃ) یعنی میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے اور ہر مسلمان سے خیر خواہی کرنے پر بیعت کی۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ مَامِنْ صَاحِبِ ذَھَبٍ وَلَا فِضَّۃٍ لَا یُؤَدِّی مِنْھَا حَقَّھَا اِلاَّ اِذَا کَانَ یَوْمُ الْقِیَامَۃِ صُفِحَتْ لَہٗ صَفَائِحُ مِنْ نَارٍ فَاُحْمِیَ عَلَیْھَا فِی نَارِ جَھَنَّمَ فَیُکْوٰی بِھَا جَنْبُہٗ وَجَبِیْنُہٗ وَظَھْرُہٗ (صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب اثم مانع الزکوٰۃ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے پاس سونا اور چاندی ہے اور وہ ان میں سے ان کا حق یعنی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا تو اس کے لیے پتھروں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا تو اس کے پہلو، ماتھے اور پشت کو داغا جائے گا۔

ایک اور حدیث میں وعید سنائی:

مَامِنْ رَجُلٍ لَہٗ مَالٌ لَا یُؤَدِّی حَقَّ مَالِہٖ اِلاَّ جُعِلَ لَہٗ طَوْقاً فِی عُنُقِہٖ شُجَاعٌ اَقْرَعُ (سنن النسائی کتاب الزکوٰۃ باب التغلیظ فی حبس الزکوٰۃ) کوئی انسان جس کے پاس مال ہے اور وہ اپنے مال کا حق (زکوٰۃ) ادا نہیں کرتا اس کے گلے میں گنجے سر والے سانپ کا طوق ڈال دیا جائے گا۔

موطا امام مالک میں ایک لمبی حدیث ہے اس کے آخری الفاظ یہ ہیں۔ مُثِّلَ لَہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ شُجَاعًا اَقْرَعَ لَہٗ زَبِیْبَتَانِ یَطْلُبُہٗ حَتّٰی یُمَکِّنَہٗ یَقُوْلُ اَنَا کَنْزُکَ (کتاب الزکوٰۃ) یعنی جس شخص کے پاس مال ہو اور اس نے اس کی زکوٰۃ نہیں نکالی۔ قیامت کے دن اس کے مال کو ایک گنجے سانپ کی صورت دے دی جائے گی اور اس کے منہ میں زہر کی دو تھیلیاں ہوں گی اور وہ آدمی کی تلاش میں نکلے گا یہاں تک اس پر قابو پائے گا اور اس سے کہے گا کہ میں تیرا خزانہ ہوں۔

زکوٰۃ کن اموال پر فرض ہے: سونا، چاندی، نقدی خواہ سکے کی شکل میں ہو یا نوٹ ہوں مال تجارت پر اور ان جانوروں پر جو سال کا اکثر حصہ چر کر اپنا پیٹ پالتے ہیں اور زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ فرض ہے۔ زمین اور سکنی مکان، استعمال کی جانے والی چیزیں، جواہرات ترکاری سبزیاں پھل وغیرہ پر زکوٰۃ فرض نہیں۔

اسلام نے نہایت ہی حکمت بالغہ سے ان اشیاء پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو کچھ عرصہ تک محفوظ رہ سکتی ہیں اور ان میں ترقی اور نشوونما کی صلاحیت بھی موجود ہو جو اشیاء زیادہ عرصہ تک محفوظ نہ رہ سکتی ہوں اور ان میں ترقی اور نشوونما کی صلاحیت بھی موجود نہ ہو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

ہیرے اور جواہرات اگر تجارت کی غرض سے ہوں تو ان میں زکوٰۃ واجب ہے کیونکہ کسی بھی مال میں زکوٰۃ کے وجوب کے لیے مال کا نامی ہونا شرط ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے اما الیواقیت واللالی والجواہر فلا زکوۃ فیھا۔ وان کانت حلیًا الا ان تکون التجارہ (جلد ا ص ۱۸۰) جواہر اور موتیوں میں زکوٰۃ نہیں مگر جب کہ ان کا مالک دیگر سامان تجارت کی طرح تجارت کی نیت سے رکھتا ہو۔ (ص ۱۵۹) جواہر اور موتیوں میں بالاتفاق زکوٰۃ نہیں۔ اگرچہ وہ ہزار درہم کے برابر ہوں۔ مگر یہ کہ تجارت کے لیے ہوں۔ (درمختار علی ھامش ردالمختار جلد ۲ ص ۱۵)

نصاب زکوٰۃ: زر نقد پر زکوٰۃ کی مقدار احادیث نبویہ سے اڑھائی فیصد ہے۔ اس مقدار میں کوئی اختلاف نہیں۔ سونا پانچ اوقیہ (بیس مثقال، ساڑھے سات تولے) پر ۳ اونس۔

چاندی دو سو درہم یا ساڑھے باون تولے تقریباً ۲۱ اونس۔

اگر کسی شخص کے پاس نہ تو سونے کا پورا نصاب ہے اور نہ چاندی کا البتہ دونوں کو ملا کر نصاب بن جاتا ہے تو ہر ایک کا حساب کر کے اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سونا، چاندی کے ساتھ اور چاندی سونے کے ساتھ ملا کر زکوٰۃ دی تھی۔

غلہ اور پھلوں کی زکوٰۃ: پانچ وسق، ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے اور ایک صاع چار مد کا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لَیْسَ فِیْھَا دُوْنَ خَمْسَۃِ اَوْسُقٍ صَدَقَۃٌ (صحیح بخاری وصحیح مسلم) پانچ وسق سے کم سے صدقہ (زکوٰۃ) نہیں۔

مویشی میں زکوٰۃ

اونٹ:

تعداد	شرح زکوٰۃ
۵......۹	ایک بکری
۱۰......۱۴	دو بکریاں
۱۵......۱۹	تین بکریاں
۲۰......۲۴	چار بکریاں
۲۵......۳۵	اونٹ کا ایک سال کا بچہ
۳۶......۴۵	اونٹ کا دو سالہ بچہ
۴۶......۶۰	تین سال کا اونٹ کا بچہ
۶۱......۷۵	چار سال کا اونٹ
۷۶......۹۰	دو سال کے دو بچے
۹۱......۱۲۰	تین سال کے دو بچے

۱۲۰ کے بعد ہر چالیس پر دو سال کا ایک بچہ اور ہر پچاس پر تین سال کا ایک بچہ۔

بکری: ایک سے ۳۹ تک کی تعداد پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔

تعداد	شرح زکوٰۃ
۴۰......۱۲۰	ایک بکری
۱۲۱......۲۰۰	دو بکریاں
۲۰۱......۳۰۰	تین بکریاں

پھر ہر سو پر ایک ایک بکری

گائے، بیل، بھینس: ایک سے انتیس تک کی تعداد پر زکوٰۃ نہیں۔

تعداد	شرح زکوٰۃ
۳۰ پر	ایک دو سالہ بچھڑا
۴۰ پر	تین سالہ بچھڑا
۶۰ پر	دو سال کے دو بچھڑے
۷۰ پر	ایک تین سال کا اور ایک سال کا
۸۰ پر	تین سال کے دو
۹۰ پر	دو سال کے تین
۱۰۰ پر	دو سال کے دو اور تین سال کا ایک

زمین: زمین کی دو قسمیں ہیں۔ وہ زمین جو بارش یا قدرتی چشموں سے سیراب ہوتی ہے تو حکومت اس سے پیداوار کا دسواں حصہ لے گی جب زمین کنوؤں یا مصنوعی ذرائع سے سیراب ہوتی ہے تو اس سے پیداوار کا بیسواں حصہ لیا جاتا ہے۔

رکاز (دفینہ) اسلامی تعلیم کی رو سے اگر کسی کو دفینہ مل جائے تو حکومت اس کے پانچویں حصہ کی مالک ہوگی۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ...... فِی الرِّکَازِ الْخُمُسُ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا...... دفینہ میں اسلامی حکومت کا پانچواں حصہ ہے۔

سامان تجارت: یہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ روزانہ فروخت ہونے والا یا سامان تجارت کو ذخیرہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ پہلی صورت میں سال گزرنے پر اس کی نقد قیمت بنائی جائے اگر نصاب پورا ہو جاتا ہے تو اڑھائی روپے فیصد سے زکوٰۃ ادا کر دی جائے اگر نصاب پورا نہیں ہوا لیکن اس کے علاوہ بھی اس کے پاس رقم موجود ہے تو اس کے ساتھ ملا کر نصاب پورا کر لیا جائے۔

اگر سامان تجارت ذخیرہ کر لیا گیا ہے تو جس دن فروخت ہوگا اس دن ایک سال کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے چاہے کئی سال تک اس کے پاس سامان ذخیرہ رہے تاکہ اس کی قیمت بڑھ جائے۔

قرضہ پر زکوٰۃ کی تفصیل: قرضہ پر زکوٰۃ کی ادائیگی پر اختلاف ہے۔ بعض فقہاء کا یہ مسلک ہے کہ دائن اور مدیوں میں سے کسی پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں، یہ قول عکرمہ اور عطاء کا ہے لایزکی الذی علیه الدین والدین لایزکیه صاحبه حتی یقبضه (محلی لابن حزم جلد ۲ ص ۱۰۱) امام بیہقی نے بقول ابن حنذ حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ (سنن کبری جلد ۴ ص ۱۵) اور ابن حزم نے بھی حضرت عائشہؓ کا یہ قول اپنی کتاب محلی میں نقل کیا ہے۔ لیس فی الدین زکاۃ (جلد ۲ ص ۱۰۱) یعنی دین پر زکوٰۃ نہیں۔

اس قول سے معلوم ہوا کہ دائن اور مدیوں دونوں میں سے کسی پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ دائن اور مدیون میں کسی کو بھی دَین کی رقم پر قبضہ نہیں۔ مدیوں کو صرف قبضہ حاصل ہے لیکن ملکیت اصل میں دائن کی ہے اور دائن کی ملکیت اگرچہ دَین پر ہے لیکن قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملک تام حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا دونوں میں سے کسی پر بھی زکوٰۃ نہیں۔ یہی مسلک اصحاب ظواہر کا ہے۔ حسن بن زیاد کی بھی یہی رائے ہے کہ اس میں زکوٰۃ نہیں اس لیے دائن اس مال سے نفع نہیں اٹھاتا لیس لصابا لانه لا ینتفع به (فتح القدیر جلد ۲ ص ۱۲۳) جمہور فقہاء صحابہ اور تابعین کا مسلک یہ ہے کہ قرض کی زکوٰۃ کی ادائیگی دائن پر واجب ہے۔ سال گزرنے کے بعد اپنے پاس موجود نقدی میں شامل کر کے زکوٰۃ دے اگر قرض والی رقم کے علاوہ نقدی نہیں لیکن مال قرض سے نصاب پورا ہو گیا ہے تو بھی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

صحابہ میں سے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبداللہؓ بن عمر اور حضرت جابرؓ بن عبداللہ یہی مسلک رکھتے ہیں۔ تابعین میں جابر بن زید، مجاہد ابراہیم میمون بن مہران شامل ہیں۔ (کتاب الاموال ص ۴۳۰) فقہائے احناف کی بھی یہی رائے ہے۔ (ہدایہ مع البنایہ جلد ۳ ص ۲۷) یہ وہ صورت ہے جبکہ دائن کو رقم مدیوں کی امانت داری یا قانونی لحاظ سے ملنے کی توقع ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ دائن کو قرض ملنے کی امید نہ ہو اس صورت میں وجوب زکوٰۃ کے بارہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

ایک مذہب حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہؓ بن عباس کی جانب منسوب ہے کہ وہ یہ کہ قبضہ میں آنے سے قبل اس قرض پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ لیکن اگر دائن نے کسی طرح رقم وصول کر لی ہے تو گزشتہ تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے جتنے سال وہ رقم مدیوں کے پاس رہی ہے۔ (کتاب الاموال ص ۴۳۴، ۴۳۵) یہی مذہب امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا ہے۔

دوسرا مسلک حضرت حسن بصریؒ، عمر بن عبدالعزیزؒ اور امام مالکؒ کا ہے۔ دَین کی رقم قبضہ آنے کے بعد صرف ایک سال کی زکوٰۃ ادا کی جائے۔ امام مالک کا یہ مسلک ہے کہ صرف اس دین میں نہیں بلکہ ہر طرح کے دین میں خواہ اس کے ملنے کی امید ہو یا نہ ہو۔ ہر دو صورتوں میں سے کسی ایک سال کی زکوٰۃ ادا کر دینا کافی ہے البتہ تجارتی قرضے مستثنیٰ ہیں ان کی زکوٰۃ امام مالکؒ کے نزدیک ہر سال واجب ہے۔ (شرح کبیر و حاشیہ دسوتی ص ۴۶۶)

تیسرا مسلک حنفی فقہاء ہے کہ قرض وصول ہو جانے کے بعد بھی گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں۔ احناف کے نزدیک یہ مال ضمار کے حکم میں ہے۔ (ہدایہ مع البنایہ جلد ۲ ص ۲۴) حضرت علیؓ کے نزدیک مال ضمار میں زکوٰۃ میں نہیں ہے۔ (فتح القدیر لابن ہمام جلد ۲ ص ۱۲۲) اس طرح ابن ہمام نے حسن بصری اور عمر بن عبدالعزیزؒ سے ایسے اموال پر زکوٰۃ واجب نہ ہونا نقل کیا ہے جن کی وصولی کی امید ہی نہ ہو۔

اگر غور کیا جائے تو عقل سلیم اس طرف جاتی ہے کہ دائن پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں ایک تو دائن کا مال پر قبضہ تام نہیں دوم مال دائن کے حق میں نامی اور افزائش پذیر نہیں۔ کاسانیؒ نے لکھا ہے۔ لان المال اذا لم یکن مقدور الا انتفاع به فی حق المالک لایکون المالک به غنیا (بدائع

الصناع جلد ۲ ص ۹) یعنی اس لیے مال جبکہ مالک مال سے فائدہ اٹھانے کی قدرت نہیں رکھتا اس لیے وہ مالک غنی نہیں ہوسکتا کیونکہ مال غیر نامی ہے اس لیے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ بن حنبل کا یہی مسلک ہے ان کے ساتھ حضرت عمرؓ حضرت عبداللہ بن عباس اور امام حسن بصری اور ابراہیم نخعی کی یہی رائے ہے۔

دین اس وقت زکوٰۃ ادا کرنے پر مانع ہے جب دائن قرض دی ہوئی رقم کے بعد صاحب نصاب نہیں رہتا۔ اس حالت میں وہ شخص غنی اور مال دار نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ کسی شخص کے پاس ہزار درہم ہوں اور کسی اور کے اس پر ہزار درہم قرض ہوں۔ تو ایسے شخص پر زکوٰۃ نہیں۔ (المغنی جلد ۲ ص ۳۴۲) اسی طرح حضرت عثمانؓ سے روایت ہے آپؐ نے فرمایا یہ زکوٰۃ ادا کرنے کا مہینہ ہے۔ پس جس کے ذمہ قرض ہو۔ اسے چاہیے کہ پہلے قرض ادا کرے پھر زکوٰۃ ادا کرے۔ (موطا امام محمد ص ۱۲۸)

صدقہ الفطر: جیسا کہ پہلے یہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ اسلام نے انفاق فی سبیل اللہ پر زور دیا ہے۔ پھر انفاق کی مختلف شکلیں قرار دیں ان میں سے زکوٰۃ کو بہت ہی اہمیت حاصل ہے ان شکلوں میں سے ایک شکل صدقہ فطر ہے مسلمانوں پر فطرانہ لازم ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے۔ فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم زَكٰوةَ الْفِطْرِ مِنْ رَمَضَانَ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ اَوْصَاعًا مِنْ شَعِيْرٍ عَلَى الْعَبْدِ وَالْحُرِّ وَالذَّكَرِ وَالْاُنْثٰى وَالصَّغِيْرِ وَالْكَبِيْرِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (صحیح بخاری کتاب الزکوٰ باب فرض صدقہ الفطر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر پر غلام اور آزاد، مرد اور عورت چھوٹے اور بڑے سب مسلمانوں پر صدقہ فطر کھجور یا جو کا ایک صاع فرض کیا ہے۔

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَاْمُرُ بِاِخْرَاجِ الزَّكٰوةِ قَبْلَ الْغُدُوِّ لِلصَّلٰوةِ يَوْمَ الْفِطْرِ (سنن الترمذی ابواب الزکوٰۃ باب ماجاء فی تقدیمها قبل الصلوٰۃ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ صدقہ فطر، عیدالفطر کی نماز کے لیے نکلنے سے پہلے ادا کرنے کا حکم دیتے تھے۔

صدقہ فطر کی حکمت: حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں۔

فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ زَكَاةَ الْفِطْرِ طُهْرَةً لِلصَّائِمِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ وَطُعْمَةً لِلْمَسَاكِيْنِ (ابو داؤد فی باب زکوٰۃ الفطر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے دار کو لغو اور رفث سے پاک کرنے اور مساکین کی خوراک کے لیے صدقہ فطر فرض کیا ہے۔

فرمایا۔ اَغْنُوْهُمْ عَنِ السُّؤَالِ فِيْ هٰذَا الْيَوْمِ (سنن البیہقی) اس دن ان (مساکین وغرباء) کو سوال سے بے نیاز کردو۔

نصاب: غلہ کھجور وغیرہ کا ایک صاع، ایک صاع چار مد (اڑھائی کلو) کا ہوتا ہے۔ حضرت سعید خدری سے روایت ہے کہ "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چھوٹے بڑے آزاد وغلام کی طرف سے ایک صاع طعام یا ایک صاع پنیر یا ایک صاع جو یا ایک صاع کھجور یا ایک صاع کشمش نکالتے تھے۔ (صحیح بخاری) فقہاء کے نزدیک صدقہ الفطر اس شخص سے ساقط ہوتا ہے جو ایک دن کی خوراک کا مالک نہ ہو۔

صدقہ الفطر کے بارے میں شرعی حکم کی نوعیت: جمہور فقہاء کے نزدیک فرضیت کے معنی وجوب کے ہیں یعنی صدقہ الفطر واجب ہے۔

مالکیہ شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک صدقۃ الفطر فرض ہے اور بعض شافعی اور مالکی فقہاء کے نزدیک سنت ہے اور داؤد ظاہری کا بھی یہی قول ہے۔ (نووی جلد ۱ ص ۳۱۷) حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صدقہ فطر واجب ہے (ہدایہ مع فتح القدیر جلد ۲ ص ۲۱۸) عموماً فرض اور وجوب میں فرق نہیں کیا جاتا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے دونوں میں فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا جس چیز کا لزوم قرآن مجید سے دلالت قطعیہ سے ثابت ہو وہ فرض ہے اور جس چیز کا لزوم احادیث اور اخبار احاد سے ثابت ہو وہ واجب ہے چونکہ صدقہ الفطر کا لزوم احادیث سے ثابت ہے اس لیے واجب ہے۔

وہ اموال جن پر زکوٰۃ ادا نہیں کی جاتی: ا۔ غلاموں، گھوڑوں، خچروں اور گدھوں میں زکوٰۃ نہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ لَيْسَ عَلَى الْعَبْدِ فِيْ فَرَسِهٖ وَغُلَامِهٖ صَدَقَةٌ (صحیح بخاری) بندے پر اس کے گھوڑے اور غلام میں زکوٰۃ نہیں۔

۲۔ جو مال نصاب سے کم ہو: فرمایا لَيْسَ فِيْمَا دُوْنَ خَمْسَةِ اَوْسُقٍ صَدَقَةٌ وَلَيْسَ فِيْمَا دُوْنَ خَمْسِ اَوَاقٍ مِنَ الْوَرِقِ صَدَقَةٌ، وَلَيْسَ فِيْمَا دُوْنَ خَمْسِ ذَوْدٍ مِنَ الْاِبِلِ صَدَقَةٌ (صحیح بخاری ومسلم)

پانچ وسق سے کم میں صدقہ نہیں اور چاندی میں پانچ اوقیہ سے کم میں صدقہ نہیں اور پانچ عدد اونٹ سے کم میں صدقہ نہیں۔

۳۔ پھلوں اور سبزیوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوٰۃ ثابت نہیں۔

۴۔ عورتوں کے زیورات پر بھی زکوٰۃ نہیں۔
۵۔ قیمتی جواہرات میں زکوٰۃ نہیں اگر یہ تجارت کی غرض سے ہیں تو ان میں سامان تجارت کی طرح زکوٰۃ ہوگی۔
۶۔ گھریلو سامان میں زکوٰۃ نہیں۔

زکوٰۃ کے آداب

۱۔ رضائے الٰہی کا حصول: اسلامی تعلیمات کی رو سے جو بھی کام کیا جائے وہ رضائے الٰہی کا حصول ہو۔ اسی طرح جو شخص اپنی حلال کمائی میں سے بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے خرچ کرتا ہے اس کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہونا چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (البقرہ ۲:۲۶۵) اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو رضا چاہتے ہوئے اور اپنے آپ کو مضبوط رکھنے کے خرچ کرتے ہیں۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ (البقرہ ۲:۲۷۲) اور تم صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرتے ہو۔ خدا کی رضا کے لیے مال خرچ کرنے سے خدا کی راہ میں ثابت قدمی اور وفاداری بڑھتی ہے۔

ریاکاری سے اجتناب: خدمت خلق کا یہ عمل (زکوٰۃ) ریاکاری، نمود ونمائش سے پاک ہونا چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْكٰفِرِيْنَ (البقرہ ۲:۲۶۴) جو شخص احسان جتانے اور دل آزاری کے لیے مال خرچ کرتا ہے وہ شخص اس شخص کی طرح ہے جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہ لاتا ہو اس کی مثال اس صاف چٹان کی سی ہے جس پر مٹی ہو پھر اس پر زور کا مینہ برسے اور اسے بالکل صاف کر کے چھوڑ دے اس میں کچھ بھی نہ پاسکیں گے جو کمایا تھا اور اللہ کافروں کو راہ نہیں دکھاتا۔

مثال سے ریاکاری کا نتیجہ واضح ہو گیا ہے کہ جس طرح کسی پتھر پر مٹی ہو اور اس میں بیج ڈالا جائے تو اگتا نظر نہیں آتا۔ جب اس پتھر پر زور سے بارش پڑے تو بیج اور مٹی کو بہا کے لے جائے وہ پتھر بالکل صاف ہو جائے حالانکہ بارش روئیدگی کا سبب ہوتی ہے لیکن وہی بارش بجائے روئیدگی کے مٹی اور بیج بہا لے جانے کا ذریعہ ہو جاتی ہے۔ اس بیج سے کچھ حاصل نہیں ہوتا ایک عمدہ مثال سے یہ بتایا ہے ریاکاری کا نتیجہ بھی یہی حاصل ہوتا ہے کہ جو مال قوم کی ترقی کے لیے دیا جارہا ہے اس کا حاصل کچھ نہیں ہوگا کیونکہ نیت فاسد ہے۔ خدا کی رضا اور خدمت خلق مقصود نہیں۔

۳۔ احسان اور دل آزاری سے اجتناب: ارشاد الٰہی ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (البقرہ ۲:۲۶۴) اے ایمان والو! اپنے صدقات (لازمی اور اختیاری صدقات) کو احسان جتانے اور آزار سے باطل نہ کرو۔

احسان اور آزار سے انسان کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔

تعمیر سیرت کا ذریعہ ہے: جب کوئی انسان اپنے آپ کو اپنی اور دوسروں کی نظر میں گرا ہوا محسوس کرتا ہے تو یہ اسلام کی تعلیم تکریم انسانیت کے منافی ہے۔ عزت نفس کے مجروح ہونے سے صرف اس شخص کی ذات کو ہی نقصان نہیں ہوتا بلکہ یہ قومی سطح پر ایک خطرناک بیماری ہے جو قوموں کی بربادی کا ذریعہ ہے وہی مال جو قوم کی ترقی کے لیے خرچ کرنا مقصود ہوتا ہے وہ مال احسان جتا کر اور آزار دے کر قوم کو ادبار کی وادی میں دھکیل دیتا ہے۔

۴۔ طیب مال سے زکوٰۃ دی جائے: اسلام نے زکوٰۃ کی ادائیگی کے ساتھ یہ بھی حکم دیا ہے وہ طیب مال سے دی جائے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ (البقرہ ۲:۲۶۷) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ان اچھی چیزوں سے خرچ کرو جو تم کماتے ہو اور اس سے جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالا ہے اور ردی چیزوں کا قصد نہ کرو اس میں جو تم خرچ کرتے ہو۔

۵۔ علانیہ اور خفیہ دونوں ہی طریقے جائز ہیں: اسلام نے انجیل کے برعکس زکوٰۃ اور خیرات علانیہ اور خفیہ دونوں طریقوں سے ادا کرنے کی ہدایت دی ہے۔ انجیل میں آتا ہے کہ تم ریاکاری سے خیرات نہ کرو بلکہ تمھارے دایاں ہاتھ دے تو بایاں کو بھی خبر نہ ہو۔ قرآن مجید خیرات اور زکوٰۃ کی تعلیم کو کمال تک پہنچایا ہے کہ دوسرے لوگوں کو ترغیب اور تشویق دلانے کے لیے خالص نیت کے ساتھ علانیہ بھی زکوٰۃ و خیرات دے سکتے ہو اگر پسند کرو تو خفیہ بھی۔

قلبی مسرت: قرآن مجید نے منافقین کی ایک علامت یہ بیان کی ہے کہ انفاق زکوٰۃ) کو چٹی سمجھتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا (توبہ ۹:۹۸) ان اعراب میں سے بعض وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو چٹی سمجھتے ہیں۔

لفظ مَغْرَمًا (چٹی،) انقباض قلب کو ظاہر کرتی ہے۔ زکوٰۃ تزکیہ نفس اور تزکیہ مال کا ذریعہ ہے۔ یہ دونوں مقاصد اسی وقت پورے ہوں گے جب یہ عبادت دل کی گہرائیوں سے کی جائے۔

زکوٰۃ قومی خزانہ میں جمع ہونی چاہیے۔ وَالْعَامِلِیْنَ عَلَیْهَا (کارکنان زکوٰۃ) کے الفاظ سے ظاہر ہے اگر زکوٰۃ انفرادی طور پر خرچ کرنا ہوتی تو یہ الفاظ بیان نہ ہوتے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مانعین زکوٰۃ پر فوج کشی کی اس کی وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ حکومت کا حق ہے جو اس کا انکاری ہے وہ باغی ہے۔

دور حاضر میں سرکاری سطح پر مسلمان ممالک دور اولیٰ کی طرح زکوٰۃ کی وصولی کا وہ بندوبست نہیں کرتے۔ اگر زکوٰۃ کو جمع کرنے کا صحیح بندوبست ہو جائے تو بے شمار مالی مسائل حل ہو جائیں۔

مصارف زکوٰۃ

اسلام دولت اور وسائل دولت دونوں کو اللہ تعالیٰ کی مِلک قرار دیتا ہے انسان اس دولت کا امین ہے اس لیے احکام شریعت کے مطابق ہی اس میں تصرف کرسکتا ہے اگر احکام شریعت کے خلاف تصرف کرے گا تو وہ اسلام کی نظر میں خائن ہوگا حکومت بھی اسی قاعدہ کے تحت امین ہے اس کی جو آمدنی ہے وہ احکام الٰہی کے مطابق ہی صرف ہوگی۔ بعض تصرفات تو قرآن مجید نے واضح طور پر بیان کردیے ہیں۔ بعض کی وضاحت نہیں امیر مملکت کو اختیار حاصل ہے کہ حالات کے مطابق مسلمانوں اور ملک کی بہبود کے لیے خرچ کرے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَفِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَرِيْضَةً مِنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (توبہ ۹:۶۰) زکوٰۃ ناداروں کے لیے ہے اور مسکینوں اور اس کے کارکنوں کے لیے اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب ضروری ہے اور غلاموں کے آزاد کرنے اور قرض داروں کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے یہ اللہ کی طرف سے ضروری قرار دیا گیا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

فقراء: فقیر کی جمع ہے۔ فقیر فَقْر سے مشتق ہے جس کے معنی ریڑھ کی ہڈی توڑنا ہے یہ لفظ اس شخص پر بولا جاتا ہے جو کسی جسمانی عذر کی وجہ سے، بیماری کی وجہ سے، بڑھاپے کی وجہ سے یا جس پر کوئی سخت مصیبت آن پڑی ہو اور وہ اس قابل نہ رہا ہو کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکے۔

مساکین: مسکین کی جمع ہے مسکین سَکَنَ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں وہ خاموش یا بے حرکت ہوگیا مسکین سے مراد وہ شخص ہے۔ جو کمانے کے لائق ہو مگر غربت یا عدم ذرائع کی وجہ سے کچھ کما نہ سکتا ہو اور کسی کے سامنے دست سوال پھیلانا پسند نہ کرے۔ ایک حدیث میں ہے۔ مسکین وہ ہے جو ضروری مال سے بھی محروم ہو اور پہچان میں نہ آئے اور نہ ہی وہ لوگوں سے کھڑے ہو کر مانگتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول ہے لیس المسکین الذی لا مال له ولکن المسکین الذی لا مکسب له یعنی مسکین وہ نہیں جس کے پاس مال نہیں بلکہ مسکین وہ ہے جس کے پاس کمائی کا ذریعہ نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جس کے پاس مال نہیں وہ مسکین ہے لیکن جس کے پاس مال بھی نہیں اور نہ ذریعہ معاش ہے اس کی مسکنت تو شدید تر ہے۔ اس مد میں وہ تمام لوگ آجاتے ہیں جو صاحب ہنر ہیں لیکن نادار ہیں اور اپنے ہنر کے لیے اوزار نہیں خرید سکتے۔ اس طرح وہ لوگ بھی شامل ہیں جو تعلیم یافتہ ہیں لیکن ان کو روزگار نہیں ملا۔ حکومت کا یہ فرض ہے کہ ان تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے زکوٰۃ کے فنڈ سے ماہوار وظیفہ مقرر کرے۔ اس طرح غریب طلباء بھی مسکین کے زمرے میں آتے ہیں۔

عاملین علیہا (کارکن): اس مد میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو زکوٰۃ کے جمع کرنے والے حساب رکھنے والے اور حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرنے والے ہیں۔ گویا اس میں ریاست کی تمام سول انتظامیہ شامل ہے۔

المولفة قلوبهم (تالیف قلب) یہ چار قسم کے لوگ ہیں اوّل ایسے لوگ جو لوگ اسلام میں داخل نہیں ہوئے لیکن ان کو اسلام کے قریب لانے کی ضرورت ہے اس قسم کے لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے کئی طریقے ہیں ان کے لیے سکول ہسپتال اور دیگر رفاہی ادارے قائم کیے جائیں ان کے لیے اسلامی کتب کی لائبریریاں بنائی جائیں۔ اسلامی لٹریچر مفت تقسیم کیا جائے وغیرہ۔

دوم۔ وہ نومسلم جن کے قلوب میں اسلام پورے طور پر راسخ نہیں ہوا۔ اور ان کی امداد اور ان کو تعلیم اسلام سے واقف کرانے کے لیے بیت المالؒ سے خرچ کیا جائے گا۔ یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی آدمی اپنے مذہب کو ترک کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہوگا تو اس کے اعزہ و اقربا اور ہم قوم اس سے اپنے تعلقات قطع کرلیں گے کیونکہ انسان کی عقل پر اپنے مذہبی پردے ہوتے ہیں کہ وہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کا کوئی عزیز دوسرا دین قبول کرے۔

اس مصرف کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نومسلم ایمان لائیں تو اسلامی حکومت ان کے اخراجات کا بوجھ اٹھائے اور اپنے اعزہ و اقربا اور ہم قوم کا معاشرتی بائیکاٹ کو بھول جائیں اور مسلمانوں میں داخل ہو کر یہ سمجھیں کہ وہ ایسے معاشرے میں داخل ہوئے ہیں جو خونی اور نسبی تعلقات سے بھی زیادہ محبت کرنے والا ہے۔

سوم۔ وہ لوگ جن کے شر سے مسلمانوں اور اسلام کو بچانا مقصود ہوتا ہے تا کہ حالت جنگ میں وہ غیر جانب دار رہیں گے۔
چہارم۔ وہ لوگ ہیں جن کو رقم اس لیے دی جائے کہ وہ مسلمانوں کی مدد کریں۔

فی الرقاب: (غلاموں کو آزاد کرانا) اسلام کے علاوہ کوئی مذہب نہیں جس نے غلاموں کی رہائی کے لیے باضابطہ طور پر بیت المال سے ایک مد مقرر کر دی ہو۔ یہ آزادی تین طرح کی ہو سکتی ہے۔ ا۔ حکومت مالکوں سے غلام خرید کر آزاد کرائے۔ ۲۔ اسیران جنگ کا فدیہ دیا جائے۔ ۳۔ ان غلاموں کی مدد کی جائے جو مالک سے مکاتب ہونا چاہتے ہیں۔ فی الرقات میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں۔

طبقات ابن سعد میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ایک خط نقل کیا ہے وہ خط گورنر یمن کے نام ہے اس خط میں لکھتے ہیں کہ جتنی رعایا دشمن کے ہاتھ قید ہے اس کو چھڑانے کے لیے سرکاری خزانے سے رقم خرچ کی جائے اس صراحت کے ساتھ کہ چاہے وہ مسلمان ہو یا ذمی۔

گویا اسیران جنگ کی رہائی کے لیے بھی اس مد سے خرچ کیا جائے گا۔ اسی طرح ان جہادی تحریکوں کی جن کے ملکوں پر استعماری طاقتوں نے غاصبانہ قبضہ کر لیا ہوا ہے۔ اس مد سے مدد کی جانی چاہیے تا کہ ضروری سامان جنگ خرید کر سکیں۔

الغارمین (مقروض): قرض داروں کا قرض اتارنے کے لیے زکوٰۃ کی مد سے خرچ کیا جائے گا اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن پر جرمانہ ہو گیا ہو مگر یہ شرط ضروری ہے کہ مقروض پر قرضے کا بوجھ عیاشی اور فضول خرچی کی وجہ سے نہ ہو بلکہ کسی ناگہانی مالی مصیبت کی وجہ سے ہو۔ مال چوری ہو جائے۔ تجارت میں گھاٹا پڑ جانے کی وجہ سے قرض کے بوجھ تلے آ گیا ہو اس سے نجات حاصل کرنا مشکل نظر آتا ہو تو حکومت کا یہ فرض ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی مدد زکوٰۃ فنڈ سے کرے۔

حضرت عمرؓ نے لفظ غارمین سے استنباط کی ایک نئی راہ نکالی ہے وہ یہ ہے کہ خزانہ سے لوگوں کی امداد نہیں بلکہ قرضہ حسنہ بلا سود دینا ہے ایک ایسا شخص ہے جس کو امداد کی ضرورت نہیں لیکن اس کو کاروبار چلانے کے لیے مال کی ضرورت ہے حضرت عمرؓ کے دور میں سرکاری خزانے سے اس قسم کے لوگوں کو مالی امداد کی جاتی تھی یہ رقم بطور قرض کے ہوتی تھی واپس کرنا ضروری ہوتا تھا۔

فی سبیل اللہ: (اللہ کے راستے میں): اس سے مراد جہاد ہے جہاد تین قسم کا ہے جہاد سیفی، جہاد قلبی اور جہاد لسانی۔

جہاد سیفی سے مراد یہ ہے کہ ملک کے دفاع کا خرچ زکوٰۃ فنڈ سے کیا جائے جہاد قلمی سے مراد یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت کے لیے عمدہ عمدہ کتب زکوٰۃ کے فنڈ سے خرچ کر کے شائع کی جائیں۔ جہاد لسانی سے مراد یہ ہے کہ بیت المال کے خرچ پر مبلغ تیار کر کے بیرونی ملک بھیجے جائیں اور وہ فریضہ تبلیغ انجام دیں۔ ''فی سبیل اللہ'' کے تحت تمام ملٹری انتظامیہ آ جاتی ہے سپاہیوں کی تنخواہوں کی ادائیگی اور جدید ترین اسلحہ کی تیاری پر اس مد سے خرچ کیا جائے گا۔

ابن السبیل (مسافر): بیت المال سے مسافروں کی امداد کرنے کا حکم ہے۔ بعض اوقات سفر میں ایسے مراحل آ جاتے ہیں کہ مسافر بیمار ہو جاتا ہے، اس کی رقم گر جاتی ہے تو وہ بالکل تہی دست ہو جاتا ہے اس صورت میں وہ مالی امداد کا محتاج ہو جاتا ہے حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اس قسم کے مسافروں کی مالی امداد کر کے ان کے گھروں تک پہنچائے۔

جب سے زکوٰۃ کی تقسیم حکومت کی بجائے نجی ہاتھوں میں آئی ہے اس کا مفہوم بھی تنگ ہو گیا ہے۔ فقہاء نے زکوٰۃ کے مستحقین صرف مسلمان قرار دیے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے دور میں زکوٰۃ غیر مسلموں پر بھی خرچ کی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ ایک روز مدینہ میں کسی گلی سے گزر رہے تھے دیکھا کہ ایک شخص بھیک مانگ رہا ہے اس سے بھیک مانگنے کی وجہ پوچھی تو بوڑھے نے کہا کہ میں یہودی ہوں۔ جوانی میں کاروبار کیا کرتا تھا اور جزیہ دیا کرتا تھا اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ کام نہیں کر سکتا لہٰذا بھیک مانگنے پر مجبور ہوں حضرت عمرؓ نے فوراً امیر خزانہ کو حکم دیا کہ اس یہودی کے لیے روزینہ مقرر کر دیا جائے۔ آپ نے فرمایا ''ھذا من مساکین اھل الکتاب'' یہ مساکین کے زمرہ میں آتا ہے اس لیے زکوٰۃ سے رقم دی جائے۔

مقابلہ یہودی شریعت: یہودی شریعت کی رو سے زکوٰۃ خاص لادیوں (قوم موسیٰ) کا حق تھا یا مسکن کے لیے خرچ کرتے تھے۔ تورات میں آتا ہے ہدایا مسکن کے لیے سونا، سونے کے برتن، نمدے، مینڈھے، بیل بخور (گنتی ۷ باب ۱۱، ۱۸ باب ۸، ۳۵) گھر کے لیے سال بسال ثلث مثقال تخمیناً ۷ باب ۳۱ یہ فدیہ ہارون اور اس کی اولاد کے لیے (گنتی ۴ باب ۴۸ خروج ۳۰ باب ۱۳......۲۶۔۲ تاریخ ۲۴ باب ۶، ۹) زکوٰۃ عیسائیت اور آریہ میں کاہنوں اور برہموں کے لیے ہے۔ جبکہ اسلام میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خاندان کے لیے زکوٰۃ نہیں۔

فلسفہ زکوٰۃ

انفرادی فوائد: زکوٰۃ تزکیہ نفس کا موجب ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ ۹:۱۰۳) یعنی ان کے مالوں سے زکوٰۃ لے تاکہ اس سے انھیں پاک صاف کرے۔

انسان کو سب سے زیادہ عزیز اور محبوب چیز مال ہے اسی وجہ سے قرآن مجید نے مال کو فتنہ قرار دیا ہے کیونکہ بعض اوقات محبوب چیز کی وجہ سے احکام الٰہی کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ زکوٰۃ انسان کے دل سے مال کی محبت کم کرتی ہے۔ مال کی محبت کی کمی کی وجہ سے انسان اکثر برائیوں سے بچ جاتا ہے اور نیکیوں کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ ایک تو ناجائز طریقہ سے روپیہ کمانے سے احتراز کرتا ہے دوم بخل جیسی قبیح عادت سے نجات مل جاتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے۔ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الحشر ۹:۵۹) اور جو اپنے دل کو حرص و لالچ سے بچائے گا وہی کامیاب ہونے والا ہے۔ سوم۔ انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے جو تمام نیکیوں کی جڑ ہے اور انسان کی زندگی کا منتہائے مقصود اور مطلوب ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ. (بقرہ ۲:۲۶۵) ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو رضائے الٰہی کے حصول کے لیے خرچ کرتے ہیں اور کچھ اپنے آپ کو مضبوط کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں اس باغ کی مثال کی طرح ہے جو اونچی جگہ پر ہے۔

اس آیت کریمہ میں زکوٰۃ کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ جو لوگ رضائے الٰہی کے لیے صدقات دیتے ہیں وہ ایمان کی ایک محکم چٹان پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کے دل اللہ کی محبت سے بھر جاتے ہیں اور ان کی طبیعت خود بخود نیکی کی طرف بہہ نکلتی ہے اور اپنے آپ کو ایک حصن حصین میں پاتے ہیں۔ جہاں شیطان کا گزر نہیں ہوتا۔

اجتماعی فوائد

اقتصادی ترقی: زکوٰۃ قوم کی اقتصادی ترقی کا بہترین ذریعہ ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ (البقرہ ۲:۲۷۶) اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (بقرہ ۲:۲۶۱) ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ایک دانہ کی مثال ہے جو سات بالیں اگائے ہر ایک بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے کئی گنا کر دیتا ہے اور اللہ بہت دینے والا اور جاننے والا ہے۔

زکوٰۃ کا لفظ بھی قوم کی معاشی ترقی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ زکوٰۃ کا مفہوم ہی بڑھوتی ہے۔

اقتصادی ترقی کا انحصار چند اشخاص کے ہاتھوں میں دولت کے جمع ہونے پر نہیں ہے بلکہ ساری قوم کی مجموعی خوش حالی سے وابستہ ہے۔ جب غرباء میں زکوٰۃ تقسیم ہوگی تو روپیہ چند ہاتھوں سے نکل کر بے شمار دوسرے افراد میں تقسیم ہو جائے گا۔ دوم وہ اس مالی امداد سے اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ اپنی روزی کما سکیں، اس طرح ملک کی اقتصادی اور معاشی حالت مستحکم بنیادوں پر قائم ہو جائے گی۔

زکوٰۃ قوم کی ترقی کا ذریعہ ہے: قرآن مجید نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو قوم کی ترقی کا ذریعہ بیان کیا ہے سورہ بقرہ میں حضرت حزقیل کا ایک رویاء بیان ہوا ہے کہ وہ ایک تباہ حال بستی (یروشلم) پر سے گزرے اس کو دیکھ کر حضرت حزقیل نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ یہ بستی کب آباد ہوگی۔ کب اس کے رہنے والے ترقی کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو رویاء میں بتایا کہ یہ بستی سو سال کی تباہی کے بعد آباد ہوگی۔ اس رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے احیاء موتی کی کیفیت کا سوال کرتے ہیں معاً اس رکوع کے بعد انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر آ جاتا ہے تباہ حال بستی اور احیاء موتی کے ذکر کے معاً بعد اللہ کی راہ میں خرچ کا بیان یہ ظاہر کرتا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کا تباہ حال بستی کی آبادی اور احیاء موتی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

تاریخ اس بات پر شہادت دیتی ہے کہ وہی قوم دنیا کے نقشہ پر ترقی کے ساتھ ابھرتی ہے جو قومی ملی مفاد کی خاطر خرچ کرنا جانتی ہے۔ آغاز اسلام میں مسلمان کسمپرسی اور غربت کی حالت میں تھے انھوں نے اس حالت میں بھی ملی اور قومی مفاد کے لیے خرچ کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی ملی ضرورت کے لیے چندہ کی اپیل کرتے تو صحابہ اپنے گھروں کا اثاثہ لا کر پیش کر دیتے تھے۔ اگر کسی کے پاس کچھ نہیں تو وہ مزدوری کر کے چند ٹکے کما کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیتا تھا۔ آخر اس قربانی کے نتیجہ میں یہ اللہ کے فضلوں کے وارث بنے اور بڑی بڑی حکومتیں ان کے قدموں پر آن پڑیں۔

۳۔ غرباء کی ربوبیت: زکوٰۃ قوم کے غرباء کی ربوبیت اور کفالت کا بہترین ذریعہ ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ

عَلَیْھِمْ صَدَقَةً تُؤخَذُ مِنْ اَغْنِیَاءِ ھِمْ فَتُرَدُّ فِی فُقَرَاءِ ھِمْ (بخاری ۱:۲۴) یعنی اللہ نے ان پر (مسلمانوں) پر زکوٰۃ فرض کی ہے اور وہ امراء سے لے کر حاجت مندوں میں تقسیم کی جائے۔

۴۔ زکوٰۃ قوم کی اخلاقی حالت درست رکھنے کا ذریعہ ہے: بھوک غربت اور افلاس ہمیشہ جرائم کے ارتکاب کا سبب بنتے ہیں جس قوم کے افراد افلاس کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں اس قوم میں جرائم کی کثرت ہو جاتی ہے۔ روزمرہ کے واقعات اس پر کافی گواہ ہیں کہ بعض لوگ مالی عسرت کی وجہ سے چوری، قزاقی اور لوگوں کی جیبیں کاٹنی شروع کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات جب غربت اور افلاس انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو یہ دن دھاڑے امراء کا خون سے اپنے ہاتھ رنگنا شروع کر دیتے ہیں اور ملک کا امن تہس نہس ہو جاتا ہے۔

غربت کی وجہ سے انسان صرف جرائم کا ہی ارتکاب نہیں کرتا بلکہ اس میں اور بھی بے شمار اخلاقی کمزوریاں آ جاتی ہیں۔ فقر اور مسکنت انسان کو دنی اور خسیس بنا دیتی ہے اور ایمان باللہ دل سے نکل جاتا ہے وہ امراء کو ہی ارباباً من دون اللہ (اللہ کے سوا دوسرے کو معبود بنا لینا) تصور کرنا شروع کر دیتا ہے انہی کو اپنا پالن ہار اور مربی خیال کرتا ہے۔ ان کا خوف خدا کے خوف سے بڑھ کر دل پر مستولی ہوتا ہے یہی وہ اخلاقی بیماریاں ہیں جن کی وجہ سے انسان کی طبعی استعدادیں دب جاتی ہیں اور قردۃ خاسئین کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔

زکوٰۃ کا معاشی نظام میں مقام

اس وقت دنیا میں دو معاشی نظام چل رہے ہیں ایک سرمایہ داری اور دوسرا کمیونزم۔ سرمایہ داری کا مزاج اس قسم کا ہے اس سے دولت چند ہاتھوں میں جمع ہو جاتی ہے اور دوسری قوم افلاس کی دلدل میں پھنس جاتی ہے اس نظام کے ردعمل سے دوسرا معاشی نظام اشتراکیت وجود میں آیا۔ جس کا اصول یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے کمائے ہوئے مال کا مالک نہیں ہے۔ سب دولت حکومت کی ہے اور وہ تمام لوگوں کو ضروریات کے مطابق دے گی۔

یہ دونوں نظریات افراط اور تفریط کا شکار ہیں اگر سرمایہ داری نظام مزدور طبقہ کے افلاس کا سبب بنتا ہے اور ان کی محنت کی بے وقری کرتا ہے جب کہ اشتراکی نظام میں مزدور محنت سے کمائی ہوئی چیز کا مالک نہیں بن سکتا۔ اس سے محنت اور کوشش کرنے کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔

اسلام نے دونوں نظاموں کے برعکس محنت کی توقیر اور عزت کی ہے۔ ملکیت کو بھی جائز قرار دیا ہے تاکہ محنت کرنے کا جذبہ زندہ رہے۔ دوسری طرف تقسیم دولت کے لیے زکوٰۃ کی ادائیگی کا لازمی قانون نافذ کر دیا تاکہ دولت چند ہاتھوں میں جمع نہ ہونے پائے بلکہ ساری قوم میں گردش کرتی رہے کیونکہ زکوٰۃ کا اصول یہ ہے کہ ہر سال جمع شدہ سرمایہ کا چالیسواں حصہ غرباء کے لیے بیت المال میں جمع کیا جائے ایک تو زکوٰۃ کی ادائیگی کی وجہ سے سرمایہ دار ہمیشہ اپنے سرمایہ کو کاروبار میں لگائے رکھے گا تاکہ زکوٰۃ ہی تمام سرمایہ کو نہ کھا جائے۔ کاروبار میں سرمایہ لگانے سے روپیہ لوگوں کے ہاتھوں میں گردش کرتا رہتا ہے اور مزدور طبقہ بھی اپنی محنت کا پھل حاصل کرتا رہتا ہے دوسرے امراء اور غرباء کے تعلقات خوشگوار رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو اپنا بھائی خیال کرتے ہیں۔ دونوں طبقوں کے باہمی اتحاد، اتفاق اور مواخات کی وجہ سے ملک اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے محفوظ رہتا ہے۔

اگر مسلم ریاستیں زکوٰۃ کے نظام کو مستحکم بنالیں تو ریاست کا مالی نظام مضبوط بنیاد پر قائم ہو جائے گا۔ اس سے صرف غربت اور افلاس ہی دور نہ ہوگی بلکہ ملکی دفاع بھی مضبوط ہوگا۔

زکوٰۃ کی وصولی اور ادائیگی کا مسئلہ: اسلامی حکومت کی موجودگی میں کوئی ادارہ زکوٰۃ وصول کر کے عامۃ الناس کی بھلائی پر خرچ نہیں کر سکتا۔ زکوٰۃ صرف حکومت وصول کر سکتی ہے۔ عہد نبوی میں زکوٰۃ بیت المال میں جمع ہوتی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب مسلمان عرب قبائل نے حکومت کو زکوٰۃ دینے سے انکار کیا اور مالیاتی نظام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تو خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ نے ان لوگوں کو حکومت کا باغی قرار دے کر ان کے خلاف اعلان جہاد کیا اور اس وقت تک ان کی سرکوبی کی جب تک انھوں نے زکوٰۃ بیت المال میں بھیجنی شروع نہ کر دی جب حضرت عثمان شہید ہو گئے تو مسلمان حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کی حمایت میں دو گروہوں میں بٹ گئے۔ اس انتشار اور سیاسی عدم استحکام کے زمانہ میں صحابہ کرام کے درمیان یہ سوال اٹھا کہ زکوٰۃ کس کو دی جائے تو اہل مدینہ نے عبداللہ بن عمر سے اس بارے میں استفسار کیا تو انھوں نے یہ فتویٰ دیا مسلمانوں کی حکومت کیسی ہو زکوٰۃ بہرحال حکومت کو ادا کی جائے گی۔

اہل حجاز کے لیے ایک عملی دشواری یہ تھی حجاز پر کبھی حامیان معاویہ غالب آ جاتے اور کبھی شیعان علی اور دونوں حکومتیں ایک دوسرے کو باغی سمجھتی تھیں ایسی حکومتوں میں سے کس کو زکوٰۃ ادا کی جائے۔

جب یہ مسئلہ دوبارہ حضرت عبداللہ بن عمر کے سامنے پیش ہوا تو انھوں نے جواب دیا جو غالب آ جائے اسے زکوٰۃ دے دو (ابوعبیدہ کتاب الاموال

ج ۲ جلد ۳۴۹)

ایک دفعہ ربیع بن معید نے اس فتنے کے دور میں حضرت عبداللہ بن عمر سے دریافت کیا کہ وہ اپنے زیر نگرانی یتیموں کے مال کی زکوٰۃ اپنے ضرورت مند عم زاد بھائیوں کو دے دوں آپ نے فرمایا ''زکوٰۃ صرف حکومت کا حق ہے اسے اہل حکومت کے حوالے کر دو۔ (ابوعبیدہ کتاب الاموال ج ۲ ص ۳۴۳) غرضیکہ مسلمانوں کا اس امر پر اجماع ہے کہ زکوٰۃ صرف اسلامی حکومت کو ادا کرنی چاہیے۔ زکوٰۃ کی وصولی کا اور کوئی حق نہیں رکھتا۔

زکوٰۃ کو انفرادی طور پر جمع کرنے کا رواج سقوط بغداد کے بعد ہوا جب مسلمانوں کا سیاسی شیرازہ منتشر ہو گیا تو مسلمانوں نے غیر مسلم حکومتوں کو زکوٰۃ دینا مناسب نہ سمجھا اس کے بعد زکوٰۃ کی وصولی حکومتوں کے ہاتھ نہ آئی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومتوں کی معاشی حالت درست نہیں ہوتی۔ اگر اسلامی حکومتیں زکوٰۃ کی وصولی اپنے ہاتھ میں لیں۔ تو ہر اسلامی حکومت اپنے ملک سے غربت اور افلاس کو ختم کر سکتی۔

زکوٰۃ اور ٹیکس میں اصولی فرق: بعض متجددین زکوٰۃ کو ٹیکس شمار کرتے ہیں اس کے متعلق یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ٹیکس کی کمی بیشی اور ساقط کرنے کا حکومت کو ہر وقت اختیار ہے جبکہ زکوٰۃ میں نہ کمی بیشی ہو سکتی ہے اور نہ صاحب نصاب سے ساقط ہو سکتی ہے ٹیکس کی ادائیگی نہ کرنے کی وجہ سے بندہ صرف حکومت کا مجرم ہوتا ہے اور زکوٰۃ نہ ادا کرنے سے انسان خدا کا بھی مجرم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے مصارف قرآن مجید میں بیان کر دیے ہیں اور انہی جگہوں پر زکوٰۃ خرچ ہو گی جبکہ ٹیکس کے خرچ کرنے میں حکومت کو اختیار ہے جہاں چاہے خرچ کرے اس وجہ سے یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ زکوٰۃ ٹیکس ہے جب حکومت کسی سے کوئی ٹیکس وصول کرے تو زکوٰۃ کی ادائیگی ضروری نہیں رہتی۔ زکوٰۃ خدائی مالی فریضہ ہے جو کسی صورت میں صاحب نصاب سے ساقط نہیں ہوتا۔

صوم (روزہ)

صوم کے لغوی اور اصطلاحی معنی: صوم کے لغوی معنی رکنے کے ہیں لیکن شریعت کی اصطلاح میں صبح صادق سے غروب آفتاب تک ارادۃً کھانے پینے اور مباشرت سے رکے رہنے کا نام ہے۔

روزہ عالمگیر عبادت ہے: روزہ سب مذاہب میں بطور عبادت کے فرض ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (سورہ بقرہ ۲:۱۸۳) اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح ان لوگوں پر فرض کیے گئے تھے جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے۔

''اس کے طریقے اور اس کی اغراض آب و ہوا قوم ونسل اور تہذیب و تمدن اور دوسرے حالات کے پیش نظر سب کچھ مختلف ہیں لیکن کسی ایسے قابل ذکر مذہبی سلسلے کا نام لینا مشکل ہے جس میں روزہ سے کلیتہً انکار کر لیا گیا ہو۔ اور اسے تسلیم نہ کیا گیا ہو۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا از مضمون روزہ Fasting)

روزہ کی اہمیت: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اَلصِّیَامُ جُنَّةٌ فَلَا یَرْفُثْ وَلَا یَجْھَلْ وَاِنِ امْرُءٌ قَاتَلَهٗ اَوْ شَاتَمَهٗ فَلْیَقُلْ اِنِّیْ صَائِمٌ مَرَّتَیْنِ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَخُلُوْفُ فَمِ الصَّائِمِ اَطْیَبُ عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰی مِنْ رِیْحِ الْمِسْکِ یَتْرُکُ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ وَشَھْوَتَهٗ مِنْ اَجْلِیْ اَلصِّیَامُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِهٖ وَالْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِھَا (بخاری کتاب الصوم باب فضل الصوم) روزہ ڈھال ہے سو چاہیے کہ روزہ رکھنے والا فحش باتیں نہ کرے۔ نہ جہالت کی باتیں کرے اگر کوئی اس سے لڑے یا گالی دے تو دو دفعہ کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ روزہ دار کے منہ کی خوشبو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) وہ اپنا کھانا پینا اور (اپنی) نفسانی خواہشات میری (رضا) کے لیے چھوڑتا ہے۔ روزہ صرف میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا اور نیکی کا بدلہ اس کا دس گناہ ہے۔

فرمایا فَاِذَا کَانَ یَوْمُ صَوْمِ اَحَدِکُمْ فَلَا یَرْفُثْ یَوْمَئِذٍ وَلَا یَسْخَبْ فَاِنْ سَابَّهٗ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَهٗ فَلْیَقُلْ اِنِّیْ صَائِمٌ اِنِّیْ (مسلم جلد اول باب فضل الصیام) پس جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو چاہیے کہ وہ نہ فحش باتیں کرے اور نہ غل غپاڑہ کرے اور اگر کوئی اس سے گالی گلوچ کرے یا لڑائی جھگڑا کرے تو وہ کہے کہ میں روزے سے ہوں میں روزے سے ہوں۔

ان دونوں احادیث میں روزے کا یہ ادب سکھایا ہے کہ روزے کی حالت میں روزے دار کسی سے گالی گلوچ، فحش کلامی اور لڑائی جھگڑا نہ کرے۔

فرمایا مَنْ لَّمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَیْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِیْ اَنْ یَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ (بخاری کتاب الصیام باب مَنْ لَّمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فِی الصَّوْمِ) جو کوئی جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔

فرمایا اِنَّ فِی الْجَنَّةِ بَابًا یُّقَالُ لَهُ الرَّیَّانُ یَدْخُلُ مِنْهُ الصَّائِمُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ لَا یَدْخُلُ مِنْهُ اَحَدٌ غَیْرُھُمْ یُقَالُ اَیْنَ الصَّائِمُوْنَ؟ فَیَقُوْمُوْنَ لَا یَدْخُلُ مِنْهُ اَحَدٌ غَیْرُھُمْ فَاِذَا دَخَلُوْا اُغْلِقَ فَلَمْ یَدْخُلْ مِنْهُ اَحَدٌ (بخاری کتاب الصیام باب الرَّیَّانُ لِلصَّائِمِیْنَ) جنت میں ایک دروازہ ہے جسے ریان کہتے ہیں۔ اس سے قیامت کے دن روزہ دار داخل ہوں گے ان کے سوا اور کوئی اس سے داخل نہ ہوگا کہا جائے گا۔ روزہ دار کہاں ہیں تو وہ کھڑے ہو جائیں گے۔ اس سے ان کے سوا اور کوئی داخل نہ ہوگا۔ جب وہ داخل ہو جائیں گے تو اسے بند کر دیا جائے گا پھر اس سے کوئی داخل نہ ہوگا۔

ریان رواء سے ہے اور رواء وہ پانی ہے جو سیراب کرتا ہے اور یہ وہ میٹھا پانی ہے جس سے تروتازگی آتی ہے۔ اس حدیث میں ''ریان'' جنت کے دروازے کو کہا گیا ہے جو صائم کے لیے ہے۔ قیامت کے دن ہر عمل کی مناسبت سے اجر ملے گا چونکہ صائم پیاس کی شدت محسوس کرتا ہے اس کو جزا کے طور پر مخصوص رنگ میں تروتازگی اور سیرابی دی جاتی ہے۔

فرمایا: مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ بخاری کتاب الصوم باب من صام رمضان ایمانا الخ) جس نے ایمان اور احتساب (رضا الٰہی چاہتے ہوئے) کے ساتھ روزے رکھے۔ اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔

ماہ رمضان کی فضیلت: ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْاٰنُ (البقرہ۲:۱۸۵) رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا۔

پھر اس میں وہ مبارک رات ہے جس کو لیلۃ القدر کہا جاتا ہے۔ اس لیلۃ القدر میں ہی نزول قرآن ہوا۔ لیلۃ القدر کو لیلۃ المبارک بھی کہا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ إِنَّآ أَنْزَلْنٰهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ مَآ أَدْرٰكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ أَمْرٍ سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (القدر۹۷:۱......۵) ہم نے اسے (قرآن) لیلۃ القدر میں اتارا۔ اور تجھے کیا خبر کہ لیلۃ القدر کیا ہے لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے اس میں فرشتے اور روح اپنے رب کی اجازت سے ہر امر خیر (بھلائی) کو لے کر نازل ہوتے ہیں۔ سلامتی یہ فجر کے طلوع تک ہے۔

اس لیلۃ القدر کو دوسری جگہ لیلۃ المبارک کیا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ إِنَّآ أَنْزَلْنٰهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (الدخان۴۴:۳) ہم نے اسے بابرکت رات میں نازل کیا ہے۔

قرآن مجید کی توصیف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُورٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِينٌ يَّهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّورِ وَيَهْدِيهِمْ إِلٰى صِرٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ (المائدہ ۵:۱۵، ۱۶) تمھارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور واضح روشن کتاب آ چکی ہے۔ اللہ اس کے ذریعہ اپنی رضا اور سلامتی کی راہیں کھولتا ہے۔ اس کے ذریعہ انھیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف نکال لاتا ہے اور ان کو سیدھی راہ کی طرف ہدایت دیتا ہے۔

قرآن مجید کے اس وصف کی صداقت وہ انقلاب عظیم ہے جو اس نے بے آب وگیاہ وادی عرب میں برپا کیا۔ وہ عرب جو ہر قسم کی برائی میں مبتلا تھے۔ ان بگڑے ہوئے انسانوں کو باادب پھر بااخلاق بنایا۔ پھر باخدا۔ خدا کی رضا کے لیے ان کے سینے کھل گئے وہ عرب جو گناہوں میں لذت لیتے تھے اب وہی عرب برائیوں سے نفرت کرنے لگے۔ خدا کی عبادت میں لذت اور سرور پانے لگے۔ ہر دم خدا کی یاد میں رہتے دنیا میں رہتے ہوئے انقطاع عن الدنیا تھے۔ ہر لحہ دل و دماغ متوجہ الی اللہ تھے۔ اس روحانی قرب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کی نعمت سے متمتع ہوئے۔ یہ تھا وہ روحانی انقلاب جو قرآن مجید نے برپا کیا۔ پھر وہی پسماندہ قوم جو قرب و جوار کی ترقی یافتہ قوموں میں ذلیل وحقیر جانی جاتی تھی۔ وہی مادی ترقی کے بام عروج تک پہنچی۔ ایک ایک تخت ان کے قدموں میں گرنے لگا۔ تمام متمدن دنیا پر قابض ہو گئے جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو مسلمانوں کو اس عظیم انقلاب کی یاد دلاتا ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے عرب کی سرزمین میں برپا ہوا تھا۔ اس دور کے پسماندہ اور مقہور مسلمان قوم کو سبق دیتا ہے کہ اگر اس تاریک حالت سے نکلنا ہے تو قرآن مجید سے تمسک اختیار کرو۔ یہی وہ کامیابی وکامرانی کی مفتاح ہے۔ اسی سے ہر قسم کی برکت کا دروازہ کھلے گا۔ اسی دروازے میں داخل ہو کر اپنی گمشدہ متاع حاصل کرسکو گے۔

کتب سابقہ میں روزہ کی فرضیت: نماز اور زکوٰۃ کی طرح بھی روزے امم سابقہ میں موجود تھے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے کہ جس طرح مسلمانوں پر روزے فرض کیے گئے ہیں اسی طرح پہلی اقوام پر بھی فرض کیے گئے تھے جب قوموں کی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ صداقت عیاں ہو جاتی ہے۔ سب سے زیادہ قدیم تہذیب ہونے کا دعویٰ ہندوستان کو ہے۔ وہ بھی روزہ رکھتے تھے برہمن (مذہبی طبقہ) ہر ہندی مہینہ کی گیارہ بارہ تاریخ کو روزہ رکھتے تھے۔ اسی طرح کا تک کے مہینہ میں دوشنبہ کو روزہ رکھتے۔ ہندو جوگی تزکیہ نفس کے لیے چالیس دن تک چلہ کشی کرتے اور کھانے پینے سے گریز کرتے تھے اسی طرح ہندوستان کے مذہب جینی میں چالیس چالیس دن کا روزہ ہوتا تھا۔ پارسی مذہب کے مذہبی پیشواؤں کے لیے پنج سالہ روزہ ضروری تھا۔ اسی طرح قدیم مصر اور یونان کی تاریخ سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں بھی کسی نہ کسی شکل میں روزے کی عبادت پائی جاتی تھی۔ نینوا اور بابل کی تہذیب بھی پرانی گردانی جاتی ہے یہاں آشوری قوم آباد تھی جن کی طرف حضرت یونسؑ مبعوث ہوئے تھے بائبل کے صحیفہ یونس میں ذکر ہے۔

''تب نینوا کے باشندوں نے خدا پر ایمان لا کر روزہ کی منادی کی اور ادنیٰ و اعلیٰ سب نے ٹاٹ اوڑھا اور یہ خبر نینوا کے بادشاہ کو پہنچی اور وہ اپنے تخت پر سے اٹھا اور بادشاہی لباس اتار ڈالا اور ٹاٹ اوڑھ کر راکھ پر بیٹھ گیا اور بادشاہ اور اس کے ارکان دولت کے فرمان سے نینوا میں یہ اعلان کیا گیا کہ اس بات کی منادی ہوئی کہ کوئی انسان یا حیوان گلہ یا رمہ کچھ نہ چکھے اور نہ کھائے پیے لیکن انسان اور حیوان ٹاٹ سے ملبس ہوں اور خدا کے حضور گریہ وزاری کریں بلکہ ہر شخص اپنی بری روش اور اپنے ہاتھ کے ظلم سے باز آئے۔ (۳:۵......۸)

یہودیوں میں بھی روزے کی عبادت رائج تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر چالیس دن روزے رکھے۔ چنانچہ خروج میں ہے۔

''اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو یہ باتیں لکھ کیونکہ انہی باتوں کے مفہوم کے مطابق میں تجھ سے اور اسرائیل سے عہد باندھتا ہوں سو وہ چالیس دن اور چالیس رات وہیں خدا کے پاس رہا اور نہ روٹی کھائی اور نہ پانی پیا اور اس نے ان لوحوں پر اس عہد کی باتوں کو یعنی اس احکام کو لکھا۔ (۳۴:۲۷......۲۸)

ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دس احکام عنایت ہوئے۔ اس لیے تورات میں اس دن کے روزہ کی نہایت تاکید آتی ہے۔ چنانچہ احبار میں ہے۔

''اور یہ تمھارے لیے ایک دائمی قانون ہے کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو تم اپنی اپنی جان کو دکھ دینا اور اس دن کوئی خواہ وہ دیسی ہو یا پردیسی جو تمھارے بود و باش رکھتا ہو۔ کسی طرح کا کام نہ کرے کیونکہ اس روز تمھارے واسطے تم کو پاک کرنے کے لیے کفارہ دیا جائے گا۔ سو تم اپنے سب گناہوں سے خداوند کے حضور پاک ٹھہرو گے۔ یہ تمھارے لیے خاص آرام کا سبت ہوگا تم اس دن اپنی اپنی جان کو دکھ دینا۔'' (۱۶:۲۹......۳۱)

اسرائیلی اصطلاح ''دکھ'' سے مراد روزہ ہے۔

قضاہ میں ہے۔

''تب سب بنی اسرائیل اور سب لوگ اٹھے اور بیت ایل میں آئے اور وہاں خداوند کے حضور بیٹھے روتے رہے اور اس دن شام تک روزہ رکھا اور سوختنی قربانیاں اور سلامتی کی قربانیاں خداوند کے آگے گزاریں۔'' (۲۰:۲۶)

سموئیل دوم میں ہے۔

''اور وہ ساؤل اور اس کے بیٹے یونتن اور خداوند کے لوگوں اور اسرائیل کے گھرانے کے لیے نوحہ کرنے اور رونے لگے اور شام تک روزہ رکھا۔ اس لیے وہ تلوار سے مارے گئے تھے۔'' (۱:۱۲)

''اس لیے داؤد نے اس لڑکے کی خاطر خدا سے منت کی اور داؤد نے روزہ رکھا اور اندر جا کر ساری رات زمین پر پڑا رہا۔ (۱۲:۱۶)

نحمیاہ میں ہے۔

''پھر اسی مہینے کی چوبیسویں تاریخ کو بنی اسرائیل روزہ رکھ کر اور ٹاٹ اوڑھ کر اور مٹی اپنے سر پر ڈال کر اکٹھے ہوئے اور اسرائیل کی نسل کے لوگ سب پردیسیوں سے الگ ہو گئے اور کھڑے ہو کر اپنے گناہوں اور اپنے باپ دادا کی خطاؤں کا اقرار کیا۔ (۹:۲)

زبور میں ہے۔

''لیکن میں نے تو ان کی بیماری میں، جب وہ بیمار تھے۔ ٹاٹ اوڑھا اور روزہ رکھ کر اپنی جان کو دکھ دیا اور میری دعا میرے ہی سینے میں واپس آئی۔'' (۳۵:۱۳)

یرمیاہ میں ہے۔

''پر تو جا اور خداوند کا وہ کلام جو تو نے میرے منہ سے اس طومار میں لکھا ہے خداوند کے گھر میں روزہ کے دن لوگوں کو پڑھ کر سنا۔'' (۳۶:۶)

یوایل میں ہے۔

''خداوند کا روز عظیم نہایت خوف ناک ہے کون اس کی برداشت کر سکتا ہے؟ لیکن خداوند فرماتا ہے اب بھی پورے دل سے اور روزہ رکھ کر اور گریہ و زاری و ماتم کرتے ہوئے میری طرف رجوع لاؤ اور اپنے کپڑوں کو نہیں بلکہ دلوں کو چاک کر کے خداوند اپنے خدا کی طرف متوجہ ہو کیونکہ وہ رحیم و مہربان قہر کرنے میں دھیما اور شفقت میں غنی ہے اور عذاب نازل کرنے سے باز رہتا ہے۔ ۲:۱۱......۱۳)

زکریا میں ہے۔

''پھر رب الافواج کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ چوتھے اور پانچویں اور ساتویں اور دسویں مہینے کا روزہ بنی یہوداہ کے لیے خوشی اور خرمی کا دن اور شادمانی کی عید ہوگا۔ (۸:۱۸......۱۹)

عزرا میں ہے۔ میں نے اہاوا کے دریا پر منادی کرائی کہ روزہ رکھیں اور خدا کے آگے دکھ کھینچیں اور اس سے دعا مانگیں تو کہ اپنے اور اپنی اولاد اور مال کے لیے سیدھی راہ پائیں۔ (عزرا ۸ باب ۲۱)

متی میں ہے۔

''اور جب تم روزہ رکھو تو ریا کاروں کی طرح اپنی صورت اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں تا کہ لوگ ان کو روزہ دار جانیں میں تم سے سچ کہتا ہوں وہ اپنا اجر پا چکے ہیں کہ جب تم روزہ رکھو تو اپنے سر میں تیل ڈال اور منہ دھو تا کہ آدمی نہیں بلکہ تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہے تجھے روزہ دار جانے اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے۔ تجھے بدلہ دے گا۔ (۶:۱۶......۱۸)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن تک جنگل میں روزہ رکھا۔ (متی ۴......۲)

اعمال میں ہے۔

''جب وہ خداوند کی عبادت کر رہے اور روزے رکھ رہے تھے تو روح القدس نے کہا میرے لیے برنباس ساؤل کو اس کام کے واسطے مخصوص کر دو جس کے واسطے میں نے ان کو بلایا ہے تب انھوں نے روزہ رکھ کر اور دعا کر کے اور ان پر ہاتھ رکھ کر انھیں رخصت کیا۔'' (۱۳:۲.....۳)

یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اعتراض کیا کہ تیرے شاگرد کیوں روزہ رکھتے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا۔

''کیا براتی جب تک دولہا ان کے ساتھ ہے روزہ رکھ سکتے ہیں جب دولہا ان کے پاس ہے روزہ نہیں رکھ سکتے پر وہ دن آئیں گے کہ جب دولہا ان سے جدا کیا جائے گا تب ان دنوں میں روزہ رکھیں گے۔ (مرقس ۲:۱۸)

حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ ہم بدروحوں کو کسی طرح نکال سکتے ہیں آپ نے جواب میں فرمایا۔

''یہ جنس سوائے دعا اور روزہ کے کسی اور طرح سے نہیں ملتی۔ (متی ۱۷۔۲۱)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل عرب روزہ سے آشنا تھے۔ جواد علی ''المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام'' میں لکھتے ہیں۔

روایتوں میں ہے کہ قریش یوم عاشور کا روزہ رکھتے تھے اس روز جمع ہوتے عید مناتے اور بیت اللہ کو غلاف پہناتے تھے۔ حدیث میں آتا ہے کان یوم عاشوراء تصومه قریش فی الجاهلیة و کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یصوم فاذا قدم المدینة صامه و امر بصیامه فلما فرض رمضان ترک عاشوراء فمن شاء صامه ومن شاء ترکهٗ (صحیح بخاری کتاب الصوم جلد اوّل) زمانہ جاہلیت میں قریش عاشوراء کے دن روزہ رکھتے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس دن روزہ رکھتے تھے جب آپ مدینہ تشریف لائے آپ نے روزہ رکھا اور روزے رکھنے کا حکم دیا جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشوراء کے دن روزہ رکھنا چھوڑ دیا اور فرمایا جو چاہے روزہ رکھے جو چاہے چھوڑ دے۔

اصلاحات (تجدید و تکمیل): تعذیب جسمانی سے پرہیز: اسلام میں عبادت کا مقصد صرف تزکیہ نفس ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کچھ بدنی شرائط بھی ضروری قرار دی ہیں اور جسم اور روح کا آپس میں ایک گہرا تعلق ہے اور وہ ایسی شرائط ہیں جن کا صحت مند اثر روح پر پڑتا ہے اگر انسان اپنے اعضاء سے خوشی و مسرت کا اظہار کرتا ہے تو اس سے روح بھی متاثر ہوتی ہے روح میں بھی انبساط کی لہر پیدا ہو جائے گی۔ اس طبعی حالت کو پیش نظر رکھ کر علیم و خبیر ہستی نے جسمانی شرائط وہی مقرر کی ہیں جن کا صحت مند اثر پڑے۔ ایسی حرکات و سکنات سے روکا ہے جن سے روح میں انقباض کی حالت پیدا ہو۔

دیگر مذاہب نے روزہ میں تعذیب جسمانی کو اختیار کر لیا ہے۔ ہندو جوگیوں نے رہبانیت اختیار کر کے جنگلوں اور ویرانوں میں کئی کئی دن اکل و شرب سے الگ رہتے اور اس کو تقرب الی اللہ کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ یہی طریقہ جین مت اور بدھ مت میں ہے۔ بھکشو جنگلوں میں بسیرا کر لیتے کھانے پینے کو چھوڑ دیتے کبھی کبھی چند لقمے کھا لیتے اور شدید پیاس کی حالت میں ایک دو گھونٹ پی لیتے۔

یہودی روزے میں افطار کے بعد صرف ایک وقت کھاتے اور دوسرے دن افطار تک کچھ نہیں کھاتے تھے۔ بغیر سحری کھائے چوبیس گھنٹے کا روزہ بھی جسمانی تعذیب کا باعث ہے۔

اسلام نے ان تمام امور سے روک دیا ہے جو جسمانی تعذیب اور اذیت کا باعث بنتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ ۲:۱۸۵) خدا تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مسعود میں قیام لیل اور نفلی روزے میں مبالغہ سے کام لیا جانے لگا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب علم ہوتو آپ نے منع فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا کہ میں نے تادم مرگ دن بھر روزے اور رات بھر عبادت کے لیے جاگنے کا ارادہ کیا ہے تو آپ نے بلا کر مجھ سے دریافت کیا میں نے اقرار کیا اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو اس کی طاقت نہیں رکھ سکے گا۔ اس لیے روزہ بھی رکھ اور روزہ چھوڑ بھی دے رات کو جاگ بھی اور نیند بھی کر اور مہینہ میں صرف تین دن تک نفلی روزے رکھ کیونکہ نیکی کا بدلہ دس گنا ہے اور تیرا یہ عمل ہر روز کے روزے رکھنے کے برابر ہوگا۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں آپ نے فرمایا کہ پھر ایک دن روزہ رکھ اور دو دن افطار کر میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ میں اس سے بھی زیادہ طاقت رکھتا ہوں اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر ایک دن روزہ رکھ اور ایک دن چھوڑ دے اور داؤد علیہ السلام اس طرح روزہ رکھا کرتے تھے اور یہ نفلی روزوں کا بہترین طریق ہے میں نے پھر عرض کیا کہ یارسول اللہ میں اس سے بھی زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ بس اس سے بہتر طریق اور کوئی نہیں ہے۔ (بخاری کتاب الصوم باب ۵۶ الصوم الدھر) گزشتہ امم کی روزہ میں مبالغہ آرائی کی اصلاح کرتے ہوئے آپ نے صوم وصال کی ممانعت فرمائی۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ نَهَی رَسُولُ اللّٰهِ صَلَی الله علیه وَسَلَّم عَنِ الْوِصَالِ فِی الصوم (بخاری کتاب الصوم باب الوصال) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم وصال سے منع فرمایا۔

صوم وصال یہ ہے بغیر افطار اور سحری کے مسلسل روزے رکھے جائیں یہ تشدد فی العبادت ہے لہٰذا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا۔ یہ اس تشدید اور تکلیف مالایطاق سے انسانی صحت پر اثر پڑتا ہے جو دوسرے فرائض کی ادائیگی میں مانع ہے۔ دوم قرآنی حکم "روزہ رات (غروب آفتاب) تک مکمل کرو کے خلاف ہے۔ اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام مشقتوں سے آزاد کر دیا جن کے اٹھانے کی انسان میں طاقت نہیں ہے۔

اس لیے قرآن مجید میں اس دعا کی تعلیم دی۔ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ (البقرہ ۲:۲۸۶) اے ہمارے رب ہم پر (ایسی مشقتوں کا بوجھ نہ ڈال جیسا کہ ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اٹھانے کی طاقت نہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشقت سے نجات دینے کے لیے سحری کو باعث برکت قرار دیا ہے فرمایا۔ تَسَحَّرُوْا فَإِنَّ فِي السُّحُوْرِ بَرَكَةً (صحیح مسلم کتاب الصوم فضل السحور، صحیح البخاری کتاب الصوم باب برکۃ السحور)

حضرت عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ فَصْلُ مَا بَيْنَ صِيَامِنَا وَصِيَامِ أَهْلِ الْكِتَابِ أَكْلَةُ السَّحَرِ (صحیح مسلم کتاب الصوم باب فضل السحور) ہمارے روزوں اور اہل کتاب کے روزوں میں سحری کھانے کا فرق ہے۔

تحدید اوقات صوم: پہلی امتوں میں شب و روز کا روزہ ہوتا تھا۔ اسلام نے پہلی امتوں کی اس تشدید و تکلیف مالا یطاق کی اصلاح کی اور روزہ کی مدت صرف صبح (صبح صادق) سے شام (غروب آفتاب) تک قرار دی۔ ارشاد الٰہی ہے۔ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (البقرہ ۲:۱۸۷) اس وقت سے جب رات کا تاریک خط صبح کے سفید خط سے ممتاز ہو جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ فَإِنْ كَانَ اللَّيْلُ فَأَفْطِرُوْا (الطبرانی) روزہ رات کے ہونے تک پورا کرو۔ جب رات شروع ہو جائے تو روزہ افطار کرلو۔

اسلام نے وقت کے ساتھ ساتھ رمضان میں روزے رکھنے فرض قرار دیے ہیں اور یہی وہ مہینہ ہے جس میں قرآن مجید کا نزول شروع ہوا۔

مباشرت کی اجازت: ایام جاہلیت میں لوگ روزوں کی پوری مدت تک مجامعت سے احتراز کرتے تھے چونکہ یہ پابندی خلاف حکم فطری تھی۔ اکثر لوگ خیانت کے مرتکب بھی ہو جاتے تھے اس لیے اسلام نے صرف روزے کے دورانیہ میں مجامعت سے روکا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلٰى نِسَائِكُمْ (البقرہ ۲:۱۸۷) تمھارے لیے روزہ کی شب میں اپنی بیویوں سے مباشرت حلال کر دی گئی ہے۔

روزے کی چھوٹ: اسلام نے طبعی اصول (لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا) کے مطابق بوڑھے کمزور معذور بیماروں اور مسافروں کو روزے سے چھوٹ دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضًا أَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (البقرہ ۲:۱۸۴) جو کوئی تم میں سے بیمار ہو، یا سفر میں ہو تو اور دنوں سے گنتی پوری کرو۔ جو اس میں مشقت پاتے ہوں وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں۔

عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهُ (جو اس میں مشقت پاتے ہیں) میں بوڑھے مرد اور عورتیں حاملہ عورتیں مرضعہ عورتیں معذور اپاہج لوگ دائم المریض جن کی بیماری بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔ مزدور طبقہ جو سخت مشقت سے معاش حاصل کرتا ہے اس قسم کے لوگوں کے لیے اسلام نے آسانی کے طور پر روزہ کے بدلے صرف ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ مقرر کیا ہے۔

پہلے مذاہب میں اس قسم کے معذور اصحاب کے لیے کوئی استثناء نہیں ہے۔ اسلام نے انسانی فطرت کے مطابق اس تشدید کی اصلاح کی۔

غیر معتدلانہ طریقہ کی اصلاح: دوسرے مذاہب میں روزے کے غیر معتدلانہ طریقے رائج تھے یا تو چالیس چالیس روز تک کا فاقہ یا روزہ کے اوقات میں غلہ اور گوشت کے علاوہ پھل تک کھانے کی اجازت تھی۔ اسلام نے افراط اور تفریط کو ترک کر کے ایک درمیانی راستہ کی تعلیم دی کہ صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور مباشرت سے منع کر دیا۔

زیب و زینت کی اجازت: اکثر مذاہب میں (خصوصاً یہودیت) میں روزہ کی حالت میں زیب و زینت اختیار کرنا ناجائز تھا اسلام نے روزہ کی حالت میں ہر قسم کے زیب و زینت کے طریقے اختیار کرنے اجازت دی ہے۔ روزے سوگ منانے کے ایام نہیں ہیں بلکہ قرآن مجید کے نزول کی سالگرہ منانے کا مہینہ ہے روزے دار کے چہرے اور لباس سے انبساط ظاہر اور خوشی کا اظہار ہونا چاہیے۔

مزید سہولتیں: جو روزہ دار بھول کر کھا یا پی لے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ روزہ پورا کیا جائے۔ آپ نے فرمایا مَنْ اَفْطَرَ فِی رَمْضَانَ نَاسِیًا فَلَا قَضَاءَ عَلَیْهِ وَلَا کَفَّارَةَ (سنن دارقطنی) جو شخص رمضان میں بھول چوک کھا پی لے تو اس پر نہ قضا لازم ہے اور نہ کفارہ۔

اِذَا نَسِیَ فَاَکَلَ وَشَرِبَ فَلْیُتِمَّ صَوْمَهُ فَاِنَّمَا اَطْعَمَهُ اللّٰهُ سَقَاهُ (صحیح بخاری کتاب الصوم باب الصائم ....) جو روزہ دار بھول کر کھا یا پی لے وہ اپنا روزہ پورا کرے اسے اللہ نے کھلایا پلایا ہے۔

ایک شخص روزہ کے لیے سحری کھا رہا ہو۔ اذان ہو جائے اور برتن میں ہاتھ ہو تو وہ شخص جو کچھ کھا رہا ہو کھائے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ (ابوداؤد)

جنابت کی حالت میں روزہ رکھا جا سکتا ہے حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات روزہ رکھ لیتے اور فجر کے بعد غسل جنابت کرتے تھے۔ (بخاری کتاب الصوم باب الصائم یصبح جنبیاً)

روزے میں مجامعت کے سوا بیوی سے اظہار محبت کی جا سکتی ہے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزے کی حالت میں بوسہ لیتے اور مجھے اپنے ساتھ بھی لگا لیتے تھے۔ (بخاری کتاب الصوم باب المباشرہ للصائم)

روزہ کس کے لیے فرض ہے؟ روزے بالغ مقیم اور تندرست پر فرض ہیں۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر حیض والی عورت دوسرے رمضان کی آمد سے پہلے پورے کریں۔ بچہ کی پیدائش پر نفاس کے جاری ہونے کی صورت میں بھی حیض کی طرح ہے۔ فرق یہ ہے کہ اگر ماں بچے کو دودھ پلاتی ہے تو وہ روزے کی بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔

جہاں مہینوں کی تقسیم نہیں ہوتی: جہاں لمبے دن ہونے کی وجہ سے مہینوں کی تقسیم نہیں ہوتی وہاں کیا حکم ہے اس کے بارے میں قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (البقرہ ۲:۱۸۵) یعنی جو کوئی اس مہینے کو پائے تو چاہیے کہ اس کے روزے رکھے۔ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ کے الفاظ نے ان تمام مقامات کو خارج کر دیا ہے۔ جہاں دن رات بہت لمبے ہونے کی وجہ سے مہینوں کی تقسیم نہیں ہوتی کئی کئی دن تک کئی مہینوں تک سورج نہیں نکلتا یا غروب نہیں ہوتا کیونکہ وہاں مہینہ ہی نہیں اگر وہاں روزہ رکھنا چاہئیں تو پھر ان کو کسی علاقے سے مطابقت پیدا کر کے اپنے روزہ رکھنے اور افطار کرنے کا وقت مقرر کر لیں۔

نفلی روزے: رسول کریم ﷺ نے دیگر عبادات اسلامیہ کی طرح نفلی روزے رکھنے کی بھی تلقین کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نفلی عبادات کو خیر کہا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا (البقرہ ۲:۱۹۸) جو کوئی شوق سے نیکی کرتا ہے وہ اس کے لیے بہتر ہے۔ اس لیے اسلام نے فرائض کے ساتھ نوافل کی تعلیم دی ہے لیکن نوافل کی ادائیگی میں غلو نہیں ہونا چاہیے۔ نفلی عبادت کا ایک فائدہ یہ ہے کہ فرض عبادت کی ادائیگی انسان کے دل میں راسخ ہو جاتی ہے اور لذت محسوس کرتا ہے۔ دوم انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور عظمت مستولی ہو جاتی ہے۔ جس سے نہ صرف انسان روحانی زندگی میں ترقی کرتا ہے بلکہ مادی زندگی میں بھی رعنائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اخوت اتحاد اور مساوات پر مبنی معاشرہ جنم لیتا ہے۔ اس کی واضح مثال عہد نبوی کا دور ہے۔ جب صحابہ نے بت پرستی کو چھوڑ کر ایک خدا کے آستانہ پر سر رکھا اور فرائض اور نفلی عبادات ادا کرنے لگے۔ وہی عرب جو صدیوں سے اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف عداوت کی آگ روشن کیے ہوئے تھے مواخات کی لڑی میں پروئے گئے۔ سوم نفلی عبادت ان نقائص کو بھی پورا کر دیتی ہے جو فرائض کی ادائیگی میں رہ گئے تھے۔

رسول کریم ﷺ نے عاشورہ کے روز یعنی دسویں محرم کو روزہ رکھنے [۱] ایام التشریق یعنی ذوالحج کی گیارھویں بارھویں اور تیرھویں تاریخوں میں [۲] شوال کے پہلے چھ دن [۳] شعبان کے آخری ایام میں [۴] ایام البیض یعنی قمری مہینے کی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخوں میں [۵] دوشنبہ کے دن یا پنجشنبہ کے دن [۶] عرفہ کے دن یعنی عیدالاضحیٰ سے ایک دن پہلے۔ [۷] روزے رکھنے کی تلقین فرمائی۔

---

۱ بخاری کتاب الصوم باب صیام یوم عاشوراء۔ ۲ بخاری کتاب الصوم باب صیام ایام التشریق۔
۳ ابوداؤد کتاب الصوم باب فی صوم ستۃ ایام من شوال۔ ۴ بخاری کتاب الصیام باب الصوم اخر الشھر۔
۵ بخاری کتاب الصیام باب صیام ایام البیض۔ ۶ ابوداؤد کتاب الصوم باب فی صوم الاثنین والخمیس۔
۷ ترمذی ابواب الصوم باب ماجاء فی فضل صوم یوم عرفہ۔

مزید براں جیسا کہ عبداللہ بن عمر کی روایت سے ظاہر ہے کہ آپ نے ہر ماہ میں تین دن روزہ رکھنے کی ہدایت کی۔[1] اس کی حکمت یہ بیان کی کہ نیکی کا بدلہ دس گنا ہے۔ تیرا یہ عمل ہر روز کے روزہ رکھنے کے برابر ہوگا۔

اس طرح آپ نے یہ بھی فرمایا جمعہ کا دن نفلی روزے کے لیے مقرر کرلیا جائے۔[2]

نفلی روزہ پر پابندی: رسول کریم ﷺ نے عیدین کے دو دنوں میں نفلی روزہ رکھنے پر ممانعت فرمائی۔[3] ماہ رمضان سے ایک یا دو دن پہلے روزہ کے لیے مخصوص کرنا بھی منع فرمایا۔[4]

رسول کریم ﷺ نے خصوصاً ان نفلی روزوں سے منع فرمایا جن سے زندگی کے دوسرے فرائض میں خلل پڑتا ہو۔ بخاری میں ابودرداءؓ اور سلمانؓ کا واقعہ درج ہے۔ رسول کریم ﷺ نے ابودرداءؓ اور سلمانؓ میں مواخات قائم کی۔ سلمانؓ حضرت ابودرداءؓ سے ملاقات کے لیے ان کے گھر گئے اور دیکھا کہ ان کی بیوی خستہ حال میں بیٹھی ہوئی ہے جب اس نے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ ابودرداء تارک الدنیا ہوگیا ہے جب ابودرداء گھر آئے اور کھانا رکھا گیا تو اس نے روزہ کی وجہ سے کھانے سے انکار کر دیا۔ حضرت سلمانؓ نے کہا کہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ جب تک ابودرداء نہیں کھائیں گے چنانچہ انھوں نے روزہ (نفلی) افطار کرلیا۔ جب رات ہوئی اور ابودرداء تھوڑا سا آرام کرنے کے بعد بیدار ہو گئے تو حضرت سلمانؓ نے ان سے کہا کہ ابھی سو رہیں اور جب رات کا آخری حصہ آیا تو دونوں نے نماز تہجد ادا کی۔ تب سلمانؓ نے ابودرداء سے کہا کہ یقیناً تیرے خدا کا تجھ پر حق ہے تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے اور تیری بیوی بچوں کا تجھ پر حق ہے جب یہ واقعہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں بیان کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا سلمان نے درست کہا ہے۔[5]

ابودرداء کے عمل میں غلو اور تعمق تھا۔ اس وجہ سے آپ ﷺ نے سلمانؓ کی نصیحت کو درست قرار دے کر ابودرداء کو اس عمل سے منع فرما دیا جس سے زندگی کے دوسرے فرائض میں خلل پڑتا تھا۔

روزے بطور کفارہ: بعض احکام کو توڑنے پر بطور کفارہ روزے رکھنے کا حکم قرآن مجید میں آتا ہے۔

۱۔ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کو غلطی سے قتل کر دینے پر متواتر دو ماہ روزہ رکھنا بشرطیکہ غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہ ہو۔ (سورہ النساء ۴:۹۲)

۲۔ ظہار کی صورت میں دو ماہ متواتر روزے رکھنا (خاوند بیوی سے یہ کہہ دے کہ تو مجھ پر ایسی ہے جیسی میری ماں کی پشت) بشرطیکہ غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہ ہو۔ (سورۃ المجادلہ ۳۔۴)

۳۔ ایک شخص حلفاً ایک حلال چیز کو اپنے اوپر حرام ٹھہرا لیتا ہے پھر اس قسم کو توڑ دیتا ہے اگر اسے غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہ ہو اور نہ دس مساکین کو کھانا کھلانے کی طاقت رکھتا ہو تو تین دن کے روزے رکھے۔

۴۔ اگر کوئی حاجی احرام کی حالت میں کسی جانور کو مارے اور کفارہ کے طور پر جن کا دو حَکَم فیصلہ دیں۔ اگر مساکین کو کھانا کھلا نہیں سکتا تو فیصلے کے مطابق اتنے دنوں کے روزے رکھے۔ (مائدہ ۵:۹۵)

۵۔ حدیث میں آتا ہے اگر کوئی شخص ماہ رمضان میں ارادتاً روزہ توڑے تو اس کے لیے بطور کفارہ دو ماہ متواتر روزے رکھے۔ (بخاری کتاب الصوم باب اذا جامع فی رمضان)

روزے بطور تلافی مافات: قرآن مجید میں ایسے روزوں کا بھی ذکر ہے جو تلافی مافات کے طور پر رکھے جاتے ہیں مثلاً جو حاجی خاص وجوہ کی بناء پر احرام کی تمام مقتضیات کو پورا کرنے سے قاصر رہے ہوں تو انھیں تلافی مافات کے طور پر صدقہ اور جانور کی قربانی کے بجائے تین دن روزے رکھنے کا حکم ہے۔ (سورہ بقرہ ۲:۱۹۶)

---

[1] بخاری کتاب الصوم باب الصوم الدھر۔
[2] بخاری کتاب الصوم باب صوم یوم الجمعۃ۔
[3] بخاری کتاب الصوم یوم الفطر۔
[4] بخاری کتاب الصوم باب لایتقدمن رمضان بصوم یوم ولا یومین۔
[5] بخاری کتاب الصوم باب من اقسم علی اخیہ لیفطر فی التطوع۔

اسی طرح ان حجاج کو جو عمرہ اور حج جمع کرنے کے لیے دونوں کے وقفہ کے درمیان حالت احرام سے باہر نکل آئیں انھیں تین دن کے روزے حج کے دوران میں اور سات روزے حج سے گھر مراجعت پر رکھنے چاہئیں۔ (بقرہ ۲:۱۹۶)

نذر پورا کرنے کے لیے روزہ: بطور نذر روزہ رکھنے کا ذکر قرآن مجید میں آتا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ اِنِّی نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُکَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا (مریم ۱۹:۲۶) یقیناً میں نے خدا کے لیے روزہ کی نذر مانی ہے پس میں آج کسی سے بات نہیں کروں گی۔

افطار کے وقت دعا پڑھنا: جب اسلامی دعاؤں کے دفتر پر نگاہ ڈالیں تو ایک ایک لفظ اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور عظمت پر دلالت کرتا ہے اور انسان کی انکساری اور عاجزی اور عبدیت کا اظہار ہوتا ہے۔ دیگر مذاہب میں دعاؤں کا ذخیرہ بہت ہی کم ہے۔ اسلام نے زندگی کے ہر لمحے پر دعا کرنا سکھائی ہے۔ اسلام کا یہ پہلو دیگر مذاہب پر فوقیت رکھتا ہے۔

رسول کریم ﷺ نے روزہ کے افطار پر دعا سکھائی ہے وہ یہ ہے۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْنَا وَعَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْنَا فَتَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (سنن ابی داؤد) اے اللہ ہم نے تیرے ہی لیے روزہ رکھا اور تیرے ہی رزق پر افطار کیا اور ہم سے (اس عبادت کو) قبول فرما تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔

روزہ کن چیزوں سے ٹوٹتا ہے: تین چیزیں روزہ کو باطل کر دیتی ہیں برضا و رغبت کھانے پینے اور جماع سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن سہوا کھانے پینے سے روزہ باطل نہیں ہوتا۔ پچھ لگانے اور قے کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ حضرت ابن عباس اور عکرمہ کا بیان ہے کہ روزہ کسی چیز کے پیٹ کے اندر جانے سے ٹوٹتا ہے نہ کسی چیز کے باہر آنے سے۔ (بخاری کتاب الصوم باب الحجامة والقئی للصائم)

اعتکاف: عکف علیہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں وہ ہمیشہ یا مستقل طور پر اس سے چمٹا رہا۔ (لینز عربک انگلش لیکسی کان) اعتکاف کے معنی لغوی طور پر ایک جگہ ٹھہرنے کے ہیں اور اصطلاحی طور پر کچھ دنوں کے لیے ماہ رمضان کے آخری عشرہ میں مسجد میں قیام کرنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

تمام مذاہب نے عبادات میں جو غلو اور تعمق اختیار کر لیا تھا۔ اسلام نے اس کی اصلاح کی اور اس غلو کو ایک طبعی اور فطری شکل دی۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ تمام مذاہب خصوصاً ہندو مذہب نے بہت ہی غلو اختیار کیا۔ گھر بار چھوڑ کر تپسیہ کے لیے جنگلوں پہاڑوں کی غاروں ویرانوں میں چلے جانا وہاں چلے کاٹنا، کئی آیام تک بغیر کھائے پیے روزے رکھنا۔ اسلام نے اسی غیر فطری طریقہ عبادت کی اصلاح کی۔ روزوں کے لیے ایک ماہ کا دورانیہ اور صبح صادق سے غروب آفتاب تک کا روزے کا وقت مقرر کر دیا۔ اس وقت میں کھانے پینے اور مباشرت سے منع کر دیا۔ کھانے اور پینے سے رکے رہنا کا کتنا طبعی وقت ہے۔ اس وقت میں کوئی ایسی مشقت اٹھانی نہیں پڑتی جو انسانی طاقت سے باہر ہو۔ پھر بھی کوئی روزے دار اس وقت میں ایسی حالت کو پہنچ جائے جو زندگی کے لیے باعث خطرہ ہے تو صائم اپنا روزہ کھول سکتا ہے۔ صرف اس پر قضا واجب ہے۔ پھر سالہا سال کی رہبانیت کو صرف دس دنوں میں بدل دیا۔ جس کو اعتکاف کہا جاتا ہے۔ روزے دار تمام دنیا سے کٹ کر صرف دس دن کے لیے مسجد میں ذکر الٰہی کے لیے بیٹھ جاتا ہے اور وہ اشد ضرورت کے بغیر مسجد سے نہیں نکلتا۔ (بخاری کتاب الاعتکاف باب المعتکف لا یدخل البیت و باب غسل المعتکف) معتکف کے پاس دوسرے لوگ اور اس کی بیوی ملنے کے لیے آ سکتی ہے۔ (بخاری کتاب الاعتکاف باب زیارۃ المراۃ زوجھا فی اعتکاف) معتکف زیادہ عرصہ ذکر الٰہی میں مصروف رہتا ہے۔ ذکر الٰہی میں انسانی روح کی غذا ہے۔ جس سے وہ قوت حاصل کرتی ہے جب شوال کا چاند نظر آتا ہے۔ معتکف اعتکاف سے باہر نکل آتا ہے۔ یہ ہے اسلام میں رہبانیت کی مختصر سی شکل جس میں کوئی غلو نہیں جو انسان برداشت نہ کر سکے۔ انسان ایک مختصر وقت کے لیے تمام دنیاوی علائق سے الگ ہو کر خدا کے گھر میں بیٹھ جاتا ہے۔ پھر یہ فرض قرار نہیں دیا۔

لیلۃ القدر: رمضان کی فضیلت کے ضمن میں لیلۃ القدر کا مختصر ذکر کیا تھا۔

یہ وہ مبارک رات ہے جس میں وہ دین جس کی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام نے خدا کی وحی پر رکھی پھر مختلف انبیاء علیہم السلام اس دین کو وقت کی ضرورت کے مطابق آگے بڑھاتے رہے۔ پھر وہی دین بغرض تکمیل اس مبارک رات میں نازل ہونا شروع ہوا۔ آخری عشرہ کی کون سی رات ہے۔ اس کا کسی کو علم نہیں لیکن مسلمانوں کو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں یا آخری راتوں میں تلاش کرنا چاہیے بعض احادیث میں ستائیسویں یا انتیسویں رات ہے۔ رسول کریم ﷺ نے کسی خاص رات کی تخصیص نہیں کی۔

رویت لیلۃ القدر کے متعلق مسلمانوں میں عجیب و غریب قسم کی باتیں مشہور ہیں حقیقت میں یہ ایک روحانی تجربہ ہے جس سے انسان لطف اندوز ہوتا ہے۔

روزوں کا فلسفہ

انفرادی فوائد

ا۔ روحانی قوت تیز ہوتی ہے: ماہ رمضان میں صائم کی روحانی قوت تیز ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے دو موقعوں پر روزہ رکھنے والوں کو سائح فرمایا ہے۔ (توبہ ۹:۱۱۲، سورہ التحریم ۶۶:۵) جس کے معنی ہیں روحانی سفر کرنے والا، حقیقت بھی یہی ہے کہ جب روزہ دار کھانے پینے اور ہر قسم کی برائی سے پرہیز کرتا ہے تو وہ سائح ہی کہلاتا ہے۔ رمضان کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید میں روزوں کا مقصد قرب الٰہی قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ (البقرہ ۲:۱۸۶) اور جب مرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو میں قریب ہوں دعا کرنے والے کی دعا کو جب وہ مجھے پکارتا ہے قبول کرتا ہوں پس چاہیے کہ میری فرمانبرداری کریں اور چاہیے کہ مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ ہدایت پائیں گے۔

اس وجہ سے صوفیاء کرام ماہ رمضان کو تنویر قلب کا مہینہ کہتے ہیں۔ روحانیت کی بڑی علامت سچی روياء اور مکاشفات ہیں۔ یہ نعمت اس مہینہ میں حاصل ہوتی ہے۔ صائم خدا کی محبت اور قدرت کے کرشمے دیکھتا ہے۔ اللہ کے اسرار اور رموز پر اطلاع پاتا ہے۔

۲۔ تعمیر سیرت: روزہ صرف کھانے پینے اور مباشرت کے ترک کرنے کا ہی کام نہیں بلکہ ہر قسم کی برائیوں سے اجتناب کرنے کا نام ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ برائیوں سے اجتناب نہیں کرتے اور صرف بھوک پیاس کی مصیبتیں جھیلتے ہیں۔ ان کے متعلق رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ کَمْ مِنْ صَائِمٍ فَلَیْسَ لَهٗ مِنْ صِیَامِهٖ اِلَّا الظَّمَا (مشکوٰۃ ص ۱۷۷) کتنے روزے دار ہیں جن کو روزہ سے بھوک پیاس کے سوا کچھ فائدہ نہیں۔ فرمایا۔ مَنْ لَمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَیْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِیْ اَنْ یَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ (بخاری کتاب الصوم باب من لم یدع قول الزور فی الصیام) جو کوئی جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو کوئی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔

روزے دار کو برائی سے دور رہنے کی یہاں تک تاکید ہے کہ اگر کوئی شخص اس کو گالی گلوچ کرے تو رسول کریم ﷺ کے فرمان کے مطابق شاتم کو یہ کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ اَلصِّیَامُ جُنَّةٌ فَلَا یَرْفُثْ وَلَا یَجْهَلْ (بخاری کتاب الصوم باب فضل الصوم) روزہ ایک ڈھال ہے۔ اس لیے روزہ دار کو فحش اور جہالت کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔

کسی انسان کی سیرت کی تعمیر اس وقت ہوتی ہے جب وہ برائیوں سے بکلی اجتناب کرے اور نیکیوں کے راستہ پر قدم مارے۔ یہی روزہ سکھاتا ہے۔

۳۔ ضبط نفس: روزہ ضبط نفس کی تعلیم دیتا ہے۔ دیگر مذاہب نے ضبط نفس کے لیے عجیب عجیب رسوم اپنائی ہیں جو انسانی صحت کے لیے بھی مضر ہیں۔ اسلام میں ضبط نفس کے لیے روزہ بہترین ذریعہ ہے۔ روزہ دار صبح صادق سے قبل سحری کھالیتا ہے اور غروب آفتاب تک کسی کھانے پینے والی چیز کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتا یہ روک ضبط نفس کے لیے بہت عمدہ مشق ہے۔ ضبط نفس تکمیل انسانیت کے لیے بہت ضروری ہے۔ کسی شخص کا بے لگام ہونا نہ صرف معاشرہ کے لیے نقصان دہ ہے بلکہ اس شخص کے لیے بھی جو بے لگام زندگی کا گھوڑا دوڑائے جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زندگی گزارنے کے لیے کچھ حد بندیاں لگا دی ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔ روزہ ان حد بندیوں میں زندگی گزارنے کی تعلیم دیتا ہے اس کا نام ضبط نفس ہے۔

۵۔ اللہ کی ہستی کا تصور اجاگر ہونا: روزہ اللہ کی ہستی کا تصور زیادہ راسخ کرتا ہے اسلام کی تمام عبادات کا مقصد وحید ہی یہ ہے کہ اللہ کی ہستی کا تصور انسان کے دل میں جاگزین ہو جائے۔ اللہ کا تصور ہی انسان کو بدیوں سے بچاتا ہے۔ جب انسان روزہ رکھتا ہے بھوک پیاس کے باوجود خلوت میں کھانے پینے سے اجتناب کرتا ہے اس کا یہ اجتناب صرف اللہ کو علیم وخبیر جاننے کی وجہ سے ہے کیونکہ صائم جانتا ہے کہ لوگوں کو دھوکا دیا جا سکتا ہے مگر علیم وخبیر ہستی کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ سو ایک ماہ روزہ رکھنے سے اللہ تعالیٰ کی ہستی کا تصور انسان کے دل میں زیادہ راسخ ہو جاتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ بہتر زندگی گزارنے کے لیے خدا کی ہستی کا تصور بہت ضروری ہے۔

قوت صبر کا نمو: دیگر مذاہب نے قوت صبر کی نمو کے لیے تعذیب آمیز طریقے ایجاد کیے۔ سالہا سال تک کھڑے رہنا۔ گرمی کے موسم میں جلتی آگ کے قریب بیٹھنا موسم سرما میں برہنہ بیٹھے رہنا۔ سالہا سال تک معمولی سے معمولی غذا پر گزارا کرنا۔ ایک ٹانگ پر کھڑے رہنا۔ اس سے انسان میں قوت صبر نمو نہیں

کرتی بلکہ یہ تو تعذیب جسمانی ہے جس سے آہستہ آہستہ قوت صبر مرتی جاتی ہے۔

اسلام نے قوت صبر کی نمو کے لیے ایک ماہ رمضان کھانے پینے اور مباشرت سے روک دیا ہے۔ روزے دار کو بھوک پیاس لگی ہوئی ہے عمدہ کھانا اور ٹھنڈا پانی اس کے سامنے ہے لیکن حکم خداوندی سے اس کے قریب نہیں جاتا۔ انسان کی زندگی میں بعض اوقات سخت مصائب آتے ہیں ان کے مقابلہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان میں قوت صبر ہو۔ تبھی وہ ان مصائب اور مشکلات کا سامنا کر سکے گا۔ انسان میں جتنی زیادہ قوت صبر ہوگی اتنا ہی عمدہ مصائب کا سامنا کر سکے گا۔ سو روزہ انسان کے اندر قوت صبر بڑھا کر آنے والے مشکلات کا سامنا کرنے کی تربیت کرتا ہے۔

طبی فائدہ: یہ ایک مسلمہ طبی اصول ہے کہ مقررہ کردہ اوقات کے دوران کھانے پینے سے اجتناب اشتہاء کو بڑھاتا ہے۔ جس طرح زمین کو ایک عرصہ تک بیکار چھوڑنے سے اس کی قوت نمو بحال ہو جاتی ہے۔ فصل بوئیں تو بہتر آگتی ہے۔ اسی طرح لگاتار محنت کرتے رہیں تو بدن سے قوت کم ہو جاتی ہے اس کی بحالی کے لیے آرام کرنا ضروری ہے۔

یہی حالت قوت انہضام کی ہے۔ سال بھر کھانے پینے بعض اوقات کھانے میں بے احتیاطی سے قوت انہضام میں کمزوری پڑ جاتی ہے اس قوت انہضام کی بحالی کے لیے ضروری ہے کہ کچھ عرصہ کے لیے معدہ کو خالی رکھا جائے۔ یہ کام روزہ بخوبی انجام دیتا ہے۔

اجتماعی فوائد

۱۔ انسانی ہمدردی اور مواسات: روزے انسانی ہمدردی اور مواسات کا پیغام لے کر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے رسول کریم ﷺ نے رمضان کے مہینے کو ''شھر المواساۃ'' فرمایا ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ جب تک کسی چیز کا عملی احساس نہ ہو۔ اس وقت تک اس چیز کی طرف توجہ پیدا نہیں ہوتی۔ اسلام نے امراء کو بھوک اور پیاس کا عملی احساس دلانے کے لیے روزوں کی تعلیم دی ہے۔ تاکہ غرباء کی بھوک اور پیاس کا احساس ہو جائے اور ان کے دل میں غرباء کی ہمدردی اور مواسات کا جذبہ پیدا ہو۔ ہمدردی اور مواساۃ ہی معاشرہ کی رعنائی اور خوبصورتی کا سبب ہے۔ ہمدردی اور مواساۃ سے امراء وغرباء کے درمیان جذبہ محبت ابھرتا ہے۔ اگر ان فریقوں میں باہمی محبت کی بجائے بغض عناد اور دشمنی ہو تو معاشرتی زندگی ایک جہنم بن جاتی ہے اس نفرت سے خونی انقلاب جنم لیتے ہیں جیسا کہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے۔ روس میں خونی انقلاب کی وجہ امراء اور غرباء کے مابین جذبہ نفرت تھا۔ اس انقلاب نے روس کی زمین کو امراء اور سرمایہ داروں کے خون سے رنگ دیا تھا۔

۲۔ مساوات اور اتحاد کا ذریعہ: جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو مسلمانوں کے اندر مساوات اور اتحاد کی ہمہ گیر لہر دوڑ جاتی ہے تمام دنیا کے مسلمان حکم خداوندی کے تحت پو پھٹنے سے لے کر غروب آفتاب تک اکل وشرب سے رک جاتے ہیں اور ایک ہی حالت میں داخل ہو جاتے ہیں اس طرح ماہ رمضان دنیا کے تمام مسلمانوں کو اتحاد، اخوت اور مساوات کی لڑی میں منسلک کر دیتا ہے۔ قوموں کی ترقی اخوت مساوات اور اتحاد پر ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے اتحاد پر بہت زور دیا ہے اور تمام اسلامی عبادات اسی قدر کی تعلیم دیتی ہیں قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ رکھو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔

۳۔ جہاد کی تیاری: روزہ جہاد کے لیے تیار کرتا ہے۔ جہاد میں مجاہد کو مصائب اور مشکلات، بھوک اور پیاس برداشت کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے ہر دور میں جنگجوؤں کو مختلف قسم کی مشکلات میں سے گزارا جاتا تھا تاکہ ان میں مشکلات برداشت کرنے کی قوت پیدا ہو۔ قرآن مجید بھی یہی کہتا ہے کہ اعانت الٰہی نماز اور صبر کے ساتھ منسلک ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ ۲:۴۵) صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔

اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا۔ وَاصْبِرْ مَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ (نحل ۱۶:۱۲۷) صبر کیجئے اور آپ کا صبر اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے ہے۔

صبر مشکلات اور مصائب برداشت کرنے کا نام ہے۔ انسان کے اندر یہ وصف روزہ کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ جب کسی قوم میں مشکلات برداشت کرنے کا مادہ ختم ہو جاتا ہے تو وہ قوم دنیا کے نقشہ سے مٹ جاتی ہے۔ اسلامی عبادات کی یہی خوبی ہے کہ جہاں روحانی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ وہاں مادی فوائد (قومی ترقی کے ذرائع) بھی حاصل ہوتے ہیں۔

حج

حج کے لغوی اور اصطلاحی معنی: حج کے لغوی معنی میں القصد لزیارۃ (مفردات امام راغب) یعنی کسی چیز کی زیارت کا قصد کرنا۔ لیکن اصطلاح شریعت میں ضروری عبادات کی بجا آوری کے لیے بیت اللہ کا قصد کرنا (امام راغب)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نامساعد حالات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے فرمان کے تحت اپنے مولد فدان ارام سے ہجرت کا ارادہ کیا۔ وَقَالَ اِنِّی ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّی سَیَھْدِیْنِ (اور ابراہیم نے کہا میں جانے والا ہوں اپنے پروردگار کی طرف قریب ہی وہ میری راہنمائی کرے گا۔)

حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت سارہ کو ساتھ لے کر فرات کی غربی کنارہ کے قریب ایک بستی میں چلے گئے جو کلدانیین کے نام سے مشہور ہے اور کچھ دنوں کے بعد یہاں سے حران کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہاں دین حنیف کی تبلیغ شروع کر دی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی طرح دعوت توحید دیتے ہوئے فلسطین پہنچے اس سفر میں بھی حضرت سارہ، حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی بیوی ساتھ تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فلسطین کے غربی اطراف میں سکونت اختیار کر لی۔ اس زمانہ میں یہ علاقہ کنعانیوں کے زیر تسلط تھا۔ پھر قریب ہی شکیم (نابلس) میں چلے گئے وہاں کچھ عرصہ قیام کیا۔ اس کے بعد یہاں بھی زیادہ عرصہ قیام نہیں فرمایا اور غرب کی طرف چلتے چلتے مصر جا پہنچے۔ اس وقت مصر میں عمالقہ کی حکومت تھی اور بادشاہ رقیوں تھا۔ (خطبات احمدیہ از سرسید ص ۱۰۹) شاہان عمالقہ عیش پرستی میں یہاں تک آگے گزر گئے تھے کہ رعایا کی شوہر دار حسین ازواج ان کے خاوندوں سے چھین کر اپنے حرم میں داخل کر لیتے تھے۔ بی بی سارہ کو بھی بادشاہ نے اپنے لیے پسند کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے شب کو رویاء میں بتایا کہ وہ ایک برگزیدہ نبی کی زوجہ ہے۔ لہٰذا وہ اپنے اس ناپاک ارادہ سے باز رہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قدر ومنزلت کی اور رضا جوئی کے لیے اپنی صاحبزادی ہاجرہ کو بھی عقدہ نکاح میں دے دیا۔ حضرت سارہ نے اولاد سے محروم ہونے کی وجہ سے حضرت ابراہیم سے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسماعیل پیدا ہوئے اور حضرت سارہ کے بطن سے حضرت اسحاق متولد ہوئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مکہ کی طرف ہجرت: تورات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکہ میں چھوڑنے کی وجہ یہ بیان کی ہے حضرت سارہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حضرت اسماعیل علیہ السلام سے پدری محبت اور پیار گوارہ نہ تھا۔ حضرت سارہ کے گمان میں حضرت اسماعیل خدمت گار عورت کا لڑکا ہے اس وجہ سے انھوں نے قسم کھائی کہ وہ حضرت ہاجرہ کے ساتھ نہیں رہیں گی اس وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ وہ حضرت ہاجرہ اور اس کے بیٹے کو نکال دیں تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو ساتھ لیا اور جنوب کی طرف روانہ ہو گئے اور اس جگہ لا کر چھوڑ دیا جو آج کل مکہ کے نام سے مشہور ہے اس وقت وہاں کوئی مستقل آبادی نہ تھی۔ صرف شام ویمن سے آنے جانے والے قافلے آرام کرنے کے لیے پڑاؤ ڈال لیا کرتے تھے۔

حضرت ہاجرہ نے وہاں سر چھپانے کے لیے ایک جھونپڑی وغیرہ بنا لی جو تھوڑا سا سامان معیشت ساتھ لایا ہوا تھا۔ وہ ختم ہوگیا۔ جب بچہ کو سخت پیاس لگی تو حضرت ہاجرہ نے ماں کی مامتا میں پانی کی تلاش میں صفا اور مروہ دونوں پہاڑیوں پر سات مرتبہ چکر لگائے لیکن پانی کا نشان تک نہ پایا مایوسی کے عالم میں واپس اپنے ننھے بچے کو دیکھنے کے لیے لوٹیں تو دیکھا کہ بچہ پیاس کے مارے زمین پر ایڑیاں رگڑ رہا ہے اس کی ایڑیاں پانی سے شرابور ہیں اور صاف شفاف پانی بہہ نکلا ہے۔ انھوں نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو پانی پلایا اور چشمہ کے اردگرد منڈیر بنا دی۔

بائبل کا یہ بیان سرتاپا غلط اور بے بنیاد ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ کے کہنے پر حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو گھر سے نکالا تھا۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایک بہت بڑا اخلاقی اور معاشرتی بہتان ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اس مقام پر چھوڑنے کی وجہ یہ بیان کی ہے ارشاد الٰہی ہے۔ رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ (ابراہیم۱۴:۳۶) ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد کو تیرے عزت والے گھر کے پاس وادی غیر ذی زرع میں بسایا ہے۔ ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم کریں سو تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے اور ان کے پھلوں سے رزق

دے تا کہ وہ شکر کریں۔

یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے خانہ کعبہ کے پاس چھوڑنے کی طرف اشارہ ہے یہاں لفظ اَسۡکَنۡتُ لا کر بتایا ہے کہ یہ چھوڑنا محض اخراج کے طور پر نہ تھا بلکہ مصلحت الٰہی کا تقاضا تھا کہ حضرت ابراہیم کی اولاد کا ایک قصبہ یہاں آباد ہو۔ حدیث میں بھی ہے کہ یہ چھوڑنا حکم الٰہی سے تھا۔ اور وادی غیر ذی زرع کے الفاظ اس جگہ کی کیفیت ظاہر کرتے ہیں کہ وہ زمین پتھریلی ہے جہاں سبزی کا نام ونشان نہیں اور بارش کم ہوتی ہے اس لیے وہ کھیتی باڑی کے لیے موزوں نہیں۔ یہ الفاظ کہنے میں یہ حکمت بالغہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی پیاری بیوی اور پیارے معصوم بچے کو محض رضائے الٰہی کے تحت چھوڑا تھا۔ دنیوی اغراض مدنظر نہ تھیں۔

حضرت رسول کریم ﷺ نے حضرت اسماعیل اور حضرت ہاجرہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ کو چھوڑ کر واپس جانے لگے تو حضرت ہاجرہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کیا آپ اللہ کے حکم سے ہمیں یہاں چھوڑ کر جا رہے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اشارہ فرمایا ہاں۔ تب حضرت ہاجرہ نے فرمایا اگر آپ ہمیں خدا کے فرمان کے تحت یہاں چھوڑ کر جا رہے ہیں تو وہ رازق قدرت والا خدا ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔

خانہ کعبہ کی تعمیر: حضرت سارہ کی وفات کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ تشریف لائے۔ حضرت اسماعیل سن بلوغت کو پہنچ چکے تھے۔ وہاں باپ بیٹے نے فرمانِ خداوندی کے تحت ایک گھر کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰھٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَاِسۡمٰعِیۡلُ (بقرہ ۲:۱۲۷) جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔ تب خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ وَطَھِّرۡ بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَالۡقَآئِمِیۡنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ یَاۡتُوۡکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاۡتِیۡنَ مِنۡ کُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ (الحج ۲۲:۲۶، ۲۷) اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کر اور لوگوں میں حج کے لیے پکار دے وہ تیری طرف آئیں گے (کچھ) پیدل اور (کچھ) ہر طرح کی دبلی (سواریوں) پر جو ہر دور کے راستے سے آتی ہوں گی۔

چشمہ جاری ہونے کی وجہ سے وہاں آبادی قائم ہوگئی تھی۔

تورات میں بیت اللہ کی تعمیر کا ذکر: ابراہیم نے خداوند کے لیے کنعان میں ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں سے روانہ ہوئے اس نے بیت اہل کے پورب ایک پہاڑ کے بائیں اپنا ڈیرا کھڑا کیا۔ بیت اہل اس کے پچھم اور عی اس کے پورب تھا اور وہاں اس نے خدا کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا اور ابرام رفتہ رفتہ دکھن کی طرف گیا۔ (پیدائش ۱۲ باب ۶......۹) یہاں جس بیت اہل کا ذکر ہے وہ ضرور مکہ ہی ہے کیونکہ کنعان عرب کے حدود میں ہے بیت اللہ جسے مکہ کہتے ہیں۔ کنعان سے دکھن کی طرف واقع ہے۔ پیدائش ۱۳ باب ۳ میں ابرام کی نسبت لکھا ہے کہ وہ دکھن کی طرف چلا اور سفر کرتا دکھن سے بیت اہل میں پہنچا۔

تورات کی یہ شہادت یہ ظاہر کرتی ہے کہ مکہ والے بیت اللہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہی تعمیر کیا تھا۔

تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ سات مرتبہ بنایا گیا اول حضرت آدم نے اس کو تعمیر کیا۔ مرور زمانہ سے مسمار ہوگیا پھر انہی بنیادوں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا۔ پھر عمالقہ نے پھر جرہم پھر قریش نے جب رسول کریم ﷺ نے حجر اسود رکھا۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمر پینتیس سال تھی۔ پھر حضرت عبداللہ بن زبیر نے پھر حجاج نے۔ بعض نے عمالقہ اور جرہم کے بنانے کا ذکر نہیں کیا صرف پانچ مرتبہ تعمیر کرنا لکھا ہے۔ بیت اللہ کی قدامت کا ذکر حدیث میں آتا ہے چنانچہ بخاری اور مسلم میں ہے کہ ابوذرؓ نے رسول کریم ﷺ سے سوال کیا اَیُّ مَسۡجِدٍ وُّضِعَ اَوَّلُ کونسی مسجد سب سے پہلے بنائی گئی تو آپ نے جواب دیا المسجد الحرام۔ ایک حدیث حضرت عمرو بن العاصؓ سے مرفوع بیان ہوئی ہے۔ بَعَثَ اللّٰہُ جِبۡرَئِیۡلَ اِلٰی اٰدَمَ وَحَوَّاءَ فَاَمَرَھُمَا بِبِنَاءِ الۡکَعۡبَۃِ فَبَنَاہُ اٰدَمُ ثُمَّ اَمَرَ بِالطَّوَافِ یعنی اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو آدم اور حوا کی طرف بھیجا اور ان کو کعبہ کے بنانے کا حکم دیا پس آدم نے اسے بنایا پھر اسے اس کے طواف کا حکم دیا۔

دور حاضر کے مورخ بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ چنانچہ میور لکھتا ہے۔ ''مذہب مکہ کے اہم خدوخال (کی تاریخ) کا تعلق نہایت قدیم زمانہ سے متعین کرنا پڑے گا''...... ڈائی ڈورس سیکولس (Diodorus Siculus) یہ ہمارے زمانہ سے تقریباً نصف صدی پیشتر عرب کے متعلق جس کے کناروں سے بحرۂ قلزم ٹکراتا ہے لکھتا ہے۔

''اس ملک میں ایک عبادت گاہ ہے جس کی عرب لوگ بڑی عزت کرتے ہیں۔ یہ الفاظ مکہ کے مقدس گھر کے متعلق ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ کوئی دوسری

جگہ ہمارے علم میں نہیں ہے، جس کو اس قدر عالمگیر عزت اور قبولیت حاصل ہے...... روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ مکہ اس زمانہ سے جس کا تصور ناممکن ہے عرب کے تمام حصوں سے حج کا مرکز رہا ہے۔ اس گھر کی عزت و منزلت اور اس کی مقبولیت کی ابتداء یقیناً نہایت قدیم زمانہ سے متعلق رکھتی ہے۔
(لائف آف محمد ﷺ صفحہ ایکس سی)

بیت اللہ کی قدامت: گبن کی تاریخ عروج و زوال روم میں بھی لکھا ہے "ثمودیوں اور سبا والوں کے درمیان ایک مشہور معبد ہے جس کی تمام عرب بہت بڑی عزت کرتے تھے"۔

المسجد الحرام کا رقبہ: انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں مسجد حرام کا رقبہ حسب ذیل ہے۔ شمال مغربی ضلع ۵۴۵ فٹ، جنوب مشرقی ضلع ۵۵۳ فٹ شمال مغربی ضلع ۵۶۰ فٹ اور جنوب مغربی ضلع ۳۶۴ فٹ۔

ثقافتی مرکز: اسلام سے قبل مسجد حرام عربوں کے تمام انتظامی معاملات کا مرکز تھی۔ دارالندوہ اس کے اندر ہی تھا۔ جہاں لوگوں کی شکایات کے فیصلے کیے جاتے تھے۔ اسلام کے بعد بھی تمام علمی، اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ اب تمام مسلمانان عالم بیت اللہ کو ہی اپنا روحانی مرکز تسلیم کرتی۔

حج کی اہمیت: حج بعض شرائط کے ساتھ ہر مسلمان عاقل بالغ پر فرض ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ (آل عمران ۳:۹۷) اور لوگوں پر اللہ کے لیے اس گھر کا حج کرنا فرض ہے اس پر جو اس تک راہ پا سکے اور جس نے انکار کیا تو اللہ جہانوں سے بے نیاز ہے۔ استطاعت سے مراد یہ ہے کہ:

۱۔ حج کرنے والا آزاد ہو۔ ۲۔ صحت ایسی ہو کہ وہ سفر کی صعوبتیں برداشت کر سکے۔ ۳۔ راستے میں جان کا کوئی خطرہ نہ ہو یعنی راستہ پُرامن ہو۔ ۴۔ اتنا روپیہ ہو جس سے وہ اپنا زادِ راہ بھی اور اپنے اہل و عیال کے لیے بھی پیچھے چھوڑ جائے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔

مَنْ لَمْ يَحْبِسْهُ مَرَضٌ أَوْ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ أَوْ سُلْطَانٌ فَاجِرٌ وَلَمْ يَحُجَّ فَلْيَمُتْ إِنْ شَاءَ يَهُوْدِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا (سنن کبریٰ جلد ۴ باب امکان الحج) جسے کسی بیماری یا کسی حاجت نے یا کسی فاجر حکمران نے روک نہ رکھا ہو۔ اس کے باوجود وہ حج نہ کرے۔ وہ یہودی مرے چاہے نصرانی۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ لِيَمُتْ يَهُوْدِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا يَقُوْلُهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ رَجُلٌ مَاتَ وَلَمْ يَحُجَّ وَوَجَدَ لِذٰلِكَ سَعَةً وَخُلِّيَتْ سَبِيْلُهُ (سنن کبریٰ جلد ۴ باب امکان الحج) اس شخص کو یہودی مرنا چاہیے۔ نصرانی مرنا چاہیے (آپ نے یہ الفاظ تین بار دہرائے) جو سفر کی استطاعت اور راستے کا امن پائے لیکن پھر بھی حج کیے بغیر مر گیا ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں۔ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا يُوْجِبُ الْحَجَّ قَالَ الزَّادُ وَالرَّاحِلَةُ (سنن ترمذی ابواب المناسک باب ماجاء فی ایجاب الحج بالزاد والراحلۃ) ایک شخص رسول کریم ﷺ کے پاس آیا عرض کیا یارسول اللہ! کس سے حج فرض ہوتا ہے۔ فرمایا زاد راہ اور سواری۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ مَنْ مَلَكَ زَادًا وَرَاحِلَةً تُبَلِّغُهُ إِلَى بَيْتِ اللّٰهِ وَلَمْ يَحُجَّ فَلَا عَلَيْهِ أَنْ يَمُوْتَ يَهُوْدِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا وَذٰلِكَ أَنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ فِي كِتَابِهِ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا (سنن ترمذی ابواب الحج باب ماجاء فی التغلیظ فی ترک الحج) جو زاد راہ اور سواری کا مالک ہو کہ وہ اسے بیت اللہ تک پہنچا سکے اور اس نے حج نہ کیا تو وہ شخص یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر کوئی فرق نہیں کیونکہ قرآن مجید میں آتا ہے اور لوگوں پر اللہ تعالیٰ کے لیے بیت اللہ کا حج لازم ہے، جو وہاں تک جانے کی طاقت رکھتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ مَنْ أَرَادَ الْحَجَّ فَلْيَتَعَجَّلْ (سنن ابی داؤد کتاب المناسک) جو حج کا ارادہ کرے تو اسے جلدی کرنا چاہیے۔

مَنْ أَرَادَ الْحَجَّ فَلْيَتَعَجَّلْ فَإِنَّهُ قَدْ يَمْرَضُ الْمَرِيْضُ وَتَضِلُّ الضَّالَّةُ وَتَعْرِضُ الْحَاجَةُ (سنن ابن ماجہ ابواب المناسک باب الخروج الی الحج) جو حج کا ارادہ کرے، تو اسے چاہیے کہ جلدی کرے کیونکہ کوئی مرض لاحق ہو سکتی ہے اور کوئی بہکا سکتا ہے اور کوئی حاجت درپیش آ سکتی ہے۔ فرمایا اَلْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ (صحیح بخاری کتاب الحج باب وجوب العمرۃ) مقبول حج کا بدلہ جنت کے سوا اللہ کچھ نہیں۔

فرمایا مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ (صحیح بخاری کتاب الحج باب فضل الحج والعمرۃ) جس نے اللہ کی رضا کی خاطر حج کیا۔ کوئی بے حیائی نہ کی اور نہ کوئی نافرمانی کی تو وہ حج سے اس طرح پاک اور طاہر لوٹے گا جیسا کہ اس کو اس کی ماں نے جنم دیا ہے۔

فرمایا۔ تَابِعُوا بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ فَإِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الْفَقْرَ وَالذُّنُوبَ كَمَا يَنْفِي الْكِيرُ خَبَثَ الْحَدِيدِ وَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَلَيْسَ لِلْحَجَّةِ الْمَبْرُورَةِ ثَوَابٌ إِلَّا الْجَنَّةُ (ترمذی ونسائی) پے در پے حج اور عمرہ کیا کرو کیونکہ حج اور عمرہ دونوں فقر ومحتاجی، گناہوں کو اس طرح دور کر دیتے ہیں جس طرح لوہار اور سنار کی بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کا میل کچیل دور کر دیتی ہے۔ حج مبرور کا بدلہ بس جنت ہی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول کریم ﷺ نے خطبہ دیا اور فرمایا۔ أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ فَرَضَ عَلَيْكُمُ الْحَجَّ فَحُجُّوا فَقَالَ رَجُلٌ أَكُلَّ عَامٍ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَسَكَتَ حَتَّى قَالَهَا ثَلَاثًا فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ ثُمَّ قَالَ ذَرُونِي مَا تَرَكْتُكُمْ فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِكَثْرَةِ سُؤَالِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ عَلَى أَنْبِيَائِهِمْ فَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَدَعُوهُ (صحیح مسلم کتاب الحج باب فرض الحج مرة فی العمر) اے لوگو! تم پر حج فرض کر دیا گیا ہے بس تم حج کرو۔ ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ کیا ہر سال رسول اللہ ﷺ خاموش رہے حتیٰ کہ اس نے تین بار کہا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میں "ہاں" کہہ دیتا تو فرض ہو جاتا اور تم طاقت نہ پاتے۔ پھر فرمایا جو میں چھوڑ دوں تو تم مجھ سے اس بارے میں سوال مت کرو کیونکہ پہلی امتیں سوالوں کی کثرت اور ان کے اپنے انبیاء سے اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہو گئیں پس جو میں تم کو حکم دوں تو اس پر اپنی استطاعت کے مطابق عمل کرو اور جب میں کسی شے سے تم کو روکوں تو تم اسے چھوڑ دو۔

سنن ابی داؤد میں ہے قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ الْحَجُّ فِي كُلِّ سَنَةٍ أَوْ مَرَّةً وَاحِدَةً قَالَ بَلْ مَرَّةً وَاحِدَةً فَمَنْ زَادَ فَهُوَ تَطَوُّعٌ (سنن ابی داؤد اول کتاب المناسک) عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ حج ہر سال فرض ہے یا ایک مرتبہ فرمایا ایک ہی مرتبہ جو ایک سے زیادہ کرے وہ نفل ہے۔

<u>حج کے مہینے:</u> اسلام نے دیگر فرض عبادات کی طرح حج کے ایام بھی متعین کر دیے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ (البقرہ ۲:۱۹۰) حج معلوم مہینوں میں کیا جاتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے۔ قَالَ ابْنُ عُمَرَ أَشْهُرُ الْحَجِّ شَوَّالٌ وَذُو الْقَعْدَةِ وَعَشْرٌ مِنْ ذِي الْحَجَّةِ وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ مِنَ السُّنَّةِ أَنْ لَا يُحْرِمَ بِالْحَجِّ إِلَّا فِي أَشْهُرِ الْحَجِّ (بخاری کتاب المناسک باب قول اللہ تعالیٰ الحج اشھر معلومات) ابن عمر کہتے ہیں کہ حج کے مہینے شوال اور ذی قعدہ اور دس دن ذی الحجہ کے ہیں اور ابن عباس کہتے ہیں۔ سنت یہ ہے کہ حج کا احرام حج کے مہینوں میں باندھے کسی مذہب کی کتاب سے بھی عبادات کا وقت مقرر نہیں ہے۔ اسلام نے فرض عبادات کے اوقات مقرر کیے ہیں۔ دیگر مذاہب کے علماء نے اپنے نبی کے بعد اوقات عبادت مقرر کیے تھے۔ اسلام نے اپنی عبادات کے اوقات مقرر کر دیے ہیں۔ اس کے کئی دقیق رموز ہیں جن کا زیر عنوان "فلسفہ حج" بیان کیا جائے گا۔

<u>مناسک حج:</u> احرام، حرم سے مشتق ہے جس کے معنی ممنوع ہیں۔ وہ حالت ہے جس میں وہ چیز جو انسان کے لیے حلال ہوتی ہے ممنوع ہو جاتی ہے۔ جب حاجی میقات پر پہنچتا ہے تو وہ احرام باندھ لیتا ہے۔ احرام کا لباس صرف دو اَن سلی چادروں کا ہوتا ہے۔ ایک چادر بطور تہ بند کے باندھی جاتی ہے دوسری چادر جسم کے اوپر کے حصہ کے لیے ہوتی ہے یہ چادر اس طرح اوڑھی جاتی ہے کہ اس کا ایک سرا دائیں بغل سے نکال کر بائیں کندھے پر اور دوسرا بائیں بغل سے نکال کر دائیں کندھے پر لٹکایا جاتا ہے۔ اس کے بعد دو رکعت نماز ادا کی جاتی ہے۔ نماز ادا کرنے کے بعد حاجی بلند آواز سے یہ الفاظ پکارتا ہے۔ لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ لَبَّيْكَ إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ. (بخاری ۲۵:۲۶ صحیح مسلم کتاب الحج باب التلبیہ وصفتھا ووقتھا) حاضر ہوں۔ میرے اللہ! میں حاضر ہوں، حاضر ہوں تیرا سوا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں۔ یقیناً حمد تیرے لیے ہی ہے نعمت تیری ہے بادشاہی تیری ہے۔ کوئی تیرا شریک نہیں۔ یہ پکار حاجی کا ورد بن جاتی ہے۔ ہر نماز کے بعد ہر نشیب و فراز پر اترتے چڑھتے ہوئے ہر صبح بیدار ہوتے ہوئے یہ پیارے کلمات حاجی کی زبان پر جاری رہتے ہیں۔

<u>ممنوعات احرام:</u> درج ذیل اعمال سے شارع علیہ السلام نے منع فرمایا ہے۔

ا۔ سر کو کسی چیز سے ڈھانپنا۔ ۲۔ بال مونڈنا۔ ۳۔ ناخن کاٹنا۔ ۴۔ خوشبو لگانا۔ ۵۔ سلا ہوا کپڑا پہننا۔ ۶۔ خشکی کا شکار کرنا۔ (ارشاد الٰہی ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ (مائدہ ۵:۹۵) اے ایمان والو! احرام کی حالت میں تم شکار نہ کرو)۔ ۷۔ مجامعت تک پہنچا دینے والے شہوانی عمل (ارشاد الٰہی ہے فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (البقرہ ۲:۱۹۷) حج میں شہوانی عمل گناہ اور جھگڑا (جائز) نہیں۔ ۸۔ نکاح کرنا یا پیغام منگنی دینا (رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں لَا يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ وَلَا يُنْكِحُ وَلَا يَخْطُبُ (مسلم) محرم نہ خود نکاح کرے۔ نہ کسی کا نکاح کرے اور نہ ہی منگنی کا پیغام دے۔

۸۔ عورت سے مباشرت کرنا۔ اگر کوئی حاجی مذکورہ بالا ممنوعات میں سے پہلے پانچ کا مرتکب ہو جائے تو یہ لازم ہو جاتا ہے وہ تین روزے رکھے یا چھ مساکین کو کھانا دے یا ایک بکری ذبح کرے۔ ارشاد الٰہی ہے فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ (البقرہ ۲:۱۹۶) جو

کوئی تم میں کوئی بیمار ہو جائے یا اس کے سر میں تکلیف ہو تو اس کا فدیہ روزوں سے یا صدقہ سے یا قربانی سے دے۔

مجامعت سے حج باطل ہو جاتا ہے مگر اس حج کی تکمیل ضروری ہے اور اس پر ایک اونٹ کا فدیہ ہے۔ اگر اس کی استطاعت نہیں تو دس دن کے روزے رکھے گا اور اگلے سال حج کی قضا کرے گا۔ موطا امام مالک میں ہے۔ حضرت عمر بن خطاب حضرت علی بن ابی طالب اور ابو ہریرہؓ سے سوال کیا گیا کہ ایک آدمی حج کے احرام میں جماع کر لیتا ہے تو تینوں اصحاب نے یہ جواب دیا کہ یہ حج پورا کرے، پھر اگلے سال حج اور قربانی کرے۔

عورت کو معمولی لباس پہننے کی اجازت ہے پاجامہ قمیض وغیرہ مگر اس کو دستانے اور نقاب اور ورس اور زعفران والے کپڑے پہننے منع ہیں حدیث میں آتا ہے حضرت عائشہؓ نے ذکر فرمایا۔ لَا تُلَثِّمُ وَلَا تَبَرْقَعُ وَلَا تَلْبَسُ ثَوْبًا بِوَرْسٍ وَلَا زَعْفَرَانٍ (بخاری کتاب المناسک باب مایلبس المحرم الخ) عورت ہونٹ نہ چھپائے نہ برقعہ منہ پر ڈالے نہ ورس والا اور زعفران والا کپڑا پہنے۔

فرمایا وَلَا تَنْتَقِبِ الْمَرْاۃُ الْحَرَامُ وَلَا تَلْبَسُ الْقُفَّازَیْنِ (سنن الترمذی ابواب الحج باب ماجاء مالا یجوز للمحرم لبسہ) حرام کی حالت میں عورت نہ نقاب لے نہ دستانے پہنے۔

دستانے اور نقاب اور ورس اور زعفران والا کپڑا مرتبہ کی علامت ہیں اور حج میں تمام انسانوں کو مساوات کی ایک سطح پر لانا مقصود ہے۔ اس لیے ان چیزوں سے منع کیا ہے۔

طواف: طواف کے معنی چکر لگانا کے ہیں لیکن اسلامی اصطلاح میں کعبۃ اللہ کے اردگرد سات بار چکر لگانے کو کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ (الحج ۲۲:۲۹) اور قدیم گھر کا طواف کریں۔

امام بخاری نے ایک باب باندھا ہے۔ من طاف بِالْبَيْتِ إِذَا قَدِمَ مَكَّةَ قَبْلَ أَنْ يَرْجِعَ إِلَى بَيْتِهِ ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الصَّفَا (بخاری کتاب المناسک باب ۶۲) جو شخص بیت اللہ کا طواف کرے جب مکہ آئے پہلے اس سے کہ اپنے گھر کی طرف ہوئے پھر دو رکعتیں پڑھے پھر صفا کی طرف نکلے۔ اس طواف کو طواف قدوم کہا جاتا ہے یہ طواف مسنون ہے فرض نہیں۔

طواف حجر اسود سے شروع کیا جاتا ہے جس کو بوسہ دیا جاتا ہے (بخاری کتاب المناسک باب استلام الحجر الاسود) اگر ازدہام کی وجہ سے حجر اسود کو بوسہ نہ دیا جا سکے تو اشارہ کر دینا ہی کافی ہے۔ (بخاری کتاب المناسک باب تقبیل الحجر و باب من اشار الی الرکن) طواف کرتے ہوئے کعبہ کو دائیں طرف رکھا جاتا ہے اور کل سات چکر کاٹے جاتے ہیں پہلے تین چکر تیزی سے لگائے جاتے ہیں۔ اس کو رمل کہا جاتا ہے اور باقی چار معمولی رفتار سے۔ لیکن کسی ضرورت سے طواف کسی جانور پر سوار ہو کر بھی کیا جا سکتا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر اونٹ پر سوار ہو کر طواف کیا تھا اور آپ ﷺ نے ام سلمہ کو بھی بیماری کی وجہ سے سواری پر طواف کرنے کی اجازت دی تھی۔ (بخاری کتاب المناسک باب المریض یطوف راکبا) طواف کرتے ہوئے کسی ضرورت کی وجہ سے کوئی کام کرنا یا بات چیت کرنا منع نہیں ہے۔ (بخاری کتاب المناسک باب الکلام فی الطواف) طواف کی حالت میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں کی جائیں۔ نبی کریم ﷺ نے یہ دعا فرمائی تھی۔ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (اے ہمارے رب! ہمیں اس دنیا میں بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی نصیب کر اور دوزخ کی آگ سے بچا۔ (کتاب المناسک ۲۵:۶۲)

طواف سے پہلے نبی کریم ﷺ نے وضو کیا ہے (بخاری) آپ کا ارشاد ہے کہ یہ نماز ہی کی طرح ہے لیکن اس کے دوران میں اگر کوئی بات کرنا چاہے تو کر سکتا ہے لیکن یہ نیکی کی بات ہو۔ (مشکوٰۃ ۱۱:۳ بروایت ترمذی)

حائضہ حج کے تمام مناسک ادا کر سکتی ہے مگر طواف نہیں کر سکتی حضرت عائشہ سے روایت ہے۔ کہتی ہیں کہ ہم حج کے لیے نکلے اور حج کے سوائے کوئی ہمارا مقصد نہ تھا جب ہم مقام سرف پر پہنچے تو مجھے حیض آ گیا۔ پس میرے پاس رسول اللہ ﷺ آئے اور میں رو رہی تھی تو فرمایا تجھے کیا ہوا تجھے حیض آ گیا۔ میں نے کہا ہاں فرمایا كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَى بَنَاتِ آدَمَ وَاقْضِي مَا يَقْضِي الْحَاجُّ غَيْرَ أَنْ لَا تَطُوفِي بِالْبَيْتِ (بخاری کتاب المناسک) یہ ایک چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں پر مقرر کر دیا ہے جو مناسک حاجی کرتے ہیں تم بھی کرو۔ مگر بیت اللہ کا طواف نہ کر۔

طواف قدوم کے علاوہ ایک طواف وداع ہے یہ طواف مناسک حج ادا کرنے کے بعد گھر واپس آنے سے قبل کیا جاتا ہے۔ یہ طواف حنفی مذہب میں واجب ہے جو طواف ایام النحر (دسویں گیارھویں اور بارھویں تاریخ) کو بعد قربانی اور حلق کیا جاتا ہے اس کو طواف زیارت کہا جاتا ہے۔ یہ طواف حج کی ضروری عبادات میں سے ہے۔ مقدس جگہوں کے گرد طواف بنی اسرائیل میں رائج تھا۔ (زبور ۲۶)

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام مضمون طواف کے تحت مضمون نگار لکھتا ہے۔ ''جہاں کہ قربان گاہ کے اردگرد پہلے چھ دنوں میں ایک مرتبہ اور بعض اوقات ساتویں دن طواف کیا جاتا ہے۔''

حجر اسود کی حقیقت: یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حجر اسود جس زمانہ سے کعبہ کا وجود علم میں آیا ہے اسی زمانہ سے حجر اسود بھی وہاں موجود ہے۔ حجر اسود بیت اللہ کے زمانے کا ایک پتھر ہے۔ حجر اسود ایک بن گھڑا پتھر ہے چونکہ عرب میں گھڑے ہوئے پتھروں کی عبادت ہوتی تھی۔ اس واسطے بیت کعبہ کے کونے میں بن گھڑا پتھر رکھا گیا تاکہ اس کی پرستش کا خیال دل میں نہ آئے۔ یہ پتھر تصویری زبان کی علامت ہے۔ ہر زمانہ میں تصویری زبان کا رواج ہے۔ اکثر آریہ ورت کے قصص تصویری زبان میں ہیں۔ جرائد اور اخبارات میں تصویری زبان کا معمول ہے۔ سکندر اور دارا کے قصے میں تصویری زبان کی گفتگو مشہور ہے۔ عیسائی بھی یہ تسلیم کرتے ہیں۔ یشوع کے بارہ پتھر بارہ حواریوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہودی قربانی کو مسیح کی پھانسی کی تصویری علامت بتاتے ہیں حتیٰ کہ ختنہ بھی عیسیٰ کے قتل کا نشان کہتے ہیں۔ اسی طرح پولا ہلانا جس کی نسبت احبار ۲۳ باب ۱۰ میں حکم ہے۔ مسیح کا جی اٹھنا مراد لیتے ہیں۔ لہٰذا حجر اسود کی شکل میں یہ تصویری زبان حضرت مسیح کی اس پیشگوئی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ ''وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا کونے کا سرا ہو گیا (زبور ۱۱۸: ۲۳) جس پتھر کو راجگیر وں نے ناپسند کیا وہی کرنے کا سرا ہوا (متی ۲۱: ۴۲) پیشینگوئیوں میں اس پتھر سے مراد حضرت اسمٰعیل تھے۔ جن کو بنی اسرائیل نے رد کیا اور اس کے کونے کا سرا ہونے میں اشارہ رسول کریم ﷺ ہے جو ساری دنیا کے لیے آخری نبی ہوئے۔ پیشگوئی کے یہ الفاظ جو کوئی اس پر گرے گا چور ہوگا جس پر یہ گرا اسے پیس ڈالے گا۔ ظاہر کرتے ہیں کہ اس پتھر سے مراد کوئی عظیم ہستی ہے کہ جو اس کی مخالفت میں اٹھے گا وہ تباہ و برباد ہو جائے گا اور جس مخالف کے خلاف ہتھیار اٹھائے گا وہ بھی تباہ و برباد ہو جائے گا۔ رسول کریم ﷺ کی دفاعی جنگیں ان الفاظ کی صداقت کو ظاہر کرتی ہیں۔

سعی صفا و مروہ: سعی کے معنی دوڑنا ہے۔ اسلامی شریعت میں حاجیوں کا صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے کو کہتے ہیں۔ سعی کا ذکر قرآن مجید میں آتا ہے۔
اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا (بقرہ ۲: ۱۵۸) بلاشبہ صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں پس جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے۔

قرآن مجید میں لفظ سعی استعمال نہیں ہوا بلکہ لفظ طواف کا ایک اشتقاق یطوف آتا ہے۔

یہ منسک حج رسول کریم ﷺ نے اس طرح کیا کہ طواف سے فارغ ہو کر آپ صفا کی طرف گئے اور اس کے اوپر تک چڑھ گئے پھر قبلہ رو ہوئے تو فرمایا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ، اَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ (مسلم) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اس کا کوئی شریک نہیں بادشاہی اس کی ہے اور تعریف بھی اسی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ تنہا ہے اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے اور اپنے بندے کی مدد کی ہے اور کافروں کے تمام گروہوں کو تنہا شکست دی ہے۔ یہی کلمات آپ نے تین مرتبہ دہرائے اور ان کے درمیان دعا بھی کی۔ اس کے بعد پھر مروہ کی طرف چلے۔ جب نشیب میں پہنچے تو دوڑنے لگے۔ پھر جیسے ہی چڑھائی شروع ہوئی تو عام چال چلنے لگے مروہ پر پہنچ کر بھی آپ نے وہی کلمات کہے جو صفا پر کہے تھے اور آپ نے سات چکر لگائے۔

صفا اور مروہ کو اللہ کی نشانیاں کہا گیا ہے یہی دو پہاڑیاں ہیں جہاں حضرت ہاجرہ اپنے پیاسے بیٹے اسمٰعیل کے لیے پانی کی تلاش میں بے قراری اور اضطراب کی حالت میں بھاگتی رہیں۔

اسی طرح وہ پہاڑی ہے جہاں حضرت ابراہیم نے اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسمٰعیل کو پیشانی کے بل زمین پر لٹا کر اللہ کی رضا کی خاطر ذبح کرنے لگے تھے۔ اس لیے اس طرح صفا اور مروہ کے درمیان سعی حضرت ہاجرہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ان اعمال کی تصویر حاجی کے سامنے پیش کرتی ہے کہ ہر شخص کو خدا کی رضا کی خاطر اپنے نفس کی سرکشی اونٹنی کو ذبح کر دینا چاہیے اور مصائب میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔

منیٰ کی جانب کوچ: طواف اور سعی کے بعد حاجی ۸ ذی الحج کو منا کی طرف کوچ کرتے ہیں۔ طواف اور سعی انفرادی مناسک ہیں اجتماعی مناسک منیٰ کی طرف کوچ کرنے سے شروع ہوتے ہیں۔ منیٰ ایک وسیع میدان ہے جو عرفات اور مکہ کے درمیان مکہ مکرمہ سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

عرفات میں وقوف: عرفات اس میدان کا نام ہے جو مکہ کے مشرق میں تقریباً ۹ میل کے فاصلہ پر واقع ہے عرفات میں قیام حج کا لازمی رکن ہے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ اَلْحَجُّ عَرَفَةُ (ترمذی و مسند احمد) حج وقوف عرفہ ہے۔ حاجی نو ذوالحجہ کو دوپہر کے وقت منیٰ سے رخصت ہو کر عرفات میں ظہر اور عصر کی نمازیں جمع کرنے کے لیے پہنچ جاتے ہیں اور اس کے بعد امام جبل الرحمۃ پر خطبہ دیتا ہے۔ حاجی عرفات میں سہ پہر سے مغرب تک قیام کرتے ہیں۔ اگر حاجی عرفات کے قیام میں شریک نہ ہو سکے تو حج ادا نہیں ہوتا۔

اسلام سے قبل قریش اور چند عرب قبائل جو اپنے آپ کو دوسرے قبائل پر فوقیت کا دعویٰ کرتے تھے۔ عرفات میں نہیں جاتے تھے۔ اس طبقاتی تقسیم کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا۔ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ (بقرہ ۲: ۱۹۹) پھر تم وہاں سے پلٹو جہاں سے لوگ پلٹتے ہیں۔

اس کو یوم الترویہ کہا جاتا ہے جس کے لغوی معنی پانی لینے یا پیاس بجھانے کے ہیں کیونکہ اس دن حاجی آئندہ ایام کے لیے اپنے لیے پانی مہیا کرتے ہیں۔ (نہایہ) حقیقت میں یوم الترویہ روحانی پیاس بجھانے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

یہ روحانی معرفت کا دن ہے اور اس دن حاجی اپنی استطاعت کے مطابق روحانی سلوک طے کرتا ہوا خدا کا قرب حاصل کرتا ہے اس وجہ سے اس میدان کا نام عرفات رکھا گیا ہے۔ حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے قریب ہوتے ہیں۔ فرشتوں کے روبرو ان پر فخر کا اظہار کرتے ہیں اور اس سے زیادہ کسی دن اپنے بندوں کو آگ سے نجات نہیں دیتے۔ (مسلم)

یہ صرف معرفت الٰہی کا دن ہی نہیں بلکہ انسان کو اپنی حقیقت سمجھنے کا دن بھی ہے۔ تمام انسان ایک لباس میں ملبوس ہو کر ایک امام کے پیچھے نماز ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ دن مساوات محمدی کا دن ہے۔

مزدلفہ میں قیام: مزدلفہ زلف سے مشتق ہے جس کے معنی قرب کے ہیں یعنی وہاں قیام کر کے خدا کا قرب تلاش کیا جاتا ہے (نہایہ) قرآن مجید میں اس کو مشعر الحرام کہا گیا ہے یعنی (متبرک نشانی) اس مقام میں قیام کے دوران خدا کو یاد کرنے کا خاص حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَإِذَا أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ (بقرہ۲:۱۹۸) جب تم عرفات سے چلو تو مشعر الحرام کے پاس اللہ کا ذکر کرو اور اسے یاد کرو جیسے اس نے تمھیں ہدایت دی اور اگرچہ اس سے پہلے تم یقیناً گمراہوں میں سے تھے۔

حاجی مزدلفہ پہنچ کر مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کر کے ادا کرتا ہے۔ (بخاری کتاب المناسک باب من جمع بینھما ولم تطوع) رات وہاں ہی بسر کرتا ہے پھر نماز فجر ادا کرنے کے بعد منیٰ کی طرف روانہ ہوتا ہے۔

منیٰ میں قربانی: حاجی ۱۰ ذی الحجہ کی صبح کو پھر منیٰ میں پہنچ جاتے ہیں اس دن کو یوم النحر (قربانی کا دن) کہتے ہیں اس دن اکناف عالم میں تمام مسلمان عیدالاضحیٰ مناتے ہیں منیٰ میں نماز عید ادا کرنے کے بعد جانوروں کی قربانی دیتے ہیں۔ قربانی قرب سے مشتق ہے۔ جانور کی قربانی کا فلسفہ یہ ہے کہ جس طرح جانور مالک کے سامنے اپنی گردن رکھ دیتا ہے۔ اس کی اپنی خواہش ختم ہو جاتی ہے اس طرح بندے کو خدا کی رضا کی خاطر اپنے نفس کی سرکشی اونٹنی کو ذبح کر دینا چاہیے۔ انسان کی ہر حرکت اللہ کے حکم کے تحت ہو۔

قربانی کے بعد سر منڈا لیا جاتا ہے پھر حاجی حالت احرام سے نکل آتا ہے۔

تشریق کے ایام: قربانی کے بعد خدا کے فرمان کے مطابق حاجیوں کو تین یا کم از کم دو دن منیٰ میں قیام کرنے کا حکم ہے یعنی گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں ذی الحجہ کو۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَن تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ (بقرہ۲:۲۰۳) اور گنتی کے دنوں میں اللہ کو یاد کرو۔ پھر جو کوئی دو دن میں جلدی کر کے چلا جائے اس پر کوئی گناہ نہیں اس کے لیے ہے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ سے ڈرتے رہا کرو اور یہ جان لو۔ یقیناً تم سے اس کے حضور اکٹھے ہونا ہے۔

ان ایام کو ایام تشریق کہا جاتا ہے۔ تشریق کے ایک معنی گوشت سکھانے کے لیے دھوپ میں ڈالنا۔ قربانی کیے ہوئے جانور کا گوشت زاد راہ کی غرض سے ان دنوں دھوپ میں خشک کیا جاتا تھا (نہایہ) دوسرے معنی یہ ہیں۔ جانوروں کی قربانی سورج نکلنے کے بعد کی جاتی تھی کیونکہ تشریق کے ایک یہ بھی معنی ہیں (نہایہ) لیکن تشریق کے معنی مشرق کی طرف جانا ہے۔ (لینز عربک انگلش لیکسی کان) منیٰ مکہ کے مشرق کی طرف ہے۔ ایک معنی خوبصورت ہونے اور چہرہ کی چمک بھی ہیں (لینز عربک انگلش لیکسی کان) گویا حج کے مناسک کا فلسفہ بیان کر دیا ہے۔ حج کے مناسک ادا کرنے کے بعد حاجی کا چہرہ خدا کی محبت اور عشق میں سورج کی مانند چمک اٹھے گا۔ اس لیے رسول کریم ﷺ نے حج مبرور کا بدلہ جنت قرار دیا ہے۔

رمی الجمار: تشریق کے تین دنوں میں حاجی رمی الجمار کرتے ہیں۔ ہر کنکر مارتے وقت یہ الفاظ کہے جاتے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجًّا مَّبْرُوْرًا وَّسَعْيًا مَّشْكُوْرًا وَّذَنْبًا مَّغْفُوْرًا (اے اللہ اسے پاک اور مقبول حج اور قابل قدر محنت اور گناہ کو معاف کیا ہوا بنا دے۔) منی کے میدان میں تین ستون ہیں جنھیں تصویری زبان میں شیطان کی علامت قرار دیا جاتا ہے ان میں سے ایک بڑا ستون ہے اسے جمرۃ عقبہ یا جمرہ الاخری کہا جاتا ہے۔ دوسرے دو ستوں جمرہ الاولی اور جمرہ الوسطی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تلبیہ ختم کر دی جاتی ہے۔ رمی الجمار شیطان سے نفرت اور اس کو دور بھگانے کی علامت ہے۔ اس رسم سے علامتی طور پر حاجی اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ حق مٹانے والی ہر باطل قوت کو نیست و نابود کر دے گا۔

عمرہ: لفظ عمرہ عَمَرَ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں اس نے ایک جگہ آباد کی۔ اس جگہ کی زیارت کی۔ اسلامی شریعت میں عمرہ کے معنی زیارت کعبہ کے ہیں۔ یہ حج سے دو باتوں میں مختلف ہے پہلی بات تو یہ ہے عمرہ سال کے کسی دن بھی کیا جا سکتا ہے جبکہ حج کے مخصوص ایام ہیں۔ دوم عمرہ کے لیے احرام باندھنا، طواف

کرنا اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا لازمی رکن ہیں اور دیگر مناسک منی، مزدلفہ اور عرفات میں قیام، رمی الجمار اور قربانی وغیرہ ساقط ہیں۔

قرآن مجید میں حج اور عمرہ دونوں کو ادا کرنے کا حکم ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (بقرہ ۲:۱۹۶) اور حج اور عمرہ اللہ کے لیے پورا کرو۔

حضرت ابن عمرہ کا قول ہے ہر شخص پر حج اور عمرہ واجب ہے اور حضرت ابن عباس کہتے ہیں عمرہ کتاب اللہ میں حج کے ساتھ ہے۔ کتب حدیث میں وجوب العمرہ کے الفاظ کے ساتھ باب باندھے گئے ہیں۔ مثلاً بخاری ابواب العمرہ وجوب العمرۃ وفضلھا ایک حدیث میں ہے کہ رمضان میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہے۔ (بخاری ابواب العمرہ باب عمرۃ فی رمضان) ایک اور حدیث کی رو سے عمرہ فرض نہیں ہے۔ (ترمذی ابواب الحج باب ماجاء فی العمرہ اواجبۃ ھی ام لا) جو شخص حج کی استطاعت رکھتا ہے وہ عمرہ بھی ادا کرسکتا ہے۔ ویسے بھی عمرہ حج قران اور تمتع سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس عبادت کو واجب قرار دے تو وہ حج اور عمرہ کو جمع کرسکتا ہے۔ حقیقت میں حج ہی صاحب استطاعت پر فرض ہے۔ عمرہ تطوع کی شکل میں آتا ہے۔ یہ وہ نیکی ہے جو فرض حج کے علاوہ کی جاتی ہے۔ جس طرح نفلی عبادات انسان کی روحانی زندگی کے لیے اہم کردار ادا کرتی ہیں اسی طرح عمرہ بھی ایک نفلی عبادت ہے۔ جس طرح نفلی عبادات میں رسول کریم ﷺ نے افراط سے روکا ہے اسی طرح عمرہ میں افراط صحیح نہیں یعنی ایک شخص ہر مہینے عمرہ کے لیے روانہ ہو پڑے یا سال میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد عمرہ ادا کرنا شروع کردے۔ اسلام نے ہر قسم کے افراط سے روکا ہے اس لیے عمرکی ادائیگی میں افراط کا رنگ نہیں آنا چاہیے۔

حج کے اقسام: حج کے تین اقسام ہیں حج افراد جب حاجی احرام صرف حج کی نیت سے باندھے۔ حج قران جب حاجی حج اور عمرہ دونوں کی نیت سے احرام باندھتا ہے پھر مکہ پہنچ کر احرام نہیں کھولتا جب تک تمام مناسک حج سے فارغ نہیں ہو جاتا۔ حج تمتع حاجی حج کے مہینوں میں صرف عمرہ کی نیت سے احرام باندھے مکہ پہنچ کر عمرہ کے ارکان پورے کر کے احرام کھول دے پھر ایام حج میں حج کے لیے احرام باندھے۔ اس طرح حاجی عمرہ اور حج کے درمیان اپنی معمول حالت میں رہنے کا فائدہ اٹھالیتا ہے احرام کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ ایک جانور کی قربانی کرے یا حج میں تین دن اور حج سے مراجعت پر سات دن کے روزے رکھے۔

اصلاحات: ۱۔ قریش کے سوا دیگر عرب قبائل برہنہ طواف کرتے تھے۔ اس غرض سے خانہ کعبہ کے پاس ایک تختہ رکھا ہوا تھا۔ اس پر کپڑے اتار کر رکھ دیے جاتے تو قریش کے مرد اور عورتیں ان برہنہ مردوں اور عورتوں کو خاص طواف کے لیے کپڑے دیتے تو وہ لوگ اس کپڑے میں طواف کرتے اگر کوئی مرد یا عورت قریش کی فیاضی سے محروم رہتی تو وہ برہنہ ہی طواف کرتے۔ (بخاری جلد ا کتاب المناسک) قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی۔ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف ۷:۳۱) ہر عبادت کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔

اسی طرح ننگ کو ڈھانپنے کے لیے لباس کا ذکر کیا ارشاد الٰہی ہے۔ يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا (اعراف ۷:۲۶) اے بنی آدم بے شک ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمھارے ننگ کو ڈھانپے اور زینت ہو۔

۹ ہجری کو موسم حج میں رسول کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر کو امیر الحج بنا کر بھیجا کہ اس سال کے بعد نہ کوئی مشرک حج کرے اور نہ کوئی ننگا بیت اللہ کا طواف کرے گا۔ (بخاری کتاب المناسک باب لا یطوف بالبیت عریان ولا یحج مشرک) اس کے بعد غیر مہذبانہ اور بدرسم ختم ہوگئی۔

۲۔ قریش اپنے آپ کو دیگر قبائل سے برتر اور افضل سمجھنے کی وجہ سے دوسرے قبائل کے ساتھ عرفات میں قیام نہیں کرتے تھے اور مزدلفہ میں ہی قیام کرتے۔ اسلام نے اس نسلی اور نسبی امتیاز کو ختم کیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ (البقرہ ۲:۱۹۹) پھر تم وہاں سے پلٹو جہاں سے لوگ پلٹتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے یہ فرما کر اَلْحَجُّ عَرَفَةُ (حج قیام عرفہ کا نام ہے) عرفات کے میدان میں قیام حج کا لازمی رکن قرار دے دیا۔ اس طرح نسبی برتری کا خاتمہ کر کے تمام انسانوں کو مساوات کے پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔

۳۔ زمانہ جاہلیت میں حج نے ایک میلہ کی سی شکل اختیار کرلی۔ ہر قسم کے لوگ اکٹھے ہوتے اور وہ ہر قسم کی برائی کے مرتکب ہوتے جو حج کی روح کے منافی ہوتیں اسلام نے ہر اس بدعمل سے روک دیا جو حج کے منافی تھا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (بقرہ ۲:۱۹۷) پس جس نے ان مہینوں میں اپنے اوپر حج فرض کرلیا تو حج میں نہ فحش کلام اور نہ گالی گلوچ اور نہ جھگڑا ہو۔

چونکہ رفث، فسوق اور جدال حج کی روح کے منافی تھے اس وجہ سے عربوں کو ان باتوں سے روک دیا اور ساتھ یہ بیان کر دیا۔ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ (بقرہ ۲:۱۹۷) جو تم نیکی کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے۔ آیت کریمہ میں لفظ خیر (ہر قسم کی بھلائی اور نیکی) لوگ حج کی غرض وغایت بیان کردی۔

۴۔ حج میں جانور کی قربانی ایک لازمی رکن ہے عرب قربانی کا خون بیت اللہ کی دیواروں پر لگا کر قرب الٰہی چاہتے۔ رسول کریم ﷺ نے اس رسم کو

ختم کیا اور قربانی کی اصل روح سے آگاہ کیا۔ قرآن میں ارشاد الٰہی ہے۔ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآءُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (حج ۲۲: ۳۷) نہ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں اور نہ ان کے خون لیکن اسے تمہاری طرف سے صرف تقویٰ ہی پہنچتا ہے۔

قربانی کے دو مقصد ہیں ایک تو یہ کہ ہر انسان خدا کا اس طرح مطیع و تابعدار بن جائے جس طرح یہ جانور اپنے مالک کے سامنے ذبح کے وقت کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ دوم اس ابراہیمی رسم کے موقع پر قربانی کے گوشت سے غرباء کی ضیافت کی جائے۔

۵۔ اہل عرب نے حج کو ذاتی اور نسبی نام و نمود کا ذریعہ بنا لیا تھا مناسک حج ادا کرنے کے بعد تمام قبائل منیٰ میں جمع ہو جاتے۔ شعراء اپنے قبائل کے مفاخر اور مباہات بیان کرتے۔ گویا حج ایک دنیاوی میلہ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اس دنیاوی رسم ختم کرنے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ ۲: ۲۰۰) پھر جب تم اپنے حج کے مناسک (ارکان) پورا کر چکو تو اللہ کا ذکر کرو جس طرح تم اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کرتے تھے بلکہ اس سے بڑھ کر۔

۶۔ یمن کے لوگ حج کے لیے بغیر زاد راہ کے سفر پر روانہ ہو پڑتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل ہیں جب وہ مکہ پہنچتے تو بھیک مانگتے پھرتے۔ (بخاری کتاب المناسک باب قول اللہ تعالیٰ وتزودوالح) اس رسم کو مٹانے کے لیے قرآن مجید میں یہ آیت نازل ہوئی۔ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (بقرہ ۲: ۱۹۷) اور زاد راہ لے لیا کرو البتہ بہترین توشہ تقویٰ ہے۔

چونکہ حج انسان کو شرک سے الگ کر کے توحید کی تعلیم دیتا ہے اور توحید ہی عزت نفس کا ذریعہ ہے۔ بھیک مانگنے سے عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔ اس لیے اس رسم کو ختم کر دیا۔

۷۔ عرب پیادہ یا ننگے پاؤں سفر کر کے حج کرنے کا عہد کر لیتے آپ نے اس تکلیف دہ بات سے سختی سے منع فرمایا۔ رسول کریم ﷺ نے ایک شخص کو پیادہ پا کرتے ہوئے سخت مصیبت میں دیکھا اور آپ کو بتایا گیا کہ اس نے پیادہ پا سفر کرنے کا عہد کیا ہوا ہے تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ خدا کو کوئی ضرورت نہیں کہ یہ شخص اس طرح اپنے آپ کو سزا دے۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ سوار ہو جائے۔ (بخاری کتاب جزاء الصید باب من نذر المشیۃ الی الکعبۃ) اسی طرح ایک دفعہ آپ ﷺ نے اس قسم کی ایک عورت کو دیکھا تو آپ نے پایا، خدا اس پریشان حالی کا کوئی بدلہ نہ دے گا اس کو سوار اور چادر اوڑھنا چاہیے۔ (ترمذی کتاب النذور والایمان)

اسلام ایک دین فطرت ہے۔ تکلیف مالایطاق والی باتوں سے روکتا ہے تاکہ انسانی فطرت عمل کرنے سے ابا نہ کرے۔

۸۔ اہل عرب صفا اور مروہ کے درمیان وادی سے حج کے ایام میں تیزی کے ساتھ دوڑ کر گزرتے تھے اس کو ایک مذہبی سنت قرار دے لیا ہوا تھا۔ اسلام نے اس کو سنت قرار نہیں دیا۔

۹۔ مناسک حج ادا کرنے کے بعد مراجعت کے بارے میں دو گروہ تھے ایک کہتا تھا کہ جو لوگ ایام تشریق ہی میں واپس آتے ہیں۔ وہ گناہگار ہیں۔ دوسرا ان لوگوں کو گناہگار ٹھہراتا جو دیر سے واپس ہوتے تھے۔ قرآن مجید نے دونوں باتوں جائز قرار دیا ہے اور کسی کو گناہ گار نہیں ٹھہرایا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى (بقرہ ۲: ۲۰۴) پھر جو کوئی جلدی کرے دو دن میں چلا جائے اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو کوئی پیچھے رہے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں یہ اس کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے۔

۱۰۔ اہل عرب نے ایک سکوت حج ایجاد کر لیا تھا۔ یعنی حج کا احرام باندھتے تھے تو خاموش رہتے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر نے ایک عورت کو خاموش دیکھا تو وجہ پوچھی۔ معلوم ہوا کہ اس نے خاموش حج کا احرام باندھا ہے۔ انھوں نے اس کو منع فرمایا اور کہا یہ جاہلیت کی رسم ہے (بخاری) رسول کریم ﷺ کی یہ سنت ہے کہ جب حاجی احرام کی حالت میں آ جاتا ہے تو تلبیہ کہنا شروع کر دیتا ہے۔ اس وجہ سے خاموش حج اسلامی رسم تلبیہ کے منافی ہے۔ حج کے ایام اللہ تعالیٰ کی کبریائی بیان کرنے کے ہوتے ہیں نہ کہ خاموش رہنے کے۔

۱۱۔ بخاری میں ہے کہ احرام کی حالت میں حمس کے سوائے دوسرے لوگ گھر کے پچھواڑوں سے داخل ہوتے تھے۔ اس رسم کو دور کرنے کے لیے یہ حکم دیا لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (بقرہ ۲: ۱۸۹) یہ نیکی نہیں کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے آؤ لیکن بڑا نیک وہ ہے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور اللہ کا تقویٰ کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔

فلسفہ حج

حج عشق الٰہی کا عملی اظہار ہے: عشق اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ محب اپنے محبوب کی رضا کی خاطر جان، مال، آرام، اعزہ و اقارب اور گھر بار قربان کرنے کے لیے کمر بستہ ہے جتنا عشق کامل ہوگا اتنا ہی قربانی کا ولولہ اور جذبہ زیادہ ہوگا جو جتنا محبوب کامل ہوگا۔ اتنا ہی عشق کامل ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کے عشق کے عملی اظہار کے لیے چند ایک عبادات مقرر کر دی ہیں۔ ان میں سے ایک عبادت حج کی ہے۔

حج کے ایام میں ایک فرمانبردار بندہ گھربار، اعزہ و اقارب کو الوداع کہتا ہے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی ہوئی پونجی سے زاد راہ لے کر مکہ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے جب میقات پر پہنچتا ہے تو حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام قرار دیتے ہوئے دو چادریں پہن لیتا ہے۔ لبیک اللھم لبیک کی صدائیں بلند کرنا شروع کر دیتا ہے مکہ پہنچ کر والہانہ عشق میں بیت اللہ کا طواف کرتا ہے کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں سچے عشق والوں کو دیدار الٰہی ہوا تھا۔ حجر اسود کو بوسہ دیتا ہے۔ صفا مروہ پہاڑیوں کے درمیان دوڑتا پھرتا ہے اور حضرت ہاجرہ کی قربانی کی یاد دل میں تازہ کرتا ہے منیٰ، عرفات اور مزدلفہ کے میدانوں میں دیدار الٰہی کے لیے عبادات میں مشغول رہتا ہے۔ حج شفقت مخلوق کی تعلیم دیتا ہے۔ عشق الٰہی اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک اس کی مخلوق سے محبت نہ کی جائے۔ حج مخلوق الٰہی سے محبت کرنے کا سبق دیتا ہے احرام باندھنے کے بعد حاجی کسی سے لڑ نہیں سکتا۔ نہ گالی دے سکتا ہے نہ کسی کی طرف بدنظر سے دیکھ سکتا ہے۔ نہ وہ کسی کی گری ہوئی چیز اٹھا سکتا ہے یہ تمام باتیں مخلوق الٰہی سے شفقت اور محبت کرنے کا سبق دیتی ہیں۔

حج سادگی کی تعلیم دیتا ہے: حج میں میقات پر حاجی کو احرام باندھنے کا حکم ہے۔ احرام صرف بغیر سلی دو چادریں ہوتی ہیں۔ احرام کی جہاں بے شمار حکمتیں ہیں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان کو سادہ زندگی بسر کرنی چاہیے۔ تعیشانہ زندگی نہ صرف خود انسان کے لیے مضر ہے بلکہ معاشرہ میں بھی فساد کا موجب ہے۔ تعیشانہ زندگی سے انسان میں تکبر کا جذبہ نمو ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ طبقاتی تقسیم پیدا ہو جاتی ہے۔

حج کسب حلال کی تعلیم دیتا ہے: حج بنی نوع انسان کو کسب حلال اور حکم الٰہی کے تحت خرچ کرنے کی تعلیم دیتا ہے کیونکہ حج کے مصارف کسب حلال سے پورے کرنے ضروری ہیں۔ معاشرہ میں بگاڑ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسب ناجائز ذرائع سے کیا جائے۔ اس سے ایک طبقہ امیر سے امیر تر ہوتا جاتا ہے۔ ایک طبقہ غریب سے غریب تر ہوتا جاتا ہے اور طبقاتی تقسیم پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے طبقاتی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ ملک فساد کی لپیٹ میں آ جاتا ہے معاشرتی امن تہ و بالا ہو جاتا ہے۔ کسب حلال ہی ایک ایسا ذریعہ آمدن ہے۔ جس سے ملک امن کی حالت میں رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے اسلام نے کسب حلال پر بہت زور دیا ہے۔

حج عالمگیر اتحاد ملی کا ذریعہ ہے: دنیا کی ترقی کا دار و مدار قومی اجتماع اور یک جہتی پر ہے جب تہذیب و تمدن شروع ہوئی اس وقت سے قومی اجتماعی روح پیدا کرنے کے لیے انجمنیں وجود میں آئیں۔ جن کا مقصد عوام میں یک جہتی اور اجتماعی زندگی کا شعور پیدا کرنا تھا۔ اسلام نے فطری جذبہ کی نشوونما کے لیے ایسے روحانی محرکات کی تعلیم دی ہے۔ جن کے باعث اسلامی انجمنوں کے درہم برہم ہونے کا خطرہ نہ ہو۔ انہی محرکات میں ایک محرک حج ہے۔ حج تمام مسلمانوں کو اتحاد، اخوت اور یک جہتی کی سلک میں منسلک کر دیتا ہے جس سے مسلمانوں کی سیاسی قوت بڑھ سکتی ہے۔ ایک دوسرے کے مسائل سمجھنے اور ان کو حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دیا ہے۔ تاکہ مسلمانوں میں یک جہتی پیدا ہو اور اپنے دشمنوں کے مقابل بنیان مرصوص بن جائیں۔

حج مساوات کی تعلیم دیتا ہے: حج مساوات کی بہترین شکل ہے دنیا کے چاروں کونوں سے مسلمان ایک لباس میں ملبوس ہو کر مکہ میں جمع ہوتے ہیں۔ گورے کالے کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ غریب اور امیر کی تقسیم ختم ہو جاتی ہے ہر طبقہ کے لوگ بغیر کسی امتیاز کے مناسک حج ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حج کے موقع پر رسول کریم ﷺ نے اخوت اور مساوات کا مشہور خطبہ دیا تھا کہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت ہے نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ کسی کالے کو گورے پر فضیلت ہے ہاں اگر کسی کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہے تو تقویٰ کی وجہ سے ہے۔

حج اقتصادی ترقی کا ذریعہ ہے: اسلام نے ایام حج میں تجارت کرنے سے منع نہیں کیا بلکہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (بقرہ ۲:۱۹۸) تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے رب سے فضل کی تلاش کرو۔

مکہ ایام حج میں عالمگیر تجارتی منڈی بن جاتا ہے ہر ملک کی صنعت اور تجارتی سامان منیٰ کی منڈی میں پہنچ جاتا ہے۔ حج کی ادائیگی کے بعد لوگ منیٰ جاتے ہیں خرید و فروخت کرتے ہیں۔ اس تجارت سے صرف اہل مکہ کو ہی فائدہ نہیں بلکہ تمام اسلامی ممالک کو بھی ہے کیونکہ ہر ملک کی صنعت سے لوگ روشناس

ہو جاتے ہیں۔

تاریخیت: وہ قوم زندہ نہیں رہ سکتی جس کا تعلق اپنے آباؤ اجداد کے سنہری کارناموں سے منقطع ہو جائے۔ سنہری کارنامے ہی قوم کے جذبہ کو آگے بڑھنے کے لیے ابھارتے ہیں۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ وہی قوم تنزل و ادبار کے گڑھے میں گری ہے۔ جس کے سامنے اپنے بزرگوں کے کارنامے دھندلا گئے ہوں۔ حج مسلمانوں کی تاریخ کو ان کے سامنے دہرانے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ جب حاجی مکہ پہنچتے ہیں تو ان کی آنکھوں کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کی قربانیاں آ جاتی ہیں۔ اس کے بعد رسول کریم ﷺ کا عہد ان کے سامنے آ جاتا ہے۔ کہ یہی وہ مقامات ہیں جہاں آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے صحابہ کو حق کی خاطر مصائب جھیلنے پڑے۔ خدا کے حکم سے مکہ سے مدینہ ہجرت کر گئے۔ حق کی سربلندی کے لیے اور انسانی عظمت کی بحالی کے لیے جنگیں لڑیں۔ فتح پائی، حق کا بول بالا ہوا۔ اور باطل نے شکست کھائی۔

اسلام حق اور صداقت کی سربلندی کے لیے ہی آیا ہے۔ جب حاجی مکہ پہنچتا ہے تو اس کے سامنے رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی زندگیوں کا نمونہ آ جاتا ہے۔ جو اس کے جذبہ کو مہمیز کرتا ہے کہ تمہارا یہاں آنا صرف اس غرض کے لیے ہے کہ تم بھی رسول کریم ﷺ کے نقش قدم پر چل کر حق کی سربلندی کے لیے اپنی جان و مال قربان کر دو۔

جہاد و تبلیغ

جہاد

جہاد کے لغوی معنی: لفظ جہاد جَہد یا جُہد سے مشتق ہے جَھَدَ یا جَاھَدَ کے معنی ہیں ایک شخص نے کوشش کی۔ محنت کی یا لیاقت خرچ کی۔ جَاھَدَ فِی الْاَمْرِ کے معنی ہیں اس نے خوب سعی کی۔ اپنی لیاقت اور طاقت سے پورا کام کیا۔ جہاداً حاصل مصدر ہے یعنی مشقت، محنت تکلیف تھکان۔

جوہری اپنی صحاح میں لکھتا ہے: جَاھَدَ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ مُجَاھَدَۃً وَجِھَادًا اور نیز اِجْتَھَدَ اور جَاھَدَ کے معنی ہیں اس نے خوب زور لگایا اور جفاکشی کی۔

مصباح المنیر میں ہے: جَاھَدَ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ جِھَادًا اور اِجْتَھَدَ فِی الْاَمْرِ کے معنی ہیں اس نے اللہ کی راہ میں اپنی طاقت اور کوشش سے پورا پورا کام کیا۔

امام راغب جہاد اور مجاہد کے معنی دشمن اور دفاع کے لیے طاقت خرچ کرنا لکھتا ہے پھر بیان کرتا ہے جہاد تین قسم پر مشتمل ہے۔ (۱) کھلے دشمن کے خلاف (۲) شیطان کے خلاف (۳) نفس کے خلاف۔

قرآن مجید میں جہاد اور اس کے مشتقات کے معنی: جہد یا جہاد اور اس کے مشتقات قرآن کی مکی اور مدنی سورتوں میں آئے ہیں۔

لفظ جہاد مکی سورتوں میں: وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ (سورہ عنکبوت ۲۹:۶۹) اور جو لوگ ہمارے لیے کوشش کرتے ہیں ہم یقیناً انھیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے اور اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اس آیت میں جَاھَدُوْا جو جہاد یا مجاہدہ سے مشتق ہے۔ اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ (سورۃ الحج ۲۲ آیت ۷۸) اور اللہ کی راہ میں کوشش کرو جو کوشش کا حق ہے۔ اس آیت میں بھی خدا کا قرب حاصل کرنے کے معنی میں لفظ جاھدو استعمال ہوا ہے۔

وَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَجَاھِدْھُمْ بِہٖ جِھَادًا کَبِیْرًا (سورۃ الفرقان ۲۵:۵۲) پس کافروں کی بات نہ مان اور اس قرآن کے ذریعہ ان کے ساتھ جہاد کر جو بڑا جہاد ہے اس آیت میں بِہٖ کی ضمیر قرآن مجید کی طرف لوٹتی ہے۔

لفظ جہاد مدنی سورتوں میں: یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ وَمَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ (سورۃ توبہ ۹ آیت ۷۳) اے نبی کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان کے مقابلہ میں شدت اختیار کر اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔

اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفار اور منافقین دونوں سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے تاریخ اسلام اس امر پر شاہد ہے کہ منافقین کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کبھی لڑائی نہیں کی اس آیت میں کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کرنا انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے جس معنی میں یہ لفظ مکی سورتوں میں استعمال ہوا ہے۔ سورۃ بقرہ میں آتا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (بقرہ ۲ آیت ۲۱۸) اس آیت میں لفظ جَاھَدُوْا جو جہد یا جہاد سے مشتق ہے جنگ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حدیث میں لفظ جہاد کا استعمال: حدیث میں بھی یہ لفظ صرف جنگ کے معنوں میں ہی استعمال نہیں ہوا بلکہ دوسرے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کو افضل جہاد قرار دیا ہے اَفْضَلُ الْجِھَادِ حَجٌّ مَبْرُوْرٌ۔ فرمایا بہترین جہاد حج مبرور ہے۔

حضرت امام بخاریؒ نے کتاب الجہاد والسیر کے عنوان کے تحت تبلیغ اسلام کے متعلق احادیث لائے ہیں مثلاً: دُعَاءُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَی الْاِسْلَامِ وَالنُّبُوَّۃِ وَاَنْ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُھُمْ بَعْضًا اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (بخاری باب ۱۰۶) حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشرکین کو اسلام کی دعوت دینا اور یہ کہ وہ اللہ کے سوائے کسی اور کو معبود نہ بنائیں۔

باب نمبر ۱۴۳ کا عنوان ہے: فَضْلُ مَنْ اَسْلَمَ عَلٰی یَدَیْہِ رَجُلٌ اس شخص کی فضیلت جس کے ہاتھ پر کوئی شخص مسلمان ہو۔

باب نمبر ۱۷۸ کا عنوان ہے: كَيْفَ يُعْرَضُ الْإِسْلَامُ عَلَى الصَّبِيِّ یعنی بچے کے سامنے کس طرح اسلام پیش کیا جائے۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام بخاری کے زمانہ تک لفظ جہاد وسیع تر معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔

جہاد کا لفظ جنگ کا مترادف نہیں: مستشرقین جہاد کے معنی صرف کفار کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے لیتے ہیں جیسا کہ جہاد کی لغوی بحث سے یہ واضح ہوتا ہے جہاد کا لفظ نہ قرآن میں نہ حدیث میں اور نہ لغت میں صرف جنگ کے معنی میں استعمال ہوا ہے بلکہ جنگ کے لیے عربی زبان میں حرب وقتال کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ عرب استعارہ اور تشبیہ کے طور پر یہ الفاظ (روع وفزع وخوف) شر (اصل معنی بدی کے ہیں) اہیاج برانگیختگی مغضبہ (غصہ ناراضی) لڑائی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اسی طرح جنگ کو چکی سے بھی تشبیہ دی ہے اِذَا دَارَتْ رَحَى الْحَرْبِ الزُّبُوْنِ جب جنگ کی چکی چلتی ہے۔

اس سے مستشرقین کا اعتراض خود دور ہو جاتا ہے: مستشرقین کا جہاد کے لفظ کو جنگ کے معنی میں استعمال کرنے کا صرف ایک مقصد ہے وہ یہ کہ اسلام کی اشاعت بزور شمشیر ثابت کریں۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں جہاد کے عنوان کے تحت لکھا ہے "اسلام کی اشاعت بزور شمشیر عام طور پر مسلمانوں کا ایک مذہبی فریضہ ہے بالفاظ دیگر جہاد صرف جنگ ہی نہیں بلکہ اسلام پھیلانے کی غرض سے تلوار اٹھانے کا نام ہے۔

کلین نے ریلیجن آف اسلام میں لکھا ہے۔

> "جہاد یعنی منکرین اسلام کے خلاف اس مقصد کے لیے جنگ کرنا یا تو انھیں اسلام کے اندر جذب کر لیا جائے یا اگر وہ قبول اسلام سے انکار کریں تو انھیں مطیع ومنقاد بنا لیا جائے اور...... ان کی بیخ کنی کر دی جائے اور یہ کہ اسلام کی اشاعت اور اس کو تمام مذاہب پر غالب کرنا مسلمان قوم کا ایک مقدس فریضہ سمجھا جاتا ہے۔"

اسلام نے کب جنگ کرنے کی اجازت دی: اسلام صرف مدافعت دین اور حفاظت خود اختیاری کے لیے لڑائی کی اجازت دیتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَإِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ نِ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (الحج ۲۲:۳۹،۴۰) ان لوگوں کو اجازت دی گئی ہے۔ جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے اور وہ اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کی ایک دوسرے کے ذریعہ مدافعت نہ کرتا تو یقیناً راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت ذکر کیا جاتا ہے گرا دی جاتیں۔

یہ آیات اس امر پر بین ثبوت ہیں کہ مسلمانوں کی جنگیں دفاعی تھیں اور ان کو اس وقت اجازت دی گئی جب ان کی بقا اور زندگی خطرے میں تھی۔ کفار مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ مکہ میں کفار کا ظلم وستم انفرادی طور پر تھا۔ دائرہ اسلام میں داخل ہونے پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے جاتے تھے لیکن جب مسلمان مدینہ میں ہجرت کر کے آ گئے تو کفار نے لشکر کشی کے ذریعہ اسلام کو مٹا دینے کا تہیہ کر لیا۔ اس صورت میں بین الاقوامی قانون بھی یہی تقاضا کرتا ہے کہ اپنی قومی بقا کے لیے لڑائی لڑی جائے۔

آیت ۴۰ اسلامی جنگوں کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتی ہے کہ اسلامی جنگیں صرف مسلمانوں کی اپنی مذہبی آزادی کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام مذاہب کی آزادی کے لیے تھیں۔ جنگوں کی غرض تمام مذہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت ہے عبادت گاہوں کی حفاظت مذہبی تحفظ پر دلالت کرتی ہے۔

اس آیت میں قیام امن کا نہایت ہی سنہری اصول بیان کیا ہے کہ اگر دنیا کے کسی حصے میں کسی مذہب کے ماننے والوں اور ان کی عبادت گاہوں کو دشمن کی طرف سے خطرہ لاحق ہو تو مسلمانوں پر ان کی مدد کرنا فرض ہو جاتا ہے۔

مستشرقین کی سمجھ اور ادراک پر افسوس ہے کہ وہ جنگیں جو قیام امن اور مذہبی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے لڑی گئی تھیں ان کو وہ بے رحمی اور ظلم کی جنگوں کا نام دیتے ہیں۔

سورۃ بقرہ میں آتا ہے۔ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوْا (بقرہ ۲ آیت ۲۱۷) اور وہ ہمیشہ تم سے جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تمھیں تمھارے دین سے لوٹا دیں اگر انھیں طاقت ہو۔

یہ آیت اس کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ کافر مسلمانوں سے اس لیے جنگ لڑتے تھے کہ ان کو دین اسلام سے ہٹا دیں۔ یہ آیت مستشرقین کے اس اعتراض کی بیخ کنی کرتی ہے کہ مسلمانوں نے کفار کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کے لیے جنگیں لڑی تھیں۔

پھر قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (بقرہ) اور اللہ کے راستے میں

جنگ کرو۔ ان لوگوں سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور حد سے نہ بڑھنا بے شک اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ اس آیت میں واضح طور پر اسلامی جنگ کا اصول بیان کیا ہے کہ جنگ صرف انہی لوگوں سے جائز ہے جو مسلمانوں کی قومی زندگی کو ختم کرنے کے لیے ہتھیار اٹھائیں۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ بھی اخلاقی تعلیم دی ہے کہ جنگ میں زیادتی نہ کی جائے۔

جنگ کا دوسرا داعیہ: اسلام نے ان لوگوں سے جنگ کرنے کی اجازت دی ہے جو نقض عہد کرتے ہیں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نقض عہد خرمن امن کو بھسم کر دیتا ہے اور اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا۔ جب تک معاہدات کی پابندی نہ کی جائے۔ اسلام نے معاہدات کی پابندی پر بہت زور دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا. (النحل ۹۱:۱۶) جب تم معاہدہ کرو تو اللہ کے عہد کو پورا کرو اور قسموں کو پختہ کرنے کے بعد انھیں نہ توڑو۔ اس آیت کے بعد معاہدہ توڑنے والوں کی مثال ایک بے وقوف عورت سے دی ہے جو سوت کاتتی ہے پھر کاتنے کے بعد تار تار کر دیتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ (النحل ۹۲:۱۶) اے معاہدہ توڑنے والو تم اس عورت کی طرح نہ بن جاؤ جو اپنے سوت کو کاتنے کے بعد تار تار کر دیتی ہے تم اپنی قسموں کو آپس میں مکر و فریب کا ذریعہ نہ بناؤ تا کہ ایک قوم دوسری قوم سے نفع میں بڑھ جائے۔

اسلام نے صرف اس قوم سے لڑنے کی اجازت دی ہے جو معاہدات کے کرنے کے بعد بار بار توڑتی ہے اور مسلمانوں کی بقاء کے لیے خطرہ کا موجب بنتی ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ. (الانفال ۵۶:۸) وہ جن سے تو عہد کرتا ہے پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں وہ عہد کے توڑنے کے جرم سے نہیں بچتے۔

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (الانفال ۵۷:۸) سو اگر تو ان کو جنگ میں پائے تو ان کو عبرت ناک سزا دے کر منتشر کر دے تا کہ ان کی آنے والی نسلیں نصیحت حاصل کریں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ (الانفال ۵۸:۸) اگر تجھے کسی قوم کی بدعہدی کا خوف ہو تو ان کا عہد برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے اللہ عہد میں خیانت کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اسلام بدعہد قوم کے ساتھ بھی خیانت کی اجازت نہیں دیتا بلکہ یہ حکم دیتا ہے کہ معاہدہ قوم کی بدعہدی کا علم ہو جانے کے بعد ان کو برابر کا موقعہ دے کر معاہدہ سے دست برداری اختیار کر لی جائے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کفار کی اذیتوں کی وجہ سے مکہ سے مدینہ ہجرت کر آئے تو آپ نے مدینہ میں یہود سے بھی معاہدے کیے اور گرد و نواح کے قبائل سے بھی معاہدے کیے تا کہ ہر گروہ امن کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔

تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ یہود نے اپنے معاہدات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مدینہ پر حملہ آوروں کا ساتھ دیا اور مسلمانوں کے لیے وہ مار آستین ثابت ہوئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی بدعہدی کی وجہ سے ان کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا مسلمانوں کا بدعہد یہود سے مقابلہ کرنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ ان کو دائرہ اسلام میں داخل کیا جائے بلکہ یہ مقابلہ ان کی بدعہدی کی وجہ سے تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ پر حملہ اس وجہ سے کیا تھا کہ انھوں نے صلح حدیبیہ کی شرط کی خلاف ورزی کی تھی۔ صلح حدیبیہ کی شرائط کے مطابق بنو خزاعہ مسلمانوں کے حلیف بن گئے اور بنو بکر قریش کے۔ بنو بکر نے بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا۔ قریش نے ان کی مدد کی بنو خزاعہ اپنی مظلومیت کی داستان لے کر بارگاہ رسالت میں پہنچے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک قاصد قریش کے پاس تین شرائط کے ساتھ بھیجا یا تو خون بہا دے دیں یا بنو بکر کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔ یا یہ اعلان کر دیں کہ معاہدہ حدیبیہ ٹوٹ گیا ہے۔ قریش نے تیسری شرط منظور کر لی۔

اب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بنو خزاعہ کے ساتھ معاہد ہونے کی وجہ سے یہ فرض تھا کہ وہ ان کی مدد کرتے سو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دس ہزار قدسیوں کے ساتھ مکہ پر حملہ آور ہوئے۔

کیا دنیا کا کوئی قانون اس حملہ کو جارحانہ حملہ کہہ سکتا ہے یا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ حملہ اس وجہ سے ہوا تھا کہ قریش کو دائرہ اسلام میں داخل کیا جائے۔

اسی طرح مشرکین عرب کے ساتھ اسلام کی مٹھ بھیڑ کی وجہ بھی نقض عہد تھا۔ مشرکین عرب جب موقع پاتے معاہدات کو پس پشت ڈال کر اسلام کی بیخ کنی کی کوشش کرتے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیصر روم کے حملہ کو روکنے کے لیے عرب کی شمالی سرحد تبوک پر گئے تھے تو مشرکین نے اس نازک موقعہ پر تمام معاہدات کو پس پشت پھینک دیا اور اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ ہرقل کی فوجیں بعض وجوہات کی بنا پر میدان جنگ میں نہ آئیں اور

مسلمان بغیر لڑائی لڑے واپس آ گئے مشرکین اپنے منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔
اس قسم کی غداریوں کی روک تھام کرنا ہر حکومت کا فرض ہے اس روک تھام کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا ہے: فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ (توبہ ۹:۵) پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو۔
رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کے دن ان مشرکین سے اعلان جنگ کیا اور حرمت والے چار ماہ کا نوٹس دیا تاکہ وہ لڑائی کی تیاری کر لیں۔
کیونکہ مشرکین معاہدات کو بار بار توڑنے کی وجہ سے اس قابل نہیں رہے تھے کہ ان کو اس طرح کھلا چھوڑ دیا جائے۔ ان کو کھلا چھوڑنے کی وجہ سے امن میں خلل آتا تھا۔ اب صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی کہ وہ مطیع ہو کر اسلامی حکومت کے تحت زندگی بسر کریں تاکہ ملک کا امن برقرار رہ سکے۔ اب کون سا بین الاقوامی قانون ہے جو اس قسم کی جنگ کو ناجائز قرار دے سکتا ہے اس قسم کی جنگیں قیام امن کے لیے ضروری ہیں۔ اگر یہ جنگیں نہ لڑی جائیں تو دنیا سے امن ہی اٹھ جائے جن قبائل نے معاہدات کی خلاف ورزی نہیں کی ان کو اعلان جنگ سے مستثنیٰ قرار دیا ہے: إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ. (توبہ ۹:۴) مگر جب مشرکوں کے ساتھ تم نے عہد کیا۔ پھر انھوں نے تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کے ساتھ ان کا عہد ان کی مدت تک پورا کرو اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔
یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ مشرکین کے ساتھ جنگ کی وجہ صرف عہد شکنی ہے نہ کہ کفر اور شرک۔ اگر جنگ کی وجہ صرف کفر اور شرک ہوتا تو کسی مشرک کو بھی اعلان جنگ سے مستثنیٰ قرار نہ دیا جاتا۔ پھر اس کے آگے صرف نقض عہد کو وجہ جنگ بیان کرتے ہوئے فرمایا: أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (توبہ ۹:۱۳) تم ان لوگوں سے کیوں جنگ نہیں کرتے جنھوں نے اپنی قسموں کو توڑا اور رسول کے نکالنے کا قصد کیا اور انھوں نے پہلے تمہارے ساتھ ابتداء کی۔

تیسرا داعیہ

<u>احترام انسانیت اور مظلوموں کی دست گیری:</u> اسلام نے نہ صرف ظلم کرنے سے روکا ہے بلکہ مظلوم کی حمایت اور ظالم کو ظلم سے روکنے کی تعلیم بھی دی ہے۔ جب دنیا سے ظلم کا قلع قمع نہ کیا جائے تو دنیا میں نہ تو انسانیت کا احترام باقی رہ سکتا ہے اور نہ امن کا شجر ہرا رہ سکتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ عَنْ اَبِی بَکْرٍ قَالَ اِنِّی سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَاَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ یَاْخُذُوْا عَلٰی یَدَیْہِ اَوْشَکَ اَنْ یَعُمَّھُمُ اللّٰہُ بِعِقَابٍ مِنْہُ (اخرجه الترمذی) حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے فرمایا کہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ جب لوگ ظالم کو دیکھیں اور اس کو ظلم سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں تو اللہ سب کو عذاب میں مبتلا کر دے گا۔
یہ حدیث ظاہر کرتی ہے کہ ظلم کا سدباب کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ قرآن مجید نے مظلومین کی حمایت میں جنگ کرنا لازمی قرار دیا ہے ارشاد ہے:
وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا. (سورۃ النساء ۴ آیت ۷۵) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے راستہ میں جنگ نہیں کرتے اور کمزور مردوں اور عورتوں اور بچوں کے لیے جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی دوست بنا اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی مددگار اور معاون بنا۔
اس آیت میں اسلامی جنگ کا کتنا بلند اور مقدس مقصد بیان کیا ہے کہ دنیا کے کسی خطہ میں مردوں اور عورتوں کے حقوق کی پامالی ہو رہی ہو۔ خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ مسلمانوں کا یہ مذہبی فریضہ ہے کہ ان مظلوم انسانوں کو درندگی اور بہیمیت کے چنگل سے نجات دلائیں۔

<u>چوتھا داعیہ:</u> اسلام حریت انسانی کا جانفزا پیغام لے کر آیا ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے طاقتور حکومت کمزور حکومت پر زبردستی قبضہ حاصل کرنے کی مجاز نہیں دنیا کے نقض امن کا سبب یہی طاقتور حکومتیں ہوتی ہیں جو ملک گیری کی ہوس کو پورا کرنے کے لیے کمزور ملکوں پر چڑھائی کر دیتی ہیں اور زمین کو معصوم اور بے گناہ لوگوں کے خون سے رنگ دیتی ہیں۔ قرآن مجید نے اس قسم کی فتنہ سازی اور استعماریت کے خلاف جنگ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:
وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ (بقرہ ۲:۱۹۳) تم ان سے لڑتے رہو جہاں تک فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے پھر اگر وہ باز آ جائیں تو ظالموں پر دست درازی سے رک جاؤ۔
اسی مضمون کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: لَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ. (الحج ۲۲:۴۰) اگر اللہ لوگوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ نہ ہٹاتا تو زمین میں فساد کا دور دورہ ہوتا لیکن اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے۔

اس آیت میں اسلامی جنگوں کا مقصد زمین سے فساد کی بیخ کنی اور امن کا قیام بیان کیا ہے۔

اگر دنیا کی تمام حکومتیں اسلام کے اس سنہری اصول پر عمل کر کے باغی اور استعمار پسند حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں تو امن وسلامتی تمام دنیا کو اپنے دامن میں لے لے گی۔

قواعد جنگ: اسلام نے اصولی طور پر جنگ کے قواعد قرآن مجید میں بیان کر دیے ہیں۔ پہلا قاعدہ قتل ہے دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ جب فوج یا اس کا ایک حصہ محاصرہ میں آجائے اور ہتھیار ڈال دے تو ان کو قید کر لینا چاہیے۔ تیسرا قاعدہ یہ بیان کیا ہے کہ جنگ کے زمانہ میں دشمن ملک کے آدمیوں کو اپنے ملک میں آنے سے روکنا چاہیے کیونکہ بے شمار فوجی راز ہوتے ہیں جن کے انکشاف سے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔

ان تین قواعد کو حسب ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ پس تم مشرکین کو قتل کرو جہاں کہیں بھی تم ان کو پاؤ یہاں ان مشرکین کا ذکر ہے جو برسرپیکار ہوں اور میدان جنگ میں اترے ہوئے ہوں۔ معاہد مشرکین اور لڑائی میں حصہ نہ لینے والے مشرکین اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں۔

وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ. یعنی دشمن کے لیے گھات میں بیٹھے رہو ان الفاظ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جنگ کے موقعہ پر ان تمام راستوں کو بند کر دینا چاہیے اور پہرے بٹھا دینے چاہئیں۔ جہاں سے دشمن ملک کے اندر آ سکتا ہو اس طرح دشمن کی فوج کی پیش قدمی روکنے کے لیے تمام اہم جگہوں پر فوج متعین کر دینی چاہیے۔ اگر وہاں سے دشمن فوج آگے بڑھے تو اس پر حملہ کر دیا جائے۔

صلح: اسلام صلح کو جنگ پر ترجیح دیتا ہے۔ اگر دشمن صلح کی طرف مائل ہوں تو فوراً صلح کا ہاتھ بڑھا دینا چاہیے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (الانفال ۸:۶۱) اگر وہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو درحقیقت وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اسلامی جنگوں کی اخلاقی قدریں

اگر دنیا کی مہذب سے مہذب قوم کی جنگوں کے حالات پڑھیں تو وہاں بھی بربریت و بہیمیت ظلم وستم غصب ونہب کے خونچکاں واقعات نظر سے گزریں گے۔ جن کو پڑھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اسلام ایک دین رحمت ہے۔ جس کی رحمت کے سائے زندگی کے ہر شعبہ پر چھائے ہوئے ہیں۔ ہر قوم کی زندگی میں لڑائی ناگزیر ہے۔ اسلام نے لڑائی کے لیے بھی ضابطہ اخلاق مقرر دیا ہے۔

جیسا کہ مبحث گذشتہ میں بیان ہو چکا ہے کہ اسلامی جنگیں مدافعت، حفاظت خود اختیاری مذہبی آزادی حمایت مظلومین اور استعماریت اور فتنہ کی بیخ کنی کے لیے لڑی گئی تھیں یہ جنگیں بنی نوع انسان کے لیے سراسر رحمت تھیں اور وہ اخلاقی قوانین کے تابع لڑی گئی تھیں اگر کوئی مجاہد اخلاقی قیود کو توڑتا تو وہ قابل مواخذہ ہوتا تھا۔

اسلام میں جنگ کے متعلق احکام

جنگ کے اسلامی احکام بیان کرنے سے قبل اہل عرب کے تصور جنگ اور وحشت کاریوں کا ذکر کرنا ضروری ہے تاکہ قاری اسلامی جنگوں کی برکت اور رحمت آسانی سے سمجھ سکے۔ عربوں کا تصور جنگ ان مجموعہ الفاظ سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ جو ان کے لٹریچر میں استعمال ہوا ہے جس کا ذکر مستشرقین کے اعتراض کے جواب میں ذکر کیا گیا ہے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک جنگ غصب ونہب تباہی و بربادی غارت گری کا دوسرا نام ہے کبھی انھوں نے لڑائی نیک مقصد کے لیے نہیں لڑی۔ ان کا مقصد لوٹ مار، جذبہ تفاخر کا اظہار، جذبہ انتقام کو ٹھنڈا کرنا ہوتا تھا۔ جب عربوں کا تصور جنگ اور مقصد اتنا گھٹیا قسم کا تھا تو ان کی جنگوں میں انسانیت کی مٹی کیوں نہ پلید ہوتی ہوگی۔ ذیل میں عربوں کی جنگ کے وحشیانہ طریقے اور انسانیت سوز افعال کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ اسلام کا نظریہ جہاد قاری کے سامنے نکھر کر آجائے اور معلوم ہو جائے کہ اسلامی مسلح جہاد بنی نوع انسان کے لیے کون سا رحمت کا پیغام لایا ہے اور اسلام نے طریقہ جنگ میں کیا کیا اصلاحات کی ہیں۔

جنگ کے انسانیت سوز طریقے

۱۔ عرب دشمن کے لیے قسی القلب تھے۔ وہ دشمن کو زندہ آگ میں پھینک دینے میں تامل نہ کرتے تھے۔ عرب کی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ جب

منذر بن امرء القیس نے جنگ میں بنی شیبان پر فتح حاصل کر لی تو ان کی مستورات کو زندہ آگ میں پھینک دیا۔
عمرو بن ہند کے بھائی نے بنو تمیم پر حملہ کر دیا سو وہ لوگ بھاگ گئے۔ صرف ایک عورت باقی بچی اس کو گرفتار کر کے آگ کے الاؤ میں پھینک دیا دور سے عمار نامی شخص نے آگ کا دھواں دیکھا۔ اس طرف کا رخ کیا شائد کھانے کو مل جائے عمرو نے آنے کی وجہ پوچھی اس نے جواب دیا۔ میں کئی دن سے بھوکا تھا۔ دھوئیں کو دیکھ کر آیا ہوں شائد کھانا مل جائے۔ اس سنگ دل عمرو نے حکم دیا کہ اس کو بھی آگ میں پھینک دیا جائے چنانچہ اس کو آگ میں پھینک دیا گیا۔

۲۔ حملہ آور قبیلہ جب مغلوب قبیلہ کے مرد اور عورتیں اور بچے پنجہ اسیری میں لے لیتا تو ان سے ہر قسم کا ناروا سلوک کرتا۔ قتل کرائے جاتے آگ کے الاؤ میں پھینک دیے جاتے۔ پہاڑ کی چوٹیوں سے نیچے گرا کر آتش غضب کو بجھایا جاتا۔ منذر بن امرؤ القیس نے بنی شیبان کے جتنے قیدی پکڑے ان سب کو پہاڑ کی چوٹی پر قتل کر دیا۔

احادیث میں عکل اور عرینہ کا واقعہ مذکور ہے کہ یہ لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چرواہوں کو پکڑ کر لے گئے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے ان کی آنکھوں میں گرم سلایاں پھیریں اور انھیں تپتی ہوئی ریت پر پھینک دیا یہاں تک وہ تکلیف اور پیاس سے مر گئے۔
امرء والقیس کے باپ حجر بن حارث نے بنی اسد پر حملہ کیا ان کے جتنے آدمی پنجہ اسیری میں آئے ان سب کو ڈنڈوں کی ضربات سے مار دیا۔

۳۔ عرب اپنے جوش غضب کو معصوم بچوں کے خون سے ٹھنڈا کرنے سے نہیں چوکتے تھے داحس اور غبراء کی لڑائیوں میں قیس نے بنو ذبیان کے پاس اپنے بچے بطور ضمانت رکھے تھے۔ حذیفہ رئیس ذبیان ان بچوں کو ایک وادی میں لے جاتا ان کو تیروں کا نشانہ بناتا تھا۔ اس کے قبیلہ کے لوگ اس انسانیت کے سوز نظارے کو دیکھ کر خوش ہوتے۔

۴۔ عرب لوگ اتنے بے رحم اور سنگ دل تھے کہ جب اپنے حریف کو مار دینے سے بھی ان کی آتش غضب ٹھنڈی نہ ہوتی تو وہ لاشوں کا مثلہ کرتے پھڑکتے ہوئے اعضاء کا ہار بنا کر گلے میں پہنتے چنانچہ جنگ احد کا مشہور واقعہ ہے کہ حضرت ابوسفیانؓ کی بیوی ہندہ نے سید الشہداء حضرت حمزہؓ کی لاش کا مثلہ کیا پھر ان کا کلیجہ چبا کر اپنی آتش غضب کو ٹھنڈا کیا۔

۵۔ عربوں کا کینہ اس قدر سخت ہوتا تھا کہ اپنے دشمن کے متعلق منت مانتے کہ اس کو قتل کر کے اس کی کھوپری میں شراب پئیں گے۔ جنگ احد میں عاصمؓ بن ثابت نے مسافع بن طلحہ اور حلاس بن طلحہ کو قتل کیا۔ ان کی والدہ سلافہ نے قسم کھائی کہ وہ عاصم کی کھوپڑی میں شراب پیے گی۔

۶۔ عربوں کا دائرہ ظلم صرف مقاتلین تک ہی محدود نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کے ظلم وستم کے آہنی پنجہ سے غیر مقاتلین بھی نہیں بچ سکتے تھے۔ معصوم بچوں کے خون سے زمین رنگ دی جاتی۔ حاملہ عورتوں کے پیٹوں کو چاک کر دیا جاتا۔ بوڑھوں اور راہبوں کو قتل کر دیا جاتا۔

۷۔ عربوں کی یہ عادت تھی کہ وہ ہمیشہ دشمن پر غفلت کی حالت میں حملہ کرتے تھے تاکہ وہ آسانی سے قابو پاسکیں اور ان کے خون سے آتش انتقام کو ٹھنڈا کر سکیں۔ عربوں کی اصطلاح میں غفلت میں حملہ کرنے کو فتک اور حملہ کرنے والے کو فاتک کہتے ہیں۔ تابط شر، سلیک اور حارثہ بن ظالم مشہور فاتک گزرے ہیں۔

۸۔ اپنے ذاتی اغراض کے سامنے معاہدات کو کوئی حیثیت نہ دیتے تھے۔ جب بھی انتقام لینے کا موقعہ پاتے تو تمام معاہدات کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے اور حملہ کر دیتے۔ بدعہدی کی مثالیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں کثرت سے ملتی ہیں۔ آپ نے یہود سے معاہدات کیے انھوں نے ہر بار معاہدہ توڑ دیا اور مسلمانوں کے خلاف کفار سے مل کر ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ کے مقام پر قریش سے معاہدہ کیا انھوں نے اس کا کوئی پاس اور لحاظ نہ کیا۔ مسلمانوں کے حلیف بنوخزاعہ کے خلاف بنو بکر کی مدد کی۔

اسلام کی جنگی اصلاحات: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو دنیا کے لیے رحمت بن کر آئے تھے جنگ کی ان تمام قبیح اور انسانیت سوز رسومات کو پاؤں تلے روند دیا اور ایک جنگی ضابطہ اخلاق دیا۔

پہلی اصلاح: جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے عرب کی جنگ کا مقصد ہی غصب ونہب، قتل و غارت تھا۔ سب سے پہلے اسلام نے مقصد جنگ کی تطہیر کی۔ اسلام نے مسلمانوں کے سامنے جنگ کا مقصد یہ پیش کیا کہ خدا پرستی کو فروغ ہو مظلوم کی دست گیری ہو۔ انسانیت کا احترام قائم ہو۔ فتنہ کی بیخ کنی ہو۔ جارحیت ختم ہو۔ اب جب ایک مجاہد ان مقاصد کو سامنے رکھ کر میدان جنگ میں جائے گا تو وہ لازمی طور پر وہ ان تمام افعال سے اجتناب کرے گا جو انسانیت سوز اور موجب فساد ہیں۔

دوسری اصلاح: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غیر مقاتلین کو قتل کرنے کی ممانعت فرمائی ابو داؤد میں حضرت انسؓ کی روایت ہے: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ انْطَلِقُوْا بِاسْمِ اللّٰہِ وَبِاللّٰہِ وَ عَلٰی مِلَّۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَقْتُلُوْا شَیْخًا فَانِیًا وَّلَا طِفْلًا صَغِیْرًا وَّلَا امْرَاَۃً وَّلَا تَغُلُّوْا وَضُمُّوا غَنَائِمَکُمْ وَاَصْلِحُوْا وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (سنن ابی داؤد) کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوج کو روانہ کرتے وقت فرمایا اللہ کا نام لے کر اللہ کی مدد سے اور اللہ کے رسول کی ملت پر قائم رہتے ہوئے چل پڑو۔ کسی بوڑھے ضعیف چھوٹے بچے اور عورت کو قتل نہ کرنا۔ مال غنیمت میں سے چوری نہ کرنا۔ جنگ میں جو کچھ ہاتھ آئے ایک جگہ جمع کرنا۔ صلح کی روش اختیار کرنا احسان کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

مسلم بخاری اور ترمذی میں عبداللہؓ بن عمر سے روایت ہے ایک دفعہ جنگ میں ایک عورت کی لاش پڑی ہوئی دیکھی تو آپ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔

حضرت ابو ایوب فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں مقابلہ میں اجیروں اور غلاموں اور لونڈیوں کے قتل کرنے سے منع فرمایا۔ (مسند احمد)

اسی طرح ابن عباس کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَا تَغْدِرُوْا وَلَا تَغُلُّوْا وَلَا تُمَثِّلُوا وَلَا تَقْتُلُوا الْوِلْدَانَ وَلَا اَصْحَابَ الصَّوَامِعِ (مسند احمد) یعنی بدعہدی نہ کرو۔ مال غنیمت میں سے خیانت نہ کرو۔ مثلہ نہ کرو بچوں اور خانقاہ نشینوں کو قتل نہ کرو۔

اسلام نے جنگ میں مقاتلین کے متعلق ذیل کی نصیحتیں فرمائیں۔

۱۔ زخمی پر حملہ نہ کیا جائے۔ بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے۔ قیدی کو قتل نہ کیا جائے جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے وہ امان میں ہے۔
(فتوح البلدان لبلاذری صفحہ ۴۷)

۲۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آگ کا عذاب دینے سے منع فرمایا۔ فرمایا: لَا یَنْبَغِیْ اَنْ یُّعَذِّبَ بِالنَّارِ اِلَّا صَاحِبُ النَّارِ یعنی آگ کا عذاب دینا صرف خدا کا حق ہے۔

۳۔ آپ نے مقتولین کے اعضاء کی قطع و برید سے منع فرمایا۔ عبداللہؓ بن یزید انصاری کی روایت ہے: نَھَی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ النُّھْبٰی وَالْمُثْلَۃِ یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوٹ مار اور مثلہ (اعضاء کی قطع و برید) سے منع فرمایا۔
اسلام نے صرف ہم مثل سزا دینے کی اجازت دی ہے قرآن مجید میں آتا ہے: وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَاعُوْقِبْتُمْ بِہٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَھُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ. (النحل ۱۶:۱۲۶)
اگر تم بدلہ لو تو صرف اتنا ہی لو جس قدر تم پر زیادتی ہو چکی ہے لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ بات صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔

۴۔ قتل میں احتیاط برتنے سے متعلق ارشاد فرمایا: اَعَفُّ النَّاسِ قِتْلَۃً اَھْلُ الْاِیْمَانِ (ابو داؤد) یعنی اہل ایمان قتل کرنے میں تمام دنیا کے انسانوں سے زیادہ محتاط ہوتے ہیں۔

۵۔ باندھ کر قتل کرنا منع ہے۔ ابو ایوب انصاری نے فرمایا: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَنْھٰی عَنْ قَتْلِ الصَّبْرِ (ابو داؤد) یعنی میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا کہ آپ نے باندھ کر قتل کرنے سے منع فرمایا۔

۶۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار کے مقتولین کی لاشوں کو گڑھوں میں دفن کروایا علامہ ابو یعلی نے الاحکام السلطانیہ میں لکھا ہے کہ لشکر کے رئیس پر یہ فرض ہے کہ وہ کفار کی لاشوں کو گڑھوں میں دفن کرے۔

تیسری اصلاح: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غفلت یا نیند کی حالت میں حملہ کرنے سے احتراز فرماتے تھے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے: اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَرَجَ اِلٰی خَیْبَرِ فَجَاءَ ھَا لَیْلًا وَکَانَ اِذَا جَاءَ قَوْمًا بِلَیْلٍ وَلَا یُغِیْرُ عَلَیْھِمْ حَتّٰی یُصْبِحَ. (صحیحین) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیبر پر چڑھائی کی۔ آپ رات کے وقت وہاں پہنچے اور آپ کا یہ دستور تھا کہ جب کسی محارب قوم پر رات کے وقت پہنچتے تو آپ حملہ نہ کرتے۔ جب تک صبح نہ ہو جاتی۔

لیکن اگر دشمن قوم کے ساتھ جنگ جاری ہے تو ایسی صورت میں رات کے وقت حملہ کرنا جائز ہے۔

چوتھی اصلاح: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوٹ مار کی ممانعت فرمائی ہے۔ عبداللہ بن زید انصاری سے روایت ہے۔ نَھَی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ النُّھْبٰی وَالْمُثْلَۃِ (بخاری) کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوٹ مار اور مثلہ سے منع فرمایا۔

عاصم بن کلیب اپنے باپ سے اور وہ ایک انصاری سے روایت کرتے ہیں۔

خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرٍ فَاَصَابَ حَاجَةٌ شَدِيْدَةٌ وَجَهْد فَاصَابُوا غَنَمًا فَانْتَهَبُوْهَا؟ فَاِنَّ قُدُوْرَنَا لَتَغْلِي اِذْ جَاءَ نَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْشِي فَاَكْفَاءَ الْقُدُوْرَ بِقَوْسِهٖ ثُمَّ جَعَلَ يُرَمِّلُ اللَّحْمَ بِالتُّرَابِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ النهبة لَيْسَتْ باحل مِنَ الْمَيْتَةِ (ابو داؤد) ہم ایک سفر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نکلے اس سفر میں خوراک کی قلت کی وجہ سے لوگوں کو سخت تکلیف ہوئی۔ لوگوں کو بکریاں مل گئیں اور انھوں نے لوٹ لیں اور ذبح کر لیں اور ہماری ہنڈیاں پک رہی تھیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے آپ نے اپنی کمان سے ہنڈیاں الٹ دیں اور گوشت کو مٹی سے آلودہ کر دیا اور فرمایا لوٹ کا مال مردار سے بہتر نہیں ہے۔

پانچویں اصلاح: اسلام نے تباہ کاری اور فساد برپا کرنے سے منع فرمایا۔ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (قصص ۲۸:۸۳) ہم آخرت کا گھر جنت میں ان لوگوں کے لیے مخصوص کریں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں نیک انجام متقیوں کے لیے ہے۔ حضرت ثوبان سے روایت ہے: اِنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ قَتَلَ صَغِيْرًا وَّ كَبِيْرًا اَوْ اَحْرَقَ نَخْلًا اَوْ قَطَعَ شَجَرَةً مُثْمِرَةً اَوْ ذَبَحَ شَاةً لِاِهَابِهَا لَمْ يَرْجِعْ كَفَافًا (مسند احمد) یعنی انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا جو شخص کسی چھوٹے بچے کو یا معمر آدمی کو قتل کرے گا یا کھجوروں کے درخت جلائے گا' یا پھل دار درختوں کو کاٹے گا یا بکری کو محض اس کی کھال حاصل کرنے کے لیے ذبح کرے گا تو وہ جہاد کے ثواب سے تہی دست لوٹے گا۔

جنگ کی نوعیت اور مصلحت اور ضرورت کی بناء پر درخت وغیرہ کاٹنے کی اجازت ہے جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنو نضیر کی کھجوریں کٹوا دیں۔ اور انھیں جلا دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی: مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ. کھجور کے درختوں میں سے جو کچھ تم نے کاٹا ہے اور جو کچھ چھوڑا ہے سب اللہ ہی کے حکم سے ہے۔

چھٹی اصلاح: اسلام نے مال غنیمت میں سے خیانت کی شدید ممانعت کی ہے قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (آل عمران ۳:۱۶۱) جو کوئی مال غنیمت میں خیانت کا مرتکب ہوگا۔ وہ جو کچھ اس نے خیانت کی ہے قیامت کے دن لائے گا۔

اس آیت کی تشریح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَا تَغُلُّوْا فَاِنَّ الْغُلُوْلَ نَارٌ وَعَارٌ عَلٰى اَصْحَابِهٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (احمد) یعنی مال غنیمت میں خیانت نہ کرو کیونکہ خیانت دنیا کے اندر اور آخرت میں بھی مرتکبین کے لیے عذاب اور شرمندگی کا باعث ہے۔

موطا امام مالک اور ابو داؤد میں حدیث ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے شخص کی نماز جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا۔ جس نے مال غنیمت میں چوری کی تھی۔

ساتویں اصلاح: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفراء اور قاصدوں کے قتل سے منع فرمایا چنانچہ مسیلمہ کذاب کے دو قاصد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا: اَمَا وَاللّٰهِ لَوْلَا اَنَّ الرُّسُلَ لَا تُقْتَلُ ضَرَبْتُ اَعْنَاقَكُمَا (ابو داؤد. احمد) اللہ کی قسم اگر قاصدوں کا قتل ممنوع نہ ہوتا تو میں تمہاری گردن الگ کر دیتا۔

آٹھویں اصلاح: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سپاہیوں کو ہر قسم کی بدنظمی اور سرکشی کی ممانعت فرمائی عربوں کی یہ عادت تھی کہ جب وہ کسی قبیلہ پر حملہ کے لیے نکلتے تو جس منزل پر پڑاؤ ڈالتے یا جس راستہ پر سے گزرتے وہاں کے لوگ مصیبت میں پڑ جاتے۔ ایک دفعہ آپ کے پاس اس قسم کی سرکشی کی شکایت آئی تو آپ نے فرمایا: مَنْ ضَيَّقَ مَنْزِلًا اَوْ قَطَعَ طَرِيْقًا فَلَا جِهَادَ لَهٗ. یعنی جو کوئی راستے کے لوگوں کو تنگ کرے یا راستے میں لوٹ مار کرے اس کا کوئی جہاد نہیں۔

نویں اصلاح: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاہدات کو صرف دنیاوی منفعت کے لیے توڑ دینے سے منع فرمایا۔ کیونکہ یہ بدعہدی قیام امن کے راستے میں ایک مضبوط دیوار ہے جب تک یہ دیوار کھڑی ہے۔ اس وقت تک امن نہیں ہوسکتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے قیام امن کے لیے اس دیوار کو پیوند خاک کیا اور عہد کی پابندی پر زور دیا۔ آپ نے فرمایا: مَنْ قَتَلَ مُعَاهَدًا لَمْ يَرَحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ وَاِنَّ رِيْحَهَا لَتُوْجَدُ مِنْ مسيرة اَرْبَعِيْنَ عَامًا. یعنی جو کوئی کسی معاہد کو قتل کرے گا وہ جنت کی بو تک نہیں سونگھے گا حالانکہ اس کی خوشبو چالیس برس کی مسافت سے بھی محسوس ہوتی ہے۔

عمرو بن عتبہ سے روایت ہے انھوں نے کہا: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ فَلَا يحلن عُقْدَةً حَتّٰى

يَنْقَضِي اَمَدُهَا اَوْ يَنْبِذَ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ (ابوداؤد. ترمذی) کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو وہ اس وقت تک معاہدے کا بند نہ کھولے جب تک اس کی مدت نہ پوری ہو جائے یا وہ برابر کا لحاظ کر کے اس قوم کی طرف پھینک دے۔ ینبذ الیھم علی سواء. یعنی برابر کو ملحوظ رکھ کر معاہدہ کو اس قوم کی طرف پھینک دے کا مطلب یہ ہے کہ معاہد قوم کو صاف طور پر اطلاع دے دی جائے کہ ان کے معاندانہ رویہ اور امن سوز حرکات کی وجہ سے معاہدہ کو فسخ کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِيْنَ (الانفال) اگر تمہیں کسی قوم کی خیانت کا خوف ہو تو ان کا معاہدہ برابری کو ملحوظ رکھ کر ان کی طرف پھینک دے۔

ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اِذَا جَمَعَ اللّٰهُ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرْفَعُ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ فَقِيْلَ هٰذَا غَدْرَةُ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ. (رواہ مسلم) جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اوّلین اور آخرین کو جمع کرے گا تو ہر عہد شکنی کے لیے ایک نشان بلند ہوگا کہ یہ فلاں بن فلاں کی بدعہدی کا نشان ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر لشکر کو ہدایات دیتے ہوئے فرمایا: لَا تَغُلُّوا وَلَا تَغْدُرُوا وَلَا تُمَثِّلُوا وَلَا تَقْتُلُوْا وَلِيْدًا وَلَا اِمْرَاَةً (مؤطا امام مالک) مال غنیمت میں سے خیانت نہ کرنا' بدعہدی نہ کرنا' مثلہ نہ کرنا' بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل یہ بتاتا ہے کہ آپ نے معاہدات کی پوری طرح حفاظت کی صلح حدیبیہ کا مشہور واقع ہے۔ ابوجندل معاہدہ ہو چکنے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پابہ زنجیر حاضر ہوتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ اس کو پنجہ ظلم سے نجات دلائیں۔ آپ نے دنیا کو معاہدہ کی حفاظت کرنے کا سبق دینے کے لیے ابوجندل کو فرمایا ''اے ابوجندل صبر کر۔'' ہم عہد کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے کوئی راستہ نکال دے گا۔

دسویں اصلاح

اسیروں سے حسن سلوک: اسلام سلامتی اور امن کا دین ہے۔ بنی نوع انسان کے لیے رحمت اور اسلامی کا پیغام لے کر آیا ہے اور اس نے ان تمام زمانہ جاہلیت کی مکروہ رسومات کو کچل کر رکھ دیا تھا جس سے حرمت انسانیت مجروح ہوتی تھی۔ زمانہ جاہلیت کی مکروہ رسومات میں سے ایک گھناؤنی رسم اسیران جنگ سے انسانیت سوز سلوک تھا۔ جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اسلام نے اسیرانِ جنگ کو مستقل طور پر پنجہ اسیری میں جکڑے رکھنے سے منع فرمایا بلکہ یہ تعلیم دی کہ یا ان کو احسان کے طور پر یا ان سے فدیہ لے کر رہا کر دو اور جب تک وہ قبضہ میں ہوں ان سے نیک سلوک کیا جائے قرآن مجید میں آتا ہے: فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰى اِذَا اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا. (محمد ۴۷:۴) پس جب کافروں سے مٹھ بھیڑ ہو تو پہلے گردنیں مارنا ہے یہاں تک کہ تم ان پر غالب آ جاؤ۔ پھر قید کے بندھن مضبوط کرو۔ اس کے بعد تمھیں اختیار ہے یا تو احسان کے طور پر یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔

دوسری جگہ آتا ہے: يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا. (سورۃ دھر ۷۶:۸۔۱۰) مسلمان اللہ کی محبت کی خاطر مسکینوں' یتامیٰ اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں' ہم صرف اللہ کی رضا کے لیے کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم نہ تو تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ ہم اپنے رب سے تنگی اور سختی کے دن کا خوف رکھتے ہیں۔

جنگ بدر میں جو قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے ان کے ساتھ نہایت ہی نیک سلوک روا رکھا گیا اس حسن سلوک کی وجہ سے بہت سے قیدی اسلام کے حلقہ اسیری میں داخل ہو گئے۔ ایک قیدی بیان کرتا ہے کہ وہ جس گھر میں قید تھا گھر والے اس کو تو اچھا کھانا کھلاتے تھے لیکن خود کھجور وغیرہ کھا لیتے تھے۔ بعض بدری قیدیوں کو فدیہ دے کر آزاد کر دیا گیا' بعض ناداروں کو بلا فدیہ رہا کر دیا گیا اور جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان کو دس دس بچوں کو تعلیم دینے کی شرط پر چھوڑ دیا گیا۔ جنگ مریسیع میں بنی مصطلق کے ایک سو خاندان پکڑے گئے۔ ان سب کو فدیہ لیے بغیر رہا کر دیا گیا۔ غزوہ حنین میں قبیلہ ہوازن کے چھ ہزار قیدی بطور احسان آزاد کر دیے گئے جبال تنعیم میں مکہ کے اسی آدمیوں نے اسلامی لشکر پر دھاوا بول دیا۔ سب کے سب گرفتار کر لیے گئے۔ جب آپ کی خدمت میں ان کو پیش کیا گیا تو آپ نے ازراہ احسان سب کو رہا کر دیا۔

اسلام بزور شمشیر نہیں پھیلا: جہاد پر مذکورہ تفصیل مستشرقین کے اس اعتراض کو رد کر دیتی ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں جہاد کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

''اسلام کی اشاعت بزور شمشیر عام طور پر مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے بالفاظ دیگر جہاد صرف جنگ ہی نہیں بلکہ اسلام پھیلانے کی غرض

سے تلوار اٹھانے کا نام ہے۔''

کلین نے ریلیجن آف اسلام میں جہاد کے متعلق اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جہاد یعنی منکرین اسلام کے خلاف اس مقصد کے لیے جنگ کرنا کہ یا تو انھیں اسلام کے اندر جذب کر لیا جائے یا اگر وہ قبول سے انکار کریں تو انھیں مطیع و منقاد بنا لیا جائے اور ان کی بیخ کنی کر دی جائے اور یہ کہ اسلام کی اشاعت اور اس کو تمام مذاہب پر غالب کرنا مسلمان قوم کا ایک مقدس فریضہ سمجھا جاتا ہے۔''

اگر مستشرقین اعتراض کرنے سے قبل نیک نیتی سے لغت کا مطالعہ کر لیتے اور قرآن مجید کے ان محکم اصولوں پر نظر ڈال لیتے جو اشاعت اسلام سے متعلق ہیں تو وہ یقیناً اعتراض نہ کرتے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرۃ ۲:۲۵۶) یعنی دین میں کوئی جبر نہیں کیونکہ ہدایت کی راہ گمراہی کے مقابلہ میں واضح ہو چکی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی تو مصائب و آلام سے پرتھی۔ مسلمان کھلے بندوں عبادت تک نہیں کر سکتے تھے۔ مدنی زندگی اقتدار کی زندگی تھی اس زندگی میں ایک مثال نہیں ملتی جس کا معترضین سہارا لے کر اپنی دلیل ٹھہرا سکیں۔ مدینہ پر کفار نے بار بار حملے کیے ہر جنگ میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا۔ دشمنوں کے قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے آپ نے فدیہ لے کر یا احسان کے طور پر رہا کر دیا ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ آپ نے کسی قیدی کو جبر و اکراہ کے ساتھ اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کی ہو۔

مشرکین کے ساتھ معاہدے کیے۔ باوجود قوت حاصل کر لینے کے اسلام نے ان مشرکین سے جنگ کرنے کی ممانعت کر دی جو اپنے معاہدوں پر کاربند تھے۔ اگر اسلام جبر کا حامی ہوتا تو قوت اور طاقت ملنے کے ساتھ ہی تمام مشرکین کو جنگ کر کے دائرہ اسلام میں داخل کر لیا جاتا تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات تک عرب میں ایسے لوگوں کی تعداد خاصی تھی جو دائرہ اسلام میں نہیں داخل ہوئے تھے۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ کفار کو حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت اسلام دینے کی تلقین کی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (النحل ۱۶: ۱۲۵) اے نبی اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور لوگوں سے احسن طریقہ پر مجادلہ کرو۔ یہ آیت معترضین کے اعتراض پر کاری ضرب ہے اور واضح کرتی ہے کہ اسلام کی تبلیغ حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ ہونی چاہیے۔

اسلام جہاں بغیر کسی وجہ کے دوسروں کے علاقوں کو زیر کرنا بنظر استحسان نہیں دیکھتا۔ وہاں یہ بھی تعلیم دیتا ہے کہ سرحدوں کی حفاظت کی جائے۔ اگر غیر ممالک پر چڑھائی فساد اور بگاڑ کا موجب ہے تو سرحدوں کو کھلا چھوڑ دینا بھی موجب فساد ہے۔ اس وجہ سے قیام امن کے لیے اسلام نے سرحدوں کو مضبوط رکھنے کی تعلیم دی ہے اور رسول کریم ﷺ نے مدافعانہ لڑائیاں لڑیں۔

۲۔ مالی جہاد

مالی جہاد قوم کی ترقی اور استحکام اور عزت کا باعث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے انفاق فی سبیل پر بہت زور دیا ہے۔ جہاں نماز جو روحانی ترقی کا زینہ ہے کا ذکر کیا ہے۔ وہاں انفاق کا ذکر کیا ہے۔ جو قوم کی بہبودی اور ملک کی ترقی کا ذریعہ ہے۔ صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کو اکٹھا لا کر مسلمانوں کو سبق دیا ہے کہ روح کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ مادی ترقی کی طرف قدم بڑھانا بھی ضروری ہے۔

مالی جہاد کی اہمیت از روئے قرآن مجید

ارشاد الٰہی ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (الحجرات:۱۵) حقیقت میں وہی لوگ مومن ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں۔ پھر وہ شک نہیں کرتے بلکہ اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں یہی لوگ (اپنے دعویٰ میں) سچے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں ایمان کی عملی صورت مال اور جان سے جہاد کرنا بتایا ہے پھر مالی جہاد کو جانی جہاد پر مقدم کیا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (ال عمران ۳:۹۲) یعنی تم ہرگز نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک تم اپنی محبوب ترین چیز خرچ نہ کرو۔

پھر ارشادِ الٰہی ہے: فَضَّلَ الْمُجَاهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (النساء۴:۹۵) یعنی اللہ تعالیٰ نے مال اور جان سے جہاد کرنے والوں کو گھر میں بیٹھے رہنے والوں پر درجات میں فضیلت دی ہے اللہ نے سب سے نیکی کا وعدہ کیا ہے۔

پھر ارشاد الٰہی ہے: وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى. یعنی تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ آسمان اور زمین اللہ کی میراث ہے۔ جن لوگوں نے فتح سے پہلے مال خرچ کیا اور لڑائی لڑی۔ تم میں سے کوئی ان کے برابر نہیں ہے اور ان لوگوں کا مقام ان لوگوں سے کہیں بڑھا ہوا ہے جنھوں نے فتح کے بعد مال خرچ کیا اور جہاد میں حصہ لیا اللہ نے ہر ایک سے نیکی کا وعدہ کیا ہے۔

اہمیت از روئے حدیث: عَنْ خُرَيْمِ بْنِ فَاتِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَنْفَقَ نَفَقَةً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كُتِبَ لَهٗ بِسَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ (ترمذی' نسائی) خریم بن فاتک سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ کی راہ میں کچھ مال خرچ کرتا ہے تو اللہ کی طرف سے اس کے لیے سات سو گنا اجر لکھا جاتا ہے۔

حضرت علیؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔

قَالَ مَنْ اَرْسَلَ نَفَقَةً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَقَامَ فِيْ بَيْتِهٖ فَلَهٗ بِكُلِّ دِرْهَمٍ سَبْعُ مِائَةِ دِرْهَمٍ وَمَنْ غَزَا بِنَفْسِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَنْفَقَ فِيْ وَجْهِهٖ ذٰلِكَ فَلَهٗ بِكُلِّ دِرْهَمٍ سَبْعُ مِائَةِ اَلْفِ دِرْهَمٍ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ (ابن ماجہ) آپ نے فرمایا جس نے اللہ کی راہ میں اپنا مال بھیجا اور خود گھر میں بیٹھا رہا تو اسے ہر درہم کے بدلے سات سو درہم کا اجر ملے گا۔ لیکن جو خود اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلا اور اپنا مال خرچ کیا تو اسے ہر درہم کے بدلے سات لاکھ درہم ملیں گے۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ.

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَامِنْ يَوْمٍ يُصْبِحُ الْعِبَادُ فِيْهِ اِلَّا مَلَكَانِ يَنْزِلَانِ فَيَقُوْلُ اَحَدُهُمَا اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَيَقُوْلُ الْاٰخَرُ اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا. (بخاری۔ مسلم) انسانوں پر کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس میں دو فرشتے نازل نہ ہوتے ہوں۔ ان میں سے ایک فرشتہ یہ دعا کرتا ہے اے اللہ جس نے خرچ کیا اسے اچھا بدلہ دے اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ جس نے ہاتھ روک رکھا ہے اس کے مال کو تلف کر یہ حدیث ظاہر کرتی ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ ترقی کا موجب اور بخل ہلاکت اور تباہی کا سبب ہے۔

قرآن مجید میں بے شمار آیات ہیں جو انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دیتی ہیں۔ اس طرح بے شمار احادیث ہیں جو انفاق فی سبیل اللہ کے فوائد اور حکمت بیان کرتی ہیں۔ صرف اختصار کو مدنظر رکھ کر چند آیات اور چند احادیث بیان کر دی ہیں۔

اس وقت اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ مسلمان قومی ضروریات اور اشاعت اسلام کے لیے دل کھول کر خرچ کریں تاکہ مسلمان قوم ذلت اور مسکنت کی گہرائیوں سے نکل کر ترقی کی شاہراہ پر چل پڑے مسلمانوں کی پستی اور تنزل کا باعث ترک جہاد اور دنیاوی حرص ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ. (توبہ ۹:۲۴) اے نبی کہہ دو کہ اللہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارے خاندان کے آدمی اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے ماند پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہو اور مکان جن کو تم پسند کرتے ہو۔ تمھارے نزدیک اللہ اور اس کے رسول اور اس کے راستہ میں جہاد سے زیادہ پسندیدہ ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے اور اللہ نافرمانوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے قومی ترقی کا ایک اصول بیان کیا ہے وہ یہ کہ مسلمان ہمیشہ دین کو دنیا پر مقدم رکھیں جب کبھی بھی ان کو دین کی اشاعت کے لیے اپنے عزیزوں' تجارتوں' مالوں اور عظیم الشان مکانوں کو قربان کرنا پڑے تو وہ بطیب خاطر قربان کر دیں اگر انفاق فی سبیل اللہ کی بجائے دنیا کی محبت پر گدھوں کی طرح گرے پڑے رہے تو ان کو اپنی پستی اور زوال کا منظر سامنے رہنا چاہیے۔

اس آیت کریمہ میں دولت کمانے اور عزیزوں سے تعلق رکھنے سے منع نہیں فرمایا بلکہ یہ تعلیم دی ہے کہ یہ چیزیں اللہ اور اس کے رسول اور جہاد سے عزیز نہ ہوں۔

ابن عمر کہتے ہیں کہ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔ جب لوگوں کے دلوں میں دنیا اور درہم کی محبت غالب آ جائے گی اور جنس بازار میں آنے سے پہلے ہی اس پر بیع کرنے لگیں گے کھیتی باڑی میں ہی منہمک ہو جائیں گے اور جہاد کو ترک کر دیں گے تو ان پر اللہ سخت آزمائش مسلط کر

دے گا اور وہ اس آزمائش سے اس وقت تک چھٹکارا نہ پاسکیں گے۔ جب تک اپنے دین کی طرف نہ لوٹ آئیں گے۔ یعنی جب تک دین کو دنیا پر مقدم نہ کریں گے۔ (مسند احمد۔ ابوداؤد)

ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔ اے ثوبان تمہاری اس وقت کیا حالت ہوگی جب تم پر دوسری قومیں اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جس طرح بھوکے کھانے کے برتن پر ٹوٹ پڑتے ہیں؟ ثوبان نے عرض کیا۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ اے اللہ کے رسول کیا ہماری مغلوبیت کی حالت قلت تعداد کی وجہ سے ہوگی؟ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ تعداد میں تم زیادہ ہو گے لیکن تمھارے اندر کمزوری آجائے گی۔ دوسرے صحابہ کرام نے دریافت کیا۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کمزوری سے کیا مراد ہے آپ نے فرمایا تمہارا دنیا کی محبت کا شکار ہو جانا اور موت کو ناپسند کرنا۔

پس مسلمانوں کی پستی اور زوال کا اصل سبب مالی، قلمی، لسانی اور سیفی جہاد کو ترک کر دینا ہے اب جب تک مسلمان قوم ہر قسم کے جہاد کو اپنا نہیں لیتی اس وقت تک اس کا ذلت اور مسکنت اور محکومی کی زنجیروں سے چھٹکارا پانا مشکل ہے۔

۳۔ جہاد بالنفس

جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم جہاد بالنفس ہے۔ یعنی نفس امارہ کی سرکش اونٹنی کو مطیع ومنقاد بنانا۔ یہی وہ عظیم مقصد ہے جس کے لیے اسلام آیا ہے۔

اس جہاد میں انسان کی دنیاوی و اخروی فلاح مضمر ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (الشمس ۹:۹۱) یعنی جس نے اپنے نفس کو پاک کیا وہ کامیاب ہوگیا اس جہاد سے روگردانی کرنا ناکامی اور نامرادی کے مترادف ہے ارشادِ الٰہی ہے۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۱۰:۹۱) اور نامراد ہوگیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو گناہوں کی میل سے آلودہ کیا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (العنکبوت ۶:۲۹) جو کوئی جہاد کرتا ہے وہ اپنے ہی نفس کے لیے جہاد کرتا ہے۔ اللہ تو تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاد بالنفس کو جہاد اکبر قرار دیا ہے چنانچہ ایک مرتبہ صحابہ کسی لڑائی سے واپس مدینہ آئے تو آپ نے فرمایا: رَجَعْتُمْ مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آئے ہو چھوٹے جہاد سے مراد دشمن سے جنگ اور بڑے جہاد سے مراد تزکیہ نفس ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک اور ارشاد ہے: جَاهِدُوْا اَهْوَاءَكُمْ كَمَا تُجَاهِدُوْنَ اَعْدَاءَكُمْ اپنی خواہشات سے جہاد کرو جس طرح اپنے دشمن سے جہاد کرتے ہو۔

۴۔ جہاد بالقلم واللسان

تبلیغ جہاد کی ایک اعلیٰ قسم ہے۔ مسلح ہتھیار کے ذریعہ اگر دشمن کے حملوں کا دفاع کیا جاتا ہے اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت کی جاتی ہے تو دلائل اور براہین کے ذریعہ اسلام کی سچائی اور حقانیت واضح کی جاتی ہے اور معترضین کے اعتراضات کا جواب دیا جاتا ہے۔ جتنا جہاد بالسیف ضروری ہے اتنا ہی جہاد بالقلم ضروری ہے۔

تبلیغ کے لغوی معنی انتہا یا آخری منزل تک پہنچانے کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں تبلیغ سے مراد اللہ کے پیغام کو بنی نوع انسان تک پہنچانا ہے۔

قرآن مجید اور حدیث سے جہاد بالقلم واللسان کی اہمیت اتنی ہی واضح معلوم ہوتی ہے۔ جتنی نماز اور روزہ کی اہمیت۔ افسوس مسلمان اس اہم فریضہ سے روگردانی کر کے تنزل اور ادبار کی انتہائی گہرائیوں میں جا گرے ہیں۔

تبلیغ کی اہمیت از روئے قرآن: قرآن مجید میں آتا ہے: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (یوسف ۱۰۸:۱۲) یعنی کہہ دیجئے یہ میرا راستہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر میں اور جو میری پیروی کرتے ہیں اور اللہ پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ دعوت الی اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا راستہ ہے جو شخص اس کام کو فرض منصبی نہیں سمجھتا وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے سے ہٹا ہوا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران ۱۱۰:۳) تم سب سے اچھی امت ہو جو لوگوں کی بھلائی اور بہبودی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

"للناس" میں (ل انتفاع کے لیے ہے یعنی امت مسلمہ کا ظہور لوگوں کی بھلائی کے لیے ہے۔ بھلائی کی تشریح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کی ہے یعنی تمہارا کام دنیا میں لوگوں کو نیکی کی طرف بلانا اور ان کو برائیوں سے روکنا ہے۔ تؤمنون باللہ کے الفاظ لا کر یہ ظاہر کیا ہے۔ داعی خود بھی کمال نفس کا مالک ہو اور لوگوں کو جن امور کے کرنے اور جن امور سے مجتنب رہنے کا حکم دیتا ہے وہ خود بھی اس پر کاربند رہے۔

حدیث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ امت مسلمہ خیر الامم ہے۔ چنانچہ امام احمد نے حدیث بیان کی ہے: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُعْطِيْتُ مَالَمْ يُعْطَ اَحَدٌ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ وَاُعْطِيْتُ مَفَاتِيْحَ الْاَرْضِ. سُمِّيْتُ اَحْمَدَ وَجُعِلَ التُّرَابُ لِيْ طُهُوْراً وَجُعِلَتْ اُمَّتِيْ خَيْرَ الْاُمَمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مجھے وہ کچھ دیا گیا ہے جو اور کسی نبی کو نہیں دیا گیا۔ میری نصرت رعب سے کی گئی ہے اور مجھے زمین کے خزانے دیے گئے ہیں اور میرا نام احمد رکھا گیا ہے اور میرے لیے مٹی پاک کرنے والی بنائی گئی ہے میری امت بہترین امت ہے۔

قرآن مجید کی آیت ظاہر کرتی ہے کہ امت مسلمہ کا خیر الامم ہونا نیکیوں کا حکم دینے اور برائیوں سے روکنے کی وجہ سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس امت کے علماء کو ورثۃ الانبیاء (انبیاء کے وارث) کا نبیاء بنی اسرائیل (بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح) کہا ہے۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین ٹھہرایا ہے۔

پھر قرآن مجید میں آتا ہے: وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُوْلٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (ال عمران ۳:۱۰۴) اور چاہیے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو جو بھلائی کی طرف بلائے اور نیکی کے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے اور وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ کہہ کر یُسر کے طور پر بتا دیا ہے کہ مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ ضرور ہونا چاہیے جو تبلیغ کا کام سرانجام دے اس کی وجہ دوسری جگہ قرآن مجید میں فرمائی ہے: مَاكَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً (توبہ ۹:۱۲۲) اور مومنوں کو یہ بھی مناسب نہیں کہ سب کے سب تبلیغ اسلام کی طرف نکل پڑیں۔

دعوت الی الخیر سے مراد دعوت الی القرآن ہے کیونکہ دوسری جگہ قرآن مجید کو خیر کہا گیا ہے۔ "مَايَوَدُّالَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَّبِّكُمْ (البقرہ ۲:۱۰۵) اہل کتاب میں سے جو کافر ہیں پسند نہیں کرتے اور نہ مشرک کہ تمھارے رب سے تم پر کوئی خیر اتاری جائے۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ. (العصر ۱۰۳:۱۔۳) قسم ہے وقت کی کہ انسان گھاٹے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرتے ہیں۔

اس مختصر سی صورت میں جن لوگوں کو خسران اور گھاٹے سے مستثنیٰ کیا ہے وہ چار صفات کے مالک ہیں۔ ۱۔ وہ عقائد صحیحہ کے مالک ہوتے ہیں۔ ۲۔ اعمال صالحہ کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ۳۔ ایک دوسرے کو حق پہنچاتے ہیں۔ ۴۔ تمام دنیا کی مشکلات کا سامنا کر کے اطاعت الٰہی کی مضبوط چٹان پر کھڑے رہتے ہیں۔ اس سورت میں تواصوا بالحق کے الفاظ سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انسان کی صرف یہی خوبی نہیں ہے کہ وہ خود حق کے بلند مینار پر کھڑا ہو جائے بلکہ حقیقی خوبی یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی حق کی بلندی کی طرف لے جائے اور حق دعوت اسلام کا نام ہے۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ آتا ہے: فَاذْكُرُوْنِيْ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ (البقرہ ۲:۱۵۲) پس مجھے یاد کرتے رہو تمھیں یاد رکھوں گا اور میری ناشکری نہ کرو۔ اس آیت میں مسلمانوں کی ترقی کا راز بیان کیا ہے کہ مسلمان اس وقت بڑے بن سکتے ہیں۔ جب وہ اللہ کے ذکر کو پھیلائیں گے۔ اللہ کا نام یاد کرنے سے مراد اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (حج ۲۲:۴۱) یعنی وہ لوگ جن کو ہم زمین پر صاحب اقتدار بناتے ہیں وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوۃ دیتے ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں۔ اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت پر تبلیغ اسلام فرض ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (الصف ۶۱:۹) وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کرے۔

تبلیغ کی اہمیت از روئے حدیث: عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا عَظَّمَتْ اُمَّتِيَ الدُّنْيَا نُزِعَتْ عَنْهَا هَيْبَةُ الْاِسْلَامِ وَاِذَا تَرَكَتِ الْاَمْرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيَ عَنِ الْمُنْكَرِ حُرِمَتْ بَرَكَةَ الْوَحْيِ وَاِذَا تَسَابَّتْ اُمَّتِيْ سَقَطَتْ مِنْ عَيْنِ اللّٰهِ. (ترمذی) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت

ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب میری امت دنیا کی عظمت میں کھو جائے گی تو اسلام کی ہیبت ان کے قلوب سے نکل جائے گی اور جب امر بالمعروف اور نہی المنکر کو ترک کر دے گی تو وحی کی برکات سے محروم ہو جائے گی۔ جب آپس میں ایک دوسرے کو سب وشتم دینا شروع کر دے گی تو اللہ کی نگاہ سے گر جائے گی۔

ابن مسعود سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔ نَضَرَ اللّٰہُ اِمْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَیْئًا فَبَلَّغَہٗ کَمَا سَمِعَہٗ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰی لَہٗ مِنْ سَامِعٍ کہ اللہ تعالیٰ اس آدمی کو سرسبز اور کامیاب کرے جس نے ہم سے کوئی بات سنی پھر جس طرح اس کو سنا دوسروں تک پہنچا دیا کیونکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سننے والے سے جس کو حدیث پہنچائی گئی ہے وہ زیادہ محفوظ رکھنے والا ہوتا ہے۔

پھر لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: بَلِّغُوا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً (الترمذی کتاب العلم باب ماجاء فی الحدیث عن بنی اسرائیل ۴۰/۵) یعنی مجھ سے پیغام حق سن کر لوگوں تک پہنچاؤ خواہ وہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔

ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لِیُبَلِّغَ الْعِلْمَ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ (بخاری ۳:۳۷) ان لوگوں تک میری علمی باتوں کو پہنچا دو جو میری مجلس میں موجود نہیں ہو سکتے۔

عَنِ الْمُغِیْرَۃِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَایَزَالُ نَاسٌ مِّنْ اُمَّتِیْ ظَاھِرِیْنَ حَتّٰی یَاْتِیَھُمْ اَمْرُ اللّٰہِ وَھُمْ ظَاھِرُوْنَ (بخاری ۲۸:۶) حضرت مغیرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ میری امت کے کچھ لوگ برابر غالب رہیں گے یہاں تک کہ اللہ کا امر ان کے پاس آجائے اور وہ غالب آجائیں۔

اس حدیث میں نَاسٌ مِّنْ اُمَّتِیْ سے یہی مراد ہے یعنی وہ لوگ جو اعلائے کلمۃ اللہ کا کام کرتے ہیں خدا کے فیصلہ کے مطابق وہ غالب رہیں گے اور یہی قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (۶۹:۲۹) اور جو لوگ ہمارے لیے جہاد کرتے ہیں ہم یقیناً انھیں اپنے رستوں پر چلائیں گے۔

سورہ آل عمران آیت ۱۰۳ میں بھی یہی بشارت دی گئی ہے وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاتَزَالُ طَائِفَۃٌ مِّنْ اُمَّتِیْ یُقَاتِلُوْنَ عَلَی الْحَقِّ ظَاھِرِیْنَ عَلٰی مَنْ نَّا وَاھُمْ (مشکوٰۃ ۱۸ بروایت ابوداؤد) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت سے ایک گروہ حق کے لیے لڑتا رہے گا اور وہ اس پر غالب رہیں گے جو ان کے ساتھ دشمنی کرے گا۔

عون المعبود میں یقاتلون کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے "اس گروہ میں مومنوں کے مختلف طبقے شامل ہیں یعنی بہادر جنگ کرنے والے فقیہہ محدث، زاہد وہ جو نیکیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور وہ لوگ جو نیک کام کرتے ہیں۔" اس سے معلوم ہوا کہ شارحین حدیث نے نہ صرف لفظ جہاد کو اپنے وسیع معنی میں لیا ہے بلکہ قتال کے لفظ کو بھی صرف جنگ تک محدود نہیں کیا بلکہ اس میں ہر قسم کے خدمت اسلام کے کام کو شامل کیا ہے۔

اس لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جذبہ جہاد (تبلیغ) کو زندہ رکھنے کے لیے امت مسلمہ کو یہ بشارت دی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر صدی کے سر پر مجدد بھیجتا رہے گا جو اس کے دین کی تجدید کرے گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا (ابوداؤد ۱:۳۶) اس وعدہ الٰہی کے مطابق ہر دور میں اس امت میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے فریضہ تبلیغ سرانجام دیا۔ مسلمانوں میں جو قرآنی، کلامی، فقہی، حدیثی اور تصوف کی غلطیاں پیدا ہو گئی تھیں ان کو دور کیا، ان لوگوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ہر وہ شخص جو تبلیغی کام کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیتا ہے وہ اس حدیث کا مصداق ہے۔

دہشت گردی اور جہاد

مسئلہ جہاد پر سیر کن بحث گزر چکی ہے۔ جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ جہاد سے متعلق مستشرقین کا جو تصور کہ "کلمہ پڑھو ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے" بہت ہی گمراہ کن اور اسلامی تعلیم کے منافی تھا۔ مسلمانوں نے جنگیں لڑی ہیں وہ مسلمانوں نے اپنی جان، مال اور عزت اور ملکی سرحدوں کی حفاظت کے لیے لڑی تھیں جیسا کہ قرآن مجید کے یہ الفاظ ظاہر کر رہے ہیں۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا الخ (ان لوگوں کو اجازت دی گئی ہے جن سے لڑائی لڑی جاتی ہے پس اس وجہ سے وہ مظلوم تھے) ان الفاظ سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں ایک تو مسلمانوں پر جنگ تھونپی گئی تھی۔ دوم مسلمان مظلوم تھے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اللہ کے حکم سے ہتھیار اٹھائے تو صرف اپنے دفاع کے لیے تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عدوان اور دیگر اس دور کے جنگی جور وستم اور مظالم سے سختی سے منع کیا جیسا کہ جنگی اصلاحات کا ذکر گزر چکا ہے۔

اس کے ساتھ جہاد کی بحث کے ضمن میں یہ بھی رقم کیا گیا تھا کہ قرآن مجید میں لفظ جہاد صرف قتال کے معنی میں ہی استعمال نہیں ہوتا یہ لفظ مختلف معانی میں بھی استعمال ہوا ہے حاصل کلام یہ ہے کہ مسلمانوں کا جہاد بالسیف دفاعی ہے اور ملک گیری کی ہوس سے پاک ہے۔

دہشت گردی: قرآن مجید میں دہشت گردی کے لیے دو الفاظ بیان ہوئے ہیں۔ فتنہ اور فساد۔ دونوں الفاظ مذموم مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ اسلام نہ فتنہ کو پسند کرتا ہے اور نہ فساد کو۔ اسلام فتنہ وفساد کو مٹا کر امن قائم کرنے آیا ہے جیسا کہ لفظ اسلام کا مفہوم ظاہر کر رہا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے دہشت گردی کی کیا تعریف ہے۔ پھر یہ دیکھنا ہے کہ یہ تعریف اسلامی جہاد پر استعمال ہوسکتی ہے امریکہ کی وزارت دفاع کے ایک سابق فوجی سیاسی تجزیہ نگار جان مور (John Moore) اپنے مقالے ''اسلامی دہشت کا ارتقاء'' (The Evolution of Islamic Terrorism) سے اخذ کی ہے۔

(Terrorism is) the in lawful use of..... threatened use of force or violence against individual or property to coerce or intimidate government or societies, often to achieve political, religious or indeological objectives"[1]

''سیاسی یا نظریاتی مقاصد کے حصول کے لیے مختلف معاشروں، حکومتوں اور افراد کے خلاف غیر قانونی طور پر طاقت کا استعمال یا طاقت استعمال کی دھمکی دہشت گردی ہے۔''

گویا ذاتی مفاد کے لیے معاشروں، حکومتوں اور افراد کے خلاف غیر قانونی طور پر طاقت استعمال کرنے یا دھمکی دینے کا نام دہشت گردی ہے۔ اسلام کی رو سے اس قسم کی کاروائیاں بھی حرام ہیں اور اس قسم کی کاروائیوں کو ناپسند قرار دیتا ہے۔ دنیا کا کوئی قانون اس قسم کی کاروائیوں کو جائز قرار نہیں دے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے اگر کسی ملک پر کوئی طاقت شدید بمباری اور مہلک ہتھیار استعمال کر کے عوام پر ظلم ڈھا کر قبضہ کر لے اور اس ملک کے عوام زمین دوز قیادت کے تحت اپنی سرزمین سے غیر طاقت کا قبضہ چھڑانے کے لیے زمین دوز مجاہدانہ کوشش یا ایک نظم و نسق کے تحت اپنے قائد کی ہدایت پر قابضین کے افراد پر خودکش حملے کر کے ان کی پریشانی کا باعث بنتے ہیں اور اپنے ملک سے غیروں کا قبضہ چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں اس مقدس مقصد کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں یا کوئی ایسی تنظیم معرض وجود میں آ جاتی ہے۔ جو کسی ملک کے کمزور طبقے عورتوں، بچوں، بوڑھوں کو آزادی دلانے اور ان کی تکالیف اور مصائب کو دور کرنے کے لیے ان کی معاون اور مددگار بنتی ہے کیا اس قسم کی تنظیم قائم کرنے والے دہشت گرد ہیں؟

ان سوالات کے متعلق مختلف قسم کے نظریات ہیں ایک تو اس قسم کی تمام کاروائیوں اور اس قسم کی تنظیموں کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور دہشت گردی میں شامل کرتے ہیں۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اس قسم کی کاروائیاں اسلامی تعلیم کے مطابق ہیں اور وہ اس کو جہاد قرار دیتے ہیں۔

اسلام میں کسی معاملہ کو صحیح یا غلط پرکھنے کا پیمانہ صرف قرآن مجید ہے اب دیکھنا یہ ہے قرآن مجید اس قسم کی کاروائیوں کے متعلق کیا کہتا ہے۔ اس لیے پھر ہم ان آیات پر نظر دوڑاتے ہیں جو جہاد کے متعلق ہیں۔ پہلی آیت تو وہی ہے جس کا ذکر ابھی کیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ. (الحج ۲۲:۴۰)

یہ آیت واضح ثبوت ہے کہ مسلمانوں کی جنگیں دفاعی تھیں، ان کو اس وقت اجازت دی گئی جب ان کی بقاء اور زندگی خطرے میں تھی۔ کفار مسلمانوں کو ہستی کو مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے مکہ میں ظلم وستم انفرادی تھا۔ دائرہ اسلام میں داخل ہونے پر تکالیف دی جاتی تھیں۔ جب مسلمان مدینہ میں ہجرت کر کے آ گئے تو کفار نے لشکر کشی کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کو مٹا دینے کا تہیہ کر لیا۔ اس صورت میں بین الاقوامی قانون بھی یہی تقاضا کرتا ہے کہ اپنی قومی بقا اور ملکی سرحدوں کی حفاظت کے لیے لڑائی لڑی جائے۔

جس طرح سورۃ الحج کی آیت ۴۰ اسلامی جنگوں کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتی ہے اسی طرح اسلامی حروب صرف مسلمانوں کی آزادی کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام مذاہب کی آزادی کے لیے تھیں۔ جنگوں کی غرض و غایت تمام مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت، مظلومین کی حمایت اور مدد بیان کی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا (النساء ۴:۷۵) اس آیت میں اسلامی جنگ کا کتنا بلند اور دور رس مقصد بیان کیا ہے کہ دنیا کے کسی خطہ میں مردوں اور عورتوں کے حقوق کی پامالی ہو رہی ہو۔ خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے کہ ان مظلوم انسانوں کی مدد کی جائے۔

سورۃ الحج کی آیت ۴۰ میں ان لوگوں کو مدافعانہ جنگ کی اجازت دی گئی ہے جو مظلوم ہیں۔ ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ اگر یہ دفاعی جنگیں نہ لڑی جائیں تو مذہب اور انسانیت خطرہ میں پڑ جاتی ہیں۔

---

[1] "The evolution of Islamic terrorism P.I.w.w.w state gov.

سورۃ النساء کی آیت ۷۵ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ غریب کمزور مظلوم لوگ دنیا کے کسی خطے میں ہوں اگر اپنی مدد کے لیے مسلمانوں کو پکاریں تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس مدد کے لیے نکل پڑیں۔

یہ ہے اسلام کی جنگوں کا فلسفہ یعنی امن قائم کرنا اور مظلوم عوام کی اعانت اب زمانہ قریب میں بعض ممالک پر استعمار پسند قوم نے محض اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ظلم ڈھائے ہیں کیا ان کا اپنی آزادی کے لیے استعمار پسند قوم سے لڑنا دہشت گردی کہلائے گا اور کیا ان ممالک کے مظلوم لوگوں کا اپنی مدد کے لیے پکارنا اور کسی تنظیم کا ان مظلوموں کی مدد کرنا ناجائز ہے۔ قرآن مجید واضح طور پر اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ مظلوموں کو اپنی آزادی کے حصول کے لیے لڑنا جائز ہے خواہ وہ لڑائی کی صورت میں ہو۔ مسئلہ صرف جارح قوم کے مظالم سے نجات ہے۔ نجات حاصل کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ ان طریقوں میں سے ایک طریقہ خودکش حملے بھی ہیں۔ عراق، افغانستان، کشمیر اور فلسطین میں یہ خودکش حملے انفرادی نہیں ہیں بلکہ یہ تمام حملے اپنے ملک کے دفاع اور ظالموں کے پنجہ استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنے زیر زمین قائد اور حکمران کے حکم پر کر رہے ہیں۔ اس قسم کی زیر زمین قائدین کے حکم پر کاروائیاں دہشت گردی کے زمرے میں نہیں آتیں۔ یہ تمام کاروائیاں سرفروشانہ اور مجاہدانہ افعال کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کاروائیوں میں تعمیر اور زندگی کی رمق پائی جاتی ہے اور مظلوم ظالم کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

اور سورۃ الحج کی آیت ۴۰ اور دیگر قرآنی آیات کی عین روح کے مطابق ہیں دوسرا مسئلہ ہے مظلوموں کی مدد کرنا۔ سورۃ النساء کی آیت ۷۵ واضح بیان کرتی ہے کہ مظلوموں کی مدد کرنا خواہ وہ کسی ملک کے باشندے ہوں خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ ان کو پنجہ استبدادیت سے نجات دلانے اور ان کی حریت کی بحالی کے لیے ہر مسلمان کا فرض ہے اگر کوئی تنظیم دوسرے مظلوم ممالک کی مدد کے لیے جان فروشوں کو بھیجتی ہے اور وہ اپنی مرضی سے حصول رضائے الٰہی اور حکم خداوندی کے تحت جاتے ہیں یہ عمل بھی قرآن مجید کی تعلیم کے مطابق ہے کیونکہ وہ ایک قرآن کا حکم بجا لا رہے وہ مجاہدین کی صف میں شامل ہوں گے۔ ان کا اجر خدا کے پاس ہے جو لوگ ان سرفروشانہ کاروائیوں کو دہشت گردی قرار دیتے ہیں اگر انھوں نے نیک نیتی سے غور وخوض کرنے کے بعد یہ اجتہاد کیا ہے تو ان کا معاملہ تو خدا کے ساتھ ہے۔ میں ان کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ ان کا اجتہاد نیک نیتی پر مبنی ہے اگر کسی ملک کا حکمران محض استعمار پسند قوم کے حاکم کو خوش کرنے کے لیے مجاہدین کی سرگرمیوں کو کچلنے کے لیے اس کے ساتھ قدم بقدم چلتا ہے۔ ظالم حکمران کی آرزو کو پورا کرنے میں ہی اپنے حکمرانی عہدے کا تحفظ سمجھتا ہے۔ اس کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ تاریخ اس کو قوم کے غداروں میں شمار کرے گی۔ ماضی میں جن لوگوں نے جارح قوم کا ساتھ دیا وہ بھی یہی کہتے تھے کہ وقت کا یہی تقاضا ہے اور وہ جارح قوم سے انعام واکرام کے متمنی تھے۔ ممکن ہے وہ اپنے تئیں درست ہی خیال کرتے ہوں لیکن تاریخ نے ان کی غداری کو معاف نہیں کیا۔ آج وہ تاریخ میں غدار کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں اور جن لوگوں نے کمزوری کے باوجود جارح اور ظالم قوم کا مقابلہ کیا اور لڑتے لڑتے جان دے دی تاریخ ان کو سنہری الفاظ میں یاد کرتی ہے۔

افغانستان، عراق، کشمیر اور فلسطین کے عوام کی سرفروشانہ کاروائیوں نے ان کو ایک زندہ قوم بنا دیا ہے۔ ان کی ان مجاہدانہ کاروائیوں کی وجہ سے مفاد پرست ظالم اور استعمار پسند قوم کے قدم دیگر ممالک پر حملہ کرنے سے رک گئے ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنی زندگی کا نذرانہ نہ دیتے اور سرفروشانہ کاروائیاں نہ کرتے تو عین ممکن تھا وہ استعمار پسند قوم کئی دیگر ممالک پر چڑھائی کر دیتی اور ان کو تہ وبالا کر دیتی اے مجاہدانہ کاروائیوں کو دہشت گردی جاننے والو! وہ کاروائیاں تو دوسروں کی حفاظت کا ضامن بن رہی ہیں۔ ظالم قوم کے قدم رک گئے ہیں۔ اے مسلمانو! آؤ ہم استعمار پسند قوم کے سامنے بنیان مرصوص بن جائیں۔ دشمن مسلمانوں کی بیداری کو محسوس کر رہا ہے۔ اس بیداری کی لہر کو روکنے کے لیے پہلے بنیاد پرستی کا طعنہ دیا۔ جب یہ طعنہ بیدار عوام نے خوشی سے اپنے سینہ پر لگا لیا تو بنیاد پرستی کی اصطلاح کو چھوڑ کر دہشت گردی کی اصطلاح مجاہدانہ سرگرمیوں کو روکنے کے لیے اختراع کی۔ جبکہ دہشت گردی اور مجاہدانہ سرگرمیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے حالانکہ دہشت گردی کی تعریف کو سامنے رکھیں تو یہ تعریف استعمار پسند قوم پر ہی لاگو ہوتی ہے۔

دوسری طرف میں سرفروشوں کی خدمت میں بھی عرض کروں گا کہ ان کا ہدف صرف دشمن قوم کی فوج ہونا چاہیے امن پسند شہریوں کی جان اور مال خطرے میں نہیں ہونا چاہیے کیونکہ رسول کریم ﷺ بھی جب کوئی دستہ یا فوج دفاع کے لیے بھیجتے تو یہی نصیحت کرتے تھے کہ پرامن شہریوں کی زندگیوں کو خطرے میں نہ ڈالنا۔

جارح قوم یاد رکھ لے سرفروشانہ سرگرمیوں کو دبانے کے لیے جتنی زیادہ طاقت استعمال کی جائے گی۔ اس قدر مجاہدانہ قوت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ ان مجاہدوں کے پیچھے ایک الٰہی نظریہ ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ اپنی جانوں کا بطیب خاطر نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔

ان سرفروشانہ سرگرمیوں کو بند کرنے کے دو ہی طریقے ہیں ایک یہ استعمار پسند قوم اپنے استعمار پسندی عزائم سے باز آ جائے۔ دوم مسلمان حکمران جو استعمار پسند قوم کے مفاد کی حفاظت کر رہے ہیں۔ وہ حقیقی معنوں میں اپنے ملک کے خادم بن جائیں تو یہ مجاہدانہ سرگرمیاں خود بخود بند ہو جائیں گی۔ کیونکہ سرفروشوں کے سامنے تو اپنا دفاع ہے جب حریصانہ طور پر کمزور قوم پر چڑھائی ہی نہ ہوگی۔ تو دفاع کس چیز کا۔ الغرض جارح قوم کو اپنا ظالمانہ رویہ بدلنا ہوگا۔ تب دنیا میں امن قائم ہو جائے گا۔ جارح قوم یہ سمجھے کہ ان کو کمزوروں پر ظلم کی اجازت ہے لیکن مظلوم آگے سے حرکت نہ کریں۔ ناممکن ہے اور محال ہے۔

باب ۵

اسلام کا اخلاقی نظام

اخلاق و آداب: اخلاق، خُلق کی جمع ہے عربی زبان میں خَلق اور خُلق دو الفاظ ہیں۔ خَلق خا کی فتح سے ظاہری پیدائش کا نام ہے اور خُلق، خا کی ضمہ سے باطنی پیدائش مراد ہے۔

حکماء نے خُلق کی بے شمار تعریفیں کی ہیں۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق کے بارے میں چند ایک علماء کی تعریفات بیان کر دی جائیں۔

امام غزالی نے خُلق کی حسب ذیل تعریف کی ہے۔

''خُلق'' نفس کی ایک ایسی کیفیت اور ہیت راسخ کا نام ہے جس کی وجہ سے سہولت اور فکر اور توجہ کے بغیر ''نفس'' کے اعمال صادر ہوسکیں پس اگر یہ ہیت اس طرح قائم ہے کہ اس سے عقل و شرع کی نظر میں اعمال حسنہ صادر ہوتے ہیں تو اس کا نام ''خُلق حسن'' ہے اور اس سے غیر محمود افعال وجود میں آتے ہیں تو وہ خلق سیئہ ہے۔ (امام غزالی احیاء العلوم جلد۳ صفحہ ۵۶)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔

''یہ واضح رہے کہ ''شارع'' نے انسان کو ایجاب وتحریم کا جن اعمال کی بناء پر مکلف بنایا ہے وہ اعمال ہیں جن کی تحریک، نفس کی ان کیفیات کے ذریعے ہوتی ہے جو عالم آخرت میں نفس کے لیے مفید یا مضر ثابت ہوں گے۔

اس طرح کے اعمال سے دو طرح بحث کی جاتی ہے۔

ایک اس حیثیت میں کہ وہ انسانی نفوس کو مہذب بنانے کا ذریعہ ہیں اور ان اعمال سے جو ملکات فاضلہ مقصود ہیں ان تک نفس کو پہنچانے کا آلہ ہیں اس کو تو علم الاحسان (علم الاخلاق) کہتے ہیں۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱)

سب سے عمدہ تعریف یہ ہے کہ ''اخلاق فاضلہ وہ اعمال ہیں جو خدا کی صفات مختلفہ کی مقتضیات ہوں اور جو اعمال صفات الٰہیہ کی مقتضیات کے برعکس ہوں گے ان کو اخلاق رذیلہ یا سیئات کہا جائے گا۔

یہ تعریف قرآن مجید کی اس آیت سے مستنبط ہے۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (بقرہ۲:۱۳۸) یعنی اللہ کا رنگ اختیار کرو اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ کا رنگ اس کی صفات حسنیٰ ہیں۔ رنگ اختیار کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو اپنے اعمال میں صفات حسنیٰ کا رنگ اختیار کرنا چاہیے۔

ایمان اور اخلاق فاضلہ: قرآن مجید نے بے شمار مقامات پر ایمان اور عمل صالحہ (اخلاق فاضلہ یا حسنات) کو اکٹھا بیان کیا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ (بقرہ۲:۶۲) جو اللہ اور آخری دن پر ایمان لائیں اور نیک کام بجالائیں ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے ان کو نہ کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (بقرہ۲:۸۲) اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ بجالائے وہی لوگ جنت کے وارث ہوں گے اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایمان اور اعمال صالح (اخلاق فاضلہ) لازم

دلمزوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے سے ہی انسان کے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے جو انسان کو برائیوں سے روکتا ہے اور نیکی کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

عبادات اور اخلاق فاضلہ: قرآن مجید میں جہاں بھی عبادات بجا لانے کا ذکر آتا ہے وہاں عبادات کی غرض و غایت ہی اخلاق بیان فرمائی ہے نماز کا فلسفہ یہ بیان کیا ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ بے شک نماز فحشا اور منکر سے روکتا ہے۔ روزہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔ زکوٰۃ کا مقصد بنی نوع انسان سے شفقت اور ہمدردی کرنا ہے۔ حج کے بے شمار مقاصد میں سے ایک مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی سرکش اونٹنی کو رضا الٰہی کے حصول کے لیے ذبح کر دے جو انسان اپنے سرکش نفس پر قابو پالیتا ہے وہ سالکوں کے رستہ پر تیزی سے گامزن ہو جاتا ہے اور خدا کا قرب حاصل کر لیتا ہے۔

اخلاق فاضلہ کی اہمیت: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کی بعثت کی غرض بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (سورۃ جمعہ ۶۲ ۲) اللہ وہ ذات ہے جس نے اَن پڑھ لوگوں میں اپنا رسول بھیجا جو انہی میں سے ہے وہ ان کے سامنے اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو گناہوں کی میل سے پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب کی تعلیم دیتا ہے اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا (الشمس ۹۱:۹،۱۰) کامیاب ہو گیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو پاک کیا اور ناکام و نامراد ہو گیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو گناہوں کی میل سے ملوث کیا۔

رسول کریم ﷺ نے اخلاق حسنہ پر بہت زور دیا ہے آپ فرماتے ہیں۔ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ (کنز العمال جلد ۱۶/۳ الادب المفرد للبخاری، مسند احمد) میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق حسنہ کی کروں۔

موطا امام مالک میں حسن الاخلاق کے الفاظ آئے ہیں۔ (باب حسن الاخلاق)

فرمایا۔ اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا (ابوداؤد والدارمی) ایمان لانے والوں میں زیادہ کامل ایمان والے وہ لوگ ہیں جو اخلاق میں زیادہ اچھے ہیں۔ (ابوداؤد، دارمی)

فرمایا۔ اِنَّ اَثْقَلَ شَیْءٍ یُوْضَعُ فِیْ مِیْزَانِ الْمُؤْمِنِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ خُلُقٌ حَسَنٌ (ابوداؤد، ترمذی) قیامت کے دن مومن کی میزان عمل میں سب سے زیادہ وزنی چیز جو رکھی جائے گی وہ اس کے اچھے اخلاق ہوں۔

عَنْ رَجُلٍ مِنْ مزینۃ قَالَ قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مَاخَیْرُ مَااُعْطِیَ الْاِنْسَانُ قَالَ اَلْخُلُقُ الْحَسَنُ (البیہقی فی شعب الایمان، البغوی فی شرح السنۃ عن اسامہ بن شریک) قبیلہ مزینہ کے ایک شخص سے روایت ہے کہ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! انسان کو جو کچھ عطا ہوا ہے اس میں سب سے بہتر کیا ہے آپ نے ارشاد فرمایا کہ اچھے اخلاق)

فرمایا۔ اِنَّ مِنْ اَحَبِّکُمْ اِلَیَّ اَحْسَنُکُمْ اَخْلَاقًا (بخاری) تم میں سے مجھے سب سے زیادہ پیارا وہ ہے جن سے اخلاق زیادہ اچھے ہیں۔

فرمایا۔ اِنَّ مِنْ اَحَبِّکُمْ اِلَیَّ وَاَقْرَبِکُمْ مِنِّیْ مَجْلِسًا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَحْسَنُکُمْ اَخْلَاقًا (ترمذی) تم میں سے مجھے زیادہ پیارا اور محبوب وہ ہیں اور قیامت کے دن ان کی نشست بھی میرے زیادہ قریب ہوگی جن کے اخلاق تم میں زیادہ بہتر ہوں گے۔

فرمایا۔ اِنَّ الرَّجُلَ لَیُدْرِکُ بِحُسْنِ خُلُقِہٖ دَرَجَۃَ قَائِمِ اللَّیْلِ وَصَائِمِ النھار انسان اچھے اخلاق سے اس شخص کا درجہ پالیتا ہے۔ جو رات بھر عبادت کے لیے کھڑا رہتا ہے اور دن کو روزہ رکھتا ہے۔

حسن اخلاق کے متعلق رسول کریم ﷺ ایک دعا میں یہ فرمایا کرتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اَحْسَنْتَ خَلْقِیْ فَاَحْسِنْ خُلُقِیْ (احمد بن حنبل) اے اللہ! تو نے میری شکل اچھی بنائی ہے میرے خلق کو اچھا بنا۔

حضرت علی سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نماز تہجد میں یہ دعا بھی فرمایا کرتے تھے۔ وَاھْدِنِیْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا یَھْدِیْ لِاَحْسَنِھَا اِلَّا اَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّیْ سَیِّئَھَا لَا یَصْرِفُ عَنِّیْ سَیِّئَھَا اِلَّا اَنْتَ (مسلم) اے میرے اللہ! تو مجھ کو احسن اور اعلیٰ اخلاق کی راہنمائی کر۔ تیرے سوا کوئی بہتر اخلاق کی رہنمائی نہیں کر سکتا اور برے اخلاق کو میری طرف سے پھیر دے ان کو تیرے سوا کوئی اور نہیں پھیر سکتا۔

اخلاق کی اقسام

اخلاق کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اخلاق حسنہ اور اخلاق شنیعہ۔

اخلاق حسنہ

صدق

صدق سب نیکیوں کی جڑ اور تمام بھلائیوں کی اصل ہے اس وجہ سے قرآن مجید اور احادیث میں صدق پر بہت زور دیا گیا ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ (مائدہ ۵:۱۱۹) یہ دن (قیامت) ہے کہ سچے بندوں کو ان کا سچ کام آئے گا۔

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ (احزاب ۳۳:۲۴) تاکہ اللہ سچا اترنے والوں کو ان کی سچائی کا بدلہ دے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (توبہ ۹:۱۱۹) ارشاد الٰہی ہے۔ وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (زمر ۳۹:۳۳) اور وہ جو سچائی کو لایا اور اس کی تصدیق کرتا ہے یہی متقی ہیں۔ جنت اور خدا کی رضا حاصل کرنے والوں میں جہاں اور بہت اوصاف حمیدہ پائے جاتے ہیں وہاں صدق بھی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ (ال عمران ۳:۱۷) صبر کرنے والے اور سچ بولنے والے اور فرمانبردار اور خرچ کرنے والے اور صبح کے وقتوں میں استغفار کرنے والے۔

صدق کی اہمیت اس سے اور بڑھ جاتی ہے کہ صدق اللہ کی صفات میں سب سے بڑی صفت ہے۔ اس طرح لوگوں میں یہ صفت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفت صدق کے متعلق آتا ہے۔ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا (نساء ۴:۸۷) اللہ سے بڑھ کر بات کا سچا کون ہے۔

وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا (نساء ۴:۱۲۲) اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون بات کا سچا ہے۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (ال عمران ۳:۹۵) کہہ اللہ نے سچ فرمایا ہے پس راست رو ہو کر ابراہیم کے دین کی پیروی کرو۔

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی سچائی کی گواہی دیتے ہوئے فرمایا۔

صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (احزاب ۳۳:۲۲) اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا ہے۔

وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (یٰسین ۳۶:۵۲) رسولوں نے سچ کہا ہے۔

وَاذْكُرْ فِى الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (مریم ۱۹:۴۱) اور کتاب میں ابراہیم کا ذکر کر وہ صدیق نبی تھا۔

حضرت ادریس کے متعلق بھی لفظ صدیق استعمال ہوا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَاذْكُرْ فِى الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (مریم ۱۹ : ۵۶) اور کتاب میں ادریس کا ذکر کر۔ وہ صدیق نبی تھا۔

حضرت یوسف کے متعلق بھی یہی لفظ استعمال ہوا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ (یوسف ۱۲:۴۶) یوسف اے صدیق رسول کریم ﷺ کے متعلق آتا ہے۔ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس ۱۰:۱۷) میں تم میں اس سے پہلے ایک عمر رہا ہوں۔ (کیا تم نے مجھے کبھی غلط بیانی کرتے ہوئے دیکھا ہے) تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

جب رسول کریم ﷺ کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں صرف آپ کے رشتے داروں یا صحابہ نے ہی آپ ﷺ کی سچ بیانی کی گواہی نہیں دی بلکہ شدید دشمن مثلاً ابوجہل (ترمذی ابواب التفسیر سورۃ الانعام)، نضر بن حارث (السیرۃ النبویہ لابن ہشام جلد ۱ ص ۳۲۰ مصر)، امیہ بن خلف (بخاری کتاب المناقب باب علامات النبوۃ فی الاسلام)، امیہ کی بیوی (بخاری کتاب المناقب باب علامات النبوۃ فی الاسلام)، سردار قریش عقبہ (السیرۃ الحلبیۃ از علامہ برہان الدین جلد ۱ ص ۳۰۳ مطبوعہ البیروت) نے بھی آپ کی سچ بیانی کی شہادت دی کہ آپ راست باز اور راست گو تھے۔

جب حدیث کے دفتر کا مطالعہ کیا جائے تو رسول کریم ﷺ نے صدق کی اہمیت مختلف پیرایوں میں بیان کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَاِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِىْ اِلَى الْبِرِّ وَاِنَّ الْبِرَّ يَهْدِىْ اِلَى الْجَنَّةِ وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيْقًا (البخاری کتاب الادب) تم سچائی کو لازم پکڑ لو کیونکہ سچ بولنا نیکی کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور نیکی جنت کی طرف اور آدمی جب ہمیشہ سچ ہی بولتا ہے تو وہ خدا کے ہاں صدیق لکھا جاتا ہے۔ یعنی مقام صدیقت تک پہنچ جاتا ہے۔

ایک دفعہ رسول کریم ﷺ نے وضو کیا تو آپ ﷺ کے صحابہ وضو کا پانی لے لے کر اپنے چہروں اور جسموں پر ملنے لگے تو آپ نے فرمایا "تم کو کیا چیز اس فعل پر آمادہ کر رہی ہے تو صحابہ نے عرض کیا کہ "اللہ اور اس کے رسول کی محبت" ان کا جواب سن کر آپ نے اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے حصول کا طریقہ بیان کیا۔ فَلْيَصْدُقْ حَدِيْثَهُ إِذَا حَدَّثَ وَالْيُؤَدِّ أَمَانَتَهُ إِذَا ائْتُمِنَ وَلْيُحْسِنْ جِوَارَ مَنْ جَاوَرَهُ (البیہقی فی شعب الایمان) جب وہ بات کرے تو سچ بولے اور جب کوئی امانت اس کے پاس رکھی جائے۔ اس کو ادا کرے اور جس کے پڑوس میں وہ رہ رہا ہے اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

فرمایا۔ اِضْمَنُوْا لِي سِتًّا مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَضْمَنْ لَكُمُ الْجَنَّةَ اُصْدُقُوْا إِذَا حَدَّثْتُمْ وَأَوْفُوْا إِذَا وَعَدْتُمْ وَأَدُّوْا إِذَا اؤْتُمِنْتُمْ وَاحْفَظُوْا فُرُوْجَكُمْ وَغُضُّوْا أَبْصَارَكُمْ وَكُفُّوْا أَيْدِيَكُمْ (احمد بن حنبل، البیہقی فی شعب الایمان) تم چھ باتوں کے ضامن ہو جاؤ میں تمہارے لیے جنت کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ سچ بولو جب تم بات کرو۔ جب تم وعدہ کرو تو پورا کرو۔ جب تمھارے پاس امانت رکھی جائے تو اس کو ادا کرو اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرو اور اپنی نظروں کو نیچی رکھو۔ اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو۔ (نہ کسی کو مارو نہ کسی کو ستاؤ، نہ کسی سے چھینا جھپٹی کرو)

فرمایا۔ كَبُرَتْ خِيَانَةً أَنْ تُحَدِّثَ أَخَاكَ حَدِيْثًا وَهُوَ لَكَ بِهِ مُصَدِّقٌ وَأَنْتَ بِهِ كَاذِبٌ (ابوداؤد) یہ بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات جھوٹی بیان کرو جبکہ وہ تم کو اس بیان میں سچا سمجھتا ہو۔

صدق کے معنی عام طور پر سچ بولنے کے کیے جاتے ہیں لیکن اس کے اندر وسیع معنی ہیں حضرت امام غزالی نے احیاء العلوم میں اس کی چھ قسمیں بیان کی ہیں۔ ہر قسم کو قرآنی آیات اور احادیث سے استنباط کیا ہے وہ یہ ہیں۔ بات میں سچائی، ارادہ اور نیت میں سچائی، عزم میں سچائی عزم کو پورا کرنے میں سچائی عمل میں سچائی، دینداری کے مقامات اور مراقب میں سچائی۔

صبر

صبر کے لغوی معنی ہیں روکنا۔ جب کسی جانور کو مارا جائے تو عرب کہتے ہیں۔ قتل صبرا اصطلاح میں صبر کو اس لیے صبر کہا جاتا ہے کہ انسان دل کو گریہ و زاری سے زبان کو شکوہ وگلہ اور جوارح کو بے قراری اور اضطراب سے روک لیتا ہے۔ محقق درانی لکھتے ہیں کہ صبر کے معنی ہیں خواہشات سے مقابلہ کرنا تاکہ ان کو رفع کر کے لذات قبیحہ کے استعمال سے باز رہے۔

اہمیت از روئے قرآن: قرآن مجید میں نوے مقامات پر صبر کا ذکر کیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ وَاسْتَعِينُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ ۲:۴۵) صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔

اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا (آل عمران ۳:۲۰۰) صبر رکھو اور آپس میں صبر کی تعلیم دو۔ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ (احقاف ۴:۳۵) صبر کیجئے جیسا کہ صاحب عزم رسولوں نے صبر کیا اور ان کے لیے جلدی نہ کیجئے۔

رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (بقرہ ۲:۲۵۰) اے ہمارے رب ہم پر صبر ڈال دے اور ہمارے قدموں کو مضبوط رکھ اور کافر قوم پر ہمیں مدد دے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَا اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ (ال عمران ۳:۱۴۶) اور کتنے ہی نبی ہوئے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے ربانی لوگ لڑے۔ پھر اس وجہ سے وہ سست نہ ہوئے جو ان کو اللہ کی راہ میں مصیبت پیش آئی اور نہ کمزور ہوئے اور نہ عاجزی اختیار کی اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (الزمر ۳۹:۱۰) صبر کرنے والوں کو ان کا ثواب بغیر حساب پورا دے دیا جائے گا۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ (السجدہ ۳۲:۲۴) اور ان میں سے ہم نے پیشوا بنائے جو کہ ہمارے حکم سے لوگوں کی راہنمائی کرتے ہیں جب انھوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین کرتے ہیں۔

وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (النحل ۱۶:۹۶) ہم صبر کرنے والوں کو ان کے اعمال کا اچھا بدلہ دیں گے۔

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (البقرہ ۲:۱۵۵......۱۵۷) اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دو۔ جب انھیں مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ''ہم اللہ کے ہیں اور اس کی طرف ہی لوٹنے والے ہیں یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے رحمت ہے یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

اہمیت ز روئے حدیث: رسول کریم ﷺ کی ایک بیٹی کے فرزند کا جان بلب کا وقت تھا۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو بلایا تو ارشاد فرمایا۔ اَقْرِأْ لَهَا السَّلَامَ قُلْ لَهَا اِنَّ لِلّٰهِ مَا اَخَذَ وَلَهٗ مَا اَعْطٰى وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِاَجَلٍ مُّسَمًّى فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ (صحیح بخاری) میری بیٹی کو سلام کہو اور ان سے کہو۔ اللہ ہی کا ہے جو اس نے لے لیا اور جو اس نے دیا وہ بھی اسی کا ہے ہر چیز کا اس کے ہاں ایک وقت مقررہ ہے اسے چاہیے کہ وہ صبر کرے اور اللہ کے ہاں ثواب کی نیت کرے۔

مَايَزَالُ الْبَلَاءُ بِالْمُؤْمِنِ فِيْ نَفْسِهٖ وَوَلَدِهٖ وَمَالِهٖ حَتّٰى يَلْقَى اللّٰهَ وَمَاعَلَيْهِ خَطِيْئَةٌ (سنن ترمذی) مومن کو اس کے نفس، اولاد اور مال میں آزمایا جاتا ہے حتیٰ کہ جب وہ اللہ سے ملتا ہے تو اس کے ذمہ کوئی گناہ نہیں ہوتا۔

مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّصِبْ مِنْهُ (صحیح بخاری) اللہ جس سے بھلائی چاہتا ہے اسے مصیبت میں ڈال کر آزماتا ہے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَهٗ كُلَّهٗ لَهٗ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذَالِكَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ (مسلم) مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے اس کے ہر معاملہ میں اس کے لیے بھلائی ہی بھلائی ہے اگر اس کو کوئی خوشی پہنچے تو وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اور اگر اسے کوئی دکھ پہنچے تو وہ صبر سے کام لیتا ہے یہ بھی اس کے لیے موجب خیر ہے۔

حدیث قدسی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ یَقُوْلُ اللّٰهُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی یَا ابْنَ اٰدَمَ اِنْ صَبَرْتَ وَاحْتَسَبْتَ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰی لَمْ اَرْضَ لَکَ ثَوَابًا دُوْنَ الْجَنَّةِ (ابن ماجہ) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے فرزند آدم! اگر تو نے صدمہ کے شروع میں صبر کیا اور میرے ثواب کی نیت کی تو میں راضی ہوں گا کہ جنت سے کم اس کے سوا کوئی ثواب تجھے نہیں دیا جائے۔ فرمایا۔ مَنْ اُصِیْبَ بِمَصِیْبَةٍ فِیْ مَالِهٖ اَوْ فِیْ نَفْسِهٖ فَکَتَمَهَا وَلَمْ یَشْکُهَا اِلَی النَّاسِ کَانَ حَقًّا عَلَی اللّٰهِ اَنْ یَّغْفِرَلَهٗ (الطبرانی فی الاوسط) جو بندہ کسی مالی و جانی مصیبت میں مبتلا ہو اور وہ اس کو اپنے دل میں چھپائے رکھے اور لوگوں سے شکایت نہ کرے تو اللہ کا ذمہ ہے کہ وہ اس کو بخش دے۔

حضرت امام بخاری کتاب الادب میں نبی کریم ﷺ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ اَلصَّبْرُ وَالسَّمَاحَةُ (یعنی صبر اور سرچشمی)

فرمایا اَلصَّبْرُ مِفْتَاحُ الْفَرَجِ یعنی صبر کشائش کی چابی ہے۔

فرمایا اَلنَّصْرُ مَعَ الصَّبْرِ فتح صبر کے ساتھ ہے۔

نبی کریم ﷺ خود بھی کسی حالت میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے مکی زندگی میں کن کن مصائب سے دوچار ہوئے لیکن صبر کی مضبوط چٹان پر کھڑے رہے۔ آپ کے پاؤں میں ذرا برابر بھی لغزش نہ آئی۔ آپ کے عزیز فوت ہوتے ہیں تو کمال صبر کا نمونہ دکھاتے ہیں اسی طرح اگر کسی صحابی کو کسی عزیز کی وفات کا صدمہ پہنچتا ہے تو صبر کی تلقین فرماتے ہیں۔ حضرت معاذ بن جبل کا بیٹا فوت ہو گیا اور انھیں صبر کا نمونہ دکھانے کی نصیحت فرمائی۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے ساتھ اظہار افسوس کرتے ہوئے تعزیتی خط تحریر فرمایا۔ آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد تحریر فرمایا۔

اللہ کے رسول محمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی طرف سے معاذ بن جبل کے نام، میں پہلے اس اللہ کی تم سے حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں۔ بعدازاں کہ اللہ تعالیٰ تمھیں عظیم اجر عطا کرے اور آپ کے دل کو صبر عطا فرمائے اور ہم کو اور تم کو نعمتوں پر شکر کی توفیق دے یاد رکھو۔ ہماری جانیں اور ہمارے مال اور ہمارے اہل و عیال سب اللہ کی عطا ہیں۔ یہ امانتیں ہیں جو اس نے ہمارے سپرد فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس بچے کے عوض سچی خوشی نصیب عطا کرے (لڑکا تمھارے پاس اس کی امانت تھا) اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا خوشی کے ساتھ تم کو اس سے فائدہ اٹھانے اور جی بہلانے کا موقعہ دیا۔ جب چاہا تو اس نے اپنی امانت کو واپس لے لیا۔ وہ تم کو اس کا اجر دینے والا ہے۔ اللہ کی خاص نوازش اور اس کی رحمت اور اس کی طرف سے ہدایت کی۔ (بشارت ہے) اگر تم نے ثواب کی نیت سے صبر کیا تو صبر کرو ایسا نہ ہو کہ جزع و فزع تمھارے اجر کو اکارت کر دے پھر تمھیں ندامت ہو اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ جزع و فزع سے کوئی مرنے والا واپس نہیں آتا اور نہ اس سے غم دور ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم نازل ہوتا ہے وہ تو پورا ہونے والا ہوتا ہے۔ (مجمع الزوائد للھیثمی جلد۳ ص۳)

تعزیت نامہ میں تین الفاظ الصلوٰۃ، الرحمۃ والھدی استعمال ہوئے۔ مذکورہ الفاظ قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ "اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (جو مصائب پر صبر سے کام لیتے ہیں) ان پر اللہ کی خاص نوازش ہوگی وہ (اللہ کی) رحمت سے نوازے جائیں گے اور وہ ہدایت پانے والے ہیں۔

خباب بن ارتؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن کعبہ کے سائے کے تلے چادر کا سرہانہ بنا کر لیٹے ہوئے تھے۔ ہم نے آپ ﷺ کے پاس شکایت کی اور کہا "کیا آپ ہمارا بدلہ نہیں لیں گے کیا آپ ﷺ ہمارے لیے دعا نہیں کریں گے۔ تو فرمایا۔ قَدْ کَانَ مِنْ قَبْلِکُمْ یُؤْخَذُ الرَّجُلُ فَیُحْفَرُلَهٗ فِی الْاَرْضِ فَیُجْعَلُ فِیْهَا ثُمَّ یُؤْتٰی بِالْمِنْشَارِ فَیُوْضَعُ عَلٰی رَاْسِهٖ فَیُجْعَلُ نِصْفَیْنِ وَیُمْشَطُ بِاَمْشَاطِ الْحَدِیْدِ مَادُوْنَ لَحْمِهٖ وَعَظْمِهٖ مَایَصُدُّهٗ ذَالِکَ عَنْ دِیْنِ اللّٰهِ (صحیح بخاری علامات النبوۃ فی الاسلام) تم سے پہلے لوگوں میں ایسے اشخاص بھی تھے۔ جنھیں زمین میں گاڑ دیا جاتا اور پھر آرے سے ان کے جسموں کو سر سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا اور لوہے کی کنگھیوں سے گوشت کو ہڈیوں سے کھینچا جاتا۔ تو یہ بھی ان کو اللہ کے دین سے نہیں روکتی تھی۔

فرمایا اِنَّ عِظَمَ الْجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ الْبَلَاءِ وَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی اِذَا اَحَبَّ قَوْمًا اِبْتَلَاهُمْ فَمَنْ رَضِیَ فَلَهُ الرِّضَا وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السُّخْطُ (سنن ترمذی و سنن ابن ماجہ) جتنی بڑی مصیبت اتنا ہی بڑا اجر۔ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو انھیں آزماتا ہے چنانچہ وہ راضی ہوتا ہے اس کے لیے اللہ کی خوشنودی ہے اور جو ناراض ہوتا ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی ناراضی۔

صبر کی تین حالتیں ہیں۔

۱۔ صبر باللہ۔ ۲۔ صبر للہ۔ ۳۔ صبر مع اللہ

صبر باللہ سے مراد یہ ہے کہ صبر اللہ کے لیے ہو جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰهِ (نحل) صبر کیجیے اور آپ کا صبر اللہ

کی رضا اور خوشنودی کے لیے ہو۔

صبر للہ سے مراد یہ ہے کہ صبر رضا الٰہی اور تقرب الٰہی کے لیے ہو نہ کہ شہرت حاصل کرنے اور قوت نفس کا اظہار کرنے کے لیے۔

صبر مع اللہ سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو احکام الٰہی کا مکمل طور پر مطیع ومنقاد بنا دے۔

صبر کی تین اقسام ہیں۔

۱۔ طاعت الٰہی پر صبر۔ ۲۔ معصیت الٰہی سے صبر۔ ۳۔ امتحان الٰہی پر صبر

طاعت الٰہی پر صبر سے مراد یہ ہے کہ طاعت الٰہی پر دوام اختیار کیا جائے معصیت الٰہی سے صبر سے مراد یہ ہے کہ اپنے نفس کو احکام ربانی کے توڑنے سے روکا جائے۔ امتحان الٰہی پر صبر سے مراد یہ ہے کہ تنگی معصیت اور لڑائیوں میں اپنے جوارح کو جزع وفزع کرنے سے روکا جائے۔

شرم وحیا

حیا وہ ملکہ اور قوت ہے جو انسان کو بھلائی کی طرف لے جاتی ہے اور برائیوں سے روکتی ہے پس جس قدر انسان میں یہ ملکہ زیادہ ہوگا اتنا ہی اس سے زیادہ نیکیوں اور بھلائیوں کا صدور ہوگا۔ جتنا یہ ملکہ کمزور اور کم ہوگا اتنے ہی زیادہ اس سے اعمال قبیحہ سرزد ہوں گے۔

حیاء وہ وصف ہے جس سے اللہ تعالیٰ بھی متصف ہے سورہ بقرہ میں ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا (بقرہ ۲:۲۶) اللہ اس بات سے شرم نہیں کرتا کہ کوئی سی مثال بیان کرے مچھر کی اور اس سے بڑھ کر۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَاللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ (احزاب ۳۳:۵۳) اور اللہ حق بات کہنے سے شرم نہیں کرتا۔

حدیث میں بھی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ (بخاری کتاب الادب) رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ اِنَّ لِکُلِّ دِیْنٍ خُلُقًا وَخُلُقُ الْاِسْلَامِ الْحَیَاءُ (ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان، عن انس بن مالک) ہر دین کا کوئی وصف ہے۔ دین اسلام کا امتیازی وصف حیاء ہے۔

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰی رَجُلٍ مِنَ الْاَنْصَارِ وَهُوَ یَعِظُ اَخَاهُ فِی الْحَیَاءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ دَعْهُ فَاِنَّ الْحَیَاءَ مِنَ الْاِیْمَانِ (بخاری کتاب الادب ومسلم) رسول کریم ﷺ ایک انصار میں سے کسی ایک شخص پر سے گزرے اور وہ اپنے بھائی کو حیا کے بارہ میں نصیحت کر رہا تھا تو آپ نے اس سے فرمایا۔ اس کو اس کے حال پر ہی چھوڑ دیجئے کیونکہ حیاء تو ایمان کا ایک جز ہے۔

فرمایا اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ وَالْاِیْمَانُ فِی الْجَنَّةِ وَالْبَذَاءُ مِنَ الْجَفَاءِ وَالْجَفَاءُ فِی النَّارِ (احمد بن حنبل وترمذی) حیا ایمان کی شاخ ہے۔ اور ایمان کا مقام جنت ہے بے حیائی بدکاری میں سے ہے اور بدی آگ میں لے جانے والی ہے۔ فرمایا اِنَّ الْحَیَاءَ وَالْاِیْمَانَ قُرَنَاءُ جَمِیْعًا فَاِذَا رُفِعَ اَحَدُهُمَا رُفِعَ الْاٰخَرُ (البیہقی فی شعب الایمان ومستدرک حاکم وصححہ علی شرط الشیخین) حیا اور ایمان دونوں اکٹھے رہتے ہیں۔ جب ان دونوں میں سے کوئی ایک اٹھا لیا جائے تو دوسرا بھی اٹھا لیا جاتا ہے۔

فرمایا اَلْحَیَاءُ لَا یَاْتِیْ اِلَّا بِخَیْرٍ (بخاری ومسلم) حیا صرف خیر ہی کو لاتی ہے۔

فرمایا اِنَّ مِمَّا اَدْرَکَ النَّاسُ مِنْ کَلَامِ النُّبُوَّةِ الْاُوْلٰی اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَاشِئْتَ (بخاری) اگلی نبوت کی باتوں میں سے لوگوں نے جو کچھ پایا ہے اس میں ایک یہ بھی ہے جب تم میں شرم نہ ہو تو پھر جو چاہو کرو۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اِسْتَحْیُوْا مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَیَاءِ اللہ تعالیٰ سے ایسی حیا کرو جیسا کہ حیاء کرنے کا حق ہے۔

صحابہ نے فرمایا یا رسول اللہ! ہم اللہ سے حیا کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ نہیں جتنا تم سمجھتے ہو بلکہ آپ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ وَلٰکِنَّ الْاِسْتَحْیَاءَ مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَیَاءِ اَنْ تَحْفَظَ الرَّاْسَ وَمَاوَعٰی وَالْبَطْنَ وَمَا حَوٰی وَ تَذْکُرَ الْمَوْتَ وَالْبِلٰی وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ تَرَکَ زِیْنَةَ الدُّنْیَا وَاٰثَرَ الْاٰخِرَةَ عَلَی الْاُوْلٰی فَمَنْ فَعَلَ ذَالِکَ فَقَدِ اسْتَحْیٰی مِنَ اللّٰهِ الْحَیَاءَ (ترمذی) بلکہ اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا حق یہ ہے کہ سر اور سر میں جو خیالات ہیں ان سب کی نگہداشت کرو اور پیٹ کی اور جو کچھ اس میں بھرا ہوا ہے سب کی نگہداشت کرو اور موت اور موت کے بعد قبر میں جو حالت ہوتی ہے اس کو یاد کرو جو شخص آخرت کو اپنی منزل قرار دے دنیا کی زینت کو چھوڑ دے اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دے۔ پس جس نے یہ کیا پس اس نے اللہ سے حیا کرنے کا حق ادا کیا۔

رسول کریم ﷺ نے حیا کی وضاحت فرما دی کہ حیا دماغ کو برے خیالات اور پیٹ کو حرام خوری سے پاک رکھنے، آخرت کو دنیاوی زندگی پر ترجیح دینے کا نام ہے۔

عملی اعتبار سے حیاء کے تین شعبے ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ سے حیاء

۲۔ لوگوں سے حیاء

۳۔ اپنے نفس سے حیاء

اللہ تعالیٰ سے حیاء کا مطلب یہ ہے کہ احکام ربانی کو توڑا نہ جائے۔ لوگوں سے حیاء کا یہ مطلب ہے کہ حقوق العباد کو ادا کیا جائے اور اپنے نفس سے حیاء کا مطلب یہ ہے کہ حقوق النفس ادا کیے جائیں۔

احسان

احسان، حسن سے مشتق ہے جس کے معنی خوبی اور رعنائی کے ہیں اسلام میں لفظ احسان حقوق اللہ اور حقوق العباد کو نہایت ہی خوبصورتی اور رعنائی کے ساتھ ادا کرنے پر بولا جاتا ہے۔

رسول کریم ﷺ نے احسان کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا۔ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ (مسلم) احسان یہ ہے تو اللہ کی عبادت کرے گویا تو اسے دیکھتا ہے اگر تو نہیں اسے دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

اس حدیث میں عبادت کے معنی میں احسان کو استعمال کیا گیا ہے اسلام میں عبادت صرف نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج ادا کرنے کا نام ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے کامل فرمانبرداری کرنے کا نام ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ اس سے زیادہ خوبصورت دین کس کا ہوگا جس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا اور وہی محسن ہے۔

اس آیت میں اسلام کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے والے کو محسن کہا گیا ہے۔ جب یہ لفظ انسانوں کے لیے استعمال ہوگا تو اس سے مراد ہر وہ نیکی ہے جو شرعاً بنی نوع انسان سے کی جاتی ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى (نحل ۱۶:۹۰) اللہ تعالیٰ انصاف کا اور احسان کرنے کا اور قریبی رشتہ داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (قصص ۲۸:۷۷) اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا تو بھی دوسروں کے ساتھ احسان کر۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (توبہ ۹:۱۲۰) بے شک اللہ احسان کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے الفاظ قرآن مجید میں بیان کیے ہیں۔ وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْۤ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ (یوسف ۱۲:۱۰۰) اور اس (خدا) نے مجھ پر احسان کیا جب مجھے قید خانہ سے نکالا اور تمھیں بادیہ یا (گاؤں) سے لے آیا۔

قرض اور واجبات کی ادائیگی کو اچھے طریقے سے ادا کرنے پر بھی لفظ احسان استعمال ہوا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ (بقرہ ۲:۱۷۸) مگر جس کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دی گئی ہے تو عمدگی سے پیروی کرنی چاہیے اور نیکی کے ساتھ ادا کیا جائے۔

قصور واروں کے قصور کو خوش دلی سے معاف کرنے اور کسی کمزور پر سے غصہ پی جانے والے پر لفظ محسن استعمال کیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران ۳:۱۳۴) جو لوگ خوش حالی اور تنگ دستی میں خرچ کرتے ہیں اور غصے کو دبا لینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (توبہ ۹:۱۲۰) بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں۔

بلکہ یہ بھی فرمایا احسان کا بدلہ احسان کی شکل میں ملے گا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (رحمان ۵۵:۶۰) بھلائی کا بدلہ سوائے بھلائی کے کچھ نہیں۔

اہمیت از روئے حدیث

رسول کریم ﷺ فرمایا اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ (البیہقی فی شعب الایمان) ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے پس اللہ کو اپنی مخلوق میں زیادہ محبت ان سے ہے جو اس کے کنبے (مخلوق) کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرتے ہیں۔

لَا تَكُوْنُوْا اِمَّعَةً تَقُوْلُوْنَ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَحْسَنَّا وَاِنْ ظَلَمُوْا ظَلَمْنَا وَلٰكِنْ وَطِّنُوْا اَنْفُسَكُمْ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَنْ تُحْسِنُوْا وَاِنْ اَسَاءُوْا فَلَا تَظْلِمُوْا (ترمذی باب ماجاء فی الاحسان والعفو) تم دوسروں کو دیکھا دیکھی کام کرنے والے نہ ہو جائے کہ تم یہ کہو کہ اگر دوسرے لوگ احسان کریں گے تو ہم

بھی احسان کریں گے اور اگر دوسرے لوگ ظلم کا راستہ اختیار کریں گے تو ہم بھی ویسا کریں گے لیکن یہ مصمم ارادہ کر لو کہ اگر اور لوگ احسان کریں تب بھی تم احسان کرو اور اگر وہ برا سلوک کریں تو تم ظلم نہیں کرو گے (بلکہ احسان ہی کرو گے)

معاشرے کے گرے ہوئے محتاج لوگوں سے بھلائی کرنے والے کے متعلق رسول کریم ﷺ کا فرمان ہے۔ السَّاعِي عَلَى الأَرْمَلَةِ وَالمِسْكِينِ كَالسَّاعِي فِي سَبِيلِ اللهِ وَاحْسِبُهُ قَالَ كَالقَائِمِ لَا يَفْتُرُ وَكَالصَّائِمِ لَا يُفْطِرُ (بخاری ومسلم) جو شخص بیوہ اور مسکین کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتا ہو۔ وہ اس مجاہد کی طرح ہے جو اللہ کی راہ میں دوڑ دھوپ کرتا ہے راوی کہتا ہے میرا خیال ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا اس شب بیدار شخص کی طرح ہے جو رات کو اللہ کے حضور کھڑا ہوتا ہے اور تھکتا نہ ہو اور اس روزے دار کی طرح ہے جو بے روزہ نہیں رہتا۔

اسی طرح امت کے محتاجوں کی ضرورت کو پورا کرنے والے کے متعلق فرمایا۔ مَنْ قَضَى لِاَحَدٍ مِنْ اُمَّتِي حَاجَةً يُرِيْدُ اَنْ يَسُرَّهُ بِهَا فَقَدْ سَرَّنِي وَمَنْ سَرَّنِي فَقَدْ سَرَّ اللهَ وَمَنْ سَرَّ اللهَ اَدْخَلَهُ الجَنَّةَ (البیہقی فی شعیب الایمان) جس کسی نے میرے کسی امتی کی حاجت پوری کر دی اس کو خوش کرنے کے لیے تو اس نے مجھے خوش کیا اور جس نے مجھے خوش کیا اس نے میرے اللہ کو خوش کیا اور جس نے اللہ کو خوش کیا اللہ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا۔

احسان کے تقاضے:

احسان جتانا نہیں چاہیے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالمَنِّ وَالاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاءَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (بقرہ ۲:۲۶۴) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر باطل نہ کرو۔ اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتا۔

اس آیت میں تین تقاضے بیان کیے ہیں۔

۱۔ احسان جتانا نہیں چاہیے۔ ۲۔ تکلیف دینی نہیں چاہیے۔ ۳۔ احسان دکھاوے کے لیے نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس سے مقصود محض رضائے الٰہی ہو۔

زیادہ معاوضہ کی نیت سے احسان نہیں کرنا چاہیے

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (المدثر ۷۴:۶) اور کسی کو اس غرض سے مت دو کہ دوسرے وقت زیادہ معاوضہ ہی ہو۔

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ احسان زیادہ معاوضہ کی نیت سے نہیں کرنا چاہیے بلکہ نیکی اور بھلائی خلوص نیت اور رضا الٰہی کے واسطے ہو۔

بلا درخواست احسان کرنا چاہیے

قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰى اِذْ اَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّكَ مَا يُوْحٰى (طٰہٰ ۲۰:۳۶، ۳۷) اور یقیناً ہم نے تجھ سے ایک بار (پہلے بھی) احسان کیا جب ہم نے تیری ماں کی طرف وحی کی جو (اب) وحی کی جاتی ہے۔

اس آیت کریمہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس پر اس کی خواہش اور درخواست کے بغیر احسان کیا گیا۔ اس میں بنی نوع انسان کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ احسان بلا درخواست ہی کرنا چاہیے۔

احسان صرف اپنوں اور دوستوں پر نہیں ہونا چاہیے بلکہ بے مروت اور دشمنوں کے ساتھ بھی ہونا چاہیے۔

رسول کریم ﷺ سے ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! میں ایک شخص کے پاس سے گزرتا ہوں وہ میری مہمانی نہیں کرتا۔ جب وہ میرے پاس آئے تو میں بھی اس کی کج خلقی کا بدلہ یہی دوں؟ تو آپ نے فرمایا "نہیں تم اس کی مہمانی کرو۔" (جامع ترمذی)

رسول کریم ﷺ کا اپنا ایک نمونہ ہے کہ فتح مکہ کے دن ان تمام مخالفین کو معاف کر دیا جس کے ظلم وستم سے بے کس و بے بس اور نہتے مسلمانوں کا خون زمین پر گرا۔ اس سے بڑھ کر احسان کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اسلام نے اگر احسان کرنے والوں پر کچھ اخلاقی پابندیاں عائد کی ہیں۔ جن کا پورا کرنا ضروری ہے تو دوسری طرف ان لوگوں پر کچھ پابندیاں عائد کر دی ہیں جن پر احسان کیا جاتا ہے۔

احسان یاد رکھنے کا حکم: قرآن مجید میں آتا ہے۔ يٰبَنِيْ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (بقرہ ۲:۴۰) اے بنی اسرائیل میری نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمہیں عطا کی اور میرے عہد کو پورا کرو۔ میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا اور مجھ سے ہی ڈرو۔

محسن کا احسان ماننا: قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَ غَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (یوسف ۱۲:۲۲) اور (حضرت یوسف علیہ السلام) جس گھر میں تھا اس نے اسے اپنے ارادہ سے پھیرنا چاہا اور دروازے بند کر لیے اور کہا ادھر آؤ اس نے کہا اللہ کی پناہ چاہتا ہوں وہ (ترا خاوند) میرا مربی اور محسن ہے اس نے مجھے کیسی اچھی طرح رکھا ایسا احسان فراموش کامیاب نہیں ہوتا۔

رسول کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر کا احسان مانتے ہوئے فرمایا کہ ابوبکرؓ کے احسان کا بدلہ اللہ ہی قیامت کو دے گا۔

احسان کا بدلہ احسان: احسان ادا کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اگر کوئی احسان کرے تو اس کے ساتھ بھی نیکی کرنا چاہے قرآن مجید میں آتا ہے۔ هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ (الرحمٰن ۵۵:۶۰) احسان کا بدلہ احسان ہے۔

رسول کریم ﷺ کی عادت تھی کہ اگر کسی سے قرضہ لیا ہے تو واپسی کے وقت اس کی اصل رقم سے کچھ زیادہ دیتے۔ اگر کوئی آپ کو ہدیہ دیتا تو اس سے بہتر تحفہ دیتے۔ احسان کی یہ شکل فضل کہلاتی ہے۔

احصان (پاک دامنی)

احصان سے مراد پاک دامنی ہے جو مرد اور عورت کی قوت شہوت سے تعلق رکھتی ہے محصن یا محصنہ اس مرد یا عورت کو کہا جاتا ہے جو بدکاری اور اس کے مقدمات سے اجتناب کر کے پاک بازی سے زندگی بسر کرے۔

قرآن مجید اور احادیث میں احصان (پاک دامنی) بہت زور دیا گیا ہے۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ (المومنون ۲۳:۵) اور وہ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا (نور۲۴:۳۳) چاہیے کہ وہ لوگ جن کو نکاح کا موقع میسر نہیں آتا وہ اپنے آپ کو (بدکاری) سے بچائے رکھیں۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (معارج ۷۰:۲۹) اور اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہیں۔

وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ (احزاب ۳۳:۳۵) اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۳۲) اور زنا کے قریب مت جاؤ کیونکہ وہ بے حیائی کی بات ہے اور بری راہ ہے۔

لَا يَزْنِي الزَّانِي حِيْنَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَسْرِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَنْتَهِبُ نُهْبَةً يَرْفَعُ النَّاسُ اِلَيْهِ فِيْهَا اَبْصَارَهُمْ حِيْنَ يَنْتَهِبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ (بخاری کتاب الحدود) زانی جس وقت زنا کرتا ہے وہ مومن نہیں ہوتا اور جو شراب پیتا ہے جس وقت شراب پیتا ہے وہ مومن نہیں ہوتا اور جو چوری کرتا ہے جس وقت چوری کرتا وہ مومن نہیں ہوتا اور جو مال لوٹتا ہے جس وقت مال لوٹتا ہے یہ لوگ اس کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھتے ہیں وہ مومن نہیں ہوتا۔

پاک دامن رہنے کے لیے پانچ علاج

غض بصر: یعنی اپنی نظر کو محرم پر ڈالنے سے بچانا، قرآن مجید میں آتا ہے۔ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (النور۲۴:۳۰) مومنوں کو کہہ دو کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں۔ وہ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے اللہ اس سے باخبر ہے جو وہ کرتے ہیں۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (النور۲۴:۳۱) مومن عورتوں کو کہہ دے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔

پردہ: قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ (نور۲۴:۳۱) اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو عادتاً کھلا رہتا ہے اور چاہیے کہ وہ اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال رکھیں۔

نکاح: ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (النساء۴:۲۵) اور جو شخص تم میں سے یہ طاقت نہ رکھتا ہو کہ آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرے تو تمہاری ان مومن لونڈیوں سے نکاح کرے جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ (النور۲۴:۳۲) جو تم میں سے مجرد ہیں ان کے نکاح کرو۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ مَنِ اسْتَطَاعَ الْبَآءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَاِنَّهٗ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَاَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَاِنَّهٗ لَهٗ وِجَآءٌ (بخاری، کتاب الصوم) تم میں سے جو نکاح کی طاقت رکھتا ہے تو نکاح کرے کیونکہ وہ نظر کو نیچے رکھنے کا ذریعہ ہے اور پاکدامنی کا موجب ہے جسے طاقت نہیں تو وہ روزہ اس کے لیے انقطاع شہوت کا سبب ہے۔

کسی کے گھر بغیر اجازت نہ جانا: کسی کے گھر جانا ہو تو اجازت سے پہلے پردہ اٹھا کر اس کے اندر جھانکنا نہیں چاہیے۔
ارشاد الٰہی ہے۔ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا (النور۲۴:۲۷) اپنے گھروں کے سوائے دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو یہاں تک کہ اجازت لے لو اور اس کے رہنے والوں پر سلام کرو۔

عورت تیز خوشبو لگا کر باہر نہ نکلے: اسلام نے عورت کو تیز خوشبو لگا کر باہر نکلنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ تیز خوشبو لگانے کی وجہ سے عورت لوگوں کی نظر کا نشانہ بن جاتی ہے۔ (ابوداؤد کتاب الترجل باب فی المراۃ تطیب للخروج)

بعض مذاہب نے پاک دامنی کا علاج رہبانیت قرار دیا ہے۔ یہ علاج غیر فطری ہے۔ اسلام نے رہبانیت سے منع فرمایا ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (حدید ۵۷:۲۷) (بعض مذاہب نے) رہبانیت کا طریقہ خود ایجاد کیا ہے ہم نے اسے ان پر لازم نہیں کیا۔ مگر اللہ کی رضا کو حاصل کرنے کے لیے (نکالی) پر اس کی وہ نگہداشت نہ کر سکے جو اس کی نگہداشت کا حق تھا۔
رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ یعنی اسلام میں ترک دینا جائز نہیں۔

امانت داری و دیانت داری

امانت کا لفظ جامع ہے تمام امانتوں کے لیے جو خدا تعالیٰ نے یا معاشرے یا افراد نے کسی شخص کو سپرد کی ہوں۔
قرآن مجید اور احادیث میں امانت اور دیانت کو اختیار کرنے کی تاکید کی ہے۔

اہمیت از روئے قرآن مجید: وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (مومنون ۲۳:۸) وہ اپنی امانتوں اور وعدہ کا پاس رکھتے ہیں۔
فَلْیُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ (بقرہ ۲:۲۸۳) پس جو امین بنایا گیا ہے اس کو چاہیے کہ اپنی امانت ادا کر دے اور چاہیے کہ وہ اپنے پروردگار سے ڈرے۔
اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا (النساء ۴:۵۸) اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے اہل کی طرف لوٹا دو۔
وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (انفال ۸:۲۷) اور اپنی امانتوں میں خیانت نہ کرو حالانکہ تم جانتے ہو۔
امانت دار ہونا رسولوں کا وصف ہے ارشاد الٰہی ہے۔ یٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ (قصص ۲۸:۲۶) اے میرے باپ اسے نوکر رکھ لیجیے بہترین نوکر جو آپ رکھنا چاہتے ہیں مضبوط امین ہے۔ امین کا لفظ حضرت موسیٰ کا وصف بیان کیا گیا ہے۔
اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ (شعراء ۲۶:۱۲۵) میں تمھارے لیے رسول امین ہوں اس آیت کریمہ میں حضرت شعیب نے اس لحاظ سے اپنے آپ کو امین کہا ہے کہ جو اللہ کی طرف سے ان پر نازل ہوتا تھا۔ وہ بے کم و کاست اپنی قوم تک پہنچا دیتے تھے۔

اہمیت از روئے حدیث: لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ (کنز العمال ج ۲ ص ۱۱۵ البیہقی فی شعب الایمان) جو امانت دار نہیں اس کا ایمان نہیں رسول کریم ﷺ نے صحابہ کرام سے چھ باتوں کے بدلے جنت کے حصول کا وعدہ فرمایا اور فرمایا جو ان چھ باتوں کی ضمانت دے گا میں اس کو جنت کی بشارت دیتا ہوں۔ ان چھ چیزوں میں سے ایک امانت داری ہے آپ ﷺ نے فرمایا۔ وَاَدُّوْا اِذَا ائْتُمِنْتُمْ (احمد بن حنبل البیہقی فی شعب الایمان) جب تمھارے پاس امانت رکھی جائے تو اس کو ادا کرو۔ ایک دفعہ رسول کریم ﷺ نے وضو کیا تو آپ کے صحابہ وضو کا پانی لے لے کر اپنے چہروں اور جسموں پر ملنے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا ''تم کو کس چیز نے اس فعل پر آمادہ کیا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا ''اللہ اور اس کے رسول کی محبت نے'' صحابہ کا جواب سن کر آپ ﷺ نے فرمایا ''جس شخص کو یہ خوشی ہو اور وہ یہ پسند کرے کہ اس کو اللہ اور رسول سے محبت ہو یا یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کریں تو اسے چاہیے۔ فَلْیَصْدُقْ حَدِیْثَهٗ اِذَا حَدَّثَ وَلْیُؤَدِّ اَمَانَتَهٗ اِذَا ائْتُمِنَ وَلْیُحْسِنْ جِوَارَ مَنْ جَاوَرَهٗ (البیہقی فی شعب الایمان) جب وہ بات کرے تو سچ بولے اور جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو ادا کرے۔ جس کے پڑوس میں اس کا رہنا ہو اس کے ساتھ بہتر سلوک کرے۔
رسول کریم ﷺ دیانت دار تاجر کے متعلق فرماتے ہیں۔ اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَاءِ (ترمذی دار القطنی) سچا اور امانت دار سوداگر نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔
رسول کریم ﷺ نے خائن کو منافق قرار دیا ہے۔ فرمایا اٰیَةُ الْمُنَافِقِ ثَلٰثٌ اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ (بخاری و مسلم) منافق کی تین نشانیاں ہیں جب بات کرے تو جھوٹ بولے وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب اس کے پاس کوئی چیز امانت کے طور پر رکھی جائے تو خیانت کرے۔
رسول کریم ﷺ نے صرف لین دین کے معاملہ میں ہی لفظ ''امانت'' کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ لفظ امانت کو وسعت بھی دی ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی سے مشورہ طلب کرتا ہے جس سے مشورہ طلب کیا جا رہا ہے وہ اس بات کا امین ہے کہ وہ مشورہ حتی المقدور صحیح دے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ المستشار موتمن (ادب المفرد بخاری) جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امین ہے۔
اسی طرح آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق مجالس کی باتیں بھی امانت ہیں یعنی حاضرین مجلس کے لیے ضروری ہے اس قسم کی مجلسی باتیں جن کا پردہ راز میں رکھا جانا ضروری ہے ان کو ظاہر نہ کرے۔ آپ نے فرمایا۔ اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ (ابوداؤد) نشستیں امانت کے ساتھ ہیں۔

لیکن معاشرہ کو فتنہ اور فساد سے بچانے کے لیے تین باتوں سے مستثنٰی بھی قرار دیا ہے وہ ہے کسی کے ناحق قتل کی یا کسی کی آبرو ریزی کی یا کسی کا مال ناجائز طور پر لینے کی سازش ہو تو متعلقہ لوگوں کو آگاہ کر دینا چاہیے۔

اس طرح کسی کا راز افشا کرنا بھی امانت کے خلاف ہے۔ میاں بیوی کے درمیان پردہ کی باتیں ہوتی ہیں وہ بھی ایسے راز ہیں جن کا اظہار امانت کے خلاف ہے۔ رسول کریم ﷺ نے لفظ امانت کے دائرے کو مزید وسیع کرتے ہوئے ان عورتوں کو جن کو ایک شخص عقد نکاح میں لاتا ہے ان کو بھی امانت کہا ہے حجتہ الوداع کے خطبہ میں فرمایا ''عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ فرمایا کیونکہ تم ان کو اللہ کی امانت اور عہد کے ساتھ اپنی زوجیت میں لائے ہو۔
(صحیح مسلم حجتہ الوداع)

رسول کریم ﷺ نے امانت کے جاتے رہنے کو امت کے زوال کی نشانی بیان کیا ہے فرمایا کہ ''سب سے پہلے اس امت سے امانت جاتی رہے گی۔''
(کنز العمال ج ۲ ص ۱۵)

حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کے زوال کا سبب امانت کا ضیاع ہے۔ جب کسی قوم سے یہ جوہر ختم ہو جائے تو وہ قوم ادبار کی گہرائیوں میں گر جاتی ہے جیسا کہ مذکورہ مضمون میں یہ نشان دہی کی گئی ہے کہ امانت کا لفظ اپنے اندر وسیع مفہوم لیے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار استعدادیں عطا کی ہوئی ہیں اگر کوئی شخص ان استعدادوں کو اجاگر نہیں کرتا تو وہ خائن ہے۔ کسی قوم کے افراد کا اپنی طبعی استعدادوں کو کام میں نہ لانا ہی تنزل کا باعث ہے مثلاً اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عقل کے نور سے نوازا ہے۔ جب کوئی شخص اس عقل سے کام نہیں لے گا وہ شخص صرف اپنی ذات کو ہی نقصان نہیں پہنچا رہا بلکہ اپنی قوم کو بھی تنزل کے راستہ پر ڈال رہا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اسی طرح اللہ تعالیٰ کی بے شمار عطا کردہ مخفی استعدادیں ہیں ان کا اجاگر کرنا ہر شخص پر فرض ہے۔ اگر اجاگر نہیں کرتا تو وہ خائن ہے اور قوم کی جڑوں پر تبر رکھ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انسان کی ان استعدادوں پر لفظ امانت استعمال کیا ہے جو اس کو عطا کی گئی ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (احزاب ۳۳:۷۲) ہم نے امانت آسمانوں اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا ہے بلاشبہ وہ ظالم اور نادان ہے۔

اس آیت کریمہ میں لفظ امانت ان مخفی استعدادوں پر استعمال ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے خصوصاً انسان کو دی ہیں ان استعدادوں کی وجہ سے ہی کائنات کا مخدوم ہے۔ ان کی نشوونما پر انسان کی ذاتی ترقی وابستہ ہے جب کوئی بحیثیت قوم ان استعدادوں کی اعلیٰ طور پر آب یاری کرتی ہے تو وہ قوم ترقی کے راستہ پر گامزن ہو جاتی ہے۔ ان استعدادوں کی اعلیٰ طور پر نشوونما دراصل امانت کا ادا کرنا ہے جو شخص ان استعدادوں کی نشوونما نہیں کرتا تو وہ خائن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی ترقی کے لیے اس کو استعدادیں دی ہیں لیکن وہ کماحقہ ان سے کام نہیں لے رہا۔ مذکورہ مضمون سے یہ واضح ہو جاتا ہے لفظ امانت اپنے اندر وسیع مفہوم لیے ہوئے جو فرائض منصبی ادا نہیں کرتا وہ بھی خائن ہے۔ اس لحاظ سے امانت داری بہت اہم خلق ہے۔

ایفائے عہد

کسی سے جو وعدہ کیا جائے کسی سے معاہدہ کیا جائے اس کو پورا کرنے کا نام ایفائے عہد ہے۔ گویا زبان اور عمل کی سچائی کا نام ہے کیونکہ زبان سے عہد کیا جاتا ہے اور اپنے عمل سے اس کو پورا کیا جاتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے جب ایک قوم دنیوی ترقی کے معراج تک پہنچ جاتی ہے تو پھر اسے امانت اور عہد کی کوئی پرواہ نہیں رہتی اس لیے کہ وہ طاقت ور ہے جو چاہے کرسکتی ہے حقیقت یہ ہے کہ بددیانتی اور عدم ایفا عہد کی وجہ سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا رعب جاتا رہتا ہے۔ رعب کے بغیر کوئی مادی قوت کچھ کام نہیں آتی۔ اس طرح تمدن کی بنیاد پابندی معاہدہ پر ہے قوموں کے عدم ایفائے عہد کی وجہ سے دنیا میں فساد اور بگاڑ پیدا ہوتا ہے اس وجہ سے دنیا میں امن قائم رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایفائے عہد پر بہت زور دیا ہے۔

ارشاد الٰہی اہمیت از روئے قرآن مجید: وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (المومنون ۲۳:۸) اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں۔

اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۳۴) اور عہد پورا کرو کیونکہ ہر عہد کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (المائدہ ۵:۱) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اقراروں (عہدوں) کو پورا کرو۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْكِیْدِهَا (النحل ۱۶:۹۱) اور اللہ کے عہد کو پورا کرو جب تم عہد کرلو۔ قسموں کو پکا ہونے کے بعد مت توڑو۔

اللہ تعالیٰ اپنے متعلق خود فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ (رعد ۱۳:۳۱) بے شک اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

وَعْدَ اللّٰهِ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ (روم ۳۰:۶) اللہ کا وعدہ ہے اللہ اپنے وعدہ کا خلاف نہیں کرتا۔

قرآن مجید میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا یہ وصف خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔

وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِسْمٰعِیْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا (مریم ۱۹:۵۴) اور یاد کر کتاب (قرآن) میں (حضرت) اسماعیل کا ذکر یقیناً وہ وعدہ کا سچا تھا اور خدا کا رسول اور نبی تھا۔

اہمیت از روئے حدیث: لَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ (احمد، طبرانی، ابن حبان) جس میں عہد نہیں اس میں دین نہیں۔

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَمَار اَخَاکَ وَلَا تَمَاحَهٗ وَلَا تعدهٗ مَوْعِدَةً فَتَخْلُفَهٗ (ترمذی) حضرت ابن عباس حضرت نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اپنے بھائی سے جھگڑا مت کرو اور نہ اس سے ٹھٹھا کرو اور نہ اس سے کوئی وعدہ کرو جس کو پورا نہ کرسکو۔

عَنْ اَبِی جَرِی الْهَجْمِی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَوْعِدْ اَخَاکَ مَوْعِدًا فَتَخْلُفَهٗ (مسلم) حضرت ابوجری ھجمی سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے بھائی کے ساتھ ایسا وعدہ نہ کر جسے تو پورا نہ کرے۔

عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِكُلِّ غَادِرٍ لوءٌ یوم الْقِیَامَةِ یُعْرَفُ بِهَا (بخاری) حضرت انس سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہر عہد شکن کے لیے قیامت کے دن ایک نشان (جھنڈا) ہوگا جس سے وہ پہچانا جائے گا۔

عَنْ اَبِی سَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ یَوْمَ الْقِیَامَةِ یُرْفَعُ لَهٗ بِقَدْرِ غَدْرِ وَلَا غَادِر اَعْظَمُ مِنْ اَمِیْرِ عَامَةٍ (مسلم) حضرت ابوسعید سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہر ایک وعدہ شکن کے لیے قیامت کے دن ایک نشان (جھنڈا) ہوگا جو اس کی وعدہ شکنی کی مقدار کے مطابق بلند کیا جائے گا یاد رکھو سب سے بڑا وعدہ شکن وہ شخص ہے جو قوم کا سردار ہو کر وعدہ شکنی کرے۔

عَنْ ابن عباسٍ اِنَّهٗ قَالَ وَلَا خطرَ قَوْمٌ بِالْعَهْدِ اِلَّا سَلَّطَ عَلَیْهِمُ الْعَدو (موطا امام محمد باب السیر) حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ جب

کسی قوم کو وعدہ خلافی کی عادت ہو جائے تو اس پر دشمن کو مسلط کر دیا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں وعدہ خلافی کو منافقت کی ایک نشانی قرار دیا ہے فرمایا۔ اٰيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ (بخاری و مسلم) منافق کی تین نشانیاں ہیں جب بات کرے تو جھوٹ بولے وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب اس کو کسی چیز کا امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔

فرمایا۔ اَلْعِدَةُ دَيْنٌ (الطبرانی فی الاوسط) وعدہ بھی ایک طرح کا قرض ہے (اس کو ادا کرنا چاہیے)

اسوۂ حسنہ: جب ہرقل قیصر روم نے ابوسفیان سے پوچھا کیا مدعی نبوت عہد شکنی کرتا ہے۔ تو ابوسفیان نے جواب دیا نہیں۔

ابو رافع کا بیان ہے کہ قریش نے مجھے رسول کریم ﷺ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا جب میں آپ کے پاس گیا اور آپ کا نورانی چہرہ دیکھا تو اسلام کی صداقت میرے دل میں جاگزین ہو گئی میں نے عرض کیا "یارسول اللہ! میں کبھی قریش کے پاس نہیں جاؤں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا "میں عہد شکنی نہیں کرتا اور نہ قاصدوں کو اپنے پاس روکتا ہوں تم اب واپس لوٹ جاؤ۔ اگر وہاں بھی تمھارے قلب میں صداقت اسلام رہی تو واپس آ جانا۔ ابو رافع کا قول ہے کہ میں چلا گیا پھر آپ کے پاس حاضر ہو کر ایمان لایا۔ (ابوداؤد)

صلح حدیبیہ میں ایک شرط یہ تھی کہ مکہ سے جو مسلمان ہو کر مدینہ جائے گا وہ اہل مکہ کے مطالبہ پر واپس کر دیا جائے گا اس وقت جبکہ معاہدہ کی شرائط زیر تحریر تھیں تو ابوجندل بیڑیوں میں جکڑا ہوا آپ ﷺ کے پاس پہنچ گیا صحابہ ابوجندل کی اس بے بسی اور مظلومیت کی حالت دیکھ کر تڑپ اٹھے لیکن حضرت رسول کریم ﷺ نے ابوجندل کو صبر سے تکلیف برداشت کرنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا بدعہدی نہیں کر سکتے اللہ تعالیٰ تمھارے لیے کوئی راستہ کھول دے گا۔
(صحیح بخاری)

غزوہ بدر کے موقع پر حذیفہ بن الیمان اور ابوجمیل دو صحابی مکہ سے آ رہے تھے راستہ میں کفار نے ان کو روک لیا کہ محمد (ﷺ) کے پاس جا رہے ہیں۔ انھوں نے انکار کیا آخر اس شرط پر رہائی دی کہ وہ جنگ میں شریک نہ ہوں۔ جب وہ آپ کے پاس آئے تو ماجرا سنایا آپ نے فرمایا تم دونوں واپس جاؤ ہم بہرحال وعدہ پورا کریں گے ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے۔ (صحیح مسلم باب الوفا بالعہد)

صفوان بن امیہ آپ ﷺ کا شدید دشمن تھا۔ فتح مکہ ہوا تو وہ بھاگ کر یمن چلا گیا عمیر بن وہب نے حاضر خدمت ہو کر ماجرا سنایا تو آپ ﷺ نے امان کے طور پر عمامہ دیا۔ عمامہ لے کر صفوان کے پاس گیا اور کہا کہ بھاگنے کی ضرورت نہیں تم کو امان ہے جب بارگاہ نبوت میں حاضر ہوا تو عرض کیا۔ کیا آپ نے مجھے امان دی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں یہ سچ ہے۔

عدل و انصاف

عدل کے لغوی معنی ہیں سیدھا کرنا، برابر کرنا توازن قائم کرنا، افراط و تفریط سے بچنا۔
امام راغب اصفہانی مفردات میں عدل کے یہ معنی کیے ہیں۔ کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دینا کہ ان دو میں سے کسی حصے میں ذرا بھی کمی بیشی نہ ہو۔
امام سید شریف عدل کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ ''عدل افراط اور تفریط کے درمیان ایک نقطہ مساوات ہے جو اطراف کو برابر رکھتا ہے اور حق پر آ کر رک جاتا ہے۔
داتا گنج بخش کشف المحجوب میں عدل کے یہ معنی لکھتے ہیں۔
''کسی چیز کو اس کے صحیح موقع اور محل پر رکھنا۔ اس کی ضد ظلم ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کو اس جگہ پر رکھنا جو اس کے لائق نہ ہو۔''

اہمیت از روئے قرآن مجید: عدل اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ جب یہ صفت اللہ کی طرف منسوب ہوگی تو اس کے یہ ہوں گے۔ ''اللہ کا فیصلہ حق ہوتا ہے'' ''وہ حق بات کہتا ہے'' ''وہ وہی کرتا ہے جو حق ہوتا ہے''۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاللّٰهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ (مومن ۴۰:۲۰) اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ (الاحزاب ۳۳:۴) اللہ حق بات کہتا ہے۔ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا (انعام ۶:۱۱۵) اور تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف کے ساتھ پوری ہوگی۔

قرآن مجید عدل قائم رکھنے پر بہت زور دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى (النحل ۱۶:۹۰) اور اللہ عدل و احسان کا اور قریبیوں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا وَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا (النساء ۴:۱۳۵) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو انصاف پر قائم ہونے والے اللہ کے لیے گواہی دینے والے رہو۔ گو معاملہ تمہاری اپنی ذات یا ماں باپ اور قریبیوں کے خلاف ہو۔ اگر کوئی امیر ہو یا غریب تو اللہ دونوں کا (تمہاری نسبت) زیادہ خیر خواہ ہے سو تم خواہش کی پیروی نہ کرو تا کہ عدل کر سکو۔

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (المائدہ ۵:۸) اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو انصاف کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔

کسی قوم کی دشمنی کی وجہ سے عدل و انصاف پر قائم رہنا بہت مشکل کام ہے خاص طور پر اس وقت جہاں اپنی ذات پر اثر پڑتا ہو بعض اوقات انسان ایک امیر آدمی کے لحاظ سے انصاف اور شہادت حقہ کو چھوڑ دیتا ہے تا کہ اس کو خوش کرے خاص طور پر اس وقت جب ایک حکمران جابر ہو۔ اس کے ہاتھ میں جور وظلم کا عصا ہو انصاف کے ترازو کو قائم رکھنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مصنف ایک غریب پر رحم کھا کر حق و انصاف کے تقاضوں کا خون کر دیتا ہے۔ فرمایا منصف دونوں کی پرواہ نہ کرے اللہ کا حق زیادہ ہے کہ خدا کی خاطر انصاف کیا جائے۔ عدل کی صفت سے انسان اسی وقت متصف ہوتا ہے جب انسان اپنی خواہشات کی پیروی نہ کرے اس کے سامنے صرف خدا کی رضا ہو۔

عدل زندگی کے ہر شعبہ میں ضروری ہے۔ معاشرتی زندگی کے لیے ارشاد الٰہی ہے۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (نساء ۴:۳) اگر تمہیں خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی یا جس کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے۔

عورتوں کی طرح یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت کے لیے عدل و انصاف کی ضرورت ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ (النساء ۴:۱۲۷) یہ کہ یتیموں کے معاملے میں انصاف پر قائم رہو۔

زندگی کے معاشی معاملات میں حق و انصاف کا قائم رکھنا قوموں کی ترقی اور معاشرتی امن کے لیے بہت ضروری ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ (انعام ۶:۱۵۳) اور ناپ تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو۔ عدالتی معاملات میں عدل و انصاف کی بہت ضرورت ہے اس انصاف سے حکومتیں مستحکم ہوتی ہیں اس کو ترک کرنے سے حکومتیں زوال پذیر ہوتی ہیں۔ تحریری دستاویز کے متعلق حکم ہے۔ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ (بقرہ

۲۸۱:۲) اور تمہارے درمیان لکھنے والا عدل کے ساتھ لکھے۔

فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَايَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ (بقرہ۲:۲۸۱) پھر اگر وہ شخص جس پر حق ہے کم عقل یا ضعیف ہو یا لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوائے۔

قومی دولت میں برابر کی شرکت: معیشت اس بات کا متقاضی ہے کہ ملک کے ہر فرد کو قومی دولت سے برابر کا استفادہ کرنے کا موقع میسر ہو اور ایسے اصول وضع کر دیے جائیں جن کی وجہ سے دولت چند ہاتھوں میں جمع نہ رہو۔

اسلام نے دنیا و مافیہا کی ہر چیز کو اللہ کی امانت قرار دیا ہے اس امانت کو انسان کے سپرد کر دیا ہے کہ وہ اس سے اللہ کے قانون کے تحت فائدہ اٹھائے اور ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِى الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ (الاعراف:۱۰) اور ہم نے تمھیں زمین میں آباد کیا اور اس میں تمھارے لیے معیشت کے سامان رکھ دیے۔ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمانوں اور زمینوں کے خزانے اللہ تعالیٰ کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان خزانوں سے ہر شخص کو فائدہ حاصل کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ۶۲:۱۰) جب نماز ختم ہو جائے تو خدا کے فضل (رزق) کی تلاش میں پھیل جاؤ۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ اِجْعَلُوْا فِىْ طَلَبِ الدُّنْيَا فَاِنَّ كُلًّا مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ (بخاری ومسلم) دنیا کی طلب اپنی صلاحیت کے مطابق کرو اس لیے کہ جس کے لیے آدمی پیدا کیا گیا وہ ضرور اسے ملے گا۔ ایک طرف اسلام نے معاشرہ کے تمام افراد کو روزی حاصل کرنے کے یکساں مواقع دیے ہیں تاکہ اقتصادی عدل و انصاف قائم رہے دوسری طرف ناجائز ذرائع سے دولت کمانے پر پابندی عائد کی ہے تاکہ دولت کے وسائل پر محدود چند افراد کی اجارہ داری نہ ہو جائے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کماؤ۔

اس آیت میں افراط باطل سے تمام ناجائز طریقوں سے دولت کمانے سے منع فرمایا۔

عدالتی نظام میں فیصلہ حقہ کے لیے گواہی بہت ضروری ہے ارشاد الٰہی ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ (مائدہ ۵:۸) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ان کے لیے کھڑے ہونے والے انصاف کی گواہی دینے والے ہو جاؤ۔

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (انعام ۶:۱۵۱) جب تم بات کہو تو عدل کرو اگرچہ قریبی ہو۔

شہادت یا فیصلہ اس وقت مشکل ہوتا ہے جب ایک فریق اپنا عزیز ہو یا کوئی فریق دشمن اور مخالف ہو۔ تو اس وقت فیصلہ کرتے ہوئے منصفوں کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں اسلام نے ہر حالت میں حق و انصاف کے ترازو کو قائم رکھنے کے لیے بہت زور دیا ہے۔ رسول کریم ﷺ کی زبان مبارک سے وحی الٰہی یہ کہلوائی ہے۔ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (اے یہودیو اور عیسائیو) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف فیصلہ کرو۔

اسی طرح یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں یہ حکم ہوا۔

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ (مائدہ ۵:۴۲) اگر تو فیصلہ کرے تو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر۔

دو شخصوں اور یا دو گروہوں میں مصالحت کرانا ایک عدالتی معاملہ ہے اس لیے ان میں عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (الحجرات ۴۹:۹) اور اگر مومنوں میں سے دو گروہ جنگ کریں تو ان میں صلح کرا دو۔ پس اگر ایک، دوسرے پر زیادتی کرتا ہو تو اس سے جنگ کرو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے۔ پس اگر وہ رجوع کرے ان کے درمیان عدل و انصاف سے صلح کرا دو اور انصاف کرو کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

ان تمام تصریحات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے جو عدل کا حکم دیا ہے وہ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔

اہمیت از روئے حدیث: رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔

"قیامت کے دن جن سات آدمیوں کو اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں جگہ دے گا۔ ان میں سے ایک عادل حکمران ہے۔ (بخاری کتاب المحاربین باب فضل عن ترک الفواحش)

فرمایا "اللہ کے نزدیک سب سے محبوب امام عادل اور سب سے مبغوض ظالم حکمران ہے۔ (مشکوٰۃ)

فرمایا جو امام اپنی رعایا پر انصاف سے حکومت کرتا ہے اس کا ایک دن ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ (مسند احمد)

فرمایا ''حاکم عادل کی دعا قبول ہوتی ہے اور وہ جنتی ہے۔(ترمذی)

فرمایا ''انصاف کرنے والے کے لیے دو اجر ہیں ایک اجر انصاف کرنے کا دوسرا فرض منصبی کی ادائیگی کا۔

اسوۂ حسنہ: آپ ﷺ عدالت کے اس ارفع مقام پر قائم تھے کہ دشمن اور دوست میں کوئی فرق نہ کرتے تھے ایک دفعہ خاندان مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی قریش کی عزت کے لحاظ سے لوگ چاہتے تھے کہ وہ سزا سے بچ جائے اور معاملہ دب جائے حضرت اسامہ بن زید کو رسول کریم ﷺ کے پاس سفارش کے لیے بھیجا آپ ﷺ نے غضب آلود ہو کر فرمایا کہ بنی اسرائیل اس کی بدولت تباہ ہوئی کہ وہ غرباء پر حد جاری کرتے اور امراء سے درگزر کرتے تھے۔(صحیح بخاری)

اپنی وفات سے چند روز پہلے آپ نے اعلان فرمایا اگر آپ کے ذمہ کسی کا کچھ آتا ہے تو طلب کر لے سبھی جماعت خاموش رہی ایک شخص نے چند درہم کا تقاضہ کیا تو فوراً وہ رقم ادا کر دی گئی۔(ابن اسحاق) ایک مرتبہ آپ ﷺ مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے ایک جماعت آپ کے گرد تھی۔ایک شخص نے اپنے بدن کا سارا بوجھ آپ ﷺ پر ڈال دیا آپ ﷺ نے پتلی چھڑی سے اسے ہٹا دیا لیکن چھڑی کی نوک سے اس کے چہرے پر خفیف سی خراش آ گئی آپ نے فوراً اس سے فرمایا مجھ سے انتقام لے سکتے ہیں اس نے کہا یا رسول اللہ! میں بطیب خاطر آپ کو معاف کیا۔(ابن داؤد)

عدل کے بہت سے مظاہر ہیں چند یہ ہیں۔

ا۔ اللہ کے ساتھ عدل یعنی اس کی عبادت اور اس کی صفات میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔اس کے احکام کی پیروی کی جائے اس کی نعمتوں اور عطایا پر شکر ادا کیا جائے۔

۲۔لوگوں کے فیصلہ میں انصاف یعنی حق والے کو اس کا حق ہو اور اس کی دادرسی کی جائے۔

۳۔ بیویوں اور اولاد میں عدل۔

۴۔قول میں عدل یعنی جھوٹ نہ بولا جائے۔

۵۔عقائد میں عدل یعنی حق کو قبول کیا جائے۔

شکر

شکر کے لغوی معنی یہ ہیں کہ جانور میں تھوڑا سا چارہ ملنے پر بھی تر و تازگی پوری موجود ہو، دودھ زیادہ دے۔

امام راغب کے نزدیک شکر کے معنی ہیں نعمت کا تصور اور اس کا اظہار اسلامی اصطلاح میں شکر سے مراد یہ ہے کہ کسی کی نیکی پر دل، زبان اور عمل سے پورا پورا اجر دیا جائے۔

عربی زبان میں شکر کے مقابل پر کفر کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ڈھانپنا اور چھپانا ہیں لیکن عام مفہوم میں کسی کی نیکی یا نعمت کی ناشکری پر بولا جاتا ہے۔ کفرانِ نعمت کا لفظ اردو میں عام مستعمل ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے بھی شکر کے مقابل میں کفر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاشْكُرُوْلِي وَلَا تَكْفُرُوْنِ تم میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔

شکر کی دو قسمیں ہیں۔ اللہ کا شکر، بندوں کا شکر۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِيْهَا سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا (الفرقان ۲۵: ۶۱، ۶۲) بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور اجالا کرنے والا چاند بنایا اور اس نے رات اور دن بنائے یکے بعد دیگرے آتے ہیں یہ سب نعمتیں ان لوگوں کے لیے ہیں جو یاد کرنا اور شکر کرنا چاہیں۔ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (نحل ۱۶: ۷۸) اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے باہر نکالا۔ جب کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تا کہ تم اس کا شکر ادا کرو۔

ارشاد الٰہی ہے۔ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا. (نساء ۴: ۱۴۷) اگر تم خدا کا شکر کرتے رہو اس پر ایمان لاؤ تو خدا تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا بلکہ خدا تو شکر گزاروں کا قدردان ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفت شاکر بیان کی ہے۔ ویسے تو ہر نبی شاکر ہوتا ہے لیکن قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام کا ایک وصف ''شاکر'' بیان کیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا (بنی اسرائیل ۱۷: ۳) تم ان کی نسل ہو جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا تھا وہ شکر گزار بندہ تھا۔

حضرت سلیمان نے جب اپنے کسی فوجی کو ملکہ کا تخت لانے کا حکم دیا تو وہ فوجی ملکہ کے پاس گیا تو ملکہ نے خود حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے تخت تحفہ کے طور پر پیش کر دیا جب وہ افسر حضرت سلیمان کے پاس تخت لے کر آیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا۔ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ (النمل ۲۷: ۴۰) یہ میرے رب کے فضل سے ہے کہ وہ مجھے آزمائے میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں اور جو کوئی شکر کرتا ہے وہ صرف اپنے فائدہ کے لیے ہی شکر کرتا ہے اور جو کوئی ناشکری کرتا ہے تو میرا رب بے نیاز بزرگی والا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمان کو حکمت کی نعمت سے نوازا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمان سے فرمایا۔ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (لقمن ۳۱: ۱۲) (یہ کہ تو اللہ کا شکر ادا کر اور جو کوئی شکر کرتا ہے وہ اپنی جان کی بھلائی کے لیے شکر کرتا ہے جو ناشکری کرتا ہے تو اللہ بے نیاز تعریف کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تو انسان کو شکر ادا کرنے کا تاکیدی حکم دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَنِ اشْكُرْلِيْ وَلِوَالِدَيْكَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ (لقمن ۳۱: ۱۴) کہ میرا شکر کر اور اپنے ماں باپ کا بھی میری ہی طرف تمہارا آنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شکر ادا کرنے کی خود ہی حکمت بیان کر دی۔ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ (ابراہیم ۱۴: ۷) اگر تم میرا شکر کرو گے تو میں اور زیادہ نعمتیں دوں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو یاد رکھو میرا عذاب بہت سخت ہے۔

شکر کی دوسری قسم بندوں کا شکر ہے۔ انسان مدنی الطبع ہے اس کو ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت ہے اس باہمی تعاون سے ہی معاشرہ صحیح خطوط پر چل سکتا ہے اس وجہ سے اس دنیا میں ہر انسان کی گردن کسی نہ کسی دوسرے انسان کے احسان کے جوا کے نیچے ہے اس لیے اس پر واجب ہے کہ وہ اپنے محسن

کے احسانات کا شکر ادا کرے رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ مَنْ لَا یَشْکُرُ النَّاسَ لَا یَشْکُرُ اللّٰهَ (ترمذی کتاب البر والصلۃ باب ماجاء فی الشکر) جو انسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ خدا کا شکر ادا نہیں کرتا۔

فرمایا۔ مَنْ اُعْطِیَ عَطَاءً فَوَجَدَ فَلْیَجْزِ بِهٖ فَاِنْ لَمْ یَجِدْ فَلْیُثْنِ بِهٖ فَمَنْ اَثْنٰی بِهٖ فَقَدْ شَکَرَهٗ وَمَنْ کَتَمَهٗ فَقَدْ کَفَرَهٗ (ابوداؤد باب فی شکر المعروف) جس شخص کو کوئی عطیہ دیا جائے اسے چاہیے اگر ہو سکے تو اس کا بدلہ دے اگر نہ ہو سکے تو دینے والے کی تعریف کرے کیونکہ تعریف کر دینے سے شکر گزاری کا حق ادا ہو جاتا ہے اور جو شخص یہ دونوں باتیں نہ کرے تو وہ کفران نعمت کا مرتکب ہے۔

فرمایا وَمَنْ صَنَعَ اِلَیْکُمْ مَعْرُوْفًا فَکَافِئُوْهُ فَاِنْ لَمْ تَجِدُوْا مَا تُکَافِئُوْا فَادْعُوْا لَهٗ حَتّٰی تَرَوْا اَنْ قَدْ کَافَأْتُمُوْهُ (ابوداؤد باب عطیۃ سال باللہ) اگر کوئی شخص تمہارے ساتھ احسان کرے تو تم بھی بدلے میں احسان کرو اور اگر نہ کر سکو تو اپنے محسن کے حق میں دعا کرو حتیٰ کہ تمہیں اطمینان ہو جائے کہ تم نے احسان کا بدلہ پورا کر دیا ہے۔

فرمایا مَنْ صُنِعَ اِلَیْهِ مَعْرُوْفٌ فَقَالَ لِفَاعِلِهٖ جَزَاکَ اللّٰهُ خَیْرًا فَقَدْ اَبْلَغَ فِی الثَّنَاءِ (ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی الثناء بالمعروف) جب کسی شخص پر احسان کیا جائے اور وہ اپنے محسن کو جزاک اللہ خیرا کہہ دے تو گویا اس نے اپنے محسن کی تعریف کا پورا حق ادا کر دیا۔

حضرت عمر نے رسول کریم ﷺ سے پوچھا ہم کون سا مال جمع کریں آپ ﷺ نے فرمایا "ذکر کرنے والی زبان اور شکر ادا کرنے والا دل۔" (احیاء العلوم الغزالی کتاب الشکر ص ۲۰)

شکر کے طریقے: اظہار شکر کے تین طریقے ہیں قلبی، قولی، عملی۔ قلبی شکر کا یہ مطلب ہے کہ محسن کی محبت انسان کے دل میں ہو قولی شکر سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے محسن کی نعمت کا زبان سے اقرار اور اس کی تعریف کرے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جس نے ثنا کی اس نے شکر ادا کیا اور جس نے نعمت کو چھپایا اس نے (ناشکری) کی۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ تو اپنے پروردگار کی نعمتوں کا ذکر کر۔

عملی شکر سے مراد یہ ہے کہ محسن نے جو نعمتیں انسان کو دی ہیں۔ اسی کی ہدایت اور رضا کے لیے استعمال کرے مثلاً اللہ تعالیٰ نے انسان کو آنکھ، کان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ دیے ہیں تو وہ ان اعضا کو غلط رنگ میں استعمال نہ کرے اگر کسی کو دولت سے نوازا ہے تو وہ اپنی دولت کو احکام الٰہی کے مطابق خرچ کرے۔

علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے شکر کو پانچ باتوں پر مبنی قرار دیا ہے۔

۱۔ محسن کے لیے فروتنی اور انکساری

۲۔ محسن سے محبت

۳۔ نعمت کا اعتراف

۴۔ نعمت کی بناء پر محسن کی تعریف

۵۔ اس نعمت کو محسن کی مرضی کے مطابق خرچ کرنا

یہ پانچ باتیں شکر گزاری کی بنیاد ہیں اگر ان میں سے ایک بھی ضائع ہو جائے تو شکر کے قواعد میں سے ایک قاعدہ ضائع ہو گیا۔

رسول کریم ﷺ کا اسوہ حسنہ موجود ہے کہ آپ ہر لحظہ اور ہر آن اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتے رہتے تھے رات کو عبادت الٰہی میں اتنا لمبا قیام کرتے کہ آپ کے پاؤں متورم ہو جاتے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں اس حالت کو دیکھ کر ایک دن میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی یا رسول اللہ! آپ کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے پھر آپ ﷺ اتنی محنت اور مشقت کیوں برداشت کرتے ہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَفَلَا اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ رسول کریم ﷺ قلبی قولی اور عملی شکر گزاری کے بعد بھی اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ (ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب فی الاستغفار) اے اللہ! مجھے اپنے ذکر اپنے شکر اور عبادت کی توفیق دے۔

سجدات شکر: رسول کریم ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کوئی خوشی کی خبر آتی تو آپ ﷺ سجدہ شکر بجا لاتے۔ (تاریخ الخطیب البغدادی جلد ۴ ص ۱۵۷)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لائے اور قبلہ رو ہو کر سجدے میں گر گئے اور بہت لمبا سجدہ کیا یہاں

تک کہ ہمیں گمان ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے شاید آپ ﷺ کی روح قبض کر لی ہے میں آپ ﷺ کے قریب ہوا تو آپ ﷺ اُٹھ بیٹھے اور پوچھا کون ہے؟ میں نے عرض کیا عبدالرحمٰن فرمایا کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ آپ نے اتنا لمبا سجدہ کیا کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح تو قبض نہیں کر لی آپ ﷺ نے فرمایا میرے پاس جبرئیل آئے تھے انھوں نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ اللہ تعالیٰ آپ کے حق میں فرماتا ہے کہ جو آپ ﷺ پر درود بھیجے گا میں اس پر اتنی رحمتیں نازل کروں گا اور جو آپ پر سلام بھیجے گا میں اس پر سلامتی بھیجوں گا۔ یہ سن کر میں اللہ تعالیٰ کے حضور سجدۂ شکر بجالایا ہوں۔

(مسند احمد جلد اص ۱۹۱ مطبوعہ بیروت)

جب فتح مکہ ہوا تو اس موقع پر آپ ﷺ اپنی اونٹنی پر بیٹھے تھے اور سر جھک کر بالوں کو چھو رہا تھا۔ آپ ﷺ سجدہ شکر بجالاتے ہوئے یہ دعا پڑھ رہے تھے "اے اللہ تو پاک ہے اپنی حمد اور تعریف کے ساتھ۔ (السیرۃ النبوۃ لابن ہشام جلد ۴ ص ۹۱ مطبوعہ بیروت)

عفو و درگزر

عفو سے مراد دوسرے کی خطا، غلطی اور زیادتی کو معاف کر دینا لیکن عیسائیوں کے معاف کرنے کی طرح نہیں کہ اگر کوئی آدمی ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی اس کے سامنے کر دیا جائے بلکہ اسلام میں عفو اس صورت میں مناسب ہے جب خاطی اپنی خطا اور غلطی پر نادم ہو اور اس کو معاف کر دینا اس کے لیے اصلاح کا موجب ہو۔

عام طور پر عفو صفح اور مغفرت کے معنوں میں بھی استعمال ہو جاتا ہے۔

اہمیت از روئے قرآن مجید: ارشاد الٰہی ہے۔ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا (نساء۴:۱۴۹) یا کسی برائی کو معاف کرو تو یقیناً اللہ معاف کرنے والا قدرت والا ہے۔ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (نور۲۴:۲۲) اور چاہیے کہ وہ معاف کریں اور درگزر کریں کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا تم کو معاف کر دے اور اللہ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (شوریٰ۴۲:۳۷) جب انھیں (مومنوں کو) غصہ آئے تو معاف کر دیتے ہیں۔

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (ال عمران۳:۱۳۴) جو غصہ کو دبا جاتے ہیں اور جو لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں ایسے نیکو کار لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ (الاعراف ۷:۱۹۹) (اے پیغمبر) تو درگزر کر اور (لوگوں کو) نیک کام کرنے کا حکم دے اور جاہلوں سے اعراض کر۔

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (بقرہ۲:۱۰۹) پس معاف کرو اور درگزر کرو یہاں تک کہ خدا اپنا حکم صادر فرما دے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاۗءَ فَعَلَيْهَا ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ (جاثیہ۴۵:۱۴،۱۵) ایمان والوں سے کہہ دے کہ ان کو جو اللہ کے جزا و سزا کے واقعات پر یقین نہیں رکھتے معاف کر دیا کریں تا کہ وہ ان لوگوں کو ان کے کاموں کا بدلہ دے۔ جس نے اچھا کام کیا اس نے اپنے لیے کیا اور جس نے برا کیا اس نے اپنے لیے برا کیا پھر تم اپنے پروردگار کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔

ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے۔ وَجَزٰۗؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (شوریٰ۴۲:۴۰) اور برائی کا بدلہ اتنی ہی برائی ہے اس پر بھی جو کوئی معاف کر دے اور صلح کرے تو اس کا اجر اللہ کے پاس ہے بے شک اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اہمیت از روئے حدیث: رسول کریم ﷺ نے فرمایا مَازَادَ اللّٰهُ عَبْدًا يَعْفُوْا اِلَّا عِزًّا (مسلم باب استحباب العفو ترمذی ابواب البر والصلة باب ماجاء فی التواضع) کوئی شخص کسی کا قصور معاف کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت بڑھاتا ہے۔ ترمذی میں عبداً کی جگہ رجلا کا لفظ آیا ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ لَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاحِشًا وَلَا مُتَفَحِّشًا وَلَا سَخَّابًا فِي الْاَسْوَاقِ وَلَا يَجْزِي بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ لكن يَعْفُوْا فَيَصْفَحُ (ترمذی) حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ بالطبع نہ فحش گو تھے نہ تکلف سے فحش کہنے والے تھے بازاروں میں چیختے نہ چلاتے تھے اور نہ برائی کا بدلہ برائی کے ساتھ دیتے تھے بلکہ معاف کرتے تھے اور درگزر فرماتے۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مُوْسٰى ابن عُمْرَ ان عَلَيْهِ السَّلَامُ يَا رَبِّ مَنْ اَعَزُّ عِبَادِكَ عِنْدَكَ قَالَ مَنْ اِذَا قَدَرَ غَفَرَ (بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ) حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خداوند کریم سے سوال کیا کہ اے میرے پروردگار تیرے نزدیک سب سے عزیز آدمی کون ہے خداوند کریم نے جواب دیا کہ وہ شخص جو انتقام پر قادر ہو اور معاف کر دے۔

عَنْ اَبِيْ عَبَّاسٍ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ قَالَ الصَّبْرُ عِنْدَ الْغَضَبِ وَالْعَفْوُ عِنْدَ الْغَضَبِ وَالْعَفْوُ عِنْدَ الاساء فَاِذَا فَعَلُوْا عَصَمَهُمُ اللّٰهُ وَخَضَعَ لَهُمْ عَدُوٌّ هُمْ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ قَرِيْبٌ (بخاری) حضرت ابن عباس قولہ تعالیٰ (ادفع بالتی ھِیَ احسن) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ

یہ اس طرح کہ غصے کے وقت صبر کیا جائے اور برائی کو معاف کیا جائے اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں۔ خدا ان کا نگہبان ہوتا ہے اور ان کے دشمن کو نیچا دکھاتا ہے اور اسے ایسا بنا دیتا ہے گویا وہ نہایت قریبی دوست ہے۔

عَنْ بُرَيْدَةِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم مَنْ لَمْ يَقْبَلْ عُذْرَ مُسْلِمٍ يَعْتَذِرُ اِلَيْهِ فَوِزْرُهٗ كَوِزْرِ صاحب مَكْسٍ فَقِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا صَاحِبُ مكس قَالَ عِشَارٌ (مسند امام اعظم کتاب الادب) حضرت بریدہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کا عذر قبول نہ کرے۔ اس کا گناہ صاحب مکس کے برابر ہے پوچھا گیا صاحب مکس کون ہوتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ عشر وصول کرنے والا جو رشوت لے۔

جنگ احد میں آپ کے دانت مبارک شہید ہو گئے روئے مبارک زخمی ہو گیا آپ گر گئے بعض صحابہ نے فرمایا یارسول اللہ ﷺ ان لوگوں پر جنہوں نے خدا کے رسول کو ستایا اور دکھ دیا بددعا کیجئے فرمایا مجھے لعنت کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا بلکہ رحمت بنا بھیجا ہے۔ آپ نے دعا فرمائی۔

''اے خدا میری قوم کو ہدایت دے کیونکہ وہ نہیں جانتے'' کس قدر دل میں رحمت اور عفو کا جوش ہے کہ دشمن ایذا دینے پر تلا ہوا ہے اور آپ اپنے دشمنوں کے لیے دعا ہدایت و مغفرت کر رہے ہیں۔

حضور کی بے نظیر مثال عفو کی فتح مکہ کے دن تھی وہ دشمن جس نے آپ کو ہر قسم کی تکلیف دی۔ معاشرتی مقاطعہ کر کے شعب ابی طالب میں محصور کر دیا۔ قتل کے منصوبے بنائے شہر سے نکال دیا جب وہ مغلوب ہو کر سامنے آتے ہیں تو سرتاپا حلم وعفو انسان لا تثریب علیکم الیوم کہہ کر تمام خطا کاروں کو معاف کر دیتے ہیں۔

جس زمانہ میں آپ فتح مکہ کے لیے تیاریاں کر رہے تھے اس بات کا خاص خیال فرما رہے تھے کہ قریش کو حضور کے ارادہ کی خبر نہ ہو۔ حاطب بن ابی بلتعہ نے قریش کو اطلاع دینے کے لیے ایک عورت کو خط دے دیا جب آپ کو خبر ہوئی حضرت علیؓ اور حضرت زبیر کو عورت کو پکڑ کر واپس لانے کے لیے بھیجا آپ ﷺ نے حاطب کو بلا کر دریافت فرمایا۔ انہوں نے اپنے جرم کا اعتراف کیا اگر کوئی اور بادشاہ یا حکمران ہوتا تو فوجی راز فاش کرنے کے جرم میں ان کو قتل کر دیتا لیکن آپ ﷺ نے اس لیے معاف کر دیا کہ یہ بدری صحابی ہے عورت جو اس جرم میں شریک تھی اس سے بھی کسی قسم کا تعرض نہ کیا۔ (صحیح بخاری فتح مکہ)

آپ ﷺ کی محبوب ترین زوجہ حضرت عائشہ پر منافقین نے تہمت لگائی خود اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ افک کی تکذیب کی۔ عبداللہ بن ابی سلول رئیس المنافقین کو اس بناء پر چھوڑ دیا گیا کہ اس نے تہمت لگانے کا اقرار نہ کیا اور ثبوت کے لیے شرعی شہادت موجود نہ تھی اگر دنیا کا کوئی اور بادشاہ ہوتا تو وہ عبداللہ بن سلول کو اس کے کیفر کردار تک پہنچاتا۔

نبوت کے دسویں سال جب رسول اللہ ﷺ اہل طائف کو دعوت اسلام دینے کے لیے گئے بجائے روبراہ ہونے کے انھوں نے سنگ باری سے استقبال کیا اور نعلین مبارک خون سے بھر گئیں جب واپس ہوئے تو راستہ میں فرشتہ نے آ کر کہا یا محمد! اگر آپ حکم دیں تو اس پہاڑ کو ان پر الٹ دوں۔ آپ نے جواب دیا کہ میں ان کی ہلاکت نہیں چاہتا بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے ایسے بندے پیدا کرے گا جو صرف خدا کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔ (صحیح بخاری)

حضرت جابر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ غزوہ ذات الرقاع میں ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ واپس آتے ہوئے ایک گھنے جنگل میں دوپہر کاٹی آپ ﷺ ایک درخت کے نیچے لیٹ گئے اور تلوار ایک درخت سے لٹکا دی۔ اسی اثنا میں آپ ﷺ نے آواز دی۔ تمام صحابہ اکٹھے ہو گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بدو سامنے کھڑا ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں سو رہا تھا۔ اس نے آ کر میری تلوار کھینچ لی اور میں بیدار ہوا تو یہ تلوار سونتے میرے سرہانے کھڑا تھا کہنے لگا۔ ''تجھ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے۔'' میں نے کہا ''اللہ'' یہ سن کر اس نے تلوار نیام میں کر لی۔ آپ ﷺ نے اس کو سزا نہ دی اس اعرابی کا نام غورث بن حارث تھا۔ (صحیح بخاری کتاب الجہاد)

وحشی نے رسول کریم ﷺ کے عزیز ترین چچا حضرت حمزہ کو جنگ احد میں شہید کیا۔ فتح مکہ کے بعد وہ طائف بھاگ گیا آخر طائف نے بھی سر اطاعت خم کر لیا وحشی کے لیے یہ بھی جائے امن نہ رہا۔ لیکن اس نے سنا کہ رسول کریم ﷺ سفراء سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتے ناچار خود بارگاہ رحمت میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کیا۔ آپ ﷺ نے صرف اس قدر فرمایا کہ ''میرے سامنے نہ آیا کرنا تم کو دیکھ کر چچا کی یاد آتی ہے۔'' (صحیح بخاری قتل حمزہ) ہندہ زوجہ ابوسفیان جس نے حضرت حمزہ کا کلیجہ چبایا تھا اور مثلہ کیا تھا فتح مکہ کے دن نقاب پوش آئی لیکن رسول کریم ﷺ پہچان نہ سکے اور بیعت کر کے سند امان حاصل کر لی۔ پھر اس موقع پر بھی گستاخی سے باز نہ آئی آپ ﷺ نے ہندہ کو پہچان لیا لیکن حضرت حمزہ کے واقعہ کا ذکر نہ کیا ہبار بن الاسود وہ شخص تھا جس نے آپ کی صاحبزادی حضرت زینب کو اونٹ سے گرایا تھا جس سے ان کو سخت چوٹ آئی اور حمل ساقط ہو گیا اس کے علاوہ اس کے اور بھی بہت جرائم تھے اس بناء پر فتح مکہ کے دن ہبار اشتہاری مجرموں میں شامل تھا وہ ایران بھاگ جانا چاہتا تھا آخر پیکر عفو کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی۔ یارسول اللہ میں ایران بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن پھر

آپ کے احسانات اور حلم اور عفو یاد آئے مجھے اپنے قصور کا اعتراف ہے۔ اب اسلام سے مشرف ہونے آیا ہوں۔ دفعتہً آپ نے اس کو معاف فرما دیا کفار مکہ نے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء کو تین سال شعب ابی طالب میں محصور رکھا۔ غلہ کا ایک دانہ اندر نہ پہنچ سکتا تھا۔ بچے بھوک سے بلبلاتے تھے لیکن ان کے سنگ دلوں میں جذبہ رحم مفقود ہو چکا تھا لیکن رحمت عالم نے اس کے معاوضہ میں قریش کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ مکہ میں غلہ یمامہ سے آتا تھا۔ وہاں کا سردار ثمامہ بن اثال مسلمان ہو گیا تھا۔ کفار نے تبدیل مذہب پر طعنہ دیا انھوں نے کہا 'خدا کی قسم رسول اللہ کی اجازت کے بغیر ایک دانہ بھی مکہ نہیں جانے دوں گا۔ اس بندش سے مکہ میں اناج کا قحط پڑ گیا۔ آخر گھبرا کر قریش آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے حضور نے کہلا بھیجا کہ بندش اٹھالو۔ چنانچہ بدستور غلہ مکہ جانے لگا۔

عکرمہ، ابوجہل کے بیٹے جس کی فتح مکہ سے قبل تک زندگی اسلام کی بیخ کنی اور مسلمانوں کو ایذا رسانی میں گزری تھی۔ فتح مکہ کے موقع پر امن کے اعلان عام کے باوجود ہتھیار نہ ڈالے بلکہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حضرت خالد بن ولید کے دستہ پر حملہ کر کے حرم میں خون ریزی کی۔ ان تمام گھناؤنے جرائم کے باعث اس کو قتل کرنے کا حکم تھا۔ جان بچانے کے لیے یمن بھاگ گیا اس کی بیوی ام حکیم دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی تھی۔ اور عکرمہ کی معافی کے لیے خواستگار ہوئی تو رسول کریم ﷺ نے اس جانی دشمن کے لیے امان نامہ لکھا دیا۔ وہ یمن گئی عکرمہ سے کہا کہ وہ اس کے لیے رسول کریم ﷺ سے امان نامہ لکھوا کر لائی ہے چنانچہ وہ دربار رسالت میں حاضر ہوا اور آپ نے معاف کر دیا۔ (السیرۃ الحلبیہ جلد ۳ ص ۱۰۶ مطبوعہ بیروت)

اسی طرح اسلام کا ایک اور بڑا دشمن صفوان بن امیہ تھا۔ اس کی بھی ساری عمر اسلام کی دشمنی میں گزری تھی۔ یہ بھی ان اشخاص میں سے تھا جس نے فتح مکہ کے دن حضرت خالد بن ولید کے دستہ پر حملہ کیا تھا اور حرم کے تقدس کی بے حرمتی کی تھی۔ وہ بھی یمن بھاگ گیا۔ اس کی معافی کے لیے اس کے چچا حضرت عمیر بن وہب رسول کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور صفوان کے لیے معافی کے خواستگار ہوئے تو عفو کے پیکر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے معاف فرما دیا اور حضرت عمیر نے فرمایا مجھے اپنی امان کی کوئی نشانی دیجئے تو آپ ﷺ نے اپنا سیاہ عمامہ دے دیا۔ حضرت عمیر سیاہ عمامہ لے کر یمن گیا۔ صفوان سے معافی کی خوشخبری سنائی۔ ساتھ امان کی نشانی عمامہ دکھائی تو رسول کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور یہ سوال کیا کیا آپ ﷺ نے مجھے امان دی ہے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا ہاں، میں نے امان دی ہے صفوان نے عرض کیا مجھے دو ماہ کی مہلت دے دیں کہ اپنے دین کے رہتے ہوئے مکہ میں ٹھہروں۔ رسول کریم ﷺ نے چار ماہ کی مہلت عطا فرمائی۔ یوں آپ نے اسلام کے بدترین دشمن کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا حسن سلوک کر کے عفو کی شاندار مثال قائم کر دی۔ (موطا امام مالک کتاب النکاح باب نکاح المشرک اذا اسلمت زوجتہ)

حارث بن ہشام اور زُہَیر بن امیہ بھی عکرمہ اور صفوان کے رفقاء میں سے تھے جنھوں نے رسول کریم ﷺ کی امان قبول کرنے کی بجائے مزاحمت کا فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے رسول کریم ﷺ کی چچازاد بہن ام ہانی ؓ سے معافی کی سفارش چاہی۔ حضرت ام ہانی ؓ نے ان کو امان دے کر اپنے گھر ٹھہرا لیا۔ پہلے اپنے بھائی حضرت علی ؓ سے ان کی معافی کے لیے بات کی حضرت علیؓ نے صاف جواب دے دیا کہ ایسے عدوان اسلام کو تو میں خود قتل کروں گا تب حضرت ام ہانی ؓ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا میرا بھائی علی کہتا ہے کہ وہ ان کو قتل کر دے گا جسے میں نے امان دی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "اے ام ہانی جسے تم نے امان دی ہے ہم نے امان دی۔ چنانچہ ان دونوں عدوان اسلام کو بھی معاف کر دیا۔ (السیرۃ النبوۃ لابن ہشام جلد ۴ ص ۹۲ مطبوعہ بیروت)

غزوہ خیبر کے بعد مشہور یہودی جرنیل مرحب کی بہن نے ایک بکری کے گوشت میں زہر ملا کر پکایا اور رسول کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں بطور تحفہ پیش کیا رسول کریم ﷺ گوشت کھانے لگے اور دیگر صحابہ نے کھا لیا تھا۔ رسول کریم ﷺ نے شک گزرنے پر فوراً فرمایا کہ گوشت نہ کھایا جائے چنانچہ حضور ﷺ نے یہودی عورت کو بلا کر دریافت فرمایا تو اس عورت نے اقرار کر لیا۔ اس عورت نے پوچھا کہ آپ ﷺ کو کیسے علم ہوا ہے آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ میں دستی کے گوشت کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس نے بتایا۔ حضور ﷺ نے پوچھا کہ تمہارا مقصد کیا تھا۔ کہنے لگی میں نے خیال کیا اگر آپ ﷺ نبی ہیں تو یہ زہر آپ کو نقصان نہیں دے گا۔ اگر نہیں ہیں تو آپ ﷺ سے ہماری جان چھوٹ جائے گی۔ رسول کریم ﷺ نے اس عورت کو معاف کر دیا جبکہ حضور کا ایک صحابی زہر آلود گوشت کھانے کی وجہ سے شہید ہو چکا تھا۔ (ابوداؤد کتاب الدیات باب فیمن سقی رجلا سما اواطعمہ)

رحم (شفقت و رحمت)

رحم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جو رحمان اور رحیم سے مشتق ہے اس خلق سے شفقت، عفو اور احسان جیسے اخلاق متفرع ہوتے ہیں۔ رحم بنیادی اخلاق میں سے ہے اسی صفت سے معاشرہ قائم و دائم ہے۔

اہمیت از روئے قرآن: ارشاد الٰہی ہے۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح ۴۸:۲۹) (حضرت) محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں کافروں کے حق میں سخت اور آپس میں رحم دل ہیں ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا (مومن ۴۰:۷) اے ہمارے پروردگار تو نے اپنی رحمت اور علم میں ہر چیز کو سما لیا ہے۔

هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (حشر ۵۹:۲۲) وہی رحم والا مہربان ہے۔

وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ (مومنوں ۲۳:۱۰۹) اور تو سب رحم کرنے والوں میں سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اسی وصف کے ساتھ رسول کریم ﷺ کو متصف قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (توبہ ۹:۱۲۸) لوگو! تمھارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آئے ہیں تمہاری تکلیف ان پر شاق گزرتی ہے اور تمہاری بھلائی کے بہت خواہش مند ہیں۔ مومنوں پر بہت شفیق اور رحیم ہیں۔

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ (البلد ۹۰:۱۷، ۱۸) پھر وہ ان لوگوں سے ہوتا ہے جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر اور رحم کی تلقین کرتے رہتے ہیں یہی لوگ دائیں جانب (سعادت) والے ہیں۔

اہمیت از روئے حدیث: حدیث میں ہے کہ ''خدا نے رحمت کے سو ٹکڑے کیے جن میں سے ننانوے ٹکڑے اپنے پاس رکھ لیے اور زمین پر صرف ٹکڑا اتارا اور اسی ٹکڑے کی بناء پر لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ گھوڑا اس خوف سے اپنے بچے پر پاؤں نہیں رکھتا کہ کہیں اس کو صدمہ نہ پہنچ پائے۔ (بخاری کتاب الادب)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہا۔ سَمِعْتُ اَبَا الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا تُنْزَعُ الرَّحْمَةُ اِلَّا مِنْ شَقِيٍّ (ترمذی باب رحمۃ الناس) کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص کے دل سے رحم ہٹایا جاتا ہے۔ وہ یقیناً بدبخت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَلرّٰحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا اَهْلَ الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَآءِ (ابوداؤد باب فی الرحمۃ) رحم کرنے والوں پر خدائے رحیم رحم کرتا ہے زمین کے رہنے والوں پر رحم کرو تاکہ آسمان پر رہنے والا تم پر رحم کرے۔

حضرت اسامہ بن زید سے روایت ہے کہا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اِنَّمَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَآءَ (نسائی باب الامر بالاحتساب) کہ اللہ تعالیٰ ان بندوں پر رحم کرتا ہے جو اوروں پر رحم کرتا۔

فرمایا لَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَّا يَرْحَمُ النَّاسَ (بخاری باب رحمۃ الناس) جو شخص بندوں پر رحم نہیں کرتا خدا اس پر رحم نہیں کرتا۔

اس حدیث میں تمام مخلوق پر رحم کھانے کی ترغیب دی گئی ہے اس لیے رسول کریم ﷺ کا جذبہ رحمت کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے حسنؓ کا بوسہ لیا۔ اقرع بن حابس جو ایک درشت خو بدو تھے پاس بیٹھے ہوئے تھے بولے کہ میرے دس بچے ہیں۔ میں نے ان میں سے کسی کا بوسہ نہیں لیا۔ آپ ﷺ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ ''جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا''

ایک اور بدو نے آپ ﷺ سے کہا کہ لوگ بچوں کو چومتے ہیں لیکن ہم لوگ نہیں چومتے آپ ﷺ نے فرمایا ''خدا نے جب تمھارے دل سے رحم کو نکال لیا تو میرا کیا بس ہے۔ (بخاری کتاب الادب باب رحمۃ وتقبیلہ ومعانقہ)

حضرت اسامہ بن زیدؓ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ایک زانو پر مجھ کو اور دوسرے زانو پر حضرت حسن کو بٹھا لیتے تھے۔ پھر دونوں زانو کو ملا کر کہتے تھے کہ خداوندا ان دونوں پر رحم فرما کیونکہ میں ان دونوں پر رحم کرتا ہوں۔ (بخاری کتاب الادب باب وضع الصبی علی الفخذ)

امام بخاری حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ابو یوسف القین کے گھر گئے جو حضرت ابراہیم فرزند رسول اللہ ﷺ کی آیا کے شوہر تھے۔ آپ ﷺ نے بچے کو اپنے ہاتھ میں لیا اور بوسے دیے اس واقعہ کے بعد ایک دفعہ ہم پھر وہاں گئے جبکہ ابراہیمؑ جان بلب تھے۔ آپ کی آنکھوں میں سے آنسو بہنے لگے عبدالرحمان بن عوفؓ نے عرض کی کہ آپ ﷺ اور یہ آنسو یا رسول اللہ فرمایا ''ابن عوف! یہ رحمت ہے۔ پھر فرمایا ''آنکھ آنسو بہاتی ہے دل غمگین ہے اور ہم وہی کہیں گے جس پر ہمارا رب راضی ہوتا ہے اور ابراہیم کا ہم تیرے جدا ہونے پر بہت غمگین ہیں۔''

مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى (صحیح مسلم) مومنوں کی مثال باہمی محبت ایک دوسرے پر رحم اور نرمی کرنے میں ایک جسم کی طرح ہے اگر اس کا ایک عضو بیمار ہو جائے تو سارا جسم بیداری اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اسلام میں رحم کی تعلیم صرف انسانوں تک محدود نہیں بلکہ ہر ذی روح رحم کے دائرہ میں شامل ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ''اگر کوئی شخص ذبیحہ جانور پر بھی رحم کرے گا تو اللہ تعالیٰ روز قیامت اس پر رحم کرے گا۔ (ادب المفرد باب رحمۃ البہائم) ایک شخص نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر ترس آتا ہے یا یہ کہ مجھے اس پر ترس آتا ہے کہ بکری ذبح کروں آپ نے دو بار فرمایا اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ بھی تم پر رحم کرے گا۔ (ادب المفرد باب ارحم من فی الارض)

امام بخاریؒ حضرت ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں ایک شخص کو سخت پیاس لگی وہ کنوئیں میں نیچے اترا پانی پیا باہر نکلا تو ایک کتا دیکھا جو پیاس کی وجہ ہانپ رہا تھا اور گیلی مٹی چاٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ بھی میری طرح پیاسا ہے تو اس نے پانی سے اپنا موزہ بھرا منہ سے پکڑا اور کنویں سے باہر آ کر کتے کو پانی پلایا اللہ تعالیٰ نے اس کے اس فعل کی قدر کی اور مغفرت فرما دی۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ جانوروں کے ساتھ ہمدردی سے بھی ہمیں ثواب ملتا ہے فرمایا ہر زندہ جگر والی چیز (کے ساتھ شفقت اور رحم) میں اللہ کے ہاں اجر ہے۔

اس کے برعکس امام بخاری حضرت ابوہریرہ سے ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''ایک عورت کو صرف اس لیے عذاب ہوا کہ اس نے بلی کو باندھا جس کی وجہ سے وہ بھوکی پیاسی مرگئی۔ (اللہ کی طرف سے اسے کہا گیا) کہ تو نے اسے باندھ کر نہ اسے کھانا دیا نہ پانی پلایا اور نہ چھوڑا کہ یہ خود زمینی جانور کر گزارہ کرتی۔

جود و کرم

یہ خلق سخاوت، وسعت قلبی، بنی نوع انسان سے ہمدردی اور شفقت اور پیار اور انفاق فی سبیل اللہ کا اظہار ہے۔

اہمیت از روئے قرآن مجید: ارشاد الٰہی ہے۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (بقرہ۲:۳) جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں۔
وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (الضحیٰ ۹۳:۱۰) اور سوالی کو نہ ڈانٹ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ (البقرہ۲:۲۶۷) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ ان چیزوں سے خرچ کرو جو تم کماتے ہو۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ (بقرہ۲:۱۷۷) لیکن بڑا نیک وہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن اور فرشتوں اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت کے لیے قریبوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوالیوں کو اور غلاموں کو آزاد کرنے میں مال دے اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔

مَنْ ذَا الَّذِىْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (البقرہ۲:۲۴۵) کوئی شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض حسنہ دے۔

مَنْ ذَا الَّذِىْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ (الحدید۵۷:۱۱) کوئی شخص ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے پھر اللہ تعالیٰ اس کو اس شخص کے لیے بڑھاتا چلا جاتا جائے اور اس کو بہت اچھا بدلہ دیا جائے گا۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (البقرہ۲:۲۷۴) لوگ اپنے مالوں کو رات دن خرچ کرتے ہیں پوشیدہ طور پر یا علانیہ طور پر تو ان کے لیے ان کے رب کے پاس اس کا بدلہ ہے۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ (الروم۳۰:۳۸) سو قریبی کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو بھی۔

مذکورہ تمام آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عطیہ خداوندی میں سے ضرورت مند بھائی بندوں کے لیے خرچ کرنا ایک بڑی نیکی ہے اور ضرورت مند انسانوں کی ضرورت کو پورا کرنا گویا خدا کو قرض دینا ہے اس کا بدلہ اللہ ہی دے گا۔

اہمیت از روئے حدیث: حضرت جابرؓ سے روایت ہے مَاسُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ شَيْءٍ قَطُّ فَقَالَ لَا (بخاری باب حسن الخلق) ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آنحضرت ﷺ سے کچھ چیز مانگی گئی ہے اور آپ نے فرمایا ہو کہ نہیں۔

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَصْلَتَانِ لَا تَجْتَمِعَانِ فِي مُؤْمِنٍ اَلْبُخْلُ وَسُوْءُ الْخُلُقِ (ترمذی باب فی البخل) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مومن میں دو خصلتیں جمع نہیں ہوسکتیں ایک بخل اور بدخلقی۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہا۔ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْبُخْلِ (بخاری) آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ اے میرے خدا میں بخل سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

حضرت عبداللہ بن حبشی سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا۔ فَاَيُّ الصَّدَقَةِ اَفْضَلُ قَالَ جُهْدُ الْمُقِلِّ (نسائی باب جھد المقل) کون سا صدقہ افضل ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ نادار کا صدقہ جو وہ کوشش کر کے دے۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ کس صدقے کا اجر سب سے زیادہ ہے آپ ﷺ نے فرمایا وہ صدقہ تندرستی کی حالت میں کرے جبکہ تجھے مال جمع کرنے کی حرص ہو فقر سے ڈرتا ہو۔

اور تونگری کی امید یہ نہیں کہ جب جان لبوں پر آ جائے تو کہے کہ یہ چیز فلاں شخص کے لیے اور یہ فلاں شخص کے لیے کیونکہ اس وقت تو یہ چیزیں خود دوسروں کی ہو جاتی ہے۔ (بخاری باب ای الصدقۃ افضل)

فرمایا لَا حَسَدَ اِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَسُلِّطَ عَلٰى هَلَكَتِهٖ فِي الْحَقِّ وَرَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا (صحیح بخاری) صرف دو آدمیوں کے ساتھ رشک کرنا جائز ہے ایک وہ شخص جس کو اللہ نے مال دیا پھر وہ صحیح مواقع پر دل کھول کر خرچ کرتا ہے اور دوسرا وہ جسے اللہ

نے حکمت سے نوازا ہو وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور لوگوں کو سکھاتا ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہا کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَحْسَنَ النَّاسِ وَاَجْوَدَ النَّاسِ وَاَشْجَعَ النَّاسِ (بخاری) رسول کریم ﷺ سب لوگوں سے زیادہ حسین اور سب سے زیادہ سخی تھے اور سب سے زیادہ بہادر تھے۔

فرمایا اِنَّ اللّٰہَ جَوَّادٌ یُحِبُّ الْجُوْدَ وَیُحِبُّ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ وَیَکْرَہُ سَفْسَافَھَا (معجم الطبرانی وسنن البیہقی) بے شک اللہ سخی ہے اور سخاوت کو پسند کرتا ہے اور اچھے اخلاق کو پسند کرتا ہے اور گھٹیا عادات کو ناپسند کرتا ہے۔

<u>اسوۂ حسنہ:</u> ایک شخص نے بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر سوال کیا آپ نے فرمایا کہ میرے پاس اس وقت کچھ نہیں تم میرے نام پر قرض لے لو۔ میں پھر اسے اُتار دوں گا حضرت عمر نے کہا کہ خدا نے آپ ﷺ کو یہ تکلیف نہیں دی کہ طاقت سے بڑھ کر کام کریں۔ آپ ﷺ خاموش رہے کہ ایک انصاری نے پاس سے کہہ دیا یارسول اللہ! خوب داد و دہش کیجئے رب العرش مالک ہے عسرت کا کیا ڈر ہے آپ ﷺ کے روئے مبارک پر خوشی و انبساط کی لہر دوڑ گئی اور فرمایا مجھے بھی یہی حکم ملا ہے۔ (شفاص ۵۰ بحوالہ شمائل ترمذی)

ایک دفعہ ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور دیکھا آپ کی بکریوں کا ریوڑ دو پہاڑوں کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ اس نے درخواست کی آپ ﷺ نے سب کی سب دے دیں۔ اس نے اپنے قبیلہ میں جا کر کہا کہ اسلام قبول کر لو۔ محمد ﷺ ایسے فیاض ہیں کہ مفلس ہو جانے کی پروا نہیں کرتے۔ (صحیح مسلم)

ایک بار عصر کی نماز پڑھ کر خلاف معمول فوراً گھر کے اندر تشریف لے گئے اور پھر فوراً نکل آئے لوگوں کو تعجب ہوا آپ ﷺ نے فرمایا مجھ کو نماز میں خیال آیا کہ کچھ سونا گھر میں ہے گمان ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات ہو جائے سونا گھر میں پڑا رہ جائے۔ اس لیے اس کو خیرات کر دیا ہے۔ (بخاری یفکر الرجل الشی فی الصلوٰۃ)

غزوہ حنین میں مال غنیمت ملا اس میں ۲۴ ہزار اونٹ ۴۰ ہزار بکریاں اور ۴۰۰ اوقیہ چاندی شامل تھے۔ آنحضرت ﷺ اس کو خیرات فرما کر واپس آ رہے تھے۔ راہ میں بدوؤں کو خبر ہوئی کہ ادھر سے آپ ﷺ کا گزر ہونے والا ہے آس پاس سے دوڑ دوڑ کر آئے اور لپٹ گئے کہ ہمیں عنایت ہو آپ ﷺ بھیڑ سے گھبرا کر ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے انھوں نے چادر تھام لی۔ بالآخر اس کشاکش میں چادر اتر کر ان کے ہاتھ میں رہ گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''میری چادر دے دو خدا کی قسم ان جنگلی درختوں کے برابر بھی میرے پاس مال ہوتا تو میں سب تم کو دے دیتا اور پھر مجھ کو بخیل پاتے نہ دروغ گو نہ۔ (بخاری)

بعض اوقات جس مالک سے کوئی چیز خریدتے قیمت ادا کرنے کے بعد اس کو ہبہ کر دیتے ایک مرتبہ حضرت عمرؓ سے اونٹ خریدا اور ان کے بیٹے عبداللہ کو ہبہ کر دیا ایک دوسرے موقع پر حضرت جابر سے اونٹ خریدا اور قیمت ادا کرنے کے بعد اونٹ انہی کو لٹا دیا۔ رسول کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے اگر اُحد پہاڑ میرے لیے سونے کا ہو جائے تو میں نہیں چاہتا کہ تین دن گزر جائیں اور اس میں سے کچھ بچ جائے۔

مدنی زندگی میں مال و دولت کی ریل پیل تھی۔ آپ ﷺ کے پاس اتنی کثرت سے مال و اسباب آتا کہ مسجد میں ڈھیر لگ جاتے تھے لیکن جب آپ ﷺ کا وصال ہوا تو آپ ﷺ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تھوڑے سے جَو کے بدلے رہن رکھی ہوتی تھی۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ لَا یَدَّخِرُ شَیْئًا بِغَدٍ (ترمذی) کہ رسول اللہ ﷺ کل کے لیے کوئی چیز نہ اٹھا رکھتے تھے۔

جود و کرم ہی ایک ایسا وصف ہے جس سے غربت و افلاس دور ہوتی ہے۔ معاشرہ میں جذبہ اخوت ابھرتا ہے۔ امرا اور غرباء کے قلوب میں ایک دوسرے کا پیار اور محبت پیدا ہوتی ہے۔ باہمی نفرت اور بغض کی آگ ٹھنڈی ہوتی ہے۔

<u>جود و کرم کے آداب:</u> سائل کو احسان اور ایذا رسانی کے بغیر دیا جائے۔ معطی سائل کو دیکھ کر قلبی مسرت محسوس کرے۔ ۳۔ جود و کرم افراط اور تفریط سے پاک ہو۔ ۴۔ طلب کے بغیر محتاج کو دیا جائے۔

ایثار

ایثار، جود و کرم کا آخری درجہ ہے اس کے معنی ہیں دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھنا خود بھوکا رہے دوسروں کو کھلائے خود تکلیف میں رہے اور دوسروں کو آرام پہنچائے۔

اہمیت از روئے قرآن: ارشاد الٰہی ہے۔ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الحشر ۵۹:۹) اور وہ اپنے آپ پر انھیں مقدم رکھتے ہیں گو انھیں تنگی ہو اور جو شخص اپنے نفس کے بخل سے بچ جائے تو وہی کامیاب ہوں گے۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا (الدھر ۷۶:۸) اور اس کی محبت کی وجہ سے مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (الدھر ۷۶:۹) ہم تمھیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھانا کھلاتے ہیں ہم نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔

اہمیت از روئے حدیث: آپ کو اپنے بچوں سے بے حد محبت تھی جب کبھی حضرت فاطمہؓ آپ ﷺ سے ملنے آتی تھیں آپ ﷺ فرط محبت سے کھڑے ہو جاتے تھے۔ پیشانی پر بوسہ دیتے تھے تاہم حضرت فاطمہ کی عسرت اور تنگ دستی کا یہ حال تھا کہ گھر میں کوئی خادمہ نہیں تھی۔ خود چکی پیستیں اور خود ہی پانی کی مشک بھر لاتیں ایک دن بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئیں لیکن اپنی تکلیف بیان کرنے کی جرأت و ہمت نہ ہوئی چنانچہ حضرت علیؓ نے یہ حال عرض کی اور درخواست کی کہ فلاں غزوہ سے جو کنیزیں آئی ہیں ان میں سے ایک کنیز مل جائے۔

آپ ﷺ نے فرمایا اصحاب صفہ کے لیے کوئی تسلی بخش انتظام نہیں ہو سکا جب تک اس طرف سے اطمینان نہ ہو جائے اس وقت تک میں کسی طرف توجہ نہیں کر سکتا۔ (ابوداؤد)

ایک دفعہ حضرت علیؓ نے کسی امر کے متعلق درخواست کی فرمایا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم کو دوں اور اہل صفہ کو اس حال پر چھوڑ دوں کہ وہ بھوکے رہیں۔

(مسند احمد)

ایک روایت ہے کہ حضرت زبیر کی دو صاحبزادیاں اور حضرت فاطمہؓ آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اپنے افلاس کی شکایت کی اور عرض کی کہ غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں ان میں سے ایک دو ہم کو مل جائیں آپ ﷺ نے فرمایا بدر کے یتیم تم سے پہلے درخواست کر چکے ہیں۔ (ابوداؤد)

یہ ہے وہ ایثار جس سے آپ ﷺ متصف ہیں آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ اور آپ کے داماد اور چچیرے بھائی حضرت علی اور حضرت زبیر کی صاحبزادیاں آپ ﷺ کے سامنے اپنی عسرت بیان کرتی ہیں لیکن آپ پہلے دوسرے مسلمانوں کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنے عزیزوں کو کوئی چیز دینے کو تیار نہیں جب تک پہلے دیگر ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کر لیا نہیں جاتا۔

ایک مرتبہ ایک عورت نے ایک چادر آپ ﷺ کو تحفۃً پیش کی اور آپ ﷺ نے قبول فرما لیا۔ آپ کو اس چادر کی اشد ضرورت تھی۔ اسی وقت ایک غریب مسلمان نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ مجھے عنایت ہو۔ آپؐ نے اسی وقت اتار کر ان کو عطا کر دی صحابہ نے ان کو ملامت کی کہ کیا تم نہیں جانتے کہ آپؐ نے کبھی سائل کے سوال کو رد نہیں کیا۔ پھر تم نے ایسا کیوں کیا۔ اس نے جواب دیا ہاں میں یہ دونوں باتیں جانتا ہوں۔ لیکن میں نے حصول برکت کی غرض سے کیا ہے۔ میں وصیت کر جاؤں گا کہ مرنے کے بعد اس چادر کا مجھ کو کفن دیا جائے اور اس میں دفن کیا جائے۔ (ابوداؤد صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخا و باب من استعد الکفن) ایک صحابی نے شادی کی سامان ولیمہ کے لیے گھر میں کچھ نہ تھا۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ عائشہ کے پاس جاؤ اور آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ وہ صحابی گئے اور جا کر لے آئے حالانکہ گھر میں اس ذخیرہ کے سوا شام کے کھانے کو کچھ نہ تھا۔ (مسند احمد جلد ۴) ایک دفعہ ایک غفاری آ کر مہمان ہوا۔ رات کو کھانے کے لیے صرف بکری کا دودھ تھا۔ وہ آپ نے میزبان کو دے دیا۔ آپ تمام رات فاقہ میں بسر کی حالانکہ اس سے پہلی شب میں بھی آپ ﷺ فاقے میں تھے۔ (مسند احمد)

رسول کریم ﷺ کی زندگی مجسم ایثار تھی صحابہ کرام میں انصار کا سب سے بڑا یہی وصف تھا۔ جبکہ مکہ کے مسلمان تہی دامن مدینہ پہنچے تو انصار اہل

مدینہ نے جو ایثار دکھایا وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے اور مہاجرین کے سامنے ہر چیز رکھ دی اور نصف نصف تقسیم کرنے پر رضامند ہو گئے۔ یہاں تک کہ بعض انصار میں سے جن کی دو بیویاں تھیں۔ ایک کو طلاق کی پیشکش کر دی اس ایثار کا قرآن مجید میں بھی ذکر ہے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ایک مہمان کو ایک انصاری صحابی کھانا کھلانے کے لیے لے گئے۔ اور بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کچھ ہے؟ بولیں ''صرف بچوں کا کھانا'' بولے بچوں کو سلا دو اور چراغ بجھا دو۔ ہم دونوں رات بھر بھوکے رہیں گے البتہ مہمان پر ظاہر کریں گے کہ ہم بھی کھا رہے ہیں۔ اس کے آگے کھانا رکھا۔ بیوی کو کہہ کر کسی بہانے دیا بجھا دیا اور کھانا کھانے کے لیے ہاتھ بڑھاتے رہے اور کھایا نہیں اور مہمان سیر ہو گیا صبح ہوئی وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ آپ کے حسن سلوک سے بہت خوش ہوا ہے۔ (صحیح مسلم کتاب الاشربۃ باب اکرام الضیف و فضل ایثارہ و صحیح بخاری تفسیر سورۃ حشر) اور یہ آیت نازل ہوئی۔ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ. (صحیح بخاری تفسیر)

انکساری و تواضع

کبریائی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (جاثیہ ۴۵:۳۷) آسمانوں اور زمین اس کے لیے بڑائی ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

بندوں کی شان نہیں کہ وہ اللہ کی صفت کبریائی میں شریک ہوں اور اظہار کبریائی کریں۔ بندوں کی شان یہی ہے وہ تواضع اور انکساری کریں اور یہی اللہ کو پسند ہے۔ تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ جس شخص نے تکبر اور کبریائی کا اظہار کیا وہ خدا کی گرفت میں آ گیا۔ نمرود و فرعون کی ہلاکت کا ذکر اس ضمن میں قرآن مجید میں آتا ہے کہ انھوں نے تکبر کا اظہار کیا اور وہ تباہ و برباد ہو گئے۔

اہمیت از روئے حدیث: ارشاد الٰہی ہے۔ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (حجر ۱۵:۸۸) اور اپنے بازو مومنوں کے لیے جھکا دے۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (شعراء ۲۶:۲۱۵) اور اپنا بازو جھکا رکھ ان مومنوں کے لیے جنھوں نے تیری پیروی کی۔ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (الفرقان ۲۵:۶۳) اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی اور انکساری سے چلتے ہیں۔ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (لقمان ۳۱:۱۸) اور لوگوں کے لیے تکبر سے اپنا گال مت پھولا اور زمین میں اتراتے ہوئے مت چلو اللہ تعالیٰ ہر اترانے والے تکبر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

اہمیت از روئے حدیث: حضرت انسؓ سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ رسول کریم ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اس نے کہا یَاخَيْرَ الْبَرِيَّةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاكَ اِبْرَاهِيْمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ (مسلم) اے بہترین مخلوق تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا نہیں یہ وصف حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے۔

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰى ابْنَ مَرْيَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُهٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ. (بخاری و مسلم) میری مدح میں مبالغہ نہ کرنا جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی مدح میں مبالغہ کیا میں تو خدا کا ایک بندہ ہوں اور اس لیے تم مجھے خدا کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا۔ مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ مَازَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا وَمَا تَوَاضَعَ اَحَدٌ لِلّٰهِ اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ (مسلم باب استحباب العفو والتواضع) صدقہ دینے سے مال کم نہیں ہوتا اور کسی کا قصور معاف کرنے سے اللہ تعالیٰ عزت بڑھاتا ہے اگر کوئی شخص خدا تعالیٰ کی رضا کے لیے تواضع اختیار کرے تو خدا اس کا مرتبہ بلند کرتا ہے۔

حضرت عیاض بن حمار المجاشعی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ اَوْحٰى اِلَيَّ اَنْ تَوَاضَعُوْا حَتّٰى لَا يَفْخَرَ اَحَدٌ عَلٰى اَحَدٍ وَلَا يَبْغِيْ اَحَدٌ عَلٰى اَحَدٍ (ابن ماجہ باب البراۃ من الکبر صحیح مسلم) کہ اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی کہ تم تواضع کرو حتیٰ کہ کوئی آدمی کسی آدمی سے فخر نہ کرے۔

حضرت عمرؓ منبر پر کھڑے ہوئے کہہ رہے تھے کہ اے لوگو! فروتنی اختیار کرو کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ جو شخص صرف خدا کے لیے فروتنی اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو بلند کرتا ہے اور وہ شخص اپنے نفس میں حقیر ہے مگر لوگوں کی آنکھوں میں وقیع ہے اور جو شخص تکبر کرتا ہے خدا اس کو نیست کرتا ہے تو وہ لوگوں کی نظر میں حقیر اور اپنی آنکھ میں بزرگ ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ لوگوں کے نزدیک کتے اور سور سے بھی زیادہ ذلیل ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ صحابہ کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی شخص محبوب نہ تھا لیکن جب آپ ﷺ کو آتا دیکھتے تو تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہوتے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آنحضرت ﷺ اس سے ناخوش ہوتے ہیں۔ (ترمذی)

اسوۂ حسنہ: باوجود صاحب اقتدار ہونے کے مریضوں کی عیادت فرماتے۔ جنازوں میں شریک ہوتے غلاموں کی دعوت قبول فرماتے اور اپنی کفش کو مرمت خود ہی کر لیتے کپڑوں پر پیوند خود ہی لگا لیتے اور گھر میں ازواج کے ساتھ مل کر فرائض خانگی ادا کر دیتے۔ (شمائل ترمذی) ایک دفعہ ایک شخص کو صحابہ رسول کریم ﷺ کے پاس لائے وہ خوفزدہ ہو گیا آپ ﷺ نے فرمایا خوف مت کر۔ میں بادشاہ نہیں ہوں بلکہ قریش کی ایک عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی جوتی کو خود پیوند لگاتے اور اپنا کپڑا خود پہنتے اپنے گھر میں ویسا ہی کام کرتے جیسا کہ تم میں ہر ایک شخص اپنے گھروں میں کام کاج کرتا ہے پھر انھوں نے یہ بھی کہا کہ آپ ﷺ آدمیوں میں سے ایک آدمی تھے کپڑوں کی جوئیں آپ چنتے اور اپنی بکری کا دودھ خود دوہتے اور اپنا کام آپ کرتے۔ (ترمذی)

رفق و لطف (رقیق القلبی)

رفق و لطف اللہ تعالیٰ کی صفت لطیف کا پرتو ہے۔ امام راغب لطیف کے مختلف معنوں میں سے ایک معنی یہ بتاتے ہیں وہ اپنے بندوں کی راہنمائی میں نرمی فرماتا ہے۔ (لفظ لطف) امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں نقل کرتے ہیں "خدا کا نام لطیف ہے اس لیے ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی اور آسانی چاہتا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ رَبِّی لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ (یوسف ۱۲:۱۰۰) بے شک میرا رب لطف کرنے والا ہے جس بات کا چاہے بے شک وہی جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ رفق و لطف کا اظہار اس طرح فرماتا ہے۔ اَللّٰهُ لَطِیْفٌ بِعِبَادِهٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ وَهُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ (شوریٰ ۴۲:۱۹) اللہ اپنے بندوں پر لطف کرنے والا ہے جس کو چاہتا رزق دیتا ہے وہی قوت والا اور غالب ہے۔

اہمیت از روئے قرآن مجید: اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیْمٌ (توبہ ۹:۱۱۴) بے شک ابراہیم نرم دل و بردبار ہے۔ اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس خلق کی مدح میں قرآن مجید میں آیا ہے۔

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ (ھود ۱۱:۷۵) بے شک ابراہیم بردبار نرم دل حق کی طرف رجوع کرنے والا ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَا انْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِکَ (آل عمران ۳:۱۵۹) تو اللہ کی رحمت کے سبب سے ان کے لیے نرم دل ہوئے اور تند مزاج اور دل کے سخت ہوتے تو یہ لوگ تمھارے پاس سے دوڑ گئے ہوتے۔

اہمیت از روئے حدیث: ایک دفعہ رسول کریم ﷺ نے حضرت عائشہ کو رفق اور نرمی کی حقیقت سمجھاتے ہوئے فرمایا۔ اِنَّ الرِّفْقَ لَا یَکُوْنُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا زَانَهٗ وَلَا یُنْزَعُ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا شَانَهٗ (صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب فی فضل الرفق) نرمی جس چیز میں ہو اس کو زینت دیتی ہے اور جس سے الگ کر لی جاتی ہے تو اس کو بدنما کر دیتی ہے۔

حضرت جریر سے روایت ہے وہ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا مَنْ یُّحْرَمُ الرِّفْقَ یُحْرَمُ الْخَیْرَ (مسلم کتاب البر والصلۃ فی فضل الرفق و ابن ماجہ باب الرفق) جو شخص نرمی سے محروم کیا گیا وہ ہر ایک نیکی سے محروم کیا گیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِمَنْ یَّحْرُمُ عَلَی النَّارِ وَبِمَنْ تُحَرَّمُ عَلَیْهِ النَّارُ عَلٰی کُلِّ قَرِیْبٍ هَیِّنٍ سَهْلٍ (ترمذی ابواب الزہد) کہ میں تمھیں وہ شخص بتاؤں جو دوزخ کی آگ پر حرام ہے اور جس پر دوزخ کی آگ حرام ہے ہر اس شخص پر جو لوگوں کے قریب ہو نرم ہو اور آسان ہو۔

مالک بن حویرث فرماتے ہیں۔ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَحِیْمًا رَفِیْقًا (بخاری) رسول کریم ﷺ رحم مزاج اور نرم طبیعت تھے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نرم خو ہے اور نرم خوئی کو پسند کرتا ہے اور نرم خوئی پر جو کچھ دیتا ہے وہ سختی پر اس کے علاوہ کسی اور چیز پر نہیں دیتا۔ (صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب فی فضل الرفق)

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا لَا یُرِیْدُ اللّٰهُ بِاَهْلِ الْبَیْتِ رِفْقًا اِلَّا نَفَعَهُمْ وَلَا یُحْرِمُهُمْ اِلَّا ضَرَّهُمْ (بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ) جب اللہ تعالیٰ کسی گھر کے آدمیوں کو نرمی دیتا ہے تو ان کو نفع پہنچاتا ہے اور جب ان کو نرمی سے محروم رکھتا ہے تو ان کو نقصان پہنچاتا ہے۔

ایک صحابی سے ایک دفعہ روزہ میں شرعی غلطی ہوگئی۔ انھوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضور ﷺ کی خدمت میں لے چلو ان سب نے معاملہ کی اہمیت کی رو سے چلنے سے انکار کر دیا تو انھوں نے اکیلے ہی حدیث نبوی میں حاضر ہو کر حقیقت حال عرض کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک غلام کی گردن آزاد کرو۔ وہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر بولا کہ یارسول اللہ ﷺ! اس گردن کے سوا میری کوئی ملکیت نہیں فرمایا لگاتار دو مہینے روزے رکھو گذارش کی کہ یارسول اللہ ﷺ روزہ ہی میں یہ حرکت ہوئی ہے پھر روزہ رکھوں۔ فرمایا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔ عرض کی کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق دے کر بھیجا ہے کہ ہم نے بھوک میں رات گزاری ہے فرمایا کہ صدقہ کے فلاں محصل کے پاس جاؤ اور اس سے اتنے چھوہارے لے لو۔ اس سے ساٹھ مسکینوں کو

کھلا کر جو بچ جائے وہ خود کھاؤ وہ صحابی خوش وخرم اپنی قوم کے پاس آیا اور روداد بیان کر کے بولے میں نے تمھارے پاس تنگی اور بری رائے اور نبی کریم ﷺ کے پاس کشادگی اور اچھی رائے پائی۔ (سنن ابی داؤد باب فی الظہار)

اسوۂ حسنہ: حضرت عائشہ ام المومنینؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اپنے معاملہ میں کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ جب احکام الٰہی کی خلاف ورزی کی جاتی ہے تو اس کو سزا دیتے۔ (بخاری کتاب الادب باب قول النبی ﷺ یسروا ولا تعسروا)

ایک بار یہودیوں کی ایک جماعت رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ ''السام علیکم'' یعنی تم کو موت آئے۔ حضرت عائشہ سمجھ گئیں اور انھوں نے جواب میں کہا وعلیکم السام واللعنۃ یعنی تم کو موت آئے اور تم پر لعنت ہو۔ رسول کریم ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ عائشہ ٹھہر جاؤ خدا تمام کاموں میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔ بولیں یا رسول اللہ ﷺ انھوں نے جو کچھ کہا کیا آپ نے نہیں سنا فرمایا میں نے بھی تو کہہ دیا ہے کہ علیکم یعنی تم پر (بخاری کتاب الادب باب الرفق فی کل الامر کلہ)

شجاعت

شجاعت کے لغوی معنی ہیں بہادری لیکن علم الاخلاق کی اصطلاح میں قوت غضبی کو اعتدال کے ساتھ استعمال کرنے کا نام ہے جلال الدین دوانی اخلاق جلالی میں لکھتے ہیں کہ شجاعت اس ملکہ کا نام ہے جس کے باعث قوت غضبی ناطقہ کے مطیع ہو کر خوف اور ہلاکت کی جگہوں میں ثابت قدم رکھتی ہے۔ وصف شجاعت اللہ تعالیٰ کی صفات غالب، قاہر عزیز قادر، قوی اور مقتدر کا پرتو ہے یہ وصف رسول کریم ﷺ میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس وصف کا اظہار جنگ یا مصائب و آلام کے وقت ہوتا ہے۔

اہمیت از روئے قرآن مجید: ارشاد الٰہی ہے وَقَاتِلُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (بقرہ ۲:۱۹۰) جو لوگ تم سے لڑتے ہیں۔ تم بھی اللہ کے راستے میں ان سے جنگ کرو لیکن زیادتی نہ کرنا کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران ۳:۱۳۹) اے مسلمانو! ہمت نہ ہارو اور نہ غمگین ہو تم ہی غالب رہو گے اگر تم کامل مومن ہو۔

وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ (النساء ۴:۱۰۴) اے مسلمانو! دشمنوں کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرو یعنی ہمت نہ ہارو اور بزدلی سے کام نہ لو۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ (الانفال ۸:۱۵) اے ایمان والو! جب تم کافروں سے میدان جنگ میں مقابل ہو تو تم پیٹھ نہ پھیرو۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا (انفال ۸:۴۵) اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ سے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو۔

ایک مومن کی تعریف بھی قرآن مجید میں یہ بیان کی ہے کہ وہ کافروں کی قوت کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا ارشاد الٰہی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ (فتح ۴۸:۲۹) وہ کافروں پر زور آور ہیں۔ علم الاخلاق کی کتب میں لکھا ہے کہ اخلاق فاضلہ دراصل چار ہیں۔ حکمت، شجاعت، عفت اور عدالت پھر ان میں سے ہر ایک کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اس سے معلوم ہوا شجاعت ایک نہایت اہم اور اعلیٰ وصف ہے اور رسول کریم ﷺ علی وجہ الکمال اس صفت سے متصف تھے جس کی گواہی حالات و واقعات دیتے ہیں۔

اسوۂ حسنہ: جب مکہ میں کفار آپ کو قتل کرنے کے منصوبے باندھ رہے تھے تب بھی دن کو اور رات کی تاریکی میں باہر نکلتے تھے تمام دوستوں کو مکہ سے رخصت کر کے پھر خود ہجرت کی۔ جب غزوات پیش آئے تو آپ نے سب سے بڑھ کر بہادری کا ثبوت دیا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب بدر میں زور کا رن پڑتا تو ہم لوگ آپ ﷺ ہی کی آڑ میں پناہ لیتے تھے۔ آپ ﷺ سب سے زیادہ شجاع تھے مشرکین کی صف میں اس دن آپ سے زیادہ کوئی قریب نہ تھا۔ (مسند ابن حنبل جلد ا صفحہ ۱۲۶)

جنگ احد میں جب ساری فوج دشمن کے نرغہ میں آ گئی تو آپ ﷺ نے نہایت درجہ کی شجاعت سے آواز دے کر سب کو اکٹھا کیا۔

غزوہ حنین میں ہوازن کے تیر اندازوں کی تیر اندازی کی وجہ سے مسلمانوں کی کثیر التعداد فوج میدان سے بھاگ نکلی لیکن آپ ﷺ مع چند جان نثاروں کے بدستور میدان کارزار میں ڈٹے رہے اور بلند آواز سے کہہ رہے تھے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔

ڈاکے کا خطرہ ہوا تو سب سے پہلے گھوڑے کی برہنہ پشت پر سوار ہو کر تمام خطروں کے مقامات میں گشت لگا آئے اور واپس آ کر لوگوں کو تسلی دی کہ کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ (بخاری)

کسی سفر میں اکیلے درخت کے نیچے لیٹے ہوئے تھے۔ ایک دشمن تلوار لے کر آپ ﷺ کے سر پر آن پہنچا اور جگا کر کہا اب کون تم کو میرے ہاتھ سے بچا سکتا ہے۔ آپ ﷺ ذرا بھر بھی نہیں گھبرائے۔ نہایت ہی پُر رعب آواز سے کہا اللہ۔ دشمن کے ہاتھ سے تلوار نیچے گر پڑی۔ تب آپؐ نے اسی تلوار کو اٹھا کر اس سے کہا اب تم کو میری تلوار کی کاٹ سے کون بچا سکتا ہے تو اس نے عاجزی کا اظہار کیا آپ ﷺ اسے کچھ نہیں کہتے اور چھوڑ دیتے ہیں۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے بڑھ کر سخی اور سب سے بڑھ کر شجاع اور دلیر تھے۔ (بخاری و مسلم)

حضرت براء کہتے ہیں کہ جب لڑائی نہایت خون ریز اور شدید ہوتی تو ہم آنحضرت ﷺ کی پناہ ڈھونڈا کرتے تھے اور ہم میں سے بڑا دلیر وہ شخص ہوتا تھا جو آنحضرت ﷺ کے پہلو میں کھڑا ہوتا۔

عزم و استقلال و استقامت

انسان کی استقامت یہ ہے کہ مستقیم یعنی سیدھی راہ پر لگا رہے۔ (امام راغب)

مصائب اور مشکلات کے درمیان حق و صداقت پر ڈٹے رہنے کا نام عزم استقلال و استقامت ہے۔ علم الاخلاق کے ماہرین شجاعت کا لازمہ سمجھتے ہیں کیونکہ استقامت و ثبات و استقلال کا نہ ہونا بزدلی کی دلیل ہے یہ وصف ہی کسی انسان اور کسی قوم کی ترقی کا باعث ہے۔

اہمیت از روئے قرآن مجید: ارشاد الٰہی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (انفال ۸:۴۵) اے مسلمانو! جب تم کافروں کے کسی گروہ سے مقابلہ کرو تو ثابت قدم رہا کرو اور اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرو۔ تاکہ تم فلاح پاؤ۔

ایک اور موقع پر ارشاد الٰہی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (محمد ۴۷:۷) اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے تو اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمھارے قدموں کو مضبوط کرے گا۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (بقرہ ۲:۲۵۰) جب وہ (طالوت کے پیروکار) جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابل ہوئے تو کہنے لگے اے ہمارے رب ہم پر استقلال نازل فرما ہمارے قدم جمائے رکھ اور ہمیں ان کافروں پر غالب کر۔ علامہ جلال الدین دوانی اخلاق جلالی میں لکھتے ہیں کہ ثبات کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو آلام و مصائب سے مقابلہ کرنے کی قوت حاصل ہو جائے تاکہ رنج و غم بدن یا نفس میں اپنی مقدار سے زیادہ اثر نہ کریں۔

اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ (حم سجدہ ۴۱:۶) کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے سو اسی کی طرف سیدھی راہ پر لگے رہو اور اس سے بخشش مانگو۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (ہود ۱۱:۱۱۲) تو سیدھی راہ پر چلتا رہ جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے اور وہ بھی جو توبہ کر کے تیرے ساتھ ہوا اور حد سے نہ بڑھو جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (حم السجدہ ۴۱:۳۰) وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے پھر سیدھے راہ پر ڈٹے رہتے ہیں ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ تم نہ ڈرو اور نہ غمگین ہو اس بہشت کی خوشی سنو جس کا تم سے وعدہ تھا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (احقاف ۴۶:۱۳) وہ لوگ جو کہتے ہیں اللہ ہمارا رب ہے پر سیدھی راہ پر ڈٹے رہتے ہیں تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

رسول کریم ﷺ کی ساری زندگی عزم استقلال اور استقامت کا نمونہ ہے آپ ﷺ کی زندگی کا ایک ایک کارنامہ آپ کے عزم و استقلال و استقامت کا مظہر اتم ہے۔ عرب کے کفرستان میں ایک بے یار و مددگار شخص دعوت اسلام کی آواز بلند کرتا ہے۔ اپنے و بیگانے حق کی آواز کو دبانے کے لیے تل جاتے لیکن زبردست مصیبت کی لہر بھی آپ ﷺ کے پائے عزم و استقلال میں لغزش پیدا نہ کر سکی۔ روساء مکہ نے آپ کے سامنے حکومت کا تخت، زر و جواہر کا خزانہ حسین سے حسین بیوی کی پیش کش کی لیکن آپ نے حقارت سے تمام پیش کشوں کو ٹھکرا دیا۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب آپ کے ہمدرد اور غم خوار چچا نے بھی ساتھ چھوڑنا چاہا۔ یہ عزم اور استقلال کا آخری امتحان تھا اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا پیارے چچا! اگر قریش میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں میں چاند رکھ دیں تب بھی توحید کی منادی سے باز نہ آؤں گا۔ (ابن ہشام) مکہ سے نکل کر طائف کا ارادہ کیا کہ شاید وہ لوگ آپ ﷺ کی آواز پر کان دھریں لیکن وہاں بھی امید بر نہ آئی۔ انھوں نے پتھر مار مار کر زخموں سے نڈھال کر دیا لیکن ان بظاہر ناکامیوں نے ایک لحہ کے لیے بھی آپ کی آخری کامیابی کے یقین کو متزلزل نہ کیا۔ حج کے ایام میں بندے بندے کے پاس گئے اور پیغام حق پہنچایا۔

آخر وہ وقت بھی آیا جب قتل کا منصوبہ تیار کر کے دشمنوں نے گھر کا محاصرہ کر لیا تب بھی گھبرائے نہیں بلکہ اکیلے گھر سے باہر نکلتے ہیں اپنے ساتھی حضرت ابوبکر کو ساتھ لے کر غار میں پناہ لیتے ہیں جب دشمن برہنہ تلواروں کو لے کر غار کے منہ پر جا پہنچتا ہے تب بھی اپنے ساتھی کو لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (غم نہ کیجئے اللہ ہمارے ساتھ ہے) کہہ کر مژدہ جانفزا سناتے ہیں۔ غرض نازک سے نازک حالات میں بھی آپ کے عزم اور استقلال میں ذرا بھر فرق نہ آیا۔

یہ عزم و استقلال کا پیکر اپنے ساتھیوں کو بھی عزم و استقلال کی مضبوط چٹان پر ڈٹے رہنے کی تلقین ان الفاظ میں کرتا ہے۔

لقد کَانَ مِنْ قَبْلِکُمْ یُوْخَذُ الرَّجُلُ فَیُحْفَرُ لَهٗ فِی الْاَرْضِ فَیُجْعَلُ فِیْهَا ثُمَّ یُوْتٰی بِالْمِنْشَارِ فَیُوْضَعُ عَلٰی رَاْسِهٖ فَیُجْعَلُ بِنِصْفَیْنِ وَیُمْشَطُ بِاَمْشَاطِ الْحَدِیْدِ مَادُوْنَ لَحْمِهٖ وَعَظْمِهٖ مَا یَصُدُّهٗ ذٰلِکَ عَنْ دِیْنِ اللّٰهِ (صحیح بخاری علامات النبوۃ فی الاسلام) تم سے پہلے لوگوں میں ایسا مرد بھی ہوا ہے جس کو زمین میں گاڑ دیا گیا اور آرے سے اس کو چیر کر دو ٹکڑے کر دیا گیا اور لوہے کی کنگھیوں سے اس کا گوشت ہڈی سے نوچ دیا گیا لیکن وہ راہ حق سے الگ نہ ہوا۔

اس تعلیم کا صحابہ پر یہ اثر ہوا۔ ہر صحابی عزم و استقلال کا کوہ گراں بن گیا۔ ہر تکلیف کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ حضرت خباب بن ارث کو جلتے کوئلوں پر چت لٹا دیا گیا۔ ایک شخص ان کی چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائے یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے۔ (ابن سعد جلد ۳ تذکرہ خباب) حضرت بلال کو گرم ریت پر لٹا دیا جاتا۔ بھاری پتھر ان کے سینہ پر رکھ دیا جاتا گلے میں رسی باندھ کر زمین پر گھسیٹا جاتا اور کہا جاتا کہ اسلام کو ترک کر دو اس وقت بھی ان کی زبان سے احد احد کے الفاظ نکلتے خبیبؓ کو سولی پر لٹکا دیا گیا سولی پر چڑھنے سے پہلے کفار سے دو رکعت نماز بطور شکرانہ ادا کرنے کی اجازت لیتے ہیں۔

ہر صحابی تکلیف کے سامنے استقامت کی تصویر بنا ہوا تھا۔ کسی قسم کی تکلیف نے بھی کسی صحابی کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ کی۔

صرف مکی زندگی ہی پرخطر نہ تھی۔ جب ہجرت کر کے مدنی زندگی اختیار کی تو بھی کفار نے پے در پے حملوں سے مسلمانوں کی نیندوں کو حرام کر دیا تھا لیکن جذبہ استقامت نے ان کے حوصلوں کو بلند رکھا۔ آخر کار فتح و نصرت نے ان کے پاؤں چومے۔

اعتدال

امت مسلمہ کو امۃ وسطا (درمیانی امت) کہا گیا ہے جس میں یہی سر ہے کہ امت مسلمہ کا راستہ افراط اور تفریط سے پاک ہے قرآن مجید مسلمانوں کو نماز میں دعا ہی یہ سکھائی ہے۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ اے اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ صراط مستقیم وہی راستہ ہوتا ہے جو افراط اور تفریط کے درمیان ہو پھر اس کے بعد الفاظ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ (نہ ان لوگوں کا راستہ جن پر اللہ کا غضب ہوا اور نہ ان لوگوں کا راستہ جو گمراہ ہوئے) آئے ہیں۔ مفسرین کہتے ہیں المغضوب سے مراد یہود میں اور الضالین سے مراد عیسائی۔ عیسائی اور یہودی دونوں نے افراط اور تفریط کا راستہ اختیار کیا ہے سورہ فاتحہ میں صراط مستقیم کی دعا کے بعد یہ بھی دعا سکھائی کہ اللہ تعالیٰ یہودیوں اور عیسائیوں کے راستہ پر نہ چلائے جو دونوں افراط اور تفریط کے شکار ہیں۔

اسلام نے زندگی کے ہر شعبہ میں اعتدال پسندی کی تعلیم دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاقْصِدْ فِیْ مَشْيِكَ (لقمان ۳۱:۱۹) اپنی رفتار میں اعتدال اختیار کرو۔ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (اسرائیل ۱۷:۲۹) اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھ اور نہ اسے بالکل چھوڑ دے کہ ملامت زدہ اور عاجز ہو کر رہ جائے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (الفرقان ۲۵:۶۷) اور جو لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ درمیانی راستہ اختیار کرتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ مَا اَحْسَنَ الْقَصْدِ فِی الغنٰی وَمَا اَحْسَنَ الْقَصْدِ فِی الْفَقْرِ وَمَا اَحْسَنَ الْقَصْدِ فِی الْعِبَادَةِ یعنی دولت مندی میں اعتدال کتنا اچھا ہے محتاجی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے۔ عبادت میں میانہ روی کتنی اچھی ہے۔ (بروایت کنز العمال جلد دوم ص ۷)

عبادت سے بڑھ کر اسلام میں کوئی نیکی نہیں آپ ﷺ نے اس میں بھی میانہ روی اور اعتدال کی تعلیم دی حضرت عثمان بن مظعون کا واقعہ کتب احادیث میں بیان ہوا ہے کہ انھوں نے جب راتیں عبادت اور دن روزوں میں بسر کرنا شروع کیے تو [illegible] ﷺ نے منع فرمایا اور اعتدال کی تعلیم دی اور فرمایا تمھارے ذمہ اور بھی حقوق ہیں۔ فرمایا اِكْلِفُوْا مِنَ الْاَعْمَالِ مَا تُطِيْقُوْنَ (بخاری) اتنا ہی عمل کا التزام کرو جس کی تمہیں طاقت ہو۔

زہد و قناعت و استغناء

مذکورہ الفاظ کے معنی ایک ہی ہیں یعنی بے نیازی، سیر چشمی، بے نیازی اللہ تعالیٰ کی صفت غنی کا پرتو ہے اور انسان کی بے نیازی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا باقی تمام دنیا سے بے نیاز ہو جائے اور سورہ فاتحہ میں آیت اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں) میں اسی صفت بے نیازی کی تعلیم دی ہے اس صفت میں رسول کریم ﷺ بدرجہ کمال پہنچے ہوئے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے بندوں کو یہی ہدایت دی ہے کہ وہ خدا کے سامنے ہی اپنی حاجات پیش کریں اور غیروں کے مال و منال کی طرف لالچ اور حرص کی نگاہ سے مت دیکھیں ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ اِلٰی مَامَتَّعْنَا بِہٖ (طٰہٰ ۲۰:۱۳۱) اور اپنی آنکھوں کو طمع کے ساتھ ان چیزوں کی طرف مت دیکھئے جو ہم نے ان میں سے طرح طرح کے لوگوں کو سامان دیا ہے۔ اس مضمون کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ (نساء۴:۳۲) اور جس چیز میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی تو اس کی ہوس مت کرو۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کسی کی دولت کی طرف حرص کی نگاہ سے دیکھنے سے منع فرمایا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کسی کی دولت کی طرف لالچ وحرص کی نگاہ سے دیکھنے سے ایک قسم کا شرک لازم آتا ہے۔ اس نکتہ کو رسول کریم ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا۔ لَیْسَ الْغِنٰی عَنْ کَثْرَۃِ الْعُرُوْضِ وَلٰکِنَّ الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ (بخاری باب الغنی غنی النفس) دولت مندی مال و اسباب کی کثرت کا نام نہیں بلکہ دولت مندی دل کی بے نیازی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جس نے خدا کی رضا کو تسلیم کیا اور بقدر حاجت روزی دیا گیا جو کچھ خدا کی طرف سے ملا اس پر خدا نے اسے قانع کر دیا تو اس نے فلاح پائی۔ (مسلم)

<u>اسوۂ حسنہ:</u> رسول کریم ﷺ کے گھر میں متواتر دو دو ماہ تک آگ نہیں جلتی تھی حضرت عائشہ نے یہ واقعہ بیان کیا تو عروہ بن زبیر نے پوچھا کہ آخر کس چیز پر گزارہ فرماتے تھے۔ بولیں پانی اور کھجور البتہ کبھی کبھی ہمسائے والے بکری کا دودھ بھیج دیتے تو پی لیتے۔ (بخاری) حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ تمام عمر یعنی مدینہ کے قیام سے وفات تک آپ نے کبھی دو وقت سیر ہو کر روٹی نہیں کھائی۔ (شمائل)

ایک بار چند انصاریوں نے آپ ﷺ سے مال کا سوال کیا اور آپ ﷺ نے ان کا سوال پورا کیا لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے اور پھر سوال کیا آپ ﷺ نے پھر ان کا سوال پورا کیا۔ جب دیتے دیتے تمام مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ مال ہوگا میں تم سے بچا کر جمع نہ رکھوں گا جو شخص خود داری چاہتا ہے خدا اس کو خوددار بناتا ہے اور جو شخص بے نیازی حاصل کرنا چاہتا ہے خدا اس کو بے نیاز کر دیتا ہے۔ (ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب الاستعفاف)

حکیم بن حزام نے رسول کریم ﷺ سے بار بار مال کا سوال کیا اور آپ نے ہر بار ان کا سوال پورا کیا لیکن آخر میں فرمایا کہ اے حکیم یہ مال نہایت مرغوب چیز ہے جو شخص اس کو کھلے دل سے لیتا ہے اس میں خدا برکت دیتا ہے جو شخص اس کو حرص کے ساتھ لیتا ہے اس میں برکت نہیں ہوتی اور اس شخص کے مثل ہوتا ہے جو کھاتا ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ ان پر اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے اس کے بعد کسی کا عطیہ قبول نہیں کیا۔ (ترمذی کتاب الزہد)

تقویٰ

تقویٰ کا مادہ وقی ہے جس کے لغوی معنی ہیں کسی کی حفاظت کرنا، اذیت سے بچانا اور کسی امر کو درست کرنا۔ اس سے تقویٰ ہے جس کے معنی میں اللہ کا خوف اور اس کی اطاعت شامل ہے۔

تقویٰ کے اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ یہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کے مطابق ہر کام میں صرف خدا کے حکم کو ہی پیش نظر رکھا جائے جس سے نیکی کے کام کی صرف شدید رغبت اور برائی کی طرف شدید نفرت ہوتی ہے۔ یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے۔ جس سے یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر آن حاضر و ناظر ہے۔ جس کی وجہ سے دل میں خیر و شر کی تمیز پیدا ہوتی ہے۔

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ تقویٰ کے بارے میں حضرت کعب الاحبارؓ سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ آپ کبھی خار دار جھاڑیوں کے درمیان سے گزرے ہیں؟ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا ''ہاں'' پوچھا کیسے فرمایا ''دامن سمیٹ کر'' تو حضرت کعبؓ نے کہا ''یہی تقویٰ ہے'' کہ انسان دنیا میں گناہوں کے درمیان اپنا دامن سمیٹ گزرے تاکہ اس کا دامن گناہوں سے آلودہ نہ ہو۔ اس وضاحت کے مطابق تقویٰ گناہوں سے بچنے اور احتیاط کرنے کا نام ہے۔ تقویٰ کے لیے قرآن میں ایک اور لفظ ''خشیۃ'' آیا ہے۔ جس کے معنی بھی ڈرنے اور خوف کھانے کے ہیں۔

تقویٰ کا مرکز: تقویٰ کا مرکز دل ہے۔ قرآن حکیم میں تقویٰ کے ساتھ قلب کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ تقویٰ کا تعلق دل کے ساتھ ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ اور جو اللہ کے شعار (نشانیوں) کی تعظیم کرتا ہے تو یہ صرف دلوں کے تقویٰ سے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ کا اصل تعلق دل سے ہے۔

قرآن میں دوسری جگہ آتا ہے۔ إِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيْمٌ (حجرات ۴۹:۳) بے شک جو لوگ رسول کے سامنے پست آواز سے بات کرتے ہیں وہی ہیں جس کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے واسطے جانچ لیا ہے۔ ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔

تقویٰ کی یہ حقیقت کہ وہ دل کی خاص کیفیت کا نام ہے ایک حدیث سے بالکل واضح ہو جاتی ہے جس میں حضور علیہ السلام نے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا یعنی تقویٰ یہاں ہے۔ اس لیے تقویٰ کو تمام نیکیوں کی جڑ قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ہر نیکی اور برائی کے ارتکاب سے پہلے اس کا خیال دل میں پیدا ہوتا ہے۔ جب دل کو خدا کے خوف کا گھر بنا دیا جائے تو انسان نیکیوں کی طرف مائل رہے گا اور برائیوں سے اجتناب کرتا رہے گا۔

تقویٰ کی اہمیت: تقویٰ دین اسلام کی بنیاد ہے۔ دین اسلام کے کسی عقیدے اور عمل کا تذکرہ تقویٰ کے بغیر نہیں کیا گیا۔ گویا خوف خدا کا جذبہ ہر عقیدہ و عمل کا متحرک ہے۔ اس کے بغیر نہ تو فکر میں صحت پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی عمل میں درستی پیدا ہوتی ہے۔

ایمان اور تقویٰ لازم اور ملزوم ہیں۔

ارشاد الٰہی ہے۔ يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (ال عمران ۳:۱۰۲) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو جس طرح ڈرنے کا حق ہے۔

عزت وفضیلت کا معیار: اللہ کے نزدیک عزت و شرافت کا معیار نسلی اور خاندانی برتری نہیں بلکہ تقویٰ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ (الحجرات ۴۹:۱۳) تم میں سے سب سے زیادہ بزرگ وہ ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِأَحْمَرَ عَلٰى أَسْوَدَ وَلَا لِأَسْوَدَ عَلٰى أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوٰى عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر اور کسی سرخ کو کالے پر اور کسی کالے کو کسی سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔

عبادات الٰہی کی غرض و غایت تقویٰ ہے۔

تمام اسلامی عبادات کی غرض و غایت تقویٰ کا حصول ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ يٰأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ ۲:۲۱) اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

حج کا مقصد بھی تقویٰ کا حصول ہے فرمان الٰہی ہے۔ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (الحج) جو اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرتا ہے تحقیق یہ (کام) دلوں کا تقویٰ ہے۔

رمضان کے روزوں کا پورا سلسلہ تقویٰ کے حصول کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ روزے تم پر فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلی اقوام پر فرض کیے گئے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

خدا کی محبت کا ذریعہ: فرمان الٰہی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (توبہ ۹:۴) بے شک اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے۔ اِنْ اَوْلِيَاءُهٗ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ (انفال ۸:۳۴) تقویٰ والے ہی اللہ کے دوست ہیں۔

نظام اخلاق کی بنیاد: اسلامی نظام اخلاق کی بنیاد ہی تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔ عدل و انصاف کے متعلق آتا ہے۔ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (المائدہ ۵:۸) عدل کرو یہ تقویٰ کے قریب ہے۔ صبر کے متعلق آتا ہے۔ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (ال عمران ۳:۱۸۶) اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بڑی ہمت کی بات ہے۔ عفو اور درگزر کے بارے میں فرمان الٰہی ہے۔ وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (بقرہ ۲:۲۳۷) اگر تم معاف کر دو تو یہ بات تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

معیت الٰہی کا ذریعہ: متقی اللہ کی معیت کے شرف اور اس کی نصرت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (التوبہ ۹:۳۶) جان لو کہ بے شک اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے۔

قبول اعمال کا ذریعہ: ایک کام مختلف اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھ کر انجام دیا جاتا ہے۔ اللہ اعمال کو قبول کرتا ہے جن کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (المائدہ ۵:۲۷) اللہ تقویٰ والوں ہی سے قبول کرتا ہے۔ آدم کے دو بیٹوں قابیل اور ہابیل نے قربانی کی۔ لیکن قابیل کی قربانی ٹھکرا دی گئی اور ہابیل کی قربانی قبول کر لی گئی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اس عمل کو قبول کرتا ہے جس کا حقیقی محرک محض خدا کا تقویٰ ہے۔

اچھا انجام: دنیا چند روز ہے۔ مال و دولت جاہ و منصب سب عارضی چیزیں ہیں۔ ہمیشہ قائم رہنے والی چیز اچھائی اور نیکی ہے۔ یہ دائمی چیز تقویٰ اور پرہیزگاری سے حاصل ہوتی ہے۔ دراصل انسان کی حقیقی کامیابی اور کامرانی یہی ہے کہ وہ نیکی اور اچھائی کا سرمایہ لے کر اس دنیا سے جائے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (الاعراف ۷:۱۲۸) اور اچھا انجام تقویٰ والوں کے لیے ہے۔ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ (ھود ۱۱:۴۹) بے شک انجام متقیوں کے لیے ہے۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى (طہ ۲۰:۳۲) اور اچھا انجام تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لیے ہے۔

تقویٰ بہترین زادِ راہ ہے: جب کوئی شخص سفر پر نکلتا ہے تو اپنے ساتھ زادِ راہ لیتا ہے انسان اس دنیا میں ایک اہم سفر پر گامزن ہے اس کا یہ سفر موت ختم کرے گی۔ اس سفر کے لیے بہترین زاد راہ تقویٰ ہے اور اس پیہم سفر میں اور کوئی زاد راہ مفید نہیں۔ یہ زاد راہ سفر کی کامیابی کی کلید ہے ارشاد الٰہی ہے۔ فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (بقرہ ۲:۱۹۷) سب سے اچھا زاد راہ تقویٰ ہے۔

بہترین لباس: قرآن مجید نے تقویٰ کو بہترین لباس قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ (اعراف ۷:۲۶) اور تقویٰ کا لباس سب سے اچھا ہے۔

لباس کا یہ کام ہوتا ہے کہ انسان کو گرمی اور سردی سے بچاتا ہے اس کی جسمانی عریانی کا ستر ہے اور انسان کی خوبصورتی کا ذریعہ ہے تقویٰ کو انہی وجوہ کی بناء پر لباس سے تشبیہ دی ہے کہ وہ انسان کو گناہوں سے بچاتا ہے انسان کی اخلاقی عریانی کا پردہ ہے۔ جب انسان تقویٰ کا لباس پہن لیتا ہے تو اخلاقی عیوب چھپ جاتے ہیں۔ اس طرح جو شخص تقویٰ کی باریک راہوں پر گامزن ہوتا ہے تو اس کا اخلاقی حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

خشوع وخضوع کا ذریعہ: تقویٰ سے عبادت میں خشوع اور خضوع اور دل میں خوف پیدا ہوتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا نقطہ آغاز: تقویٰ تمام نبیوں کی دعوت کا نقطہ آغاز رہا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلے دن جو کام سپرد ہوا وہ یہی تھا کہ قوم فرعون کو تقویٰ کی دعوت دو۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ قَوْمَ فِرْعَوْنَ اَلَا يَتَّقُوْنَ (الشعراء ۲۶:۱۰، ۱۱) جب تیرے رب نے موسیٰ کو پکارا کہ ظالم قوم کے پاس جائے۔ (فرعون کی قوم) کیا وہ تقویٰ اختیار نہیں کریں گے۔

حضرت نوح کی دعوت کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے۔ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ میں تمہارے لیے ایک رسول امین ہوں۔ پس

اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

تقویٰ کے متعلق ارشادات نبوی اور اکابرین اسلام

فرمایا میں تمھیں تقویٰ کی تلقین کرتا ہوں کیونکہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو جو بہترین تلقین کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے آخرت کے لیے آمادہ کرے اور تقویٰ کا حکم دے۔ (طبری)

فرمایا تقویٰ ہر نیکی کی ابتداء ہے پھر فرمایا "تقویٰ زندگی کے ہر شعبے کو حسن و جمال بخشا ہے۔"

ایک صحابی نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا میں سفر پر جا رہا ہوں آپ میرے لیے دعا فرمائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا "اللہ تمھیں تقویٰ کا زادِ راہ دے۔"

حدیث قدسی ہے "میں اس بات کا سزاوار ہوں کہ مجھ سے تقویٰ رکھا جائے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے اور اس کے لیے میرے پاس مغفرت ہے۔" (اربعین)

حضرت ابوذر غفاریؓ کے استفسار پر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا "میں تمھیں تقویٰ کی تلقین کرتا ہوں کیونکہ یہ ہر چیز کی ابتداء ہے۔"

صحیح مسلم میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا "تقویٰ سے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے۔" بخاری اور مسلم میں ہے۔ "تقویٰ سے انسان حقوق و فرائض سے آگاہ ہوتا ہے۔ ہر حلال و حرام کی تمیز ہوتی ہے۔"

جن چیزوں کا حلال یا حرام ہونا شریعت سے معلوم نہیں متقی ایسی مشکوک اشیاء سے بھی کنارہ کش رہتا ہے۔

فرمایا "تقویٰ آبرو ہے اور خدا کی خوشنودی اور بلندی درجات کا موجب ہے۔"

حضرت ابوبکرؓ اکثر فرمایا کرتے تھے "دنیا کی تاریکیوں میں تقویٰ چراغ کی راہ کا کام دیتا ہے۔

معروف قرنی کا قول ہے زندگی دریا ہے آخرت اس کا ساحل تقویٰ اس کی کشتی۔

تقویٰ کے حصول کے بہترین ذرائع ایمان باللہ، عبادت الٰہی دعا، حب رسول صحبت صادقین، حلال و حرام کی تمیز اور آخرت میں محاسبہ کا خوف ہیں جب ایک انسان ان ذرائع پر کاربند ہوتا ہے تو اس کے دل میں تقویٰ نشوونما پانا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر ایک وقت وہ آتا ہے جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یَآ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (الفجر ۸۹: ۲۷، ۲۸) اے اطمینان پانے والی جان! اپنے رب کی طرف لوٹ آ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔

توکل

لفظ توکل کی وضاحت: وکلتُ امری الی فلان کے معنی ہیں میں اپنا معاملہ دوسرے کی طرف لے گیا اور اس بارہ میں اعتماد کیا توکل کا استعمال دو طرح پر ہے ایک صلہ ''لام'' کے ساتھ توکلت لفلان کے معنی ہیں توکلت لہ یعنی اس کی خاطر میں اس کا متولی ہوگیا۔ صلہ ''علی'' کے ساتھ یعنی توکلت علیہ کے معنی ہیں اعتمدت علیہ اس پر میں نے اعتماد کیا۔ (امام راغب)

اہمیت از روئے قرآن مجید: ارشاد الٰہی ہے۔ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (ال عمران ۳:۱۵۹) جب تو ارادہ کرے پھر خدا پر بھروسہ کر بے شک اللہ بھروسہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

فرمایا وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (المائدہ ۵:۱۳) اور اللہ ہی پر بھروسہ کرو۔ اگر تم ایمان والے ہو۔

فرمایا تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ (الفرقان ۲۵:۵۸) اس زندہ پر بھروسہ کر جو کبھی نہیں مرے گا۔ اللہ کے اوپر توکل کرنے کے کیا معنی ہیں۔ لفظی معنی اعتماد کرنا ہے خدا پر اعتماد کرنے سے یہ مطلب نہیں کہ ہمیں کچھ نہیں کرنا چاہیے اور کام کو خدا پر چھوڑ دینا چاہیے آج کل کے متصوفین نے ترک عمل اور اسباب سے بے پروائی کا نام توکل رکھا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید کی روشنی میں توکل اسباب سے کام لینے کا نام ہے۔ سورہ ال عمران میں جہاں دو گروہوں (بنو حارثہ اور بنو سلمہ) کا ذکر ہے کہ انھوں نے جنگ سے واپس ہو جانے کا ارادہ کیا۔ خدا نے ان کو اس ارادہ پر عمل کرنے سے بچا لیا اور فرمایا۔ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۳:۱۶۰) یعنی اللہ پر ہی مومنوں کو بھروسہ کرنا چاہیے تو معلوم ہوا کہ جنگ کرنا ہی توکل تھا اور جنگ نہ کرنا اور واپس چلا جانا خلاف توکل تھا۔ پس قرآن مجید کے اس استعمال نے واضح کر دیا کہ توکل اسباب سے پورا کام لینے کا نام ہے اور حقیقت میں وہ شخص متوکل علی اللہ نہیں کہلا سکتا جو اسباب کو کام میں نہیں لاتا بلکہ حقیقت میں توکل یہ ہے کہ اسباب و علل کتنے ہی کمزور نظر کیوں نہ آئیں تو بھی ان سے کام لیا جائے اور نتیجہ خدا پر چھوڑ دیا جائے۔ پس خدا پر توکل کرنے کے یہ معنی ہوئے کہ اسباب کو پورا عمل میں لایا جائے پھر نتیجہ خدا پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ توکل انسان کی ہمت کو بڑھانے والی چیز ہے یہی وہ توکل ہے جس پر صحابہ کرام نے عمل کیا اور کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (النساء ۴:۸۱) تو (ان منافقوں) سے درگزر کر اور اللہ پر بھروسہ رکھ اللہ ہی کارساز ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (احزاب: ۳۰) اللہ پر بھروسہ رکھ اللہ ہی کارساز ہے۔ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (التوبۃ ۹:۱۲۹) اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے وہ بڑے تخت ...... ہے۔

احادیث سے بھی یہی واضح ہوتا ہے رسول کریم ﷺ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ اونٹ کو خدا کے توکل پر کھلا چھوڑ دوں تو آپ ﷺ نے فرمایا اِعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ اس کے گھٹنے کو اس سے باندھ اور توکل کر یعنی اسباب کو کام میں لاؤ پھر نتیجہ خدا پر چھوڑ دو۔

رسول کریم ﷺ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس بات کی شہادت دیتا ہے۔ آپ (ﷺ) کو خدا کی ذات پر مکمل توکل اور اعتماد تھا۔ مکی زندگی میں جب مصائب و آلام کے سیاہ بادل منڈلا رہے تھے اس وقت بھی آپ (ﷺ) کے دل میں کسی قسم کی مایوسی اور ناامیدی پیدا نہیں ہوئی۔ جب مونس اور غم خوار چچا ابو طالب کفار کے دباؤ کی وجہ سے سمجھانے لگتے ہیں تو آپ (ﷺ) فرماتے ہیں خدا مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا۔ (ابن ہشام) مکہ میں ایک دکھیا صحابی سے فرماتے ہیں۔ ''خدا کی قسم عنقریب وہ وقت آتا ہے جب یہ دین مرتبہ کمال کو پہنچ جائے گا اور خدا کے سوا کسی اور کا ڈر نہیں رہے گا۔ (صحیح بخاری جلد اوّل)

ہجرت کی رات میں مکہ کے قسی القلب نوجوان ہاتھوں میں تلواریں لیے ہوئے خون آشام ارادوں کے ساتھ آپ (ﷺ) کے گھر کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں۔ آپ (ﷺ) خدا کے اذن پر اعتماد کر کے نامساعد حالات میں گھر سے باہر نکلتے ہیں اور سیدھے حضرت ابو بکر کے گھر جاتے ہیں اور ان کو ساتھ لے کر اونٹوں پر سوار ہو کر غار ثور میں پناہ لیتے ہیں۔ کفار اپنی ناکامی و نامرادی کی آگ میں جل کر آپ (ﷺ) کے تعاقب میں نشان قدم دیکھتے ہوئے اس غار کے منہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ حضرت ابو بکر کفار کے پاؤں دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں اور عرض کرتے ہیں۔ ''یارسول اللہ! دشمن اس قدر قریب آ گیا ہے کہ اگر ذرا نیچے جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھیں تو ہم پر نظر پڑ جائے گی۔''

لیکن اس غم اور مصیبت کی گھڑی میں بھی پڑ اعتماد اور پرسکون آواز میں فرماتے ہیں۔ ''لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا'' غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

غارثور میں تین دن کے قیام کے بعد مدینہ کی طرف رخ کرتے ہیں تو سراقہ بن جعشم سو اونٹ بطور انعام حاصل کرنے کی خاطر آپ (ﷺ) کا تعاقب کرتا ہے۔ وہ بہت قریب پہنچ جاتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ بار بار اضطراب کی حالت میں مڑمڑ کر دیکھتے ہیں لیکن آپ (ﷺ) نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا بلکہ آپ (ﷺ) سکینت ربانی کے سایہ میں تلاوت قرآن مجید کرتے ہوئے جا رہے ہیں۔

احد اور صفین کے غزوات میں جب مسلمان میدان جنگ کو قلیل عرصے کے لیے چھوڑ گئے تھے اس وقت بھی آپ توکل کے اس ارفع مقام پر کھڑے تھے۔ جہاں یاس اور ناامیدی، خوف ہراس، اضطراب و بے قراری کی ہوا تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

غزوہ نجد سے واپسی میں آپ (ﷺ) نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا جہاں درختوں کے جھنڈ تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ صحابہ درختوں کے سایہ میں ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ آپ (ﷺ) بھی ایک درخت کے نیچے تلوار لٹکا کر استراحت فرما رہے تھے۔ چپکے سے ایک بدو آ نکلا۔ تلوار کو اتار کر آپ (ﷺ) کے سینہ پر سوار ہو گیا اور کہا ''اے محمدؐ! اب مجھ سے کون تم کو بچا سکتا ہے۔ آپ (ﷺ) نہایت ہی اطمینان سے کہتے ہیں ''اللہ''

یہ توکل کا ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ بھی اس سے کم دلکش نہیں آپ (ﷺ) نے کبھی بھی ایک دن کی آمدنی دوسرے دن کے لیے اٹھا نہیں رکھی تھی جو بچ جاتا شام تک مستحقین میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ ترمذی میں حضرت انسؓ سے روایت ہے اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم کَانَ لَا یُدَّخِرُ لِغَدٍ رسول اللہ ﷺ کل کے لیے کوئی چیز اٹھا کر نہیں رکھتے تھے۔

نزع کی حالت میں جب انسان دنیا اور مافیہا کو فراموش کر دیتا ہے اس حالت میں آپ (ﷺ) کو یاد آیا۔ چند اشرفیاں گھر میں پڑی ہوئی ہیں فوراً حضرت عائشہؓ سے فرماتے ہیں۔ عائشہ! ''کیا محمدؐ خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا۔ جاؤ پہلے ان کو خیرات کر دو۔'' سبحان اللہ اس نازک موقع پر بھی سید المرسلین و خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ نے توکل کے ارفع مقام کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ توکل کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ کسی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے خدا کے پیدا کردہ اسباب وعلل کو استعمال میں لایا جائے پھر نتیجہ خدا کے سپرد کر دیا جائے۔

توکل کی وضاحت کے لیے ہجرت کا ذکر کیا ہے اس میں بھی رسول کریم ﷺ کے سامنے حسب ذیل ترجیحات تھیں۔

۱۔ اپنے ساتھیوں میں سے بہتر ساتھی حضرت ابوبکرؓ کو مصاحبت کے لیے منتخب کیا۔

۲۔ اکل وشرب کی اشیاء تیار کروائیں۔

۳۔ اس طویل سفر کے لیے اعلیٰ اونٹنیوں کا بندوبست کیا۔

۴۔ ایک ماہر راستوں کو جاننے والے ہادی کی خدمات حاصل کیں۔

۵۔ آپ (ﷺ) کا گھر دشمنوں کے احصار میں تھا۔ آپ (ﷺ) نے کمال دانشمندی سے اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو سلا دیا تاکہ دشمنوں کو یہ باور کرایا جائے کہ آپ ﷺ گھر میں ہی ہیں۔

۶۔ رسول کریم ﷺ کو علم تھا کہ دشمن گھر میں آپ ﷺ کو نہ پا کر آپ ﷺ کے پیچھے بھاگے گا تو آپ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ غار ثور میں پناہ گزیں ہو گئے۔

۷۔ جب دشمن غار کے منہ تک پہنچ گیا تو حضرت ابوبکرؓ کی گھبراہٹ دیکھ کر یہ فرمایا۔ مَاظَنُّکَ یَا اَبَابَکْرٍ بِاثْنَیْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا (صحیح بخاری)

اے ابوبکر! ان دو ہستیوں کے بارے میں کیا گمان رکھتے ہو؟ جن کے ساتھ تیسرا اللہ تعالیٰ ہے؟

رسول کریم ﷺ نے ہجرت کرنے سے پہلے تمام میسر اسباب وعلل کو اختیار کیے اور نتیجہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا۔

اسی طرح رسول کریم ﷺ کی جنگوں کا مطالعہ کرنے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ (ﷺ) نے حتی المقدور اسباب وعلل سے کام لیا اور مادی اسباب مہیا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی جناب میں یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔ ''اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ وَمُجْرِی السَّحَابِ وَهَازِمَ الْاَحْزَابِ اهْزِمْهُمْ وَانْصُرْنَا عَلَيْهِمْ'' (صحیح بخاری وصحیح مسلم) اے اللہ! کتاب نازل کرنے والے بادلوں کو چلانے والے دشمن کو شکست دینے والے ان کو شکست دے اور ہمیں ان پر فتح عطا کر۔ جب کبھی ایسی حالت آ جائے جب بظاہر کوئی سبب وعلت نظر نہیں آتی۔ تو اللہ تعالیٰ کے حضور ملتجی ہوتے ہیں۔ دعا خود ایک سبب ہے۔ رسول کریم ﷺ ہمیشہ اس قوی سبب کو اختیار کرتے تھے اور اس سے ایک لحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہوتے تھے۔ یہ وہ روحانی سبب ہے جس سے لوگ غافل ہیں۔ جیسا کہ غزوہ اُحد اور غزوہ حنین میں صحابہ میدان جنگ سے وقتی طور پر منتشر ہو گئے تو اس وقت بھی آپ ﷺ کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی اور آپ ﷺ اپنی جگہ پہاڑ کی طرح ڈٹے رہے۔ یہاں بچاؤ کے لیے بظاہر کوئی سبب نظر نہیں آتا۔ لیکن اس خطرناک موقع پر آپ ﷺ نے روحانی سبب یعنی دعا کو استعمال کیا۔ اللہ

تعالیٰ نے غیب سے پھر مادی اسباب پیدا کر دیے اور جنگوں میں کامیابی حاصل کر لی۔

ایک مادہ پرست کامیابی یا نتیجہ حاصل کرنے کے لیے صرف مادی اسباب پر بھروسہ رکھتا ہے جبکہ ایک مسلمان مادی اسباب کے ساتھ روحانی سبب یعنی دعا کو بھی استعمال میں لاتا ہے کیونکہ وہ حقیقی سبب الاسباب اللہ تعالیٰ کی ذات کو سمجھتا ہے۔ انہی متوکلین کے متعلق رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ لَوْ اَنَّكُمْ تَتَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهٖ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرَ تَغْدُوْ خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا (سنن ترمذی) اگر تم اللہ پر ایسے بھروسا کرو جس طرح بھروسا کرنے کا حق ہے تو تمھیں بھی ایسے روزی دے گا جس طرح پرندوں کو دیتا ہے۔ صبح خالی پیٹ نکلتا ہے شام کو سیر ہو کر واپس آتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب ایک بندہ مادی اسباب کی دست یابی سے مایوس ہو جاتا ہے پھر وہ روحانی سبب (دعا) کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ غیب سے ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے جو انسان کی عقل سے ماوراء ہوتے ہیں افسوس یہ ہے کہ مادہ پرستوں نے روحانی سبب (دعا) سے منہ پھیر لیا ہوا ہے۔ حالانکہ حقیقی مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ ہے اس لیے رسول کریم ﷺ گھر سے نکلتے وقت فرمایا کرتے تھے۔ بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (سنن ترمذی) اللہ کے نام سے میں اللہ پر توکل کرتا ہوں۔ اللہ کے سوا کوئی بھی سبب اور قوت کا مالک نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِىْ سَبْعُوْنَ اَلْفًا بِغَيْرِ حِسَابٍ هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَسْتَرْقُوْنَ وَلَا يَتَطَيَّرُوْنَ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (بخاری و مسلم) میری امت سے ستر ہزار آدمی بے حساب جنت میں داخل ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں نہ تو جنتر منتر کراتے تھے اور نہ بدشگون لیتے تھے بلکہ ہر حال میں اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے تھے۔

مسئلہ توکل کے بارے میں مسلمانوں میں افراط اور تفریط پایا جاتا ہے۔ ایک طبقہ محض مادی اسباب کو ہی کامیابی کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کا خفی شرک ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کو بالکل الگ کر کے مادی اسباب پر بھروسہ کرنا افراط ہے۔ اسی طرح دوسرا طبقہ مادی اسباب کو ترک کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیے رکھتا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مادی اسباب سے کام لینے کا حکم دیا ہے۔ یہ تفریط ہے۔ صحیح راستہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ تمام مادی اسباب کو حتی المقدور کام میں لایا جائے پھر نتیجہ خدا پر چھوڑ دیا جائے۔

قرآن مجید میں مادی اسباب سے کام لینے کے متعلق آتا ہے۔ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى اور انسان کے لیے نہیں ہے مگر وہی جو اس نے کوشش کی بے شک اس کو اس کی سعی کا پھل ملے گا۔

خوش کلامی

خوش کلامی سے یہ مقصد ہے کہ باہم ایک انسان دوسرے انسان سے کلام کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھے تاکہ آپس میں تعلقات خوشگوار پیدا ہوں۔ معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے خوش کلامی بہت ضروری ہے۔ خوش کلامی ہی پیار و محبت کے جذبات پیدا کرتی ہے اور بدکلامی باہمی عداوت اور نفرت کا سبب بنتی ہے۔

اہمیت از روئے قرآن مجید: ارشاد الٰہی ہے۔ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (بقرہ ۲:۸۳) لوگوں سے اچھی بات کہو۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ وَقُلْ لِعِبَادِی یَقُوْلُوا الَّتِی هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُبِیْنًا (بنی اسرائیل ۱۷:۵۳) اے پیغمبر! میرے بندوں سے کہہ دے کہ وہ بات کہیں جو سب سے اچھی ہو بے شک شیطان ان کے درمیان جھگڑا پیدا کرتا ہے۔ بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

بدکلامی اور حقارت آمیز الفاظ استعمال کرنے سے سختی سے روکا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الْاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ (حجرات ۴۹:۱۱) اور اپنے لوگوں کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کے نام دھرو۔ ایمان کے بعد برا نام کیا ہی برا ہے۔

اہمیت از روئے حدیث: حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیَقُلْ خَیْرًا اَوْ لِیَصْمُتْ (بخاری باب من کان جارہ) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اچھی بات کہے ورنہ خاموش رہے۔ قَالَ اَبُوْهُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْكَلِمَةُ الطَّیِّبَةُ صَدَقَةٌ (بخاری باب طیب الکلام) حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اچھی بات بمنزلہ صدقہ کے ہے۔

عَنْ عَدِی بن حاتم قَالَ قَالَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ فَاِنْ لَمْ تَجِدْ فَبِكَلِمَةٍ طَیِّبَةٍ (بخاری باب طیب الکلام) حضرت عدی بن حاتم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صدقہ کر کے دوزخ کی آگ سے بچو اگرچہ وہ صدقہ کھجور کے ایک ٹکڑے کا ہو اگر اتنا بھی نہ ہو تو اچھی بات کہہ دو۔

عَنْ بِنِ عَبَسَةٍ قَالَ اَتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَقُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَاالْاِسْلَامُ قَالَ طَیِّبُ الْكَلَامِ (مسند امام احمد) حضرت ابن عبسہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ! اسلام کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا خوش کلامی۔

چشم پوشی

چشم پوشی، حسن معاشرت کا ایک بہترین عمل ہے۔ اسلام نے چشم پوشی کا حکم دے کے اشاعت فحش اور منکرات کا سد باب کر دیا ہے۔ سورۃ النور میں واضح طور پر اشاعت فحش کو عذاب الیم کا موجب قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النور ۲۴:۱۹) ترجمہ: جو لوگ چاہتے کہ بے حیائی کی باتیں ان لوگوں میں پھیلیں جو ایمان لائے ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

سورۃ ہمزہ میں عیب لگانے اور طعن دینے والے کے لیے ویل (ہلاکت) کی خبر دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَیْلٌ لِّکُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ (ہمزہ ۱۰۴:۱) ترجمہ: تباہی ہے ہر عیب لگانے والے (عیب ڈھونڈنے والے) طعن کرنے والے کے لیے۔

ہمزہ کسی کے منہ پر عیب لگانے والے کو کہا جاتا ہے اور لمزہ پیٹھ کے پیچھے عیب لگانے والے کو کہا جاتا ہے۔ عیب جوئی ان دو ہی طریقوں سے ہوتی ہے۔ دونوں طریقوں کو اس آیت کریمہ میں نہایت وضاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ چشم پوشی امن و سلامتی کا دروازہ کھولتی ہے اس کے برعکس عیب جوئی فساد اور بگاڑ کا در وا کرتی ہے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ لا یستر عَبْدٌ عَبْداً فِی الدُّنْیَا اِلَّا یَسْتُرَهُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ. (مسلم باب من ستر) جو شخص دنیا میں کسی کی پردہ پوشی کرتا ہے قیامت کے دن اللہ اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ فرمایا۔ مَنْ سَتَرَ عَوْرَةَ اَخِیْهِ الْمُسْلِمِ سَتَرَ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَمَنْ کَشَفَ عَوْرَةَ اَخِیْهِ الْمُسْلِمِ کَشَفَ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ حَتّٰی یَفْضَحَهُ بِهَا فِی بَیْتِهٖ. (ابن ماجہ) جو شخص اپنے بھائی مسلمان بھائی کے عیب پر پردہ ڈالتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیب پر پردہ ڈالے گا۔ اور جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے عیب ظاہر کرتا ہے اللہ اس کے عیب ظاہر کرے گا۔ حتیٰ کہ اس کو گھر بیٹھے رسوا کر دے گا۔

مَنْ رَاٰی عَوْرَةً فَسَتَرَهَا کَانَ کَمَنْ اَحْیَا مَوْؤدَةً (ابوداؤد فی ستر علی المسلم) جس شخص نے کسی کا عیب دیکھا اور اس پر پردہ ڈالا۔ اس نے گویا زندہ گاڑی ہوئی لڑکی کو قبر سے نکالا۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے۔ کہا۔ صَعِدَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم الْمِنْبَرَ فَنَادٰی بِصَوْتٍ رَفِیْعٍ فَقَالَ یَامَعْشَرَ مَنْ اَسْلَمَ بِلِسَانِهٖ وَلَمْ یَفْضِ الْاِیْمَانَ اِلٰی قَلْبِهٖ لَا تؤذُوا الْمُسْلِمِیْنَ وَلَا تُعیروْهُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِهِمْ فَاِنَّهٗ مَنْ تَبِعَ عَوْرَةَ اَخِیْهِ الْمُسْلِمِ تَبِعَ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ یَفْضَحْهُ وَلَوْ فِی جَوْفِ رَحْلِهٖ (ترمذی باب فی التعظیم المومن) رسول اللہ ﷺ منبر پر چڑھے اور بلند آواز سے فرمایا کہ اے لوگو! جن کی زبانیں ایمان لائی ہیں اور جن کے دلوں تک ایمان نہیں پہنچا۔ مسلمانوں کو ایذا نہ دو۔ ان کو عار نہ دلاؤ۔ اور ان کے عیب تلاش کرو۔ کیونکہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے عیب ڈھونڈتا ہے۔ خدا اس کے عیب ڈھونڈتا ہے اور جس شخص کے عیب خدا ڈھونڈھے وہ خواہ گھر میں چھپ کر بیٹھ جائے رسوا ہو جاتا ہے۔

خدمت خلق (خیر خواہی)

مخلوق خدا کی بے لوث، بغیر لالچ اور بلا معاوضہ خیر خواہی کو خدمت خلق کہا جاتا ہے۔ یہ ایک معاشرتی خلق ہے۔ جس کی اسلام میں بہت ہی اہمیت دی گئی ہے۔ اسی پر معاشرتی زندگی کی اساس ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا مطالعہ کر لیجئے۔ اس میں خدمت خلق کا پہلو نمایاں ہوگا۔ اسلام کی رو سے خدمت خلق میں صرف انسان ہی شامل نہیں بلکہ چرند پرند سب شامل ہیں اور یہی اسوہ حسنہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

خدمت خلق بہت بڑی نیکی اور عبادت ہے۔ جذبہ خلق ہی درحقیقت کسی قوم کی کامرانی و کامیابی کا ضامن ہے یہ نہ ہو تو قوم تباہ و برباد ہو جائے۔ جب کسی قوم کے افراد میں نفسانفسی کا عالم ہو۔ اور وہ اپنا اپنا راگ اور اپنی اپنی ڈفلی کے اصول پر عمل کرنے لگیں۔ انہیں اپنے رشتہ داروں کی فکر نہ ہو۔ پڑوسیوں کا خیال نہ ہو۔ بیمار کی تیمارداری ان کے لیے ضروری نہ ہو۔ وہ آپس کے دکھ سکھ میں شریک نہ ہوں۔ اور جب ان کی تجوریاں پُر ہوں۔ اور غریب فاقوں سے دم توڑ رہے ہوں۔ ان کے تن پر کپڑے نہ ہوں۔ تو ایسی قوم ہرگز ترقی نہیں کر سکتی۔ ترقی تو کجا ایسی قوم کا زندہ رہنا ہی مشکل ہے۔ جس قوم نے اس جذبہ خدمت خلق کو اپنا لیا وہی کامیابی و کامرانی کے رستہ پر گامزن ہوتی ہے۔ خدمت خلق کوئی آسان کام نہیں۔ ایثار اور قربانی کا طالب ہے چنانچہ یہ جذبہ صرف اسی شخص میں ابھر سکتا ہے جو ایثار، قربانی، ہمدردی، اخوت، مساوات، احسان اور صبر جیسی صفات عالیہ سے متصف ہو۔ بد اخلاق، تن آسان، لالچی اور مطلب پرست انسان سے خدمت خلق کی توقع رکھنا عبث ہے۔

خُلق کی تعریف میں پڑھ آئے ہیں کہ خلق درحقیقت انسانوں کے باہمی تعلقات میں اچھائی برتنے کا نام ہے۔ خلق کی اس حقیقت کی بناء پر واضح ہو جاتا ہے۔ کہ خلق کو برتنے کے لیے انسانوں میں باہمی تعلقات اور وابستگی کتنی ضروری ہے۔ اس کے بغیر اخلاق اور حقوق العباد بے معنی چیز ہو کر جاتے ہیں۔ اگر انسان معاشرہ سے کٹ کر رہبانیت یا تجرد کی زندگی بسر کرے اور مخلوق خدا سے کوئی سروکار نہ ہو۔ وہ خدمت خلق جیسے اہم فریضہ سے محروم رہتا ہے اگر ہم یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ کہ وہ منشاء ربانی کو پس پشت ڈال کر ایک بڑے جرم کا مرتکب ہوتا ہے اس لیے اسلام میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی بجا آوری ضروری قرار دی گئی ہے حقوق اللہ کی ادائیگی معاشرہ سے تنہائی اور علیحدگی میں بھی ایک حد تک ہو سکتی ہے۔ (حقیقت تو یہ ہے کہ تنہائی میں حقوق اللہ کی ادائیگی بھی کماحقہ نہیں ہو سکتی، نماز باجماعت اور حج جیسے فرائض معاشرہ میں رہ کر ہی ادا کئے جا سکتے ہیں) لیکن حقوق العباد کی ادائیگی معاشرہ میں رہ کر ہی کی جا سکتی ہے۔ جو حضرات اس دنیا کو ترک کر کے رہبانیت اختیار کر لیتے ہیں پہاڑوں جنگلوں اور میدانوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ وہ معاشرہ کی مشکلات کو حل کرنے میں مدد نہیں دیتے بلکہ مشکلات میں مزید اضافہ کا سبب بنتے ہیں نہ وہ غریبوں کی مدد کر سکتے ہیں نہ یتیموں، ناداروں اور بیوؤں کی سرپرستی کر سکتے ہیں نہ لوگوں کو گمراہی اور ضلالت سے بچا سکتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تبلیغ و دعوت، پندو موعظت، تعلیم و تربیت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر جیسے فرائض سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے حالانکہ اخلاقی عبادتوں کے یہی بہترین مواقع ہیں۔ چونکہ خدمت خلق کا فریضہ معاشرہ میں ہی رہ کر ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے یہ تسلیم کئے۔ بغیر چارہ نہیں کہ حقوق العباد اور خدمت خلق لازم و ملزوم ہیں جن کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام معاشرہ سے زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے اور رہبانہ زندگی کا سختی سے مخالف ہے یہی وجہ ہے اسلام نے اخلاق اور حقوق العباد کی ادائیگی پر بہت زور دیا ہے حقوق اللہ کی کوتاہی کو تو شاید معاف کر دیا جائے لیکن حقوق العباد کی تقصیر اسلام کے نزدیک قطعی طور پر نا قابل معافی ہے یہی نہیں بلکہ حقوق العباد کی کوتاہی لازمی طور پر حقوق اللہ پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اس لیے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مظلوم کے گناہ ظالم کے حساب میں شامل کر دے گا اور ظالم کی نیکیاں مظلوم کے حساب ہیں۔

چونکہ خدمت خلق اور حقوق العباد میں چولی دامن کا تعلق ہے اس لیے اسلام نے خدمت خلق کو بھی ایک مسلمان کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔

اہمیت از روئے قرآن مجید: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ. (البقرہ ۲:۱۷۷) اور خدا کی محبت کے سبب اپنا مال رشتہ داروں کو یتیموں کو محتاجوں کو مانگنے والوں کو دے اور گردنیں چھڑانے میں صرف کر دے۔

ایک اور مقام پر نیک لوگوں کا وصف خدمت خلق ٹھہرایا ہے۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا (الدھر ۷۶:۸) وہ اس کی رضا محبت کے لیے مسکین، یتیم اور اسیر (قیدی) کو کھانا کھلاتے ہیں۔ (حالانکہ ان کو کھانے کی خود بھی ضرورت اور خواہش ہوتی ہے)

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر ۵۹:۹) وہ اپنے پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اور خود ضرورت مند ہی کیوں نہ ہوں۔ فرمایا مَنْ ذَالَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗ اَجْرٌ كَرِيْمٌ اور کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے اور یہ صدقہ اس کے لیے دو چند کر دیا جائے گا۔ اور اس کے لیے اجر ہے پسندیدہ۔ سورۃ بقرہ میں راہ خدا میں مال خرچ کرنے والوں کو خوش خبری دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (البقرہ ۲:۲۶۱) مثال ان لوگوں کی جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایسی ہے کہ جیسے ایک دانہ میں آگیں سات بالیں اور ہر بالی میں ہوں، سو دانے اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے چاہے اور اللہ بڑی وسعت سب کچھ جاننے والا ہے۔

اہمیت ازروئے حدیث: خدمت خلق خدا کو کس قدر محبوب ہے۔ اس کا اندازہ حسب ذیل حدیث قدسی سے لگایا جا سکتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے خدمت خلق کو خود اپنی خدمت سے تعبیر کیا ہے اس لیے کہ مخلوق خدا ہی کی پیدا کی ہوئی ہے۔

(قیامت کے دن ایسا ہوگا کہ خدا ایک انسان سے کہے گا) اے ابن آدم! میں بیمار ہو گیا تھا۔ مگر تو نے میری تیمار داری نہ کی۔ بندہ متعجب ہو کر کہے گا۔ بھلا ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے اور تُو تو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہو گیا تھا اور تو نے اس کی بیمار پرسی نہ کی۔ اگر تو اس کی بیمار پرسی کے لیے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا اسی طرح خدا فرمائے گا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا۔ مگر تو نے نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا۔ بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے میں تجھے کیسا کھلاتا۔ آپ تو خود تمام جہانوں کے پالن ہار ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ کیا تجھے یاد نہیں کہ فلاں میرے بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا تھا۔ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تُو تو اسے میرے پاس پاتا۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا۔ مگر تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ بندہ عرض کرے گا بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے پیاس لگے۔ تو تو تمام جہانوں کا رب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے فلاں پیاسے بندہ نے تجھ سے پانی مانگا تھا۔ لیکن تو نے اسے پانی نہیں پلایا اگر تو اسے پانی پلا دیتا تُو تو اسے میرے پاس پاتا۔ (مسلم)

حضور اکرم ﷺ سے متعدد احادیث مروی ہیں جن میں آپ ﷺ نے خدمت خلق کی بڑی تاکید فرمائی۔

آپ ﷺ نے فرمایا!

''مجھے رمضان بھر کے روزے رکھنے اور اس مہینہ مسجد حرام میں بیٹھ کر اعتکاف کرنے سے یہ زیادہ عزیز ہے کہ اپنے بھائی کی بوقت ضرورت امداد کروں۔'' (کنز العمال)

''جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پورا کرنے میں لگا رہے گا تو خدا اس کی ضرورت کو پورا کرے گا۔ جو کسی مسلمان کی تنگی کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اس کی تنگی دور کرے گا۔'' (ابوداؤد)

''جو کوئی دنیا میں کسی مسلمان کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا۔ اور جو کسی تنگ دست پر آسانی کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس پر آسانی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے۔ جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔'' (ابوداؤد)

ایک حدیث میں خدمت کو صدقہ کی ذیل میں شمار کیا گیا ہے۔

''تمہارا اپنے بھائی سے ملتے وقت مسکرا دینا بھی صدقہ ہے اچھی بات کہنا بھی اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے۔ کسی بھٹکے ہوئے کو راہ دکھانا بھی صدقہ ہے کسی اندھے کو راستہ دکھانا بھی صدقہ ہے اپنے ڈول سے دوسرے بھائی کے ڈول میں پانی انڈیل دینا بھی صدقہ ہے۔

حضرت انسؓ خدمت خلق کے بارے میں رسول کریم ﷺ کی ایک حدیث بیان فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا!''مخلوق خدا کا کنبہ ہے بہترین شخص مخلوق میں سے وہ ہے جو خدا کے کنبہ کے ساتھ احسان کی روش اختیار کرے۔'' (مشکوۃ)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا!''جو شخص اپنے بھائی کی مدد نہ کرے اس موقع پر جہاں کہ اس کی بے حرمتی کی جاتی ہو یا اس کی ابرو ریزی کی جاتی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد اس موقع پر بھی نہ کرے گا جہاں وہ اس کی مدد کو پسند کرتا ہے۔ (یعنی دنیا اور آخرت میں) اور جو مسلمان اپنے بھائی کا ایسے موقع پر مدد کرے جہاں اس کی بے حرمتی کی جاتی ہو یا ابرو ریزی کی جاتی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد اس موقع پر کرے گا۔ جہاں کہ وہ اس کی مدد پسند

کرتا ہو۔ (ابوداؤد)

اگر انسان میں کسی کی خدمت کی طاقت نہ ہو۔ یا وہ کسی بناء پر خود کوئی خدمت انجام نہ دے سکتا ہوں تو اس کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ سفارش ہی کردے چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد ہے۔ ''اگر انسان کسی مجبوری سے حاجت مند کی حاجب روائی نہ کر سکے۔ تو اسے چاہیے کہ کسی اور شخص سے سفارش کرے۔'' (بخاری)

رسول کریم ﷺ نے جہاں لوگوں کو خدمت خلق کی تعلیم دی ہے وہاں خدمت خلق نہ کرنے والے صاحب استطاعت کو تہدید دی ہے۔ فرمایا! اِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ عَلٰى عَلَى الْاَغْنِيَاءِ فِي اَمْوَالِهِمْ مَا يَكْفِي فُقَرَاءَ هُمْ وَاِنْ جَاعُوْا وعورُوا وَجَهْدُوْا فَمَنَعَ الْاَغْنِيَاءُ وَحَقٌّ عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُحَاسِبَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيُعَذِّبُهُمْ (البیہقی) اللہ تعالیٰ نے دولت مند لوگوں پر ان کے مالوں میں اتنی مقدار مقرر کی ہے جو غربا کے لیے کافی ہو سکے۔ اس کے باوجود اگر وہ بھوکے ننگے اور تنگ دست ہوں تو یہ صرف اغنیاء کے بخل کی وجہ سے ہوسکتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ ان امراء سے قیامت کے دن محاسبہ کرے گا اور ان کو عذاب دے گا فرمایا: لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالَّذِيْ يَشْبَعُ وَجَارَهُ جَائِعٌ اِلٰى جَنْبِهٖ. ایسا شخص مومن نہیں ہوسکتا جو خود تو سیر ہو کر سوئے اور اس کے پہلو (پڑوس) میں اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔

رسول کریم ﷺ کی معاشرتی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو خدمت خلق ہے۔ خدمت خلق کے واقعات سے احادیث کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔
خدمت خلق کا جذبہ صرف بعثت کے بعد ہی شروع نہیں ہوا بلکہ بعثت سے قبل بھی آپ ﷺ کی زندگی خدمت خلق کے لیے وقف تھی۔ بعثت سے قبل آپ ﷺ معاہدہ حلف الفصول میں شریک ہوئے تھے۔ جس کا بنیادی مقصد مظلوں کی امداد تھا۔ آپ ﷺ فرماتے تھے کہ اس معاہدہ میں شرکت کی خوشی مجھے اونٹوں کی دولت سے بڑھ کر ہے اور اسلام کے بعد مجھے اس معاہدہ کا واسطہ دے کر مدد سے بلایا جائے تو میں ضرور مدد کروں گا۔ (السیرۃ النبویہ لابن ھشام جزاص ۱۴۱،۱۴۲)

حضرت خدیجہؓ نے پہلی وحی پر رسول کریم ﷺ کے جذبہ خدمت خلق کے متعلق گواہی ان الفاظ میں دی۔ وَاللّٰهِ لَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ. (بخاری بدء الوحی) بعثت کے بعد نبی کریم ﷺ کی زندگی کا لحہ لحہ خدمت خلق کے لیے وقف تھا۔ جن کا احاطہ کرنا ناممکن ہے صرف ایک دلچسپ واقعہ خدمت خلق کے سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے۔
حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول کریم ﷺ کے پاس کہیں سے دس درہم آئے اتنے میں ایک سوداگر آگیا رسول کریم ﷺ نے اس سے چادر درہم میں ایک قمیص خرید لیا۔ اسے پہن کر باہر تشریف لائے۔ تو ایک انصاری نے عرض کیا حضور آپ ﷺ یہ مجھے عطا کر دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو جنت کا لباس عطا فرمائے۔ آپ ﷺ نے وہ قمیص اسے دے دی۔ پھر آپ ﷺ دوکان دار کے پاس گئے۔ اور اس سے چار درہم میں ایک اور قمیص خریدی۔ اب آپ ﷺ کے پاس دو درہم بچ گئے۔ راستہ میں آپ ﷺ کو ایک لونڈی ملی جو رو رہی تھی۔ آپ ﷺ نے سبب پوچھا تو وہ بولی کہ گھر والوں نے مجھے دو درہم کا آٹا خریدنے بھیجا تھا۔ وہ دو درہم گم ہو گئے ہیں رسول کریم ﷺ نے فوراً اپنے دو درہم اس کو دے دیئے۔ جانے لگے تو وہ پھر رو پڑی۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ اب کیوں روتی ہو؟ وہ کہنے لگی مجھے ڈر ہے کہ گھر والے مجھے دیر ہو جانے کی وجہ سے ماریں گے۔ رسول کریم ﷺ اس کے ساتھ ہو لئے اور اس کے مالک کو جا کر کہا اس لونڈی کو ڈر تھا کہ تم اس کو مارو گے اس کا مالک کہنے لگا یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ کے تشریف لانے کی وجہ سے میں آج اسے آزاد کرتا ہوں۔ رسول کریم ﷺ نے اسے نیک انجام کی بشارت دی۔ اور فرمایا! ''اللہ نے ہمارے اس درہموں میں کتنی برکت ڈالی کہ ایک قمیص انصاری کو ایک قمیص خدا کے نبی کو عطا ہوئی اور ایک غلام بھی اس سے آزاد ہوا۔ میں اس خدا کی تعریف کرتا ہوں جس نے اپنی قدرت سے ہمیں سب کچھ عطا فرمایا۔
(ھیثمی مجمع الزوائد جلد 9 ص ۱۴)

اخلاق شنیعہ

خُلق کا باب اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک اخلاق شنیعہ کا ذکر نہ کیا جائے۔ چنانچہ اختصار کے ساتھ ان اخلاق کا بھی ذکر کر دیا جانا مناسب ہے جن سے اسلام نے منع کیا ہے۔

جو افعال صفات الٰہیہ کی مقتضیات کے خلاف ہوں وہ رذائل اخلاق کہلاتے ہیں۔ اگر اخلاق فاضلہ انسانی شخصیت اور معاشرہ کی بہبود اور بھلائی کا ضامن ہیں تو اخلاق سیہ انسانی شخصیت کے بگاڑ اور معاشرہ میں فساد کا موجب ہیں۔ یہ موضوع انسانی زندگی کے لیے اتنا اہم ہے کہ تمدنی زندگی کے آغاز سے ہی حکماء اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے آ رہے ہیں۔ پھر ایک ایسا موضوع ہے کہ ہر زمانہ اور ہر علاقہ میں اچھائی اور برائی کا پیمانہ نہیں بدلا۔ جن اخلاق کو قدیم زمانہ میں انسانی شخصیت اور معاشرہ کے لیے مفید اور بہتر سمجھا جاتا تھا۔ اب بھی ان کو مفید ہی جانا جاتا ہے اور جن اخلاق کو قدیم زمانہ میں برا سمجھا تھا اب بھی وہ مذموم ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اخلاق فاضلہ فطرت انسانی کے مطابق ہیں اور اخلاق مذمومہ فطرت صحیحہ کے خلاف ہیں چونکہ اخلاق کا انسانی فطرت کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور فطرت انسانی غیر متغیر ہے اس لیے اخلاق کا پیمانہ بھی بدلہ نہیں جا سکتا۔ جن حکماء نے ذاتی یا ملکی مصلحت کی وجہ سے اخلاق کے پیمانہ کو بدلنا چاہا۔ آخر کار ان کا نقطہ نظر جلد ہی رد کر دیا گیا۔ مثلاً روس میں انقلاب کے علمبرداروں نے ملکی مصلحت کے پیش نظر جھوٹ فریب دغا بازی وغیرہ کو اچھا قرار دینے کی کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ جھوٹ فریب دغا بازی برے افعال ہی ہیں خواہ وہ ملکی فائدہ کے لیے کیے جائیں چونکہ اخلاق فاضلہ اسماء الٰہیہ کا ظل ہیں اور اسماء الٰہیہ اٹل حقیقتیں ہیں لہٰذا اخلاق فاضلہ کی بنیاد کو بھی بدلا نہیں جا سکتا اخلاق فاضلہ وہی ہوں گے جو اسماء الٰہیہ کا ظل ہوں گے۔

کذب

امر واقع کے خلاف کسی قول یا فعل کو کذب کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث میں کذب سے اجتناب کی بہت تاکید کی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (الحج ۲۲:۳۰) اور ہر جھوٹی بات سے بچو۔

اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰہِ عَلَیْہِ اِنْ کَانَ مِنَ الْکَاذِبِیْنَ (النور ۲۴:۷) اس پر اللہ کی لعنت اگر وہ جھوٹوں میں سے ہے۔ لعنت کے معنی ہیں اللہ کی رحمت سے محروم اور عذاب الٰہی کا مستحق ہونا۔ اس آیت کریمہ میں کاذب کو لعنتی قرار دیا ہے یعنی کاذب اللہ کی رحمت سے محروم اور عذاب الٰہی کا مستحق ہوگا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ (زمر ۳۹:۳) بے شک اللہ تعالیٰ اس شخص کو راہ نہیں دکھاتا جو جھوٹا ناشکر گزار ہے۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَکْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (بقرہ ۲:۴۲) سچ کو جھوٹ کے ساتھ نہ ملاؤ اور جان بوجھ کر سچ کو مت چھپاؤ۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ (مومن ۴۰:۲۸) اللہ اسے ہدایت نہیں کرتا جو حد سے گزرنے والا جھوٹا ہے۔

قرآن مجید میں مباہلہ کے موقع پر یہ فرمایا گیا کہ دونوں فریق خدا سے دعا مانگیں کہ جو جھوٹا ہے اس پر خدا کی پھٹکار ہو۔ ارشاد الٰہی ہے۔ ثُمَّ نَبْتَہِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ (ال عمران ۳:۶۱) پھر گڑگڑا کر دعا کریں اور جھوٹوں پر ایسی لعنت کریں۔

اسلام کی رو سے کذب صرف امر واقع کے خلاف بات کہنے کا نام ہی نہیں بلکہ حق کو چھپانے کا نام بھی کذب ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ (بقرہ ۲:۱۵۹) جو لوگ اس کو چھپاتے ہیں جو ہم نے کھلی باتوں اور ہدایت سے اتارا ہے اس کے بعد کہ ہم نے اسے لوگوں کے لیے کھول کر کتاب میں بیان کر دیا۔ یہی ہیں کہ اللہ ان پر لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں۔ گویا حق کو چھپانا بھی کذب میں شامل ہے چونکہ سچی بات چھپانے سے معاشرہ میں ظلم کے راستے کھلتے ہیں۔ اس لیے کتمان حق کو کذب میں شامل کیا ہے۔ رسول کریم فرماتے ہیں۔ جھوٹ گناہ کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ دوزخ کی طرف اور جھوٹ بولتے بولتے آدمی خدا کے ہاں جھوٹا لکھا جاتا ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الادب باب قولہ تعالیٰ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ)

فرمایا: جو شخص لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے اس پر افسوس اس پر افسوس (سنن ابی داؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب)

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اٰیَۃُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ (بخاری

باب قول اللہ تعالیٰ......عن الکذب)

منافق کی تین نشانیاں ہیں جب وہ بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے۔ جب وعدہ کرتا ہے تو پورا نہیں کرتا جب اسے امین بنایا جاتا ہے تو خیانت کرتا ہے۔

صفوان بن سلیم کی روایت ہے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا۔ اَیَکُوْنُ الْمُؤْمِنُ جَبَانًا قَالَ نَعَمْ فَقِیْلَ لَهٗ اَیَکُوْنُ الْمُؤْمِنُ بَخِیْلًا قَالَ نَعَمْ فَقِیْلَ لَهٗ اَیَکُوْنَ الْمُؤْمِنُ کَذَّابًا قَالَ لَا (موطا امام مالک باب فی الصدق والکذب) کیا مومن بزدل ہوسکتا ہے فرمایا ہاں پھر پوچھا گیا کیا مومن بزدل ہوسکتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا ہاں پھر دریافت کیا گیا کیا مومن جھوٹا ہوسکتا ہے فرمایا نہیں۔

حضرت ام معبد سے روایت ہے کہ وہ کہتی ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا۔ اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ لِسَانِیْ مِنَ الْکَذِبِ (بیہقی بحوالہ مشکوۃ) میرے اللہ میری زبان کو جھوٹ سے پاک رکھ۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین آدمی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ (ابو معاویہ نے کہا ان کی طرف نہیں دیکھے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے) شَیْخٌ زَانٍ وَمَلِکٌ کَذَّابٌ عَائِلٌ مُسْتَکْبِرٌ (مسلم باب بیان غلظ تحریم) ایک بوڑھا زانی، دوسرا بادشاہ جھوٹ بولنے والا اور تیسرا فقیر تکبر کرنے والا۔

وعدہ خلافی

وعدہ خلافی بھی دراصل ایک قسم کا جھوٹ ہی ہے یعنی ایک شخص کسی سے وعدہ کرے اور نیت یہ ہو کہ وہ پورا نہ کرے گا تو یہ جھوٹ ہی ہے۔ وعدہ خلافی ایک دوسرے سے صرف اعتماد ہی نہیں اٹھ جاتا بلکہ معاشرہ میں فساد بھی برپا ہوتا ہے۔ عہد و پیمان صرف انفرادی زندگی میں ہی نہیں باندھے جاتے بلکہ قومیں بھی عہد و پیمان کے بندھن میں آتی ہیں۔ اسلام نے قومی وعدہ خلافی کو اتنا برا جانا ہے عہد شکن قوم کے خلاف جہاد کا حکم دیا ہے کیونکہ عہد شکن قوم اس عہد کی خلاف ورزی کر رہی ہوتی ہے جس کے پورا کرنے کی ذمہ داری اپنے پر عائد ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنَّ الْعَهْدَ کَانَ مَسْؤُلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۳۴) بے شک وعدہ کی باز پرس ہوگی۔

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ بِمَا اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ (التوبہ ۹:۷۷) سو اس نے انھیں بدلہ دیا کہ ان کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا اس دن تک کہ وہ اس سے ملیں اس لیے کہ انھوں نے اللہ سے اس کے خلاف کیا۔ جو اس سے وعدہ کیا اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

جیسا کہ ''کذب'' کے ذکر میں ایک حدیث بیان کی گئی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ جب وہ بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے جب وعدہ کرتا ہے تو اس کو پورا نہیں کرتا اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرتا ہے۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے۔ اَنَّهٗ قَالَ وَلَا خَطَرَ قَوْمٌ بِالْعَهْدِ اِلَّا سَلَّطَ عَلَیْهِمُ الْعَدُوَّ (موطا امام محمد باب السیر) جب کسی قوم کو وعدہ خلافی کی عادت ہو جائے تو اس پر دشمن کو مسلط کر دیا جاتا ہے۔

حضرت ابو الجھمی سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ وَلَا تَوَاعِدْ اَخَاکَ مَوْعِدًا فَتُخْلِفَهٗ (مسلم) اپنے بھائی کے ساتھ ایسا وعدہ نہ کر جسے تو پورا نہ کرے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ لِکُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ یَوْمَ الْقِیَامَةِ یُعْرَفُ بِهٖ (بخاری) کہ ہر عہد شکن کے لیے قیامت کے دن ایک نشان ہوگا جس سے وہ پہچانا جائے گا۔

حضرت ابوسعید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ لِکُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ یَوْمَ الْقِیَامَةِ یُرْفَعُ لَهٗ بِقَدْرِ غَدْرِهٖ وَلَا غَادِرَ اَعْظَمُ غَدْرًا مِنْ اَمِیْرِ عَامَّةٍ (مسلم) کہ ہر ایک عہد شکن کے لیے قیامت کے دن ایک جھنڈا ہوگا جو اس کی وعدہ شکنی کی مقدار کے مطابق بلند کیا جائے گا اور یاد رکھو کہ سب سے بڑا عہد شکن وہ شخص ہے جو قوم کا امیر ہو کر عہد شکنی کرے۔

خیانت

اللہ اور بندوں کے حقوق کو باحسن طریق ادا نہ کرنا خیانت ہے اگر کسی کے پاس کوئی امانت رکھی گئی ہے اس میں بے جا تصرف کرنا اور طلب پر واپس نہ کرنا یا واپس کرنے سے انکار کر دینا یہ بھی خیانت ہے اسلام نے خیانت کو نہایت ہی مذموم فعل قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْا اَمٰنٰتِکُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (انفال ۸:۲۷) اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو اور نہ آپس کی امانتوں

میں خیانت کرو اور تم جانتے ہو۔ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (ال عمران ۳:۱۶۱) جو کوئی خیانت کرے جو کچھ کسی نے خیانت کی، قیامت کے دن وہ لائے گا پھر ہر شخص کو جو اس نے کمایا پورا دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (مومن ۴۰:۱۹) اللہ آنکھوں کی خیانت کاری کو جانتا ہے اور جو سینے چھپائے ہوتے ہیں حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا منافق کی تین علامتیں ہیں جب وہ بات کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے جب وعدہ کرتا ہے تو اس کو پورا نہیں کرتا اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرتا ہے۔

ابن مسعود سے موقوفاً روایت ہے کہ انھوں نے کہا خدا کی راہ میں شہید ہونا ہر گناہ کا کفارہ ہے سوائے امانت کے۔ قیامت کے دن بندہ کو لایا جائے گا۔ اگر چہ وہ خدا کی راہ میں شہید ہی ہوا ہو اور کہا جائے گا کہ تم امانت لاؤ اور ادا کرو اور وہ کہے گا۔ اے اللہ! اب کیسے لاؤں۔ دنیا تو ختم ہو چکی ہے کہا جائے گا۔ اس کو دوزخ کے طبقہ ہاویہ میں لے جاؤ۔ وہاں امانت کی چیز مثالی بن کر اصل صورت میں سامنے آئے گی تو وہ اس کو دیکھ کر پہچان لے گا اور اس کے پیچھے گرے گا۔ یہاں تک کہ اس کو پکڑ لے گا۔ اور اس کو اپنے کندھوں پر لاد کر لے چلے گا۔ جب دوزخ سے نکلنا چاہے گا تو وہ بوجھ اس کے کندھے سے گر پڑے گا اور وہ پھر اس کے پیچھے ہمیشہ ہمیشہ گرتا چلا جائے گا۔ پھر انھوں نے فرمایا نماز امانت ہے وضو امانت ہے تول بھی امانت ہے ناپ بھی امانت ہے اور بہت سی چیزیں گنا کر فرمایا اور ان سب سے زیادہ سخت معاملہ امانت کی چیزوں کا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے یہ حدیث حضرت براء بن عازب صحابی کو سنائی۔ انھوں نے تصدیق کی اور فرمایا کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں سنی۔ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا (نساء ۴:۵۸) یعنی بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو ادا کر دیا کرو۔ (مسند احمد، بیہقی، منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَخُونُهُ (ترمذی باب شفقۃ المسلم علی المسلم) مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے اور اپنے بھائی سے خیانت نہیں کرتا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْجُوعِ فَإِنَّهُ بِئْسَ الضَّجِيعُ وَمِنَ الْخِيَانَةِ فَإِنَّهَا بِئْسَتِ الْبِطَانَةُ (نسائی باب الاستعاذہ من الخیانت) اے میرے اللہ! میں بھوک سے تیری پناہ مانگتا ہوں کیونکہ بھوک بری ہم خوابہ ہے اور خیانت سے تیری پناہ مانگتا ہوں کیونکہ خیانت بری خصلت ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ أَنَا ثَالِثُ الشَّرِيكَيْنِ مَا لَمْ يَخُنْ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ فَإِذَا خَانَهُ خَرَجْتُ مِنْ بَيْنِهِمَا (ابوداؤد باب فی الشرکت) کہ میں دو شریکوں کے ساتھ تیسرا شریک ہوتا ہوں تاوقتیکہ وہ ایک دوسرے سے خیانت نہیں کرتے لیکن جب ایک شریک خیانت کرنے لگ جاتا ہے تو اس شراکت سے نکل جاتا ہوں اور شیطان داخل ہو جاتا ہے۔

کبر (غرور)

دوسروں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور باقیوں کو کم تر اور حقیر جاننے کا نام کبر ہے کبر بدترین اخلاقی مرض ہے حقیقت یہ ہے کہ تمام رذائل اخلاق کی اساس ہی کبر ہے اور یہ مرض شیطانی مرض ہے اور انسان کو اللہ کی رحمت سے دور کر دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ (اعراف ۷:۱۳) کہا پھر اس حالت سے اتر جا تیرے لیے یہ زیبا نہیں کہ تو اس پر تکبر کرے سو نکل جا تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (لقمان ۱۸:۱) تو غرور میں لوگوں سے بے رخی نہ کر اور نہ زمین میں اکڑتا ہوا چل۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اترانے والے اور شیخی خورہ ہیں۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا (بنی اسرائیل ۱۷:۳۷) اور زمین میں اکڑتا ہوا نہ چل۔ کیونکہ نہ تو زمین کو پھاڑ ڈالے گا اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ جائے گا۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ إِنَّ الْعُجْبَ لَيَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ یقیناً غرور نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو۔

حضرت حارثہ بن وہب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ کیا میں تمھیں نہ بتاؤں کہ دوزخی کون ہے فرمایا كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُتَكَبِّرٍ (بخاری کتاب الادب باب الکبر) تمام اکھڑ سخت گو اور متکبر۔

فرمایا۔ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ ذَرَّةٌ مِنْ كِبْرٍ قَالَ رَجُلٌ اِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ اَنْ يَكُوْنَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَنَعْلُهُ حَسَنًا قَالَ اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ الْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ (مسلم تحریم الکبر) جس شخص کے دل میں ایک ذرے کے برابر بھی کبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا اور ایک شخص نے پوچھا کہ ایک چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اس کی جوتی اچھی ہو آپ نے فرمایا اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے کبر تو یہ ہے کہ حق کو باطل کیا جائے اور لوگوں کو حقارت سے دیکھا جائے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا يَقُوْلُ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ الْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي وَالْعَظَمَةُ اِزَارِي مَنْ نَازَعَنِي وَاحِدًا مِنْهُمَا اَلْقَيْتُهُ فِي النَّارِ (ابن ماجہ باب البراءۃ من الکبر) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کبریائی میری چادر ہے اور عظمت میرا تہہ بند ہے جو شخص ان میں سے ایک چیز بھی مجھ سے چھیننے کی کوشش کوشش کرے گا۔ اس کو (دوزخ کی) آگ میں ڈالوں گا۔

حضرت سلمہ بن اکوع سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ لَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَذْهَبُ بِنَفْسِهِ حَتّٰى يُكْتَبَ فِي الْجَبَّارِيْنَ فَيُصِيْبُهُ مَا اَصَابَهُمْ (ترمذی باب ماجاء فی الکبر) آدمی اپنے آپ کو کھینچتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ جبارین (متکبرین) میں لکھا جاتا ہے اور پھر اس کا وہی انجام ہوتا ہے جو ایسے (جبار و متکبر) لوگوں کا ہوتا ہے۔

حضرت عمرو بن شعیب سے روایت ہے وہ اپنے باپ سے اور وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ يُحْشَرُ الْمُتَكَبِّرُوْنَ اَمْثَالَ الذَّرِّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِي صُوَرِ الرِّجَالِ يَغْشَاهُمُ الذُّلُّ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ يُسَاقُوْنَ اِلٰى سِجْنٍ فِي جَهَنَّمَ يُسَمّٰى بُوْنَس تَعْلُوْهُمْ نَارُ الْاَنْيَارِ وَيُسْعَوْنَ مِنْ عُصَارَةِ اَهْلِ النَّارِ طِيْنَةَ الْخَبَالِ (ترمذی) متکبر میدان حشر میں اس طرح اکٹھے کیے جائیں گے جیسے چھوٹی چھوٹی چونٹیاں ہوتی ہیں آدمیوں کی شکل میں ان پر ہر طرف سے ذلت چھائی ہوگی اور دوزخ کے قید خانے کی طرف ہانکے جائیں گے جس کا نام بونس ہے ان پر دوزخ کی آگ چڑھتی جائے گی اور دوزخیوں کے زخموں کا دھون ان کو پلایا جائے گا۔

حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خُيَلَاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللّٰهُ اِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (بخاری) جو تکبر کے باعث اپنے کپڑے کو دراز رکھے گا۔ خدا قیامت کے دن اس کی طرف نہیں دیکھے گا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ثَلَاثٌ مُنْجِيَاتٌ وَثَلَاثٌ مُهْلِكَاتٌ فَاَمَّا الْمُنْجِيَاتُ فَتَقْوَى اللّٰهِ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ وَالْقَوْلُ الْحَقُّ فِي الرِّضَا وَالسُّخْطِ وَالْقَصْدُ فِي الْغِنَاءِ وَالْفَقْرِ وَاَمَّا الْمُهْلِكَاتُ فَهَوًى مُتَّبَعٌ وَشُحٌّ مُطَاعٌ وَعُجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهِ (مشکوٰۃ) تین چیزیں نجات دینے والی ہیں اور تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں لیکن نجات دینے والی چیزیں (یہ ہیں) خدا سے ڈرنا پوشیدہ اور ظاہر اور خوشی اور غصے دونوں حالتوں میں، حق بات کہنا اور تونگری اور فقر میں میانہ روی اختیار کرنا اور جو ہلاک کرنے والی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ خواہش نفسانی کا تابع ہونا۔ بخل کی اطاعت کرنا اور اپنے نفس سے خوش ہونا۔ (خود پسندی اور تکبر کرنا)

حسد

کسی آدمی کے فضل اور کمالات کو دیکھ کر رنجیدہ خاطر ہونا پھر اس کے کمالات کی تباہی کا آرزومند ہونا حسد کہلاتا ہے۔

یہ بھی ان اخلاقی امراض میں سے ایک مرض ہے جس کی آگ کی تپش سے انسان کی عقل اور دل کی تمام استعدادیں بھسم ہو جاتی ہیں۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (النساء: ۴:۵۴) وہ لوگوں سے اس بات پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ (بقرہ ۲:۱۰۹) اہل کتاب میں سے بہت چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان کے بعد تمہیں کافر بنا دیں اپنے حسد کی وجہ سے اس کے بعد کہ ان پر حق کھل گیا۔

اللہ تعالیٰ سے حاسد کے شر سے بچنے کے لیے دعا سکھائی ہے۔ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (فلق ۱۱۳:۵) میں تیری پناہ چاہتا ہوں۔ حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

وَلَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَلَا تَقَاطَعُوْا كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا (صحیح مسلم) ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، حسد نہ کرو۔ اعراض نہ کرو۔ قطع تعلق نہ کرو۔ اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔

اِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ يَاْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَاْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ (سنن ابی داؤد) حسد سے بچو یہ نیکیوں کو ایسے کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ كَادَ الْفَقْرُ اَنْ سَيَكُوْنَ كُفْراً وَكَادَ الْحَسَدُ يَغْلِبُ الْقَدْرَ (بیہقی مشکوٰۃ) قریب ہے کہ فقر کفر کی طرف لے جائے اور قریب ہے کہ حسد تقدیر پر غالب آ جائے۔

حضرت زبیر سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ دَبَّ اِلَيْكُمْ دَاءُ الْاُمَمِ مِنْ قَبْلِكُمْ اَلْحَسَدُ وَ الْبَغْضَاءُ هِيَ الْحَالِقَةُ وَلَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰكِنْ تَحْلِقُ الدِّيْنَ (ترمذی) پہلی امتوں کا مرض تمہاری طرف سرایت کرتا جاتا ہے اور وہ ایک تو حسد ہے دوسرے بغض اور (ہر بیماری) مونڈھنے والی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بالوں کو مونڈتی ہے بلکہ دین کو مونڈتی دیتی ہے۔

حسد دوسرے کو کوئی نقصان دے یا نہ دے لیکن یہ حقیقت ہے کہ حاسد خود حسد کی آگ میں جلتا رہتا ہے اور زندگی میں کوئی سکھ محسوس نہیں کرتا، اس سے بڑھ کر اور کیا عذاب ہو سکتا ہے۔

خودستائی

خودستائی سے مراد اپنے نفس سے غیر معمولی محبت ہے یہ بھی ایک مرض ہے اس مرض کے دو بڑے نقصان ہیں۔ ایک نقصان تو یہ ہے کہ خودبین اور خودنما شخص دوسروں کو حقیر جاننا شروع کر دیتا ہے۔ دوسرا نقصان یہ ہے کہ تمام خوبیوں اور کمالات کا اپنے نفس کو مصدر اور منبع تصور کرتا ہے اور خدا کی ذات سے بھروسہ ختم ہو جاتا ہے گویا خودنما شخص اپنی ذات کی پرستش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ خودستائی بھی کبر کی ایک شاخ ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَا اَتَوْا وَيُحِبُّوْنَ اَنْ يُحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (ال عمران ۳:۱۸۸) ہرگز خیال نہ کرو کہ جو لوگ اس پر خوش ہوتے ہیں جو انھوں نے کی اور پسند کرتے ہیں اس کے لیے ان کی تعریف کی جائے جو انھوں نے نہیں کیا۔ یہ ہرگز خیال نہ کرو کہ وہ عذاب سے بچ جائیں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (النجم ۵۳:۳۲) سو اپنے نفسوں کو پاک ٹھہراؤ اللہ خوب جانتا ہے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے۔

غزوہ حنین میں اسلامی فوج اپنی کثرت پر اترانے لگی تو آغاز جنگ میں سوائے رسول کریم ﷺ اور چند صحابہ کے تمام اسلامی فوج میدان جنگ سے منہ پھیر گئی۔ بعدازاں رسول کریم ﷺ کی آواز پر منتشر فوج جمع ہوئی اور دشمن کو شکست دی۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا (توبہ ۹:۲۵) اور حنین کے دن جب تمہاری کثرت تعداد نے تم میں خودستائی پیدا کر دی تھی، تو عددی کثرت تمھارے کچھ کام نہ آئی۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ (انفال ۸:۴۷) اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھاوے کے لیے نکلے۔

لَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰكُمْ (حدید ۵۷:۲۳) خدا نے جو دیا اس پر مت اتراؤ۔

رسول کریم ﷺ نے دوسروں کی تعریف کرنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس طرح انسان میں خودستائی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ حدیث میں ہے ایک شخص کسی کی مبالغہ آمیز طریقہ سے تعریف کر رہا تھا تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم نے اس کو ہلاک کر دیا ہے ایک بار آپ ﷺ کے سامنے کسی کا ذکر ہوا۔ تو ایک شخص نے اس کی تعریف کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تم نے اس کی گردن کاٹ لی۔ اگر کسی کی تعریف ہی کرنا ہو تو کہو کہ میں ایسا سمجھتا ہوں۔ (بخاری کتاب الادب باب ما یکرہ من التمادح)

رسول کریم ﷺ نے تین تباہ کن چیزوں سے انتباہ کیا ہے وہ تین تباہ کن چیزیں یہ ہیں۔ شُحٌّ مُطَاعٌ وَهَوًى مُتَّبَعٌ وَاِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ. کنجوسی کی اطاعت، خواہش کی پیروی، انسان کی خودستائی اور خود پسندی۔

فرمایا اِذَا رَاَيْتَ شُحًّا مُطَاعًا وَهَوًى مُتَّبَعًا وَ اِعْجَابَ كُلِّ ذِيْ رَاْيٍ بِرَاْيِهٖ فَعَلَيْكَ بِنَفْسِكَ (سنن ابی داؤد و سنن ترمذی) جب تو دیکھے کہ کنجوسی کی اطاعت کی جا رہی ہے خواہش کی پیروی ہو رہی ہے اور صاحب رائے اپنی رائے کو ہی پسندیدہ قرار دے رہا ہے تو تجھ پر لازم کہ تو اپنے آپ کو بچا۔

فرمایا۔ اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْاَحْمَقُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا تَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ الْاَمَانِيَّ (احمد، ابن ماجہ) سمجھدار وہ ہے جو اپنے نفس پر قابو پاتا ہے اور آخرت کے لیے کام کرتا ہے اور احمق وہ ہے جو اپنی خواہش پر چلتا ہے اور اللہ سے غلط تمنائیں قائم رکھتا ہے۔

قرآن مجید میں ابلیس کا کثرت سے ذکر آیا ہے اس کے ذکر میں اس کی ایک برائی خود پسندی اور خودستائی بیان کی گئی ہے جس کی وجہ سے درگاندۂ درگاہ ہوا۔ ابلیس کے یہ الفاظ خودپسندی پر دلالت کرتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ (ص ۷۶:۳۸) تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس کو (آدم) کو مٹی سے۔

ابلیس کے ذکر میں جہاں انسان کے لیے بے شمار فوائد مضمر ہے وہاں مذکورہ الفاظ میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ انسان خود پسندی سے خدا کی رحمت سے دور ہو جاتا ہے۔

غیبت

کسی شخص کی عدم موجودگی میں ایسی بات کرنا جس سے اس کی پردہ دری یا تحقیر مقصود ہو۔ غیبت ہے۔ قرآن مجید اور حدیث میں اس فعل کو مذموم قرار دیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ لَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ (الحجرات ۱۲:۴۹) ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہو۔ کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے تو تم اس سے کراہت کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو یقیناً اللہ رجوع پر رحمت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ شب معراج کو میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا ناخن تانبے کے تھے۔ وہ ان سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔ میں نے جبرائیل سے پوچھا کہ کون لوگ ہیں؟ جبرائیل نے جواب دیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے اور ان کی عزت اور آبرو لیتے تھے۔ (ابو داؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا لوگو! تمھیں معلوم ہے کہ غیبت کیا چیز ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا اپنے بھائی کو ایسی بات سے یاد کرنا جو اسے اچھی نہ لگے۔ کسی نے عرض کیا کہ میرے بھائی میں وہ بات موجود ہو جو میں کہتا ہوں تو پھر آپ ﷺ کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا اس میں وہ بات موجود ہو جو تو کہتا ہے تو تُو نے اس کی غیبت کی۔ اگر وہ بات اس میں نہیں جو تُو کہتا ہے تو تُو نے اس پر بہتان طرازی کی۔ (مسلم)

حضرت ابوسعید اور حضرت جابر سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا غیبت زنا سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ آدمی زنا کر کے توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ اتنی توبہ کرتا ہے تو خدا اس کی بخش دیتا ہے اور غیبت کرنے والے کو نہیں بخشتا۔ جب تک وہ شخص نہ بخشے اور حضرت انس کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زانی توبہ کرتا ہے اور غیبت کرنے والے کے لیے توبہ نہیں۔ (بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ)

آپ ﷺ نے فرمایا ''اے لوگو! جو زبان سے تو ایمان لائے لیکن ایمان تمھارے دلوں کے اندر جاگزیں نہیں ہوا۔ نہ مسلمانوں کی غیبت کرو نہ ان کے عیوب تلاش میں رہو کیونکہ جو شخص ان کے عیوب تلاش کرے گا۔ خدا تعالیٰ بھی اس کے عیوب کی تلاش کرے گا۔ خدا جس کے عیب تلاش کرے گا خود اس کے گھر کے اندر ہی اس کو رسوا کر دے گا۔ (ابو داؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ)

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ دو شخصوں نے ظہر یا عصر کی نماز پڑھی اور دونوں روزہ دار تھے جب نبی کریم ﷺ نماز پڑھ چکے تو ان کو فرمایا تم پھر وضو کرو اور پھر نماز پڑھو اور روزے کو پورا کرو مگر کسی اور دن اس کو پھر رکھ لینا انھوں نے عرض کیا کہ اس کا کیا سبب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تم نے فلاں شخص کی غیبت ہے۔ (مشکوٰۃ)

غیبت ناقض وضو، نماز اور روزہ نہیں ہے لیکن آپ ﷺ نے ان دونوں اشخاص کو دوبارہ وضو کر کے نماز پڑھنے اور کسی اور دن روزہ رکھنے کا ارشاد فرمایا۔ اس میں دقیق راز یہ ہے کہ غیبت نماز اور روزہ کی روح کے منافی ہے۔ نماز اور روزہ کی روح حصول تقویٰ ہے جب انسان کے دل کے اندر میں نماز اور روزہ سے تقویٰ پیدا نہیں ہوتا تو نماز اور روزہ بے روح اور بے مغز ہیں۔ ان دونوں اشخاص کو نماز اور روزہ کے اعادہ کی حکم دے کر نماز اور روزے کی حکمت کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو قبروں پر سے گزرے تو فرمایا۔ إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ وَأَمَّا هٰذَا فَكَانَ يَمْشِي بِالنَّمِيمَةِ (بخاری باب الغیبت) ان دو مردوں کو عذاب دیا جا رہا ہے اور یہ عذاب کسی ایسی بڑی بات کے لیے نہیں دیا جا رہا۔ (جس سے وہ بچ نہ سکتے تھے) اور ان میں سے ایک اس لیے عذاب میں ہے وہ غیبت کیا کرتا تھا۔

حضرت حذیفہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا۔ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ قَتَّاتٌ (بخاری باب مکرہ من النمیمۃ)
چغل خور بہشت میں داخل نہیں ہوگا۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو۔ صحابہ کرام نے پوچھا
یارسول اللہ! وہ کون سی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا...... اور پاک دامن مومن عورتوں پر تہمت لگانا جب سے وہ بے خبر ہوں۔ حضرت اسماء بنت یزید سے روایت
ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا من ذَبَّ عَنْ لَحْمِ اَخِیْہِ بِالْمَغِیْبَۃِ کَانَ حَقًّا عَلَی اللّٰہِ یُعْتِقُہٗ مِنَ النَّارِ (بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ) جو شخص غیبت کرنے والے کو اپنے
بھائی کے گوشت کھانے سے (غیبت کرنے سے) روکے اللہ تعالیٰ پر لازم ہے کہ اسے دوزخ کی آگ سے بچائے۔

تمسخر

تمسخر کے معنی ہیں ٹھٹھا مخول کرنا یعنی کسی آدمی کو دوسروں کی نظروں میں گرانے کے لیے نشانہ تضحیک بنا لینے کا نام تمسخر ہے۔
تمسخر سے اپنی بڑھائی اور دوسرے کی حقارت کا پہلو نکلتا ہے تمسخر سے باہمی عداوتیں جنم لیتی ہیں جس سے معاشرہ میں جذبہ اخوت سرد پڑتا ہے، فساد
اور بگاڑ پرورش پاتا ہے اس لیے اسلام نے اس بدخلقی کو ناپسند قرار دیا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْراً مِّنْھُمْ (الحجرات ۴۹:۱۱) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ تم
میں سے کوئی قوم دوسری قوم سے تمسخر نہ کرے ممکن ہے وہ ان سے بہتر ہو۔

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ کسی سفر میں حضرت صفیہؓ کا اونٹ بیمار ہوگیا اور حضرت زینبؓ کے پاس ایک فالتو سواری تھی کہ حضور ﷺ نے
حضرت زینبؓ سے فرمایا کہ صفیہؓ کو اپنی سواری دے دو۔ زینبؓ نے کہا کیا میں اس یہودیہ کو اپنا اونٹ دے دوں؟ اس پر رسول اللہ ﷺ کو سخت غصہ آیا اور
آپ ﷺ نے ذی الحجہ اور محرم اور صفر کے کچھ دنوں تک زینب سے الگ رہے۔ (ابوداؤد)

بدظنی

کسی دوسرے شخص کے متعلق جھوٹا وہم کرنا یا اس کی طرف اَن ہونی بات منسوب کر دینے کا نام بدظنی ہے۔ اس سے باہمی نفرت اور دشمنی پیدا ہوتی
ہے اللہ تعالیٰ نے بدظنی سے باز رہنے کی تاکید کی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْراً مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (الحجرات
۴۹:۱۲) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو بہت بدگمانی سے بچا کرو۔ بے شک بعض بدگمانی گناہ ہے۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اَکْذِبُ الْحَدِیْثِ (بخاری باب ما ینھی عن الحاسد) بدظنی سے بچو کیونکہ بدظنی سب سے
زیادہ جھوٹ ہوتا ہے۔

اسلام نے صرف بدگمانی سے ہی نہیں روکا بلکہ بدگمانی پیدا کرنے والے کے واقعے سے باز رہنے کی تلقین کی تھی۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ
رسول کریم ﷺ اعتکاف میں بیٹھے ہوئے تھے رات کو آپ ﷺ کی ایک بیوی ملنے کو آئیں۔ آپ ﷺ ان کو گھر تک پہنچانے کے لیے چلے، راستہ میں دو
انصاری ملے اور آپ کو کسی عورت کے ساتھ دیکھ کر اپنے آپ کو بے موقع سمجھے اور واپس جانے لگے۔ آپ ﷺ نے فوراً ان کو بلایا اور فرمایا یہ میری بیوی فلاں
ہے۔ انھوں نے عرض کیا یارسول اللہ! اگر مجھے کسی کے ساتھ بدگمانی بھی کرنی ہوتی تو کیا آپ ﷺ کے ساتھ کرسکتا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا شیطان انسان کے
اندر خون کی طرح دوڑتا ہے۔ (صحیح مسلم باب انه یستحب لمن رؤی خالیا بامراۃ)

بخل

کسی انسان کا ضرورت کے مطابق اپنی جان، اہل وعیال، رشتے دار یا معاشرہ کے مستحقین پر خرچ نہ کرنے کا نام بخل ہے۔ اس عادت سے بے شمار
بداخلاقیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بے مروتی، تنگ نظری، حرص، دنائت قسم کی بدخلقیاں بخل کے بطن سے جنم لیتی ہیں اور معاشرہ میں فساد پیدا کر دیتی ہیں۔ بخل کے
علاج کے لیے اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اور صدقات ادا کرنے کی تعلیم دی ہے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اس عادت کو نہایت ہی ناپسندیدہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ھُوَ خَیْراً لَّھُمْ بَلْ ھُوَ شَرٌّ لَّھُمْ سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِہٖ یَوْمَ
الْقِیٰمَۃِ (آل عمران ۳:۱۸۰) جن لوگوں کو اللہ نے مال و دولت دیئے پھر وہ بخل کرتے ہیں۔ وہ یہ خیال نہ کریں کہ یہ بخیلی ان کے لیے بہتر ہے بلکہ یہ ان کے
لیے انتہائی بری ہے جو کچھ جمع کر رہے ہیں۔ وہی قیامت کے دن ان کے طوق بن جائے گا۔

اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (حدید ۵۷:۲۴) یعنی اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بخل کی
ترغیب دیتے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ خَصلَتَانِ لَا تَجتَمِعَانِ فِي مُؤمِنٍ اَلبُخلُ وَسُوءُ الخُلقِ (ترمذی باب فی البخل) مومن میں دو خصلتیں جمع نہیں ہو سکتیں ایک بخل اور دوسری بد خلقی۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اَعُوذُبِکَ مِنَ البُخلِ (بخاری) اے میرے اللہ میں بخل سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اَلسَّخِیُّ قَرِیبٌ مِنَ الجَنَّةِ قَرِیبٌ مِنَ النَّاسِ بَعِیدٌ مِنَ النَّارِ وَالبَخِیلُ بَعِیدٌ مِنَ اللّٰهِ بَعِیدٌ مِنَ الجَنَّةِ بَعِیدٌ مِنَ النَّاسِ قَرِیبٌ مِنَ النَّارِ وَالجَاهِلُ السَّخِیُّ اَحبُّ اِلَی اللّٰهِ مِن عَابِدٍ بَخِیلٍ (ترمذی باب السخا) سخی نزدیک ہے اللہ کے۔ نزدیک ہے جنت کے۔ نزدیک ہے لوگوں کے اور دور ہے دوزخ سے اور بخیل دور ہے اللہ سے دور ہے جنت سے دور ہے لوگوں سے نزدیک ہے دوزخ کے اور جاہل سخی اللہ کے نزدیک زیادہ عزیز ہے عابد بخیل ہے۔

حضرت ابو بکر الصدیق سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ لَا یَدخُلُ الجَنَّةَ خبٌ وَلَا بخیل ولَا مَنَّانٌ (ترمذی باب فی البخل) مکار بخیل اور احسان جتانے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ مَا مِن یَومٍ یُصبِحُ العِبَادُ فِیهِ اِلَّا مَلَکَانِ یَنزِلَانِ فَیَقُولُ اَحَدُهُمَا اَعطِ مُمسِکًا تَلَفًا (بخاری باب فی قولہ تعالیٰ فاما من اعطی) ہر روز جب لوگ صبح کو اٹھتے ہیں دو فرشتے نازل ہوتے ہیں ایک کہتا ہے اے خدا خرچ کرنے والے یعنی سخی کو دے اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ! بخیل کے مال کو تلف کر۔

قرآن مجید میں جہاں انفاق فی سبیل کے ثمرات اور فوائد بیان کیے ہیں۔ وہاں بخل کے بدانجام سے بھی ڈرایا ہے۔ قرآن مجید بخل کی بدانجامی کی بڑی مثال سورۃ القصص میں قارون کی بیان کی ہے۔ وہ کس طرح تباہ و برباد ہوا اور مال و منال اس کو عبرت ناک انجام سے بچا نہ سکا۔ اس طرح رسول کریم ﷺ کے دور میں قارون ثانی ابولہب تھا۔ اس کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے۔ مَا اَغنٰی عَنهُ مَالُهٗ وَمَا کَسَبَ (ابی لھب) ابولہب کو اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا تھا کوئی مدد نہ پہنچا ہے۔

اگر انفاق قوموں کی ترقی کا سبب ہے تو بخل قوموں کی تباہی کا ذریعہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بخل سے طبقاتی خلیج وسیع ہوتی جاتی ہے۔ معاشرہ دو انتہاؤں پر پہنچ جاتا ہے ایک انتہا پر بخیل صاحب ثروت حضرات ہوتے ہیں۔ دوسری انتہا پر مفلس نان جویں سے محروم لوگ ہوتے ہیں۔ اس حالت میں دونوں طبقوں کا باہمی تصادم ناگزیر ہے جس کے نتیجہ میں اصحاب ثروت کی تباہی و ہلاکت لازمی ہے۔

بہتان طرازی

بہتان یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی کی طرف ناکردہ گناہ منسوب کر دیا جائے۔ قرآن مجید اور حدیث میں اس فعل کی بہت مذمت کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَن یَّکسِب خَطِیٓئَةً اَو اِثمًا ثُمَّ یَرمِ بِهٖ بَرِیٓئًا فَقَدِ احتَمَلَ بُهتَانًا وَّاِثمًا مُّبِینًا (نساء۴:۱۱۲) اور جو کوئی گناہ کرے پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگا دے۔ یقیناً اپنے اوپر بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ لیتا ہے۔ اِنَّ الَّذِینَ یَرمُونَ المُحصَنٰتِ الغٰفِلٰتِ المُؤمِنٰتِ لُعِنُوا فِی الدُّنیَا وَالاٰخِرَةِ وَلَهُم عَذَابٌ عَظِیمٌ (نور۲۴:۲۳) جو لوگ پاک دامن بے ضرر مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو کوئی اپنے غلام پر تہمت لگائے حالانکہ اس نے وہ گناہ نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس مالک کی پیٹھ پر کوڑے مارے گا۔ (سنن ابی داؤد کتاب الادب)

بہتان بھی ایک قسم کا جھوٹ ہے مگر کذب بیانی سے سنگین اس لیے اس کی سزا بھی بہت سخت مقرر کی گئی ہے۔

چغل خوری

چغل خوری دو آدمیوں کے درمیان پھوٹ اور جھگڑا ڈالنے کے لیے جھوٹی سچی باتیں بیان کرنے کا نام ہے۔ یہ فعل معاشرہ میں فساد اور ایک دوسرے سے نفرت پیدا کرنے کا موجب ہے اسی وجہ سے قرآن مجید اور رسول کریم ﷺ نے چغل خور کی بہت خدمت کی ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِیمٍ (قلم ۶۸:۱۱) عیب لگانے والے چغلیاں لگانے والے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِینَ اٰمَنُوٓا اِن جَآءَکُم فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوٓا اَن تُصِیبُوا قَومًا بِجَهَالَةٍ فَتُصبِحُوا عَلٰی مَا فَعَلتُم نٰدِمِینَ (حجرات ۴۹:۶) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کو نادانی سے دکھ پہنچاؤ۔ پھر اس پر جو تم نے کیا پشیمان ہو۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا کیا میں تمھیں بتاؤں کہ سب سے بُرے لوگ کون ہیں؟ آپ ﷺ نے خود ہی فرمایا اَلْمَشَّاؤُنَ بِالنَّمِیْمَۃِ الْمُفَرِّقُوْنَ مِنَ الْاَحِبَّۃِ (مشکوٰۃ) جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور دوستوں کے آپس کے تعلقات میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔

حضرت حذیفہ سے روایت ہے کہا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے سنا لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ قَتَّاتٌ (بخاری) کہ چغل خور جنت میں نہیں جائے گا۔

عبدالرحمان بن غنم اور اسماء بنت یزید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خدا کے بہترین بندے وہ ہوتے ہیں کہ جب ان کو دیکھا جائے تو خدا یاد آ جائے اور خدا کے بندوں میں بدترین بندے وہ ہیں جو اِدھر اُدھر کی چغلیاں لگاتے پھرتے اور دوستوں میں جدائی ڈالتے ہیں اور پاک لوگوں کو تہمت لگاتے ہیں۔ (مشکوٰۃ)

ظلم

ظلم کے معنی ہیں وَضْعُ الشَّیْءِ فِی غَیْرِ مَحَلِّہٖ یعنی ظلم کسی چیز کو غیر مقصد جگہ پر رکھنے کا نام ہے اسی وجہ سے قرآن مجید میں ظلم کو شرک کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (لقمان ۳۱:۱۳) یعنی شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

قرآن مجید میں لفظ ظلم مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

یہ لفظ بَغْیٌ اور عدوان کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِہٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیْھِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (شوریٰ ۴۲: ۴۰.....۴۲)

اور برائی کا بدلہ اس کی مثل برائی ہے پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ پر ہے۔ وہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا اور جو کوئی اپنے (اوپر) ظلم کے بعد بدلہ لیتا ہے تو ان لوگوں پر (الزام کا) کوئی راستہ نہیں الزام کا رستہ انھیں لوگوں پر جو ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتی کرتے پھرتے ہیں۔ انہی لوگوں کے لیے دردناک دکھ ہے۔

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (البقرہ ۲:۲۷۹) نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

وَمَنْ یَّظْلِمْ مِّنْکُمْ نُذِقْہُ عَذَابًا کَبِیْرًا (الفرقان ۲۵:۱۹) اور تم میں سے کوئی بھی ظلم کرے گا۔ ہم اسے بڑا عذاب چکھائیں گے۔

حدیث میں آتا ہے۔ یَا عِبَادِیْ اِنِّیْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰی نَفْسِیْ وَجَعَلْتُہٗ بَیْنَکُمْ مُحَرَّمًا فَلَا تَظَالَمُوْا (مسلم باب تحریم الظلم) اے میرے بندو میں نے اپنے نفس پر ظلم کو حرام کیا ہے اور تمہارے مابین بھی اسے حرام قرار دیا ہے تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔

فرمایا: اِتَّقُوا الظُّلْمَ فَاِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ (صحیح مسلم باب تحریم الظلم صحیح بخاری ابواب المظالم) ظلم سے بچو کیونکہ قیامت کے دن ظلم اندھیروں کا باعث ہوگا۔

اِنَّ اللّٰہَ یُمْلِیْ لِلظَّالِمِ فَاِذَا اَخَذَہٗ لَمْ یُفْلِتْہُ ثُمَّ قَرَأَ وَکَذٰلِکَ اَخْذُ رَبِّکَ اِذَا اَخَذَ الْقُرٰی وَھِیَ ظَالِمَۃٌ اِنَّ اَخْذَہٗ اَلِیْمٌ شَدِیْدٌ (ہود ۱۱:۱۰۲) (صحیح بخاری و مسلم) اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتا رہتا ہے پھر جب اسے پکڑتا ہے تو پھر کوئی مہلت نہیں دیتا پھر آپ نے یہ آیت (کذلک اخذ...... الخ) تلاوت فرمائی۔ اور ایسے ہی تیرے رب کی پکڑ ہے جب وہ بستی کے ظالم باشندوں کو پکڑتا ہے تو اس کی گرفت سخت اور دردناک ہے۔

فرمایا۔ وَاتَّقِ دَعْوَۃَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّہٗ لَیْسَ بَیْنَھَا وَبَیْنَ اللّٰہِ حِجَابٌ (صحیح بخاری ابواب المظالم) اور ظالم کی بددعا سے بچ کیونکہ اس کے اور اللہ کے مابین کوئی حجاب نہیں۔ حضرت انس کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اِیَّاکُمْ وَدَعْوَۃَ الْمَظْلُوْمِ وَاِنْ کَانَ کَافِرًا (بخاری) کہ مظلوم کی بددعا سے بچو خواہ مظلوم کافر ہی کیوں نہ ہو۔

عباس بن مرداسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عرفہ کی شام کو اپنی امت کی بخشش کے لیے دعا مانگی پس دعا قبول کی گئی اور خداوند نے فرمایا کہ میں نے تیری امت کو بخش دیا۔ البتہ بندوں کے حقوق نہیں بخشے۔ میں مظلوم کے لیے ظالم سے اس کا حق ضرور لوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے میرے رب اگر تو چاہے تو مظلوم کو اس کے حق کے بدلے جنت کی نعمتیں عطا فرما دے اور ظالم کو بخش دے۔ یہ دعا اس شام کو قبول نہ ہوئی۔ جب دوسرے دن مزدلفہ میں صبح ہوئی تو آپ نے پھر وہی دعا مانگی پس جو کچھ مانگا گیا قبول ہوا۔ (ابن ماجہ باب الدعا بعرفۃ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ مَنْ کَانَتْ لَہٗ مَظْلِمَۃٌ لِاَخِیْہِ مِنْ عِرْضِہٖ اَوْ شَیْءٍ فَلْیَتَحَلَّلْہُ مِنْھَا الْیَوْمَ قَبْلَ اَنْ لَا یَکُوْنَ دِیْنَارٌ وَلَا دِرْھَمٌ اِنْ کَانَ لَہٗ عَمَلٌ صَالِحٌ اُخِذَ مِنْہُ بِقَدْرِ مَظْلِمَتِہٖ وَلَوْلَمْ یَکُنْ لَہٗ حَسَنَاتٌ اُخِذَ مِنْ سَیِّئَاتِ صَاحِبِہٖ فَحُمِلَ عَلَیْہِ (بخاری ابواب المظالم) جس نے اپنے بھائی پر کسی طرح کا ظلم کیا ہو یعنی اس کی آبروریزی کی ہو یا مال وغیرہ چھین لیا ہو تو آج اس سے اس ظلم کو معاف کرائے۔ اس سے

پہلے کہ دینار اور درہم کچھ پاس نہ ہوں اور اگر اس کے پاس عمل نیک ہوں گے تو بقدر ظلم اس سے لے لیے جائیں گے اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کے گناہ لے کر اس پر لاد دیے جائیں گے۔

منافقت (دورخاپن)

منافقت صرف زبان سے اقرار کرنے اور خلوص قلب سے کسی سے وابستگی پیدا نہ کرنے کا نام ہے اسلام نے دورخاپن کو نہایت ہی برے الفاظ سے بیان کیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (البقرہ۲:۱۴) اور جب یہ لوگ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں اور جب علیحدگی میں اپنے سرداروں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو تمھارے ساتھ ہیں اور ان سے تو ہم محض مذاق کر رہے تھے۔

منافقوں کے بدانجام کے متعلق فرمایا اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ لَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا (النساء۴:۱۴۵) بے شک منافق دوزخ کے سب سے نچلے حصے میں ہوں گے اور تم وہاں کسی کو بھی ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ مَنْ كَانَ ذَا وَجْهَيْنِ فِي الدُّنْيَا كَانَ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لِسَانَانِ مِنْ نَارٍ (دارمی) دنیا میں جس دورخ ہوں گے قیامت کے دن ان کے منہ میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔

تَجِدُوْنَ شَرَّ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ذَا الْوَجْهَيْنِ الَّذِيْ يَاْتِيْ هٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ وَهٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ (بخاری کتاب الادب باب ماقیل فی ذی الوجہین) قیامت کے دن تم دوزخ میں سب سے لوگوں سے بدتر حالت میں اس کو پاؤ گے جو کچھ لوگوں کے پاس تو ایک منہ سے جاتا ہے اور دوسرے لوگوں کے پاس دوسرے منہ سے جاتا ہے۔

خوشامد و مدح سرائی

کسی آدمی کو محض خوش کرنے کے لیے اس کی جھوٹی تعریف کرنا خوشامد کہلاتا ہے۔ یہ فعل نہایت مذموم ہے حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ کسی کی سچی تعریف بھی اس کے منہ پر نہیں کرنی چاہیے مبادا کہ اس کے دل میں تکبر اور خودستائی کا جذبہ پیدا ہو جائے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (ال عمران۳:۱۸۸) تم مت خیال کرو کہ جو لوگ اس پر خوش ہوتے ہیں جو انھوں نے کیا اور اس پر تعریف کیے جانے کو پسند کرتے ہیں جو انھوں نے نہیں کیا یہ ہرگز خیال نہ کرو کہ وہ عذاب سے بچ جائیں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت عثمانؓ کے منہ پر ان کی تعریف کی تو حضرت مقدادؓ نے اس کے منہ پر خاک پھینک دی اور فرمایا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا خوشامد اور تعریف کرنے والوں سے ملو تو ان کے منہ میں خاک جھونک دو۔ (صحیح مسلم وابو داؤد وکراھیۃ التمادح)

ایک دفعہ آپ ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے تو دیکھا ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو اس نے اس کی بڑی تعریفیں شروع کیں آپ نے فرمایا، اس کو سنا کر مت کہو کہ اس کو برباد ہی کر دو۔ (ادب المفرد باب حثی فی وجوہ المداحین)

عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ مَدَحَ رَجُلٌ رَجُلًا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَيْحَكَ قَطَعْتَ عُنُقَ اَخِيْكَ ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ اِنْ كَانَ اَحَدُكُمْ مَادِحًا اَخَاهُ فَلْيَقُلْ اَحْسَبُهٗ وَلَا يُزَكِّيْ عَلَى اللّٰهِ اَحَدًا (ابن ماجہ باب المدح) حضرت ابوبکرۃ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں ایک شخص نے دوسرے شخص کی تعریف کی۔ اس پر رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ تو نے اپنے ممدوح کی گردن کاٹ دی اور تین دفعہ اس بات کو دہرایا اور فرمایا کہ جب تم کسی کی کوئی تعریف کرے تو چاہیے کہ صرف اتنا کہے کہ میں فلاں شخص کو ایسا سمجھتا ہوں۔ اس کی نیکی پر قطعی حکم لگانا خدا پر حکم لگانا ہے جو درست نہیں حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اِذَا مُدِحَ الْفَاسِقُ غَضِبَ الرَّبُّ تَعَالٰی وَالْعَرْشُ لَهٗ اِهْتَزَّ (بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ) جس وقت فاسق کی تعریف کی جاتی ہے اللہ کو غصہ آتا ہے اور عرش کانپ جاتا ہے۔

فحش گوئی، گالی، لعنت وتکفیر

فحش گوئی سے مراد ہر وہ کلام ہے جو تہذیب و شائستگی سے گرا ہوا ہو قرآن میں فحش گوئی کو رفث کہا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ

وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (بقرہ۲:۱۹۷) یعنی حج کے ایام میں نہ فحش گوئی کرو نہ گناہ کی بات اور نہ بڑائی کی۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النور۲۴:۱۹) جو لوگ چاہتے ہیں کہ بے حیائی کی باتیں ان لوگوں میں پھیلائیں جو ایمان لائے ہیں ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

حدیث میں آتا ہے ابو ذرؓ نے ایک غلام کو ماں کی گالی دی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے۔ (بخاری کتاب الادب باب ما ینھی الفاحش من السباب واللعن)

رسول کریم ﷺ نے فرمایا لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَاللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِيِّ مومن طنز و تشنیع نہیں کرتا لعنت نہیں بھیجتا۔ بدزبانی اور فحش کلامی نہیں کرتا۔ (ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی اللعنۃ)

فرمایا سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ (کتاب الادب باب ما ینھی من السباب واللعن) مسلم کو گالی دینا گناہ ہے اور اس کے ساتھ لڑنا کفر۔

عَنْ ثَابِتِ الضَّحَاكِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ لَعَنَ مُؤْمِنًا فَهُوَ كَقَتْلِهٖ وَمَنْ قَذَفَ مُؤْمِنًا بِكُفْرٍ فَهُوَ كَقَتْلِهٖ (بخاری باب ما ینھی عن السباب واللعن) حضرت ثابت الضحاک سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مومن پر لعنت کرے وہ ایسا ہی گناہگار ہے جیسا کہ اس نے اس کو قتل کر دیا اور جس شخص نے کسی مومن کی تکفیر کی۔ وہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے اس کو قتل کر دیا۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اِذْ قَالَ الرَّجُلُ لِاَخِيْهِ يَا كَافِرُ فَقَدْ جَاءَ بِهٖ اَحَدُهُمَا (بخاری باب من کفر اخاہ) جب ایک شخص نے اپنے بھائی کو کافر کہا تو دونوں میں سے ایک کافر ہوا۔

حضرت حارثہ بن وھب سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ الْجَوَّاظُ وَلَا الْجَعْظَرِيُّ قَالَ وَالْجَوَّاظُ الْغَلِيْظُ الفظ (ابو داؤد باب فی حسن الخلق) سخت گو اور سخت خو سے مراد سخت گو ہے۔

سمرہ بن جندب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ لَا تَلَاعَنُوْا بِلَعْنَةِ اللّٰهِ وَلَا بِغَضَبِ اللّٰهِ وَلَا بِالنَّارِ. (ابو داؤد باب فی اللعن) ایک دوسرے کو نہ کہو کہ تم پر اللہ کی لعنت ہو اور تم پر اللہ کا غضب ہو اور نہ یہ کہو کہ تم دوزخی ہو۔

حضرت اسامہ بن شریک سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حج کو گیا لوگ آپ کے پاس آتے تھے کوئی کہتا تھا کہ میں نے طواف سے پہلے سعی کر لی یا کوئی کہتا میں نے یہ تقدیم کر لی ہے یا یہ (رکن حج) بعد میں کیا ہے آپ ﷺ فرماتے تھے کوئی حرج نہیں کوئی حرج نہیں۔ حرج اس آدمی کو ہے جس نے کسی مسلمان کی بے وجہ توہین اور آبرو ریزی کی۔ وہ ظالم ہے یہ وہ حرج ہے اور وہ ہلاک ہوا۔ (ابوداؤد باب فی من قدم شیئاً قبل شیء)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مَا كَانَ الْفُحْشُ فِي شَيْءٍ اِلَّا شَانَهٗ وَمَا كَانَ الْحَيَاءُ فِي شَيْءٍ اِلَّا زَانَهٗ (ترمذی) جس چیز میں سخت کلامی ہوگی اسے عیب ناک کر دے گی اور جس میں حیا (نرمی) ہوگی اسے زینت دے گی حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَنْ فَرَقَهُ النَّاسُ اتِّقَاءَ فُحْشِهٖ. (مسلم) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ برا آدمی وہ ہوگا جس سے لوگ اس کی بدکلامی کے باعث میل ملاپ چھوڑ دیں گے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا الْمُسْتَبَّانِ مَا قَالَا فَعَلَى الْبَادِي مَالَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ (مسلم) جب دو شخص ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں تو دونوں کی گالیوں کا گناہ اس شخص پر ہے جس نے پہلے گالی دی تاوقتیکہ دوسرا (مظلوم) تجاوز نہ کرے۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کہا یارسول اللہ ﷺ فلاں عورت نماز، روزہ اور صدقہ کی کثرت کی وجہ سے مشہور ہے مگر اپنے ہمسایوں کو اپنی زبان سے تکلیف دیتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا دوزخی ہے۔ پھر اس نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ فلاں عورت نماز، روزہ اور صدقہ کی کمی کی وجہ سے مشہور ہے۔ البتہ اپنے ہمسایوں کو اپنی زبان سے تکلیف نہیں دیتی آپ نے فرمایا وہ بہشتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اِنَّ مِنَ الْكَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَيْهِ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَهَلْ يَشْتُمُ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ قَالَ نَعَمْ يَسُبُّ اَبَا الرَّجُلِ فَيَسُبُّ اَبَاهُ وَيَسُبُّ اُمَّهٗ فَيَسُبُّ اُمَّهٗ (مسلم باب الکبائر) کہ اپنے والدین کو گالی دینا گناہ کبیرہ ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کیا کوئی آدمی اپنے والدین کو بھی گالی دیتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا ہاں اس طرح کہ کسی کے باپ کو گالی دے وہ جواب میں اس کے باپ کو گالی دے یا کسی کی ماں کو گالی دے اور جواباً اس کی ماں کو گالی دے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا۔ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ.

(مسلم باب جامع اوصاف الاسلام)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ يَامَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ فَاِنِّی رَاَيْتُكُنَّ اَهْلَ النَّارِ فَقَالَتْ اِمْرَاَةٌ مِنْهُنَّ وَمَالَنَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَكْثَرَ اَهْلَ النَّارِ قَالَ تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ (مسلم باب نقصان الایمان) اے عورتوں کی جماعت! صدقہ کرو میں دیکھتا ہوں کہ دوزخ میں زیادہ تر عورتیں ہیں ان میں سے ایک نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ کیا وجہ ہے کہ دوزخ میں عورتیں زیادہ ہیں آپ ﷺ نے فرمایا وجہ یہ ہے تم زیادہ لعنت کرتی ہو۔

ریاء کاری، دکھاوا

ریاء کے معنی کھاوا اور نمائش کے ہیں لیکن اصطلاح میں ان انسانی اعمال پر بولا جاتا ہے جن کے ساتھ خلوص نیت شامل نہ ہو۔ اسلام میں تمام اعمال کا دارو مدار حسن نیت پر ہے۔

قرآن اور حدیث میں ریاء کاری کی بہت مذمت کی گئی ہے اور ریاء کاری والے عمل کو بے ثمر کہا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَراً وَّ رِئَآءَ النَّاسِ (انفال ۸:۴۷) اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھاوے کے لیے اپنے گھروں سے نکلے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَاتُبْطِلُوا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (بقرہ۲:۲۶۴) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور تکلیف دے کر باطل نہ کرو۔ اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتا۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَخَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُ وْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلاً (نساء ۴:۱۴۲) منافق اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں وہ ان کو دھوکا بازی کی سزا دے گا اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو وہ دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر بہت ہی کم۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُ وْنَ (ماعون ۱۰۷:۴......۶) بس ان نمازیوں کے لیے ہلاکت ہو جو اپنی نماز سے غافل ہیں جو دکھاوا کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں ''کیا میں تم کو وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمھارے لیے مسیح دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے؟ صحابہ نے کہا ہاں فرمایئے آپ ﷺ نے فرمایا شرک خفی اور یہ کہ آدمی نماز کے لیے کھڑا ہو۔ اس کو زیب و زینت کے ساتھ ادا کرے اس لیے وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کو دوسرا شخص دیکھتا ہے۔ (ابن ماجہ باب الریاء والسمعۃ)

ایک بدو نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لیے ایک شخص شہرت کے لیے اور ایک شخص اظہار شجاعت کے لیے لڑتا ہے تو ان میں کس کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے فرمایا اس شخص کا جو اس لیے لڑتا ہے کہ خدا کا کلمہ بلند ہو، کسی نیک کام میں ریاکاری کی آمیزش کے بدنتائج کا ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن ایک شخص کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا جس نے شہادت حاصل کی ہو۔ یہ شخص خدا کے سامنے لایا جائے گا اور خدا اس پر اپنے احسانات جتا کر پوچھے گا کہ تم نے ان سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا کہ میں تیری راہ میں لڑا اور شہید ہوا اور خدا کہے گا کہ جھوٹ کہتے ہو۔ تم صرف اس لیے لڑے کہ تم کو بہادر کہا جائے۔ اس کے بعد اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر وہ شخص لایا جائے گا جس نے علم حاصل کیا۔ لوگوں کو علم سکھایا اور قرآن پڑھا اس سے بھی اسی طرح کا سوال کیا جائے گا اور وہ جواب میں کہے گا کہ میں نے علم سیکھا اور علم سکھایا اور تیرے لیے قرآن پڑھا۔ ارشاد ہوگا کہ جھوٹ کہتے ہو۔ تم نے علم اس لیے حاصل کیا کہ عالم کہے جاؤ۔ قرآن اس لیے پڑھا کہ قاری کہے جاؤ پھر اسی طرح گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کے بعد ایک دولت مند شخص لایا جائے گا اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا وہ کہے گا کہ مال خرچ کرنے کے جو طریقے تجھ کو پسند تھے میں نے سب میں اپنا مال صرف کیا ارشاد ہوگا جھوٹ بولتے ہو۔ تم نے یہ سب صرف اس لیے کیا کہ لوگ تم کو فیاض کہیں پھر اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ (مسلم کتاب الامارۃ باب من قاتل للریا والسمعۃ استحق النار)

حرص وطمع

اپنے مال اور دولت کو ناجائز طریقہ سے بڑھانے کے لیے ہر وقت تگ و دو کرتے رہنے کا نام حرص وطمع ہے اس سے انسان کے اندر دنائت، بخل تنگ ظرفی جیسے مذموم جذبات پیدا ہوتے ہیں اسی وجہ سے قرآن مجید اور رسول کریم ﷺ نے حرص اور طمع سے منع فرمایا ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْراً (نساء۴:۱۲۸) دلوں میں حرص طمع ہی ہوتا ہے اور اگر تم احسان کرو اور تقوی کرو تو اللہ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔

وَاَنْفِقُوْا خَيْراً لِاَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (تغابن۶۴:۱۶) اور خرچ کرو یہ تمہارے نفسوں کے لیے بہتر ہے جو اپنے نفس کے حرص وطمع سے بچ جائے تو وہی کامیاب ہیں۔

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (حشر۵۹:۹) وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں گو انہیں تنگی ہی ہو۔ جو شخص اپنے نفس کے طمع وحرص سے بچ گیا، تو وہی کامیاب ہوں گے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ حرص طمع سے بچو کہ اسی نے تم سے پہلوں کو تباہ و برباد کیا۔ اس نے ان کو آمادہ کیا۔ خون بہائیں اور حرام کو حلال سمجھیں۔ (صحیح مسلم باب تحریم الظلم)

آپ (صلعم) نے فرمایا ''ایمان اور حرص ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ (نسائی)

حضرت انسؓ سے روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا!

يَهْرِمُ ابْنُ اٰدَمَ وَيَشِبُّ فِيْهِ اثْنَانِ اَلْحِرْصُ عَلَى الْمَالِ اَلْحِرْصُ عَلَى الْعُمُرِ (بخاری ومسلم ترمذی) انسان بوڑھا ہوتا ہے اور دو چیزیں یعنی مال کی حرص اور عمر کی حرص اس میں زیادہ ہو جاتی ہے۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا!

لَوْكَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغٰى ثَالِثًا وَلَا يَمْلَاءُ جَوْفَ ابْنِ اٰدَمَ اِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ (بخاری ومسلم) اگر ابن آدم کے لیے مال کے بھرے ہوئے دو میدان بھی ہوں۔ تو وہ تیرے کی بھی خواہش کرے گا اور انسان کے پیٹ کو تو قبر کی مٹی بھرتی ہے۔ جو شخص توبہ کرے۔ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔

غیظ وغضب

جذبات بہیمیہ میں اشتعال کا نام غیظ وغضب ہے۔ چونکہ اس اشتعال سے ظلم وتعدی کے راستے کھلتے ہیں اس وجہ سے قرآن مجید اور حدیث نے جذبات پر قابو رکھنے کی تعلیم دی ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ (ال عمران۳:۱۳۴) یعنی سچے مسلمان وہ ہیں جو غصے کو دبا جاتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَاِذَا مَاغَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (شوریٰ۴۲:۳۷) اور جب ان کو غصہ آتا ہے معاف کر دیتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا!

لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرْعَةِ اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِىْ يَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ (بخاری الحذر عن الغضب) ترجمہ: پہلوان وہ نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کو دبا جاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے!

اِنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ اَوْصِنِىْ قَالَ لَا تَغْضَبْ فَرَدَّدَ وَ مِرَارًا قَالَ لَا تَغْضَبْ (بخاری الحذر عن الغضب) ترجمہ: ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کو کہا کہ مجھے نصیحت فرمائیں آپ ﷺ نے فرمایا غصہ نہ کر اس شخص نے کئی دفعہ اپنے سوال کا اعادہ کیا آپ ﷺ نے ہر بار یہی فرمایا کہ غصہ نہ کر۔

حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا!

اِنَّ الْغَضَبَ مِنَ الشَّيْطَانِ اِنَّ الشَّيْطَانَ خُلِقَ مِنَ النَّارِ وَاِنَّمَا تُطْفَى النَّارُ بِالْمَاءِ فَاِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَتَوَضَّا (سنن ابی داود، کتاب الادب باب من کتم غیضا) غصہ شیطان سے پیدا ہوا ہے اور شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے۔ آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے تو جب تم میں کسی کو غصہ آ جائے تو اسے وضو کر لینا چاہیے۔

حضرت ابوذر سے روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا!

اِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ وَهُوَ قَائِمٌ فَلْيَجْلِسْ فَاِنْ ذَهَبَ عَنْهُ الْغَضَبُ وَاِلَّا فَلْيَضْطَجِعْ (سنن ابی داود باب من کظم غیضا) جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے وہ کھڑا ہوا ہو تو چاہیے کہ وہ بیٹھ جائے اس پر اگر غصہ فرو ہو جائے تو بہتر ورنہ لیٹ جائے۔

حضرت سلمان بن صردؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دو آدمی ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگے ایک ان میں سے دوسرے کو غصے میں گالیاں دے رہا تھا۔ اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے ایک کلمہ یاد آ گیا ہے اگر وہ شخص وہ کلمہ پڑھے تو اس کا غصہ جاتا رہے اور وہ کلمہ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم لوگوں نے اس شخص کو کہا کیا تو نہیں سنتا کہ حضور (صلعم) کیا فرما رہے ہیں اس نے جواب دیا کہ میں تو مجنوں نہیں ہوں۔ (صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب ومسلم باب فضل من یملک نفسہ الغضب)۔

عیب لگانا

قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ (۴۹:۱۱) ترجمہ: ایک دوسرے کے خلاف عیب نہ لگاؤ۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا!

مَنْ عَيَّرَ اَخَاهُ بِذَنْبٍ لَمْ يَمُتْ حَتّٰى يَعْمَلَهٗ (ترمذی) ترجمہ: جو شخص اپنے کسی بھائی پر گناہ کا عیب لگائے تو جب تک وہ خود اس گناہ میں مبتلا نہیں ہو جاتا نہیں مرے گا۔

عاجزی۔ کاہلی

سستی اور کاہلی ایک ایسی کج خلقی ہے جس سے قومیں تنزل کے راستہ پر چل پڑتی ہیں۔ عموماً لوگ اس کج خلقی کو برا نہیں سمجھتے اور کاہلی کے عادی ہو جاتے ہیں اسلام نے عاجزی اور کاہلی سے منع فرمایا ہے۔ اور تمام عبادات اسی بات کی تعلیم دیتی ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے اس مذموم صفت سے تحفظ کے لیے اللہ تعالیٰ سے ان الفاظ میں دعا مانگی ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْهَرَمِ وَالْبُخْلِ (صحیح بخاری وصحیح مسلم) اے اللہ اس عاجزی کاہلی۔ بزدلی بڑھاپا اور بخل سے تیری پناہ طلب کرتا ہوں۔

رسول کریم ﷺ نے کام کرنے اور محنت کرنے کی تلقین کی ہے فرمایا۔

اَحْرِصْ عَلٰى مَا يَنْفَعُكَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجِزْ (صحیح مسلم) مفید کاموں کی حرص کر اور اللہ سے مدد طلب کر اور عاجزی اور سستی نہ کر۔

اس دنیا کی رونق اور آبادی محض محنت میں مضمر ہے۔ جو شخص محنت سے جی چراتا ہے اور کاہلی کو اپنے اوپر وارد کرتا ہے۔ تو گویا وہ دنیا کی رونق اور آبادی کو عملی طور پر اجاڑ رہا ہے۔ اس لیے اسلام نے کاہلی اور کسل سے منع فرمایا ہے محنت کی ترغیب دی ہے کیونکہ دنیا کے باغ کی آبیاری محنت سے ہوتی ہے۔ کاہلی کے بداثرات صرف اجتماعی زندگی پر ہی نہیں پڑتے بلکہ انسان خود بھی اس کے بداثرات کے نیچے آتا ہے۔ کاہل اور نکمے شخص کی تمام باطنی استعدادیں مردہ ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے اس میں اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ کو کاہلی پسند نہیں اس وجہ سے رسول کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ وہی قومیں دینا کے نقشہ پر ابھری ہیں جو محنت کے تیز رو گھوڑے پر سوار ہوئی ہیں اور وہ قومیں ادبار کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتی ہیں جس کے افراد کاہلی کی زندگی بسر کرتے تھے۔

روحانی حالت و تعمیر سیرت کے اصول

قلبی اخلاق: اخلاق کا تیسرا اہم حصہ روحانی حالت ہے جو قلبی اخلاق سے موسوم ہے اسلام کے نزدیک اخلاق صرف ظاہری اعمال سے ہی نہیں تعلق رکھتے بلکہ دل کی پاکیزگی ہی ضابطہ اخلاق کی اساس ہے کیونکہ اعمال کا سرچشمہ دل ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (الانعام ۶:۱۵۱) اور بے حیائی کی باتوں کے قریب مت جاؤ جو ان میں سے ظاہر ہوں اور جو چھپی ہوئی ہوں۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اخلاقی تعلق صرف ظاہری اعمال سے ہی نہیں بلکہ ان اعمال سے بھی ہے جن کا مرتکب دل ہوتا ہے۔ گو ان کو معلوم کرنے کا طریقہ لوگوں کے پاس نہیں ہے چونکہ اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہستی ہے۔ جو دلوں کے بھیدوں کو جانتی ہے وہ جانتی ہے کہ انسان کے دل میں کیا کیا خیالات موجزن ہیں اور وہ کیا کیا بُرے اعمال اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہے۔

دوسری جگہ اس مضمون کو اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ (البقرہ ۲:۲۸۴) اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا اسے چھپاؤ اللہ اس کا تم

سے حساب لے گا۔

ایک اور جگہ پر آتا ہے۔

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (البقرہ۲:۲۲۵) اور اللہ مواخذہ کرے گا جو تمہارے دلوں نے کمایا۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (بخاری) یعنی اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے۔

اگر ایک انسان عمدہ کام کرتا ہے لیکن اس کی نیت خراب ہے تو وہ اس عمل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل مواخذہ ہے یہ حدیث ظاہر کرتی ہے کسی عمل کی اچھائی یا برائی کا فتویٰ اس کے خیال پر مبنی ہے۔ اگر خیال اچھا ہے اور عمل بھی اچھا ہے تو اس عمل پر اچھا اجر مرتب ہوگا۔ اگر خیال برا ہے خواہ عمل اچھا ہی ہو۔ تو اس پر اچھا اجر مرتب نہیں ہوگا۔ اور وہ عمل قابل مواخذہ ہے۔

ایک اور حدیث ہے رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔

اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ (بخاری ومسلم) جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ جان لو وہ دل ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (الاعلیٰ ۸۷:۱۴) جس نے دل کو پاک کیا وہ کامیاب ہو گیا۔

اس مضمون کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (الشمس ۹۱:۹) یقیناً بامراد ہوا وہ شخص جس نے اپنے دل کو پاک کیا۔

جو لوگ دل کی پاکیزگی کی طرف توجہ نہیں دیتے ان کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس۹۲:۱۰) ترجمہ: یقیناً ناکام و نامراد ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنے دل کو گناہوں کی میل سے پاک نہ کیا۔

اگر کسی کے دل میں ایک لحہ برا خیال آتا ہے لیکن وہ اس کو دبا جاتا ہے۔ اور مجاہدہ اور خدا خوفی سے اس برے خیال سے دل کو پاک کر لیتا ہے۔ تو وہ خیال قابل مواخذہ نہیں ہوگا بلکہ قابل تعریف ہوگا اور وہ شخص اچھے اجر کا مستحق ہوگا رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔

مَنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً (بخاری) ترجمہ: اگر کسی شخص کے دل میں برا خیال پیدا ہو جاتا ہے اور اس خیال کو عملی جامہ نہیں پہناتا بلکہ دل میں دبا دیتا ہے اس کے لیے ایک پوری نیکی لکھ دے گا۔

بُرا خیال اس وقت قابل مواخذہ ہوتا ہے جب انسان اس خیال کو عملی جامہ پہنائے گا۔ اگر راستہ تلاش کرتا ہے مگر وہ خیال بُرے عمل کی شکل میں ظاہر نہ ہوا۔ اللہ کے نزدیک وہ برا خیال بداخلاقی میں شمار ہوگا۔

تزکیہ نفس اور تعمیر سیرت کے اصول

اسلام نے تزکیہ نفس اور تعمیر سیرت کے لیے اصول مقرر کیے ہیں۔
ان میں سے تین حقیقی اور چار ثانوی ہیں۔

حقیقی اصول (عقائد): عقائد سے مراد اللہ پر، فرشتوں پر، نبیوں پر، کتب سماوی پر اور آخرت پر ایمان ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے لیے بہت زور دیا گیا ہے۔

ایمان باللہ اصل الاصول ہے۔ جو نیکیوں کی جڑ ہے جو شخص غیر اللہ طرف جھکتا ہے نہ وہ دل کی پاکیزگی حاصل کر سکتا ہے اور نہ اخلاق حسنہ کے زیور سے آراستہ ہو سکتا ہے۔ سورۃ البقرہ کے آغاز سے ہی متقیوں کی ایک علامت یہ بیان کی ہے۔

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (البقرہ ۲:۲) متقی وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان ہوتے ہیں گویا اتقاء اور ایمان باللہ لازم وملزوم ہیں تقوی ایمان باللہ کے سوا حاصل نہیں ہوتا متقی وہ لوگ ہوتے ہیں جو دل کے پاک اور اخلاق حسنہ کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں۔

ایک اور مقام پر آتا ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ اے لوگو! جو ایمان لائے اللہ پر ایمان لاؤ۔ ایک اور جگہ پر آتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ (الحدید ۱۹:۵۷) اور جو اللہ اور اس رسولوں پر ایمان لائے اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں صدیق اور شہید دو روحانی مقام ہیں۔ مقام صدیقت اور مقام شہادت پانے کے لیے اللہ پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جو لوگ قولاً اور عملاً اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں وہ با اخلاق بنتے ہیں اور با اخلاق بننے کے بعد روحانی منازل طے کرنا شروع کرتے ہیں اور مقام ولایت حاصل کرتے ہیں۔ مقام ولایت حاصل کرنے کے لیے اخلاق فاضلہ کا لباس زیب تن کرنا ضروری ہے۔ اس لباس کو قرآن مجید میں لباس تقوی بھی کہا گیا ہے کیونکہ تقوی ہی تمام اخلاق فاضلہ کی جڑ ہے۔ یہ اللہ پر ایمان لانے کا ثمر ہے۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (الحدید ۸:۵۷) ترجمہ: اور تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے اللہ کی ہستی پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کی جائے اور اس کے اسماء حسنی میں اپنے آپ کو رنگین کیا جائے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (البقرہ ۱۳۸:۲) اللہ کا رنگ اختیار کرو اس کے رنگ سے اچھا اور کسی کا رنگ ہے۔

اس آیات کریمہ میں صبغتہ سے مراد اسماء حسنی ہیں۔ جب ایک شخص اللہ تعالیٰ کی ذات میں فنا ہو کر اس کی صفات میں اپنے آپ کو رنگ لیتا ہے اسی حالات فنا سے بقا باللہ کی حالت ظاہر ہوتی ہے۔ یہ دونوں مقام اس وقت حاصل ہوتے ہیں جب انسان کامل طور پر اللہ کی صفات میں رنگین ہوتا ہے اخلاق فاضلہ ہی صفات الٰہیہ کا ظل ہیں۔ گویا صفات الٰہیہ میں اپنے آپ کو رنگنے سے مراد اخلاق فاضلہ کو اختیار کرنا ہے۔ لہٰذا تعمیر سیرت کے لیے ایمان باللہ لازمی ہے۔

قرآن مجید میں ایک اور مقام پر ایک عمدہ تمثیل بیان کی گئی ہے یہ وضاحت کی ہے کہ جو اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کی پیروی کرتا ہے وہ کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ (الرعد ۱۴:۱۳) یعنی دعا کرنے کے لائق صرف اللہ ہی ہے جو لوگ اس کے غیروں کو پکارتے ہیں وہ ان کو کچھ جواب نہیں دے سکتے۔ ان کی مثال ایسی ہے جب کہ کوئی پانی کی طرف اپنا ہاتھ پھیلائے تاکہ پانی اس کے منہ تک پہنچ جائے لیکن پانی اس کے منہ تک نہیں پہنچ سکے گا۔ یہ حال ان لوگوں کا ہے جو اللہ کے علاوہ غیر کو پکارتے ہیں وہ ان کو کسی قسم کا نفع نہیں پہنچا سکتے۔

اس آیت کریمہ میں ایمان باللہ کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر غیر اللہ کو پیچھے بھاگتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک پیاسا پیاس بجھانے کے لیے صرف پانی کی طرف ہاتھ پھیلاتا ہے اور پانی خود بخود اس کے منہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس طرح جو لوگ غیر اللہ کی طرف

بھاگتے ہیں وہ منزل مقصود نہیں حاصل کر سکتے۔ منزل تک پہنچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمان لانا ضروری ہے۔

ضمنی عقائد فرشتوں، نبیوں، کتب سماوی اور یوم آخرت پر ایمان لانا ہے۔ یہ عقائد بھی تعمیر سیرت کا کام دیتے ہیں فرشتے انسان کے دل میں نیکی کی تحریک کرتے ہیں انسان پر لازم ہے ان نیک کاموں کو بجا لائے۔ انبیاء علیہم السلام لوگوں کی ہدایت کے لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے ضابطہ حیات لاتے ہیں جس کو وحی نبوت یا کتاب کہا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا وجود اور آسمانی ضابطہ حیات لوگوں کی حیات کا موجب ہیں۔ اسی میں انسانی فلاح اور تعمیر سیرت کے اصول پائے جاتے ہیں تمام آسمانی کتب کا مطالعہ کیجئے اس میں تعمیر سیرت کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ اسی طرح یوم آخرت پر ایمان انسان کے اندر محاسبے کا شعور پیدا کرتا ہے کہ ایک دن مرنے کے بعد اللہ کے سامنے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اس لیے اس کو خدا کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے۔ احکام خداوندی پر عمل کرنا ہی تعمیر سیرت ہے۔ اور یہی انسانی فلاح ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جہاں ایمان لانے کا ذکر کیا ہے وہیں اعمال صالح بجالانے کا ذکر ہے گویا ایمانیات اور اعمال صالحہ لازم ملزوم ہیں۔

۲۔ عبادات: اسلام میں عبادات سے مراد چند رسمی کلمات اور حرکات کا نام ہیں۔ بلکہ لفظ عبادت اپنے اندر ایک وسیع مفہوم لیے ہوئے ہے اللہ تعالیٰ ہمارے چند تعریفی کلمات کا محتاج نہیں وہ تو غنی اور صمد ہے اسلام میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام اور ضابطہ حیات کا جوا اپنی گردن پر رکھ کر اس کے مطابق زندگی بسر کرے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض وغایت ہی عبادت قرار دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات۵۱:۵۶) میں نے جن وانس کو اس لیے پیدا کیے ہیں تا کہ مری عبادت کریں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ۲:۲۱) اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا۔ اور انہیں بھی جو تم سے پہلے تھے تا کہ تم متقی بنو۔

چار عبادتیں: آسمانی ضابطہ حیات کے مطابق زندگی گزارنا عمومی عبادت میں شامل ہے لیکن اسلام نے چار مخصوص عبادتیں مقرر کی ہیں جو عمومی عبادت کے قائم مقام ہیں وہ ہیں نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج۔ ان چاروں عبادات کا ایک ہی ہدف ہے وہ ہے تعمیر سیرت اور حصول تقویٰ۔ اسلام میں تقویٰ وہ وصف ہے جو تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔ اور اسی جڑ سے تمام نیکیاں نمو پاتی ہیں اور یہی تعمیر سیرت ہے۔

نماز: نماز دین کا ستون ہے۔ قرآن مجید اور حدیث میں نماز کے قائم کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ سورۃ البقرہ کے آغاز میں ہی ارشاد الٰہی ہے۔ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ (۲:۳) متقی وہ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں۔

متقیوں کو ہی مفلحون کہا گیا ہے۔ اور نماز کو فلاح کا ذریعہ اس وجہ سے قرار دیا ہے۔ یہ انسانی تعمیر سیرت کا ذریعہ ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (العنکبوت۲۹:۴۵) نماز ہر قسم کی بے حیائیوں اور بے شرمی کی باتوں سے روکتی ہے۔

ایک دفعہ رسول کریم ﷺ صحابہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے آپ ﷺ نے فرمایا بتاؤ تو سہی اگر کسی کے دروازے کے سامنے نہر گزرتی ہو۔ اور وہ دن میں پانچ دفعہ اس میں نہائے تو اس کے بدن پر کسی قسم کی میل رہ جاتی ہے؟ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ نہیں آپ ﷺ نے فرمایا یہی حالت پانچ نمازوں کی ہے کہ وہ انسان کے گناہوں کو دھو دیتی ہے۔

فحشاء ومنکرات سے اجتناب ہی فلاح انسانی ہے جو نماز کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ (المومنون۲۳:۲) مومن یقیناً کامیاب ہیں جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔

نماز صرف فحشاء ومنکرات سے ہی نہیں روکتی بلکہ تزکیہ نفس، اخوت، مساوات، رواداری اور ہمدردی جیسے اوصاف حمیدہ کی بھی تعلیم دیتی ہے۔

زکوٰۃ: قرآن مجید میں اقامت صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا ذکر بھی آیا ہے جس میں یہ حکمت بالغہ ہے کہ انسان اس وقت صحیح تربیت یافتہ نہیں کہلا سکتا جب تک وہ اللہ کے سامنے جھکنے کے ساتھ ساتھ مخلوق الٰہی کی خدمت بجا نہیں لاتا کیونکہ یہ دونوں پہلو تکمیل انسانیت کے لیے ضروری ہیں ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔

سورۃ البقرہ کے آغاز میں فلاح کا ایک ذریعہ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۲:۳) (اور اس میں سے جو ہم نے ان کو دیا ہے خرچ کرتے ہیں) بیان کیا ہے۔ اسی طرح سورۃ مومنوں میں بھی زکوٰۃ کو مومنین کی فلاح کا سبب قرار دیا ہے فلاح تعمیر سیرت کا ثمر ہے تعمیر سیرت ہوگی تب فلاح میسر ہوگی۔ گویا زکوٰۃ تعمیر سیرت کا ذریعہ ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (المومنون۲۳:۴) (کامیاب وہ مومن ہیں) جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں۔ زکوٰۃ ایک طرف انسانی مواسات غم خواری، ہمدردی، ربوبیت اور اخوت جیسے اخلاق فاضلہ کا سبق دیتی ہے۔ دوسری طرف حرص، لالچ، خودغرضی جیسے اخلاقی امراض کا علاج بھی ہے۔

روزہ: روزہ تعمیر سیرت کا ایک سبب ہے۔ روزے سے انسان کی روحانی قوت تیز ہوتی ہے اس وجہ سے صوفیاء کرام ماہ رمضان کی تنویر قلب کا مہینہ کہتے ہیں اسی طرح روزہ انسانی مواسات، مساوات اور اخوت کے جذبات پیدا کرتا ہے۔

حج: صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک دفعہ بیت اللہ کا حج کرنا فرض ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (آل عمران۳:۹۷) اور لوگوں پر اللہ کے لیے اس گھر کا حج کرنا فرض ہے جو اس تک راہ پا سکے۔

حج تمام عبادات کا مجموعہ ہے اس سے تزکیہ نفس، اخوت، مساوات، ہمدردی، مواسات اور کسب حلال کا سبق ملتا ہے۔ گویا اسلامی عبادات کردار سازی کا ذریعہ ہے۔ انہی عبادات کو ادا کر کے مسلمان بااخلاق بنے تھے۔

۳۔ رسول کریم ﷺ کا نمونہ: ہر شخص طبعی طور پر نمونے کا محتاج ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس طبعی احتیاج کو پورا کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام بھیجے۔ آخر میں رسول کریم ﷺ کو لوگوں کے لیے کامل نمونہ بنا کر بھیجا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب۳۳:۲۱) تمہارے رسول کریم ﷺ میں ذات میں کامل نمونہ ہے۔

رسول کریم ﷺ کی ذات اس وجہ سے نمونہ ٹھہراتی ہے کہ آپ ﷺ خود خلق عظیم پر قائم تھے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم ۶۸:۴) ترجمہ: آپ ﷺ خلق عظیم پر متمکن ہیں لہٰذا جو شخص خلقِ عظیم پر متمکن ہوگا۔ وہی لوگوں کے لیے نمونہ بن سکتا ہے۔ رسول کریم ﷺ اپنی بعثت کی ایک غرض یہ بیان فرماتے ہیں۔ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ (موطا امام مالک باب حسن خلق) میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

قرآن مجید میں بھی آتا ہے۔ وَيُزَكِّيْهِمْ وہ ان کو پاک کرے گا۔

لہٰذا اس دنیا میں اگر کوئی شخص کسی کا نمونہ بن سکتا ہے وہ حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی ذات ہے اس لیے کردار سازی اور تعمیر سیرت کے لیے رسول کریم ﷺ کی پیروی لازمی ہے۔ تاریخ اس بات پر شاید ہے کہ آپ کی اتباع سے عرب کے لوگ جو ہر قسم کی برائی میں مبتلا تھے باادب اور بااخلاق بن گئے۔ وہی عرب جو گناہوں میں لذت محسوس کرتے تھے وہی عرب برائیوں سے نفرت کرنے لگے۔ کرداری سازی کی اس سے بڑھ کر تاریخ میں کوئی مثال نہیں مل سکتی۔

ضمنی اصول

۱۔ دعا: اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

اُدْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن۴۰:۶۰) تم دعا کرو میں قبول کروں گا۔

روحانی انعامات حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ دعا ہے اور دعا اس وقت کارگر ثابت ہوتی ہے جب انسان اپنی زندگی اور اپنی تمام قوتوں کو اللہ کے راستہ میں وقف کر دیتا ہے۔ اور قرآن مجید کی اس آیت کا مصداق ہو جاتا ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الانعام۶:۱۶۲) کہہ کہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میرا مرنا اللہ کے لیے ہیں جو جہانوں کا رب ہے۔ یعنی انسان کی زندگی کا ایک لمحہ اللہ کی رضا کے لیے وقف ہو۔

اسلامی نقطہ نگاہ سے دعا کرنا اپنے اوپر ایک موت وارد کرنا ہوتا ہے۔ جب انسان کی ارضی اور سفلی خواہشات اللہ کی محبت کی آگ سے بھسم ہو جاتی ہیں اور انسان کی روح آستانہ الوہیت پر پانی کی طرح بہہ نکلتی ہے جب انسان پر یہ حالت وارد ہوتی ہے۔ اس وقت انسان محفوظیت کی مستحکم چٹان پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور شیطان اس آدمی کو گناہوں کے راستے پر چلانے سے بالکل مایوس ہو جاتا ہے۔

۲۔ توبہ استغفار: توبہ عربی میں رجوع کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں خدا کا نام توّاب ہے۔ یعنی بہت رجوع کرنے والا۔ اس کے معنی ہیں جب انسان اپنے کردہ گناہوں سے دست بردار ہو کر اللہ تعالیٰ اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی چادر میں لپٹ لیتا ہے اور اپنے تائب بندے کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔

توبہ کی تین شرائط: اقلاع: یعنی توبہ کرنے والا اپنے دل سے خیالات فاسدہ کو دور کر دے کیونکہ خیالات فاسدہ ہی افعال بد کا محرک ہوتے ہیں عمل سے پہلے

تصور جنم لیتا ہے وہ تصور عمل کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے جب انسان اپنے دل کو خیالات فاسدہ سے پاک کرے گا۔ تو اس سے افعال ردیہ سرزد نہیں ہوں گے۔

ندم: یعنی اپنے کئے پر حقیقی پشیمانی اور ندامت اختیار کرنا۔ جب انسان اپنے کیے پر حقیقی پشیمانی اور ندامت اختیار کرتا ہے تو پھر اس سے مزید افعال مذمومہ سرزد نہیں ہوتے کیونکہ ندامت روح کے لیے ایسی ضرب ہے جو ہمیشہ انسان کو افعال فاسدہ سے آگاہ رکھتی ہے اور لغزشوں سے بچاتی ہے۔

عزم: یعنی آئندہ کے لیے مصمم ارادہ کر لینا کہ پھر ان افعال ردیہ کی طرف رجوع نہیں کرے گا جو اس سے سرزد ہو چکے ہیں جب بندہ اس عزم کے ساتھ اللہ کی طرف قدم بڑھائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ بھی اسے سچی توبہ کی توفیق عطا کر دے گا۔

استغفار: استغفار غفر سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کہ اللہ سے درخواست کرنا کہ بشریت کی کمزوری ظاہر نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں استغفار کے معنی استمداد اور استقامت کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں استغفار اور توبہ کرنے کی بہت تاکید کی ہے ارشاد الٰہی ہے۔ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ (محمد ۱۹:۴۷) ترجمہ: یعنی خدا سے درخواست کر کہ وہ مجھے بشریت کی کمزوری سے محفوظ رکھے اس طرح مومن مرد اور مومن عورتوں کو بھی محفوظ رکھے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ (ہود۱۱:۳) ترجمہ: یعنی تم اپنے رب سے استغفار کرو اور اسی کی طرف رجوع کرو۔

استغفار اور توبہ دو ایسی شمعیں ہیں جن کی روشنی سے انسان اللہ تعالیٰ کے قرب کے راہوں پر آسانی سے چل سکتا ہے۔

۳۔ مجاہدہ: قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت ۶۹:۲۹) اور جو لوگ ہمارے لیے محنت اٹھاتے ہیں ہم یقیناً انہیں اپنے راستوں پر چلائیں گے۔

تمام انبیاء علیہم السلام خصوصاً رسول کریم ﷺ کی زندگی کا مطالعہ کریں۔ تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ دل کی طہارت کے حصول اور روحانی سلوک پر گامزن ہونے کے لیے تمام انبیاء علیہم السلام نے مجاہدات کئے ہیں اور انہی کی سنت پر اولیا کرام گامزن ہوئے اور انہوں نے بھی خدا سے تعلق پیدا کرنے کے لیے مجاہدات کیے۔ پہلے انبیاء علیہم السلام کے امتیوں نے مجاہدہ سے مراد رہبانیت لے لی۔ اور تارک الدنیا ہو کر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا پناہ گزیں ہوئے۔ لیکن رسول کریم ﷺ نے رہبانیت کو غیر اسلامی طریقہ قرار دیا اور کہا کہ حقیقی مجاہدہ معاشرہ میں رہ کر اپنے کام کاج کو الٰہی قوانین کے مطابق کرنے اور رات کے پچھلے حصے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے قیام رکوع اور سجود بجالانے کا نام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سعی بلیغ کے بغیر کوئی چیز بھی حاصل نہیں ہو سکتی چہ جائیکہ تزکیہ نفس حاصل ہو جائے۔ یہ قانون قدرت کے ہی خلاف ہے۔

اسلام نے مجاہدے کی حدود مقرر کر دی ہیں ان کے باہر بدعات ہیں جو گمراہی کا باعث ہیں۔

۴۔ استقامت: استقامت یہ ہے کہ اگر انسان ہر قسم کے مصائب اور تکالیف میں گھر جائے کوئی بھی مونس اور معاون نہ ہو۔ اس حالت میں بھی اس کی زبان اور اس کے جوارح سے کسی قسم کی بے چینی و اضطراب ظاہر نہ ہو۔ بلکہ مصائب کے کڑوے گھونٹ آب شریں سمجھ کر پی جائے۔ اس کے چہرے پر انبساط اور بشاشت کی ہی لہریں دوڑیں اس کا قدم اللہ تعالیٰ کے لیے اور بھی تیزی سے اٹھے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے قوانین پر مستقل مزاجی اور مضبوط قدموں کے ساتھ جمے رہنے کا نام استقامت ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِيَآؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (حم السجدہ ۴۱:۳۰،۳۱) ترجمہ: یعنی وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر استقامت اختیار کی۔ (یعنی ہر قسم کی تکلیف اور آزمائش کے وقت ثابت قدم رہے) ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم مت ڈرو اور مت غمگین ہو۔ جنت اور دائمی خوشی کی بشارت پاؤ جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا ہے۔ ہم دنیا اور آخرت کی زندگی میں تمہارے دوست ہیں۔

پس طہارت قلبی حاصل کرنے کے لیے استقامت ضروری امر ہے۔

آداب

آداب، ادب کی جمع ہے لغت میں ادب کے معنی ہیں حفظ مراتب، دستور، قاعدہ، سلیقہ، تمیز، تہذیب، اخلاق، تعظیم سے سلام کرنا.......... تعظیمی الفاظ جو خطوط میں القاب کے بعد لکھے جاتے ہیں۔

اصطلاحی نقطہ نگاہ سے انسانی زندگی کے لیل و نہار کے ضروری مشاغل جن کے بجالانے سے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو فائدہ اور آرام پہنچے آداب کہلاتے ہیں۔

فطری آداب: فطری آداب دو اصولوں پر مبنی ہیں۔ طہارت اور ترک رہبانیت دو ایسے اصول ہیں جن کو انسانی فطرت پسند کرتی ہے اور جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ خَمسٌ مِنَ الْفِطْرَةِ اَلْاِسْتِحْدَادُ وَالْخِتَانُ وَقَصُّ الشَّارِبِ وَنَتْفُ الْاِبِطِ وَتَقْلِمُ الْاَظْفَارِ (سنن نسائی و مسلم باب خصال الفطرت) پانچ صفات فطرت میں سے ہیں۔ زیر ناف بال اتارنا، ختنہ کرنا، مونچھیں کاٹنا، بغل کے بال اکھڑنا، اور ناخن تراشنا۔

دوسری حدیث میں یہ خصال دس تک بیان کئے گئے ہیں مونچھ ترشوانا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن ترشوانا، انگلیوں کے درمیان خلال کرنا، بغل کے بال کٹوانا، موئے زیر ناف کو صاف کرنا، پانی سے استنجا کرنا، راوی کہتا ہے دسویں بات بھول گیا ہوں، غالباً کلی کرنا ہے۔

بخاری کی ادب المفرد میں ہے کہ حضرت ابراھیم علیہ السلام نے سب سے پہلے ختنہ کرایا مونچھیں ترشوائیں اور ناخن کٹوائے (باب الختان الکبیر)

طہارت اور اس کے آداب: اسلام نے طہارت اور پاکیزگی پر بہت زور دیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ (مدثر۷۴:۵۱) اے اوڑھنے والے اٹھ اور ڈرا اور اپنے رب کی بڑائی کر اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ۔

ان آیات کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذکر الٰہی کا طہارت کے ساتھ نہایت گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ ظاہر کا باطن پر گہرا اثر ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالٰی نے روح کی صفائی کے لیے ظاہر کی صفائی ضروری قرار دی ہے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ اَلنَّظَافَةُ مِنَ الْاِیْمَانِ یعنی پاکیزگی ایمان کا حصہ ہے۔

نماز کے لیے وضو لازمی قرار دیا ہے۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں نماز جنت کی چابی ہے اور وضو نماز کی۔ اسلام ایک ایسے ملک میں ظاہر ہوا۔ جہاں پانی نسبتاً کم تھا۔ پھر بھی اس نے بعض حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا ہے۔ مجامعت کے بعد جب تک میاں بیوی دونوں غسل نہ کرلیں۔ نماز ادا نہیں ہوتی۔ کپڑے بھی پاک رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اگر پانی دست یاب نہ ہو۔ تو پاک مٹی سے تیمم کی اجازت دی ہے۔

طہارت کے حسب ذیل آداب سکھاتے ہیں۔

1- سوکر اٹھو تو برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے پہنچوں تک ہاتھ دھولو۔ کیونکہ معلوم نہیں سونے میں ہاتھ کہاں کہاں پڑا ہے۔ (مسلم کتاب الطھارة)
2- دانتوں کی صفائی کے لیے مسواک کرنا۔ ارشاد ہے۔ اگر میری امت پر دو بھر نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا (ابوداؤد کتاب الطھارة)
3- عام راستوں اور درختوں کے سایہ میں قضائے حاجت نہ کرو۔ (ابو داؤد کتاب الطھارة) تاکہ راستہ پر چلنے والے اور درختوں کے سایہ میں بیٹھنے والے لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔
4- ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کرو اور نہ اس میں غسل جنابت کرو۔
5- کھڑے ہو کر پیشاب نہ کرو تاکہ چھینٹیں اڑ کر کپڑوں پر نہ پڑیں۔
6- غسل خانہ میں پیشاب نہ کرو۔ کیونکہ نہاتے وقت پانی کی چھینٹیں اڑ کر کپڑوں کو ناپاک کریں گی۔
7- قضائے حاجت اور پیشاب کرنے کے بعد استنجا کرو تاکہ گندگی کا اثر جسم اور کپڑوں پر نہ آئے۔

-8 مٹی سے استنجا کرنے کے بعد پانی سے بھی صفائی کرنی چاہیے۔
-9 جمعہ کو ہر مسلمان پر غسل کرنا، کپڑے دھونے، عطر اور تیل لگانا مستحب ہے۔
-10 صفائی اور طہارت کا ہر حالت میں خیال رکھنا چاہیے یہ ایک مسلمہ امر ہے ظاہر کا باطن پر اثر پڑتا ہے۔
ایک بار رسول کریم ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے بال پراگندہ ہیں۔ فرمایا کیا اس کے پاس بال درست کرنے کا سامان نہ تھا؟
ایک شخص کو گندے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا۔ تو فرمایا کیا اس کو پانی نہیں ملتا کہ کپڑے دھولے۔ (ابوداؤد کتاب اللباس فی غسل الثوب)
اسلام نے صفائی کی تعلیم میں سادگی کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ ایسی تعلیم نہیں دی۔ جو غلو اور تشدد کی حد تک پہنچ جائے۔ اور لوگوں کے لیے تکلیف کا موجب بنے۔

کھانے پینے کے آداب: رسول کریم ﷺ کھانے پینے کے آداب بھی سکھائے ہیں۔

پاک اور حلال اشیاء سے کھانا تیار ہونا چاہیے اللہ کا فرمان ہے۔ ''اے ایمان والو! جو پاک روزی تمہیں دی گئی ہے اسے کھاؤ (البقرہ ۲:۱۷۲)

-1 کھانا کھانے سے پہلے اور کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھولینے چاہئیں۔ فرمایا'' اگر کوئی کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے بغیر سو جائے اور کوئی جانور اس کا ہاتھ کاٹ لے۔ تو اسے اپنے آپ کو ملامت کرنا چاہیے کیونکہ ایسا اس غلطی سے ہوا۔ (ابوداؤد)
-2 کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنی چاہیے کیونکہ کھانا خدا کی نعمت عظمیٰ ہے۔ اس لیے اس کے نام کے ساتھ کھانا شروع کرنا چاہیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا'' جس کھانے پر خدا کا نام نہیں لیا جاتا شیطان اس کو اپنے لیے جائز کر لیتا ہے۔ (ابوداؤد کتاب الاطعمہ)
-3 کھانے پینے کا کام دائیں ہاتھ سے اور رفع نجاست کا کام بائیں ہاتھ سے کرنا چاہیے۔
-4 کھانا برتن کے کنارے کے پاس سے کھانا چاہیے۔ (ترمذی کتاب الاطعمہ باب ماجاء فی کراھیۃ الاکل فی وسط الطعام)
تاکہ بچا ہوا کھانا خراب نہ ہو۔ دوم برتن گندہ نہ ہو۔ سوم یہ کہ اگر کوئی اس طریقہ سے نہ کھائے تو اس سے اس کی حرص کا پتہ لگ جاتا ہے۔
-5 ساتھیوں کی اجازت کے بغیر دو دو کھجور وغیرہ ایک ساتھ نہ کھایا جائے۔ (ترمذی ابواب الطعام) یہ طریقہ ایثار کے خلاف بھی ہے اور انسان کی حرص واضح ہوتی ہے۔
-6 کھانے میں نقص نکالنا نہیں چاہیے اس سے گھر والے اور پکانے والوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر کھانا بدمزہ ہو تو اگر خواہش ہو کھالینا چاہیے۔ ورنہ ترک کر دینا چاہیے۔ (بخاری کتاب الاطعمہ)
-7 دوستوں اور گھر والوں کے ساتھ مل کر کھانا چاہیے کیونکہ یہ حسن معاشرت کی علامت ہے اور آپس کے اختلاف کم ہوتے ہیں اور محبت بڑھتی ہے۔
رسول کریم ﷺ نے فرمایا'' ساتھ مل کر کھانے میں برکت ہوتی ہے اور کھانا زیادہ برباد نہیں ہوتا۔
-8 ٹیک لگا کر یا اوندھے لیٹ کر کھانا نہیں کھانا چاہیے۔ (ابوداؤد کتاب الاطعمہ) کیونکہ طبی لحاظ سے بھی مضر صحت ہے کیونکہ اس طرح کھانا معدہ میں آرام سے نہیں پہنچتا۔
-9 ایک برتن میں مل کر کھانے کی صورت میں ہر شخص کو اپنی طرف سے کھانا چاہیے۔ اس طرح کھانا خرب نہیں ہوتا اور دوسرے کی نفرت کا موجب نہیں ہوتا۔
-10 کھانا کھانے کے بعد برتن کو انگلیوں سے اور انگلیوں کو منہ سے اچھی طرح صاف کر لینا چاہیے پھر ہاتھ کو رومال سے صاف کر لینا چاہیے۔ (بخاری کتاب الاطعمہ)
-11 پانی ٹھہر ٹھہر کر دو تین سانس میں پینا چاہیے۔ (بخاری کتاب الاشربۃ) اس طرح آدمی سیر بھی ہوتا ہے اور اندر سے نکلنے والی گندی سانس پانی کو نہیں لگتی۔
-12 کھانے کے متعلق آپ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ کوئی بغیر بلائے کسی دعوت پر نہ چلا جائے۔ ایک دفعہ ایک عورت نے دعوت دی اور کہا چار آدمی بھی اپنے ساتھ لیتے آئیں جب آپ ﷺ عورت کے گھر کے دروازے پر پہنچے تو پانچواں آدمی بھی ساتھ تھا۔ آپ ﷺ نے میزبان سے کہا کہ ایک آدمی زائد ہے۔ چاہیں تو آپ اس کو بھی اجازت دے دیں چاہیں تو اس کو رخصت کر دیں۔ میزبان نے اجازت دے دی (بخاری کتاب الاطعمہ)
-13 پانی کے برتن میں سانس نہ لینی چاہیے (ابوداؤد کتاب الاشربۃ) کیونکہ اندر کی ہوا کثیف ہوتی ہے اس لیے سانس سے ملی ہوئی کثیف چیز کو پھر اندر نہیں لے جانا چاہیے۔
-14 بے ضرورت کھڑے ہو کر پانی نہ پینا چاہیے طبی لحاظ سے پانی پینے کے وقت اندر کے پٹھے ڈھیلے ہونے چاہئیں اور وقار کے خلاف ہے البتہ اگر کوئی چاہے تو کچھ حرج نہیں، کیونکہ آپ ﷺ کبھی کبھی کھڑے ہو کر پانی پی لیا کرتے تھے (ابوداؤد کتاب الاشربۃ)

15- مشکیزہ کے منہ یا ابریق کی ٹونٹی سے پانی نہیں پینا چاہیے کیونکہ اس میں یہ دیکھا نہیں جا سکتا کہ اس میں کوئی ضرر رساں چیز تو نہیں۔
16- کھانے اور پانی کے برتنوں کی ڈھانک کر رکھنا چاہیے۔ (صحیح مسلم کتاب الاشربۃ) تاکہ گرد یا کوئی کیڑا مکوڑا نہ پڑ جائے۔
17- پیٹ بھرنے سے پہلے کھانا چھوڑ دینا چاہیے اور فرماتے تھے ایک انسان کا کھانا دو انسانوں کو کافی ہونا چاہیے۔
(بخاری کتاب الاطعمہ باب طعام الواحد یکفی الاثنین)

فرمایا "انسان پیٹ سے بدتر کوئی برتن نہیں بھرتا ابن آدم کے لیے چند لقمے کافی ہیں جو اسے کھڑا رکھ سکیں۔ اگر ایسا نہیں کرتا (اور زیادہ کھانے کا شوق ہے) تو تہائی کھانے کے لیے تہائی پینے کے لیے اور تہائی سانس کے لیے۔" (سنن ابن ماجہ۔ مستدرک حاکم)

حفظ مراتب ملحوظ رکھتے ہوئے اکٹھے بیٹھنے والوں میں سے سب سے پہلے بڑے کو کھانا یا مشروب پیش کیا جائے۔ پھر دائیں طرف سے دینا شروع کیا جائے۔ کھلانے اور پلانے والا آخر میں خود نوش کرے۔ رسول کریم ﷺ کا فرمان ہے۔ کَبِّرْ کَبِّرْ (پہلے بڑا پہلے بڑا)

رسول کریم ﷺ نے بڑوں کو دینے کے لیے عبداللہ بن عباسؓ سے اجازت طلب کی تھی۔ جب کہ وہ دائیں طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ اور بڑے شیوخ بائیں جانب تھے۔ آپ ﷺ کا اجازت طلب کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ زیادہ حق دار دائیں طرف والا ہوتا ہے نیز آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ اَلْاَیْمَن فَالْاَیْمَن (صحیح بخاری و صحیح مسلم) پہلے دائیں طرف سے شروع کرو۔

ایک اور جگہ فرمایا۔ سَاقِی الْقَوْمِ آخِرُھُمْ (سنن ابی داؤد) پلانے والا آخر میں پیتا ہے۔

کھانا کھانے کے بعد خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے حدیث میں یہ دعا آئی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ترجمہ: سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا۔ ایک اور دعا یہ ہے۔ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَنَا فِیْمَا رَزَقْتَنَا وَزِدْنَا مِنْہُ ترجمہ: اے اللہ! اس روزی میں جو تو نے ہمیں دی ہے برکت دے اور مزید عطا کر۔

آداب مجلس: اسلام نے نشست برجاست کے آداب سکھائے ہیں تاکہ مجلس میں تہذیب اور محبت کی فضاء پیدا ہو۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا (المجادلہ ۵۸:۱۱) ترجمہ: اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تمہیں کہا جائے کہ مجلس میں کھل کر بیٹھو تو کھل جایا کرو۔ تاکہ اللہ تمہیں فراخی دے اور جب کہا جائے اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو۔

1- مجلس میں انسان کو جہاں پہلے جگہ مل جائے بیٹھ جائے صفوں کو چیر کر سروں کو پھاندتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے اس سے دوسرے کو تکلیف ہوتی ہے اور اس کے ساتھ غرور و گھمنڈ کا اظہار بھی ہوتا ہے صحابہ رسول کریم ﷺ کی مجلسوں میں اسی طریقہ سے بیٹھتے تھے۔
(ادب المفرد باب مجلس الرجل حیث انتھی)

رسول کریم ﷺ نے ایذا رسانی سے اجتناب کا ایک عمومی اصول بیان فرمایا ہے۔ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ (صحیح بخاری و مسلم) ترجمہ: مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

حضرت معاذ بن انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ مَنْ تَخَطّٰی رِقَابَ النَّاسِ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ اتُّخِذَ جَسْرًا اِلٰی جَھَنَّمَ (ترمذی) ترجمہ: جو شخص جمعہ کے روز لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا جائے تو جہنم کے راستے کی طرف اس کا پل بنایا جائے گا۔"

مذکورہ حکم صرف جمعہ سے متعلق ہی نہیں بلکہ ہر اجتماع سے متعلق ہے جہاں لوگ بیٹھے ہوئے ہوں۔ بعد میں آنے والے لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا آگے نہ جائے۔ بلکہ تقریباً آخر میں جہاں جگہ مل جائے بیٹھ جائے حضرت جابر بن سمرۃ سے روایت ہے کہا کُنَّا اِذَا اَتَیْنَا النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَعَدْنَا حَیْثُ انْتَھٰی الْمَجْلِسُ (مسند امام اعظم کتاب الادب)

2- کسی کو اٹھا کر اس جگہ نہ بیٹھا چاہیے حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ لَا یُقِیْمُ الرَّجُلُ الرَّجُلَ مِنْ مَجْلِسِہٖ ثُمَّ یَجْلِسُ فِیْہِ وَلٰکِنْ تَفَسَّحُوْا وَتَوَسَّعُوْا (مسلم باب تحریم اقامۃ الانسان) ترجمہ: کوئی آدمی کسی آدمی کو اٹھا کر اس کی جگہ پر نہ بیٹھے البتہ کھل جاؤ اور آنے والے کو جگہ دو۔

3- اگر کوئی شخص کسی ضرورت کی وجہ سے اٹھ کر گیا ہے۔ تو اس کی جگہ دوسرے کو قبضہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ واپس آنے پر وہی اس جگہ کا مستحق ہوگا۔
(ترمذی الواب الاستیذان باب اذا قام الرجل من مجلسہ ثم رجع ھو احق بہ۔ وصحیح مسلم)

4- دو شخص اگر مل کر بیٹھے ہوں تو ان کو الگ الگ کر کے درمیان میں نہیں بیٹھنا چاہیے ایسے شخص پر رسول کریم ﷺ نے لعنت بھیجی ہے۔
(ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی کراھیۃ الجلوس بین الرجلین، سنن ابی داؤد)

5- اگر لوگ حلقہ میں بیٹھے ہوں تو کسی حلقہ کے درمیان میں نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ایسے شخص پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت بھیجی ہے۔ ترمذی باب الاستیذان باب ماجاء فی کراھیۃ القعود فی الحلقۃ وسنن ابی داؤد)

6- راستہ میں بیٹھنا نہیں چاہیے اگر کوئی ضرورت کی وجہ سے بیٹھ جائے تو رسول اللہ ﷺ نے چند اخلاقی شرائط پر اجازت دی ہے۔ اور وہ یہ ہیں نگاہ نیچی رکھے۔ ایذا نہ دے۔ سلام کا جواب دے اچھائی کا حکم دے اور برائی سے روکے بعض روایات میں ہے ناواقف کو راستہ بتائے۔ (صحیح بخاری و مسلم، ابوداؤد کتاب الادب باب فی الجلوس فی الطرقات)

7- بیٹھک کے لیے اچھے رفقاء منتخب کرے تاکہ ان کی مجلس سے فائدہ حاصل ہو رسول کریم ﷺ نے فرمایا" آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے اس لیے ہر شخص کو دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے۔" پھر فرمایا" اچھے اور برے ساتھی کی مثال مشک بیچنے والے اور لوہار کی ہے مشک بیچنے والے سے تم کو فائدہ ضرور پہنچے گا۔ یا خریدو گے یا خوشبو پاؤ گے۔ لیکن لوہار کی بھٹی تمہارا گھر یا کپڑا جلا دے گی یا تمہارے دماغ میں اس کی بدبو پہنچے گی۔ (بخاری کتاب البیوع باب فی العطار وبیع المسک)

8- مجلس میں خود معزز جگہ پر بیٹھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کسی دوسرے کے پاس جائے تو بھی اس کی اجازت کے بغیر اس کی معزز جگہ پر بیٹھنے کی کوشش نہ کرے آپ ﷺ نے فرمایا کہ" اپنے بھائی کی معزز جگہ پر اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہ بیٹھے۔ (ترمذی ابواب الاستیذان)

9- مجلس میں بیٹھ کر اس طرح سرگوشی نہیں کرنی چاہیے کہ دوسرے کو یہ شک گزرے کہ تم اس کے متعلق کچھ بات کر رہے ہو۔ حدیث میں آیا ہے۔" دو آدمی تیسرے آدمی کو چھوڑ کر آپس میں نہ گفتگو کریں اس سے تیسرا غمگین ہوگا۔ (ابوداؤد کتاب الادب باب فی التناجی)

10- مجلس کی راز کی باتوں کو برملا نہیں کہنا چاہیے رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ اَلْمَجٰلِسُ بِالْاَمَانَۃِ ترجمہ: یعنی مجالس امانت کے ساتھ ہوتی ہیں۔
(ابوداؤد باب فی نقل الحدیث)

11- کسی کے سامنے تعظیماً کھڑا نہیں رہنا چاہیے رسول کریم ﷺ نے اپنے لیے لوگوں کی تعظیماً کھڑا ہونا پسند نہیں فرمایا۔ حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ لاٹھی ٹیکے ہوئے تھے تو ہم آپ ﷺ کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس طرح عجمی لوگ ایک دوسرے کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جایا کرتے ہیں تم اسی طرح نہ کھڑے ہوا کرو۔ (ابوداؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل للرجل)

حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اس بات سے خوش ہوتا ہو کہ لوگ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جایا کریں تو اسے اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنانا چاہیے۔

بعض لوگ اس حدیث سے سند لیتے ہیں کہ جب بنو قریظہ کو ان کی غداری کی وجہ سے جنگ خندق کے بعد پچیس روز تک قلعہ میں محصور رکھا اور اس شرط پر قلعہ سے باہر آئے کہ ان کے متعلق حضرت سعد جو فیصلہ کریں وہ ان کو منظور ہوگا۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے حضرت سعدؓ کو بلوا بھیجا۔ حضرت سعدؓ جنگ خندق میں زخمی ہوئے تھے۔ اس لیے گدھے پر سوار ہو کر رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کے آنے پر رسول کریم ﷺ نے انصار سے فرمایا۔ قُوْمُوْا اِلٰی سَیِّدِکُمْ

شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی مشکوۃ کی شرح اشعۃ اللمعات میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ کھڑا ہونا سنت ہے۔ ان کی دلیل ابوسعید خدری کی مذکورہ حدیث ہے اور بعض علماء کہتے ہیں کہ مکروہ اور بدعت ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو کھڑا ہونے سے منع فرمایا۔

حقیقت یہ ہے کہ اعاجم کی عادت تھی کہ اپنے بڑوں یعنی رعایا بادشاہ کے لیے، نوکر چاکر اپنے آقا کے لیے اہل قبیلہ اپنے سردار وغیرہ کے لیے تعظیماً کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ اس طرح کھڑے ہونے سے شرک کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس وجہ سے آپ ﷺ نے اپنے لیے بھی تعظیماً کھڑا ہونا پسند نہ فرمایا۔ دوم عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔ سوم مساوات کے منافی ہے۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ حضرت ابوسعید خدری والی حدیث جس میں رسول کریم ﷺ نے حضرت سعد کے لیے انصار کو کھڑا ہونے کو کہا۔ تو اس حدیث کے الفاظ ہیں قُوْمُوْا اِلٰی سَیِّدِکُمْ

یعنی حضرت سعد کو گدھے سے اترنے میں مدد کریں۔ کیونکہ حضرت سعد غزوہ خندق میں زخمی ہونے کی وجہ سے چل نہیں سکتے تھے۔ ان کا خود گدھے سے اترنا دشوار تھا۔ اس کی گدھے سے اتارنے کے لیے مدد کرنے کو فرمایا۔ طیبی نے لکھا ہے کہ اگر یہاں قیام تعظیم مراد ہوتی تو آپ ﷺ "قوموا لِسَیِّدِکُمْ" فرماتے نہ کہ "اِلٰی سَیِّدِکُمْ" گویا کسی کی بڑھائی کے اظہار کے لیے تعظیماً کھڑا ہونا اسلامی روح مساوات، اخوت اور عزت نفس کے منافی ہے۔

12- مجالس میں اخلاق، مذہب، تزکیہ نفس اور عمدہ امور سے متعلق گفتگو ہونی چاہیے اور لغو گفتگو نہیں ہونی چاہیے آپ ﷺ معمولی، خفیف لغو باتیں بھی ناپسند فرماتے تھے۔ مثلاً یا رسول اللہ ﷺ میرے باپ کا نام کیا ہے؟ میرا اونٹ کھو گیا ہے وہ کہاں ہے؟

ایک بار اسی قسم کے لغو سوال کیے گئے تو آپ ﷺ نے برہم ہو کر فرمایا جو پوچھنا ہے پوچھ لو میں اس کا جواب دوں گا تو حضرت عمرؓ نے آپ ﷺ کے چہرہ کا رنگ دیکھا تو فرمایا رضیت (بخاری کتاب العلم)

آپ ﷺ کی مجلس میں کوئی شخص کھڑے کھڑے سوال نہیں کرتا تھا ایک شخص نے اس طرح سوال کیا تو آپ ﷺ نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا۔

13- مجلس میں جب کوئی مسئلہ زیر بحث ہو تو اس وقت تک دوسرا مسئلہ نہیں پوچھنا چاہیے جب تک پہلا مسئلہ طے نہیں ہو جاتا رسول کریم ﷺ کا معمول تھا، جب ایک مسئلہ طے ہو جاتا تو دوسرا مسئلہ پیش کیا جاتا بعض اوقات آپ ﷺ گفتگو کرتے ہوئے کوئی بدو آ جاتا۔ اور آداب مجلس سے ناواقفیت کی وجہ سے عین سلسلہ تقریر میں کوئی بات پوچھ بیٹھتا آپ ﷺ سلسلہ گفتگو جاری رکھتے فارغ ہو کر اس کے سوال کا جواب دیتے۔ ایک دفعہ آپ (صلعم) تقریر فرما رہے تھے۔ ایک بدو آیا اس نے آتے ہی قیامت کے متعلق سوال کیا۔ آپ ﷺ نے تقریر جاری رکھی۔ حاضرین سمجھے کہ آپ ﷺ (صلعم) نے نہیں سنا۔ کسی نے کہا۔ ''سنا'' لیکن آپ ﷺ کو ناگوار ہوا۔ آپ ﷺ نے گفتگو سے فارغ ہونے کے بعد دریافت فرمایا کہ ''پوچھنے والا کہاں ہے، بدو نے کہا'' میں حاضر ہوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا'' جب لوگ امانت ضائع کرنے لگیں گے'' بولا کہ امانت کیونکر ضائع ہو گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا جب نا اہلوں کے ہاتھ میں کام آئے گا۔'' (بخاری کتاب العلم)

14- مجلس میں مساوات کا رنگ ہونا چاہیے۔ رسول کریم ﷺ کی مجلس میں یہ کیفیت پوری طور پر نمایاں ہوتی تھی۔ رسول کریم ﷺ مجلس میں رونق افروز ہوتے۔ صحابہ عقیدت کیش غلاموں کی طرح آتے باہر سے آنے والا اجنبی آپ ﷺ میں اور حاشیہ نشینوں میں کوئی امتیاز نہ کر سکتا تھا۔ لوگوں سے پوچھتا کہ ''محمد ﷺ کون ہے۔'' صحابہ بتاتے کہ یہی گورے سے آدمی جو ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ (بخاری)

15- مجلس میں دقیق مباحثہ پر گفتگو نہیں ہونی چاہیے رسول کریم ﷺ ناپسند فرماتے تھے۔ ایک روز صحابہ کی مجلس میں مسئلہ تقدیر پر گفتگو ہو رہی تھی۔ آپ ﷺ نے سنا تو حجرے سے نکل آئے اور ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا (سنن ابن ماجہ باب القدر) دقیق مسائل پر گفتگو خاص مجالس میں ہونی چاہیے۔

16- جب آدمی مجلس میں آئے تو بدبودار چیز کھا کر نہیں آنا چاہیے بلکہ خوشبو لگا کر آنا چاہیے۔ مجلس میں کسی شخص کے گرد یا سامنے کسی کو کھڑا نہیں رہنا چاہیے۔ (ابو داؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل للرجل)

یہ عجمیوں کے عادت تھی نوکر آقا کے سامنے رعایا بادشاہ کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے تھے۔ یہ مبالغہ امیر تعظیم تھی۔ جس سے شرک لازم آتا تھا۔ اور مساوات انسانی کی روح ختم ہوتی تھی۔ اسلام نے منع کیا ہے۔

مجلس کے آداب میں یہ ضروری ہے کہ جب اٹھے تو کفارہ مجلس کے طور پر استغفار کرے رسول کریم ﷺ جب کسی مجلس سے اٹھتے تو یہ دعا پڑھتے۔ سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ (سنن ترمذی) اے اللہ! تو پاک ہے اور تیری تعریف ہے۔ گواہی دیتا ہوں آپ کے سوا کوئی معبود نہیں تجھ سے اپنی کوتاہیوں کی مغفرت چاہتا ہوں۔ اور تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔

آپ ﷺ سے پوچھا تو فرمایا ''مجلس کی کوتاہیوں کا کفارہ ہے۔''

کلام کے آداب

1- نرمی سے گفتگو کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہما السلام کو ہدایت دیتے ہیں کہ تم فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے نرمی سے گفتگو کرنا۔

(طہٰ) تم دونوں اس سے نرم بات کرنا۔

2- بات فیض رساں ہونی چاہیے فرمایا ''لوگوں سے اچھی بات کہو۔''

3- مجلس میں کسی پر طعن و ذلت آمیز فقرے نہ کسے جائیں کہ یہود کا وطیرہ تھا جب کہ یہود رسول کریم ﷺ کی مجلس میں آتے تو ''راعنا'' کی عین کو کھینچ کر ''راعینا'' (ہمارا گڈریا) کہہ دیتے۔

4- بات منصفانہ اور عادلانہ ہونی چاہیے جس سے باہم لڑائی جھگڑا پیدا نہ ہو۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِیْدًا یُّصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَیَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ (الاحزاب ۳۳:۸۰،۸۱) اے ایمان والو! اللہ سے تقویٰ کرو۔ اور سیدھی سادھی بات کرو۔ تمہارے اعمال کو سنوارے گا اور تمہارے گناہ معاف کرے گا۔

5- عورتوں کو مردوں سے بات کرتے ہوئے نزاکت کے لہجہ میں گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِہٖ وَقُلْنَ قَوْلاً مَّعْرُوْفًا (الاحزاب ۳۳:۳۲) اے نبی ﷺ کی بیویوں! دبی زبان سے بات نہ کرو۔ ایسا کرو گی تو وہ شخص جس کے دل میں

مرض ہوگا جو خدا جانے تمہارے متعلق کیا خیال رکھے۔ اور بات کرو تو معقول بے لاگ۔

6- گفتگو وقار کے ساتھ کرنی چاہیے بے موقع چیخ چیخ کر بولنا بے وقوفی ہے قرآن مجید میں ہے۔ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ (لقمان ۱۹:۳۱) ترجمہ: اور اپنی نواز پست کر۔ سب آوازوں میں بری آواز گدھوں کی ہے۔
بلند آواز سے انسان کی قوت حیات ضائع ہو جاتی ہے نہ ہی اتنی پست آواز کی جائے کہ سننے والا تکلیف محسوس کرے۔

7- لغو باتوں سے احتراز کرنا چاہیے آپ ﷺ نے فرمایا ''وہ جو لغو باتوں سے پرہیز کرتے ہیں فلاح پانے والے ہیں۔'' نہ ایسی بات کہنی چاہیے جو دل میں موجود نہیں ہے ریاء اور نفاق ہے۔ تخمین سے کسی کے مدح وقدح نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ یہ جھوٹ ہے۔ نہ کسی کی غیبت کرے۔ برا کلمہ کہہ کر کسی کا دل نہ دکھایا جائے فحش کلامی سے اجتناب کرنا چاہیے۔ جھوٹی شہادت نہیں دینی چاہیے۔

8- ہر بات کہنے سے قبل سوچ لی جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''انسان نیک بات کہے یا چپ رہے۔
(صحیح مسلم کتاب الایمان باب الحث علی اکرام الجار والضیف)

9- بات ضرورت کے ساتھ کہنی چاہیے آپ ﷺ نے فرمایا ''بے ضرورت بولنے والے امت کے بدترین افراد ہیں۔'' (ادب المفرد باب فضول الکلام)

10- کلام آسان پرائے میں کرنی چاہیے تاکہ مخاطب سمجھ لے۔ ضرورت ہو تو دہرا دینا چاہیے رسول کریم ﷺ کی عادت تھی کہ بات دو تین دفعہ دہرا دیتے تھے۔ تاکہ سامعین سمجھ جائیں۔ (ابوداؤد کتاب العلم باب تکرار الحدیث)
حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ كَانَ كَلَامُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ كَلَامًا فَصْلًا يَفْهَمُهُ كُلُّ مَنْ سَمِعَهٗ (ابوداؤد کتاب الادب باب الھدی فی الکلام) یعنی رسول اللہ ﷺ کا کلام ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتا تھا اور جو شخص اس کو سنتا سمجھ لیتا تھا۔

11- گفتگو تکلف اور تصنع سے نہیں کرنی چاہیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''خدا اس متکلف آدمی کو مبغوض رکھتا ہے۔ جو اپنی زبان کو اس طرح توڑتا مروڑتا ہے جس طرح بیل اپنی زبان توڑ مروڑ کر گھاس کھاتا ہے۔'' نیز فرمایا ''جو شخص اسلوب کلام میں اس لیے ادل بدل کرتا ہے کہ اس کے ذریعے سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے۔ خدا قیامت کے دن اس کا فدیہ وتوبہ قبول نہ کرے گا۔'' (ابوداؤد کتاب الادب باب ماء جاء فی المتشدق الکلام)

12- گفتگو کے وقت زیادہ آدمی ہوں۔ تو ہر ایک کی طرف التفات کرنی چاہیے۔ (ادب المفرد باب اذ حدث الرجل لایقبل علی واحد)

13- گفتگو مختصر الفاظ میں کرنی چاہیے ایک بار ایک شخص نے لمبی گفتگو کی یا کوئی خطبہ دیا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے سنا تو کہا کہ اگر وہ میانہ روی اور اعتدال اختیار کرتا تو اس کے لیے بہتر ہوتا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں مختصر گفتگو کروں۔ کیونکہ اختصار بہتر ہے۔ (ابوداؤد کتاب الادب باب جاء فی المتشدق فی الکلام)

ملاقات کے آداب: اسلام نے معاشرتی حیثیت سے ملاقات کرنا موجب ثواب قرار دیا ہے ایک حدیث میں ہے کہ جس نے کسی مریض کی عیادت کی یا اپنے بھائی کی ملاقات کو گیا تو ایک پکارنے والا اس کو آواز دے گا کہ تم اچھے تمہارا آنا اچھا اور تم نے جنت میں اپنے لئے مکان بنا لیا۔
(ترمذی کتاب البر والصلۃ باب ما جاء فی زیارۃ الاخوان)

ملاقات کے حسب ذیل آداب ہیں۔

1- دوستوں کو ملاقات کے وقت خوشی اور مسرت سے ملنا چاہیے اور السلام علیکم کہنا چاہیے رسول کریم ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ میں آ کر سب سے پہلے جن امور کی تعلیم دی۔ ان میں ایک یہ تھی کہ لوگو! ''باہم سلام کو عام کرو۔'' آپ ﷺ نے فرمایا! ''تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا یہ بھی صدقہ ہے۔'' اصول تمدن کے لحاظ سے یہ ہدایت کر دی۔ کہ چھوٹا بڑے کو، گزرنے والا بیٹھنے والے کو، چھوٹی جماعت، بڑی جماعت کو سلام کرنے میں پہل کرے اور تعلیم تواضع کے لیے یہ فرمایا کہ سوار پیدل چلنے والے کو سلام کہے۔ (بخاری کتاب الاستیذان باب فی تسلیم الراکب علی الماشی)

2- جن کو سلام کیا جائے وہ اس کا جواب احسن طور پر دیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا (النساء ۴: ۸۶) مسلمانو! جب تمہیں سلام کیا جائے تو (جواب میں) اس سے بہتر سلام کرو یا (کم سے کم) ویسا ہی جواب دو۔

3- ملاقات کے وقت معانقہ کرنا چاہیے۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ ''سلام کی تکمیل مصافحہ سے ہوتی ہے۔ (ابوداؤد باب المصافحہ)

4- ملاقات کے لیے یا کسی اور کام کے لیے کسی کے گھر پر جائے تو داخل ہونے سے قبل اہل خانہ سے اجازت لینی چاہیے۔ اجازت سے قبل دروازہ سے دائیں یا بائیں جانب کھڑا ہونا چاہیے سامنے کھڑا نہیں ہونا چاہیے تاکہ اندر کی چیزوں پر نظر نہ پڑے۔ (ابوداؤد کتاب الادب فی الاستیذان)
حدیث میں آتا ہے اگر کوئی شخص بلا اجازت کسی کے گھر میں جھانک کرے اور اس کی آنکھ پھوڑ دی جائے تو کوئی الزام نہیں۔
(ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت)

نیز اجازت لینا اسی لیے ہے کہ اس کو دیکھو نہیں۔ (صحیح بخاری کتاب الاستیذان)

اجازت لینے کا طریق یہ ہے کہ تین بار سلام کرے، اگر جواب نہ ملے، تو واپس۔ (ابوداؤد کتاب الادب باب کم مرۃ یسلم الرجل فی الاستیذان)

اجازت طلب کرنے کے متعلق سورۃ نور میں آیا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِیْهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى یُؤْذَنَ لَكُمْ وَ اِنْ قِیْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ (سورۃ نور ۲۴: ۲۷، ۲۸) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ اپنے گھروں کے سوائے (دوسروں) گھروں میں داخل نہ ہو۔ یہاں تک کہ اجازت لے لو۔ اور ان کے رہنے والوں پر سلام کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ پھر اگر ان میں کسی کو نہ پاؤ۔ تو ان میں داخل نہ ہو۔ یہاں تک کہ تمہیں اجازت دی جائے اگر تمہیں کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو لوٹ جاؤ۔ وہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہے اور جو تم کرتے ہو۔ اللہ اسے جانتا ہے۔

5- یہ آداب غیر لوگوں کے لیے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے پردہ کرنا ضرور نہیں یہ وہ ہیں جو ہر وقت گھر میں آتے جاتے رہتے ہیں مثلاً چھوٹے چھوٹے بچے یا لونڈی، غلام، ان کے لیے خاص خاص اوقات میں گھر میں آنے کے لیے اذن طلب کرنا ضروری ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِیْنَ مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ وَ الَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَ حِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِیْرَةِ وَ مِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ لَیْسَ عَلَیْكُمْ وَ لَا عَلَیْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ طَوّٰفُوْنَ عَلَیْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْیَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (سورۃ نور ۲۴: ۵۸، ۵۹) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں اور وہ جو تم میں سے بالغ نہیں ہوئے۔ کہ تین دفعہ تم سے (اندر آنے کی) اجازت لے لیا کریں۔ نماز فجر سے پہلے اور جب تم دوپہر کو اپنے کپڑے اتار دیتے ہو۔ اور نماز عشاء کے بعد، تین وقت تمہارے پردے کے ہیں ان کے بعد نہ تم پر اور نہ ان پر کوئی گناہ ہے۔ تم ایک دوسرے کے پاس آتے رہتے ہی ہو۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے حکم کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے اور جب تم میں سے لڑکے بلوغت کو پہنچ جائیں تو چاہیے کہ وہ (اندر آنے کی) اجازت لے لیا کریں۔ جس طرح وہ اجازت لیتے رہے جو ان سے پہلے ہیں اسی طرح اللہ اپنے حکم تمہارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

بظاہر یہ باتیں معمولی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن یہ معمولی باتیں بھی معاشرتی زندگی میں راحت وسکون کا موجب ہیں۔ مذکورہ تین اوقات آرام وسکون کے لیے ہوتے ہیں۔ مرد وزن بے تکلفی سے سو رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے ان اوقات میں غلام اور نابالغ لڑکے کا گھر کے اندر آنے کے لیے اجازت لینا ضروری قرار دیا ہے۔

باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب: 1- آدمی کو راستہ میں سنجیدگی اور خاکساری کے ساتھ چلنا چاہیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (سورۃ الفرقان ۲۵: ۶۳) اور رحمت والے خدا کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں اکڑ کر چلنے والوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۷) اور زمین میں اکڑ کر نہ چل۔ اس طرح چل کر نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں کی بلندی تک پہنچ سکتا ہے۔

2- عورتوں کے زیور پہن کر چلتے وقت زمین پر زور زور سے پاؤں نہیں مارنا چاہیے قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَ لَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ (سورۃ نور ۲۴: ۳۱) اور چلنے میں اپنے پاؤں ایسے زور سے نہ ماریں کہ لوگوں کو ان کی اندرونی زینت کی خبر ہو۔

3- عورتیں پردہ میں نکلیں اور نگاہیں نیچی رکھیں قرآن مجید میں آتا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ (الاحزاب ۳۳: ۵۹) ترجمہ: "اے نبی! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی چادریں اپنے اوپر اوڑھ لیا کرو۔ یہ زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچان لی جائیں۔ تو انہیں ایذا نہ دی جائے۔ دوسری آیت ہے۔ وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ یَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَ لَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ لْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُیُوْبِهِنَّ وَ لَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ (سورۃ نور ۲۴: ۳۱) "اے نبی! ایمان والی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نگاہیں، نیچی رکھیں اور اور اپنا سر چھپائیں اور اپنا سنگار نہ دکھائیں مگر جو فطرۃً کھلا رہتا ہے۔ اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں میں ڈالے رکھیں۔ اور اپنا بناؤ سنگار سوائے خاوند کے کسی کو نہ دکھائیں۔

4- راستہ میں مردوں اور عورتوں کو مل جل کر نہیں چلنا چاہیے اسی وجہ سے رسول کریم ﷺ نے عورتوں کو وسط راہ سے الگ ہو کر راستہ کے کنارے پر چلنے کی ہدایت فرمائی ہے اور مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے کی ممانعت فرمائی۔

ایک دفعہ راستہ میں مرد اور عورتیں باہم مل جل گئے تو آپ ﷺ نے یہ حکم دیا اس کے بعد عورتیں راستہ کی ادھر ادھر کی دیوار سے لگ کر چلیں۔

(ابوداؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطریق)

5-بھاگ کر نہ چلنا چاہیے یہ متانت اور وقار کے خلاف ہے اسلام نے نماز تک کے لیے حکم دیا کہ دوڑ کر شامل نہیں ہونا چاہیے۔
رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔''اگر مسجد میں تکبیر ہو رہی ہو یا نماز کھڑی ہو چکی ہو تو دوڑ کر اس میں شامل نہ ہو۔ بلکہ متانت اور وقار سے آ کر جماعت میں ملو (صحیح مسلم باب استحباب ایتان الصلوۃ بوقار)

6-استطاعت ہو تو جوتے پہننے چاہیں تا کہ پاؤں کو گندگی نہ لگے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔اکثر جوتے پہنا کرو کہ جوتا پہننے والا بھی ایک طرح کا سوار ہوتا ہے۔ (ابوداؤد باب الانتعال)

7-یہ نہیں کرنا چاہیے کہ ایک پاؤں میں جوتا ہے اور دوسرا ننگا۔ رسول کریم ﷺ نے منع فرمایا۔ (ابوداؤد باب الانتعال) لیکن گھر میں کسی ضرورت سے چند قدم چلتے ہیں تو کوئی حرج نہیں (ترمذی کتاب اللباس باب المشی فی نعل واحدۃ)

آداب سفر: رسول کریم ﷺ نے جس زمانہ میں سفر کیا اس وقت کے حالات اس زمانہ سے مختلف ہیں اس لیے بعض ہدایات جو آپ ﷺ نے فرمائیں وہ موجود حالات کے لیے بھی موزوں ہیں۔

1-سفر کے وقت مسافروں کو دعائے خیر کے ساتھ رخصت کرنا چاہیے اور ہو سکے وہ دعا پڑھ لینی چاہیے جو رسول کریم ﷺ فوج کو الوداع کہتے وقت پڑھ لیتے تھے۔ اَسْتَوْدِعُ اللّٰہَ دِیْنَکُمْ وَ اَمَانَاتِکُمْ وَخَوَاتِیْمَ اَعْمَالِکُمْ (ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الدعا عند الوداع) ترجمہ: یعنی تمہارے دین امانت اور خاتمہ عمل کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

2-سفر صبح کرنا چاہیے تا کہ سورج کی گرمی تیز ہونے سے قبل کافی منازل طے کر لی جائیں۔ صبح سفر کرنے سے وقت بھی ضائع نہیں ہوتا۔ پورا دن کام میں آ جاتا ہے۔
3-سفر تنہا نہیں کرنا چاہیے بلکہ کم از کم تین آدمی ساتھ ہونے چائیں۔ (ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی القوم یسافرون یومرون احدھم) اس سے انسان بہت سے خطرات اور مصائب سے محفوظ رہتا ہے۔

4-اگر تین یا تین سے زیادہ سفر کریں تو ایک کو اپنا امیر بنا لیا جائے۔ (ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی القوم یسافرون ویومرون احدھم فی الطرق)
5-سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر میں داخل نہیں ہونا چاہیے بلکہ گھر والوں کو تیاری کا موقع دینا چاہیے بہتر یہ ہے آنے سے قبل گھر والوں کو آمد کی اطلاع دے دی جائے۔
6-مسافر کا استقبال کرنا چاہیے (ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التلقی)
7-سفر عموماً رات کو کرنا چاہیے حدیث میں اس کی یہ مصلحت بیان ہوئی ہے۔ کہ ٹھنڈے وقت میں فاصلہ اچھا طے ہوتا ہے۔ (ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی سرعۃ السیر) یہ طریقہ سفر عرب یا اس قسم کے علاقوں کے لیے ہے۔
8-سوار کے جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہیے۔
9-رات کا پڑاؤ راستہ ہٹ کر کرنا چاہیے تا کہ دوسرے مسافروں کو تکلیف نہ ہو۔ اس وجہ سے بھی کہ راستہ سے جانور گزرتے رہتے ہیں اور موذی جانوروں کا بھی خطرہ رہتا ہے۔ (مسلم کتاب الامارہ باب مراعات مصلحۃ الدواب فی السیر والنھی التعریس فی الطریق)
10-سفر کی ضرورت پوری ہو جائے تو فوراً واپس آ جانا چاہیے کیونکہ سفر ہر حال تکلیف کی چیز ہے۔ (مسلم کتاب الامارۃ باب السفر قطعۃ العذاب) تا کہ گھروں کو پریشانی نہ ہو۔ دوسرے سفر کی مزید تکلیف سے محفوظ ہو جائے۔
11-ایک شخص نے کہا'' یارسول اللہ ﷺ میں سفر کا ارادہ کرتا ہوں مجھے وصیت کیجئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ عَلَیْکَ بِتَقْوَی اللّٰہِ وَالتَّکْبِیْرِ عَلٰی کُلِّ شَرَفٍ (سنن الترمذی) تم اپنے اللہ کا خوف لازم پکڑو اور ہر اونچائی پر اللہ اکبر کہو۔
13-خطرہ محسوس ہو تو یہ دعا پڑھنی چاہیے۔ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجْعَلُکَ فِی نُحُوْرِھِمْ وَنَعُوْذُبِکَ مِنْ شُرُوْرِھِمْ (سنن ابی داؤد مسند احمد) اے اللہ! ہم تجھے ان کے مقابلے میں کرتے ہیں۔ اور ان کے شر سے تیری پناہ مانگتے ہیں۔
14-سفر میں اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت کی بھلائی کا سوال کرے کیونکہ سفر میں دعا قبول ہوتی ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ثَلَاثُ دَعْوَاتٍ مُسْتَجَابَاتٌ لَا شَکَّ فِیْھِنَّ دَعْوَۃُ الْمَظْلُوْمِ وَدَعْوَۃُ الْمُسَافِرِ وَدَعْوَۃُ الْوَالِدِ عَلٰی وَلَدِہٖ (سنن الترمذی) تین دعائیں قبول ہوتی ہے مظلوم کی دعا، مسافر کی دعا اور والد کی اولاد کے حق میں دعا۔
15- کسی منزل پر اترے تو یہ کہے۔ اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (الطبرانی الاوسط) میں اللہ کے تمام کلمات کی پناہ لیتا ہوں اس کی مخلوق کے شر سے۔
16-واپس آتے ہوئے تین بار اللہ اکبر کہے پھر بار بار ذکر کرے۔ آئِبُوْنَ، تَائِبُوْنَ، عَابِدُوْنَ، لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ (صحیح بخاری ومسلم) ہم واپس آنے والے ہیں،

توبہ کرنے والے، اپنے رب کی عبادت کرنے والے اور تعریف کرنے والے۔

17- عورت اپنے محرم کے بغیر ایک دن اور رات کا سفر نہیں کر سکتی رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ لَا يُحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُسَافِرُ مَسِيْرَةَ يَوْمٍ وَّ لَيْلَةٍ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ عَلَيْهَا (صحیح بخاری و مسلم) کسی عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے محرم کے بغیر ایک دن اور رات کا سفر کرے۔

آداب خواب: نیند اللہ تعالیٰ کے نعماء میں سے ایک نعمت ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ (سورۃ الروم ۳۰:۲۳) اور خدا کی نشانیوں میں سے ایک تمہارا رات کو سونا ہے۔

نیز سورۃ فرقان میں فرمایا وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَالنَّوْمَ سُبَاتًا وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا (سورۃ فرقان ۲۵:۴۷) اور ہم نے رات کو تمہارے لیے پردہ اور نیند کو تمہارے لیے آرام اور دن کو کاروبار کے لیے بنایا۔

اس لیے رسول کریم ﷺ نے سونے اور جاگنے کے آداب بھی سکھائے ہیں۔

1- نماز عشاء پڑھنے سے قبل سونا نہیں چاہیے اور نماز ادا کر لینے کے بعد جلد سو جانا چاہیے۔ (ابوداؤد کتاب الادب باب النھی عن السمر بعد العشاء)

اگر دینی یا دنیاوی اہم امور کے لیے نماز عشاء کے بعد بات چیت کرنی پڑ جائے تو کوئی حرج نہیں چنانچہ حضرت ابوبکرؓ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں نماز عشاء کے بعد ضروری امور میں مشورہ کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ (صحیح مسلم باب اکرام الضیف)

2- سونے سے قبل بستر کو جھاڑ لینا چاہیے۔ پھر داہنے پہلو پر سونا چاہیے (ابوداؤد کتاب الادب ما یقال عند النوم)

3- ایسی چھت پر نہیں سونا چاہیے جس پر منڈیر نہ ہو۔ اس سے گرنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ (ابوداؤد کتاب الادب باب فی النوم علی سطح غیر محجر)

4- طہارت کی حالت میں سونا چاہیے بلکہ سونے سے پہلے وضو کر لینا چاہیے۔

(ترمذی کتاب الادب باب ما یقال عند النوم و باب فی النوم علی الطھارۃ صحیح بخاری و صحیح مسلم)

5- پیٹ کے بل نہیں سونا چاہیے رسول کریم ﷺ نے ایک شخص کو اسی طرح سوتے دیکھا تو فرمایا۔ اِنَّهَا ضِجْعَةٌ لَا يُحِبُّهَا اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ (ابوداؤد کتاب الادب باب فی الرجل ینبطح علی بطنہ) ایسا لیٹنا اللہ بزرگ و برتر کو پسند نہیں۔

ایک اور موقع پر فرمایا! اِنَّهَا ضِجْعَةُ اَهْلِ النَّارِ "یہ لیٹنا جہنمیوں کا لیٹنا ہے۔

6- سونے سے پہلے یہ دعائیں پڑھنی چاہئیں۔ سبحان اللہ 33 بار۔ الحمد للہ 33 بار۔ اللہ اکبر 33 بار پڑھ کر پھر یہ دعا پڑھے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (صحیح مسلم) اللہ کا کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اس کے لیے بادشاہت ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے جو ہر چیز پر قادر ہے۔

مذکورہ دعاؤں کے علاوہ بھی احادیث میں تین دعائیں منقول ہیں باعث طوالت حذف کی جاتی ہیں۔

7- ایک پاؤں کو اٹھا کر دوسرے پاؤں پر رکھ کر لیٹنا نہیں چاہیے۔ (ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی کراہیۃ فی ذالک) اس طرح تہبند باندھنے کی صورت میں برہنگی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہو۔ تو جائز ہے کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار رسول کریم ﷺ اس طریقہ سے لیٹے تھے۔

(ترمذی باب ما جاء فی وضع الرجلین علی احدی مستلقیا)

8- سونے سے پہلے گھر کا دروازہ بند کر لینا چاہیے۔ (بخاری کتاب اغلاق الابواب باللیل)

9- سوتے وقت دیا بجھا دینا چاہیے ایک دفعہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" آگ تمہاری دشمن ہے جب سوؤ تو اس کو بجھا دو (بخاری کتاب الاستیذان باب لا تترک النار فی البیت عند النوم)

10- جاگنے کے بعد یہ دعا پڑھی جانی چاہیے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانَا بَعْدَمَا اَمَاتَنَا اِلَيْهِ النُّشُوْرُ (ابوداؤد کتاب الادب ما یقال عند النوم) اس خدا کی تعریف جس نے سونے کے بعد ہمیں جگایا اور جس کی طرف اٹھ کر جانا ہے دوسری ایک مختصر دعا یہ ہے۔ ترجمہ: اے اللہ تیرے نام پر اٹھتا ہوں اور سوتا ہوں۔

آداب لباس: لباس کے دو مقاصد ہیں ایک جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیف سے بچایا جائے دوسرا جسم کی عریانی اور برہنگی کو چھپایا جائے۔ اسلام سب سے پہلا مذہب ہے جس نے ستر پوشی کو دین کا ضروری جزو ٹھہرایا ہے۔ یہاں تک کہ بغیر مجبوری اس کے بغیر نماز بھی ادا نہیں ہو سکتی۔

مردوں کے لیے ناف سے لے کر گھٹنوں کا حصہ اور عورتوں کے لیے سر کے بالوں سے لے کر ٹخنوں تک اور لونڈیوں کے پیٹ اور پٹھ سے لے کر ٹخنوں تک کا حصہ ستر ہے۔

ستر پوشی انسان کی فطرت ہے اگر جب اس کی فطرت مسخ اور بگڑ جاتی ہے تو وہ عریانی اور برہنگی کو معیوب نہیں سمجھتا۔ قرآن مجید میں حضرت آدم اور اس کی زوجہ کا واقعہ بیان کیا ہے تو خدا تعالیٰ نے فرمایا۔ تو جب ان دونوں نے درخت کا پھل چکھا۔ ان کے ستر ان پر کھل گئے تو وہ اپنے اوپر باغ کے پتوں کو جوڑنے لگے۔ اس آیت کریمہ میں خدا نے بیان کیا ہے کہ ستر پوشی بنی نوع انسان کی فطرت ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں پھر فرمایا۔ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ (اعراف ۷:۲۶) ترجمہ: اے آدمی کے بیٹو! ہم نے تم پر وہ پوشاک اتاری جو تمہارے ستر کو ڈھانک سکے۔

دوسری جگہ فرمایا۔ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف ۷:۳۱) ترجمہ: اے آدم کے بیٹو! ہر نماز کے وقت اپنی زینت (لباس) اختیار کرو۔

1- مرد کو بے ضرورت ریشم نہ پہننا چاہیے اس سے نزاکت اور تنعم کا اظہار ہوتا ہے۔ لڑائی میں زرہ کے نیچے ریشمی کپڑا پہننے کی اجازت ہے۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ لَا تَلْبَسُوا الْحَرِیْرَ فَاِنَّهٗ مَنْ لَبِسَهٗ فِی الدُّنْیَا لَمْ یَلْبَسْهُ فِی الْاٰخِرَۃِ (صحیح بخاری و مسلم) ریشم نہ پہنو جو اسے دنیا میں پہنتا ہے آخرت میں نہیں پہنے گا۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے ریشم دائیں ہاتھ میں اور سونا بائیں ہاتھ میں لیا اور فرمایا۔ اِنَّ هٰذَیْنِ حَرَامٌ عَلٰی ذُکُوْرِ اُمَّتِیْ (ابوداؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی) یہ دونوں میری امت کے مردوں پر حرام ہے۔

فرمایا۔ حُرِّمَ لِبَاسُ الْحَرِیْرِ وَالذَّهَبِ عَلٰی ذُکُوْرِ اُمَّتِیْ وَاُحِلَّ لِنِسَائِهِمْ (سنن ترمذی، سنن النسائی، وابن ماجہ) ریشم اور سونا میری امت کے مردوں کے لیے حرام اور عورتوں کے حلال ہے۔

2- دامن چھوڑ کر نہیں چلنا چاہیے حضور ﷺ نے فرمایا۔ الْاِسْبَالُ فِی الْاِزَارِ وَالْقَمِیْصِ وَالْعِمَامَةِ، مَنْ جَرَّ شَیْئًا خُیَلَاءَ لَمْ یَنْظُرِ اللّٰهُ اِلَیْهِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ (سنن ابی داؤد و سنن ابن ماجہ) چادر قمیص اور پگڑی میں یعنی اسبال نیچے گھسیٹنے کا احتمال جو انہیں تکبر کے طور پر گھسیٹے گا۔ اللہ قیامت کے دن اس کی طرف نہیں دیکھے گا۔

فرمایا۔ لَا یَنْظُرُ اللّٰهُ اِلٰی مَنْ جَرَّ ثَوْبَهٗ خُیَلَاءَ (صحیح بخاری و صحیح مسلم) اللہ تعالیٰ اس کی طرف دیکھے گا جو تکبر سے اپنا کپڑا گھسیٹتا ہے۔

3- مرد عورتوں کی سی پوشاک نہ پہنیں اور نہ عورتیں مردوں کا لباس۔ کیونکہ رسول کریم ﷺ نے اسے حرام قرار دیا ہے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ لَعَنَ اللّٰهُ الْمُخَنَّثِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالْمُتَرَجِّلَاتِ مِنَ النِّسَاءِ (صحیح بخاری) عورتوں کے ساتھ مشابہت کرنے والے مرد اور مردوں کے ساتھ مشابہت کرنے والی عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے۔

فرمایا۔ لَعَنَ اللّٰهُ الرَّجُلَ یَلْبَسُ لِبْسَةَ الْمَرْاَةِ وَالْمَرْاَةَ تَلْبَسُ لِبْسَةَ الرَّجُلِ کَمَا لَعَنَ الْمُتَشَبِّهِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ (صحیح بخاری) عورت جیسا پہنے والے مرد اور مرد کا لباس پہننے والی عورت۔

4- مرد اور عورت ایسے باریک کپڑے نہ پہنیں جن سے بدن نظر آئے۔ رسول کریم صلعم نے فرمایا کتنی ہی کپڑے پہننے والیاں ہیں جو دراصل ننگی ہیں۔

5- ایسا کپڑا پہننا چاہیے جس سے پوری ستر پوشی ہو۔ ایک دفعہ رسول کریم ﷺ نے حضرت اسماء سے فرمایا۔ ''اے اسماء جب عورت جوان ہو جائے تو اس کو چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا کھولنا حلال نہیں۔'' گویا عورت کا چہرہ قدم اور ہتھیلیاں ستر میں داخل نہیں۔

6- رسول کریم ﷺ عام طور پر مردوں کے لیے سفید کپڑے پسند فرماتے تھے۔ اَلْبَسُوا الْبَیَاضَ فَاِنَّهَا اَطْهَرُ وَاَطْیَبُ وَکَفِّنُوْا فِیْهَا مَوْتَاکُمْ (ترمذی نسائی، مستدرک حاکم) سفید لباس پہنو بہت پاک صاف ہوتا ہے اور اس میں مردوں کو کفناؤ۔

رسول کریم ﷺ نے سفید کپڑا پہننے کو ترجیح دی ہے ورنہ حدیثوں میں یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے سرخ لباس بھی زیب تن کیا (بخاری) اس طرح یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے سبز رنگ کا لباس پہنا اور کالے رنگ کی پگڑی استعمال کی

7- لباس پہنتے وقت دائیں جانب اختیار کی جائے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یُحِبُّ التَّیَمُّنَ فِیْ شَانِهٖ کُلِّهٖ فِیْ تَنَعُّلِهٖ وَتَرَجُّلِهٖ وَطُهُوْرِهٖ (صحیح مسلم) رسول کریم ﷺ سب کاموں جوتا پہننے، کنگھی کرنے اور وضو میں دائیں جانب کو پسند کرتے تھے۔

8- جب رسول کریم ﷺ نیا لباس پہنتے تو خدا کا شکر ادا کرتے اور یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ کَسَانِیْ هٰذَا وَرَزَقَنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَقُوَّةٍ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَاَخَّرَ (ترمذی) اس خدا کی حمد جس نے مجھے یہ کپڑا پہنایا اور میری طاقت اور قدرت کے بغیر اپنے فضل سے پہنچایا تو اس کے اگلے پچھلے سب گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔

9- لباس میں اسراف منع ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ کُلْ مَاشِئْتَ وَالْبَسْ مَا شِئْتَ مَا اَخْطَاَتْکَ اثْنَتَانِ سَرَفٌ

وَمَخِيْلَةٌ (بخاری) جو تمہارا دل چاہیے کھاؤ اور جو دل چاہیے پہنو لیکن دو باتیں نظر انداز نہیں کرنی چاہئیں۔ اسراف اور تکبر سے پرہیز کریں۔

متفرق آداب: انسان جب خوشی کے موقعہ پر حد اعتدال سے بڑھ جاتا ہے۔ تو غرور اور نخوت کی چوٹیوں پر چڑھ جاتا اور اپنے آپ کو تباہ و برباد کر لیتا ہے۔ اس وجہ سے مسرت کے موقعہ پر رسول کریم ﷺ کی سنت کے مطابق خدا کا شکر بجا لانا چاہیے اور غمی کے موقع پر جوارح پر بے قراری اور زبان پر شکوہ جاری نہیں ہونا چاہیے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا!'' جو شخص گریبان پھاڑتا اور گالوں پر طمانچے مارتا اور جاہلیت کی طرح چیختا چلاتا اور بین کرتا ہے وہ میری امت سے نہیں ہے۔

خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ بتایا ہے کہ کسی مسلمان پر مصیبت آئے تو صرف زبان سے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھے یعنی ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔

انسان کی بعض حالتیں ادب اور تہذیب کے خلاف ہوتی ہیں ان کو دیکھ کر نفرت پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً جمائی کے وقت انسان کا منہ کھل جانا۔ اس کے متعلق رسول کریم ﷺ نے فرمایا'' جمائی شیطان کی جانب سے ہے اور جب کوئی اس حالت میں آہ آہ کہتا ہے تو شیطان اس کے پیٹ کے اندر سے اس پر ہنستا ہے۔ (ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب)

بعض احادیث میں ہے کہ جب تم میں کوئی جمائی لے۔ تو اپنے منہ کو بند کرے۔ کیونکہ شیطان اس کے منہ کے اندر گھس جاتا ہے۔ (ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی التثاؤب)

1- پہلا حکم یہ ہے کہ جمائی کو روک لینا چاہیے اگر نہ روک سکے تو منہ پر ہاتھ رکھ لینا چاہیے۔ (ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب)

2- چھینک کے روکنے کی کوئی ہدایت نہیں کی بلکہ اس کو خدا کی جانب سے بتلایا ہے۔ (ایضاً)

شارحین اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ چھینک سے بدن کے مسامات کھل جاتے ہیں جسم ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے اور جمائی بدن میں سستی وکسل کا نتیجہ ہے۔

3- رسول کریم ﷺ نے چھینک والے کو یہ حکم دیا ہے وہ الحمد للہ کہے دوسرے لوگ اس کے جواب میں ''یرحمک اللہ'' کہیں۔ (ترمذی کتاب الاستیذان باب ماء جاء کیف یشمت العطاس) چھینکتے وقت منہ کو ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانک لینا چاہیے بعض اوقات اس حالات میں ناک سے بلغم وغیرہ نکل آتا ہے۔ منہ پر ہاتھ یا رومال رکھ کر آواز کو پست کرنا رسول کریم ﷺ کا بھی طریقہ تھا۔ (ابوداؤد کتاب الادب باب فی العطاس)

4- انگڑائی اور ڈکار کے متعلق آپ ﷺ نے کوئی خاص حکم نہیں دیا۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ مجمع میں ڈکار یا انگڑائی لینا خلاف تہذیب ہے۔ بعض کتب میں ہے کہ رسول کریم ﷺ جمائی اور انگڑائی نہیں لیتے تھے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان دونوں کو نقل کیا ہے۔ (فتح الباری جلد 10 صفحہ 5، 6)

باب ۶

اسلام کا عمرانی نظام
(معاشرہ، تہذیب، تمدن)

عمرانیات سے مراد آبادی، اجتماع اور معاشرہ کا علم ہے جو معاشرے کا بطور اکائی تجزیہ کرتا ہے اس طرح اس کا مقصد یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ معاشرتی ادارے (Social Institutions) جن سے معاشرہ کی تشکیل ہوتی ہے کس طرح ایک دوسرے سے ربط وضبط رکھتے ہیں۔ بنابریں عمرانیات کا واسطہ گروہ اور اجتماع سے ہے نہ کہ فرد سے۔

معاشرہ کیا ہے؟: معاشرہ کے معنی مل جل کر زندگی بسر کرنا لیکن عمرانیات (Sociology) میں معاشرہ کی اصطلاح اپنے مخصوص معنی رکھتی ہے۔ اسے وسیع اور محدود دونوں معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ وسیع معنی میں تمام نسل انسانی کو معاشرہ یعنی سوسائٹی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور محدود معنی میں اس سے مراد وہ گروہ لیا جاتا ہے جو کچھ لوگوں یا خاندانوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

مختلف ماہرین عمرانیات (Sociologist) نے معاشرہ کی تعریف حسب ذیل الفاظ میں کی ہے۔

ایف ایچ گڈنگز (F.H.Giodings) کہتا ہے۔

معاشرہ یا سماج ایک جیسے خیالات رکھنے والے افراد کا مجموعہ ہے جو ہم خیالی کو پسند کریں اور اس بناء پر مشترکہ مفاد کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔

اسپنسر کہتا ہے۔

''معاشرہ افراد کی ایک تعداد کا اجتماعی نام ہے اور بس۔''

جان ایف سوبر کہتا ہے۔

یہ ایک ایسا (بہت بڑا) انسانی گروہ ہے جو کافی عرصہ سے اکٹھا رہا ہو حتیٰ کہ منظم ہو گیا ہو اور جس کے افراد اپنے آپ کو ایک وحدت میں منظم کریں۔

سمر اور کیلر (Summer and Kellar) کے نزدیک معاشرہ ''ایسے افراد کا مجموعہ ہے جو کہ اشتراک عمل کے ذریعے وسائل حیات کے حصول اور بقائے نسل کے لیے جدوجہد کرے۔

میک لیور (Macluer) معاشرہ کو سماجی تعلقات کا وہ نظام قرار دیتا ہے۔ جس میں اور جس کے ذریعہ ہم زندگی گزارتے ہیں۔

کمپلورز، معاشرہ کی تعریف میں کہتا ہے ''ایک گروہ جو کہ چند ایک یا زیادہ مشترک مفادات پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔''

مذکورہ بالا تعریفات کے پیش نظر ہم حسب ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

۱۔ معاشرہ افراد کا ایسا مجموعہ ہے جو مشترکہ مفادات کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کرتا ہے۔
۲۔ معاشرہ کو معرض وجود میں آنے کے لیے ایک کافی عرصہ کی ضرورت ہے۔
۳۔ ضروریات زندگی کو پورا کرنا معاشرے کا فرض ہے۔
۴۔ معاشرہ میں مختلف قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔
۵۔ معاشرہ باہمی تعاون اور تعلق کی مستقل بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔
۶۔ ایک معاشرہ کے لوگوں کی ثقافت مشترک ہوتی ہے۔
۷۔ معاشرے کے سب ارکان اپنے آپ کو وحدت میں سمجھتے ہیں۔

اہمیت: تمام مفکرین نے انسان کو ''مدنی الطبع'' کہا ہے جب ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے تمام حوائج اور ضروریات کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا اگر کوئی

شخص دوسروں سے بے نیاز ہو کر الگ تھلگ زندگی بسر کرنا چاہے تو زندگی بسر نہیں کر سکتا انسان کو قدم قدم پر دوسروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ غذا ہر انسان کے لیے ضروری ہے اس کے حصول کے لیے کتنے لوگوں کی خدمات حاصل کرنا پڑتی ہے پہلے انسان اناج بوئے گا۔ اناج پکنے اور کاٹنے تک کئی انسانوں کی ضرورت پڑتی ہے جب اناج پک کر گھر آتا ہے تو آٹا بنانے کے لیے چکی کی ضرورت پڑتی ہے۔ پھر ایک شخص اس کو گوندھے گا اور پکائے گا۔ تب جا کر انسان اپنی بھوک دور کر سکے گا۔ اس طرح ستر کے لیے کپڑے کی ضرورت ہے کپڑا زیب تن کرنے سے قبل کتنے مراحل میں سے گزرتا ہے تب کپڑا تیار ہوتا ہے۔ پھر ایک درزی کی ضرورت ہے۔ غرض کہ کوئی انسان بغیر دوسروں کے سہارے زندگی بسر نہیں کر سکتا معاشرے کی ضرورت بچاؤ اور دفاع کے نقطہ نظر سے بھی ہے۔ دفاعی ضرورت نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ مل جل کر زندگی بسر کرے اس لحاظ سے عمرانی زندگی لازمی ٹھہری۔ قرآن مجید نے انسان کو دو حیثیتوں سے بیان کیا ہے۔ انفرادی حیثیت اور اجتماعی حیثیت، انفرادی حیثیت کے لحاظ سے اس کی زندگی کا ایک لائحہ عمل بتایا ہے اور اجتماعی زندگی کے لحاظ سے الگ ضابطہ دیا ہے چونکہ انسان کی پرورش اور تربیت معاشرہ میں ہوتی ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں عمرانی زندگی کو بہت اہمیت دی ہے انسان کی تخلیق کا مقصد بھی عمرانی زندگی کے علاوہ پورا نہیں ہو سکتا قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس آیت ۱۹) اور ابتداء میں انسانوں کی ایک امت تھی پھر الگ الگ ہو گئے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ انسان شروع سے ہی گروہی زندگی کا عادی ہے اور گروہی زندگی میں ہی اس کی تعلیم و تربیت ہوئی ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (الحجرات ۴۹:۱۳) اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔

ارشاد الٰہی ہے۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران ۳:۱۰۲) سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور جدا نہ ہو جاؤ۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ انسان کی انفرادی حیثیت کے علاوہ عمرانی اور معاشرتی حیثیت بھی ہے انسان کی معاشرت کو بہتر بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں بھی کسی نبی کی بعثت کا ذکر آتا ہے تو وہاں قوم یا امت کا لفظ آتا ہے۔ گویا نبی معاشرتی، عمرانی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے مبعوث کیے گئے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس ۱۰:۴۷) یعنی ہر امت کے لیے رسول بھیجا گیا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر ۳۵:۲۴) یعنی ہر امت میں ڈرانے والا گزر چکا ہے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ اَلْاِسْلَامُ اَحْوَجُ اِلَى الْجَمَاعَةِ (کنوز الحقایق حرف الہمزہ) اسلامی جماعتی نظام چاہتا ہے۔

فرمایا لَا يَحِلُّ لِثَلَاثَةٍ يَكُوْنُ فِي الْفَلَاةِ مِنَ الْاَرْضِ اِلَّا اُمِّرُوْا عَلَيْهِمْ اَحَدُهُمْ (مسند احمد، مشکوٰۃ باب الامارۃ) رسول کریم ﷺ نے فرمایا تین آدمی اگر چٹیل میدان میں موجود ہوں تو ان کے لیے بغیر اس بات کے کہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں زندگی گزارنا جائز نہیں۔

فرمایا۔ يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ یعنی جماعتی زندگی پر ہی خدا کی رحمت ہے۔

حضرت عمر فرماتے ہیں۔ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ (جامع لابن البرص ۶۲) اسلام بغیر جماعت کے نہیں۔

جب انسان نے اجتماعی زندگی کا آغاز کیا تو اجتماعی ضروریات نے جنم لیا۔ مختلف قسم کی ضروریات و احتیاجات درپیش آئیں ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مختلف معاشرتی ادارے وجود میں آتے چلے گئے۔ جوں جوں معاشرہ ترقی کرتا چلا گیا اور ضروریات بڑھتی گئیں اداروں میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ریاست بھی اداروں میں سے ایک اہم ادارہ ہے۔ اب دنیا ایک گاؤں کی شکل اختیار کر گئی ہے اب کوئی ملک اکیلا اپنی ضروریات پوری نہیں کر سکتا۔ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دوسروں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے اب اداروں نے بین الاقوامی شکل اختیار کر لی ہے اس وجہ سے اب عمرانی علم کا پھیلاؤ عالمگیر ہو گیا ہے اس کے دفاعی اداروں کے علاوہ بین الاقوامی اداروں کا مطالعہ بھی عمرانیات کی حدود میں داخل ہو گیا ہے اور طویل ویلج کی شکل اختیار کرتے جانے کی وجہ سے تمام ممالک کے اجتماعی ادارے ایک دوسرے سے بہت متاثر ہو رہے ہیں اور ایک دوسرے سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مثلاً کسی ایک ملک میں کسی بیماری کے بہتر علاج کے لیے...... دوائی معلوم ہوئی ہے تو تمام ممالک اس دوائی اور علاج سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اس طرح زندگی کے دوسرے معاملات ہیں جس میں صحت مند تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔

معاشرہ کے مقاصد

۱۔ انسان عالم صغیر ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے بے شمار قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت کر رکھی ہیں۔ وہ مخفی صلاحیتیں صرف معاشرہ میں ہی نشوونما پا سکتی ہیں۔ جس طرح درخت کا ایک چھوٹا سا بیج ہے۔ اس بیج میں ہی شاخیں' تنے' پتے' پھول اور پھل وغیرہ بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ جب اس بیج کو وہ ماحول دے دیا جائے تو اس کی تمام مخفی استعدادیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے لیے ایک ایسا ماحول

ہو جس میں اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو ظاہر کر سکے۔ وہ ماحول صرف سوسائٹی میں میسر آ سکتا ہے۔ پس معاشرہ کا سب سے اہم مقصد افراد کی صلاحیتوں کی آبیاری کرنا ہے۔

۲۔ دوسرا مقصد افراد میں جذبہ خدمت پیدا کرنا ہے۔ اسلام نے خدمت خلق پر بہت زور دیا ہے جب تک معاشرہ کے افراد میں خدمت خلق کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت تک معاشرہ مستحکم بنیادوں پر کھڑا نہیں ہوسکتا۔ قرآن مجید میں خدمت خلق کے متعلق آتا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِ جَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران ۳:۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو سارے انسانوں کے فائدہ کے لیے پیدا کی گئی ہو۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا. (الدھر ۷۶:۸)

اور اس کی محبت کی وجہ سے مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّائِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ.

اور اس کی محبت کے لیے قریبیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوالیوں کو مال دیتے اور غلام آزاد کرتے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے:

تو مومنوں کو ایک دوسرے پر رحم، محبت اور مہربانی میں ایسا دیکھے گا جیسا کہ بدن میں اگر ایک عضو بیمار ہو جائے تو سارے اعضاء بخار اور بیداری میں اس کے شریک ہوتے ہیں۔ (بخاری کتاب الاداب)

جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہے گا تو خدا اس کی ضرورت پوری کرے گا۔ جو کسی مسلمان کی تنگی کو دُور کرے گا تو اللہ اس کے بدلے قیامت میں اس کی تنگی کو دُور کرے گا۔ (ابو داؤد)

۳۔ معاشرے کا تیسرا مقصد افراد کی مادی ضروریات کی تکمیل ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث قدسی ہے جو اس مقصد کی اہمیت ظاہر کرتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک انسان سے پوچھے گا اے ابن آدمؑ میں بیمار ہو گیا تھا مگر تو نے میری بیمار پرسی نہ کی۔ بندہ متعجب ہو کر کہے گا۔ بھلا ایسا کیوں کر ہوسکتا ہے اور تو تُو تمام جہانوں کا خود پالنے والا ہے۔ خدا فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہو گیا تھا تو نے اس کی خبر نہیں لی تھی۔ اگر تو اس کی عیادت کے لیے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اسی طرح خدا فرمائے گا اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا بھلا ایسا کیسے ہوسکتا ہے میں تجھے کیسے کھلاتا۔ آپ تو خود رب العالمین ہیں۔ خدا فرمائے گا تجھے یاد نہیں کہ فلاں میرے بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے کھلانے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ ایسے ہی خدا فرمائے گا اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا، مگر تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ بندہ عرض کرے گا بھلا ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ تجھے پیاس لگے تو تو خود پروردگار عالم ہے۔ خدا فرمائے گا میرے فلاں پیاسے بندے نے تجھ سے پانی مانگا لیکن تو نے اسے پانی نہیں پلایا۔ اگر تو اسے پانی پلا دیتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ (مسلم)

۴۔ معاشرہ کا چوتھا مقصد امن قائم کرنا ہے جب تک افراد معاشرہ، امن اور محبت کے ساتھ زندگی بسر نہیں کرتے۔ اس وقت تک معاشرہ حقیقی معنوں میں معاشرہ کہلانے کا مستحق نہیں۔ معاشرہ کا نصب العین ہی امن کا قیام اور باہمی محبت کی فضا پیدا کرنا ہے۔

معاشرہ میں حقیقی امن، جان، مال اور آبرو کی حفاظت سے قائم ہوتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ. (بنی اسرائیل ۱۷:۳۳)

اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اِنَّ دِمَاءَ كُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا (کتاب الحج بخاری) تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی حرمت رکھتی ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت ہے۔

اسلامی معاشرے کی خصوصیات

اسلامی معاشرہ حسب ذیل خصوصیات کا حامل ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو دنیا کے کسی معاشرے میں پائی نہیں جاتیں۔

وحدتِ نسل انسانی: اسلام وحدتِ نسل انسانی کا داعی ہے۔ تفریق بین الناس کا شدید مخالف ہے۔ قومی' لونی' لسانی اور نسلی امتیازات کو جڑ سے کاٹتا ہے۔ نسل انسانی کی وحدت کا نظریہ وہ نظریہ ہے جس کی نظیر دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں نہیں ملتی۔ یہی وہ نظریہ جس پر امن کی عمارت کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔

نسل انسانی کی وحدت کا اعلان

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً. (النساء ۴:۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا ہے' اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا' اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا. (یونس ۱۰:۱۹)

اور سب لوگ ایک ہی قوم ہیں اور وہ باہم جھگڑتے ہیں۔

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ.

(المومنون ۲۳:۵۲'۵۳)

یہ تمہاری قوم ایک ہی قوم ہے اور میں تمہارا رب ہوں' سو مجھ سے ڈرو۔ مگر انھوں نے اپنے معاملہ کو آپس میں قطع کر کے ٹکڑے کر دیا ہے۔ ہر گروہ اس پر خوش ہے جو ان کے پاس ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ. (الانبیاء ۲۱:۹۲'۹۳)

اور یہ تمہاری قوم ایک ہی قوم ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔ سو میری بندگی کرو مگر انھوں نے اپنے معاملہ کو آپس میں قطع کر دیا۔ سب ہماری طرف لوٹ کر آنے والے ہیں۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران ۳:۱۰۳)

اور سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ نہ کرو۔

اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عَيَالِهٖ. (بیہقی کتاب الایمان)

ساری مخلوق عیال اللہ ہے' اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو اللہ کی مخلوق کو سب سے زیادہ چاہتا ہے۔

كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا (بخاری)

تم اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جاؤ۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَیْءٍ اِنِّیْ اَشْهَدُ اِنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ اِخْوَةٌ. (بخاری)

اے ہمارے اور ہر چیز کے رب میں گواہی دیتا ہوں کہ انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

احترام انسانیت: اسلامی معاشرہ میں انسان ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ نہ تو امارت کسی کے لیے وجہ تکریم ہے اور نہ غربت وجہ ذلت اور نہ کوئی نسل کے لحاظ سے مسند صدارت پر بیٹھنے کا زیادہ مستحق ہوسکتا ہے۔ دنیا کا ہر انسان احترام کا مستحق ہے۔

ارشاد الٰہی ہے:۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ. (اسرائیل ۱۷:۷۰) یعنی ہم نے آدمؑ کے بیٹوں کو عزت کے قابل بنایا ہے۔ اب رہا یہ کہ معاشرہ میں لوگوں کی عزت اور ذلت کا معیار کیا ہے۔ سو اس کے لیے قرآن مجید نے اچھے اعمال اور تقویٰ معیار مقرر کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا. یعنی ہر ایک کا درجہ اس کے کاموں کے لحاظ سے مقرر کرو۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ تم میں سب سے زیادہ عزت کا مستحق اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ تقویٰ کیا ہے؟ اللہ کے احکام کی پیروی کرنا۔

نیکی کا فروغ اور برائی کا انسداد: اسلام معاشرہ کے لیے ایک ایسا ضابطہ اخلاق مقرر کرتا ہے جس سے کسی کو بھی سرمو تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ صرف اس ضابطہ اخلاق کو خود اپنانا ہی لازمی قرار نہیں دیتا بلکہ یہ بھی حکم دیتا ہے کہ جو شخص اس سے انحراف کرنے کی طرف مائل ہو اس کو روکا جائے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ساتھ ہی معاشرہ میں حسن اور نظم پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کے بغیر معاشرہ میں فساد اور بگاڑ ہو جاتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے:۔

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. (المائدہ ۵:۲)

نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ. (ال عمران ۳:۱۱۰)

تم سب سے اچھی جماعت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ. (ال عمران ۳:۱۰۴)

اور چاہیے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:۔

مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ. فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذَالِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ. (مشکوٰۃ المصابیح کتاب الاداب باب الامر بالمعروف نہی عن المنکر)

تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو اس کو ہاتھ سے درست کر دے اور اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنے دل میں برا منائے اور یہ کمزور ترین ایمان ہوگا۔

وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اَوْ لَيُوْشِكَنَّ اللّٰهُ اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ عِنْدِهٖ ثُمَّ لَتَدْعُنَّهٗ وَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ. (ایضاً)

قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تمہیں ضرور نیکی کی ہدایت کرنا ہوگی اور برائی سے روکنا ہوگا ورنہ عین ممکن ہے اللہ تم پر اپنی طرف سے عذاب بھیج دے پھر تم اسے پکارو گے اور تمہاری پکار کا جواب نہ دیا جائے گا۔

مساوات: اسلامی معاشرہ میں ہر فرد کو ہر قسم کی مساوات حاصل ہے نہ تو کسی کو دوسرے پر نسلی، لونی، قومی فوقیت حاصل ہے اور نہ کسی کو قانونی برتری، اسلامی معاشرہ میں تمام لوگوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ یہ خصوصیت اسلامی معاشرہ کے ہر پہلو میں نمایاں نظر آتی ہے۔ نماز میں سب لوگ ایک ہی حیثیت سے صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ امیر غریب شاہ و گدا، آجر اور اجیر سب دست بستہ خدا کے حضور کھڑے ہوتے ہیں۔ کسی کے لیے بھی کھڑا ہونے کے لیے کوئی خاص مقام نہیں ہوتا۔ ماہ رمضان کا مہینہ آتا ہے تو سب یکساں طور پر بھوکے رہتے ہیں۔ حج کا موسم آتا ہے تو تمام اکناف عالم سے مسلمان مکہ پہنچ جاتے ہیں اور سب ایک ہی لباس میں ملبوس ہوتے ہیں اور مناسک حج ادا کرتے۔ معاشرہ میں عدل و انصاف قائم رکھنے کے لیے سب لوگ قانون کی نظر میں برابر ہیں۔ امیر قانون شکنی کرتا ہے تو سزا پاتا ہے۔

قرآن میں اعلانِ مساوات: قرآن مجید نے مساوات کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ تمام انسان ایک ہی اصل سے پیدا ہوئے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً. (النساء ۴:۱)

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

حدیث میں اعلانِ مساوات: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ایک مشہور خطبہ میں فرمایا:۔

اَيُّهَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَّاَبَاكُمْ وَاحِدٌ اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى.

اے لوگو! بیشک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

خدا پرستی: اسلام کی تعلیم کا بنیادی پتھر توحید ہے یعنی خدا کو اس کی ذات صفات اور افعال میں ایک جاننا اور اسی کی عبادت بجا لانا۔ ماسوا اللہ کے نقوش کو دل سے مٹا دینا اس وجہ سے اسلامی معاشرہ کی اہم اور سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام افراد صرف اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اس کے سامنے سرنگوں ہوتے ہیں۔ خدا پرستی ہی وہ خصوصیت ہے۔ جس سے اسلامی معاشرہ کی تمیز دوسرے معاشروں سے کی جا سکتی ہے۔ اسلام عبادت کو مقصد زندگی ٹھہرتا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات ۵۶:۵۱) میں نے جن وانس کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے يٰاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (البقرہ ۲۳:۲) اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا اور انھیں جو تم سے پہلے تھے تا کہ تم متقی بنو۔

سورۃ فاتحہ میں آتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ. (الفاتحہ ۵:۱) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ چونکہ اللہ کی عبادت ہی کمالات کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس لیے اسلام نے اللہ کی عبادت پر بہت زور دیا ہے۔

اطاعت رسول: اطاعت رسول توحید کا لازمہ ہے۔ اس وجہ سے قرآن مجید نے اطاعت رسول پر بہت ہی زور دیا ہے قرآن مجید میں آتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۲۱:۳۳)

یعنی تمھارے لیے اللہ کے رسول میں عمل کا نمونہ ہے یعنی رسول کے نقش قدم پر چلو۔

وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا. (الحشر ۷:۵۹)

اور یعنی رسول جو کچھ تمھیں دے اس کو لے لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ.

اور اللہ سے ڈرتے رہو اور باہمی مصالحانہ رویہ اختیار کرو اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ۳۰:۳) کہہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو۔ تو میری عبادت کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (النساء) یہ اللہ کی حدیں ہیں۔ جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے گا اور اسے جنت میں داخل کرے گا۔ جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء ۵۹:۴) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے صاحب امر (حاکم) کی اطاعت کرو اگر کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے پس اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔

رواداری: اسلامی معاشرہ کی ایک نمایاں خصوصیت رواداری ہے اسلام نے رواداری کو فروغ دینے کے لیے ایک بنیادی اصول وضع کیا کہ ہر وہ شخص جو دائرہ اسلام میں داخل ہوگا۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ وہ اللہ یوم آخرت ملائکہ سابقہ کتب سماوی اور بلا تفریق انبیاء علیہم السلام پر ایمان لائے۔ ارشاد الٰہی ہے مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّبِيّٖنَ (البقرہ ۱۷۷:۲) جو اللہ اور آخرت کے دن اور فرشتوں پر اور کتابوں اور نبیوں پر ایمان لائے۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَا اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (آل عمران ۸۴:۳) کہہ کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہم پر اتارا گیا اور اس پر جو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور نبیوں کو ان کے رب کی طرف دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے اور ہم اس کے فرمانبردار ہیں۔

اس زریں اصول کی آب یاری کے لیے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ دین کے معاملات میں کسی پر جبر نہیں کیا جا سکتا اور اس پر عمل کر کے بھی دکھایا۔ مذہبی اور سیاسی معاملات میں کامل رواداری کا ثبوت دیا ارشاد الٰہی ہے لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ (البقرہ ۲۵۶:۲) کہ دین میں کوئی جبر نہیں۔

آپ نے دفاع مدینہ کی خاطر اگر کوئی باہر دستہ بھیجا اور کسی غلط فہمی کی وجہ سے اگر کوئی شخص قتل ہو گیا تو آپ نے زجر و توبیخ کی۔ حضرت اسامہ بن زید نے ایک سریہ میں ایک شخص کو قتل کر دیا۔ جس نے کلمہ توحید پڑھ لیا تھا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خبر پہنچی تو اسامہ نے کہا۔ یا رسول اللہ اس

نے ڈر کر کلمہ پڑھا تھا۔ تو آپؐ نے فرمایا ہَلْ شَقَقْتَ قَلْبَہٗ کیا تو نے اس کا دل پھاڑ کر دیکھا تھا۔

اسی طرح ایک حدیث عقبہ بن مالک لیثی کی ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ میں مسلمان ہوں تو اس نے قتل کر دیا جب آپؐ کو اس کی خبر ہوئی تو آپؐ نے بہت برا منایا۔

محمد بن جعفر بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ نصاریٰ کا وفد نجران سے (مدینہ) بوقت عصر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اس کی مہمانداری کی مسجد نبوی میں جگہ دی بلکہ ان کو اپنے طریقہ پر مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دی اور جب عام مسلمانوں نے ان کو عبادت سے روکنا چاہا تو آپؐ نے منع فرمایا پھر تو وہ لوگ مشرق کی طرف منہ کر کے عبادت کرنے لگے۔ (زاد المعاد فی ھدی خیر العباد)

نجران کے عیسائیوں سے معاہدہ: نجرانی عیسائیوں کا یہ وفد اس لیے نہیں آیا تھا کہ اسلام قبول کرے بلکہ اس لیے آیا تھا کہ اسلام کی بالادستی تسلیم کرے۔ چنانچہ وفد کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ضمانت دی گئی جس کے الفاظ یہ ہیں۔ نجران جوار اللہ وذمہ محمد النبی علی انفسھم وملتھم وغائبھم وشاھدھم وعشیرتھم وتبعھم وان لا یغیر حق من حقوقھم ولا ملتھم ولا یغیر کلما تحت ایدھم من قلیل او کثیر ولیس علیھم ربیہ ولادم جاھلیۃ ولا یحشرون ولا یطاء ارضھم الجیش یعنی نجران کے عیسائیوں کو خدا اور اس کے رسول محمد کا ذمہ حاصل ہوگا۔ ان کی جان مذہب، زمین اور جائیداد کے بارے میں ان تمام لوگوں کو یہاں حاضر ہیں یا یہاں سے غائب ہیں۔ قبیلہ والے ہیں یا پیروکار، ان کے کسی حق میں تغیر نہیں کیا جائے گا جو کچھ ان کے قبضہ اور تصرف میں ہے خواہ کم ہو یا زیادہ اس میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ گذشتہ دور کے شبہات قتل کے معاملات میں وہ ماخوذ نہ کیے جائیں گے۔ نہ وہ بیگار میں پکڑے جائیں گے۔ نہ ان کے علاقہ کی زمین سے اسلامی فوج گزرے گی پھر جب یہ وفد جانے لگا تو اس نے پھر ایک تحریر آپ سے اپنے دین معاہد اور شعار دین کے بارے میں حاصل کی وہ حسب ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم من محمد النبی الاسقف ابی الحارث واساقفہ نجران و کفتھم ورھبانھم و اھل بیتھم ورفیقھم و ملتھم ومواظبتھم و علی کل تحت ایدیھم من قلیل و کثیر جوار اللہ ورسول لایغیر اسقف من سقفیہ ولاراھب من رھانیہ ولا کاھن من کھانیۃ ولا یغیر حق من حقوقھم ولا سلطانھم ولا مما کانوا علیہ علی ذالک جوار اللہ ورسولہ ابداً یعنی محمد رسول اللہ کی طرف سے اسقف ابو حارث اور نجران کے دوسرے پادریوں اور راہبوں اور ان کے رفیقوں اہل بیت، غلاموں کو یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ جو کچھ ان کے قبضہ اور تصرف میں ہے۔ خواہ وہ کم ہو یا زیادہ۔ سب کو خدا اور اس کے رسول کا ذمہ حاصل ہوگا کسی راہب یا کاہن کے حق میں یا اختیار یا منصب میں کچھ رد و بدل نہیں کیا جائے گا ان کی موجودہ حالت بغیر کسی تغیر کے خدا اور اس کے رسول کے ذمہ میں دائما باقی رہے گی (طبقات ابن سعد جزو ثالث)

حضرت جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے سے ایک جنازہ گزرا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہو گئے پھر ہم لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ تو ایک یہودی کا جنازہ تھا آپ نے فرمایا جب جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جایا کرو (خواہ وہ مسلمان کا ہو یا کافر کا ہو)

(بخاری کتاب الجنائز)

تاریخ اسلام میں وہ معاہدات جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفاء راشدینؓ نے غیر مسلموں سے کیے۔ وہ اس بات پر شاہد ہیں کہ آپ نے غیر مذاہب سے کس قدر مذہبی اور سیاسی رواداری کا ثبوت دیا۔ صرف ایک معاہدہ یہاں رقم کیا جاتا ہے آپ نے نجران کے نصاریٰ کو مندرجہ ذیل دستاویز عنایت فرمائی۔ نجران اور اس کے قرب و جوار کے عیسائیوں کو خدا تعالیٰ کی حفاظت اور اس کے رسول کی نیک نیتی کا وعدہ یہ ایں الفاظ دیا گیا کہ ''ان کے نفوس اموال اور عقائد سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے گا اور ان کے مذاہبی مراسم میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے گی اور ان کے حقوق اور مراعات میں کمی نہ کی جائے گی کسی اسقف یا راہب کو اس کی جائے مقررہ سے برطرف نہ کیا جائے گا اور ان کی پوزیشن اور عزت برقرار رہے گی۔ کوئی مورت یا صلیب نہ توڑی جائے گی نہ ان پر کوئی دوسرا ظلم کرے گا اور نہ وہ کسی پر ظلم کرسکیں گے ایام جاہلیت کا طریق قصاص موقوف کیا جاتا ہے۔ ان سے عشر نہ لیا جائے گا۔ نہ ان کو سامان رسد مہیا کرنا پڑے گا۔''

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف رواداری کی تعلیم ہی نہیں دی بلکہ اس پر عمل کر کے معاشرہ میں رائج کیا۔

آزادی: انسان فطرتاً آزادی کا خواہش مند ہے اور اگر کوئی فرد غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو۔ تو اس کی روح آزادی کے لیے تڑپتی ہے تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ جب کوئی قوم بداعمالیوں کی دلدل میں پھنس جاتی ہے۔ ترقی کے اصولوں کو پس پشت ڈال دیتی ہے تو وہ قوم کسی قوم کی غلام بن جاتی ہے۔ تاریخ یہ بھی ظاہر کرتی ہے کوئی طاقتور قوم کسی کمزور قوم پر چڑھائی کر کے اس کے ملک پر قبضہ کر لیتی ہے اور اس کے تمام حقوق چھین لیتی ہے تو وہ

قوم اپنی اس طبعی خواہش کی وجہ سے آزادی کا سانس لینے کے لیے تگ و دو کرنا شروع کر دیتی ہے۔ دنیا کی اکثر جنگیں حصول آزادی کے لیے لڑی گئی ہیں انہی جنگوں نے معاشرتی زندگی کو تباہ و برباد کر دیا۔ ہزاروں جانیں تلف ہوئیں۔ اسلام نے معاشرتی زندگی کو پُر امن بنانے کے لیے استحصالی جنگوں کی ممانعت کی ہے۔

تاریخ عالم میں صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہی ایسی شخصیت ہیں جنھوں نے تلوار کا صحیح استعمال بتایا۔ یعنی قیام امن کے لیے۔ آپ نے مندرجہ ذیل تین صورتوں میں تلوار چلانے کی اجازت دی ہے۔

۱۔ خدا کی عبادت گاہوں کو بچانے کے لیے خواہ وہ عیسائیوں کی ہوں یا یہود کی ہوں۔ ہنود کی ہوں یا مسلمانوں کی (قرآن مجید ۲۲:۴۰)

۲۔ ضمیر کی آزادی قائم کرنے کے لیے قرآنی تعلیمات کی رو سے ہر شخص کو اپنا مذہب اختیار کرنے کی آزادی ہے اور کسی کو اپنا عقیدہ دوسرے سے بزور شمشیر منوانے کی اجازت نہیں اور اگر کوئی شخص ایسا کرے تو مسلمانوں پر اس سے جنگ کرنا فرض ہے خواہ اس فعل کا مرتکب مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔
(قرآن مجید ۲:۱۹۰ تا ۱۹۳)

۳۔ حفاظت ذات خویش (قرآن مجید ۲۲:۳۹)

۴۔ استحصالی جنگوں کا سلسلہ کلیتہً بند ہو جائے تو غلامی خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ گویا اسلام نے استحصالی جنگوں کی ممانعت کر کے آزادی کا اعلان کیا ہے اور کسی طاقت ور قوم کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کسی کمزور قوم پر حملہ کر کے اس کو غلام بنا لے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اِنَّ مِنْ شَرَارِ النَّاسِ الَّذِیْنَ یَبِیْعُوْنَ النَّاسَ (بخاری بحوالہ کنوز الحقائق) بہت بُرے وہ لوگ ہیں جو آدمیوں کو فروخت کرتے ہیں۔
قرآن مجید میں آتا ہے۔
مَاکَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ (الانفال ۸:۶۷)
نبی کے لیے سزاوار نہیں کہ اس کے قبضہ میں قیدی ہوں۔

دنیا میں یکے بعد دیگرے مختلف مذاہب پیدا ہوئے مختلف تہذیبوں کے ادوار آئے۔ اسلام ہی پہلا مذہب ہے جس نے اسیری جنگ کے علاوہ ہر طرح کی غلامی کا انسداد بھی فرمایا۔

عدل و انصاف: معاشرتی زندگی کو خوشگوار اور پُر مسرت بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ معاشرہ میں عدل و انصاف کی حکومت ہو۔ اسی وجہ سے اسلام نے عدل و انصاف پر بہت زور دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (المائدہ ۵:۸) اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کے لیے کھڑے ہونے والے انصاف کی گواہی دینے والے ہو جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو انصاف کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ کا تقویٰ کرو اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔

دوسری جگہ آتا ہے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا۔ (النساء ۴:۱۳۵)

اے وہ جو ایمان لائے ہو۔ انصاف پر قائم رہو (سچی سچی) گواہی دو خواہ وہ تمہاری ذات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو یا تمھارے والدین یا اقرباء ہی کیوں نہ ہوں۔ بلالحاظ افلاس و تونگری اور جب تم انصاف کرنے بیٹھو تو اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی مت کرو۔ اگر تم نے اظہار حق میں گریز کر دیا یا کترائے۔ تو اس سے بھی اللہ خوب باخبر ہے۔

حدیث میں آتا ہے قبیلہ مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی۔ اس کے اعزہ نے اسامہ بن زید کو آپ کی خدمت میں سفارش کرنے کی درخواست کی۔ حالانکہ آپ ابن زید کا بہت خیال فرماتے تھے لیکن اس موقعہ پر فرمایا اسامہ! کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری خوشنودی کے لیے اللہ کے احکام سے روگردانی کروں اس کے بعد آپ نے مجلس میں یوں تقریر فرمائی تم لوگوں سے پہلے بہت سی قومیں صرف اس وجہ سے تباہ ہو گئیں کہ انھوں نے غریبوں کے معاملات میں ملکی قانون کو سخت طریقہ میں برتا اور امیروں کے لیے ملائم کر دیا۔ خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ چوری کا ارتکاب کرے تو اس کے ہاتھ بھی اسی طرح کٹوائے جائیں گے (بخاری)

ایک مرتبہ آپ مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے۔ ایک جماعت آپ کے گرد تھی۔ اس اثنا میں ایک شخص نے اپنے بدن کا سارا بوجھ آپؐ پر ڈال دیا آپؐ نے ایک پتلی سی چھڑی سے اسے ہٹا دیا لیکن چھڑی کی نوک سے اس کے چہرے پر ایک خفیف سی خراش آ گئی۔ آپؐ نے فوراً اس سے فرمایا۔ مجھ سے انتقام لے

سکتے ہو۔ اس نے کہا۔ یا رسول اللہ! میں نے بطیب خاطر آپ کو معاف کیا۔ (ابوداؤد)

آپؐ نے فرمایا قیامت کے دن جب خدا کے عرش کے سائے کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا خدا سات شخصوں کو اپنے عرش کے سائے میں جگہ دے گا جس میں ایک شخص عادل ہوگا۔

میانہ روی: ہر کام میں افراط تفریط نقصان دہ ہے۔ اس لیے اسلام نے معاشرتی زندگی کو صحیح خطوط پر چلانے کے لیے میانہ روی اور اعتدال کی تعلیم دی۔ اس تعلیم کی وجہ سے امت مسلمہ کو امت وسطی کہا جاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (البقرہ ۲:۱۴۳) ہم نے تم کو امت وسطی بنایا وسطی سے مراد جو افراط اور تفریط سے پاک ہو۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۱۱۰) درمیان کی راہ اختیار کر۔

ایک اور موقع پر فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (بقرہ) اللہ کی حد سے زیادہ بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

مذہب کی روح عبادت ہے ہر نبی نے اپنے پیروکاروں کو عبادت کی تعلیم دی۔ اسلام نے تو انسان کی پیدائش کی غرض ہی عبادت قرار دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ میں نے جن و انس کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔

اسلام نے عبادت میں بھی افراط و تفریط کو پسند نہیں کیا حضرت عثمان بن مظعون کا واقعہ حدیثوں میں آتا ہے۔ انھوں نے جب راتیں نمازوں اور دن روزوں میں بسر کرنے شروع کیے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرما دیا اور اعتدال کی تاکید فرمائی اور فرمایا تمھارے ذمہ اور بھی حق ہیں۔

اس طرح سخاوت اور فیاضی سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔ ہر مذہب نے اس کی تعلیم دی ہے اسلام نے اس نیکی کے عمل میں بھی بے اعتدالی کو پسند نہیں کیا کہ دوسروں کو دے کر تم خود دوسروں کے محتاج بن جاؤ۔ ارشاد الٰہی ہے وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۲۹) اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن میں باندھ لے اور نہ اس کو بالکل کھول دے پس تو ملامت کا نشانہ بن کر تھکا ہارا بیٹھ جائے۔

چال ڈھال میں میانہ روی کی تعلیم دی۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ (لقمان ۳۱:۱۹) اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر۔

ارشاد الٰہی ہے۔ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کر۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بھی غلو سے روکا ہے۔ غلو راہ اعتدال چھوڑنے کا نام ہے۔

پس میانہ روی اور اعتدال پسندی اسلام کی ایسی خصوصیت ہے جس سے مادی تہذیبیں تہی دامن ہیں۔ مسلمان نہ یہودیوں کی طرح جن کے سامنے مادی فوائد اور جسمانی لذتوں کے سوا کچھ نہیں اور نہ نصاریٰ اور ہندوؤں کی طرح ہیں جن کے ہاں عبادت کا دار و مدار نفس کو ذلیل کرنے اور جسمانی مشقتیں برداشت کرنے پر تھا۔

اخلاقی اصول: اسلامی معاشرہ کی اہم خصوصیت اخلاقی اصول ہیں یہ حقیقت ہے کہ اخلاق حمیدہ ہی معاشرتی زندگی کو خوشگوار بناتے ہیں اسی لیے قرآن مجید میں جہاں ایمان کا ذکر ہے ساتھ ہی اعمال صالحہ کا ذکر ہے گویا ایمان اور اعمال صالحہ لازم و ملزوم ہیں۔

اخلاق فاضلہ کیا ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی صفات کا پرتو۔ جب ایک انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بن جاتا ہے۔ تو اس کے اعمال اور افعال سے اسماء الٰہیہ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اسی کا نام اخلاق فاضلہ ہے۔ اسی کو اللہ کا رنگ کہا جاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (بقرہ ۲:۱۳۸) اللہ کا رنگ (اختیار کرو) اور اللہ سے بہتر کس کا رنگ ہے۔

اللہ کا رنگ اختیار کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کے لیے اپنے دل میں رحم کا جذبہ رکھتا ہے تو وہ خدا کی صفت رحیم کا مظہر ہے۔ اسی طرح کسی کی زیادتی پر قدرت رکھتے ہوئے درگزر سے کام لیتا ہے تو وہ خدا کی صفت عفو کا اظہار کر رہا ہوتا ہے اسی طرح ایک شخص خدا کے دیے ہوئے مال میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو گویا وہ خدا کی صفت ربوبیت کے تقاضا کو پورا کر رہا ہے اسی طرح ایک انسان مشکلات میں صبر سے کام لیتا ہے تو وہ خدا کی صفت صبور کا اظہار کر رہا ہے۔ اسی طرح جو شخص بھی خدا کی صفات کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے دراصل وہی اخلاق حمیدہ کے زیور سے آراستہ ہے۔ وہ شخص معاشرہ کا بہترین شخص ہے جب اللہ تعالیٰ کی صفات کسی معاشرہ میں جلوہ گر ہوں۔ تو اس سے بہتر دنیا میں کوئی معاشرہ نہیں ہے اسی قسم کے معاشرہ کی تشکیل کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے جب آپ نے وفات پائی تو معاشرہ میں ہر قسم کی برائیاں ناپید تھیں اور ہر قسم کے اخلاق فاضلہ جلوہ گر تھے۔

اسلام نے جہاں اللہ کا رنگ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے وہاں ہر قسم کی بدی چھوڑنے کا حکم دیا ہے ارشاد الٰہی ہے وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا

وَمَا بَطَنَ (الانعام ۱۵۱:۶) بے حیائی کی باتوں کے قریب مت جاؤ جوان میں سے ظاہر ہوں اور چھپی ہوئی ہوں۔

دوسری جگہ آتا ہے وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ (الانعام ۱۲۰:۶) اور کھلے اور چھپے گناہ کو چھوڑ دو۔

امن عالم: اسلامی معاشرہ امن عالم کا زبردست حامی ہے۔ لفظ اسلام کے معنی ہی یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ اسلام سلامتی کا مذہب ہے۔ اسلام نے ان امور کو فروغ دیا۔ جن سے امن قائم ہوتا ہے مثلاً انسانی عظمت، مساوات، اتحاد، اخوت، مذہبی رواداری، عدل و انصاف، آزادی اور جان مال اور عزت کی حرمت وغیرہ اور ان امور سے روکا جن سے فساد برپا ہوتا ہے مثلاً عداوت و بغض، تعصب، کینہ، درشت مزاجی، ظلم، تمسخر، قتل بے گناہ، زنا، چوری، رشوت، غصب و نہب، غیبت، چغل خوری، دو روئی، کبر و غرور، حرص، طمع، لالچ، حسد، خیانت، بہتان وغیرہ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمان کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرا امن میں رہے۔

اس کے ساتھ تمام مخلوق کو عیال اللہ قرار دیا ہے اور خدا کا محبوب اس کو قرار دیا ہے جو اس کی مخلوق سے پیار کرتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عَيَالِهٖ مخلوق اللہ کی عیال ہے اور اللہ کو محبوب ترین وہ شخص ہے جو اس کی عیال سے محبت کرے۔ (جامع صغیر جلد ۱)

پھر فرمایا خَيْرُ النَّاسِ اَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ (کنوز الحقائق) لوگوں میں بہتر وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔

اسلام ہی پہلا مذہب ہے جس نے محض امن کے قیام کے لیے تلوار اٹھانے کی تعلیم دی ہے۔ اگر استحصالی جنگ کا دفاع نہ کیا جائے تو تمام زمین فساد کا گہوارہ بن جائے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (البقرہ ۱۹۲:۲) اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو۔ پھر اگر وہ رک جائیں تو سزا ظالموں کے سوائے اور کسی کے لیے نہیں۔

یہ آیت صاف بتاتی ہے کہ اسلام نے محض فساد کو ختم کرنے کے لیے جنگ کی اجازت دی ہے اور آیت مذکورہ میں لفظ "فتنہ" فساد کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لفظ فتنہ میں فساد کی نسبت زیادہ گہرائی اور گیرائی ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے لفظ فتنہ استعمال کیا ہے۔

اسلام نے صرف قیام امن کا نظریہ ہی نہیں دیا بلکہ اس نظریہ اور تصور کو عملی جامہ بھی پہنایا۔

ذمہ داری کا احساس: اسلامی معاشرہ میں ہر فرد کے حقوق و فرائض متعین کر دیے گئے ہیں جن کا ادا کرنا ہر فرد کے لیے لازمی ہے یہ فرض کی ادائیگی اس کی ساری زندگی میں اسے کام کے لیے آمادہ رکھتی ہے اور حقوق و فرائض کی ادائیگی سے پہلو تہی اس کے لیے دائمی عذاب کا موجب بنتی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور وہ اپنی رعایا کے متعلق پوچھا جائے گا۔ یعنی ہر ایک شخص کے حقوق و فرائض متعین کر دیے گئے ہیں ان کی ادائیگی کے متعلق پوچھا جائے گا۔

تحریم و تقدیس نکاح: زمانہ جاہلیت کے معاشرہ میں نکاح کو حرمت و تقدیس حاصل نہ تھا۔ حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ جاہلیت میں نکاح کی چار صورتیں تھیں۔

۱۔ ایک طریقہ تو یہی تھا جو آج کل رائج ہے۔

۲۔ اپنی منکوحہ بیوی سے مرد کہتا کہ حیض کا خون تیرا جب بند ہو جائے تو پاکی حاصل کرنے کے بعد تو فلاں مرد کے پاس چلی جا اور اس سے فائدہ حاصل کر۔ یعنی اس غیر مرد سے ہم بستر ہو اور اتنی مدت شوہر اپنی اس عورت سے علیحدہ رہتا جب تک اس کی عورت کو غیر مرد کا حمل ظاہر نہ ہو جاتا چنانچہ جب غیر مرد کا حمل نمودار ہو جاتا تو وہ اپنے پہلے خاوند کے پاس آ جاتی۔ اب اگر شوہر کی خواہش ہوتی تو اپنی بیوی کے پاس جاتا۔ ایسا جاہلیت میں اس لیے کرتے تھے کہ لڑکا نجیب ہو اس نکاح کو استبضاع کہا جاتا تھا گویا "تخم" حاصل کرنے کا یہ ایک طریقہ تھا۔

۳۔ تیسری شکل یہ تھی کہ ایک عورت کے پاس متعدد مرد آتے اور لطف اندوز ہوتے مگر ان کی تعداد دس سے کم ہوتی۔ عورت کو جب حمل ظاہر ہوتا۔ بچہ پیدا ہوتا اور پیدا ہوئے کچھ دن گزر جاتے تو یہ عورت ان تمام مردوں کو قاصد کے ذریعہ بلا بھیجتی کوئی انکار کی جرأت نہیں کر سکتا تھا چنانچہ جب سب جمع ہو جاتے یہ عورت کہتی تم اپنے معاملہ سے واقف ہو کر میرے پاس وطی کے لیے آیا کرتے تھے۔ میرے بچہ پیدا ہوا ہے۔ اے فلاں شخص! یہ تیرا بچہ ہے تم اپنی پسند سے اس کا کوئی نام رکھو چنانچہ یہ لڑکا اس شخص کا ہو جاتا تھا۔ جس کا عورت نام لیتی مرد انکار نہیں کر سکتا تھا۔

۴۔ کچھ عورتیں ایسی تھیں جن کے دروازوں پر جھنڈیاں نصب رہتی تھیں یہ بازاری پیشہ ور عورتیں تھیں جس کا جی چاہتا ان کے پاس جاتا۔ جب ان کے

کوئی بچہ پیدا ہوتا تو تمام لطف اندوز ہونے والے جمع ہوتے اور قیافہ شناس بلایا جاتا اور وہ اپنے قیافہ سے جانچ کر اس بچہ کو ان مردوں میں جس کا کہہ دیتا وہ بچہ اس کا ہو جاتا۔ مرد انکار نہیں کر سکتا تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ ان صورتوں کو بیان کر کے فرماتی ہیں کہ تمام ناجائز صورتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بند کیا۔

فَلَمَّا بُعِثَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْحَقِّ هَدَمَ نِكَاحَ الْجَاهِلِيَّةِ اِلَّا نِكَاحَ النَّاسِ الْيَوْمَ (بخاری کتاب النکاح ج ۴ ص ۱۶۵)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب حق لے کر مبعوث ہوئے تو آپ نے جاہلی نکاحوں کو بند کیا صرف اس نکاح کو باقی رکھا جو آج رائج ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیت میں عورتوں کی عصمت وعفت اپنی قدرتی قدر و قیمت سے محروم ہو چکی تھی۔

اس کے علاوہ عرب میں امراء کے گھروں میں غیر منکوحہ لونڈیاں بے حساب ہوتی تھیں۔ لونڈیوں کی زیادہ تعداد معزز ہونے کی علامت تھی۔ اس کے ساتھ طلاق کی بے رحمانہ رسوم رائج تھیں اسلام نے ازدواجی زندگی کو اسلامی معاشرے کا سنگ بنیاد قرار دیا اور نکاح کو میثاقاً غلیظاً (النساء۴:۲۱) پختہ عہد قرار دیا اس معاہدہ کی رو سے میاں بیوی دونوں اپنے کندھوں پر بعض اہم ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کا اقرار کرتے ہیں۔

اسلام نے ازدواجی زندگی کے لیے نکاح کو لازمی قرار دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ (نور ۲۴:۳۲)

تم میں سے مجرد ہیں ان کے نکاح کر دو اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے بھی جو صلاحیت رکھتے ہوں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ اَتَزَوَّجُ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ (بخاری) میں شادی کرتا ہوں پس جو میری سنت سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہیں۔

پھر فرمایا يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ (بخاری) اے جوانوں کے گروہ جو تم میں سے نفقہ ومہر دینے کی طاقت رکھتا ہے اسے نکاح کرنا چاہیے۔

معاشرتی زندگی کو پاکیزہ رکھنے کے لیے نکاح کے احکام اور جائز اور ناجائز تمام رشتوں کو کھول کر بیان کر دیا۔ جن کا ذکر آئندہ کے صفحات پر آئے گا۔

عورت کو مساوی مقام: اسلام سے قبل دنیا کے ہر معاشرے میں عورت انسانی حقوق سے محروم تھی۔ ذلت کی زندگی گزار رہی تھی۔ اس سلسلہ میں ایک غیر مسلم مورخ ڈاکٹر گستاؤلی لکھتا ہے۔

اسپارٹا میں اس بدنصیب عورت کو جس سے کسی قومی سپاہی کے پیدا ہونے کی امید نہ ہوتی مار ڈالتے تھے۔ جس وقت کسی عورت کے بچہ ہو چکتا تھا تو فوائد ملکی کی غرض سے اسے (عورت کو) دوسرے شخص کی نسل لینے کے لیے اس کے خاوند سے عاریتاً لے لیتے (تمدن عرب ص ۳۷۳)

یونانی اپنے اعلیٰ سے اعلیٰ تمدن کے زمانہ میں بھی بجز طواف کے کسی عورت کی قدر نہیں کرتے تھے (تمدن عرب ص ۳۷۳)

"عہد قدیم" کے باب واعظ میں لکھا ہے "جو کوئی خدا کا پیارا ہے وہ اپنے کو عورت سے بچائے گا ہزار آدمیوں میں سے میں نے ایک خدا کا پیارا پایا ہے لیکن تمام عالم کی عورتوں میں سے ایک عورت بھی ایسی نہیں جو خدا کی پیاری ہوتی۔" (تمدن عرب ص ۳۷۳)

روم میں مرد کی حکومت اپنی بیوی پر جابرانہ تھی......... جس کا معاشرت میں کوئی حصہ نہ تھا اور شوہر کو پورا حق اس کی جان پر بھی حاصل تھا۔ یہی حال یونان کا تھا (تمدن عرب ص ۳۷۳)

جب موجودہ مذاہب عالم کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی مذہب نے بھی عورت کو عزت کا مقام نہیں دیا اسلام آیا اس نے عورت کو عزت کا مقام دیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرہ۲:۲۲۸) عورتوں کے کچھ حقوق ہیں اور جس طرح کہ بھلائی کے ساتھ دستور کے مطابق ان پر کچھ فرائض ہیں اور مردوں کو ان پر فضیلت حاصل ہے۔

اسلام نے مرد اور عورت کو بحیثیت انسان مساوی قرار دیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً (النساء۴:۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔ جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا۔ پھر دونوں کی نسل سے مردوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی۔

دوسری جگہ آتا ہے هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا (اعراف: ۱۸۹) وہی ذات جس نے ایک جان سے تمھیں پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا تا کہ اس کی رفاقت میں سکون پائے۔

دنیا کی مختلف تہذیبوں اور مذاہب میں عورت کا کیا مقام ہے اس موضوع پر بعد میں مفصل ہوگی۔

مُنْزَل مِنَ اللّٰه (اللہ کی جانب سے)

اسلامی معاشرہ کی اہم بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اصول اللہ کی طرف سے اتارے ہوئے ہیں اس اہمیت کے لحاظ سے تو اس کا ذکر شروع میں کرنا چاہیے تھا لیکن عمداً سب سے آخر میں اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے قاری کو یہ بتانے کے لیے کہ معاشرتی زندگی کے یہ تمام اصول کسی انسان کے وضع کردہ نہیں ہیں بلکہ یہ تمام اصول اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہیں قرآن مجید میں مختلف مقامات پر یہ بتایا ہے کہ یہ تمام ضابطہ حیات اللہ کی طرف نازل شدہ ہے۔ اسی وجہ سے ان پر عمل پیرا ہونے میں کامیابی ہے ارشاد الٰہی ہے۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (البقرہ ۲:۲) یہ وہ کتاب (ضابطہ حیات) ہے جس میں کوئی شک نہیں (یہ کتاب) متقیوں کو منزل مقصود تک پہنچاتی ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم ۵۳:۳،۴) نہ وہ (حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا ہے یہ صرف وحی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے۔ (اس کے مطابق تعلیم دیتا ہے)

ایک اور جگہ آتا ہے وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (۵:۴۸) اور ہم نے تیری طرف کتاب حق کے ساتھ اتاری اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس سے پہلے کتابوں میں سے ہے اور اس پر نگہبان ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا ہے انسانی زندگی گزارنے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف تمام اصول حق کے ساتھ نازل کیے گئے ہیں۔ ساتھ یہ بھی بتایا قرآن سے قبل تمام انبیاء پر انسانی زندگی کی فلاح کے لیے اصول اتارے گئے تھے وہ بھی حق تھے۔

ایک اور مقام پر ارشاد الٰہی ہے قُلْ اِنَّنِىْ هَدٰىنِىْ رَبِّىْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (الانعام: ۱۶۱) کہہ بے شک مجھ کو میرے رب نے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی ہے۔

گویا خدا کی طرف نازل شدہ اصول ہی وہ صراط مستقیم ہے جس پر انسان چل کر کامیابی سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔

عالمگیریت

اسلامی معاشرہ اپنے اندر عالمگیریت رکھتا ہے۔ اسلام سے قبل کسی مذہب نے بھی عالمگیر معاشرہ کی بنیاد نہیں رکھی۔ ہندوؤں کا یہ ایمان ہے کہ برہما صرف اس قوم کا خدا ہے اور یہی اس کی چہیتی قوم ہے ہندوستان کے باہر جتنی قومیں بستی ہیں وہ سب کی سب ناپاک ہیں ان کے چھو جانے سے ان کی ہر چیز ناپاک ہو جاتی ہے۔ غیر ہندو ہندوؤں کے برتن کو ہاتھ نہیں لگا سکتا ہندو قوم صرف غیر ملک کے رہنے والوں سے ہی نفرت نہیں کرتی بلکہ ہندوستان میں دس کروڑ اچھوت رہ رہے ہیں۔ ان کو بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہودیوں کا بھی یہی نظریہ ہے وہی خدا کی محبوب ترین قوم ہے نجات صرف یہودیوں کے لیے ہے قرآن مجید نے ان کے تعصبات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ، یعنی ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں دوسری جگہ آتا ہے لَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ صرف اسی شخص پر ایمان لاؤ جو تمھارے دین کا پیرو کا ہے (جو تمھارے دین کے سوا اور کوئی عقیدہ رکھتا ہو اس کی بات پر کان نہ دھرو اور آسمانی کتاب صرف انھیں کے لیے نازل ہوئی ہے)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل علیہ السلام کے آخری پیغمبر ہیں انھوں نے تو صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میں بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا (متی ۱۵:۲۴)

اپنے شاگردوں کو نصیحت فرمائی کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا (متی ۱۰:۵)

نجات صرف یہودیوں کے لیے ہے (یوحنا ۴:۲۲)

پس تمام مذاہب نے صرف قومی معاشرہ کی بنیاد رکھی ہے۔ جس کی وجہ سے ان معاشروں میں ایک دوسرے سے نفرت اور دشمنی پائی جاتی ہے۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے عالمگیر معاشرے کی بنیاد رکھی اور اعلان کیا کہ اسلام کا خدا رب العالمین ہے یعنی اسلام کا خدا صرف مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ تمام جہانوں کا خدا ہے اور سب کی برابر ربوبیت کرتا ہے اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق فرمایا وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ. ہم

نے تجھے تمام دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف مسلمانوں کے ہی نبی نہیں بلکہ دنیا کے تمام لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں۔

پس اسلام نے ایک عالمگیر معاشرہ کی بنیاد رکھ کر تمام دنیا کو اتحاد' محبت' رواداری سے زندگی بسر کرنے کی تعلیم دی ہے۔

شرف انسانیت: پیشتر اس کے کہ شرف انسانیت کے بارے میں اسلامی تعلیم کا اظہار کیا جائے یہ ضروری ہے کہ دیکھا جائے کہ دوسرے مذاہب شرف انسانیت کے بارے میں کیا تعلیم دیتے ہیں تاکہ تقابلی جائزہ سے اسلام کی فوقیت اور برتری ظاہر ہو جائے۔ سب سے پہلے ہندو مذہب کا مطالعہ کرتے ہیں۔

ہندو مذہب میں انسانیت سوز ذات پات کا امتیاز ہے۔ اسی پر ہندو تمدن کی بنیاد قائم ہے۔ وید انسانوں کو چار ذاتوں میں منقسم کرتا ہے۔ برہمن' کھشتری' ویش' شودر۔

وید میں لکھا ہے برہمن پر ماتما کے منہ سے کشتری بازوؤں سے ویش رانوں سے اور شودر پاؤں سے پیدا ہوا ہے۔ (رگوید یجروید اتھروید)

وید کے لیے برہمن حکومت کے لیے چھتری کاروبار کے لیے ویش دکھ اٹھانے کے لیے شودر پیدا کیا ہے (یجروید ۳۰:۵)

منوشاستر ہندوؤں کی قانون کی کتاب ہے جس میں مختلف ذاتوں کے فرائض اور شادی بیاہ کے مسائل درج ہیں۔

''قادر مطلق نے دنیا کی بہبودی کے لیے اپنے منہ سے اور اپنے بازوؤں سے اور اپنی رانوں سے اور اپنے پیروں سے برہمن چھتری ویش اور شودر کو پیدا کیا۔'' (باب اوّل:۳)

اس دنیا کی حفاظت کے لیے اس نے ان میں سے ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ فرائض قرار دیے۔ (باب اول' ۸۴)

برہمنوں کے لیے وید کی تعلیم اور خود اپنے اور دوسروں کے لیے دیوتاؤں کو چڑھاوے دینا اور دان لینے دینے کا فرض قرار دیا (باب اوّل)

چھتری کو اس نے حکم دیا ہے کہ خلقت کی حفاظت کرے۔ (باب اوّل ۸۹)

ویش کو اس نے یہ حکم دیا ہے کہ مویشی کی سیوا کرے دان دے چڑھاوے چڑھائے تجارت لین دین اور زراعت کرے (باب اوّل ۹۰)

شودر کے لیے قادر مطلق نے صرف ایک ہی فرض بنایا ہے وہ ان تینوں کی خدمت کرنا ہے (باب اوّل ۹۱)

ہندو سماج میں برہمنوں کو دوسری ذات کے انسانوں پر تفوق حاصل ہے منوشاستر میں ہے کہ ''جو کچھ دنیا میں ہے برہمن کا دل ہے چونکہ وہ خلقت میں سب سے بڑا ہے کل چیزیں اس کی ہیں۔'' (باب اوّل ۱۰۰)

چھتری:۔ اس طبقہ کا کام ملک کا دفاع تھا۔ یہ طبقہ ہندو معاشرہ میں دوسرے درجہ پر تھا۔

ویش:۔ اس طبقہ کا کام زراعت' تجارت اور صنعت کو فروغ دینا تھا ان کا درجہ تیسرا تھا۔ ان کی زنار بندی چھتریوں کے بعد ہوتی تھی۔

ویشوں کے متعلق منو لکھتا ہے۔

''ویش کو چاہیے کہ زنار بندی اور اپنی ذات میں شادی کرنے کے بعد کاروبار میں مصروف ہو جائے اور مویشی کی نگہداشت کرے (باب نہم ۳۲۰)

شودر: شودر ہندو معاشرہ کا ذلیل ترین طبقہ تھا۔ ان کے لیے مندر اسکول کنویں اور چشمے الگ اور مخصوص ہو گئے۔ وہ اس راہ پر نہیں چل سکتے تھے جس پر کسی اعلیٰ ذات کا ہندو جا رہا ہو۔ اور اسے وہ خوراک کھانے کا حق نہ تھا۔ جو اعلیٰ ذات کے ہندو کھاتے تھے۔ وہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے لیے گندے اور ادنیٰ کام کرتے تھے۔ عملاً وہ قدرت کی ہر اس نعمت سے محروم تھے جن پر اعلیٰ ذات کا ہندو اپنا پیدائشی حق جتا دے اس پر زندگی کے تمام دروازے بند تھے نہانا دھونا ان کے لیے ناممکن ہو گیا کیونکہ کنوؤں اور چشموں پر اعلیٰ ذات کا ہندو قابض تھا۔

شودر کے فرائض: منو لکھتا ہے ''لیکن شودر کا اعلیٰ ترین فرض یہ ہے کہ وہ وید کے ماہر گرہست برہمنوں کی جو تقوے میں مشہور ہیں خدمت کرے اور یہی اس کی نجات کا ذریعہ ہے۔'' (باب نہم ۳۳۴)

''برہمن کی خدمت کرنا شودر کے لیے نہایت قابل تعریف بات ہے اور اس کے سوا کسی اور چیز سے اسے اور کوئی اجر نہیں مل سکتا۔'' (باب دہم ۱۲۳)

''شودر اگر موقع ملے تو اسے نہیں چاہیے کہ مال و دولت جمع کرے کیونکہ شودر دولت جمع کر کے برہمنوں کو دکھ دیتا ہے۔'' (باب نہم ۱۲۹)

شودر پر مظالم: شودر جس عضو سے برہمن کی ہتک کرے وہی عضو اس کا کاٹ دیا جائے۔ اگر برہمن کے برابر بیٹھ جائے تو کمر پر داغ لگا کر چوتڑ کٹوا کر ملک سے باہر نکال دینا چاہیے۔ (منو ۲۸۱:۲) (اتھر ۲۲:۱۹)

وید سننے پر دونوں کانوں میں سیسہ ڈال دو پڑھنے میں زبان کاٹ دو یاد کرنے پر دل کو چیر دو۔

یہ ہے وہ تعلیم ہندومت کی انسانیت کے بارے میں کہ تمام معاشرہ کو چار ذاتوں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ ہر ذات کے حقوق وفرائض متعین کر دیے ہیں ایک ذات والا دوسری ذات کے حلقہ میں شامل نہیں ہوسکتا شودر کے گھر جنم لینے والا شودر ہی رہے گا۔ شودر کو جو ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ سراسر انسانیت کے منافی ہے۔ جس سے شرف انسانیت کا مصفا آئینہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو بحیثیت انسان قابل احترام پیدا کیا ہے لیکن ہندوازم اس احترام آدمیت کو رسوائے آدمیت میں بدل دیتا ہے۔ اس طرح ہندو معاشرہ میں عورت کو مقام شرف انسانیت سے گرا کر قصر مذلت میں ڈال دیا گیا ہے۔

مذاہب عالم اور شرف انسانیت: دنیا میں سب سے بڑا مذہب عیسائیت ہے۔ عیسائیت کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان پیدائشی طور پر گناہ گار ہے آدم اور حوا نے جو گناہ کیا وہ وراثتاً ہر شخص کی فطرت میں چلا آ رہا ہے جس کی وجہ سے ہر شخص گناہ گار ہے۔

یہ عقیدہ شرف انسانیت کے منافی ہے۔

شرک' شرف انسانیت کی ضد ہے اور انسان کو پستی کی طرف لے جاتا ہے جب تمام مذاہب عالم پر سرسری نظر ڈالی جائے۔ تو تمام مذاہب میں ایک چیز مشترک کہ نظر آتی ہے وہ ہے شرک۔ ہندو مذہب عقیدہ تثلیث (تریموتی) یعنی تین خداؤں کے قائل ہیں۔ ان کے یہ تین دیوتا ہیں براہمہ۔ وشنو۔ شیو۔

بدھ مت والوں نے تین بدھستواؤں کو تسلیم کیا ہے ان کی پرستش کی جاتی ہے۔

میتریا۔ منجوسری۔ اولوکیسٹوار یہ سب سے زیادہ مکرم ومحترم بدھستوا ہے جس کی عبادت دور دراز علاقوں میں کی جاتی ہے (انسائیکلوپیڈیا مذاہب ص ۲۴۱)

مجوسیت دو خداؤں یعنی اہوز مزدا اور اہرمن کا تصور پیش کرتی ہے۔

عیسائیت تین خداؤں باپ بیٹا اور روح القدس کا تصور پایا جاتا ہے۔

یہ شرک شرف انسانیت کو آسمان کی بلندیوں سے نیچے گراتی ہے۔ اپنے سے کمتر کے سامنے سر جھکانا انسانی ذلت ہے۔

عیسائیت اور عورت

۱۔ عورتیں کلیسا کی مجلس میں نہ بولیں (۱۔ کرنتھیوں ۱۴/۳۴)

۲۔ عورتیں سر نہ گوندھیں۔ سنگار نہ کریں اور اچھے اور قیمتی کپڑے نہ پہنیں (پطرس ۳/۳ و تمیتھس ۲/۸-۱۰)

۳۔ مرد عورت کے لیے نہیں بلکہ عورت مرد کے لیے پیدا ہوئی۔ (کرنتھیوں ۱۱/۱۹)

۴۔ مرد کے لیے اچھا ہے کہ وہ عورت کو نہ چھوئے۔ (کرنتھیوں ۷/۱، ۸)

۵۔ شادی کرنے سے شادی نہ کرنا بہتر ہے۔ (کرنتھیوں ۷/۲۸، ۲۹، ۳۲ تا ۴۰)

یہودیت اور عورت: بائبل کی عبرانی زبان میں بیوی کو بعولہ (جائیداد منقولہ) کیا گیا ہے اور خاوند کو بعل یعنی مالک انسائیکلوپیڈیا ببلیکا نے ان دونوں لفظوں پر لکھا ہے۔ .The man is the owner, The woman is chattle

موسوی شریعت نے عورتوں کو مردوں کا ہمیشہ محکوم اور غلام بنایا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔

''خدا نے کہا میں تیرے درد حمل کو بڑھاؤں گا' تو درد کے ساتھ بچہ جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔

(پیدائش باب ۳)

شادی سے پہلے عورت اپنے باپ یا ولی کی ملکیت ہوتی تھی۔ اس وجہ سے لڑکی کو اغوا کرنے والا قانوناً لڑکی کے والد کو جرمانہ ادا کرتا تھا۔ چنانچہ خروج ۱۶:۲۲ میں لکھا ہے۔

''اگر کوئی ایک چھوکری کو جو اس کی منگیتر نہیں فریب دے کر اس سے مباشرت کرے وہ البتہ اس کی قیمت دے کر اس سے نکاح کرے اگر اس کا باپ راضی نہ ہو کہ اسے اس کو دے تو وہ کنواریوں کے اجر کے موافق اسے نقدی دے۔''

اس کی وضاحت کتاب استثناء ۲۲: ۲۸، ۲۹ میں کی گئی ہے۔

اگر کوئی آدمی کنواری لڑکی کو پاوے جو کسی کی منگیتر نہ ہو اور اسے پکڑ کے اس سے ہم بستر ہو اور وے پکڑے جاویں تو وہ مرد جو اس کے ساتھ ہم بستر ہوا۔ لڑکی کے باپ کو پچاس مثقال چاندی دے اور وہ اس کی جورو ہو کیونکہ اس نے اسے رسوا کیا اور اپنی زندگی بھر اسے طلاق نہ دے۔

ہندو دھرم اور عورت: ویدک دھرم نے عورت کو قعر مذلت میں گرا کر ان کے ہر قسم کے حقوق چھین لیے ہیں۔ چنانچہ رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۹۵ منتر ۱۵ میں لکھا ہے ''عورتوں کے ساتھ محبت نہیں ہوسکتی عورتوں کے دل فی الحقیقت بھیڑیوں کی بھٹ ہیں''

دوسری جگہ آتا ہے "اندر (آریوں کا ایشور) نے خود یہ کہا ہے کہ عورت کا دل استقلال سے خالی ہے اور وہ عقل کی رو سے نہایت ہلکی چیز ہے۔
(رگوید سوکت ۳۳ منتر ۱۷)

ان دو منتروں سے چار حکم مستنبط ہوتے ہیں۔
۱۔ کسی عورت سے مستقل محبت نہیں کی جا سکتی۔
۲۔ عورت دھوکے باز ہے۔
۳۔ ہر عورت کی عصمت مشتبہ ہے۔
۴۔ عورت کم عقل ہے۔

عورت کی معاشرتی حیثیت: عورت اور شودر دونوں کو نردھن (مال سے محروم) کہا گیا ہے (یجروید ادھیاء ۸) منتر ۵۔ منو ادھیاء ۸ شوک ۴۱۶ ادھیا ۹ شلوک ۱۹۹)

لڑکی باپ کی جائیداد کی وارث نہیں (اتھروید کانڈا سوکت ۱۷ منترا۔ یجروید ۵:۸۔ نرکت ۳:۴ منو ۹:۹۹)

عورت کا وجود صرف اس لیے ہے کہ بچے دیں، ان کی پرورش کریں اور ہر روز خانہ داری کے کام میں مصروف رہیں (منو نواں باب ۲۷)

اس وجہ سے ہندو شاستروں کا زور عورت کے فرائض پر ہے حقوق پر نہیں اس لیے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہندو سوسائٹی کی تشکیل میں عورت کا کوئی حصہ نہیں عورت کے پیدائش سے لے کر وفات تک تمام افعال زندگی مشکلات مصائب بلکہ زندگی کے معمولی مقتضیات کھانے پینے جاگنے سونے غسل کرنے باہر کے معمولی کاروبار میں مرد کے رحم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

ہندو دھرم میں عورت کو رفعت انسانیت سے گرانے والا عقیدہ نیوگ ہے۔ ہندو مذہبی ادب کی رو سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ عورت کا اولاد کے حصول کے لیے اپنے خاوند کے علاوہ کسی دوسرے سے جنسی تعلقات قائم کرنا۔

اسلام کا نظریہ: اسلام ہی ایک ایسا دین ہے۔ جس نے انسان کو ارفع مقام دیا ہے۔

قرآن اور سنت میں شرف انسانیت کا مثبت انداز میں تصور پایا جاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۷۰) اور یقیناً ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سواری دی اور ان کو اچھی چیزوں سے رزق دیا اور ہم نے ان کو بہتوں پر جنھیں ہم نے پیدا کیا۔ بڑی فضیلت دی۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (الاعراف ۷:۱۴۰) وہی ذات ہے جس نے تم کو تمام جہانوں پر فضیلت دی ہے۔

ایک اور مقام پر آتا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (التین ۴) یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا۔

احسن تقویم سے مراد صرف جسمانی ساخت کی فضیلت ہی مراد نہیں بلکہ امام راغب نے لکھا ہے یہاں صرف جسمانی ساخت کی عمدگی نہیں جس کے لحاظ سے وہ تمام جانداروں سے افضل ہے بلکہ اس میں عقل اور فہم کے علاوہ اخلاق فاضلہ اور تعلق باللہ بھی شامل ہیں۔ اور فی الحقیقت اخلاق کی طرف ہی یہاں خاص اشارہ ہے کیونکہ اخلاق فاضلہ سے ہی انسان بلند مقام پر پہنچتا ہے اور جب اس کے اخلاق گر جائیں تو دوسرے حیوانات سے بھی زیادہ ذلیل ہو جاتا ہے احسن تقویم پر وہی انسان قائم رہ سکتا ہے جو ماسوی اللہ کے اور کسی کے آگے اپنے آپ کو نہ جھکائے۔

ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ (البقرہ ۲:۳۴) اور جس وقت ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے سامنے سجدہ میں گر جاؤ پس سوائے ابلیس کے سب سجدے میں گر گئے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو مسجود ملائکہ قرار دے کر اس کے مقام کو بلند ظاہر کیا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے۔ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (لقمان ۳۱:۲۰) کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے (تمام چیزوں کو) جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے (تمھارے کام میں لگا دیا ہے) اس نے تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں)

یہ آیت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ دنیا کی تمام اشیاء انسان کی خادم ہیں اور اس کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔

احادیث: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ (مشکوۃ المصابیح کتاب الاداب ص ۳۹۷) اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی

صورت پر پیدا کیا۔

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اِذَا ضَرَبَ اَحَدُکُمْ خَادِمَهٗ فَلْیَتَّقِ الْوَجْهَ (امام بخاری الجامع الصحیح جلد ۲ کتاب العتق صفحہ ۳۵۷) جب تم میں سے کوئی اپنے خادم کو سزا دے تو چہرے پر نہ مارے۔

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَاتَلَ اَحَدُکُمْ اَخَاهُ فَلْیَجْتَنِبِ الْوَجْه (امام مسلم الجامع الصحیح کتاب البر والصلة ج ۸ ص ۳۱) جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی سے لڑے تو اس کے چہرے پر مارنے سے گریز کرے۔

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ لَا تَقُوْلَنَّ قَبَّحَ اللّٰهُ وَجْهَکَ...... فَاِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ (بخاری الادب المفرد باب لاتقل قبح اللہ وجھک ص ۱۰۷) حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ یہ کہنا نہیں چاہیے کہ اللہ تیرے چہرے کو خراب کرے کہ اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔

مذکورہ تمام احادیث انسانی عظمت کو بیان کیا ہے۔ خصوصاً چہرہ کی بے حرمتی سے منع کیا گیا ہے۔ چہرہ انسانی عظمت کی نشانی ہوتا ہے چہرے کی تعظیم انسان کی فضیلت کا سبب ہے اور انسان کی صورت کو خدائی صورت سے تشبیہ دراصل اس کی عظمت اور شرف کا اظہار ہے۔

تکریم انسانیت کے وجوہ: انسانی فضیلت کا حقیقی سبب اس کا مقام خلافت ہے۔ خلافت جانشینی یا نیابت کو کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا جانشین مقرر کیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرہ: ۳۰) کہ میں اس کو اپنا جانشین بنانے والا ہوں۔ یہی اس کی فضیلت کی دلیل ہے کہ دنیا میں کسی دوسری مخلوق کو جس میں فرشتے بھی شامل ہیں اپنا جانشین مقرر نہیں کیا۔ صرف انسان کو ہی یہ شرف حاصل ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذریعہ ہی اپنے احکام اور فرائض اس دنیا میں نافذ کرنے تھے۔ ان احکام الٰہی کا حامی ہونا ہی باعث عزت ہے۔ دنیا کی کوئی مخلوق خدا تعالیٰ کے احکام (فرائض) کی حامل نہیں ہے۔ ارشاد ربانی کی رو سے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام الٰہی کے بوجھ کو اٹھانے کے لیے کہا تو سب نے انکار کر دیا۔ مخلوقات خداوندی میں سے صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق تھی۔ جب احکام الٰہی (فرائض خداوندی) کے بوجھ اٹھانے کو کہا گیا تو اس نے اس بوجھ کو اٹھا لیا۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (الاحزاب: ۷۲) ہم نے امانت کو آسمان اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انھوں نے انکار کیا کہ اس کا بوجھ اٹھائیں اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کا بوجھ اٹھا لیا کیونکہ وہ بڑا "ظلوم" اور "جہول" ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات میں سے صرف انسان کو فضیلت اور شرف کی سند دی ہے کہ جب احکام الٰہی اور فرائض خداوندی کا بوجھ اٹھانے کو کہا تو سب نے انکار کر دیا صرف انسان نے اس امانت کو اٹھایا۔ اس کے بعد یہ فرمایا اس نے کیوں اٹھایا اس وجہ سے وہ ظلوم وجہول کے اوصاف سے متصف تھا۔ یہ دونوں الفاظ مقام مدح پر استعمال ہوئے ہیں۔ اس مقام میں اس کی یہی فضیلت پیش کی ہے کہ وہ ظلوم اور جہول ہے۔

ظلوم اور جہول کی وضاحت: ظلوم سے مراد یہ ہے کہ انسان ہی وہ مخلوق ہے جو اللہ کی رضا کے لیے ناقابل برداشت تلخیاں اور سختیاں اور طرح طرح کے دوزخوں کی جلق اور حرقت برداشت کر لیتا ہے۔ ظلومیت کی صفت جو مومن میں ہے یہی اس کو اللہ تعالیٰ کا پیارا بنا دیتی ہے اسی برکت سے مومن بڑے بڑے مراحل سلوک طے کر لیتا ہے اور خدا کا قرب پا لیتا ہے اور مکالمہ مخاطبہ کی نعمت سے نوازا جاتا ہے۔

جہول کے لفظ سے یہ مراد ہے کہ خدا کی رضا کی خاطر غیر اللہ سے اس قدر بے گانہ اور دور ہو جاتا ہے کہ غیر اللہ کے نقش اس کے دل و دماغ سے مٹ جاتے ہیں اور صرف اللہ کی صورت ہی اس کے دل پر مرتسم ہو جاتی ہے۔ بڑے بڑے محقق اور فضلاء نے جو اہل زبان تھے یہی معنے کیے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب فتوحات مکیہ ہیں۔ وہ اپنی کتاب تفسیر میں یہی معنی کرتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے زیر تفسیر آیت فَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا یہی معنی لکھے ہیں کہ یہ ظلوم و جہول مقام مدح میں ہیں اور صاحب تفسیر حسینی خواجہ محمد پارسا کی تفسیر سے نقل کرتے ہیں کہ آیت کے یہ معنی ہیں کہ انسان نے اس امانت کو اس لیے اٹھا لیا کہ وہ ظلوم تھا یعنی اس بات پر قادر تھا کہ اپنے نفس اور اس کی خواہشوں سے باہر آ جائے یعنی جذبات نفسانی کو کم بلکہ معدوم کر دے اور خدا کی ذات میں گم ہو جائے اور انسان جہول تھا اس لیے اس میں یہ قوت ہے کہ غیر حق سے بکلی غافل ہو جائے بقول لا الہ اللہ نفی ماسوا کر دے۔ ابن جریر اس آیت کی شرح میں لکھتا ہے کہ ظلوم اور جہول کا لفظ محل مدح میں ہے۔ نہ کہ مقام ذم میں۔

صفات الٰہیہ کا اظہار بذریعہ اخلاق و کردار: اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات ہیں جن کا اظہار ایک انسان اپنے اخلاق حسنہ کے ذریعہ کرتا ہے۔ انسان کے اخلاق فاضلہ دراصل صفات الٰہیہ کا عکس ہیں۔ اخلاق عالیہ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں "صبغة اللہ" کہا ہے۔ یعنی اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ اللہ تعالیٰ کا رنگ اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا اظہار اپنے اخلاق اور اعمال کے ذریعہ کرو اللہ تعالیٰ رب ہے اس نے تمام جہانوں کی ربوبیت کا سامان پیدا

کیا ہے۔ اس صفت کو انسان بھی اپنے عمل سے ظاہر کرے کہ وہ حتی المقدور انسانوں کی ربوبیت کا باعث بنے۔ اللہ تعالیٰ رحیم و رحمان ہے۔ انسان کو بھی ان صفات کا اظہار اپنے اعمال کے ذریعہ کرنا چاہیے اللہ تعالیٰ ستار غفار ہے انسان کو بھی اپنے اندر صفت ستاری اور غفاری پیدا کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کے اظہار کے لیے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ شروع کیا حقیقت میں یہی انسانوں میں وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے اللہ کی صفات کا اپنے اعمال کے ذریعہ اظہار کیا۔ سب سے بڑھ کر حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کا وجود ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے مظہر اتم تھے۔ اسی سبب سے انسان شرف اور تکریم کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ دنیا کی کوئی مخلوق خدا کی صفات کا اظہار نہیں کرتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس غرض کے لیے انسان کو پیدا کیا اور اس وجہ سے قابل تکریم قرار دیا ہے۔

علم: اللہ تعالیٰ نے انسان کو مسجود ملائکہ علم کی وجہ سے بنایا ہے سورہ بقرہ کے آغاز میں ہی ملائکہ پر انسان کی برتری اور فضیلت کی وجہ علم قرار دیا ہے۔ خدا کی تمام مخلوقات میں صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جس میں حصول علم کی استعداد ہے۔ پھر علم حاصل کرنے کی مختلف قوتیں اور استعدادیں عنایت کی ہیں مثلاً قوت بصرہ، قوت سمع، قوت گویائی، قوت فکریہ، پھر ان تمام قوتوں کو جلا دینے کے لیے وحی سے بھی نوازا ہے۔

اسلامی تہذیب

اسلامی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک روحانی اور دوسرا مادی۔ انسان کی شخصیت کی اس وقت تک تعمیر نہیں ہو سکتی۔ جب تک یہ دونوں پہلو نشوونما نہ پائیں۔ اسلام نے ان دونوں پہلو کی نشوونما کی تعلیم دی ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کی صحیح نشوونما سے ہی اسلامی تہذیب جنم لیتی ہے۔

اسلامی تہذیب پر بحث کرنے سے پہلے دو متداول الفاظ ثقافت اور تمدن کی وضاحت ضروری ہے چونکہ علم المعاشرت میں سویلائزیشن (تہذیب) کلچر (ثقافت و تمدن) کی اصطلاحیں عام مستعمل ہیں۔ عام بول چال میں ان اصطلاحوں کو ہم معنی ہی تصور کیا جاتا ہے لیکن خفیف فرق بھی ہے۔

ثقافت کا مفہوم: انگریزی کا لفظ کلچر (Culture) عربی کے لفظ ثقافت کا مترادف ہے۔ ثَقِفَ ، ثَقُفَ اور ثَقَافَةٌ کے معنی ہیں زیرکی دانائی اور کسی کام کے کرنے میں عقلمندی اور مہارت' ثقف وہ زیرک اور دانا حاذق ہوا۔ ثَقِفَ ، لَقِفَ ، ثَقُفَ اور ثَقِيفٌ زیرک' ذہین اور حاذق شخص کو کہتے ہیں۔

ثَقِفَ یعنی کسی نے کسی امر کو پالیا۔ کامیاب ہوا فتح مند ہوا۔ ثَقِيفٌ کامیاب اور فاتح شخص ثَقِفَ الْحَدِيْثَ یعنی بات تیزی سے سمجھ لی۔

ثقافت اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے نیزے سیدھے کیے جاتے ہیں۔

امام راغب اصفہانی اپنی کتاب مفردات القرآن میں لکھتے ہیں کہ کسی چیز کے بھانپ لینے اور کسی کام کے کرنے میں مہارت اور حذاقت کا نام ثَقِفَ ہے اس سے ثقافت کا لفظ مشتق ہے۔ جس کے معنی باہم شمشیر زنی کے ہیں رُمْحٌ مُثَقَّفٌ کے معنی ہیں۔ سیدھا کیا ہوا نیزہ اور جس آلہ سے نیزے کو سیدھا کیا جاتا ہے وہ ثقافت کہلاتا ہے۔

ثَقِفْتُ كَذَا کے معنی ہیں کہ میں نے دقت نظر سے کسی چیز کو تاڑ لیا' صاحب محیط کے نزدیک یہی لفظ گرفت اور غلبہ پانے کے معنی میں استعمال کیا جائے گا۔ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ (بقرہ ۲:۱۹۱) اور جہاں ان کو پاؤ مارو۔ فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ (الانفال ۸:۵۷) اگر تو ان کو لڑائی میں پائے مَلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلاً (الاحزاب ۳۳:۶۱) پھٹکارے ہوئے جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور قتل کیے جائیں گے۔

علامہ زمخشری اپنی کتاب ''اساس'' میں لکھتا ہے کہ مجازاً آداب سکھانے اور مہذب بنانے کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ وَلَوْ تَثْقِيْفُكَ وَلَوْ قَيْفُكَ لِمَا كُنْتُ شَيْئًا. یعنی اگر مجھے نہ سنوارتا اور باخبر نہ کرتا تو میں کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس طرح یوں بھی کہا جاتا ہے' هَلْ تهذبتُ وَتَثَقَّفْتُ اِلاَّ عَلٰى يَدِكَ. یعنی میں نے تجھ سے ہی ادب اور تہذیب سیکھی۔

راغب علی بیروتی اپنے رسالہ الثقافتہ میں لکھتا ہے۔ **الثقافة ا هی الا صلاح النفس الصحيح الكامل بحيثيت يكون صاحبها مراة الكمال والفضائل...... اصلاح الفساد و تقويم المعوج.** (الثقافتہ صفحہ ۱۹ مکتبہ اہلیہ بیروت)

یعنی ثقافت نام ہے نفس کی صحیح اور کامل اصلاح کا' اس طرح کہ مثقف آدمی کی ذات کمال اور فضائل کی آئینہ ہو...... فاسد کی اصلاح اور ٹیڑھے کو سیدھا کرنا ثقافت ہے۔

ارنلڈ اپنی کتاب (Culture and Anarchy) میں کلچر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

''کلچر انسان کو کامل بنانے کی بے لوث سعی ہے۔ کلچر کمال کی تحصیل ہے۔ (ترجمہ ثقافت و انتشار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ص ۱۶۱)

ٹی ایس ایلیٹ ثقافت کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''ثقافت آداب کی شائستگی کا نام ہے یعنی مدنیت اور انسانیت۔ (Note towards the Defination of Culture P. 13)

پھر اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

''ثقافت سے میری اولین مراد یہ ہے جسے ماہرین لسانیات بیان کرتے ہیں۔ یعنی ایک خاص مقام پر رہنے والے مخصوص افراد کا طرز حیات۔

(Note towards the Defination of Culture P.120)

محسن مہدی لکھتا ہے۔

''ثقافت نہ تو صلاحیت و استعداد کا نام ہے اور نہ ان خواہشات کا جو آدمی کی ذات کے اندر موجود ہیں بلکہ صحیح طور پر معاشرتی اور فنی تخلیقات کی عادی اور رسمی صورت کا نام ہے۔ (Ibn Khaldun`s Philosophy of History P.181)

فلپ بگ بی (Philip Bagby) لکھتا ہے۔

''ثقافت معاشرے کے افراد کے داخلی اور ابدی طرز عمل کی باقاعدگیوں کا نام ہے۔ اس میں وہ باقاعدگیاں بھی شامل ہیں جو صاف طور پر موروثی بنیاد رکھتی ہیں۔ (Culture and History) فیضی لکھتا ہے۔

کلچر کسی مخصوص زمانے یا ملک کے عام دانشورانہ معیار کا نام ہے۔ (Islamic Culture)

پروفیسر ہیری شپیرو (Harry Shapiro) نے اسے فقط اکتسابی طرز عمل کا نام دیا ہے۔ (ثقافت کا مسئلہ ترجمہ سیّد قاسم محمود)

ہاب ہاؤس (Hob House) کے نزدیک۔

ہر وہ شے جو افراد کے جذبات اور احساسات سے وجود میں آئے ثقافت ہے۔''

میلی نوسکی (Mali Nowski) کے نزدیک۔

''زندہ رہنے کے مجموعی سلیقے کا نام ثقافت ہے جو ہمہ قسم کے ذہنی معاشرتی اور مادی آلات پر مشتمل ہے۔''

گستاف کلائم (Gustave Clams) کے نزدیک رسوم و روایات اکتسابی طریق کار امن و جنگ کے دنوں میں شخصی اور اجتماعی زندگی مذہب' سائنس اور فنون کا ایک ایسا مجموعہ جو ماضی کا ورثہ ہے اور مستقبل کے لیے تجربہ بھی۔

(بینی ڈکٹ بحوالہ سیّد قاسم محمود قدیم تہذیب اور جدید انسان ص ۵۱۷ شیش محل کتاب گھر لاہور)

رابرٹ ریڈ فیلڈ (Robert Red Field) لکھتا ہے۔

''کسی انسانی گروہ کے علوم اور خود ساختہ فنون کا ایک ایسا مصالحتی نظام جو باقاعدگی سے رواں دواں ہو''

(Ogburn W.F. and Nimkoff M.F. Sociology P.50)

ڈاکٹر برہان الدین احمد فاروقی لکھتا ہے۔

یہ جرمن کے لفظ کلتور (Kulture) سے ماخوذ ہے' جس میں جوتنے بونے اور اگانے کا استعارہ پایا جاتا ہے' مگر جو کچھ جوتا جاتا ہے وہ زمین نہیں انفرادی اور اجتماعی ذہن ہے۔ جو کچھ بویا جاتا ہے وہ بیج نہیں تصورات ہیں اور جو کچھ اگایا جاتا ہے وہ اناج کی فصل نہیں بلکہ یکسا نئے کردار کا نمونہ ہے جس کی بدولت کسی گروہ میں وحدت کا شعور راسخ ہوتا ہے۔ (بحوالہ سیّد قاسم محمود ص ۵۱۸)

مذکورہ بالا تصریفات سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ثقافت (کلچر) کی اصطلاح کتنی مبہم ہے اور ہر ماہر فن نے ایک دوسرے سے مختلف تعریف کی ہے۔ قرآن مجید میں کلچر کا مترادف لفظ فلاح آیا ہے' جیسا کہ قرآن مجید کے آغاز میں اُولٰئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ کے الفاظ آئے ہیں فَلَحَ کے اصل معنی شق یعنی پھاڑنا ہیں۔ زمین پر ہل چلانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے' اس لیے کسان کو عربی زبان میں فلاح کہا جاتا ہے۔ فلاح کے معنی ظفر اور ادراک بغیہ ہیں (امام راغب) یعنی کامیابی اور مطلوب کو پالینا۔

یہی لغوی معنی کلچر کے ہیں۔ یعنی ہل چلانا' عام وسیع مفہوم میں انسانی اعمال کے ثمرات پر بولا جاتا ہے۔

پس قرآنی نقطہ نگاہ سے ثقافت سے مراد ان قوائے مضمرہ کا ظہور ہے جو اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ذرہ ذرہ میں ودیعت کر رکھے ہیں۔

جب انسان کی مخفی استعدادیں ظاہر ہو جائیں' اور کائنات کے ذرے ذرے کو اپنا تابع بنالیں' تب کلچر (ثقافت) اپنے نقطہ عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے قوائے مضمرہ اور مخفی استعدادوں کو نشوونما دینے کے لیے دو چیزیں عنایت کی ہیں' اول' وحی الٰہی' یہ وہ آسمانی پانی ہے جو دلوں کی مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے' اور انسان کی مخفی استعدادیں جاگ اٹھتی ہیں۔ دوم' عقل اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا کی ہے تاکہ اس کے ذریعے انسان اپنی مخفی استعدادوں کو بروئے کار لاسکے' گویا اسلامی نقطہ نگاہ سے ثقافت کا سرچشمہ وحی الٰہی اور عقل ہیں۔

بحث کا ماحصل: مذکورہ بالا بحث کا ماحصل یہ ہے کہ ثقافت سے مراد بڑے بڑے شہروں کا آباد کرنا۔ عالیشان عمارات کا تعمیر کرنا۔ چوڑی اور وسیع سڑکیں بنانا' موسیقی چنگ و رباب رقص و سرود کی محفلیں جمانا' یا عیش و عشرت کے سامان کا حصول نہیں ہے بلکہ ثقافت سے مراد مخفی استعدادوں کی نشوونما ہے' کیونکہ مخفی استعدادوں کی نشوونما میں ہی انسانی ترقی کا راز مضمر ہے۔ جس طرح کسی درخت کا ایک بیج ہوتا ہے۔ اس بیج میں ہی بالقوۃ پھل' پھول' شاخیں۔ پتے ٹہنیاں وغیرہ موجود ہوتے ہیں۔ جب اس بیج کو مناسب آب و ہوا اور زمین میسر آتی ہے' اسی بیج سے بالفعل پھل پھول' شاخیں' پتے اور ٹہنیاں نکل آتی ہیں' اس بیج کی زندگی ان مخفی استعدادوں کے ظہور سے ہے۔ اسی طرح انسان کی ترقی انسان کی مخفی استعدادوں کی نشوونما سے ہے' جب مخفی استعدادیں ظاہر ہوتی ہیں تو ثقافت کی تشکیل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

تمدن وتہذیب

<u>لفظ تمدن کی تشریح:</u> تمدن کا مادہ ''مدن'' ہے جس کے معنی جگہ' بستی اور شہر کے ہیں تمدن کے ٹھیک معنی ہیں آپس میں مل جل کر رہنا۔

اصطلاح میں تمدن کہتے ہیں آپس میں ملنے جلنے' رہنے سہنے کے قواعد وضوابط شخصی و جماعتی آزادی' شخصی و اجتماعی حقوق وفرائض بجالانے کے قوانین اور انسانی حقوق وفرائض ادا کرنے کے طریقے جو اخلاقی اصول پر منضبط ہوتے ہیں۔

تہذیب عام بول چال میں ثقافت اور تہذیب کے الفاظ ہم معنی اور مترادف سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن علمی اصطلاح میں دونوں میں نمایاں فرق ہے۔
عربی لغت میں تہذیب کے معنی ہیں۔

۱۔ کسی درخت' مضمون یا مسودہ وغیرہ کی کاٹ چھانٹ کرنا۔
۲۔ نقائص سے پاک صاف کرنا۔ ٹیڑھ پن نکال دینا یا اصلاح کرنا۔
۳۔ تعلیم دینا' رہنمائی کرنا۔
۴۔ کلچر۔
۵۔ تنقیح۔ (القاموس العصری)

عرب بولتے ہیں۔ ھَذَّبَہٗ' اَصْلَحَہٗ' اس کی تہذیب کی یعنی اس کی اصلاح کی۔ اسے درست کیا۔ سنوارا۔

لیکن اصطلاح میں تہذیب کا لفظ ہر چیز کی درستگی اور اصلاح پر بولا جاتا ہے۔ یعنی ارادہ اور نیت کی درستگی' خیالات و جذبات کی درستگی' عادات و اطوار کی درستگی' رسم و رواج کی درستگی' نظام معاشرت کی درستگی' سیاست مدن کی درستگی' اقتصادی اور معاشی امور یعنی لین دین' تجارت' زراعت' صنعت وحرفت کی درستگی' فنون لطیفہ کی درستگی' زبان اور ادب کی درستگی' روحانی اور فکری قوتوں کی درستگی غرض کہ زندگی کے تمام شعبوں میں درستگی اور اصلاح کرنا ''تہذیب'' ہے۔

سرسید تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے پرچہ کی پہلی اشاعت (۱۸۷۰ء) میں لکھتے ہیں۔

''اس پرچہ کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سولزیشن (Civilisation) یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے (سویلائزڈ) مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہوئے اور وہ بھی دنیا میں معزز اور مہذب قومیں کہلائیں۔''

سولزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی' اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور تمدن اور طریقہ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجے کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصل خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکین و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔'' (منقول از دبستان تاریخ اردو مصنفہ حامد حسن قادری کراچی ۱۹۶۶ء ص ۳۴۴)

تہذیب کی مزید تشریح کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں:۔

''جب ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے تو اکثر ان کی ضرورتیں اور ان کی حاجتیں ان کی غذائیں' اور ان کی پوشاکیں' ان کی معلومات اور ان کے خیالات ان کی مسرت کی باتیں اور ان کی نفرت کی چیزیں' سب یکساں ہوتی ہیں اور اسی لیے برائی اور اچھائی کے خیالات بھی یکساں ہوتے ہیں اور برائی کو اچھائی سے تبدیل کرنے کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے۔'' (مقالات سرسید جلد ۶ صفحہ ۳ لاہور ۱۹۶۲ء)

سرسید کے ان دونوں حوالوں سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ تہذیب کی روح اچھائی ہے۔

<u>ثقافت، تمدن اور تہذیب میں فرق:</u> انسانی زندگی دو پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ ایک مادی اور دوسرا روحانی' یہ دونوں پہلو اپنے اپنے مطالبات اور مقتضیات رکھتے ہیں' جب ایک انسان مادی زندگی کی ضروریات اور احتیاجات کے لیے کوشاں ہوتا ہے تو تمدن وجود میں آتا ہے اور جب انسان لطیف جذبات'

احساسات‘ ذہن اور روح کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ذرائع اور وسائل عمل میں لاتا ہے تو ثقافت وجود میں آتی ہے۔ مثلاً ایک فلسفی کے افکار‘ شاعر کے اشعار‘ موسیقار کے نغمات سب ایک انسان کے داخلی احساسات اور کیفیات کا آئینہ دار ہیں۔ گویا تمدن خارجی امور کا مظہر ہوتا ہے اور ثقافت باطنی کیفیات کا مظہر۔

الندوۃ العالمیہ للاسلامیات کے مقالہ نگاروں میں ایم۔ زیڈ صدیقی کلچر اور تمدن کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

”ثقافت کی اصطلاح فکری ارتقا پر دلالت کرتی ہے جب کہ تمدن معاشرتی ترقی کے بلند درجہ کو ظاہر کرتی ہے۔ لہٰذا ثقافت ذہنی کیفیت کو بیان کرتی ہے اور تمدن اس کے مادی مظہر کی نمائندگی کرتا ہے۔ پہلی کا تعلق فکری عمل سے ہے اور دوسرے کا مادی اکتسابات سے۔ پہلی ایک داخلی کیفیت ہے۔ جب کہ دوسرا خارجی دنیا میں اس کی عملیت کا نام ہے۔ (International Colloqium Pape P.26)

فیضی لکھتا ہے:۔

”کلچر باطنی روح کا نام ہے جب کہ تمدن خارجی مظہر ہے۔“ (Islamic Culture P.20)

خارجی مظاہر میں درستگی اور اصلاح تہذیب کہلاتی ہے۔ جس طرح ایک بیج سے پودا نکلتا ہے۔ اس پودے کی صحیح نشوونما کے لیے مالی اس پودے کی زائد ٹہنیاں اور خشک پتے کاٹ دیتا ہے۔ تا کہ پودا صحیح نشوونما پا سکے اور اس کی خوبصورتی بھی قائم رہے۔ اس طرح تمدن کے پودے کی صحیح نشوونما کے لیے خارجی مظاہر کی اصلاح اور درستگی کی جاتی ہے۔ یہی اصلاح درستگی اور تہذیب ہے۔

تہذیب کے عناصر ترکیبی

تہذیب اور اس کی حقیقی روح کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے عناصر ترکیبی کا جائزہ لیا جائے یہ عناصر پانچ ہیں۔

پہلا عنصر: کسی تہذیب کا پہلا عنصر یہ ہے کہ اس کا دنیوی زندگی کے متعلق کیا تصور ہے‘ وہ اس دنیا میں انسان کو کیا مقام دیتی ہے کائنات اور انسان کا باہمی کیا تعلق ہے۔

دوسرا عنصر: انسانی زندگی کا کیا مقصد ہے اور وہ کون سی منزل ہے جس کے لیے انسان کو کوشش کرنی چاہیے۔

تیسرا عنصر: اس تہذیب کی بنیاد کن عقائد اور افکار پر ہے وہ افکار اور عقائد انسانی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔

چوتھا عنصر: وہ تہذیب سوسائٹی کے افراد کو کن کن اخلاق کا حامل بنانا چاہتی ہے اور کن کن اخلاق سے بچنے کی ہدایت کرتی ہے۔

پانچواں عنصر: اس تہذیب کا اجتماعی نظام کیا ہے اجتماعی نظام ایک فرد کی زندگی سے لے کر بین الاقوامی زندگی پر پھیلا ہوا ہے۔

اسلامی تہذیب کی رُوح

اسلامی تہذیب کی روح توحید ہے۔ اسلام میں توحید کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات صفات اور اعمال میں ایک ماننا اور تمام خوبیوں کا جامع اور تمام عیوب سے مبرا تسلیم کرنا ہے‘ توحید کے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر مسئلہ توحید کو مختلف پیرایوں میں قرآن مجید میں بیشمار مقامات پر دہرایا ہے قرآن مجید کا کوئی صفحہ نہیں ہے جہاں اس مسئلہ پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ تمام علماء اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ توحید ہی تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلقہ قرآنی تعلیمات کا عمود ہے اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر ایک پوری صورت نازل ہوئی ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ. (اخلاص ۱۱۲:۱۔۴)

کہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ اس کا بیٹا ہے اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔

اس مختصر سی سورت میں توحید کے اثبات اور شرک کی نفی کے تمام دلائل دے دیے ہیں۔

توحید تین امور کو ظاہر کرتی ہے۔

اوّل: اللہ تعالیٰ اور انسان کا باہمی تعلق۔

دوم: انسانوں کا باہمی تعلق۔

سوم: انسان کا دوسری مخلوقات سے تعلق۔

امر اوّل: امر اوّل اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے اور اسی کی عبادت میں حقیقی خوشی محسوس کرے‘ اس

کے غیر کے تمام بتوں سے اپنے دل کو صاف رکھے۔ قرآن مجید نے اس تعلق کو مختلف رنگوں میں بیان کیا ہے ارشاد الٰہی ہے: يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ (البقرہ ۲:۲۱) لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (الفاتحہ ۱:۵) ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات ۵۱:۵۶) میں نے جن اور انس اس لیے پیدا کیے ہیں کہ وہ میری عبادت کریں۔

توحید کی ضد شرک ہے قرآن مجید نے اس کو بھی براہین قاطعہ سے باطل کیا ہے اور تمام گناہوں سے بدترین گناہ قرار دیا ہے ارشادِ الٰہی ہے: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان ۳۱:۱۳) شرک بڑا بھاری ظلم ہے۔

شرک کو اس وجہ سے بدترین گناہ قرار دیا ہے کہ وہ مانع تہذیب ہے جب انسان ماسوا اللہ کی پرستش کرتا ہے تو سب علمی تحقیقات کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیتا ہے۔

جب انسان حجر، شجر، شمس و قمر اور دیگر مخلوقات کو اپنا معبود اور مطلوب بنا لیتا ہے۔ تو ان کو مسخر کرنے اور ان سے خدمت لینے کی تمام راہیں مسدود کر لیتا ہے یہی وجہ ہے اسلام سے قبل مادی علوم میں کوئی ترقی نہ ہوئی اس وجہ سے اسلام نے شرک کی ہر قسم کو باطل قرار دیا ہے تا کہ یہ انسان ماسوا اللہ کی زنجیروں سے آزاد ہو کر تہذیب کے میدان میں ترقی کرے قرآن مجید نے شرک کی مختلف صورتوں کو سورۃ آل عمران کی آیت ۶۳ میں اکٹھا کر دیا ہے۔ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (ال عمران ۳:۶۴) کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

پس اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان تعلق عبودیت کا ہے۔ عبودیت یہ تقاضا کرتی ہے کہ انسان احکام الٰہی کی کامل فرمانبرداری کرے۔ جب ایک انسان اللہ تعالیٰ کا ہی حقیقی بندہ بن جاتا ہے تو انسان کی مخفی استعدادیں ترقی کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ نیکیوں سے محبت اور بدیوں سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل تمام عرب شرک میں مبتلا تھا جس کی وجہ سے ان میں ہر قسم کی برائی پائی جاتی تھی۔ جونہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توحید کا نعرہ بلند کیا، اور لوگوں نے ایمان لانا شروع کیا تو ان میں ایک روحانی انقلاب رونما ہو گیا وہی لوگ جو بتوں کی پوجا کرتے تھے اور ہر قسم کی برائیوں کی آلودگیوں میں ملوث تھے۔ وہی لوگ نیکی کے راستہ پر قدم مارنے لگے اور برائیوں سے نفرت کرنے لگے۔

امر دوم: توحید الٰہیہ نسل انسانی کے اتحاد کی متقاضی ہے۔ نسل انسانی کی وحدت پر جو توحید کا نتیجہ ہے۔ قرآن مجید نے بہت زور دیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (یونس ۱۰:) سب لوگ ایک ہی قوم ہیں۔ پھر فرمایا: وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّا اُمَّةً وَّاحِدَةً (یونس ۱۰:۱۹) سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں۔

امر سوم: توحید انسان کو یہ سبق دیتی ہے کہ وہ کائنات کو اپنا خادم سمجھے یہی وہ تصور ہے جس نے مادی ترقی کے راستے کھولے ہیں ایک وقت تھا جب دنیا نے کائنات اور اس کے عناصر کو اپنا معبود سمجھا تھا۔ اس عناصر پرستی کی وجہ سے انسان کے دل میں یہ کبھی بھی خیال نہیں آ سکتا تھا کہ کائنات اور اس کے عناصر اس کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ جب تک کائنات اور اس کے عناصر معبود اور مطلوب بنے رہے تو انسان نے ان کے متعلق کسی قسم کی تحقیق نہیں کی۔ جب اسلام نے توحید کا پیغام سنایا۔ عناصر کی پرستش کی زنجیروں سے نجات دلائی اور یہ سبق دیا۔ سورج چاند، ستارے، دریا، سمندر، آگ، ہوا، پانی، غرض کہ یہ دنیا کی ہر چیز تمہاری خادم ہے اور تم ان کے مخدوم۔ تب انسان نے ان کو مسخر کرنے کی طرف توجہ کی۔ سائنس کے شعبہ میں تحقیقات کے دروازے کھلے۔ یہ امر واقع ہے کہ اسلام کے آنے سے ہی علوم جدیدہ اور سائنس کی ترقی ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً (لقمان ۳۱:۲۰) کیا تم نے غور نہیں کرتے کہ اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں کو پورا کیا ہے۔

پس قرآنی توحید نے ہی انسان کو علمی تحقیق کی طرف توجہ دلائی ہے اگر حکماء کی آراء و افکار کا جائزہ لیا جائے تو یہی تین امور جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے سامنے آتے ہیں۔ جن کو حکماء نے اصول تہذیب ٹھہرایا ہے۔

مشہور فلاسفر کانٹ Kant نے یہ تسلیم کیا ہے کہ "تہذیب انسانی اس وقت کمال کو پہنچے گی۔ جب انسان خدا کی وحدانیت کو تسلیم کرے۔ (تمدن اسلام حصہ اوّل مصنفہ خواجہ کمال الدین)

تہذیب اسلامی کی خصوصیات

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اسلامی تہذیب کی روح توحید ہے جو بھی تہذیب اسلامی کی خصوصیات بیان ہوں گی وہ دراصل توحید کے ہی ثمرات ہیں جو تہذیب اسلامی کے شجر کو لگتے ہیں۔

عظمت انسان: اسلامی تہذیب کا درخشندہ پہلو عظمت انسان ہے یہ وہ پہلو ہے جو دنیا کی کسی تہذیب میں نہیں پایا جاتا۔ ہندوؤں نے ذات پات کے مسئلے سے انسانوں کو عظمت کے لحاظ سے تقسیم کر دیا ہے۔ شودر بقیہ تین ذاتوں کی خدمت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ہندو تہذیب میں شودر کی حیثیت ایک گری پڑی شے سے زیادہ نہیں۔ عیسائیت نے تو انسان کو پیدائشی گنہگار قرار دے کر ذلت کا طوق اس کی گردن میں پہنا دیا ہے۔

اسلام نے جو عظمت انسان کا تصور دیا ہے وہ دنیا کی کسی تہذیب میں نہیں ملتا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۷۰) اور ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سواری دی اور ان کو اچھی چیزوں سے رزق دیا اور ہم نے ان کو بہتوں پر جنھیں ہم نے پیدا کیا ہے بڑی فضیلت دی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (الاعراف ۷:۱۴۰) اور اس نے تم کو مخلوقات پر فضیلت دی ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (التین ۹۵:۴) یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ (البقرہ ۲:۳۴) اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو تو انھوں نے فرمانبرداری کی سوائے ابلیس کے۔

اللہ نے انسان کو اس دنیا میں اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے تاکہ اس کی صفات کا کلی طور پر اظہار کرے خدا کا نائب ہونے کا تصور دنیا کی کسی کتاب نے نہیں دیا۔ خدا کی نیابت میں انسان کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (البقرہ ۲:۳۰) اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ (مشکوٰۃ المصابیح کتاب الاداب ص ۳۹۷) اللہ نے آدم کو بہترین صورت پر پیدا کیا ہے۔ اسلام نے انسان کی اس عظمت کی وجہ سے یہ تعلیم دی ہے کہ ہر انسان ایک دوسرے کی عزت و تکریم کرے اور محبت سے پیش آئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عَيَالِهٖ (بیہقی کتاب الایمان) ساری مخلوق عیال اللہ ہے اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو اللہ کی مخلوق سے سب سے زیادہ بھلائی کرتا ہے۔

ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلام کیا ہے اَلتَّعْظِيْمُ لِاَمْرِ اللّٰهِ وَالشَّفْقَةُ عَلٰى عَيَالِ اللّٰهِ (بیہقی کتاب الایمان) اللہ کے احکام کی تعظیم کرو اور اللہ کی مخلوق سے محبت رکھو۔

مساوات: اسلامی تہذیب مساوات کا سبق دیتی ہے اور مسئلہ ذات پات کو جڑ سے کاٹتی ہے۔ پامال شدہ لوگوں کو اٹھا کر بڑوں کے دوش بدوش کھڑا کرتی ہے۔ اس تہذیب کا عملی سبق نماز اور حج کے موقع پر ملتا ہے۔ مسجد میں پانچ دفعہ نماز کے وقت لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور ایک امام کے پیچھے امیر غریب، شاہ و گدا، چھوٹا بڑا صف باندھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہر قسم کے امتیازات مٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح حج کے موقع پر دنیا کے ہر کونے سے مسلمان مکہ میں جمع ہوتے ہیں اور ایک ہی لباس میں ملبوس ہو کر مناسک حج ادا کرتے ہیں۔ گورے کالے کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ غریب اور امیر کی تقسیم ختم ہو جاتی ہے ہر قسم کا طبقہ بغیر کسی امتیاز کے مناسک حج ادا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مساوات کا اس قسم کا نظارہ دنیا کے کسی اجتماع میں نظر نہیں آتا۔

قرآن مجید میں مساوات انسانی کا سبق ان الفاظ میں دیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (الحجرات ۴۹:۱۳) اے لوگو! ہم نے تمھیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے اللہ جاننے والا اخبردار ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ دیا۔ جس میں اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا: اَيُّهَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى (مسند احمد) لوگو! ہاں بیشک تمہارا رب ایک ہے اور بیشک تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

اسلام نے سب سے پہلے دنیا میں مساوات کا زریں سبق دیا۔ اسی سبق سے رنگ نسل اور قوم کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ دنیا میں حقیقی تہذیب قائم ہونے میں یہی تفریقات روک بنے ہوئے ہیں۔ اگر یہ تفریقات مٹ جائیں تو حقیقی تہذیب دنیا میں قائم ہو سکتی ہے۔

اخوت اور اتحاد: اسلام ہی وہ دین ہے جس نے وحدت انسانی کی تعلیم دی ہے۔ اسلام سے قبل انسانیت ملکی، قومی، لونی، لسانی، نسبی تعصبات اور تفریقات میں

بٹی ہوئی تھی۔ ہر قوم دوسری قوم کو اپنا دشمن تصور کرتی تھی اور ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی تھی۔ اسلام نے یہ نعرہ بلند کیا کہ کل روئے زمین کے انسان ایک ہی اصل سے ہیں اس نعرہ نے تعصبات اور تفریقات کی زنجیروں کو کاٹا۔ اتحاد اور اخوت کی لڑی میں منسلک کر دیا۔

ارشادِ الٰہی ہے: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً (النساء۴:۱) اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو۔ جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس۱۰:۱۹) اور سب لوگ ایک ہی گروہ کے ہیں سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات ۴۹:۱۰) مومن بھائی بھائی ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَیْءٍ اِنِّیْ اَشْهَدُ اِنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ اِخْوَةٌ (مسند احمد، ابو داود) اے اللہ ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار میں گواہی دیتا ہوں کہ سب انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ تَرَى الْمُؤْمِنِیْنَ فِیْ تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَكٰى عُضْوٌ تَدَاعٰى لَهُمْ سَائِرُ جَسَدِهٖ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى (بخاری کتاب الادب) تو اللہ پر ایمان رکھنے والوں کو ایک دوسرے سے رحم اور محبت اور مہربانی میں ایسا دیکھے گا جیسا بدن میں ایک عضو بیمار ہو جائے تو سارے اعضا بخار اور بیماری میں اس کے شریک ہو جاتے ہیں۔

اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضًا ثُمَّ شَبَّكَ بَيْنَ اَصَابِعِهٖ (بخاری کتاب الادب) ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایسا ہے جیسا کہ عمارت کا ایک جزو دوسرے جزو کو قوت دیتا ہے۔ پھر اپنی انگلیوں کو ملا کر مثال بتائی۔

رواداری: اسلامی تہذیب کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ مذہبی رواداری کی علمبردار ہے۔ وہ ہر ایک سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہر مذہبی کتاب اور ہر پیغمبر کو مانا جائے اور ان کے درمیان کسی قسم کی تفریق نہ کی جائے ارشادِ الٰہی ہے۔ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (البقرہ۲:۱۷۷) جو اللہ اور آخرت کے دن اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (ال عمران۳:۸۴) کہہ کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہم پر اتارا گیا اور اس پر جو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا ہم ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ۲:۲۸۵) رسولؐ اس پر ایمان لایا جو اس کے رب سے اس کی طرف اتارا گیا اور مومن بھی سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں 'ہم اس کے رسولوں میں سے کسی میں کچھ تفرقہ نہیں کرتے۔

اسلام اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ قوت اور طاقت سے دین کی اشاعت کی جائے اور لوگوں کو جبراً دین منوایا جائے۔ دین کا اختیار کرنا لوگوں کی رضا ورغبت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اسلام محض مذہبی اختلاف کی بناء پر ایک دوسرے کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ارشادِ الٰہی ہے: لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّيْنِ (البقرہ ۲:۲۵۶) کہ دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (یونس۱۰:۹۹) کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن بن جائیں۔

اسلام تمام ادیان کی عبادت گاہوں کو قابلِ احترام سمجھتا ہے اور ان کی حفاظت اور مدافعت کی تعلیم دیتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (الحج ۲۲:۴۰) اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے نہ ہٹاتا رہتا تو یقیناً راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے گرا دی جاتیں۔ اسلامی تہذیب صرف جبر نہ کرنے اور دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت کرنے ہی کی تعلیم نہیں دیتی بلکہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے باطل عقائد کی بناء پر سب وشتم کی بھی اجازت نہیں دیتی' ارشادِ الٰہی ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام ۶:۱۰۹) اور ان لوگوں کو گالی نہ دو جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ زیادتی کر کے بے علمی سے اللہ کو گالی دیں۔

اسلام محض مذہبی اختلاف کی وجہ سے دوسروں سے نیکی اور صلہ رحمی سے نہیں روکتا' اسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ مسطح جو حضرت ابوبکرؓ کی خالہ یا ہمشیرہ کا بیٹا تھا تشہیر افک میں ملوث تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اس کی مالی امداد کیا کرتے تھے۔ افک میں ملوث ہونے کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ نے امداد کرنا چھوڑ دی' اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلاَ یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْا اُولِی الْقُرْبٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَالْمُھٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا (النور۲۴:۲۲) اورتم میں سے بزرگی اور وسعت والے یہ قسم نہ کھائیں کہ وہ غریبوں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہیں دیں گے اور چاہیے کہ معاف کریں اور درگزر کریں۔

آزادی: انسان فطرتاً آزادی کا خواہشمند ہے اور اگر کوئی فرد غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو تو اس کی روح آزادی کے لیے تڑپتی ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ جب کوئی قوم غلام بن جاتی ہے تو وہ قوم اپنی طبعی خواہش کی وجہ سے از سر نو آزادی کا سانس لینے کے لیے تگ و دو کرنا شروع کر دیتی ہے۔ دنیا کی اکثر جنگیں حصولِ آزادی کے لیے لڑی گئی ہیں۔ انسان کے اس طبعی تقاضے کی وجہ سے اسلامی تہذیب حریت کا پیغام دیتی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: فَلاَ اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَةُ فَکُّ رَقَبَةٍ (البلد۹۰:۱۱:۱۳) سو وہ اونچی گھاٹی پر چڑھنے کی ہمت نہیں کرتا اور تجھے کیا خبر کہ اونچی گھاٹی کیا ہے کسی گردن کا آزاد کرنا' ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ انسان تہذیب وتمدن کی ارفع گھاٹی پر نہیں چڑھ سکتا۔ جب تک غلاموں کی آزادی کے لیے جدوجہد نہیں کرتا۔ حقیقی تہذیب اس وقت دنیا میں قائم ہوگی جب ہر فرد آزادی کی دولت سے متمتع ہوگا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: شَرَارُ النَّاسِ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ النَّاسَ وَ یَبِیْعُوْنَھُمْ (ترمذی' کنوز الحقائق) برے لوگ وہ ہیں جو انسان کی خرید وفروخت کرتے ہیں۔

اِنَّ مِنْ شَرَارِ النَّاسِ الَّذِیْنَ یَبِیْعُوْنَ النَّاسَ (بخاری) بہت برے وہ لوگ ہیں جو آدمیوں کو فروخت کرتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے اپنے ایک گورنر کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مُذْکَمْ تَعَبَّدْتُمُ النَّاسَ وَقَدْ وَلَدَتْھُمْ اُمَّھَاتُھُمْ اَحْرَارًا (حسن المحاضرہ جلد۲ صفحہ۱) تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنا لیا حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا ہے۔

امن عالم: اسلامی تہذیب امن عالم کی زبردست حامی ہے جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے' اسلامی تہذیب کا بنیادی پتھر توحید ہے' عقیدہ توحید نفرت اور دشمنی کو ختم کرتا ہے' ہر قسم کے تعصبات کو مٹا دیتا ہے۔ انسانی عظمت' مساوات' اتحاد اخوت' مذہبی رواداری اور آزادی کو برقرار رکھتا ہے' جب دنیا میں دشمنی ختم ہو جائے اور اس کی جگہ اخوت لے لے تو دنیا میں حقیقی امن قائم ہو سکتا ہے' یہی دو اصول اسلامی تہذیب کے ہیں۔ ایک طرف دنیا سے دشمنی کو ختم کرتی ہے تو دوسری طرف انسانی عظمت اور اخوت کو فروغ دیتی ہے۔ اس طرح امن عالم کے لیے راستہ ہموار کرتی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرا مسلمان امن میں رہے۔ رسول کریمؐ کی اس تعریف کے مطابق مسلمان اسلامی تہذیب کا نمونہ ہوتا ہے جس کے قول اور فعل سے نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں ہو سکتا۔

اعتدال اور میانہ روی: اسلامی تہذیب زندگی کے ہر شعبہ میں اعتدال پسندی کی تعلیم دیتی ہے اور افراط اور تفریط سے روکتی ہے قرآن مجید میں آتا ہے: وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (البقرہ۲:۱۴۴) اور اسی طرح ہم نے تم کو امت وسطی بنایا۔ امت وسطی سے مراد ایسا گروہ ہے جو افراط اور تفریط سے پاک ہو۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلاً (بنی اسرائیل ۱۷:۱۱۰) اور درمیان کی راہ اختیار کرو۔

نماز اسلام کی ایک عبادت ہے جس کو دین کا ستون کہا گیا ہے۔ اس میں بھی اعتدال سے کام لینے کی تعلیم دی گئی ہے' حضرت عثمان بن مظعونؓ نے جب راتیں نماز اور دن روزہ میں بسر کرنا شروع کیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو روک دیا اور فرمایا تم پر اور بھی حقوق ہیں جن کو ادا کرنا ضروری ہے' حد سے زیادہ بڑھنے والوں کے متعلق فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰہَ لاَ یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (بقر:۱۹۰) اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

صدقہ و خیرات بھی اسلامی عبادات کا اہم جز ہے' اس میں بھی اعتدال سے کام لینے کا حکم ہے ارشاد الٰہی ہے: وَلاَ تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَةً اِلٰی عُنُقِکَ وَلاَ تَبْسُطْھَا کُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَحْسُوْرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۲۹) اور اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اسے حد سے زیادہ کھول' ورنہ تو ملامت کیا ہوا اور ماندہ ہو کر بیٹھ رہے گا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: مَاعَالَ مَنِ اقْتَصَدَ. جس نے میانہ روی اختیار کی وہ محتاج نہ ہوا۔

دین اور دنیا کا امتزاج: اسلامی تہذیب دین اور دنیا کا حسین امتزاج ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (البقرہ۲:۲۰۱) اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت پر بھی اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

اسلامی تہذیب دین کو سیاست سے جدا نہیں کر سکتی اور ایک ایسا نظام سلطنت وضع کرتی ہے جس کی بنیاد دین پر ہوتی ہے۔

عدل و انصاف: اسلامی تہذیب عدل و انصاف پر بہت زور دیتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (النحل ۱۶:۹۰) اللہ تمھیں عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے۔ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (الانعام ۶:۱۵۲) اور جب تم بات کہو تو عدل کرو اگرچہ قریبی ہو۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (المائدہ ۵:۸) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کے لیے کھڑے ہونے والے انصاف کی گواہی دینے والے ہو جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو۔ یہ تقویٰ سے قریب تر ہے اللہ کا تقویٰ کرو۔ اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن جب خدا کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا۔ سات شخصوں کو خدا اپنے سایہ میں لے گا جن میں سے ایک شخص امام عادل ہوگا۔ (بخاری)

ایک مرتبہ قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی شہادتوں سے جرم ثابت ہوگیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ صحابہ کرامؓ نے حضرت اسامہؓ کو سفارش کے لیے بھیجا۔ جب حضرت اسامہؓ نے اپنے مدعا کا اظہار کیا تو آپ غصہ میں آ کر بولے تم سے پہلی قومیں اسی لیے تباہ ہوئیں۔ کہ ان کا بڑا آدمی قصور کرتا تھا تو اس سے درگزر کرتی تھیں لیکن اگر چھوٹے آدمی سے کوئی قصور سرزد ہوتا تھا تو اسے سخت سزا دیتی تھیں۔ تم فاطمہ مخزومیہ کی سفارش کر رہے ہو۔ خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس جرم کی پاداش میں اس کے ہاتھ کاٹ ڈالتا۔

اخلاقی اصول: اسلامی تہذیب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے پورے نظام میں اخلاقی اصولوں کو جگہ دی۔ برائی کا سرچشمہ دل ہے۔ دل میں برے خیالات جنم لیتے ہیں۔ پھر وہ جوارح کے ذریعے عمل جامہ پہنتے ہیں۔ قرآن مجید میں برے خیالات سے پاک رکھنے کے متعلق آتا ہے: وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ (البقرہ ۲:۲۸۴) اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے یا اسے چھپاؤ اللہ اس کا حساب لے گا۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ (الانعام ۶:۱۲۰) اور کھلے اور چھپے گناہ کو چھوڑ دو۔

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (الانعام ۶:۱۵۱) بے حیائی کی باتوں کے قریب مت جاؤ جو ان میں سے ظاہر ہوں اور چھپی ہوئی ہوں۔

اعضا کو برائیوں کی آگ سے بچانے کے لیے قرآن مجید میں آتا ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ (مائدہ ۵:۱۰۵) اے لوگو! جو ایمان لائے اپنے نفسوں کی برائی کی آگ سے حفاظت کرو۔

کسی تہذیب کا درخت برگ و بار نہیں لا سکتا۔ جب تک اس درخت کو اخلاق کا پانی نہ دیا جائے۔ جب کسی تہذیب میں بداخلاقی اور بدکرداری جگہ لے لیتی ہے تو وہ تہذیب مٹنا شروع ہو جاتی ہے۔ دنیا میں جتنی تہذیبیں گزر چکی ہیں اگر ان کے مٹنے کی وجہ معلوم کریں تو یہ وجہ نمایاں ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ ان تہذیبوں میں بداخلاقی نے جگہ لے لی تھی۔

عالمگیریت: اسلامی تہذیب عالمگیر تہذیب ہے' اس کے بنیادی اصول تمام نسل انسانی کے لیے ہیں۔ اسلام سے قبل کسی مذہب نے بھی عالمگیر تہذیب کی بنیاد نہیں ڈالی۔ ہندوؤں کا یہ ایمان ہے کہ برہما صرف ان کی قوم کا خدا ہے اور وہی اس کی چہیتی قوم ہے' ہندوستان سے باہر جتنی قومیں بستی ہیں وہ سب کی سب ناپاک ہیں ان کے چھو جانے سے ان کی ہر چیز ناپاک ہو جاتی ہے' غیر ہندو ہندوؤں کے برتن کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ ہندو قوم صرف غیر ملک کے رہنے والوں سے ہی نفرت نہیں کرتے بلکہ ہندوستان میں دس کروڑ اچھوت رہ رہے ہیں ان کو بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں یہودی قوم کا بھی یہ نظریہ ہے' یہووہ صرف ان کا ہی خدا ہے اور وہ اس کی محبوب ترین قوم ہیں۔ نجات صرف یہودیوں کے لیے ہے۔

قرآن مجید نے ان کے تعصبات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ ۵:۱۸) یعنی ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ دوسری جگہ آتا ہے: وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ (آل عمران ۳:۷۳) صرف اسی شخص پر ایمان لاؤ جو تمھارے دین کا پیروکار ہے' جو تمھارے دین کے سوا اور کوئی عقیدہ رکھتا ہو اس کی بات پر کان نہ دھرو اور آسمانی کتب انھی کے لیے نازل ہوئی ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر ہیں۔ انھوں نے تو صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میں بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا (متی ۲۴/۱۵) اپنے شاگردوں کو یہ نصیحت فرمائی کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا (متی باب ۱۰ص ۵) فرمایا ''نجات صرف یہودیوں کے لیے ہے'' (یوحنا ۲۲/۴)

پس ہندو' یہودی اور عیسائی تہذیب صرف قومی تہذیب ہے۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے ایک عالمگیر تہذیب کی بنیاد ڈالی فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یعنی اسلام کا خدا صرف مسلمانوں کا ہی خدا نہیں بلکہ تمام دنیا کی اقوام کا پروردگار ہے: رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا

هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلاً (مزمل ۷۳:۹) یعنی اسلام کا خدا اہل مشرق کی تربیت ونشوونما کرتا ہے اور اہل مغرب کا پروردگار ہے' اس کے سوا کوئی اور دوسرا خالق اور ربوبیت کرنے والا نہیں۔ اسی کو اپنا کارساز بنانا چاہیے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: هُدًى لِّلنَّاسِ (بقرہ ۲:۱۸۵) یعنی تمام روئے زمین کے لوگوں کے لیے ہدایت ہے: ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِيْنَ (القلم ۶۸:۵۲) یعنی تمام جہانوں کے لیے نصیحت۔

رسول کریمؐ کے متعلق ارشاد ہے: رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ یعنی تمام جہانوں کے لیے رحمت کا پیغام لے کر آئے ہیں۔
غرضیکہ اسلام ہی ایک ایسی عالمگیر تہذیب کی بنیاد ڈالتا ہے جس کے اندر شانِ عالمگیریت پائی جاتی ہے۔

مادی تہذیب کی اساس

مادی تہذیب کی اساس اجتماعی مفادات کی تکمیل ہے۔ فرد صرف انہی کاموں میں دلچسپی لیتا ہے جو اجتماعیت کے لیے سود مند ہوں۔ خواہ وہ کام اخلاقی پہلو سے کتنے ہی گرے ہوئے ہوں۔ قومی مفاد کی خاطر جھوٹ بولنا جائز' دوسروں پر جور وستم ڈھانے جائز' قتل کرنا جائز گویا مادی تہذیب میں نیکی اور بدی کے پیمانے اجتماعی مفادات کے تناظر میں بدلتے رہتے ہیں۔ نیکی ان کے نزدیک وہ عمل نہیں جس کو اللہ پسند کرتا ہے بلکہ نیکی وہ ہوگی جو اجتماعی نقطہ نگاہ سے مفید ہو۔

مغربی تہذیب (جو مادی تہذیب ہے) کی مثال ہمارے سامنے ہے اس نے اپنے مفادات کی خاطر کس طرح کمزور ممالک پر ظلم وستم کیے ہیں۔ اس تہذیب کی قیادت امریکہ کر رہا ہے۔ ہلاکت خیز اسلحہ سے اپنے گودام بھر رہا ہے لیکن کسی غریب مسلمان ملک کو یہ اجازت نہیں کہ وہ اپنے دفاع کے لیے اپنے ایٹمی پروگرام کو ترقی دے سکے۔ یا اپنی معاشی ترقی کے لیے اپنے وسائل استعمال میں لا سکے۔ اگر کوئی ملک امریکہ کے حکم کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتا تو تمام سفارتی اور ریاستی آداب کو پس پشت ڈال کر اس ملک کے قوم پرست قائد کو عبرت ناک سزا کی دھمکی دی جاتی ہے۔ پھر اس دھمکی کو عملی شکل بھی دے دی جاتی ہے۔ امریکہ عراق کے صدر صدام[1]' لیبیا کے صدر قذافی یا ایران کے خلاف کیوں ہے۔ یہ ممالک صرف اپنا دفاع مضبوط بنانا چاہتے ہیں۔ اب جائزہ لیجیے کہ کسی اسلامی ملک کا ایٹمی پروگرام امریکہ کو اس لیے ناپسند ہے کہ امریکہ کے اجتماعی مفاد کے خلاف ہے۔ امریکہ اپنے تمام ظلم وستم کو اپنے اجتماعی مفاد کی خاطر عین نیکی خیال کرتا ہے اسی میں اپنی ترقی کا راز سمجھتا ہے۔ حال میں افغانستان کی ہلاکت خیز بمباری سے اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس میں بھی امریکہ کے اجتماعی مفادات شامل تھے۔ ایران' چین' پاکستان' وسط ایشیائی ریاستوں کے سر پر امریکی فوجوں کو بٹھانا بحر ہند میں امریکی بحری بیڑوں کی یلغار وسط ایشیا کے تجارتی راستہ پر قبضہ چین کی نگرانی اور پاکستان کے ایٹمی تنصیبات کو نشانہ بنانا وغیرہ شامل ہے۔

اسرائیل اور بھارت دہشت گردی کی آخری حدود کو پھاند چکا ہے۔ بھارت کشمیر پر اقوام متحدہ کی تمام قراردادوں کو پاؤں میں روندتے ہوئے قابض ہے اور بھارتی فوج کشمیریوں کی جنگ آزادی کو قوت سے کچل رہی ہے تقریباً ۸۰ ہزار مسلم کشمیریوں کو شہید کر چکی ہے امریکہ کو اپنے اجتماعی مفاد کی خاطر ان مظالم پر نظر نہیں۔ نہ بھارت کو اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل کرنے پر مجبور کرتا ہے کیونکہ وہ ایک ارب آبادی کا ملک ہے۔ امریکہ کے بھارت کے ساتھ اقتصادی اور سیاسی مفادات وابستہ ہیں۔ اس کا غیظ وغضب پاکستان اور آزاد کشمیر کی جہادی تنظیموں پر ہے کہ وہ مظلوم کشمیریوں کے کیوں معاون و مددگار ہیں۔ اس ضمن میں امریکہ پاکستانی حکومت کو گرم سرد الفاظ میں دھمکی دے چکا ہے کہ ان تنظیموں کے کیمپس ختم ہونے چاہئیں۔

فلسطینی مسلسل اسرائیل کے مظالم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ امریکہ اسرائیل کی پشت پر کھڑا ہے۔

اسی طرح اگر مغربی تہذیب کے حامل ممالک کی اقتصادی پالیسی کا جائزہ لیا جائے تو باطل طریقے سے حصول دولت کی مثالیں سامنے آ جائیں گی اور اپنے باطل ذرائع کو جائز قرار دیا جا رہا ہے۔ گویا مادی تہذیب کی اساس خود غرضی اور مفاد پرستی پر ہے۔ اس وجہ سے دنیا میں ظلم وستم کا دور دورہ ہے اور کہیں امن کی کرن دکھائی نہیں دیتی۔ امریکہ اور اس کے اتحادی طاقت کے نشہ میں مخمور ہر باعزت مسلمان ملک کو دھمکی پر دھمکی دیتے چلے جا رہے ہیں۔ کہیں ایران کو آنکھیں دکھائی جا رہی ہیں اور کہیں شام دھمکیوں کی زد میں ہے۔[1]

---

[1] امریکہ نے پہلے روس کی سلطنت سے آزادی حاصل کرنے والی نئی اسلامی ریاستوں کے زمینی ذخائر کے حصول کے لیے افغانستان پر حملہ کیا۔ طالبان کی حکومت کو ختم کیا اور ملک پر اتنی بم باری کی گئی کہ پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو گئے۔ آبادیاں تباہ ہو گئیں۔ لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ اس کے بعد عراق کے تیل پر قبضہ کرنے کی خاطر بیہودہ مفروضات کو بنیاد بنا کر حملہ کر کے عراق کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ اس طرح صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے لیے مقام فکر ہے۔

اسلام کا معاشرتی نظام

معاشرتی ادارے

علمائے عمرانیات نے معاشرے کو مختلف اداروں میں منقسم کیا ہے اور ان کے نزدیک ان اداروں کے عمل سے ہی معاشرتی زندگی کا تعین ہوتا ہے۔ معاشرتی استحکام اس کی ترقی اور منزل کا علم بھی انھیں کے ذریعے ہوتا ہے۔

آغاز وارتقاء

جب انسان نے اجتماعی زندگی کا آغاز کیا اور اجتماعی ضروریات بڑھتی گئیں۔ معاشرتی ادارے وجود میں آتے چلے گئے۔ جوں جوں معاشرہ ترقی کرتا چلا گیا اور ضروریات بڑھتی گئیں۔ اداروں میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اداروں کا آغاز ارتقاء معاشرتی زندگی کے آغاز اور ارتقاء سے وابستہ ہے۔ ادارے معاشرہ کا لاینفک جزو ہیں۔ وارڈ کہتا ہے کہ ادارت معاشرتی ضروریات یا مطالبے کا نتیجہ ہیں۔ ایل ایچ مارگن کے نزدیک ہر ادارے کی بنیاد دائمی ضرورت پر ہے۔ وہ ضروریات جو اداروں کو جنم دیتی ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ بھوک ۲۔ ذاتی تسکین
۳۔ ذاتی تحفظ ۴۔ بقائے نسل
۵۔ افزائش نسل

اقسام: ماہرین عمرانیات نے ادارہ کی کئی قسمیں بیان کی ہیں۔

بائزن آرڈلسن کے نزدیک معاشرتی ادارے حسب ذیل ہیں۔

صنعتی ادارے، حکومتی شعبے، ٹریڈ یونینیں، فوجی تنظیمیں، عوامی رسل و رسائل کے ادارے، سیاسی جماعتیں، ہسپتال، یونیورسٹیاں، مدرسے، عبادت خانے، فرقے کلبیں اور تمام قسم کے رضا کارانہ تنظیمیں ہرٹزلر Hertizler نے اپنی کتاب سوشل انسٹی ٹیوشن میں اداروں کی حسب ذیل قسمیں بیان کی ہیں۔

۱۔ معاشی وصنعتی ۲۔ ازدواجی وخانگی
۳۔ سیاسی ۴۔ مذہبی
۵۔ اخلاقی ۶۔ تعلیمی
۷۔ مزاحیہ، جمالیاتی اور اظہاری ۸۔ صحتی اور تفریحی

ہربرٹ سپنسر نے اپنی کتاب پرنسپل آف سوشیالوجی میں اداروں کی یہ چھ اقسام بیان کی ہیں۔

۱۔ خانگی ۲۔ رسمی
۳۔ سیاسی ۴۔ کلیسائی
۵۔ پیشہ ورانہ ۶۔ صنعتی

فوائد

۱۔ ادارے معاشرتی زندگی کی بنیاد ہیں۔
۲۔ ان کی وجہ سے معاشرے کو استحکام نصیب ہوتا ہے۔
۳۔ انہی کے سبب معاشرتی حالات کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔
۴۔ انسانی ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے۔
۵۔ نسل انسانی کے شاندار ماضی کا تحفظ ہوتا ہے۔

فرائض

معاشرتی اداروں کے فرائض انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ انفرادی فرائض ہر ادارہ اپنے دائرہ کار میں سرانجام دیتا ہے مثلاً مدرسہ تعلیم وتربیت دیتا

ہے، مسجد اخلاقی اقدار کو ابھارتی ہے ریاست جانی و مالی تحفظ دیتی ہے ہر ادارہ کا انفرادی فریضہ دوسرے ادارے سے مختلف ہوتا ہے۔ معاشرتی اداروں کے اجتماعی فرائض حسب ذیل ہیں۔

۱۔ معاشرتی ہم آہنگی:۔ یہ اہم فریضہ ہے معاشرے کا ہر ادارہ ایک دوسرے سے ہم آہنگی پیدا کرتا ہے اور اس طرح ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا اتحاد کی لڑی میں تمام منسلک ہیں۔ اگر معاشرتی اداروں میں ہم آہنگی نہ ہو تو معاشرے میں بگاڑ اور فساد برپا ہو جاتا ہے۔

۲۔ نظم وضبط: ادارہ نام ہے۔ نظم وضبط کا اگر کسی ادارہ میں نظم وضبط مفقود ہے تو ادارہ' ادارہ نہیں کہلا سکتا' اس لیے معاشرتی ادارہ کا اہم فریضہ ہے۔ وہ افراد میں نظم وضبط پیدا کرے افراد میں تنظیم کے ساتھ ہی ادارہ مستحکم بنیادوں پر استوار ہو سکتا ہے۔

۳۔ اجتماعی احساس کی بیداری جب کبھی کسی ادارہ کے افراد میں خود غرضی اور انفرادیت غالب آ جاتی ہے۔ تو معاشرتی ادارہ کا یہ اہم فرض ہو جاتا ہے کہ وہ افراد میں اجتماعی احساس کو بیدار کرے تا کہ انفرادی مفاد اجتماعی مفاد پر غالب نہ آ سکے' جس معاشرہ میں انفرادی، احساس اجتماعی احساس اور مفاد پر غالب آ جاتا ہے۔ تو وہاں باہمی محبت' اتفاق ہمدردی مفقود ہو جاتی ہے اور معاشرہ میں ہر قسم کا ظلم عود کر آتا ہے۔

مقاصد کی تکمیل: جیسا کہ پہلے یہ ذکر گزر چکا ہے' معاشرتی اداروں کا وجود میں آنے کی وجہ ہی مختلف انسانی ضروریات ہیں کیوں کہ انسان اپنی ضروریات زندگی اکیلا پوری نہیں کر سکتا' اسے مجبوراً دوسروں کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ یہ ادارے انسانی ضروریات و احتیاجات کو احسن طریقہ سے پورا کرتے ہیں۔

خاندان

خاندان قدرتی اداروں میں وہ ادارہ ہے جو ابتدائے آفرینش سے موجود ہے اور تا ابد موجود رہے گا۔ ارسطو کہتا ہے کہ ''خاندان ایک قدرتی ادارہ ہے جس کی ابتدا انسانی ضروریات کی وجہ سے ہوئی، انسان کو اپنی مختلف ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے ساتھیوں کی ضرورت رہی۔ ابتدا ہی میں عورت زندگی کی بہترین ساتھی ثابت ہوئی اور مرد عورت دونوں کی رفاقت کی وجہ سے خاندان ظہور پذیر ہوا۔

معاشرتی زندگی میں خاندان کی اہمیت

۱۔ خاندان بچے کے لیے ابتدائی درس گاہ ہے۔ قدیم زمانہ میں تعلیم کا بڑا مرکز خاندان ہی سمجھا جاتا تھا۔ جب بچہ اس دنیا میں سانس لیتا ہے تو اس کو ماں اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ اس کی جسمانی نشوونما کے ساتھ ساتھ ذہنی پرورش بھی کرتی ہے۔ مافی الضمیر ادا کرنے کے لیے زبان سکھاتی ہے۔ جب سن شعور کو پہنچتا ہے تو والدین بچے کی اخلاقی اور روحانی پرورش کی طرف توجہ کرتے ہیں اور اس کام سے روکتے ہیں جو مخرب الاخلاق ہوتی ہے ای۔ ایم۔ وائٹ لکھتا ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے۔ وہ معاشرہ میں یا معاشرہ کے ذریعہ کرتا ہے۔ خاندان وہ پہلی درس گاہ ہے جو اسے معاشرہ کا مفہوم اور معاشرتی عادات کی اہمیت سکھاتی ہے۔

۲۔ خاندان شہریت کی پہلی درس گاہ ہے جہاں سے بچہ مفاد عامہ نظم وضبط کی پابندی سماجی بہبود اور حقوق و فرائض کی ادائیگی کا سبق سیکھتا ہے یہی امور سماجی زندگی کو بہتر بناتے ہیں۔

۳۔ خاندان افراد میں سیاسی شعور پیدا کرتا ہے۔ ویسے بھی خاندان کو ایک چھوٹی سی ریاست سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ اس وجہ سے ارسطو نے کہا کہ جو ایک خاندان کا نظام اچھی طرح سنبھال سکتا ہے۔ وہ ایک حکومت کا بھی اچھی طرح نظام چلا سکتا ہے۔

۴۔ خاندان معاشرہ میں معاشی ادارہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ باپ اپنے بچوں کی پرورش کے لیے دن رات محنت کرتا ہے۔ اگر والد اپنی محنت سے افرادِ خاندان کی ضروریات پوری نہیں کر سکتا تو اس کی بیوی بھی کسب کے میدان میں قدم رکھ لیتی ہے تو متحد کوششوں سے گھر کی تمام ضروریات اور احتیاجات پورا کر لیتے ہیں۔ جب بچے جوان ہوتے ہیں تو وہ کنبہ کی معاشی ضروریات کا بوجھ سنبھال لیتے ہیں۔

عائلی زندگی

ازدواجی زندگی انسانی تہذیب اور معاشرہ کا سنگ بنیاد ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے اس کے متعلق شرح وبسط کے ساتھ تعلیم دی ہے ازدواج کے لیے عربی لفظ نکاح ہے۔ تناکحت الاشجار اذا تمایلت وانضم بعضھا الی بعض (عبدالرحمٰن الجزیری الفقہ علی المذاہب اربعہ کتاب النکاح جلد ۴ صفحہ نمبر ۱)

عبدالرحمٰن الجزیری نے نکاح کے معنی پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ نکاح کے معنی عقد اور زوجیت کے ہیں۔ قرآن مجید نے نکاح کو میثاقاً غلیظاً (النساء ۴:۲۱) (پختہ عہد) کہا ہے۔

اس معاہدہ کی رو سے میاں بیوی دونوں اپنے کندھوں پر بعض اہم ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کا اقرار کرتے ہیں۔

نکاح کی اہمیت از روئے قرآن مجید: اسلام نے ازدواجی زندگی کو اختیار کرنا لازمی قرار دیا ہے ارشادِ الٰہی ہے۔ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (نور۲۴:۳۲) تم میں سے جو مجرد ہیں ان کے نکاح کر دو اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے بھی جو صلاحیت رکھتے ہوں اگر وہ محتاج ہوں گے تو اللہ اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ فراخی والا علم والا ہے۔

یہ آیت واضح طور پر رشتہ ازدواج کے قیام کی تاکید کرتی ہے۔ تمام مرد اور عورتوں کو شادی کا حکم دیتی ہے سوائے اس کے کہ کوئی خاص وجوہ مانع نہ ہوں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً. (الرعد۱۳:۳۸) اور ہم نے تجھ سے پہلے رسول بھیجے اور انھیں بیویاں اور اولاد بھی دی۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے ازدواجی زندگی اختیار کرنا تمام رسولوں کی سنت تھی۔

از روئے حدیث: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ اَتَزَوَّجُ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ (بخاری باب الترغیب فی النکاح) میں شادی کرتا ہوں پس جو میری سنت سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے۔

اِذْ تَزَوَّجَ الْعَبْدُ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ نِصْفَ الدِّيْنِ (مشکوۃ کتاب النکاح) جب بندہ نے شادی کر لی تو اس نے نصف دین پورا کر لیا۔

يَامَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ (بخاری کتاب النکاح جلد۳ صفحہ۱۷۰) اے جوانوں کے گروہ جو تم میں سے نفقہ و مہر دینے کی طاقت رکھتا ہے اسے نکاح کرنا چاہیے۔

حضرت ابو ذرؓ فرماتے ہیں ایک دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عکاف بن بشیر تمیمی آئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عکاف سے پوچھا اے عکاف! تمہاری بیوی ہے؟ حضرت عکاف نے جواب دیا نہیں۔ رسول کریم نے پوچھا لونڈی؟ حضرت عکاف نے کہا نہیں۔ یہ جواب سن کر آپ نے فرمایا تم صلاحیت بھی رکھتے ہو اور خوشحال بھی ہو پھر تو نے شادی سے گریز کیا ہے: اِذًا اَنْتَ مِنْ اَخْوَانِ الشَّيَاطِيْنِ (مجمع الفوائد کتاب النکاح عن احمد) تب تم شیطان کے بھائیوں میں سے ہو۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الدُّنْيَا كُلُّهَا مَتَاعٌ وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْاَةُ الصَّالِحَةُ (مشکوۃ المصابیح کتاب النکاح صفحہ ۲۶۴) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ساری دنیا متاع ہے اور دنیا کی بہترین متاع نیک عورت ہے۔

حضرت انس کی روایت ہے آپؐ نے فرمایا مَنْ تَزَوَّجَ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ نِصْفَ الْاِيْمَانِ فَلْيَتَّقِ اللّٰهَ فِى النِّصْفِ الْبَاقِى (معجم اوسط طبرانی) جس نے نکاح کیا اس نے آدھا ایمان مکمل کر لیا' اب نصف باقی میں اسے اللہ سے ڈرنا چاہیے۔

فرمایا تَزَوَّجُوا النِّسَاءَ يَاْتِنَّكُمْ بِالْاَمْوَالِ عورتوں سے نکاح کرو وہ تمہاری آمدنی میں برکت کا ذریعہ ہوں گی۔

فرمایا مَنْ كَانَ مُوْسِرًا لِاَنْ يتزوج ثُمَّ لَمْ يَتَزَوَّجْ فَلَيْسَ مِنِّيْ جو شخص صاحب دولت ہوتے ہوئے شادی نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

پھر صاف طور پر کہا گیا "لَا صَرُوْرَةَ فِى الْاِسْلَامِ" اسلام میں ترک نکاح نہیں اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان کیا۔ لا رهبانية فى الاسلام اسلام میں رہبانیت (ترک دنیا) نہیں ہے۔

عَنْ سَعْدٍ يَقُوْلُ رَدَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُوْنٍ التَّبَتُّلَ وَلَوْ اَذِنَ لَهٗ لَاخْتَصَيْنَا (بخاری ۸/۶۷) حضرت سعد سے روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عثمان بن مظعون کو ترک نکاح سے منع فرمایا اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے اجازت دیتے تو ہم خصی ہو جاتے۔

اجتماعی حیثیت سے اہمیت: نظام حیات کا تمام دار و مدار نکاح پر ہے اس وجہ سے شادی کرنا اجتماعی لحاظ سے بہت ضروری ہے۔ نکاح دو خاندانوں کو باہمی محبت اور مودت کے رشتہ میں منسلک کر دیتا ہے۔ سوسائٹی کے پراگندہ اور منتشر اجزاء کو مربوط کر دیتا ہے۔ شادی سے ہی تمام رشتے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ان رشتوں کے باہمی تعلق سے ایک سوسائٹی معرض وجود میں آتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا (النساء۴:۱) اے لوگو اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

تمدن اور اجتماعی زندگی کا منبع ہی متاہل زندگی ہے۔ اگر سوسائٹی کے پراگندہ اجزاء کو نکاح کے ذریعہ اکٹھا نہ کیا جائے تو کوئی تہذیب و تمدن اور اجتماعی

زندگی معرض وجود میں نہیں آ سکتی۔

ترکِ لذت سے ممانعت: اسلام ایک متحرک مذہب ہے دین اور دنیا کا جامع۔ اس وجہ سے اسلام نے ان تمام امور سے سختی سے روکا ہے جو ازدواجی زندگی پر اثر انداز ہوں۔ ارشاد الٰہی ہے: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (مائدہ ۵:۸۷)
اے لوگو جو ایمان لائے ہو پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ ٹھہراؤ جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں اور حد سے نہ بڑھو اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

عرب میں بعض زاہد متقشف اپنی قوت رجولیت ہی ختم کرا دیتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس رسم کو سختی سے ختم کیا اور صحابہ کرام کو ترک نکاح سے منع فرمایا۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمانؓ بن مظعون کی ترک نکاح کی درخواست رد فرما دی ورنہ ہم لوگ قوت رجولیت ہی ختم کرا دیتے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں دنیا کو آخرت کے لیے ترک کرنے والا اچھا نہیں نہ آخرت کو دنیا کے لیے ترک کرنے والا بلکہ وہ شخص بہتر ہے جو آخرت کو بھی اختیار کرتا اور دنیا کو بھی۔

نکاح کی اساس: اسلام کی روح تقویٰ ہے اور اس روح کو ازدواجی زندگی میں بھی برقرار رکھا جا سکتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو نکاح کے بارہ میں یہ نصیحت فرمائی ہے۔

لا تزوجوا النساء لحسنهن فعسى حسنهن ان يرديهن ولا تزوجوهن لاموالهن فعسى اموالهن ان تطغيهن ولكن تزوجوهن على الدين ولامة خرقاء سوداء ذات دين افضل (ابن ماجہ شامی باب تزویج ذات الدین جلد ۱ صفحہ ۵۹۷ فتح القدیر شرح ہدایہ ج ۳، ص ۱۸۹) عورتوں سے ان کے حسن کی وجہ سے نکاح نہ کرو ممکن ہے کہ ان کا حسن انھیں خراب کر دے اور نہ ان کے مال و دولت کی وجہ سے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ یہ مال انھیں متکبر کر دے بلکہ ان سے دین کی بنیاد پر نکاح کرو کیونکہ سیاہ فام کان چھدی متدینہ لونڈی زیادہ بہتر ہے۔

قَالَ تُنْکَحُ الْمَرْاَۃُ لِاَرْبَعٍ لِمَالِهَا وَ لِحَسَبِهَا لِجَمَالِهَا وَلِدِیْنِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّیْنِ (بخاری ۱۶/۶۷) فرمایا عورت سے نکاح چار وجہ سے کیا جاتا ہے اس کے مال کی وجہ سے اور اس کے نسب کی وجہ سے اور اس کی خوبصورتی کی وجہ سے اور اس کے دین کی وجہ سے پس دیندار عورت کے ذریعہ سے کامیابی حاصل کی۔

یعنی مقدم اس بات کو کرو کہ عورت دین دار ہو۔ دین ہی اصل اخلاق کا سرچشمہ ہے ویسے خوبصورتی اور دیگر امور دیکھنا منع نہیں۔

صاحب فتح القدیر نے طبرانی کے حوالے سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے۔

مَنْ تَزَوَّجَ اِمْرَاۃً لِعِزِّهَا لَمْ یَزِدْہُ اللّٰهُ الا ذلا وَمَنْ تَزَوَّجَهَا لِمَالِهَا لَمْ یَزِدْہُ اللّٰهُ اِلَّا فَقراً وَمَنْ تَزَوَّجَهَا لِحَسَبِهَا لَمْ یَزِدْہُ اللّٰهُ اِلَّا دِنَاءَۃً وَمَنْ تَزَوَّجَهَا اِمْرَاۃً لَمْ یُرِدْ بِهَا اِلَّا اَنْ یَّغُضَّ بَصَرَہٗ ویحصن فَرْجَهٗ اَوْ یَصِلَ رحمه بَارَکَ اللّٰهُ لَهٗ فِیْهَا وَبَارَکَ لِهَا فِیْهِ (رواہ الطبرانی فی الاوسط) جس شخص نے کسی عورت کے ساتھ اس کی عزت کی وجہ سے شادی کی۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے ذلت بڑھا دے گا اور جس نے اس کے مال کی وجہ سے شادی کی۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے غربت کے سوا اور کسی چیز کا اضافہ نہ کرے گا اور جو شخص حسب کے پیش نظر شادی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے دناءۃ کے سوا اور کچھ نہیں بڑھائے گا۔ جو شخص کسی عورت سے شادی کرتا ہے اور اس کے پیش نظر نگاہوں کو محفوظ رکھنا شرمگاہ کو مصئون اور صلہ رحمی ہے تو اللہ تعالیٰ اس مرد کے لیے اس عورت میں برکت دیتا ہے اور عورت کے لیے بھی۔

معاہدہ نکاح کی ضروری شرائط: نکاح کو قرآن میں میثاق کہا گیا ہے یعنی شوہر اور بیوی کے درمیان ایک اقرار نامہ چنانچہ فرمایا۔ وَکَیْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰی بَعْضُکُمْ اِلٰی بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْکُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا (نساء ۴:۲۱) اور تم اسے کس طرح لے سکتے ہو حالانکہ تم میں سے ایک دوسرے تک پہنچ چکا ہے وہ تم سے مضبوط عہد لے چکی ہیں۔

نکاح کا یہ میثاق گواہوں کی موجودگی میں میاں بیوی کے ایجاب و قبول سے ہوتا ہے۔ مگر نکاح کو متبرک میثاق کی حیثیت دینے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اعلان سے قبل خطبہ دیا کرتے تھے۔ قرآن مجید کی رو سے عورت کے لیے حق مہر کا فیصلہ ہونا چاہیے لیکن اگر حق مہر کا ذکر نہ کیا جائے یا حق مہر کی رقم پر اتفاق نہ بھی ہوا ہو تو بھی نکاح جائز رہتا ہے۔

ہدایہ کی رو سے رضامندی کے لیے ایک پرانی صورت یہ ہے یعنی میاں بیوی کہیں گے قبلت یا زوجت یعنی میں قبول کیا یا میں نے ساتھی بنا لیا۔

نکاح کے مقاصد

اسلام نے نکاح کو جذبہ شہوت کی تسکین کا ذریعہ نہیں ٹھہرایا بلکہ نکاح کے اغراض و مقاصد کو شہوت رانی سے بہت بلند قرار دیا ہے۔

افزائش نسل: نکاح کا ایک مقصد نسل انسانی کی افزونی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ (الشوریٰ ۴۲:۱۱) آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا اس نے تمھارے لیے تمہاری جنس سے جوڑا پیدا کیا اور چار پایوں کے بھی جوڑے پیدا کیے وہ اس طرح سے تمھیں پھیلاتا رہتا ہے۔

افزائش نسل کا دار و مدار مرد اور عورت کے مستقل عہد پر ہے۔ نوع انسانی کی بقا نہ تو آزاد محبت سے قائم رہ سکتی ہے نہ عارضی نکاح سے جیسا کہ آج کل مغربی ممالک نکاح کی بجائے آزاد محبت کی طرف جھکتے چلے جا رہے ہیں۔ آزاد محبت میں بچوں کی فلاح اور تربیت کا خیال نہیں رکھا جاتا اور حتی الامکان بچوں کے پیدا کرنے سے احتراز کیا جاتا ہے۔ عموماً ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب فریقین میں سے کسی ایک فریق کی طبیعت پُر ہو جاتی ہے تو بچوں کو کسمپرسی کی حالت میں چھوڑ کر کسی اور فریق کی تلاش میں گھومنا شروع ہو جاتا ہے اسلام نے اس عارضی نکاح کو اس وجہ سے منع فرمایا ہے کہ مرد اور عورت کے تعلقات میں استحکام اور پائیداری نہیں پیدا ہوتی۔ بچوں کو پیدا کرنے سے حتی الامکان گریز کیا جاتا ہے اگر اولاد پیدا بھی ہو جائے تو باپ بھی ان کی پرورش کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا وہ بھی ماں کی طرح کسمپرسی کی حالت میں چھوڑ دیتا ہے۔ کوئی ایسا قانون نہیں ہوتا جو باپ کو مجبور کرے کہ وہ بچوں کی غور و پرداخت کرے۔ قرآن مجید نے ذمہ داریوں کے بندھن کو توڑ کر جذبہ شہوت کو تسکین دینے کا نام سفاح رکھا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ (المائدہ ۵:۵) جب تم ان کو ان کے مہر دے دو نکاح میں لانے والے نہ عارضی نکاح کرنے والے اور نہ چھپی دوستی رکھنے والے۔

یہ لفظ مُسَافِحِيْنَ سَفَحَ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پانی کو باہر انڈیلنا یا خون گرانا۔ (لینز، عربک انگلش لیکسی کان) حضرت ابن عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ آپ نے عارضی نکاح (متعہ) کو سفاح قرار دیا ہے۔ (عون المعبود علی سنن ابو داؤد نمبر ۲ صفحہ ۱۸۶) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ حضرت امام بخاری نے متعہ کے باب کا یہ عنوان باندھا ہے۔ نهى رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم عن النكاح المتعة اخراً کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نکاح متعہ سے بالآخر منع فرمانا۔ اس عنوان کے تحت حضرت علیؓ سے ایک روایت بیان کی ہے کہ انھوں نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہم خیبر کے موقعہ پر متعہ اور گھریلو گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔ (بخاری کتاب النکاح باب ۳۲ بعنوان مندرجہ متن)

عفت اور عصمت

انسان کا سب سے قیمتی جوہر اس کی عفت اور پاک دامنی ہے۔ اس جوہر کو محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بے شمار قواعد اور ضوابط مقرر کیے ہیں۔ ان میں سے ایک نکاح ہے۔ قرآن مجید نے نکاح کو احصان سے تعبیر کیا ہے۔ احصان حَصَنَ سے مشتق ہے جس کے معنی ناممکن الحصول تھا یا ناممکن الحصول ہو گیا۔ یا یہ کہ اس کو قلعہ کے اندر لے لیا گیا یا حملہ کے مقابل پر محفوظ کر دیا گیا گویا نکاح مرد اور عورت کے لیے ایک ایسا قلعہ ہے جہاں سے شیطان اس پر حملہ کرنے سے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ (النساء ۴:۲۴) اور جو اس کے سوا ہیں وہ تمھارے لیے حلال ہیں۔ اس طرح کہ تم اپنے مالوں کے ساتھ چاہو نکاح میں لا کر نہ شہوت رانی کرتے ہوئے دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے لیے لباس قرار دیا ہے۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (البقرہ ۲:۱۸۷) وہ تمھارے لیے لباس اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

جس طرح لباس انسانی جسم کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ اس طرح مرد اور عورت جب عقد نکاح میں آ جاتے ہیں وہ ایک دوسرے کے جوہر عفت کی حفاظت کرتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَاِنَّهُ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَاَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَاِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ لِلْفَرْجِ (بخاری ۳۰:۱۰ کتاب النکاح) (اے نوجوانوں کے گروہ) تم میں سے جو اسباب معیشت رکھتا ہو اس کو نکاح کرنا چاہیے کیونکہ یہ نگاہ کو محفوظ رکھتا ہے اور جائے شہوت کو بچاتا ہے اور جسے طاقت نہیں تو وہ روزہ رکھے یہ اس کے لیے انقطاع شہوت کا موجب ہے۔

مَنْ اَرَادَ اَنْ يَّلْقَى اللّٰهَ طَاهِرًا مُّطَهَّرًا فَلْيَتَزَوَّجِ الْحَرَائِرَ (مشکوۃ کتاب النکاح) جو شخص اللہ تعالیٰ سے پاک و صاف ملنا چاہتا ہے تو وہ شریف

عورتوں سے شادی کرے۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے: وَيَتَزَوَّجُ لِكَسْرِ الشَّهْوَةِ وَاِعْفَافِ النَّفْسِ وَتَكْثِيرِ النَّسْلِ (فتح الباری پ ۲۱ ص ۲۷) شادی شہوت توڑنے نفس کو پاک رکھنے اور نسل کی کثرت کے لیے کی جاتی ہے۔

ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے مَنْ كَانَ مُوسِراً لِاَنْ يَّتَزَوَّجَ ثُمَّ لَمْ يَتَزَوَّجْ فَلَيْسَ مِنِّي یعنی صاحب دولت ہو اس کو شادی کرنی چاہیے پھر نہیں شادی کرتا اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں پھر صاف طور سے کہا گیا ہے لَا صَرُوْرَةَ فِي الْاِسْلَامِ یعنی اسلام میں ترک نکاح نہیں۔ امام ابن حزم اور دوسرے علماء نے نکاح کو فرض قرار دیا ہے اور دوسرے ائمہ نے واجب۔ بخاری کی حدیث میں کہا گیا ہے اَلدُّنْيَا كلها مَتَاعٌ وَخَيْرُ مَتَاعِهَا اَلْمِرْاَةُ الصَّالِحَةُ دنیا ایک بازار ہے جس کا بہترین سامان نیک عورت ہے۔

ایک روایت میں آپ نے بے نکاح مرد اور عورت کو مسکین قرار دیا ہے (مسند رزین)

حضرت ابو ذر عطاف بن بشر تمیمی کے بارے میں کہتے ہیں کہ باوجود استطاعت شادی نہ کرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا۔ اِذْ اَنْتَ مِنْ اَخْوَانِ الشَّيَاطِيْن (جمع الفوائد کتاب النکاح عن احمد) تب تو تم اخوان الشیاطین میں ہو۔

اسلام میں عفت اور پاکدامنی کی اہمیت: اسلام نے عفت اور پاک دامنی اختیار کرنے کی مختلف پرایوں میں تعلیم دی ہے کیونکہ اس کی حفاظت پر ہی فرد اور قوم کی ترقی کا انحصار ہے اور تمدن کا سنگ بنیاد ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ (الاحزاب ۳۳:۳۵) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ (المومنون ۲۳:۶۵) اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں مگر اپنی بیوی سے یا ان سے جن کے ان کے داہنے ہاتھ مالک ہوئے تو وہ ملامت کیے گئے نہیں۔ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَ هُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِيْنَهُ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ (الممتحنہ ۶۰:۱۲) زنا نہ کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے سامنے کوئی بہتان باندھ لائیں۔

ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عفت کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا یَا شَبَابَ قُرَيْشٍ اِحْفَظُوْا فُرُوْجَكُمْ وَلَا تَزْنُوْا اِلَّا مَنْ حَفِظَ فَرْجَهُ فَلَهُ الْجَنَّةُ رواه الحاكم والبيهقي وقال صحيح على شرطهما اے قریش کے جوانو! اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرو۔ زنا نہ کرو۔ سنو جو اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرے گا اس کے لیے جنت ہے۔

من تو كل لى مارجليه وما بين لحييه تو كلت له بالجنة (بخاری کتاب المحاربین باب فضل من ترک الفواحش مشکوٰۃ باب جامع الدعا صفحہ ۲۱۸) جو میرے لیے شرم گاہ اور زبان کی حفاظت کی ذمہ داری لے، میں اس کے لیے جنت کی ذمہ داری لوں گا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعاؤں میں عفت طلب کرتے رہتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْئَلُكَ الْهُدٰى وَالتُّقٰى وَالْعِفَافَ وَالْغِنٰى (مشکوٰۃ باب جامع الدعا صفحہ ۲۱۸) اے اللہ تجھ سے ہدایت تقویٰ پاک دامنی اور غنی طلب کرتا ہوں۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ الصِّحَّةَ وَالْعِفَّةَ وَالْحُسْنَ وَالرِّضَا بِالْقَدَرِ. (مشکوٰۃ باب جامع الدعا صفحہ ۲۲۰) اللہ تجھ سے صحت، عفت، اچھائی اور تقدیر پر رضا کی درخواست کرتا ہوں۔

اَللّٰهُمَّ اَلْهِمْنِيْ رُشْدِيْ وَ اَعِذْنِيْ مِنْ شَرِّ نَفْسِي (رواہ الترمذی مشکوٰۃ ص ۲۱۷) اے اللہ مجھے راہ راست پر ہونے کی توفیق عطا فرما اور نفس کی برائی سے اپنی پناہ میں رکھ۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ مُنْكَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَ الْاَعْمَالِ وَ الْاَهْوَآءِ (رواہ الترمذی) اے اللہ برے اخلاق اور اعمال اور بری خواہشوں سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔

مودت و رحمت: ازدواجی زندگی مودت اور تسکین کا سرچشمہ ہے اور محبت اور مودت کی اساس پر ہی تہذیب وتمدن ترقی کرتا ہے ارشاد الٰہی ہے: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا (الاعراف :۱۸۹) وہی ذات ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا کہ اس کے پاس سکون حاصل کرے: وَمِنْ اٰيَاتِهِ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِي ذَالِكَ لَاٰيٰتٍ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (الروم ۳۰:۲۱) اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمھارے لیے تمھارے نفسوں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے تسکین پاؤ اور

تمھارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو فکر کرتے ہیں۔

صحت: ڈاکٹر اور اطبا اس امر پر متفق ہیں کہ جماع انسانی صحت کے لیے ضروری ہے۔ اگر مادہ تولید ایک عرصہ تک رکا رہے تو قسما قسم کی بیماریاں جنم لے لیتی ہیں۔

جالینوس کا قول ہے کہ مادہ تولید پر آگ اور ہوا غالب ہے اور اس کی طبیعت گرم و تر ہے۔ اس کا فاضل حصہ جب بھی روک لیا جاتا ہے اور اسی طرح ایک عرصہ تک رہتا ہے تو اس سے خراب قسم کی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ کبھی وسواس کی بیماری ہوتی ہے۔ کبھی جنون کا مرض لاحق ہو جاتا ہے اور کبھی مرگی کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ نیز مادہ تولید کا اخراج معتدل صحت پر خوشگوار اثر ڈالتا ہے۔ بہت سی بیماریوں سے آدمی محفوظ رہتا ہے۔ ورنہ رکاوٹ سے ایک زہریلا مادہ تمام جسم میں دوڑ جاتا ہے جو صحت کے لیے مضر ہوتا ہے اور اسی وجہ سے زیادتی کے وقت انسانی طبیعت اس کے باہر نکالنے پر مجبور ہوتی ہے (زاد المعاد ج ۳ صفحہ ۱۴۶)

نفیسی طب کی مشہور کتاب ہے اس میں لکھا ہے:۔

''اور اس وقت مقاربت اور مادہ تولید کا خارج کرنا ضروری ہے کیونکہ اگر اسے ترک کر دیا جائے گا اور وہ ظرف میں زیادہ ہو جائے گا تو حرارت غریزی کا گلا گھونٹ دے گا اور اسے بجھا دے گا اور لازم ہوگا کہ وہ خود ٹھنڈا پڑ جائے اور بدن کو بھی ٹھنڈا کر دے۔'' (نفیسی ص ۴۱۳)

مادہ تولید زہر آلود طبیعت میں بدل جائے گا اور زہر آلود مادہ دل اور دماغ کی طرف زہر آلود روی بخار کو روانہ کرے گا۔ جو غشی' مرگی اور اس طرح کی دوسری بیماریوں کا موجب ہوگا۔ (نفیسی ص ۴۱۳)

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:۔

''مرد پر جنسی میلان کا تقاضا بسا اوقات مستولی ہو جاتا ہے اگر اس تقاضے کی تکمیل میں تاخیر سے کام لیا جائے گا تو نقصان بدن کو بھی پہنچتا ہے اور دل کو بھی۔'' (نووی شرح مسلم ج ۱ صفحہ ۴۵۰)

جالینوس نے اپنی کتاب حفظ الصحت میں لکھا ہے کہ:۔

''بیوی سے اختلاط مخصوص اعتدال کے ساتھ تندرستی کے مختلف ذرائع میں سے ایک بڑا ذریعہ ہے اور بہت سے امراض کی شفا ہے۔

ان طبی ارا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شادی صحت کے لیے ضروری ہے۔

احساس کی ذمہ داری پیدا کرنا: متاہل زندگی کا مقصد احساس ذمہ داری پیدا کرنا ہے جو بغیر شادی کرنے کے پیدا نہیں ہوتا کیونکہ بغیر شادی شدہ کی توجہ کا مرکز صرف اس کی اپنی ذات ہوتی ہے لیکن شادی کے بعد ایک تو باہر سے ایک عورت آ جاتی ہے جس کی دیکھ بھال' آرام و آسائش کی ذمہ داری مرد کے کندھوں پر آ پڑتی ہے۔ اس کے بعد اولاد پیدا ہو جاتی ہے جس سے مزید ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لیے اپنی تمام استعدادوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ اس وجہ سے حافظ ابن کثیر نے عبداللہ بن مسعودؓ کا ایک قول نقل کیا ہے۔ التمسوا الغنی فی النکاح (ابن کثیر ج ۳ صفحہ ۲۸۶) یعنی نکاح میں تونگری تلاش کرو۔

قرآن مجید میں آتا ہے:۔

اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ (النور۲۴:۳۲) اگر وہ محتاج ہوں گے تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا اور اللہ فراخی والا علم والا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک قول ہے۔ اِلْتَمِسُوا الرِّزْقَ بِالنِّکَاحِ (مدارک) یعنی نکاح کے ذریعہ رزق تلاش کرو۔

ان فرمودات سے مراد یہ ہے کہ احساس ذمہ داری سے انسان جدوجہد کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور عمل اور کوشش سے ان وسائل کو تلاش کرتا ہے جو رزق کی فراخی کا موجب ہوتے ہیں۔

جنسی میلان کا علاج: جنسی میلان ایک طبعی جذبہ ہے۔ جب یہ میلان حد اعتدال سے بڑھ جاتا ہے تو اس کا بخار دماغ پر اتنا مستولی ہوتا ہے کہ انسان شہوت کے بخار کی حدت کو بجھانے کے لیے زنا کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جنسی میلان میں اعتدال اور توازن قائم رکھنے کے لیے نکاح ضروری ہے۔ نکاح ہی ایک ذریعہ ہے جس سے قوت بہیمیہ دب جاتی ہے۔

روحانی ترقی: نکاح انسان کی روحانی ترقی اور تزکیہ نفس کا ذریعہ ہے حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ اپنے ایک عقیدت مند کو لکھتے ہیں:۔

''تمہارا یہ کہنا کہ شادی کرنے کے بعد باطن کی اصلاح ناممکن ہے میں اسے تسلیم نہیں کرتا کیوں کہ مقاربت دل کو جلا بخشتی ہے اور

روحانی آلائشوں کی صاف کرتی ہے قاضی عیاض کی کتاب کے شارح نے کہا ہے کہ "ہر شہوت قلب کو سیاہ کرتی ہے۔ مگر ایک مقاربت کا فعل کہ اس سے دل کو روشنی حاصل ہوتی ہے۔" (مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲ ص ۳۱)

محرمات

ارشاد الٰہی ہے۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِىْ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِىْ فِىْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِىْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (النساء ۴:۲۳)
وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (۴:۲۲)

حرام عورتیں: اسلام نے بعض رشتوں کے احترام خاندانی تعلقات کی پاکیزگی معاشرہ کی اصلاح اور بقا کے لیے بعض رشتوں میں باہم نکاح حرام قرار دیا ہے۔ اس حرمت کی تین وجوہ ہیں۔ نسب' رضاعت اور مصاہرت۔

حرمت نسب: حقیقی ماں باپ کے تعلق سے جو رشتے قائم ہوتے ہیں۔ یہ سات ہیں۔ ماں' بیٹی' بہن' پھوپھی' خالہ' بھتیجی' بھانجی۔

حرمت رضاعت: رضاعی رشتہ کی بنا پر مثلاً رضاعی بہن رضاعت کی وجہ سے وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو حقیقی ماں باپ کے تعلق سے حرام ہوتے ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یحرم من الرضاع مایحرم من النسب یعنی رضاعت سے تمام وہ رشتے حرام ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔

حرمت مصاہرت: نکاح کے تعلق سے کچھ رشتے حرام ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ساس' سالی' بیٹے کی بیوی۔

محرمات سے نکاح نہایت ہی برا فعل اور گناہ ہے۔ ابن ماجہ نے ابن عباس سے ایک روایت نقل کی ہے کہ جو شخص محرمات میں سے کسی سے ملوث ہو اس کو قتل کر دو۔

ماں: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ. تم پر تمہاری مائیں حرام کی گئی ہیں۔ ماں کے حکم میں دادی' نانی پھر دادی اور نانی کی ماں اور ماں کی ماں اوپر تک داخل ہیں۔

بیٹی: وَبَنٰتُكُمْ. اور تمہاری بیٹیاں' بیٹی کے حکم میں اولاد کی بیٹی یا اولاد کی اولاد کی بیٹی بھی شامل ہیں۔

بہن: وَاَخَوٰتُكُمْ. اور تمہاری بہنیں۔ بہنوں میں سگی بہنوں کے علاوہ ماں شریک بہن اور باپ شریک بہنیں شامل ہیں۔

پھوپھی: وَعَمّٰتُكُمْ. اور تمہاری پھوپھیاں۔ پھوپھی کے حکم میں دادا کی بہن اور اوپر تک کی پشتوں کی بہن سب شامل ہیں۔

خالہ: وَخٰلٰتُكُمْ. اور تمہاری خالائیں۔ ماں کی بہن کے علاوہ نانی' پرنانی کی بہنیں بھی اس حکم میں شامل ہیں۔

بھتیجی: بَنٰتُ الْاَخِ. تمہاری بھتیجیاں۔

بھانجی: وَبَنٰتُ الْاُخْتِ اور تمہاری بھانجیاں۔ بھائی خواہ سگا ہو یا سوتیلا اس کی بیٹی حرام عورتوں کے حکم میں شامل ہے۔

ساس: وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ. اور تمہاری بیویوں کی مائیں۔

سوتیلی بیٹی: وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِىْ فِىْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِىْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ اور تمہاری پالی ہوئی لڑکیاں جو تمہاری حفاظت میں ہوں ان عورتوں کے بطن سے جن پر تم داخل ہو چکے ہو۔

فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ.
اور اگر تم ان پر داخل نہ ہوئے ہو تو تم پر گناہ نہیں۔

بہو: وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ. اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری پیٹھوں سے ہوں۔
بیٹے کی بیوی کے حکم میں پوتے اور نواسے کی بیوی بھی شامل ہیں۔

بیک وقت دو بہنیں: وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ (النساء ۴:۲۳) اور دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔

بہن کی طرح اس کی خالہ پھوپھی بھانجی اور بھتیجی کو بھی اکٹھا کرنا حرام ہے۔ ہدایہ میں یہ اصول بیان کیا ہے کہ دو ایسی عورتوں کو بیک وقت زوجیت میں لینا منع ہے جن میں سے اگر ایک مرد ہوتی تو ان کی شادی حرام ہوتی۔

دوسرے کی منکوحہ: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاءِ (النساء ۴:۲۴) ان عورتوں سے بھی شادی کرنا حرام ہے جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں۔

سوتیلی ماں: وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ (النساء ۴:۲۲) اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمھارے باپ نکاح کر چکے ہیں۔

مشرکہ عورت سے: قرآن مجید نے مشرکہ عورت سے بھی شادی کرنا ناجائز قرار دیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ (بقرہ ۲:۲۲۱) اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں اور یقیناً ایک مومن لونڈی مشرک عورت سے بہتر ہے گو وہ تمھیں اچھی لگتی ہو۔

اس آیت میں مشرکہ سے مراد وہ عورتیں ہیں جن کے پاس آسمانی کتاب نہیں۔ سورۃ مائدہ آیت ۵ میں واضح حکم ملتا ہے کہ ان عورتوں سے شادی کی اجازت ہے جو کسی آسمانی کتاب کو مانتی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ یعنی پاک دامن عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں۔ حرام عورتوں کا ذکر کرنے کے بعد اس بات کا بتانا بھی ضروری ہے کہ آیا ایک مسلمان عورت کا نکاح غیر مسلم سے کیا جا سکتا ہے۔ تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمان عورت کا غیر مسلم مرد سے نکاح جائز نہیں۔

متعہ: اسلام سے قبل ایک مقررہ وقت تک نکاح کرنے کا دستور تھا۔ اس کو متعہ کہتے تھے۔ جس کے معنی فائدہ اٹھانا۔ کسی چیز سے حظ اور لطف اٹھانا ہے۔

اسلام نے متعہ سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس سے مرد اور عورت کے تعلقات میں استحکام قائم نہیں رہتا اور اولاد کی پرورش اور تربیت کی ذمہ داری باپ پر نہیں رہتی اور وہ اپنی ماں کے ساتھ کس مپرسی کی حالت میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسلام اس نکاح کی اجازت دیتا ہے جس کے نتیجہ میں اولاد پیدا ہو اور خاوند اولاد کی تربیت اور پرورش کی ذمہ داری قبول کرے۔ اسی کے لیے قرآن مجید نے لفظ احصان استعمال کیا ہے۔ احصان کے معنی قلعہ اور محفوظ مقام ہے۔ یعنی جب ایک مرد کسی عورت سے شادی کر لیتا ہے تو وہ عورت ہر لحاظ سے محفوظ ہو جاتی ہے اس کی اولاد کی ذمہ داری باپ پر آن پڑتی ہے اور اولاد بھی باپ کی ذمہ داری کی وجہ سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

جس نکاح میں اولاد کی پرورش اور تربیت میں باپ کی ذمہ داری نہ ہو اس کو قرآن مجید نے سفاح کا نام دیا ہے۔ سفاح سفح سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں پانی کو باہر انڈیلنا یا خون گرانا (لینز عربیک انگلش لیکسی کان)

پہلے لفظ احصان میں مستقل ملاپ کا تصور اور ذمہ داریاں ادا کرنے کا تصور ابھرتا ہے جب کہ دوسرے لفظ متعہ میں جذبہ شہوت کی تسکین پائی جاتی ہے۔ حضرت امام بخاری نے متعہ کے باب میں یہ عنوان باندھا ہے نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ نِكَاحِ الْمُتْعَةِ اٰخِرًا یعنی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح متعہ سے بالآخر منع فرما دیا۔

اس عنوان کے تحت بخاری نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ حضرت علیؓ نے جو اس کے راوی ہیں ابن عباس سے کہا کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہم خیبر کے موقعہ پر متعہ اور گھریلو گدھے کے گوشت کھانے سے منع فرمایا (بخاری کتاب النکاح)

حضرت ابن عمر کے متعلق روایت ہے کہ آپ نے متعہ یا عارضی نکاح کو سفاح قرار دیا تھا۔ (عون المعبود علی سنن ابو داؤد نمبر ۲ صفحہ ۱۸۶)

نکاح کے احکام: اسلام نکاح کو پختہ عہد قرار دیتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام نکاح میں انتخاب کی آزادی دیتا ہے ارشاد الٰہی ہے: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ (النساء ۴:۳) ایسی عورتوں سے شادی کرو جو تمھیں پسند ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت سے شادی کرنے کی تجویز کرے تو اسے دیکھ لینا چاہیے حضرت امام بخاری نے ایک باب کا یہ عنوان باندھا ہے۔ النظر الی المراۃ قبل التزویج۔ یعنی نکاح سے قبل عورت کو دیکھنا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث مروی ہے مغیرہ بن شعبہ نے ایک عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ کیا تم نے اس عورت کو دیکھ لیا ہے۔ مغیرہ نے جواب دیا یا رسول اللہ نہیں جس پر حضور نے فرمایا فَانْظُرْ اِلَيْهَا فَاِنَّهٗ اَحْرٰى اَنْ يُّؤْدَمَ بَيْنَكُمَا۔ کہ اسے پہلے دیکھ لو کیونکہ اس سے زیادہ محبت اور یگانگت پیدا ہونے کی توقع ہے۔ (مشکوٰۃ کتاب النکاح باب النظر الی المخطوبہ الفصل الثانی)

حضرت ابو ھریرہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص سے جس نے کسی عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ پوچھا اَنظَرْتَ اِلَيْهَا (کیا تو نے اس کو دیکھ لیا ہے) اس نے نفی میں جواب دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب معلوم ہوا کہ اس نے دیکھا نہیں ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اِذْهَبْ فَانْظُرْ اِلَيْهَا فَاِنَّ فِي اَعْيُنِ الْاَنْصَارِ شَيْئًا (مسلم باب ندب من اراد امرأة الی ان ینظر قبل خطبتہا) جاؤ اس عورت کو دیکھ لو کیونکہ انصار کی آنکھوں میں کچھ (عیب) ہے۔

امام نووی اس حدیث کے ضمن میں لکھتے ہیں اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عورت کو دیکھنا جس سے شادی کرنے کا ارادہ کیا جائے مستحب ہے یہی ہمارا (شافعی کا) مذہب ہے امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے امام مالک کا مذہب ہے اور تمام کوفین کا۔ امام احمد کا بھی یہی مذہب ہے اور جمہور علماء کا بھی (شرح مسلم نووی ج ۱ صفحہ ۴۵۶)

محمد بن مسلمہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا اِذْ اَلْقَى اللّٰهُ فِي قَلْبِ امرأ خطبة اَمْرَاةٍ فَلَا بَاسَ اَنْ يَّنْظُرَ اِلَيْهَا (ابن ماجہ باب النظر الی المرأة الخ) اللہ تعالیٰ جب کسی شخص کے دل میں کسی عورت سے شادی کرنے کی خواہش ڈال دے تو اس کے لیے اس عورت کو دیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

شادی سے پہلے دیکھنا مستحب ہے۔ فقہاء نے مستحب قرار دیا ہے جیسے ندب کے لفظ سے ظاہر ہے صرف مولانا ثناء اللہ پانی پتی نے سنت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں سَنَّ لِلْخَاطِبِ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى وَجْهِ الْمَخْطُوْبَةِ وَكَفَّيْهَا قَبْلَ النِّكَاحِ اِجْمَاعًا (تفسیر مظہری سورۃ النساء ص ۶) شادی کرنے والے کے لیے مسنون طریقہ یہ ہے کہ نکاح سے پہلے (عورت) مخطوبہ کو دیکھ لے مخطوبہ کا چہرہ اور ہتھیلی دیکھنا بالاتفاق جائز ہے۔

فقہ کی کتابوں میں عام طور پر ندب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یندب اعلانه ...... والنظر قبله (درمختار ج ۲ ص ۱) نکاح کا اعلان اور نکاح سے پہلے دیکھنا مستحب ہے۔

وَيُنْدَبُ نَظَرُ الزَّوْجِ اِلٰى زَوْجَتِهٖ قَبْلَ العقد وَان خَافَ الشَّهْوَةُ (الکواکب المشرقة) عقد سے پہلے شوہر کا بیوی کو دیکھنا مستحب ہے گو شھوت کا خوف ہو۔

دیکھنے کا شرعی طریقہ اور کن حصوں کو دیکھا جائے: اسلام نے دیکھنے کی اجازت دی ہے لیکن شرافت کی حد تک رہتے ہوئے۔ غیر قوموں کی طرح نہیں کہ شادی سے پہلے مرد اور عورت آزادانہ بے باکی سے ملیں جلیں۔ چھپ چھپا کر دیکھ لیا جائے۔ لڑکی کے والدین کی مرضی سے دیکھ لیا جائے۔ عورت کا تمام جسم ستر ہے سوائے چہرہ ہتھیلی کے لحاظ سے جو ستر میں شامل نہیں یعنی چہرہ اور ہتھیلی دیکھ لیا جائے۔ امام نووی کہتے ہیں کہ صرف چہرہ اور ہتھیلی دیکھنا چاہیے۔ چنانچہ لکھتے ہیں ثم انما یباح له النظر الی وجهها وكفيها فقط لانهما ليس بعورة مرد کے لیے جائز ہے کہ مخطوبہ کا چہرہ اور ہتھیلی دیکھ لے کیونکہ دونوں ستر نہیں۔
(شرح مسلم ج ۱ ص ۴۵۶)

مولوی ثناء اللہ پانی پتی کہتے ہیں۔ نکاح سے پہلے مخطوبہ کا چہرہ اور اس کی ہتھیلی دیکھ لی جائے۔ چہرہ اور ہتھیلی کے دیکھنے پر اجماع ہے لیکن اوزاعی کہتے ہیں۔ مواضع اللحم کو دیکھا جائے گا داؤد ظاہری کہتے ہیں کہ غلیظ حصوں کے سوا تمام بدن کا دیکھنا جائز ہے (تفسیر مظہری سورۃ النساء ص ۶)

عورت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی رضا دینے سے پہلے مرد کو دیکھ لے۔ نکاح میں مرد اور عورت دونوں کی رضامندی ضروری ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ ۲:۲۳۲) تم انھیں اس بات سے مت روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کریں جب آپس میں پسندیدہ طور پر راضی ہوں۔

نکاح علانیہ کیا جائے: تمام فقہاء نے نکاح کو برسر عام اور علانیہ کرنا ضروری سمجھا ہے۔ اسی وجہ سے فقہاء نے یہ کہا ہے کہ نکاح کا اعلان دف کے ساتھ کرنا مستحسن ہے تاکہ دوسروں کو یہ خبر ہو جائے اور پیچھے کسی قسم کی خرابی پیدا نہ ہو۔ کئی دفعہ نکاحوں کے متعلق مقدمات تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ پھر وراثت پر بھی اثر پڑتا ہے اس وجہ سے اعلان کرنا ضروری ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اِعْلَنُوْا هٰذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوْا فِي الْمَسَاجِدِ وَاضْرِبُوْا عَلَيْهِ بِالدفوف. (ترمذی باب ماجاء فی اعلان النکاح) اس نکاح کا اعلان کرو اور نکاح مسجد میں کرو اور دف بجاؤ۔

مہر: نکاح میں حق مہر ضروری ہے۔ قرآن مجید کی رو سے مہر ایک عطیہ ہے۔ جو نکاح کے موقع پر خاوند بغیر کسی معاوضہ کے بیوی کو دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ قرآن مجید نے مہر کے لیے اجر، صدقہ اور فریضہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اجر کے معنی ہیں صلہ یا عطیہ جو دلہن کو دیا جائے (لینز عربک انگلش لکسی کان) حضرت امام راغب لکھتے ہیں۔ اجر وہ ہے جس میں فائدہ ہی فائدہ ہو۔ نقصان نہ ہو۔ قرآن مجید میں آتا ہے: فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (النساء ۴:۲۴) ان کے مقررشدہ

مہر دے دو۔

صدقہ: صدق سے مشتق ہے جس کے معنی سچائی ہیں۔ یہ لفظ ظاہر کرتا ہے کہ مہر خلوص نیت' صدق دل اور طیب خاطر سے دیا جائے۔ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (النساء:۴) اور عورتوں کو ان کے مہر بلا بدل دو۔

فریضہ کے معنی ہیں۔ وہ چیز جو فرض کی گئی ہو ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَالَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً (البقرہ ۲:۲۳۶) تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دے دو جب کہ تم نے ابھی ان کو چھوا نہ ہو یا مہر مقرر نہ کیا ہو۔

حضرت عقبہ بن عامر روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جن شرطوں کو تم پورا کرتے ہو ان میں سب سے ضروری اس شرط کو پورا کرنا ہے جس کی وجہ سے تم نے عورتوں کی ناموس اپنے لیے حلال کی ہے۔ (بخاری مسلم)

نکاح کی عمر: قرآن مجید نکاح کی عمر بلوغت قرار دیتا ہے ارشاد ہے: وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا (النساء ۴:۶) اور یتیموں کا امتحان لیتے رہو۔ یہاں تک کہ جب وہ شادی کی عمر کو پہنچ جائیں تب اگر تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ فضول خرچی سے اور جلدی کر کے ان کو کھانہ جاؤ۔

چونکہ اسلام میں نکاح کی اصل روح فریقین کی رضامندی ہے اس وجہ سے نکاح کے لیے مرد اور عورت کا بالغ ہونا ضروری ہے۔ فتاویٰ عالمگیری کی رو سے نکاح کے لیے مرد اور عورت میں عقل اور تمیز بلوغت اور حریت کا ہونا ضروری ہے۔

نکاح میں ولی: مرد کے بارے میں فقہاء کا کوئی اختلاف نہیں کہ وہ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کی منظوری دے سکتا ہے لیکن عورت کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا وہ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کی منظوری دے سکتی ہے یا کہ نہیں۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں لکھا ہے:۔

''ایک آزاد عورت جو بالغہ اور عاقلہ ہو اس کی اپنی منظوری سے معاہدہ نکاح مکمل ہو جاتا ہے خواہ وہ کنواری ہو یا پہلے بیاہی جا چکی ہو اور اگرچہ اس کے ولی نے اس کے نکاح کی توثیق نہ بھی کی ہو۔ (فتاویٰ عالمگیری جلد ۲ صفحہ ۱)

شیعوں کا بھی یہی نقطہ نگاہ ہے چنانچہ امیر علی محمڈن لاء میں لکھتا ہے:۔

''ایک راشدہ عورت کے نکاح کے لیے کسی ولی کی ضرورت نہیں''

لیکن امام مالک اور امام شافعی دونوں کا یہ مسلک ہے کہ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا۔

نکاح میں اکفا: اسلام نسلی' قومی لونی' ہر قسم کے امتیازات مٹانے اور تمام نوع انسانی کو اخوت اور مساوات کی لڑی میں منسلک کرنے آیا ہے۔ اس وجہ سے وہ تمام شرائط جو اخوت اور مساوات کی تعلیم کے خلاف ہوں گے وہ ناجائز ہوں گی۔ اس وجہ سے نکاح کے لیے کفو کی شرط ناجائز ہے۔ ابن حجر کے قول کے مطابق کفو نسبی کے معتبر ہونے میں کوئی صحیح حدیث نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس کتب میں ایسے آثار اور روایات کا ذخیرہ پایا جاتا ہے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں نسبی کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔

حضرت امام بخاریؒ نے باب الاکفاء فی الدین کے عنوان کے تحت دو واقعات بیان کیے ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ نکاح میں نسبی کفو کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ پہلا واقعہ حضرت ابو حذیفہؓ کا ہے انھوں نے اپنی بھتیجی ہند بنت ولیدؓ کی شادی حضرت سالم سے جو ایک انصاری عورت کے آزاد کردہ غلام تھے، کر دی۔ دوسرا واقعہ ضباعہ بنت زبیر کا بیان کیا ہے ان کی شادی حضرت مقداد سے ہوئی تھی ضباعہ اپنے نسب کے لحاظ سے بہت اونچی تھی۔ حافظ ابن قیم نے اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام میں کفو کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے اور اسلامی روح کے منافی ہے۔ اسلام نے صرف تقویٰ کو ہی وجہ تکریم بیان کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (الحجرات ۴۹:۱۳) یقیناً اللہ کے نزدیک مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (حجرات ۴۹:۱۰) بے شک مومن بھائی بھائی ہیں اسلام نے نکاح کے اعلان کی ایک اور صورت بھی اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی کے تعلقات کرنے کے بعد ولیمہ کیا جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہؓ کو دعوت ولیمہ کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عبدالرحمان بن عوف کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اولم ولو شاۃ (بخاری باب الولیمۃ حق) دعوت ولیمہ کرو خواہ ایک ہی بکری سے ہو۔

عدت میں نکاح: وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ (البقرہ ۲:۲۳۵) اور نکاح کی گرہ کو پختہ کرو یہاں تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔

تہذیب وتمدن اور معاشرہ کی اساس خاندان ہے اس وجہ سے اسلام نے خاندان کے ماحول کو پاکیزہ رکھنے کے لیے یہ حکم دیا ہے۔ نہ زانیہ عورتوں سے نکاح کیا جائے۔ نہ بدکاروں سے مومن اور پاک عورتوں کو بیاہا جائے۔ صرف پاک مرد اور پاک عورت کے ساتھ نکاح ہونا چاہیے۔

زانیہ کے متعلق: وَالزَّانِيَةُ لَا يَنكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (النور ۲۴:۳) اور زنا کرنے والی عورت کے ساتھ سوائے زانی یا مشرک کے کوئی نکاح نہیں کرسکتا اور یہ مومنوں پر حرام ہے۔

بدکاروں سے نکاح نہ کیا جائے: اَلزَّانِيْ لَا يَنكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً (نور ۲۴:۳) زانی مرد کا نکاح زانیہ یا مشرکہ کے ساتھ ہی ہوسکتا ہے۔

پاکیزہ مردوں کے لیے پاکیزہ عورتیں اور پاکیزہ عورتوں کے لیے پاکیزہ مرد:

وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ (النور ۲۴:۲۶) پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔

ایک اہم مسئلہ ضبط تولید: اس دور کا یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ اس پر مفکرین کی مختلف آرا ہیں۔ بعض مفکرین خاص طور پر ماہرین معاشیات ضبط تولید کو جائز بلکہ ضروری قرار دیتے ہیں۔ بعض اسلام کی تعلیم کے منافی۔

اگر نکاح کا بنیادی تصور سامنے رکھا جائے کہ ازدواجی تعلقات کا اصل مقصد نسل انسانی کی افزائش ہے تو ضبط تولید اس غرض و غایت کے منافی ہے دوم ضبط تولید بچوں کی غور و پرداخت کی ذمہ داری کے احساس کو بھی ختم کرتی ہے۔ اس طرح انسان کے اندرونی جذبہ محنت پر ایک کاری ضرب لگتی ہے۔ سوم مصنوعی طریقہ ضبط تولید سے بعض بیماریاں جنم لے لیتی ہیں۔ چہارم نکاح کا مقصد صرف جنسی لذت اور لطف اندوزی ہی رہ جاتا ہے جو قرآنی نقطہ نگاہ سے ناجائز ہے قرآن نے اس نقطہ نگاہ کو سفاح کہا ہے۔ لہٰذا ضبط تولید نکاح کی روح کے منافی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے ضبط تولید کو قتل اولاد قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (انعام آیت ۱۵۱) تم اپنی اولاد کو غربت کے اندیشہ سے قتل نہ کرو ہم تم کو بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی، سورۃ بنی اسرائیل میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (۳۱) تم اپنی اولاد غربت کے خوف سے قتل نہ کرو ہم ان کو بھی اور تم کو بھی رزق دیتے ہیں بالبداہت یہاں لڑکیوں کو زندہ درگور کی طرف اشارہ نہیں جو افلاس کے ڈر سے کیا جاتا تھا جن بچوں کا یہاں ذکر ہے وہ آئندہ پیدا ہونے والی اولاد ہے۔ جن کو ضبط تولید کے طریقوں اور تدابیر سے روک دیا جاتا ہے یہ قرآن نے اس کو قتل کے مترادف قرار دیا ہے۔

بعض حدیثوں میں عزل کا ذکر ہے جو ضبط تولید کا ایک طریقہ ہے۔ دراصل یہ عزل کسی خاص مجبوری کے تحت تھا۔ اسلام مجبوری کے تحت ضبط تولید کی اجازت دیتا ہے بیوی کی صحت اجازت نہ دیتی ہو۔ بعض اوقات ایسی اولاد پیدا ہوتی ہے جو اپاہج ہوتی ہے بچہ پیدائش کے وقت ہی کئی بیماریوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس قسم کے مخصوص حالات میں اسلام ضبط تولید کی اجازت دیتا ہے۔

مہر

تعریف مہر: مہر وہ رقم ہے یا وہ جائیداد ہے جو زوجہ معاہدہ نکاح کے بعد شوہر سے پانے کی مستحق ہے۔ شرعاً نکاح ایک عمرانی معاہدہ ہے اور ہر اس مالی منفعت کا نام ہے جو عورت اپنے خاوند سے نکاح کے عوض پانے کی مستحق ہوتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَآتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (النساء ۴:۴) اور عورتوں کے مہر خوش دلی سے ادا کرو۔ سورہ نساء میں آتا ہے وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّاوَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرَاضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ (نساء ۴:۲۴) ''ان محرمات کے سوا باقی سب عورتیں تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں تاکہ اپنے اموال کے بدلے تم ان کو حاصل کرنے کی خواہش کرو۔ قید نکاح میں لانے کے لیے نہ آزاد شہوت رانی کے لیے پس ان سے تم نے جو تمتع (استفادہ) کیا ہے اس کے بدلے میں طے شدہ مہر ادا کرو۔''

سر عبدالرحیم کہتے ہیں کہ زوجہ کے احترام کی علامت کے طور پر شوہر پر مہر کی ادائیگی واجب کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو ان کی کتاب (Muhammadan Jurisprudence page 334)

دراصل مہر نکاح کے ارکان وشرائط میں سے نہیں ہے بلکہ اس کے احکام ونتائج میں سے ہے کیونکہ نکاح سے مہر کا حکم ہو جاتا ہے۔ پس مہر اگر نہ بھی مقرر کیا جائے تو بھی نکاح صحیح ہو سکتا ہے کیونکہ لغوی طور پر نکاح سے مراد ملانا اور جوڑنا ہے۔ اگر مہر کا تقرر بھی واجب ٹھہرایا جائے تو یہ نص قرآنی (Text of Qruan) پر اضافہ ہوگا۔ لیکن مہر شرعاً واجب ہے جو محل نکاح کے شرف و اکرام کے انتہاء کے لیے ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّاوَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ (سورۃ النساء ۴:۲۴) جو اس کے سوا (عورتیں) ہیں وہ تمھارے لیے حلال ہیں اس طرح کہ تم اپنے مالوں کے ساتھ حاصل کرو۔

جب مہر کی حیثیت یہ ہے تو نکاح میں اس کا ذکر کرنا ناگزیر نہیں ہے۔ اس کے بغیر بھی نکاح درست ہے اور اس طرح نکاح اس وقت بھی صحیح ہو جائے گا جب کہ مرد اس شرط پر نکاح کرے کہ عورت کو کوئی مہر نہ دے گا۔ مگر چونکہ مہر شرعی حق کے طور پر واجب ہے۔ لہٰذا اس صورت میں بھی مہر مثل واجب ہو گا۔ امام مالک اس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ نکاح صحیح نہ ہوگا۔

مہر کے مترادف الفاظ: قرآن حکیم میں مہر کا لفظ استعمال نہیں ہوا بلکہ اس کے معنی ومفہوم میں اُجُورٌ (واحد: اَجْرٌ) صَدُقَات (واحد: صَدُقَةٌ) اور فَرِيْضَةٌ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ حدیث شریف میں مہر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مہر مصدر بھی مَهَرَ يَمْهَرُ کا یعنی مہر ادا کرنا۔ چنانچہ کہتے ہیں مَهَرْتُ الْمَرْاَةَ یعنی میں نے عورت کا مہر ادا کر دیا۔ حدیث شریف میں مہر کے علاوہ صِدَاق (صاد پر زبر اور زیر دونوں درست ہیں) کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ جو اسم مصدر ہے اَصْدَقَ يُصْدِقُ کا۔ اَصْدَقْتُ میں نے صداق یعنی مہر ادا کر دیا۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّاوَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (النساء ۴:۲۴) جو اس کے سوا (عورتیں) ہیں وہ تمھارے لیے حلال ہیں۔ اس طرح کہ تم اپنے اپنے مالوں کے ساتھ حاصل کرو نکاح میں لا کر نہ کہ شہوت رانی کرتے ہوئے۔ سو تم نے ان میں سے جس سے نفع اٹھایا ہے۔ ان کے مقرر شدہ مہر دے دو۔

مہر کے احکام اور مسائل

نکاح کے وقت مہر کا فیصلہ کرنا ضروری ہے: ارشاد الٰہی ہے وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّاوَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (سورۃ النساء ۴:۲۴) جو اس کے سوا (عورتیں) ہیں وہ تمھارے لیے حلال ہیں۔ اس طرح کہ تم اپنے اپنے مالوں کے ساتھ حاصل کرو نکاح میں لا کر نہ کہ شہوت رانی کرتے ہوئے سو تم نے ان میں سے جس سے نفع اٹھایا ہے ان کے مقرر شدہ مہر دے دو۔

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جو عورتیں حلال ہیں ان کے ساتھ تعلق اس صورت میں ہو کہ مہر دے کر انھیں قید نکاح میں لایا جائے۔

اس آیت میں تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ (تم اپنے مالوں کے ساتھ چاہو) یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ عورت کو قید نکاح میں لانے سے پہلے حق مہر مقرر کرنا

ضروری ہے۔

مہر دینا ضروری ہے: مندرجہ بالا آیت کے الفاظ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (سو تم ان میں سے جس کے ساتھ نفع اٹھانا چاہو تو انھیں ان کے مقرر شدہ مہر دو) یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ عورتوں سے ازدواجی زندگی کا لطف اٹھانے کے بدلے ان کو مہر ادا کرنا ضروری ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے: وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (النساء:۴) اور عورتوں کے مہر خوشی سے ادا کرو۔

حدیث شریف میں آتا ہے حضرت عقبہ بن عامر کہتے ہیں کہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جن شرطوں کو تم پورا کرتے ہو۔ ان میں سب سے زیادہ ضروری اس شرط کو پورا کرنا ہے جس کی وجہ سے تم نے عورتوں کے ناموس اپنے لیے حلال کیے (بخاری۔ مسلم)

لونڈی کے ساتھ نکاح کرنے کی صورت میں بھی حق مہر ادا کرنا ضروری ہے۔ ارشاد الٰہی ہے فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (سورۃ النساء۴:۲۵) سو انھیں ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح میں لاؤ اور ان کو دستور کے مطابق ان کے مہر دے دو۔

ایسا ہی جب ایک مسلمان ایک غیر مسلم عورت سے شادی کرے تو اس کے متعلق بھی یہی حکم ہے وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ (مائدہ ۵:۵) اور ان میں سے پاک دامن عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی جب کہ تم ان کو ان کے مہر دے دو۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے قرآن مجید نکاح کے وقت مہر کی ادائیگی ضروری قرار دیتا ہے اور حدیث سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے مہر دینا ضروری ہے خواہ بہت ہی تھوڑی رقم ہو لیکن بعض استثنا کی صورتوں میں مہر کی رقم متعین نہیں ہوتی تو بھی نکاح جائز ہے۔

دیا ہوا مہر واپس نہ لو: اسلام نے اعلیٰ اخلاقی اصولوں کی تعلیم دی ہے۔ ان اصولوں کی رو سے مرد کے لیے یہ لازمی قرار دیا ہے کہ اگر وہ اپنی بیوی کو طلاق کے ذریعہ الگ کر رہا ہے تو وہ جو اپنی بیوی کو مہر وغیرہ دے چکا ہے واپس نہ لے بلکہ اسلام نے تو یہاں تک تعلیم دی ہے کہ مطلقہ عورتوں کو کچھ اور دے دلا کر شریفانہ سلوک کے ساتھ رخصت کیا جائے کیونکہ یہ وہ عورتیں ہیں جو ایک عرصہ تک ان مردوں کے ساتھ رہ چکی ہیں۔ قرآن مجید میں آیا ہے: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا (البقرہ۲:۲۲۹) اور تمھارے لیے جائز نہیں کہ تم اس مال سے کچھ لو جو تم نے انھیں دیا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا (النساء۴:۲۰) اور اگر تم ایک بی بی کی جگہ دوسری بی بی سے (نکاح کرنا چاہو) اور تم اسے (پہلی بیوی کو) سونے کا ڈھیر دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ نہ لو۔

مہر کی معافی عورت کے اختیار میں ہے: اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ (البقرہ۲:۲۳۷) مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں۔ مہر چونکہ عورت کا حق ہے اس لیے یہ اسی وقت معاف ہو سکتا ہے۔

معاف کردہ مال تمہارا ہے: فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا (النساء۴:۴) اور اگر عورتیں اپنی خوشی سے کچھ مہر چھوڑ دیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔

اس آیت میں لفظ طِبْنَ ظاہر کرتا ہے کہ عورت کسی دباؤ کے تحت معاف نہ کر رہی ہو بلکہ اپنی خوشی اور آزادی سے معاف کرے تو وہ خاوند کے لیے جائز ہے۔

اگر بعض استثنائی صورتوں میں مہر کی رقم متعین نہ کی گئی ہو تو بھی کچھ دے کر رخصت کرنا چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے: لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً (البقرہ۲:۲۳۶) تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دے دو جب کہ تم نے ابھی ان کو چھوا نہ ہو یا مہر مقرر نہ کیا ہو۔

لونڈی اور اہل کتاب عورت کے متعلق احکام: لونڈی اور غیر مسلم کے ساتھ نکاح کرنے کی صورت میں بھی حق مہر کا ادا کرنا ضروری ہے ارشاد الٰہی ہے: فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (سورۃ النساء۴:۲۵) سو انھیں ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح میں لاؤ اور ان کو دستور کے موافق ان کا مہر دے دو۔

مہر کا مقدار: عورتوں کے مہر پر کوئی حد بندی نہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا (النساء۴:۲۰) اور تم اسے سونے کے ڈھیر دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ نہ لو۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے جتنا مہر کوئی شخص چاہے دے سکتا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ بڑے بڑے فرضی مہر باندھے جائیں بلکہ مہر وہی ہے جو

ادا کر دیا جا سکے۔ ایسے مہر باندھنا جو ایک انسان ادا ہی نہیں کر سکتا صریحاً خلاف قرآن ہے۔ یہاں قنطار (ڈھیر) کا دینا بھی جائز رکھا ہے جو ایک غیر محدود مقدار ہے۔ مگر اٰتَیْتُم کا لفظ بڑھا کر اور دوسری جگہ اٰتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً (عورتوں کو خوشی سے ان کے مہر دو) کا حکم دے کر صاف بتا دیا کہ مہر دینے کی چیز ہے ایسے مہر باندھنا جو دے نہیں سکتا یا جو دینے کا ارادہ نہیں خلاف قرآن شریف ہے۔ احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا هُنَّ خَیْرُ النِّسَاءِ اَیْسَرُهُنَّ صَدَاقًا بہترین عورت وہ ہے جس کے مہر میں سہولت ہو۔ ایک اور حدیث میں ہے۔ اَعْظَمُ النِّسَاءِ بَرَكَةً اَیْسَرُهُنَّ صَدَاقًا سب سے بڑھ کر برکت والی عورت وہ ہے جس کے مہر میں سہولت ہو۔ ایک امیر آدمی اپنی عورت کا مہر لاکھوں روپے بھی باندھتا ہے تو اسے روکنا بھی درست نہیں۔

حضرت عمرؓ کا خطبہ تعیین مہر پر: روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منبر پر چڑھے اور خطبہ دیا اور فرمایا۔ اے لوگو! تم اپنی عورتوں کے مہر بڑھاتے ہو اور رسول کریمؐ اور آپ کے اصحاب کے درمیان مہر چار سو درہم یا اس سے کم ہی ہوتے تھے اور اگر مہر میں زیادتی اللہ کے نزدیک تقویٰ اور عزت کا موجب ہوتی تو تم ان سے اس بات میں سبقت نہ لے جاتے۔ اس لیے میں چار سو درہم سے زیادہ مہر کو تسلیم نہیں کروں گا اور ایک روایت ہے جس قدر چار سو درہم سے زیادہ ہوگا اسے بیت المال میں داخل کرا دوں گا۔ پھر آپ منبر سے اترے تو ایک عورت قریش میں سے سامنے آئی اور کہا اے امیر المومنین آپ نے لوگوں کو چار سو درہم سے زیادہ مہر دینے سے روکا ہے۔ آپ نے کہا۔ ہاں اس نے کہا کیا آپ نے نہیں سنا اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْئًا (۲۰:۴) (اگر تم اسے سونے کے ڈھیر دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ نہ لو) تو حضرت عمرؓ نے کہا۔ اے اللہ معاف فرمائیں سب لوگ عمر سے زیادہ سمجھدار ہیں ایک اور روایت میں ہے کہ اس عورت نے کہا اے خطاب کے بیٹے تو ہم کو روکتا ہے اور اللہ ہم کو دیتا ہے اور مذکورہ آیت پڑھی۔

مہر کی اقسام (پورا اور نصف)

۱۔ پورا مہر (عقد صحیح اور مباشرت صحیح): اگر عقدہ صحیح کے بعد حقیقی مباشرت ہو جائے تو خاوند کے ذمہ پورا مہر واجب الادا ہوتا ہے اگر طے شدہ ہو تو اسی قدر ورنہ مہر مثل، ہاں اگر عورت اپنی مرضی سے اپنے حق سے دست بردار ہو جائے تو الگ بات ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاٰتُوا النِّسَاءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْئًا مَّرِیْئًا (النساء۴:۴) اور عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دو۔ پھر اگر وہ خوشی سے اس میں سب کچھ تمھارے لیے خود دیں تو اسے مزے سے خوش گواری سے کھاؤ۔

اس آیت میں مہر دینے کی تاکید فرمائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان کو بغیر ان کے مطالبہ کے مہر دے دو۔ اس لیے لفظ نِحْلَةً بڑھایا ہے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے مہر پر لڑکی کے والد کا کوئی حق نہیں۔ عرب میں لوگ ایسا کرتے تھے جیسا کہ یہ رواج آج بھی پاکستان کے بعض حصوں میں ہے کہ جب لڑکی کا نکاح کر دیتے ہیں تو اس کے مہر کو خود وصول کر لیتے ہیں پس اس رسم بد سے روکا۔

۲۔ آدھا مہر طلاق قبل از خلوت جب مہر مقرر ہو چکا ہے: نکاح کے وقت مہر مقرر ہو چکا ہے۔ لیکن خلوت نہیں ہوئی تو طلاق پر نصف مہر ادا کرنا ہوگا۔ ہاں البتہ عورت اپنی رضا مندی سے اس نصف مہر سے دست بردار ہو سکتی ہے۔ یا خاوند اگر نصف کی بجائے پورا مہر ادا کرتا ہے تو ایسا کر سکتا ہے۔ جیسا حضرت جبیرؓ بن مطعم سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک بی بی سے نکاح کیا اور قبل از خلوت طلاق دے دی۔ تو سارا مہر ادا کیا اور فرمایا کہ مجھ پر زیادہ حق ہے کہ میں اپنے حق کو چھوڑ دوں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِیْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (البقرہ۲:۲۳۷) اور اگر تم ان کو طلاق دے دو اس سے پہلے کہ تم نے ان کو چھوا ہو اور تم ان کے لیے مہر مقرر کر چکے ہو تو اس کا آدھا دے دو جو مقرر کیا ہو مگر وہ (عورت) معاف کر دیں۔ یا وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اپنا (حق) معاف کر دے۔

۳۔ صرف متعہ (فائدہ) طلاق قبل از تقرر مہر: اگر نکاح کرتے وقت مہر مقرر نہ کیا جائے اور خلوت صحیحہ سے قبل ہی عورت کو طلاق دے دی جائے تو ایسی صورت میں عورت کو مہر نہیں دیا جائے گا لیکن ایسی صورت میں بھی کچھ سامان دینا ضروری ہے۔ وہ رقم حالات کے لحاظ سے ہوگی۔ امیر کے لیے زیادہ غریب کے لیے کم۔ خواہ مرد خود دے یا حاکم مقرر کرے۔ ارشاد الٰہی ہے: لَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَالَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِیْضَةً وَّمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ (البقرہ۲:۲۳۶) تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم ان عورتوں کو طلاق دے دو۔ جب کہ تم نے ابھی ان کو چھوا نہ ہو یا مہر مقرر نہ کیا ہو اور ان کو کچھ سامان دو۔ فراخی والا اپنی قدر کے مطابق اور تنگ دست اپنی قدر کے مطابق۔

۴۔ مہر مثل مہر مقرر نہیں کیا گیا اور خلوت صحیحہ ہو: عقد صحیح کے بعد خلوت صحیحہ ہوگئی ہے لیکن مہر مقرر نہیں کیا گیا اس صورت میں مہر مثل ادا کرنا ہو گا۔ یعنی وہ مہر جو عام طور پر عورت کے خاندان میں رائج ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اس کی حقیقی بہنوں' چچا زاد بہنوں' پھوپھیوں یا پھوپھی کی بیٹیوں کا مہر معتبر تسلیم کیا جائے گا۔ لیکن ساتھ ہی ان کی ہم عمری' حسن و جمال' عقل و فہم' ہم عصری' ہم شہری ہونے کو بھی نظرانداز نہ کیا جائے گا۔

مقدار کے لحاظ سے مہر کی اقسام

مقدار کے لحاظ سے مہر کی تین اقسام بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ مہر مقررہ۔ ۲۔ مہر مسمی۔ ۳۔ مہر مثل۔

۱۔ مہر مقررہ: مہر مقررہ سے مراد یہ ہے کہ معاہدہ نکاح کے وقت مہر کی خاص تعداد یا رقم کی مقدار مقرر کر دی جاتی ہے۔ معاہدہ نکاح کے وقت یا اس سے قبل یا بعد میں بھی فریقین باہمی رضامندی سے رقم تعین کر سکتے ہیں۔ شریعت نے مہر مقررہ کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر نہیں کی ہے۔ بعض حنفی فقہاء کے نزدیک کم از کم مہر تین درہم ہے جبکہ اہل تشیع نے کم از کم مقدار مقرر نہیں کی ہے۔

۲۔ مہر مثل: اگر معاہدہ نکاح کے وقت مہر کی رقم مقرر نہ کی گئی ہو یا یہ طے کر لیا گیا ہو کہ عورت کو کوئی مہر ادا نہ کیا جائے گا۔ تب بھی عورت کو حق مہر سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ اس صورت میں بھی نکاح درست ہوگا اور عورت مہر مثل کی مستحق ہوگی۔ مہر مثل سے مراد یہ ہے کہ اس عورت کے خاندان کی دوسری عورتوں مثلاً بہن' پھوپھی زاد' چچی زاد' بہن وغیرہ کا جو عام مہر مقرر کیا جاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ عورت اپنے خاندان کی عورتوں کی برابری عمر' مال' علم' ادب' عقل و تمیز' ذہانت و پاکبازی اور زمانہ و مقام وغیرہ میں کرتی ہو۔

ادائیگی کے اعتبار سے مہر کی اقسام

۱۔ مہر معجل۔ ۲۔ مہر موجل۔ ۳۔ مہر مطلق۔ ۴۔ مہر منجم۔

۱۔ مہر معجل: مہر معجل سے مراد یہ ہے کہ وقت نکاح کی کل مقدار یا اس کے کسی معینہ جزو کو معجل (فوری ادائیگی) قرار دیا جائے تو عندالطلب اس کی ادائیگی شوہر پر فرض ہوگی' خواہ تعلقات زوجیت قائم ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں۔ اگر خاوند عندالطلب زوجہ کو مہر معجل ادا کرنے سے انکار کر دے تو بیوی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ حقوق زن شوئی غصب کر لے یا اپنے خاوند کے ساتھ رہنے سے انکار کر دے۔ اگر خاوند حقوق زن شوئی کے لیے دعویٰ دائر کرے تو عدالت اس کی دادرسی نہ کرے گی تاوقتیکہ وہ مہر معجل کی مقرر رقم ادا نہ کر دے۔ اگر کوئی شوہر یہ عذر تراشے کہ اس نے کچھ رقم یا کوئی شے رقم کے عوض بیوی کے رشتہ داروں کو مہر کے طور پر دی ہے تو عدالت اس وقت اس عذر کو تسلیم نہ کرے گی جب تک شوہر اس کا ثبوت پیش نہ کرے۔ کیا اس نے واقعی وہ رقم مہر کے طور پر ادا کی ہے۔ اس صورت میں بیوی کو حق ہوگا کہ وہ مہر کی رقم مکمل وصول کرے اور اس عذر کو تسلیم نہ کرے۔

۲۔ مہر موجل: مہر موجل سے مراد یہ ہے کہ خاوند مہر فی الفور ادائیگی کا پابند نہیں ہوتا بلکہ وقت نکاح اس مہر کی رقم کی ادائیگی کے لیے کوئی خاص مدت متعین کر دی جاتی ہے۔ پوری مدت ہونے کے بعد مہر واجب الادا قرار پاتا ہے۔ ورنہ موت یا طلاق سے نکاح فسخ ہو جانے کی صورت میں واجب الادا قرار پاتا ہے اور بیوی اس کی وصولیابی کا تقاضا کر سکتی ہے۔ عام طور پر مہر موجل کا رواج کم ہے۔

۳۔ مہر مطلق: مہر مطلق سے مراد یہ ہے کہ وقت نکاح یہ طے نہ کیا جائے کہ مہر معجل ہے یا موجل' تو مہر مطلق قرار پائے گا۔ اس کی ادائیگی کے بارے میں اہل تشیع اور اہل سنت کے فقہاء میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

۴۔ مہر منجم: اگر پورے مہر یا اس کا کچھ حصہ کی ادائیگی قسطوں میں کرنا طے پائے تو اس مہر کو مہر منجم کہتے ہیں۔

شغار: اسلام سے قبل عربوں میں ''شغار'' شادی کی ایک مسلمہ رسم موجود تھی یعنی وہ شادی باہمی تبادلہ سے ہوتی یعنی ایک شخص کی لڑکی یا اپنی بہن یا وہ جس کی تولیت اس کے سپرد ہوتی تھی۔ دوسرے کے نکاح میں دے دیتا اور اس کی لڑکی یا بہن یا جس کی تولیت اس کے سپرد ہو۔ اپنے نکاح میں لے لیتا۔ دونوں فریق مہر مقرر نہیں کرتے تھے۔ اس رسم کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قطعاً ناجائز قرار دیا کیونکہ اس طریق سے عورت اپنے مہر سے محروم ہو جاتی تھی (بخاری کتاب النکاح باب الشغار)

ولیمہ: نکاح کی رسم مکمل ہونے کے بعد دلہن کو سسرال لایا جاتا ہے۔ اس کے بعد شادی کی ضیافت کی جاتی ہے اس کو ولیمہ کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ ضیافت نکاح کے مشتہر کرنے کا ایک ذریعہ ہے اس لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تاکید فرمائی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے متعلق روایت ہے جب ان کے چہرہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زردی کے نشانات دیکھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دریافت کرنے پر حضرت عبدالرحمٰن نے فرمایا کہ نکاح کیا ہے آپ نے ان کے لیے دعا فرمائی اور ان سے کہا کہ ولیمہ کا انتظام کریں خواہ مہمانوں کے لیے صرف ایک بکری ہی ہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت صفیہ سے شادی کی تو خیبر سے واپس آتے ہوئے دعوت ولیمہ دی۔ جس میں ہر شخص کو اپنا اپنا کھانا لانے کے لیے کہا گیا۔ حضرت زینب کے ساتھ نکاح کے موقعہ پر بھی آپ نے دعوت ولیمہ پر اپنے دوستوں کو بلایا۔

طلاق

معنی و مفہوم: لغت میں طلاق کے اصل معنی بندش سے آزاد کرنا ہیں۔ لیکن فقہ کی اصطلاح میں اپنی بیوی سے نکاح کی پابندیاں اٹھانے کا نام طلاق ہے۔

عقد نکاح فریقین کے مابین ایک ایسا مقدس معاہدہ ہوتا ہے جس کی رو سے دونوں پر ایک دوسرے کے حقوق واجب ہو جاتے ہیں۔ وہ شرعی اخلاقی اور معاشرتی بندش میں جکڑے جاتے ہیں لیکن طلاق مرد اور بیوی کو ان قیود اور بندشوں سے آزاد کر دیتی ہے۔ طلاق کی بعض صورتوں میں جدائی ناقص اور بعض صورتوں میں جدائی کامل ہو جاتی ہے۔ ناقص جدائی کی حالت میں بندشوں اور پابندیوں میں کچھ کمی آ جاتی ہے اور کامل جدائی کی حالت میں نکاح مکمل طور پر زائل ہو جاتا ہے اگر عورت چاہے تو وہ کسی دوسرے مرد کے عقد نکاح میں جا سکتی ہے۔ اس کی تفصیلات بعد میں آئیں گی۔

طلاق کا قانون تورات میں: یہودیت میں طلاق کا اختیار خاوند کو حاصل ہے۔ جب چاہے ادنیٰ وجوہ کی بناء پر طلاق دے سکتا ہے۔ کیونکہ یہودیت میں عورت کی حیثیت محض ایک مملوکہ شے کی ہے اور مرد مالک اور مختار، شریعت کے تمام احکام اسی مرکزی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ چنانچہ تورات میں لکھا ہے: ''اگر کوئی مرد عورت لے لئے اس سے شادی کر لے اور بعد میں ایسا ہو کہ وہ اس کی نگاہ میں عزیز نہ ہو۔ اس سبب سے کہ اس نے اس میں کچھ پلید بات پائی ہو تو وہ اس کا طلاق نامہ لکھ کر اس کے ہاتھ دے اور اسے اپنے گھر کے باہر کر دے۔'' (استثناء ۲۴:۱)

قانون طلاق عیسائیوں میں: فریسیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا ''کیا جائز ہے کہ مرد ایک سبب سے اپنی بیوی کو طلاق دے دے'' (متی ۱۹:۳)

آپ نے فرمایا ''جسے خدا نے ملایا ہے۔ اسے انسان جدا نہ کرے (متی ۱۹:۶)

ایک لمبے عرصہ تک مسیحی دنیا اس قانون پر عامل رہی۔ جب عملی زندگی میں میاں بیوی کے درمیان تفریق نہ ہونے کی وجہ سے دشواریاں پیدا ہوئیں تو یہ قانون وبال جان بنا تو مشرقی کلیسا نے بعض حالتوں میں طلاق کو جائز قرار دیا مگر مغربی کلیسا نے اس کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

چنانچہ 1910ء میں انگلستان میں طلاق اور نکاح کے مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اس نے سفارش کی کہ ''باب طلاق کے اعتبار سے مرد اور عورت دونوں کو مساوی قرار دیا جائے۔ یعنی جن وجوہ کی بناء پر مرد طلاق ڈگری پانے کا مستحق ہے انہی وجوہ کی بناء پر عورت بھی طلاق کرنے کی مستحق ہے 1923ء کے قانون میں یہ شامل کر لیا گیا کہ مرد اگر ایک مرتبہ بھی زنا کا ارتکاب کرے تو عورت مرد سے طلاق لے سکتی ہے۔

ہندو مذہب: ہندو مذہب میں طلاق کا قانون غیر انسانی اقدار پر مبنی ہے۔ صرف عورت کو طلاق لینے کے حق سے محروم ہی نہیں رکھا گیا بلکہ عورت کو مرد کے ہاتھ میں قیدی بنا دیا گیا ہے۔

جاہلیت میں قانون طلاق: اسلام سے پہلے جاہلیت میں دستور یہ تھا کہ مرد عورتوں کو متعدد طلاقیں دیتا اور رجوع کر لیتا اور اس طرح برسوں عورتوں کو ستاتا رہتا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ ایک شخص جب چاہتا اپنی بیوی کو طلاق دیتا اور عدت کے اندر رجوع کر لیتا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ عورت اس مرد کی زوجیت سے نکل نہیں سکتی تھی۔ ایک مرد سو سے اوپر تک طلاق دیا کرتا تھا۔

اسلام کے قانون طلاق میں اعتدال: اسلام نے جو طلاق کا قانون پیش کیا ہے وہ افراط و تفریط سے پاک اور اعتدال پر مبنی ہے۔ اس قانون میں مرد اور عورت دونوں کو پورا حق دیا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہیں لیکن یہ حق مخصوص حالات کے تابع ہے۔ اگر میاں بیوی دیکھیں کہ وہ ایک دوسرے کے حقوق و فرائض ادا نہیں کر سکتے۔ ان کے اکٹھا رہنے سے اولاد اور دوسرے رشتہ داروں پر برا اثر پڑتا ہے۔ نکاح کی روح مجروح ہوتی ہے تو اس وقت میاں بیوی ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ (البقرہ ۲:۲۳۶) یعنی تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو۔

قرآن مجید اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ واضح تعلیم ہے کہ علیحدہ ہونے سے پہلے ہر ممکن کوشش کر لینی چاہیے کہ حالات سدھر جائیں جن

کی بناء پر علیحدگی اختیار کی جارہی ہے۔ اسلام نے طلاق کے بارہ میں عجلت سے روکا ہے۔ شریعت اسلام میں گو طلاق جائز ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حلال چیزوں میں سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ (مشکوٰۃ المصابیح الطلاق) حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز اللہ تعالیٰ کو طلاق ہے۔ لَاخَلَقَ اللّٰهُ شَيْئًا عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ اَبْغَضَ اِلَيْهِ مِنَ الطَّلَاقِ (مشکوٰۃ المصابیح کتاب الطلاق ص۲۸۴) اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر طلاق سے بڑھ کر کوئی چیز مبغوض پیدا نہیں کی۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (النساء ۱۹:۴) اگر تم انھیں ناپسند کرتے ہو تو ہوسکتا ہے تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت سی بھلائی رکھ دے یہ آیت طلاق سے باز رہنے کی ترغیب دیتی ہے۔

طلاق کے احکام: اسلامی سوسائٹی کی بنیاد محبت اور اخوت پر ہے۔ سوسائٹی کے تمام افراد جسم کے اعضاء کی مانند ہیں۔ جس طرح جسم کے کسی ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو تمام جسم تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی کے کسی ایک فرد کو تکلیف پہنچے تو تمام سوسائٹی اس تکلیف سے متاثر ہوتی ہے۔ اس اصول کے تحت گو طلاق کو حلال قرار دیا ہے لیکن اس فعل کو ناپسندیدہ اور مبغوض سمجھا ہے۔ اسی وجہ سے اس فعل حلال کو روکنے کے لیے اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ اگر میاں بیوی کے درمیان کشیدگی اور اختلاف پیدا ہو جائے تو جہاں تک ممکن ہو دونوں میں صلح کرانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا (النساء ۴: ۳۵)

اگر تم کو دونوں (میاں بیوی) میں باہم دشمنی کا ڈر ہو تو ایک فیصلہ کرنے والا اس مرد کے لوگوں میں سے ایک فیصلہ کرنے والا اس عورت کے لوگوں میں سے مقرر کرو۔ اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ ان میں موافقت کر دے گا بے شک اللہ جاننے والا خبردار ہے۔

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْاِعْرَاضًا فَلَاجُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ. (النساء ۴: ۱۲۸)

اور اگر ایک عورت کو اپنے خاوند کی زیادتی یا بے رغبتی کا ڈر ہو تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ آپس میں صلح کرلیں اور صلح اچھی چیز ہے۔

ان آیات میں منصفین کا یہ کام بیان کیا ہے کہ وہ میاں بیوی کی کشیدگی کی وجوہ معلوم کر کے ان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کریں۔ صلح کی کوشش ناکام ہونے کی صورت میں آخری انقطاع ہوگا۔ اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خاوند اپنی مرضی سے نکاح فسخ نہیں کرسکتا۔ فیصلہ منصفوں کے ہاتھ میں ہوگا اور فریقین کو منصفوں کے فیصلہ کی پابندی لازمی ہوگی۔

حالت طہر میں طلاق دی جائے: حالت حیض میں میاں بیوی زن شوئی تعلقات سے الگ ہوتے ہیں۔ ناراضی اور کشیدگی کے دور کرنے کے مواقع نہیں ملتے۔ مگر حالت طہر میں خاوند بیوی میں تعلقات قائم ہوتے ہیں اور اختلاف کے دور کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے ایام حیض میں طلاق دینا ممنوع قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (البقرہ ۲: ۲۲۸) اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں۔ قرء حالت طہر سے حالت حیض میں داخل ہونے کا نام ہے۔ اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے حالت حیض میں طلاق دے دی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سخت ناراض ہوئے اور رجوع کا حکم دیا۔ (بخاری کتاب الطلاق باب قول اللہ تعالیٰ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ (النساء)

گواہ: دو گواہوں کی موجودگی میں طلاق دی جائے۔ ارشاد الٰہی ہے وَاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (الطلاق ۶۵: ۲) یعنی طلاق دیتے وقت دو معتبر گواہ بنالو۔

عدت گزارنا: یہ زمانہ انتظار ہے جس میں میاں بیوی ایک دوسرے سے مصالحت کر سکتے ہیں۔ ہر طلاق کے بعد عدت مقرر کی گئی ہے۔ ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (الطلاق ۶۵: ۱)

اے نبیؐ جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انھیں عدت کے شروع میں طلاق دو۔

عدت تین طہر ہیں جیسا کہ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ سے ظاہر ہے۔ عام حالتوں میں یہ تقریباً چار مہینہ کا عرصہ ہوتا ہے۔ جن عورتوں کے حیض بند ہو گئے ہیں ان کی عدت تین ماہ کی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَالّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ (الطلاق ۶۵: ۴)

اور جو تمہاری عورتوں میں سے حیض سے ناامید ہو چکی ہوں اگر تمھیں شک ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہے۔

اور حاملہ عورتوں کا زمانہ انتظار وضع حمل تک ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق ۶۵: ۴) اور حمل والی

عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ بچہ جنیں۔

عدت گزر جانے کے بعد دوبارہ نکاح کی اجازت ہے: عدت گزر جانے کے بعد بھی دوبارہ نکاح کی اجازت ہے۔ ارشاد ہے: وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ (البقرہ۲:۲۳۲) اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور پھر وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں تو انھیں اس بات سے مت روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کر لیں جب آپس میں پسندیدہ طور پر راضی ہوں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ معقل بن یسار کی ہمشیرہ کو اس کے خاوند نے طلاق دے دی۔ جب عدت گزر گئی تو خاوند نے دوبارہ اس سے نکاح کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ معقل نے انکار کر دیا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی تو معقل نے اپنی ہمشیرہ کا نکاح اس کے خاوند سے کر دیا۔ بیوہ بھی رضامند تھی۔

علیحدگی ہو جائے تو دونوں اللہ پر بھروسہ رکھیں: اگر فریقین میں مصالحت کامیاب نہ ہو سکے اور میاں بیوی کے درمیان تفریق ضروری ہو جائے تو دونوں اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ ارشاد الٰہی ہے: وَإِنْ يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِنْ سَعَتِهِ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا (النساء۴:۱۳۰) اور اگر وہ دونوں جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنی کشائش سے غنی کر دے گا اور اللہ وسعت والا' حکمت والا ہے۔

طلاق کی حد: زمانہ جاہلیت میں طلاق کی کوئی حد نہ تھی۔ مرد عورتوں کو متعدد طلاقیں دے دیتے اور رجوع کر لیتے۔ اسلام نے اس رسم کو باطل قرار دے کر طلاق کی حد مقرر کر دی ہے۔ قرآن مجید کی رو سے ایک مرد اپنی بیوی کو صرف دو طلاق رجعی دینے کا حق رکھتا ہے۔ دو بار طلاق دینے کے بعد جب کبھی بھی تیسری بار طلاق دے گا' عورت مستقل طور پر اس سے اس طرح جدا ہو جائے گی پھر نہ اس سے رجوع ہی ممکن ہوگا اور نہ حلالے کے بغیر نکاح ہی ممکن ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ (البقرہ۲:۲۲۹) طلاق دو دفعہ ہے۔ پھر پسندیدہ طور پر رکھنا یا سلوک سے رخصت کرنا ہے۔

طلاق رجعی میں رجوع: طلاق رجعی سے مراد وہ طلاق ہے جو صریح لفظ طلاق سے دی گئی ہو اس کی حدود کا پہلے ذکر ہو چکا ہے اور اس طلاق سے عدت کے دوران مرد جب بھی چاہے رجوع کر سکتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ (البقرہ۲:۲۲۹) (طلاق رجعی کے بعد) یا تو اچھے طریقے پر روک رکھو یا حسن سلوک سے رخصت کرو۔

شوہر کو رجعت کا حق ہے: ارشاد الٰہی ہے: وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا (البقرہ۲:۲۲۸) اور اس (اثنا) میں ان کے خاوند ان کو واپس لینے کے لیے زیادہ حق دار ہیں اگر وہ اصلاح چاہیں۔

علیحدگی کی صورت میں شریفانہ رویہ اختیار کرو: اگر خاوند اپنی بیوی سے رجوع کرے تو اس رجوع کا مقصد نیک ہونا چاہیے اور خاوند اپنی بیوی کو حسن سلوک کے ساتھ رکھے اور اس کے ساتھ محبت کی زندگی گزارے۔ طلاق دینے کے بعد محض اس نیت سے رجوع کرنا کہ بیوی کو ایذا رسانی پہنچانے کا موقع ہاتھ آ جائے گا ایک مسلمان کے لیے کسی طرح مناسب نہیں۔ یہ اللہ کے احکام کے ساتھ تمسخر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِتَعْتَدُوا وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا (البقرہ۲:۲۳۱) اور جب عورتوں کو طلاق دو پھر اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو (یا) انھیں اچھی طرح سے رکھو یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کرو اور ان کو دکھ دینے کے لیے نہ روک رکھو تاکہ تم زیادتی کرو جو ایسا کرتا ہے وہ اپنی جان پر ظلم کرتا ہے اور اللہ کے احکام سے ہنسی نہ کرو۔

دوسری جگہ آتا ہے: لِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (البقرہ۲:۲۴۱) اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہے ان کو معروف دستور کے مطابق کچھ دیا جائے یہ متقیوں پر لازم ہے۔

دیا ہوا مال واپس نہیں لینا چاہیے: مطلقہ سے وہ مال جو اس کو دیا جا چکا ہے واپس نہیں لینا چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے: لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ (البقرہ۲:۲۲۹) تمھارے لیے ہرگز جائز نہیں کہ دیے ہوئے مال میں سے ان سے واپس لو۔

تین طلاق کے بعد قطعی علیحدگی: دو طلاقوں کے بعد تک تو مرد کو اختیار ہے کہ وہ عدت کے دوران رجوع کرے اور عدت کے بعد نکاح کر لے۔ تین طلاق کے بعد عدت گزرنے کے بعد قطعی جدائی اور علیحدگی ہے' ہاں صرف ایک صورت ہے وہ حلالہ ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ (البقرہ۲:۲۳۰) پھر اگر وہ اسے تیسری بار طلاق دے تو وہ عورت اس کے بعد اس کے لیے حلال نہیں یہاں تک کہ وہ اس کے سوا کسی دوسرے خاوند سے نکاح کرے۔

حلالہ کے بعد دوبارہ میاں بیوی نکاح کر سکتے ہیں: تیسری طلاق کے بعد بیوی نے کسی اور خاوند سے شادی کر لی ہے اور اس کے خاوند نے ہم بستری بھی کر لی ہے۔ پھر خاوند اپنی خوشی سے طلاق دے دے۔ عدت گزرنے کے بعد پہلا شوہر نکاح کر سکتا ہے۔ اس صورت کو شریعت میں "حلالہ" کہتے ہیں "ارشاد الٰہی ہے: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (البقرہ: ۲-۲۳۰) اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو ان دونوں پر کچھ گناہ نہیں۔ اگر وہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لیں۔ اگر ان کو یقین ہو کہ اللہ کی حدود کو قائم رکھیں گے۔

عدت تک گھر میں رکھو: جب خاوند کسی عورت کو طلاق دے دے تو اس کو فوراً گھر سے نہ نکال دے بلکہ مطلقہ عورت کو عدت گزارنے کے لیے اپنے مکان میں ہی جگہ دینے کا حکم ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ (الطلاق ۶:۶۵) تم اپنی مطلقہ عورتوں کو عدت گزارنے میں وسعت کے مطابق مکان دو جہاں تم رہتے ہو۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ (الطلاق ۱:۶۵) اور اللہ سے ڈرو جو تمہارا پروردگار ہے ان کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں۔

ایذا نہ دو: جب مطلقہ عورت خاوند کے گھر میں عدت گزار رہی ہو تو اس کو ایذا نہیں دینی چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ (الطلاق ۶:۶۵) ان کو تنگ کرنے کے لیے ایذا نہ پہنچاؤ (تاکہ وہ تمہارا مکان چھوڑ کر چلی جائیں)

بے حیائی کریں تو نکال دو: اگر مطلقہ عورت بے حیائی کا کام کرتی ہے تو اس صورت میں خاوند کے لیے جائز ہے کہ وہ مطلقہ کو گھر سے نکال دے۔ ارشاد الٰہی ہے: اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (الطلاق ۱:۶۵) ہاں اگر وہ کھلی بے حیائی کرنے لگیں (تو انھیں گھر سے نکال دینے میں کوئی حرج نہیں) مطلقہ حاملہ کا خرچ خاوند برداشت کرے۔ اگر مطلقہ عورت حاملہ ہے تو خاوند وضع حمل تک خرچ برداشت کرے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق ۶:۶۵) اور اگر (مطلقہ) عورتیں حمل والی ہیں تو بچہ ہونے تک ان کا خرچ دیتے رہو۔

دودھ پلانے کا معاوضہ: اگر عورت بچے کو دودھ پلائے تو دودھ پلانے کا معاوضہ خاوند کے ذمے ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ (الطلاق ۶:۶۵) پھر اگر وہ تمھارے لیے دودھ پلائیں تو ان کو ان کا معاوضہ دو۔

طلاق کی قسمیں (صریح و کنایہ کے لحاظ سے)

۱۔ طلاق رجعی: طلاق رجعی سے مراد وہ طلاق ہے جو صریح لفظ طلاق سے دی گئی ہو۔ یہ طلاق دو مرتبہ وارد ہو سکتی ہے اور اس میں عدت کے دوران مرد جب بھی چاہے رجوع کر سکتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (البقرہ ۲:۲۹۹) طلاق دو دفعہ ہے پھر پسندیدہ طور پر رکھنا یا حسن سلوک سے رخصت کرنا ہے۔ فقہ میں اسے بیونت خفیفہ کہتے ہیں یعنی ناقص جدائی۔

۲۔ طلاق بائن یا مغلظہ: جب تین طلاقیں دی جائیں تو وہ طلاق مغلظہ کہلاتی ہے۔ اس طلاق کے بعد میاں بیوی رجوع نہیں کر سکتا۔ ہاں دوبارہ نکاح کی ایک ہی صورت ہے کہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کرے اور وہ خاوند اپنی مرضی سے طلاق دے دے تو پہلا خاوند اور مطلقہ عورت چاہیں کہ دوبارہ شادی کر لیں تو عورت عدت گزارنے کے بعد پہلے خاوند سے شادی کر سکتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (البقرہ ۲:۲۳۰) پھر اگر وہ تیسری بار طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے بعد اس کے لیے حلال نہیں۔ یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے خاوند سے نکاح کرے پھر اگر وہ اسے طلاق دے دے تو ان دونوں پر کچھ گناہ نہیں۔ اگر وہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لیں بشرطیکہ ان کو یقین ہو کہ اللہ کی حدود کو قائم رکھیں گے۔ فقہ میں اس طلاق کو بیونت غلیظہ کہتے ہیں یعنی کامل جدائی۔

طلاق وارد کرنے کی تین صورتیں (سنت اور بدعت کے لحاظ سے)

۳۔ طلاق بدعی: طلاق دینے کی تین صورتیں ہیں۔ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے دی جائیں اور ان کو تین طلاقیں خیال کر لی جائیں۔ یہ طلاق بدعی ہے۔ اس طلاق کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سخت ناپسند کیا ہے۔ نسائی کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک شخص کے متعلق خبر دی گئی کہ اس نے اپنی بیوی کو تین مرتبہ اکٹھی طلاق دے دی ہے: فَقَامَ غَضْبَانًا ثُمَّ قَالَ اَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَاَنَا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ (مشکوٰۃ المصابیح الخلع

والطلاق ص ۲۸۴) آپ غصہ میں اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ کیا اللہ کی کتاب سے ہنسی کی جاتی ہے اور میں تمھارے درمیان ہوں۔

اکٹھی تین طلاقیں دینے کا رواج زمانہ جاہلیت میں تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس رواج کو ختم کیا ہے اور بیک وقت تین طلاقیں دینے کو تسلیم نہ کیا۔ ابو داؤد ترمذی کی حدیث ہے رکانہ بن یزید رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں تو آپ نے فرمایا کہ تیرا ارادہ کیا تھا۔ تو کہا کہ میرا ارادہ ایک ہی طلاق کا تھا۔ آنحضرتؐ نے رجوع کی اجازت دے دی (مشکوٰۃ المصابیح باب الخلع والطلاق ص ۲۸۴)

صاحب فتح القدیر کہتے ہیں کہ اس مسئلہ پر ایک ایسی نص ہے کہ جس میں کوئی تاویل نہیں ہو سکتی۔

بنابریں طلاق صرف ایک دفعہ دی جائے گی اور جب یہ دی جائے تو عدت شروع ہو جائے گی اور اس عرصہ کے اندر فریقین کو طلاق کے منسوخ کرنے کا حق حاصل ہے۔ حالت حیض میں یا ایسی حالت میں طلاق دی جائے جس میں ہم بستری کی گئی' یہ طلاق بھی بدعی ہے۔

طلاق حسن: طلاق کی دوسری صورت یہ ہے کہ ایک آدمی بیوی کو پہلی طلاق طہر میں دیتا ہے۔ پھر دوسرے طہر میں دوسری طلاق' پھر تیسرے طہر میں تیسری طلاق دیتا ہے۔ جب کہ ان ایام میں ہم بستری نہ کی ہو۔ فقہاء نے اس طریق کو طلاق حسن کہا ہے۔ یعنی طلاق وارد کرنے کا بہتر طریقہ۔

طلاق احسن: تیسری صورت یہ ہے کہ ایک طہر میں صرف ایک دفعہ طلاق دی جائے۔ اس کے بعد عدت کی مدت گزار دی جائے۔ اس طہر میں ہم بستری نہ کی ہو۔ یہ وہ طریقہ ہے جس کا حکم قرآن وحدیث سے ہوتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ (الطلاق ۶۵ آیت ۱) اے نبیؐ جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انھیں ان کی عدت کے لیے ہی طلاق دو اور عدت گنتے رہو اور اپنے اللہ سے ڈرو جو تمہارا پروردگار ہے۔

یہی وہ طلاق ہے جو قرآن کریم کی آیات سے صاف معلوم ہوتی ہے اور جس کا پتہ احادیث سے بھی لگتا ہے۔ یہی وہ طریقہ ہے جسے اختیار کرنا چاہیے۔ دوسرے طریق اختیار کر کے مسلمانوں کو اس قدر ذلت دیکھنی پڑی ہے۔ جس کا بیان نہیں ہو سکتا اور قرآن شریف کی صراحت کے یہ خلاف ہے کہ مرد عورت کو طلاق دے تو اسے عدت میں رجوع کرنے کا اختیار نہ رہے۔ دوسرے طریقوں کو اختیار کرنے کا نتیجہ ہی وہ حیوانیت کا طریقہ ہے جسے حلالہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

طلاق ایک ہی ہے خواہ سو دفعہ کہے یا تین دفعہ۔ خواہ اسے ہر روز کہتا جائے یا ہر ماہ میں ایک دفعہ کہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ جیسا کہ رکانہ بن یزید کے تین دفعہ طلاق دینے کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک طلاق شمار کیا تھا۔ اس طرح ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین دفعہ طلاق دی تو آپؐ نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

شرائط طلاق

۱۔ عقل: طلاق دینے والا عقل میں ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''ہر طلاق جائز ہے سوائے مدہوش اور جس کی عقل پر غلبہ ہو۔'' (ترمذی کتاب الطلاق)

۲۔ اختیار: اکراہ اور جبر کی صورت میں طلاق متصور نہ ہوگی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اکراہ اور جبر کی حالت میں طلاق اور عتاق (آزاد کرنا) نہیں ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح باب الخلع والطلاق)

۳۔ بلوغت: شریعت اسلامی میں نابالغ مکلف نہیں ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں ''تین آدمیوں سے باز پرس نہیں ہوتی۔ سونے والا حتیٰ کہ وہ بیدار نہ ہو جائے۔ بچے سے حتیٰ کہ وہ بالغ ہو۔ مغلوب العقل سے حتیٰ کہ وہ ہوش میں آ جائے (ابن ماجہ الطلاق المعتوہ)

۴۔ گواہ: دو گواہوں کی موجودگی کے بغیر طلاق درست نہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (الطلاق ۶۵:۲) اپنے میں دو گواہ رکھ لو اور گواہی کو اللہ کے لیے درست ادا کرو۔

۵۔ حالت طہر میں طلاق: ارشاد الٰہی ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (الطلاق ۶۵:۱) اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انھیں ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دی۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علم ہوا تو آپ سخت ناراض ہوئے اور رجوع کا حکم دیا۔

عدت

معنی و مفہوم: عدت کا لفظ عَدٌّ کا مصدر ہے۔ جس کے معنی ہیں شمار کرنا۔ لیکن شریعت کی اصطلاح میں اس انتظار اور توقف کو کہتے ہیں جو مطلقہ یا بیوہ طلاق یا خاوند کی وفات کے بعد کرتی ہے۔ اس عرصہ میں عورت نکاح نہیں کر سکتی۔

عدت کی اقسام: عدت کی دو اقسام ہیں (۱) عدت وفات (۲) عدت طلاق

۱۔ عدت وفات: جس عورت کا خاوند مر جائے وہ عورت خاوند کی وفات کے چار ماہ دس دن تک انتظار کرے۔ اس مدت کے دوران نہ شادی کر سکتی ہے نہ پیغام شادی وغیرہ دے سکتی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا (البقرہ۲:۲۳۴) تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور اپنے پیچھے اگر بیویاں زندہ چھوڑیں تو وہ اپنے آپ کو چار ماہ دس دن تک روکے رکھیں۔

۲۔ عدت طلاق: اس کی تین صورتیں ہیں:۔

(الف) مطلقہ حاملہ نہ ہو: اس صورت میں عدت تین قروء ہیں ارشادِ الٰہی ہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (البقرہ۲:۲۲۸) اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہے وہ تین قروء تک اپنے آپ کو روکے رکھیں۔

قُرُوْٓءٍ قَرْءٌ کی جمع ہے۔ قَرْءٌ حالت طہر سے حالت حیض میں داخل ہونے کا نام ہے اور چونکہ یہ لفظ قروء دونوں باتوں کا جامع ہے یعنی طہر اور حیض کا۔ اس لیے بعض وقت دونوں پر الگ الگ بھی بولا جاتا ہے (مفردات امام راغب)

امام ابوحنیفہ کے نزدیک قُرُوْٓءٍ سے مراد حیض ہیں اور امام شافعی اس سے طہر مراد لیتے ہیں۔

امام شافعی کے نزدیک: پس ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ یہ ہے کہ عورت تین دفعہ حالت طہر سے حالت حیض میں آئے۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت تین دفعہ حالت حیض سے حالت طہر میں آئے۔ دونوں صورتوں میں عام طور پر تقریباً تین ماہ کی عدت ہوتی ہے۔

طلاق کی ہر صورت یعنی طلاق رجعی، طلاق بائن دونوں صورتوں میں ہی عدت ہے۔

(ب) مطلقہ حاملہ ہو: حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل تک ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق ۶۵:۴) اور حمل والی عورتوں کی عدت یہ ہے کہ بچے کی ولادت ہو جائے۔

(ج) آئسہ اور نابالغہ ہو: بیوی کو حیض نہ آتا ہو۔ یعنی کم سن ہو یا آئسہ ہو یعنی عمر بڑھ جانے کی وجہ سے حیض ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔ اس کی عدت طلاق کے وقت سے تین ماہ تک ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَالّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ (الطلاق ۶۵:۴) اور جو تمہاری عورتوں میں سے حیض سے ناامید ہو چکی ہیں اگر تمہیں شک ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور (ان کی بھی) جنہیں حیض نہیں آتا۔

آیت کے اس حصے میں دو قسم کی عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کا قرء سے عدت شمار نہیں ہو سکتی۔ ایک وہ جو اس قدر بوڑھی ہو گئی ہو کہ انہیں حیض آنا موقوف ہو گیا ہو اور یہاں ارتبتم اس لیے بڑھایا ہے کہ بعض وقت بیماری کی صورت ہو جاتی ہے۔ جسے استحاضہ کہتے ہیں۔ ماہوار ایام نہیں ہوتے۔ دوسری وہ عورتیں جنہیں ابھی حیض آیا ہی نہیں یعنی کم سن ہیں۔

مباشرت کے بغیر طلاق دینے کی صورت میں عورت کی عدت: اگر کسی عورت کو مباشرت کے بغیر طلاق دے دی گئی ہو تو اس پر کوئی عدت نہیں۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ کسی عورت کا نکاح کر دیا جاتا ہے۔ لیکن رخصتی سے قبل ہی طلاق دے دی جاتی ہے اور میاں بیوی میں زن شوئی کے تعلقات قائم نہیں ہو سکے۔ تو اس صورت میں کوئی عدت نہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ

فَمَالَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلاً (الاحزاب ۳۳:۴۹) اے مومنو! تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انھیں مباشرت کرنے سے پہلے ہی طلاق دو۔ تو تمہاری طرف سے ان پر کوئی عدت نہیں جس کے پورا کرنے کا مطالبہ کرسکو۔ لہٰذا انھیں کچھ مال دو اور اچھے طریقے سے رخصت کرو۔

عدت کے احکام و مسائل

۱۔ عدت کے دوران انھیں گھر سے نہ نکالو: اسلام نے عدت گزارنے والی عورت کے متعلق یہ حکم دیا ہے کہ انھیں گھر سے نہ نکالو۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ لَاتُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ (الطلاق ۶۵:۱) اللہ سے ڈرو جو تمہارا رب ہے۔ نہ تو تم ان مطلقہ عورتوں کو گھروں سے نکالو اور نہ وہ خود ہی گھروں سے نکلیں۔ عدت کے دوران انھیں ایذا نہیں پہنچانی چاہیے۔ وَلَا تُضَارُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ (الطلاق ۶۵:۶) اور (عدت کے دوران) ان کو تنگ کرنے کے لیے ایذا نہ پہنچاؤ۔ قرآن مجید نے طلاق کی عدت میں عورت کے ساتھ فیاضانہ سلوک کی تعلیم دی ہے۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ (البقرہ ۲:۲۲۹) طلاق دو مرتبہ ہے۔ پھر پسندیدہ طور سے رکھنا یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کرنا۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (البقرہ ۲:۲۳۱) جب تم عورتوں کو طلاق دو اور پھر وہ اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو یا انھیں اچھی طرح رکھو یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کرو۔

۲۔ عدت کے بعد انھیں نکاح سے نہ روکو: جب مطلقہ عورتیں اپنی عدت گزار لیں تو پھر انھیں آزادی ہے جہاں چاہیں شادی کر لیں۔ ارشادِ الٰہی ہے: فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (البقرہ ۲:۲۳۴) پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں تو انھیں پورا اختیار ہے کہ اپنی ذات کے معاملہ میں جو فیصلہ چاہیں کریں تم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک عمل سے پوری طرح باخبر ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ ۲:۲۳۲) اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو پھر اس میں رکاوٹ نہ ڈالو کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں۔ جب وہ معروف دستور کے مطابق آپس میں نکاح کرنے پر رضا مند ہو جائیں تمھیں نصیحت کی جاتی ہے کہ ایسی حرکت ہرگز نہ کرو اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ تمھارے لیے شائستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے کہ اس سے باز رہو۔ اللہ خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

۳۔ رجعت: طلاق رجعی (ایک یا دو طلاق) کی عدت کی میعاد ختم ہونے سے پہلے خاوند کو رجوع کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ یہ میعاد ختم ہونے کے بعد اس کا یہ حق بھی جاتا رہے گا۔ طلاق رجعی کی صورت میں نکاح زائل نہیں ہوتا' اس لیے رجعت کے لیے بیوی کی رضا کی ضرورت نہیں۔ رجعت کے لیے شریعت نے آسانیاں رکھی ہیں۔ الفاظ صریح ہوں یا کنایہ بلکہ غیر سنجیدہ الفاظ کے ساتھ بھی رجعت واقع ہو جاتی ہے۔ البتہ مستحب طریقہ یہ ہے کہ دو گواہ ٹھہرا لیے جائیں اور بیوی کو بھی رجعت سے مطلع کر دیا جائے۔ رجعی طلاق کی صورت میں عدت کے اندر اندر رجعت کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے: وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (البقرہ ۲:۲۳۱) اور جب تم نے بیویوں کو (رجعی) طلاق دے دی اور وہ اپنی (عدت کی) میعاد کے قریب پہنچیں تو انھیں بھلائی کے ساتھ رکھ لو یا انھیں بھلائی سے جانے دو۔

نیز ارشاد ربانی ہے: وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ (البقرہ:۲۲۸) اور ان کے خاوند اس اثناء میں ان کی واپسی کے بہت حقدار ہیں۔

۴۔ زیب و زینت: طلاق رجعی کی عدت کے دوران میں بیوی کو چاہیے کہ خاوند کے سامنے بناؤ سنگھار کرتی رہے' شاید شوہر کا دل اس کی طرف دوبارہ مائل ہو جائے۔

۵۔ حاملہ عورت کا نان ونفقہ: مطلقہ اگر حاملہ ہو تو وضع حمل تک اس کے نان ونفقہ کی ذمے داری طلاق دینے والے شوہر پر ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق ۶۵:۶) اور اگر وہ (یعنی مطلقہ عورتیں) حمل والی ہیں تو ان پر خرچ کرتے رہو جب تک کہ ان کا وضع حمل نہ ہو جائے۔

۶۔ دودھ پلانے کا معاوضہ: اگر مطلقہ عورت بچے کو دودھ پلائے تو اس کا معاوضہ طلاق دینے والے شوہر کے ذمے ہے۔ معاوضہ دونوں باہمی مشورے

سے طے کرلیں۔ ارشادِ ربانی ہے: فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ (الطلاق ۶:۶۵) اور اگر وہ (یعنی مطلقہ عورتیں) تمھارے لیے (بچے کو) دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دو اور (اجرت کے بارے میں) آپس میں پسندیدہ طور پر مشورہ کرلو۔

۷۔ بیوہ سوگوار رہے: بیوہ کو چاہیے کہ اپنی عدت کا زمانہ یعنی چار مہینے اور دس دن سوگواری سے گزارے۔ خواہ بیوہ نابالغہ اور آئسہ ہو۔ سوگواری سے مراد یہ ہے کہ وہ زیب و زینت وغیرہ نہ کرے۔ احادیث مبارکہ میں زیب و زینت سے ممانعت کے بارے میں واضح احکام ملتے ہیں' مثلاً ایک عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پوچھا کہ میری بیٹی کا خاوند مرگیا ہے اور اس کی آنکھیں دکھ رہی ہیں' کیا میں اس کے سرمہ لگا دوں؟ آپؐ نے فرمایا نہیں۔ اس عورت نے دو تین مرتبہ اپنا سوال دہرایا۔ آپؐ نے یہی جواب دیا۔

۸۔ حیض و حمل کو چھپانے کی ممانعت: عدت گزارنے والی عورت کو حکم دیا کہ اس کے پیٹ میں جو کچھ ہے اسے ظاہر کردے' اسے چھپانے کی کوشش نہ کرے' یعنی اگر وہ حیض کی حالت میں ہے یا اسے حمل ہو چکا ہے جیسی بھی صورت حال ہو اسے ظاہر کردے تاکہ زمانہ عدت کا صحیح شمار ہو سکے اور وہ مصلحتیں اور مقاصد پورے طور پر حاصل ہوسکیں۔ جو شریعت کو عدت سے مطلوب ہیں۔ اس کے اندر کا حال وہی جانتی ہے اس پر کوئی بیرونی شہادت قائم نہیں کی جا سکتی۔ چھپانے میں کئی مقاصد ملحوظ ہو سکتے ہیں' مثلاً عدت سے نکل جانے کی غرض سے کہہ دے کہ اسے حیض آ گیا ہے جبکہ نہ آیا ہو وغیرہ۔ اس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْۤ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرہ:۲۲۸) اور ان (یعنی مطلقہ عورتوں) کے لیے جائز نہیں ہوگا کہ وہ چھپائیں جو اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کیا ہے۔ اگر وہ (واقعی) اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہیں۔

۹۔ پیغام نکاح کی ممانعت: عدت کے دوران میں بیوہ کو نکاح کا پیغام دینے کی ممانعت ہے۔ خاوند کی وفات کے بعد جلد ہی اس کی بیوہ کو نکاح کا پیغام دینا کسی طرح سے بھی مناسب نہیں۔ ایسا کرنے سے ایک طرف تو متوفی شوہر کے ساتھ بے حسی' بے اعتنائی' سرد مہری اور بے وفائی کی صورت بنتی ہے اور دوسری طرف غمزدہ بیوہ کے احساسات کو ٹھیس پہنچے گی۔ وقت گزرنے سے زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اتنا وقت تو انتظار کرنا چاہیے کہ جن میں وہ اس صدمے سے باہر آ جائے۔ شریعت نے اس وقت کا تعین کر دیا ہے' جسے عدت کہتے ہیں۔ یہ کم از کم مدت ہے۔ عدت پوری ہونے سے پہلے کسی مرد کو روا نہیں کہ وہ صراحت کے ساتھ نکاح کا پیغام دے۔ البتہ اشارے کنایے سے وہ اپنی خواہش کا اظہار کرسکتا ہے تاکہ کوئی دوسرا پہل نہ کرجائے۔ اس بارے میں ارشاد ربانی ہے: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّاۤ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ (البقرہ ۲:۲۳۵) اور تم پر کوئی گناہ نہیں اس میں جو تم نے (بیوہ) عورتوں کے پیغام نکاح میں اشارے کنایے سے کہا یا تم نے جو چھپایا اپنے دلوں میں' اللہ نے جانا کہ یقیناً تم جلد ان (عورتوں) کا خیال رکھو گے لیکن تم ان سے (نکاح کا) پوشیدہ معاہدہ نہ کرو۔ سوائے اس کے کہ تم کوئی بات دستور کے موافق کہو اور نکاح کی گرہ کا عزم مت کرو یہاں تک کہ مقرر کیا ہوا وقت اپنی انتہا کو پہنچ جائے۔

عدت کے اغراض و مقاصد

عدت میں چند اغراض و مقاصد ہیں مثلاً:

۱۔ اولاد سے متعلق بعض دفعہ نسب و وراثت کے مشکل اور پیچیدہ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر عورت جیسا کہ قرآن حکیم (البقرہ ۲: ۲۲۸) میں ہدایت دی گئی ہے' راست گوئی سے کام لے۔ تو نسب اور وراثت کا مسئلہ صاف ہو جاتا ہے۔ اس لیے نسب میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ عورت وضع حمل تک نکاح ثانی نہیں کرسکتی۔

۲۔ طلاق بائن نہ ہو تو اصلاح کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ تھوڑی مدت کی علیحدگی میں ایک دوسرے کی قدر و منزلت معلوم ہو جائے خیالات محبت اگر اس تعلق میں فی الواقع موجود ہیں تو ان خیالات منافرت پر جو عارضی طور پر پیدا ہو گئے تھے' غالب آ جائیں اور اصلاح کی گنجائش نکل آئے۔

۳۔ ایک غرض یہ ہے کہ اگر عورت حاملہ ہے تو اس مدت میں حمل ظاہر ہو جائے گا چونکہ اولاد' میاں بیوی کے تعلقات محبت میں ایک بڑا واسطہ بن جاتی ہے کیونکہ اکثر حالات میں بی بی کا صاحب اولاد ہونا طلاق کے لیے مانع ہو جاتا ہے۔

۴۔ بعض اوقات غصے اور جلد بازی میں معاملہ طلاق تک پہنچ جاتا ہے۔ اس عرصہ میں مرد کو غور و فکر کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ عارضی رنجش دور ہو جاتی ہے تو مرد رجوع کر لیتا ہے۔

رضاعت

معنی ومفہوم: رَضَعَ الْوَلَدُ اُمَّهٗ بچے نے اپنی ماں کا دودھ پیا۔ اس فعل کا مصدر رَضْعٌ رِضَاعٌ رِضَاعَةٌ رَضَاعَةٌ (زیر اور زبر دونوں صحیح ہے)
جب رَضَعَ کو باب افعال میں لے جائیں گے تو اَرْضَعَ بن جائے گا۔ جس کے معنی ہیں۔ اس نے دودھ پلایا۔ اَرْضَعَتِ الْاُمُّ ماں نے دودھ پلایا۔ دودھ پلانے والی (اسم فاعل) کو مُرْضِعٌ اور مُرْضِعَةٌ کہتے ہیں۔ جب رضع کو باب استفعال میں لایا جائے یعنی اِسْتَرْضَعَ تو اس کے معنی ہیں اس نے دودھ پلوایا۔

اگر میاں بیوی ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں خواہ اطلاق کے ذریعے یا خلع کے ذریعے سے اور عورت کی گود میں دودھ پیتا بچہ ہو یا وضع حمل اور بچہ پیدا ہو تو اس کی رضاعت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے حسب ذیل احکام بیان کیے ہیں۔

۱۔ دودھ پلانے کی مدت: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے دودھ پلانے کی مدت دو سال بیان فرمائی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ (البقرہ۲:۲۳۳) اور مائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال دودھ پلائیں اس لیے جو دودھ پلانے کے زمانہ کو پورا کرانا چاہتا ہے۔ مگر یہ حکم نہیں کہ ضرور اس عمر تک دودھ پلایا جائے کیونکہ خود اس آیت میں یہ فرمایا کہ اگر دونوں چاہیں تو دو سال سے پہلے دودھ چھڑا دیں جیسے کہ مجاہد سے یہ معنی مروی ہیں۔ دو سال کی مدت دودھ پلانے کی زیادہ سے زیادہ ہے۔

۲۔ دو سال سے پہلے دودھ چھڑایا جا سکتا ہے: اگر ماں باپ دونوں باہمی رضامندی اور مشورے سے دو سال سے پہلے دودھ چھڑانا چاہیں تو چھڑا سکتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا (البقرہ۲:۲۳۳) پھر اگر وہ دونوں آپس کی رضامندی اور مشورہ سے دودھ چھڑا لینا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں۔

۳۔ رضاعت کے معاملہ میں فریقین کو باہم موافقت کی تاکید اور دودھ پلانے کے لیے اجر دینے کا حکم: دودھ پلانے کے لیے ماں اور باپ کی باہمی رضامندی اور موافقت ہونا ضروری ہے تاکہ باہمی ضد اور مخالفت کی وجہ سے معصوم بچے کی زندگی خراب نہ ہو۔ والد کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ بچے کی ماں کو دودھ پلانے کا اجر دے۔

ارشاد الٰہی ہے: فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗ اُخْرٰى (الطلاق۶۵:۶) پھر اگر وہ تمھارے لیے دودھ پلائیں تو ان کو ان کی مزدوری دے دیا کرو اور دستور کے مطابق آپس کے معاملے طے کر لیا کرو اور اگر آپس میں کشمکش کرو گے تو کوئی اور عورت اس کو دودھ پلائے گی۔

۴۔ دایہ سے دودھ پلوایا جا سکتا ہے: وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ۲:۲۳۳) اور جس کا بچہ ہے (اس باپ) پر اچھے طور پر ان کا کھانا اور ان کا کپڑا ہے۔

اگر بچے کا باپ نہیں ہے تو بچے کا ولی نان ونفقہ وغیرہ کا ذمہ دار ہوگا۔ ارشاد الٰہی ہے: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ (البقرہ۲:۲۳۳) کسی شخص پر بوجھ نہیں ڈالا جاتا۔ مگر جہاں تک اس کی طاقت ہے ماں کو اپنے بچے کی وجہ سے تکلیف دی جائے نہ باپ کو اپنے بچے کی وجہ سے۔

۵۔ دودھ پلوانا باپ کی ذمہ داری ہے: بچہ باپ کا ہوتا ہے: (اَلْمَوْلُوْدُ لَهٗ) وہی اس کا سرپرست اور اس کی رضاعت کا انتظام کرنے کا ذمہ دار ہے۔ دودھ پلوانے کی اجرت دینا اس کے ذمہ ہے۔ وہ چاہے بچے کی والدہ سے دودھ پلوائے چاہے کسی آیہ (دایہ) سے۔ تاہم والدہ سے دودھ پلوانے کو ہی ترجیح دینی چاہیے۔ خواہ ان دونوں میں کتنا ہی باہمی بغض وعداوت ہو باپ کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ بچے کو جس قدر پیار اور خلوص ومحبت والدہ کی آغوش میں مل سکتا ہے اور کسی میں نہیں مل سکتا۔ اسے اپنے بچے پر ترس کھانا چاہیے۔

۶۔ باپ نہ ہو تو وارث ذمہ دار ہے: اگر شیر خوار بچے کا باپ زندہ نہ ہو تو دودھ پلوانے کا انتظام کرنے کی ذمہ داری اس کے وارث پر ہے۔ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ یعنی وارث کے ذمے بھی ایسا ہی ہے (جیسا کہ باپ کے ذمے) باپ کی عدم موجودگی میں بھی دودھ پلانے کی ذمہ داری ماں پر نہیں ہے۔

۷۔ دودھ پلانے کا اصل حق والدہ کا ہے: بچے کو دودھ پلانے کا اصل حق والدہ کا ہے' جس نے اسے اپنے پیٹ میں اٹھائے رکھنے کی مشقت برداشت کی اور اسے جنم دیا۔ اگر ماں سے دودھ پلوانے کا انتظام کسی وجہ سے نہ ہو سکے تو پھر انا (دایہ) سے دودھ پلوانے کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کی مذکورہ بالا آیت میں پہلے ارشاد ہوا۔ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ (البقرہ۲:۲۳۳) یعنی مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں۔ بعد میں انا(دایہ) سے دودھ پلوانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ (البقرہ۲:۲۳۳) یعنی اگر تم چاہو کہ اپنے بچے کو انا سے دودھ پلواؤ تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔ والدہ کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے بچے کو دودھ پلانے سے انکار نہ کرے۔ اسے بغض و عداوت تو اس کے باپ سے ہے' بچہ تو دودھ کی اولاد ہے۔ اگر وہ انکار کر دے گی تو ظاہر ہے کہ باپ کسی انا سے دودھ پلوانے کا انتظام کرے گا۔

۸۔ رضاعت کے رشتوں کی حرمت: اسلام میں دودھ کو ایک لحاظ سے اتنی اہمیت دی گئی ہے جتنی کہ خون کی ہے۔ یعنی رضاعی رشتے بھی ویسے ہی محترم ہیں جیسے نسبی رشتے۔ دودھ پلانے والی اور اس کی بیٹی دودھ پلانے والے پر اس طرح حرام ہیں' جیسے اس کو جنم دینے والی ماں اور حقیقی بہن۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَكُمْ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ یعنی (اور حرام کی گئی ہیں تم پر) اور تمہاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہو اور تمہاری دودھ شریک بہنیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: يُحَرَّمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَايُحَرَّمُ مِنَ النَّسَبِ یعنی رضاعت سے بھی وہ حرام ہے جو نسب سے حرام ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے: يُحَرَّمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يُحَرَّمُ مِنَ الْوَلَادَةِ یعنی رضاعت بھی اسے حرام کرتی ہے جسے ولادت حرام کرتی ہے۔

خلع اور اس کے احکام

معنی ومفہوم: خَلَعَ ماضی یَخْلَعُ مضارع خَلْعًا مصدر۔ اس کا معنی ہے۔ (کپڑا' جوتا وغیرہ اتارنا) قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا' فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ (طٰہٰ ۲۰:۱۲) پس تو اپنے جوتے اتار دے۔ خَلَعَ الرَّجُلُ ثَوْبَہٗ' اس آدمی نے اپنا کپڑا اتار دیا۔ قرآن مجید میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے (البقرہ ۲:۱۸۷) چنانچہ اس مناسبت سے میاں بیوی کا ایک دوسرے سے الگ ہونے پر بھی خلع کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ خَلَعَ الرَّجُلُ امْرَاَتَہٗ' (مرد نے اپنی بیوی کو الگ کر دیا۔ خَلَعَتِ الْمَرْاَۃُ زَوْجَھَا بیوی نے اپنے شوہر کو الگ کر دیا۔ خلع غیر قیاسی (سماعی) مصدر ہے جس کا استعمال صرف میاں بیوی کو علیحدگی کے لیے مخصوص ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں خلع مالی معاوضہ کا ایک معاملہ ہے' بیوی کچھ مال کے عوض شوہر سے علیحدگی حاصل کر کے اپنے نفس کی مالک ہو جاتی ہے اور شوہر اس مالی معاوضہ کا حقدار ہو جاتا ہے۔

خلع کی تحریک فریقین میں سے کسی ایک کی طرف سے ہو سکتی ہے۔ خاوند بیوی سے کہہ سکتا ہے کہ میں تمھارے ساتھ اتنے مال پر خلع کرتا ہوں' بیوی قبول کر لے تو خلع ہو جائے گا یا بیوی خاوند سے کہہ سکتی ہے کہ میں تمھارے ساتھ اتنے مال پر خلع کرتی ہوں اور شوہر اسے قبول کر لے تو خلع ہو جائے گا۔

خلع میں لازم ہے کہ علیحدگی کا مطالبہ خلع یا اس کے ہم معنی لفظ کے ساتھ مال کے عوض کیا جائے گا۔ اگر تجویز خاوند کی طرف سے ہے اور مال کا ذکر نہ ہو تو خلع نہیں ہوگا۔ البتہ طلاق بائن پڑ جائے گا۔ یعنی علیحدگی تو ہو جائے گی مگر بیوی کے ذمے کچھ بھی واجب الادا نہ ہوگا اور اگر تجویز بیوی کی طرف سے ہو اور خاوند قبول کرے تو خلع ہو جائے گا وہ مال بیوی کے ذمے واجب الادا ہوگا۔

خلع کا جواز قرآن وحدیث سے: میاں بیوی کا ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے میں قرآن مجید نے دونوں کو ایک مکمل مساوات کی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ اگر مرد ناگزیر حالات کے بنا پر طلاق دے سکتا ہے تو عورت بھی مرد سے بعض ناگزیر حالات کے تحت کچھ دے دلا کر آزادی حاصل کر سکتی ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں اس کو خلع کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ (البقرہ ۲:۲۲۹) پس اگر انھیں یہ ڈر ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو پھر ان پر اس کے بارے میں کچھ گناہ نہیں جو عورت فدیہ دے دے۔

حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ عہد نبویؐ میں عورت نے اپنے خاوند سے آزادی حاصل کی تھی۔

ثابت بن قیس کی بیوی کا واقعہ ہے وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی یا رسول اللہ! میں ثابت بن قیس کے اخلاق اور دین داری پر کوئی عیب نہیں لگاتی مگر میں اس سے نباہ نہیں کر سکتی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا ''کیا تو اس کا باغ (جو اس نے بطور مہر دیا تھا) واپس کر دے گی؟'' ثابت بن قیس کی بیوی نے کہا ہاں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ثابت کو بلوا بھیجا اور اسے حکم دیا کہ اپنا باغ واپس لے لو اور اپنی بیوی کو طلاق دے دو۔ (بخاری کتاب الطلاق باب ۱۲ الخلع وکیف الطلاق فیہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک عورت سے جس کا نام امیمہ یا بنت الجون تھا نکاح کیا اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے قریب گئے تو اس نے کہا میں آپؐ سے پناہ مانگتی ہوں یعنی طلاق چاہتی ہوں۔ اس پر حضورؐ نے اسے طلاق دے دی اور کچھ تحائف دے کر رخصت کیا۔ (بخاری کتاب الطلاق)

حضرت عمرؓ کے پاس ایک عورت اپنے خاوند سے بگڑی ہوئی آئی۔ آپؓ نے فرمایا اسے گندگی والے گھر میں قید کر دو۔ پھر قید خانہ سے بلوایا اور پوچھا کیا حال ہے؟ اس نے کہا آرام کی راتیں میری زندگی میں گزری ہیں آپ نے اس کے خاوند سے فرمایا اس سے خلع کرے۔ (ابن کثیر)

ان حدیثوں سے واضح ہے عورت خاوند سے طلاق لے سکتی ہے۔ قرآن مجید کی آیت میں وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ (اگر تمھیں ڈر ہو پس دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکو گے) یہاں اللہ کی حدود کو قائم کرنے کا مطلب صریحاً مقصد نکاح کو پورا کرنا یا ان فرائض کو بجا لانا ہے جو اس تعلق سے پیدا ہوتے ہیں۔

عورت کن وجوہ کی بنا پر خلع لے سکتی ہے

نامرد ہونا: اگر خاوند نامرد ہے تو عورت عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے اور اپنا مقدمہ پیش کر دے۔ عدالت اس کے شوہر کو نوٹس دے گی اور حالات کی تحقیقات کرے گی۔ اگر مرد نامرد ثابت ہو گا تو قاضی اس کو پہلے ایک سال کی مہلت دے گا کہ وہ اپنا علاج و دوا کرے۔ اگر مرد حق زوجیت ادا کرنے کے قابل ہو گیا تب تو خیر ورنہ ناکامی کی صورت میں تفریق کر دے گا۔ حضرت سعید بن المسیب کا بیان ہے: مَنْ تَزَوَّجَ اِمْرَاۃً فَلَمْ یَسْتَطِعْ اَنْ یَمَسَّھَا فَاِنَّہٗ یُضْرَبُ اَجَلُ سَنَۃٍ فَاِذْ مَسَّھَا وَاِلَّا فُرِّقَ بَیْنَھُمَا (موطا امام مالک ج ۲ ص ۳۲) جو کوئی کسی عورت سے شادی کرے اگر اس کو عورت سے ہم بستر ہونے کی قدرت نہ ہو تو اس کو ایک سال کی مہلت دی جائے گی۔ اگر اس کے بعد ہم بستر نہ ہو سکا تو پھر ان دونوں میں تفریق کر دی جائے گی۔

شوہر کا مجبوب ہونا: اسی طرح اگر کسی عورت کا شوہر مجبوب ہو یعنی اس کا عضو تناسل کٹ جائے اور وہ عورت کے جنسی میلان کی تکمیل کے لائق نہ رہے تو عورت ایسے شوہر سے اسی ترکیب سے باآسانی علیحدہ ہو سکتی ہے بلکہ اس میں اتنی سہولت اور ہے کہ ایک سال کی تاخیر بھی نہ ہو گی۔ درخواست پاتے ہی قاضی تحقیقات حال کرے گا اور عورت کو مرد سے علیحدہ کر دے گا۔ امام قدوری عنین (مجبوب) وغیرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''اگر کسی کا شوہر نامرد ہو تو حاکم اسے دوا علاج کے لیے ایک سال مہلت دے گا۔ اگر وہ عورت کے لائق ہو گیا تب خیر ورنہ ان دونوں میں عورت کے مطالبہ پر تفریق کر دی جائے گی۔

شوہر کا خصی ہونا: خصی شوہر کا حکم بھی نامرد ہی جیسا ہے۔ یعنی مرد اپنے کو خصی کرا کے اس لائق بنائے کہ اس میں جنسی میلان باقی نہ رہے اور اس طرح وہ عورت کے لیے ناکارہ ثابت ہو تو تب قاضی کے پاس عورت درخواست دے۔ قاضی فوراً مرد کی حالت کی تحقیق کرے گا۔ علاج کے لیے ایک سال کا موقع دے گا اور اس کے بعد بھی نکما ہی باقی رہے تو قاضی اس عورت کو اس مرد سے جدا کر دے گا۔ قدوری کتاب النکاح میں آتا ہے وَالْخَصِیُّ یُؤَجَّلُ کَمَا یُؤَجَّلُ الْعِنِّیْنُ شوہر خصی کو نامرد کی طرح ایک سال کی مہلت دی جائے گی۔

ناموافقت طبع: عورت ناموافقت طبع کی بنا پر بھی مرد سے آزادی حاصل کر سکتی ہے۔ اسلام کی تعلیم فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ اگر مرد اور عورت میں ناموافقت ہے تو وہ نکاح کی غرض کو پورا نہیں کر سکتے کیوں کہ ایک غرض نکاح کی یہ بھی ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہیں۔ اس لیے وہ ایک دوسرے کی تسکین و راحت کا موجب ہوں۔ یہ غرض ناموافقت طبع کی وجہ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے اسلام نے ناموافقت طبع کی بنا پر عورت کو یہ حق دیا ہے کہ وہ عدالت میں جا کر شوہر سے آزادی حاصل کر سکتی ہے۔

مفقود الخبر خاوند: اگر خاوند کا پتہ نہ چلے تو عورت کو طلاق کا حق حاصل ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی رائے کے مطابق ۲۰ سال' امام ابو یوسفؒ کی رائے کے مطابق ۱۰ سال تک بیوی کو انتظار کرنا چاہیے۔ شافعیؒ فقہ میں سات سال اور امام مالک کے نزدیک چار سال میعاد ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ اور اہل تشیع امام مالکؒ کی رائے سے متفق ہیں۔ یہی زیادہ معقول رائے ہے۔

حافظ ابن القیم کی رائے: قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر وہ عیب جس کی وجہ سے زن و شوہر میں یک جہتی باقی نہ رہ سکے اور نکاح کا مقصد جو محبت ہے فوت ہو جائے تو ایسی حالت میں علیحدگی اختیار کرنا ضروری ہو جاتا ہے (زاد المعاد ج ۴ ص ۲۱)

اس طرح کے نازک وقت کے لیے اسلام نے کشمکش کی آخری شکل میں خلع کی اجازت بخشی ہے۔ ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کے لیے پیش بندی کے طور پر سختی کے ساتھ خلع سے روکا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اَیُّمَا اِمْرَاۃٍ سَاَلَتْ زَوْجَھَا طَلَاقًا فِیْ غَیْرِ مَا بَاْسٍ فَحَرَامٌ عَلَیْھَا رَائِحَۃُ الْجَنَّۃِ (مشکواۃ باب الخلع) جو عورت ذرا سی بات پر اپنے شوہر سے طلاق کی درخواست کرے اس پر جنت کی بو حرام ہے۔

امام رازی کی رائے: امام رازی خلع کے بارے میں جمہور کا مسلک یہ بتاتے ہیں کہ وہ غصہ اور خوف ہی کی صورت میں نہیں بلکہ ہر صورت میں ہو سکتا ہے جس میں زوجین کے خوشگوار تعلقات میں فرق آ جائے یا مستقبل میں اس کا اندیشہ ہو اس کے برخلاف زہریؒ نخعیؒ اور داؤدؒ ان دونوں حالتوں (غصہ اور خوف) کا وجود ضروری سمجھتے ہیں۔

اکثر مجتہدین خلع کو خوف وغضب کے بغیر بھی جائز کہتے ہیں جب کہ زہری داؤد اور نخعی اسے مباح نہیں سمجھتے اور اس کے لیے خوف اور غضب کا وجود ضروری سمجھتے ہیں۔

خلع کا طریقہ کار: خلع کا ایک طریقہ کار یہ ہے کہ میاں بیوی خلع کا معاملہ آپس میں گھر کے اندر ہی طے کر لیں تو کسی بھی وجہ سے خلع ہو سکتا ہے۔ اگر معاملہ عدالت میں جائے تو عدالت صرف یہ اطمینان کرے گی کہ ان دونوں میں نباہ ممکن نہیں ہے۔ اطمینان ہو جانے کے بعد عدالت خلع کرا دے گی۔ گویا عدالت سے کوئی بھی عورت جب چاہے خلع کا حکم لے سکتی ہے۔

خلع لینا ایک ناپسندیدہ فعل ہے: گو اسلام نے طلاق کی طرح خلع کو جائز قرار دیا ہے اور عورت کا یہ حق تسلیم کر لیا گیا ہے کہ وہ بھی مرد سے شرعاً الگ ہو سکتی ہے۔ لیکن اسلام نے حلال ہوتے ہوئے ناپسندیدہ عمل قرار دیا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو عورت معمولی بات پر اپنے خاوند سے طلاق مانگے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔

عدت: جمہور علماء کے نزدیک عدت وہی ہے جو طلاق کی ہے یعنی تین طہر ان عورتوں کی عدت ہے جن کو حیض آتا ہے۔ اگر کسی عورت کو حیض نہیں آتا تو اس کی عدت تین ماہ ہے۔ اگر حاملہ ہے تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔

معاوضہ کی تعداد: اگر عورت بوجہ ناموافقت طبیعت یا کسی اور وجہ سے خلع لینا چاہتی ہے اور خاوند کا کوئی قصور نہیں تو اس صورت میں مہر کا کچھ حصہ لے لینا جائز ہے۔ اگر ناگواری شوہر نے پیدا کی ہے تو شوہر کو عوض لینا مکروہ ہے۔

رجوع کا حق نہیں: جمہور علماء اور چاروں ائمہ اہل سنت کے نزدیک خلع کے بعد شوہر کو رجوع کرنے کا حق نہیں۔ اس لیے کہ عورت نے مال دے کر اپنے آپ کو آزاد کرا لیا ہے اور اب وہ اپنے نفس کی خود مالکہ ہے۔ اس پر سب علماء کا اتفاق ہے۔ اگر دونوں رضامند ہوں تو عدت کے اندر اندر نیا نکاح کر سکتے ہیں۔

خلع کی اہمیت و افادیت: اسلام سے قبل عرب میں عورت کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ ایک ظالم اور جابر خاوند سے علیحدگی حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن اسلام نکاح کو فریقین میں ایک عمرانی معاہدہ تصور کرتے ہوئے ہر فریق کو یہ حق دیتا ہے کہ اگر وہ سمجھیں کہ رشتہ ازدواج کا مقصد فوت ہو رہا ہے تو وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں۔ اسلام سے پہلے عورت کو یہ حق حاصل نہیں تھا اور وہ صرف خاوند کے رحم و کرم پر ہوتی تھی۔ اسلام نے میاں بیوی کو مساوات کے مقام پر کھڑا کیا ہے اور اگر خاوند کو اپنی بیوی چھوڑنے کا حق ہے تو بیوی کو بھی خاوند سے علیحدہ ہونے کا حق حاصل ہے۔ گویا اسلام نے مرد اور عورت کو مساوی مقام پر کھڑا کیا ہے۔

جیسا کہ طلاق کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ خاندان کی بقا اور نشوونما کے لیے طلاق کو جائز اور حق قرار دیا تھا۔ اس طرح خلع بھی عورت کی طرف سے جائز ہے۔ عورت اسی وقت مرد سے علیحدہ ہوتی ہے جب میاں بیوی میں باہم نفرت ہو۔ مرد ظالم ہو۔ عورت کے حقوق کی نگہداشت نہیں کرتا۔ اس صورت میں اگر میاں بیوی کی علیحدگی نہ ہو تو خاندان پر برے اثرات مرتب ہوں گے۔ اولاد کے اخلاق و کردار پر برا اثر پڑے گا۔ خاندان کی ترقی رک جائے گی۔ خاندان ایک جہنم کی شکل اختیار کرے گا۔

ایلاء

معنی اور مفہوم: اِلیٰ حرف ہے جو ہر شش جہات میں کسی نہایہ (سمت) کو ظاہر کرتا ہے۔ اَلَوتُ فِی الْاَمْرِ کے معنی ہیں۔ میں نے اس امر میں کوتاہی کی۔ گویا اس میں کام کرنے والا انتہا کو دیکھ لیتا ہے اور آگے نہیں چلتا۔ لَایَأْلُوْنَکُمْ خَبَالاً (آل عمران ۳:۱۱۸) اور تمہاری خرابی میں کمی نہیں کرتے۔ ایلاء وہ قسم ہے کہ جس کی غرض کسی کام میں یعنی کسی حق کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا ہو۔

اصطلاح شریعت میں مفہوم: شریعت کی اصطلاح میں اگر کوئی عاقل اور بالغ شخص شرعاً درست قسم کھا کر کہے کہ میں اپنی بیوی کے پاس چار ماہ یا اس سے زیادہ عرصہ تک نہ جاؤں گا تو اس قسم کھانے کو ایلاء کہتے ہیں۔

عرب کی بدرسم: زمانہ جاہلیت میں عرب اس قسم کی قسمیں بکثرت کھایا کرتے تھے۔ چونکہ قسم میں وقت مقرر نہیں ہوتا تھا کہ کب تک وہ اپنی بیوی کے پاس نہیں جائے گا۔ اس وجہ سے بعض اوقات بیوی کو عمر بھر اس بندش میں گزارنی پڑتی تھی۔ نہ تو اسے بیوی کی حیثیت حاصل تھی اور نہ ہی ایک مطلقہ کی کہ وہ کسی دوسری جگہ شادی کر لے۔

سعید بن المسیبؓ سے روایت ہے کہ عرب میں یہ رواج تھا کہ کوئی آدمی کسی عورت کو نہیں چاہتا تھا اور نہ پسند کرتا تھا کہ وہ کسی دوسرے سے نکاح کرے۔ تو وہ قسم کھا لیتا کہ میں اس کے قریب نہیں جاؤں گا اور اس طرح پر اسے معلقہ چھوڑ دیتا۔ وہ خاوند والی ہوتی نہ دوسری جگہ نکاح کر سکتی اور اس کی غرض صرف عورت کو دکھ پہنچانا تھا۔

بدرسم کی اصلاح: اسلام نے اس بدرسم کی اصلاح کی اور حکم دیا کہ اگر چار ماہ کے اندر اندر خاوند ازدواجی تعلقات قائم نہ کرے تو بیوی کو طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (البقرہ ۲:۲۲۶، ۲۲۷) ان لوگوں کے لیے جو اپنی عورتوں کے حق میں قسم کھا لیتے ہیں۔ چار ماہ کا انتظار ہے پھر اگر وہ رجوع کریں تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اگر طلاق کا پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

مصلحت: اس حکم سے ایک طرف تو زمانہ جاہلیت میں مروجہ اس بدرسم کا خاتمہ ہو گیا۔ جس کے تحت بیوی معلقہ ہو کر رہ جاتی تھی، دوسری مصلحت اس میں یہ بھی ہے اگر بیوی کی اصلاح کی ضرورت پڑ جائے تو اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ خاوند اس کے بستر سے الگ رہے۔ مزید سختی کی ضرورت ہو تو ایلاء بھی کر سکتا ہے، یہ ایک قسم کی دھمکی ہے۔ اگر بیوی اپنی اصلاح کرے تو بہتر ورنہ چار ماہ کے بعد از خود طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ ایلاء کا واقع مدینہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش آیا۔ وہ یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات نے جب مسلمانوں میں نسبتاً آسودہ حالی دیکھی تو انھیں خیال ہوا کہ انھیں بھی اس سے حصہ ملنا چاہیے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گزارہ کی حالت یہ تھی کہ گھروں میں کوئی سامان نہ تھا۔ روشنی کے لیے چراغ تک نہ ہوتا تھا "مہینوں صرف کھجور کھا کر پانی پی لیتے اور کھانا نہ پکتا تھا۔ اس سے آپ کی بیبیوں کے دل میں اس خیال کا آنا کہ کسی قدر آسودہ حالی انھیں ملے ایک قدرتی امر تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے جس غرض کے لیے اپنے نبی کو اجازت دی تھی کہ ان بیبیوں کو اپنے نکاح میں لائیں وہ اس کے منافی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے مطالبہ کو ناپسند فرمایا۔ بعض بیبیوں نے اصرار اور مطالبہ میں شدت کا پہلو اختیار کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ماہ کے لیے اپنی بیبیوں کو اپنے اوپر حرام کر دیا اور ایک بالا خانے میں علیحدگی اختیار کی اور لوگوں میں غلط مشہور ہو گیا کہ آپ نے طلاق دے دی ہے، بالآخر وحی نازل ہوئی اور ازواج مطہرات کو سمجھا دیا کہ اگر وہ نبیؐ کے گھر میں رہنا چاہتی ہیں تو دنیاوی مال و منال سے محروم ہو کر رہنا پڑے گا۔ انھوں نے دوسری شق اختیار کی لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ماہ کے لیے علیحدگی کی قسم کھا چکے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَکَ (التحریم ۶۶:۱) اے نبی کیوں اسے حرام کرتا ہے۔ جو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا۔

اگر آپ ایک حلال چیز کو حرام کر لیتے تو امت میں فتنہ پڑتا ہے۔ اس لیے یہ حکم نازل ہوا۔

ایلاء کی اقسام: اگر کوئی شخص ایلاء کرتے وقت مدت معین نہ کرے اور یوں کہے وَاللّٰهِ لَا اَقْرَبُكِ (اللہ کی قسم میں تیرے قریب نہیں جاؤں گا) تو یہ ایلاء مؤید ہے۔

اگر ایلاء کرتے وقت کم از کم چار ماہ کی مدت مقرر کر دے تو وہ ایلاء مُوَقَّتْ ہے۔

فے: اگر خاوند چار ماہ کے اندر رجوع کرے تو اس رجوع کو فقہی اصطلاح میں فے کہتے ہیں۔

ایلاء کے فقہی مسائل

۱۔ شریعت اسلام نے ایلاء کو طلاق یا فسخ نکاح قرار نہیں دیا کہ خاوند اپنی بیوی کے نان ونفقہ اور دیگر ضروریات سے دست بردار ہو جائے جیسا کہ قبل از اسلام لوگ کیا کرتے تھے۔ ایلاء کی مدت تک عورت مرد کے نکاح میں رہے گی وہ قانونی طور پر وہ عورت کے نان ونفقہ کا ذمہ دار ہے جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واقعہ سے ظاہر ہے جس کا اوپر ذکر گزر چکا ہے۔

۲۔ ایلاء مؤید اور ایلاء موقّت دونوں صورتوں میں شریعت نے چار ماہ کی مدت مقرر کی ہے۔ قرآن پاک کے حکم کے تحت اگر خاوند چار ماہ کے اندر اندر بیوی کے پاس نہیں جاتا تو عورت کو طلاق پڑ جائے گی۔

فقہاء کا اختلاف: اس میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ آیا یہ طلاق رجعی ہوگی یا بائن۔ رجعی کا مطلب یہ ہے کہ دوران مدت میں شوہر کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہے لیکن بائن کی صورت میں شوہر کو رجوع کا حق نہیں رہے گا۔ البتہ میاں بیوی اگر دونوں چاہیں تو دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ رائے دی ہے کہ چار ماہ گزرنے کے بعد معاملہ قاضی کے سامنے پیش کیا جائے اور قاضی شوہر کو حکم دے گا کہ یا تو وہ عورت سے رجوع کرے یا اسے طلاق دے دے۔

۳۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعیؒ کی یہ رائے چونکہ آیت میں قسم کھا لینے کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اس طرح حکم کا اطلاق صرف وہیں ہوگا جہاں خاوند نے بی بی سے مباشرت نہ کرنے کی قسم کھائی ہو۔ باقی رہا قسم کھائے بغیر جنسی قطع تعلق کر لینا تو یہ خواہ کتنی مدت کے لیے کیوں نہ ہو اس آیت کی رو سے ایلاء نہ ہوگا۔ امام مالک اور امام احمد کے نزدیک خواہ قسم کھائی گئی ہو یا نہ دونوں صورتوں میں انقطاع تعلق کے لیے چار مہینے کی مدت ہے۔

فقہاء نے اس بات کی بھی صراحت کر دی ہے کہ حکم صرف اس انقطاع تعلق کے لیے ہے جو کسی بگاڑ ناراضی سے ہو اگر کسی مجبوری یا مصلحت کے باعث تعلقات کے خوش گوار ہوتے ہوئے جنسی تعلقات نہیں تو اس پر اس حکم کا اطلاق نہ ہوگا۔ مثلاً ایک شخص بیماری یا گھر سے دوری کی وجہ سے جنسی تعلقات قائم نہیں کر سکتا تو وہ ایلاء کے حکم میں نہیں آتا۔

۴۔ ایلاء کے مؤثر ہونے کے لیے کم از کم چار ماہ کی مدت کا تعین ضروری ہے۔ اگر مدت اس سے کم ہو تو ایلاء بے اثر ہے۔ تو فے کی ضرورت نہیں۔

۵۔ کفارہ: اگر چار ماہ کے اندر اندر اس نے اپنی قسم توڑ ڈالی اور صحبت کر لی تو طلاق نہیں پڑے گی۔ البتہ قسم توڑنے کا کفارہ دینا پڑے گا۔ دس فقیروں کو کھانا (کفارہ گزار کی حیثیت کے موافق جو اس کے گھر میں عام طور پر کھایا جاتا ہے) کھانا ایک دن کا ہوگا یعنی صبح وشام یا دس محتاجوں کو کپڑے خرید کر دے۔ لباس ایسا ہو کہ بدن کو ڈھانپ دے اور اس میں نماز ادا ہو سکے۔ یا ایک غلام خرید کر آزاد کرے۔ یا تین دن کے روزے رکھے یہ روزے متواتر ہونے چاہئیں۔

ظہار: زمانہ جاہلیت میں اہل عرب غصہ کی حالت میں کبھی یہ کہہ دیتے تھے: اَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ اُمِّي تو میرے لیے ایسی ہے جیسے میری ماں ہے ان الفاظ سے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ عورت اس پر حرام ہو گئی ہے۔ اسلام نے اس کی اصلاح کی اور کہا کہ اپنی بیوی کو ماں کہہ دینے سے ماں نہیں بن جاتی بلکہ ماں تو وہی ہے جس کے بطن سے آدمی پیدا ہو۔ محض زبان سے ماں کہہ دینے سے ماں نہیں بن جاتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓئِيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ (الاحزاب ۳۳:۴) اور نہ تمہاری بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمہاری مائیں بنایا ہے۔

قرآن مجید نے اس رسم کو نامعقول قرار دیا ہے ارشاد ہے: وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا (المجادلہ ۵۸:۲) اور وہ بیہودہ بات اور جھوٹ کہتے ہیں۔

ظہار سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا ارشاد ہے: اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓئِيْ وَلَدْنَهُمْ (المجادلہ ۵۸:۲) تم میں سے جو لوگ اپنی عورتوں کو مائیں کہہ دیتے ہیں وہ ان کی مائیں نہیں صرف وہی ہیں جنھوں نے انھیں جنا۔

کفارہ: وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا. (المجادلہ

۵۸: ۳،۴)

اور جو لوگ اپنی عورتوں کو مائیں کہہ دیتے ہیں پھر اس کی طرف واپس لوٹتے ہیں جو کہا تھا تو ایک غلام کا آزاد کرنا ہے اس سے پہلے کہ وہ ایک دوسرے کو چھوئیں اس کے ساتھ تمہیں وعظ کیا جاتا ہے اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔ پھر جو کوئی نہ پائے تو دو مہینے کے متواتر روزے رکھے۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک دوسرے کو چھوئیں پھر جسے یہ بھی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔

لعان: لعان کا لفظ لعنت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ایک دوسرے پر لعنت بھیجنا۔ مگر اسلامی اصطلاح میں شوہر اور بیوی میں علیحدگی کی اس صورت کا نام ہے کہ جب خاوند اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور اس کی تائید میں گواہ پیش نہ کر سکے قرآن مجید میں آتا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ. (النور ۲۴: ۶...... ۹)

اور جو لوگ اپنی عورتوں پر تہمت لگائیں اور سوائے اپنے ان کا کوئی گواہ نہ ہو تو ان تہمت لگانے والوں میں سے ایک کی گواہی یہ ہے کہ اللہ کی قسم کے ساتھ چار بار گواہی دے کہ وہ سچوں میں سے ہے اور پانچویں بار یہ کہ اللہ کی لعنت اس پر ہو اگر وہ جھوٹوں سے ہے اور عورت سے یہ بات سزا کو ٹال سکتی ہے کہ وہ اللہ کی قسم کے ساتھ چار بار گواہی دے کہ وہ مرد جھوٹوں میں سے ہے اور پانچویں بار یہ کہ اللہ کا غضب اس پر ہو اگر وہ سچوں میں سے ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ کسی شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو فاحشہ کام میں مبتلا دیکھ لے تو کیا کرے۔ اگر وہ دوسروں سے بیان کرتا ہے یہ بہت برا کام ہے اگر وہ خاموش رہتا ہے تو یہ بھی ایک مشکل کام ہے۔ آنحضرت نے جواب نہ دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وہ شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا۔ یا رسول اللہ جس امر کے متعلق میں نے آپؐ سے پوچھا تھا اس میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ اس وقت سورہ نور کی آیتیں نازل ہوئیں۔ آپؐ نے ان کو تلاوت فرما کر وعظ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے بہت ہی ہلکا ہے۔ اس شخص نے عرض کیا نہیں یا رسول اللہ اس کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے میں اس عورت کے بارے میں جھوٹ نہیں بولا۔ پھر آپ نے اس عورت کو بلایا اس کو بھی اس طرح پند و نصیحت فرمائی۔ اس نے عرض کیا نہیں یا رسول اللہ اس کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے یہ جھوٹا ہے۔ تب حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد سے قسم کی ابتدا فرمائی چنانچہ اس نے چار مرتبہ قسمیں کھائیں اس کے بعد آپ نے عورت سے بھی قسمیں کھلوائیں اور دونوں کے درمیان تفریق کرا دی۔ (عمدۃ الرعایہ حاشیہ وقایہ جلد۲ ص ۱۳۸ حاشیہ ۹)

اس تفریق کے لیے میاں بیوی کی رضامندی ضروری نہیں۔ لعان زوجین میں ہمیشہ کے لیے تفریق کر دیتا ہے۔

اسلام میں عورتوں کا درجہ اور حیثیت

عورت انسانی سوسائٹی کا ایک نہایت ہی اہم حصہ ہے جس کے بغیر سوسائٹی کی گاڑی چل ہی نہیں سکتی۔ تخلیق اور افزائش نسل انسانی کے لیے دونوں کا وجود لازم و ملزوم ہے۔ سوسائٹی کا اتنا اہم اور ضروری جزو ہونے کے باوجود اسلام سے قبل دوسری اقوام عالم اور مذاہب میں عورت کا درجہ بہت ہی پست تھا۔ وہ مردوں کی محکوم اور دست نگر خیال کی جاتی تھی۔ پرانی ترقی یافتہ اور مہذب اقوام اور مذاہب عالم میں عورت کو بہت ہی گھٹیا سمجھا جاتا تھا۔ جس کا مفصل ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔

عورت کی دو حیثیتیں: اسلام نے عورت کا درجہ دو حیثیتوں سے متعین کیا ہے۔ ایک عمومی حیثیت سے اور دوسرا خصوصی حیثیت سے عمومی حیثیت سے عورت کو انسانیت کا وہی درجہ دیا ہے جو مرد کو حاصل ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً (النساء ۴:۱) اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک اصل سے پیدا کیا ہے اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔ اس آیت کریم میں مرد اور عورت کو ایک ہی اصل سے قرار دے کر دونوں کو انسانیت میں مساوی درجہ دیا ہے۔ روحانی اور اخلاقی میدان میں مرد اور عورت میں کامل مساوات ہے جس طرح مرد جدوجہد سے اطاعت گزاری سے اللہ کا قرب حاصل کر سکتا ہے اسی طرح عورت بھی اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکتی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا. (النساء ۴:۱۲۴) جو نیک کام کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ذرہ بھر بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔

تعلیم کے حاصل کرنے میں عورت مرد کے برابر ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

ملکیت کا حق: مادی لحاظ سے بھی عورت کو مرد کے مساوی درجہ دیا ہے۔ جس طرح مرد روپیہ کما سکتا ہے اسی طرح عورت کو اجازت دی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کہتا ہے: لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء ۴:۳۲) مردوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کے لیے حصہ ہے جو وہ کمائیں۔

عورت کو اپنی ملکیت کے تصرف پر پورا اختیار حاصل ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے۔ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓــًٔا مَّرِيْٓــًٔا (النساء ۴:۴) پھر اگر وہ خوشی سے اس میں سے کچھ تمھارے لیے خود دے دیں تو اسے مزے اور خوشگواری سے کھاؤ۔

وراثہ: اسلام پہلا دین ہے جس نے عورتوں کو ورثہ میں حق دار قرار دیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ (النساء ۴:۱۱) اللہ تمھاری اولاد کے متعلق تمھیں تاکیدی حکم دیتا ہے مرد کے لیے دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہو اگر (اولاد میں) دو یا (اس سے) اوپر عورتیں ہوں جو ان کے لیے دو تہائی ہے جو چھوڑا اور اگر اکیلی ہو تو اس کے لیے نصف ہے۔

تاریخ انسانیت کا مطالعہ کر لیا جائے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ اسلام نے عورتوں کو ورثہ میں حق دار ٹھہرا ہے۔

مذکورہ آیت سے پہلے آیت ۷ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا (النساء) مردوں کے لیے اس سے ایک حصہ ہے جو ان کے والدین اور قریبی چھوڑیں اور عورتوں کے لیے اس سے ایک حصہ ہے جو ان کے ماں باپ اور قریبی چھوڑیں خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت ایک مقرر حصہ۔

عرب میں یتامیٰ کو خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں میراث سے حصہ نہ دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ ابن عباس سے روایت ہے کہ عرب کے لوگ کہتے تھے لَا يُوَرَّثُ اِلَّا مَنْ قَاتَلَ عَلٰى ظُهُوْرِ الْخَيْلِ کوئی ورثہ نہیں لے سکتا مگر وہ جو گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر جنگ کرتا ہے چنانچہ جب ام کحت نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکایت کی کہ اس کے خاوند اوس بن ثابت کے ترکہ میں سے اس کی بیٹیوں کو کوئی حصہ نہیں ملا اور کل پر اس کے بھائی قابض ہو گئے ہیں تو انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہی عرض کیا تھا۔ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَدُهَا لَا يَرْكَبُ فَرَسًا وَيَحْمِلُ كَلًّا وَلَا سكى عَدُوًّا یعنی اولاد نہ گھوڑے

پر سوار ہوتی ہے نہ بوجھ اٹھاتی ہے اور نہ دشمن کو مارتی ہے۔

پس اس آیت نے ایک نہایت قدیم رسم کو موقوف کیا اور ترکہ میں مرد اور عورت بڑے چھوٹے جنگ میں شریک ہونے والے یا نہ ہونے والے سب ترکہ میں حصے دار ہیں۔

یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوت قدسی کا کمال ہے ہزاروں سالوں کی دیرینہ رسم کو ایک آن میں ختم کر دیا۔ جب عورتوں کا ورثہ میں حق دار ہونے کا حکم آیا تو سب صحابہ نے اس حکم کو بطیب خاطر قبول کر لیا۔ سب کی گردنیں جھک گئیں۔ ہزاروں سال کی پرانی رسم کو ختم کر دینا کوئی آسان کام نہیں بہر حال اسلام نے عورتوں کو ورثہ میں حق دار ٹھہرا کر مردوں کے برابر قرار دے دیا۔

قیمتی تحفہ، عفت کی حفاظت: عورت کا مقام بلند کرنے کے لیے اسلام نے جو سب سے قیمتی تحفہ عورت کو دیا ہے وہ اس کے جوہر عفت کی حفاظت ہے۔ یہی وہ جوہر ہے جس کی حفاظت کے لیے عورت خواہش مند ہوتی ہے۔ اسلام نے اس جوہر کی حفاظت کے لیے زنا کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا پھر اس کے انسداد کے لیے سنگین سزا مقرر کر دی یعنی بعض علماء کے نزدیک سنگساری اور بعض کے نزدیک کوڑے۔ اس کے ساتھ انسدادی ذرائع بھی مقرر کر دیے۔ یعنی پردہ اور غیر محرم مردوں سے آزادانہ ملاپ پر پابندی، پردہ پر تفصیلی بحث بعد میں آئے گی۔

عورت کا خصوصی حیثیت سے مقام: عورت کی مختلف خصوصی حیثیتیں ہیں۔ وہ بیوی بھی ہے ماں بھی ہے اور بیٹی بھی ہے ہر حیثیت سے اسلام نے ذلت کے گڑھے سے نکال کر عزت و تکریم کے مقام پر کھڑا کیا ہے۔

بیوی کی حیثیت سے: بیوی سکونِ قلب کا ذریعہ ہے۔ ارشاد ہے: وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً (الروم ۳۰:۲۱) اس خدا کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمھاری بیویاں پیدا کیں۔ تاکہ ان کے پاس سکون قلب پاؤ اور تمھارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَعَاشِرُوْھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء ۴:۱۹) عورتوں سے نیکی اور بھلائی کے ساتھ پیش آؤ۔

ماں کی حیثیت سے: اسلام نے ماں کو عظمت و احترام کے بلند مقام پر کھڑا کیا ہے۔ اس عظمت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ توحید الٰہی کے بعد دوسرا درجہ والدین کی اطاعت کا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ (البقرہ ۲:۸۳) اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ سوائے اللہ کے تم کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا اور رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اور لوگوں کو اچھی بات کہو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ پھر تم پھر گئے مگر تم میں سے تھوڑے اور تم منہ موڑنے والے ہو۔

ایک دوسری آیت ہے: قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمْ عَلَیْکُمْ اَلَّا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (انعام ۶:۱۵۱) کہ آؤ میں پڑھ کر سناؤں جو تمھارے رب نے حرام کیا ہے تم پر واجب ہے کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔

حدیث میں آتا ہے: عن ابی ھریرۃ قال قال رجل یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ اَحَقُّ بِحُسْنِ صَحَابَتِی قَالَ اُمُّکَ قَالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ اُمُّکَ قَالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ اُمُّکَ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ اَبَاکَ (مشکوٰۃ المصابیح باب البر والصلۃ صفحہ ۴۱۹ متفق علیہ) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہا کہ ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے۔ آپ نے فرمایا تیری ماں بولا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں۔ بولا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں۔ بولا پھر کون؟ فرمایا تیرا باپ۔

عَنِ الْمُغِیْرَۃِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَیْکُمْ عُقُوْقَ الْاُمَّھَاتِ وَدَاَ الْبَنَاتِ وَمنع ھَاتِ وَ کَرِہَ لَکُمْ قِیْلَ وَقَالَ وَکَثْرَۃَ السُّؤَالِ وَاِضَاعَۃَ الْمَالِ (مشکوٰۃ المصابیح باب البر والصلۃ صفحہ ۴۱۹) حضرت مغیرہؓ سے روایت ہے کہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ نے یقیناً تم پر حرام کیا ہے ماؤں کی نافرمانی اور بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا اور بخل اور گدائی کو تمھارے لیے ناپسند کیا ہے۔ فضول باتیں اور کثرت سے سوال اور مال ضائع کرنا۔

بیٹی کی حیثیت سے: اسلام نے بیٹی کے ساتھ حسن سلوک محبت اور شفقت سے پیش آنے کی تعلیم دی ہے اور اس کی اچھی تعلیم و تربیت کو دوزخ کی آگ سے نجات کا ذریعہ ٹھہرایا ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو قیامت کے دن میرا اس کا ساتھ (انگلیوں کو ملا کر فرمایا) اس طرح ہوگا۔ (مسلم کتاب البر والصلۃ والادب باب فضل الاحسان الی البنات) مسلم کی روایت ہے کہ جو شخص لڑکیوں کی پیدائش میں مبتلا ہو گیا اور اس نے ان کی پوری پرورش اور دیکھ بھال کی تو وہ لڑکیاں اس کے لیے دوزخ سے نجات کا باعث بن جائیں گی۔ (مسلم باب فضل الاحسان الی البنات)

گھریلو زندگی میں مقام: اسلام ایک عملی مذہب ہے۔ اس وجہ سے اس کی تعلیم زندگی کے ہر شعبہ میں حسن اور استواری بخشتی ہے۔ اس تعلیم کے علاوہ جو قانون بھی نافذ کیا جائے گا خواہ بظاہر کتنا ہی دلکش اور حسین ہو، وہ بگاڑ اور فساد کا موجب ہوگا۔ خاندان معاشرے کی پہلی اکائی ہے۔ اسی پر تہذیب وتمدن کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے اصولی طور پر خاندان کے متعلق احکام تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ وہ ایسے فطری اصول ہیں کہ انہی پر خاندان کا نظام احسن طریق پر چل سکتا ہے۔ اسلام نے مرد اور عورت کے جداگانہ طبعی میلانات جسمانی ساخت، عضویاتی اختلافات کے پیش نظر دونوں کے وظائف مقرر کر دیے ہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے دائرہ عمل میں آزاد ہے لیکن مجموعی طور پر مرد کو گھریلو زندگی میں نگران اعلیٰ مقرر کیا ہے جس کے یہ معنی نہیں کہ مرد حاکم ہیں اور عورتیں محکوم۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاۗءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (النساء ۴:۳۴) مرد عورتوں کے گزارہ کے ذمہ دار ہیں۔ اس لیے اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس لیے کہ انھوں نے اپنے مالوں سے کچھ خرچ کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مرد کو جسمانی اور بدنی قوت میں عورت پر فضیلت دی ہے۔ اس وجہ سے اس کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ مشقت اور محنت سے روزی کمائے اور اہل وعیال کی پرورش کرے اور عورت مرد سے محبت اور شفقت میں سبقت لے جاتی ہے اس وجہ کے پیش نظر عورت کے سپرد بال بچوں کی پرورش کر دی کیونکہ پرورش محبت اور شفقت کے جذبہ سے ہی صحیح ہوتی ہے۔ نسل انسانی کی ترقی کے لیے یہی تقسیم ضروری ہے کہ روٹی کمانے کا کام مرد کے سپرد ہونا چاہیے اور بچے پالنے کا کام عورت کو تفویض ہو۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نظام منزلی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔ ''ضروری ہے کہ مرد کو اس کی بیوی کا قوام بنایا جائے اور فطرت کا تقاضا ہے کہ عورت پر مرد کو غلبہ حاصل ہو اس لیے کہ مرد عقل میں کامل سیاست میں ماہر حمایت میں مضبوط اور ننگ و عار کو دور کرنے کی صلاحیت کا مالک ہے اور اس حیثیت سے بھی مرد کو عورت پر برتری حاصل ہے کہ مرد عورت کو کپڑا روٹی اور گھر مہیا کرتا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ حقوق زوجیہ ج ۲ صفحہ ۱۳۶)

مرد اور عورت کے عضویاتی اختلافات کی وجہ سے دانشور اسلام کی تعلیم کی طرف آ رہے ہیں اور برملا اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ عورتوں کا دائرہ عمل گھر کی چاردیواری ہے، اور ان کے مردوں کے مشاغل میں شریک ہونا سوسائٹی کے لیے زہر قاتل ہے۔ چنانچہ فلسفہ حسی کا موسس اگسٹ کونٹ اپنی مشہور تصنیف میں رقمطراز ہے۔

> ''جس طرح ہمارے زمانہ میں عورتوں کی سوشل حالت کے متعلق خیالی گمراہیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اسی طرح کے تغیر نظام تمدن اور آداب معاشرت کے ہر ایک دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ مگر وہ لا آف نیچر جو جنس محب (عورت) کو منزلی زندگی کے لیے مخصوص رکھتا اس میں کبھی کوئی اہم تغیر واقع نہیں ہوا۔ یہ قانون الٰہی اس درجہ صحیح اور محقق ہے کہ گو اس کی مخالفت میں سینکڑوں باطل خیالات قائم ہوتے رہے۔ مگر یہ بغیر کسی نقصان یا تغیر کے سب پر غالب آتا رہا۔ مردوں کے مشاغل میں عورتوں کی شرکت سے جو خوفناک نتائج اور فساد پیدا ہو رہے ہیں ان کا علاج یہی ہے کہ دنیا میں جنس عامل (مرد) پر جنس محبّ (عورت) کے جو مادی فرائض ہیں ان کی حد بندی اور تعین کر دی جائے۔ مرد پر واجب ہے کہ عورت کے تغذیہ کا انتظام کرے یہی وہ قانون طبعی اور ناموس الٰہی ہے جو جنس محبّ کی اصلی زندگی کو منزلی دائرہ میں محدود کرتا ہے۔ یہی وہ قاعدہ ہے جو ہیت اجتماعی کے خوفناک اور مہیب اشکال کو احسن اور اکمل کر دیتا ہے۔ یہی وہ قانون ہے جو عورت کو اپنے طبعی جذبات سے ترقی نوع انسانی جیسے شریف فرض کی بجا آوری پر آمادہ کرتا ہے۔ (مسلمان عورت صفحہ ۶۴، ۶۵)

علوم مادیہ کا ایک اور ماہر ژون سیمان اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے۔

''عورت کو چاہیے عورت رہے ہاں بے شک عورت کو چاہیے عورت رہے۔ اسی میں اس کے لیے فلاح ہے اور یہی وہ صفت ہے جو اس کو سعادت کی منزل تک پہنچا سکتی ہے۔ قدرت کا یہ قانون ہے اور قدرت کی یہ ہدایت ہے۔ اس لیے جس قدر عورت اس کے قریب ہوگی اس کی حقیقی قدر ومنزلت بڑھے گی اور جس قدر دور ہوگی اس کے مصائب ترقی کریں گے بعض فلاسفہ انسانی زندگی کو پاکیزگی سے خالی سمجھتے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ انسان کی زندگی دلفریب پاک اور بے حد پاکیزہ ہے۔ بشرطیکہ ہر مرد اور ہر عورت اپنے مدارج سے واقف

ہو جائے جو قدرت نے اس کے لیے قرار دیے ہیں اور اپنے فرائض ادا کرے جو قدرت نے اس کے متعلق کر دیے ہیں۔" (بحوالہ مسلمان عورت صفحہ ۵۹،۵۸)

یہی ژون سیمان ایک موقع پر لکھتا ہے:۔

"جو عورت اپنے گھر سے باہر کی دنیا کے مشاغل میں شریک ہوتی ہے اس میں شک نہیں کہ وہ ایک عامل بسیط کے فرائض انجام دیتی ہے۔ مگر افسوس کہ عورت نہیں رہتی۔ (ایضاً)

اگسٹ کونٹ لکھتا ہے:۔

شوہر یا کسی قریبی رشتہ دار کی عدم موجودگی میں سوسائٹی کا فرض ہے کہ عورت کی ضروریات کا اپنی دولت سے انتظام کرے تاکہ معاش کی ضرورت سے مجبور ہو کر اسے گھر کے باہر کی زندگی میں اپنے آپ کو مبتلا نہ کرنا پڑے کیوں کہ حتی الامکان عورت کی زندگی کو منزلی دائرے میں محدود رہنا چاہیے اور ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ عورت خارجی زندگی کے مصائب اور تکلیفوں سے محفوظ رہے اور قدرت نے اسے جس دائرہ میں محدود کر دیا ہے۔ اس سے باہر نکلنے پر مجبور نہ ہو۔ (مسلمان عورت ص ۷۹)

مسلم عورت اور سیاسیات: اسلام میں عورت کو زندگی کے ہر شعبہ میں شریک ہونے کی اجازت ہے۔ متعینہ حدود کے اندر رہتے ہوئے مسلمان عورتوں نے حصہ بھی لیا ہے۔ زندگی کا ایک اہم شعبہ سیاسیات ہے۔ مسلمان عورتیں اس شعبہ میں شریک تھیں۔ سمراء بنت نہیک کے بارے میں آتا ہے کہ وہ محکمہ امر بالمعروف کے اونچے عہدے پر فائز تھیں۔ وہ ہاتھ میں کوڑا لے کر نکلتیں اور تادیب کرتیں۔ حضرت عثمان کی خلافت کی تقرری فاطمہ بنت قیس کے گھر میں ہوئی۔ جس میں وہ شریک تھیں۔ حضرت عائشہ چاروں خلفاء کے دور میں خلفاء کو اپنے قیمتی مشورہ سے نوازتی تھیں۔ ابن العربی معافری نے روایت کی ہے کہ حضرت عمر نے بازاروں کی نگرانی شفاء نامی خاتون کے سپرد کی تھی۔ (الاحکام ۲/۱۳۶)

نیز ابن حزم نے (محلی ۹/۴۲۹) ابن عبدالبر نے (استیعاب ۲/۷۴۰) ابن الاثیر نے (اسد الغابہ ۵/۴۸۶) ابن حجر نے (اصابہ ۸/۱۲۰، تہذیب ۱۲/۴۲۸) میں اس بات کی وضاحت کی ہے۔ ان کا اصل نام لیلیٰ بنت عبداللہ العدویہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے ہاں قیولہ فرماتے تھے۔ انہی مثالوں کو دیکھ کر ابن جریر طبری عورت کی امارت کے بھی قائل ہیں لیکن امام صاحب مالیات میں اس کا قاضی ہونا صحیح سمجھتے ہیں۔ (ہدایۃ المجتہد ۲/۳۸۱) احناف میں راشدانی اور شوافع میں ابن طراز مطلق قاضی بنانا جائز کہتے ہیں۔ (ہدایۃ احکام ابن العربی ۲/۳۶ بحوالہ اسلام کا عائلی نظام ص ۲۴۱) مسلم عورت حکومت کی مشیر ہو سکتی ہے انقلابی پروگراموں میں حصہ لے سکتی ہے سیاسیات میں اپنی ذہنی استعدادوں کو بروئے کار لا کر کوئی نیا رخ موڑ سکتی ہیں۔ اس کے برخلاف یورپ میں مسز پانخرسٹ اور کرسٹابل کی تحریک کے دس سالہ جدوجہد کے بعد انگلینڈ میں ۱۹۱۶ء میں جزوی طور پر پھر ۲۸ میں رائے دہندگی کا حق ملا تھا۔

مسلم عورت اور سماجی خدمات: تاریخ سے یہ بات واضح ہے کہ عورتیں سماجی کاموں میں بھرپور حصہ لیتی تھیں حتیٰ کہ ناگزیر حالات میں صحابیات میدان جنگ میں گئی ہیں فوجی خدمات میں پیش پیش تھیں۔ بخاری اور احمد میں ربیع بنت معوذ سے روایت ہے کہ **كنا نغزو مع رسول الله صلى الله عليه وسلم نسقى القوم و نخدمهم ونروا القتلى والجرحى الى المدينة.** ہم عورتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ غزوات میں ہوتی تھیں اور مجاہدین کو پانی پلاتیں ان کی خدمت کرتیں اور مقتول اور مجروح لوگوں کو مدینہ لاتی تھیں۔

مسلم، احمد، ابن ماجہ، ام عطیہ انصاریہ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتی ہیں **غزوت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم سبع غزوات اخلفهم فى رحالهم واضع لهم الطعام واداوى الجرحى واقوم على الزمنى.** میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سات غزوات میں شریک رہی۔ سامان کی حفاظت، کھانا پکانا، زخمیوں اور بیماروں کی دیکھ بھال میرے ذمہ ہوتی تھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ "احد کے دن میں جدھر دیکھتا تھا۔ اسماء تلوار چلاتی نظر آتی تھیں۔"

حضرت ابوطلحہ کی زوجہ رمیصاء سے مسلم میں روایت ہے کہ انھوں نے حنین کے دن تلوار اٹھائی تو ان کے شوہر نے انھیں حیرت سے دیکھا اس پر انھوں نے کہا یہ احتیاطاً میں نے لے لی ہے کہ اگر کوئی مشرک قریب آئے تو اس کا کام تمام کر دوں۔

حضرت ام عمارہ فتنہ ارتداد میں سرفروشانہ شریک ہوئیں۔ دس زخم اٹھا کر مسیلمہ کذاب کو قتل کرتی ہیں۔ (المراۃ للخولی ۱۲۸)

حدیث تاریخ اور طبقات کی کتب عورتوں کی حربی خدمات سے بھری پڑی ہیں۔ ان کا ایک نمونہ مولانا سلیمان ندوی کی "اسلام کی بہادر بیٹیاں" نامی کتابچے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ شیخ منتصر کتانی نے "المراۃ فی النبوی" میں یہ تمام تفصیلات رقم کرنے کے بعد علماء اور ائمہ کے چند فتوے جمع کیے ہیں۔ کہ ضرورت

پڑ جائے تو عورتیں جنگ میں بھی حصہ لے سکتی ہیں اس پر ائمہ کا اتفاق ہے کہ عورتوں کا جہاد میں شریک ہونا جائز ہے۔ ابن حزم کہتے ہیں ان کا شریک ہونا مباح ہے۔ خلیل اور دردیر مالکی کہتے ہیں۔ ناگہانی صورت حال میں عورتوں پر بھی جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ دسوتی کہتے ہیں کہ عورتوں پر جہاد واجب عین ہے۔ (حاشیہ دسوتی ۲/۱۵۵)

ابن حبیب کہتے ہیں اگر عورت ان خدمات میں حصہ لیتی ہے اسے غنیمت میں سے حصہ دیا جائے گا۔ علم و ادب کے شعبے میں بھی مسلم عورتوں کی کارگزاری قابل تعریف ہے۔ حضرت عائشہ کا شمار محدثین نے مکثرین صحابہ میں کیا ہے۔ ان کی روایتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے ابونعیم نے حضرت عائشہ و حفصہ اسماء۔ رمیضاء ام عمارہ اور حضرت فاطمہ کے بارے میں لکھا ہے۔ کہ یہ کئی علوم میں دسترس رکھتی تھیں۔ (حلیہ ۲/۵۰ ۶۰)

فقہی معلومات میں زینب ابی سلمہ کا یہ پایہ تھا کہ الصائغ کہتے ہیں کہ وہ مدینہ کی عورتوں میں سب سے بڑھ کر فقیہ تھیں۔ (اصابہ ۸/۹۶)

ابن زبیر حضرت عائشہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ علم الفرائض حلال و حرام اور مسائل میں حضرت عائشہ سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔ مسروق کہتے ہیں کہ واللہ میں نے مشائخ اور اکابر صحابہ کو مسائل میراث حضرت عائشہ سے پوچھتے سنا ہے۔ عطا فرماتے ہیں کہ وہ سب سے بڑی عالم اور فقیہہ تھیں (زرقانی)

ابن حزم کہتے ہیں کہ ان کے اجتہادی مسائل اتنے ہیں کہ ان سے ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے اور پھر مجتہد صحابیات کے اسماء گرامی درج کیے ہیں وہ یہ ہیں امہات المومنین۔ حضرت فاطمہ' زینب' لیلی بنت قائف۔ (احکام ابن حزم ۵/۹۵)

اسماء ام شریک' ام الدرداء' عاتکہ بنت زید' سہلہ بنت سہیل' فاطمہ بنت قیس' ام سلیم' ام ایمن' ام یوسف اور غامدیہ رضوان اللہ علیہن۔

عروہ حضرت عائشہ کی تفسیری خدمات کے بارے میں کہتے ہیں کہ میں نے ان سے بڑا قرآن کا عالم نہیں دیکھا۔ ابن حزم کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ سے ۲۲۱۰ حدیثیں بقی بن مخلد اندلسی نے اپنی مسند میں ذکر کی ہیں ان کی متفق علیہ حدیثوں کی تعداد ۱۷۴ ہے۔ حضرت اشوی فرماتے ہیں کہ ہر مشکل حدیث کا حل ہم حضرت عائشہ سے پوچھتے تھے وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے حضرت عائشہ سے بڑا شعر و ادب طب و حکمت اور تاریخ عرب کا عالم نہیں دیکھا۔ حضرت معاویہ فرماتے ہیں۔ ''میں نے حضرت عائشہ سے بڑا کوئی پُرزور خطیب اور معاملہ فہم نہیں پایا۔ موسیٰ بن طلحہ کی بھی یہی رائے تھی خطیب عرب احنف بن قیس کہتے ہیں میں نے خلفاء اربعہ کی تقریریں سنی ہیں لیکن حضرت عائشہ کی تقریروں کا بلند آہنگی اور حسن اثر کا جواب نہ تھا۔ ابوزناد نے حضرت عروہ سے ایک بار کہا کہ آپ سے بہتر میں نے راوی شعر نہیں دیکھا عروہ بولے کہ حضرت عائشہ کے آگے میری کیا حقیقت ہے جب کوئی بات ہوتی تو موقع کی مناسبت سے وہ بہترین اشعار ضرور پڑھتی تھیں۔ (زرقانی ۳/۲۶۷)

حضرت علی فرماتے ہیں اگر عورت خلیفہ بن سکتی تو عائشہ خلیفہ ہوتیں (الحکومتہ النبویہ ۲/۴۳۴)

امام زہری فرماتے ہیں کہ تمام لوگوں کا اور ازواج نبی کا علم جمع کیا جائے تب بھی حضرت عائشہ کا علم ہی وسیع ہوگا (ابن سعد ۲/۲۶)

انھوں نے صحابہ پر مختلف موقعوں پر جو گرفت کی تھی اسے سیوطی نے ایک مستقل رسالہ میں جمع کر دیا ہے اس کا نام ہے ''عین الاصابہ فیما استدرکتہ عائشہ علی الصحابہ'' ام المومنین ام سلمہ سے ۳۷۸ حدیثیں مروی ہیں۔ اسی طرح دوسری صحابیات سے شیخ منتصر کیانی کے انداز کے مطابق ۳۰۶۳۵۔ امہات المومنین میں حضرت حفصہ لکھنا جانتی تھیں' قلقشندی کی روایت ہے کہ حضرت عائشہ بھی لکھنا جانتی تھیں (صبح الاعشیٰ ۱/۶۱) ان کے علاوہ عام صحابیات میں لکھنے پڑھنے کے بہت واقعات ملتے ہیں۔

صحابیات شاعرات ہیں اروی بنت عبدالمطلب۔ حضرت خنساء' زینب بنت العوام' سعدی بنت کریز (حضرت عثمان کی خالہ) شیما (آنحضرت کی رضاعی بہن صفیہ بنت عبدالمطلب' عاتکہ بنت زید' قتیلہ بنت النضر' لبابہ بنت الحارث۔ (حضرت خالد کی ماں) رقیہ' ضباعہ' عمرہ' فارعہ (حضرت حسان کی ہمشیرہ) کبشہ' ام رعلہ' اسماء بنت یزید کا نام اسلامی تاریخ میں مشہور ہیں۔

قتیلہ نے اپنے باپ کا مرثیہ پڑھا (جو بدر میں مارا گیا تھا) تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اشکبار ہو گئے حضرت ابوبکر سے فرمایا ابوبکر! میں نے اگر پہلے اس کا شعر سنا ہوتا تو اس کے باپ کو مارنے کا حکم نہ دیتا۔

حضرت خنساء کا شعری مرتبہ یہ تھا کہ صاحب اسد الغابہ ناقدین کا اجماع نقل کرتے ہیں کہ ان سے بڑھ کر کوئی شاعرہ نہیں ہوئیں مرثیہ گوئی میں انھیں امتیاز حاصل تھا۔ نابغہ نے ان کا شعر سن کر کہا اگر میں نے اعشیٰ کو نہ سنا ہوتا تو خنساء کو سب سے بڑا شاعر کہتا۔ عکاظ کے میلوں میں آپ کے خیمہ پر ارثی العرب (عرب کی عظیم مرثیہ گو شاعرہ) لکھا ہوتا۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی توجہ سے آپ کا کلام سماعت فرمایا ہے آپ ہاتھوں سے اشارہ کر کے اور مزید سنانے کی فرمائش کرتے اھیہ یا خناس (خنساء کچھ اور سناؤ) جب ہم پہلے دور کے بعد تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو بے شمار عورتیں ہیں جنھوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں کام کیا اور نام پایا۔

یورپ میں عورتوں کی آزادی کا نعرہ اور اس کے نتائج: ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ یورپ میں اٹھارویں صدی تک مسیحی فلسفہ زندگی کے زیر اثر عورت ہر قسم کے انسانی حقوق سے محروم تھی۔ اسی مظلومی اور محکومی کے بطن سے آزادی نسواں کی تحریک اٹھی اور بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے یہ تحریک بے اعتدالی اور افراط کا راستہ اختیار کر گئی۔ اب یورپ میں یہ تحریک تین عنوانوں کے تحت آتی ہے۔

۱۔ عورتوں اور مردوں میں مساوات۔

۲۔ عورتوں کا معاشی استقلال۔

۳۔ مرد اور عورت میں آزادانہ اختلاط۔

اس آزادی کا نقشہ مولانا محمد ظفیر الدین اپنی تصنیف اسلام کا نظام عفت و عصمت میں ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

''کون نہیں جانتا کہ عورتوں کی آزادی ملک کو تباہ کر دیتی ہے۔ قوم کی ریڑھ کی ہڈی کو توڑ ڈالتی ہے اور خود عورتوں کو تو جنت سے جہنم میں پہنچا دیتی ہے۔ عورت اس بیسویں صدی میں خوش ہے کہ اسے حقوق مل رہے ہیں۔ وہ ہر محکمہ میں ملازمت حاصل کر رہی ہے۔ مگر اسے پتہ نہیں کہ مردوں نے اسے گائے کی طرح استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اسے ذرہ برابر چین نہیں۔ اپنے قدرتی فرائض سے دن بدن دور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مردوں کی تفریح کے لیے عورتوں کو سینما کے پردوں پر آنا پڑا مردوں کی دلبستگی کا سامان مہیا کرنے کے لیے تھیٹر کی ناپاک زندگی قبول کرنی پڑی۔ مردوں کی ہوس پوری کرنے کے لیے ان کو کلب اور ناچ گھروں میں ناچنا پڑا اور حد یہ ہے کہ محض مردوں کی شہوت پرستی کے سلسلہ میں عورت کو عریاں کلب بنانا پڑا مگر اب تک عورت یہ سمجھ رہی ہے کہ مردوں کی غلامی سے ہمیں نجات مل گئی۔ (صفحہ ۳۴۳)

اس آزادی کے نتیجہ میں بدکاری اور بے حیائی کے چشمے یورپ میں ابلنے لگے ہیں۔ زنا عام ہو گیا۔ مالی منفعت کے لیے ایک منظم حرفہ بن گیا۔ چنانچہ پول بیورو لکھتا ہے۔

''یہ ایک زبردست نظام ہے جو پورے منظم طریقے سے تنخواہ یاب عہدیداروں اور کارکنوں کے ساتھ چل رہا ہے۔ ناشرین اور اہل قلم خطباء و مقررین اطباء اور قابلات اور تجارتی سیاح اس میں باقاعدہ ملازم ہیں اور اشتہار اور مظاہرہ کے جدید طریقے اس کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ (بحوالہ پردہ از مودودی صاحب صفحہ ۸۵)

فرنچ سینٹ کے ایک رکن موسیو فرونان درلیغو نے بیان کیا کہ:۔

''قحبہ گری کا پیشہ اب محض انفرادی کام نہیں رہا بلکہ اس کی ایجنسی سے جو عظیم مالی فوائد حاصل ہوتے ہیں ان کی وجہ سے اب یہ ایک تجارت Business اور ایک منظم حرفہ Organised Industry بن گیا ہے اس کے ''خام پیداوار'' مہیا کرنے والے ایجنٹ الگ ہیں۔ سفری ایجنٹ الگ ہیں۔ اس کی باقاعدہ منڈیاں موجود ہیں جوان لڑکیاں اور کم سن بچیاں وہ تجارتی مال ہیں جس کی درآمد و برآمد ہوتی ہے اور دس سال سے کم عمر کی لڑکیوں کی مانگ زیادہ ہے۔''

ڈاکٹر ایڈتھ ہوکر Edith Hooker اپنی کتاب Laws of Sex میں لکھتی ہے کہ:۔

نہایت مہذب اور دولت مند طبقوں میں بھی یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ آٹھ برس کی لڑکیاں اپنے ہم عمر لڑکوں سے عشق و محبت کے تعلقات رکھتی ہیں جن کے ساتھ بسا اوقات مباشرت بھی ہو جاتی ہے۔''

اس کا بیان ہے: ''ایک سات سال کی چھوٹی سی لڑکی جو ایک نہایت شریف خاندان کی چشم و چراغ تھی خود اپنے بڑے بھائی اور اس کے چند دوستوں سے ملوث ہوئی اور ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ پانچ بچوں کا ایک گروہ جو دو لڑکیوں اور تین لڑکوں پر مشتمل تھا اور جن کے گھر پاس پاس واقع ہوئے تھے باہم شہوانی تعلقات میں وابستہ پائے گئے اور انھوں نے دوسرے کم سن بچوں کو بھی اس کی ترغیب دی۔ ان میں سب سے بڑے بچے کی عمر دس سال کی تھی۔ ایک اور واقعہ ایک نو سال کی بچی کا ہے جو بظاہر بڑی حفاظت سے رکھی جاتی تھی اس بچی کو ''متعدد عشاق'' کی منظور نظر ہونے کا فخر حاصل تھا۔ (پردہ صفحہ ۸۵)

امریکہ میں جن عورتوں نے زنا کاری کو مستقل پیشہ بنا لیا ہے۔ ان کی تعداد کا کم سے کم اندازہ چار پانچ لاکھ کے درمیان ہے۔

(Prostilution in the united states pp64 صفحہ ۳۲۸ بحوالہ پردہ صفحہ ۹۰)

انگلستان کا ایک مصنف جارج رائیلی اسکاٹ اپنی کتاب تاریخ الفحشاء History of Prastitution میں اپنے ملک کی نسل کی بے راہ روی کا

ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

''جن عورتوں کی بسر اوقات کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ اپنے جسم کو کرایہ پر چلا کر روزی کمائیں ان کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد ان عورتوں کی بھی ہے (اور وہ روز بروز زیادہ ہو رہی ہے) جو اپنی ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لیے دوسرے ذرائع رکھتی ہیں اور ضمنی طور پر اس کے ساتھ فاحشہ گری بھی کرتی ہیں تاکہ آمدنی میں کچھ اور اضافہ ہو جائے یہ پیشہ ور فاحشات سے کچھ بھی مختلف نہیں ہیں مگر اس نام کا اطلاق ان پر کیا نہیں جاتا۔ ہم ان کو غیر پیشہ ور فاحشات (A mateur prostitues) کہہ سکتے ہیں۔(بحوالہ پردہ صفحہ ۹۷)

''ان شوقین یا غیر پیشہ ور فاحشات کی کثرت آج کل جتنی ہے اتنی کبھی نہ تھی سوسائٹی کے نیچے سے لے کر اوپر تک ہر طبقہ میں یہ پائی جاتی ہیں اگر ان معزز خواتین کو کہیں اشارے کنائے میں بھی ''فاحشہ'' کہہ دیا جائے۔ تو یہ آگ بگولا ہو جائیں گی مگر ان کی ناراضی سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ حقیقت بہر حال یہی ہے۔ کہ ان میں اور پکاؤلی کی کسی بڑی سے بڑی بے شرم بیسوا میں بھی اخلاقی حیثیت سے کوئی وجہ امتیاز نہیں ہے.......... اب جوان لڑکی کے لیے بدچلنی اور بے باکی بلکہ سوقیانہ اطوار تک فیشن میں داخل ہو گئے ہیں اور سگریٹ پینا' تلخ شرابیں استعمال کرنا، ہونٹوں پر سرخی لگانا، صنفیات اور منع حمل کے متعلق اپنی واقفیت کا اظہار کرنا۔ فحش لٹریچر پر گفتگو کرنا یہ سب چیزیں بھی ان کے لیے فیشن بنی ہوئی ہیں...... ایسی لڑکیوں' عورتوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے جو شادی سے پہلے صنفی تعلقات بلاتکلف قائم کر لیتی ہیں اور وہ لڑکیاں اب شاذ کے حکم میں ہیں۔ جو کلیسا کی قربان گاہ کے سامنے نکاح کا پیمان وفا باندھتے وقت صحیح معنوں میں دوشیزہ ہوتی ہوں۔ (بحوالہ پردہ صفحہ ۹۷۔۹۸)

یہ مصنف ان بے حیائیوں کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

''عورتوں کی آزادی کا بھی ان حالات کی پیدائش میں بہت کچھ دخل ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں لڑکیوں پر سے والدین کی حفاظت و نگرانی اس حد تک کم ہو گئی ہے کہ تیس چالیس سال قبل لڑکوں کو بھی اتنی آزادی حاصل نہ تھی جتنی اب لڑکیوں کو ہے۔''

''ایک اور اہم سبب جو سوسائٹی میں وسیع پیمانے پر صنفی آوارگی پھیلنے کا موجب ہوا یہ ہے کہ عورتیں روز افزوں تعداد میں تجارتی کاروبار دفتری ملازمتوں اور مختلف پیشوں میں داخل ہو رہی ہیں جہاں شب و روز ان کو مردوں کے ساتھ خلط ملط ہونے کا موقع ملتا ہے اس چیز نے عورتوں اور مردوں کے اخلاقی معیار کو بہت گرا دیا ہے۔ مردانہ اقدامات کے مقابلہ میں عورتوں کی قوت مزاحمت کو بہت کم کر دیا ہے اور دونوں صنفوں کے شہوانی تعلق کو تمام اخلاقی بندشوں سے آزاد کر کے رکھ دیا ہے۔ اب جوان لڑکیوں کے ذہن میں شادی اور باعصمت زندگی کا خیال آتا ہی نہیں۔ آزادانہ خوش وقتی جسے پہلے کبھی آوارہ قسم کے مرد ڈھونڈتے پھرتے تھے آج ہر لڑکی اس کی جستجو کرتی پھرتی ہے دوشیزگی اور بکارت کو ایک دقیانوسی چیز سمجھا جاتا ہے اور دور جدید کی لڑکی اس کو ایک مصیبت خیال کرتی ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کا لطف یہ ہے کہ عہد شباب میں لذات نفس کا جام خوب جی بھر کر پیا جائے اسی چیز کی تلاش میں وہ رقص خانوں' نائٹ کلبوں، ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کے چکر لگاتی ہے اور ان کی جستجو میں وہ بالکل اجنبی مردوں کے ساتھ موٹر کی سیر کے لیے بھی جانے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ جان بوجھ کر خود اپنی خواہش سے اپنے آپ کو ایسے ماحول میں اور ایسے حالات میں پہنچا دیتی ہے اور پہنچاتی رہتی ہے۔ جو صنفی جذبات کو مشتعل کرنے والے ہیں اور پھر اس کے جو قدرتی نتائج ہیں ان سے وہ گھبراتی نہیں ہے بلکہ ان کا خیر مقدم کرتی ہے۔'' (بحوالہ پردہ صفحہ ۹۸۔۹۹)

جنسی آوارگی اس آزادی اور مساوات کا نتیجہ ہے جو یورپ نے عورت کو دے رکھی ہے اور یورپ کے مفکرین ان فواحش کو دیکھ کر نوحہ کر رہے ہیں۔ تاریخی حقائق اور شواہد سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جنسی مساوات اور آزادی کا جو تصور قرآن نے پیش کیا ہے وہی عین فطرت کے مطابق ہے اور وہی معاشرہ کی پاکیزگی کا موجب ہو سکتا ہے۔ اس کی تصدیق مغربی حکماء اور ماہرین نفسیات نے بھی کی۔ چنانچہ ایک فرانسیسی مصنف الکوس کیرل اپنی کتاب Man the Unknown میں لکھتا ہے۔

''مردوں اور عورتوں کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ بنیادی نوعیت کے ہیں یہ اختلافات ان کے جسم کی رگوں اور ریشوں کی ساخت کے مختلف ہونے سے پیدا ہوتے ہیں عورتوں کے بیضہ دان سے جو کیمیاوی مادے خارج ہوتے ہیں۔ ان کا اثر صنف نازک کے ہر حصہ پر پڑتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے طبعی اور نفسیاتی اختلافات کا سبب بھی یہی ہے ان بنیادی حقائق کو نظر انداز کر

دینے کی وجہ سے نسوانی آزادی کے علمبرداروں نے یہ دعویٰ کیا کہ مردوں اور عورتوں کی ذمہ داریاں اور حقوق بالکل یکساں اور مساوی ہونے چاہئیں۔ حالانکہ فی الحقیقت مردوں اور عورتوں کے درمیان بے حد اختلافات پائے جاتے ہیں۔ عورت کے جسم کے ہر عطیہ پر اس کی نسوانیت کے نقوش مرتسم ہوتے ہیں یہی بات اس کے نظام عصبی کے متعلق عورتوں کو اپنی فطرت کے مطابق اپنے رجحانات کی تشکیل کرنی چاہیے بغیر اس کے کہ وہ مردوں کی تقلید کریں۔ تہذیب کے ارتقاء میں عورتوں کا بہ نسبت مردوں کے حصہ ہے۔ اس لیے انھیں اپنے خصوصی فرائض سے پہلو تہی نہیں کرنی چاہیے۔'' (اسلام میں حیثیت نسواں مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی صفحہ ۲۸)

ڈاکٹر لیمبر دس گنا اپنی کتاب ''روحِ نسوانیت'' میں رقمطراز ہے کہ:۔ عورتیں اور مرد صرف طول و قامت' ہڈیوں کی ساخت اور عضلاتی بناوٹ کے اعتبار سے ہی مختلف نہیں بلکہ اس اعتبار سے بھی مختلف ہیں کہ وہ ہوا اور غذا کی ایک ہی مقدار جذب نہیں کرتے ان کے امراض کی نوعیت مختلف ہوتی ہے ان کے ذہنی اور اخلاقی رجحانات میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتی ہے ترقی اور ارتقاء صرف اسی طرح ممکن ہے کہ مردوں اور عورتوں کے حقوق و فرائض کا تعین کرنے میں ان کے فروق و اختلافات کو مدنظر رکھا جائے۔
(اسلام میں حیثیت نسواں مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی صفحہ ۳۱)

انسائیکلو پیڈیا کا مصنف پروفیسر دوفاریی لکھتا ہے:۔

''جس طرح مرد اور عورت کے جسمانی اور دماغی قویٰ کا باہمی اختلاف تم کو پیرس جیسے متمدن شہر کے شائستہ باشندوں میں نظر آتا ہے۔ اسی طرح امریکہ کے وحشی ترین اقوام میں پایا جاتا ہے۔'' (مسلمان عورت ص ۴۵)

ان تحریرات سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے مرد اور عورت کے درمیان طبعی اختلافات کو مدنظر رکھ کر عورت کو جو درجہ دیا ہے۔ وہی ٹھیک ہے اور اسی سے معاشرہ میں اعتدال قائم رہ سکتا ہے۔ قرآن مجید کا عطا کردہ درجہ افراط اور تفریط سے پاک ہے اور عورتوں کے طبعی رجحانات' جسمانی ساخت کے مطابق ہے۔

پردہ (عفت کی حفاظت کا بہترین ذریعہ)

پردہ کی اہمیت: پردہ عورت کی عفت کے جوہر کی حفاظت کے لیے ہے۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ عورت کے عفت کے داغدار ہونے کی وجہ سے معاشرہ میں بگاڑ اور فساد پیدا ہوا۔ جس کا زہریلا اثر سلطنتوں پر پڑا اور بڑی مضبوط ریاستیں ریت کی دیوار کی طرح گر گئیں۔ لہٰذا عورت کی عفت اور پاک بازی کا بگاڑ صرف عورت کی ذات تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اس کا زہر معاشرہ میں پھیلتا ہے پھر وہی زہر سلطنت کی بربادی کا ماتحت بنتا ہے۔ لہٰذا اسلام نے عورت کی عفت کے جوہر کو عورت کا زیور قرار دیا ہے اس کی حفاظت کے طریقے اختیار کیے ہیں۔ ان میں سے ایک پردہ ہے۔

پردہ کے احکام: پردہ کے احکام میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں بعض احکام میں مرد اور عورت برابر کے شریک ہیں۔ بعض احکام صرف عورتوں کے لیے ہیں۔ مرد ان سے مستثنٰی ہیں اور بعض وہ احکام ہیں جن میں صرف مرد شامل ہیں۔

وہ احکام جن میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں

ا۔ غض بصر (آنکھوں کو نیچا رکھنا): سب سے پہلا حکم مردوں اور عورتوں کو دیا گیا ہے۔ وہ غض بصر (آنکھوں کو نیچا رکھنا) ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ قُلْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِکَ اَزْکٰی لَهُمْ (النور۲۴:۳۵) ''مومنوں کو کہہ دو اپنی نظریں نیچی رکھیں اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کیا کریں۔ یہ ان کے لیے پاکیزہ ہے۔'' عورتوں کے متعلق آتا ہے: قُلْ لِلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (النور۲۴ص:۳۰) ''اور مومن عورتوں کو کہہ دو اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔'' مذکورہ آیات میں مردوں اور عورتوں کو غض بصر اور حفاظت فروج (شرم گاہوں) کا حکم دیا گیا ہے۔ غض بصر سے انسان کے اندر ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اگر بدی کے لیے بڑی ترغیب بھی ہو تو وہ اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ گویا عفت کی قوت پیدا کرنے کا پہلا ذریعہ ہے۔ جب انسان اپنی نگاہ نیچی رکھے گا۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ شہوات کی نظر سے عورتوں کے دیکھنے سے بچ جائے گا اور اس کے اندر عفت کی قوت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جائے گی۔ اگر کسی وقت کوئی ترغیب کا موقعہ بھی آ جائے۔ تو اس کے اندر پاکیزگی کی قوت اس قدر ہوگی۔ وہ اس ترغیب پر آسانی سے غالب آ جائے گی۔ حدیث میں ہے۔ آنکھوں کا بھی زنا ہے اور کانوں کا بھی زنا ہے اور ہاتھوں کا بھی زنا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ نگاہوں کو نیچے رکھنے کا یہ نتیجہ ہے کہ انسان آنکھوں کے زنا سے بچ گیا۔

یہ تو ممکن ہی نہیں کہ کوئی مرد کسی عورت کو اور کوئی عورت کسی مرد کو کبھی دیکھے ہی نہیں اس لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اچانک ایک نظر پڑ جائے تو معاف ہے۔ حدیث میں آتا ہے: عَنْ جَرِیْرٍ قَالَ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنْ نَظْرِ الْفُجَاةِ فَقَالَ اصْرِفْ بَصَرَکَ (ابو داؤد) ''حضرت جریرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ اچانک نظر پڑ جائے تو کیا کروں؟ آپ نے فرمایا کہ نظر پھیر لو۔''

حدیث ہے اِبْنَ اٰدَمَ لَکَ اَوَّلَ نَظْرَةٍ وَاِیَّاکَ وَالثَّانِیَةَ (الجصاص) ''آدم زادے! تیری پہلی نظر تو معاف ہے مگر خبردار دوسری نظر نہ ڈالنا۔''

حضرت علیؓ سے فرمایا یَاعَلِی لَا تَتْبِعُ النَّظْرَةُ النَّظْرَةَ فَاِنَّ لَکَ الْاُوْلٰی وَلَیْسَ لَکَ الْاٰخِرَةَ (ابو داؤد ما یومر به من غض البصر) اے علی ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالو پہلی نظر تو معاف مگر دوسری نہیں۔

حضرت جابر نے پوچھا ''اچانک نظر پڑ جائے تو کیا کروں؟ فرمایا نظر پھیر لو۔ (ابوداؤد باب مذکور)

۲۔ لباس اور ستر کے احکام: اسلام نے لباس اور ستر کے احکام کے ذریعہ برہنگی اور عریانی کا خاتمہ کیا ہے مرد اور عورتوں کے لیے ستر کی حدود مقرر کر دیں۔ عرب جاہلیت میں غسل اور قضائے حاجت میں پردہ کرنا غیر ضروری تھا۔ کعبہ کا طواف مرد اور عورتیں برہنہ کیا کرتی تھیں۔ ابن عباسؓ مجاہدؒ طاؤس اور زہری کی متفقہ روایت ہے۔ کعبہ کا طواف برہنگی کی حالت میں کیا کرتے تھے۔ مسلم کتاب التفسیر میں عرب کی یہ رسم بیان کی گئی ہے کہ ایک عورت برہنہ ہو کر طواف کرتی پھر حاضرین سے کہتی کہ ''کون مجھے ایک کپڑا دیتا ہے کہ میں اس سے اپنا بدن ڈھانکوں اس طرح سائلہ کو کپڑا دینا ایک کار ثواب سمجھا جاتا۔

اسلام نے انسان کو ثقافت کا درس دیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا (الاعراف ۷:۲۶) ''اے آدم

کی اولاد ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمھارے عیبوں کو ڈھانکے اور زینت ہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''ملعون وہ جو اپنے بھائی کے ستر پر نظر ڈالے۔ (احکام القرآن للجصاص) پھر فرمایا کوئی مرد کسی مرد اور کوئی عورت کسی عورت کو برہنہ نہ دیکھے۔ (مسلم باب تحریم النظرالی العورات) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''اللہ کی لعنت ہے ان عورتوں پر جو لباس پہن کر بھی ننگی کی ننگی رہیں۔'' حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ اپنی عورتوں کو ایسے کپڑے نہ پہناؤ جو جسم پر اس طرح چست ہوں کہ سارے جسم کی ہیت نمایاں ہو جائے۔ (المبسوط کتاب الاستحسان)

۳۔ تخلیہ (علیحدگی) اور لمس (چھونا) کی ممانعت: اسلام میاں بیوی کے علاوہ کسی مرد اور عورت کو ایک تخلیہ (علیحدگی) اور لمس (چھونے) کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ تخلیہ اور لمس دونوں بدکاری کا رستہ ہیں۔ حدیث میں آتا ہے۔ عَنْ عُقْبَۃَ بْنِ عَامِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اِیَّاکُمْ وَالدُّخُوْلَ عَلَی النِّسَاءِ فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَفَرَاَیْتَ الْحَمْوَ قَالَ اَلْحَمْوُ الْمَوْتُ (ترمذی) ''عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا خبردار عورتوں کے پاس تنہائی میں نہ جاؤ'' انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! دیور اور جیٹھ کے متعلق کیا حکم ہے۔ فرمایا: ''وہ موت ہے'' تخلیہ میں عورت اور مرد دونوں ایک ہی حکم میں آتے ہیں۔

فرمایا: ''شوہروں کی غیر موجودگی میں عورتوں کے پاس نہ جاؤ کیونکہ شیطان تم میں سے کسی کے اندر خون کی طرح گردش کر رہا ہے۔'' (ترمذی باب کراہۃ الدخول علی المغیبات)

فرمایا۔ عَنْ عَمْرُو ابْنِ عَاصٍ قَالَ نَھَانَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ نَدْخُلَ عَلَی النِّسَاءِ بِغَیْرِ اِذْنِ اَزْوَاجِھِنَّ (ترمذی باب فی النھی عن الدخول عَلَی النِّسَاءِ اِلَّا بَاذن ازواجھن) ''عمرو ابن عاص کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو عورتوں کے پاس ان کے شوہروں کی اجازت کے بغیر جانے سے منع فرمایا۔''

صرف عورتوں کے بارے میں احکام

۱۔ اصلی جگہ اس کا گھر ہے: اصل میں عورت کا دائرہ کار اس کا گھر ہے اس لیے سب سے پہلے عورت کو یہ حکم دیا ہے وہ بلا ضرورت اپنے گھروں سے باہر نہ نکلیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ (الاحزاب ۳۳:۳۳) اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہیں۔''

۲۔ تبرج (بناؤ سنگھار کر کے باہر نکلنے سے ممانعت): جاہلیت میں عورتیں لوگوں کی توجہ اپنی طرف مائل کرنے کے لیے بناؤ سنگھار کر کے باہر نکلتی تھیں۔ بہت ہی باریک لباس زیب تن کرتی تھیں اور جسم کے بعض حصے بالکل ننگے ہوتے تھے۔ جس طرح آج کل یورپ کی عورتیں نیم عریاں لباس پہن کر کلبوں میں جاتی ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی یہ مرض ساری دنیا میں پھیل گیا ہے حتیٰ کہ اسلامی ممالک میں امیر گھرانوں کی عورتیں نیم عریاں لباس پہن کر مخلوط تقریبات میں جاتی ہیں۔ قرآن مجید نے ایک جامع اصطلاح ''تبرج جاہلیت استعمال کی ہے۔'' ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاھِلِیَّۃِ الْاُوْلٰی (الاحزاب ۳۳:۳۳) ''پہلی جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو۔''

۳۔ انداز گفتگو: عورتوں کو ایسے انداز سے گفتگو کرنے سے روکا ہے جو فتنہ کا موجب بن سکتا ہے۔ اس کو حدیث کی زبان میں زبان کا زنا کہا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:۔ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِہٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (الاحزاب ۳۳:۳۲) ''اگر تم تقویٰ اختیار کرو سو نرم آواز میں بات نہ کرو ایسا نہ ہو کہ وہ جس کے دل میں بیماری ہے طمع کرے اور نیکی کی بات کہو۔''

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اگر غیر محرم مردوں سے گفتگو کرنا پڑے تو ایسے انداز سے گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ جو موجب فتنہ ہو اور دوسروں کی کشش کا سبب ہو بلکہ ایسے انداز سے بات کی جائے۔ جس میں ایک قسم کا جلال ہو۔ مردانہ انداز ہو۔ حدیث میں آتا ہے ''آنکھیں زنا کرتی ہیں اور ان کا زنا نظر ہے اور ہاتھ زنا کرتے ہیں۔ ان کا زنا لمس اور گرفت ہے اور پاؤں زنا کرتے ہیں اور ان کا زنا (غلط مقصود کے لیے) چل کر جانا ہے اور زبان کا زنا گفتگو ہے اور دل کا زنا تمنا اور خواہش ہے آخر میں صنفی اعضاء یا تو ان سب کی تصدیق کر دیتے ہیں یا تکذیب۔

۴۔ انداز رفتار: بعض اوقات زبان خاموش رہتی ہے۔ لیکن ایک عورت اپنے انداز رفتار سے دوسروں کے قلوب کو تسخیر کرتی ہے۔ اسلام نے اس قسم کے انداز رفتار سے منع فرمایا۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِھِنَّ لِیُعْلَمَ مَایُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِھِنَّ (النور ۲۴:۳۱) ''اپنے پاؤں کو اس طرح زمین پر نہ ماریں کہ ان کی چھپی ہوئی زینت معلوم ہو جائیں۔''

۵۔ خوشبو: بعض اوقات ایک عورت خوشبو لگا کر گھر سے باہر نکلتی ہے۔ محافل اور تقریبات میں جاتی ہے تا کہ خوشبو کی وجہ سے مردوں کی نظر کا مرکز بن جائے۔ اسلام نے اس کو ایک فتنہ قرار دیا ہے۔ اس سے انسان کے شیطانی جذبات متحرک ہو جاتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اَلْمَرْاَۃُ اِذَا اسْتَعْطَرَتْ فَمَرَّتْ بِالْمَجْلِسِ فَهِیَ کَذَا یَعْنِیْ زَانِیَةً (ترمذی) کہ جو عورت عطر لگا کر لوگوں کے درمیان سے گزرتی ہے۔ وہ آوارہ قسم کی عورت ہے۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے: اِذَا شَهِدَتْ اِحْدٰکُنَّ الْمَسْجِدَ فَلَا تَمَسَّنَ طِیْبًا (موطا و مسلم) ''جب تم میں سے کوئی عورت مسجد میں جائے تو خوشبو نہ لگائے۔''

۶۔ عریانی و برہنگی: زمانہ جاہلیت میں عورتیں مردوں کی نظر کا مرکز بننے کے لیے نیم برہنہ لباس زیب تن کرتیں جس طرح آج کل یورپ میں ہے وہ گردن اور کندھے اور سینے کے بعض حصے اظہار حسن کے لیے کھلا چھوڑتی ہیں تا کہ دوسرے کے لیے صنفی کشش ظاہر ہو۔ یہ ایک ناشائستہ انداز ہے۔ جس کو اسلام ناپسند کرتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: نِسَاءٌ کَاسِیَاتٌ عَارِیَاتٌ مُمِیْلَاتٌ مَائِلَاتٌ رُؤُسُهُنَّ کَالْبُخْتِ الْمَائِلَةِ لَا یَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ وَلَا یَجِدْنَ رِیْحَهَا (مسلم باب النساء الکاسیات العاریات) ''جو عورتیں کپڑے پہن کر بھی ننگی ہیں اور دوسرے کو رجھائیں اور خود دوسروں پر ریجھیں اور بختی اونٹ کی طرح ناز سے گردن ٹیڑھی کر کے چلیں وہ بہشت میں ہرگز داخل نہیں ہوں گی۔ نہ اس کی بو پائیں گی۔''

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں ''ملعون ہے وہ جو اپنے بھائی کے ستر میں نظر ڈالے۔'' (احکام القرآن للجصاص) پھر فرمایا کوئی مرد کسی مرد کوئی عورت کسی عورت کو برہنہ نہ دیکھے (مسلم باب تحریم النظر الی العورات)

۷۔ گھر سے باہر کا پردہ: گو عورت کا دائرہ کار گھر ہے لیکن عائلی، معاشرتی، معاشی، مسائل یا دیگر وجوہ کی بنا پر عورت کو گھر سے باہر جانا پڑتا ہے۔ جب کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ عورتوں نے غازیوں کو پانی پلانے مرہم پٹی کرنے کے لیے جنگوں میں حصہ لیا۔ لہٰذا عورت ضروریات زندگی کے لیے گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔ اسلام نے گھر سے باہر نکلنے کے آداب سکھائے ہیں اور اظہار محاسن سے منع کیا اور ستر کا حکم دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ (النور۲۴:۳۱) اور چاہیے کہ اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈالیں اور اپنی زینت کو (اور کسی کے سامنے) ظاہر نہ کریں۔

دوسری جگہ آتا ہے: یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَبَنٰتِکَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ذٰلِکَ اَدْنٰی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ وَکَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (الاحزاب ۳۳:۵۹) ''اے نبی اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ اپنی چادریں اپنے اوپر اوڑھ لیا کریں۔ یہ زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچان لی جائیں۔ تو انھیں ایذا نہ دی جائے اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

عورت کا ستر: عورت کا ستر یہ ہے کہ اپنے چہرے اور ہاتھوں کے سوا تمام جسم کو اوڑھنی سے لوگوں سے چھپائیں اس حکم میں باپ، بھائی اور تمام رشتے دار شامل ہیں اور شوہر کے سوا کوئی مرد اس سے مستثنیٰ نہیں ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: لَا تَحِلُّ لِامْرَاَۃٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ تَخْرُجَ یَدَیْهَا اِلَّا اِلٰی هٰهُنَا وَقَبَضَ نِصْفَ الذِّرَاعِ (ابن جریر) کسی عورت کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہو۔ جائز نہیں کہ وہ اپنا ہاتھ اس سے زیادہ کھولے۔ یہ کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی کلائی کے نصف حصہ پر ہاتھ رکھا۔ فرمایا: اَلْجَارِیَةُ اِذَا حَاضَتْ لَمْ یُصْلِحْ اَنْ یُرٰی مِنْهَا اِلَّا وَجْهَهَا وَیَدَهَا اِلَی الْمُفْصَلِ ''جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے جسم کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دینا چاہیے۔ سوائے چہرہ اور کلائی کے جوڑ تک ہاتھ کے۔''

حضرت اسماء بنت ابوبکر ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے باریک لباس پہن کر حاضر ہوئیں تو آپ نے فوراً نظر پھیر لی۔ اور فرمایا: یَا اَسْمَاءُ اِنَّ الْمَرْاَۃَ اِذَا بَلَغَتْ الْمَحِیْضَ لَمْ یُصْلِحْ اَنْ یُرٰی مِنْهَا اِلَّا هٰذَا وَهٰذَا وَاَشَارَ اِلٰی وَجْهِهٖ وَکَفِّهٖ (تکملہ فتح القدیر) اے اسماء! عورت جب بالغ ہو جائے۔ تو اس کے لیے یہ درست نہیں کہ اس کے جسم میں سے کچھ دیکھا جائے بجز اس کے اور اس کے یہ کہہ کر آپ نے اپنے چہرے اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ فرمایا۔

کن سے پردہ نہیں: ۱۔ خاوند۔ ۲۔ باپ (دادا۔ پردادا نانا۔ پرنانا اور اس سے اوپر سب شامل ہیں) ۳۔ خسر (خسر کا باپ، دادا، پردادا اور اوپر تک) ۴۔ بیٹے (بیٹوں میں پوتا۔ پرپوتا۔ نواسہ، پرنواسہ، نیچے تک) ۵۔ اپنے خاوند کے بیٹے۔ ۶۔ بھائی (بھائیوں میں عینی۔ اخیافی علاتی بھائی شامل ہیں) ۷۔ بھتیجے (بھتیجوں میں ان کے بیٹے، نیچے تک) بھانجے (بھانجوں میں تینوں قسم کی بہنوں کی اولاد شامل ہے) ۸۔ ایسے خادم مرد جو حاجت نکاح نہ رکھتے ہوں۔ یعنی شیخ فانی۔ ۹۔ نابالغ لڑکے۔

گھر کے اندر پردہ: اس حکم میں صرف مرد شامل ہیں۔ اس حکم کا مفصل ذکر الگ عنوان ''استیذان'' کے تحت کیا جائے گا۔ مضمون کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ ا۔ کوئی شخص کسی کے زنانہ مکان کے اندر داخل نہیں ہوسکتا۔ ۲۔ داخل ہونے سے قبل اجازت طلب کرنا ضروری ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے سلام کرتے تھے۔ پھر داخل ہونے کی اجازت طلب کرتے۔ اسی طرح آپ کا معمول تھا کہ تین مرتبہ آپ اجازت طلب فرماتے۔ ۳۔ اگر اجازت نہ ملے تو واپس لوٹ جانا چاہیے۔ ۴۔ داخل ہونے والے مرد کو چاہیے کہ وہ اپنی نگاہ نیچی رکھے اور شرم کی جگہوں کے معاملہ میں پوری احتیاط کرے۔

عورتوں کے لیے حکم: ۵۔ عورتیں اوڑھنیاں اوڑھ لیں تاکہ سینہ چھپ جائے۔ ۶۔ ملاقاتی کے سامنے باوقار چلیں چلتے پھرتے زمین پر پاؤں مار کر نہ چلیں۔ ۷۔ جب عورت ملاقاتی سے کلام کرے تو انداز گفتگو بارعب ہونا چاہیے۔ (تلخیص سورۃ نور آیات ۲۷ تا ۳۰)

بعض رخصتیں اور ان کی حدود: خادم اور نابالغ بچے کو گھروں کے اندر آنے جانے کے لیے ہر وقت اجازت لینے کی ضرورت نہیں صرف تین اوقات ایسے ہیں جن میں ان کو بھی گھر میں داخل ہونے سے قبل اجازت لینا ہوگی۔ ا۔ نماز فجر سے قبل۔ ۲۔ دوپہر کے وقت اور عشاء کے بعد۔ یہ اوقات سونے اور آرام کرنے کے ہوتے ہیں اور اہل خانہ کو ایسی حالت میں دیکھ لیں جس حالت میں دیکھنا معیوب ہوتا ہے۔

مردوں کا ستر: مرد کے پردے کے بارے میں ہے کہ اسے جسم کے کن حصوں کو پردے میں رکھنا چاہیے۔ تو امام ابو حنیفہ حضرت امام مالک اور حضرت امام شافعی کا یہ فتویٰ ہے کہ مرد کا گھٹنے سے لے کر ناف تک کا جسم پردے میں رہنا چاہیے۔ بعض فقہائے نے اس بارے میں زیادہ وسعت دی ہے۔ ان کے نزدیک صرف مرد کی شرم گاہوں کا پردہ ضروری ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''جو کچھ گھٹنے کے اوپر ہے وہ چھپانے کے لائق ہے اور جو کچھ ناف کے نیچے ہے وہ چھپانے کے لائق ہے (دارقطنی) فرمایا ''مرد کے لیے ناف سے گھٹنے تک کا حصہ چھپانے کے لائق ہے۔'' (مبسوط)

پردہ کے فوائد

عورت کا بلند رتبہ: اسلام سے قبل عرب میں عورت مقام انسانیت سے گری ہوئی تھی۔ زنا اور فحاشی عام تھی شعراء فخریہ اپنے عشق کی داستانیں شعروں میں بیان کرتے۔ ایک عورت کے پاس کئی مرد جاتے۔ ہم بستری کرتے جب عورت کو حمل ہو جاتا اور بچہ جنتی تو وہ ان تمام مردوں کو کہلا بھیجتی جب سب اس کے پاس آ جاتے وہ عورت کسی ایک مرد کو کہتی اے فلاں شخص یہ تیرا بچہ ہے۔ چنانچہ وہ بچہ اس کا ہو جاتا۔ لونڈیوں سے زنا کروا کر روپیہ کمایا جاتا۔ اگر لڑائیوں میں مفتوحہ قبیلہ کی عورتیں ہاتھ آ جاتیں تو ان کی عزت و ناموس محفوظ نہ رہ سکتی تھی۔ عرب میں استبضاع کی رسم تھی۔ عورت صرف اپنی خواہش اولاد کے لیے اپنے خاوند کے سوا دوسرے سے تعلق پیدا کر لیتی بلکہ لکھا ہے مرد اپنی عورت یا لونڈی سے کہہ دیتا اِرْسِلِي اِلٰى فُلَانٍ فَاسْتَبْضِعِيْ مِنْهُ فلاں کو کہلا بھیجو اور اس سے اولاد حاصل کرنے کے لیے تعلق پیدا کرو۔

یونان اور روم میں عورت کی حیثیت: یونان اور روم میں عورت کو بہت پست اور گھٹیا درجہ دیا جاتا۔ ڈاکٹر گستاؤلی بان تمدن عرب میں بیان کرتا ہے۔ ''یونانی عموماً عورتوں کو ایک کم درجہ مخلوق سمجھتے تھے۔'' (تمدن عرب ۳۷۲)

لیکی عورت کی اس ذلت کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔ ''بہ حیثیت مجموعی باعصمت یونانی بیوی کا مرتبہ بہ غایت پست تھا۔ اس کی زندگی مدت العمر غلامی میں بسر ہوتی تھی۔'' (تاریخ اخلاق یورپ ترجمہ اردو جلد سوم میں ۱۸۲)

روم میں عورت کی حیثیت بیان کرتے ہوئے لیکی لکھتا ہے۔ ''عورت کا مرتبہ رومی قانون نے ایک عرصہ دراز تک نہایت پست رکھا۔'' (تاریخ اخلاق یورپ لیکی حصہ دوم ص ۱۹۰)

ایران: مزدک نے عورت کو آگ پانی اور چارے کی طرح مردوں کی مشترکہ جائیداد قرار دیا ہے۔

مذاہب عالم میں عورت کا مقام یہودیت: بائبل میں آتا ہے ''اگر کوئی آدمی کنواری لڑکی پائے جو کسی کی منگیتر نہ ہو اور اسے پکڑ کر اس سے ہم بستر ہو اور وہ پکڑے جائیں۔ تو وہ مرد جو اس کے ساتھ ہم بستر ہو لڑکی کے باپ کو پچاس مثقال چاندی دے اور وہ اس کی جورو ہو کیوں کہ اس نے اسے رسوا کیا ہے۔ اپنی زندگی بھر اسے طلاق نہ دے۔ (استثناء ۲۲: ۲۸، ۲۹)

عیسائیت: پولوس کا مشہور قول ہے ''عورت کے ذریعہ ہی گناہ دنیا میں آیا۔'' (پولوس کا پہلا خط

ہندومت: عورت کا سب سے قیمتی جوہر اس کی عفت ہے عورت کے اس جوہر کو ہندومت نے خاک میں ملا دیا عورت کو اولاد نہ ہونے کی صورت میں خاوند کے علاوہ کسی دوسرے سے ہم بستری کی اجازت دیتا ہے۔ ہندومت کی اصطلاح میں اس کو نیوگ کہا جاتا ہے۔ (ستیارتھ پرکاش صفحہ ۱۵۲)

اسلام وہ دین ہے جس نے عورت کو پستی کے گڑھے سے نکال کر انسانیت کے بلند مقام پر کھڑا کیا اور اس کے حقوق مقرر کیے۔ اس کے ساتھ پردہ کا حکم دے کر عورت کے جوہر عفت کی حفاظت کی۔ گویا پردہ بد اور شہوانی نظروں کا حصار ہے۔ پردہ کی وجہ سے کسی بد کی نظر عصمت کی شہزادی تک نہیں پہنچ سکتی۔

۲۔ فحاشی کا انسداد: اسلام نے فحاشی کے انسداد کے لیے دو طبعی طریقے اختیار کیے ہیں ایک روحانی دوسرا جسمانی۔ روحانی طریقے سے اسلام انسان کے دل و دماغ کی تربیت کرتا ہے اور اسلام انسان کے دل و دماغ سے فحاشی کا تصور مٹا دیتا ہے۔ اسلام اللہ کی ذات کو انسان کے قلب و نظر میں اتنا نمایاں کر دیتا ہے کہ انسان بدی اور زنا کا راستہ اختیار ہی نہیں کرتا بدیوں اور فحاشی سے بچنے کا ذریعہ قیامت کا تصور ہے کہ انسان ایک دن خدا کے سامنے پیش ہوگا اس کے اعمال کا حساب کتاب ہوگا۔ اگر اس کے اعمال کا وزن بھاری ہوا۔ تو دل پسند زندگی گزارے گا اور خدا کی نعماء سے فیض یاب ہوگا۔ اگر اس کے اعمال کا وزن ہلکا ہوا۔ تو ہاویہ میں گرایا جائے گا۔ اس نظریہ نے انسان کے دل و دماغ سے بدکاری کے خیالات کو مٹا دیا ہے۔ روحانی تربیت کے ساتھ ساتھ بدکاری اور فحاشی سے بچنے کے لیے مادی تدابیر بھی اختیار کی ہیں۔ ان تدابیر میں سے ایک پردہ ہے گویا پردہ فحاشی کے انسداد کا بہترین ذریعہ ہے اس فلسفہ کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ (الاحزاب ۳۳:۳۳) ''بے شک اللہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کرے۔''

۳۔ عائلی زندگی کا استحکام: یہ ایک مسلمہ بات ہے۔ زنا عائلی زندگی کے لیے سم قاتل ہے۔ زنا اور عائلی زندگی کا استحکام نقیضین ہیں جہاں زنا، فحاشی ہوگی وہاں عائلی زندگی کی حسین عمارت پیوند خاک ہوگی۔ اسلام نے عائلی زندگی کے استحکام کے لیے پردہ کے احکام نازل کیے تاکہ میاں بیوی خوشگوار زندگی بسر کر پائیں۔

۴۔ جسمانی قوتوں کا تحفظ: طب اس بات پر مہر ثبت کرتی ہے کہ جن ممالک میں زنا کی کثرت ہوتی ہے۔ وہاں کے لوگ جسمانی طور پر کمزور ہو جاتے ہیں۔ جسمانی قوت رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے۔ اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں۔ انسان مختلف قسم کی بیماریوں کی اماجگاہ بن جاتا ہے۔ اسلام نے پردہ کے احکام دینے سے انسان کو بیماریوں سے نجات دلائی ہے۔ ان ممالک کی سرکاری رپورٹوں کا معائنہ کیجئے۔ جہاں فحاشی عام ہے وہاں کس قسم کی بیماریوں میں انسان مبتلا ہے سوزاک زنا کا لازمہ ہے۔ سوزاک کے متعلق ڈاکٹر بتائے گا کہ مجرائے بول کا زخم شاذ و نادر ہی کامل طور پر مندمل ہوتا ہے۔ کسی ڈاکٹر کا مشہور قول ہے ''ایک دفعہ سوزاک ہمیشہ کے لیے سوزاک۔''

گنٹھیا اور بعض دوسرے امراض زنا کا ہی نتیجہ ہیں ایک فرانسیسی ڈاکٹر لیرید کا بیان ہے کہ فرانس میں ہر سال آتشک اور اس کی پیدا کردہ امراض کی وجہ سے تیس ہزار جانیں ضائع ہوتی ہیں۔

۵۔ اخلاقی بیماریوں کا تحفظ: پردہ صرف جسمانی قوتوں کے تحفظ کا باعث ہی نہیں بلکہ اخلاقی بیماریوں کا بھی تحفظ ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے زنا جہاں انسان کی جسمانی قوت کو ختم کر دیتا ہے اس طرح زنا انسان کے اخلاق حمیدہ کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے جو شخص اس مرض (زنا) میں مبتلا ہوگا وہ بے حیائی، خود غرضی، جھوٹ، مکر، فریب کاری، خیالات کی پراگندگی اور ضبط نفس کی کمزوری میں مبتلا ہوتا ہے پردہ سے انسان زنا سے بچ جاتا ہے۔ اسی طرح اخلاقی بیماریوں سے دور ہو جاتا ہے۔

۶۔ قومی ترقی کا ذریعہ: جسمانی کمزوری اور اخلاقی انحطاط قوموں کی بربادی کا ذریعہ ہے یہ دونوں بیماریاں زنا کا نتیجہ ہیں۔ پردہ ان ذرائع میں سے ایک ہے جو انسان کو زنا سے دور رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے انسان جسمانی اور اخلاقی انحطاط سے محفوظ رہتا ہے اور قوم ترقی کے راستہ پر گامزن رہتی ہے۔

۷۔ حسن معاشرت: جس معاشرہ میں مرد، عورت کا اختلاط آزادانہ ہو۔ وہاں فحاشی ضرور جنم لے گی۔ یورپ کی مثال سامنے ہے۔ جہاں عورت کو غیر طبعی آزادی کی نعمت سے نوازا ہے اس کا نتیجہ فحاشی اور بدکاری نکلا ہے عائلی زندگی کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ فحاشی اور بدکاری نے ایک پیشہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ جس نے معاشرہ کے حسن کو بالکل تباہ و برباد کر دیا ہے اسلام نے مرد و عورت کے آزادانہ اختلاط کے درمیان پردہ کی شکل میں ایک دیوار کھڑی کر دی ہے۔ جو فحاشی اور بدکاری کے جراثیم کو بڑھنے نہیں دیتی اور معاشرہ کے حسن کو برقرار رکھتی ہے۔

استیذان

معاشرتی نقطہ نگاہ سے پردہ معاشرتی زندگی کے لیے اہم ہے۔ اور استیذان پردہ ایک حصہ ہے۔ اس لیے اختصار کے ساتھ اس موضوع پر بحث کی جاتی ہے۔

استیذان کے معنی ہیں اجازت لینا۔لیکن اسلامی معاشرت میں اس کا مطلب ہے کہ کسی کے گھر میں داخل ہونے سے قبل اہل خانہ سے اجازت لی جائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (النور۲۴:۲۷) ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے گھروں کے سوائے (دوسرے کے) گھروں میں داخل نہ ہو۔ جب تک کہ اجازت نہ لے لو اور ان کے رہنے والوں پر سلام نہ کرو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرلو۔

آداب دخول بیت (گھر میں داخل ہونے کے آداب)

ا۔اجازت: اس آیت میں کسی کے گھر میں داخل ہونے سے قبل اجازت لینے کا حکم ہے۔ اس اجازت میں کئی معاشرتی فوائد ہیں۔ ناگہاں دوسرے کے گھر میں داخل ہونے سے بدظنی کے مواقع بھی پیدا ہوتے ہیں اور بدی بھی۔ دوسرے ایک انسان اپنے گھر میں ہر وقت ایسی حالت میں نہیں ہوتا کہ وہ پسند کرتا ہو کہ دوسرا اس حالت میں اس کو دیکھے علیحدگی یا خلوت پر انسان کا حق ہے۔ جس میں کوئی دوسرا داخل ہونے کا مجاز نہیں۔

۲۔ سلام: سلام اپنے آپ کو متعارف کرانے اور طلب اذن کا نہایت پاکیزہ طریقہ ہے۔ تَسْتَاْنِسُوْا (تم اجازت لو) کے بعد تُسَلِّمُوْا (تم سلام کرو) طریقہ تعارف کی وضاحت کے لیے ہے۔ ظاہر ہے کہ جب دروازے پر کوئی سلام کرے گا۔ تو گھر والے معلوم کر ہی لیں گے کہ کون صاحب ہیں؟ کیا چاہتے ہیں اور گھر کے اندر ان کا داخل ہونا مناسب ہے یا نہیں اور اس وقت ان کا آنا مناسب ہے۔ یا کسی اور وقت۔ گھروں کے اندر داخل ہونے کے لیے اجازت لینے کا کوئی نہ کوئی طریقہ تمام مہذب اقوام میں ہمیشہ رہا ہے۔ عرب جاہلیت کے شرفاء میں بھی اس کا رواج تھا بلکہ ان کے ہاں حصول اجازت کے لیے جو الفاظ تھے وہ تقریباً بالکل ان الفاظ کے ہم معنی ہیں جو اس وقت نام نہاد ماڈرن سوسائٹی میں رائج ہیں لیکن اسلام نے ان الفاظ کو اختیار نہیں کیا بلکہ ان کی جگہ پر سلام کی ہدایت فرمائی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سلام کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کرے اگر کوئی جواب مل جائے تو ٹھیک ورنہ تین بار سلام کر کے واپس لوٹ آئے۔ (صحیح بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم والاستیذان ثلاثا ابو داؤد کتاب الادب باب كَمْ مَرَّةٍ يُسَلِّمُ الرَّجُلُ فِي الْاِسْتِئْذَانِ) ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت سعدؓ بن عبادہ کے گھر گئے تو آپ نے السلام علیکم کہا۔ حضرت سعد نے اتنا آہستہ جواب دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ سنا۔ اسی طرح دوسری اور تیسری مرتبہ ہوا۔ تو آپ واپس چلے گئے۔ تو سعد آپ کے پیچھے نکلے اور عرض کیا یا رسول اللہ میں نے عمداً آہستہ جواب دیا تاکہ آپ سن نہ پائیں کہ آپ بار بار السلام علیکم کہیں (کیونکہ سلام بھی دعا ہے) تو آپ واپس آئے اور ان کے لیے بہت دعا کی۔

گھر میں جھانکنا: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دروازے پر کھڑے ہو کر اندر جھانکنے سے بھی سختی سے منع فرمایا۔ حتیٰ کہ اگر کسی شخص نے جھانکنے والے کی آنکھ پھوڑ دی تو آپ نے فرمایا اس پر کوئی گناہ نہیں نہ دیت۔ (بخاری كِتَابُ الدِّيَاتِ، مُسْلِم، كِتَابُ الْاٰدَابِ تَحْرِيْمُ النَّظْرِفِيْ بَيْتِ غَيْرِهٖ) آپ نے اس بات کو بھی ناپسند فرمایا کہ جب اندر سے گھر والا پوچھے کون ہے۔ اس کے جواب میں ''میں میں'' کہا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نام لے کر اپنا تعارف کرایا جائے۔ (صحیح بخاری كِتَابُ الْاِسْتِئْذَانِ. بَابٌ قَالَ مَنْ ذَا قَالَ اَنَا (کہا کون ہے۔ (جواب میں کہا میں) مسلم كِتَابُ الْاٰدَابِ بَابُ كَرَاهِيَةِ قَوْلِ الْمُسْتَاْذِنِ اَنَا اِذَا قِيْلَ مَنْ هٰذَا (اجازت حاصل کرنے والے کے اس قول کی ناپسندیدگی ''میں ہوں۔''

اس طریقہ کی برکات: ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (یہ تمھارے لیے بہتر ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔) اجازت حاصل کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان زنا اور تہمت سے بچ جاتا ہے۔ یہی دو باتیں معاشرہ کے بگاڑ کا ذریعہ ہیں۔ اسلام نے ہر اس بات سے روکا ہے۔ جو معاشرہ میں باعث فساد ہو۔ گھروں میں بغیر اجازت داخل ہونا باعث فساد ہے۔ اس وجہ سے روک دیا۔

اجازت نہ ملنے پر واپسی: اگر طلب اجازت کے بعد معلوم ہو جائے کہ گھر میں اس وقت اجازت دینے والا کوئی نہیں ہے تو جب تک اجازت نہ ملے گھر کے اندر داخل نہ ہو اور اگر واپس ہو جانے کے لیے کہا جائے تو واپس ہو جاؤ۔ ارشاد الٰہی ہے: فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (النور ۲۴:۲۸) ''پھر اگر ان میں کسی کو نہ پاؤ تو اس میں داخل نہ ہو جب تک کہ تمھیں اجازت نہ دی جائے اور اگر کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو لوٹ جاؤ وہ تمھارے لیے زیادہ پاکیزہ ہے اور جو تم کرتے ہو اللہ اسے جانتا ہے۔'' اسلام نے مسلمانوں کو فراخ دلی کی تعلیم دی ہے کہ اگر کوئی کسی کی ملاقات کو جائے اور وہ اس وقت کی مصروفیت کی وجہ سے نہ مل سکے تو یہ ہمیشہ کے تعلقات منقطع کر لیتا ہے۔ بعض مہاجرین کا قول نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے اپنی ساری عمر اس بات کو چاہا کہ وہ کسی سے ملنے جائیں تو انھیں کہا جائے کہ واپس ہو جاؤ تا کہ اس حکم الٰہی کی بھی تعمیل ہو جائے اور ایسا موقعہ نہیں ملا۔

استثنائی صورتیں: اسلام نے سہولت کے لیے بعض ایسی جگہیں مستثنیٰ قرار دی ہیں۔ جہاں انسان بغیر اجازت داخل ہو سکتا ہے۔ ایسے گھر جو خاص مہمانوں یا بیٹھنے والوں کے لیے الگ تیار ہوں۔ شرفاء اپنے مسکن گھروں کے ساتھ ایسے مکان تعمیر کرتے تھے۔ جو مہمان خانہ کا کام دیتے تھے یا لوگوں کے بیٹھنے کے لیے استعمال ہوتے تھے جیسے سقیفہ بنی ساعدہ اس قسم کی جگہیں عوام کے بیٹھنے کے لیے ہی تعمیر کی جاتی تھیں۔ آج کل بھی شرفاء اپنے گھروں کے ساتھ مہمان خانے یا عام لوگوں کے بیٹھنے کے لیے مکان تعمیر کر دیتے تھے۔ یا گاؤں کے لوگ آرام کے لیے یا میل ملاپ کے لیے آ جاتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ (النور ۲۴:۲۹) ''تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم غیر آباد گھروں میں داخل ہو جاؤ۔ جن میں تمھارا کوئی فائدہ ہو۔'' غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ سے مراد وہ گھر ہیں جہاں مستورات وغیرہ کی رہائش نہ ہو۔ مثلاً مہمان خانے' تجارتی گھر' سرائے وغیرہ اگر ان جگہوں میں لوگوں کا آنا جانا ہے تو اجازت کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر ایسے گھر ہیں جو عام لوگوں کے بیٹھنے کی جگہیں تو نہیں ہیں۔ لیکن زنان خانہ سے الگ محض اپنے ہی مہمانوں کے لیے ہی بنائے گئے ہیں۔ فقہاء کے نزدیک صرف صاحب خانہ کی پہلی اجازت میں کافی ہیں۔

استیذان ثانی (دوسرا اجازت نامہ): پہلے گھر میں داخل ہونے کے لیے اجازت نامے کا ذکر ہوا ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو کسی سے ملنے یا کسی کام کے لیے کسی کے گھر جاتے ہیں۔ سورہ نور آیت ۵۸۹ میں غلاموں اور بچوں پر قید لگائی ہے کہ وہ تین اوقات میں گھر میں داخل ہونے سے پہلے اجازت لیں۔ نماز فجر سے پہلے دوپہر کے وقت جب گھر والے قیلولہ کے لیے کپڑے اتار دیتے ہیں اور عشاء کے بعد ان تین اوقات میں خاص احتیاط کی وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ اوقات بے تکلفی اور بے پردگی کے ہیں۔ اس لیے ان اوقات ثلاثہ میں گھر کے خدمت گاروں اور بچوں کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ بغیر اجازت طلب کیے گھر کے اندر داخل ہوں۔

تعدد ازدواج

تعداد ازدواج: اسلام سے پہلے دنیا کی دوسری قوموں میں تعدد ازدواج کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ دنیا کی کوئی مذہبی کتاب نہیں جس نے تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دیا ہو۔ ہر مذہب کے مقدس بزرگوں نے ایک سے زائد بیویاں کیں۔ سری کرشن جی کی سینکڑوں بیویاں تھیں۔ راجہ پانڈو کی دو بیویاں تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی چار۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی چار۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی نو اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک ہزار عورتیں تھیں۔ (سلاطین ۱۱:۳)

عرب میں تعدد ازدواج کا عام رواج تھا۔ قبائل کے روسا ایک سے زائد بیویاں کرتے تھے۔ مردوں کا صرف ایک شادی کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔
فرانس کا مشہور سائنس دان مانٹسکو یہ کہتا ہے کہ

میرووِنجیسن کے بادشاہان جنھوں نے پانچویں صدی سے لے کر ۷۵۲ء تک فرانس پر حکومت کی ایک سے زیادہ بیویاں کرتے تھے اور اس کو اپنی شان وشوکت کا باعث خیال کرتے تھے ایک سیاح عورت لکھتی ہے۔

"امریکہ میں یلسک بادشاہوں کے خلفاء اور مقربین کا یہ اعتقاد تھا کہ عورتوں اور لونڈیوں ہی کی کثرت سے وہ بلند مرتب اور عالی مقامات حاصل کر سکتے ہیں۔"

برٹن کہتا ہے:۔

"افریقہ کے بعض قبائل میں زیادہ عورتیں رکھنے والے کو قبائل فخر و مباہات گردانا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک شخص بارہ سے تین سو عورتوں تک اپنے لیے اختیار کرتا ہے۔"

ان تصریحات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اقوام عالم میں تعدد ازدواج کا رواج تھا۔ اس کے کئی اسباب تھے۔

۱۔ زیادہ بیویاں رکھنے کو وجہ تکریم وفخر گردانا جاتا تھا۔ ان کی تعداد سے ہی مرد کی شجاعت' قوت اور ثروت کا اندازہ لگایا جاتا تھا جیسا کہ برٹن اور مانٹسکو کے بیان سے ظاہر ہے۔

۲۔ افریقہ میں مرد عورتوں سے امور خانہ داری کے علاوہ باغوں کھیتوں اور دوسرے کاروبار میں کام لیتے تھے۔ عورتوں کا دائرۂ عمل صرف گھر ہی نہ تھا بلکہ باہر بھی تھا اس وجہ سے امراء کی یہ عادت تھی کہ کئی کئی بیویاں کرتے تھے تاکہ ان کو اقتصادی امور سونپے جاسکیں۔ لیبان تمدن عرب میں لکھتا ہے اس کے علاوہ مشرق میں جن گھرانوں کا دارومدار زراعت اور مویشی پر ہے ان میں بسا اوقات جب پہلی بیوی تنہا گھر اور کھیتی کا انتظام نہیں سنبھال سکتی تو وہ خود شوہر کو دوسری شادی کرنے پر مجبور کرتی۔

۳۔ تعداد ازدواج کا ایک سبب دینی مصلحت بھی تھا۔ چنانچہ شیوی کے قبائل کا یہ عقیدہ تھا کہ زیادہ بیویاں کرنے والا ان کے معبود روح اکبر کے نزدیک محبوب ہوتا ہے۔

۴۔ تعدد ازدواج کا سبب آب وہوا کے اثرات بھی ہے۔ جن ممالک کی آب وہوا گرم ہوگی وہاں تعدد ازدواج کا رواج عام ہوگا۔ یہی وجہ ہے افریقہ اور اہل مشرق میں زیادہ رواج ہے۔

۵۔ بعض اوقات عورتوں کی بیماری سبب بن جاتی ہے کہ دوسری بیوی کی جائے۔

۶۔ دنیا میں لڑائیوں کا سلسلہ غیر متناہی ہے۔ مرد مر جاتے ہیں۔ ان کے پیچھے بیوہ اور یتیم بچے رہ جاتے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے دوسری شادی کرنے کی اجازت ضروری ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملک میں لڑائیوں کا لمبا سلسلہ ہو جانے کی وجہ سے مرد کم رہ جاتے ہیں اور عورتیں زیادہ۔ تو معاشرہ کو برائیوں اور بے حیائیوں سے بچانے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں کی جائیں۔

اسلام میں تعدد ازدواج: اسلام اصولی طور پر صرف ایک ہی عورت کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دیتا ہے لیکن بعض حالات میں ایک سے زائد

عورتوں کے ساتھ نکاح کی اجازت بھی دے دی ہے۔ ارشاد ہے:۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (النساء۴:۳) اور اگر تمھیں خوف ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ایسی عورتوں سے نکاح کر لو جو تمھیں پسند ہوں۔ دو دو اور تین تین اور چار چار اور اگر تمھیں خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی۔ یہی وہ قرآن مجید کی آیت ہے جس میں تعدد ازدواج کا ذکر ہے۔ یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اس آیت کریمہ میں حکم نہیں بلکہ ضروریات اور شرائط کے ساتھ اجازت دی گئی ہے جب تک وہ ضرورت اور اسباب پیدا نہ ہوں۔ اس وقت تک دوسری شادی کرنا مستحب نہیں۔

قرآن مجید نے تعدد ازدواج کی انفرادی اور ملکی ضرورتوں کی تصریح نہیں کیں اس کی وجہ یہ ہے۔ انسانی ضروریات زمانہ اور حالات کے تغیر سے بدلتی رہتی ہیں۔ اس وجہ سے قرآن مجید نے تعدد ازدواج کو وقتی ضروریات کے ساتھ مفید کر دیا ہے کہ جب بھی تعدد ازدواج کی ضرورت پڑے تو اس تعلیم پر عمل کر لیا جائے۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو حسب ذیل اسباب اور ضروریات کے تحت دوسری شادی کی جا سکتی ہے۔

۱۔ دنیا میں اکثر خون ریز جنگیں ہوتی رہتی ہیں جن میں لاکھوں مرد موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ اس وقت اگر ایک سے زائد بیویاں نہ کی جائیں تو عورتوں کی ایک خاصی تعداد باقی رہ جائے گی۔ جن کو عائلی زندگی میسر نہ ہوگی اور وہ بے حیائیوں میں مبتلا ہو جائیں گی۔ ہربرٹ اسپنسر اپنی کتاب علم الاجتماع میں لکھتا ہے۔

''تعدد زوجات قوموں کے لیے بے حد مفید ہے۔''

آگے لکھا ہے۔

''جب کسی قوم پر کوئی ایسی حالت طاری ہو مثلاً جنگوں اور خون ریزیوں کی وجہ سے اس قوم کے اکثر مردوں کی جانیں تباہ ہو جائیں اور ان عورتوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے جن کے شوہر مر چکے ہیں یا مردم شماری میں اناث کی زیادتی ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نسل میں انحطاط واقع ہو جائے گا۔''

مسز برڈسل کال کنز صدر ینگ وومن کرسچین ایسوسی ایشن نے واشنگٹن میں بیان دیتے ہوئے کہا ہے:۔

''امریکہ میں چودہ سال سے اوپر کی جوان لڑکیوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ ہے جو سب کی سب کنواری ہیں۔ ان کے مقابلہ میں کنواروں کی تعداد نوے لاکھ ہے۔ اس حساب سے تیس لاکھ کنواری لڑکیوں کے لیے شوہروں کا ملنا محال ہے کیونکہ جنگ نے مردوں اور عورتوں کا عددی توازن بہت بڑی حد تک خراب کر دیا ہے۔ (زمزم لاہور ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء)

جس زمانے میں تعدد ازدواج کی اجازت نازل ہوئی تھی وہ لڑائیوں کا زمانہ تھا۔ مسلمان بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی پرورش کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ کسی کی سرپرستی میں آئیں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یہ حکم نازل ہوا۔

۲۔ عورت ایسی بیماری میں مبتلا ہو جائے جس سے اولاد کے پیدا ہونے کی امید نہ رہے۔ ایسی صورت میں مرد اولاد کے لیے دوسری شادی کر سکتا ہے۔

۳۔ بعض اوقات سوسائٹی میں زنا کاری اور بے حیائی کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس بیماریوں کا واحد علاج تعدد ازدواج ہے۔ چنانچہ مشہور فلسفی سر طامس بیماریوں کا علاج تجویز کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

''مرد کے لیے ایک سے زیادہ عورتوں کو مباح کر دیا جائے۔ یہی ایک دوا ہے جو تمام مہلک امراض کے حق میں تریاق ہے اور یہی وہ تیر بہدف نسخہ ہے۔ جو سوسائٹی کے زہریلے جراثیم کو تباہ کر دیتا ہے۔ یورپ میں سب سے بڑی بیماری اور متعدی بلا یہ ہے کہ یہاں مردوں نے محض ایک عورت پر اکتفا کر لیا ہے۔ یہی وہ تحدید ہے جس نے موجودہ زمانے میں ہماری لڑکیوں کو مردوں کے ساتھ ناجائز تعلقات پیدا کرنے اور برسر بازار زنا فحش کاری کرنے غرض دنیا بھر کی برائیوں اور مہلک بیماریوں کا شکار بننے کے لیے آمادہ کر دیا ہے۔ اگر یہی حال رہا اور تعدد ازدواج کو مباح قرار دینے کے لیے کوئی قانون نافذ نہ ہوا تو اس طوفان بدتمیزی کے اور بڑھ جانے میں کوئی شبہ باقی نہ رہے گا۔ افسوس اگر اس مسئلہ کو پہلے ہی مباح قرار دیا جاتا تو آج اس قدر لاوارث اولاد جو حرام کاری کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ابنائے قوم وطن کے باعث ننگ و عار اور انسانیت کے دامن پر بدنما داغ ثابت نہ ہوتی۔''

تعدد ازدواج کی اصلاح: اسلام نے انفرادی اور ملکی ضرورتوں کی وجہ سے تعدد ازدواج کی رسم کو باقی رکھا لیکن اس رسم میں جو خرابیاں تھیں ان کی اصلاح کر دی۔ اسلام سے قبل تعدد ازدواج میں یہ خرابی تھی کہ مرد بلا تعین عورتوں سے نکاح کر لیتے تھے۔ اسلام نے چار کی حد بندی کر دی جیسا کہ ارشاد ہے:

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (النساء۴:۳) پس ایسی عورتوں سے نکاح کرلو جو تمھیں پسند ہوں دو دو اور تین تین اور چار چار چنانچہ جی ڈبلیو لائنز اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی کتاب Esseys on Muhammadanism میں لکھتا ہے۔

''اس غیر محدود تعدد ازدواج کو جو صورت حالات کا ذمہ دار تھا پیغمبر اسلام نے روک دیا انھوں نے اذن دیا مرد دو یا تین یا چار عورتوں سے عقد کرسکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ان سب کے ساتھ ویسے ہی انصاف کی زندگی بسر کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرسکے تو اس کو صرف ایک بیوی کی اجازت تھی۔ اب چونکہ کوئی شخص بطور قاعدہ دو یا زیادہ بیویوں کے ساتھ اسی انصاف سے نہیں رہ سکتا لہٰذا پیغمبر اسلام کے قانون کی روح صاف طور پر اسی طرف مائل نظر آتی تھی کہ ایک بیوی کے ساتھ شادی کی جائے۔''

دوسری اصلاح: اسلام سے قبل فخر و مباہات، شان و شوکت قوت و شجاعت کے اظہار کے لیے بلاتعین تعدد ازدواج کا رواج تھا۔ خاوند نہ تو بیویوں میں عدل و انصاف قائم کرسکتے تھے اور نہ کرتے تھے۔ اس برائی کو ختم کرنے کے لیے اسلام نے یہ حکم دیا کہ اگر بیویوں میں عدل و مساوات قائم نہیں کرسکتے تو صرف ایک ہی نکاح کیا جائے۔ ارشادِ الٰہی ہے: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (النساء۴:۳) اگر تمہیں خوف ہو کہ بیویوں کے درمیان عدل نہ کرسکو گے تو بس ایک ہی بیوی کرو۔ دوسری جگہ آتا ہے: فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (النساء۴:۱۲۹) بس بالکل ہی نہ جھک جاؤ کہ ادھر میں لٹکی ہوئی کی طرح چھوڑ دو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں: اذا كانت عند الرجل امراتان فلم يعدل بينهما جاء يوم القيمة وشقه ساقط رواه الترمذی و غیر (مشکوٰۃ باب القسم) جب کسی مرد کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان عدل نہ کرے تو قیامت کے دن اس حالت میں آئے گا کہ اس کا پہلو ساقط ہوگا۔

تعدد ازدواج غیروں کی نظر میں: تجربہ کے بعد اب حقیقت پسند دوسرے مذاہب کے علماء نے بھی اسلام کے قانون ''تعدد ازدواج'' کو درست تسلیم کرنا شروع کردیا ہے۔ معاشرہ کی بعض خرابیوں کا علاج اسی قانون کو تجویز کیا ہے۔ چنانچہ لندن کے ایک سکول کی استانی میری اسمتھ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

''یک زوجی کا جو قاعدہ قانون برطانیہ میں چلا ہوا ہے وہ تمام تر غلط ہے مردوں کو دوسری شادی کی اجازت ملنا چاہیے۔''

ایک اور جگہ لکھتی ہے۔

''چونکہ اس ملک برطانیہ میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے اس لیے ہر عورت شوہر کو پانے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔''

اس کے بعد اس نے کہا ہے:۔

''ایک بیوی کا رواج ناکام ہو چکا ہے اور یہ رواج کوئی سائنٹفک نہیں ہے۔'' (ندائے حرم کراچی ربیع الاخر ۱۳۷۱ھ)

انگلستان میں جنسی بے راہ روی کو روکنے کے لیے سترھویں صدی سے کثرت ازدواج کا چرچا شروع ہوگیا۔ چنانچہ ۱۶۵۸ء میں ایک شخص نے زنا کاری اور نومولود حرامی بچوں کی اموات کو روکنے کے لیے کثرتِ ازدواج کی حمایت میں ایک پمفلٹ شائع کیا۔ اس کے ایک صدی بعد انگلستان کے ایک قابل اعتماد اور صاحب کردار...... نے اس مسئلہ کی تائید میں ایک کتاب لکھی مشہور ماہر جنسیات جمیس پلٹن نے فحاشی اور زنا کاری کو روکنے کے لیے کثرت ازدواج کے طریقہ کو اختیار کرنے کی رائے دی۔ (اسلام اور جنسیات صفحہ ۲۸۶)

''لوگ سمجھتے ہیں تعدد ازدواج اور وحدت ازدواجی کا مقابلہ ہے لیکن یہ غلط ہے۔ اصل مقابلہ ہے محدود تعدد ازدواجی کا لامحدود حرام کاری سے، اسلام بعض سخت شرائط کے تحت محدود تعدد ازدواجی کی اجازت اس لیے دیتا ہے کہ لامحدود حرام کاری کا سد باب ہو لیکن جو وحدت ازدواجی کے قائل ہیں ان کے پاس لامحدود حرام کاری کے انسداد کا کوئی علاج نہیں اسی لیے تو وہ تعدد ازدواجی کے خلاف زہر افشانی کرتے ہیں۔ مگر یہ آواز بلند نہیں کرتے کہ ایک عورت والے مرد کو دوسری جگہ شہوانی جذبات کی سیری کے لیے منہ کالا نہ کرنا چاہیے۔'' (زمزم لاہور ۷ اگست ۱۹۴۵ء)

''مدارس ہندو مہا سبھا نے ہندو کمیٹی کے نام جو یادداشت ارسال کی ہے۔ اس میں پہلی بار ہندو سوسائٹی کے لیے بعض ایسے حالات میں تعدد ازدواج کی ضرورت کا اعتراف کیا گیا ہے یعنی ہندوؤں کو بعض ایسے حالات بھی پیش آسکتے ہیں جن میں ایک مرد کو کئی کئی عورتوں سے شادی کی اجازت ہونی چاہیے۔ (زمزم لاہور ۲۳ فروری ۱۹۴۵ء)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تعدد زوجات کے اسباب: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیات طیبہ کا مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تعدد زوجات کے دو سبب تھے ایک سبب دینی تھا اور دوسرا ملکی، قرآن مجید نے دینی غرض ان الفاظ میں بیان کی

ہے: وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا (الاحزاب ۳۳:۳۴) (اے نبی کی بیویو!) اسے یاد رکھو جو تمھارے گھروں میں اللہ کی آیتوں اور حکمت سے پڑھا جاتا ہے۔ اللہ باریک باتوں کا جاننے والا خبردار ہے۔

اس آیت میں ازدواج مطہرات کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عقد نکاح میں آنے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی باتوں کو لوگوں تک پہنچائیں۔ اسلام میں عورتوں کے بعض ایسے مسائل ہیں جن کو مرد شرم و حیا کی وجہ سے بیان نہیں کر سکتا۔ حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث ہے کہ اسماء بنت یزید انصاریہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر سوال کیا کہ یا رسول اللہ میں غسل حیض کس طرح کروں۔ آپ نے فرمایا ایک روئی کا ٹکڑا رکھ لے اور وضو کر لے۔ اس کے بعد آپ نے شرم و حیا کی وجہ سے اپنا روئے مبارک پھیر لیا۔ حضرت عائشہؓ پاس ہی کھڑی تھیں۔ اسماء کا دامن کھینچا اور رسول کریم ﷺ علیہ وآلہ وسلم کی مراد سمجھائی۔

عورتوں کے اس قسم کے مسائل اور احکام کی تعلیم و اشاعت کے لیے متعدد نکاحوں کی ضرورت تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول بھی اس طرف اشارہ کرتا ہے: خذوا دینکم من ھذہ الحمیرا یعنی تم اپنا دین حضرت عائشہؓ سے حاصل کرو۔

<u>ملکی ضرورت:</u> رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعدد شادیاں پچپن اور ساٹھ سال کی عمر کے درمیان کی تھیں اور یہی زمانہ کفار کے ساتھ جنگ کرنے کا ہے۔ جب کفار مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا ارادہ کر چکے تھے اور ان کا ہر حملہ پہلے حملے سے زیادہ زبردست ہوتا تھا۔ مسلمان دن رات مسلح رہتے تھے۔ کبھی تنگ آ کر یہ کہتے تھے اے اللہ کے رسول ہم دن رات زرہ لگائے اور ہتھیار پہنے تھک گئے ہیں تو آپ جواب دیتے تھے کہ یہ زمانہ ختم ہو جائے گا۔

آپ ہر وقت اس فکر میں غلطاں رہتے کہ کس طرح مٹھی بھر مسلمانوں کی حفاظت کی جائے۔ آپ کو صرف بیرونی دشمنوں سے ہی واسطہ نہیں تھا بلکہ مدینہ کے اندر یہود اور منافق بھی مار آستین بنے ہوئے تھے۔ وہ بھی ہر وقت مسلمانوں کو گزند پہنچانے کے لیے منصوبے گھڑتے رہتے تھے۔ ان حالات میں بھلا کسی کو رنگ رلیاں اور عیاشی سوجھ سکتی ہے اور رات کو عیش و طرب کی محفل جمائی جا سکتی ہے۔ ان تاریک حالات میں طاقتور دشمن پر غلبہ حاصل کرنا اس امر کی کھلی دلیل ہے کہ معترضین کا اعتراض بالکل باطل ہے کہ آپ نے شادیاں عیش و عشرت کے لیے کی تھیں۔

عیش و عشرت کا زمانہ تو شباب کا ہوتا ہے۔ جب رگوں میں تازہ اور گرم خون دوڑتا ہوتا ہے۔ یا فارغ البالی اور اقتدار کا زمانہ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عین شباب کی بہاروں میں صرف ایک چالیس سالہ عورت سے شادی کرتے ہیں اور ان کی زندگی میں ایک وقت وہ بھی آیا جب کفار نے عرب کی حسین ترین عورت سے شادی کرانے کی پیش کش کی لیکن آپ نے ان کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام دشمنوں کو زیر کر لیا اور آپ کے اقتدار کا پرچم تمام عرب پر لہرانے لگا۔ اس زمانہ میں بھی کوئی شادی نہیں کی۔ اس کے علاوہ اگر آپ کی راتوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ رات کا اکثر حصہ بارگاہ الٰہی میں قیام کے ساتھ گزارتے تھے اور قیام بھی اتنا لمبا کہ پاؤں متورم ہو جاتے تھے۔

پس بڑھاپے میں آپ کا متعدد نکاح کرنا اور صرف جنگ کے زمانہ تک کرنا صاف بتاتا ہے کہ تعدد ازدواج کا تعلق جنگ سے ضرور ہے۔ ظاہر ہے کہ جنگوں میں مرد مارے جاتے ہیں عورتوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ اس وقت یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ عورتوں کی خبر گیری اور ان کو بے حیائیوں سے بچانے کے لیے ایک مرد متعدد شادیاں کرے۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیواؤں کی خبر گیری کے لیے متعدد نکاح کیے۔ باسورتھ سمتھ ایک عیسائی مصنف نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے وہ لکھتا ہے۔

''یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے نکاحوں کی جہاں دیگر وجوہات ہو سکتی ہیں۔ یہ معقول وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ نے یہ نکاح ان بیبیوں پر رحم کھا کر کیے جو بے کس بے یار و مددگار رہ گئی تھیں۔ یہ عورتیں قریباً سب کی سب بیوہ ہی تھیں اور ان کے حسن و دولت کا کوئی شہرہ نہ تھا بلکہ بات اس کے برعکس تھی۔

لونڈیاں

عیسائیوں نے تعدد ازواج کے بعد اگر کسی قرآنی مسئلہ پر سب سے زیادہ اعتراضات کیے ہیں وہ لونڈیوں کا مسئلہ ہے۔ ان کے نزدیک اسلام نے یہ اجازت دے رکھی ہے کہ لونڈیوں کے نام سے جتنی عورتیں کوئی چاہے گھر میں رکھ سکتا ہے چنانچہ سیل' میور کے بعد اسلامی امور پر رائے دینے کے لیے تعلیم یافتہ عیسائیوں کے اندر بڑا معتبر گردانا جاتا ہے۔ اس نے کرسچن کالج میگزین مدراس میں لکھا۔ کہتا ہے کہ تعدد ازواج سے بھی سخت غلطی جو اسلام نے کی وہ یہ تھی کہ اس مذہب نے یہ اجازت دی کہ لونڈیوں کے نام سے جتنی عورتیں کوئی چاہے گھر میں ڈال لے۔ اس کے جواب میں بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ اسلامی ممالک میں دوسرے ممالک سے زنا بہت کم پایا جاتا ہے مگر لونڈیوں کے متعلق جو کھلی اجازت دی گئی ہے کہ جس سے چاہے وطی کرے اس میں اور رنڈی بازی میں کچھ بھی فرق نہیں اور جہاں یورپ کے عام مذہب نے رنڈی بازی کو سخت منع کیا ہے۔ مذہب اسلام نے لونڈیوں سے وطی کو جائز رکھا ہے۔

حقیقت میں یہ اعتراض قرآن مجید کے لونڈیوں والے مضامین کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ جو اعتراض کیا گیا ہے اسلامی احکام کے متضاد ہے۔ قرآن مجید لونڈی کو نکاح میں لیے بغیر اپنے تصرف میں رکھنے کو جائز قرار نہیں دیتا سب سے اوّل ان آیات کی تشریح کی جاتی ہے جن میں لونڈیوں کے بارہ میں احکام پائے جاتے ہیں جن کو نہ سمجھنے کی وجہ سے سیل نے غلطی کھائی ہے۔

لونڈی بلا نکاح جائز نہیں: پہلا حکم:۔ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَاطَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ اَدْنٰی اَلَّا تَعُوْلُوْا (النساء ۴:۳) اور اگر تمھیں خوف ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کرسکو گے تو ایسی عورتوں سے نکاح کرو جو تمھیں پسند ہوں دو دو اور تین تین اور چار چار اور اگر تمھیں خوف ہو کہ عدل نہیں کرسکو گے تو ایک ہی جس کے تمھارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے یہ زیادہ نزدیک ہے تا کہ تم ناانصافی نہ کرو۔

اس آیت کریمہ میں اَوْ مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ کی وضاحت کی ضرورت ہے عموماً لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ چار کی حد بندی توڑنے کے لیے ہے کہ لونڈیاں جتنی چاہے کوئی رکھ لے۔ یہ نظریہ اور خیال نکاح کی حد بندی کے ہی خلاف ہے نکاح کی حد بندی کے فلسفے کو ہی باطل کرتا ہے۔ جو بھی نکاح کی حد بندی (یعنی چار سے زیادہ بیویوں سے نکاح حرام ہے) کے خلاف ہوگا۔ وہ باطل ہے۔ اس وجہ سے یہ برملا کہا جائے گا۔ جو لوگ چار بیویوں کے علاوہ بے حساب لونڈیاں اپنے ماتحت رکھنے کے قائل ہیں وہ گمراہی میں ہیں۔

اب قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت کی وضاحت کی جاتی ہے اور اشکال کو دور کیا جاتا ہے۔ ترکیب عبارت میں دو صورتیں ہوسکتی ہیں پہلی صورت یہ ہے کہ مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ کا عطف النساء پر ہے۔ یعنی ترکیب یوں ہے۔ کہ فَانْکِحُوْا مَاطَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَاءِ اَوْ مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ یعنی جو پسند ہوں عورتوں سے یا لونڈیوں سے نکاح کرلو۔ النساء سے مراد آزاد عورتیں ہیں۔ اس صورت میں لونڈیاں خود حد بندی کے اندر آتی ہیں گویا آزاد عورتوں اور لونڈیوں میں سے جو پسند ہیں وہ چار تک تمھارے نکاح میں آسکتی ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ عطف فَوَاحِدَۃً پر کیا جائے تو ترکیب یوں ہوگی فَانْکِحُوا مَاطَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ وَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ پس جب پسند کے نکاح کرو۔ ایک سے یا اپنی لونڈیوں سے یعنی آزاد عورتوں میں سے حسب پسند اگر ایک بھی میسر نہ ہو۔ لونڈی سے نکاح کرلو۔

اس کی موید وہ آیت ہے جس میں آگے چل کر لونڈی کے ساتھ نکاح اس شرط پر مشروط قرار دیا ہے جب آزاد عورت میسر نہ آئے تو کنیز سے شادی کرلو۔

دوسرا حکم: ارشاد الٰہی ہے۔ وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّاوَرَآءَ ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ (النساء ۴:۲۴) جو اس کے سوا ہیں وہ تمھارے لیے حلال ہیں اس طرح کہ تم اپنے مالوں کے ساتھ ان کو چاہو نکاح میں لا کر نہ شہوت رانی کرتے ہوئے اس میں تمام وقتی نکاح حرام قرار دیے گئے ہیں۔ وقتی نکاح وہ ہے جن میں میاں بیوی کی رفاقت و مصاحبت عارضی ہوتی ہے۔ لونڈیوں کو تصرف میں رکھنا بھی عارضی ہوتا ہے اس لیے لونڈیوں سے بغیر نکاح کے اپنے تصرف میں رکھنا اور ہم بستری کرنا مسافحین کے زمرہ میں آتا ہے۔ اگر لونڈیوں سے نکاح کرلیا جائے تو پھر یہ عمل احصان میں شامل ہوگا۔

آگے چل کر یہی مضمون تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (النساء ۴:۲۵) اور جو شخص تم میں سے یہ مقدور نہیں رکھتا کہ آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرے تو تمہاری ان مومن لونڈیوں سے نکاح کرے۔ جن کے تمھارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے اور اللہ تمھارے ایمان کو خوب جانتا ہے۔ تم آپس میں ایک ہی ہو سو انھیں ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح میں لاؤ اور ان کو دستور کے موافق ان کے مہر دے دو۔ پاک دامن ہوں نہ کھلی بدکاری کرنے والی اور نہ در پردہ آشنا رکھنے والی۔

اس آیت میں واضح طور پر یہ حکم ہے کہ اگر آزاد مومنہ عورتوں کو حلقہ زوجیت میں لانے کا مقدور نہیں تو پھر مومنہ لونڈیوں سے نکاح کر لو۔ انھیں حقیر اور ذلیل نہ سمجھو۔ اگر اپنی لونڈی نہ ہو اور دوسرے کی ہو تو مالک سے اجازت لے کر نکاح کر لو اور دستور کے مطابق مہر مقرر کرو اور ادا کرو اور بتایا کہ لونڈی سے نکاح کا مقصد عمر بھر کی رفاقت اور مصاحبت ہو نہ کہ وقتی رفاقت اور شہوت رانی ظاہر اور چھپی ہو۔

تیسرا حکم: مذکورہ بالا آیت قرآنی سے واضح ہے کہ جسے آزاد مومنہ عورتوں کے ساتھ نکاح کی استطاعت نہ ہو تو پھر مومنہ لونڈیوں سے نکاح کرو۔ ایسی بھی صورت ہو سکتی ہے کہ اتنی استطاعت ہی نہ ہو کہ وہ لونڈی سے شادی کر سکے۔ اس کے متعلق بھی سورۃ نور میں وضاحت ہے۔ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (النور ۲۴:۳۳) اور جو شادی کا سامان نہیں پاتے اپنے تئیں (گناہوں سے) بچائے رکھیں۔ یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے انھیں غنی کر دے یہ آیت لونڈیوں کو اپنے تصرف میں رکھنے کے بارے میں فیصلہ کن ہے کہ جنھیں نکاح کے لیے کوئی عورت نہیں ملتی تو وہ گناہوں سے بچنے کی کوشش کریں اگر لونڈی بلا نکاح جائز ہوتی اور ہم بستری کی اجازت ہوتی تو یوں ہونا چاہیے تھا کہ جنھیں آزاد عورت نکاح کے لیے نہیں ملتی اور نہ لونڈی ملتی ہے تو وہ ضبط سے کام لیں' مگر صرف اتنا فرمانا کہ جنھیں نکاح نہیں ملتا تو وہ ضبط سے کام لیں یہ حکم واضح کرتا ہے کہ آزاد عورت یا لونڈی دونوں کے ساتھ نکاح جائز نہیں۔ نکاح یا استعفاف (گناہوں سے بچاؤ) کے سوا تیسری صورت قرآن مجید نے کوئی رکھی ہی نہیں سورۃ النساء میں یہ فرمایا تھا کہ آزاد عورت سے نکاح نہ کر سکو تو لونڈی سے نکاح کر لو۔ اب یہاں یہ فرمایا ہے اگر نکاح میسر نہ آئے تو ضبط سے کام لو۔ نتیجہ یہ کہ نکاح کے سوا کسی عورت سے ہم بستری کرنے کی کوئی اجازت نہیں۔ آیت فیصلہ کن ہے یا نکاح کیا جائے یا استعفاف (گناہوں سے بچنے کی کوشش) کیا جائے اور لونڈیوں کو بلا نکاح اپنے تصرف میں رکھنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

یہاں ایک سوال اٹھتا ہے۔ اَوْ مَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (لونڈیوں) کا الگ ذکر کیوں کیا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ سورۃ النساء میں دو قسم کی عورتوں سے نکاح کی تفصیل دی ہے۔ جو آزاد عورتیں حلقۂ زوجیت میں آتی ہیں وہ ازواج کہلاتی ہیں جو ملک یمین یعنی لونڈیاں آزاد کر کے نکاح میں لائی جاتی ہیں۔ وہ بھی آزاد عورتوں کی طرح ازواج کہلاتی تھیں۔ لیکن جو لونڈیاں بغیر آزاد کیے نکاح میں آتی تھیں وہ آزاد عورتوں سے امتیاز کے لیے ملک یمین کہلاتی تھیں۔ یہ امتیاز اس لیے رکھا گیا کہ منکوحہ ملک یمین اگر زنا میں ملوث ہو جائے اور شرعی لحاظ سے ثابت ہو جائے تو اس کو آزاد منکوحہ عورت سے نصف سزا ملے گی چونکہ بعض امور میں لونڈیوں اور آزاد عورتوں میں قوانین شرعی کے لحاظ سے فرق تھا اور لونڈیوں کے لیے کچھ رعایتیں رکھی گئی تھیں۔ اس لیے نکاح کے بعد بھی جب تک لونڈیاں آزاد نہ ہو جائیں وہ ملک یمین ہی کہلاتی تھیں' محض نکاح انھیں آزادی نہیں دلا سکتا جب تک خود مالک انھیں آزاد نہ کرے۔ اس امتیاز کو شرعی لحاظ سے قائم رکھنا ضروری تھا اس وجہ سے ملک یمین یعنی لونڈیوں کا ذکر الگ کیا گیا ہے۔ پس مذکورہ آیات میں ازواج سے مراد وہ عورتیں ہیں جو نکاح کے وقت آزاد تھیں اور ملک یمین سے مراد وہ عورتیں مراد تھیں جو نکاح کے وقت آزاد نہ تھیں۔ ازواج اور ملک یمین دو اصطلاحیں ہیں۔ جن کا مفہوم الگ الگ ہے لیکن جہاں تک نکاح کا تعلق ہے۔ آزاد عورتوں اور ملک یمین دونوں کے لیے ضروری ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھیں۔ لونڈیاں خواہ منکوحہ ہیں یا غیر منکوحہ جب تک آزاد نہ ہو لیں وہ ملک یمین ہی کہلاتی ہیں۔ اس لیے قرآن مجید میں جب یہ لفظ آئے گا تو قرینہ سے معانی کیے جائیں گے۔ بہر حال یہ بات عیاں ہو گئی ہے کہ جس طرح آزاد عورت کو حلقہ زوجیت میں لانے کے لیے نکاح ضروری ہے اسی طرح ملک یمین کو زوجیت کی گرہ میں باندھنے کے لیے نکاح ضروری ہے جس طرح آزاد عورت کو عقدہ نکاح میں لانے کے لیے شرائط اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہیں۔ اسی طرح مَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (لونڈیوں) کے ساتھ تعلقات زنا شوئی قائم رکھنے کے احکام بھی بیان کر دیے ہیں تا کہ نکاح کا مضمون مکمل ہو جائے اور لونڈیوں کے مالکوں کو واضح یہ ہدایت کی ہے اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو۔ انھیں نکاح سے روکنا انھیں زنا پر مجبور کرنا ہے۔ پھر صاف الفاظ میں یہ حکم ہے کہ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ (نور ۲۴:۳۲) یہاں صالح غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کا حکم دیا ہے۔

سنت نبوی: جب ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر نظر دوڑاتے ہیں یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے کسی لونڈی سے اس کو لونڈی کی حیثیت سے رکھ کر نکاح نہیں کیا بلکہ آزاد کر کے اور اس کو زوجیت کے پورے حقوق دے کر نکاح کیا ہے چنانچہ ام المومنین حضرت صفیہ ملک یمین تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو آزاد کیا اور شادی کی تاکہ دوسری بیویوں کے ہم پلہ ہو جائے۔ یہی حالت ماریہ قبطیہ کی معلوم ہوتی ہے کہ جن کے بطن سے حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے۔ شاہ مصر نے انھیں بطور لونڈی کے آپ کو بھیجی۔ ان کو آزاد کر کے اپنے حلقہ زوجیت میں لائے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ان کی وفات تک ان کو دیگر ازواج کی طرح برابر نفقہ دیتے رہے جب آپ کی دوسروں کو یہ تعلیم تھی کہ لونڈیوں سے آزاد کرنے کے بعد نکاح کرو تو آپ خود کیوں نہ ایسا کرتے۔

صحابہ کرام کا نمونہ: تمام اکابر صحابہ کا نمونہ بھی یہی ہے کہ انھوں نے ان احکام کے نزول کے بعد کسی لونڈی سے تعلق رکھنا چاہا تو پہلے آزاد کیا پھر اس سے نکاح کیا۔

فقہاء کے فتاویٰ کی حیثیت: بعض فقہاء نے بلا نکاح لونڈی کے جواز کا فتوی دیا ہے۔ اوّل تو فقہاء کے فتوی کی حیثیت قرآن اور سنت کے مقابل پر کچھ نہیں۔ فقہاء کے فتاوی کی تین وجوہ ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ فقیہہ نے اجتہاد سے کام لیا اور نیک نیتی سے یہ فتوی دے دیا کہ مالک بلا نکاح لونڈی کو تصرف لا سکتا ہے اور جتنی چاہے لونڈیاں اپنے گھر میں رکھ لے۔ نیک نیتی سے اجتہاد کرنا قابل گرفت نہیں بلکہ اجتہاد کرنے کی وجہ سے اس کو نیک نیتی کا بدلا ملے گا۔

دوسری وجہ فقہاء کی معاشرتی مجبوری تھی کہ لونڈی اور غلاموں کا باب باندھیں۔ اسلام سے قبل تمام غیر مسلم قوموں میں لونڈی اور غلاموں کا رواج تھا اور جو قوم بھی مسلمان ہوتی وہ اپنے ساتھ لونڈی اور غلاموں کی فوج ساتھ لاتی تھی۔ گو اسلام نے عالمگیر پیغام حریت دیا تھا۔ مگر اس پیغام کے ہوتے ہوئے تمام غلاموں اور لونڈیوں کو یکلخت آزاد کر کے بیکاروں کی ایک فوج چھوڑ کر معاشرتی امن و امان کو تباہ نہیں کیا جا سکتا اس لیے اس نے غلاموں اور لونڈیوں کو بتدریج آزاد کرانا چاہا تاکہ آزاد ہونے سے پہلے تعلیم و تربیت سیکھ کر آزاد لوگوں کے برابر ہو سکیں۔ اور انسانیت کا جامہ پہن لیں۔ معاشرے کے بہتر ممبر بنیں۔ اس وقت تک ان کے حقوق اور ان کے ساتھ سلوک کے لیے قوانین بنانا فقہاء کا کام تھا۔ انھوں نے ایسا کیا تو ایک معاشرتی ضرورت کے تحت کیا۔

تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ کسی فقیہہ نے حکمران کے دباؤ کے تحت لونڈیوں پر تصرف کا فتوی دے دیا ہو۔ اس قسم کے فتاوی سے ہماری تاریخ بھری ہوئی ہے۔ ہر دور میں عدالتوں نے آمروں کے دباؤ کے تحت ان کی مرضی کے فیصلے کیے جن کی فہرست لمبی ہے۔ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح پہلے ادوار میں بھی بعض قاضیوں اور فقہا نے حکمران کے دباؤ کے تحت فتاوی دے دیا تو وہ توجہ کے قابل نہیں۔

زوجین کے حقوق و فرائض

حقوق حق کی جمع ہے۔ علماء لغت نے حق کے کئی معنی کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو حق کہا گیا ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ چیزوں کو اقتضائے حکمت کے مطابق ایجاد کرتا ہے۔ ثُمَّ رُدُّوْا اِلَی اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ (الانعام ٦:٦٢) پھر وہ اس سچے مالک کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

خدا کی پیدا کی ہوئی اشیا کو حق کہا جاتا ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ اقتضائے حکمت کے مطابق پیدا کی گئی ہیں۔ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ مَاخَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ. (یونس :٥) وہی ذات ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو نور بنایا اور چاند کی منزلیں مقرر کیں تا کہ تم برسوں کا شمار اور کاموں کا حساب معلوم کرو۔ یہ سب کچھ اللہ نے حق کے ساتھ پیدا کیا۔

ہر اس فعل اور قول کو حق کہا جاتا ہے جو اس کے مطابق ہو جو واجب ہے اور اس اندازہ سے ہو جو واجب ہے اور اس وقت پر ہو جو واجب ہے۔

حق کے معنی صدق، مطابقت، موافقت، لازم اور واجب کے بھی ہوتے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں حقوق کی یہ تعریف ہے حقوق انسانی وہ اختیارات ہیں جنھیں معاشرہ مفاد عامہ کے لیے ضروری قرار دے۔ پروفیسر ہالینڈ نے کہا ہے۔ انسانی حق کی وہ صلاحیت ہے جس کی وجہ سے وہ دوسروں کے افعال پر ذاتی قوت سے نہیں بلکہ سماج کی قوت یا رائے عامہ سے اثر ڈال سکتا ہے۔

آسٹن حق کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔ حق انسان کی وہ قوت یا صلاحیت ہے جس کے ذریعہ وہ دوسروں کو صبر و تحمل یا دوسرے کاموں کی تلقین کرتا ہے حقوق کی کئی اقسام ہیں۔

۱۔ قدرتی حقوق

۲۔ قانونی حقوق

۳۔ اخلاقی حقوق

۴۔ معاشی حقوق

۵۔ تمدنی حقوق

قدرتی حقوق سے مراد وہ حقوق ہوتے ہیں جو ہر ذی روح اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور ان حقوق کے لیے انسان کو کسی قسم کی جدوجہد نہیں کرنی پڑتی۔ مثلاً انسان پیدا ہوتے ہی ہوا، روشنی، پانی وغیرہ سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

قانونی حقوق سے مراد وہ حقوق ہوتے ہیں جن کو حکومت تسلیم کرتی ہے اور ان کی خلاف ورزی پر عدالتوں کے ذریعہ سزا دی جاتی ہے۔

اخلاقی حقوق سے مراد وہ حقوق ہوتے ہیں جن کو عوام نے از خود اپنے اوپر لازم کر لیا ہوتا ہے۔ قانون کی رو سے ان کی پابندی لازم نہیں ہے اور ان کا توڑنا جرم ہے۔

معاشی حقوق سے مراد وہ حقوق ہوتے ہیں جن کا تعلق روپیہ پیسے سے ہوتا ہے۔

تمدنی حقوق سے مراد وہ حقوق ہیں جو بنی نوع انسانی کے معاشرتی تعلق سے پیدا ہوتے ہیں۔

<u>فرائض</u> فرائض فرض کی جمع ہے۔ حقوق اور فرائض لازم ملزوم ہیں۔ جب انسان کو حقوق حاصل ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو فرائض کہا جاتا ہے۔

فرائض کو عموماً دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ قانونی فرائض

۲۔ اخلاقی فرائض

قانونی فرائض وہ ہوتے ہیں جن کا ادا کرنا ہر انسان پر قانونی طور پر واجب ہوتا ہے۔ جن کی ادائیگی نہ کرنے کی وجہ سے حکومت کی طرف سے سزا ہے۔

اخلاقی فرائض وہ ہیں جن کی ادائیگی معاشرہ کے دباؤ کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ اگر ان فرائض کو ادا نہ کیا جائے تو قانون گرفتار نہیں کرتا۔

حقوق وفرائض کا باہمی تعلق: حقوق وفرائض لازم وملزوم ہیں ایک کے بغیر دوسرے کا کوئی وجود نہیں۔ یہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ ہر حق کے ساتھ فرض ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ حقوق کی ادائیگی پر زور دیا جائے لیکن فرائض کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ہر حق کے ساتھ ایک فرض ہے۔ حقوق اور فرائض کے گہرے تعلق کا سبب انسان کا مدنی الطبع ہونا ہے۔ ہر انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ ایک گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا ہر فعل دوسرے پر اثر انداز ہوگا۔ معاشرتی تعلقات کو درست اور مضبوط رکھنے کے حقوق وفرائض ضروری ہیں۔

بیوی کے حقوق

قدرتی حقوق

ہم بستری: اسلام نے عبادت اور ریاضت کو قرب الٰہی کا ذریعہ ٹھہرایا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر ایک سالک چل کر سلوک کی منزلیں طے کرتا ہے دن رات میں پانچ دفعہ بارگاہ ایزدی میں حاضری دینا ہر مسلم پر فرض ہے۔ قرآن مجید نے انسان کی پیدائش کی غرض وغایت ہی عبادت قرار دی ہے ارشاد ہے۔ مَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات ۵۶:۵۱) یعنی میں نے جن وانس کو صرف عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ عبادت کی اتنی اہمیت کے باوجود اسلام نے یہ اجازت نہیں دی کہ کوئی مسلمان عورت کے اس حق پر دست درازی کر کے دن رات عبادت میں مشغول رہے۔ چند صحابہ ایسے تھے کہ جن کی نگاہ میں زن وشوہر کے باہمی تعلقات کی کوئی وقت نہ تھی تو آپ نے ان کو بلا کر فرمایا۔ ان لزوجک علیک حَقٌّ. (بخاری باب لزوجک علیک الحق) یعنی تم پر تمہاری بیوی کا حق ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (البقرہ ۱۸۷:۲) تمھارے لیے روزوں کی رات میں اپنی عورتوں کی طرف رغبت کرنا حلال کیا گیا ہے وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ اللہ جانتا ہے کہ تم اپنی جانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے سو اس نے تم پر رجوع رحمت کیا اور تم کو معاف کیا۔ بس اب ان سے میل جول رکھو اور جو اللہ نے تمھارے لیے مقرر کیا ہے چاہو۔

حضرت عمرؓ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا۔ وَحَصِّنُوا فُرُوْجَ هٰذِهِ النِّسَاءِ (مسند احمد) ان عورتوں کی شرم گاہوں کو محفوظ رکھو۔ امام بن تیمیہ کا قول ہے۔ مرد پر واجب ہے کہ معروف طریقے سے اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستری کرے۔ یہ بیوی کا نہایت ہی موکد حق ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ا صفحہ ۵۶) حافظ ابن قیم زاد المعاد میں رقمطراز ہیں۔ بیوی کا خاوند پر حق ہے کہ وہ اس کے ساتھ فطری طریقہ پر ہم بستری کرے۔

معاشی حقوق

نفقہ: نفقہ سے مراد کھانا کپڑا اور مکان ہے۔ درالمختار باب النفقہ میں لکھا ہے هی لغة ما ینفقه' الانسان علی عیاله و شرعا هی الطعام والکسوة والسکنی. یعنی لغت میں نفقہ سے مراد یہ ہے جو آدمی اپنے بال بچوں پر خرچ کرتا ہے اور شریعت میں نفقہ کھانا کپڑا اور مکان کا نام ہے۔ شوہر کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کے نان ونفقہ کے لیے روزی کمائے اور اپنی بساط کے مطابق گزارہ کا انتظام کرے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: لِيُنْفِقْ ذُوْسَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا اٰتٰهُ اللّٰهُ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَا اٰتٰهَا. (الطلاق ۷:۶۵)

چاہیے کہ وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس پر اس کی روزی تنگ ہے تو چاہیے کہ وہ اس سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔ اللہ کسی شخص پر کچھ لازم نہیں کرتا مگر اسی کے مطابق جو اسے دیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت حکیم بن معاویہ قشیری کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے ہر ایک کی بیوی کا اس پر کیا حق ہے۔ آپ نے فرمایا جس وقت تو کھائے اسے بھی کھلائے اور جب تو پہنے اسے بھی پہنائے اور نہ تو اس کے منہ پر مارے اور نہ یہ کہے کہ تیری شکل اچھی نہیں اور باہم لڑائی ہو تو صرف گھر ہی میں اس کی خواب گاہ علیحدہ کر دے۔ (ابو داؤد' ابن ماجہ)

اَنْ تُحْسِنُوْا اِلَيْهِنَّ فِىْ كِسْوَتِهِنَّ وَطَعَامِهِنَّ (ترمذی باب ماجاء فی حق المراۃ علی زوجھا) یعنی تم ان (بیویوں) کے ساتھ کپڑا اور کھانا دینے میں اچھا سلوک کرو۔ خاوند کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی بیوی کی رہائش کا انتظام کرے۔

ارشادِ الٰہی ہے: اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ (الطلاق آیت ۶) عورتوں کو اپنے مقدور کے مطابق وہیں رکھو جہاں تم خود رہو۔

مہر: قرآن مجید میں آتا ہے: فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (النساء ۲۴:۴) پس ان کے مقررشدہ مہر دے دو۔

دوسری جگہ ہے: وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (النساء ۴:۴) اور عورتوں کو ان کے مہر بلا بدل دو۔

حدیث میں آتا ہے: عَنْ عُقْبَةَ ابْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَقُّ مَا اَوْفَيْتُمْ بِهٖ مِنَ الْمَشْرُوْطِ اسْتَحْلَلْتُمْ بِهٖ الْفُرُوْجَ (بخاری ومسلم) حضرت عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ان شرطوں کو تم نے پورا کرنا ہے جس کی وجہ سے تم عورتوں کی ناموس اپنے لیے حلال کی ہے۔

وراثت: لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ (النساء۴:۷) یعنی مردوں کے لیے اس سے ایک حصہ ہے جو ان کے والدین اور قریبی چھوڑیں اور عورت کے لیے ان سے ایک حصہ جو ان کے ماں باپ اور قریبی چھوڑیں۔

ملکیت اور اس پر تصرف کی اجازت: اگر عورت ضرورت محسوس کرے، تو اس کو کوئی پیشہ اختیار کرنے کی اجازت ہے اور وہ مرد کی طرح روپیہ پیسہ کما سکتی ہے۔ پھر اسے اپنی ملکیت پر پورا پورا اختیار ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء۴:۳۲) اور عورتوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں۔

تمدنی حقوق

حسن سلوک: قرآن مجید نے عورتوں سے حسن سلوک کی بہت تاکید کی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء۴:۱۹) عورتوں سے حسن معاشرت کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عورتوں سے حسن سلوک اور بھلائی کی وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اِسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَاِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ وَاِنَّ اَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ اَعْلَاهُ فَاِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهٗ كَسَرْتَهٗ وَاِنْ تَرَكْتَهٗ لَمْ يَزَلْ اَعْوَجَ فَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ (بخاری باب الوصاۃ بالنساء) تم کو عورتوں سے بھلائی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔ اور پسلی میں سب سے ٹیڑھا حصہ اوپر والا ہے۔ لہٰذا تم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو توڑ ڈالو گے اور اگر چھوڑ دو گے تو ہمیشہ کے لیے کجی رہ جائے گی۔ اس لیے عورتوں کے متعلق نصیحت قبول کرو۔

اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا وَخِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ (ترمذی باب ماجاء فی حق المراۃ علی زوجھا) یعنی ایمان میں سب سے کامل ترین وہ ہے جو اپنے اخلاق میں سب سے اچھا ہو اور تم میں بہترین وہ ہے جو اپنی بیوی کے لیے اچھا ہو۔

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِيْ (مشکوٰۃ المصابیح کتاب النکاح باب فی عشرۃ النکاح الفصل الثانی) تم میں بہترین وہ شخص ہے جو اپنی بیویوں سے نیک سلوک کرے۔

ظلم وتعدی سے ممانعت: عورت کی طبیعت حساس ہونے کی وجہ سے ضدی، درشت خو اور ذرا ذرا سی بات پر وہ چراغ پا ہو جاتی ہے۔ اگر اس کمزوری کو نظر انداز نہ کیا جائے تو گھر دوزخ بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورت کو ٹیڑھی پسلی سے تشبیہ دی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے ٹیڑھے پن کو درست کرنے کی کوشش نہ کی جائے اگر کوشش کی گئی تو ٹوٹ جائے گی۔ قرآن مجید نے بار بار عفو وکرم سے کام لینے اور ظلم وتعدی سے باز رہنے کی تعلیم دی ہے۔ ارشاد ہے: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (التغابن ۶۴:۱۴) اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ تمہاری بیویوں میں سے اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن بھی ہیں۔ سو ان سے بچتے رہو اور اگر تم معاف کرو اور درگزر کرو اور بخش دو تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

قرآن مجید نے یہاں تک تحمل اور بردباری سے کام لینے کی تعلیم دی ہے کہ اگر ان کی بعض حرکات ناپسند بھی ہوں تب بھی تحمل سے کام لینا چاہیے ارشاد ہے: فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (النساء۴:۱۹) اگر تم انھیں ناپسند کرتے ہو تو ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو۔ اور اللہ اسی میں بہت سی بھلائی رکھ دے۔ قرآن مجید نے جہاں عورتوں کو طلاق دینے کا ذکر کیا وہاں مردوں کو ہدایت کی ہے کہ عورتوں پر ظلم وتعدی نہ کی جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (البقرہ۲:۲۳۱) اور ان کو دکھ دینے کے لیے نہ روک رکھو تاکہ تم زیادتی کرو اور جو ایسا کرتا ہے وہ اپنی جان پر ظلم کرتا ہے اور اللہ کی باتوں سے ہنسی نہ کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ لَا يَجْلِدُ اَحَدُكُمْ اِمْرَاَتَهٗ جَلْدَ الْعَبْدِ ثُمَّ يُجَامِعُهَا فِي الْيَوْمِ الْاٰخِرِ (بخاری باب مایکرہ من ضرب النساء) تم میں سے کوئی اپنی بیوی کو اسی طرح نہ پیٹنا شروع کر دے جس طرح غلام کو پیٹا جاتا ہے اور پھر دوسرے دن جنسی میلان کو پورا کرنے کے لیے

اس کے پاس پہنچے۔

لا تضربن ظعينتک ضربک امتک (مشکوۃ ص ۲۸۲) اپنی بیوی کو لونڈی کی طرح ہرگز نہ پیٹو لَا تَضْرِبُ الْوَجْهَ وَلَا تُقَبِّحْ وَلَا تَهْجُرْ اِلَّا فِي الْبَيْتِ (مشکوۃ باب عشرۃ النساء) نہ اس کے چہرے پر مارو اور نہ برا بھلا کہو اور نہ علیحدگی اختیار کرو۔ اگر اس کا موقع بھی آئے تو یہ گھر ہی میں ہو۔

سرزنش کی اجازت: چونکہ اسلام ایک عملی دین ہے اس وجہ سے خاص حالات میں جسمانی اذیت دینے کی اجازت دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا (النساء ۴:۳۴) اور جن عورتوں کی سرکشی کا تمھیں ڈر ہو۔ تو ان کو وعظ و نصیحت کرو اور ان کے بستروں سے الگ رہو اور ان کو مارو پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف کوئی راہ تلاش نہ کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ضرب کی حد بندی کرتے ہوئے فرمایا: وَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبَ غَيْرَ مبرح ان کو مارو مگر صرف ایسا جس کا اثر نہ ہو۔

بیوی کے لیے سامان طہارت و نظافت: شوہر پر بیوی کے لیے سامان طہارت و نظافت کا مہیا کرنا ضروری ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو صاف ستھری رکھ سکے اور خاوند کے دل کو زیادہ لبھا سکے۔ خاوند اور بیوی کی باہمی محبت جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی گھر کا ماحول پرسکون اور خوشگوار ہوگا۔

فقہاء نے خاوند کے فرائض میں سے یہ ایک فریضہ قرار دیا ہے کہ خاوند اپنی بیوی کو سامان زینت اور نظافت مہیا کرے۔

ويجب عليه ما تنظف به و تزيل الوسخ كالمشط والدهن السدر والخطمي والاشنان والصابون على عادة اهل البلد...... واما الطيب فيجب عليه ما يقطع السهوكة ولا غير عليه ما تقطع الصنان (ردالمحتار ج ۲ صفحہ ۷۰۴) شوہر پر واجب ہے کہ بیوی کے لیے ایسی چیزیں مہیا کر دے جس سے وہ اپنے آپ کو ستھری رکھ سکے اور میل کچیل دور کر سکے جیسے کنگھی تیل' بیری کی پتی خطمی اشنان اور صابون جیسا کہ شہر کے رہنے والوں کا رواج ہے۔ اتنی خوشبو کا فراہم کرنا ضروری ہے اسی طرح بغل کی بو کو دور کرنے کا سامان۔

بیوی پر اعتماد اور بھروسہ: گھر کا انتظام میاں بیوی کے باہمی اعتماد اور بھروسہ پر چلتا ہے۔ اگر ایک فریق بھی بداعتمادی کرے گا تو گھر کا سکون ختم ہو جائے گا۔ چوں کہ مرد گھر کا صدر ہے۔ اس وجہ سے مرد پر فریضہ ہے کہ وہ بیوی پر اعتماد کرے اور گھر کے اندرونی معاملات اس کے سپرد کر دے تاکہ اس کو اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کو ہی گھر کا نگران قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ والمراء ة راعية على بيت زوجها. (بخاری باب المراة راعية بيت زوجها) عورت اپنے خاوند کے گھر کی نگران ہے۔

باہمی مصالحت کی کوشش: میاں بیوی کی زندگی میں کئی بار ناراضی اور شکر رنجی کے مواقع آتے ہیں۔ ناراض اور شکر رنجی اور شکایت کے دور کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ طلاق خلع کے ذریعہ مستقل طور پر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ فریقین باہمی مصالحت کی کوشش کریں اور ان شکایات کے ازالہ کی کوشش کریں جن کی وجہ سے گھر کا ماحول خراب ہوا ہے۔ قرآن مجید اسی طریقہ کو بہتر قرار دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (النساء ۴:۱۲۸) اور اگر ایک عورت کو اپنے خاوند کی زیادتی یا بے رغبتی کا خوف ہو تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ آپس میں صلح کر لیں اور صلح اچھی چیز ہے۔ اسلام نے صلح کرانے کا ایک عمدہ طریقہ یہ بیان کیا ہے کہ دونوں جانب سے حکم مقرر کر دیے جائیں۔ وہ میاں بیوی کے اختلاف اور رنجشوں کی وجوہ معلوم کر کے ان کو دور کرنے کی تجاویز پیش کریں۔ میاں بیوی کو پھر اتحاد اور محبت کی لڑی میں منسلک کر دیں ارشاد ہے: وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا (النساء ۴:۳۵) اور تم کو دونوں (میاں بیوی) میں باہم دشمنی کا ڈر ہو۔ تو ایک فیصلہ کرنے والا اس مرد کے لوگوں میں سے اور ایک فیصلہ کرنے والا اس عورت کے لوگوں میں سے مقرر کرو۔

بیویوں میں عدل و انصاف: اگر خاوند کی ایک سے زیادہ بیویاں ہیں تو ان کے درمیان عدل و انصاف ایک ضروری امر ہے ارشاد الٰہی ہے: وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَلَّا تَعُوْلُوْا (النساء ۴:۳) اور اگر تمھیں خوف ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ایسی عورتوں سے نکاح کر لو جو تمھیں پسند ہوں۔ دو دو' تین تین اور چار چار اور اگر تمھیں خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی یا جس کے تمھارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے یہ زیادہ نزدیک ہے کہ تم ناانصافی نہ کرو۔

حدیث میں آتا ہے۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا كَانَتْ عِنْدَ الرَّجُلِ امْرَاَتَانِ فَلَمْ يَعْدِلْ بَيْنَهُمَا جَآءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَشِقُّهٗ سَاقِطٌ (ترمذی ابوداؤد نسائی) حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب کسی شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں انصاف نہیں کرتا تو قیامت کے دن وہ ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کا نصف بدن خمیدہ ہوگا۔

مطلقہ عورت کو عقد ثانی سے روکنے کی ممانعت: زمانہ جاہلیت میں مطلقہ عورت کو قسم قسم کے طریقوں سے دوسری شادی سے روکتے تھے۔ اسلام نے عورت کو عقد ثانی سے روکنے کی ممانعت کر دی ارشاد ہے: وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ (البقرہ ۲:۲۳۲) اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور پھر وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں تو انھیں اس بات سے مت روکو کہ وہ دوسرے شوہر کے ساتھ نکاح کریں۔ جب کہ وہ جائز طور پر باہم راضی ہو جائیں۔

نکاح سے قبل عورتوں کی رضامندی: اسلام سے قبل عورتوں سے نکاح سے قبل رضامندی حاصل نہیں کرتے تھے۔ ولی جہاں چاہے جس سے چاہے شادی کر دیتا تھا۔ اسلام نے نکاح سے قبل عورتوں سے رضامندی حاصل کرنا ضروری قرار دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ ثیبہ کا نکاح اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک اس کی رضامندی حاصل نہ کر لی جائے۔ لوگوں نے پوچھا اس کی رضامندی کی کیا صورت ہے۔ فرمایا خاموش رہے۔ (مسلم کتاب النکاح باب استیذ ان الثیب فی النکاح النطق والبکر بالسکوت)

قانونی حقوق

جس طرح مردوں کے لیے عورتوں کو طلاق دینے کا حق ہے۔ اسی طرح اسلام نے عورتوں کو بھی مردوں سے علیحدگی اختیار کرنے کا حق دیا ہے۔ اس علیحدگی کا نام اسلامی اصطلاح میں خلع ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ (البقرہ ۲:۲۲۹) پس اگر تمھیں یہ ڈر ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو پھر ان پر اس کے بارہ میں کچھ گناہ نہیں۔ جو عورت فدیہ دے دے۔

اس آیت کی تشریح حدیث سے ہوتی ہے۔ حبیبہ بنت سہل سے روایت ہے جو قیس بن شماس کے بیٹے سہل کے نکاح میں تھیں۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز فجر کے لیے نکلے تو حبیبہ بنت سہل کو اندھیرے میں اپنے حجرہ کے دروازے پر کھڑا پایا۔ آپ نے پوچھا کون ہے؟ حبیبہ نے جواب دیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حبیبہ بنت سہل ہوں۔ فرمایا کیسے آنا ہوا۔ عرض کیا میں اور ثابت بن قیس نکاح میں نہیں رہ سکتے۔ جب ثابت آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا یہ حبیبہ بنت سہل ہیں ان کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکیں حبیبہ نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثابت نے جو کچھ مجھ کو دیا تھا۔ سب میرے پاس موجود ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ثابت سے یہ فرمایا کہ اس میں سے کچھ لے لو اور حبیبہ کو چھوڑ دو۔ چنانچہ انھوں نے لے لیا اور حبیبہ اپنے کنبہ میں جا بیٹھیں۔ (موطا باب ماجاء فی الخلع)

جبریہ شادی میں فسخ نکاح کا حق: اگر ولی لڑکی کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کر دے تو لڑکی کو یہ حق ہے کہ وہ عدالت میں جا کر فسخ نکاح کرا لے۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ ایک لڑکی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ کر شکایت کی کہ اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی کر دی ہے۔ آپؐ نے اس لڑکی کو اختیار دیا کہ چاہے وہ قبول کر لے چاہے وہ رد کر دے۔ (سنن ابی داؤد کتاب النکاح باب فی البکر یزوجھا ولا یستامرھا)

حضرت ابن عباس سے ایک دوسری روایت ہے کہ ایک عورت کا خاوند مر گیا۔ اس نے ایک شخص سے نکاح کرنا چاہا لیکن اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف ایک دوسرے شخص سے شادی کر دی۔ عورت نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے والد کو بلا کر دریافت فرمایا کہ تم نے اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی کی ہے۔ اس نے کہا ہاں جس سے لڑکی شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس سے بہتر شخص کے ساتھ میں نے شادی کی ہے آپؐ نے دونوں میں تفریق کرا دی۔ (مسند ابوحنیفہ زوج بریرۃؓ)

مفقود الخبر خاوند سے انقطاع: خاوند کے مفقود الخبر ہونے کی حالت میں بیوی کو علیحدگی اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ قرآن مجید اور احادیث میں کوئی قطعی فیصلہ تو موجود نہیں کہ بیوی کو کب تک انتظار کرنا چاہیے۔ اس وجہ سے فقہا کے درمیان مفقود الخبری کی مدت کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ کی رائے کے مطابق بیس سال اور امام ابو یوسف کی رائے کے مطابق سو سال حضرت امام شافعی کی رائے کے مطابق سات سال اور حضرت امام مالک کے نزدیک چار سال کی میعاد ہے۔ ابن مسیب کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دوران جنگ مفقود الخبر ہو جائے تو اس کی بیوی ایک سال تک انتظار کرے۔ آج کل رسل و رسائل کا سلسلہ آسان اور عام ہے اس لیے ایک سال کی میعاد کافی ہے۔

شوہر کا نامرد اور مجبوب ہونا: اگر شوہر نامرد ہے تو مرد کو ایک سال کی مہلت علاج کے لیے دی جائے اگر مرد ہم بستری کے قابل ہو گیا تو فبہا ورنہ بیوی کو علیحدگی اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ حضرت سعید بن المسیب کا بیان ہے: مَنْ تَزَوَّجَ امْرَأَةً فَلَمْ يَسْتَطِعْ أَنْ يَمَسَّهَا فَإِنَّهُ يُضْرَبُ أَجَلَ سَنَةٍ فَإِنْ مَسَّهَا

وَالْأَفْرَقُ وَالْأَفْرَقُ بَيْنَهُمَا (موطا امام مالک ج ۲ صفحہ ۳۲) اگر کوئی شخص کسی عورت سے شادی کرے اور اس کو ہم بستر ہونے کی قدرت نہ ہو تو اس کو ایک سال کی مہلت دی جائے گی اگر اس کے بعد وہ زن و شوہر کے تعلقات کے قابل ہو گیا تو بہتر ورنہ ان دونوں میں علیحدگی کر دی جائے گی۔ لیکن اگر خاوند مجبوب (عضو تناسل کا کٹا ہوا ہونا) اور وہ ہم بستری کے لائق نہیں ہے تو خاوند کو بغیر کوئی مہلت دیتے ہوئے عورت کو علیحدگی اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔

امام قدوریؒ فرماتے ہیں: فان كان عنينا اجله الحاكم حولا فان وصل اليها والافرق بينهما ان طلبت المراء ة ذالک...... وان كان مجبوباً فَرَّقَ الْقاضي بينَهُمَا في الحال ولم يوجله (قدوری مصری کتاب النکاح) اگر مرد نامرد ہو تو حاکم اسے علاج کے لیے ایک سال کی مہلت دے گا۔ اگر وہ ہم بستری کے لائق ہو گیا تب تو خیر ورنہ ان دونوں میں عورت کے مطالبہ پر علیحدگی کر دی جائے گی۔ اگر مقطوع الذکر ہو تو قاضی فوراً بغیر مہلت دیے تفریق کر دے گا۔

حافظ ابن القیم ایک عام اصول بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: والقياس ان كل عيب ينفر الزوج الاخر ولا يحصل به مقصود النكاح من الرحمة و المودة يوجب الخيار (زاد المعاد ج ۴ صفحہ ۳۱) ہر وہ عیب جس کی وجہ سے مرد ہم بستری کے لائق نہیں رہتا اور نکاح کا مقصد جو محبت اور مودت ہے فوت ہو جائے تو ایسی حالت میں علیحدگی کا اختیار دینا ضروری ہو جاتا ہے۔

بیوی کے جذبات کا پاس: خاوند کا یہ فرض کہ وہ عورت کے جذبات اور داعیات کا پاس کرے۔ حضرت عمرؓ نے ہر شادی شدہ سپاہی کو چار ماہ کے بعد گھر آنے کا حکم دیا ہوا تھا لایتخلف المتزوج عن اهله اكثر منها (ردالمختار ج ۲ ص ۴۳۳) جو سپاہی شادی شدہ ہو وہ اپنی بیوی سے چار مہینے سے زیادہ الگ نہ رہے اس کی تائید قرآن مجید کی اس آیت سے ہوتی ہے۔ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (البقرہ ۲:۲۲۶) ان لوگوں کے لیے جو اپنی عورتوں کے حق دینے میں قسم کھا لیتے ہیں چار ماہ کا انتظار ہے اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اگر کوئی خاوند چار ماہ تک بیوی کے پاس جانے کی قسم کھا لے اور رجوع نہ کرے تو اس صورت میں عورت کو طلاق ہو جائے گی اور اس کو دوسری شادی کرنے کی اجازت ہو جائے گی۔

اخلاقی حقوق

اظہار وفاداری: خاوند کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی سے مصیبت میں اظہار وفاداری کرے۔ اگر ایسی بیماری یا آفت کی وجہ سے بیوی کی شکل و صورت میں فرق آ جائے تو عورت کو بدشکل ہو جانے کی وجہ سے بدسلوکی سے پیش نہ آئے۔ بلکہ اپنی وفاداری محبت اور پیار کا اظہار کرے۔ اس سے بیوی کا دل مسرت سے لبریز ہو جائے گا اور وہ اپنے شوہر کو وفادار پا کر اس کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لیے تیار ہو جائے گی اور وہ ایک جان نثار رفیقہ ثابت ہو گی۔

بیوی کی رازداری: شوہر پر ایک یہ بھی فرض ہے کہ عورت کے ساتھ مخفی تعلقات کو دوسروں کے سامنے پیش نہ کرے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا ہے۔ ان من اشر الناس عند الله منزلة الرجل يفضى الى امراته و تفضى اليه ثم ينشر سرها (مسلم باب تحریم افشاء سر المراۃ) لوگوں میں اللہ کے نزدیک بدترین وہ شخص ہے جو اپنی بیوی کے پاس جائے اور وہ اس کے پاس آئے پھر مرد اس کے مخفی تعلقات کو پھیلا دے۔

حضرت امام نووی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ في هذا الحديث تحريم افشاء الرجل مايجرى بينه وبين امراته من امور الاستمتاع ووصف تفاصيل ذلک مايجرى من المراة فيه من قول اوفعل اونحوه (شرح مسلم ج ۱ ص ۴۶۴) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میاں بیوی کے راز کی باتوں کو افشا کرنا جیسے استمتاع اور اس کی تفصیل کہ ایسے ایسے ہوا ہے۔ اسی طرح عورت سے متعلق کوئی مخفی بات یا کوئی فعل یا اور کوئی ایسی ہی چیز کا اظہار حرام ہے۔

والدین سے ملنے کی اجازت: بیوی کے حقوق میں سے ایک حق یہ بھی ہے کہ خاوند اس کو والدین اور قریبی رشتہ داروں سے ملنے سے محروم نہ کرے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود حضرت فاطمہؓ کے گھر پر جا کر ملاقات کرتے تھے۔ فقہاء نے لکھا ہے ہفتہ میں ایک دن والدین سے ملنے کے لیے جائے تو خاوند کو روکنا نہیں چاہیے۔ یہ اس وقت جب کہ بیوی کے والدین کسی معقول وجہ سے ملنے کے لیے نہ آ سکے ہوں۔ (درمختار)

مطلقہ کو کچھ فائدہ پہنچانا: اگر مجبوری کی حالت میں خاوند اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے تو خاوند پر یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ مہر کے علاوہ دستور کے مطابق بیوی کو دے کر رخصت کرے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (البقرہ ۲:۲۳۱) یا شریفانہ طریقے پر انھیں رخصت کرو۔

اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا (البقرہ ۲:۲۲۹) حسن سلوک کے ساتھ رخصت کرنا ہے اور تمھارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ تم اس مال سے کچھ واپس لو جو تم نے انھیں دیا ہے۔

اخلاق اور آخرت سنوارنے کی کوشش: جہاں مرد پر شادی کے بعد بے شمار فرائض عائد ہوتے ہیں وہاں ایک یہ بھی فرض ہے کہ بیوی کے اخلاق کو سنوارنے اور اس کی آخرت کو بہتر بنانے کی سعی کرے۔ ارشاد الٰہی ہے: قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (تحریم ۶۶:۶) اپنے آپ کو اور اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (الشعرا ۲۶:۲۱۴) اور اپنے قریبی رشتے داروں کو ڈراؤ۔

خاوند کا صاف ستھرا رہنا: عورت طبعاً نظافت پسند ہے اور اس کی حس جمالیات بہت تیز ہوتی ہے اس وجہ سے شوہر کا یہ فرض ہے۔ وہ اپنے لباس اور جسم کو صاف ستھرا رکھے تاکہ اس کی بیوی اس کو دیکھ کر خوش ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی صحابی کو گندے لباس میں دیکھ کر ناراضی اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے تھے۔ حضرت عطار بن یسار کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے ایک شخص مسجد میں داخل ہوا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال پراگندہ تھے۔ آپ نے اشارہ سے فرمایا کہ بالوں کو درست کرے چنانچہ اس نے سر اور داڑھی کے بال درست کر لیے۔ اس شخص کو واپس جاتے وقت آپ نے اچھی ہیئت میں دیکھا تو فرمایا کیا یہ ہیئت پہلی ہیئت سے اچھی نہیں ہے جو شیطان سی معلوم ہوتی تھی۔ (مشکوٰۃ باب الترجیل) مشہور حدیث ہے: ان اللہ طیب یحب الطیب نظیفٌ یحب (مشکوٰۃ باب الترجیل) اللہ پاک ہے پاکی کو پسند کرتا ہے اللہ صاف اور پاکیزہ ہے اور صفائی کو محبوب رکھتا ہے۔

خاوند کے حقوق

قدرتی حقوق: اسلام نے عائلی زندگی میں شوہر کو گھر کا نگران اور صدر منتخب کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (النساء ۴:۳۴) مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں اس لیے کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس لیے کہ انھوں نے اپنے مالوں سے کچھ خرچ کیا ہے مرد کے قوام ہونے کی دو وجوہ بیان کی ہیں۔ اوّل مرد عورت سے جسمانی اور دماغی قویٰ میں برتر ہے۔ دوم۔ مرد عورت کے لیے کپڑا، روٹی، گھر وغیرہ مہیا کرتا ہے۔

جدید تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مرد عورت سے عقلی قویٰ میں افضل ہے اور وہ جسم اور عضلات میں مضبوط ہے۔ مشہور فلاسفر علامہ پروڈن اپنی کتاب ابتکار النظام میں لکھتا ہے:۔

> عورت کا وجدان بمقابلہ مرد کے اسی قدر ضعیف ہے جس قدر اس کی عقلی قوت مرد کی عقلی قوت کے مقابلہ میں ضعیف نظر آتی ہے۔ اس کی اخلاقی قوت بھی مرد کے اخلاق سے بالکل مختلف ہے اور ایک دوسری قسم کی طبیعت رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ جس چیز کے حسن و قبح کے متعلق وہ رائے قائم کرتی ہے وہ مردوں کی رائے کے مطابق نہیں ہوتی پس مرد اور عورت میں یہ فرق کوئی عارضی امر نہیں بلکہ عورت کی طبعی خاصیت پر مبنی ہے۔ (بحوالہ مسلمان عورت ص ۳۹)
>
> اس قول کو نقل کر کے علامہ فرید وجدی رقمطراز ہیں۔ حواس خمسہ پر انسان کی عقلی اور دماغی نشوونما کا دار و مدار ہے۔ اس میں بھی سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ علامہ نیکولس اور علامہ بیلی نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے حواس خمسہ مرد کے حواس سے ضعیف تر ہیں۔ (مسلمان عورت صفحہ ۳۹)
>
> پھر علامہ صاحب لکھتے ہیں:۔
>
> "علم سائیکلوجیا نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے بھیجے اور مرد کے بھیجے میں مادۃً اور شکلاً سخت اختلاف ہے۔ مرد کے بھیجے کے وزن کا اوسط عورت کے بھیجے سے سوڈرام زیادہ ہے۔ (مسلمان عورت صفحہ ۴۱)
>
> اس کے بعد علامہ فرید وجدی لکھتے ہیں:۔
>
> "یہی وہ قوائے عقلیہ کا سرچشمہ ہے جس میں مرد کا پلہ عورت سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔ مرد کے دماغ کے وزن کا اوسط عام طور پر (۴۹۱/۲) ساڑھے انچاس اوقیہ ہے اور عورت کے دماغ کا وزن صرف (۴۴) چوالیس، دو سو اٹھہتر مردوں کے دماغ وزن کیے گئے تو سب سے بڑے دماغ کا وزن (۶۵) اوقیہ اور سب سے چھوٹے دماغ کا وزن (۳۴) چونتیس اوقیہ ثابت ہوا۔ لیکن جب دو سو اکانوے (۲۹۱) دماغ عورتوں کے وزن کیے گئے تو سب سے وزنی دماغ (۵۴) چون اوقیہ کا اور سب سے کم وزنی دماغ (۲۱) اکیس اوقیہ کا نکلا۔ کیا یہ اس امر کا ثبوت نہیں ہے کہ عورتوں کے عقلی قویٰ مرد کے قویٰ سے بدرجہا ضعیف ہیں۔ (مسلمان عورت ص ۴۱)

جدید تحقیقات نے یہ امر واضح کر دیا ہے کہ مرد عورتوں سے جسمانی اور دماغی صلاحیتوں میں افضل اور برتر ہیں۔ اس وجہ سے گھر کے انتظام کی باگ

ڈور مرد کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ اسلام نے بھی انہی وجوہ کی بناء پر نظام منزلی میں مرد کو صدر قرار دیا ہے۔ اسلام نے مرد کو نظام منزلی کا نگران اعلیٰ مقرر کرنے کے باوجود یہ حکم دیا ہے کہ گھریلو امور باہمی مشورہ سے طے کیے جائیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا (البقرہ۲:۲۳۳) اگر وہ دونوں آپس کی رضامندی اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں۔

پھر ایک عام اصول مقرر کر دیا کہ مومن ہر معاملہ باہمی مشورہ سے انجام دیں۔ ارشاد الٰہی ہے: وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (شوریٰ ۴۲:۳۸) ان کا کام آپس میں مشورے سے ہوتا ہے۔

جنسی میلان میں حکم کی بجا آوری: جنسی میلان کی تکمیل ایک طبعی تقاضا ہے اس طبعی تقاضے کی تکمیل کے ساتھ بیشمار اخلاقی تمدنی اور روحانی فوائد وابستہ ہیں۔ اس وجہ سے اسلام نے عورت کو یہ حکم دیا ہے کہ جب اس کا شوہر بلائے تو وہ فرمانبرداری کرے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اذا الرجل دعا زوجة لحاجته خلت له وان كانت على التنور (ترمذی باب عشرۃ النساء) جب خاوند اپنی بیوی کو جنسی میلان کی تکمیل کے لیے بلائے تو وہ فوراً اس کے پاس آ جائے۔ گو وہ تنور پر بیٹھی روٹی پکا رہی ہو اگر وہ حکم نہ بجالائے تو وہ گنہگار ہوگی۔ فرماتے ہیں: اذا دعا الرجل امرأته الى فراشه فابت ان تجى لعنتها الملئكة حتى مصبح (بخاری) خاوند جب اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ آنے سے انکار کر دے تو فرشتے اس پر صبح تک لعنت کرتے رہتے ہیں۔

حضرت امام نووی فرماتے ہیں کہ بغیر عذر شرعی بیوی کا خاوند کے مطالبہ ہم بستری کا انکار کر دینا حرام ہے۔ (شرح مسلم ج ۱ ص ۴۶۴) گو جنسی میلان کی تکمیل کے لیے بیوی سے خاوند کا مطالبہ ہمبستری نہایت ضروری ہے۔ لیکن فقہانے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ اگر بیوی کی صحت اس امر کی اجازت نہ دے، تو مرد اجتناب کرے۔ لو تضورت من كثرة جماعه لم تجز الزيادة على قدر طاقتها (درالمختار باب القسم) اگر کثرت جماع عورت کی صحت کے لیے مضر ہو تو ایسی حالت میں اس کی طاقت سے زیادہ ہم بستری جائز نہیں۔

تمدنی حقوق

اطاعت: دنیا کے تمام نظاموں کے استحکام اور استواری کا راز اطاعت ناظم الامور اور نگران اعلیٰ میں مضمر ہے۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اطاعت امیر پر بہت زور دیا ہے۔ منزل نظام بھی اطاعت کے بغیر نہیں چل سکتا۔ نہ گھر کا ماحول خوشگوار بن سکتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے بیویوں کے لیے یہ لازم قرار دیا ہے کہ وہ اپنے خاوندوں کی اطاعت کریں چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ (النساء۴:۳۴) سو نیک عورتیں خاوندوں کی فرمانبردار ہوتی ہیں۔

حدیث میں آتا ہے حضرت خولا ایک دن حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور بیان کیا کہ ہر رات پہن اوڑھ کر اور آراستہ ہو کر لوجہ اللہ اپنے شوہر کے لیے دلہن بن جاتی ہوں اور ان کے پاس سوتی ہوں مگر پھر بھی وہ توجہ نہیں کرتے۔ حضرت عائشہؓ نے یہ واقعہ خدمت نبوی میں عرض کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سن کر فرمایا ان سے کہہ دو کہ وہ اپنے خاوند کی اطاعت کرتی رہیں۔ (اسوہ صحابہ ص ۲۵۲)

عن ابى هريرة قال قال رسول الله عليه وسلم لو كنت آمرا احداً ان يسجد لاحد لامرت المرأة ان تسجد لزوجها (مشکوٰۃ المصابح ص ۲۸۳) حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اگر میں کسی کو کسی کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّمَا امْرَأَةٍ مَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَنْهَا رَاضٍ دَخَلَتِ الْجَنَّةَ (مشکوٰۃ المصابح باب عشرۃ النسا) ام سلمہ کہتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہر وہ عورت جو اس حالت میں فوت ہو کہ اس کا شوہر اس سے راضی ہو تو وہ جنت میں جائے گی۔

اسلام نے اس اطاعت کو مشروط کر دیا ہے کہ یہ اطاعت صرف معروف باتوں میں ہے آپ نے فرمایا لاطاعة فى معصية انما طاعة فى المعروف (بخاری کتاب الاحکام)

گھر کا کام کاج کرنا: گھر کے کاموں کو اپنے ہاتھ سے کرنا بیوی کے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے۔ ازواج مطہرات اور حضرت فاطمہؓ اور دیگر صحابیات گھر کے کاموں کو از خود کیا کرتی تھیں۔ حضرت امام بخاری نے اپنی جامع میں ایک باب باندھا ہے۔ عمل المرأة فى بيت زوجها۔ یعنی عورت کا اپنے خاوند کے گھر میں کام کاج کرنا حضرت فاطمہ گوشہ جگر حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آٹا پیسنے کے لیے چکی چلایا کرتی تھیں اور ان کے ہاتھوں پر گھٹے پڑ گئے تھے۔ حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ بیوی پر اس وقت تک گھر میں اپنے ہاتھ سے کام کرنا لازم ہے جب تک اس کا خاوند مالدار نہیں ہو جاتا۔ خواہ بیوی کسی

بڑے گھرانے کی چشم و چراغ کیوں نہ ہو۔ (عمدۃ القاری ج ۹ ص ۲۶۵ و زاد المعاد ج ۴ ص ۳۲)

حفظ غیب: قرآن مجید نے نیک عورتوں کی ایک صفت حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں اسی وجہ سے جو اللہ نے ان کی حفاظت کی ہے) بیان کی ہے۔ حفاظت کی مفعول ''حقوق خاوند'' مضمر ہے۔

حفظ غیب سے مراد بیوی کا خاوند کی غیر موجودگی میں اپنی عصمت اور عفت کی حفاظت مال کی حفاظت اور رازوں کی حفاظت ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَرْبَعٌ مَنْ اُعْطِيَهُنَّ فقد اُعطِيَ خَيْرُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ قَلْبٌ شَاكِرٌ وَلِسَانٌ ذَاكِرٌ وَ بَدَنٌ عَلَى الْبَلَاءِ صَابِرٌ وَزَوْجَةٌ لَا تَبْغِيْهِ خَوْنًا فِي نَفْسِهَا وَلَا فِي مَالِهِ (مشکوۃ المصابیح باب عشرۃ النسا صفحہ ۲۸۳) چار چیزیں ہیں جس کو وہ دی گئی ہوں اسے دنیا اور آخرت کی بھلائی مل گئی۔ شکرگزار دل ذکر الٰہی کرنے والی زبان مصائب میں صبر کرنے والا جسم اور وہ عورت جو اپنی ذات اور شوہر کے مال میں خیانت نہ کرے۔

قِيْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ النِّسَاءِ خَيْرٌ قَالَ الَّتِي تَسُرُّهُ اِذَا نَظَرَ وَتُطِيْعُهُ اِذَا اَمَرَ وَ لَا تُخَالِفُهُ فِيْ نَفْسِهَا وَلَا فِي مَالِهَا بِمَا يَكْرَهُ (مشکوۃ المصابیح باب عشرۃ النساء ۲۸۳) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ عورتوں میں سے بہتر عورت کون سی ہے آپ نے فرمایا: ایک وہ جب شوہر اس کو دیکھے تو اس کو خوش کر دے اور جب وہ حکم دے تو اس کا حکم بجالائے اور اپنی جان اور مال میں کسی ایسی بات میں اس کی مخالفت نہ کرے جو اس کو ناپسند ہو۔

لاتصدق بشيء من بيته الا باذنه فان فعلت فان له الاجر و عليها الوزر ولا تخرج من بيته الاباذنه. (بخاری کتاب النکاح باب قوا انفسکم و اهلیکم نارا صفحہ ۱۸۳) بیوی کو شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے خیرات نہیں کرنا چاہیے اگر وہ ایسا کرے گی تو اس کے لیے ثواب ہوگا اور اس پر گناہ اور اس کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر نہ نکلے۔ اَلْمِرْاَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى بَيْتِ زَوْجِهَا وَهِيَ مَسْئُوْلَةٌ عورت اپنے شوہر کے گھر پر نگران ہے اور اس سے پوچھا جائے گا۔

خاوند کے رشتے داروں اور دوستوں سے حسن سلوک: قرآن مجید نے عزیزوں اور رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی پر بہت زور دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (الروم ۳۰:۳۸) سو قریبی کو اس کا حق دے۔ قریبی رشتے داروں کے حقوق کی ادائیگی جس طرح مرد پر فرض ہے اسی طرح عورت پر بھی فرض ہے۔

عفت اور عصمت کی حفاظت کے لوازمات: قرآن مجید کی تعلیم کا یہ کمال ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اس کی تعلیم کامل ترین ہے۔ قرآن مجید نے پاکدامن رہنے کا حکم دیا ہے تو ساتھ ہی پاک دامن رکھنے کے لیے طریقے بھی بتلا دیے ہیں۔

تحفظات کے یہ طریقے تین قسم کے ہیں۔

۱۔ اصلاح باطن: اسلام نے اصلاح باطن کی بنیاد معرفت الٰہی پر رکھی ہے جتنی اللہ کی معرفت زیادہ ہوگی اتنا ہی گناہوں کی وادی سے دور رہے گا۔ اللہ کی معرفت ہی وہ علاج جس سے انسان اپنے دل کو پاک رکھ سکتا ہے۔ تعزیری قوانین سے ڈر کر ان اعمال سے رک سکتا ہے جو سوسائٹی کے بگاڑ کا موجب ہو سکتے ہیں لیکن تعزیری قوانین دل کو پاک نہیں کر سکتے اس لیے قرآن پاک کی تمام تعلیمات کا حقیقی محور ایمان باللہ ہے جس کے دل میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کا تصور مستولی ہوگا وہ گناہوں کے زہر کا پیالہ کبھی بھی اپنے لبوں تک نہیں لائے گا۔ جس طرح وہ شخص جس کو یہ علم ہو کہ اس بل میں سانپ ہے اس میں ہلاکت سے بچنے کے لیے ہاتھ نہیں ڈالتا اسی طرح جس کا دل اللہ کی حقیقی معرفت سے بھرا ہو وہ گناہوں کے قریب نہیں پھٹکتا۔ اللہ کی حقیقی معرفت کا نہ ہونا ہی گناہوں کے ارتکاب کا سبب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حقیقی معرفت حاصل کرنے کے لیے ذکر الٰہی دعا' مجاہدہ اور راست بازوں کی صحبت میں رہنے کی تعلیم دی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے منکرات اور فواحش سے بچنے کے لیے انسان کی فطرت میں حیا کا مادہ رکھ دیا ہے۔ انسان بالطبع برائیوں سے نفرت کرتا ہے۔ یہ اس کی نفرت حیا کے مادہ سے پھوٹتی ہے۔

اصلاح باطن کا دوسرا طریقہ مادہ حیا کو جلا دینا ہے جو انسان کو ہر وقت برائیوں سے دور رہنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ اگر انسان غلطی سے کسی گناہ کا ارتکاب کر بھی جائے تو پھر اس کو ندامت کے تازیانے مارتا رہتا ہے اور وہ آئندہ اس کے لیے فواحش کا ارتکاب کرنے سے توبۃ النصوح کر لیتا ہے۔ قرآن مجید نے اس مضمون کو آدم علیہ السلام کے قصہ میں بیان کیا ہے کہ کس طرح جب آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی تو اس کو مادہ حیا نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور وہ آستانہ الوہیت پر گر پڑا اور اپنی ندامت کے آنسوؤں سے گناہوں کی میل کو صاف کیا۔ ارشاد الٰہی ہے: فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا

وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ (الاعراف ۷:۲۲) شیطان نے دھوکے سے ان کو گرا دیا سو جب ان دونوں نے درخت کو چکھا۔ ان کے عیب ان پر کھل گئے اور وہ باغ کے پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانکنے لگے۔

آدم علیہ السلام کو اپنی لغزش کا احساس شرم وحیا کی وجہ سے ہوا اور یہ وہ فطری خوبی ہے جس سے انسان برائیوں سے بچتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اَلْحَيَا خَيْرٌ کلہ (بخاری) یعنی حیا سراسر بھلائی ہے۔

اِنَّ لِكُلِّ دِيْنٍ خُلُقًا وَخُلُقُ الْاِسْلَامِ الْحَيَاءُ (الموطا باب خروج النساء الی ابراز کتاب النکاح باب خروج النساء الخ) ہر دین کے لیے ایک صفت ہوتی ہے اور اسلام کی صفت حیا ہے۔

۲۔ انسدادی تدابیر: اسلام نے عورت کی عفت کو محفوظ رکھنے کے لیے بعض ایسی انسدادی تدابیر بھی تجویز کی ہیں ان کو اختیار کرنے سے عورت فواحش سے بچ سکتی ہے۔

پردہ: اسلام میں پردہ سے مراد یہ نہیں ہے کہ عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں محصور رکھا جائے اور کسی کام کے لیے بھی گھر سے باہر قدم نہ رکھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ پردہ کا یہ تصور جہالت اور لاعلمی پر مبنی ہے اسلام میں پردہ سے مراد صرف یہ ہے کہ عورت اور مرد کو آزادانہ اختلاط نظر اندازی اور اپنی آرائش وزیبائش کے دکھانے کے مواقع ختم کیے جائیں۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل تعلیم دی ہے۔

بغیر ضرورت گھر سے باہر نہ نکلنا: وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ (الاحزاب ۳۳:۳۳) اور اپنے گھر میں ٹھہری رہو۔

اس آیت کا یہ مفہوم نہیں کہ عورت گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکل سکتی۔ اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ عورتیں بغیر کسی وجہ اور کام کے گھر سے باہر نہ نکلیں۔ حدیث شریف میں عورتوں کو کام سے باہر نکلنے کی اجازت دی گئی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں سے فرمایا: کہ تمھیں اجازت ہے کہ تم اپنی ضروریات کے لیے اپنے گھروں سے باہر جاؤ (بخاری کتاب الوضو)

فقہا نے اسے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ چند گنے چنے اسباب کے سوا عورت کو اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلنے کا حق نہیں ان اسباب میں سے ایک یہ کہ وہ ایسے مکان میں ہو جس کے گرنے کا خطرہ ہو۔

ایک یہ کہ کوئی مسئلہ پیش آ جائے اور خاوند فقیہہ نہ ہو تو وہ بلا اجازت عملی مجالس کی طرف رخ کر سکتی ہے۔ اسی طرح اس پر حج فرض ہو جائے تو اگر کوئی محرم بھی موجود ہو تو شوہر اسے جانے کی اجازت دے سکتا ہے اور اس سے وہ گنہگار نہ ہوگا۔ اسی طرح والدین کی ملاقات ان کی عیادت، تعزیت اور محرم رشتے داروں سے ملنے جلنے کے لیے بھی وہ شوہر کی اجازت کی پابند نہیں (فتاویٰ قاضی خان ج ۱ ص ۴۴۳)

نقاب اوڑھ کر نکلنا: يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. (الاحزاب ۳۳:۵۹)

اے نبی اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ وہ اپنی چادریں اپنے اوپر اوڑھ لیا کریں۔ زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچان لی جائیں اور انھیں ایذا نہ دی جائے۔

جلباب اس بڑی چادر کو کہتے ہیں جو سارے جسم کو ڈھانپ لے۔ پنجاب کے دیہاتوں میں بوڑھی عورتوں میں اب تک چادر اوڑھنے کا رواج ہے۔ وہ اس طرح اوڑھتی ہیں کہ بدن ڈھانپنے کے ساتھ چادر کا کچھ حصہ سر کے نیچے چہرہ پر لٹکا لیتی ہیں۔ جس کو گھونگٹ کہا جاتا ہے۔ روایات میں آتا ہے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مسلمان عورتیں چہرہ کو چھپا کر باہر نکلتی تھیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خواتین کو حکم دیا ہے کہ جب کسی کام کے لیے گھر سے باہر نکلیں تو اپنی چادروں سے اپنا سر اور منہ چھپالیں اور صرف ایک آنکھ کھلی رہے۔

ایک بار محمد ابن سیرینؒ نے حضرت عبید سلیمانیؒ سے اس آیت کی تشریح پوچھی تو انھوں نے زبان سے تشریح کرنے کی بجائے اپنی چادر لی اور اس طرح اوڑھ کر دکھائی کہ سر اور چہرہ وغیرہ سب کچھ چھپالیا۔ صرف ایک آنکھ کھلی رکھی۔

علامہ زمخشری کشاف میں اور علامہ عبداللہ بن احمد نسفیؒ مدارک التنزیل میں فرماتے ہیں۔ عورتیں اپنے اوپر چادر کا ایک حصہ لٹکا لیا کریں اور اس سے اپنے چہرے اور اپنے اطراف کو اچھی طرح ڈھانپ لیں۔

حضرت محمد بن جریر فرماتے ہیں۔ شریف خواتین لونڈیوں کا لباس پہن کر گھروں سے باہر نہ نکلیں کہ ان کے چہرے اور سر کے بال کھلے ہوئے ہوں بلکہ انھیں چاہیے کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں تاکہ کوئی بدکردار ان کو چھیڑنے کی جرأت نہ کر سکے۔

اظہارِ زیبائش کی ممانعت: اسلام عورتوں کو اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ بن ٹھن کر گھروں سے باہر نکلیں۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ (الاحزاب ۳۳:۳۳) پہلی جاہلیت کی طرح بناؤ سنگار نہ دکھاتی پھرو۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ (النور ۲۴:۳۱) اپنے پاؤں کو اس طرح زمین پر نہ ماریں کہ ان کے چھپے ہوئے زیور معلوم ہو جائیں۔ مرد کی فطرت میں داخل ہے جب وہ کسی عورت کی پازیب کی آواز سنتا ہے تو اس کا جنسی میلان کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے عورتوں کو منع کر دیا ہے وہ اس قسم کے زیورات پہن کر نہ نکلیں جو چلنے میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر آواز پیدا کریں۔

خوشبو لگا کر نکلنے کی ممانعت: یہ آیت اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ عورت خوشبو اور عطر وغیرہ لگا کر گھر سے باہر نہ نکلے کیونکہ خوشبو بھی مرد کی توجہ کو عورت کی طرف کھینچتی ہے۔

ایک حدیث ہے: كُلُّ عَيْنٍ زَانِيَةٌ وَالْمَرْأَةُ إِذَا اسْتَعْطَرَتْ فَمَرَّتْ بِالْمَجْلِسِ فَهِيَ كَذَا وَكَذَا يَعْنِي زَانِيَةً (ابن کثیر ج ۳ صفحہ ۲۸۶) ہر آنکھ زانیہ ہے اور جو عورت خوشبو لگا کر مجلس پر گزرتی ہے وہ بھی زانیہ ہے۔

نگاہیں نیچی رکھنا: تمام فتنے نظر اندازی سے اٹھتے ہیں اس وجہ سے مرد اور عورت دونوں کو نگاہیں نیچی رکھنے کی تعلیم دی ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَٰلِكَ أَزْكَىٰ لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ وَقُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (النور ۲۴:۳۰'۳۱) (مومنوں کو کہہ دو کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔ اللہ اس سے خبردار ہے جو وہ کرتے ہیں اور مومن عورتوں کو کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو (عادتاً) کھلا رہتا ہے)

حضرت علیؓ سے ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لاتبتع النظرة النظرة فان لک الاولی ولیست لک الاخرة (مشکوٰۃ) اے علی ایک بار نظر پڑ جانے کے بعد دوبارہ نہ دیکھو کیونکہ تمہارے لیے صرف پہلی نظر معاف ہے دوسری نہیں۔

بعض روایات میں آپ نے فرمایا اطرق بصرک (ابن کثیر) تو اپنی نگاہ جھکا لے۔ ایک دفعہ فرمایا: غُضُّوا أَبْصَارَكُمْ وَاحْفَظُوا فُرُوجَكُمْ (ابواب الکافی ص ۲۰۴) اپنی نگاہوں کو نیچا رکھو اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرو۔ طبرانی میں ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لتغضن ابصارکم ولتحفظن فروجکم (ابن کثیر ج ۳ صفحہ ۲۸۲) تم ضرور اپنی نگاہیں نیچی رکھو اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرو۔

اوٹ پیچھے سے استفادہ کرنا: وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ (الاحزاب ۳۳:۵۳) اور جب تم ان سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے ان سے مانگو۔ یہ تمہارے دلوں کے لیے اور ان کے دلوں کے لیے بہت پاک ہے اس آیت کا منشا یہ ہے کہ غیر مرد آزادانہ دوسرے گھروں میں نہ جائیں۔

غیر مردوں سے کھرے لہجہ میں بات کرنا: إِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا (الاحزاب ۳۳:۳۲) اگر تم تقویٰ اختیار کرو سو نرم آواز میں بات نہ کہو ایسا نہ ہو کہ وہ جس کے دل میں بیماری ہے طمع کرے اور نیکی کی بات کہو۔

عموماً عورتوں کی آواز میں شیرینی اور جاذبیت ہوتی ہے اس وجہ سے اسلام نے عورتوں کو تعلیم دی ہے کہ اگر وہ کسی ضرورت کے تحت کسی مرد سے کلام کرنا پڑے تو مردانہ انداز کلام اختیار کریں تاکہ وہ غلط امید نہ باندھ لے۔

عام گزرگاہ سے اجتناب کرنا: گزرگاہوں اور صدر راستوں پر عام مردوں کا گزر ہوتا ہے جہاں عورتوں کا چلنا فتنہ کا موجب بن جاتا ہے۔ اس وجہ سے عورتوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ یہ راستہ کے کنارے پر چلیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: استاخرن فانه لیس لکن ان تحتضن الطریق علیکن بحافات الطریق (ابن کثیر جلد ۳ صفحہ ۲۸۶) عورتیں پیچھے ہو جائیں عورتوں کے لیے یہ ضروری ہے وہ راستہ کے کنارے پر چلیں۔

تخلیہ: اسلام نے ان تمام دروازوں کو بند کر دیا ہے جن کے راستہ سے شیطان کسی عورت کی پاکدامنی اور عفت پر حملہ کر سکتا ہے ان خطرناک دروازوں میں سے ایک دروازہ مرد کا عورت سے علیحدگی میں ملنا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرد کو عورت سے علیحدگی میں ملنے سے منع فرما دیا ہے۔ ارشاد نبوی ہے: لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلَّا كَانَ ثَالِثَهُمَا

الشَّیْطَانُ (مشکوٰۃ صفحہ ۲۶۹) کوئی مرد کسی عورت سے تخلیہ میں نہیں ملتا مگر تیسرا شیطان موجود رہتا ہے۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شوہر کے بھائی کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا اَلْحَمْوُ الْمَوْتُ (مشکوٰۃ باب النظرالی المخطوبہ ص ۲۶۸) یعنی شوہر کا بھائی موت ہے۔

سفر: عورت کو بعض اوقات سفر حج' والدین کی ملاقات' عیادت اور تعزیت اور دیگر ضروری حاجتوں کے لیے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ اسلام نے فتنوں سے بچنے کے لیے معیت محرم کی شرط لگا دی۔ ارشادِ نبوی ہے: لایحل لا مراۃ ان تحج الامع زوج او محرم کسی عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ خاوند یا کسی محرم کے بغیر حج کرے (معجم طبرانی) یہاں پردہ اور دوسرے تحفظات کے متعلق دان ہمر اور ہملٹن کے تاثرات درج کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔

دان ہمر کہتا ہے:۔

پردہ کو اسلام نے ضروری اور عورتوں کو اجنبیوں سے میل جول رکھنے کو جو حرام کر دیا ہے اس کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ عورتوں سے اعتماد کے جذبہ کو فنا کر دیا جائے بلکہ یہ ایک وسیلہ ہے ان کے ناموس کی حفاظت و احترام کا ایک اور ذریعہ ہے۔ ان کی رسوائی کی روک تھام کا درحقیقت اسلام کی نظر میں عورت کا درجہ و مقام ہے وہ یقیناً قابل رشک ہے۔ (بحوالہ اسلام کا نظام حیات مصنفہ عبدالوہاب ظہوری ص ۱۵۰)

ہملٹن کہتا ہے:۔

''اسلامی احکام عورت کی شان میں نہایت صریح ہیں جو اس کی عزت افزائی کو برقرار رکھنے اور اس کی بے حرمتی و ایذا رسانی سے محفوظ رکھنے کی طرف خاص توجہ دلاتے ہیں۔ اسلام نے پردہ کے باب میں تنگ نظری سے کام نہیں لیا۔ جیسا کہ بعض مصنفوں کا خیال ہے بلکہ اس سے غیرت و مروت کے اسباب کا لحاظ رکھا۔'' (بحوالہ اسلام کا نظام حیات مصنفہ عبدالوہاب ظہوری ص ۱۴۹)

تعزیری قانون: عفت اور عصمت کو محفوظ رکھنے کے لیے ان تمام محرکات اور اسباب کا خاتمہ کرنے کے بعد اگر عورت اور مرد زنا کے مرتکب ہوتے ہیں تو ان کے لیے سو کوڑے کی سزا مقرر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:۔ اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْکُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْیَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (النور:۲) زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اور ان پر مہربانی اللہ کے حکم کی تعمیل سے نہ روکے اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہو۔ اور چاہیے کہ ان کی سزا کے وقت مومنوں کی ایک جماعت موجود ہو۔

اگر لونڈیاں زنا کی مرتکب ہوں تو ان کی اس سے نصف سزا ہوگی: فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَیْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَی الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ (النساء۴:۲۵) پھر جب وہ نکاح میں لائی جائیں اور اگر بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان کے لیے آزاد عورتوں کی سزا سے آدھی سزا ہے۔

حد قذف: قذف کے معنی ہیں کسی پر جھوٹی تہمت لگانا چونکہ اس سے ایک شریف عورت بدنام ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے شریعت نے اس کی بھی سزا مقرر کر دی ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَّ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (النور:۴) اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ نہ لائیں تو انھیں اسی کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو اور وہ نافرمان ہیں۔

قانونی حقوق

طلاق: ازدواجی زندگی میں بعض ایسے مواقع آتے ہیں کہ جب میاں بیوی پُرسکون ماحول میں اکٹھی زندگی بسر نہیں کر سکتے اور اکٹھے رہنے سے مختلف قسم کے اخلاقی معاشرتی ،فاسد پیدا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں اسلام نے مرد کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ عورت کو طلاق دے دے۔ ارشاد الٰہی ہے: لَاجُنَاحَ عَلَیْکُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (البقرہ۲:۲۳۶) تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو۔

طلاق کے احکام پہلے گزر چکے ہیں۔ اس وجہ سے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔

اخلاقی حقوق

خندہ پیشانی سے پیش آنا: شادی کا ایک اہم مقصد تسکین قلب ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْهَا

وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (روم ۳۰:۲۱) اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہارے لیے تمہارے نفسوں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے تسکین پاؤ اور تمھارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو فکر کرتے ہیں۔

یہ آیت اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتی ہے کہ بیوی کا یہ فرض ہے کہ خاوند جب گھر میں داخل ہو تو اس کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرے۔ محبت بھرے لہجہ میں اس کا حال دریافت کرے۔ اس طریقہ سے مرد کی دن بھر کی تھکاوٹ اور پریشانی ایک لحظہ میں غائب ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے بہترین عورت کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: التی تسرہ اذا نظر (مشکوٰۃ) جب خاوند کی نگاہ بیوی پر پڑے تو اس کو خوش کر دے۔

ہٹ دھرمی سے اجتناب: ہٹ دھرمی اور ضد اور بات بات پر آگ بگولا ہو جانا رشتہ مودت کو جلا کر رکھ دیتا ہے۔ اس وجہ سے اگر عورتوں کے لیے یہ ضروری امر ہے کہ وہ خاوند کا خندہ روئی سے خیر مقدم کریں تو اس کے لیے یہ امر اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ وہ ان تمام امور سے اجتناب کریں جو رشتہ مودت کو ختم کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔ بیوی کا اپنے رویہ کو درست رکھنے اور ہٹ دھرمی سے باز رہنے کے متعلق ارشاد الٰہی ہے: فَالصّٰلِحٰتُ (النساء ۴:۳۴) پس جو نیک روش اختیار کرنے والی عورتیں ہیں۔

صبر اور تحمل سے کام لینا: ازدواجی زندگی میں ایسے مواقع بھی آ جاتے ہیں جب کہ خاوند زیادتی پر اتر آتا ہے۔ گو اسلام نے مردوں کو عورتوں پر زیادتی کرنے سے سختی سے منع کیا ہے لیکن اگر پھر بھی اگر خاوند کی طرف سے زیادتی اور تشدد ہو تو عورت کے لیے یہ امر لازمی ہے کہ صبر و تحمل سے کام لے۔ صلح اور آشتی کی طرف ہاتھ بڑھائے تاکہ عمر بھر کی ازدواجی رفاقت کا رشتہ ٹوٹ نہ جائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (النساء ۴:۱۲۸) اور ایک عورت کو اپنے خاوند کی زیادتی یا بے رغبتی کا ڈر ہو تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ آپس میں صلح کر لیں اور صلح اچھی چیز ہے۔

زیبائش و آرائش اختیار کرنا: مرد طبعی طور پر بیوی کے زیبائش و آرائش کو پسند کرتا ہے۔ اس وجہ سے بیوی کا یہ فرض ہے کہ زینت اختیار کرے تاکہ اس میں قوت جذب بڑھے اور خاوند اس کی طرف زیادہ مائل ہو۔ عہد نبوی اور عہد صحابہ کرام میں عورتیں اپنے خاوندوں کو خوش رکھنے میں بے حد کوشش کیا کرتی تھیں۔ حضرت عائشہ کا یہ واقعہ ہے کہ ایک دن اپنے ہاتھوں میں چاندی کے چھلے پہنے ہوئے تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان چھلوں کو دیکھ کر فرمایا عائشہ یہ کیا ہے۔ جواب دیا آپ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پہنے ہیں۔ (اسوہ صحابہ ج ۲ صفحہ ۲۵۲)

حضرت خولا ہر روز اپنے شوہر کے لیے آراستہ پیراستہ ہو جاتی تھیں۔ (اسوہ اصحابہ ج ۱ ص ۲۵۲) ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے حضرت عثمانؓ بن مظعون کی بیوی کو زینت کے لباس سے عاری دیکھا تو انھوں نے دریافت کیا۔ کیا عثمان سفر پر گئے ہوئے ہیں۔ (مسند احمد)

حضرت امام شوکانی نیل الاوطار میں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہ کا تعجب سے دریافت کرنا یہ ظاہر کرتا ہے۔ بیویوں کو اپنے شوہروں کے لیے زیبائش و آرائش اختیار کرنا پسندیدہ ہے۔

شکر گزاری: عورتوں کا اپنے خاوندوں کے احسانات کی شکر گزاری کرنا نہایت ہی اہم فریضہ ہے کیونکہ شکر گزاری محبت کے جذبے کو ابھارتی ہے۔ اور ناشکر گزاری جذبہ نفرت کو بھڑکاتی ہے۔ بخاری میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علی وسلم نے خطبہ عید میں عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا: اے عورتوں کی جماعت صدقہ کرو کیوں کہ میں نے تمھیں دوزخ میں مردوں کی نسبت زیادہ تعداد میں دیکھا ہے۔ ایک عورت بول اٹھی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا کیوں ہوا؟ تو آپ نے جواب دیا۔ تکفرن اللعنة و تکثرن العشیرہ تم لعنت زیادہ کرتی ہو اور خاوندوں کی ناشکری کرتی ہو۔

حقوق والدین

حقوق والدین کی اہمیت: والدین معاشرہ کی اصل ہیں۔ اگر یہ اصل مضبوط اور صحیح سلامت رہے تو معاشرہ کا درخت سرسبز اور مثمر رہے گا۔ اس وجہ سے ہر مذہب اور ہر قوم میں والدین کی عظمت مسلمہ ہے۔ شاید ہی دنیا میں کوئی ایسی قوم ہو جو والدین کی عظمت کی معترف نہ ہو۔ والدین اللہ کی صفت ربوبیت کے مظہر ہوتے ہیں۔

بائبل میں والدین کے احترام کے باب میں آتا ہے:۔

تو اپنے والدین کو عزت دے (خروج ۱۲:۲۰) ہر ایک اپنے ماں اور باپ سے ڈرتا ہے (احبار ۳:۱۹)

جو کوئی ماں باپ پر لعنت کرے وہ مار ڈالا جائے گا۔ (احبار ۹:۲۰)

اسلام نے والدین کے حقوق کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔

والدین کا مقام: اسلام نے والدین کو عزت و احترام کے بلند مقام پر کھڑا کیا ہے۔ اتنا بلند مقام کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے عبادت کرنے اور شرک سے باز رہنے کا حکم دیا ہے وہاں والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی تعلیم دی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (البقرہ ۸۳:۲) اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ سوائے اللہ کے تم کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (بنی اسرائیل ۲۳:۱۷) اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ سے نیکی کرو حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں ہجرت اور جہاد پر بیعت کرنا چاہتا ہوں پوچھا کیا اللہ تعالیٰ سے اجر چاہتے ہو اور تمھارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے عرض کیا ہاں دونوں زندہ ہیں پس فرمایا جاؤ ان کی خدمت کرو۔ (مسلم کتاب البر والصلۃ والادب باب بر الوالدین وانھما احق بہ)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ذلیل ہو گیا وہ شخص ذلیل ہو گیا وہ شخص ذلیل ہو گیا وہ شخص عرض کیا گیا یا رسول اللہ کون۔ فرمایا جس نے ماں باپ میں سے ایک کو یا دونوں کو بڑھاپے میں پایا اور پھر جنت میں داخل نہ ہوا۔ (مشکوٰۃ المصابیح باب البر والصلۃ صفحہ ۴۱۸)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا رب کی رضا والد کی رضا میں ہے اور رب کی ناراضی والد کی ناراضی میں ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح باب البر والصلۃ صفحہ ۴۱۸) ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم والدین کا اولاد پر کیا حق ہے۔ فرمایا وہ تیری جنت اور تیری دوزخ ہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح باب البر والصلۃ صفحہ ۴۱۸)

معاشرتی حقوق

احسان کرنا: وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسَانًا حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (الاحقاف ۱۵:۴۶) اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ نیکی کا تاکیدی حکم دیا ہے۔ اس کی ماں نے اسے تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور اسے تکلیف سے جنا اور اس کا حمل میں رکھنا اور دودھ چھڑانا تیس مہینے تک ہے۔ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (النساء) اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا (عنکبوت ۸:۲۹) ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ نیکی کا حکم دیا ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (الانعام ۱۵۱:۶) کہہ آؤ میں تم کو پڑھ کر بتاؤں کہ تمھارے رب نے تم پر کیا حرام کیا ہے۔ یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ کام کون سا ہے۔ آپ نے فرمایا وقت پر نماز پڑھنا پوچھا پھر کون سا ہے۔ فرمایا والدین کے ساتھ نیکی کرنا۔ پوچھا اس کے بعد فرمایا اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔ (بخاری کتاب الاداب باب وصینا الانسان بوالدیہ)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر جہاد کی اجازت طلب کی۔ آپ نے پوچھا تمہارے والدین زندہ ہیں فرمایا جاؤ انہی کی خدمت کا فریضہ جہاد ادا کرو۔ (مسلم کتاب البر وصلۃ والآداب باب الوالدین انہما احق بہ)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے۔ فرمایا تمہاری ماں۔ بولا پھر کون فرمایا تیری ماں بولا پھر کون فرمایا تیری ماں بولا پھر کون فرمایا تیرا باپ۔ (مشکوٰۃ المصابیح باب البر والصلۃ صفحہ ۴۱۸)

شکر گزاری: دنیا میں انسان کے سب سے بڑے محسن والدین ہیں۔ بچہ ابھی ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے۔ تو وہ اپنے خون سے اس کی پرورش کرنا شروع کر دیتی ہے۔ جب بچہ اس دنیا میں سانس لیتا ہے تو چھاتیوں سے دودھ پلا کر اس کو پالتی ہے ذرا تکلیف ہو جائے۔ ساری رات دکھ اور درد سے آنکھوں میں کاٹتی ہے۔ دردیوں محسوس کرتی ہے گویا وہ خود بیمار ہے۔ اپنا آرام اپنی خوشی اپنی امید سب بچے کی خوشیوں پر قربان کر دیتی ہے۔ یہ سب کچھ بے غرض محبت سے کرتی ہے۔ دل کے کسی گوشہ میں بھی حرص اور طمع نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے اولاد کا یہ فرض ہے کہ والدین کے شکر گزار رہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اَنِ اشْكُرْلِيْ وَلِوَالِدَيْكَ (لقمان ۱۴:۳۱) میرا شکر گزار اور اپنے ماں باپ کا بھی۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے لوگو تم اپنے باپ سے بیزار مت ہو کیوں کہ باپ سے بیزار ہونا ناشکر گزاری ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الفرائض)

والدین کا ادب: قرآن مجید میں آتا ہے: فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (بنی اسرائیل ۲۳:۱۷) تو ان کو اُف تک نہ کہہ اور نہ ان کو ڈانٹ ان دونوں سے ادب سے بات کر۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپس کے لڑائی جھگڑے میں ایک دوسرے کو گالی گلوچ دینے سے منع فرمایا کیونکہ ایک آدمی جب دوسرے آدمی کو گالی دے گا تو لازمی طور پر دوسرا شخص جواباً اس کو بھی گالی دے گا تو اس طرح وہ والدین کی توہین اور بے ادبی کے مرتکب ہوں گے: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْكَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَيْهِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ يَشْتِمُ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ قَالَ نَعَمْ يَسُبُّ اَبَا الرَّجُلِ فَيَسُبُّ اَبَاهُ وَيَسُبُّ اُمَّهُ فَيَسُبُّ اُمَّهُ (مشکوٰۃ المصابیح باب البر والصلۃ صفحہ ۴۱۸) حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا سب سے بڑا گناہ یہ ہے۔ کوئی اپنے ماں باپ کو گالی دے۔ لوگوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول کیا کوئی اپنے والدین کو بھی گالی دے سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں کہ کوئی کسی کے باپ کو گالی دے اور وہ اس کے باپ کو گالی دے اور وہ اس کی ماں کو گالی دے تو یہ اس کی ماں کو گالی دے۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے ایک دفعہ دو آدمیوں کو دیکھا ایک سے پوچھا یہ دوسرے تمہارے کون ہیں اس نے کہا یہ میرے والد ہیں آپ نے فرمایا دیکھو نہ ان کا نام لینا نہ کبھی ان سے آگے چلنا اور نہ کبھی ان سے پہلے بیٹھنا۔

ایک دفعہ حضرت عبداللہ نے ابن عباسؓ سے پوچھا کیا آپ چاہتے ہیں کہ جہنم سے دور رہیں اور جنت میں داخل ہوں۔ ابن عباس نے کہا کیوں نہیں 'خدا کی قسم یہی چاہتا ہوں۔ حضرت ابن عمرؓ نے پوچھا آپ کے والدین زندہ ہیں۔ ابن عباس نے کہا ہاں میری والدہ زندہ ہیں۔ ابن عمرؓ نے فرمایا اگر آپ ان کے ساتھ نرمی سے بات چیت کریں اور ان کے کھانے پینے کا خیال رکھیں تو آپ ضرور جنت میں جائیں گے۔ بشرطیکہ کبیرہ گناہ سے بچتے رہیں۔

عاجزی اور انکساری سے پیش آنا: قرآن مجید میں آتا ہے: وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (بنی اسرائیل ۲۴:۱۷) اور ان دونوں کے آگے رحم کے ساتھ عاجزی کا بازو جھکا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اطاعت: اولاد پر خلاف شرع بات کے علاوہ ہر امر میں والدین کی فرمانبرداری فرض ہے۔ ارشاد ہے: وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَاِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (عنکبوت ۸:۲۹) اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ سے نیکی کرنے کا تاکیدی حکم دیا ہے اور وہ تجھ پر زور دیں کہ تو میرے ساتھ دوسروں کو شریک کرے جس کا تجھے علم نہیں تو ان کی بات نہ مان تمھیں میری طرف لوٹ کر آنا ہے۔ پس میں تمھیں بتاؤں گا جو تم کرتے تھے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے والدین کی نافرمانی کو کبیرہ گناہ قرار دیتے ہوئے فرمایا: كُلُّ الذُّنُوْبِ يَغْفِرُ اللّٰهُ مِنْهُ مَا شَآءَ اِلَّا عُقُوْقَ الْوَالِدَيْنِ فانه يعجل لِصَاحِبِهٖ فِي الْحَيَاةِ قَبْلَ الْمَمَاتِ۔ (مشکوٰۃ المصابیح باب البر والصلۃ ص ۴۱۸) اللہ سب گناہوں کو بخش دیتا ہے سوائے والدین کی نافرمانی کے۔ وہ اس کے مرتکب کو مرنے سے پہلے اس دنیا میں ہی سزا دے دیتا ہے۔

''میں تم کو سب سے بڑا گناہ نہ بتاؤں صحابہ نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! فرمایا خدا کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی آپؐ ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ اٹھ بیٹھے اور فرمایا ہاں جھوٹی بات اور جھوٹی شہادت اور اس کو بار بار دہراتے رہے۔ حتیٰ کہ مجھے خیال ہوا کہ آپ سکوت نہ فرمائیں گے۔ (بخاری کتاب الادب حقوق الوالدین من الکبائر)

حضرت ابو درداءؓ انصاری کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ کو نو چیزوں کی وصیت کی تھی کسی چیز کو خدا کا شریک نہ ٹھہرانا' خواہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جاؤ' جلا دیے جاؤ' فرض نمازیں نہ چھوڑنا' جو عمداً نماز چھوڑے گا اس سے میں بری الذمہ ہوں' شراب نہ پینا کہ وہ ہر برائی کی کنجی ہے' والدین کی اطاعت کرنا حتیٰ کہ اگر وہ دنیا چھوڑ دینے کو کہیں تو ان کے لیے دنیا چھوڑ دینا۔ (ادب المفرد باب بروالدیہ مالم یکن معصیہ)

ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں ہجرت کی بیعت کرنا چاہتا ہوں اور ماں باپ کو روتا چھوڑ کر آیا ہوں فرمایا واپس جاؤ جس طرح ان کو رلایا ہے اسی طرح ہنساؤ۔ (ادب المفرد باب بروالدیہ سالم یکن معصیہ)

قرآن مجید میں والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری کا واقعہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی قَالَ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ (الصافات ۳۷:۱۰۲) جب وہ اس کے ساتھ کام کاج کی عمر کو پہنچا اس نے کہا اے میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کرتا ہوں تو دیکھ تیری کیا رائے ہے۔ اس نے کہا اے میرے باپ جو کچھ تجھے حکم دیا جاتا ہے کر تو مجھے اگر اللہ چاہے صبر کرنے والوں میں سے پائے گا۔

یہ کامل فرمانبردار بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رویاء دیکھا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ باپ نے اپنے بیٹے کو رویاء بتائی تو بغیر کسی ہچکچاہٹ اور دلیل بازی کے بیٹے نے اپنی گردن ذبح ہونے کے لیے زمین پر رکھ دی۔

صحابہؓ کا نمونہ: حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میرے عقد نکاح میں ایک عورت تھی جسے میں بہت پسند کرتا تھا اور میرے والد حضرت عمرؓ اس سے ناخوش تھے انھوں نے مجھے اس کو طلاق دینے کے لیے کہا میں نے انکار کر دیا اس پر حضرت عمرؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ بیان کر دیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اسے طلاق دے دو۔ (ترمذی' ابو داؤد)

والدین کے اقارب اور دوستوں سے حسن سلوک: اسلام والدین کے اقرباء اور ان کے دوستوں سے نیک سلوک کی تعلیم دیتا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھ سے ایک بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے اب اس سے توبہ کا کوئی راستہ ہے۔ آپ نے پوچھا تمہاری ماں زندہ ہے۔ انھوں نے کہا نہیں پوچھا خالہ زندہ ہے اس نے کہا ہاں آپؐ نے فرمایا کہ اس کے ساتھ نیکی کرو۔ (ترمذی کتاب البر والصلۃ)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے کہ سب سے بڑی نیکی اولاد کا اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک ہے۔ (مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب باب فضل صلۃ اصدقا الاب والام نحوہما)

آئینی حقوق

نفقہ: والدین پر خرچ کرنا اور ان کی ضروریات کو پورا کرنا والدین کا پرورش کرنے کا حق ادا کرنا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ (البقرہ ۲:۲۱۵) تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہو جو کچھ بھی اچھے مال سے خرچ کرو وہ ماں باپ کے لیے ہے۔

حدیث میں آتا ہے: عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصَ اَنَّهٗ اَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِیْ مَالاً وَّ وَالِدَیْنِ وان اَبِی یُحْتَاجُ اِلٰی مَالِی فَقَالَ اَنْتَ وَمَالُکَ لِاَبِیْکَ. (مشکوٰۃ المصابیح البر والصلۃ صفحہ ۴۱۸) حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے پاس مال ہے اور صاحب اولاد بھی ہوں اور میرا باپ میرے مال کی حاجت رکھتا ہے آپ نے فرمایا تو اور تیرا مال تیرے باپ کی متاع ہے۔

حضرت عمرو بن شعیب سے روایت ہے۔ انھوں نے اپنے والد سے اور انھوں نے ان کے دادا سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میرے پاس مال ہے اور میرا والد بھی ہے جسے میرے مال کی حاجت ہے فرمایا تو اور تیرا مال تیرے والد کی متاع ہے۔ اس لیے کہ تمہاری اولاد تمہاری بہترین کمائی ہے تم اپنی اولاد کی کمائی میں کھاؤ۔ (مشکوٰۃ المصابیح باب النفقات وحق المملوک)

والدین کا نفقہ اولاد کے ذمہ ہے اگر اولاد اس بارے میں کوتاہی کرے تو والدین عدالت کے ذریعہ خرچہ لے سکتے ہیں حضرت عمرؓ کے عہد کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے لڑکے کے مال سے تعرض کیا تو اس نے حضرت عمرؓ کے پاس مقدمہ دائر کیا۔ حضرت عمرؓ نے فیصلہ دیا اَنْتَ وَمَالُکَ لِاَبِیْکَ تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔

میراث: قرآن مجید میں آتا ہے: لِاَبَوَیْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اور اس کے ماں باپ کے لیے دونوں سے ہر ایک کے لیے اس کا چھٹا حصہ ہے جو چھوڑا ہے۔

بیوہ کی حرمت: خاوند کے مرجانے کے بعد بیوہ روئے زمین پر سب سے زیادہ رحم اور حسن سلوک کی مستحق ہوتی ہے مختلف زمانوں میں بیواؤں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا جاتا رہا ہے۔ اسے انسانی حقوق سے محروم رکھا جاتا۔ اسے منحوس سمجھ کر عضو معطل کی طرح سوسائٹی سے باہر پھینک دیا جاتا۔ نہ انھیں کسی دعوت میں مدعو کیا جاتا نہ کسی خوشی کی تقریب پر بلایا جاتا۔ ہندوؤں میں تو اسے شوہر کی لاش کے ساتھ ہی جل مرنے کے لیے مجبور کیا جاتا۔ بعض مذہب میں دوسری شادی کرنے کی اجازت حاصل نہ تھی۔

اسلام نے بیواؤں کو سوسائٹی میں ایک عزت کے مقام پر کھڑا کیا ہے اور ان کے حقوق کی نگہداشت کی تعلیم دی ہے۔

نکاح کی اجازت: قرآن مجید میں ارشاد ہے: وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ (النور۲۴:۳۲) اور تم میں سے جو عورتیں بیوہ ہیں ان کا نکاح کرو۔

میراث نہ سمجھو: عرب میں کسی آدمی کے مرجانے کے بعد اس کی بیویاں اولاد میں ورثہ کے طور پر تقسیم ہوتی تھیں۔ اسلام نے اس رسم کو ختم کرتے ہوئے کہا کہ بیواؤں کو اپنی میراث نہ سمجھو ارشاد الٰہی ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا (النساء۴:۱۹) اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمھارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم زبردستی (بیوہ) عورتوں کو اپنی میراث بنالو۔

مال ہتھیانے سے احتراز: وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ (النساء۴:۱۹) اور تمھارے لیے یہ بات جائز نہیں کہ تم انھیں تنگ کر کے ان کا وہ مال لے لو جو تم انھیں دے چکے ہو۔

خبر گیری کرنا: حضرت صفوان بن سلیمؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا بیوہ اور مسکین کی خبر گیری کرنے والا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے یا دن کو روزہ رکھنے والے اور رات کو نماز کے لیے کھڑا رہنے والے کی مانند ہے۔ (صحیح ترمذی ابواب البر والاحسان)

اخلاقی حقوق

دُعا: قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۲۴) میرے رب تو ان پر رحم کر جس طرح انھوں نے مجھے چھوٹے ہوتے پالا۔ رَبَّنَا اغْفِرْلِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ (ابراہیم ۱۴:۴۱) اے میرے رب مجھے بخش دینا میرے باپ کو اور مومنوں کو بھی جس دن حساب قائم ہوگا۔

ایک مرتبہ بنی سلمہ کے ایک شخص نے آپؐ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی ایسی نیکی ہے جو ماں باپ کی موت کے بعد ان کے ساتھ کرسکوں فرمایا ان کے لیے دعا کرو ان کی مغفرت چاہو ان کے بعد ان کے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کرو ان کے اعزہ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ ان کے دوستوں کا احترام کرو۔ (ابوداؤد کتاب الادب فی برالوالدین)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کسی بندے کے والدین یا ان میں سے ایک مرجاتا ہے اور وہ ان کا فرمانبردار ہوتا ہے۔ پھر وہ ان کے لیے دعا اور استغفار کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس کو سعادت مندوں میں سے لکھتا ہے۔ (بیہقی)

محبت: اسلام والدین کے ساتھ احسان، انکساری اور ادب کے ساتھ پیش آنے کی ہی تعلیم نہیں دیتا بلکہ والدین کے بلند ترین قیام کے پیش نظر اس بات کی بھی تلقین کرتا ہے کہ ان کے ساتھ ظاہراً اچھا سلوک کرنے کے ساتھ دل کی گہرائیوں میں ان کے لیے محبت رکھے۔ حدیث میں ہے: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَامِنْ وَلَدٍ بَارٍّ يَنْظُرُ اِلٰى وَالِدَيْهِ نَظْرَةَ رَحْمَةٍ اِلَّا كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ بِكُلِّ نَظْرَةٍ حَجَّةً مَبْرُوْرَةً قَالُوْا وَاِنْ نَظَرَ كُلَّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ قَالَ نَعَمْ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَاَطْيَبُ۔ (مسلم) حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو نیک لڑکا اپنے والدین کو محبت بھری نگاہ سے دیکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ہر نگاہ کے عوض ایک حج مقبول کا ثواب لکھتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اگرچہ دن میں سو مرتبہ دیکھے فرمایا ہاں! خدا بزرگ تر اور پاک تر ہے۔

حقوق اولاد

حقوق والدین تو ہر مذہب نے تسلیم کیے ہیں اور ان کی ادائیگی پر زور دیا ہے لیکن یہ کسی مذہب نے تعلیم نہیں دی کہ والدین پر اولاد کے کیا حقوق ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض قوموں میں اولاد کو قتل کر دینا کوئی جرم خیال نہیں کیا جاتا تھا روما کے قانون میں باپ کو اولاد کو مار ڈالنے کا پورا اختیار تھا۔ (لیکی کی تاریخ یورپ ج اول ص ۲۲)

عرب میں اولاد کشی کی رسم رائج تھی۔ راجپوتوں میں دختر کشی کی عام رسم تھی۔ اسلام نے جہاں والدین کے حقوق متعین کیے ہیں اور ان کی ادائیگی معاشرہ کے لیے ضروری ہے اسی طرح اولاد کے حقوق مقرر کر دیے ہیں۔

اسلام میں اولاد کا مقام: اسلام اولاد کو آنکھ کی ٹھنڈک قرار دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَكُلِىْ وَاشْرَبِىْ وَقَرِّىْ عَيْنًا (مریم ۱۹:۲۶) پس تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت دیا تھا۔

اولاد کی آرزو: قَالَ رَبِّ اِنِّىْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّىْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا وَاِنِّىْ خِفْتُ الْمَوَالِىَ مِنْ وَّرَآئِىْ وَكَانَتِ امْرَاَتِىْ عَاقِرًا فَهَبْ لِىْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا يَّرِثُنِىْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا (مریم ۱۹:۴......۶) کہا میرے رب میری ہڈیاں کمزور ہو گئیں اور سر بالوں کی سفیدی سے شعلے مار رہا ہے اور میرے رب تجھ سے دعا کر کے محروم نہیں رہا اور میں اپنے بھائی بندوں سے اپنے پیچھے ڈرتا ہوں اور میری عورت بانجھ ہے سو اپنے پاس سے مجھے کوئی وارث عطا فرما۔ جو میرا وارث ہو اور آل یعقوب کا ورثہ لے اور اے میرے رب اسے پسندیدہ بنا۔

معاشرتی حقوق

پرورش کرنا: اولاد کی پیدائش کے بعد سب سے اہم فریضہ والدین پر ان کی پرورش کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بچہ کی ابتدائی پرورش کے لیے ماں کی چھاتیوں میں دودھ کا انتظام کر دیا ہے تاکہ بچہ پیدا ہوتے ہی اس قدرتی غذا سے پرورش پائے۔ اللہ تعالیٰ نے دودھ پر پرورش پانے کی مدت دو سال مقرر کی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:۔ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (بقرہ۲:۲۳۳) اور مائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔ اس کے لیے جو دودھ پلانے کے زمانہ کو پورا کرانا چاہتا ہے اور جس کا بچہ ہے اس پر اچھے طور پر ان کا کھانا اور ان کا کپڑا ہے۔

عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَنَا وَهُوَ هٰكَذَا وَضَمَّ اَصَابِعَهٗ (مشکوۃ المصابیح باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق صفحہ ۴۲۱) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو قیامت کے دن میرا تعلق اس کے ساتھ (انگلیاں ملا کر فرمایا) اس طرح ہو گا۔

عَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ جَاءَتْنِىْ امْرَاَةٌ مَعَهَا ابْنَتَانِ تَسْئَلُنِىْ فَلَمْ تَجِدْ عِنْدِىْ غَيْرَ تَمْرَةٍ وَّاحِدَةٍ فَاَعْطَيْتُهَا اِيَّاهَا فَقَسَمَتْهَا بَيْنَ ابْنَتَيْهَا وَلَمْ تَاْكُلْ مِنْهَا شَيْئًا ثُمَّ قَامَتْ فَخَرَجَتْ فَدَخَلَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (فَحَدَّثْتُهٗ) فَقَالَ مَنِ ابْتُلِىَ مِنْ هٰذِهِ الْبَنَاتِ بِشَىْءٍ فَاَحْسَنَ اِلَيْهِنَّ كُنَّ لَهٗ سِتْرًا مِّنَ النَّارِ (مشکوۃ المصابیح باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق ص ۴۲۱) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے انھوں نے کہا ایک عورت میرے پاس کچھ مانگنے آئی اور اس کے ہمراہ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ اس نے میرے پاس سوائے ایک کھجور کے کچھ نہ پایا میں نے وہی کھجور اسے دے دی۔ پھر اس نے اسے اپنی بیٹیوں میں تقسیم کر دیا اور اس نے خود کچھ نہ کھایا۔ پھر اٹھ کر باہر چلی گئی۔ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر تشریف لائے اور میں نے آپ کو بتایا تو آپؐ نے فرمایا جوان بیٹیوں کی پرورش کی آزمائش میں ڈالا اور اس نے ان سے اچھا سلوک کیا تو وہ اس کے لیے جہنم کی آگ سے آڑ ہوں گی۔

ابو داؤد میں ہے کہ جس نے تین لڑکیوں کی پرورش اور شادی کی اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا وہ جنت میں داخل ہو گا۔ (ابو داؤد کتاب الادب باب فضل من عال یتیما)

حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے افضل دینار وہ ہے جس کو آدمی اپنے اہل وعیال پر خرچ کرے اور جس کو جہاد کی سواری پر صرف کرے اور جس کو اللہ کی راہ میں اپنے ساتھیوں پر صرف کرے۔ اس روایت کے ایک راوی ابو قلابہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ پہلے آپ نے اہل وعیال کا ذکر کیا اور فرمایا کہ اس شخص سے بڑا اجر کس کو ہوسکتا ہے جو اپنے صغیر السن بچوں پر صرف کرتا ہے اور اس کے ذریعہ ان کو دوسروں کی ضرورت سے مستغنی کردیتا ہے۔ (ترمذی باب ماجاء فی النفقۃ علی الاہل)

روحانی پرورش (تعلیم وتربیت اور ادب سکھانا): جسمانی پرورش کے بعد والدین پر سب سے اہم فریضہ اولاد کی روحانی پرورش ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَیْهَا مَلٰٓىٕكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (تحریم ۶۶:۶) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اس کے اوپر فرشتے مقرر ہیں۔ سخت اور طاقتور اللہ جو حکم انھیں دے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو کچھ حکم ملتا ہے وہی کرتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ما نحل والدولدہ من نحل افضل من ادب حسن (ترمذی ابواب البرو الاحسان) کسی باپ نے اپنے بیٹے کو حسن ادب سے اچھا عطیہ نہیں دیا۔ دوسری روایت ہے آدمی کو اپنی اولاد کو ادب سکھانا ایک صاع خیرات کرنے سے بہتر ہے۔

عقیقہ کرنا: عَنْ سَلْمَانَ بْنِ عَامِرٍ الضَّبِّیِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَعَ الْغُلَامِ عَقِیْقَةٌ فَاَهْرِیْقُوا عَنْهُ دَمًا وَ اَمِیْطُوا عَنْهُ الْاَذٰى. (بخاری)

حضرت سلمان بن عامر ضبی سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا کہ لڑکے کی ولادت کے ساتھ عقیقہ ہے اس کی طرف سے خون بہاؤ اور بالوں وغیرہ کی گندگی اس سے دور کرو۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ وُلِدَ لَهٗ وَلَدٌ فَاَحَبَّ اَنْ یُّنْسِکَ عَنْهُ فَلْیَنْسِکْ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَیْنِ وَعَنِ الْجَارِیَةِ شَاةً (ابو داؤد) حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے ہاں بچہ پیدا ہو۔ تو میں اس بات کو پسند کرتا ہوں اس کی طرف سے قربانی کی جائے لڑکے کی طرف سے دو بکرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرا۔

عدل ومساوات: اولاد کے درمیان عدل ومساوات قائم رکھنا نہایت ہی ضروری ہے۔ بعض اوقات عدل وانصاف کو قائم نہ رکھنا بچوں کے درمیان دشمنی اور والدین کے ساتھ نفرت اور بغض کا سبب بن جاتا ہے جس سے گھر کا امن تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عائلی زندگی کی فضا کو خوشگوار رکھنے کے لیے والدین کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ اولاد کے درمیان عدل ومساوات قائم رکھیں حدیث میں ہے نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ ان کے والد نے اپنے ایک لڑکے کو ایک غلام عطیہ میں دیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گواہ بننے کی درخواست کی۔ آپؐ نے فرمایا جیسا تم نے اپنے اس لڑکے کو ایک غلام دیا ہے کیا ویسا ہی اپنے باقی سب لڑکوں کو بھی دیا ہے۔ انھوں نے کہا یا رسول اللہ نہیں آپؐ نے فرمایا تو اس کو واپس لے لو۔ (ترمذیؒ ابواب الحکام)

نکاح: والدین پہ فرض ہے جب بچہ جوان ہو جائے تو اس کے نکاح کا انتظام کریں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: مَنْ وُلِدَلَهٗ وَلَدٌ فَلْیُحْسِنْ اِسْمَهٗ وَاَدَبَهٗ فَاِذَا بَلَغَ فَلْیُزَوِّجْهُ فَاِنْ بَلَغَ وَلَمْ یُزَوِّجْهُ فَاَصَابَ اِثْمًا فَاِنَّمَا اِثْمُهٗ عَلٰى اَبِیْهِ. جس کے ہاں لڑکا پیدا ہو۔ اسے اس کا اچھا نام رکھنا چاہیے اور جب وہ بالغ ہو جائے تو اس کی شادی کرنی چاہیے اگر وہ بالغ ہو اور اس کی شادی نہ کی اور اس نے گناہ کیا تو اس کا گناہ باپ کے سر پر ہی ہے۔

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ وَاَنَسِ بْنِ مَالِکٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِی التَّوْرَاةِ مَکْتُوْبٌ مَنْ بَلَغَتْ اِبْنَتُهُ اثْنَتَی عَشَرَةَ سَنَةً وَلَمْ یُزَوِّجْهَا فَاَصَابَتْ اِثْمًا فَاِثْمُ ذٰلِکَ عَلَیْهِ. حضرت عمر بن خطابؓ اور حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تورات میں لکھا ہے کہ جس کی بیٹی بارہ برس کی ہوئی اور اس نے اس کی شادی نہ کی اور اس نے گناہ کیا تو اس کا گناہ باپ کے سر پر ہی ہے۔

ابو داؤد میں ہے کہ جس نے تین لڑکیوں کی پرورش اور شادی کی اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا وہ جنت میں داخل ہوگا۔
(ابو داؤد کتاب الادب باب فضل من عال یتیما)

نکاح کرتے وقت لڑکیوں سے اجازت لینا ضروری ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:۔ لَا تُنْکَحُ الْاَیِّمُ حَتّٰى تُسْتَاْمَرَ وَلَا تُنْکَحُ الْبِکْرُ حَتّٰى تُسْتَاْذَنَ (بخاری باب لا ینکح الاب و غیرہ البکر الثیب الا برضا) بیوہ کی شادی اس وقت تک نہ کی جائے جب تک اس کا حکم نہ لے لیا جائے۔ ایک اور حدیث ہے:۔ اَلثَّیِّبُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِیِّهَا وَالْبِکْرُ یَسْتَاْذِنُهَا اَبُوْهَا فِیْ نَفْسِهَا وَاِذْنُهَا صُمَاتُهَا. (مسلم باب استیذان الشیب

بالمنطق والبکر بالسکوت)

بیوہ خود اپنی ذات کی ولی سے زیادہ حق دار ہے اور کنواری کے باپ کو چاہیے کہ نکاح کے بارے میں اس کی اجازت حاصل کرے اور اس کی اجازت اس کا خاموش رہنا ہے۔

آئینی حقوق

نسل کی حفاظت: اولاد کا حق استقرار حمل سے ہی شروع ہو جاتا ہے وہ یہ کہ بغیر طبی ضرورت کے اسقاط حمل گناہ ہے اور قتل اولاد کے زمرہ میں آتا ہے۔ بعض لوگ اپنی غربت کے پیش نظر یہ فعل کر گزرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْآ اَوْلَادَکُمْ خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُھُمْ وَاِیَّاکُمْ اِنَّ قَتْلَھُمْ کَانَ خِطْاً کَبِیْرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۳۱) اور اپنی اولاد کو افلاس کے خوف سے قتل نہ کرو ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تمھیں بھی یقیناً نسل کشی بہت ہی بڑا گناہ ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَاحَرَّمَ رَبُّکُمْ عَلَیْکُمْ اَلاَّ تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَلاَ تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ مِنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَاِیَّاھُمْ وَلاَ تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَاظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ وَلاَ تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلاَّ بِالْحَقِّ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ (الانعام ۶:۱۵۱) کہو آؤ میں پڑھ کر سناؤں جو تمھارے رب نے حرام کیا ہے تم پر واجب ہے کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو ہم تم کو رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی اور بے حیائی کی باتوں کے قریب مت جاؤ جو ان میں سے ظاہر ہوں اور جو چھپی ہوئی ہوں اور اس جان کو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہو قتل نہ کرو۔ سوائے اس کے کہ انصاف چاہتا ہو۔ اس کا تم کو حکم دیتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔

حدیث میں آتا ہے: حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں:۔

قَالَ قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ الذَّنْبِ اَکْبَرُ عِنْدَ اللّٰہِ قَالَ اَنْ تَدْعُوْا لِلّٰہِ نِدًّا وَ ھُوَ خَلَقَکَ قَالَ ثُمَّ اَیُّ قَالَ اَنْ تَقْتُلَ وَلَدَکَ خَشْیَۃَ اَنْ یَّطْعَمَ مَعَکَ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ! اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے۔ فرمایا:۔ کسی کو خدا کا شریک ٹھہراؤ حالانکہ اس نے تم کو پیدا کیا ہے پوچھا پھر کون سا گناہ ہے فرمایا:۔ اولاد کو اس خوف سے قتل کرو کہ وہ تمھارے ساتھ کھائے گی۔

لڑکیوں کے قتل کی ممانعت: عرب میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی ظالمانہ رسم چلی آ رہی تھی۔ بعض قبیلے لڑکی کی پیدائش کو باعث ذلت اور عار سمجھتے تھے۔ اگر کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہو جاتی تو وہ مارے شرم کے باہر نہیں نکلتا تھا۔ وہ یوں سمجھتا تھا کہ کوئی بلائے ناگہانی آ گئی ہے۔ اس ذلت اور عار سے بچنے کے لیے وہ لڑکی زندہ درگور کر دیتا تھا۔ اس کی طرف قرآن مجید میں اشارہ ہے۔ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُھُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْھُہٗ مُسْوَدًّا وَّھُوَ کَظِیْمٌ یَتَوَارٰی مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْءِ مَابُشِّرَبِہٖ اَیُمْسِکُہٗ عَلٰی ھُوْنٍ اَمْ یَدُسُّہٗ فِی التُّرَابِ اَلاَسَآءَ مَایَحْکُمُوْنَ (نحل ۱۶:۵۸) اور جب ان میں سے ایک کو لڑکی کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصہ سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اس خبر کی برائی کی وجہ سے جو اسے دی گئی ہے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے۔ کیا اسے ذلت کے لیے رہنے دے یا اسے مٹی میں گاڑ دے سو وہ بہت برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔

سنن دارمی کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم لوگ جاہلیت کے زمانے میں بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ اولاد کو مار ڈالتے تھے۔ میرے ایک لڑکی تھی جب میں اس کو بلاتا تو وہ دوڑ کر میرے پاس چلی آتی۔ ایک دن میں نے اس کو بلایا وہ خوش خوش میرے پاس چلی آئی اور میرے پیچھے ہولی۔ میں ایک کنوئیں کے پاس پہنچا جو میرے گھر کے قریب ہی تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنوئیں میں گرا دیا۔ وہ ابا ابا کہہ کر پکارنے لگی۔ یہ اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔

یہ واقعہ سن کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنسو رواں ہو گئے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے اس شخص کو ملامت کی کہ تم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غمگین کر دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا اس کو چھوڑ دو اور اس پر جو مصیبت پڑی ہے اس کا علاج پوچھنے آیا ہے اور اس سے دوبارہ اس قصہ کو سنا اور اس قدر روئے کہ آنسو بہہ کر ریش مبارک تک آ گئے۔ پھر فرمایا:۔ جاؤ جاہلیت کے گناہ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیے۔ اب از سرنو عمل شروع کرو۔ (سنن دارمی)

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا حرام کر دیا ہے اور حق کا ترک کرنا ناحق چیزوں کا لینا منع کر دیا ہے اور تمھارے لیے قیل وقال اور کثرت سوال اور اضاعت مال کو ناپسند کیا ہے۔ (بخاری)

حق میراث: اسلام نے باپ کی جائیداد میں اولاد کو شریک ٹھہرایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ (النساء ۴:

۱۱) اللہ تمہاری اولاد کے متعلق تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے۔ مرد کے لیے دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہو۔

تمام جائیداد کو ہبہ کر دینے کی ممانعت: اسلام نے صرف اولاد کو ترکہ میں ہی حصے دار نہیں ٹھہرایا بلکہ والدین کے لیے یہ امر بھی ناجائز قرار دے دیا کہ وہ ساری جائیداد وفات سے قبل ہبہ کر دیں۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص صاحب ثروت صحابی تھے ان کے صرف ایک ہی لڑکی تھی وہ ایک مرتبہ اتنے شدید بیمار ہوئے کہ بچنے کی امید جاتی رہی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے تو انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرے پاس دولت ہے اور میری وارث صرف ایک لڑکی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ دو تہائی مال کی وصیت کر جاؤں آپؐ نے فرمایا نہیں۔ سعد نے عرض کیا اچھا نصف مال کی وصیت کر دوں۔ فرمایا نہیں۔ صرف ایک تہائی کی وصیت کر سکتے ہو اور ایک تہائی بھی بہت ہے۔ اپنے بعد اپنے ورثا کو خوشحال چھوڑ جانا اس امر سے بہتر ہے کہ ان کو محتاج چھوڑ جاؤ اور دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ (مسلم باب الوصیۃ بالثلث)

اخلاقی حقوق

اچھا نام رکھنا: بچے کی ولادت کے بعد اس کا نام ایسا رکھا جائے جو اسلامی عقائد اور اسلامی تہذیب کی عکاسی کرتا ہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ اِنَّ اَحَبَّ الْاَسْمَاءِ کُمْ اِلَی اللّٰہِ عَبْدُ اللّٰہِ وَعَبْدُ الرَّحْمَانِ (رواہ مسلم ومشکوٰۃ المصابیح باب الاسامی صفحہ ۴۰۰)

اللہ کو زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمان ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے۔ انھوں نے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے برا اور کم بخت نام اس شخص کا ہوگا جو ملک الملوک کہلائے گا۔ (مشکوٰۃ المصابیح باب الاسامی صفحہ ۴۰۷)

حضرت شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی اچھے نام رکھنے کی فلاسفی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ معلوم ہونا چاہیے کہ شریعت کے اہم اور عظیم ترین مقاصد میں سے ایک یہ مقصد بھی ہے کہ تمام ارتفاقات ضروریہ اور تدابیر معاشیات و اقتصادیات میں ذکر الٰہی شامل کر دیا جائے اور اسے دوچند کر دیا جائے تاکہ یہ امور بھی دعوت اسلام کی زبان بن کر حق کی دعوت دیں اور نومولود بچے کو عبداللہ اور عبدالرحمٰن سے موسوم کرنا اور حقیقت اسے توحید سے آگاہ و باخبر کرنا اور توحید آشنا بنانا ہے۔ نیز اہل عرب اور دیگر ممالک کے باشندے اپنی اولاد کا نام ان لوگوں کے نام سے رکھتے تھے جن کی وہ لوگ عبادت و پرستش کیا کرتے تھے چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا مقصد ہی مراسم توحید قائم کرنا تھا اس لیے لازم وضروری ہے کہ نام رکھنے میں سنت و توحید اور طریق توحید کا اعتبار اور لحاظ رکھا جائے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ صفحہ ۳۹۱)

حسن سلوک سے پیش آنا: محبت اور سلوک بچے کے کردار اور ذہنی قویٰ کو جلا دیتا ہے اور اخلاق اور نفسیاتی بیماریوں کو دور کرتا ہے۔ اس وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچوں سے حسن سلوک اور محبت سے پیش آنے کی تعلیم دی ہے۔ فرماتے ہیں: مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا فَلَیْسَ مِنَّا (مشکوٰۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق) جو چھوٹے پر رحم نہیں کرتا اور بڑے کی توقیر نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

حدیث شریف میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کے واقعات محفوظ ہیں۔ حضرت فاطمہؓ جب آپ کی خدمت میں آتیں تو ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاتے اور اپنے پہلو میں بٹھاتے ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے۔ جب سفر میں جاتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہؓ سے رخصت ہوتے اور جب واپس آتے تو سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ سے ملتے۔ (یہ تمام واقعات فضائل فاطمہ میں ہیں)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے نواسوں حضرت حسنؓ حضرت حسینؓ اور اپنی نواسی حضرت امامہ سے جو پیار تھا۔ وہ مسلمانوں کے لیے اولاد سے پیار کرنے میں مشعل راہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اقرع بن حابس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت حسنؓ کا بوسہ لیتے دیکھا اور ابن عمر کہتے ہیں کہ حضرت حسن اور حضرت حسین کا بوسہ لیتے دیکھا اور اقرع بن حابس نے کہا کہ میرے دس بیٹے ہیں میں نے ان میں سے کسی ایک کا بھی بوسہ نہیں لیا۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص رحم نہیں کرتا۔ اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔ (ترمذی باب البر والاحسان)

آپ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کی ایک صغیر السن بچی امامہ تھیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سے اتنی محبت تھی کہ کبھی کبھی مسجد میں ساتھ لے آتے اور گود میں لیے ہوئے نماز ادا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ امامہ کو کندھے پر بٹھائے ہوئے مسجد میں تشریف لائے اور اس حالت میں نماز پڑھائی۔ جب رکوع

میں جاتے تھے تو اتار دیتے تھے اور جب کھڑے ہوتے تو پھر اٹھا لیتے۔ (بخاری اذا حمل جاریۃ صغیرۃ علی عنقہ فی الصلوٰۃ)

عفو اور درگزر کرنا: بچے کم علمی اور کم تجربہ اور کم عقل کی وجہ سے شرارتیں کرتے رہتے ہیں ان کو معاف کر دینا چاہیے۔ ارشادِ الٰہی ہے: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (التغابن ۶۴:۱۴) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تمہاری بیویوں میں سے اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں سو ان سے بچتے رہو اور اگر تم معاف کرو اور درگزر کرو اور بخش دو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

بیٹی سے پیار اور محبت: عرب اور بعض دوسری قومیں بیٹی کی ولادت کو عار اور ننگ سمجھتی تھیں۔ اس وجہ سے قرآن مجید نے بیٹی کے متعلق خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ ان سے محبت اور حسن سلوک سے پیش آنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ عربوں کی بیٹیوں سے نفرت کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید میں فرماتا ہے:۔ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (النحل ۱۶:۵۷'۵۸) اور اللہ کے لیے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں وہ پاک ہے اور ان کے لیے ہے جو وہ چاہتے ہیں اور جب ان میں سے ایک کو لڑکی کی خبر دی جاتی ہے۔ اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصہ سے بھرا ہوتا ہے۔

چہرہ کے سیاہ ہو جانے سے مراد غم اور نفرت کا پیدا ہونا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ انھوں نے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس کے ہاں بیٹی پیدا ہو پس وہ نہ تو اسے زندہ درگور کرے اور نہ ذلت کی حالت میں رکھے اور نہ بچوں کو اس پر ترجیح دے تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ (ابو داؤد)

معاشرہ کے بقیہ اجزائے ترکیبی اور ان کے حقوق و فرائض

رشتے داروں کے حقوق

معاشرے کے اور بھی عناصر ترکیبی ہیں۔ جن کے ملنے سے معاشرہ تشکیل ہوتا ہے۔ انسان اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے دوسرے انسانوں خاص طور پر رشتہ داروں کا بہت ہی محتاج ہے۔ یہ احتیاج اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ ایک دوسرے کے حقوق متعین کیے جائیں۔ پھر ہر ایک ان متعینہ حقوق و فرائض کی نگہداشت کرے۔

حقوق و فرائض کی نگہداشت اور حفاظت ہی معاشرہ کو بنیان مرصوص بناتی ہے۔ اگر ان حقوق کی حفاظت نہ کی جائے تو سوسائٹی انتشار اور ہلاکت کا شکار ہو جائے۔

قرآن مجید نے رشتہ داروں کو ذی القربیٰ اور ارحام کے الفاظ سے پکارا ہے۔ قرب کئی لحاظ سے ہوتا ہے۔ نسبت کے لحاظ سے قرب پھر نسبت یا تو والد کے لحاظ سے ہوگی یا ماں کے لحاظ سے پھر قرب مرتبہ کے لحاظ سے بھی ہوتا ہے اور قرب مکان و زمان کے لحاظ سے بھی ہوتا ہے۔ یہاں قرب سے مراد نسبت کے لحاظ سے ہے۔

ارحام رحم کی جمع ہے۔ یعنی عورت کا رحم اور استعارۃ قرابت پر بولا جاتا ہے کیونکہ قریبی ایک ہی رحم سے نکلے ہوئے ہوتے ہیں۔

قرآن مجید اور حدیث میں رشتہ داروں کے حقوق و فرائض کی ادائیگی کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّهٗ (بنی اسرائیل ۲۶:۱۷) قریبی رشتے داروں کو ان کے حق ادا کرو۔ فَاٰتِ ذَی الْقُرْبٰی حَقَّهٗ (روم ۳۸:۳۰) اور قرابت داروں کو ان کے حق ادا کرو۔ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (شوریٰ ۲۳:۴۲) کہہ میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا مگر قریبیوں میں باہم محبت۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا (النساء ۱:۴) اس خدا سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رشتے داروں کے حقوق کی نگہداشت کرو اللہ تم پر نگہبان ہے۔

اس تاکیدی حکم کے ساتھ قطع رحم کرنے والوں کو فاسق کہا گیا ہے۔ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ (بقرہ ۲۷:۲) اور سوائے فاسقوں کے کسی کو گمراہ نہیں ٹھہراتا (فاسق وہ ہیں) جو اللہ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور اسے کاٹتے ہیں جس کا اللہ نے حکم دیا ہے کہ ملایا جائے۔

وصل رحم اور قطع رحم کے بارے میں حدیث شریف میں آتا ہے: اَلرَّحِمُ شُجْنَةٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی مَنْ وَصَلَکَ وَصَلْتُهٗ وَمَنْ قَطَعَکَ قَطَعْتُهٗ (بخاری کتاب الادب باب من وصل وصلہ اللہ) رحم رحمٰن سے نکلی ہوئی ایک شاخ ہے اللہ نے فرمایا جو تجھ کو جوڑے گا میں اس کو جوڑوں گا اور جو تجھ کو کاٹے گا میں اس کو کاٹوں گا۔

مسلم میں آتا ہے۔ وہ قوم اللہ کی رحمت سے محروم رہتی ہے جس میں کوئی قاطع رحم ہوتا ہے اور اس کو دنیا ہی میں قطع رحم کی سزا مل جاتی ہے۔ (ادب المفرد)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔ جو شخص چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں فراخی پیدا ہو اس کو صلہ رحم کرنا چاہیے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ جو شخص چاہتا ہے کہ اس کی عمر میں اضافہ ہو اس کو صلہ رحم کرنا چاہیے۔

ایک اعرابی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے ایسی چیز بتایئے جو مجھ کو جنت کے قریب اور دوزخ سے دور کر دے۔ فرمایا اللہ کی عبادت کرو کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ نماز پڑھو زکوٰۃ ادا کرو اور صلہ رحم کرو۔ (ادب المفرد باب صلہ رحم)

حضرت جبیر بن مطعمؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو صلہ رحمی نہ کرے گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ (بخاری باب اثم القاطع)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے۔ انھوں نے کہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کوئی احسان جتانے والا قطع رحم کرنے والا اور شراب کشید کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ (نسائی۔ دارمی)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمثیلی پیرائے میں صلہ رحم کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ مخلوقات کی پیدائش سے فارغ ہو چکا تو رحم نے اللہ تعالیٰ کا دامن تھام لیا اور کہا یہ اس کا مسکن ہوگا جو تیری گرہ (صلہ رحم کو) کاٹنے سے بچے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بے شک کیا تجھ کو یہ بات پسند نہیں کہ جو تجھ کو جوڑے گا میں اس کو جوڑوں گا۔ اور جو تجھے کاٹے گا میں اس کو کاٹوں گا۔ رحم نے عرض کیا ہاں! اے پروردگار عالم فرمایا تو یہ تجھ کو دیا گیا یہ بڑا حق ہے۔ اس لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اگر تم لوگ چاہو تو آیت پڑھ لو۔ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ (محمد ۲۲:۴۷) پس اگر تم حاکم بن جاؤ تو قریب ہے کہ زمین میں فساد پھیلاؤ اور اپنے رحموں کو قطع کرو۔ (بخاری کتاب الادب باب من وصل وصلہ اللہ)

معاشرتی حقوق

احسان: اسلام رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک اور محبت سے پیش آنے کا حکم دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِي الْقُرْبٰى (بقرہ ۸۳:۲) ماں باپ اور رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى (نحل ۹۰:۱۶) اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور رشتہ داروں کے ساتھ نیک سلوک کا حکم دیتا ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى (النساء ۳۶:۴) اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں کے ساتھ۔

حدیث شریف میں ہے ابو ہریرہ سے روایت ہے انھوں نے کہا میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جو شخص اس بات سے خوش ہو کہ اس کے رزق میں فراخی ہو اور عمر بڑھے تو اس کو چاہیے کہ اپنے رشتے داروں سے حسن سلوک کرے۔ (صحیح بخاری کتاب الادب باب من بسط لہ فی الرزق الصلۃ الرحم، مسلم)

مالی امداد: رشتے داروں کی مالی امداد اور دست گیری کرنا بڑی نیکی کا کام ہے۔ جس کو قرآن اور حدیث میں خاص اہمیت دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى (بقرہ ۱۷۷:۲) (حقیقی نیکی یہ ہے) کہ مال کی محبت کے باوجود رشتے داروں کو دے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى (نحل ۹۰:۱۶) بے شک اللہ انصاف حسن سلوک اور رشتے داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

قرابت داروں کو مالی امداد اور دست گیری کرنے کی اہمیت اس تاریخی واقعہ سے ہی ہے کہ واقعہ افک میں حضرت ابوبکرؓ کے ایک عزیز مسطح بھی شامل تھے۔ اس لیے انھوں نے اس کی دست گیری کرنا بند کر دی اس پر یہ حکم نازل ہوا۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ وَلَا يَاْتَلِ اُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسَاكِيْنَ (نور ۲۲:۲۴) اور تم میں جو لوگ بڑائی اور وسعت مال رکھتے ہیں۔ وہ رشتے داروں اور محتاجوں کو دینے کی قسم نہ کھالیں۔

قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (بقرہ ۲۱۵:۲) کہہ جو تم خرچ کرو تو وہ ماں باپ رشتہ داروں یتیموں اور غریبوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ حضرت حکیم بن حزام رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ صدقہ کا آغاز اس شخص سے کرو جو تمہارے عیال میں ہو اور اچھا صدقہ وہ ہے جو فاضل مال سے دیا جائے اور جو شخص سوال سے بچے گا۔ اللہ اسے بچائے گا اور جو شخص مستغنی رہے گا اللہ اسے غنی کر دے گا۔ (صحیح بخاری کتاب البر)

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں۔ ابوطلحہ انصار مدینہ میں کھجور کے باغات کے سلسلہ میں سب سے زیادہ مالدار تھے لیکن ان کو اموال میں سے ایک میٹھا کنواں بہت پسند تھا جو مسجد نبوی کے سامنے تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے پاس سے ہو کر گزرتے تو اس کا پانی پیتے جو خوشگوار اور میٹھا ہوتا جب یہ آیت نازل ہوئی۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (تم اس وقت تک نیکی حاصل نہیں کر سکو گے۔ جب تک تم اپنی عزیز ترین چیزیں خرچ نہ کرو گے) ابوطلحہ نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ تم اپنی پسندیدہ اشیاء اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور یہ کنواں مجھے بہت ہی محبوب اور عزیز ہے۔ اس لیے اس کو میں بطور صدقہ کے دیتا ہوں۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو نیکی اور ذخیرہ آخرت کا سامان ٹھہرائے گا آپ اس صدقہ کو اللہ کی مرضی کے مطابق جہاں چاہیں خرچ کریں۔ آپ نے فرمایا آمدنی کا اچھا ذریعہ ہے۔ میں نے تمہاری بات سن لی ہے۔ میری رائے میں یہ بہتر ہے کہ اسے اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کردو ابوطلحہ نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایسا ہی کروں گا چنانچہ انھوں نے اپنے رشتے داروں اور بنی عم میں اسے تقسیم کر دیا۔
(صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ)

قرآن مجید میں میراث سے محروم رشتہ داروں کے متعلق یہ حکم ہے۔ اگر وہ میراث کی تقسیم کے وقت حاضر ہوں تو فیاضی سے کام لے کر کمزور رشتے داروں کی مالی اعانت کرنا چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا

(النساء ۴:۸) جب میراث کی تقسیم کے وقت رشتہ دار اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان سے اچھی بات کہو۔

اس آیت کریمہ میں میت کے وارثوں کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ اگر میراث کی تقسیم کے وقت نادار اور غریب رشتہ دار حاضر ہوں تو ان کی مالی اعانت کر دینی چاہیے تاکہ باہم محبت اور الفت بڑھے۔ ان کی غربت اور افلاس دور ہو۔

میراث: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (الانفال ۸:۷۵) اور جو بعد میں ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور تمھارے ساتھ مل کر جہاد کیا تو وہ تم میں سے ہی ہیں اور رشتہ کے تعلقات والے اللہ کے حکم میں ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہیں بے شک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ میں آئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی معاشرہ کو مستحکم کرنے اور بنیان مرصوص بنانے کے لیے ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری کے درمیان اخوت قائم کر دی۔

انصار نے یہاں تک قربانی دی کہ گھر بار مال و اسباب نصف نصف مہاجرین کو دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ وفات کے بعد حصہ میراث بھی تو اسلام نے اس امر سے روک دیا اور یہ تعلیم دی کہ میراث میں حقیقی وارث رشتہ دار ہی ہیں۔

آج مسلمان گھروں میں رشتہ داروں کو میراث سے محروم رکھنے کے لیے قسم قسم کے حیلے اختیار کیے جاتے ہیں۔ جس سے ایک طرف تو دولت چند ہاتھوں میں جمع ہو جاتی ہے دوسری طرف منافرت تباغض اور عداوت بڑھ جاتی ہے۔

خاندانوں میں قتل کی بے شمار واردات اس وجہ سے ہو رہی ہیں کہ مختلف طریقوں سے ایک دوسرے کے شرعی حق کو غصب کیا جا رہا ہے۔

حدیث شریف میں ہے۔ حضرت ابو موسیٰؓ سے کسی نے بیٹی پوتی اور بہن کے حصوں کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا۔ آدھا بیٹی کے لیے اور آدھا بہن کے واسطے اور تم ابن مسعود سے دریافت کر لو یقین ہے وہ بھی میری طرح جواب دیں گے۔ اس شخص نے ابن مسعودؓ سے جا کر پوچھا اور حضرت ابو موسیٰ کا جواب بھی بتا دیا۔ انھوں نے کہا اگر میں یہ جواب دوں تو میں اس میں وہی حکم لگاؤں گا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لگایا ہے۔ بیٹی کے واسطے نصف نواسہ کے واسطے چھٹا۔ یہ دو تہائی ہو گئیں اور باقی ایک تہائی بہن کے واسطے۔ پھر ابو موسیٰؓ سے ابن مسعودؓ کا یہ فتویٰ بیان کیا گیا تو انھوں نے کہا جب تک فقیہہ ابن مسعود تم میں زندہ ہے۔ مجھ سے بھی کبھی نہ پوچھنا۔ (صحیح بخاری کتاب الفرائض)

حضرت ابن عباسؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:۔ میراث اہل تک پہنچا دو اور جو باقی ہے وہ زیادہ قریبی مرد کے واسطے ہے (صحیح بخاری کتاب الفرائض)

اخلاقی حقوق

اصلاح: معاشرہ کی اساس لوگوں کے کردار اور اخلاق کی درستی پر ہے۔ جس سوسائٹی کے لوگ اخلاق فاضلہ اور کردار عالیہ کے زیور سے مزین ہوں گے۔ اس سوسائٹی کی عمارت مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہوگی۔ اس وجہ سے رشتہ داروں کے باہمی حقوق و فرائض میں یہ امر بھی شامل ہے کہ ہر ایک رشتہ دار ایک دوسرے کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنے کی تعلیم و تبلیغ کا فریضہ انجام دے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب رسالت کی گراں ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے کر میدان عمل میں اترے تو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ حکم دیا کہ وہ پیغام رسالت کو اپنے رشتہ داروں تک پہنچائیں۔ چنانچہ آپ نے دعوت پر مدعو کر کے اور اعلانیہ بھی اپنے رشتہ داروں کو پیغام رسالت پہنچایا اور ان کو خدا کی وحدانیت پر ایمان لانے کے لیے بلایا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (الشعراء ۲۶:۲۱۴، ۲۱۵) اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرا اور اپنے بازو کو اس کے لیے جھکا جو مومنوں میں سے تیری پیروی کرتا ہے۔

بخاری میں ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صفاء پر چڑھ گئے اور بلند آواز سے پکارا! اے بنی فہر اے بنی عدی اور قریش کے مختلف بطنوں کو پکارتے رہے جب تمام جمع ہو گئے تو آپؐ نے فرمایا بتاؤ اگر میں تمھیں یہ خبر دوں کہ اس وادی میں ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو میری بات مان لو گے؟ انھوں نے کہا ہاں! کیونکہ آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ فرمایا تو میں تمھیں ایک سخت عذاب سے ڈراتا ہوں جو تمھارے سامنے ہے۔

محبت و مودت: رشتے داروں سے محبت کرنے کا اتنا اہم فریضہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تبلیغ اسلام کی راہ میں جو مصائب جھیلنے پڑے ان کے صلہ میں آپؐ نے اپنی امت سے صرف رشتے داروں سے محبت سے پیش آنے کی خواہش کی۔ ارشاد الٰہی ہے: قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي

الْقُرْبٰی (الشوریٰ ۴۲:۲۳) کہہ تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا مگر قریبیوں میں باہم محبت چاہتا ہوں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:۔ اہل جنت تین قسم کے لوگ ہیں۔ اوّل منصف بادشاہ لوگوں کے ساتھ احسان کرنے والا اور بھلائی کی توفیق دیا گیا۔ دوسرا مہربان شفیق اور نرم دل آدمی جو قریبی رشتے داروں اور نیز ہر مسلمان کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے۔ تیسرا عیال دار پارسا جو حرام کاری سے باز رہتا ہے اور محتاجی کے وقت اغیار سے شرم کرتا ہے۔ (مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔ جو شخص رشتہ داروں کے ساتھ اس لیے سلوک کرتا ہے کہ وہ بھی اس کے ساتھ اسی رنگ میں پیش آئیں تو یہ اعلیٰ درجہ کی صلہ رحمی نہیں۔ کمال درجہ کی صلہ رحمی یہ ہے۔ جب دوسرے رشتہ دار اس سے بدسلوکی سے پیش آئیں تو یہ اس وقت ان سے تعلق جوڑے اور ان کے حقوق کی نگہداشت کرے۔

یتیموں کے حقوق

یتیم معاشرہ کا وہ محتاج اور بے بس فرد ہوتا ہے جس کا باپ کم سنی میں ہی فوت ہو جاتا ہے۔ وہ یتیم فرد سوسائٹی کی مدد اور خدمت کا بہت محتاج ہوتا ہے۔ اسلام نے یتامیٰ کے حقوق متعین کر کے ان کی نگہداشت اور حفاظت کی بہت تاکید کی ہے۔

عربوں میں ہر وقت قتل و غارت کا بازار گرم رہتا تھا۔ اس وجہ سے یتیموں کی کثرت تھی۔ ان کو باپ کی وراثت سے محروم رکھا جاتا اور نہ ان کی پرورش کا سامان ہوتا تھا۔ وہ سوسائٹی میں ذلیل اور حقیر سمجھے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے عربوں کی یتامیٰ سے بدسلوکی کو قرآن مجید میں کئی جگہ بیان کیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ (الماعون ۱۰۷: ۱، ۲) کیا تو نے اس شخص کی حالت پر غور نہیں کیا جو دین کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

کَلَّا بَلْ لَّا تُکْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ وَتَاْکُلُوْنَ التُّرَاثَ اَکْلًا لَّمًّا وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (الفجر ۸۹: ۱۷ تا ۱۹) ہرگز نہیں بلکہ تم یتیم کی خاطر داری نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے اور میراث کو سب کچھ سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے بیحد پیار کرتے ہو۔

معاشرتی حقوق

احسان: اسلام نے یتیم کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کی تعلیم دی ہے اور اس کو اتنی اہمیت دی ہے کہ عبادت الٰہی کرنے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانے کے حکم کے بعد یہ حکم دیا کہ یتامیٰ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِهٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسَاکِیْنِ (النساء ۴: ۳۶) اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اور قریبیوں یتامیٰ اور مساکین کے ساتھ بھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ مسلمانوں میں سب سے بہتر وہ گھر ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور مسلمانوں کا سب سے برا گھر وہ ہے جس میں یتیم ہو اور اس کے ساتھ برا برتاؤ کیا جائے۔ (ابن ماجہ)

جو کسی یتیم لڑکی یا یتیم لڑکے کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے گا جو اس کے پاس ہے۔ تو میں اور وہ جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح اکٹھے ہوں گے اور آپ نے دونوں انگلیوں کو ملا کر لوگوں کو دکھایا۔ (ترمذی، احمد)

یتیم کو دھکے دینے اور اس کو ڈانٹ ڈپٹ سے منع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:۔ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ (الماعون ۱۰۷: ۱) کیا تو نے اس شخص کی حالت کو نہیں دیکھا جو دین کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے وہ دین کی تکذیب کرتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ (الضحیٰ ۹۳: ۹) سو یتیم پر سختی نہ کر۔

نفقہ: انسانی طبعی ضروریات میں سے سب سے اہم ضرورت پیٹ کی بھوک دور کرنا ہے۔ اس طبعی ضرورت کے پیش نظر اسلام دولت مندوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ یتامیٰ کی پرورش کریں تاکہ اس بے کس طبقے کی روٹی کا مسئلہ حل ہو جائے۔ ارشاد الٰہی ہے:۔ وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَانُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا (الدھر ۷۶: ۹،۸) اور اس کی محبت کی وجہ سے مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں ہم تمہیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھانا کھلاتے ہیں ہم نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔

دوسری جگہ آتا ہے: اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ یَّتِیْمًا ذَامَقْرَبَةٍ (البلد ۹۰: ۱۵،۱۴) یا بھوک کے دن کھانا کھلانا قریبی یتیم کو۔

قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی (البقرہ ۲: ۲۱۵) کہہ جو کچھ بھی اچھے مال سے خرچ کرو وہ ماں باپ اور غریبوں اور یتیموں کے لیے ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:۔

مَنْ اٰوٰی یَتِیْمًا اِلٰی طَعَامِہٖ وَشَرَابِہٖ اَوْجَبَ اللّٰہُ لَہُ الْجَنَّۃَ الْبَتَّۃَ اِلَّا اَنْ یَّعْمَلَ ذَنْبًا لَا یُغْفَرُ (ترمذی ابواب البر والصلۃ باب فی رحمۃ الیتیم) جو شخص یتیم کو اپنے کھانے پینے میں شریک کرے گا خدا اس کے لیے جنت واجب کر دے گا۔ بشرطیکہ وہ کسی ایسے گناہ کا مرتکب نہ ہوا ہو جو قابل معافی نہ ہو۔

صحابہ کا نمونہ: جب یتامیٰ کی پرورش اور ان کو کھانے پر مدعو کرنے کی آیات نازل ہوئیں تو ہر صحابی کا گھر یتیم خانہ بن گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر کے متعلق لکھا ہے کہ وہ کسی یتیم بچے کے بغیر کھانا نہ کھاتے تھے۔

كَانَ لَا يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَاِلَّا وَعَلٰی خِوَانِہٖ يَتِيْمٌ (ادب المفرد) کھانا نہیں کھاتا تھا مگر اس کے دسترخوان پر یتیم ہوتا تھا۔

حضرت عائشہؓ اپنے خاندان اور انصار کی یتیم لڑکیوں کی پرورش اپنے گھر میں لا کر کرتی تھیں۔ (موطا امام مالک و مسند احمد بن حنبل)

ایک مرتبہ ایک یتیم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عدالت میں ایک شخص پر ایک نخلستان کا دعویٰ کیا مگر اس کا ثبوت نہ پیش کر سکا اس لیے آپ نے مدعا علیہ کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا۔ وہ یتیم رونے لگا۔ آپ کا دل رحم سے پگھل گیا۔ مدعا علیہ سے فرمایا کہ تم یہ نخلستان اس کو دے دو خدا اس کے بدلے میں جنت دے گا مگر وہ نہ مانا۔ ایک صحابی حضرت ابوالدحداح پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے اس شخص سے کہا تم اس نخلستان کو میرے نخلستان سے بدل سکتے ہو! وہ تیار ہو گیا۔ ابوالدحداح نے اس کا نخلستان اپنے نخلستان سے بدل کر یتیم کے حوالے کر دیا۔ (استیعاب تذکرہ ابوالاحداح)

اصلاح: جس طرح یتیم کی جسمانی پرورش ضروری ہے۔ اسی طرح اس کی روحانی پرورش بھی ضروری ہے۔ اسلام نے یتامیٰ کی اصلاح اور کردار کو سنوارنے کا حکم دیا ہے تاکہ وہ سوسائٹی کا ایک اچھا فرد ثابت ہوں نہ کہ ننگ و عار۔ ارشاد الٰہی ہے:۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ (بقرہ۲:۲۲۰) اور تجھ سے یتیموں کی نسبت پوچھتے ہیں کہ ان کی اصلاح کرنا اچھا ہے۔

انصاف: عموماً دیکھنے میں آتا ہے کہ جو فرد سوسائٹی میں کمزور ہوتا ہے۔ اس کے معاملہ میں انصاف نہیں کیا جاتا۔ انسان کی اس طبعی کمزوری کو دیکھ کر اسلام نے یتامیٰ کے بارہ میں خاص طور پر یہ تاکید کی ہے کہ ان کے بارہ میں انصاف سے کام لیا جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی کمزوری انصاف کی راہ سے ہٹا دے۔ ارشاد الٰہی ہے:۔

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا (النساء۴:۱۲۷) یہ کہ یتیموں کے معاملے میں انصاف پر قائم رہو اور جو کچھ بھلائی تم کرو تو اللہ اسے جاننے والا ہے۔

آئینی حقوق

مال کی حفاظت: کسی بچے کے والدین فوت ہو جائیں۔ ورثہ میں اس کے حصے میں مال و دولت آ جائے تو یتیم بچے کے اعزا و اقرباء پر یہ لازم ہے کہ وہ اس مال کی حفاظت کریں۔ جب وہ سن بلوغت کو پہنچ جائے تو اس کا مال اس کی تحویل میں دے دیا جائے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ (الانعام ۶:۱۵۲) اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر اس طریق سے جو بہت اچھا ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ (النساء۴:۲) اور یتیموں کو ان کا مال دے دو اور اچھی چیز کو بری چیز سے نہ بدلو۔

یتیم کا مال کھانا گناہ ہے: وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا (النساء۴:۲) اور ان کے مال اپنے مالوں کے ساتھ نہ ملا کر کھاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ جو شخص یتیم کا مال کھاتا ہے وہ گویا جہنم کی آگ سے پیٹ بھرتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَّسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا (نساء۴:۱۰) جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ ہی کھاتے ہیں اور وہ بھڑکائی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔

اگر یتیم کا سرپرست کوئی غریب مفلس شخص ہے تو اسلام اس کو بقدر ضرورت حق خدمت لینے کی اجازت دیتا ہے اگر ولی آسودہ حال ہے تو وہ یتیم کے مال سے اس کا معاوضہ ہرگز نہ لے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ (نساء۴:۶) اور جو مفلس ہو تو وہ دستور کے مطابق کھائے۔

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ (نساء۴:۶) اور جو خوش حال ہے ان کے مال سے پرہیز کرے۔

جب تک یتیم عاقل بالغ نہ ہو جائے اور اس میں مال کی حفاظت کی صلاحیت پیدا نہ ہو جائے اس وقت تک مال اس کی تحویل میں نہیں دینا چاہیے۔ جب وہ عقل وشعور کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کا مال اس کو دے دینا چاہیے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آتا ہے:۔ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (نساء ۵:۴) اور کم عقل لوگوں کو تم اپنے مال نہ دے دو جن کو اللہ نے تمھارے لیے سہارا بنایا ہے اور تم انھیں ان کے ذریعہ سے کھانے کے لیے دو اور انھیں کپڑا پہناؤ اور انھیں بھلی بات کہتے رہو۔ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (نساء ۶:۴) اور یتیموں کا امتحان لیتے رہو یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں تب اگر ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔

اختلاف اور جھگڑے سے بچنے کے لیے اسلام نے یہ تعلیم دی ہے یتیم کا مال گواہوں کی موجودگی میں واپس کیا جائے۔ ارشاد الٰہی ہے:۔ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا (نساء ۶:۴) پھر جب تم ان کے مال ان کے حوالے کرو تو ان میں تو ان پر گواہ کرلو اور اللہ کافی حساب لینے والا ہے۔

مال غنیمت میں سے یتیموں کا حصہ: اسلام نے صرف انفرادی طور پر ہی یتیموں کی پرورش اور دست گیری کی ترغیب نہیں دی بلکہ قومی بیت المال میں مال غنیمت اور فئے میں سے یتیموں کا حصہ مقرر کر دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (الانفال ۴۱:۸) اور جان لو کہ جو کوئی چیز تم دشمن سے حاصل کرو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے اور وہ رسول کے لیے اور قریبیوں کے لیے اور یتیموں کے لیے اور مسکینوں کے لیے اور مسافروں کے لیے ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے:۔ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (حشر ۵۹:۷) جو اللہ نے اپنے رسول کو بستیوں والوں سے مال غنیمت دلایا تو وہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قریبیوں کے لیے اور یتیموں کے لیے اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

انصاف نہ کر سکنے پر یتیم لڑکیوں سے شادی کرنے کی ممانعت: جیسا کہ پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ عرب میں یتیم ذلیل ومقہور طبقہ خیال کیا جاتا تھا۔ امراء یتیم لڑکیوں سے شادی کر لیتے اور ان سے بدسلوکی سے پیش آتے۔ ان کے ازدواجی حقوق کو پامال کرتے۔ وہ یتیم لڑکیاں امراء کے ہاتھوں میں محض کھلونا بنی رہتیں۔ اسلام آیا تو اس نے یتیموں کو عزت کے مقام پر لا کھڑا کیا۔ امراء کو یہ حکم دیا کہ اگر وہ یتیم لڑکیوں کے بارہ میں انصاف سے کام نہیں لے سکتے تو ان کو صرف ایک ہی شادی کرنی چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے:۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (النساء ۳:۴) اگر تمھیں خوف ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ایسی عورتوں سے نکاح کر لو جو تمھیں پسند ہوں۔

اخلاقی حقوق

اولاد جیسا برتاؤ: وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (نساء ۹:۴) اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیے جو اگر اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑیں تو ان کے لیے ڈرتے ہوں۔ پس چاہیے کہ اللہ کا تقویٰ کریں اور چاہیے کہ سیدھی سادھی بات کریں۔

اس آیت کریمہ میں فطرت انسانی کو اپیل کی ہے کہ جس طرح کوئی شخص مرنے لگے اور اس کی چھوٹی چھوٹی اولاد پیچھے رہ جائے۔ اس کی یہ دلی تمنا ہوتی ہے کہ دوسرے اس کی اولاد پر رحم کریں اور متکفل ہوں۔ اسی طرح ہر شخص کو چاہیے کہ وہ یتیموں کے ساتھ اپنے بچوں کی طرح نیک سلوک کریں اور ان کے متکفل بنیں۔

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔ جو شخص یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے اور محض اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے تو اسے ہر بال کے عوض جس پر اس کا ہاتھ گزرتا ہے نیکیاں ملتی ہیں۔ (ترمذی)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی سنگدلی کی شکایت کی تو آپؐ نے فرمایا:۔ یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو اور محتاج کو کھانا کھلایا کرو۔

ہمسایوں کے حقوق

قرآن مجید نے اعزاء واقربا کے حقوق وفرائض کی اہمیت کے بعد ہمسایوں کی ذمہ داریوں پر زور دیا ہے کیونکہ ہمسائے ہی ایک دوسرے کے قریب رہنے کی وجہ سے ایک دوسرے کی غمی وخوشی میں شریک ہوتے ہیں۔ ہمسایہ وہ دو آدمی ہیں جو ایک دوسرے کے قریب رہتے ہوں۔

اسلام نے الجار (پڑوسی) میں ہر قسم کے رفقائے کار کو شامل کیا ہے۔ جیسے دو ہمسفر' دو طالب علم' دو استاذ' دو مزدور وغیرہ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ (النساء ۴:۳۶) اللہ تعالیٰ نے قریبی پڑوسی اور دور والے پڑوسی اور پہلو والے ساتھی کے ساتھ نیکی کا حکم دیا ہے۔

اس آیت کریمہ میں پڑوسی کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جو رشتے دار ہوں اور پڑوسی بھی ہوں۔ دوسرے جو صرف پڑوسی ہوں۔ تیسرے رفقائے کار۔

پڑوسی کے حقوق کی اہمیت بیان کرتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَا زَالَ جِبْرِیْلُ یُوْصِیْنِی بِالْجَارِ حَتّٰی ظَنَنْتُ اَنَّهٗ سَیُوَرِّثُهٗ (بخاری کتاب الادب الوصایا بالجار) حضرت جبرئیل پڑوسیوں کے متعلق اس تاکید کے ساتھ وصیت کرتے رہے کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ انھیں وراثت میں حصہ دار بنا دیں گے۔

جس کو پسند ہو کہ خدا اور اس کا رسول اس کو پیار کرے یا جس کو خدا اور اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا دعویٰ ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے۔

معاشرتی حقوق

پڑوسی کو ایذا نہ دی جائے: معاشرہ کا تانا بانا ایک دوسرے کو تکلیف اور ایذاء دینے سے ہی ٹوٹتا ہے اور باہمی ہمدردی اشتراک عمل' تعاون اور موالات سے ہی معاشرہ مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہوتا ہے اس وجہ سے اسلام نے پڑوسیوں کو ہر قسم کی ایذاء دینے سے منع فرمایا۔

حدیث شریف میں ہے۔ حضرت ابو شریحؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا خدا کی قسم وہ مومن نہیں خدا کی قسم وہ مومن نہیں خدا کی قسم وہ مومن نہیں۔ کسی صحابی نے پوچھا کون یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جس کے شر سے اس کے پڑوسی محفوظ نہ ہوں۔ (بخاری کتاب الادب باب اثم من لایامن جارہ بوائقہ)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔ جو شخص خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے (بخاری باب من کان یومن باللہ و یوم الاخر فلا یوذی جارہ)

ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ فلاں عورت رات بھر نمازیں پڑھتی ہے اور دن کو روزہ رکھتی ہے اور صدقہ بھی کرتی ہے لیکن اپنے پڑوسی کو اپنی زبان سے ایذاء پہنچاتی ہے۔ فرمایا وہ جہنمی ہے۔ کچھ لوگوں نے عرض کیا کہ فلاں عورت صرف نمازیں پڑھتی ہے۔ رمضان کے روزے رکھتی ہے۔ کچھ کپڑے خیرات بھی کر دیتی ہے لیکن کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتی۔ فرمایا وہ جنتی ہے۔ (ادب المفرد باب لا یوذی جارہ)

حسن سلوک: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس وقت تک بندہ مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی یا پڑوسی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنی ذات کے لیے پسند کرتا ہے (مسلم باب الایمان باب الدلیل علی ان من خصال الایمان من یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ)

جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے۔ (مسلم باب الایمان باب ابحث علی کرام الجار)

فرمایا: اللہ کے نزدیک ساتھیوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہو اور اللہ کے نزدیک پڑوسیوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہو۔ (ادب المفرد باب خیر الجیر ان)

خرچ کرنا: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن بہت سے ایسے پڑوسی ہوں گے جو اپنے پڑوسیوں کا دامن تھامے ہوئے کہیں گے کہ یا رب اس نے اپنا دروازہ مجھ پر بند کر رکھا تھا اور روزمرہ کی استعمال کی چیزوں سے روکتا تھا۔ (ادب المفرد باب من اغلق الباب علی الجار)

وہ شخص مومن نہیں ہے جو خود تو شکم سیر ہو اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔ (ادب المفرد باب من لایشبع دون جارہ)

جب تم شوربا پکاؤ تو اس میں پانی زیادہ کر دیا کرو تاکہ پڑوسی کو بھی دے سکو۔ (ادب المفرد باب یکثر ماء المرق فیقسم فی الجیران)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا میرے دو پڑوسی ہیں ان میں سے کس کو ہدیہ بھیجا کروں۔ فرمایا: جس کا دروازہ تمھارے گھر کے قریب ہو۔ (بخاری باب حق الجوار فی قرب الابواب)

مال و عزت و آبرو اور جان کی حفاظت: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! خدا کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ فرمایا خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا حالانکہ اس نے تجھ کو پیدا کیا ہے۔ اس نے عرض کیا کہ پھر کون سا گناہ فرمایا اپنی اولاد کو اس خوف سے قتل کر دینا کہ بڑے ہو کر تیرے ساتھ کھائیں گے۔ اس نے عرض کیا پھر کون سا گناہ فرمایا پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا۔ (متفق علیہ)

ایک مرتبہ پڑوسی کے مال و عزت کی حفاظت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔ آپ نے صحابہ کرام سے زنا کے بارہ پوچھا۔ تو انھوں نے جواب دیا۔ وہ حرام ہے اور اللہ اور اس کے رسول نے اس کو حرام کیا ہے فرمایا لیکن اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا دس عورتوں کے ساتھ بدکاری کرنے سے زیادہ سنگین ہے۔ پھر چوری کے بارہ میں سوال کیا۔ صحابہؓ نے عرض کیا حرام ہے۔ اللہ اور اس کے رسول نے اس کو حرام قرار دیا ہے فرمایا: پڑوسی کے گھر میں چوری کرنا دس گھروں میں چوری کرنے سے زیادہ سنگین ہے۔ (ادب المفرد باب حق الجار)

قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ لوگ اپنے پڑوسیوں کو قتل کریں گے۔ (ادب المفرد)

آزادی کی حفاظت: ابوداؤد میں روایت ہے کہ مدینہ میں کچھ لوگ شبہ کی بنا پر گرفتار کر لیے گئے۔ ایک صحابی نے عین خطبہ کے دوران اٹھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ میرے ہمسایہ کو کس قصور میں گرفتار کیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو مرتبہ ان کے سوالوں کو سن کر جواب نہ دیا تاکہ کوتوال شہر ان کی گرفتاری کے لیے معقول وجہ رکھتا ہو تو اٹھ کر بیان کرے لیکن جب تیسری مرتبہ اس صحابی نے اپنے سوال کا اعادہ کیا اور کوتوال نے کوئی وجہ بیان نہ کی تو آپ نے حکم صادر فرمایا: خلوا لہ جیرانہ کہ اس کے پڑوسی کو رہا کر دو۔ (ابوداؤد)

بیمار پرسی کرنا: پڑوسی سے حسن معاشرت کے لیے صرف مسلمان ہونا ہی شرط نہیں بلکہ غیر مسلم پڑوسی بھی اسی حسن سلوک اور موالات کا مستحق ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔ بریدہ سے روایت ہے: ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہمارے ساتھ چلو کہ ہم اپنے اس یہودی ہمسائے کی عیادت کریں۔ بریدہ نے کہا ہم اس کے پاس آئے تو آپؐ نے فرمایا کیا حال ہے۔ (کتاب الاثار باب الایمان)

آئینی حقوق

شفعہ: شفعہ ہمسایہ کا ایک شرعی حق ہے۔ اگر کوئی ہمسایہ اپنی جائیداد فروخت کرنا چاہے تو اس کا یہ فرض ہے کہ پہلے اپنے پڑوسی سے دریافت کرے کہ وہ خریدنا چاہتا ہے یا کہ نہیں۔ اگر وہ خریدنا چاہے تو اس کے ہاتھ فروخت کرے۔ اگر وہ نہ خریدنا چاہے تب وہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرے۔ اگر پڑوسی سے بغیر پوچھے کوئی جائیداد کو فروخت کر دے تو پڑوسی کو عدالت کی معرفت فروخت کی ہوئی جائیداد حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ حدیث میں ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ہمسایہ اپنے شفعہ کا زیادہ مستحق ہے۔ اگر وہ غائب ہو تو شفعہ کے لیے اس کا انتظار کیا جائے مگر یہ شفعہ اس وقت ہوگا جب ان دونوں کا راستہ ایک ہو۔ (بخاری)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر مشترک چیز میں شفعہ کا حکم دیا ہے۔ جب تک اس کی تقسیم نہ ہوئی ہو خواہ مکان ہو خواہ باغ ہو مالک کو یہ جائز نہیں کہ اپنے شریک کو اطلاع دیے بغیر اسے فروخت کر دے۔ شریک کو اختیار ہے چاہے اس کو لے لے یا چھوڑ دے جب مالک فروخت کر دے اور شریک کو اطلاع نہ دے تو شریک اس کا زیادہ مستحق ہوگا حضرت رافع بن خدیجؓ سے روایت ہے کہ حضرت سعدؓ نے اپنا ایک گھر مجھے پیش کیا اور کہا اسے لے لو۔ گو مجھے اس کی زیادہ قیمت ملتی ہے جو تم مجھ کو دیتے ہو لیکن تم اس کے زیادہ مستحق ہو کیونکہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے۔ پڑوسی کے ہوتے ہوئے اجنبی آدمی خریدنے کا حق نہیں رکھتا۔ (کتاب الاثار باب الشفعہ)

اخلاقی حقوق

دین کی تعلیم: تعلیم یافتہ پڑوسیوں کا یہ حق ہے۔ وہ اپنے پڑوسیوں کو دین کی تعلیم دیں۔ ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خطبہ میں فرمایا۔ لوگ اپنے پڑوسیوں میں دینی سمجھ پیدا نہیں کرتے ایسا کیوں ہے؟ پھر دوبارہ فرمایا کہ ایسا کیوں ہے کہ کچھ لوگ اپنے پڑوسیوں سے دین نہیں سیکھتے؟ اور اس کے بعد حکم دیا کہ لوگ اپنے پڑوسیوں کو لازماً تعلیم دیں۔ حضور کے اس خطبہ کی خبر جب قبیلہ اشعر کے لوگوں کو ہوئی تو آپ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا اے اللہ کے رسول کیا ہم دوسرے لوگوں میں دین کی سمجھ بوجھ پیدا کریں؟ ان کے خیال میں یہ ان پر فرض نہ تھا آپ نے فرمایا:۔ ہاں یہ بھی تمہاری ذمہ داری ہے۔ پھر ان لوگوں نے حضورؐ سے اس کی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے ایک سال کی مہلت مانگی۔ (راہ عمل از مولانا جلیل احمد ندوی)

تورات میں یہ حکم ہے: ''تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر۔ تو اپنے پڑوسی کی جورو اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ نہ کر۔'' (خروج ۲۰۔۱۷)

''تو اپنے پڑوسی سے دغا بازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے۔'' (احبار ۱۹۔۱۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں ''تو اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا کہ آپ کو'' (مرقس ۱۲۔۳۰)

حاجت مندوں کے حقوق

قرآن مجید نے حاجت مند کو دو الفاظ فقیر اور مسکین سے پکارا ہے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَالۡمَسٰكِیۡنِ (التوبہ ۹:۶۰) زکوٰۃ صرف ناداروں اور مسکینوں کے لیے ہے۔

حضرت امام شافعیؒ نے فقیر اور مسکین کا فرق صرف اتنا بیان کیا ہے۔ فقیر وہ ہے جس کے پاس نہ مال ہو نہ وہ کوئی پیشہ جانتا ہو۔ مسکین وہ ہے جس کے پاس مال یا ہنر تو ہو مگر اس کی ضروریات کے لیے مکتفی نہ ہو۔ اسی پر انھوں نے قرآن مجید کی آیت: اَمَّا السَّفِیۡنَةُ فَكَانَتۡ لِمَسٰكِیۡنَ (الکہف ۱۸:۷۹) کو پیش کیا ہے۔ کیونکہ جن کے پاس کشتی تھی وہ نادار نہ تھے۔

یہ دنیا دار الابتلا ہے۔ یہ روزمرہ کے مشاہدات ہیں کہ لاکھ پتی آدمی کسی ناگہانی مصیبت کی وجہ سے کوڑیوں کا محتاج ہو جاتا ہے۔ کوئی صحیح اور تندرست اعضا والا شخص کسی عضو سے بے کار ہو جاتا ہے۔ کوئی صاحب ہنر آدمی ہے لیکن اس کا ہاتھ اتنا تنگ ہے کہ وہ ہتھیار اور آلات ہی نہیں خرید سکتا۔ ذہین طالب علم ہے، والدین تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ تعلیم جاری رکھنے کے لیے ان کو مالی امداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس قسم کے اور بھی معاشرہ میں لوگ ہوتے ہیں۔ جو دوسروں کے سہارے کے محتاج ہوتے ہیں۔ اسلام نے ہر قسم کے محتاج کی ضرورت کو پورا کرنے کی بڑی تاکید کی ہے۔ تاکہ ضرورت مند طبقہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے اور معاشرہ کی تقویت اور استحکام کا موجب بن سکے۔

معاشرتی حقوق

حسن سلوک: قرآن مجید میں آتا ہے: وَبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا وَّ بِذِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰكِیۡنِ (نساء ۴:۳۶) اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو اور اسی طرح رشتہ داروں یتیموں اور حاجت مندوں کے ساتھ۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ (الضحیٰ ۹۳:۱۰) اور مانگنے والے کو مت جھڑک، سائل سے مراد ہر وہ ضرورت مند ہے جو کسی مالی مدد کا خواست گار ہوتا ہے۔

مالی امداد: اسلام نے امراء کے مالوں میں نادار اور حاجت مندوں کو حق دار قرار دیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَفِیۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ (الذاریات ۵۱:۱۹) اور ان کے مالوں میں سوالی اور نہ مانگنے والے محتاج کا حق ہے۔

امام راغب کے نزدیک محروم سے مراد وہ شخص ہے جس کا رزق وسیع نہیں جس طرح اوروں کا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مروی ہے جس کے پاس کچھ نہیں اور جس کی حاجت کا علم نہیں ہوتا کہ اسے کوئی خیرات دے۔

دوسری جگہ آتا ہے: لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِكَةِ وَالۡكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ وَاٰتَی الۡمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰكِیۡنَ وَابۡنَ السَّبِیۡلِ وَالسَّآئِلِیۡنَ وَفِی الرِّقَابِ (بقرہ ۲:۱۷۷) بڑی نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے مونہوں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو بلکہ بڑا نیک وہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت کے لیے قریبوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوالیوں کو اور غلام آزاد کرنے میں مال دے۔

قرآن مجید نے حاجت مندوں کو نہ دینے کی ہولناک سزا کا ذکر کیا ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنا کتنا ضروری ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: خُذُوۡهُ فَغُلُّوۡهُ ثُمَّ الۡجَحِیۡمَ صَلُّوۡهُ ثُمَّ فِیۡ سِلۡسِلَةٍ ذَرۡعُهَا سَبۡعُوۡنَ ذِرَاعًا فَاسۡلُكُوۡهُ اِنَّهٗ كَانَ لَا یُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ الۡعَظِیۡمِ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡكِیۡنِ فَلَیۡسَ لَهُ الۡیَوۡمَ هٰهُنَا حَمِیۡمٌ وَّ لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنۡ غِسۡلِیۡنٍ لَّا یَاۡكُلُهٗۤ اِلَّا الۡخَاطِـُٔوۡنَ (الحاقہ ۶۹:۳۰.....۳۷) اسے پکڑو پھر اسے طوق پہناؤ پھر اسے دوزخ میں داخل کرو پھر ایک ایسی زنجیر میں جس کی ناپ ستر ہاتھ ہے۔ اسے جکڑ دو وہ اللہ عظمت والے پر ایمان نہیں لاتا تھا اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہ دیتا تھا۔ سو آج اس کے لیے یہاں کوئی دوست نہیں اور نہ دھوون کے سوا کوئی کھانا ہے سوائے خطا کاروں کے اسے کوئی نہیں کھاتا۔

دوسری جگہ حاجت مندوں کے حقوق کو نہ ادا کرنے کو دین کی تکذیب قرار دیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُكَذِّبُ بِالدِّیۡنِ فَذٰلِكَ الَّذِیۡ

يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (الماعون ۱۰۷:۱....۳) کیا تو نے اس شخص کی حالت پر غور نہیں کیا جو دین کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کوئی حاجتمند آتا تو اسے آپ صحابہ سے فرماتے کہ تم سفارش کرو تو تمہیں بھی ثواب ملے گا۔ (بخاری کتاب الادب باب تعاون المومنین و باب قول اللہ من یشفع شفاعة جنة)

ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر کچھ اور نہ ہو سکے تو بے کس حاجت مند کی مدد ہی کیا کرو۔ (بخاری باب کل معروف صدقہ)

جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا رہے گا تو خدا اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہے گا اور جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو اس سے دور فرمائے گا۔ (صحیحین)

صحابہؓ کا نمونہ: صحابہ کرام نے اسلام کی تعلیم کے پیش نظر ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جائیداد وقف کر دی تھی۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے۔ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنا ایک عمدہ مال رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں خیرات کر دیا تھا وہ ایک باغ تھا جس کا نام ثمغ تھا۔ حضرت عمرؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا میرا ایک مال ہے اور وہ مجھے بہت عزیز ہے میں چاہتا ہوں کہ اسے خیرات کر دوں آپؐ نے فرمایا تم باغ اس شرط پر خیرات کر دو کہ اس کے درخت نہ بیچے جائیں اور نہ ہبہ کیے جائیں۔ نہ ان میں وراثت جاری ہو بلکہ پھل کام میں لائے جائیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس شرط پر اس باغ کو خیرات کر دیا ان کا یہ صدقہ اللہ کی راہ میں غلاموں اور مسکینوں، مہمانوں اور مسافروں اور قرابت والوں پر خرچ کیا جاتا تھا اور یہ بھی کہہ دیا گیا کہ جو شخص اس کا متولی ہو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ دستور کے مطابق خود بھی کھا لے یا اپنے کسی دوست کو بھی کھلا دے بشرطیکہ وہ اس سے مال جمع کرنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو۔ (صحیح بخاری کتاب الوصایا)

صدقہ دینے والوں کے لیے اخلاقی احکام: صدقہ دینے والوں کو یہ حکم دیا کہ وہ صدقہ لینے والے پر نہ احسان جتائیں اور نہ کسی اور طریقے سے ایذا پہنچائیں ارشاد الٰہی ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (البقرہ ۲:۲۶۴) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنی خیرات کو جتا کر اور ستا کر باطل نہ کرو۔

اگر حاجت مند سوال کرتے وقت اصرار سے کام لے تو اس کو نرمی اور محبت سے جواب دینا چاہیے اور صبر کی تلقین کرنی چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے:۔ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَاۤ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ (البقرہ ۲:۲۶۳) نیک بات کہنا اور معاف کر دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ پہنچایا جائے اور اللہ بے نیاز اور بردبار ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ انصار کے چند آدمی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کچھ مانگنے آئے تو آپ نے ان کو دے دیا۔ پھر مانگا آپ نے پھر دے دیا حتیٰ کہ جو کچھ آپ کے پاس تھا وہ ختم ہو گیا تو آپ نے فرمایا میرے پاس جتنا بھی مال ہو اس کو تم سے بچا کر جمع رکھنے والا نہیں ہوں لیکن جو شخص مانگنے سے بچا رہے گا خدا اسے محتاجی سے بچائے رکھے گا اور جو صبر کرے گا خدا اسے صبر کی توفیق دے گا اور کوئی شخص صبر سے بہتر اور فراخ چیز نہیں دیا گیا۔ (صحیحین)

اسلام کی تعلیم ہر پہلو سے جامع اور اکمل ہے۔ اسلام نے جہاں "حاجت مندوں کی دستگیری کی تعلیم دی ہے وہاں مفت خوری کے لیے سوال کی بڑی مذمت کی ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تمھارے لیے لکڑی کا بوجھ اٹھا کر کمانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ بھیک مانگے اور دینے والے کو اختیار ہے کہ وہ دے یا نہ دے۔" (بخاری باب کراھیة المسئله)

ایک دفعہ ایک ضرورت مند صحابی نے آپ سے سوال کیا' آپ نے پوچھا تمھارے پاس کچھ ہے اس نے جواب دیا ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے۔ آپ نے اس کو منگا کر نیلام فرمایا اور اس کی قیمت سے کلہاڑی خرید کر اس کو دی اور فرمایا۔ جاؤ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر فروخت کرو ان کی محنت میں اللہ تعالیٰ نے اتنی برکت دی کہ ان کی حالت اتنی اچھی ہو گئی کہ پھر ان کو کسی سے مانگنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ (ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ)

آئینی حقوق

اسلام نے حاجت مندوں کے لیے زکوٰۃ سے شرعی حق مقرر کر دیا ہے اور حکومت پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ مال زکوٰۃ سے ان کی حاجت براری کرے ارشادِ الٰہی ہے:۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ (التوبہ ۹:۶۰) زکوٰۃ صرف نادار اور مسکینوں کے لیے ہے۔

مہمان و میزبان کے حقوق وفرائض

مہمان کے حقوق

معاشرتی حقوق

تکریم: کسی مذہب نے بھی مہمان نوازی کی تعلیم نہیں دی لیکن زمانہ جاہلیت میں مہمان نوازی کو وجہ تکریم سمجھا جاتا تھا اور اسلام نے مہمان نوازی کی اہمیت کو اور بھی بڑھایا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے ذکر میں ان کی مہمان نوازی کا ذکر کیا ہے۔ جس سے تکریم ضیف کا سبق ملتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: هَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ ضَیْفِ اِبْرٰهِیْمَ الْمُکْرَمِیْنَ اِذْ دَخَلُوْا عَلَیْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ قَوْمٌ مُّنْکَرُوْنَ فَرَاغَ اِلٰی اَهْلِهٖ فَجَاءَ بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَیْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْکُلُوْنَ (ذاریات ۵۱: ۲۴۔۲۷) کیا تیرے پاس ابراہیمؑ کے معزز مہمانوں کی خبر آئی؟ جب اس پر داخل ہوئے کہا سلام اس نے کہا سلام۔ یہ اجنبی لوگ تھے۔ پس وہ اپنے گھر کی طرف چپکے سے گیا اور ایک موٹا بچھڑا لایا سو اسے ان کے نزدیک کیا۔ کہا کیا تم کھاتے نہیں۔

ان آیات سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں۔

۱۔ مہمان اور میزبان کے درمیان کلام کی ابتداء سلام سے ہونی چاہیے۔ اس سے دونوں کی دلی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔

۲۔ جب مہمان آ جائے تو اس کے کھانے کا بندوبست فوراً کرنا چاہیے اور اس سے یہ دریافت نہیں کرنا چاہیے کہ آیا وہ کھانا کھائے گا یا کہ نہیں ممکن ہے کہ مہمان ایسے وقت میں آ جائے جب گھر والے کھانا کھا چکے ہوں تو مہمان سے کھانا کھانے کے متعلق دریافت کیا جائے تو وہ شرم و حیا سے کھانا کھانے سے انکار کر دے اور بھوکا رہے۔

۳۔ مہمان کے سامنے عمدہ اور بافراغت کھانا رکھنا چاہیے جیسا کہ بعجل سمین (موٹا بچھڑا) سے ظاہر ہوتا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کے پاس جب مہمان آئے تو لوط علیہ السلام کی قوم نے ان کی اہانت کرنا چاہی لیکن حضرت لوط علیہ السلام نے مہمانوں کی طرف سے دفاع کیا اور ان کو اہانت اور ذلت سے بچایا۔ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَیْفِیْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ (الحجر ۱۵: ۶۸، ۶۹) لوطؑ نے کہا یہ میرے مہمان ہیں تو تم مجھے رسوا نہ کرو اور اللہ کا تقویٰ کرو اور مجھے ذلیل نہ کرو۔

حدیث شریف میں آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے قرابت کے تعلقات کو جوڑے رکھے۔ (بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف و خدمة بنفسه و قوله تعالیٰ ضیف ابراهیم المکرمین)

ضیافت: حدیث میں آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کا جائزہ عزت کے ساتھ دے۔ کہا گیا یا رسول اللہ اس کا جائزہ کیا ہے تو فرمایا۔ ایک دن ایک رات اور مہمانی تین دن کی ہے۔ اس کے آگے مہمان پر صدقہ ہوگا۔ (بخاری کتاب الادب باب من کان یومن باللہ والیوم لاخر فلا یوذ جارہ)

اخلاقی حقوق

متابعت: مہمان کو رخصت کرتے وقت اس کے ساتھ تکریم و تعظیم کے لیے کچھ فاصلہ تک چلنا چاہیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مِنَ السنة ان یخرج الرجل مع ضیفه الی باب الدار (ابن ماجہ، بیہقی) یہ بات سنت سے ہے کہ آدمی اپنے مہمان کے ساتھ اس کی تکریم کے لیے گھر کے دروازے تک جائے۔

ایثار: معاشرہ کو مستحکم کرنے کے لیے اپنی ضرورت اور حاجت پر دوسروں کی حاجت اور ضرورت کو ترجیح دینا ضروری ہے۔ اس سے محبت بڑھتی ہے بغض اور عناد

دور ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الحشر ۵۹:۹) اور وہ جو ان سے پہلے ہجرت کے گھر میں رہتے اور ایمان رکھتے تھے۔ وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ جو ہجرت کر کے ان کی طرف آتا ہے اور اپنے سینوں میں اس کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو انھیں دیا جاتا ہے اور وہ اپنے آپ پر انھیں مقدم رکھتے ہیں گو انھیں تنگی ہی ہو۔ جو شخص اپنے نفس کے بخل سے بچ جائے تو وہی کامیاب ہوں گے۔

اس آیت کریمہ میں انصار کے ایثار کا ذکر کیا ہے کہ جب مسلمان تہی دست مدینہ آئے تو انصار نے اپنے مالوں اور مکانوں میں سے حصہ دے دیا۔

اس آیت کی تفسیر میں بخاری میں اس شخص کا واقعہ بیان کیا ہے جس کے سپرد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مہمان کیا۔ اس کے گھر سوائے بچوں کے کھانے کے اور کچھ نہ تھا۔ تو میاں بیوی نے بچوں کو تو بھوکا سلا دیا اور چراغ بجھا کر جو کچھ تھا وہ مہمان کو کھلا دیا اور خود بھوکے رہے۔

میزبان کے حقوق

اسلام نے مہمان کے حقوق بیان کرنے کے ساتھ میزبان کے حقوق بھی بیان کیے ہیں جو مہمان کو ادا کرنے چاہئیں۔

معاشرتی حقوق

بغیر اجازت گھر میں داخل نہ ہونا: قرآن مجید میں آتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (نور ۲۴:۲۷) اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے گھروں کے سوائے دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک کہ اجازت نہ لے لو ان کے رہنے والوں پر سلام نہ کر لو یہ تمھارے لیے بہتر ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کر لو۔

اس آیت کریمہ میں یہ تعلیم دی ہے کہ گھروں میں اجازت اور السلام علیکم کہنے کے بغیر داخل نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ انسان ہر وقت اس حالت میں نہیں ہوتا کہ وہ پسند کرتا ہو۔ کہ کوئی اسے دیکھ لے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ دستور تھا کہ جب کسی کے گھر پر جاتے تو دروازہ پر کھڑے ہو کر تین دفعہ سلام کہتے اگر اندر سے جواب ملتا تو اندر تشریف لے جاتے ورنہ واپس تشریف لے آتے۔ مہمان کے ساتھ دوسرا آدمی ہو تو میزبان کو اطلاع کر دینا ضروری ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ حضرت ابو مسعودؓ سے روایت ہے کہ انصار میں ایک شخص تھا جس کو ابو شعیب کہتے تھے۔ اس کا ایک قصاب غلام تھا۔ انصاری نے اپنے غلام سے کہا کہ میرے لیے تھوڑا سا کھانا تیار کر دے کہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کروں گا اور چار آدمی آپ کے ساتھ اور ہوں گے اور آپ ان کے پانچویں ہوں گے۔ چنانچہ آپ بلائے گئے اور آپ کے ہمراہ چار آدمی اور راستہ میں ایک اور شخص بھی ان کے پیچھے ہو لیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصاری سے فرمایا۔ تو تم نے پانچ آدمیوں کو دعوت دی تھی۔ یہ شخص رستے میں ہمارے ساتھ ہو لیا ہے اگر پسند ہو تو آنے کی اجازت دے دو ورنہ چھوڑ دو اس نے کہا کہ میں نے اس کو اجازت دے دی ہے۔ (بخاری)

کھانا کھانے کے بعد کوئی نہ اُٹھے: اگر کسی دعوت پر چند آدمی اکٹھے ہو جائیں جب تک سب کھانا نہ کھا لیں اس وقت تک کوئی آدمی بھی اگر وہ سیر ہو کر دوسرے آدمیوں سے پہلے دسترخوان سے اٹھ کھڑے ہوں تو دوسرے آدمی شرم سے کھانا چھوڑ دیتے ہیں اور بھوکے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ جب دسترخوان بچھا دیا جائے تو کوئی شخص نہ اٹھے حتی کہ دسترخوان اٹھا نہ لیا جائے اور اپنا ہاتھ کھانے سے نہ اٹھائے تاوقتیکہ اور لوگ سیر ہو کر نہ کھا لیں خواہ خود سیر ہی ہو گیا ہو اور اگر پہلے ہاتھ کھینچ لینا چاہتا ہے تو عذر بیان کر دے کیوں کہ بغیر عذر کھانے سے ہاتھ کھینچ لینا ساتھی کو شرمندہ کرتا ہے اور وہ بھی اپنا ہاتھ سکیڑ لیتا ہے اور ممکن ہے کہ اسے کھانے کی ضرورت ہو (ابن ماجہ)

کم مدت قیام: حدیث میں آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مہمان کو کسی کے پاس تین دن سے زیادہ قیام نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس سے صاحب خانہ کو تکلیف ہو گی اور اس پر بوجھ پڑے گا۔ (بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف)

اخلاقی حقوق

دُعائے خیر: مہمان اپنے میزبان کے لیے دعائے خیر کرے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صاحب خانہ کے لیے دعا فرمایا کرتے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انصار کے ایک گھر والوں سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے اور وہاں کھانا تناول فرمایا جب تشریف لانے لگے تو

آپ نے گھر کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا اور وہاں چٹائی پر پانی چھڑکا گیا تو آپ نے اس پر نماز ادا کی اور ان کے لیے دعا فرمائی۔ (بخاری)

بیمار کے حقوق

انسانی معاشرہ میں بیماروں کا ایسا طبقہ ہے جو ہماری ہمدردیوں اور خبرگیری کا مستحق ہے اس وجہ سے اسلام نے ان کی عیادت کا حکم دیا ہے عیادت کا صرف یہی مفہوم نہیں ہے کہ مریض کی بیمار پرسی کر لی جائے بلکہ اس کا حقیقی مفہوم مریض کی دیکھ بھال اور غمخواری اور ہمدردی ہے۔ اسلام نے بیماروں کے لیے بعض شرعی سہولتیں دے دی ہیں۔ حج ساقط ہو جاتا ہے جہاد موقوف ہو جاتا ہے وضو معاف ہو جاتا ہے اگر کھڑا ہونے کی طاقت نہیں تو بیٹھ کر نماز ادا کرنے کی اجازت ہے۔ اگر بیٹھ کر بھی نماز ادا نہیں کر سکتا تو لیٹ کر۔ اگر لیٹ کر بھی نہیں تو اشارہ سے روزہ توڑنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔

قرآن مجید نے ایک کلی اصول مقرر کر دیا ہے۔ وَلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ (نور۲۴:۶۱) اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے۔

عیادت: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ جب وہ بیمار پڑے تو وہ اس کی عیادت کرے۔ (بخاری کتاب الجنائز)

صحابہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا جن میں سے ایک بیمار کی عیادت ہے۔ (بخاری کتاب الجنائز)

فرمایا جب کوئی صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے اس کی مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کی بخشش کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں۔ (سنن ابی داؤد کتاب الجنائز)

دُعا: جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی کسی کی عیادت کے لیے جائے۔ تو اس کے ہاتھ اور پیشانی پر ہاتھ رکھے اور اس کو تسلی دے اور اس کے شفا پانے کے لیے دعا کرے۔ (سنن ابی دائود کتاب الجنائز)

ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عیادت کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ اے ابن آدم! میں بیمار تھا تو نے میری عیادت نہ کی۔ وہ کہے گا اے میرے پروردگار! تو تو سارے جہانوں کا پروردگار تھا میں تیری عیادت کیونکر کرتا اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا۔ مگر تو نے اس کی عیادت نہ کی اگر کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ (صحیح مسلم باب فضل عیادۃ المریض)

خادم اور آقا کے حقوق و فرائض

خادم کے معاشرتی حقوق: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کی ہر چیز کے لیے رحمت کا پیغام لے کر آئے۔ اس پیغام نے ظلم و جور کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ دنیا کے ہر ملک میں بعثت نبوی سے قبل خادموں کے ساتھ نہایت ہی وحشیانہ اور بہیمانہ سلوک ہوتا تھا۔ ہر وقت محنت اور کام میں مصروف رکھے جاتے۔ پیٹ بھر کر روٹی نہ دی جاتی۔ تن ڈھانپنے کے لیے چارگرہ کپڑا نہ دیا جاتا۔ ذرا سی غلطی پر مار مار کر لہولہان کر دیا جاتا۔ سب سے بڑھ کر اگر کوئی ملازمہ عورت ہے تو اس کی آبرو محفوظ نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کو ذریعہ آمدن بنالیا جاتا۔ اسلام نے خادموں کے حقوق مقرر کیے۔ ان کو پستی سے اٹھا کر مقام عزت پر لا کھڑا کیا۔

حسن سلوک: اسلام نے صرف والدین اور رشتے داروں سے نیک سلوک کرنے کی تعلیم نہیں دی بلکہ ملازموں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کی تعلیم بھی دی ہے ارشاد الٰہی ہے: وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا (النساء۴:۳۶) اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور قریبیوں کے ساتھ بھی اور یتیموں اور مسکینوں اور قریبی پڑوسی اور دور کے پڑوسی اور پاس والے ساتھی اور مسافر اور ان کے ساتھ جن کے تمھارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے اللہ اسے پسند نہیں کرتا جو تکبر کرنے والا فخر کرنے والا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ يَسَّرَ اللّٰهُ حَتْفَهٗ وَاَدْخَلَهٗ جَنَّتَهٗ رِفْقٌ بِالضَّعِيْفِ وَشَفَقَةٌ عَلَى الْوَالِدَيْنِ وَاِحْسَانٌ اِلَى الْمَمْلُوْكِ. (ترمذی) جس میں تین خصلتیں ہوں خدا اس کی موت آسان کر دیتا ہے اور اسے جنت میں داخل کرے گا۔ ناتوانوں کے ساتھ نرمی اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا اور غلاموں کے ساتھ احسان کرنا۔

حُسْنُ الْمَمْلُوْكَةِ يَمَنٌ وَسُوْءُ الْخُلُقِ شُؤْمٌ (ابوداؤد) غلاموں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا برکت کا باعث ہے اور بدخلقی سے پیش آنا بے برکتی کا موجب ہے۔

کھانا کپڑا: اسلام صرف یہی تعلیم نہیں دیتا کہ ملازموں کو کھانا کپڑا دیا جائے بلکہ یہ حکم بھی دیتا ہے کہ آقا جو کھائے وہی ملازم کو کھلائے اور جو پہنے وہی ملازم کو پہنائے۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ لونڈی غلام تمھارے بھائی بہن ہیں۔ خدا نے ان کو تمھارے ماتحت کر دیا ہے تو جس کے بھائی بہن کو اللہ تعالیٰ اس کے ماتحت کر دے اس کو چاہیے کہ جیسا وہ خود کھاتا ہے ویسا ہی ان کو کھلائے اور جیسا خود پہنتا ہے ویسا ہی ان کو پہنائے ان کو ایسے کام پر مجبور نہ کیا جائے جو ان کی طاقت سے باہر ہو۔ اگر کوئی ایسا کام کرنے کے لیے کہا جائے تو آقا خود بھی اس کام میں اس کا ہاتھ بٹائے چنانچہ حضرت ابوذرؓ جو خود کھاتے پہنتے تھے وہی غلام کو کھلاتے پہناتے تھے۔ (بخاری باب قول النبی العبید. اخوانکم فاطعموھم مما تاکلون)

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب تم لوگوں میں سے کسی کا خادم آپ کے لیے کھانا تیار کر کے لائے۔ کیوں کہ اس نے کھانا پکانے میں آگ کی گرمی اور دھوئیں کی تکلیف اٹھائی ہے۔ اس لیے اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلانا چاہیے اگر کھانا کم ہو تب بھی اس کے ہاتھ پر چند لقمے رکھ دینا چاہیے۔ (مسلم کتاب الایمان باب اطعام المملوک مما یاکل)

فرمایا: لَعَنَ اللّٰهُ قَوْمًا يَرْغَبُوْنَ عَنْ اَرِقَّائِهِمْ اَنْ يَّاْكُلُوْا مَعَهُمْ (الاداب المفرد باب مل یجلس خادمہ اذا کل) اور ان لوگوں پر لعنت کرے جو اپنے غلاموں کے ساتھ کھانا کھانے سے احتراز کرتے ہیں۔

ملازموں کو مارنے کی ممانعت: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لوگو! میں تم کو بتاؤں بدترین آدمی کون ہے وہ جو تنہا کھاتا ہے اپنے نوکر کو تازیانہ لگاتا ہے مگر اس کو کھانے کے لیے کچھ نہیں دیتا۔ (مشکوٰۃ باب النفقات و حق المملوک)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لونڈی غلاموں کے ساتھ بھلائی کرنے کی ہدایت فرماتے تھے کہ جو تم کھاتے اور پہنتے ہو وہی ان کو کھلاؤ اور پہناؤ اور اللہ کی مخلوق و (ملازم) کو سزا نہ دو۔ (ادب المفرد باب اکسوھم مما تلبسون)

حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص اپنے غلام کو مارے تو اللہ کو یاد کرے۔ (ترمذی

ابواب البر و الصلة باب ماجاء فی ادب الخادم)

حضرت ابومسعود سے روایت ہے کہ میں اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی ابومسعود جان لو ابومسعود جان لو پیچھے مڑ کر دیکھا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے آپ نے فرمایا تم کو اپنے غلام پر قدرت ہے اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ طاقت تم پر رکھتا ہے ابومسعود کہتے ہیں کہ اس کے بعد پھر میں نے اپنے کسی غلام کو نہیں مارا۔ (ترمذی ابواب البر و الصلة باب النهی عن ضرب الخدام و شتمهم)

عفو درگزر: اسلام نے صرف مارنے اور جھڑکنے ہی سے منع نہیں کیا بلکہ ان سے غلطی سرزد ہو جائے تو درگزر کرنے کی تعلیم دی ہے حدیث شریف میں آتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ہم خدمتگاروں کے قصوروں سے کتنی دفعہ درگزر کریں آپ خاموش رہے۔ اس نے پھر اپنی بات کو دہرایا آپ پھر خاموش رہے۔ جب تیسری دفعہ اس نے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ہر روز ستر دفعہ درگزر کیا کرو۔ (ابو داؤد' ترمذی ابواب البر والصلة ماجاء فی ادب الخادم)

شادی کی ذمہ داری: رومن ایمپائر میں غلام قانونی طور پر شادی کا حق دار نہ تھا۔ (انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس باب سلیوری) لیکن قرآن میں آتا ہے آقا پر یہ فرض ہے کہ وہ اپنے خدمتگار (مرد یا عورت) کی شادی کرے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (نور ۲۴:۳۲) اور جو تم میں سے مجرد ہیں۔ ان کے نکاح کر دو اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے بھی جو صلاحیت رکھتے ہوں اگر وہ محتاج ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا اور اللہ فراخی والا علم والا ہے۔

حضرت امام بیضاوی صاحب فرماتے ہیں۔ وفيه دليل على وجوب تزويج ملوكية والمملوك (تفسیر بیضاوی مطبوعہ مصر صفحہ ۲۰۵) یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ غلام اور باندی کا نکاح کرنا واجب ہے۔

انسانی اخوت: اسلام نے روئے زمین کے تمام انسانوں کو اخوت کی سلک میں منسلک کیا ہے۔ سب کی ایک ہی اصل قرار دی ہے ارشاد الٰہی ہے: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا (النساء ۴:۱) اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں اور اللہ کے حقوق کی جس کے ذریعہ تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رحموں کی نگہداشت کرو اللہ تم پر نگہبان ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ اِنَّهُمْ اِخْوَانُكُمْ فَضَّلَكُمُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (ابو داؤد باب حق المملوک) وہ تمہارے بھائی ہیں جن پر اللہ نے تم کو فضیلت دی ہے۔

ایک اور روایت ہے۔ اِخْوَانُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ اَيْدِيْكُمْ (ابو داؤد باب حق المملوک والادب المفرد) غلام تمہارے بھائی ہیں جن کو اللہ نے تمہارے قبضہ میں کر دیا ہے۔

امامت کا حق: اسلام میں نماز صرف عبادت کا اہم رکن ہے نماز کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں مَنْ ترک الصلوٰة متعمداً فقد کفر جس نے نماز کو جان بوجھ کر چھوڑا اس نے کفر کیا الصلوٰة معراج المومنین. نماز مومنوں کے معراج کا ذریعہ ہے۔ اسلام نے اس اہم عبادت میں غلام کو امامت کا حق دیا ہے حدیث میں آتا ہے حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ابوحذیفہ کے غلام سالم نماز میں امامت کراتے تھے۔ آپ کی اقتدار میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و ابوسلمہؓ زید اور عامر بن ربیعہ بھی شامل ہوتے تھے۔ نماز پڑھتے تھے۔ (صحیح بخاری باب استفضاء الموالی واستعمالهم)

حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن مسعود کو کوفہ کا قاضی بنا کر بھیجا تو عمار بن یاسر کو کوفہ کا امام نماز اور قائد لشکر بنا کر بھیجا (فتوح البلدان بلاذری یوم جلولا الوقیعة)

غلاموں کی عیادت: حضرت اسود بن ابی زیدؓ سے روایت ہے کہ جب کوئی وفد حضرت عمرؓ کے پاس آتا تو اس سے دریافت کرتے تھے کہ تمہارے علاقے کا گورنر کیسا ہے؟ وہ کہتے بہت اچھا آدمی ہے پھر آپ دریافت کرتے کہ غلاموں کی عیادت کرتا ہے یا کہ نہیں وہ کہتے ہاں کرتا ہے اور بعد ازاں دریافت کرتے کہ ضعیفوں اور کمزوروں کے ساتھ اس کا برتاؤ کیسا ہے ان غرباء کو اس کے دروازہ پر بیٹھنے کی اجازت بھی ہے یا کہ نہیں وہ جواب ہاں میں دیتے اگر ان سوالات میں سے کسی ایک سوال کا جواب نفی میں ہوتا تو حضرت عمرؓ گورنر کو معزول کر دیتے تھے۔ (تاریخ طبری ج ۵ صفحہ ۳۳)

آقا کو نصیحت کرنے کا حق: دوسری اقوام عالم میں غلام کو آقا کے سامنے بولنے تک کی اجازت نہیں۔ اسلام نے غلاموں کو فکری اور قولی آزادی بخشی ہے

وہ اپنے آقا کے کسی فعل پر نکتہ چینی کرسکتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے: اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا نَصَحَ لِسَيِّدِهٖ وَاَحْسَنَ عِبَادَةَ رَبِّهٖ فَلَهٗ اَجْرُهٗ مَرَّتَيْنِ (ابو داؤد ادب المفرد اذا نصح العبد السیدہ) غلام اپنے آقا کو نصیحت کرے اور اللہ کی اچھی طرح عبادت کرے تو اس کو دوہرا ثواب ملے گا۔

آئینی حقوق

خدمت گار اور غلام مالِ غنیمت میں ویسے ہی حق دار ہیں جیسے احرار قرآن مجید میں غنیمت سے متعلق جتنی آیات آئی ہیں ان میں آزاد اور غلام کی تفریق نہیں کی۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ ابوبکرؓ بیت المال سے وظائف تقسیم کرتے وقت آزاد اور غلام میں کوئی فرق نہ کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ كَانَ اَبِىْ يَقْسِمُ لِلْحُرِّ وَلِلْعَبْدِ (ابوداؤد کتاب الخراج باب فی قسم الفی) میرے باپ غلام اور آزاد دونوں کے لیے تقسیم کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا میں نے ہر مسلمان کے لیے ہر مہینہ میں دو مدگیہوں اور دو قسط زیتون کے لیے اور دو قسط سرکہ کے لیے مقرر کر دیے ہیں۔ تو ایک شخص نے کہا و العبد یعنی کیا غلام کو بھی اتنا ہی ملے گا آپ نے فرمایا۔ و العبد ہاں غلام کو بھی۔ (فتوح البلدان بلاذری ص ۴۶۶)

حرام کاری پر مجبور نہ کرنا: زمانہ جاہلیت میں بعض لوگ لونڈیوں سے زنا کراتے اور اس کی اجرت وصول کرتے تھے۔ اسلام نے لونڈیوں کی عصمت محفوظ رکھنے کے لیے اس رسم کو مٹا دیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (نور۲۴:۳۳) اور اپنی لونڈیوں کو اگر وہ پاکدامن رہنا چاہتی ہیں بدکاری پر مجبور نہ کرو تاکہ تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہو اور جو کوئی انھیں مجبور کرے گا تو اللہ ان کے جبر کے بعد بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

شہادت کا حق: رومیوں کے نزدیک غلام کی شہادت کو قابل اعتبار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے غلام کی شہادت کو معتبر سمجھا ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے غلاموں اور باندیوں کی شہادت کے معنی پوچھا گیا تو فرمایا غلام کی شہادت جائز ہے بشرطیکہ وہ عادل ہو۔ (بخاری شهادة الاماء والعبد)

حافظ امام ابن تیمیہؒ شہادت عبد کے جواز پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اگر کسی ایک فقیہہ نے کہا ہے کہ غلام کی گواہی قابل اعتبار نہیں تو اس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کوئی الزام نہیں آتا اور نہ اس کا قول اور اللہ رسول کے فرمان کے بالمقابل ہمارے لیے حجت ہوسکتا ہے۔ اسی طرح کی بات کہنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کھلا ہوا بہتان ہے۔ آپ کی طرف سے ایک حرف بھی ایسا نہیں آیا جس میں فرمایا گیا ہو کہ غلاموں کی گواہی قابل اعتبار نہیں اس کے برعکس کتاب اللہ وسنت رسول اللہ اور اجماع صحابہ اور میزان عدل سب اس پر دلالت کرتے ہیں کہ غلام کی شہادت ان تمام امور میں معتبر ہونی چاہیے جن میں حر کی شہادت قبول ہوتی ہے۔ (القیاس فی الشرع الاسلامی صفحہ ۱۲۸)

ملکیت کا حق: اسلام سے قبل غلاموں کو حق ملکیت حاصل نہ تھا اسلام نے ان کے حق ملکیت کو تسلیم کیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ بریرہ حضرت عائشہؓ کی باندی تھیں کسی نے ان کو گوشت ہبہ کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر تشریف لائے تو دریافت کیا کچھ کھانے کو ہے۔ بولیں گوشت ہے مگر فلاں نے مجھ کو صدقہ دیا ہے آپؐ نے فرمایا۔ لَكِ صَدَقَةٌ وَلَنَا هَدِيَّةٌ وہ گوشت تمھارے لیے تو صدقہ ہے مگر ہمارے لیے ہدیہ ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نوکر بھی اشیاء کے مالک ہوتے ہیں۔

سیادت کا حق: معاشرتی زندگی میں غلاموں کو احرار کے ساتھ پوری مساوات تھی عہد نبوی میں غلاموں کو لشکر کی قیادت سونپی گئی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شام کی مہم کی قیادت حضرت اسامہؓ کے سپرد کی وہ صرف اٹھارہ برس کے نوخیز جوان تھے۔ ان کے والد زید کو موتہ کی لڑائی میں قائد لشکر مقرر کیا گیا تھا۔

امان کا حق: جنگ میں جس طرح ایک حُر کسی شخص کو امن دے سکتا ہے اور قائد لشکر اس کو معتبر سمجھتا ہے اسی طرح غلام کے قول کو معتبر سمجھا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ ایک سردار کو لکھتے ہیں: ان عبدالمسلمین من المسلمین و ذمته من ذمتهم یجوز امانه' (ابو داؤد فی حق المملوک) مسلمانوں کا غلام مسلمانوں میں سے ہے اس کا عہد بھی مسلمانوں کے عہد کی طرح ہے اس کا امن دینا جائز ہے۔

غلام کو خصی کرنے کی ممانعت: بعثت سے قبل دنیا کی مختلف اقوام میں غلام کو خصی کرنے کی رسم چلی آرہی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بہیمانہ رسم کو ختم کیا۔ فرمایا: من خصٰی عبده خصیناه (ابو داؤد من قتل عبده) جو شخص اپنے غلام کو خصی کرے گا ہم بھی اس کو خصی کر دیں گے۔

تہمت لگانے کی ممانعت: حدیث شریف میں آتا ہے: مَنْ قَذَفَ مَمْلُوْكَهٗ وَهُوَ بَرِیْئٌ مِمَّا قَالَ جُلِدَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِلَّا اَنْ یَّكُوْنَ كَمَا قَالَ. (بخاری) جو شخص اپنے کسی غلام پر تہمت لگائے اور وہ اس سے بری ہو اس کو قیامت کے دن کوڑے لگائے جائیں گے مگر یہ کہ ایسا ہی ہو جیسا کہ اس نے کہا ہے۔ تمام ائمہ کا اجماع ہے کہ آقا پر حد قذف لگائی جائے گی۔

غلام کے لیے حدود و عقوبات: ازروئے احکام فقہ غلاموں کے لیے حدود و عقوبات آزاد آدمیوں کی نسبت نصف ہیں جس جرم کی پاداش میں ایک آزاد آدمی کے لیے اسی کوڑے ہیں تو اسی جرم میں عبد کو چالیس کوڑے لگائے جائیں گے۔ حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> ''اگر غلاموں کے لیے انتہائی سزا (جو آزاد آدمیوں کے لیے ہے) مشروع کر دی جائے تو اس سے ظلم کا دروازہ وا ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک مالک اپنے غلام کو قتل کر دے گا اور بہانہ یہ تراشے گا کہ اس نے زنا کیا تھا اور پھر اس سے کوئی باز پرس بھی نہیں ہو گی اس بنا پر غلاموں کے حدود کو ایک حد تک کم کر دیا ہے کہ ہلاکت پر منتج نہ ہوں۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ صفحہ ۱۶۰)

اخلاقی حقوق

تعلیم دینا: خدمت گار صرف خدمت کے لیے ہی نہیں ہوتا بلکہ آقا کا یہ فرض ہے کہ اس کی تعلیم کا بھی اہتمام کرے۔ حضرت ابن عباسؓ اپنے غلام حضرت عکرمہ کو قرآن اور حدیث کی تعلیم دیتے تھے اور وہ سبق یاد نہ کرتے تو پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیتے تھے۔ (دارمی ص ۷۳)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں تین شخصوں کو دو اجر ملیں گے ایک وہ جو اپنی باندی کو تعلیم دے اور خوب اچھی تعلیم دے اس کو ادب سکھائے اور خوب سکھائے پھر اسکو آزاد کر کے خود اس سے نکاح کر لے۔ دوسرا وہ شخص ہے جو اہل کتاب تھا پھر اسلام لے آیا۔ تیسرا وہ شخص جو اللہ کا حق ادا کرتا ہے اور اپنے آقا کی خیر خواہی کرتا ہے۔ (بخاری باب من اسلم من اہل الکتاب)

غلام کی دعوت قبول کرنا: حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غلاموں کی دعوت قبول کرتے تھے اور ان کے ہاں چلے جاتے تھے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غلاموں اور باندیوں کی دعوت قبول کرتے تھے اور ان کے ہاں تشریف لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ ایک درزی غلام کے پاس تشریف لے گئے اس نے ایک پیالہ پیش کیا جس میں کدو تھا۔ آپ نے خوشی سے قبول فرما کر نوش کیا۔
(شرح الشفا للشهاب ج ۲ صفحہ ۷۷)

آقا کے حقوق

معاشرتی حقوق

خدمت گزاری: ملازم پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کام کاج محنت اور دیانتداری سے انجام دے قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ (القصص ۲۸:۲۷) حضرت شعیبؑ کی بیٹی نے باپ سے کہا (بہترین آدمی جسے تو ملازم رکھنا چاہتا ہے وہ ہے جو مضبوط بھی ہو دیانت دار بھی)

حدیث میں آتا ہے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص جنت میں داخل ہو کر دیکھے گا کہ اس کا غلام اس سے اوپر کے درجہ میں ہے وہ کہے گا اے اللہ یہ تو میرا خادم ہے' جواب ملے گا میں نے اس کو اس کے عمل اور تجھ کو تیرے عمل کا بدلہ دیا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تین آدمیوں کو دوہرا اجر ملے گا۔ ایک اہل کتاب میں سے وہ شخص جو اپنے نبی پر ایمان لایا اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی ایمان لایا اور دوسرے وہ غلام جو خدا کا حق بھی ادا کرتا ہے اور اپنے آقاؤں کا بھی اور تیسرے وہ شخص جس کے پاس باندی ہو اور بلحاظ ملک وہ اس سے ہم بستر ہوتا ہو پھر اس نے اچھا ادب سکھایا اور اچھی تعلیم دی پھر اس کو آزاد کرے تو اس سے نکاح کر لیا تو اس کے لیے بھی دوہرا اجر ہے۔ (صحیحین)

حضرت جریر سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب غلام بھاگ جاتا ہے تو اس کی کوئی نماز قبول نہیں کی جاتی اور انہی سے ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ جو غلام بھاگ جاتا ہے وہ اللہ کے ذمے اور عہد سے خارج ہو جاتا ہے۔ ایک اور روایت میں انہی سے مروی ہے کہ

جوغلام اپنے آقاؤں کی خدمت سے منہ پھیر کر بھاگ جاتا ہے جب تک اس کے پاس واپس نہ آجائے وہ کافر رہتا ہے۔

خیر خواہی: ملازم پر یہ فرض ہے کہ وہ اپنے آقا کی خیر خواہی سامنے رکھے۔ وہ دیکھے کہ اس سے غلطی سرزد ہو رہی ہے تو نصیحت کر دے حدیث میں آتا ہے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب غلام اپنے آقا کی خیر خواہی کرتا ہے اور اچھی طرح خدا کی عبادت کرتا ہے تو اسے دہرا اجر ملے گا۔

غلامی کا خاتمہ

اسلام سے قبل دنیا کے ہر خطے میں غلامی کا رواج تھا...... ضروریات زندگی کی اشیاء کی خرید و فروخت کی طرح غلاموں کی بھی خرید و فروخت ہوا کرتی تھی۔ اسلام نے اس انسانی توہین آمیز رواج کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔ غلامی کے خاتمہ سے متعلق اسلامی تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اوّل: مستقبل میں ہمیشہ کے لیے غلامی کو ختم کرنے کے متعلق تعلیم۔

دوم: غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی آزادی کا بندوبست۔

غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی آزادی کا انتظام: قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (النساء ۳۶:۴) اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور قریبیوں کے ساتھ بھی اور یتیموں اور مسکینوں اور قریبی پڑوسی اور دور کے پڑوسی اور پاس والے ساتھی اور مسافر اور ان سے بھی جن کے تمھارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے (غلام) اس آیت کریمہ میں غلاموں کے ساتھ معاشرہ کے دیگر افراد کی طرح حسن سلوک کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔ اِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ يَدِهٖ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَاْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا تُكَلِّفُوْهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَاِنْ كَلَّفْتُمُوْهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَاَعِيْنُوْهُمْ (بخاری کتاب العتیق باب قول النبی العبید اخوانکم فاطعموھم مما یاکلون) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ تمھارے غلام تمھارے بھائی ہیں۔ خدا نے ان کو تمھارے ماتحت کر دیا ہے تو جس کے تحت بھائی بہن کو اللہ اس کے ماتحت کر دے اس کو چاہیے کہ جیسا وہ خود کھاتا ہے ویسا ہی ان کو کھلائے اور جیسا خود پہنتا ہے ویسا ہی ان کو پہنائے۔ اپنے غلاموں کو ایسا کام نہ دے جو ان کی طاقت سے باہر ہو اور اگر کبھی ایسا کام دو تو پھر اس کام میں خود ان کی مدد کرو۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لوگو! میں تم کو بتاؤں کہ بدترین آدمی کون ہے۔ وہ جو تنہا کھاتا ہے اپنے غلام کو تازیانہ لگاتا ہے۔ مگر اس کو دیتا کچھ نہیں (مشکوٰۃ باب النفقات و حق المملوک)

وسائل و حریت: اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنے کے متعلق دو طریقے اختیار کیے ہیں۔ (۱) طوعی (۲) جبری

طوعی طریقہ: قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ (البلد ۹۰:۱۲-۱۳) اور تجھے کیا خبر کہ اونچی گھاٹی کیا ہے۔ کسی گردن کو آزاد کرنا۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَفِي الرِّقَابِ (البقرہ ۱۷۷:۲) لیکن بڑا نیک وہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت کے لیے قریبوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوالیوں کو اور غلام آزاد کرنے میں مدد دے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ مَنْ اَعْتَقَ النَّسَمَةَ اَعْتَقَ اللّٰهُ لِكُلِّ عُضْوٍ مِنْهَا عُضواً من النار (متفق علیہ) جو شخص کسی ایک نفس کو آزاد کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کو غلام کے ہر ہر عضو کے بدلے دوزخ کی آگ سے آزاد کرے گا۔ حضرت براءؓ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھے آپ کوئی ایسا عمل بتا دیجیے جو جنت میں داخل کر دے۔ آپ نے فرمایا تم نے لفظ تو مختصر کہے ہیں مگر بات بہت بڑی دریافت کی ہے (جنت میں داخل کرنے والا عمل یہ ہے) اعتق النسمة وفک الرقبة یعنی غلام کو آزاد کرو اگر اکیلے آزاد نہ کر سکو تو دوسروں کے ساتھ مل کر آزاد کرو (بیہقی شعب الایمان بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العتق) اس ترغیب کا یہ نتیجہ ہوا کہ صحابہ کرام کثرت سے غلام آزاد کرتے تھے شرح بلوغ المرام میں چند صحابہ کرام کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد بیان کی گئی ہے وہ درج ذیل کی جاتی ہے۔ گو یہ فہرست یقیناً نامکمل ہے لیکن یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ صحابہ کرام غلاموں کو آزاد کرانے میں کس قدر مشتاق تھے۔

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۶۳ غلام آزاد کیے۔

۲۔ حضرت عائشہؓ نے ۶۷۔ ۳۔ حضرت عباسؓ نے ۷۰۔
۴۔ حضرت حکیم بن حزامؓ نے ۱۰۰۔ ۵۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ہزار۔
۶۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے تین ہزار۔
۷۔ حضرت عثمان بن عفان نے بتیس صرف ایک دن میں' جو ان کی شہادت کا دن تھا۔ ویسے ان کی مجموعی تعداد بہت زیادہ ہے۔
۸۔ ذوالکلاع الحمیری نے آٹھ ہزار صرف ایک دن میں (سبل السلام شرح بلوغ المرام کتاب العتق)

جبری طریقہ: اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے بعض گناہوں کے کفارہ میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ قتل خطا ($\frac{۴}{۹۲}$) کفارہ ظہار ($\frac{۵۸}{۳،۴}$) کفارہ یمین ($\frac{۵}{۸۹}$) روزہ توڑنے کے کفارہ میں غلام آزاد کرنے کی تعلیم دی ہے۔

احادیث سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معمولی معمولی گناہوں کے کفارہ میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ مَنْ لَطَمَ مَمْلُوْکَہٗ اَوْ ضَرَبَہٗ فَکَفَّارَتُہٗ اَنْ یُّعْتِقَہٗ (ابو داود)

مکاتبت: وہ جبری انتظام ہے جس سے غلام خود بخود آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس انتظام کے تحت مالک اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ اگر غلام اس کے پاس رہنا پسند نہیں کرتا تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس سے مناسب رقم پیدا کرنے کی شرط کر کے آزادی حاصل کرے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:۔ وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ فَکَاتِبُوْھُمْ (نور۲۴:۳۳) اور جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں ان میں سے جو آزادی کی تحریر مانگیں تو انہیں دو۔ اگر ایک غلام کی ملکیت میں کئی آدمی شریک ہوں تو ایک شخص اپنا حصہ آزاد کرتا ہے۔ تو اس صورت میں صرف وہ حصہ ہی نہیں بلکہ پورا غلام آزاد ہو جائے گا۔ اگر آزاد کرنے والا شخص مالدار ہے تو اس پر دوسرے شرکاء کے حصوں کو آزاد کرنا ضروری ہے ورنہ غلام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسب کر کے دوسرے شرکاء کو قیمت ادا کرے اور اس کے بعد وہ آزاد ہو جائے گا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ مَنْ اَعْتَقَ نَصِیْبًا اَوْ شَقْصًا فِیْ مَمْلُوْکٍ فَخَلَاصُہٗ عَلَیْہِ فِیْ مَالِہٖ اِنْ کَانَ لَہٗ مَالٌ وَالْاَقْوَمُ عَلَیْہِ فَاسْتَسْعٰی بِہٖ غَیْ۔ مَشْقُوْقٍ عَلَیْہِ (ابو داود باب فی العتق علی الشرط) جس شخص نے کسی مشترک غلام میں اپنا حصہ آزاد کر دیا۔ پس اگر وہ مالدار ہے تو اس پر واجب ہے کہ اپنے شرکاء کے حصوں کے بقدر مال ادا کر کے اس کو آزاد کرے ورنہ اس کی قیمت مقرر کر لی جائے اور اس غلام سے بغیر کسی سخت محنت مشقت کے اس سے سعی و کسب کرایا جائے۔

غلاموں کی آزادی کے لیے بیت المال میں حصہ: اسلام نے صرف آزاد کرنے کی ترغیب نہیں دی بلکہ بیت المال میں غلاموں کی آزادی کے لیے ایک مستقل فنڈ مقرر کر دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْھَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُھُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَابْنِ السَّبِیْلِ فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰہِ (التوبہ ۹:۶۰) زکوٰۃ صرف ناداروں کے لیے ہے اور مسکینوں اور اس کے کارکنوں کے لیے اور جن کے دل مائل کرنا ہے اور غلاموں کے آزاد کرنے قرض داروں کے لیے اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے یہ اللہ کی طرف سے ضرور ٹھہرایا گیا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اس آیت میں ایک اسلامی حکومت پر یہ فرض ٹھہرایا ہے کہ وہ زکوٰۃ کے مال میں سے ایک حصہ غلاموں کے آزاد کرنے میں صرف کرے۔

ہمیشہ کے لیے غلامی کو ختم کرنے کی تعلیم: اسلام سے قبل غلام بنانے کے دو طریقے تھے۔

اوّل: جنگ کے دوران میں فاتح قوم مفتوح قوم کے مرد و زن کو غلام بنا کر ان کی متاع آزادی کو ہمیشہ کے لیے سلب کر لیتی۔

دوم: جنگ نہ ہو۔ تب مختلف حربوں سے طاقتور کمزوروں کی آزادی کو چھین لیتے تھے۔ مثلاً چوری چھپے یا علانیہ ڈاکہ ڈال کر مرد و زن کو لے بھاگنا یا چھین لینا یا خرید لینا۔

اسلام نے نسل انسانی کو غلام بنانے کے تمام طریقوں سے نجات دلائی اور غلامی کو صفحۂ ہستی سے حروف کی طرح مٹا دیا۔

غلام بنانا حرام فعل ہے: طریقہ دوم یعنی طاقت ور کا کمزور لوگوں کو چوری چھپے یا علانیہ ڈاکہ ڈال کر یا خرید و فروخت کے ذریعہ غلام بنا لینے کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے: عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اللہ تعالیٰ ثلاثۃ انا اخصمھم یوم القیامۃ رجل اعطی بی ثم غدر ورجل باع حُرًّا فاکل ثمنہ ورجل استاجرا اجیراً فاستوفی منہ ولم یعط اجرہ (بخاری کتاب البیع) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول

کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا کہ تین قسم کے لوگ ہیں جن سے قیامت کے دن جھگڑوں گا۔

اوّل: وہ شخص جو میرا واسطہ دے کر کسی سے کوئی عہد باندھتا ہے اور پھر اس عہد کو توڑتا ہے۔

دوم: وہ شخص جو کسی آزاد شخص کو غلام بناتا ہے اور اسے فروخت کر کے اس کی قیمت کھا جاتا ہے۔

سوم: وہ جو کسی شخص کو کام پر لگاتا ہے اور پھر اس سے کام تو پورا لے لیتا ہے مگر اس کی مزدوری نہیں دیتا۔

دوسری روایت یوں ہے۔

حضرت ابن عمرؓ نے روایت کی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے فرمایا کہ تین قسم کے لوگ ہیں جن کی نماز قبول نہ کی جائے گی اور میں ان سے قیامت کے دن لڑوں گا۔

اوّل: وہ شخص جو میرا واسطہ دے کر کسی سے کوئی عہد باندھتا ہے اور پھر بدعہدی کرتا ہے۔

دوم: وہ جو اسے غلام بناتا ہے۔ جسے خدا نے آزاد رکھا ہے۔

سوم: وہ جو مزدور سے تو پورا کام لیتا ہے اور پھر اس کی مزدوری نہیں دیتا۔ (ابوداؤد بروایت فتح الباری جلد ۴) صفحہ ۴۴۶)

قرآن مجید میں بھی چوری چھپے یا علانیہ ڈاکہ ڈال کر کسی کو آزادی سے محروم کر دینا ناجائز قرار دیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: مَاكَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (الانفال ۸: ۶۷، ۶۸) ایک نبی کے لیے شایاں نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں جنگ کر کے غالب نہ آئے۔ تم دنیا کا مال چاہتے ہو اور اللہ تمھارے لیے آخرت کو چاہتا ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے اور اللہ کی طرف سے پہلے سے حکم نہ ہو چکا ہوتا تو تم کو اس بارے میں جو تم کرنے لگے تھے۔ بھاری عذاب پہنچ کر رہتا۔

ہجرت کے بعد جب کفار مکہ مسلمانوں کی تباہی کے منصوبے تیار کرنے لگے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ والوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی جماعت بھیجی۔ انھیں کفار مکہ کے تین آدمی مل گئے جن پر مسلمانوں نے حملہ کر دیا اور ایک کو قتل کیا اور دو کو گرفتار کر کے مدینہ لے آئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حملہ پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ مقتول کا تو خون بہا ادا کیا' اور قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس طرح جب مسلمان جنگ بدر کے لیے نکلے تو اسلامی فوج میں بعض مسلمانوں کا خیال ہوا کہ فوج سے نبرد آزما ہونے کی بجائے قافلہ پر حملہ کر دیا جائے۔ ان وجوہ کی بناء پر یہ آیات نازل ہوئیں کہ سوائے جنگ کے اور کسی طریقے سے قیدی نہیں بنا سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے جنگ کے سوا دوسرے طریقوں کے ذریعے غلام بنانے کو "عرض الدنیا" کے الفاظ سے پکارا ہے اور "لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ" کے الفاظ میں تنبیہ کی ہے کہ اب وہ زمانہ گزر چکا ہے کہ جب طاقتور محض دنیاوی اغراض کے لیے آزاد انسانوں کو متاع حریت سے محروم کر دیتے تھے۔ جنگ کے سوا اور کسی طریقے سے قیدی بنانا عذاب عظیم کا موجب ہے۔

پس ان آیات میں جنگ کے ذریعہ کمزور قوموں کو غلام بنانے کے طریقہ کو ہمیشہ کے لیے مسدود کر دیا ہے۔ اب ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر جنگ چھڑ جائے اور جنگ میں قیدی پکڑے جائیں کیا وہ ہمیشہ کے لیے اپنی متاع آزادی سے محروم ہو جائیں گے اور فاتح قوم کے غلام بن جائیں گے۔

اسلام نے اس کا جواب نہایت ہی عمدہ پیرائے میں دیا ہے۔ جس سے رسم غلامی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (محمد ۴۷: ۴) سو جب تمہاری کافروں سے مڈبھیڑ ہو جائے تو گردنیں مارنا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم ان پر غالب آ جاؤ تو قید میں مضبوط باندھ لو پھر بعد میں یا تو احسان کے طریق پر یا فدیہ لے کر چھوڑ دو یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔

اس آیت کریمہ میں قیدیوں کے متعلق واضح حکم دے دیا کہ یہ قید عارضی ہو گی جب جنگ ختم ہو جائے گی یا تو ان قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا ہو گا یا احسان کے طور پر۔

احسان کو مقدم رکھا ہے جس میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو احسان رکھ کر چھوڑ دینا چاہیے۔

اس آیت نے قطعی فیصلہ دے دیا ہے کہ جنگی قیدی محض عارضی قیدی ہیں۔ جنگ کے اختتام پر ان کا چھوڑ دینا ضروری ہے۔

متذکرہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جنگ کے سوا غلام بنانا مستوجب عذاب عظیم ہے۔ اگر دفع شر کے لیے جنگ ناگزیر ہو جائے تو اگر جنگ میں قیدی پکڑے جائیں تو ان کی قید عارضی ہو گی۔ اختتام جنگ پر یا ان قیدیوں کو احسان رکھ کر چھوڑ دینا ہو گا یا فدیہ لے کر۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرز عمل: جب اسلامی غزوات پر نظر دوڑاتے ہیں تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسیران جنگ کو یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دیا یا فدیہ لے کر۔

غزوہ بدر میں جتنے قیدی ہاتھ آئے بعض سے معاوضہ لے کر اور بعض کو بغیر معاوضہ کے رہا کر دیا۔ جن قیدیوں کو بلا معاوضہ رہائی دی گئی تھی۔ ان میں سے ابوعزہ عمر والجمحی بھی تھا۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخانہ نظمیں لکھا کرتا تھا۔

غزوہ حنین میں چھ ہزار قیدی رہا کیے تھے۔ غزوہ بنی المصطلق میں چھ سو قیدی گرفتار ہوئے اور سب کو دفعتاً آزاد کر دیا گیا۔

فتح مکہ کے وقت ان تمام کفار کو جو آپ کے جانی دشمن تھے اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے مدینہ پر کئی مرتبہ حملہ کر چکے تھے۔ لا تثریب علیکم الیوم کہہ کر معاف کر دیا۔ انہی میں سے ہندہ بھی تھیں۔ جس نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبایا تھا۔ ابو جہل کا بیٹا عکرمہ عبداللہ بنؓ ابی سرحؓ اور کعب بن زہیر بھی جو اسلام دشمنی میں سرخیل کفار تھے معاف کر دیے گئے۔

غزوہ طائف میں جتنے قیدی آپ کے پاس آئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کو آزاد کر دیا۔ حضرت ابن عباس کے الفاظ یہ ہیں: اَعْتَقَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الطَّائِفِ كُلَّ مَنْ خَرَجَ اِلَيْهِ مِنْ رَقِيْقِ الْمُشْرِكِيْنَ. یعنی طائف کے دن مشرکوں کے جتنے غلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے آپ نے سب کو آزاد کر دیا اور پس اسلام کی اس تعلیم نے غلامی کی رسم کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور ان تمام طریقوں کو کلیتہً بند کر دیا۔ جن کے ذریعہ غلام بنائے جا سکتے تھے۔

آزاد شدہ غلاموں کا اسلامی سوسائٹی میں مقام: اسلامی سوسائٹی میں آزاد شدہ غلام ویسے ہی معزز و مکرم سمجھے جاتے تھے جیسے دوسرے آزاد شہری اور ان کو وہی حقوق حاصل تھے جو دوسروں کو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام زیدؓ بن حارثہ اور ان کے بیٹے اسامہؓ کو جنگی مہموں میں سپہ سالار مقرر کیا اور جلیل القدر اور صاحب عزت صحابیوں کو ان کے ماتحت رکھا۔ اس سے بڑھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حقیقی پھوپھی زاد بہن زینبؓ بنت جحش کو حضرت زیدؓ کے نکاح میں دے دیا سالمؓ بن معقل مولی ابی" حذیفہ جلیل القدر صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ ان چار قاریوں میں شمار ہوتے ہیں جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن مجید کی تعلیم کے لیے مقرر کیا تھا۔ حضرت عمرؓ حضرت بلالؓ کو ہمیشہ "سیدنا" کے لفظ سے پکارا کرتے تھے۔

غلاموں کو یک لخت کیوں آزاد نہ کیا گیا: مقبوضہ غلاموں کی بتدریج آزادی حکمت بالغہ پر مبنی ہے۔ فوری آزادی صرف آقاؤں کے لیے ہی باعث مضرت نہ تھی بلکہ غلاموں کے لیے بھی نقصان دہ تھی اور سوسائٹی کے تمدن اور اخلاق کے لیے تباہ کن تھی۔ وہ لوگ جو پشتوں سے غلاموں کی زندگی بسر کرتے چلے آ رہے تھے ان میں نہ صرف آزادی کی روح ہی فوت ہو چکی تھی بلکہ ان کے قوائے عملیہ بھی مضمحل ہو چکے تھے اگر ان کو خالی ہاتھ رہا کر دیا جاتا تو لاکھوں مرد و زن بے خانماں ملک میں پھرتے۔ ان کا کوئی ذریعہ معاش نہ ہوتا۔ نتیجہ یہ نکلتا یا تو وہ گدائی کی زندگی بسر کرتے یا ڈاکہ زنی سے بسر اوقات کرتے۔ اس طرح ملک کا تمدن اور اخلاق تہ و بالا ہو جاتا۔ ان قباحتوں سے بچنے کے لیے غلاموں کی اصلاح اور انسداد غلامی کے لیے تین طریقے اختیار کیے۔

۱۔ فوری اصلاح ۲۔ بتدریج اصلاح ۳۔ مستقل غلامی کا خاتمہ

فوری اصلاح یہ کہ غلام کے مرتبہ کو بلند کر دیا۔ آقاؤں کو یہ حکم دیا کہ جو وہ کھائیں وہی غلاموں کو کھلائیں جو خود پہنیں وہی غلاموں کو پہنائیں ان کی بساط سے بڑھ کر کام نہ دیں اگر وہ کام میں مشقت محسوس کریں تو ان کا ہاتھ بٹائیں۔ آقا اور غلام کے درمیان ایک کامل اخوت قائم کر دی اور پستی جو غلامی کی وجہ سے غلاموں کی روح میں رچی ہوئی تھی۔ رفعت میں تبدیل ہو گئی۔ وہ اپنے آپ کو معاشرہ کے باعزت رکن سمجھنے لگے۔

دوسری اصلاح بتدریج تھی یعنی جیسے جیسے غلام سوسائٹی کے مفید رکن بنتے چلے جائیں۔ ان کو مکاتبت کے ذریعہ یا گورنمنٹ کے خزانے سے یا عوام کی جیبوں سے آزادی بخشی جائے۔ قرآن اور حدیث دونوں سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ (النور ۲۴:۳۳) اور جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں ان میں سے جو آزادی کی تحریر مانگیں تو انھیں لکھ دو۔ اگر تم ان میں بھلائی جانتے ہو اور ان کو اللہ کے مال سے دو جو اس نے تم کو دیا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں یحییٰ بن کثیر روایت بیان کرتے ہیں۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَاتِبُوْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا قَالَ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ حِرْفَةً وَّلَا تُرْسِلُوْهُمْ كَلًّا عَلَى النَّاسِ (ابوداؤد بحوالہ تفسیر ابن کثیر زیر آیت مکاتبت) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ جو قرآن شریف میں آتا ہے کہ اگر تم غلاموں میں بھلائی پاؤ تو ان سے مکاتبت کرو۔ بھلائی سے مراد پیشہ وغیرہ کی اہلیت ہے اور فرمایا تم ان کو ایسی حالت میں مت

چھوڑ و کہ وہ لوگوں پر بوجھ ہوں۔

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا اَیُّ الرِّقَابِ اَفْضَلُ یعنی آزاد کرنے کے لیے کون سا غلام سب سے افضل ہے۔ فرمایا جو سب سے زیادہ گراں قیمت ہو اور مالک کے نزدیک سب سے زیادہ قابل قدر ہو ان الفاظ میں غلاموں کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مفید اور قیمتی فرد بنائیں' تا کہ ان کی آزادی کے لیے راہ ہموار ہو سکے کیونکہ آزادی کا سب سے پہلے وہی غلام مستحق ہے جو مفید ہو۔

اسلامی بیت المال میں غلاموں کے لیے ایک مد مقرر کر دی تا کہ وہ آزادی حاصل کر سکیں۔ ماوردی لکھتے ہیں:

''زکوٰۃ میں پانچواں حصہ غلاموں کا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعی کے نزدیک مکاتبین کو رقم دی جائے۔ جس سے خود کو آزاد کر لیں۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ غلام خرید کر آزاد کیے جائیں۔ (الاحکام السلطانیہ ص ۱۸۳)

۳۔ اسلام نے انسانوں کو مستقل غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھنے اور ان کی خرید و فروخت کو حرام قرار دے کر ہمیشہ کے لیے غلامی کا خاتمہ کر دیا۔

پس عہد نبوی میں غلاموں کی اصلاح اور خاتمہ اسیری کے یہی تین بہترین طریقے تھے جو اسلام نے اختیار کیے ان طریقوں سے ایک تو غلامی کی رسم ہمیشہ کے لیے مٹ گئی۔ دوسرا سوسائٹی کا انتظام اور اخلاق بھی تباہ نہ ہوا۔

دوستوں کے حقوق

انسان کا مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے جہاں اور بے شمار سوسائٹی کے افراد سے واسطہ پڑتا ہے وہاں اس کے دوست اور شناسا ہیں۔ جن کے تعاون کی ہر وقت ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے دوستوں کے حقوق و فرائض بھی بیان کر دیے ہیں۔

معاشرتی حقوق: اسلامی معاشرہ کا بنیادی پتھر اخوت اور امداد باہمی ہے اس وجہ سے اسلام نے ہر وہ عمل کرنے کی تعلیم دی ہے۔ جو اخوت کو تقویت دے اور ہر اس عمل سے روکا ہے جو اخوت کو مجروح کرے۔

حسن سلوک: قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (النساء ۴:۳۶)

اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور قریبیوں کے ساتھ بھی اور یتیموں اور قریبی پڑوسی اور دور کے پڑوسی اور دوستوں اور مسافر کے ساتھ بھی۔

دوسری جگہ آتا ہے: اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهَاتُهُمْ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهَاجِرِيْنَ اِلَّا اَنْ تَفْعَلُوْآ اِلٰى اَوْلِيَآئِكُمْ مَّعْرُوْفًا كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُوْرًا (الاحزاب ۳۳:۶) نبی مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتا ہے اور اس کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔ رشتہ دار اللہ کے حکم میں مومنوں اور مہاجروں کی نسبت ایک دوسرے پر زیادہ حق رکھتے ہیں۔ مگر یہ دوسری بات ہے کہ تم اپنے دوستوں سے اچھا سلوک کرو یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

ظلم سے اجتناب: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوستوں اور بھائیوں پر ظلم و ستم سے منع کرتے ہوئے فرمایا جس کسی نے اپنے بھائی دوست کی عزت یا کسی اور چیز کے بارے میں ظلم کیا ہو۔ اسے چاہیے کہ آج اس سے معاف کرالے قبل اس کے کہ اس کے پاس درہم و دینار نہ رہیں اگر اس کا کوئی عمل نیک ہوگا تو اس میں سے بقدر اس کے ظلم کے لیے لیا جائے گا۔ اگر اس کے نامہ اعمال میں نیکیاں نہ ہوں گی تو اس مظلوم کی بدیاں اس کے ذمہ ڈال دی جائیں گی۔ (صحیح بخاری کتاب المظالم)

ترک ملاقات سے ممانعت: حدیث میں آتا ہے حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی (دوست) سے کسی ناراضی کی وجہ تین دن سے زیادہ ترک ملاقات کرے دونوں ایک راستہ میں ملیں تو ایک ادھر منہ موڑ کر چلا جائے اور دوسرا ادھر اور دونوں میں بہتر وہ ہے جو پہلے سلام کرے۔ (بخاری، مسلم، مشکوٰۃ صفحہ ۴۲۷)

حضرت ابوخراش سلمی سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے ایک سال تک اپنے بھائی (دوست) سے ترک ملاقات کی تو گویا اس نے اسے قتل کر ڈالا ہے۔ (ابوداؤد)

قرآن مجید میں آتا ہے: يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر ۵۹:۹) اور وہ اپنے آپ پر دوستوں کو مقدم رکھتے ہیں گو انھیں تنگی ہو۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی نضیر کے مال مہاجرین میں تقسیم کر دیے۔ اور انصار میں سے صرف دو کو حصہ دیا۔ ابو دجانہ حضرت سماک بن خرشہ کی کنیت ہے لہٰذا آپؐ نے دو اشخاص کو مال عطا فرمایا تھا (دیکھو الرحیق المختوم اور سیرۃ النبیؐ) اور تیسرے سہل بن حنیف پھر انصار سے فرمایا۔ تم چاہو تو مہاجرین کو اپنے مالوں اور مکانوں سے حصہ دے دو اور اس غنیمت میں شریک ہو جاؤ اور چاہو تو تمھارے مال تمھارے پاس ہی رہیں اور مال غنیمت میں سے تمھیں کچھ نہ دیا جائے۔ انصار نے عرض کیا کہ آپ ہمارے مال اور ہمارے گھر انھیں تقسیم کر دیجیے۔ اور ہم مال غنیمت میں بھی انھیں ترجیح دیتے ہیں اور اس میں شریک نہیں ہوتے۔ (بخاری)

تعارف: حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب ایک شخص دوسرے شخص سے دوستی کرے تو چاہیے کہ اس کا اور اس کے باپ کا

نام پوچھ لے اور دریافت کر لے کہ کن لوگوں میں سے ہے کیونکہ یہ بات دوستی کو زیادہ تقویت دیتی ہے۔ (ترمذی)

بدظنی سے ممانعت: بدظنی رشتہ مودت کو توڑ کر رکھ دیتی ہے اس وجہ سے قرآن مجید اور حدیث میں بدظنی کرنے سے روکا ہے عموماً دو دوستوں کے درمیان بدظنی ہی لڑائی کا موجب ہوتی ہے ارشاد الٰہی ہے۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (الحجرات ۱۲:۴۹) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو گمان بد کرنے سے بچو کیونکہ بعض بدگمانی گناہ ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں ایاکم والظن فان الظن اکذب الاحادیث (مشکوٰۃ صفحہ ۴۲۷) بدگمانی سے بچو اس لیے بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔

سفارش: اسلام کسی صاحب اختیار کے پاس جائز کام کے لیے کسی ضرورت مند کی سفارش کو مستحسن سمجھتا ہے قرآن مجید میں آتا ہے:۔

وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً یَّكُنْ لَّهٗ نَصِیْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا (نساء۴: ۸۵) جو کوئی بھلی سفارش کرے اس کو اس سے حصہ ملے گا اور جو کوئی بری بات کی سفارش کرے اس کو اس سے حصہ ملے گا۔

مذاق اڑانے سے پرہیز: عموماً دوستوں کے درمیان لڑائی ایک دوسرے کا مذاق اڑانے سے ہو جاتی ہے۔ دوستی کے رشتے کو مضبوط رکھنے کے لیے اسلام نے مذاق اڑانے سے منع کر دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ (الحجرات ۱۱:۴۹) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ایک قوم دوسری قوم پر ہنسی نہ کرے شاید وہ ان سے بہتر ہوں۔

دوستوں کے بعض حقوق و فرائض عام حقوق سے مشترک ہیں ان کا ذکر مسلمانوں کے باہمی حقوق و فرائض کے عنوان کے تحت آئے گا۔

مسلمانوں کے باہمی حقوق وفرائض

معاشرتی حقوق

اخوت و وحدت: اسلام سے قبل تمام عرب معاشرہ افتراق وانتشار کا شکار تھا۔ معمولی سی بات پر جنگ چھڑ جاتی تو ایک طویل سلسلہ اختیار کر لیتی پشتہا پشت اس لڑائی کی آگ میں جلتی رہتیں۔ اگر کسی ایک خاندان کا آدمی قتل ہو جاتا تو مقتول کے بیٹے انتقام لینے کے درپے ہو جاتے اگر وہ بدلہ نہ لے سکتے۔ تو ان کے بیٹے علیٰ ہذا القیاس جب تک بدلہ لے لیا نہ جاتا اس وقت تک ان کے خون میں انتقام کی آگ بھڑکتی رہتی ان لڑائیوں کو مورخین ایام العرب کے نام سے پکارتے ہیں قرآن مجید میں عربوں کی اس حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ارشاد الٰہی ہے: وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا (ال عمران ۳:۱۰۲) تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تم کو اس سے بچا لیا۔ اسلام آیا اس نے ایک دوسرے کے خون کے پیاسوں کو دینی اخوت کی لڑائی میں منسلک کر دیا قرآن مجید میں آتا ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات ۴۹:۱۰) مومن بھائی بھائی ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنْ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (الانفال ۸:۶۳) اور اس نے ان کے (مومنوں) دلوں میں الفت ڈالی اگر تو جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب خرچ کر دیتا تو ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتا لیکن اللہ نے ان میں اُلفت ڈال دی وہ غالب حکمت والا ہے۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (ال عمران ۳:۱۰۲) اور سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقہ نہ کرو۔

تفرقہ اور انتشار سے منع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ (الانفال ۸:۴۶) اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو اگر ایسا کرو گے تو تمہاری طاقت سست پڑ جائے گی اور ہوا اکھڑ جائے گی۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ (ال عمران ۳:۱۰۵) اور ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے تفرقہ کیا اور اختلاف کیا اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی باتیں آ چکی تھیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا (بخاری) تم اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی اخوت کو تمثیل کے رنگ میں بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَكٰى عُضْوًا تَدَاعٰى لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى (بخاری ومسلم کتاب البر والصلۃ والآداب باب تراحم المومنین) مسلمانوں کے ایک دوسرے سے محبت کرنے رحم کرنے شفقت کرنے کی مثال ایک جسم کی طرح ہے کہ جب ایک عضو کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضًا ثُمَّ شَبَّكَ بَيْنَ اَصَابِعِهٖ (بخاری ومسلم باب تراحم المومنین) ایک مومن دوسرے مومن کے لیے عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط کرتا ہے۔ پھر آپ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا۔

اختلاف اور افتراق کے بدنتائج سے ڈراتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ انما اهلک من کان قبلکم الاختلاف. (کنوز الحقائق حرف الهمزة) اگلے لوگوں کو اختلاف نے ہلاک کر دیا۔

اسلام کے اس درس اخوت کا اقرار غیر مذاہب کے فاضل علماء نے بھی کیا۔ ہندو فاضل چندر پال لکھتا ہے۔

”اسلام نے اخوت اور برادرانہ روابط پر جس قدر زور دیا۔ اور وہ جس قدر شد و مد سے اس پر عمل پیرا ہوا۔ اس کی مثال دنیا کا کوئی مذہب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس میں ہندوؤں کی طرح ذات پات کا رواج موجود نہیں یہ مسلمانوں کی انتہائی ہمدردی اور خدا ترسی ہی تھی جس نے ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک کی مذہبی زندگی اور خیالات میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔“ (رسالہ نور قادیان)

شری راج دیر پنڈت گداد ھر پرشاد شرما رئیس اعظم الہ آباد لکھتے ہیں۔

''...... اور میں بیانگ دہل اعلان کرتا ہوں کہ میری رائے میں جس مذہب کو اخوت باہمی اخلاق و تہذیب اور دولت اتحاد کی فراوانی کثرت کے ساتھ عطا کی گئی ہے وہ مذاہب کا سردار ''اسلام'' ہے۔ (رسالہ مولوی رسول نمبر ۱۳۴۵)

مسٹر کے سکا مارن بی۔اے اچھوتوں کے لیڈر رقم طراز ہیں۔

''میرے خیال میں دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ہم کو نجات دے سکتا ہے اور اس کی آغوش میں ہم سیاسی، معاشرتی و مذہبی رخصت حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس میں اخوت و مساوات اور عملی ہمدردی اس قدر بلند درجہ پر پہنچ گئی ہو۔ جیسی کہ اسلام میں ہے۔'' (الامان دہلی ۲۳ نومبر ۱۹۳۱ء)

حقیر نہ جاننا: انسان کے دل میں دوسرے کے خلاف حقارت اور نفرت تکبر سے پیدا ہوتی ہے۔ تکبر ایسا مرض ہے جس سے سوسائٹی کا نظام ہی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس سے طبقاتی جنگ ہوتی ہے۔ جو قوموں اور ملکوں کی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ تکبر کی وجہ سے شیطان راندہ درگاہ الٰہی ہوا۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (لقمان ۳۱:۱۸) اور لوگوں سے گال نہ پھلاؤ اور نہ زمین میں اکڑتا ہوا چل۔ اللہ کسی خود پسند شیخی خورہ کو پسند نہیں کرتا۔

عیب نہ لگانا اور بُرے لقب سے نہ پکارنا: وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الْاِسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ (الحجرات ۴۹:۱۱) اور اپنے لوگوں کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کے نام دھرو ایمان کے بعد برا نام کیا ہی برا ہے۔

حدیث میں آتا ہے حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ کسی سفر میں حضرت صفیہؓ کا اونٹ بیمار ہو گیا اور حضرت زینبؓ کے پاس ایک فالتو اونٹ تھا تو حضورؐ نے زینبؓ سے فرمایا کہ صفیہؓ کو اپنا اونٹ دے۔ زینبؓ نے کہا کیا میں اس یہودیہ کو اپنا اونٹ دے دوں؟ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت غصہ آیا اور آپ نے ذی الحجہ محرم اور صفر کے کچھ دنوں تک زینب کو چھوڑ دیا۔ (ابو داؤد)

انسان ضعیف ہے۔ اس سے ہر دم لغزشیں ہونے کا امکان ہے اس وجہ سے اسلام مسلمان بھائی کے گناہوں کی تلاش میں لگے رہنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ یہ حکم دیتا ہے کہ مسلمان بھائی کے گناہوں پر پردہ ڈالا جائے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تَجَسَّسُوا (الحجرات ۴۹:۱۱) اور کسی کی ٹوہ میں نہ لگے رہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں کے عیوب تجسس نہ کرو جو شخص ان کی برائیوں کی تلاش میں رہے گا تو اللہ اس کے عیوب کا تجسس کرے گا اور جس کے عیوب کا اللہ تجسس کرے گا اس کو اس کے گھر کے اندر رسوا کرے گا۔ (ابو داؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ)

غیبت کرنا: غیبت کے معنی ہیں کسی کی عدم موجودگی میں وہ بات کرنا اگر وہ اس شخص کے سامنے کی جائے تو اس کو سن کر تکلیف ہو۔ قرآن مجید نے غیبت کو مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ. (الحجرات ۴۹:۱۲) اور نہ ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا کہو کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے تو تم اس سے کراہت کرتے ہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ لوگو! تمھیں معلوم ہے کہ غیبت کیا چیز ہے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا تمہارا اپنے بھائی کو ایسی بات سے یاد کرنا جو اسے اچھی نہ لگے کسی نے عرض کیا اگر میرے بھائی میں وہ بات موجود ہو جو میں کہتا ہوں۔ تو پھر آپ کیا فرماتے ہیں آپ نے فرمایا اگر اس میں وہ بات پائی جاتی ہے جو تو کہتا ہے تو تو نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ بات اس میں نہیں جو تو کہتا ہے تو تو نے اس پر بہتان باندھا۔ (مسلم)

فرمایا: غیبت زنا سے بڑھ کر ہے کیونکہ آدمی زنا کر کے توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ زانی توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بخش دیتا ہے اور غیبت کرنے والے کو نہیں بخشا جب تک وہ شخص نہ بخشے جس کی غیبت کی ہے اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا زانی توبہ کرتا ہے اور غیبت کرنے والے کے لیے توبہ نہیں۔ (مشکوٰۃ)

صلح کرانا: معاشرہ میں مفادات کے تصادم کی وجہ سے لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ اگر دو مسلمان بھائیوں کے درمیان لڑائی ہو

جائے تو ان کے درمیان صلح کرا دینی چاہیے۔ تاکہ سوسائٹی میں افتراق اور انتشار نہ پیدا ہو۔

ارشاد الٰہی ہے: وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا (الحجرات ۹:۴۹) اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو۔

سلام کرنا: اسلام نے دو مسلمانوں کو ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو السلام علیکم کہنے کا حکم دیا ہے جس کے معنی ہیں تم پر سلامتی ہو۔ یہ حکم مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ ان کا کام سوسائٹی میں امن و سلامتی برقرار رکھنا ہے۔ اسلام بھی اس دنیا میں سلامتی کا پیغام لے کر آیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَاِذَا جَآءَکَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ (الانعام ۶:۵۴) اور جب تیرے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری باتوں پر ایمان لائے ہیں تو کہہ تم پر سلامتی ہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اَفْشُوا السَّلَامَ وَاَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصَلُّوْا وَالنَّاسُ نِیَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ (ترمذی باب ماجاء فی انشاء السلام) اے لوگو! باہم سلام کو پھیلاؤ کھانا کھلاؤ اور جب تمام لوگ سو رہے ہوں تو نماز پڑھو تم جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔

سلام کرنے کے لیے شناسا اور انجان کی کوئی تخصیص نہیں۔ (بخاری کتاب الاستیذان باب السلام للمعرفة و غیر المعرفة)

سلام کرنے کے اصول بیان کرتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

چھوٹا بڑے کو گزرنے والا بیٹھنے والے کو اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سوار پیدل چلنے والے کو سلام کرے۔ (بخاری کتاب الاستیذان باب فی تسلیم الراکب علی الماشی)

جس شخص کو سلام کیا جائے تو اس کا یہ فرض ہے کہ سلام کا جواب اسی طریق سے یا اس سے بہتر طریقہ سے جواب دے۔

ارشاد ہے: وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا (نساء ۴:۸۶) اور جب تمھیں کوئی سلام کرے تو تم اس کو اس سے بہتر طریقے پر جواب دو یا انھیں الفاظ میں جواب دو۔

السلام علیکم کا بہترین الفاظ میں جواب وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ہے۔

نماز جنازہ پڑھنا: جب کوئی مسلمان بھائی مرجائے تو دوسرے مسلمانوں پر نماز جنازہ پڑھنا فرض کفایہ ہے۔ اگر نماز جنازہ میں کوئی آدمی بھی شریک نہ ہو۔ تو اس بستی کے تمام رہنے والے گناہ گار ہیں۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَصَلِّ عَلَیْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّهُمْ (توبہ ۹:۱۰۳) اور ان کے لیے دعا کر کیونکہ تیری دعا ان کے لیے تسکین ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ جس نے ایمان و اخلاص سے کسی مسلمان کے جنازے میں شرکت کی اور نماز اور دفن تک برابر شریک رہا تو اس کو دو قیراط اجر ملے گا۔ (بخاری جلد اوّل کتاب الایمان باب اتباع الجنائز)

ترمذی میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ جس نے جنازہ میں شرکت کی اور تین بار جنازہ کو کندھا دیا تو اس نے اپنا حق ادا کر دیا۔ (ترمذی)

مدد کرنا: قرآن مجید میں آتا ہے: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ (توبہ ۹:۷۱) اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کی دوست مددگار ہیں۔

حضرت سالمؓ سے روایت ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرے نہ اس کو دشمن کے حوالے کرے جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو شخص کسی مسلمان کی کسی مشکل کو آسان اور اس کی مصیبت کو دور کرے گا تو خدا اس کی مشکل آسان کر دے گا۔ (ابو داؤد کتاب الادب باب المواخاۃ)

عیادت کرنا: مسلم میں ہے کہ جب کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی بیمار پرسی کے لیے جاتا ہے تو جب تک واپس نہ آجائے جنت کے راستہ پر گامزن رہتا ہے۔ (مسلم کتاب البر والصلۃ والاداب)

جب کوئی صبح کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے اس کی مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کی مغفرت کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتے ہیں۔ (سنن ابی داؤد کتاب الجنائز)

صحیح مشورہ دینا: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب کوئی مسلمان مشورہ چاہے تو نیک مشورہ دینا چاہیے۔ (مسلم کتاب السلام باب من حق المسلم للمسلم والسلام)

دعوت قبول کرنا: دعوت سے محبت اور تعلقات بڑھتے ہیں۔ اس وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوت قبول کرنے کو مسلمان پر ایک حق قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ہر مسلمان پر اس کے مسلمان بھائی کے پانچ حق ہیں۔ سلام کرنا' سلام کا جواب دینا' جب وہ چھینکے تو یرحمکم اللہ کہنا' دعوت قبول کرنا' اس کی عیادت کرنا' اس کے جنازہ میں شریک ہونا۔ (مسلم کتاب السلام باب من حق المسلم للمسلم والسلام)

تکفیر سے اجتناب: مسلمانوں کی تباہی کا ایک سبب کفر بازی ہے۔ حالانکہ اسلام نے سختی سے ایک دوسرے کو کافر کہنے سے منع کیا ہے۔ جب سے مسلمانوں نے اسلام کے اس حکم کو توڑا ہے۔ ان پر ذلت اور مسکنت غالب آ گئی ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰىٓ اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (نساء۴:۹۴) جو تمھیں سلام علیکم کہے اسے یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ جب کوئی مسلمان بھائی اپنے مسلمان بھائی کو کافر کہتا ہے تو کفر ان دونوں میں سے کسی ایک پر لوٹ آتا ہے۔ (بخاری کتاب الادب باب من کفر اخاہ) یعنی جس کے متعلق کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے۔ اس میں کفر کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ تو فتویٰ لگانے والا خود کفر کا مرتکب ہوتا ہے۔

آئینی حقوق

جان' مال و آبرو کی حفاظت: مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدہ۵:۳۲) جو کوئی کسی جان کو بغیر جان کے بدلہ کے یا زمین میں فساد کے مار ڈالے تو گویا اس نے سب لوگوں کو مار ڈالا اور جو کوئی زندہ رکھے تو گویا اس نے سب کو زندہ رکھا۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (نساء۴:۹۳) اور جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرے تو اس کی سزا دوزخ ہے۔ اسی میں رہے گا اور اللہ اس پر ناخوش ہے اور اس پر لعنت کرتا ہے اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کرے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ. يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (نور۲۴:۲۳'۲۴) جو لوگ پاک دامن بے خبر مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے خلاف اس کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّ دِمَاءَ كُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا (بخاری کتاب الحجتہ) تمہاری جانیں اور تمھارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت ہے یعنی حج کے دن کی۔

بے جا حمایت نہ کرنا: سوسائٹی میں بے جا حمایت کی وجہ سے ظلم بڑھتے ہیں۔ اس وجہ سے اسلام نے بے جا حمایت کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے: وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا الْقُرْبٰى (الانعام۶:۱۵۳) اور جب کہو تو انصاف اور عدل سے کہو اگرچہ قریبی ہو۔

اخلاقی حقوق

نیکی کا حکم دینا: جس طرح انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی روحانی حالت کو درست کرے اسی طرح اس پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ مسلمان بھائی کی روحانی حالت کو سدھارتا رہے اور اس کو نیکی کرنے کی ترغیب دے اور برائیوں سے ترہیب کرے۔

ارشادالٰہی ہے: يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (توبہ۹:۷۱) وہ (مسلمان) اچھے کام کرنے کو کہتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ (لقمان۳۱:۱۷) اور نیکی کا حکم دے اور برائی سے روک۔

اچھی بات کہنا: ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے نرم لہجہ اور محبت بھرے انداز میں گفتگو کرے اس سے باہمی محبت، الفت اور ہمدردی

بڑھتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اپنے مسلمان بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا بھی نیکی ہے۔
اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (بقرہ ۲) اور لوگوں سے اچھی دل لگتی بات کہو۔

دعا کرنا: وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ اور اپنے قصور کے لیے حفاظت مانگ اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے۔

عام انسانوں کے حقوق

ماضی اور حال میں ہر مفکر اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ دنیا میں عدم توازن اور بدامنی صرف انسانی حقوق متعین نہ کرنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس وجہ سے ہر مفکر نے اپنی ذہنی استعدادوں کو بروئے کار لا کر انسانی حقوق کا چارٹر مرتب کیا ہے کہ دور حاضر میں انسانی حقوق کے شعور کے ارتقاء کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں کنگ جان نے ۱۲۱۵ء میں میگنا کارٹا جاری کیا تھا۔ وہ درحقیقت امراء کے دباؤ کی وجہ سے مرتب کیا گیا تھا۔ وہ صرف بادشاہ اور امراء کے درمیان ایک قرارداد تھی۔ اس میں امراء کے حقوق کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ عوام الناس کے حقوق کی اس میں کوئی نشان دہی نہ کی گئی تھی۔

ٹام پین (Tom Pain) (۱۷۳۷ء تا ۱۸۰۹ء) نے حقوق انسانی پر ۱۷۹۱ء میں ایک پمفلٹ مرتب کیا۔ اسی پمفلٹ نے مغربی ممالک میں حقوق انسانی کے تصور کو اشاعت دی۔

۱۷۸۹ء میں انقلاب فرانس کے عہد میں ''منشور حقوق انسانی'' مرتب ہوا۔ جو روسو کے نظریہ معاہدہ عمرانی کا ثمرہ تھا۔

بگوٹا کانفرنس میں امریکی ریاستوں نے ۱۹۴۸ء میں انسانی حقوق و فرائض کا ایک منشور مرتب کیا۔

دو عالمگیر جنگوں کی تباہیوں نے بیسویں صدی کے انسان کو یہ امر سوچنے پر مجبور کر دیا کہ انسانوں کے حقوق متعین کیے بغیر دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء کے اٹلانٹک چارٹر اور واشنگٹن' ماسکو' ڈمبارٹن اوکس کے مذاکرات کے بعد آخر کار سان فرانسسکو کے چارٹر کے ذریعہ ادارہ اقوام متحدہ کی اساس رکھی گئی اور حقوق انسانی کو ایک بین الاقوامی مسئلہ قرار دیا گیا۔ اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر ۲۷ جنوری ۱۹۴۷ء سے لیک سیکس میں مسز فرینکلن روز ویلٹ کی زیر صدارت متعدد اجلاس ہوئے اور ایک چارٹر مرتب کیا گیا جسے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے آخری شکل دے کر ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو عالمی اعلان حقوق انسانی کا نام دے کر منظور کیا اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر ہر سال ۱۰ دسمبر کو دنیا کے ہر ملک میں یوم حقوق انسانی منایا جاتا ہے۔

یو۔ این۔ او کے اعلان کے تیس آرٹیکل ہیں۔ آرٹیکل ۲۸' ۲۹ اور ۳۰ تو محض رسمی ہیں۔ بارہ آرٹیکل اقتصادی اور سماجی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہیں۔ تین قانون کے ضابطوں اور ملزم کے حقوق کے متعلق ہیں۔ صرف بارہ ایسے آرٹیکل ہیں جو انسانی حقوق کے اصول بیان کرتے ہیں۔ ان میں سے پانچ ایسے ضروری جزو ہیں جن کا ذکر کرنا مناسب ہے۔

آرٹیکل نمبر ۱: انسان آزاد پیدا کیے گئے ہیں اور اپنے رتبہ اور حقوق میں مساوی ہیں۔

آرٹیکل نمبر ۲: ہر انسان کو وہ آزادیاں اور حقوق مکمل طور پر حاصل ہیں۔ جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں۔ مذہب' رنگ' نسل' جنس' زبان' نسبت جائیداد یا رتبہ کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جائے گا۔

آرٹیکل نمبر ۳: ہر شخص کو زندہ رہنے اور آزادی اور حفاظت کا حق حاصل ہے۔

آرٹیکل نمبر ۴: کسی کو غلامی میں نہیں رکھا جائے گا۔ ہر قسم کی غلامی اور غلاموں کی تجارت قطعاً ممنوع ہے۔

آرٹیکل نمبر ۵: کسی شخص کو اذیت نہیں دی جائے گی۔ نہ اس کے ساتھ بے رحمی کا یا ظالمانہ سلوک کیا جائے گا نہ کوئی ایسی سزا دی جائے گی۔

یہ وہ منشور ہے جسے دور حاضر کے تمام مدبرین نے مل کر مرتب کیا۔ اس منشور کا عملی پہلو بہت ہی تاریک ہے۔ اقوام متحدہ اس منشور پر عمل نہیں کرا سکی۔ ہر ملک میں انسانی حقوق کی پامالی ہو رہی ہے۔ کشمیر عوام کی مرضی کے خلاف ہندوستان کی غلامی میں جکڑا ہوا ہے۔ بھارت میں جو مسلمانوں پر مظالم ہو رہے ہیں ان کو پڑھ سن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ آیا مسلمان انسانوں کی حکومت میں زندگی بسر کر رہے ہیں یا درندوں کی کچھاروں میں رہ رہے ہیں۔

اسرائیل انسانی حقوق کی پامالی میں سب سے سبقت لے گیا ہے۔ آئے دن عرب اسرائیلی مقبوضات سے بے خانماں اور بے آسرا کر دیے جاتے ہیں۔ وہ در بدر دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا اور کوئی طاقت اسرائیل کے ہاتھ کو ظلم کرنے سے نہیں روکتی۔ سب تماشائی بن کر دیکھ رہی ہیں۔

قبرص میں مسلمانوں کی جو حالت ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ کس طرح عیسائی مسلمانوں پر ظلم ستم ڈھا رہے ہیں۔

افریقہ میں اری ٹریا (Eriteria) کے مسلمانوں کو بنیادی حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے۔
روڈیشیا۔ جنوب مغربی افریقہ اور جنوبی افریقہ کی رنگ دار قوموں کے زیر دستوں کو جائز اور بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے۔
ویت نام میں تو انسانی حقوق کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔
کشمیر رائے خود اختیاری سے محروم ہے۔ بھارت اپنی ۶ لاکھ فوج کے ذریعہ کشمیریوں پر ظلم ڈھا رہا ہے امریکہ نے افغانستان اور عراق پر تباہ کن بم باری سے اپنی اسیری میں لے لیا ہے اپنی وفادار نام نہاد قومی حکومت بنا رکھی ہے اور ان کی دولت کو لوٹ رہا ہے۔ امریکہ نے اس دور میں اسیری اور حقوق انسانی کی پامالی کا ایک نیا انداز اختیار کر لیا ہے۔

اسلام کا حقوق انسانی کے متعلق منشور: آج سے چودہ سو سال پیشتر اسلام نے جو حقوق انسانی کا چارٹر دنیا کے سامنے پیش کیا تھا دور حاضر کے تمام مدبرین مل کر بھی اس سے بہتر تیار نہیں کر سکتے۔ اسلامی چارٹر کی سب سے بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے پیش کرنے والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منشور کے ہر آرٹیکل پر فوری عمل کر کے دنیا کے سامنے عملی نمونہ پیش کیا تھا۔

معاشرتی حقوق

اسلامی معاشرہ کا دائرہ پورے عالم انسانیت کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور ان کے لیے حقوق متعین کرتا ہے۔
رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلْخَلْقُ كُلُّهُمْ عِيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ (طبرانی' بیہقی)
ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اس کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ مخلوق وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ بھلائی کرتا ہے۔
قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس ۱۰:۱۹) اور انسانوں کی ایک ہی امت تھی پھر وہ الگ الگ ہو گئے۔
ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (نساء ۴:۱) اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا ہے۔
فرمانِ نبوی اور آیات قرآنی سے یہ امر واضح ہے کہ اسلام کا حلقہ تمام دنیا کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

تکریم انسانیت: اسلام کی نظر میں ہر انسان کا بچہ پیدائش کے اعتبار سے معزز اور مکرم ہے۔
ارشاد الٰہی ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْۤ اٰدَمَ (بنی اسرائیل ۱۷:۷۰) اور ہم نے آدمؑ کے بیٹوں کو واجب التکریم بنایا ہے۔

پیدائشی حریت: ہر انسان پیدائشی طور پر آزاد ہے اور کوئی انسان دوسرے کو غلام اور محکوم نہیں بنا سکتا۔
ارشاد الٰہی ہے: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّىْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران ۳:۷۹)
کسی بشر کے لیے شایاں نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت دے پھر وہ لوگوں کو کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔
رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ ان من شرار الناس الذین یبیعون الناس (بخاری کنوز الحقائق) وہ لوگ بہت ہی برے ہیں جو آدمیوں کو فروخت کرتے ہیں۔
شِرَارُ النَّاسِ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ النَّاسَ وَيَبِيْعُوْنَهُمْ (ترمذی وکنز الحقائق) وہ لوگ برے ہیں جو انسانوں کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔
حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ مُذْ كَمْ تَعَبَّدْتُمُ النَّاسَ وَقَدْ وَلَدَتْهُمْ اُمَّهَاتُهُمْ اَحْرَارًا (حسن المحاضرہ جلد ۲ صفحہ ۱) تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنا لیا حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا ہے۔

مساوات: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (الحجرات ۴۹:۱۳) اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے اور اللہ خوب جانتا ہے اور خبر دار ہے۔
رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر اپنے مشہور خطبے میں فرمایا۔
اَيُّهَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَّاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلَى الْاَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى (مسند احمد) اے لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر

کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔

اسلام نے جہاں مساوات کی پاکیزہ تعلیم دی ہے وہاں اس کے عملی نمونے کے اظہار کے لیے دو عبادتیں نماز اور حج مقرر کی ہیں۔ مسجد میں نماز کے وقت اور حج کے موقع پر بلاتفریق رنگ ونسل ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جاتے ہیں۔

ایک ہندو لیڈر سر پی۔ سی رائے لکھتا ہے۔

''اسلام مذاہب عالم میں سب سے زیادہ جمہوریت پسند ہے۔ یہ بنی نوع انسان کو ٹھیک ایک سطح پر لے آتا ہے جونہی کوئی شخص اسلام قبول کرتا ہے اس کا درجہ تمام مسلمانوں کے برابر ہو جاتا ہے مسجد میں شاہ وگدا امیر وغریب اور ایک ادنیٰ سے ادنیٰ مزدور اور بہشتی دوش بدوش نماز پڑھتے ہیں۔''

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے (اقبال)

اسلام رنگ ونسل کا امتیاز جانتا ہی نہیں۔ (اسلام اور پیغمبر اسلام غیروں کی نظروں میں مولفہ خلیفہ عبدالرحمٰن ص ۲۱)

بابو بپن چندر پال لکھتا ہے۔

''اسلام نے اخوت اور برادرانہ روابط پر جس قدر زور دیا ہے اور وہ جس شد و مد سے اس پر عمل پیرا ہوا اس کی مثال دنیا کا کوئی مذہب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس میں ہندوؤں کی طرح ذات پات کا رواج موجود نہیں۔ یہ مسلمانوں کی انتہائی ہمدردی اور خدا ترسی ہی تھی جس نے ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک میں مذہبی زندگی اور خیالات میں انقلاب عظیم برپا کر دیا اسلام نے سیاسی طور پر بنی نوع انسان کو ایسے حقوق عطا کیے جو رومیوں اور دیگر اقوام نے صدیوں میں بھی اپنی رعایا کو نہ دیے تھے۔ اسلام نے ٹیکس محدود کرایا۔ قانوناً سب انسانوں کو ایک دوسرے کے مساوی بنا دیا۔ حکومت خود اختیاری کے قانون رائج کیے بادشاہوں کے اختیارات پر پابندیاں عائد کر دیں۔'' (اسلام اور پیغمبر اسلام غیروں کی نظر میں ص ۲۱، ۲۲)

مسٹر کے سکا مازن بی۔ اے اچھوتوں کے لیڈر نے اچھوتوں کی نجات کے راستہ کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ہم کو نجات دے سکتا ہے اور اسی کی آغوش میں ہم سیاسی، معاشرتی و مذہبی رخصت حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس میں اخوت و مساوات اور عملی ہمدردی اس قدر بلند درجہ پر پہنچ گئی ہو۔ جیسی کہ اسلام میں ہے۔'' (الامان دہلی ۲۳ نومبر ۱۹۳۱ء)

عدل و انصاف: عدل کی حدود زندگی کے ہر شعبہ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن یہاں صرف عدالتی عدل مراد ہے جب مدعی اور مدعا علیہ عدالت کے سامنے پیش ہوتے ہیں تو حاکم کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ قانون کے مطابق فریقین میں فیصلہ کرے۔ خواہ وہ عدالت ملکی ہو یا بین الاقوامی۔ عدل کے تقاضوں کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے دنیا کا امن تباہ و برباد ہو چکا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء ۴:۵۸) جب لوگوں کا فیصلہ کیا کرو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا الْقُرْبٰى (الانعام ۶:۱۵۲) اور جب تم بات کہو تو عدل کرو اگرچہ قریبی ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (النحل ۱۶:۹۰) اللہ تمہیں عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (المائدہ ۵:۸) اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اللہ کے لیے کھڑے ہونے والے انصاف کی گواہی دینے والے ہو جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو انصاف کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ کا تقویٰ کرو اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔

اس تعلیم کی عملی تشریح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی ہے آپ نے فیصلہ کرتے وقت امیر وفقیر، مسلم وکافر سلطان وگدا اور چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں رکھی۔ ایک دفعہ ایک مخزومیہ خاتون نے چوری کی ایک بڑے اونچے خاندان کی عورت ہونے کی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ اگر اس عورت کو سزا ہو گئی تو خاندان کا وقار خاک میں مل جائے گا۔ بعض صحابہ نے حضرت اسامہؓ کو آمادہ کیا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر

ہو کر سفارش کریں۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر انھوں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سن کر فرمایا۔ اِنَّمَا هَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ فَهُمْ کَانُوْا یُقِیْمُوْنَ الْحَدَّ عَلَی الْوَضِیْعِ وَیَتْرُکُوْنَ الشَّرِیْفَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْ فَاطِمَةُ فَعَلَتْ ذٰلِکَ لَقَطَعْتُ یَدَهُمْ (بخاری اقامة الحد علی الوضیع والشریف) تم سے پہلے والے اس وجہ سے ہلاک ہوئے کہ وہ نیچ قوم کے لوگوں کو سزا دیتے اور بڑوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر فاطمہ بھی یہ کام کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹتا۔

احسان: اسلام بنی نوع انسان کے ساتھ احسان کی تعلیم دیتا ہے۔ احسان حسن سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں رعنائی، خوبصورتی، عام اصطلاح میں احسان کا مفہوم یہ ہے کہ دوسروں کی ضروریات پوری کرنا جس سے ان کا دل خوش ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْکَ (قصص ۲۸:۷۷) تو احسان کر جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا۔

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی (النحل ۱۶:۹۰) اللہ تمھیں عدل و احسان اور قریبیوں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

احسان کی تشریح کے بارہ میں اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (المعارج ۷۰:۲۴،۲۵) اور جن کے مالوں میں ایک مقرر حق ہے سوال کرنے والے اور محروم کے لیے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ معاشرہ میں جو کوئی بھی محتاج ہو یا کام کرنے کے قابل نہ رہا ہو۔ معاشرہ کی دولت میں اس کا حق ہے۔ اسلامی معاشرہ کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کی ضروریات کو پورا کرے۔

حق رزق: یعنی معاشرہ کے تمام افراد کی بنیادی ضروریات زندگی کو پورا کرنا۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ثُمَّ رَزَقَکُمْ (الروم ۳۰:۴۰) اللہ وہ ہے جس نے تمھیں پیدا کیا پھر تمھیں رزق دیا۔ نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (الزخرف ۴۳:۳۲) ہم نے ان کے درمیان ان کی دنیا کی زندگی میں ان کی روزی تقسیم کی ہے۔

نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَاِیَّاهُمْ (الانعام ۶:۱۵۱) ہم تم کو رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کو بھی پورا کرتے ہیں۔ ضروریات زندگی میں روٹی کپڑا مکان وغیرہ شامل ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰی وَاَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰی (طٰہٰ ۲۰:۱۱۸،۱۱۹) تیرے لیے یہ ہے تو اس میں نہ بھوکا رہے اور نہ ننگا رہے اور یہ کہ تو اس میں نہ پیاسا رہے اور نہ دھوپ میں رہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ ابن آدم کا حق سوائے ان تین چیزوں کے اور کسی شے سے وابستہ نہیں گھر جس میں وہ رہے کپڑا جس سے وہ تن ڈھانپے اور خشک روٹی اور پانی (ترمذی)

آزادی سکونت: قرآن مجید میں آتا ہے۔ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ (العنکبوت ۲۹:۲۰) زمین میں چلو پھرو پھر دیکھو کس طرح اس نے پہلی بار پیدا کیا۔

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ (القصص ۲۸:۸۵) جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے وہ یقیناً تجھے وطن واپس لائے گا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ کُوْنُوْا حَیْثُ شِئْتُمْ وَبَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَنْ لَّا تَفْسِکُوْا دِمَآءً وَّ لَا تَقْطَعُوْا سَبِیْلًا وَّ لَا تَظْلِمُوْا اَحَدًا. تم جہاں چاہو رہو اور ہمارے اور تمھارے درمیان یہ شرط ہے کہ نہ تم خونریزی کرو اور نہ تم راہ زنی کرو اور نہ کسی پر ظلم کرو (نیل الاوطار جلد ۷ ص ۱۲۹)

ہجرت کا حق: قرآن مجید میں آتا ہے۔ قَالُوْٓا اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا (النساء ۴:۹۷) (فرشتے) کہیں گے کیا اللہ کی زمین فراخ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا (المومن ۴۰:۶۴) (اللہ وہ ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا)

پناہ لینے کا حق: ارشاد الٰہی ہے: وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْهُ (التوبہ ۹:۶) اور اگر ان مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دو۔

محنت کا پورا پورا حق: اسلامی سوسائٹی میں ہر آدمی اپنی محنت اور کسب کا ثمرہ پانے کا مستحق ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَوُفِّیَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ (الزمر ۳۹:۷۰) اور ہر نفس کو جو اس نے کیا ہے پورا دیا جائے گا۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (النجم ۵۳:۳۹) اور کہ انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہی جو وہ کوشش کرتا ہے۔

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ (الطور ۵۲:۲۱) ہر شخص اپنی کمائی کا ثمرہ پانے کا حقدار ہے۔

مذہبی آزادی کا حق: ہر انسان کو اسلامی معاشرہ میں یہ حق حاصل ہے کہ جس مذہب کو چاہے اختیار کرے اور جسے چاہے ترک کر دے ارشاد الٰہی ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ ۲:۲۵۶) دین میں کوئی زبردستی منانا نہیں ہدایت کی راہ گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ. (الکہف ۱۸:۲۹) اور کہہ دو حق تمھارے رب کی طرف سے ہے سو جو کوئی چاہے ایمان لائے اور جو کوئی چاہے انکار کر دے۔

کسب کی آزادی: فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ ۶۲:۱۰) پس جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اِسْعَوا فَإِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ السَّعْيَ (مسند امام احمدؒ کنوز الحقائق) کوشش کرو کیونکہ اللہ نے تم پر کوشش کرنا فرض کر دیا۔

اِعْمَلُوا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ وَلِمَا خُلِقَ لَهٗ (بخاری ومسلم) عمل کرو ہر شخص کے لیے وہ کام آسان ہے جس کی وہ صلاحیت رکھتا ہو۔

طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ (کنز العمال) فریضہ عبادت کے بعد حلال کمائی کا طلب کرنا بھی ایک فرض ہے۔

اسلام نے ان تمام ذرائع کو ناجائز قرار دیا ہے جس سے دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر آ جاتی ہے۔ وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (البقرہ ۲:۱۸۸) اور اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ۔

اسی طرح اسلام نے جہاں آزادی کسب دی ہے وہاں دولت کی گردش کے لیے چند اصول بھی مقرر کر دیے ہیں۔ اگر دولت مند ان اصولوں پر کاربند نہیں رہتے تو حکومت کا یہ فرض ہے کہ ان کے خلاف حالات کے تقاضا کے مطابق کاروائی کرے۔

مزدور کا حق: نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (الزخرف ۴۳:۳۲) ہم نے ان کے درمیان ان کی دنیوی زندگی میں ان کی روزی تقسیم کی ہے اور ایک دوسرے کے درجے بلند کیے ہیں تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ (ابن ماجہ باب الاجارہ) مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو۔

فرمایا: تین قسم کے انسان ایسے ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑا کروں گا اور جس سے میں جھگڑا کروں گا اس کو مغلوب و مقہور کر کے چھوڑوں گا ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو مزدور سے کام تو پوری طرح لیتا ہے اور اس کے مناسب اس کی اجرت نہیں دیتا۔ (بیہقی کتاب الاجارہ)

مظلوم کو فریاد کا حق: اسلام مظلوم کو فریاد کرنے اور ظالم سے بدلہ لینے کا حق دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا (النساء ۴:۱۴۸) اللہ بری بات کے مشہور کرنے کو پسند نہیں کرتا سوائے اس کے جس پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ مظلوم خواہ کسی قوم و ملت کا ہو۔ اس کی دادرسی کی ذمہ داری اپنے اوپر لے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (الشوریٰ ۴۲:۴۱،۴۲) جو کوئی اپنے اوپر ظلم کے بعد بدلہ لیتا ہے تو ان لوگوں پر الزام کا راستہ نہیں۔ الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتی کرتے ہیں انہی کے لیے دردناک دکھ ہے۔

عزت نفس کا تحفظ: انسان کی ذہنی اور ترقی کے تمام سوتے عزت نفس سے ہی پھوٹتے ہیں اسی وجہ سے معبودان باطلہ کی عبادت سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان کی عبادت سے نفس کی تباہی و بربادی ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے اس حق کی پوری تفصیل سورۂ حجرات میں بیان کی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ (الحجرات ۴۹:۱۱) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ایک قوم دوسری قوم پر ہنسی نہ کرے شاید ان سے بہتر ہوں۔

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (الحجرات ۴۹:۱۱) اور اپنے لوگوں کو عیب نہ لگاؤ اور ایک دوسرے کے نام دھرو۔

نجی زندگی کا تحفظ: انسان کے بنیادی حقوق میں سے اہم حق اس کی نجی زندگی کا تحفظ ہے اس بارہ میں اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

امَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا (النور۲۷:۲۴) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے گھروں کے سوائے دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک اجازت نہ لے لو۔

حصول علم کا حق: علم ہی شرف انسانیت کا ذریعہ ہے اور علم کی وجہ سے آدم مسجود ملائکہ بنا۔ اسلام نے ہر انسان کو حصول علم کا مستحق ٹھہرایا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں۔ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ (مشکوٰۃ ۱۲) علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

علم کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (الزمر۹:۳۹) کہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں۔

اَلَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ (العلق ۹۶:۴٬۵) جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

عمل غیر کی ذمہ داری سے بریت: اسلام میں انسان صرف اپنے اعمال کا جواب دہ ہے دوسروں کے اعمال کی ذمہ داری کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الانعام ۱۶۴:۶) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

مذہبی دلآزاری: اسلام اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ دوسرے مذہب کے لوگوں کے مذہبی پیشواؤں کو برا بھلا کہا جائے۔ اسلام ہر مذاہب کے پیشوا کی عزت کرنے کی تعلیم دیتا ہے بلکہ یہاں تک کہتا ہے کہ دوسروں کے بتوں کو بھی برا بھلا نہ کہو۔

ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (الانعام ۱۰۸:۶) اور ان کو گالی نہ دو جن کو اللہ کے سوا پکارتے ہیں۔

کمزوروں کا تحفظ: اسلام نے معاشرہ کے کمزور طبقے عورت بچے بوڑھے بیمار اور عبادت گزار طبقے کے حقوق کا تحفظ کیا ہے۔ اسلام سے قبل ہر ملک میں معاشرہ کے کمزور طبقے کی جو قابل رحم حالت تھی وہ کسی سے مخفی نہیں۔ تہذیب جدید کے اس دور میں معاشرہ کا کمزور طبقہ جس طرح پامال ہو رہا ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ اسلام نے صرف اپنے ملک کے کمزور طبقے کے حقوق کو ہی محفوظ نہیں کیا بلکہ برسر پیکار ملک کے کمزور طبقے کے حقوق کو بھی محفوظ کر دیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے برسر پیکار ملک کی عورتوں بچوں اور بوڑھوں کو قتل کرنے کی صریح الفاظ میں ممانعت فرما دی ہے۔

لَا تَقْتُلُوْا شَيْخًا فَانِيًا وَلَا طِفْلًا وَلَا صَغِيْرًا وَلَا امْرَاَةً (ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی دعا المشرکین) بوڑھوں بچوں کم عمروں اور عورتوں کو قتل نہ کرو۔

خلفائے راشدین بھی جب دشمن کے مقابلہ کے لیے فوج روانہ کرتے تو ہدایت فرما دیتے کہ معاشرہ کے کمزور طبقے پر ہاتھ نہیں اٹھانا۔ حضرت ابوبکرؓ نے شام کی طرف فوج بھیجتے ہوئے سپہ سالار کو ہدایت فرمائی۔

> ”تم ایسے لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے اپنے آپ کو خدا کی عبادت کے لیے وقف کر دیا ہے ان کو چھوڑ دینا میں تم کو دس وصیتیں کرتا ہوں۔ کسی عورت، بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا، پھلدار درخت نہ کاٹنا، آبادیوں کو ویران نہ کرنا، بکری اور اونٹ کو کھانے کے سوا بیکار ذبح نہ کرنا، نخلستان کو نہ جلانا، مال غنیمت میں خیانت نہ کرنا اور نامردی نہ دکھانا“ (تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۹۶)

اذیت رسانی سے تحفظ: اسلام اذیت کو خواہ جسمانی ہو خواہ ذہنی اور قلبی جرم قرار دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا (الاحزاب ۵۸:۳۳) اور وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذا دیتے ہیں بغیر اس کے کہ انھوں نے قصور کیا ہو تو وہ بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ. (البروج ۱۰:۸۵) وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دکھ دیتے ہیں پھر توبہ نہیں کرتے ان کے لیے دوزخ کا عذاب اور ان کے لیے جلنے کا عذاب ہے۔

آئینی حقوق

جان کی حفاظت: دنیا میں امن کا قیام جان و مال اور آبرو کی حفاظت پر مبنی رہا ہے، جب کبھی بھی ان تینوں امور سے کسی ایک امر کو خطرہ لاحق ہوا ہے تو خرمن امن تباہی و بربادی کی آگ سے بھسم ہو کر رہ گیا ہے اسلام نے ان تینوں چیزوں کی حفاظت پر بہت زور دیا ہے تاکہ دنیا کا امن برباد نہ ہو۔

اسلام نے کسی ایک جان کو ناحق تلف کرنے یا زمین میں فساد برپا کرنے کو قتل عام سے مماثلت دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدہ ۳۲:۵) جو کوئی کسی جان کو بغیر جان کے بدلہ کے

یا زمین میں فساد کے مار ڈالے تو گویا اسنے سب لوگوں کو مار ڈالا ہے اور جو کوئی اس کو زندہ رکھے تو گویا اس نے سب کو زندہ رکھا۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
وَلَا تَقْتُلُوْآ اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا (النساء۴:۲۹) اور اپنے لوگوں کو قتل نہ کرو بیشک اللہ تم پر رحم کرنے والا ہے۔
وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل ۱۷:۳۳) اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ۔

مال کی حفاظت: مال و دولت زندگی کے قیام کا اہم ذریعہ ہے جب کبھی بھی کسی فرد قوم اور ملک کو اپنی دولت کا خطرہ محسوس ہوا ہے۔ فوراً حفاظت کے لیے میدان جنگ میں کود پڑی ہے۔ بڑی بڑی جنگوں کی وجہ سے ہی ناجائز استحصال دولت ہے۔ اسلام قیام امن کے پیش نظر حفاظت مال کی تعلیم دیتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَلَا تَاْكُلُوْآ اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (البقرہ۲:۱۸۸) اور اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ۔
اسلام نے ان تمام ناجائز ذرائع سے بھی منع کر دیا ہے جو دوسروں کے ہاتھوں سے دولت سمیٹنے کا ذریعہ ہیں۔

آبرو کی حفاظت: عصمت اور پاک دامنی عورت کا بہترین زیور ہے۔ یہی زیور معاشرہ کو حسن بخشتا ہے اس وجہ سے اسلام نے تحفظ ناموس خواتین پر بہت زور دیا ہے ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۳۲) اور زنا کے قریب نہ جاؤ کیونکہ وہ بے حیائی کی بات ہے اور بری راہ ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر اپنے مشہور خطبہ میں جان و مال اور آبرو کی حرمت کے متعلق فرمایا۔ اِنَّ دِمَآءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا (بخاری کتاب الحج) تمہاری جانیں اور تمھارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی حرمت رکھتی ہیں جیسی آج کے دن کی حرمت ہے۔

اخلاقی حقوق

اچھی گفتگو: اچھی گفتگو کرنا اور اچھائی سے پیش آنا اور انسانیت کا فرض اولین ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرہ۲:۸۳) اور لوگوں کو اچھی بات کہو۔

وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (النساء۴) اور انھیں بھلی بات کہو۔
پر از مکر اور تصنع آمیز گفتگو سے منع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (الحج ۲۲:۳۰) تصنع آمیز گفتگو سے پرہیز کرو۔

حسد و بغض سے پرہیز: حسد اور بغض معاشرہ کی جڑوں کو اس طرح چٹ کر جاتا ہے جس طرح گھن لکڑی کو کھا جاتا ہے انہی برائیوں سے عداوت کی آگ بھڑکتی ہے۔ جو خرمن امن کو بھسم کر دیتی ہے اور رشتہ اخوت کو جلا دیتی ہے۔ اسلام نے ان دونوں برائیوں کو سختی سے منع کیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَا تَبَاغَضُوا وَلَا تَحَاسَدُوا وَلَا تَدَابَرُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا (بخاری) آپس میں ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو ایک دوسرے پر حسد نہ کرو اور ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو سب مل کر خدا کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ۔

اُمّت

اُمّت کا مفہوم: امت کا لغوی معنی جماعت گروہ خاندان نسل اور طریقہ کے ہیں قرآن مجید میں آتا ہے۔ لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ یعنی گروہ کے لیے ایک وقت مقررہ ہے۔

نبی کی جماعت: اِنْ یُّکَذِّبُوْکَ فَقَدْ کَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِکُمْ. اگر ان لوگوں نے آپ کو جھٹلایا ہے تو اس سے قبل بھی انبیاء کو ان کی امتوں نے جھٹلایا ہے۔

نبی کی ذات: قرآن مجید میں نبی کی ذات بابرکات کو بھی امت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے۔ اِنَّ اِبْرَاھِیْمَ کَانَ اُمَّۃً ابراہیم ایک امت تھے۔

ملت اسلامیہ: قرآن مجید میں ملت اسلامیہ کے لیے بھی لفظ امت کا استعمال ہوا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا اور ہم نے تمھیں ایک میانہ رو امت بنایا ہے۔

ملت اسلامیہ کا ایک خاص گروہ: ملت اسلامیہ کے ایک خاص گروہ کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ اور تمھارے درمیان ایک خاص امت ہونی چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے۔ یہاں امت سے مراد واعظین اور مبلغین کی جماعت ہے۔

قوم اور امت میں فرق: ایک امت کے تمام لوگوں کے عقائد مشترک ہوتے ہیں جب کہ قوم کے افراد کے عقائد کا مشترک ہونا ضروری نہیں۔

۱۔ امت کے لیے اتحاد مکانی، اتحاد رنگ و نسل اور اتحاد زبان کا ہونا ضروری نہیں۔ جب کہ قوم کے لیے ان امور کا ہونا ضروری ہے۔

۲۔ امت کا ایک فرد افریقہ میں بس رہا ہو۔ دوسرا امریکہ میں تیسرا کسی اور دور دراز علاقہ میں یہ سب ایک ہی امت کے افراد کہلائیں گے۔

۳۔ عقائد کے بدلنے سے ایک فرد امت سے نکل جاتا ہے۔ جب کہ قومیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

امت اسلامیہ کی شرائط رکنیت: کعبی کے نزدیک امت اسلامیہ میں ہر وہ شخص داخل ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا معترف ہو اور ان کی تعلیمات کو سچا سمجھتا ہے۔ خواہ اس کے بعد وہ شخص کچھ بھی کہے۔ کرامیہ کے نزدیک امت اسلام کی اصطلاح کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جو کلمہ پڑھتے ہیں۔ وہ اس پر خلوص قلب سے ایمان لاتے ہوں یا نہیں۔ اہل حدیث کے ایک گروہ کے نزدیک امت اسلام کے نام کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جو فرائض کی ادائیگی پر ایمان رکھتے ہیں یعنی قبلے کی طرف منہ کر کے دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھتے ہیں۔ عبدالقاہر بغدادی کے نزدیک امت اسلام کے نام کا اطلاق ہر اس شخص پر ہوتا ہے۔ جو دنیا کو فانی سمجھتا ہو خدا کو ایک اور ہمیشہ قائم رہنے والا جانتا ہو اس کو عادل سمجھتا ہو اور مذہب تشبیہ کو رد کرتا ہو۔ خدا کی صفات کے انکار کی تردید کرتا ہو اور خدا کے تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان رکھتا ہو اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا کا نبی مانتا ہو اور یہ کہ وہ تمام انسانوں کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اور اللہ کو اپنی شریعت کا حامی و ناصر جانتا ہو اور اس کی تعلیمات کے سچ ہونے کا یقین رکھتا ہو۔ قرآن مجید کو شریعت کا ماخذ جانتا ہو۔ دن میں پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہو۔ زکوٰۃ دیتا ہو۔ رمضان کے مہینے میں روزے رکھتا ہو کچھ شرائط پورا کرنے والے مخصوص لوگوں پر حج کرنا ضروری خیال کرتا ہو۔ جو شخص ان تمام باتوں پر ایمان رکھتا ہو وہ امت اسلامیہ کا رکن ہے۔

بعض علماء اسلام نے امت اسلامیہ کا رکن بننے کے لیے کلمہ شہادت لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ قرار دیا ہے اور اس کے انکار سے دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

ایک صحابی مقداد بن الاسودؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اگر میدان جنگ میں کسی کافر سے میرا مقابلہ ہو اور وہ تلوار سے میرا ہاتھ کاٹ ڈالے۔ پھر کسی درخت کی اوٹ میں پناہ لے کر کہہ دے کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں تو کیا اسے قتل کیا جا سکتا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا اسے مت مارو۔ صحابی نے عرض کیا کہ حضور اس نے پہلے میرا ہاتھ کاٹا پھر اسلام کا اظہار کیا کیا اسے قتل نہ کروں۔ حضورؐ نے فرمایا اسے قتل نہ کر اگر تو نے اسے قتل کیا۔ تو اس قتل سے پہلے جو تیری منزلت تھی وہ اس کی ہو جائے گی اور اس کے (کفر کا) درجہ تجھے مل جائے گا۔ (مسلم)

حضرت اسامہؓ بن زید فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں ایک لشکر میں روانہ کیا۔ ہم دشمن قبیلہ پر حملہ آور ہوئے میں ایک شخص

کے سر پر پہنچا تو اس نے لا الہ الا اللہ کہہ دیا تاہم میں نے اسے برچھی مار دی لیکن میرے دل میں شبہ بیٹھ گیا میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا ذکر کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا اس کے لا الہ الا اللہ کہنے کے بعد تو نے اسے قتل کر دیا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس نے محض خوف سے کلمہ پڑھا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا کہ اس کے دل سے آواز اٹھی تھی۔ نہیں آپ نے یہ فقرہ کئی بار دہرایا۔ میری یہ حالت ہوگئی کہ میں نے چاہا کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا۔ (مسلم)

نصب العین: امت مسلمہ کا نصب العین اقامت دین ہے۔ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (شوریٰ ۴۲:۱۳) اس نے تمہارے لیے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس کا نوح کو حکم دیا تھا اور جو ہم نے تیری طرف وحی کی اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا کہ دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ اقامت دین سے مراد دین پر کماحقہ عمل کرنا ہے۔

امت اسلامیہ کا شعار: مسلمانوں کا شعار السلام علیکم ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا یعنی جو تم کو سلام کہے اس کو یہ مت کہو کہ تم مسلمان نہیں ہو۔

امت اسلامیہ کے خصوصی امتیازات

وحدت نسل انسانی: امت اسلامیہ تمام انسانوں کو ایک جوڑے کی اولاد سمجھتی ہے اور ان کے درمیان کسی قسم کی نسلی تفریق جائز قرار نہیں دیتی ارشاد الٰہی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (الحجرات ۴۹:۱۳) اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً (النساء ۴:۱) اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا پھر ان دونوں سے مردوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد پھیلا دی۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس ۱۰:۱۹) انسان ایک ہی امت تھے پھر الگ الگ ہو گئے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اِنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ اِخْوَةٌ (احمد و ابوداؤد) انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا: اَيُّهَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَّاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ (مسند احمد) لوگو! ہاں بیشک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے۔

وحدتِ فکر: امت اسلامیہ کے افراد میں فکر کا اتحاد پایا جاتا ہے وہ ایک ہی خدا اور ایک کتاب اور ایک ہی رسول اور ایک مرکز (بیت اللہ) مانتے ہیں۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران ۳:۱۰۳) سب اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور جدا نہ ہو جاؤ۔

اس آیت میں حبل اللہ کے الفاظ سے مراد قرآن مجید ہے جو مسلمانوں کے اتحاد فکر کی کلید ہے۔

پانچوں عقائد (ایمان باللہ ایمان بالملائکہ ایمان بالکتب ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرۃ) مسلمان کی سوچ اور فکر میں وحدت پیدا کرتے ہیں۔ وحدت فکر ہی قوموں کی ترقی کا ذریعہ ہے۔

عالمی اخوت: امت اسلامیہ کی اخوت عالمگیر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات ۴۹:۱۰) تمام مومن بھائی بھائی ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا (بخاری) تم اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جاؤ۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ اَنَا شَهِيْدٌ اِنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ اِخْوَةٌ (مسند احمد، ابو داؤد) اے ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار میں گواہی دیتا ہوں کہ بندے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ (بیہقی کتاب الایمان) ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے۔

عالمگیر پیغام: امت اسلامیہ عالمگیر پیغام کی علمبردار ہے۔ طلوع اسلام سے قبل تمام امتیں قومی حیثیت رکھتی تھیں کیونکہ ہر نبی اپنی اپنی قوم کی طرف آیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت دنیا کے تمام لوگوں کی طرف تھی اور ان کا پیغام اپنے اندر عالمگیریت کی شان رکھتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (سباء ۳۴:۲۸) اور ہم نے تم کو سارے لوگوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا لیکن اس بات کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔

ایک دوسری آیت ہے۔ قُلْ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا (اعراف ۷:۱۵۸) کہہ اے لوگو! میں تم سب لوگوں کی طرف خدا کا رسول ہوں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ کَانَ کُلُّ نَبِیٍّ یُبْعَثُ اِلٰی قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَّ بُعِثْتُ اِلٰی کُلِّ اَحْمَرَ وَاَسْوَدَ (مسلم باب المساجد) ہر نبی اپنی خاص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں تمام سرخ اور سیاہ قوموں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

مساوات: امت مسلمہ میں قومی، نسلی، لسانی تفریق کا کوئی مقام نہیں بحیثیت انسان سب برابر ہیں۔

ارشاد الٰہی ہے: یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰی (الحجرات ۴۹:۱۳) اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد ایک عورت سے پیدا کیا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تشریح حجۃ الوداع کے موقعہ پر کرتے ہوئے فرمایا۔ لوگو! ہاں بیشک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

امت وسط: اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو امت وسط کے الفاظ سے اعزاز بخشا ہے یعنی اعتدال پسند امت افراط اور تفریط سے پاک۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (البقرہ ۲:۱۴۳) اور ہم نے اسی طرح تم کو میانہ رو امت بنایا ہے۔

خیر امت: اللہ تعالیٰ نے امت اسلامیہ کو خیر امت کا لقب دیا ہے۔ كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران ۳:۱۱۰) تم ایک بہترین امت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لیے پیدا کی گئی ہو۔

آخری امت: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ انا اخر الانبیاء و انتم اخر الامم (ابن ماجۂ حاکم) میں آخری نبی ہوں اور تم آخری امت ہو۔

شوریٰ پر عمل: امت مسلمہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ جمہوریت کے اصول شوریٰ پر عمل کرنے والی ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ (الشوریٰ ۴۲:۳۸) مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ آپس میں باہمی مشاورت کر کے کاروبار چلائیں اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتے ہیں۔ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (آل عمران ۳:۱۵۹) اور ان سے کاموں میں مشورہ کیجئے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ مَاتَشَاوَرَ قَوْمٌ اِلَّا هُدُوْا (طبرانی، کنز الحقائق) جس قوم نے باہمی مشورہ کیا وہ ہدایت پا گئی۔

رضائے الٰہی کا حصول: امت مسلمہ کا ہر کام رضائے الٰہی کے حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے اور دین کو دنیا پر مقدم رکھتی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ لوگوں کو نفسانی خواہشوں کی محبت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ جیسے عورتیں اور بیٹے اور ڈھیروں ڈھیر سونا اور چاندی اور پلے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی یہ اس دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے۔ کہہ کیا میں تم کو اس سے اچھی بات بتاؤں ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں رہنے والے ہیں اور پاک ساتھی اور اللہ کی رضا مندی ہے اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔
(آل عمران ۳:۱۵)

موت سے بے خوفی: امت مسلمہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ موت کا وقت متعین ہے لہٰذا اس سے ڈرنا کمزوری کی علامت ہے۔

خدا پرستی پر بنیاد: امت مسلمہ کی بناء لا الہ الا اللہ ہے۔ کیونکہ خالص توحید ہی تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں امت مسلمہ کو بار بار خالص توحید پر قائم رہنے کی تعلیم دی ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (البقرہ ۲:۲۵۵) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ هُوَ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (الحشر ۵۹:۲۳) وہ اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ (بنی اسرائیل ۱۷:۲۳) اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو۔

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ (البقرہ ۲:۲۱) اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا۔

امت مسلمہ کے فرائض

نیابت رسول: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اب نبی کے فرائض امت مسلمہ کے سپرد ہیں۔ ارشاد

الٰہی ہے۔ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (الحج ۷۸:۲۲) اس نے تم کو چن لیا ہے اور دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمھارے باپ ابراہیم کا مذہب۔ اس نے تمہارا نام پہلے سے اور قرآن میں بھی مسلم رکھا تا کہ رسول تمہارا پیش رو ہو۔

اس آیت میں امت مسلمہ کو کار رسالت کے لیے نبی کا جانشین قرار دیا ہے۔ اس وجہ سے امت مسلمہ پر وہ تمام فرائض عائد ہو جاتے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سرانجام دیے۔

تبلیغ دین: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد دین حق کا پیغام دوسروں تک پہنچانا امت مسلمہ پر ایک فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی مسلمانوں کی ترقی اور عروج کی ضامن ہے۔ جب تک مسلمانوں نے اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کی وہ ترقی کی منازل طے کرتے چلے گئے جب اس فرض کی ادائیگی کی طرف کم توجہی کر دی تو گھاٹے میں چلے گئے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (العصر۱۰۳:۱۔۳) قسم ہے وقت کی کہ انسان گھاٹے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرتے ہیں۔

اس مختصری سورت میں جن لوگوں کو خسران اور گھاٹے سے مستثنیٰ قرار دیا ہے وہ چار صفات کے مالک ہیں۔

۱۔ وہ عقائد صحیح کے مالک ہوتے ہیں۔
۲۔ اعمال صالحہ کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں۔
۳۔ ایک دوسرے کو دین حق پہنچاتے ہیں۔
۴۔ دین حق کے پہنچانے میں دنیا کی مشکلات کا سامنا کر کے صبر کی مضبوط چٹان پر کھڑے ہوتے ہیں۔

اس سورۃ میں تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ انسان کی صرف یہی خوبی نہیں ہے کہ وہ خود حق کے بلند مینار پر کھڑا ہو جائے بلکہ حقیقی خوبی یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی حق کی بلندی کی طرف لے جائے۔ حق دعوت اسلام کا نام ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً یعنی مجھ سے پیغام حق سن کر لوگوں تک پہنچاؤ خواہ وہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔ نَضَرَ اللّٰهُ اِمْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فَبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعَهُ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰى لَهُ مِنْ سَامِعٍ. اللہ تعالیٰ اس آدمی کو سرسبز اور کامیاب کرے جس نے ہم سے کوئی بات سنی پھر جس طرح اس کو سنا دوسروں تک پہنچا دیا کیونکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سننے والے سے جس کو حدیث پہنچائی گئی ہے۔ زیادہ محفوظ رکھنے والا ہو۔ لِيُبَلِّغَ الْعِلْمَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ (بخاری ۳۷:۳) کہ حاضر ان لوگوں تک میری علمی باتوں کو پہنچا دے جو میری مجلس میں موجود نہیں ہو سکتے۔

دعوتِ خیر و معروف اور نہی منکر: امت مسلمہ کا یہ فرض ہے کہ وہ لوگوں کو بھلائی اور نیکی کی دعوت دے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران ۱۰۴:۳) اور چاہیے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔

مفلحون: (کامیابی پانے والے) کا لفظ اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی صرف دعوت الی الخیر والمعروف اور نہی عن المنکر سے وابستہ ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران ۱۱۰:۳) سب سے اچھی جماعت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو۔ اور برے کاموں سے روکتے ہو۔

ایک اور جگہ آتا ہے: يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ (الاعراف ۱۵۷:۷) وہ انھیں نیکیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔

نظام عدل کا قیام: امت مسلمہ کا یہ فرض ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول کی ہدایات اور احکام کی روشنی میں نظام عدل و انصاف قائم کرے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (مائدہ ۸:۵) اور ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب ہدایت اور عدل و انصاف کے فرمان نازل کیے تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

بین الاقوامی امن قائم کرنا: امت اسلامیہ کا یہ فرض ہے کہ دنیا میں امن قائم کرے اور بدامنی اور شر کو جڑ سے اکھاڑ دے۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید نے امت مسلمہ کو پہلی یہ ہدایت دی ہے۔ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَاتَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ ۵) نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو۔ گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ دوسری ہدایت یہ دی ہے کہ اگر دو قوموں کے درمیان لڑائی ہو جائے تو ان کے درمیان صلح کرا دی جائے۔ اگر کوئی قوم صلح کی طرف مائل نہ ہو، دنیا کے امن کو برباد کرنے کے لیے تل جائے تو پھر امت مسلمہ کا یہ فرض ہے کہ ظالم قوم کے خلاف اٹھ کھڑی ہو اور اس کے مزاج کو درست کر دے تاکہ دنیا میں امن ہو سکے ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (الحجرات ۹:۴۹) اگر مومنوں میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو اور اگر کوئی قوم دوسری قوم پر زیادتی کرتی ہے تو اس سے جو زیادتی کرتی ہے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئیں۔ پس اگر وہ رجوع کرے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں بین الاقوامی امن قائم کرنے کے لیے تین اصول مقرر کیے ہیں۔

۱۔ جب دو قومیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دینی چاہیے۔

۲۔ اگر کوئی قوم صلح پر رضا مند نہ ہو بلکہ زیادتی کا راستہ اختیار کرے اس قوم کے خلاف امت مسلمہ اٹھ کھڑی ہو اور ظالم قوم کو ظلم و عدوان سے روک دے۔

۳۔ جب ظالم قوم دوبارہ صلح پر رضامند ہو جائے تو عدل و انصاف کے ساتھ متحارب قوموں کے درمیان صلح کرا دی جائے۔

انفاق فی سبیل اللہ: امت مسلمہ کا یہ فرض ہے کہ خیر امت بننے کے لیے اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔

ارشاد الٰہی ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران ۳:۹۲) تم نیکی کے اس بلند مقام کو حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ جن چیزوں سے تم کو محبت ہے انھیں اللہ کی راہ میں نہ خرچ کرو۔

وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً (فاطر ۳۵:۲۹) اس سے جو ہم نے انھیں دیا چھپ کر اور علانیہ خرچ کرتے ہیں۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ ۲:۲۱۹) وہ تجھ سے سوال کرتے ہیں کیا خرچ کریں کہہ دیجئے جو کچھ ضرورت سے زائد ہو۔ خرچ کرو۔

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرہ ۲:۱۹۵) اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو (اپنے آپ کو) ہلاکت میں نہ ڈالو۔

خرچ نہ کرنے والوں کے لیے وعید ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (التوبہ ۹:۳۴) جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ہیں انھیں دردناک عذاب کی بشارت ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کا فلسفہ یہ ہے اس عمل سے تزکیہ نفس ہوتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ ۹:۱۰۳) یعنی ان کے مالوں سے صدقہ لے اور اس سے انھیں پاک کر۔

انفاق فی سبیل اللہ میں غربا کی ربوبیت اور کفالت کا بہترین ذریعہ ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان (مسلمانوں) پر صدقہ فرض کیا ہے وہ امراء سے لے کر حاجت مندوں میں تقسیم کیا جائے انفاق قوم کی اخلاقی حالت درست رکھنے کا ذریعہ ہے بھوک غربت اور افلاس ہمیشہ جرائم کے ارتکاب کا سبب بنتے ہیں انفاق سے عوام افلاس سے نجات پاتے ہیں اور وہ جرائم کے ارتکاب سے رک جاتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ انہی قوموں نے ترقی حاصل کی جنھوں نے ملی اور قومی مفاد کی خاطر مال کو خرچ کیا۔ مسلمانوں کی مثال ہمارے سامنے ہے غربت کی حالت میں بھی جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی قومی کام کے لیے خرچ کرنے کی اپیل کی صحابہ نے دل کھول حصہ لیا۔ اگر کسی کے پاس کچھ نہیں تو محنت کر کے بھی حصہ لیا۔

انفاق فی سبیل اللہ نصرت دین کا ایک ذریعہ ہے قرآن مجید نے جہاں صدقات کے مصارف بیان کیے ہیں۔ وہاں ایک مصرف فی سبیل اللہ ہے یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ نصرت دین اور اشاعت اسلام صدقات کے مقاصد میں شامل ہے۔

مکتب

مفہوم: مکتب اس جگہ کا نام ہے جہاں لکھا پڑھا جاتا ہے اور عوام کو علم کے زیور سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ مکتب معاشرتی ادارات میں سے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرے میں تعلیم و تربیت اور اصلاح اخلاق کا دار و مدار مکتب پر ہے۔ ہر ترقی یافتہ قوم نے اپنی تعلیمی درس گاہوں پر زیادہ سے زیادہ توجہ صرف کی ہے کہ مکتب کی بنیاد اشاعت علم پر ہے اس لیے سب سے پہلے اسلام میں علم کی اہمیت اور فضیلت کے متعلق لکھا جاتا ہے۔

اسلام کی رو سے سب سے پہلا اور اوّل معلم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اس نے آدمؑ کو اشیاء کا علم دیا۔ ارشاد الٰہی ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرہ ۲:۳۱) اور آدمؑ کو سب کے نام سکھائے۔ اس علم کی وجہ سے آدمؑ مسجود ملائکہ بنا۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ (البقرہ ۲:۳۴) اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کی فرمانبرداری کرو تو انھوں نے فرمانبرداری کی مگر ابلیس نے نہ کی۔

پھر علم کو پھیلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام مخلوق کی طرف بھیجنے شروع کیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو مظہر الوہیت اور تمام انبیاء علیہم السلام کے جمیع اوصاف کے جامع تھے اللہ تعالیٰ نے ان کی بعثت کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (الجمعہ ۶۲:۲) یقیناً اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان کیا جب ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اگرچہ وہ پہلے ضرور کھلی گمراہی میں تھے۔

صاحب علم آدمی کی فضیلت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ( ) کہہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (المجادلہ ۵۸:۱۱) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے درجات بلند کرے گا جو تم میں سے ایمان لائیں گے اور جنھیں علم دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (فاطر ۳۵:۲۸) اللہ سے صرف اس کے علم والے بندے ڈرتے ہیں اللہ غالب بخشنے والا ہے۔

فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل ۱۶:۴۳) تم علم والوں سے پوچھو اگر تم کو علم نہیں۔

قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (طٰہٰ ۲۰:۱۱۴) کہہ اے میرے رب میرا علم بڑھا۔

احادیث نبوی: علماء پیغمبروں کے وارث ہوتے ہیں۔ (احیاء)

پیغمبروں کے بعد علماء اور مجاہدین کا درجہ ہے۔ (احیاء)

قیامت کے دن علماء کی روشنائی اور شہداء کا خون ایک ہی درجہ میں ہوں گے۔ (صبح الاعشیٰ)

اس مسلمان کی کوئی قدر و منزلت نہیں جو نہ استاد ہے نہ طالب علم۔ (محاضرات الادباء)

بلا تاخیر ایک جاہل کو علم کی تلاش میں لگ جانا چاہیے اور ایک عالم معتبر کو اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہیے۔ (الاحیاء)

مہد سے لحد تک تلاش علم جاری رکھو خواہ اس کے لیے چین جانا پڑے۔ (کشف الظنون)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو مجلسوں میں سے گزرے جو مسجد میں منعقد تھیں۔ آپ نے فرمایا۔ دونوں مجلسیں بھلائی پر ہیں لیکن ان میں ایک دوسری سے بہتر ہے ان دونوں مجلسوں یا جماعتوں میں سے ایک عبادت میں مصروف ہے اور خدا سے دعا کر رہی ہے اور اس سے اپنی خواہش کا اظہار کر رہی ہے وہ چاہے ان کو دے چاہے نہ دے۔ مگر دوسری مجلس علماء کی ہے دین کی سمجھ حاصل کر رہے ہیں اور جاہلوں کو سکھا رہے ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ بہتر ہیں اور میں بھی معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں یہ کہہ کر آپ بھی اس مجلس میں بیٹھ گئے۔ (مشکوۃ المصابیح کتاب العلم)

علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح کتاب العلم)

قیامت کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ علم اٹھ جائے گا اور جہالت پھیل جائے گی۔ (بخاری ۳:۲۱)

اقوال: حضرت علیؓ نے کمیل کو نصیحت کی تھی۔ اے کمیل! علم دولت سے بڑھ کر ہے۔ دولت کی حفاظت تو تمھیں کرنا پڑتی ہے لیکن علم تمہاری حفاظت کرتا ہے۔ دولت تو خرچ کرنے سے کم ہو جاتی ہے لیکن علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔ (الاحیاء عقد الفرید عیون الاخبار)

الاحناف کا قول ہے کہ ہر وہ عظمت اور بزرگی جسے علم کی پشت پناہی حاصل نہ ہو جلد غارت ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ذلت لے لیتی ہے۔ (محاضرات الادباء)

نامعلوم عالم فرماتا ہے جس نے علم حاصل نہیں کیا اس نے کیا پایا جس نے علم حاصل کر لیا اس نے کیا کھویا۔ (الاحیاء)

الخلیل بن احمد سے سوال کیا گیا "علماء بہتر ہیں یا بادشاہ! انھوں نے جواب دیا علماء۔ پھر ان سے پوچھا گیا جب یہ بات ہے تو پھر یہ بتایئے کہ علماء بادشاہوں کے درباروں پر کیوں جمع ہوتے ہیں لیکن بادشاہ علماء کے دروازوں پر مجمع نہیں ہوتے۔ انھوں نے کہا علماء جانتے ہیں کہ بادشاہوں کے متعلق ان کا کیا فرض کیا ہے۔ (عقد الفرید ادب الدنیا والدین)

حضرت عبداللہ بن مبارک سے دریافت کیا گیا کہ اگر تمھیں یہ معلوم ہو کہ کل تمہاری موت آنے والی ہے تو تم کیا کرو گے انھوں نے جواب دیا کہ میں مطالعہ میں معروف ہو جاؤں گا۔ (منہاج المتعلم)

مکتب کا آغاز اور ارتقاء

آغاز اسلام سے ہی درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اسلام ابتدائی چند صدیوں میں مدارس کے بجائے مساجد کے صحن، خانقاہوں کے حجرے اور علماء کے مکانات ہی درس گاہیں تھیں۔ اور یہیں سے عظیم مفسر، محدث، فقیہہ، مجتہد، ادباء، شعراء، فلاسفر اور مورخ پیدا ہوئے جن کے نام علمی دنیا میں درخشندہ ہیں۔

معاشرے کی اصلاح میں مکتب کے فرائض

علم کی اشاعت: جیسا کہ پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے اسلامی نقطہ نگاہ سے علم کا حصول اور اشاعت لازمی ہے۔ سب سے پہلے جو وحی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی وہ علم سے تعلق رکھتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم کے پھیلانے کی طرف خاص توجہ دی آپ کی نظر میں علم اتنا ضروری تھا کہ جب جنگ بدر میں قیدی پکڑے گئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواندہ قیدیوں پر رہائی کی یہ شرط عائد کر دی کہ وہ دس دس مسلمانوں کو پڑھائیں۔ پھر آپ نے صحابہ کرام کو یہ تلقین کی کہ جو باتیں سنتے ہیں وہ دوسروں تک پہنچائیں۔ پس علم کا حاصل کرنا اور اس کی اشاعت اسلامی نقطہ نگاہ سے بہت ضروری ہے۔ مدارس اور مکاتبت علم کی اشاعت کا مرکز ہوتے تھے۔

اسلام بنی نوع انسان کو اتحاد کی لڑی میں منسلک کرنے کے لیے آیا ہے۔ یہی وہ دین ہے جس نے یہ پیغام دیا ہے کہ تمام نسل انسانی ایک اصل سے ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ (النساء ۴:۱) اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک اصل سے پیدا کیا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (یونس ۱۰:۱۹) تمام انسان ایک ہی امت تھے پھر الگ الگ ہو گئے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (الحجرات ۴۹:۱۰) سب مومن بھائی بھائی ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ان العباد کلھم اخوۃ (احمد ابوداؤد) انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اَلْإِسْلَامُ أَحْوَجُ إِلَى الْجَمَاعَةِ (کنوز الحقائق حرف الھمزہ) اسلام جماعتی نظام چاہتا ہے۔

اَلْجَمَاعَةُ رَحْمَةٌ وَالْفُرْقَةُ عَذَابٌ. جماعت پر رحمت اور متفرق ہونا عذاب ہے۔

مکتب نسل انسانی کے اتحاد کو عملی جامہ پہنانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ جب طلباء مکتب میں جاتے ہیں وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں ان کے باہمی تعلقات بڑھتے ہیں تو ان میں اتحاد کا رشتہ مضبوط ہو جاتا ہے جس کا اثر معاشرہ پر پڑتا ہے۔

مساوات: اسلام نے مساوات بین الناس پر بہت زور دیا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (الحجرات ۴۹:۱۳) اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنائے تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ اور اللہ خوب جانتا ہے اور خبردار ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مشہور خطبہ میں فرمایا:

> "لوگو! ہاں بیشک تمہارا رب ایک ہے اور بیشک تمہارا باپ ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقوی کے سبب سے۔" (مسند احمد)

مکاتیب مساوات کا سبق دیتے ہیں۔ غریب امیر سب ایک جگہ پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس سے ایک دوسرے سے برتری اور فضیلت کا جذبہ سرد ہو جاتا ہے۔

نظم و ضبط کی تربیت: تمام مکاتیب کے قوانین و ضوابط ہوتے ہیں۔ جو طالب علم کسی مکتب میں داخل ہوگا۔ وہ ان قوانین کا جوا اپنی گردن پر رکھے گا اور ان کے مطابق اپنی طالب علمی کا زمانہ گزارے گا جس سے طالب علم میں نظم و ضبط کی تربیت ہو جاتی ہے۔ مثلاً وقت پر مکتب آنا' وقت کے مطابق اپنے اسباق پڑھنا' وقت پر کھیلنا' دوسروں کے لیے ایثار اور قربانی کرنا' استاد کی اطاعت کرنا' ساتھیوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ دینا یہ سب امور مکاتیب سے سیکھے جاتے ہیں۔

اخلاق کی تربیت: اخلاق اسلام کی تعلیم کا ایک نہایت ہی اہم حصہ ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ (موطا امام مالک باب حسن خلق) کہ میری بعثت ہی اس مقصد سے ہوئی ہے کہ مکارم اخلاق کی عمارت کو مکمل کروں۔

اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا (ترمذی ۱۰:۱۱) مومنوں میں سے ایمان کے لحاظ سے کامل وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔

خِيَارُكُمْ اَحْسَنُكُمْ اَخْلَاقًا (بخاری ۶۱:۲۳) تم میں سے سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (بقرہ ۲:۸۲) اور جو ایمان لاتے اور اچھے کام کرتے ہیں وہی جنت والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس ۹۱:۹-۱۰) کامیاب ہوگیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو پاک کیا اور ناکام ہوگیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو گناہوں کی میل سے گندا کیا۔

مکتب طالب علم کو اخلاق اور آداب سکھانے کی جگہ ہے۔ استاد طالب علموں کو اخلاق سنوارنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ تاکہ طالب علم صحیح معنوں میں اچھا شہری بن سکے گویا مکاتیب اور مدارس اخلاق سنوارنے کا ایک ذریعہ ہیں۔

مذہبی رواداری: اسلام رواداری کا مذہب ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ ۲:۲۵۶) یعنی دین کے بارہ میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے۔ ہدایت کی راہ گمراہی سے الگ اور نمایاں ہوگئی ہے۔

اسلام ہر ایک سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مذہبی کتاب اور رسول پر ایمان لائے اور کسی کے درمیان تفریق نہ کرے۔

ارشاد الٰہی ہے: قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (آل عمران ۳:۸۴) کہہ ہم ایمان لائے اس پر جو ہم پر اتارا گیا اور اس پر جو ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا ہم ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔

مکتب طلباء کو مذہبی رواداری کا سبق دیتا ہے۔ مختلف مذاہب اور فرقوں کے طالب علم مکتب میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک استاد سے اکٹھے سبق لیتے ہیں اور مذہبی تعصب سے بالاتر ہوتے ہیں۔ مختلف مذاہب اور فرقوں سے تعلق رکھنے والے طلباء کا ایک جگہ بیٹھنا اور ایک ہی استاد سے سبق لینا ان کے مذہبی تعصب کو سرد کر دیتا ہے اور جذبہ رواداری کو ابھارتا ہے۔

جمہوری اقدار کی تربیت: جب ایک طالب علم مدرسہ میں داخل ہوتا ہے تو وہ دوسروں سے مل کر رہنے اور کام کرنے کی تربیت حاصل کرتا ہے۔ اچھے اور بروں سے برتاؤ کرنے کی تربیت پاتا ہے۔

روحانی تربیت: مدارس صرف ذہنی اور اخلاقی اور جسمانی تربیت کا ہی مقام نہیں بلکہ روحانی تربیت کا بھی مہد ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں صفہ مسجد نبوی کا مکتب ہی تھا۔ وہاں صرف دینی علم ہی نہیں پڑھایا جاتا تھا بلکہ روحانی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ اس مکتب کے فارغ التحصیل تھے۔

جسمانی تربیت: کسی قوم کی ترقی اور اصلاح نوجوان کی جسمانی تربیت پر منحصر ہے۔ مکاتیب اور مدارس جہاں طالب علموں کی ذہنی اخلاقی اور روحانی تربیت کرتے ہیں وہاں ان کی جسمانی تربیت کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ اس طرح ایک طالب علم اخلاقی اور روحانی تربیت کے زیور سے آراستہ ہو کر مدرسہ سے فارغ ہوتا ہے اور معاشرہ کا ایک اچھا شہری ثابت ہوتا ہے۔

معاشرہ میں استاد کا مقام

معلم اوّل اللہ تعالیٰ ہے جس نے آدمؑ کو اسماء سکھائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرہ ۲:۳۱) اور آدمؑ کو سب نام سکھائے۔ پھر انبیاء علیہم السلام کو معلمین بنا کر بھیجا۔ جنھوں نے نسل انسانی کو روحانی، معاشرتی، اخلاقی اور اقتصادی علوم سکھائے۔ حقیقت میں تہذیب انسانی کے بانی انبیاء علیہم السلام کا ہی گروہ ہے سب کے آخر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام دنیا کی طرف بھیجا اور ایک ایسا علم کا خزانہ دیا جو نہ پہلوں کو ملا تھا اور نہ بعد میں کسی کو ملے گا اور وہ کتاب لائے جو ہر قسم کے علوم سے بھری ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی غرض بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا

عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ (الجمعہ ۶۲:۲) وہی ہے جس نے امیوں کے اندر انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں حکمت سکھاتا ہے اس آیت کریمہ میں یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو معلم کی حیثیت سے بھیجا ہے۔ جب قرآن مجید کی رو سے معلم اوّل اللہ تعالیٰ اور آخری معلم رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں تو اس سے یہ امر بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں معلم کا کیا مقام ہے۔ معلم ہی وہ ذات ہے جو علم کو ترویج دیتی ہے جاہلوں کو علم کے زیور سے آراستہ کرتی ہے دلوں کی تاریک کوٹھڑیوں کو علم کی روشنی سے منور کرتی ہے اور علم کی روشنی میں ہی قوم ترقی کرتی ہے۔ گویا معلم کی ذات قوم کی ترقی کا ذریعہ ہے۔ تاریخ بھی اس امر پر شاہد ہے کہ دنیا میں اسی قوم نے ترقی کی منازل طے کی ہیں جو علم کے زیور سے آراستہ تھی۔ عرب کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل عرب قوم تنزل کی اتھاہ گہرائیوں میں گری ہوئی تھی۔ تنزل کی وجوہ میں سے ایک وجہ امی ہونا ہے جیسا کہ قرآن سے ظاہر ہے جب اس امی قوم کے دل علم کے نور سے منور ہوئے تو یہ قوم نہایت ہی قلیل عرصہ میں زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کر گئی۔ جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

تاریخ سے یہ ظاہر ہے ہر وہ قوم جو عروج کے آسمان پر نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں علم کی شمع تھی اور یہ شمع معلمین کے ذریعہ روشن ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ہر ترقی یافتہ قوم معلمین کو معاشرہ میں ایک بلند درجہ دیتی ہے۔

بعض علماء نے تو معلمین کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا ہے بے ادب طالب علم بے دین ہے جس نے شیطان کو اپنا رہنما بنا لیا ہے۔ (المشکوٰۃ جرنل ایشیا ٹک ۱۹۴۰ص ۲۸۴)

حضرت مصعب بن زبیر فرماتے ہیں۔

''لوگوں نے جو کچھ سیکھا ہے اس میں بہترین بات منہ سے نکالتے ہیں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس میں سے بہترین چیز سیکھ لیتے ہیں۔ اور جو کچھ سنا ہے اس میں سے بہترین بات لکھ لیتے ہیں لہٰذا اگر تمھیں علم کی تلاش ہے تو اسے کسی کے ہونٹوں سے حاصل کرو اور اس طرح تمہیں چیدہ اور برگزیدہ علم حاصل ہوگا۔ (محاضرات الابرار محی الدین عربی غیر مطبوعہ ماخوذ از تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ مصنفہ ڈاکٹر احمد شبلی ص ۹۵)

امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔

''جو شخص صرف کتابوں سے علم حاصل کرتا ہے اسے وہ امتیاز حاصل نہ ہوگا جس کی اسے ضرورت ہے۔'' (تذکرہ السامع ص ۸۷)

اخوان الصفا نے لکھا ہے۔

''ہر شخص کی قوت سے باہر ہے کہ وہ صرف اپنی کوشش سے علم حاصل کرے۔ اس لیے ہر طالب علم کے لیے ایک استاد کی ضرورت ہے جو حصول علم تعمیر سیرت اور اس کے عقائد و اعمال میں رہنما کا کام دے۔'' (رسائل اخوان الصفا جلد ۴ ص ۱۸)

جب ہم مسلمانوں کی ترقی کے زمانہ کی حکومتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات بڑی نمایاں معلوم ہوتی ہے کہ ان حکومتوں نے اساتذہ کو معاشرہ میں ایک بلند مقام دیا تھا۔ مثال کے طور پر علی بن حسن الاحمر خلیفہ کے محل کے محافظوں میں شامل تھا۔ وہ صرف ایک کمرہ میں رہتا تھا۔ جس میں معمولی ساز و سامان تھا۔ جب الاحمر ہارون رشید کے لڑکے کا اتالیق مقرر ہو گیا تو اس کے بعد محمد بن الجہم ان کی زندگی کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔ جب کبھی ہم الاحمر کے پاس جاتے تو ہمیں متعدد ملازمین سے واسطہ پڑتا جو ہمیں اس حویلی میں لے جاتے ہیں۔ جو بادشاہوں کے محلات کے مانند ہوتی اور پھر الاحمر ہمارے پاس شاہی خلعت میں ملبوس آتا۔ (معجم الادباء (یاقوت) جلد ۵ ص ۱۱۰)

ہارون الرشید کی خدمت میں ایک مختصر رسالہ پیش کیا گیا۔ جس میں اس کے لیے وہ فرائض درج تھے جو خلیفہ کی حیثیت سے سرانجام دیتے تھے۔ اس میں اس موضوع سے متعلقہ چند سطور رقم کی جاتی ہیں۔

''یہ بات گرہ میں باندھ رکھو کہ علماء کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک روشن چراغ یا تاریکی میں لٹکے ہوئے روشنی کے فانوس ان چراغوں سے جو روشنی سلطنت میں پیدا ہوتی ہے اس کا انحصار اس توجہ پر ہے جو تم ان پر مبذول کرو۔'' (ہارون الرشید کے لیے نصیحت غیر مطبوعہ استنبول ماخوذ از تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ ڈاکٹر احمد شبلی)

کسی بڑے خلیفہ سے یہ سوال کیا گیا۔

خدا نے دنیا اسلام میں تمھیں بہترین درجہ عطا کیا ہے کیا تمھیں اب بھی کسی چیز کی تمنا ہے؟ خلیفہ نے جواب دیا ہاں ایک مقام ایسا ہے جو ان سب چیزوں سے بڑھ کر ہے جو مجھے حاصل ہیں اور جس کی برابری کوئی چیز نہیں کر سکتی اور وہ یہ ہے کہ کسی عالم کی مسند پر بیٹھ کر لوگوں کو

درس دیا جائے اور انھیں فیض پہنچایا جائے۔ (معجم ابن حجر ماخوذ از تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ)

ایک موقع پر ہارون الرشید کو محمد بن الحسن اور ان کے سامعین کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ سوائے محمد بن الحسن کے باقی تمام لوگ خلیفہ کو سلام کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ جب خلیفہ نے ان سے اس کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا۔ چونکہ میرا تعلق علماء سے ہے لہٰذا نوکروں جیسے کام کرنے سے مجھے نفرت ہے۔ (تذکرۃ السامع والمتکلم ص ۸۸،۸۹)

الملک الافضل روزانہ بلا ناغہ کتابیں خود لے کر محل شاہی سے نکلتا اور تاج الدین الکندی کے معمولی مکان پر جایا کرتا تھا بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ جو سبق پہلے سے جاری ہوتا اس میں دیر ہو جاتی اور ایسی صورت میں الملک الافضل کو اس وقت تک انتظار کرنا پڑتا جب تک اس کی باری آتی (المقصورۃ التاجیہ (دہمان) ص ۱۱) نور الدین کے حضور کوئی قابل مواخذہ فعل قطب الدین الشافی سے منسوب کیا گیا۔ نور الدین نے جواب دیا۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس کا علم وفضل اس کی تلافی کر دے گا۔ (مفرح الکروب (ابن واصل) غیر مطبوعہ کیمرج ماخوذ از تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ)

اساتذہ کا کردار اور فرائض

تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ دنیا میں کوئی انقلاب رونما نہیں ہو سکتا جب تک اس کے پیچھے قائد کے کردار کی قوت نہ ہو۔ اساتذہ صرف طلباء کو چند کتابوں کے پڑھانے پر مامور نہیں ہوتے بلکہ طلباء کے اندر ایک ذہنی اخلاقی روحانی انقلاب پیدا کرنا بھی ہوتا ہے۔ یہ انقلاب اس وقت تک رونما نہیں ہو سکتا جب تک استاد اخلاق کے بلند مقام پر نہ کھڑا ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب دنیا میں ایک نیا آسمان اور ایک نئی زمین پیدا کرنے کے لیے مبعوث ہوئے تو اپنے مخاطبین کے سامنے اپنا کردار پیش کیا اور کسی مخالف نے آپ کے کردار پر انگلی نہ رکھی۔ اس بلند کردار کی وجہ سے ہی آپ عرب میں ایک عظیم انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ثابت ہوئے۔

قرآن مجید میں یہ آیت لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ (تم وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر تمہارا عمل نہیں ہے) اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ قول اور عمل میں مطابقت ہونی چاہیے اور ایک استاد کو یہ سبق دیتی ہے کہ وہ اخلاق حمیدہ سے متصف ہو۔

استاد کے فرائض

شفقت: استاد کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ شاگرد سے شفقت اور پیار سے پیش آئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ انما انالکم مثل الوالد لولدہ (ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ) میں تمھارے لیے ویسا ہی ہوں جیسے باپ اپنے بیٹے کے لیے استاد کی شفقت ایسی ہی ہونی چاہیے جیسا کہ باپ کی بیٹے کے ساتھ۔
اگر استاد کا دل شفقت اور محبت کے جذبہ سے عاری ہوگا تو شاگرد کا دل بھی اس کی طرف مائل نہیں ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شاگرد علم کی دولت سے محروم رہے گا۔

نئے سبق کی تیاری: استاد نے جو نیا سبق طلباء کو پڑھانا ہو وہ اچھی طرح تیاری کر کے آئے۔ نئے سبق کا خاکہ ذہن میں ہو اور سلیس رواں فصیح زبان میں پیش کرے۔ جب تک استاد نئے سبق کی تیاری گھر پر نہیں کرتا نہ تو وہ اپنے علم کو بڑھا سکتا ہے اور نہ طالب علم میں ذوق اور شوق علم بڑھا سکتا ہے۔

وسعت مطالعہ: استاد کا یہ فرض ہے کہ وہ مطالعہ سے اپنا علم بڑھاتا رہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ دعا سکھائی ہے۔ رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا اے اللہ میرے علم کو بڑھا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا شخص جو اپنے علم اگلے اور پچھلے سب انسانوں سے افضل ہے علم کی بڑھوتی کے لیے ہر وقت دعا کرتا ہے تو عام انسان کے لیے تو بدرجہ اتم ضروری ہے کہ وہ ہر دم اپنے علم کو بڑھانے کی فکر رہے۔ علم دو طرح سے بڑھتا ہے۔ مطالعہ اور مشاہدہ سے۔۔ استاد کثرت سے مطالعہ کرے اور سیر و سیاحت سے اپنے مشاہدات کو بڑھائے۔ ہر علم وفن میں پختگی اور مہارت صرف مطالعہ اور مشاہدہ سے پیدا ہوتی ہے جب تک استاد اپنے علم وفن میں کامل نہ ہوگا۔ اس وقت تک وہ طالب علم کی علم کے میدان میں صحیح طور پر رہنمائی نہیں کر سکتا۔

حکمت تعلیم: استاد اپنے شاگردوں کو ان کی قابلیت کے مطابق پڑھائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ کلموا الناس علی قدر عقولھم یعنی لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق بات چیت کرو۔

جسمانی سزا سے احتراز: شاگرد کو جسمانی سزا دینے سے حتی الامکان احتراز کرنا چاہیے کیونکہ جسمانی سزا نفرت اور بغض کا باعث بن جاتی ہے۔ جب شاگرد کے دل میں اساتذہ کے خلاف نفرت پیدا ہو جائے۔ تو وہ استاد سے نور علم حاصل نہیں کر سکتی۔ استاد کا صرف یہ فرض ہے کہ اگر شاگرد سے کسی قسم کی غلطی

سرزد ہو جائے تو وہ محبت اور مشفقانہ انداز میں شاگرد کی غلطی کی نشان دہی کر دے۔
جسمانی سزا سے طالب علم کی خودداری مجروح ہوتی ہے۔عزت نفس کچلی جاتی ہے خودداری اور عزت نفس ہی انسان کی ذہنی اور اخلاقی استعدادوں کو جلا بخشتی ہے۔

جسمانی صحت کا خیال: استاد کا یہ فرض ہے کہ شاگرد کی جسمانی صحت کا خیال رکھے کیونکہ صحت پر عقل اور ذہانت کا دار و مدار ہے۔اگر شاگرد کی صحت خراب ہوگی تو وہ محنت کرنے سے جی چرائے گا۔

نظم وضبط کی پابندی: نظم وضبط کی پابندی استاد پر فرض ہے۔اگر استاد نظم وضبط قائم نہ رکھے گا تو شاگرد کی زندگی کبھی بھی نظم وضبط کے تحت نہیں آ سکتی۔ استاد نظم وضبط کی پابندی کرے گا تب شاگرد بھی نظم وضبط کا خیال رکھے گا۔

ایثار: استاد کے اندر ایثار اور قربانی کا جذبہ ہونا چاہیے۔ہمارے گزرے ہوئے مشہور اساتذہ کی زندگی ایثار اور قربانی کا نمونہ تھی۔

سادگی: سادگی اور پاکیزگی انسان کا زیور ہے جو آدمی اس زیور سے آراستہ ہوگا وہ قابل تکریم وتعظیم ہے۔استاد کو سادہ زندگی بسر کرنی چاہیے۔تصنع اور بناوٹ اس کے قریب تک پھٹکنی نہیں چاہیے کیونکہ سادگی بیشمار خوبیوں اور اچھائیوں کو جنم دیتی ہے اور بیشمار برائیوں سے روکتی ہے۔سادہ آدمی مخلص وفادار اور ہمدرد ہوگا اور تکبر اور ریاکاری سے دور رہے گا۔

ترویج علم: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقش قدم پر چل کر ترویج علم میں کوشش کرے اور کسی معاوضے کی امید نہ رکھے۔
قرآن مجید میں آتا ہے: لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا کہہ دو کہ ہم تم سے اس تعلیم کے لیے نہ تو بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ!

غور وفکر کرنے کی تلقین: ذہنی استعداد میں غور وفکر سے ہی ترقی کرتی ہیں اس وجہ سے قرآن مجید نے انسان کو بار بار غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے اس لیے استاد کا یہ فرض ہے کہ وہ شاگرد کو ہمیشہ غور وفکر کرنے کی تلقین کرتا رہے تاکہ طالب علم محض استاد کا ہی نقال بن کر نہ رہ جائے۔

شاگرد کے فرائض

برائیوں سے اجتناب: برائی غیر طبعی فعل ہوتا ہے۔ہر غیر طبعی فعل انسان کے دل اور عقل پر پردہ ڈالتا ہے اور نور طبیعت کو بجھاتا ہے اس سے صرف ذہانت اور فطانت ہی مردہ نہیں ہوتا بلکہ انسان کی اندرونی شخصیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔اسی وجہ سے اسلام نے ہر قسم کی برائی سے مجتنب رہنے کی تعلیم دی ہے۔ایک طالب علم کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ ہر قسم کی برائیوں سے احتراز کرے۔امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ علم دل کی عبادت اور باطنی نماز کا نام ہے۔

استاد کا احترام: طالب علم کو چاہیے کہ استاد کے احترام اور وقار کو بلند رکھے۔کبھی بھی گستاخی اور تکبر سے پیش نہ آئے۔اگر استاد کا مقام معاشرہ میں بلند نہ ہوگا اور لوگوں کی نظر میں گرا ہوگا۔تو اس سے طالب علم کبھی بھی استفادہ نہیں کر سکے گا۔طبرانی، حاکم، بیہقی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کاتب وحی رسول زیدؓ بن ثابت کسی جنازے میں شریک ہوئے۔نماز جنازہ کے بعد سواری پر سوار ہونے لگے۔تو عبداللہ بنؓ عباس نے رکاب تھام لی۔حضرت زیدؓ بن ثابت نے فرمایا اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا زاد بھائی رکاب چھوڑ دیجئے۔ابن عباسؓ بولے کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ عالموں اور بڑوں کی تعظیم اسی طرح کریں۔یہ سن کر حضرت زید بن ثابتؓ نے ابن عباس کا ہاتھ چوم لیا اور فرمایا کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر والوں کا احترام اس طرح کریں۔
ایک دفعہ حضرت امام ابوحنیفہؒ طلباء کو پڑھا رہے تھے کہ ایک سقہ پاس سے گزرا تو امام صاحب کھڑے ہو گئے اور فرمایا یہ میرا استاد ہے۔طلباء نے کہا یا حضرت! آپ کا استاد فرمایا! ہاں۔طلبا نے کہا آپ نے اس سے کیا سیکھا تھا۔فرمایا اس نے مجھے بتایا تھا کہ کتا کب جوان ہوتا ہے۔

استاد کی ہدایات پر چلنا: طالب علم کو چاہیے کہ وہ استاد کی ہدایات پر اور رہنمائی کے مطابق علم سیکھے۔جو استاد بتائے وہ یاد کرے تاکہ اس کا ذہن شکوک شبہات کا شکار نہ ہو کیونکہ استاد نے تمام مسائل پر غور وخوض کیا ہوتا ہے اور مسائل کی صحت اور درستگی پر پہنچا ہوا ہوتا ہے۔طالب علم چوں کہ پختہ ذہن نہیں ہوتا اور مسائل کے ہر پہلو پر غور وفکر بھی کیا ہوا نہیں ہوتا۔اس وجہ سے یہ لازمی ہے کہ طالب علم استاد کی ہی ہدایات کے مطابق مطالعہ کرے۔

اطاعت فی المعروف: طلباء کو استاد کی اطاعت فی المعروف کرنا ضروری ہے۔حضرت علیؓ کا قول ہے۔انا عبد من علمنی حرفا جس نے مجھے ایک

حرف بھی پڑھایا ہے اس کا غلام ہوں۔

حصول علم میں انہماک: علم حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ طالب علم تمام مشاغل سے توجہ ہٹا کر صرف علم کی طرف ہی توجہ رکھے۔ حضرت امام غزالیؒ نے کہا ہے کہ جب تک تم سب کچھ علم کو نہ دے ڈالو۔ علم تمھیں اپنا کوئی حصہ بھی نہیں دے گا۔ منتشر افکار کی مثال اس پانی کی مانند ہے جسے چھوٹی چھوٹی نالیوں میں تقسیم کر دیا جائے کچھ نالیاں سورج کی گرمی سے خشک ہو جائیں گی اور ہوا انھیں اڑا لے جائے گی۔ کچھ زمین میں جذب ہو جائیں گی کچھ انسان اور حیوان پی لیں گے اور پانی ختم ہو جائے گا لیکن یہی نالیاں متحد رہیں تو نہریں بن جاتیں اور ناپید نہ ہوتیں۔

طالب علم کی توجہ علم پر ہی مرتکز رہنی چاہیے تا کہ ذہنی انتشار کی وجہ سے طالب علم کی استعدادیں اور قابلیتیں ضائع نہ ہوں۔

بلند نظری: علم ایک پاکیزہ مقصد اور مطہر چیز ہے اس وجہ سے اس کا حصول بھی بلند اور پاکیزہ مقصد کے لیے ہونا چاہیے۔ عموماً طلباء کے سامنے علم حاصل کرنے کا مقصد صرف مادی فوائد ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ مقصد نہایت ہی پست ہے۔ طالب علم کے پیش نظر یہ مقصد ہونا چاہیے کہ وہ علم کے نور سے ملک اور اسلام کی خدمت کرے گا اور علم کے خزانہ سے نسل انسانی کو فائدہ پہنچائے گا۔

محنت: دنیا میں کوئی چیز بغیر محنت کے حاصل نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے علم کے حاصل کرنے کے لیے طالب علم کو محنت کرنا ضروری ہے۔ صحابہ کرام کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے وہ ایک ایک حدیث سننے کے لیے سینکڑوں میل کے سفر پیدل کرتے اسی طرح ہمارے ائمہ اور مشہور اساتذہ نے علم حاصل کیا۔ علم کے جہاں جہاں مرکز ہوتے وہاں جاتے اور علم کی دولت جمع کرتے۔

مال خرچ کرنا: جہاں علم کے حصول کے لیے محنت ضروری ہے وہاں روپیہ پیسہ بھی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر ہمارے اس دور میں بغیر روپیہ پیسہ خرچ کرنے کے علم حاصل ہی نہیں ہوسکتا۔ سکولوں اور کالجوں میں فیس ادا کرنا پڑتی ہے۔ کتب خریدنا ہوتی ہیں اگر کوئی شخص مال کو علم سے زیادہ پسند کرتا ہے تو وہ کبھی بھی علم حاصل نہیں کر سکے گا علم تو وہ دولت ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے گھر کا سب کچھ اثاثہ لٹانا پڑتا ہے۔

تکبر سے اجتناب: طالب علم کو اپنے پر تکبر نہیں کرنا چاہیے۔ جب کسی عالم کے دل میں تکبر پیدا ہو جاتا ہے تو علم کا نور بجھنا شروع ہو جاتا ہے۔

کامل دسترس: جب تک طالب علم علم کی کسی شاخ میں کامل دسترس حاصل نہیں کر لیتا اس وقت تک کسی دوسرے علم کی طرف توجہ نہ کرے۔

علم کا پڑھنا بعض علوم ایک ہی اصل کی مختلف شاخیں ہیں۔ اس وجہ سے کامل دسترس اور مہارت پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان تمام علوم کو پڑھا جائے جن کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ مثلاً علم تفسیر ہے اس کے لیے حدیث عربی ادب، تاریخ سابقہ کتب سماوی کا علم ضروری ہے۔

مسجد

مفہوم: امام راغب کے نزدیک مسجد جیم کے کسرہ سے ہے۔ جس کے معنی ہیں موضع السجو دیعنی وہ مقام جہاں اللہ تعالیٰ کے سامنے جبین نیاز رکھی جائے۔ اس کی جمع مساجد ہے ابن الاعرابی کہتے ہیں۔ مسجد بفتح جیم "محراب البیوت" کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے زجاج نے مسجد کے معنی یہ بیان کیے ہیں۔ کل موضع یعبد فیه فهومسجد قال النبی صلی الله علیه وسلم جعلت لی الارض مسجداً و طهورا. یعنی ہر وہ جگہ جہاں عبادت ہوتی ہے وہ مسجد ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ زمین میرے لیے مسجد اور پاک بنائی گئی ہے۔

قرآن مجید میں مسجد کا لفظ عبادت گاہ کے لیے مستعمل ہوا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (الحج ۲۲:۴۰) اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے نہ ہٹاتا تو یقیناً راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے۔ گرادی جاتیں۔

اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (الجن ۷۲:۱۸) اور مسجدیں اللہ کے لیے ہیں سو اللہ کے ساتھ اور کسی کو نہ پکارو۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا مقالہ نگار لکھتا ہے کہ مسجد کا لفظ یہودیوں کے ہاں بھی مستعمل تھا۔ قرآن مجید اور حدیث سے بھی یہ شہادت ملتی ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَى (بنی اسرائیل ۱۷:۱) وہ ذات پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے گیا۔ مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہے جو یہودیوں کا قبلہ تھا۔

بخاری کی کتاب الصلوٰۃ میں حبشہ کے گرجا کے نام سے پکارا گیا ہے۔ ابن خلدون نے اپنی مشہور تصنیف (مقدمہ میں) مسجد کو عام عبادت گاہ کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

مسجد کی اہمیت: اسلام میں مسجد کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ جب آدم علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے تو تخلیق نسل انسانی کے منشا کو پورا کرنے کے لیے ایک ایسے گھر کی ضرورت محسوس ہوئی جہاں اللہ کے بندے اس کی عبادت کریں۔[1] سو اس خواہش کی تکمیل کے لیے مکہ میں ایک گھر کی بنیاد ڈالی۔

ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ (آل عمران ۳:۹۶) پہلا گھر عبادت کے لیے جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا یقیناً وہی ہے جو مکہ میں ہے برکت دیا گیا اور سب قوموں کے لیے ہدایت ہے۔

بخاری اور مسلم میں ہے کہ ابو ذر غفاریؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا یا رسول الله ای مسجد وضع فی الارض اوّلاً یعنی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روئے زمین پر پہلی مسجد کون سی ہے تو آپ نے جواب دیا مسجد الحرام یعنی خانہ کعبہ۔

مرور زمانہ سے جب یہ عبادت گاہ پیوند خاک ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو دوبارہ آباد کرنے کا کام دو عظیم الشان نبیوں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سپرد کیا۔

قرآن مجید میں آتا ہے: اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (البقرہ ۲:۱۲۷) اور جب ابراہیم علیہ السلام گھر کی بنیادیں اٹھارہے تھے اور اسمٰعیل بھی، اے ہمارے رب ہم سے قبول فرما تو سننے والا جاننے والا ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (الحج ۲۲:۲۶) اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کر۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے نسل انسانی کی تخلیق کے ساتھ ہی مسجد کی تعمیر عمل میں آئی تھی۔

---

[1] مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۱:۵۶) یعنی میں نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کو پیدا کیا۔

عہد نبوی میں پہلی مسجد: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی مصائب اور تکالیف سے لبریز تھی۔ اس تاریک اور آفات سے پُر فضا میں باضابطہ مسجد کا تعمیر کرنا مشکل تھا۔ جہاں مسلمان با جماعت نماز ادا کر سکتے۔ اور تو اور مسلمانوں کے لیے بیت اللہ میں جا کر عبادت کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اگر کسی مسلمان نے بیت اللہ میں جا کر نماز ادا کرنے کی کوشش کی تو کفار اس پر امنڈھ پڑتے تھے اور اس کو مار مار لہولہان کر دیتے تھے۔ ان مصائب کے پیش نظر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی صحابی کے گھر جاتے تمام صحابہ وہاں جمع ہو جاتے اور نماز پڑھ لیتے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی قبل ان یبنی المسجد حیث ادرکتہ الصلوۃ (ابن ماجہ ج ۱ صفحہ ۵۴)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد بننے سے قبل جہاں وقت آتا تھا نماز پڑھ لیتے تھے۔

جب اللہ کے حکم سے مکہ چھوڑ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ رخصت ہو گئے تو مدینہ سے باہر مقام قبا میں نزول فرمایا۔ ... سب سے پہلا کام جو آپ نے انجام دیا وہ عبادت الٰہی کے لیے مسجد کی تعمیر تھی خود بھی صحابہ کرام کے ساتھ کام کرتے پتھر اٹھاتے تو جسم زخمی ہو جاتا تو عقیدت مند آتے اور کہتے: فداک ابی و امی آپ چھوڑ دیں ہم خود اٹھالیں گے یہی وہ مسجد ہے جس کی شان میں قرآن مجید میں ذکر ہے۔ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ (توبہ ۹:۱۰۸) یقیناً وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے ہی تقویٰ پر رکھی گئی ہے زیادہ لائق ہے کہ تو اس میں کھڑا ہو۔

جب قبا سے مدینہ میں تشریف لائے تو سب سے پہلا کام مسجد کی تعمیر تھی۔

مسجد مذہبی مرکز کی حیثیت سے: ہر مذہب کا مرکزی نقطہ عبادت الٰہی ہے۔ کوئی ایسا رسول مخلوق کی ہدایت کے لیے نہیں آیا جس نے عبادت الٰہی پر سب سے زیادہ زور نہ دیا ہو۔ قرآنی نقطہ نگاہ سے نسل انسانی کی پیدائش کی غرض و غایت ہی عبادت الٰہی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات ۵۱:۵۶) اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔

انسان کا اللہ کی عبادت بجالانا اس کے اپنے فائدہ کے لیے ہے کیونکہ وہ اپنے کمال صرف عبادت الٰہی سے ہی حاصل کر سکتا ہے اس وجہ سے ہر مذہب نے عبادت الٰہی کو مرکزی حیثیت دی ہے۔ اسلام نے تمام روئے زمین کے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (البقرہ ۲:۲۱) اے انسانو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا ان کو جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔

قرآن مجید انبیاء علیہم السلام کی رسالت کی اصل غرض ہی یہ بیان کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو عبادت الٰہی کی دعوت دیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل ۱۶:۳۶) اور یقیناً ہم نے ہر ایک قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچو۔

اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے لیکن نماز باجماعت مسجد میں ادا کرنا عبادت کا اہم جزو ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (البقرہ ۲:۴۳) اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور جھکنے والوں کے ساتھ جھکو۔

نماز جمعہ کے متعلق آتا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ (الجمعہ ۶۲:۹) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ جب جمعہ کے دن نماز کے لیے بلایا جائے تو اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف جلدی آ جاؤ اور کاروبار کو چھوڑ دو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: صَلٰوةُ الْجَمَاعَةِ تَفْضُلُ صَلٰوةَ الْفَرْدِ بِسَبْعٍ وَّعِشْرِيْنَ دَرَجَةً (بخاری ۱۰:۳۰) باجماعت نماز کا اکیلے کی نماز سے ستائیس درجے زیادہ ثواب ہے۔

فرمایا: ''اس ذات پاک کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی کو لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں اور جب لکڑیاں اکٹھی ہو جائیں تو نماز کے لیے اذان کا حکم دوں۔ پھر کسی شخص کو یہ حکم دوں کہ لوگوں کی امامت کرائے جو حاضر جماعت نہیں ہوئے ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔'' (بخاری و مسلم)

خدا کی قسم ان کا یہ حال ہے کہ اگر کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ موٹی ہڈی یا دو کھر ہی مل جائیں گے تو پھر ضرور عشاء میں بھی حاضر ہوں گے۔ (بخاری باب وجوب صلوٰۃ الجماعۃ)

حضرت امام احمد بن حنبل لکھتے ہیں۔ اگر مسجد میں نماز باجماعت سے غیر حاضری گناہ کبیرہ نہ ہوتی تو ان کے گھروں کو جلانے کی دھمکی نہ فرماتے۔

(کتاب الصلوٰۃ ص ۲۱ امام احمد)

''جو شخص وضو کر کے اپنے گھر سے نکلے اور فرض ادا کرنے کے لیے مسجد کی طرف جائے۔ اس کو اتنا اجر ملے گا جتنا کہ احرام باندھنے والے حج کرنے والے کو ملتا ہے اور جو شخص چاشت کی نماز کے لیے گھر سے نکلا اور خالص نماز چاشت کی نیت سے مسجد میں گیا اس کا ثواب عمرہ

کرنے والے کے برابر ہے۔ اور نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کر کے نماز پڑھنا اور اس کے درمیانی وقفہ میں بیہودہ گوئی نہ کرنا ایسا عمل ہے جو علیین میں لکھا جاتا ہے۔'' (مشکوٰۃ المصابیح باب المساجد صفحہ ٦٧)

ہر نماز سے قبل موذن بلند آواز سے اذان دیتا ہے جس سے اللہ کی توحید عظمت اور کبریائی سے فضا آسمانی گونج اٹھتی ہے۔ خدا کے بندے موذن کی آواز سن کر بارگاہ ایزدی میں پہنچ جاتے ہیں۔ امام کے پیچھے نماز ادا کرتے ہیں۔ ہر رکعت میں قرآن مجید کا کوئی حصہ پڑھا جاتا ہے۔ قیام رکوع سجود کر کے احکام الٰہی کی پابندی کے سبق کی تجدید کی جاتی ہے۔ جب نماز ختم ہو جاتی ہے تو نمازی خدا کی کبریائی کا ذکر کرتے ہیں اور جب مسجد سے باہر جاتے ہیں تو دل پر سوائے اللہ کی عظمت اور جلال سے کسی کے نقش نہیں ہوتے دل میں ایک گونہ اطمینان ہوتا ہے۔ ان وجوہ کی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسجد مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا ایک مرکز ہے۔

احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ عہد نبوی میں اصحاب صفہ اور دیگر صحابہ حلقے باندھ کر تعلیم و ذکر میں مصروف رہتے تھے۔

مسجد سیاسی اور عمومی مرکز کی حیثیت سے: اسلام سیاست کو دین کا ایک جزو قرار دیتا ہے۔ اور اس کے لیے ایک واضح تعلیم کا خاکہ پیش کرتا ہے تاکہ بنی نوع انسان اس تعلیم پر عمل پیرا ہو کر اپنی دنیوی زندگی کو بہتر بنا سکیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کا مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپؐ کے اور خلفائے راشدین کے عہد مبارک میں مسجد کو سیاسی مرکز کی بھی حیثیت رہی ہے۔ تمام اہم اور ضروری قومی مسائل کا تصفیہ یہاں ہی کیا جاتا تھا۔ جب باہر سے وفود آتے تو ان کو مسجد میں اتارا جاتا تھا۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ عکل کی ایک جماعت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی تو ان کو صفہ میں ٹھہرایا گیا۔ (بخاری ٨:٥٨) نجران کے عیسائیوں اور طائف کے مشرکین کے وفد مسجد میں ہی آ کر ٹھہرے تھے۔ اس غرض کے لیے مسجد میں خیمے نصب کیے گئے تھے۔ مسجد میں قیدیوں کو باندھا جاتا حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک رسالہ نجد کی طرف بھیجا تو وہ بنی حنیفہ کے ایک آدمی ثمامہ بن اثال کو قیدی بنا کر لائے تو اس کو مسجد کے ایک ستون سے باندھا۔ (بخاری ٨:٧٦)

ایک دفعہ ایک تہوار کے موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض حبشیوں کو ڈھالوں اور نیزوں کے ساتھ مسجد میں کرتب دکھانے کی اجازت دی۔ (بخاری ٨:٦٩)

حضرت حسانؓ بن ثابت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں اور مخالفین کی ہرزہ سرائی کے جواب میں اپنے قصائد مسجد میں ہی پڑھا کرتے تھے۔ (بخاری باب الشعر فی المسجد)

بعض اوقات لڑائی میں زخم خوردہ کسی صحابی کی تیمارداری اور عیادت کے لیے اس کا خیمہ مسجد میں نصب کر دیا جاتا تھا۔ مثلاً جب غزوۂ خندق میں حضرت سعد بن معاذ کو مہلک زخم آئے تو ان کے لیے مسجد میں خیمہ نصب کر دیا گیا۔ (بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الخیمۃ فی المسجد)

مدینہ کے دفاع کے لیے باہر جانا ہوتا تو مجاہدین کا اکٹھ مسجد میں ہوتا۔ باہر سے مال آتا تو اس کو مسجد میں رکھا جاتا اور تقسیم کیا جاتا۔ (بخاری ٨:٤٢)

مقدمات کا فیصلہ اور ان کا اجرا مسجد سے ہی ہوتا بخاری کتاب الخصومات میں وہ تمام مقدمات مذکور ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس عدالت مسجد میں ہی منعقد ہوا کرتی تھی۔

خلفائے راشدین کے دور میں عدالت جنگی مجالس کا انعقاد اور میدان جنگ میں اسلامی فوج کی کامیابی کا اعلان مسجد میں ہوا کرتا تھا۔

خلفائے راشدین کے دور میں کسی اہم مسئلہ کے متعلق عوام کی رائے معلوم کرنا ہوتی تو اس کا اہتمام مسجد میں ہی کیا جاتا تھا۔

تمام خلفائے راشدین نے بیعت کے بعد اپنی حکومتی پالیسی کا اعلان مسجد میں ہی کیا۔ تمام فتاویٰ اور مقدمات کے فیصلے مسجد سے ہی جاری کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں عبداللہ بن مسعود کو کوفہ کا جج اور منتظم مالیات مقرر کیا گیا وہ مسجد میں ہی فیصلے کیا کرتے تھے۔

خلفائے راشدین کے دور کے بعد بھی مسجدیں سیاسی مرکز کی حیثیت رکھتی تھیں۔ چنانچہ طبری میں لکھا ہے کہ ١٢٣ھ میں مدینہ کے قاضی مسجد میں فیصلے کیا کرتے تھے۔ یعقوبی کے قول کے مطابق بغداد میں مشرقی حصے کا قاضی مسجد میں فیصلے کیا کرتا تھا۔ دولت فاطمیہ میں جامع عمرو کی شمالی ملحقہ عمارت قاضی کے لیے مخصوص ہوتی تھی۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ شیراز میں اسے جس عدالت میں پیش ہونا پڑا اس کا انعقاد مسجد میں تھا۔

اس تمام تفصیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد مسلمانوں کے لیے سیاسی اور عمومی مرکز کی حیثیت رکھتی ہے چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا مقالہ نگار لکھتا ہے۔

In general The Mosque and particularly the Minber was the place where official proclamation were made. Of course as early as the time of prophet. Although the Mosque lost its old political importance in later history. It has never quite lost its characrer as the assembly or occasions of public importance. (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ''مسجد'')

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ابتدائی زمانہ ہی سے مساجد بالعموم اور منبر بالخصوص وہ جگہیں تھیں۔ جہاں سے سرکاری اعلان ہوا کرتے تھے۔ گو مسجد بعد کے زمانہ میں اپنی قدیم سیاسی اہمیت کھو بیٹھی تاہم عوامی اہمیت کے مواقع پر مسجد میں اجتماع ہونا کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مسجد ثقافتی اور تعلیمی مرکز کی حیثیت سے: مسجد مسلم قوم کا ثقافتی اور تعلیمی مرکز ہے۔ مسلمانوں کی قومی زندگی کے متعلق تمام امور کی تعلیم مسجد میں دی جاتی ہے۔ خطبہ جمعہ تو ایک باقاعدہ ہفتہ وار لیکچر ہے جس میں امام مسلمانوں کو ہر قسم کے امور کے متعلق آگاہ کرتا رہتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی آخری بیماری کے دوران مسجد میں تشریف لائے اور اپنا آخری خطبہ دیا۔

عہد نبوی میں مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام مسجد میں تھا۔ مسجد کے ساتھ ہی ایک صفہ (چبوترہ) تھا۔ جہاں ان کی رہائش کا انتظام تھا۔ بعض اوقات متعلمین کی تعداد چار سو تک پہنچ جاتی تھی۔ انہی میں سے تبلیغ کے لیے باہر مبلغ بھیجے جاتے تھے۔

لہٰذا ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ مساجد ابتدا ہی سے صدیوں تک تعلیمی ادارے رہی ہیں۔ علماء فضلاء بالعموم مساجد میں رہائش پذیر ہوا کرتے تھے اور مساجد سے گرجون ٹاؤن ہال مدرسوں اور بعض اوقات اقامت گاہوں کا سا کام لیا جاتا رہا ہے۔

مسجد کے آداب

پاک نیت: اسلام میں ہر عمل کا ثواب پاک نیت پر مبنی ہے ارشاد نبوی ہے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ مسجد کی طرف جانے والا تمام دنیوی علائق سے منقطع ہو کر صرف اللہ کی خاطر جائے۔ دل محبت الٰہی سے معمور ہو۔ اس کے یہ امر پیش نظر ہو کہ وہ ایک بلند و برتر ہستی کے سامنے جا رہا ہے۔ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ وذلک انه اذا توضا فاحسن الوضو ثم خرج الی المسجد لا یخرجه الا الصلوٰۃ (بخاری جلد اصفحہ ۶۹) اور ثواب اس وقت ملے گا جب نمازی اچھی طرح وضو کرے پھر مسجد کے لیے نکلے اور فقط نماز کے لیے ہی نکل رہا ہو۔

ارشاد الٰہی ہے: وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (الجن ۷۲:۱۸) اور کہ مسجد اللہ کے لیے ہیں سو اللہ کے ساتھ اور کسی کو نہ پکارو۔

یہ حدیث اور آیت کریمہ ظاہر کرتی ہے کہ مسجد کی طرف صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر نکلنا چاہیے اور مسجد کی طرف جاتے ہوئے انسان کا دل ہر قسم کے معبودان باطلہ سے منزہ ہو۔

جسمانی طہارت: یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ روح اور جسم میں ایک گہرا تعلق ہے۔ اگر روح غمگین ہو تو انسان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں اور اگر روح خوش ہو تو انسان کا چہرہ چمک اٹھتا ہے۔ اسلام نے اس گہرے تعلق کی بناء پر یہ حکم دیا ہے کہ جب مسجد کی طرف روح کی بالیدگی اور پاکیزگی کے لیے نکلا جائے تو جسم کو ہر قسم کی آلودگی سے پاک کر لینا چاہیے۔

ارشاد الٰہی ہے: یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ وَ ثِیَابَکَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (المدثر ۷۴:۱......۵) اے چادر اوڑھنے والے اٹھ اور ڈرا اور اپنے رب کی بڑائی کر اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ اور ناپاکی سے دور رہ۔

جسمانی طہارت کی پہلی صورت وضو ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ اِلَى الْکَعْبَیْنِ (المائدہ ۵:۶) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم نماز کو اٹھو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھو لیا کرو اور اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک اپنے پاؤں دھویا کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ الصَّلٰوةُ وَمِفْتَاحُ الصَّلٰوةِ الطُّهُوْرُ (مشکوٰۃ احمد بن حنبل) جنت کی کنجی نماز ہے اور نماز کی کنجی پاکیزگی ہے۔

لَا تُقْبَلُ صَلٰوةٌ بِغَیْرِ طُهُوْرٍ وَلَا صَدَقَةٌ مِّنْ غُلُوْلٍ (مسلم، مشکوٰۃ المصابیح) پاکیزگی کے بغیر نماز قبول نہیں کی جائے گی۔ خیانت کے مال سے

صدقہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

اچھی ہیئت میں آئے: مسجد کی طرف جانے سے قبل اپنی ہیئت اور لباس کو اچھا کر لینا چاہیے۔ لباس دھلا ہوا ہو۔ بال وغیرہ بکھرے ہوئے نہ ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ سر پر ٹوپی وغیرہ ہو۔ اگر ہو سکے تو خوشبو وغیرہ بھی لگا لینی چاہیے تاکہ دوسرے ساتھیوں کو پسینہ کی بدبو سے تکلیف نہ ہو۔

ارشاد ربانی ہے۔ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف ۷:۳۱) اے بنی آدم! ہر سجدے کے وقت اپنی زینت کو لے لیا کرو۔

اس آیت سے فقہا اور مفسرین نے یہ استدلال کیا ہے کہ مسجد میں جانے سے پہلے حتی الوسع ہیئت اچھی ہو۔

وقار اور اطمینان سے آئے: مسجد کی طرف جاتے ہوئے وقار اور اطمینان سے جانا چاہیے۔ راستہ میں چلتے ہوئے لہو ولعب اور ہنسی مخول کی باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔

ارشاد نبوی ہے۔ واتوها و عليكم السكينة فما اَدْرَكْتُمْ فصلوا (مسلم باب استحباب اتيان الصلوٰة) یعنی نماز کے لیے اس طرح آؤ کہ تم پر سکینت اور وقار ہو جو پالو پڑھ لو۔

دُعا پڑھنا: مسجد میں دایاں پاؤں رکھتے ہوئے یہ دعا پڑھی جائے۔

ارشاد نبوی ہے۔ اذا دخل احدكم المسجد فليقل اللهم افتح لی ابواب رحمتک و اذا خرج فليقل اللّٰهم انی اسئلک من فضلک. (مشکوٰۃ المصابیح باب المساجد و مواضع الصلوٰۃ ص ۶۸) جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو یہ دعا کرنی چاہیے اے اللہ اپنی رحمت کے دروازے میرے لیے کھول اور جب مسجد سے باہر نکلے تو یہ دعا کرے۔ اے اللہ! میں تجھ سے تیرا فضل چاہتا ہوں۔

دنیا کی باتوں سے پرہیز: مسجد میں دنیا کی باتوں سے اجتناب کرنا اور ذکر الٰہی کے پانی سے دل کی خشک کھیتی کو سیراب کرنا چاہیے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (الجن ۷۲:۱۸) یقیناً مسجدیں اللہ کی ہیں پس اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔

دوسری جگہ آتا ہے: فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ (نور ۲۴:۳۶) نور ان گھروں میں ہے جو اللہ نے حکم دیا ہے کہ بلند کیے جائیں اور ان میں اس کا نام یاد کیا جائے۔

حدیث میں آتا ہے: نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ تَنَاشُدِ الْاَشْعَارِ فِى الْمَسْجِدِ وَعَنِ الْبَيْعِ وَالْاِشْتِرَاءِ فِيْهِ وَاَنْ يَّتَحَلَّقَ النَّاسُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ قَبْلَ الصَّلٰوةِ فِى الْمَسْجِدِ (مشکوٰۃ باب المساجد) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد میں اشعار پڑھنے اور خرید وفروخت کرنے سے منع فرمایا اور اس بات سے بھی کہ جمعہ کے دن لوگ نماز سے پہلے حلقہ باندھ کر بیٹھیں۔

لڑائی جھگڑے سے ممانعت: لڑائی جھگڑے سے اسلام تو ویسے ہی روکتا ہے۔ مگر مسجد میں لڑائی جھگڑے کی قباحت بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ مسجد مساوات اور اخوت کا عملی ثبوت ہے۔ جہاں امیر وغریب، شاہ وگدا سب ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر بارگاہِ الٰہی میں اپنی نیاز مندی کا سبق دہرا رہے ہوتے ہیں۔ اس اخوت کے گھر میں لڑنا تو کجا کھلا ہتھیار لے کر چلنا ممنوع ہے۔

ارشاد نبوی ہے۔ خصال لا تنبغی فی المسجد لا یتخذ طریقا ولا یشهر فیه سلاح ولا یقبض فیه بقوس ولا ینشر فیه نبل ولا یسر فیه بلحم فی ولا یضرب فیه حدود ولا یقص فیه من احد ولا یتخذ سوقا (ابن ماجہ باب ما یکرہ فی المساجد) چند باتیں ایسی ہیں جن کو مسجدوں میں کرنے کی اجازت نہیں۔ اس کو نہ راستہ بنایا جائے نہ ان میں ہتھیار تیز کیے جاتے ہیں نہ کمان پکڑی جائے۔ نہ تیر پھیلائے جائیں نہ کچا گوشت لے کر گزرا جائے۔ نہ حد ماری جائے نہ قصاص لیا جائے اور نہ اسے بازار بنایا جائے۔ ایک حدیث میں ہے۔ جَنِّبُوْا مَسَاجِدَكُمْ صِبْيَانَكُمْ وَمَجَانِيْنَكُمْ وَشِرَاءَكُمْ وَبَيْعَكُمْ وَخُصُوْمَاتِكُمْ وَرَفْعَ اَصْوَاتِكُمْ وَاِقَامَةَ حُدُوْدِكُمْ وَسَلِّ سُيُوْفِكُمْ (ابن ماجہ باب مايكره فی المساجد) اپنی مسجدوں کو الگ رکھو اپنے بچوں سے اپنے پاگلوں سے خرید وفروخت سے جھگڑوں سے شور وغل سے اقامت حدود سے اور تلوار کے سونتنے سے۔ مذکورہ احادیث میں حدود کے اجرا اور قصاص لینے سے بھی روکا گیا ہے۔

مسجد کی صفائی: صفائی اور نفاست کا غیر شعوری طور پر باطن پر اثر پڑتا ہے اگر کسی انسان نے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔ ماحول پاک ہو تو اس کا دل مسرت اور انبساط سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اگر ماحول گندہ ہو تو دل میں انقباض پیدا ہوتا ہے۔ اس طبعی خصلت کی وجہ سے اسلام نے مساجد کو ہر گند سے پاک صاف رکھنے کا حکم دیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (البقرہ۲:۱۲۵) اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو حکم دیا کہ میرے گھر کو پاک کر دو طواف کرنے والوں کے لیے اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَلْبُزَاقُ فِى الْمَسْجِدِ خَطِيْئَةٌ وَكَفَّارَتُهَا دَفْنُهَا (بخاری ۸:۳۷) مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ اس کو دفن کرنا ہے۔

فرمایا: وَجَدْتُ فِى مَسَاوِى اَعْمَالِهَا النُّخَاعَةَ تَكُوْنُ فِى الْمَسْجِدِ لَا تُدْفَنُ (فتح الباری ج ۱ صفحہ ۳۴۵) میں نے اپنی امت کے برے اعمال میں سے مسجد میں تھوکنا پایا جس کو دفن نہ کیا گیا ہو۔

عُرِضَتْ عَلَىَّ اُجُوْرُ اُمَّتِى حَتّٰى الْقَذَاةُ يُخْرِجُهَا الرَّجُلُ مِنَ الْمَسْجِدِ (مشکوۃ' ترمذی' ابو داؤد) مجھ پر میری امت کے اجر پیش کیے گئے یہاں تک کہ وہ کوڑا بھی جو کسی نے مسجد سے باہر پھینکا ہو۔

حضرت سائب فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے قوم کی امامت کی۔ اتفاق سے اس نے قبلہ کی جانب تھوک دیا جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود دیکھ لیا آپ کو یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی آپ نے سختی سے فرمایا کہ اس کو اب امامت نہ کرنے دینا چنانچہ اس کو لوگوں نے دوبارہ امامت نہ کرنے دی۔ اس کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جو کچھ سنا تھا بیان کیا۔ آپ نے اس کی باتیں سن کر فرمایا ہاں یہ درست ہے کہ میں نے روکا ہے اس لیے کہ تم نے مسجد میں تھوک کر اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دی۔ (مشکوۃ باب المساجد)

تزئین سے ممانعت: اسلام سادگی کو پسند کرتا ہے کیونکہ سادگی قوت عمل اور قوت کارکردگی کو بڑھاتی ہے قوم کی اقتصادی حالت کو بہتر بناتی ہے جب کوئی قوم بناؤ سنگھار اور فیشن کی دلدل میں پھنستی ہے تو وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ تزئین اور بناؤ سنگھار سے انسان کی قوت عملیہ ختم ہو جاتی ہے۔ بیکار رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اخراجات فضول خرچی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

عہد نبوی میں جو مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ وہ سادگی کا بہترین نمونہ تھیں۔ دور فاروقی تک سادگی رہی آپ نے رنگ سازی اور فضول تزئین سے سختی سے روکا۔ بخاری میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مسجد بنانے کا حکم دیا لیکن ساتھ ہی یہ فرمایا کہ میں لوگوں کو بارش سے بچانا چاہتا ہوں خبردار مسجد سرخ اور زرد نہ بنائی جائے جس سے لوگ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں۔

دور عثمانؓ میں مساجد کی عمارات پختہ کر دی گئیں لیکن بیل بوٹے اور رنگ سازی نہ تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح طور پر تزئین مسجد سے روکا ہے۔ مَاۤ اُمِرْتُ بِتَشْيِيْدِ الْمَسَاجِدِ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَتُزَخْرِفُنَّهَا كَمَا زَخْرَفَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى (ابو داؤد باب بناء المسجد) مساجد کو چونا گچ بنانے کا حکم نہیں ہے۔ جیسا کہ یہود اور نصاریٰ (اپنی عبادت گاہوں کی) تزئین کرتے تھے۔ ابن عباس نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ تم مسجدوں کو یہود اور نصاریٰ کی طرح زینت دو گے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیجا تزئین مسجد کو مسلمانوں کی تباہی کی علامت قرار دیا ہے۔

فرمایا: لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَتَبَاهَى النَّاسُ فِى الْمَسَاجِدِ (ابو داؤد باب بناء المسجد) مسلمانوں کی تباہی کی گھڑی اس وقت آئے گی جب لوگ مسجدوں کے بنانے میں تفاخر کرنے لگیں گے۔

فرمایا: مَاسَاءَ عَمَلَ قَوْمٍ قَطُّ اِلَّا زَخْرَفُوْا مَسَاجِدَهُمْ. (ابن ماجہ باب تشييد المساجد) جب کسی قوم کے حال بگڑتے ہیں تو وہ اپنی مسجدوں کو مزین کرتی ہے۔

لڑنے جھگڑنے کی ممانعت: مسجد امن اور اخوت کی جگہ ہے یہاں لڑائی جھگڑا کرنا ممنوع ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ (البقرہ۲:۱۹۱) اور ان کے ساتھ مسجد حرام کے پاس لڑائی نہ کرو جب تک وہ لوگ وہاں تم سے نہ لڑیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (آل عمران۳:۹۷) جو وہاں (مسجد) داخل امن والا ہو گیا۔

مسجد کو آباد کرنا: اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ (التوبہ۹:۱۸) اللہ کی مسجدیں صرف وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور نماز کو قائم کیا اور زکوۃ دی اور اللہ کے سوائے کسی کا خوف نہ کیا۔ سو امید ہے کہ یہ ہدایت پانے والوں میں سے ہوں۔

مسجد کو آباد کرنے سے مراد وہاں عبادت الٰہی کرنا ہے۔

مسجد کے معاشرتی اثرات

مسجد مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتی ہے مسجد کے اہم اثرات حسب ذیل ہیں۔

اخوت و مساوات: اخوت اور مساوات اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے لیے ایک لازمی عنصر ہے۔ اسلام نے اسی وجہ سے اس عنصر کو بہت اہمیت دی ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّ نِسَآءً (النساء۴:۱) اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ تمام روئے زمین کے بسنے والے ایک ہی اصل کی مختلف شاخیں ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً (البقرہ۲:۲۱۳) سب لوگ ایک ہی جماعت تھے۔

وَمَا کَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَاخْتَلَفُوْا (یونس۱۰:۱۹) اور سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (الحجرات ۴۹:۱۰) مومن بھائی بھائی ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا (بخاری) اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جاؤ۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَرَبُّ کُلِّ شَیْءٍ اِنِّی اَشْھَدُ اَنَّ الْعِبَادَ کُلَّھُمْ اِخْوَۃٌ (احمد' ابوداؤد) اے ہمارے اور ہر چیز کی پرورش کرنے والے میں گواہی دیتا ہوں کہ انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ حجتہ الوداع کے موقعہ پر مشہور خطبہ میں فرمایا۔

> ''لوگو! جان لو کہ تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔'' (مسند احمد)

اس اعلان نے حسب ونسب' رنگ ونسل' آقا وغلام' امیر وغریب' ادنیٰ واعلیٰ کے سارے امتیازات اور تفریقات ختم کر کے انسانیت کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا ہے۔ یہ ہے وہ اسلامی اخوت و مساوات کی پاکیزہ تعلیم۔ اس تعلیم کا عملی سبق مسجد میں پانچ دفعہ دہرایا جاتا ہے۔ جب موذن کی اذان پر سب لوگ مسجد میں جمع ہو جاتے ہیں اور ایک امام کے پیچھے بلاتفریق وامتیاز ایک صف میں کھڑے ہو کر رب العالمین کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار کرتے ہیں۔

مسز سروجنی نائیڈو رقمطراز ہے۔

> ''اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس نے جمہوریت کا درس دیا اور اس پر عمل بھی کیا جب مینارہ مسجد سے اذان گونجتی ہے اور پرستاران حق مسجد میں جمع ہوتے ہیں۔ تو دن میں پانچ بار جمہوریت اسلام اپنی عملی صورت میں جلوہ آرا نظر آتی ہے شاہ اور دہقان دوش بدوش سربسجود ہوتے اور پکار پکار کر اللہ اکبر کہتے ہیں میں اسلام کی اس ناقابل تقسیم وحدت و یگانگت سے بارہا متاثر ہوئی وہ وحدت جو واقعی انسان کو بھائی بھائی بنا دیتی ہے۔ لندن میں دیکھو وہاں مصری بھی ہیں حبشی بھی ہندی بھی ہیں اور ترک بھی لیکن کسی کا وطن مصر ہوا تو کیا ہند ہوا تو کیا وہ سب ایک دوسرے کو اپنا بھائی تصور کرتے ہیں۔'' (اسلام اور پیغمبر اسلام غیروں کی نظر میں مولفہ خلیفہ عبدالرحمٰن صفحہ ۲۰'۲۱)

باہمی تعاون: ہمارا یہ مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ معاشرہ باہمی تعاون کے بغیر فروغ حاصل نہیں کر سکتا۔ ابتدائے زمانہ سے لے کر آج تک تمام مفکرین نے معاشرہ کی بہبود کے لیے باہمی تعاون کو بہت اہمیت دی ہے۔

افلاطون کا بھی یہ نظریہ ہے کہ انسان اپنے معاشرے سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا انسانوں کے لیے یہ ضروری ہے وہ ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ ابن خلدون نے بھی لکھا ہے کہ تجربہ انسان کو اس امر پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے تحفظ اور مدافعت کے لیے دوسروں سے مل جل کر رہے۔ (ابن خلدون المقدمہ جلد دوم صفحہ ۳۷۱)

برٹرینڈ رسل کہتا ہے کہ نسلی تسلسل کے لیے مرد اور عورت کی مصاحبت ناگزیر ہے اور انسانی خاندان باہمی تعاون اور اختلاف کی تحریکات کے ذریعہ ہی جو یکساں قدیم ہیں نشو ونما پا کر قبائل اور اقوام کی صورت اختیار کرتا ہے۔ (Human Society in Ethics and Politics نیویارک ۱۹۵۵ صفحہ ۱۸۴)

قرآن مجید میں آتا ہے وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ ۵:۲) اور نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

ہجرت کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے تو سب سے پہلے اسلامی معاشرہ کو مستحکم اور مربوط بنانے کے لیے صحابہ میں مواخات قائم کی تاکہ مسلمان اشتراک اور تعاون کے مضبوط رشتے میں منسلک ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا۔ ''مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ نہایت خوش اسلوبی سے

ایک دوسرے کی اعانت کریں تا کہ یہ نہ ہو کہ ان میں سے کوئی فدیہ یا قصاص ادا کرنے کی سکت نہ رکھنے کے باعث خود کو بے یار و مددگار پائے خدا ترس مسلمان ہر اس شخص کے خلاف ہوں گے جو سرکشی کا راستہ اختیار کرے گا یا مسلمانوں کے مابین بے انصافی گناہ دشمنی یا بدعنوانی پھیلانے کے درپے ہوگا ہر شخص کا ہاتھ اس کے خلاف اٹھے گا خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو...... کوئی مومن کسی مومن کے خلاف کسی کافر کی حمایت نہیں کرے گا۔ غیر مسلموں کو چھوڑ کر مسلمان ایک دوسرے کے دوست ہیں...... مسلمانوں کا امن مکمل اور مشترک ہوگا مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ خدا کی راہ میں ایک دوسرے کے بہے ہوئے خون کا بدلہ لیں۔ (ابن ہشام سیرت النبی قاہرہ جلد۲ صفحہ۲۰ تا ۲۱)

مسجد مسلمانوں کو باہمی تعاون اور اشتراک عمل کا سبق دیتی ہے۔ مسجد میں ہر روز آنے والے نمازی ایک دوسرے کے واقف کار اور شناسا ہو جاتے ہیں انھیں ایک دوسرے کی ضروریات اور احتیاجات کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اپیل کی جاتی ہے اور باہمی تعاون سے ایک دوسرے کی ضروریات کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ باجماعت نماز پڑھنے کی ایک بڑی غرض یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کا باہمی ربط بڑھے اور باہمی تعاون سے ایک دوسرے کی ضروریات کو پورا کیا جا سکے۔

اتحاد: فرد اور معاشرہ کا رشتہ ایسے ہی ہے جیسے ایک عمارت کا اینٹوں کے ساتھ جب اینٹیں قاعدہ اور ترتیب سے نقشہ کے مطابق رکھ دی جاتی ہیں تو عمارت بن جاتی ہے۔ ہر ایک اینٹ دوسری اینٹ کے لیے سہارے کا موجب بنتی ہے یہی حال معاشرہ کا ہے اگر معاشرہ کے افراد اتحاد کی سلک میں منسلک ہیں تو معاشرہ کی اساس مستحکم اور غیر متزلزل ہے اس لیے اسلام نے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے اور تفرقہ سے بچنے کے لیے بار بار حکم دیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران ۳:۱۰۳) اور سب کے سب اللہ کی رسی کو پکڑے رکھو اور تفرقہ نہ کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَإِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةِ (ترمذی) جماعت کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ رہو اور تفرقہ سے بچو۔

مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِيْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهٖ. جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی الگ ہوا تو اس نے اسلام کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا۔

مَنْ خَرَجَ مِنَ الطَّاعَةِ وَفَارَقَ الْجَمَاعَةَ فَمَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً. (مسلم جلد۲ صفحہ۱۲۷) جو کوئی امام کی اطاعت سے کنارہ کش ہوا اور جماعت سے علیحدگی اختیار کی اور اسی حالت میں مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

اس تعلیم کی عملی درسگاہ مسجد ہے جب نمازی مقررہ وقت پر فرض نمازوں کی ادائیگی کے لیے ایک امام کے پیچھے قبلہ رو ہو کر باجماعت نماز ادا کرتے ہیں تو وہ گویا عملی صورت میں اتحاد کا اعلان کر رہے ہوتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتحاد کی اس عملی صورت کے اظہار کے وقت صفوں کی ناہمواری کو برداشت نہیں کیا۔ کیوں کہ صفوں کی ناہمواری تشتت اور افتراق پر دلالت کرتی ہے۔

فرمایا: عِبَادَ اللّٰهِ لَتُسَوُّنَّ صُفُوْفَكُمْ اَوْ لَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ بَيْنَ وُجُوْهِكُمْ (مسلم ج ۱ صفحہ۱۸۲) اے اللہ کے بندو! یا تم اپنی صفوں کو سیدھا ہموار رکھو پھر اللہ تمھارے اندر مخالفت ڈال دے گا۔

اِسْتَوُوْا وَلَا تَخْتَلِفُوْا فَتَخْتَلِفَ قُلُوْبُكُمْ (مسلم ج ۱ صفحہ۱۸۱) برابر کھڑے ہو جاؤ۔ اختلاف نہ ہو اس کا اثر تمھارے دلوں پر پڑے گا۔

اخلاق کی درستی: مسجد اخلاق کو درست کرنے کے لیے بہترین مکتب ہے۔ انسان اس وقت گناہوں کی آلودگیوں سے بچتا ہے جب اس کے دل میں اللہ کی معرفت ہوتی ہے۔ جتنی معرفت زیادہ ہوگی اتنا ہی انسان برائیوں سے دور رہے گا۔ اللہ کی معرفت نماز سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نماز کو برائیوں سے بچنے کی کنجی قرار دیا ہے فرمایا: اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (العنکبوت ۲۹:۴۵) نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔

فرض شناسی: مسجد انسان کو فرض شناسی کا سبق دیتی ہے فرض شناسی سے ہی قوت عملیہ ترقی کرتی ہے جب موذن مسجد منار پر کھڑا ہو کر اللہ اکبر کی صدا بلند کرتا ہے تو ہر مسلمان پر فرض عائد ہو جاتا ہے کہ تمام کاموں کو چھوڑ کر اللہ کے دربار میں حاضر ہو جائے حاضری کے لیے چند قیود بھی عائد کر دی ہیں کہ پہلے منہ ہاتھ پاؤں دھوئے جس کو اسلامی اصطلاح میں وضو کہتے ہیں۔ پھر پاک کپڑے پہن کر مسجد میں حاضر ہو جائے اور امام کی اقتدا میں نماز ادا کرے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جس طرح سپاہیوں میں فرض شناسی پیدا کرنے کے لیے دن رات میں کئی دفعہ بگل بجا کر مقررہ جگہ پر اکٹھا کیا جاتا ہے ان سے پریڈ کرائی جاتی ہے۔ یہ صرف فرض شناسی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے ایک سطح بین شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اجتماعی پریڈ کا جنگ سے کیا تعلق لیکن تجربہ اور مشاہدہ نے یہ بات یقین تک پہنچا دی ہے کہ سپاہیوں کی اجتماعی پریڈ لڑائی کی تیاری کے لیے نہایت ضروری ہے کیونکہ اس سے اطاعت اور فرض شناسی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

اطاعت امیر: اطاعت امیر کے تصور کے بغیر معاشرہ کا تصور ہی ادھورا ہے۔ معاشرہ کے استحکام کے لیے اطاعت امیر نہایت ضروری ہے۔ ایک امام کے پیچھے نماز پڑھنا اطاعت امیر کے سبق کو دہراتا ہے اسلام نے اطاعت امیر پر بہت زور دیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ (نساء ۴:۵۹) اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے صاحب امر کی اطاعت کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاِنِ اسْتُعْمِلَ حَبَشِیٌّ كَاَنَّ رَاْسَهٗ زَبِیْبَةٌ. (بخاری ۱۰:۵۴) سنو اور اطاعت کرو اگر تم پر ایک حبشی غلام امیر بنایا جائے جس کا سر کشمش کے دانہ کی طرح ہو۔

صحت: معاشرہ کی ترقی اور بہبود کے لیے افراد کا صحتمند ہونا بہت ضروری ہے۔ صحت صرف ملک کی اقتصادی حالت کو درست کرنے اور دفاع کے لیے ہی ضروری نہیں بلکہ روحانی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے یہی وجہ ہے نماز کی ادائیگی سے پہلے جسم اعضاء اور جگہ کی پاکیزگی ضروری ہے۔ نماز سے پہلے وضو ضروری قرار دیا گیا جس سے ہاتھ پاؤں منہ ناک کی صفائی ہو جاتی ہے۔ یہی اعضاء کھلے رہتے ہیں۔

مرکز سے وابستگی: جس معاشرہ کا ایک مرکز نہ ہو وہ معاشرہ کبھی بھی ترقی نہیں کرسکتا یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں تمام حکومتوں کا اپنا اپنا ایک مرکز رہا ہے۔ اگر کسی صوبے نے مرکز سے علیحدگی اختیار کرنا چاہی تو فوراً مرکزی حکومت نے اس کو باغی سمجھ کر اس پر چڑھائی کر دی۔ مرکز اور دوسرے صوبوں کی مثال ایک جسم کی طرح ہے۔ صوبے اعضاء ہیں اور دل مرکز۔ تمام اعضاء دل سے ہی تازہ خون لیتے ہیں۔ ان میں زندگی کے آثار باقی رہتے ہیں۔ مسجد اسلامی معاشرہ کو ایک مرکز سے وابستہ رہنے کی تعلیم دیتی ہے۔

وقت کی پابندی: مسجد میں پانچ وقت کی حاضری انسان کو وقت کی پابندی کا عادی بنا دیتی ہے ایک ہی آدمی کی ذات کو فائدہ نہیں دیتی بلکہ تمام معاشرے پر اس کے اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے تنزل اور پستی کا ایک بڑا سبب عدم پابندی وقت ہے۔ کھانے میں سونے میں کام کرنے میں آرام کرنے میں پابندی وقت کا خیال نہیں رکھتے۔ جس وجہ سے مسلمانوں کی زندگی میں ضبط اور نظم نہیں ہے۔ مسجد مسلمانوں کو وقت کی پابندی کا سبق دیتی ہے جس سے اسلامی معاشرہ ایک نظم اور ضبط کی لڑی میں منسلک ہو جاتا ہے۔

مسجد کا رُخ: قرآن مجید کی رو سے کعبہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا سب سے پہلا گھر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ (آل عمران ۳:۹۶) پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا ہے وہی ہے جو مکہ میں ہے برکت دیا گیا اور سب قوموں کے لیے ہدایت ہے۔

کعبہ کی اس فضیلت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ ان کی عبادت گاہوں کا رخ کعبہ کی طرف ہونا چاہیے۔ اس بارے میں سب سے پہلا حکم یہ نازل ہوا: وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (البقرہ ۲:۱۲۵) اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لیے مرجع اور امن بنایا اور ابراہیمؑ کے مقام کو قبلہ نماز بناؤ۔

پھر یہ حکم نازل ہوا: وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (البقرہ ۲:۱۵۰) اور جہاں سے تو نکلے اپنے منہ کو مسجد حرام کی طرف پھیر دے اور جہاں کہیں تم ہو اپنے مونہوں کو اس طرف پھیر دو۔

تمام روئے زمین کے مسلمانوں کے لیے قبلہ مقرر کرنے میں ایک بڑی حکمت اتحاد بین المسلمین ہے اسی لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ لاتکفروا اهل القبلة (نہایہ) اہل قبلہ کو کافر مت کہو۔

مسجد اسلام کی نظر میں: چونکہ مسجد کا اثر مسلمان کی زندگی کے ہر شعبہ پر مرتب ہوتا ہے اور اسلامی ثقافت کا مظہر ہے اور یہ وہ جگہ ہے جہاں بندہ اپنی بندگی اور نیاز مندی کا اظہار کرتا ہے اس وجہ سے اسلام میں مسجد کی بہت قدر و منزلت ہے۔ اس خاص مقام کا بلند رتبہ تو اس وقت ہی ظاہر ہو جاتا ہے جب اللہ تعالیٰ اس کی نسبت اپنی جانب کرتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (الجن ۷۲:۱۸) اور کہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں سو اللہ کے ساتھ اور کسی کو نہ پکارو۔

اسلام میں مسجد کی اس قدر عظمت ہے جو شخص لوگوں کو مسجد سے روکتا ہے وہ اللہ کے ہاں مجرم اور معتوب قرار پاتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآئِفِیْنَ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (البقرہ ۲:۱۱۴) اور اس شخص سے بڑا کون ظالم ہے جو اللہ کی مسجدوں سے روکتا ہے کہ ان میں اس کے نام کا ذکر کیا

جائے اور ان کے ویران کرنے کی کوشش کرتا ہے ان کو مناسب نہ تھا کہ ان میں داخل ہوتے مگر ڈرتے ہوئے ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

قرآن مجید نے مسجد کی اہمیت اس رنگ میں بھی ظاہر کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مقدس گھروں کی حفاظت خود کرتا ہے جو قوم ان مقدس جگہوں کو برباد کرنے کا ارادہ کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو برباد کر دیتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّ مَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (الحج ۲۲:۴۰) اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ نہ ہٹاتا رہتا تو یقیناً راہبوں کوٹھڑیاں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے گرا دی جاتیں۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ جب مسجد حرام کو ابرہہ بادشاہ نے تباہ و برباد کرنے کے لیے حملہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ابرہہ اور اس کے تمام لشکر کو لقمہ اجل بنا دیا جس کا ذکر سورہ فیل میں آتا ہے۔

احادیث نبوی میں کثرت سے فضائل مسجد بیان ہوئے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے یہاں شہروں میں محبوب ترین مسجدیں ہیں اور مبغوض ترین بازار۔ (مسلم باب فضل المساجد ج ۱ صفحہ ۲۳۶)

جو شخص صبح و شام مسجد میں حاضر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں مہمانی کا کھانا تیار کرتا ہے جو جنت میں صبح و شام پیش کی جائے گی۔ (مشکوٰۃ باب المساجد: مواضع الصلوٰۃ عن البخاری و مسلم)

فرمایا: بَشِّرِ الْمَشَّائِيْنَ فِي الظُّلَمِ اِلَى الْمَسَاجِدِ بِالنُّوْرِ التَّامِّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (مشکوٰۃ باب المساجد) تاریکی میں مسجد جانے والوں کو نور کامل کی خوشخبری دو جو قیامت کے دن حاصل ہوگی۔

اَلْمَسَاجِدُ بُيُوْتُ اللّٰهِ وَقَدْ ضَمِنَ اللّٰهُ لِمَنْ كَانَتِ الْمَسَاجِدُ بَيْتَهٗ بِالرُّوْحِ وَالرَّاحَةِ وَالْجَوَازِ عَلَى الصِّرَاطِ اِلَى الْجَنَّةِ (کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۱۲۴) مسجدیں اللہ کا گھر ہیں اور یہ جس کا گھر ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مہربانی آرام اور پل صراط سے گزار کر جنت میں پہنچانے کی ضمانت لی ہے۔

فرمایا: مَنْ بَنٰى لِلّٰهِ مَسْجِدًا بَنَى اللّٰهُ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ (بخاری ۸:۶۵) جو شخص اللہ کی رضا کے حصول کے لیے مسجد بنائے گا اللہ تعالیٰ اس کی مانند جنت میں اس کا گھر بنائے گا۔

مسجد کی عظمت شان یہ بھی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کبھی سفر سے واپس لوٹتے تو پہلے مسجد جاتے دو رکعت نماز ادا کرتے وہاں لوگوں سے مل کر گھر تشریف لے جاتے تھے۔ (مسلم)

آپ نے فرمایا۔ اَلْمَسَاجِدُ بُيُوْتُ اللّٰهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ زُوَّارُ اللّٰهِ وَحَقٌّ عَلَى الْمَزُوْرِ اَنْ يُّكْرِمَ زَائِرَهٗ (کنز العمال ج ۴ ص ۱۲۴) مسجدیں اللہ کا گھر ہیں اور ان میں حاضر ہونے والے اہل ایمان اللہ تعالیٰ کے ملاقاتی ہیں اور جس کی ملاقات کو کوئی آئے اس پر حق ہے کہ وہ آنے والے ملاقاتی کی عزت کرے۔

فرمایا: مَنْ غَدَا اِلَى الْمَسْجِدِ اَوْرَاحَ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهٗ نُزُلَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ كُلَّمَا غَدَا اَوْ رَاحَ (رواہ البخاری و مسلم) جو بندہ جس وقت بھی صبح کو یا شام کو اپنے گھر سے نکل کر مسجد کی طرف جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے واسطے جنت کی مہمانی کا سامان کراتا ہے۔ وہ جتنی دفعہ بھی صبح یا شام کو جائے۔

مسجد کا انتظام: مسجد کے شعبہ انتظام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اوّل ظاہری دیکھ بھال، دوم امامت۔

ظاہری دیکھ بھال سے مراد مسجد کی صفائی اور مرمت ہے خانہ خدا کی شانِ فضیلت کے پیش نظر صفائی اور مرمت بہت ہی ضروری ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَعَهِدْنَا اِلٰى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (البقرہ ۲:۱۲۵) اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو حکم دیا کہ میرے گھر کو پاک کر دو طواف کرنے والوں کے لیے اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں سجدہ کرنے والوں کے لیے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد کی صفائی پر بہت زور دیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں مسجد کی صفائی کے لیے ایک جاروب کش تھا۔ اس کا انتقال ہو گیا جس کی اطلاع رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ دی گئی۔ دوسرے دن جب اس کی وفات کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا مجھے خبر کیوں نہیں دی پھر فرمایا اس کی قبر کہاں ہے۔ چنانچہ اس کی قبر پر گئے اور دعائے مغفرت کی۔

صفائی کا معاوضہ: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد کی صفائی کے اجر عظیم کے متعلق فرمایا۔ مَنْ اَخْرَجَ اَذًى مِنَ الْمَسْجِدِ بَنَى اللّٰهُ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ (ابن ماجہ باب تطہیر المساجد) یعنی جو شخص مسجد سے گندگی نکالے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔

مسجد کی صفائی اور مرمت کے لیے ایک مستقل فنڈ ہونا چاہیے تاکہ جو مسجد کی صفائی کے لیے خادم رکھا جائے اس کو گزارہ دیا جا سکے۔ فنڈ کی دو صورتیں ہیں یا تو حکومت اپنے خزانہ سے رقم دے۔ یا مسجد کے اوقاف ہوں۔ جن کی آمدنی سے تمام اخراجات پورے کیے جاسکیں۔ ابتدائی عہد اسلام سے شاہی مسجدوں کی دیکھ بھال حکومتوں کے سپرد رہی ہے۔ اب بھی اسلامی ممالک میں جو شاہی مساجد ہیں ان کی دیکھ بھال حکومتوں کے سپرد ہے۔

جن مساجد کے اوقاف ہوں ان کی آمدن کا حساب کتاب رکھنے کے لیے دیانتدار آدمیوں کا ایک بورڈ ہونا چاہیے فتح القدیر میں لکھا ہے متولی کے لیے جائز ہے کہ بوقت ضرورت مسجد کی صفائی اور روشنی کے لیے ملازم رکھے مگر مشاہرہ مناسب اور دستور کے مطابق مقرر کرے گا۔ (ج ۲ صفحہ ۸۸۰)

امامت: دوسرا اہم شعبہ امامت کا ہے۔ جماعت کے لیے امام کا ہونا ضروری ہے امام کے معنی ہیں وہ شخص جس کے نمونہ کی پیروی کی جائے اور قرآن نے امام کو بہت بلند مقام دیا ہے اس کے ساتھ ہی بتایا کہ امام وہی شخص ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر گامزن رہے اس لیے خدا کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والا امام نہیں ہوسکتا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کہا کہ میں تجھے امام بنانے والا ہوں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اور میری اولاد نے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ (البقرہ ۲:۱۲۴) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں اور بعد کے ایک طویل عرصہ میں امامت کے لیے بہترین آدمی مقرر کیے جاتے رہے تھے۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں ایک عنوان باندھا ہے۔ اَهْلُ الْعِلْمِ وَالْفَضْلِ اَحَقُّ بِالْاَمَامَةِ (بخاری کتاب الاذان) وہ جو صاحب علم اور صاحب فضل ہیں وہ امامت نماز کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ پھر فرمایا: يَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَأُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ. کہ قوم کی امامت وہ کرے جو ان میں سے کتاب اللہ کو سب سے زیادہ جاننے والا ہو۔

مدینہ کی مرکزی مسجد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود امامت کراتے تھے محلوں کی دوسری مساجد میں ان صحابہ کو امام مقرر کیا تھا جو اہل علم اور بہترین خوبیوں کے مالک تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیمار ہوئے تو آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو امام مقرر کیا۔ ابو داؤد نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ احادیث بیان کی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امامت اس شخص کا حق ہے جو سب سے زیادہ قرآن مجید جاننے والا ہو۔ خلفائے راشدین کے عہد میں خلفاء خود امامت کراتے تھے۔ باہر کے صوبوں میں جو گورنر مقرر کیے جاتے تھے۔ ان کو یہ ہدایت ہوتی تھی کہ وہ جامع مسجد میں امامت کرایا کریں ایک مدت تک روحانی قیادت اور دنیوی قیادت کے دونوں عہدے ایک ہی شخص میں جمع رہے۔

باب ۷

اسلام کا سیاسی نظام

مملکت

مملکت کیا ہے؟: وہ ارفع معاشرتی ادارہ جو انسان کے تمدنی امور کو قانون کی رو سے سرانجام دینے کے لیے وجود میں آتا ہے۔

انگریزی میں ریاست کے لیے لفظ اسٹیٹ (State) استعمال کرتے ہیں جو اسٹیٹس (Status) سے ماخوذ ہے۔ قدیم ماہرین سیاسیات نے مملکت کی تعریف مختلف الفاظ میں کی ہے۔ ارسطو کہتا ہے۔

''مملکت خاندان اور دیہاتوں کی اس تنظیم کا نام ہے جس کا مقصد مکمل اور آزاد زندگی کی سہولتیں بہم پہنچانا ہے۔''

بلنٹشلی (Bluntshli) یہ تعریف کرتا ہے:

''مملکت لوگوں کی وہ سیاسی منظم جماعت ہے جو کسی مقام پر رہتی ہو۔''

ڈاکٹر وڈرو ولسن (Woodrow Wilson) کے قول کے مطابق:

''ریاست سے مراد افراد کا کسی مخصوص علاقہ کے اندر قانون کی خاطر منظم ہونا ہے۔''

برجس کہتا ہے:

''مملکت انسانوں کی اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں سیاسی تنظیم موجود ہو۔''

ہالینڈ کہتا ہے:

''مملکت انسانوں کی اس وسیع جماعت کو کہتے ہیں جو عموماً ایک خاص حصہ پر آباد ہوں اور جن میں اکثریت کی رائے مخالف طبقہ کی رائے پر فوقیت رکھے۔''

گارنر نے زیادہ وضاحت کے ساتھ تعریف کی ہے۔

مملکت کم یا زیادہ افراد کی وہ سیاسی جماعت ہے جو دائمی طور پر کسی خاص خطہ زمین پر قابض اور تمام خارجی اثرات سے آزاد ہو۔ جس کی ایک منظم حکومت ہو اور جس کی لوگ اطاعت کرتے ہیں۔

گلکرائسٹ کہتا ہے:

''ریاست علم سیاست کی ایک تخیل اور اخلاقی حقیقت ہے جس کا وجود ایسی جگہ پایا جاتا ہے جہاں اشخاص کی ایک تعداد جو معین قطعہ ارض میں رہتی ہو۔ ایک ایسی حکومت کے تحت متحد ہو جو داخلی معاملات میں ان کے اقتدار اعلیٰ کے ظہور کا ذریعہ ہو اور خارجی معاملات میں دوسری حکومتوں سے آزاد ہو۔''

لاسکی کہتا ہے:

''ایک علاقائی معاشرہ جو حکومت اور رعایا میں بٹا ہوا ہو اور اپنے طبعی مخصوص رقبہ کے اندر تمام دوسرے اداروں پر برتری کا دعویٰ دار ہو۔''

اسلامی نقطہ نگاہ سے مملکت کی تعریف یہ ہے:

مملکت (State) وہ بلند ترین معاشرتی ادارہ جو انسانوں کے دینی اور دنیاوی معاملات کو قانون کی رو سے سرانجام دینے کے لیے وجود میں آتا ہے۔

مملکت کے کم از کم اجزائے ترکیبی حسب ذیل ہیں:

۱۔ آبادی　　　۲۔ علاقہ
۳۔ تنظیمی ڈھانچہ　　　۴۔ حکومت
۵۔ دستور　　　۶۔ اقتدار اعلیٰ

اسلام کا نظریہ ریاست

اسلامی حکومت کا نام

امامت، خلافت، امارت: اسلامی حکومت کے تین نام ہیں۔ امامت' خلافت' امارت۔ تینوں ناموں کی تشریح جید علماء کے الفاظ میں کی جاتی ہے۔

امامت کبریٰ: ''امامت ایک ایسی ریاست عامہ[1] (Leader ship of democratic Government) کا نام ہے جو پیغمبر اعظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قانونی نمائندگی سے حاکمانہ بالادستی حاصل کرتی ہے اور دین و دنیا کی اجتماعی سرگرمیوں میں اپنی عظمت و طاقت کا اس طرح اظہار کرتی ہے کہ اس میں اعلیٰ رہنمائی کے اوصاف نمایاں ہو جاتے ہیں۔''

گویا امامت کبریٰ اسلامی حکومت کا اعلیٰ ترین نام ہے۔

علامہ ابن خلدون رقمطراز ہیں:۔

''حکومت کا وہ منصب جو دین کی نگہبانی اور دنیا کے سیاسی فرائض کو پورا کرتا ہے۔ خلافت و امامت ہے۔ اس کو امامت کبریٰ اور خلافت عامہ کہا جاتا ہے۔''[2]

علامہ شیخ محمد امین ابن عابدین امامت کبریٰ کی شرح ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

''خدا کی پیدا کی ہوئی دنیا کے باشندوں پر وہ عام تصرف جو ایک ریاست عامہ کی تشکیل کا موجب ہوتا ہے اور جس کو پیغمبر کی نمائندگی کا فخر حاصل ہو۔''[3]

خلافت:۔ قرآن مجید میں تین قسم کی خلافت کا ذکر ہے۔

۱۔نوعی خلافت۔ ۲۔قومی خلافت۔ ۳۔شخصی خلافت۔

۱۔نوعی خلافت: یعنی تمام بنی آدم اللہ کے خلیفہ ہیں اور ہر ایک فرد دیگر مخلوقات پر حکومت کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے:۔ وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً.[4] اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک جانشین بنانے والا ہوں۔

اس آیت کریمہ میں تمام نوع انسان کو خلیفہ کہا ہے۔

۲۔قومی خلافت: جب ایک قوم کو حکومت اور بادشاہت سے نوازا جاتا ہے تو وہ اس قوم کی خلافت ہے۔ اللہ تعالیٰ عاد قوم کو مخاطب ہو کر فرماتا ہے:۔ وَاذْکُرُوْا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ.[1] اور یاد کرو جب اس نے تم کو نوحؑ کی قوم کے بعد بادشاہ بنایا۔ وَاذْکُرُوْا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّاَکُمْ فِی الْاَرْضِ (الاعراف ۷:۷۴) اور یاد کرو جب تم کو عاد کے بعد جانشین بنایا اور تمھیں زمین میں آباد کیا۔ یہاں بَوَّاَکُمْ فِی الْاَرْضِ فرما کر خلافت کی تفسیر کر دی یعنی زمین کا وارث ہونا۔ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ. (انعام:۱۶۶) یعنی وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ یعنی وارث بنایا۔

---

۱ المواقف والرصد الرابع فی الامامة جلد ۸ ص ۳۴۴ ماخوذ از اسلام کا نظام حکومت تالیف مولانا حامد الانصاری غازی۔

۲ مقدمہ کتاب العبر ابن خلدون (امامت وخلافت ص ۱۳۴۔

۳ رد المختار بر در المختار باب الامامة جلد ۱ ص ۵۱۱۔

۴ البقرہ ۲:۳۰۔

۳۔ شخصی خلافت: شخصی خلافت دو طرح کی ہے۔ خلافت خاصہ اور خلافت عامہ۔ خلافت خاصہ سے مراد وہ خلافت ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی انسان کو لوگوں کی ہدایت کے لیے مامور کرتا ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام خلافت خاصہ کے حامل تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ لَا تَتَّبِعُ الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔[۲] اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ (حاکم) بنایا ہے۔ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور خواہشات کی پیروی نہ کر۔ ورنہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بہکا دیں گے۔

خلافت عامہ جب کوئی مامور وفات پا جائے تو اس کے مشن کو چلانے کے لیے اس کا نائب خلافت عامہ کا حامل ہوگا۔

کسی مامور کے جانشین کو اللہ کا خلیفہ قرار دینا قرآن مجید سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ جب حضرت ابوبکرؓ کو بعض لوگوں نے خلیفہ اللہ کہنا شروع کیا تو آپ نے ایسا کہنے سے منع فرما دیا اور کہا: لَسْتُ خَلِیْفَةُ اللّٰہِ وَلٰکِنْ خَلِیْفَةَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم یعنی میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں۔ میں تو اللہ کے رسول کا خلیفہ ہوں۔

یہاں جس خلافت کا ذکر ہے یہ وہ نیابتی حکومت ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت کی حیثیت سے حاصل ہوتی ہے اور جو آپ کا نائب ہوگا اور خلافت کی تمام شرائط پر پورا اترتا ہو وہ خلیفہ الرسول کہلائے گا۔

اسلامی خلافت کی خصوصیات

۱۔ اسلامی خلافت کی پہلی خصوصیت جو اس کو دوسرے سیاسی نظاموں سے جدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ طرز حکومت دین اور دنیا دونوں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ دوسرے سیاسی نظام صرف دنیا کے امور سے تعلق رکھتے ہیں اور دین کے تصور کو اپنے نظام سے خارج کرتے ہیں۔

۲۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت اور ان کو ابنائے جنس پر نافذ کرنا جس نظام میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری نہ ہوگی وہ خلافت نہیں کہلائے گا۔

۳۔ خلافت اسلامی میں مقتدر اعلیٰ محض اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے علاوہ کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ[۳] یعنی اللہ کے سوا کسی کو اقتدار اعلیٰ حاصل نہیں۔

اَلَا لَہُ الْحُکْمُ۔[۴] سنو حکم اسی کا ہے۔

وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. آسمانوں اور زمین کی حکومت اللہ ہی کے لیے ہے۔

امارت: جب حکومت امور عامہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر افراد امت کو معروفات کا حکم دیتی ہے اور منکرات سے روکتی ہے۔ تو وہ امارت امت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ یہ لفظ امر سے مشتق ہے۔ امر کے معنی ہیں حکم۔ اور حکم حکومت کا فعل ہے ابو البقاء نے مختصر الفاظ میں امارت کی یہ تعریف کی ہے۔ ''امارت ولایت ہے۔''[۵]

یعنی امارت حکومت ہے۔

امارت میں اطاعت اور غلبہ دونوں باتیں شامل ہیں اور یہی حکومت کی اصل ہیں۔

اسلامی حکومت کے رئیس کے خطابات

I- امام اعظم:۔ یہ نام اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ امام حکومت اور اعضائے حکومت کا قائد ہے۔

II- خلیفہ:۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نائب ہونے کی وجہ سے خلیفہ کہلاتا ہے۔

III- امیر:۔ معروفات کا حکم دینے اور منکرات سے روکنے کی وجہ سے کہلاتا ہے۔

۱۔ الاعراف ۷:۶۹۔ ۲۔ ص ۳۸:۲۶۔
۳۔ یوسف ۱۲:۴۰۔ ۴۔ الانعام ۶:۶۲۔
۵۔ کلیات ابو البقاء حنفی لفظ امارت صفحہ ۱۴۳۔

خلیفہ یا امیر کی ضرورت: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلْوَالِیُ مِنَ الرَّعِیَّۃِ کَالرُّوْحِ مِنَ الْجَسَدِ۔[1] یعنی حاکم رعیت میں ایسے ہیں جیسے روح جسم میں۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَۃٍ وَلَا جُمَاعَۃَ اِلَّا بِاَمَارَۃٍ وَلَا اَمَارَۃَ اِلَّا بِطَاعَۃٍ. یعنی اسلام بغیر جماعت کے نہیں اور جماعت بغیر امیر کے نہیں۔ امیر بغیر اطاعت کے نہیں (یعنی اس کی اطاعت کی جائے)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

لَا یَحِلُّ لِثَلَاثَۃٍ یَکُوْنُ فِی الْفَلَاۃِ مِنَ الْاَرْضِ اِلَّا امَرُوْا عَلَیْھِمْ اَحَدَھُمْ (مسند احمد ومشکوٰۃ باب الامارۃ) تین آدمی اگر چٹیل میدان میں بھی موجود ہوں تو وہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنائیں۔

خلیفہ کا انتخاب: رئیس مملکت کا انتخاب عوام یا ارباب حل وعقد سے ہونا چاہیے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:۔ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ۔[2] یعنی مسلمانوں کا اجتماعی امور سلطنت باہم مشورہ سے طے پاتے ہیں۔

اسلام کے دور اول میں جب خلفاء راشدین کے انتخاب پر نظر دوڑائیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ ان خلفاء کا انتخاب براہ راست شوریٰ کے ذریعہ ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوئی۔ اس وقت وہاں انصار اور مہاجرین کے صاحب الرائے افراد موجود تھے۔ تبادلہ خیالات اور اسباب ترجیح پر تبصرہ بھی ہوا تھا۔ پھر مسجد میں عام بیعت ہوئی اور سب نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بعد حضرت عمرؓ کی خلافت کے لیے نام تجویز کیا۔ پہلے اہل حل وعقد سے مشورہ کیا۔ اس کے بعد مرضی عامہ حاصل کرنے کے لیے نام پیش کیا۔ اہل حل وعقد کی رائے اور مرضی عامہ معلوم کر لینے کے بعد حضرت عمرؓ کو اپنے بعد خلیفہ نامزد کیا۔ اس نامزدگی میں بھی اپنی مرضی شامل نہیں بلکہ عوام کی مرضی شامل ہے۔

حضرت عمرؓ نے اہل حل وعقد کی ایک مجلس شوریٰ مقرر کر دی اور خلافت کے لیے چند نام تجویز فرما دیے۔ مجلس شوریٰ کو یہ ہدایت کر دی کہ اصحاب الرائے سے مشورہ کر کے کسی ایک کا نام تجویز کر دیں۔ اس کے بعد عوام کی مرضی معلوم کر لی جائے رائے عامہ کے مطابق خلیفہ منتخب کر لیا جائے۔

حضرت علیؓ کی بیعت بھی جمہور کی رائے کے مطابق ہوئی۔

خلفاء راشدین کے انتخاب کے طریقے گو مختلف ہیں۔ لیکن عوام کی رائے کا دخل ہر طریقہ میں کارفرما ہے۔

اسلامی نظام حکومت میں ولی عہدی اور نامزدگی کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔ نہ ایک ہی خاندان میں خلافت کو محدود کر لینا۔ اسی موروثی خلافت کے خلاف حضرت امام حسینؓ نے جہاد کر کے شہادت کا رتبہ پایا۔

شرائط امارت یا خلافت

شرط اوّل: امیر مملکت مسلمان ہو کیونکہ شریعت اسلامیہ کے مطابق نظام حکومت چلانے کے لیے وہی شخص مستحق ہو سکتا ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان رکھتا ہو اور یہ ناممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منکر آپ کا خلیفہ بنے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔[3] اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اللہ کی تابعداری کرو اور رسول کی اپنے میں سے صاحب امر کی تابعداری کرو۔

اس آیت کریمہ میں منکم کا لفظ اس بات پر صریح النص ہے۔ مسلمانوں کا خلیفہ انہی میں سے ہوگا۔ وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا اللہ تعالیٰ کافروں کے لیے مسلمانوں پر فوقیت رکھنے کو ہرگز روا نہیں رکھے گا۔

تمام امت مسلمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر خلیفہ مرتد ہو جائے تو اس کا عزل اور اس سے قتال وجدال مسلمانوں پر واجب ہے۔ جو شخص ابتدا ہی سے کافر ہو وہ مسلمانوں کا خلیفہ کیسے بن سکتا ہے۔

شرط دوم: خلیفہ کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ وہ عاقل اور بالغ ہو اس لیے شرعاً مجنوں اور نابالغ کے کسی تصرف پر اعتبار نہیں ہو سکتا۔

---

1. کنوز الحقائق حدیث ۱۰۲۔ 2. الشوریٰ ۴۲:۳۸۔

شرط سوم: جسمانی نقص نہ ہو۔

خلیفہ جسمانی نقص نہ رکھتا ہو۔ جس کی وجہ سے وہ فرائض منصبی اچھی طرح سرانجام نہ دے سکے۔ اگر وہ دوران خلافت کسی جسمانی نقص میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مثلاً پاگل ہو جائے۔ مفلوج ہو جائے۔ اندھا ہو جائے وغیرہ۔ تو پھر بھی اس کو مسند خلافت سے معزول کر دیا جائے گا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ.[2] یقیناً اللہ نے تمھارے مقابلہ میں اس کو چن لیا ہے اور اسے علم اور جسم میں کشادگی دی ہے۔

یہ آیت اس بات پر اشارۃ النص ہے۔ خلیفہ کے لیے حواس اور اعضاء کی سلامتی ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نقص سے ایک تو کارکردگی پر اثر پڑتا ہے۔ دوم دوسروں کے دل میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

شرط چہارم:۔ کفایت: کفایت سے مراد سیاست حاضرہ اور زمانہ کے جدید تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ.[3] یعنی ہم نے داؤد علیہ السلام کو حکمت اور فیصلہ کن بات کرنے کی صلاحیت دی۔

سورۃ بقرہ آیت ۲۴۷ سے جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔ یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ خلیفہ کے اندر معاملہ فہمی ژرف نگاہی اور مسائل کے حل کرنے کا ملکہ ہونا چاہیے۔

شرط پنجم: علوم دینیہ کا ماہر۔

خلیفہ کے لیے علوم دینیہ کا ماہر ہونا ضروری ہے تاکہ کلیات شرعیہ کی روشنی میں پیش آمدہ مسائل کو حل کر سکے اور لاعلمی کی بناء پر حدود شروع سے تجاوز نہ کرے۔

شرط ششم: تقویٰ، عدل اور امانت۔

امیر متقی عادل اور امین ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ.[4] اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم اور محترم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ.[5] بے شک اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتیں اس کے اہل کے سپرد کرو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔

مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ "امانات" سے مراد حکومت کی باگ ڈور ہے۔

قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ.[6] حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کیجئے۔ میں حفاظت کرنے والا اور باخبر ہوں۔

شرط ہفتم: شجاعت۔ خلیفہ کا شجاع ہونا ایک ناگزیر شرط ہے تاکہ دشمن کے حملے کے وقت جہاد کا جوش پیدا کر سکے۔

خلیفہ کے اختیارات

اختیارات معروف کاموں میں اطاعت: خلیفہ ہر محکمہ کا حاکم اعلیٰ ہے۔ اس وجہ سے ہر فرد پر معروف کاموں میں اس کی اطاعت واجب ہے۔

قواعد وضوابط بنانے کا اختیار: قوانین شرعیہ کی تنفید کے لیے قواعد وضوابط بنانے کا اختیار ہے۔

حکام کے نصب وعزل کا اختیار: حکومت کے حکام کے نصب وعزل کا اس کو اختیار حاصل ہے۔

احتساب ومواخذہ کا اختیار: خلیفہ سلطنت کے ہر فرد سے اس کی کسی قانون شکنی پر مواخذہ کر سکتا ہے اور اسے سزا دے سکتا ہے۔

---

1 النساء۴:۵۹۔ 2 بقرہ۲:۲۴۷۔ 3 ص ۳۸:۲۰۔ 4 الحجرات ۴۹:۱۳۔
5 النساء۴:۵۸۔ 6 یوسف۱۲:۵۵۔

جنگ و صلح کا اختیار: خلیفہ کو ملکی حالات کے مطابق جنگ اور صلح دونوں کا اختیار حاصل ہے۔

حکام کی کاروائیوں کی تفتیش کا اختیار: خلیفہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ہر حاکم کی غیر اسلامی کاروائی کی تفتیش کرے اور ان کو سزا دے۔

خلیفہ کی انتظامی مجلس شوریٰ: خلیفہ کے لیے ملکی امور چلانے کے لیے ایک ایسی مجلس ہوگی۔ جس کے ارکان کا انتخاب خلیفہ خود کر سکتا ہے تا کہ وہ تنفیذی اختیارات کے استعمال کے سلسلہ میں مشورہ دے۔ مجلس کی رکنیت کے لیے مندرجہ ذیل شرائط ہیں۔

۱۔ مسلمان ہونا۔ (غیر مسلم صاحب رائے سے بھی مشورہ لیا جا سکتا ہے) ۲۔ عالم دین ہونا۔ ۳۔ عادل ہونا۔ ۴۔ مشورہ دینے کا اہل ہونا۔ ۵۔ ملکی حالات سے باخبر ہونا۔

اختیارات تشریعی: خلیفہ کو اصحاب الرائے کے مشورہ کے ساتھ ضمنی قوانین وضع کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے:۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ[1] تو ان سے کاموں میں مشورہ لے۔

امیر کا حق تنسیخ: ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مجلس تشریعی کے متفقہ یا کثرت رائے سے پاس شدہ مسودہ قانون کو خلیفہ مسترد کر سکتا ہے یا کہ نہیں۔

اگر مجلس تشریعی ایک قانون متفقہ یا کثرت رائے سے پاس کر لیتی ہے۔ جو کسی نص صریح کے خلاف ہو۔ تو خلیفہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس قانون کو مسترد کر دے۔ مثلاً۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اکثر جید صحابہ نے حضرت ابوبکرؓ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ مانعین زکوٰۃ کے خلاف سردست جہاد نہ کریں۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اس مشورہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

لیکن کسی نص صریح کے خلاف فیصلہ نہ ہو تو خلیفہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کثرت رائے سے پاس شدہ قانون کو مسترد کر دے۔ اگر امیر ایسا لیگل فریم ورک (ضابطہ قوانین) جاری کر دے جو آئین کے صریحاً خلاف ہو تو مجلس شوریٰ اس ضابطہ کو رد کر سکتی ہے اس کے ساتھ حاکم کا محاسبہ بھی کر سکتی ہے کیونکہ اسلام آئین شکنی کی اجازت نہیں دیتا۔

عادلانہ اختیارات: عدالتوں کے لیے ضوابط مقرر کرنے کا اختیار خلیفہ کو ہے۔ لیکن خلیفہ کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ عدالت کی آزادی میں دخل اندازی کرے۔ خلیفہ نہ عدالت کو کسی فیصلہ کا حکم دے سکتا ہے اور نہ کسی فیصلہ سے روک سکتا ہے۔ اگر کوئی حاکم عدالت کے فیصلہ میں دخل اندازی کرتا ہے یا اس کو اپنی مرضی کا فیصلہ لکھنے پر مجبور کرتا ہے تو منصف کا یہ فرض ہے کہ وہ مجلس شوریٰ کو مطلع کر دے اور مجلس شوریٰ اس کا محاسبہ کرے یا منصف احتجاجاً مسند انصاف سے الگ ہو جائے۔ اسی میں کسی ملک کی ترقی اور استحکام کا راز مضمر ہے۔

امیر مملکت کے اختیارات پر پابندیاں

اسلام خلیفہ کو کلی طور پر اختیارات نہیں دیتا کہ وہ جس طرح چاہے کرے بلکہ اس پر کچھ پابندیاں بھی عائد کرتا ہے۔

امیر کو یہ اختیار نہیں کہ شریعت کے کسی حکم کو بدل ڈالے اور نہ اس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ مفاد عامہ کے خلاف کوئی قانون نافذ کر دے۔ خلیفہ عوام کے سامنے اپنے فعل کا جواب دہ ہے۔ عوام اس سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس نے یہ کام کیوں کیا۔ یہ حکم کیوں دیا۔

خلیفہ کی معزولی: خلیفہ کو حسب ذیل صورتوں میں منصب خلافت سے الگ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ خلیفہ دین اسلام سے مرتد ہو جائے۔
۲۔ پاگل ہو جائے۔
۳۔ دشمن کے ہاتھ اسیر ہو جائے اور رہائی کی امید نہ رہے۔
۴۔ ایسا مرض لاحق ہو جائے جس وجہ سے سلطنت کے فرائض سرانجام نہ دے سکتا ہو۔
۵۔ فسق و فجور میں مبتلا ہو جائے۔
۶۔ قانون کی بالادستی کو تسلیم نہ کرے۔
۷۔ مسلمانوں کے دینی اور دنیوی امور کی حفاظت نہ کرے۔ یا بیرونی حکومتوں کا آلہ کار بن جائے اور ملکی مفاد کو چھوڑ کر بیرونی حکومتوں کے مفاد کی پاسداری کرے۔

سید شریف لکھتے ہیں:۔

---

[1] سورۂ شوریٰ: ۳۸۔

''اگر مسلمانوں کے کام درست طریقہ پر انجام نہ پائیں اور دین کے معاملات میں خرابی کی صورت نظر آئے تو امت امام کو عہدہ سے علیحدہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اجتماعی نظم کے لیے امام کا تقرر بھی امت کے حق میں ہے اور معزول کرنا بھی۔''[1]

۸۔ اگر امام ارباب حل وعقد کے مشورہ کے بغیر حکومت کا نظام چلانا چاہے تو اس کو معزول کر دینا چاہیے۔ ابن عطیہ لکھتا ہے۔
''اگر صدر حکومت ماہرین علم وفن اور امت کے دین دار افراد کا مشورہ طلب کیے بغیر اپنی رائے سے کام کرتا ہے تو اس کو عہدہ سے معزول کر دینا چاہیے۔ اس پر تمام علماء قانون متفق ہیں۔''[2]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ خلیفہ کی اطاعت اسی وقت تک ضروری ہے۔ جب تک وہ اللہ تعالیٰ کا مطیع ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ لَا طَاعَةَ فِي مَعْصِيَةٍ اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ.[3] امیر کی معصیت میں کوئی فرمانبرداری نہیں ہے۔ فرمانبرداری صرف معروف میں ہے۔

حضرت ابوبکرؓ جب خلیفہ منتخب ہوئے تو مسجد نبوی میں صحابہ کرام کے سامنے اپنے پہلے خطبہ میں فرمایا۔ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا اَنَا مُتَّبِعٌ وَلَسْتُ بِمُبْتَدِعٍ فَاِنْ اَنَا اَحْسَنْتُ فَاَعِيْنُوْنِي وَاِنْ اَنَا زِغْتُ فَقَوِّمُوْنِي.[4] اے لوگو! میں اسلام کے احکام کی پیروی کرنے والا ہوں اور کسی بدعت کا موجد نہیں ہوں اگر میں نیکی کا راستہ اختیار کروں تو میری مدد کرو اور اگر کجی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کرو۔

صحابہ نے فرمایا ہم آپ کو نیزوں کی انیوں سے درست کر دیں گے۔

اقتدار اعلیٰ (حاکمیت)

اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) کے تصور کی تاریخ: اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) کا تصور علم سیاسیات میں ابتدا ہی سے پایا جاتا ہے۔ قدیم یونانی مفکر ارسطو اپنی کتاب ''سیاست'' میں اگرچہ لفظ ''حاکمیت'' کہیں استعمال نہیں کرتا مگر اس کے تصور کو ''اختیارات اعلیٰ'' کے الفاظ میں موسوم کرتا ہے اور جب اس نے ریاستوں کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا تو اس تقسیم کا اصول بھی اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) کے اصول پر مبنی کیا۔

ارسطو کے بعد رومی مفکرین نے بھی اس نظریے پر بحث کی۔ ازمنہ وسطیٰ میں جب یورپ پر عیسائیت کا غلبہ تھا تو اقتدار اعلیٰ کے تصور نے شاہنشاہیت اور پاپائیت یعنی دنیاوی حاکمیت اور دینی اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) کی شکل اختیار کر لی۔ جس کی وجہ سے ان دو حاکمین میں مدت دراز تک جھگڑا رہا کہ ان میں سے مقتدر اعلیٰ کون ہے۔

ابن خلدون نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''مقدمہ'' میں حاکمیت (اقتدار اعلیٰ) کا تصور واضح اور بین الفاظ میں پیش کیا ہے وہ کہتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ ایسی قوت ہے جو ریاست کے وجود کو قائم رکھتی ہے اور جب حاکم اعلیٰ کمزور ہو جاتا ہے تو ریاست بھی کمزور ہو جاتی ہے حتیٰ کہ زوال پذیر ہو کر دنیا کے نقشہ سے مٹ جاتی ہے اور نئی حاکمیت اس کی جگہ لے لیتی ہے۔''

دور حاضر میں یورپی مفکرین نے اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) کے مختلف تصورات ونظریات پیش کیے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا شخص فرانسیسی مفکر ژاں بوداں (Jean Bodin) تھا۔ اس نے کہا کہ ''اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) وہ طاقت ہے جو قانون سے بالاتر ہر شہری اور رعایا پر فائق ہوتی ہے'' بوداں کے نزدیک یہ طاقت بادشاہ کو حاصل ہے۔

بوداں کی طرح تھامس ہوبز نے بھی اقتدار اعلیٰ (حاکمیت کے تصور) کو بادشاہت کے تصور میں پیش کیا ہے اگرچہ اس نے اس کے تصور کو بہتر رنگ میں پیش کیا ہے اور زیادہ وضاحت کی اس نے کہا ہے کہ اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) قطعی ناقابل تقسیم اور ناقابل انتقال طاقت ہے۔

اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) کے معنی اور مفہوم: ریاست افراد اداروں اور گروہوں کا منظم معاشرہ ہوتی ہے ان افراد، اداروں اور گروہوں وغیرہ میں باہمی رشتہ کو مضبوط کرنے امن وامان قائم رکھنے اور ان کے طریقہ کار میں میل جول رکھنے کے لیے ریاست قانون نافذ کرتی ہے اور رسم ورواج قائم رکھتی ہے اس طرح اپنے قانون اور حکم کے ذریعہ اپنے اختیارات ظاہر کرتی ہے اور اپنے اختیارات کو سب پر لاگو کرتی ہے اور وہ اپنی مرضی سے کسی اور بیرونی طاقت یا قانون کے تابع نہیں ہوتی ریاست کی اس طاقت اور اختیار کو اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) کہا جاتا ہے۔

۱۔ المواقف معہ شرح جلد ۸ صفحہ ۳۵۳۔
۲۔ وحکی القرطبی من ابن عطیہ لاخلاف فی وجوب العزل من لایستشیر اہل العلم والدین۔ فتح القدیر شوکانی ال عمران جلد ۱ صفحہ ۳۶۰۔
۳۔ متفق علیہ بخاری۔
۴۔ کتاب الاموال لابی عبید صفحہ ۳۶۶۔

اقتدارِ اعلیٰ (حاکمیت) (Sovereignty)

چند مستند تعریفیں: مغربی مفکر بودین اقتدار اعلیٰ کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔ ''شہریوں اور رعایا پر ریاست کا ایسا فائق اختیار جو قانونی حد بندیوں سے آزاد ہو۔''

برگس (Burgess) نے اقتدار اعلیٰ کی اس طرح تعریف کی ہے:

''اقتدار اعلیٰ مملکت کا وہ اصلی مطلق العنان غیر محدود اور مکمل اختیار ہے۔ جس کے ماتحت ملک کا ہر فرد اور ہر جماعت ہوتی ہے۔''

جان اسٹن نے اس طرح تعریف کی ہے۔

''اگر ملک میں ایسا برتر اور افضل انسان ہو جو کسی کے ماتحت نہ ہو اور جس کے احکام کی پابندی کی سوسائٹی عادی ہو چکی ہو تو اس مخصوص اور برتر شخص کو اس سوسائٹی کا مقتدر اعلیٰ یا فرمانروا (Sovereign) متصور کیا جائے گا اور وہ منظم سوسائٹی مع اعلیٰ افضل شخص کے سمجھی جائے گی۔''

پولک (Pollak) کہتا ہے:۔

''اقتدار اعلیٰ کی قوت نہ وقتی ہوتی ہے اور نہ مستعار لی ہوئی اور نہ دنیا میں وہ کسی دوسری طاقت کے روبرو جواب دہ ہوتی ہے۔''

گروشیس کہتا ہے:۔

''ایسے شخص میں تفویض شدہ سیاسی اختیار اعلیٰ ہے جس کے اعمال کسی دوسرے کے تابع نہیں ہیں اور جس کی منشاء کا رد نہیں ہو سکتا۔''

روسو جان لاک کہتا ہے:۔

''یہ اعلیٰ اختیار عوام کے قبضہ قدرت میں ہے لیکن اس کا عملی اظہار حکومت کے ذریعہ ہوتا ہے۔''

روسو کا نظریہ اقتدار اعلیٰ: روسو نے اقتدار اعلیٰ کو ارادہ عامہ یا مشیت عامہ (General will) کے سپرد کیا ہے۔ اس طرح وہ عمومی اقتدار اعلیٰ کا قائل ہے۔

مندرجہ بالا تعریفات کی رو سے اقتدار اعلیٰ یا تو سلطنت کو حاصل ہے جیسا کہ بودین کا نظریہ ہے یا سلطنت کا بادشاہ اقتدار اعلیٰ کا مالک ہے۔ جیسا کہ جان اسٹن گروشیس کا خیال ہے۔ یا مرضی عامہ یعنی قوم کی عام منشاء اقتدار اعلیٰ ہے جیسا کہ روسو کہتا ہے:۔

اسلامی نقطہ نگاہ سے اقتدار اعلیٰ کا مفہوم: اسلامی نقطہ نگاہ سے اقتدار اعلیٰ وہ بالادست طاقت ہے۔ جس سے بالا کوئی طاقت نہ ہو۔

اسلام کے نظام حکومت میں خدا تعالیٰ ہی اقتدار اعلیٰ کا حقیقی مالک ہے جیسا قرآن مجید میں آتا ہے:۔ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ [1] اللہ حکمرانی کرتا ہے کوئی اس کے حکم کو ٹالنے والا نہیں ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ [2] حکم دینے کا اختیار صرف اللہ ہی کو ہے۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ عَمَّا جَاۗءَكَ مِنَ الْحَقِّ. [3] تو لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے کر اور اس قانون حق کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ [4] اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔

ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں سیاسی اور قانونی حاکمیت صرف اللہ کو ہی حاصل ہے۔ عہد حاضر کا فرانسیسی ماہر سیاسیات ڈی ٹوکویل خدا کی حاکمیت کے متعلق لکھتا ہے:۔

''مطلق اقتدار فی الواقعہ ایک بری چیز ہے اور خطرناک بھی۔ کسی انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اقتدار مطلق کو دور اندیشی اور احتیاط کے ساتھ استعمال کر سکے۔ اقتدار مطلق کا مرجع صرف خدائے واحد کی ذات ہے۔ کیونکہ اس کے اقتدار کی کارفرمائی کے پہلو بہ پہلو اس کی حکمت اور عدل بھی کارفرما ہے لیکن دنیا کے اندر کوئی ایسا معتبر اور قابل اطاعت اقتدار نہیں پایا جاتا۔ جس کے احکام کو میں ہر معاملے میں غیر مشروط طور پر قبول کرتا جاؤں۔ جب میں یہ معلوم کرتا ہوں کہ کسی قوم یا کسی ملک کو یا کسی حکومت کو خواہ وہ شخصی ہو یا

---

[1] الرعد ۱۳:۴۱۔ [2] سورۃ یوسف ۱۲:۴۰۔ [3] المائدہ ۵:۴۸۔ [4] المائدہ ۵:۴۴۔

ڈیموکریٹک یا بادشاہت ہو یا ری پبلک ہو۔ اقتدار سونپ دیا گیا ہے تو مجھے اسی وقت انتشار و انارکیت کے بیج نظر آنے لگتے ہیں اور میں فوراً ایک ایسی ریاست کی تلاش کرنے لگتا ہوں جو میری حقیقی آرزو پوری کرے۔''

اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات: قرآن مجید کی رو سے اقتدار اعلیٰ کی حسب ذیل خصوصیات ہیں:۔

ا۔ وحدتِ اقتدار: اسلامی حکومت کا اقتدار اعلیٰ اپنے اقتدار میں وحدت اور یگانگت کا مالک ہوتا ہے اور اس کے اقتدار میں کوئی دوسرا شریک اور ساجھی نہیں ہوسکتا جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:۔ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا۔[1] وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔

اِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ۔[2] حکم دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہی ہے۔ لَمْ يَكُنْ لَهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ. یعنی مملکت میں اس کا کوئی بھی شریک نہیں ہے۔

۲۔ قدرتِ عامہ: قدرت اور قوت اللہ تعالیٰ کے حاکمانہ اقتدار کی ایک خصوصیت ہے۔ علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ قدرت عامہ ایک ایسی خصوصیت ہے۔ جس کی مکمل نسبت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسری ہستی کے ساتھ نہیں ہوسکتی وہی ہے جس کی اعلیٰ ہستی اعلیٰ درجہ کا اقتدار اور قدرت رکھتی ہے۔ وہ ایک قادر اور مقتدر ہستی کی حیثیت سے اپنے حکم اور حکومت کے کام میں قابل تعریف تشخص کا مالک ہے۔[3]

ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

۳۔ بالا دستی: بالا دستی اقتدار اعلیٰ کی روح ہے۔ اس وجہ سے اسلام میں بالا دستی اقتدار اعلیٰ کی حقیقت ہے۔ علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں۔ ''خداوند عالم بلند و بالا دست ہے۔'' اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے مرتبہ اور حکومت میں اتنا اونچا ہے کہ اس سے کوئی اونچا نہیں۔[4]

حضرت امام غزالی مقتدر اعلیٰ کی بالا دستی کے متعلق لکھتے ہیں۔

''دنیا کی ہر چیز اس کے تخت سلطنت کے ماتحت ہے اور تخت اس کے اقتدار اعلیٰ کے ماتحت ہے۔ اس کا اقتدار اور قدرت عامہ اور حکومت کمال کے ایسے منتہا پر ہے کہ اس سے اوپر کوئی اقتدار نہیں۔ ہر کمی سے محفوظ اور ہر نقص سے خالی اس کے غلبے اور تسخیر کی قوتیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ حکومت اس کی چیز ہے اور سلطنت اس کی مِلک ہے۔''[5]

قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ. (سورہ حج) اللہ بادشاہ برحق و بالا دست ہے۔ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (مومنون ۲۳:۶۲) اور بے شک اللہ بلند شان والا بڑا ہے۔

كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا. یعنی اللہ کا ہی حکم سب حکموں سے بلند ہے۔

۴۔ آزادی: اقتدار اعلیٰ کو حکم اور نفاذ حکم کی مکمل آزادی ہونی چاہیے۔ بلنچلی لکھتا ہے۔ ''اقتدار کی آزادی اقتدار اعلیٰ کے مفہوم میں داخل ہے۔''

قرآن مجید میں آتا ہے۔ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ.[6] اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا.[7] اور اللہ ایسا نہیں کہ اسے کوئی چیز عاجز کر دے۔ نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں وہ جاننے والا قدرت والا ہے۔

۵۔ جلالت عامہ: اقتدار اعلیٰ کی حاکیت کے لیے جلالت ایک ضروری وصف ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں۔ جلالت ایک خاص وصف ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے۔[8]

۶۔ دوام: لازوال زندگی اقتدار اعلیٰ کی ایک اہم خصوصیت ہے یہ وہ وصف ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی مخصوص ہے۔ وہی ہستی ہے جو ہر قسم کے زوال

۱۔ الکہف ۱۸:۲۶۔ ۲۔ یوسف ۱۲:۴۰۔

۳۔ مفردات القرآن (قدر) صفحہ ۲۷۴-۲۷۶۔

۴۔ التبر المسبوک فی نصائح الملوک ماخوذ از اسلام کا نظام حکومت مصنفہ مولانا حامد انصاری غازی صفحہ ۱۶۴۔

۵۔ نظریہ سلطنت نمبر ۲/۷ صفحہ ۵۰۳۔ ۶۔ ابراہیم ۱۴:۲۷۔

۷۔ فاطر ۳۵:۴۴۔ ۸۔ مفردات القرآن جل الجلالۃ۔

سے پاک ہے ہمیشہ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کی حاکمیت نامعلوم زمانہ تک ہے۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ. کائنات کی تخلیق سے پہلے بھی اللہ اور اس کے نیست و نابود ہو جانے کے بعد بھی وہی رہے گا۔

لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ یعنی پہلے بھی اور بعد میں بھی حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔ هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ. وہ ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے۔

۷۔ بے تعطلی: اللہ تعالیٰ کی حاکمیت میں لحہ بھر بھی تعطل واقع نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہر وقت فعال اور خبردار رہتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (البقرہ ۲:۲۵۵) یعنی اس کو نہ کسی وقت نیند آتی ہے اور نہ اونگھ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا[1] اسے دنیا و مافیہا کی حفاظت تھکا نہیں دیتی۔

۸۔ ناقابل انتقال: اللہ تعالیٰ کے اختیارات ناقابل انتقال ہیں۔ اس کے تمام اختیارات ذاتی ہیں۔ دوسرے کسی شخص کو منتقل نہیں کیے جا سکتے۔ دنیا کی ہر چیز اسی کے ماتحت اور حلقہ اقتدار میں ہے۔ سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی صفت مالک بیان کی ہے۔ عربی زبان میں مالک وہ ہستی ہوتی ہے۔ جس کے ہاتھ میں ہر قسم کے اختیارات ہوں۔

۹۔ جامعیت تامہ: اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کائنات کی ہر چیز پر محیط ہے۔ اس کے اقتدار کی حدود غیر معین اور غیر محدود ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (البقرہ ۲:۱۱۵) مشرق اور مغرب کی وسعتیں سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ[2] یعنی اس کی حکومت زمین اور آسمان تک ہے۔ اگر کوئی انسان یہ کوشش کرے کہ اس کی حکومت سے کہیں باہر نکل جا سکتا ہے تو وہ نکل نہیں سکتا۔

حکومت کے فرائض

اسلامی ریاست کا سب سے بڑا وصف حقوق انسانی کی بحالی ہے اسلام سے قبل تمام کرہ ارض کی سلطنتوں میں حقوق انسانی کا تصور محض عنقا تھا۔ معاشرہ مختلف طبقات میں بٹا ہوا تھا عوام حقوق انسانی سے محروم تھے۔ ان کی زندگی بہائم سے بھی بدتر تھی۔ اس تاریک دور میں مکہ کی بے آب و گیاہ وادی میں تکریم انسانیت کی آواز بلند ہوئی اور تمام مرعات یافتہ طبقہ آپ کا دشمن بن گیا جب ہجرت فرما کر مدینہ آئے تو مسلم ریاست کی بنیاد رکھی اور تمام حقوق انسانی کو عملی جامہ پہنایا۔ دنیا کی تاریخ میں پہلے شخص حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ جنھوں نے انسانی حقوق کی تنفیذ کو ایک ریاست کے لیے لازمی قرار دیا۔ حقوق انسانی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ تحفظ جان: ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے زندگی بخشی ہے۔ حیات کو منقطع کرنے کا حق دار وہ صرف اللہ ہی ہے کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی کی جان لے اگر کوئی شخص کسی کی جان ماورائے تعلیم اسلام لیتا ہے تو وہ زمین میں فساد پھیلاتا ہے۔ اس لیے حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ رعایا کے ہر فرد کی جان کی حفاظت کرے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل ۱۷:۳۳) اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ۔

دوسری جگہ آتا ہے مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدہ ۵:۳۲) جو کوئی کسی کی جان کو بغیر جان کے بدلہ کے یا زمین میں فساد کے مار ڈالے تو گویا اس نے سب لوگوں کو مار ڈالا اور جو کوئی اس کو زندہ رکھے تو گویا اس نے سب لوگوں کو زندہ رکھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اِنَّ دِمَآءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا (بخاری کتاب الحج) تمہاری جانیں اور تمھارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت۔ (یعنی حج کے دن کی)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "ایک آدمی کے قتل پر اگر آسمان و زمین کی سب مخلوق بھی متفق ہو جائے تو اللہ ان سب کو سزا دیے بغیر نہ چھوڑے گا۔"

قتل جان کی مختلف صورتیں

۱۔ قتل اولاد: اسلام سے قبل اہل عرب اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل کر دیتے لڑکیوں کی پیدائش کو اپنے لیے باعث عار سمجھ کر انھیں زندہ درگور کر دیتے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان بے قصور جانوں کو بھی زندہ رہنے کا حق دیا ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (الانعام ۶:۱۵۱) اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ تمھیں بھی ہم رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی ہم دیں گے بچیوں کو زندہ درگور کرنے کے جرم کو قابل

۱۔ البقرہ ۲:۲۵۵۔ ۲۔ البقرہ ۲:۲۵۵۔

مواخذہ اور قابل تعذیب قرار دیتے ہوئے فرمایا وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا وہ کس قصور میں ماری گئی۔

ب۔ قتل مومن: مومن کا قتل ایک سنگین جرم ہے ارشاد الٰہی ہے ''وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرتا ہے اس کی سزا جہنم ہے اور اس پر اللہ کا غضب اور لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں ''کسی مسلمان کے قتل کے مقابلے میں پوری دنیا کا تباہ ہو جانا اللہ کے نزدیک زیادہ آسان ہے۔

فرمایا ''جس شخص نے کسی مومن کے قتل ناحق میں ذرہ برابر بھی مدد کی وہ قیامت کے دن اس حال میں لایا جائے گا کہ اس کی آنکھوں کے درمیان لکھا ہوا ہوگا ''اللہ کی رحمت سے ناامید''

ج۔ خودکشی: تحفظ جان کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ دوسروں کو قتل نہ کیا جائے بلکہ اسلام میں جس طرح دوسروں کی جان لینے کو حرام قرار دیا ہے اسی طرح خود اپنی جان کو بھی اپنے ہاتھوں عمداً ضائع کرنے کو قابل مواخذہ قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔

د۔ غیر مسلم کا خون: اسلامی قانون میں مسلمان اور ذمی مساوی درجہ رکھتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے ''جس نے کسی ذمی کو قتل کیا اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی۔

ایک اور حدیث ہے ''جس نے کسی معاہد غیر مسلم کو قتل کیا۔ وہ کبھی بھی جنت کی خوشبو کی نہ سونگھ سکے گا۔

۲۔ تحفظ عزت و آبرو: اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو قابل تحریم و تکریم پیدا کیا ہے۔ اس تکریم کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات ہے لہٰذا اسلام نے حرمت جان کے ساتھ حرمت آبرو کا حکم دیا۔ (سورۃ الحجرات آیات ۱۱،۱۲) میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تکریم کے بارے میں فرمایا۔

۱۔ کسی کا مذاق نہ اڑایا جائے۔ ۲۔ کسی پر طعن و تشنیع نہ کی جائے۔ ۳۔ کسی کو برے القاب سے نہ پکارا جائے۔ ۴۔ کسی کے متعلق بدگمانی نہ کریں اور غیبت سے بچا جائے۔ ۵۔ ایک دوسرے کے عیوب اور خامیاں تلاش نہ کی جائیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ بے عزتی اور آبروریزی کا یوم قیامت شدید احتساب ہوگا۔ اسلام نے عورتوں کی آبرو کے تحفظ پر خصوصاً بہت زور دیا ہے اور ان کی آبرو پر بہٹہ لگانے کو مورد سزا ٹھہرایا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (النور ۲۴:۲۳) جو لوگ پاک دامن بے خبر مومن عورتوں پر بہتان باندھتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔''

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر جہاں جان کی حفاظت کا ذکر کیا ہے وہاں آبرو کی حفاظت کا بھی ذکر کیا۔ گویا جتنی جان کی حفاظت ضروری ہے اتنی ہی آبرو کی حفاظت لازمی ہے۔

ایک اور حدیث ہے آپ نے فرمایا جس نے کسی دوسرے کی بے عزتی یا آبروریزی کی ہو یا کوئی اور ظلم کیا ہو۔ وہ آج معاف کرائے اس دن سے پہلے جب نہ کوئی روپیہ پیسہ ہوگا نہ مال و دولت البتہ جو نیک عمل اس کے پاس ہوگا وہ لے لیا جائے گا۔ اور اگر نیک عمل نہ ہوگا تو مظلوم کی برائیاں لے کر اس پر ڈال دی جائیں گی۔

۳۔ مال کی حفاظت: انسان کو اپنی جان اور آبرو کے علاوہ مال سے بہت محبت ہوتی ہے۔ دوم زندگی کی بقا کا ایک وسیلہ ہے۔ ضروریات حیات کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا کاروبار نہیں چل سکتا۔ اس لیے اسلام نے مال کی حفاظت کی بھی ضمانت دی۔ ارشاد الٰہی ہے۔ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (بقرہ ۲:۱۸۸) آپس میں دوسرے کا مال ناحق طور پر نہ کھاؤ۔

اس آیت کریمہ میں ناجائز طریقے سے مال کمانے کی تمام صورتوں مثلاً چوری، ڈکیتی، غصب، جوا، سود، دھوکہ اور خیانت کم تول و ماپ، اکتناز، احتکار اور تجیس کو حرام قرار دیا ہے۔ قابل مواخذہ قابل حد اور قابل تعزیر قرار دیا ہے۔ کسی کی زمین ناجائز طور پر غصب اور چھیننے کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''جس شخص نے کسی کی ایک بالشت برابر بھی زمین ظلم کر کے لی۔ اس کی گردن میں اس کے برابر ساتوں زمینوں کا طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا۔

۴۔ حق خلوت (نجی زندگی کا تحفظ): اسلام نے شہریوں کی نجی زندگی کو مکمل تحفظ دیا ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ بغیر اجازت کے کسی کے گھر کی چار دیواری میں داخل ہو۔ اگر گھر کی چار دیواری کو یہ تحفظ نہ ہوتو اس کے لیے آزادی سے سانس لینا محال ہو جائے گا اور گھر کی چار دیواری قید خانے کی شکل اختیار

کر جائے گی اسلام نے نجی زندگی کے تحفظ کی کامل ضمانت دی ہے اور ارشاد الٰہی ہے۔ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا (النور۲۴:۲۷) اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں مت داخل ہو جب تک ان سے اجازت حاصل نہ کرلو۔ سورۃ نور میں نجی زندگی کے تحفظ کے لیے قیمتی ہدایات ہیں۔

۱۔ اس وقت تک کسی کے گھر میں داخل نہ ہوں جب تک معروف طریقے سے گھر والوں سے اجازت نہ لے لیں۔

۲۔ اگر گھر میں کوئی موجود نہیں تو تب بھی واضح اجازت کے بغیر گھر میں داخل نہ ہوں۔

۳۔ اگر گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے تو لوٹ جانا چاہیے۔

۴۔ ایسے مکان جو نجی رہائش گاہیں نہ ہوں۔ مثلاً دفاتر' پبلک عمارات' ہوٹل' مہمان خانے' دکانیں وغیرہ یہاں اجازت کی ضرورت نہیں۔

۵۔ اسی طرح سورہ احزاب میں یہ حکم دیا گیا ہے اگر کسی کے گھر میں کسی ضرورت اور اجازت سے جاؤ تو وہیں دھرنا مار کر بیٹھ نہیں رہنا چاہیے کیونکہ گھر والے کو اور بھی کئی ضروری کام ہوتے ہیں۔

۶۔ جب کسی کے گھر کے دروازے پر جاؤ تو ایک طرف ہو کر کھڑا ہونا چاہیے۔ جھانکنا نہیں چاہیے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوئی شخص کسی کو گھر میں جھانکتے ہوئے دیکھے تو اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

کسی کی ٹوہ لگانا بھی نجی زندگی میں مداخلت کے مترادف ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ لَا تَجَسَّسُوْا تم تجسس نہ کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکمرانوں کو بھی تجسس سے منع فرمایا ہے حدیث میں ہے ''حکمران جب لوگوں کے اندر شبہات کے اسباب تلاش کرنے لگے تو وہ انھیں بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔

اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ کسی ریاست کو اپنے کسی شہری کے خلاف جاسوسی کرنا جائز نہیں۔

۵۔ شخصی آزادی کا تحفظ: اسلامی ریاست میں بغیر جرم ثابت ہوئے کسی شہری کو قید یا نظر بند کرنا جائز نہیں' شخصی آزادی ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔ موطا میں لکھا ہے ''اسلام میں کسی شخص کو بغیر عدل کے قید نہیں کیا جا سکتا۔

ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد نبوی میں خطبہ دے رہے تھے کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر اپنے ہمسایہ کے بارے میں پوچھا کہ اسے کس جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ بات ظاہر ہوئی کہ اسے بغیر کسی جرم کے ثبوت کے گرفتار کر لیا گیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی وقت اس کی رہائی کا حکم صادر فرمایا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ عدالتی طریقہ تھا کہ جب تک جرم کی پوری طرح تحقیق کر کے اس کی تہہ تک نہیں پہنچ جاتے اور جرم کا ثبوت فراہم نہ ہو جاتا۔ کسی کو کسی قسم کی سزا نہ دیتے تھے۔ ماعز کی مثال واضح ہے کہ آپ ماعز سے مختلف انداز اور طریقے سے جرم کے بارے میں استفسار فرماتے ہیں جب اس امر کا قطعی یقین ہو گیا کہ ماعز مجرم ہے تو اس کے بعد آپ نے رجم کا حکم صادر فرمایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے ''جس حد تک ممکن ہو مسلمانوں (شہریوں) کو سزا سے بچاؤ۔ کوئی گنجائش نکلتی ہو تو انھیں چھوڑ دو یہ بات کہ کسی شخص کو چھوڑ دینے میں خطا کر جائے اس بات سے بہتر ہے کہ وہ اس کو سزا دینے میں غلطی کر جائے۔

ایک دوسری حدیث ہے ''جب تک بچانے کا کوئی راستہ مل رہا ہو اس وقت تک لوگوں کو سزا سے بچاؤ۔''

آپ نے واضح طور پر ایک اصول مقرر فرمایا اِدْرَءُ وا الْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ حدود شرعیہ کو شکوک و شبہات کی بناء پر ساقط کر دیا کرو۔

قرآن مجید میں شخصی آزادی کے تحفظ کو اتنا اہم قرار دیا ہے کہ اللہ کا رسول بھی ان سے سلب نہیں کر سکتا چہ جائے کہ کوئی اور حکمران اس کو سلب کرے ارشاد الٰہی ہے۔

''کسی انسان کی یہ شایان شان نہیں کہ اللہ تو اسے کتاب و حکمت اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے غلام بن جاؤ وہ تو یہی کہے گا کہ ربانی (خدا کے غلام) بنو''

۶۔ اختلاف رائے کے اظہار کا حق

ارشاد الٰہی ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء۴:۵۹) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے صاحب امر (حاکم) کی اطاعت کرو۔ پھر اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا

کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امور سلطنت کے بارے میں صحابہ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ جنگ احد میں صحابہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے سے اختلاف بھی کیا۔

غزوہ بدر میں آپ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ فلاں فلاں مقام پر قیام کریں۔ ایک صحابی نے آپ سے دریافت کیا کہ یہ ارشاد وحی الٰہی سے ہے یا آپ کی ذاتی رائے ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میری رائے ہے صحابی نے عرض کیا کہ فلاں مقام مناسب نہیں بلکہ اس کی بجائے فلاں جگہ قیام کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابی کی رائے کو قبول فرمایا۔

ایک بار آپ مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے کہ کسی نے کہا کہ یہ ایسی تقسیم ہے جس میں اللہ کی مرضی کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان ناروا کلمات کو سنا اور درگزر کر دیا۔

ایک اور شخص نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عدل سے کام نہیں لیا آپ نے اس سے کوئی باز پرس نہ فرمائی اور فرمایا کہ اگر میں عدل نہ کروں گا تو اور کون عدل کرے گا۔

ایک مرتبہ حضرت زبیر اور ایک انصاری کا مقدمہ آپ کی خدمت میں پیش ہوا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت زبیر کے حق میں فیصلہ فرمایا انصاری نے غصے میں آ کر کہا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے پھوپھی زاد بھائی کے حق میں فیصلہ کر دیا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کے ناروا کلمات کو سن کر درگزر فرمایا اور انصاری کو کچھ نہ کہا۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اسلام اظہار رائے کی غیر مشروط آزادی نہیں دیتا بلکہ اسلام نے حدود مقرر کر دی ہیں ان کے اندر رہتے ہوئے اظہار رائے کی آزادی ہے۔

اظہار رائے کی آزادی افہام تفہیم کا ایک ذریعہ ہے۔ کسی معاملہ کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ اظہار رائے سے ہی مختلف مسائل کا حکومت کو علم ہوتا ہے۔ پھر ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

۷۔ عقیدے کی آزادی: اسلام نے جبراً عقیدے کی تبدیلی کو ناپسند کیا ہے اور واضح اعلان کیا ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں ارشاد الٰہی ہے۔ لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ۲:۲۵۶) دین میں کوئی جبر نہیں۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (یونس۱۰:۹۹) اور اگر تیرا رب چاہتا تو زمین میں جس قدر لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ تمہارا اپنا دین ہے اور میرا اپنا دین ہے۔

ایک اور جگہ آتا ہے۔ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (۸۸:۲۳) تو ان پر داروغہ نہیں ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (ال عمران۳:۲۰) پس اگر یہ لوگ (اسلام) سے منہ موڑتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صرف واضح پیغام پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

۸۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق: اسلام نے ایک طرف شہریوں کو یہ حکم دیا ہے کہ کسی پر ظلم نہ کریں دوسری طرف انھیں یہ حق بھی دیا ہے اگر ان پر ظلم ہو تو اس کے خلاف آواز اٹھائیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (النساء۴:۱۴۸) اللہ بری بات کے مشہور کرنے کو (کسی سے) پسند نہیں کرتا سوائے جس پر ظلم کیا گیا۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ جس شخص پر ظلم ہو۔ وہ اپنے ظلم کے خلاف احتجاج کر سکتا ہے۔

مشہور حدیث ہے اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَابِرٍ (مشکوٰۃ، ۱۷ بروایت ترمذی) افضل ترین جہاد یہ ہے کہ ظالم حاکم کے سامنے کلمہ حق کہا جائے۔

گو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات رحمۃ للعالمین تھی کسی کو آپ کی ذات سے نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا لیکن پھر بھی اگر کسی کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کوئی شکایت ہوتی تو آپ اسے اظہار کی اجازت دیتے اور اپنے آپ کو بدلے کے لیے پیش فرما دیتے غزوہ بدر میں آپ صفیں درست فرما رہے تھے حضرت سواد صف سے کچھ آگے بڑھے ہوئے تھے آپ نے انھیں تیر چبھو کر صف میں برابر ہونے کا حکم دیا وہ کہنے لگے! یا رسول اللہ صلی اللہ! آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عدل قائم کرنے کے لیے بھیجا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوراً اپنا شکم مبارک کھول کر فرمایا۔ سواد! اپنا بدلہ لے لو۔ سواد دوڑ کر آپ کے جسم اطہر کے ساتھ لپٹ گیا اور شکم مبارک کو چوم لیا۔

ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے قرض کی ادائیگی کا تقاضا کرتے ہوئے سخت کلامی سے پیش آیا صحابہ کرام کو اس کے طرز عمل پر غصہ آیا۔ آپ نے فرمایا اسے کہنے دو۔ اسے کہنے دو۔ جس کا کچھ حق نکلتا ہے وہ ایسی باتیں کر سکتا ہے۔

۹۔حصول انصاف کا حق: عدل و انصاف ہی سلطنتوں کے استحکام کا ذریعہ ہے اور عدل و انصاف ہی وہ حق ہے جو بعثت نبوی سے قبل تمام کرہ ارض کی سلطنتوں سے عنقا تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عدل و انصاف کو قائم کیا' آپ کا فرمان ہے اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان عدل قائم کروں۔ قُلْ اَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ اے محمدؐ! آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔''امام عادل کا ایک دن ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔''

نیز آپ نے فرمایا مخلوق میں خدا کو سب سے زیادہ محبوب امام عادل ہے اور خدا کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض آدمی امام ظالم ہے اگر آپ کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ادنیٰ اعلیٰ مسلم غیر مسلم آقا غلام کے درمیان عدل و انصاف قائم رکھا۔ قریش کی ایک فاطمہ نامی عورت کی چوری کا مقدمہ مشہور ہے آپ کے پاس سفارش کے لیے حضرت اسامہ گئے آپ کا رخ مبارک غصہ سے سرخ ہو گیا اور خطبہ فرمایا کہ''تم سے پہلے قومیں اسی وجہ سے تباہ ہوئیں کہ بڑوں کو جرم کے ارتکاب میں چھوڑ دیتے اور کمزور اور غریب کو سزا دیتے۔ اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔''

۱۰۔ہجرت کا حق: ارشاد الٰہی ہے۔ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ. (الزمر ۳۹:۱۰) اور اللہ کی زمین فراخ ہے۔ صابروں کو ان کا اجر بے حساب ملے گا۔

ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے۔ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا (النساء ۴:۹۷) (فرشتے) کہیں گے کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی تم اس میں ہجرت کر جاؤ۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا (المومن:۶۴) اللہ وہ ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا۔

۱۱۔پناہ لینے کا حق: ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ (التوبہ:۶) مشرک (دشمن) اگر تم سے پناہ کا خواستگار ہو تو اسے پناہ دے دو۔

۱۲۔آزادی سکونت کا حق: ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ سلطنت کے جس حصہ میں رہائش اختیار کرنا چاہے۔ اختیار کرے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ (العنکبوت ۲۹:۲۰) دنیا میں پھرو پھر دیکھو کس طرح اس نے پہلی بار پیدا کی۔

آپ نے فرمایا''تم جہاں چاہو رہو اور تمھارے اور ہمارے درمیان شرط یہ ہے کہ نہ تم خون ریزی کرو اور نہ تم راہ زنی کرو اور نہ کسی پر ظلم کرو (نیل الاوطار جلد ۷ ص ۱۳۹)

۱۳۔آزادی اجتماع کا حق: یہ حق آزادی ضمیر اور اظہار رائے کی آزادی کے حق سے منسلک ہے اس حق سے مراد یہ ہے کہ ہر شہری کو آزادانہ طور پر میل ملاپ اور تنظیمیں بنانے کا حق ہے اگر تنظیمیں بنانے کا حق نہ ہو تو اظہار رائے کا حق بیکار ہے اس لیے اسلام نے آزادی اجتماع کا حق دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (ال عمران ۳:۱۰۴) اور چاہیے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔

۱۴۔حصول علم کا حق: اسلام ہر شخص کو حصول علم کا حق دیتا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (بقرہ ۲:۲۶۹) جسے اللہ نے علم و حکمت سے نوازا ہے اسے بڑی دولت حاصل ہو گی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ علم حاصل کرنا ہر مسلم مرد اور عورت پر علم فرض ہے۔

ابو الدرداء سے روایت ہے کہ حصول علم کے لیے سفر کرنا جنت کی راہ طے کرنا ہے جویان علم کی رضا جوئی کے لیے فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں ارض و سما کا ایک ایک فرد حتیٰ کہ سمندر کی مچھلیاں بھی اس کی مغفرت کے لیے دست بدعا رہتی ہیں عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے بدر کامل کو ستاروں پر ہوتی ہے۔ ترکہ انبیاء علیہم السلام کے یہی اہل علم وارث ہیں نبیوں نے درہم اور دنیا کی میراث نہیں چھوڑی بلکہ میراث علم چھوڑا ہے جس نے اسے حاصل کر لیا اس نے بہت کچھ لے لیا (ترمذی ابو داؤد)

۱۵۔حق مساوات: اسلام نے تمام لوگوں کو بحیثیت انسان برابر پیدا کیا کسی کو کسی پر برتری اور فوقیت نہیں ارشاد الٰہی ہے يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ

ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (الحجرات ۴۹:۱۳) اے لوگو! ہم نے تمھیں مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو۔ اللہ جاننے والا خبردار ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس ۱۰:۱۹) اور (ابتداء میں) انسانوں کی ایک ہی امت تھی پھر الگ الگ ہو گئے۔ ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (النساء ۴:۱) اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔ جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ (بیہقی کتاب الایمان) ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔

فرمایا اِنَّ الْعِبَادَ كُلُّهُمْ اِخْوَةٌ (مسند احمد بن حنبل ابوداؤد) تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى. (مسند احمد) لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک اور تمہارا باپ ایک ہے بے شک عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر یا سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

۱۶۔ بنیادی ضروریات کے حصول کا حق: ماہرین عمرانیات نے ایک انسان کے لیے تین بنیادی ضروریات قرار دی ہیں وہ ہیں گھر، لباس اور روٹی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال پہلے اس بات کا اظہار کیا تھا۔ ابن آدم کا بنیادی حق یہ ہے کہ اس کے لیے ایک گھر ہو۔ جس میں وہ رہ سکے کپڑا ہو جس سے وہ اپنے جسم کو ڈھانپ سکے اور کھانے کے لیے روٹی اور پینے کے لیے پانی۔"

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ آ کر جب اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی تو مہاجرین کی سب سے پہلے انہی ضروریات کو نہایت حکمت عملی اور منصوبہ بندی سے پورا کیا۔ وہ حکمت عملی انصار اور مہاجرین کے درمیان "عقد مواخات" تھی عقد مواخات کے تحت انصار نے مہاجرین کی ان ضروریات کو پورا کر دیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کے لیے مدینہ میں میٹھے پانی کا بھی سرکاری سطح پر انتظام کیا چنانچہ آپ کی خواہش پر حضرت عثمان نے چار ہزار دینار میں بئر رومہ خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔

رہائشی مکانات کے لیے قطائع کے علاوہ متعدد قطائع زرعی مقاصد کے لیے بھی مسلمانوں کو دیے۔ یہ زرعی قطائع بعض اوقات گھاس کھجوروں اور باغات پر مشتمل ہوتے تھے۔ قابل کاشت اراضی کے علاوہ زمینیں بھی مسلمانوں کو بطور قطائع عطا فرمائی تھیں تاکہ ان پر کاشت کی جائے اور زراعت کو ترقی دی جائے۔

بعض ایسی زمینیں بھی تقسیم کیں۔ جن سے حاصل ہونے والی پیداوار کے ایک حصے سے مستقل یا عارضی طور پر مستفید ہونے کا حق دیا گیا مگر ملکیت کے حقوق نہیں ملتے تھے۔

۱۷۔ کسب کی آزادی: اسلامی ریاست ہر شخص کو کسب کی آزادی کا حق جائز حدود میں دیتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ:۱۰) خدا کے فضل (رزق) کی تلاش کے لیے زمین میں پھیل جاؤ۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء:۳۲) مردوں کے لیے ان کی کمائی کے موافق حصہ ہے اور عورتوں کے لیے ان کی کمائی کے موافق حصہ ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ يَّرَى الْعَبْدَ مُحْتَرِفًا. (طبرانی بحوالہ کنز الحقائق) اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو کوئی پیشہ کرتے ہوئے دیکھنا پسند کرتا ہے۔

اِسْعَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ السَّعْيَ (مسند امام احمد۔ کنز الحقائق) کوشش کرو کیونکہ اللہ نے تم پر کوشش کرنی فرض کی ہے۔

طَلَبُ الْحَلَالِ جِهَادٌ. حلال روزی کمانا جہاد ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ (کنز العمال) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا فریضہ عبادت کے بعد حلال کمائی کا طلب کرنا بھی ایک فریضہ ہے۔

۱۸۔ مزدور کا حق: ارشاد الٰہی ہے۔ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (الزخرف:۳۲) اور ہم نے ایک کے دوسرے پر

درجے بلند کیے ہیں تا کہ ایک دوسرے سے کام لے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اکتساب کا ایک قانون وضع کر دیا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے سامان روزی کے لحاظ سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے تا کہ ایک دوسرے سے خدمت کے کام لے سکیں اور نظام قائم رہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اعْطُوْا الْاَجِیْرَ اَجْرَهٗ قَبْلَ اَنْ یجفَّ عَرَقُهٗ (ابن ماجہ باب الاجارہ) مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو۔

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ عِزَّ وَجَلَّ ثَلٰثَةٌ اَنَا اَخْصَمُهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَمَنْ کُنْتُ خَصَمَهٗ خَصَمْتُهٗ...... وَبِرَجُلٍ اِسْتَاجَرَا جِیراً اسْتَوْفٰی مِنْهُ وَلَمْ یُوَفِّهٗ (بیہقی کتاب الاجارہ) حضرت ابوھریرہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ کا ارشاد ہے تین قسم کے انسان ایسے ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑا کروں گا اور جس سے میں جھگڑا کروں گا۔ اس کو مغلوب و مقہور ہی کر کے چھوڑوں گا۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو مزدور سے کام تو پوری طرح لیتا ہے اور اس کے مناسب اس کی اجرت نہیں دیتا۔

عَنْ اَبِی سَعِیْدِ الْخُدْرِیْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ نَهٰی عَنِ اسْتِجَارِ الْاَجِیْرِ حَتّٰی یُبَیِّنَ لَهٗ اَجْرَهٗ (بیہقی کتاب الاجارہ) ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ممانعت فرمائی کہ مزدور اور اجیر کو اس کی اجرت طے کیے بغیر کام پر لگایا جائے۔

۱۹۔ امورِ سلطنت میں شرکت کا حق: تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اسلام ہی پہلا دین ہے جس نے عوام کو امور سلطنت میں شریک کیا ہے اسلام سے قبل بادشاہت تھی۔ بادشاہ کا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ اسلام نے اس طرز سلطنت کو مٹا کر ایک جمہوری اور شورائی نظام کی بنیاد رکھی اور امور سلطنت میں عوام کو شریک کیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ (الشوریٰ ۴۲:۳۸) کہ ان کا کام آپس میں شوریٰ سے ہوتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (آل عمران ۳:۱۵۸) اور ان سے (حکومتی کاموں) میں مشورہ لیتے رہا کیجیے۔

فرمایا مَا شَاوَرَ قَوْمٌ اِلَّا هُدُوْا (طبرانی کنوز الحقائق حدیث ۸۷) جس قوم نے باہمی مشورہ کیا اس قوم نے فلاح پائی۔

یَدُ اللّٰهِ عَلَی الْجَمَاعَةِ یعنی جمہور کو اللہ کی تائید حاصل ہے۔

۲۰۔ معصیت سے اجتناب کا حق: کوئی حاکم کسی کو اللہ کی نافرمانی پر مبنی حکم دینے کا مجاز نہیں۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں۔'' (کنز العمال)

امراء کی اطاعت اس وقت تک واجب ہے جب وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کا حکم نہ دیں جب خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے اور نہ ماننا۔ (بخاری ۵۶:۱۰۸)

۲۱۔ معاہدہ: ہر شہری کو حق حاصل ہے کہ قانون کے مطابق کسی دوسرے شہری سے معاہدہ کر کے کاروبار کر سکتا ہے اگر کوئی فریق معاہدے کی شرائط پوری نہیں کرتا تو قانون اس کو جبراً پورا کرنے پر مجبور کر سکتا ہے اس کا معاوضہ دلوا سکتا ہے۔ اگر معاہدے کی تکمیل کا احترام نہ کیا جائے تو سارا اقتصادی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس لیے اسلام نے معاہدات کی پابندی پر بہت زور دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (مائدہ ۵:۱) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے عہد کو پورا کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں لَادِیْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ (احمد۔ طبرانی) جس میں عہد کا پاس نہیں اس کا دین نہیں۔

۲۲۔ عمل غیر کی مسولیت سے برأت کا حق: دور حاضر میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ مجرم روپوش ہو جاتا ہے اور مجرم کے مرد و زن کو پکڑ لیا جاتا ہے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ مجرم کی جگہ کسی غیر مجرم کو پکڑ لیا جائے۔ قرآن مجید میں ضابطہ مقرر ہوا ہے۔ وَلَا تَکْسِبُ کُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (الانعام ۶:۱۶۴) ہر شخص جو کچھ کماتا ہے وہ خود اس کا ذمہ دار ہے کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

لَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ (البقرہ ۱۹۳) نہ کسی پر زیادتی ہو سوائے ظالم کے۔

۲۳۔ قومی دفاع: جس طرح عوام کا یہ حق ہے کہ حکومت ان کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کرے اور پرُامن زندگی بسر کریں۔ اسی طرح عوام اپنی حکومت سے یہ بھی امید رکھتے ہیں کہ وہ بیرونی دشمنوں سے ان کی حفاظت کرے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب مدینہ میں مدنی ریاست کی بنیاد رکھی تو سب سے پہلے اس ریاست کے دفاع کا بندوبست کیا۔ یہود سے پرُامن رہنے کو کہا۔ لڑائی میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے کا وعدہ کیا۔ اردگرد قبائل سے بھی معاہدے کیے۔ دشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کے لیے باہر دستے بھیجنے شروع کر دیے۔ قرآن مجید نے اس اہم قومی ذمہ داری کے متعلق فرمایا ہے یٰاَیُّهَا

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا (ال عمران ۳:۱۹۹) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو صبر کرو اور مقابلہ میں بڑھ کر صبر دکھاؤ اور سرحدوں کی حفاظت کرو۔

دوسری جگہ آتا ہے اَعِدُّوْا مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (الانفال ۸:۶۰) اور جو کچھ طاقت اور گھوڑوں کے سرحدوں پر بندھے رکھنے سے تم سے ہو سکے ان کے لیے تیار رکھو تم اس کے ساتھ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوف زدہ رکھو اور ان کے سوائے اوروں کو بھی جنھیں تم نہیں جانتے اللہ ان کو جانتا ہے۔

اسلامی حقوق انسانی کی اہمیت دور حاضر کے تناظر میں: جب یورپ طبقاتی تقسیم میں بٹ گیا حقوق انسانی پامال ہونے لگے۔ صنعت وحرفت نے جاگیرداری کی جگہ لے لی۔ تو مزدوروں میں بیداری پیدا ہوئی۔ تو حقوق انسانی کے لیے مختلف ممالک میں آوازیں اٹھنی شروع ہوئیں۔ وہ تحریکیں بھی انسانی حقوق کے تعین میں اس کمال تک نہیں پہنچیں۔ جس کمال تک اسلام پہنچا تھا بلکہ یوں کہہ لیجیے اس دور کی تحریکات اسلام کے ہی مقرر کردہ حقوق انسانی کی بازگشت ہیں۔ سب سے پہلے ۱۲۱۵ء میں انگلینڈ کے شہنشاہ جان نے ایک دستور جاری کیا جس کا نام میگنا کارٹا ہے۔ جس کا مقصد صرف وہاں کے امراء کی بغاوت کو فرو کرنا تھا۔ اس میں عام انسانوں کے حقوق کی کوئی خاص واضح اور ٹھوس تجویز یا سفارش نہیں تھی۔ اس کی کل تریسٹھ دفعات ہیں بہرحال منشور میں ایک حد تک انسانی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی گئی۔

امریکہ کا اعلان ورجینیا ۱۸۷۶ء میں اس اعلان کے ذریعہ یہ کیا گیا کہ تمام انسان مساوی درجہ لے کر پیدا ہوئے۔ انھیں زندہ رہنے کا حق ہے دیگر حقوق میں قانونی تحفظ جائیداد رکھنے کا حق معقول اجرت کا حق تعلیم تحریر و تقریر اور اظہار رائے کا حق انجمن سازی سیاسی آزادی اور حصول مسرت کے اہم حقوق شامل ہیں۔

انسانی حقوق کا فرانسیسی اعلان: ۱۸۸۹ء میں انسانی حقوق کا اعلان فرانس میں ہوا۔ اس کی بین الاقوامی کوئی اہمیت نہیں۔ صرف انقلاب فرانس کے مقاصد کا منظر ہے۔

اقوام متحدہ اور انسانی حقوق: اقوام متحدہ نے ۱۹۴۸ء میں تیس نکات پر مبنی انسانی حقوق کا عالمی منشور جاری کیا۔ اس میں اقتصادی معاشرتی' دیوانی' سیاسی اور قانونی حقوق کی علیحدہ علیحدہ جو دستاویزات منظور ہوئیں شامل ہیں۔ اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق اس ادارہ کا فرض ہے کہ وہ بنیادی حقوق کی پاسداری کرے اور عمل کرائے تاکہ انسانی وقار دنیا میں بحال ہو سکے۔

اگر ان تحریکات کے منشوروں کا مطالعہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ اسلامی منشور کا مطالعہ کریں تو ہر قاری پر واضح ہو جائے گا کہ اسلام نے آج سے چودہ سو سال قبل جس بلندی پر انسانی حقوق کا اعلان کیا تھا اس دور کی تحریکوں کے منشور ابھی بہت پیچھے ہیں۔ اسلامی منشور کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو منشور پیش کیا اس پر خود عمل کیا اور عمل کروایا۔ مثلاً اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حق مساوات کا اعلان کرتے ہیں تو حضرت بلال' حضرت سلمان' حضرت صہیب رومی' حضرت خباب بن الارت' عمار بن یاسر کا مقام اسلامی ریاست مدینہ اور اسلامی معاشرہ میں کسی رئیس مہاجر اور کسی رئیس انصاری سے کم نہیں اسلام نے غلاموں کو بھی وہی حقوق دیے ہیں۔ جو ایک معزز خاندان کے آزاد فرد کو حاصل تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب مسلمانوں میں مواخات کروائی تو حضرت زید بن حارث (آزاد کردہ غلام) کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عزیز چچا حضرت امیر حمزہ کا بھائی بنا دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وفات سے قبل روم کی سرحدوں کے دفاع کے لیے ایک لشکر تیار کیا۔ اسکا قائد اسامہ مقرر کیا۔ اس لشکر میں قریش کے بڑے بڑے رئیس شامل تھے۔

غرض کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس انسانی حقوق کی تعلیم دی ان پر عمل کیا اور عمل کرایا۔ دوم ان تحریکات کے منشوروں کا ماخذ اسلامی منشور ہے جس کا نفاذ آج سے چودہ سو سال قبل ہو چکا ہے۔

بیت المال کی حفاظت: اسلامی ریاست کا یہ فرض ہے کہ بیت المال کی حفاظت کریں اور حکمران ناجائز طریقہ سے اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ نہ کریں کیونکہ بیت المال قومی ملکیت ہے اس میں ناجائز تصرف نہیں ہونا چاہیے۔ خلفاء راشدین کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں انھوں نے بیت المال سے اتنا ہی وظیفہ لیا جتنی ضرورت تھی۔ ارشاد الٰہی ہے۔

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ (یوسف ۱۲:۵۵) یوسف نے کہا مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کر دو میں نگہبان اور خبردار ہوں۔

اسلامی حکومت میں اقلیّت

اسلامی حکومت کے اعتبار سے اقلیتوں کی دو قسمیں ہیں۔

ایک وہ معاہد جو مصالحت یا معاہدے کے ذریعہ اسلامی حکومت کے ماتحت آتے ہیں۔ ان کو اسلامی اصطلاح میں معاہد یا ذمی کہا جاتا ہے۔ یہ غیر مسلم رعایا جزیہ دیتی ہے اور اسلامی حکومت کی رعایا بننا منظور کرتی ہے۔

دوم: اہل العنوۃ یعنی جولڑائی میں شکست کھا کر مغلوب ہوتے ہیں۔

غیر مسلم رعایا کے حقوق

معاہدات کی پابندی: اسلام نے معاہدات کو دیانت داری کے ساتھ نبھانے کی تعلیم دی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ اَوْفُوا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلاً (بنی اسرائیل ۱۷:۳۴) اے مسلمانو! تم اپنے عہد کو پورا کرو کیونکہ عہدوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔

دوسری جگہ آتا ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَالَكُمْ مِنْ وَلَايَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيْثَاقٌ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (الانفال ۸:۷۲) اور وہ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت نہیں کی۔ تم پر ان کی دوستی کا کوئی حق نہیں یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اور اگر تم سے دین کے متعلق مدد چاہیں تو تم پر مدد دینا فرض ہے سوائے اس کے کہ یہ مدد ان لوگوں کے خلاف نہ ہو جن کے اور تمھارے درمیان عہد ہے۔ اللہ جو تم کرتے ہو اسے دیکھتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں معاہدہ کی پابندی کا اس قدر تاکیدی حکم دیا ہے کہ اگر اسلامی حکومت کا کسی غیر مسلم قوم کے ساتھ معاہدہ ہو اور پھر اس غیر مسلم معاہدہ کے خلاف کوئی دوسری مسلمان قوم اسلامی حکومت سے مدد طلب کرے تو وہ معاہد قوم کے خلاف ہرگز مدد نہ کرے اور اپنے عہد پر قائم رہے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ فاتح شام کو لکھا۔

وَامْنَعِ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ ظُلْمِهِمْ وَالْاِضْرَارِ لَهُمْ وَاَكْلِ اَمْوَالِهِمْ اِلَّا بِحِلِّهَا وَوَفِّ لَهُمْ بِشَرْطِهِمُ الَّذِيْ شُرِعَتْ لَهُمْ فِيْ جَمِيْعِ مَا اَعْطَيْتُمْ (کتاب الخراج امام یوسف ص ۸۲ مطبوعہ مصر) مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرنے ان کو نقصان پہنچانے اور ناجائز طور پر ان کا مال کھانے سے روکو ان سے جو شرطیں کی گئی ہیں اور ان سے جو وعدے کیے گئے ہیں ان کو پورا کرو۔

ایک مرتبہ آپ کو معلوم ہوا کہ اہواز کے ذمی بھاگ رہے ہیں تو تحقیقات کے لیے بصرہ سے دس نیک سیرت مسلمان طلب کر لیے ان میں سے ایک احنفؓ بن قیس بھی تھے۔ ان سے پوچھا کہ ذمی مسلمانوں کے ظلم وتشدد کی وجہ سے بھاگ رہے ہیں یا اور کسی وجہ سے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہوا۔ وہ از خود بلا کسی وجہ کے بھاگ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ آپ کی مرضی کے مطابق سلوک کیا جاتا ہے۔

مگر اس بیان سے آپ کو اطمینان قلب نصیب نہ ہوا تو عتبہ بن غزوان والی بصرہ کو لکھا کہ:۔

"لوگوں کو ذمیوں کے ساتھ جور وظلم سے روکو اور اس سے ڈرو اور محتاط رہو ایسا نہ ہو کہ تمہاری بدعہدی یا ظلم کی وجہ سے حکومت تم سے چھین لی جائے خدا نے تم کو اس وعدہ پر حکومت عطا کی ہے۔ اس لیے اس عہد کو پورا کرو اور اس کے حکم اور مرضی پر عمل کرو اس وقت خدا تمہاری مدد کرے گا۔" (طبری جلد ۴ ص ۲۵۴۴)

دشمن کے حملے سے حفاظت: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن قوموں پر جزیہ لگایا تو ان کو یہ لکھ کر دیا کہ اگر دشمن ان پر حملہ کرے گا تو ان کی طرف سے مدافعت کی جائے گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں: یمنعوا۔ (فتوح البلدان ص ۵۹)

مذہب کی آزادی: ذمی اپنی بستیوں میں مذہبی فرائض بجا لانے میں آزاد ہوں گے اور ان کے مذہبی حقوق پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی جائے گی۔

قرآن مجید میں آتا ہے:۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (بقرہ ۲:۲۵۶) یعنی دین میں کوئی جبر نہیں۔

ابوعبید نے تلوار کے ذریعہ فتح کیے ہوئے مقامات کی فہرست دینے کے بعد لکھا: کہ "سارے مقامات بزور شمشیر فتح ہوئے اور ان میں ان کے باشندوں کو ان کے مذہب وشریعت کی پوری آزادی کے ساتھ بسنے کی اجازت دی گئی۔" (کتاب الاموال ابوعبیدہ صفحہ ۱۵۵)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں حیرہ کی فتح کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید نے جو اہل حیرہ سے معاہدہ کیا اس میں لکھا:۔ لَا يُهْدَمُ لَهُمْ بَيْعَةٌ وَلَا كَنِيْسَةٌ وَلَا يُمْنَعُوْنَ مِنْ ضَرْبِ النَّوَاقِيْسِ وَلَا مِنْ اِخْرَاجِ الصُّلْبَانِ فِيْ يَوْمِ عِيْدِهِمْ.. (کتاب الخراج ص ۸۴) ان کی خانقاہیں اور گرجے پیوند خاک نہیں

کیے جائیں گے۔ نہ ان کے عید کے دن ان کو ناقوس بجانے اور صلیبیں نکالنے سے روکا جائے گا۔

شام کے پادری کو یہ ضمانتیں دیں۔

وَلاَ یُهْدَمُ لَهُمْ بَیْعَةٌ وَلاَ كَنِیْسَةٌ وَعَلَى اَنْ یَضْرِبُوا اَنْوَاقِیْسَهُمْ فِی اَیِّ سَاعَةٍ شَاؤُا مِنْ لَیْلٍ اَوْنَهَارٍ اَلاَّفِی اَوْقَاتِ الصَّلٰوةِ وَعَلٰى اَنْ یَخْرِجُوا الصُّلْبَانَ فِی اَیَّامِ عِیْدِهِمْ۔ (کتاب الخراج صفحہ ۸۶) ان کی خانقاہیں اور گرجے نہ ڈھائے جائیں گے۔ وہ نماز کے اوقات کے علاوہ رات دن جب چاہیں ناقوس بجاسکتے ہیں اور عید کے موقع پر صلیبیں نکال سکتے ہیں۔

ابو عبیدہؓ فاتح شام نے اہل شام کو عبادت خانوں کے تحفظ کی پوری ضمانت دی۔ وَاشْتَرَطَ عَلَیْهِمْ حِیْنَ دَخَلَهَا اَنْ یَّتْرُکَ كَنَائِسَهُمْ وَبِیَعُهُمْ۔ (کتاب الخراج صفحہ ۸۰) حضرت ابو عبیدہؓ نے اہل شام سے وعدہ کیا کہ ان کی خانقاہیں اور گرجے برقرار رکھے جائیں گے۔

جان کی حفاظت: اسلام نے اقلیتوں کی جان مسلمانوں کی جان کے برابر قرار دی ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کرے گا تو قاتل کو مقتول کے قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔ اگر مقتول کے ورثاء قصاص لینے کی بجائے خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں تو قاتل کو خون بہا دینا ہوگا۔ بیہقی میں روایت ہے کہ عہد نبوی میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا۔ مقدمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا۔ تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ مجھ پر ذمی کے عہد کو پورا کرنے کی زیادہ ذمہ داری ہے اور مسلمان کو قصاص میں قتل کر دیا۔ (سنن بیہقی جلد ۸ صفحہ ۳۰، ۳۱)

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے کسی ذمی کو قتل کر دیا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا۔ (بخاری احمد)

قبیلہ بکر بن وائل کے ایک مسلمان نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر دیا حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے لکھ بھیجا کہ "قاتل مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے۔" چنانچہ قاتل حنین نامی ایک شخص کو جو مقتول کے ورثاء میں سے تھا سپرد کر دیا گیا اور اس نے اس کو قتل کر دیا۔ (زیلعی تخریج ہدایہ مطبوعہ دہلی صفحہ ۳۳۸، ۳۳۹)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔ من کان له ذمتنا فدمه کدمنا و دیته کدیتنا. یعنی جو ذمی ہیں ان کا خون ہمارا خون ہے اور ان کا خون بہاء ہمارا خون بہا ہے۔

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ایک مسلمان شاان نے شام کے ایک قبطی کو قتل کر دیا مقدمہ حضرت عثمانؓ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ نے قاتل کو قتل کرنے کا حکم دیا لیکن حضرت زبیرؓ بن عوام اور بعض دوسرے صحابہ کی سفارش پر قصاص معاف کرایا اور مقتول کے ورثاء کو مسلمان کی دیت کے برابر ایک ہزار دینار دیت دلوائی۔ (سنن بیہقی جلد ۸ صفحہ ۳۳)

امام شعبیؒ، نخعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں:

"اقلیت کا قاتل اگر مسلمان بھی ہو اس کو قصاص میں قتل کیا جائے گا۔"

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے عہد میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا تو آپ نے مسلمان کو ذمی کے ورثاء کے سپرد کر دیا کہ وہ چاہیں معاف کر دیں چاہیں قصاص میں قتل کر دیں۔ انھوں نے قتل کر دیا۔ (نصب الرایہ جلد ۴ صفحہ ۳۳۷)

مال کی حفاظت: ذمی کی جان کی حفاظت کی طرح اس کے مال کی حفاظت بھی اسلامی حکومت کے ذمہ ہے۔ ذمیوں کے قبضہ میں جس قدر زمینیں تھیں انھیں کی تحویل میں رہنے دیں اگر خلیفہ کو مسجد یا اور کسی عمارت کی غرض سے زمین لینے کی ضرورت ہوتی تو معاوضہ دے کر لی جاتی تھی۔

جب عراق فتح ہوا تو صحابہ کی رائے تھی کہ ان کی اراضی مجاہدین میں تقسیم کر دی جائے لیکن حضرت عمرؓ کی یہ رائے تھی کہ زمینداروں اور کاشتکاروں کی تحویل میں رہنے دی جائے۔ کئی دن بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ آخر کار یہ ٹھہرا کہ مہاجرین اور انصار سے مشورہ کیا جائے۔ چنانچہ ایک اجتماع ہوا۔ انصار میں سے دس آدمی اپنے اپنے قبیلہ کی طرف سے حاضر ہوئے اور بڑے بڑے مہاجرین صحابہ یعنی حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ حضرت طلحہؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی موجود تھے۔ حضرت عمرؓ نے کھڑے ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ حضرت بلالؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف مخالف رہے لیکن عام رائے یہی ہوئی کہ ذمیوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل نہ کیا جائے۔ حضرت بلالؓ قائل نہیں ہوتے تھے لیکن حضرت عمرؓ نے قرآن مجید کی ایک آیت سے استدلال کیا تو ان کو مجبور ہونا پڑا اور تمام صحابہ حضرت عمرؓ کی رائے سے متفق ہو گئے۔ (کتاب الخراج صفحہ ۱۴، ۱۵)

چنانچہ عراق کی کل اراضی زمینداروں کے قبضہ میں رہنے دی گئی۔ ان کو مالکانہ حقوق دے دیے گئے۔ مصر کی اراضی بھی مالکان کے قبضہ میں رہنے دی گئی۔ حکومت بھی بغیر معاوضہ کے ان سے لینے کی مجاز نہ تھی۔

وَلَيۡسَ لَهٗ اَنۡ يَّاۡخُذَ بَعۡدَ ذٰلِكَ مِنۡهُمۡ وَهِيَ مِلۡكٌ لَهُمۡ يَتَوَارَثُوۡنَهَا یعنی امام وقت بھی زمین لینے کا مجاز نہیں ہے وہ کاشتکاروں کی ملک ہے جو ان میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہے گی اور وہ اس کی خرید و فروخت کر سکتے ہیں۔

اگر حکومت کو زمین کی ضرورت پڑتی تو مالک کو معاوضہ دیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک شخص نے دجلہ کے کنارے گھوڑوں کے پالنے کے لیے ایک رمنہ بنانا چاہا۔ آپ نے حضرت ابو موسیٰؓ اشعری کو جو بصرہ کے گورنر تھے لکھا کہ اگر وہ زمین ذمیوں کی نہ ہو اور اس میں ذمیوں کی نہروں اور کنوؤں کا پانی نہ آتا ہو تو سائل کو زمین دے دی جائے۔ (فتوح البلدان صفحہ ۳۵۱)

حضرت عمرؓ جابیہ میں تھے کہ ایک ذمی نے آ کر شکایت کی کہ لوگوں نے اس کا انگوروں کا باغ تباہ کر دیا ہے۔ حضرت عمرؓ تحقیق کے لیے خود وہاں گئے دیکھا کہ ان کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب ڈھال میں انگور لیے جا رہا ہے۔ آپ نے فرمایا اچھا آپ بھی ہیں۔ اس نے جواب دیا یا امیر المومنین بھوک شدت سے لگی ہوئی تھی اس وجہ سے یہ حرکت کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ باغ کے مالک کو اس کے انگوروں کی قیمت ادا کر دی جائے۔ (کتاب الموال ابو عبیدہ صفحہ ۱۵۱)

تحفظ عزت: اقلیت کی عزت و ناموس کو وہی تحفظ حاصل ہے جس طرح ایک مسلمان کی عزت و آبرو کو۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں حمص کے گورنر حضرت عمیر بن سعد کی زبان سے کسی ذمی کے متعلق اخزاک اللہ (اللہ تجھے رسوا کرے) یہ کلمہ نکل گیا تھا۔ اس پر حضرت عمیر بن سعد کو سخت ندامت ہوئی اور اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور فرمایا کہ اس منصب کے غرور میں مجھ سے یہ گناہ سرزد ہوا ہے۔ لہٰذا یہ عدل و انصاف کے خلاف ہے کہ میں اس منصب پر فائز رہوں (الفاروق)

درالمختار میں لکھا ہے: ''اس کو تکلیف دینے سے باز رہنا واجب ہے اور اس کی غیبت اسی طرح حرام ہے جیسی مسلم کی غیبت حرام ہے۔'' (درالمختار جلد ۳ صفحہ ۲۷۳، ۲۷۴)

ارشاد نبوی ہے: مَنۡ ظَلَمَ مُعَاهِداً اَوۡ انۡتَقَصَهٗ اَوۡ كَلَّفَهٗ فَوۡقَ طَاقَتِهٖ اَوۡ اَخَذَ مِنۡهُ شَيۡئًا بِغَيۡرِ طِيۡبِ نَفۡسِهٖ فَاَنَا حَجِيۡجُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ. جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے یا اس کو نقصان پہنچائے یا اس کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف دے یا اس کی خوشی کے بغیر کچھ لے تو میں اس معاہد کی طرف سے قیامت کے دن حجت کروں گا۔

روزی اور کفاف کا ذمہ: اگر ذمی اپنی روزی کمانے سے عاجز آ جائے تو اس کے گزارے کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کیا جائے گا۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے اپنے عامل عدی بن ارطاۃ کو حکم بھیجا کہ اپنے علاقہ کے ذمیوں کے حالات معلوم کرو جو بوڑھے ہو چکے ہوں اور روزی کمانے کے قابل نہیں رہے تو ان کے گزران کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کیا جائے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے ذمی کو دیکھا کہ در در بھیک مانگتا پھرتا تھا آپ نے اس سے فرمایا ہم نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ جب تم جوان تھے اور کماتے تھے تو ہم نے تم سے جزیہ وصول کیا اب جب تم کمانے کے قابل نہیں رہے اب ہم نے تم کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اس کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ (کتاب الاموال ابو عبیدہ صفحہ ۴۶)

اگر ذمی دشمن کے قبضہ میں آ جائے اور فدیہ دے کر چھڑانے کی ضرورت پیش آئے تو فدیہ بیت المال سے دیا جائے گا۔
(کتاب الاموال ابو عبیدہ صفحہ ۱۲۷)

خالد بن ولیدؓ نے فتح حیرہ کے وقت جو معاہدہ کیا تھا اس میں درج کیا اور میں نے ان کو یہ حق دیا کہ اگر کوئی بوڑھا کام کرنے سے معذور ہو جائے یا اس پر کوئی مصیبت آن پڑے یا پہلے دولت مند تھا پھر مفلس ہو گیا اور اس وجہ سے اس کے ہم مذہب اس کو خیرات دینے لگیں تو اس کا جزیہ موقوف کر دیا جائے گا اور اس کا اور اس کے اہل و عیال کا نفقہ مسلمانوں کے بیت المال سے مقرر کر دیا جائے گا۔ جب تک وہ مسلمانوں کے ملک میں رہے اگر وہ اسلامی ملک سے چلا جائے تو مسلمانوں پر اس کے اہل و عیال کا نفقہ واجب نہ ہو گا۔ (کتاب الخراج از امام ابو یوسف)

اقتصادی آزادی: اسلامی حکومت میں اقلیتوں کو اقتصادی آزادی حاصل ہوتی ہے کمانے اور خرچ کرنے میں مکمل آزادی ہے یہاں تک کہ بعض ایسی چیزوں کی تجارت کرنا جو ایک مسلمان کے لیے حرام ہے۔ اقلیتوں کو اجازت ہے جیسے شراب اور خنزیر کی خرید و فروخت کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

''ان کے لیے شراب جیسے ہمارے لیے سرکہ ہے ان کے لیے خنزیر جیسے ہمارے لیے بکری۔'' (ہدایہ)

یعنی جس طرح ایک مسلمان کے لیے سرکہ اور بکری کی خرید و فروخت اور استعمال حلال ہے اسی طرح اقلیتوں کے لیے شراب اور خنزیر کی بیع و شراء اور

اکل وشرب جائز ہے۔

سیاسی حقوق: اسلامی حکومت میں اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ خلیفہ ملکی امور میں ان سے مشورہ لے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بنیامین نامی مصری قبطیوں کا ایک سردار تھا۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ وہ اپنی قوم میں بااثر شخص ہے تو حضرت عمروؓ بن العاص کو لکھ بھیجا کہ انتظامی امور میں اس سے مشورہ لیں۔

اسی طرح اقلیتوں کے امور میں انہی کی رائے معتبر تصور ہوگی۔ عراق کے انتظام کے وقت وہاں کے قائدین کو مدینہ بلوایا اور ان سے مشورہ لیا۔ ایسا ہی مصر کے اقلیتی لیڈر مقوقس کی رائے لینے کے بعد وہاں انتظامی امور کا فیصلہ فرمایا تھا۔

اقلیتوں کے پرسنل لاء

اسلام نے اقلیتوں کے اپنے مذہبی قانون میں ہر قسم کی آزادی دی ہے اسلامی عدالت میں ان کے قانون کے مطابق ہی فیصلے ہوں گے۔ اہل نجران کے معاہدہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صاف طور پر فرمادیا تھا کہ:

''ان کے خالص مذہبی امور میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔'' (کتاب الاموال)

خلفائے راشدین کے دور میں اس پر عمل ہوتا رہا۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے حضرت حسن بصریؒ سے پوچھا:

''کیا وجہ ہے کہ خلفائے راشدین نے ذمیوں کو محرمات کے ساتھ نکاح' شراب اور خنزیر کے معاملہ میں آزاد چھوڑ دیا ہے۔''

حضرت حسن بصریؒ نے جواب دیا:

''انھوں نے جزیہ دینا اس وجہ سے قبول کیا ہے کہ انھیں ان کے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی دی جائے۔ آپ کا کام انہی کے نقش قدم کی پیروی کرنا ہے۔ اور اپنی طرف سے کوئی نئی بات ایجاد نہیں کرنی ہے۔'' (کتاب الاموال ابوعبیدہ صفحہ ۳۶)

علامہ ابوالحسن ماوردی تحریر فرماتے ہیں:

''انھیں اپنے حقوق اپنے حکام کے پاس لے جانے میں کسی قسم کی ممانعت نہیں کی جاسکتی۔'' (احکام سلطانیہ)

تاریخ سپین کا مصنف لکھتا ہے:

''جن عیسائیوں نے مفتوحہ ملک میں رہنا پسند کیا ان کے مال و جان کی پوری حفاظت کی گئی۔ انھیں پورا حق حاصل تھا کہ اپنے طور پر اپنی عبادت کریں۔ معینہ حدود میں انہی کے قوانین رائج تھے۔ بعض ملکی اور قومی عہدوں پر ان کا تقرر کیا گیا۔ ان کی عورتوں کو اجازت تھی کہ وہ فاتحوں کے ساتھ شادی بیاہ کریں غرض ازروئے قانون ان کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ نہیں کیا جاتا تھا جس سے مفتوح یا غلام معلوم ہوں۔'' (الہارون صفحہ ۲۸۴)

دفاعی نظام اور اقلیت: اصولی طور پر اسلامی حکومت کسی اقلیت کو جبری طور پر فوج میں بھرتی نہیں کرسکتی کیونکہ اسلامی حکومت ان سے ایک دفاعی ٹیکس لیتی ہے اور اقلیت کے ہر فرد کی جان' مال اور ناموس کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ اس دفاعی ٹیکس سے بچے' بوڑھے' عورت اور اپاہج وغیرہ مستثنیٰ تھے۔

اگر اسلامی حکومت ان کی حفاظت نہ کرسکے تو وہ دفاعی ٹیکس واپس کرنا پڑتا ہے۔ حضرت ابوعبیدہؓ کے عہد گورنری میں رومیوں کے ساتھ ایک دفعہ شام کی لڑائی میں مسلمان کچھ پسپا ہو گئے تھے تو اس وقت حضرت ابوعبیدہؓ نے اقلیتوں سے لیا ہوا ٹیکس یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ تمہاری حفاظت کے بدلہ میں یہ لیا گیا تھا۔ اس وقت ہم تمہاری حفاظت نہیں کرسکے اس لیے ہمیں اس کے رکھنے کا کوئی حق نہیں۔

ہاں! جو اقلیت اپنی خوشی سے فوج میں بھرتی ہونا چاہے اس سے یہ جزیہ وصول نہیں کیا جاتا بلکہ اس کو فوجی وظیفہ بھی ملتا ہے۔ معاہدہ آذربائیجان میں یہ واضح طور پر لکھا تھا کہ اقلیت کے وہ افراد جو اسلامی فوج میں حصہ لیں گے ان سے اس سال کا جزیہ نہیں لیا جائے گا۔

امام شافعیؒ لکھتے ہیں کہ اسلامی حکومت میں رہنے والے غیر مسلم باشندے اگر اپنی مرضی سے فوج میں بھرتی ہوں تو حکومت کو ان سے خدمت لینے میں کوئی حرج نہیں اور اس کے عوض ان کو عطیہ یعنی مال غنیمت سے کچھ دیا جائے گا۔ (کتاب الاموال)

سرکاری ملازمت: سرکاری مناصب پر اسلام اقلیتوں کو بھی ان کی صلاحیت کے مطابق ملازمت کا موقع دیتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب اپنے عہد خلافت میں قاہرہ سے بحر احمر تک ایک نالی کھدوائی تھی تو اس وقت ایک ذمی کو انجینئر مقرر فرمایا تھا۔

حضرت سید احمد شہید نے اپنے زمانہ میں ایک ہندو کو اسلحہ خانہ کا نگران مقرر کیا تھا۔

قانون کی نظر میں مساوات: اسلامی حکومت میں مسلمان اور اقلیت قانون کی نظر میں برابر ہیں۔ دنیا میں کوئی ایسی مثال نہیں کہ فاتح قوم نے مغلوب قوم کو قانون میں اپنے برابر قرار دیا ہو۔ یہ امتیاز بھی اسلام کو حاصل ہے۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل نجران کو یہ تحریر فرما دیا تھا کہ ان میں سے اگر کوئی حق کا دعویٰ لے کر حاضر ہو تو اس کے ساتھ غیر جانبدارانہ انصاف کیا جائے گا۔" (کتاب الاموال)

عہد علیؓ مرتضیٰ میں ایک یہودی نے ان کی زرہ چوری کر لی تھی۔ حضرت علیؓ قاضی کی عدالت میں حاضر ہوئے اور ان کے دو گواہ تھے۔ ایک حضرت حسنؓ بن علی اور دوسرے ان کے غلام۔ لیکن قاضی نے باپ کے حق میں بیٹے کی شہادت اور آقا کے حق میں غلام کی گواہی کو مسترد کر دیا اور یہودی کے حق میں فیصلہ صادر فرما دیا۔ یہودی اسلام کے اس عدل و انصاف کو دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔

جزیہ اور خراج وصول کرنے میں نرمی: اسلام جزیہ اور خراج کی وصولی میں سختی سے منع کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے شام کے گورنر حضرت ابو عبیدہؓ کو لکھا:

"مسلمانوں کو ان پر ظلم کرنے اور انھیں ستانے اور ناجائز طریقے سے ان کے مال کھانے سے منع کرو۔" (کتاب الخراج صفحہ ۸۲)

حضرت عمرؓ جزیہ کی وصولی کے بعد خفیہ طور پر تفتیش کرتے تھے کہ ان پر کسی قسم کا دباؤ ڈال کر تو جزیہ وصول نہیں کیا گیا۔

شہریوں کے فرائض اور اسلامی حکومت کے حقوق

سمع و طاعت: اسلامی ریاست کے ہر شہری پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ خلیفہ اور ارباب کار کا حکم مانیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنی اطاعت کے لیے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس طرح اولوالامر کی اطاعت کو رسول کی اطاعت کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ. (النساء ۴:۵۹) اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہیں۔

موطا میں حضرت عبادہؓ بن صامت سے روایت ہے:

بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرِہِ. یعنی ہم سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سمع و طاعت (ماننے اور تعمیل کرنے) کا عہد لیا۔ تنگی فراخی خوشی اور ناخوشی ہر حال میں۔

ایک اور حدیث میں ہے فرمایا: اسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاِنِ اسْتُعْمِلَ حَبْشِیٌّ کَاَنَّ رَاْسَہٗ زَبِیْبَۃٌ (بخاری ۱:۵۴) ''سنو اور اطاعت کرو'' اگرتم پر کوئی حبشی غلام مقرر کردیا جائے۔ جس کا سر کشمش کی طرح ہو جب تک کہ وہ کتاب اللہ کے مطابق تم کو حکم دے۔ (بخاری)

اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَۃُ حَقٌّ مَالَمْ یُؤْمَرْ بِالْمَعْصِیَۃِ فَاِذَا اُمِرَ بِالْمَعْصِیَۃِ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَۃَ (بخاری ۵۶:۱۰۸) اولو الامر کے احکام سننا اور ان کی تعمیل کرنا واجب ہے جب تک کہ وہ معصیت کا حکم نہ دے جب برائی کا حکم دیا جائے تو پھر اس کا نہ سننا جائز ہے اور نہ اس کی تعمیل کرنا۔

اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَۃُ عَلَی الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِیْمَا اَحَبَّ وَاَکْرَہَ مَالَمْ یُؤْمَرْ بِمَعْصِیَۃٍ فَاِذَا اُمِرَ بِمَعْصِیَۃٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَۃَ. (بخاری کتاب الاحکام) ہر مسلمان پر امراء کی اطاعت ضروری ہے جب تک کہ وہ برائی کا حکم نہ دے جب برائی کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے اور نہ ماننا۔

قانون کی پابندی: قانون کی تابعداری ہر شہری کا فرض ہے۔ اس کے بغیر نہ ملک میں امن قائم رہ سکتا ہے اور نہ معاشرہ کی عمارت صحیح بنیادوں پر کھڑی ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا (الاعراف ۷:۸۵) یعنی زمین میں اس کی اصلاح ہو جانے کے بعد فساد نہ کرو۔

فساد ہمیشہ قانون شکنی سے پیدا ہوتا ہے گویا فساد قانون شکنی کا دوسرا نام ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَادُّوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ اُولٰٓئِکَ فِی الْاَذَلِّیْنَ (المجادلہ ۵۸: ۲۰) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگ ہیں۔

تعاون: انسان مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کا محتاج ہے اگر باہمی تعاون کے ساتھ انسان ایک دوسرے کی ضروریات اور احتیاجات کو پورا نہ کریں تو سوسائٹی میں فساد برپا ہو جائے اور ایک دوسرے کی زندگی اجیرن ہو جائے۔ اس وجہ سے سوسائٹی کو برقرار رکھنے کے لیے ایک دوسرے کا تعاون ضروری ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی (المائدہ ۵:۲) نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو۔

وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ ۵:۲) اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلامی سوسائٹی کے افراد کو ایک عمارت سے تشبیہ دے کر فرماتے ہیں:

اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ کَالْبُنْیَانِ یَشُدُّ بَعْضُہٗ بَعْضًا شَبَّکَ بَیْنَ اَصَابِعِہٖ. (بخاری کتاب الادب) ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایسا ہے جیسا کہ عمارت کی اینٹیں ایک جز دوسرے جز کو قوت دیتا ہے۔ پھر اپنی انگلیوں کو ملا کر مثال بتائی۔ اور پھر فرمایا:

تَکَاتَفُوْا وَلَا تَعَاصَیَا وَیَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا. (کنوز الحقائق صرف التاء) مل کر رہو ایک دوسرے کے خلاف نہ رہو۔ آسانی کرو اور تنگی مت کرو۔

قربانی (ٹیکس کی ادائیگی): حکومت کا انتظام چلانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مالی حالت مضبوط ہو اور حکومت خرچ پورا کرنے کے لیے ٹیکس لگاتی ہے ہر شہری کا یہ فرض ہے کہ وہ ٹیکس ادا کرے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

يَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ. (البقرہ ۲۱۹.۲) وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں کہہ جو ان کی ضرورت سے بچ جائے وہ سب خرچ کرو۔

امن کا قیام: اچھے شہری کا صرف یہ کام نہیں ہے کہ وہ خود قانون کی تابعداری کرے بلکہ اس سے یہ بھی امید ہوتی ہے کہ وہ خود قانون کی تابعداری کرے بلکہ اس سے یہ بھی امید ہوتی ہے۔ وہ حکومت کی قوانین کے نفاذ میں مدد کرے اور قانون شکنی کرنے والوں کی سرکوبی کے لیے حکومت کا ہاتھ بٹائے۔ جب تک ہر شہری ملک کے قانون کا محافظ نہیں ہوتا۔ اس وقت تک ملک میں امن قائم نہیں ہوسکتا۔

فوجی خدمات: مملکت کا تحفظ سب سے اہم فریضہ ہے۔ اس وجہ سے ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ بیرونی حملہ کے وقت ملک کے دفاع میں ہر ممکن کوشش کرے اور بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار رہے۔ قرآن میں آتا ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ. (الانفال ۸:۶۰)
اور جو کچھ طاقت گھوڑوں کے سرحدوں پر باندھ رکھنے سے تم سے ہو سکے ان کے لیے تیار رکھو تم اس کے ساتھ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوف زدہ رکھو۔

مَالَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ. (توبہ ۹:۳۸) تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم کو خدا کی راہ میں نکلنے کے لیے کہا جاتا ہے تو تم زمین پر جم جاتے ہو۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ. (البقرہ ۲:۱۹۰) اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔

تعلیم وصحت: ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھے تعلیم کے ساتھ ان میں سیاسی اور تمدنی شعور پیدا ہوتا ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ. (الزمر: ۹) کہہ دیجئے کیا علم والے اور جہل برابر ہو سکتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ. (مشکوٰۃ بروایت بیہقی) یعنی ہر مسلم مرد اور عورت پر علم کا حاصل کرنا فرض ہے۔

دستور اساسی

دستور اساسی کے معنی: انگریزی لفظ (Constitution) کے لغوی معنی جسمانی ساخت ہوتے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں، دستور اساسی (Constitution) سے مراد وہ منظور شدہ قواعد وضوابط ہیں جن کے مطابق حکومت کا انتظام و انصرام ہوتا ہے۔

ارسطو دستور کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے:

''کہ دستور اساسی اس اصول کو کہتے ہیں جس کے مطابق حکومت کا ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے۔''

گرٹ (Guret) کہتا ہے:

''مملکت کا دستور اساسی ان بنیادی اصولوں کا مجموعہ ہے۔ جو حکومت کی نوعیت کا تعین کرتے ہیں۔ بنیادی اصولوں میں وہ طریقہ جس کے ذریعہ مملکت کی تنظیم ہوتی ہے۔ مختلف اعضائے حکومت (Organs of Government) کے درمیان اختیارات کی تقسیم اور فرائض حکومت انجام دینے کا طریقہ کار شامل ہے۔''

دوسری جگہ کہتا ہے:

''دستور اساسی ان چند انقلابی اصولوں پر خاص طریقے سے پاس کیے ہوئے رسوم ورواج کے مجموعہ کو کہتے ہیں جن کے مطابق مملکت کی تنظیم ہوتی ہے۔''

برائس (Bryce) کہتا ہے:

''کسی قوم یا مملکت کا دستور اساسی ان قوانین وضوابط پر مشتمل ہوتا ہے جو حکومت کی نوعیت شہریوں اور حکومت کے حقوق وفرائض کا تعین کرتے ہیں۔''

پروفیسر ووکے (Prof Wookey) کہتا ہے:

''دستور اساسی ان اصولوں کا مجموعہ ہے جن کے مطابق حکومت کا اختیار رعایا کے حقوق اور دونوں کے مابین جو تعلق ہے ان کی ترتیب و تنظیم کی جاتی ہے۔''

پروفیسر ڈائسی (prof Dicy) کہتا ہے:

''دستور اساسی ان قاعدوں کو کہتے ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ حکومت کے اختیارات اور فرائض پر اثر انداز ہوتے ہیں۔''

ان مفکرین کی تعریفات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دستور اساسی مملکت کے وہ بنیادی اصول ہیں جس کے ذریعہ حکومت کی مشینری چلتی ہے اور ملک کے دوسرے ضمنی قوانین اسی کی روشنی میں وضع کیے جاتے ہیں۔

اسلامی حکومت کا دستور اساسی قرآن مجید ہے۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تقریباً تیئس سال تک نازل ہوتا رہا۔

دستور اساسی کی اہمیت: سیاسی نقطہ نگاہ سے دستور اساسی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ کوئی حکومت دستور اساسی کے بغیر چل نہیں سکتی۔ اس سے ملک میں امن و امان قائم رہتا ہے۔ لوگ آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں وہ شہریوں کے حقوق وفرائض متعین کرتا ہے عمال حکومت کے اختیارات اور فرائض پر روشنی ڈالتا ہے۔

دستور اساسی کے بغیر ملک میں طوائف الملوکی پھیل جاتی ہے ہر طرف فساد اور لاقانونیت کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ ہر شہری کی جان و مال اور عزت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اس وجہ سے ہر حکومت کے لیے ایک دستور اساسی ہونا ضروری ہے۔ جس کے بغیر وہ چند دن بھی چل نہیں سکتی۔

اسلامی دستور کی بنیادیں

ا۔ حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ. (یوسف ۱۲:۴۰) حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ. (آل عمران ۳: ۲۶) کہہ اے اللہ ملک کے مالک تو جسے چاہے بادشاہت دے اور جس سے چاہے چھین لے۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف ۷:۵۴) خبردار اسی کی پیدائش ہے اور حکم بھی اسی کا ہے۔

علامہ آمدی اصول فقہ کی مشہور کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں رقم طراز ہیں:

اِعْلَمْ اَنَّهُ لَا حَاكِمَ سِوَى اللّٰهِ وَلَا حُكْمَ اِلَّا مَاحَكَمَ بِهِ جان لو کہ حاکم اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے حکم وہی ہے جو اللہ نے دیا ہے۔

شیخ محمد خضری اصول فقہ میں لکھتے ہیں:

اِنَّ الْحُكْمَ هُوَ خِطَابُ اللّٰهِ فَلَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ وَهٰذِهٖ قَضِيَّةٌ اِتَّفَقَ عَلَيْهَا الْمُسْلِمُوْنَ قَاطِبَةً. یقیناً حکم اللہ کے فرمان کو کہتے ہیں پس حکم دینے کا حق صرف اللہ ہی کو حاصل ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

۲۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ. (النساء ۴:۸۰) جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تابعداری کرے تو اس نے اللہ کی تابعداری کی۔

وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر:۷) اور جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم کو دے اسے لے لو اور جس سے تم کو روکے اس سے رُک جاؤ۔

۳۔ حکومت وراثت نہیں ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ. (النور ۲۴:۵۵) اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین پر خلیفہ بنائے گا جیسا کہ انھیں خلیفہ بنایا جو ان سے پہلے تھے۔

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے۔ تمام مسلمان بحیثیت مجموعی حامل خلافت ہوتے ہیں۔ اس پر جمہوریت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ جب حضرت امیر معاویہؓ نے قرآنی تعلیم اور خلفاء راشدین مہدیین کے اسوہ حسنہ سے ہٹ کر یزید کو خلیفہ بنایا تو حضرت امام حسین نے جمہوری نظام اور اسلامی طریقہ حکومت کو قائم رکھنے کی خاطر شہادت پائی۔ اگر کسی ملک میں ایک طاقت ور ادارہ محض طاقت کے بل پر حکومت پر قبضہ جما لیتا ہے۔ اس کے بعد اسی ادارہ کا کوئی دوسرا سربراہ حکومت پر قبضہ کر لیتا ہے وہ بھی ایک لحاظ سے وراثت میں شامل ہوگا۔ اسلام حکومت میں ہر قسم کی وراثت کی نفی کرتا ہے۔

۴۔ شوریٰ: حکومت کے امور باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ. (الشوریٰ ۴۲:۳۸) مسلمانوں کا کام آپس میں مشورے سے ہوتا ہے۔

خطیب بغدادی نے حضرت علیؓ سے یہ روایت نقل کی ہے:

"میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے بعد کوئی معاملہ ایسا پیش آ جائے۔ جس کے متعلق نہ قرآن مجید میں کچھ اترا ہو اور نہ آپ سے کوئی بات سنی گئی ہو فرمایا میری امت میں سے عبادت گزار لوگوں کو جمع کرو اور اسے ان کے سامنے مشورہ کے لیے رکھ دو اور کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔" (روح المعانی)

قرآنی آیت اور حدیث ہر قسم کی آمریت کو رد کرتی ہے اور اسلامی حکومت وہی ہوگی جو عوام کے مشورہ سے تشکیل پائے گی اس کے لیے غیر جانب دارانہ انتخاب ضروری ہیں جو بھی حکومت جانب دارانہ انتخاب یا طاقت کے بل پر قائم ہوگی وہ غیر اسلامی ہوگی۔

۵۔ حکومت صالحین کے سپرد ہو: رئیس مملکت اور حکام وہ لوگ ہوں جو اہل اور صلاحیت رکھتے ہوں۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰى اَهْلِهَا. (النساء ۴: ۵۸) اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کو دو۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ. (الانبیاء ۲۱:۱۰۵، ۱۰۶) اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔ یقیناً اس میں عبادت کرنے والوں کے لیے پیغام ہے۔

لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ. (بقرہ ۲:۱۲۴) میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔

ظالمین سے مراد وہ امرا ہیں جو عوام کی اکثریت رائے سے نہیں آتے محض اپنی طاقت سے حکومت پر قبضہ کرتے ہیں۔

٦۔ بھلائی کا فروغ اور منکرات کا خاتمہ: اسلامی دستور کی اساس معروفات کو فروغ دینا اور منکرات کا خاتمہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ. (الحج ۲۲: ۴۱) وہ جنھیں اگر ہم زمین میں طاقت دیں تو وہ نماز کو قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور اچھی باتوں کا حکم کریں گے اور بری باتوں سے روکیں گے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ حکومت تشکیل سیرت اور رفاہ عامہ اور ضروریات عوام کو پورا کرنے کے لیے معرض وجود میں لائی جاتی ہے۔

۷۔ قرآن اور سنت کی بالادستی: قرآن اور سنت کے خلاف کوئی قانون نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ ارشاد الٰہی ہے:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ هُمْ عَمَّا جَاءَ كَ مِنَ الْحَقِّ. (المائدہ ۵:۴۸) سو ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے اتارا ہے اور اس کو چھوڑ کر جو تیرے پاس حق آیا ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَادُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ فِى الْاَذَلِّيْنَ. (المجادلہ ۵۸:۲۰) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (الانعام ۶:۱۱۵) اور تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف میں کمال کو پہنچ گئی ہے کوئی اس کی باتوں کو بدلنے والا نہیں ہے۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ اسلامی ریاست میں قرآن اور سنت کو ہی بالادستی حاصل ہے اور اس کے خلاف قانون سازی نہیں ہو سکتی۔

۸۔ امیر کی اطاعت: اسلامی دستور میں بھلائی کے کاموں میں امیر کی اطاعت واجب ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ. (النساء ۴: ۵۹) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے صاحب امر کی اطاعت کرو پھر اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ حَقٌّ مَالَمْ يُؤْمَرْ بِالْمَعْصِيَةِ فَاِذَا اُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَطَاعَةَ. (بخاری ۵۶:۱۰۸)

''ایک مسلمان پر سمع و طاعت لازم ہے تاوقتیکہ اسے برائی کا حکم نہ دیا جائے جب اللہ کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو نہ سننا ہے اور فرمانبرداری کرنا۔''

آپ نے فرمایا۔ اِسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاِنِ اسْتُعْمِلَ حَبْشِىٌّ كَاَنَّ رَاْسَهٗ زَبِيْبَةٌ. (بخاری ۱۰:۵۴) سنو اور اطاعت کرو اگرچہ ایک حبشی حاکم بنایا گیا ہو جس کا سر گویا کہ کشمش کا دانہ ہو۔ فرمایا اَلطَّاعَةُ فِى الْمَعْرُوْفِ (بخاری ۶۴:۶۱) فرمانبرداری صرف نیک کاموں میں ہے۔

۹۔ عدل: اسلامی دستور عدل کے ہر تقاضے کو پورا کرتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے کہ:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (المائدہ ۵:۸) اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو انصاف کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''جب تیرے سامنے دو فریق اپنا معاملہ لے کر آئیں تو ان کا فیصلہ نہ کر جب تک کہ دوسرے کی بات بھی نہ سن لے جس طرح پہلے کی سنی ہے۔'' (ابوداؤد، ترمذی)

اسلام میں کوئی شخص بغیر عدل کے قید نہیں کیا جا سکتا۔ (موطا)

عدل میں سب سے اہم باتیں جان، مال اور عزت کی حفاظت ہے۔ اس کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: اِنَّ دِمَاءَ كُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا (بخاری کتاب الحج) تمہاری جانیں اور تمھارے مال اور تمھاری آبروئیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت یعنی حج کے دن کی۔

۱۰۔ مساوات: اسلامی دستور کی اساس مساوات ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس ۱۰:۱۹) اور سب لوگ ایک ہی گروہ ہے۔ سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ. (المومنون ۲۳:۵۲) اور کہ یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں سو

میر اتقویٰ کرو۔
یَاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً. (النساء۴:۱) اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔
اِنَّ الْعِبَادَ كُلُّهُمْ اِخْوَةٌ. (اخرجہ احمد۔ ابوداؤد) انسان آپس میں سب بھائی بھائی ہیں۔

۱۱۔ ضروریات زندگی بہم پہنچانا: قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا. (ہود ۱۱:۶) زمین میں کوئی جاندار نہیں مگر اللہ کے ذمہ اس کا رزق ہے۔ نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا. (الزخرف ۴۳:۳۲) ہم نے ان کے درمیان ان کی دنیا کی زندگی میں ان کی روزی تقسیم کی ہے۔
وَفِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ. (الذاریات ۵۱:۱۹) اور ان کے مالوں میں سے سوالی اور نہ مانگنے والے محتاج کا حق ہے۔
مَا اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ. (الحشر ۵۹:۷) اور اللہ ۔ اپنے رسول کو بستیوں والوں سے مال غنیمت دلایا تو وہ اللہ کے لیے اور رسولؐ کے لیے اور قریبیوں کے لیے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ تم میں سے دولت مندوں کے اندر نہ پھرتا رہے۔

۱۲۔ یُسر: اسلامی دستور کی بنیاد یُسر پر ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ یُسْرٌ۔
قرآن مجید میں آتا ہے:
لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا. یعنی اللہ کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر مشقت میں نہیں ڈالتا۔

۱۳۔ امن کا قیام: اسلامی دستور کی بنیاد امن کا قیام ہے۔ اسلام کا لفظ خود سلامتی اور امن کے قیام کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ جس دستور میں امن قائم کرنے کے متعلق وضاحت موجود نہیں ہے وہ اسلامی دستور نہیں کہلا سکتا۔ ارشاد الٰہی ہے:
وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (الانفال ۸:۶۱) اگر وہ صلح کی طرف مائل ہو جائیں تو تم بھی جھک جاؤ قرآن مجید میں بیت اللہ کے متعلق کہا گیا ہے:
وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا. (آل عمران ۳:۹۷) جو وہاں داخل ہوا امن والا ہو گیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی:
رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا. (البقرہ ۲:۱۲۶) اے میرے رب اس شہر کو امن والا شہر بنا۔
یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ اسلام امن کا نصب العین پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا ہے وہ بھی امن قائم کرنے اور فساد اور فتنہ کو مٹانے کے لیے ہے۔

۱۴۔ اشاعت اسلام: اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے لہٰذا اشاعت اور تبلیغ اسلامی دستور کا ایک اہم جزو ہے ارشاد الٰہی ہے:
كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ. (آل عمران ۳:۱۱۰) تم بہترین امت ہو جو سارے انسانوں کے فائدے کے لیے پیدا کی گئی ہو تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔
هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ. (التوبہ ۹:۳۳) وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایات اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو کل دینوں پر غالب کرے۔

۱۵۔ سرحدوں کی حفاظت: جس طرح اسلامی دستور ملک کے اندر امن کے قیام کا داعی ہے۔ اسی طرح ملک کی سرحدوں کی حفاظت ضروری قرار دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:
وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ. (الانفال ۸:۶۰) اور جو کچھ طاقت اور گھوڑوں کے سرحدوں پر باندھ رکھنے سے ہو سکے ان کے لیے تیار رکھو تم اس کے ساتھ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوفزدہ رکھو۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ جَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ اللہ کے راستے میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کا حق ہے۔
اسلام میں جہاد اس وقت فرض ہوتا ہے جب اسلامی حکومت کی سرحدوں کو خطرہ لاحق ہو اور جارح قوت امن کو برباد کرتی ہے۔

۱۶۔ انسانی حقوق کا تحفظ: اسلامی دستور انسانی حقوق کی مکمل حفاظت کرتا ہے۔ جس میں جان، مال اور آبرو، مذہب کا تحفظ اور حریت شامل ہے۔

لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ. (بنی اسرائیل ۱۷:۳۳) اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ۔

لَا تَاْکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ. (البقرہ ۲:۱۸۸) اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ۔

لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ. (الحجرات ۴۹:۱۱) ایک قوم دوسری قوم پر ہنسی نہ کرے۔

لَا اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ. (البقرہ ۲:۲۵۶) دین میں کوئی جبر نہیں۔

وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ (الاعراف ۷:۱۵۷) وہ بوجھوں کو ان سے دور کرتا ہے جو ان پر لدے ہوئے ہیں اور طوق جو ان پر پڑے ہوئے ہیں انھیں دور کرتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں باریک سے باریک غلامی سے آزادی عطا کرنے کا اعلان ہے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَةُ فَکُّ رَقَبَةٍ. (البلد ۹۰:۱۱.....۱۳) سو وہ اونچی گھاٹی پر چڑھنے کی ہمت نہیں کرتا اور تجھے کیا خبر کہ اونچی گھاٹی کیا ہے۔ کسی گردن کو آزاد کرنا۔

انسانی حقوق کی فہرست درج ذیل ہے اور آزادی کے متعلق بحث ''اسلامی حکومت کے اوصاف'' کے زیر عنوان آئے گی۔

انسانی حقوق کی فہرست: ۱۔ شخصی آزادی کا تحفظ۔ ۲۔ عزت و ناموس کی حفاظت۔ ۳۔ حرمت جان یا جینے کا حق۔ ۴۔ نجی زندگی کے تحفظ کا حق۔ ۵۔ مستضعفین کا تحفظ۔ ۶۔ سیاسی کارفرمائی (امورحکومت) میں شرکت کا حق۔ ۷۔ ظلم کے خلاف احتجاج کا حق۔ ۸۔ اظہار رائے کا حق۔ ۹۔ تحفظ ملکیت۔ ۱۰۔ معاشی تحفظ۔ ۱۱۔ حصول انصاف کا حق۔ ۱۲۔ مساوات کا حق۔ ۱۳۔ حصول تعلیم کا حق۔ ۱۴۔ حق حریت کا عقیدہ۔ ۱۵۔ عمل غیر کی مسئولیت سے برات کا حق۔ ۱۶۔ آزادی تنظیم و اجتماع۔ ۱۷۔ آزادی نقل وحرکت اور سکونت کا حق۔ ۱۸۔ حق اجرت و معاوضہ۔ ۱۹۔ ہجرت کا حق۔ ۲۰۔ پناہ لینے کا حق۔ ۲۱۔ ملکیت میں دوسروں کا حق۔

۱۷۔ انفرادی جائیداد کی اجازت: اسلام ذاتی ملکیت بنانے کی اجازت دیتا ہے لیکن جائز طریقوں کے ساتھ۔ اسلام کا دولت کے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ حقیقی ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہی ہے۔ انسان کو اس کا امین بنایا گیا ہے۔ اس لیے اسلام دولت کمانے کی اجازت دیتا ہے لیکن کمانے اور خرچ کرنے پر بعض ضروری پابندیاں عائد کرتا ہے تاکہ دولت انسان اور معاشرے کے لیے مفید ثابت ہو۔ ارشاد الٰہی ہے:

اَنْ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی. (النجم ۵۳:۳۹) انسان کسب معاش کے لیے جو بھی کوشش کرتا ہے۔ اس کا پھل پانے کا مستحق ہے۔

کُلُّ امْرِئٍ بِمَا کَسَبَ رَهِیْنٌ. (الطور ۵۲:۲۱) ہر آدمی اپنے کیے کا ثمرہ پانے کا حق دار ہے۔

لَا تَاْکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ. (البقرہ ۲:۱۸۸) اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ۔

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۲۶) بے جا خرچ کر کے مال کو نہ اڑاؤ۔

وَالَّذِیْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا. (الفرقان ۲۵:۶۷) اور وہ جو جب خرچ کرتے ہیں نہ بے جا خرچ کرتے ہیں اور نہ موقع پر تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ ان دونوں حالتوں کے درمیان اعتدال پر ہے۔

اسلام میں نہ سرمایہ داری جائز ہے اور نہ جاگیرداری۔ ارشاد الٰہی ہے: وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ. (التوبہ ۹:۳۴) اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک عذاب کی خبر دے۔

وَیْلٌ لِّکُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ نِ الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ کَلَّا لَیُنْبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ. (الہمزہ ۱۰۴:۱.....۴) تباہی ہے ہر عیب لگانے والے طعن کرنے والے کے لیے جو مال جمع کرتا ہے اور اسے شمار میں لاتا ہے وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ رکھے گا۔ ہرگز نہیں وہ ضرور حطمہ میں ڈالا جائے گا۔

۱۸۔ تعلیم کا انتظام: اسلامی دستور تعلیم عام کا ضامن ہوتا ہے بلکہ یہ بھی ضروری قرار دیتا ہے۔ اسلامی سلطنت میں ہر شخص علم حاصل کرے۔ علم کے حصول میں کوتاہی کرنے والا قابل مواخذہ ہے کیونکہ انفرادی اور قومی ترقی علم کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ. (البقرہ ۲:۱۲۹) (نبی کے فرائض میں ہے) کہ وہ لوگوں کو کتاب اور حکمت سکھائے۔

قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ. (الزمر ۳۹:۹) کہہ دو کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَةٍ. (سنن ابن ماجہ باب فضل العلماء) علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر فرض ہے۔

۱۹۔ غیر مسلم ریاستوں سے مصالحانہ روابط: غیر مسلم ریاستیں جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے معاند نہ ہوں۔ ان سے مصالحانہ روابط قائم کیے جائیں۔

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَیْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ. (الممتحنہ ۶۰:۸) اللہ تمھیں ان سے نہیں روکتا۔ جنھوں نے تمھارے ساتھ دین کے بارے میں لڑائی نہیں کی اور تمھیں اپنے گھر سے نہیں نکالا کہ تم ان سے احسان کرو اور ان سے انصاف کرو اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

۲۰۔ معاہدات کی پابندی: اسلامی دستور معاہدات کی پابندی لازمی قرار دیتا ہے۔ کیونکہ وہ ہدایت کی پابندی ہی امن عالم کا ذریعہ ہے۔ اس لیے دوسری حکومتوں کے ساتھ کیے ہوئے معاہدات کی پابندی کی جائے گی۔ اگر معاہدہ کو کسی جائز وجہ سے توڑنا مقصود ہو تو پہلے اعلان کیا جائے گا۔

اِلَّا الَّذِیْنَ عٰھَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْکُمْ شَیْئًا وَّلَمْ یُظَاهِرُوْا عَلَیْکُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰی مُدَّتِهِمْ. (توبہ ۹:۴) مگر جن مشرکوں کے ساتھ تم نے عہد کیا پھر انھوں نے تمھارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمھارے خلاف کسی کو مدد دی تو ان کے ساتھ ان کا عہد ان کی مدت تک پورا کر دیں۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ. (الانفال ۸:۵۸) اور تجھے کسی قوم کی دغا بازی کا خوف ہو تو ان کا عہد برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے۔ اللہ دغا بازوں سے محبت نہیں کرتا۔

اقسام قانون

قانون کی دو قسمیں ہیں۔
فوجداری قانون۔ دیوانی قانون۔

حدود: یہ لفظ حد کی جمع ہے جس کے معنی ہیں روک' تقید' امتناع' الحاجز بین الشیئین (دو چیزوں کے درمیان امتیاز کرنے کے ہیں) فقہ میں لفظ حدود ان جرائم کی سزا کے لیے بولا جاتا ہے۔ جن کا ذکر قرآن مجید اور حدیث میں آتا ہے۔

تعزیرات: تعزیر کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ منع کرنا، باز رکھنا، ملامت کرنا، پھر یہ لفظ تنبیہہ اور تادیب کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔ فقہ کی اصطلاح میں یہ لفظ ان سزاؤں پر استعمال ہوتا ہے جو حاکم وقت کے منشاء پر چھوڑ دی گئی ہوں۔

حد اور تعزیر میں فرق

۱۔ حد کو حق اللہ کہا جاتا ہے۔ اس میں بندہ کوئی تصرف نہیں کرسکتا اور تعزیر کو حق العبد کہا جاتا ہے۔ کیونکہ بندہ اسے معاف کرسکتا ہے۔ زیادتی و کمی بھی' موقعہ حالات اور جرم کی نوعیت کے اعتبار سے سزا کی نوعیت بدلی جاسکتی ہے۔

۲۔ حد نابالغ پر واجب نہیں ہے۔ مگر تعزیر جاری کی سکتی ہے۔ ان الحد لا یحب علی الصبی والتعزیر شرع علیه. (ردالمختار ج ۳ ص ۲۴۵)

۳۔ شک کی حالت میں حد کا اجرا ساقط ہو جاتا ہے۔ مگر تعزیر کا اجرا شک کے باوجود جائز ہے۔ ان الحدید یدرأبالشبهات والتعزیر یجب معها. (ردالمختار ج ۳ ص ۲۴۵)

۴۔ حد صرف امام یا قائم مقام امام وقت جاری کرسکتا ہے۔ تعزیر کے لیے یہ قید نہیں۔

حد میں سزا مقرر ہوتی ہے۔ اس میں کمی بیشی نہیں کی جاسکتی۔ تعزیر میں سزا مقرر نہیں ہے اور حالات اور جرم کی نوعیت کے اعتبار سے سزا معاف بھی کی جاسکتی ہے اور کمی بیشی بھی کی جاسکتی ہے۔

احمد اور ابوداؤد میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اقیلوا ذوی الهیئات من عشراتهم الا الحدود (سنن نسائی سنن بیہقی، سبل السلام ج ۴ ص ۵۲، الاحکام السلطانیہ ص ۲۳۸) صاحب اقتدار حدود کے سوا دیگر لغزشوں میں درگزر سے کام لیں۔

والتعزیر لیس فیه تقدیر بل هو مفوض الی رای القاضی لانه المقصود منه الزجرو احوال الناس فیه مختلفة. (ردالمختار علی ہامش الدرالمختار ج ۳ ص ۲۴۷)

حد میں کسی قسم کی سفارش جائز نہیں جب کہ تعزیر کی صورت میں حاکم کے پاس معاملہ لے جانے سے پہلے اور بعد میں سفارش کی جاسکتی ہے مسند احمد میں صفوان بن امیہ کا واقعہ ہے جب ان کی چادر مسجد سے چوری ہوئی تو ان کا مقدمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم فرمایا تو صفوان سفارش کے لیے آئے اور دعویٰ سے دست بردار ہونے لگے تو حضورؐ نے فرمایا میرے پاس مقدمہ لانے سے پہلے آپ نے ایسا کیوں نہ کیا اسی طرح فاطمہ نامی بنی مخزوم کی عورت پر چوری کا مقدمہ تھا اس کے ہاتھ کاٹنے کی حد جاری کی گئی تو اسامہ قریش کی طرف سے سفارش کرنے کے لیے گئے تو سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اقرار کر کے رجوع کر لینا حد میں اثر انداز ہوتا ہے مگر تعزیر میں نہیں حدود نافذ کرنے کے سبب اگر کوئی نقصان ہو جائے تو وہ رائیگاں ہوگا۔ مگر جب تعزیر میں نقصان ہو جائے تو جمہور کے نزدیک بدل دینا واجب ہے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ نے ایک عورت کو خوف زدہ کیا اور اس کے حمل کا اسقاط ہوگیا تو آپ نے دیت دی۔ (الاحکام السلطانیہ ۳۶/۲۳۸، فقہ السنہ ج ۲ ص ۵۹) مگر امام ابوحنیفہ اور امام مالک کی رائے یہ ہے کہ تعزیر کے سبب ہونے والا نقصان رائیگاں ہے کیونکہ دونوں کی اجازت شارع نے دی ہے۔ (ملاحظہ کیجئے ابن عابدین ج ۴ ص ۶۰، الاحکام السلطانیہ ۳۶/۲۳۸، فقہ السنہ ج ۲ ص ۵۹، سبل السلام ج ۴ ص ۵۱)

تعزیر اور تادیب میں فرق: بعض فقہاء کہتے ہیں کہ تعزیر ایسے گناہ کی سزا کو کہتے ہیں جس میں حد نہیں لگائی جاتی اور تادیب اس سے عام ہے یہ گناہ اور بغیر

گناہ کے بھی کی جا سکتی ہے۔ جیسے والد اپنے بیٹے، خاوند اپنی بیوی اور آقا اپنے غلام کو کسی معمولی لغزش پر ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے اس کو تادیب کہا جاتا ہے۔ بعض فقہاء کا یہ کہنا ہے کہ بغیر گناہ کے سزا دینے کو تادیب کہتے ہیں۔ جیسے باپ بیٹے، آقا غلام، خاوند اور بیوی کے درمیان ہو سکتی ہے اور اس کے علاوہ جو سزا ہے وہ تعزیر ہے بعض فقہاء کے نزدیک تعزیر اور تادیب میں کوئی فرق نہیں۔

یہی آخری نظریہ درست ہے کیونکہ ان کے درمیان فرق کرنے کے لیے کوئی دلیل مضبوط نہیں۔

اسلام میں تعزیری سزاؤں کا اصول: اسلام میں تعزیری سزا کا قانون عدل و انصاف پر مبنی ہے اور انسانی فطرت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ غیر جانبدارانہ قانونی عدل و انصاف کے ساتھ رحم کے تقاضے اور مجرم کی اصلاح کو سامنے رکھتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَجَزٰٓءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ. (الشوریٰ ۴۲:۴۰) بدی کا بدلہ اس کی مثل سزا ہے۔ پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ پر ہے۔ وہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ. (البقرہ ۲:۱۹۴) پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم اس کو اسی کے مطابق سزا دو جو اس نے تم پر کی ہے۔ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ. (النحل ۱۶:۱۲۶) اگر تم انھیں بدلہ دو تو اتنا دو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی اور اگر تم صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔

ان آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سزا کا اصل مقصد انصاف اور اصلاح ہے۔ اگر معاف کر دینے سے اصلاح ہوتی ہو تو معاف کرنا بہتر ہے اور اگر معاف کرنے سے معاشرہ میں بگاڑ اور فساد ہوتا ہو تو سزا دینا ضروری ہے۔

مختلف جرموں کی سزائیں

قتل کی سزا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِىَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَىْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَلَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (البقرہ ۲:۱۷۸، ۱۷۹)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو مقتولوں کے بارے میں تم پر قصاص مقرر کیا گیا ہے۔ قاتل آزاد ہو تو آزاد ہی مارا جائے غلام ہو تو غلام اور عورت ہو تو عورت مگر جس کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دی گئی ہے تو عمدگی سے پیروی کرنی چاہیے اور نیکی کے ساتھ اسے ادا کیا جائے۔ یہ تمھارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہے۔ پھر جو کوئی اس کے بعد زیادتی کرے اس کے لیے دردناک عذاب ہے اور تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ اے عقل والو! تاکہ تم بچے رہو۔

اس آیت کریمہ میں حسب ذیل احکام ہیں:

۱۔ قصاص یعنی قاتل کو قتل کی سزا دی جائے۔

۲۔ آزاد قتل کرے تو اس کے بدلہ آزاد قاتل کو ہی قتل کیا جائے اگر غلام قتل کرے تو غلام قاتل کو قتل کیا جائے اور عورت قتل کرے تو عورت قاتل کو قتل کیا جائے۔

۳۔ اگر وارث خون بہا پر راضی ہو جائے تو دیت کا لے لینا جائز ہے۔

قتل بغیر عمد کی سزا: قتل بغیر عمد کی سزا خون بہا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ. (النساء ۴:۹۲)

اور کسی مومن کو شایان نہیں کہ وہ مومن کو قتل کرے مگر غلطی سے اور جو کوئی غلطی سے کسی مومن کو مار ڈالے تو ایک مومن غلام آزاد کرے، اور خون بہا دے جو اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائے۔ سوائے اس کے کہ وہ معاف کر دیں۔ پھر اگر مقتول ایسے لوگوں سے ہو جو تمھارے دشمن ہیں اور وہ مومن ہو تو ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہیے اور اگر ایسے لوگوں سے ہو کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہے تو خون بہا دینا چاہیے۔ جو اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائے اور ایک مومن آزاد کیا جائے۔

اس آیت کریمہ سے حسب ذیل احکام مستنبط ہوتے ہیں:

۱۔ قتل بغیر عمد کی سزا مومن غلام آزاد کرنا اور وارثوں کو خون بہا دینا ہے۔
۲۔ دشمن قوم (جو اسلامی حکومت سے برسر جنگ ہو) سے کوئی مسلمان قتل ہو جائے تو اس کی سزا ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے۔
۳۔ اگر معاہد قوم کے کسی شخص کو غلطی سے قتل کر دیا ہے تو مقتول کے ورثاء کو دیت دینا ہے اور ایک غلام آزاد کرنا ہے۔

ڈاکہ کی سزا: ڈاکوزنی کی سزا کے متعلق ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ. (المائدہ ۵: ۳۳)

ان کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں صرف یہی ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا صلیب پر مارے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف اطراف سے کاٹے جائیں یا ان کو قید کیا جائے۔ یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

اس آیت کریمہ میں چار قسم کی سزائیں بیان فرمائی ہیں:

۱۔ جو لوگ ڈاکے کے ساتھ قتل بھی کرتے ہیں ان کو قتل کیا جائے۔
۲۔ جو قتل و غارت کے ساتھ ملک میں فساد برپا کرتے ہیں انھیں صلیب پر لٹکایا جائے تاکہ ان کی سزا کی تشہیر ہو۔
۳۔ جو لوگ ڈاکہ کے ساتھ لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹتے ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹنے کا حکم ہے۔
۴۔ جو لوگ محض ڈرا دھمکا کر مال لوٹتے پھرتے ہیں انھیں قید کرنے کا حکم دیا ہے۔ یُنْفَوْا فِی الْاَرْضِ کے معنی قید لیے گئے ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور احمد بن حنبلؒ نے ان الفاظ کے معنی قید ہی لیے ہیں۔

چوری کی سزا: سرقہ کی سزا کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے: وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا جَزَآءً بِمَا کَسَبَا نَکَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتُوْبُ عَلَیْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ. (المائدہ ۵: ۳۸، ۳۹)

اور چور مرد اور چور عورت سو ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو یہ اس کی سزا ہے جو انھوں نے کیا ہے اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ پھر جو شخص اپنے ظلم کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے تو اللہ اس پر رحمت سے توجہ کرے گا اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

ہمارے اس دور میں قطع ید کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے تو قطع ید کے معنی ہاتھ کاٹنے کے لیے ہیں۔ دوسرے گروہ نے قطع ید کے مجازی معنی بھی لیے ہیں یعنی ہاتھ روک دینا۔ یہ گروہ کہتا ہے کہ قطع کا لفظ روکنے کے معنی میں عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے مثلاً: تَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ سے مراد رستہ کا روکنا ہے نہ کہ رستہ کا کاٹنا۔ اسی طرح قطع رحم بھی مجازی معنی میں استعمال ہوا ہے اور قَطَعَ لِسَانَهٗ کے معنی میں اسے خاموش کر دیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شاعر نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ہرزہ سرائی کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اقطعوا عنی لسانہ میری طرف سے اس کی زبان کاٹ دو یعنی اسے خاموش کرو۔ یہاں زبان کاٹنے سے مراد زبان روکنا ہے۔

اسی طرح قطع' ید کا معنی یہ ہے کہ چور کے ہاتھ سے معاشرہ کو امن میں لایا جائے خواہ قید کر کے اس کا ہاتھ روک دیا جائے خواہ ہاتھ کاٹ کر روک دیا جائے۔

اگر دونوں آیات پر غور کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ قطع ید کی سزا انتہائی سزا ہے یعنی اگر چور توبہ اور اصلاح نہ کرے اور عادی ہو جائے جس کی وجہ سے معاشرہ کا امن خطرے میں پڑ جائے تو اس چور کی سزا یقینی قطع ید (ہاتھ کاٹنا) ہے۔ نئی تحقیقات نے بھی یہ بات واضح کر دی ہے کہ چور کے دماغ میں چوری کی عادت ایک نیا مرکز چوری کا بنا دیتی ہے۔ جس کا تعلق ہاتھ سے ہوتا ہے۔ ہاتھ کے کٹنے سے وہ مرکز بھی ختم ہو جاتا ہے اور عادت دور ہو جاتی ہے۔

ہاں ایسا چور جس نے کسی مجبوری کے تحت چوری کی ہے اور عادی مجرم نہیں ہے یا کسی معمولی چیز کی چوری کی ہے تو چور کو اصلاح کا موقع دینا چاہیے۔ چور کو اس معمولی چوری کے بدلے حاکم حالات کے مطابق سزا دے سکتا ہے۔ مثلاً قید کر دے یا کوئی اور سزا تجویز کر دے۔

آئمہ مجتہدین کے اجتہاد سے بھی یہی بات ثابت ہے چوری کی سزا میں حد بندی کر دی ہے مثلاً امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دس درہم اور امام شافعیؒ کے نزدیک دینار کے چوتھے حصے سے کم کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں۔ جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا کسی خاص حد تک پہنچ کر شروع ہوتی ہے۔ سورہ مائدہ کی آیت ۳۹ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ چور کو توبہ اور اصلاح کا موقع دیا جائے اور آغاز جرم میں ہی اس کو انتہائی سزا نہ دی جائے۔

زنا کی سزا: الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَافَةٌ فِي دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ. (النور ۲۴:۲) زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد کا حکم یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اور ان پر مہربانی تمھیں اللہ کے حکم کی تعمیل سے نہ روکے۔ اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہو اور چاہیے کہ ان کی سزا کے وقت مومنوں کی ایک جماعت موجود ہو۔

زنا کی سزا کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ہمارے اس دور کے بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ مرد یا عورت شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ہر حالت میں زنا کی سزا صرف سو دُرّے ہے۔ رجم یعنی سنگ ساری نہیں۔ احادیث میں شادی شدہ مرد یا عورت کو زنا کی پاداش میں رجم کی سزا مذکور ہے۔ وہ سورہ نور کے نزول سے قبل کا حکم ہے۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رواج سابق کے مطابق حکم دیا تھا۔ دوسری شریعت میں زنا کی سزا رجم تھی۔ سورہ نور کی مذکورہ بالا آیات نے دوسری شریعت کے حکم کو منسوخ کر دیا اور قرآن مجید کی کسی آیت میں رجم کی سزا مذکور نہیں ہے۔

جمہور علماء کا گروہ کہتا ہے اگر زانی محصن (شادی شدہ) ہے اسے سنگ سار کیا جائے یہاں تک کہ وہ مر جائے اگر محصن نہیں آزاد ہے اسے سو دُرّے اگر غلام ہے پچاس دُرّے لگائے جائیں۔

رجم کی سزا میں زانی کے محصن ہونے سے مراد یہ ہے' وہ آزاد عاقل و بالغ اور مسلمان ہو اور اس نے آزاد عورت کے ساتھ مباشرت صحیحہ کی ہو اور وہ دونوں محصن ہوں۔

حدیث میں آتا ہے۔ خُذُوْا عَنِّی قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلاً اَلْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَتَغْرِيْبُ عَامٍ وَالثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ الْجَلْدُ والرجْمُ (مسلم، ابوداؤد، ترمذی) مجھ سے یہ تعلیم حاصل کرو اللہ نے ان کے لیے رستہ پیدا کیا ہے۔ کنوارے مرد عورت زنا کریں تو انھیں سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور شادی شدہ مرد عورت زنا کریں تو ان کی سزا سو کوڑے اور سنگ ساری ہے۔

فتاویٰ عالمگیری کی عبارت یہ ہے۔

وجب الحد ان كان الزاني محصنا رجمة بالحجارة حتى يموت واحصان الرجم ان يكون حراً عاقلاً بالغاً مسلماً قد تزوج امراة حرة نكاحا صحيحا و دخل بها وهما على صفة الاحصان كذافي الكافي. وان كان غير محصن فحده مائة جلدة ان كان حراً وان كان عبدا جلده خمسين بامر الا مام. (فتاویٰ عالمگیری جلد۲ کتاب الحدود صفحہ ۱۵۱۔۱۵۲)

وَاِذَا وَجَبَ الْحَدُّ وَكَانَ الزَّانِي مُحْصِنًا رَجَمَهُ بِالْحِجَارَةِ حَتّٰى يَمُوْتَ لِاَنَّهٗ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ رَجَمَ مَاعِزاً وَقَدْ اَحْصَنَ (الهدایہ)

جب حد زنا واجب ہو اور زانی محصن ہو اس کو سنگ سار کریں۔ یہاں تک کہ وہ مر جائے (حد زنا میں شادی شدہ کا سنگ سار کرنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت) کیونکہ آپ نے ماعز کو سنگ سار کیا کیونکہ وہ محصن تھا۔

جرم قذف (اتہام لگانا) کی سزا: شریعت میں قذف کے معنی زنا کی تہمت لگانا ہے۔ زنا کے جھوٹے الزام کی سزا شریعت اسلامی میں اسی کوڑے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ. (النور ۲۴:۴)

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ نہ لائیں تو انھیں اسی کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو اور وہی نافرمان ہیں۔

اسی کوڑوں کی سزا حر (آزاد) کے لیے ہے' اگر غلام ہے تو اسے چالیس کوڑے لگانے کا حکم ہے۔

شراب خوری: قرآن مجید میں شراب خوری کے لیے سزا کا کوئی ذکر نہیں لیکن احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں کوئی متعین سزا نہ تھی۔ صرف پٹائی کا حکم صادر فرمایا کرتے تھے کوئی ہاتھ سے مارتا کوئی جوتے سے کوئی کوڑے سے اور کوئی کھجور کی شاخ سے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شرابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا اس کا جرم ثابت تھا آپ نے صحابہ کو فرمایا: اِضْرِبُوْهُ فَقَالَ اَبُوْ هُرَيْرَةَ فَمِنَّا الضَّارِبُ بِيَدِهٖ وَالضَّارِبُ بِنَعْلِهٖ وَالضَّارِبُ بِثَوْبِهٖ. (بخاری کتاب الحدود) یعنی اس کی پٹائی کرو۔ ہم میں سے کوئی ہاتھ سے مارنے لگا کوئی اپنے جوتے سے کوئی اپنے کپڑے سے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَلَدَ شَارِبَ الْخَمْرِ بِالْجَرِيْدِ وَالنِّعَالِ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شرابی کو چھڑی اور جوتوں سے مارا۔ مذکورہ احادیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شرابی کو چھڑی جوتوں یا دیگر اشیاء کے مارنے سے تعداد کا کوئی تعین نہیں ہوتا۔ ۔۔ات غیر معین ہو جاتی ہیں لہٰذا شرابی کی سزا تعزیر ہے۔

زہری کی روایت ہے۔ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمْ یَفْرِضْ فِی الْخَمْرِ حداً وَاِنَّمَا کَانَ یَامُرُ مَنْ یَحْضرہ ان یَضْرِبُوْہُ بِاَیْدِیْھِمْ حَتّٰی یَقُوْلَ لَھُمْ اِرْفَعُوْا۔ (ابو داؤد) یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شراب سے متعلق کوئی حد مقرر نہیں کی آپ حاضرین کو فرمایا کرتے تھے اسے ہاتھوں سے مارو وہ اسے مارتے رہتے یہاں تک کہ فرماتے بس کرو۔

خلفاء کے عہد میں سزا: حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی دور میں شراب نوشی کی سزا چالیس کوڑے تھی۔ جب مقدمات زیادہ آنے لگے تو حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام کو جمع کیا۔ غور وفکر کرنے کے بعد متفقہ طور پر اسی کوڑے طے پائے۔

جرم لواطت کی سزا: قرآن میں آتا ہے:

اَللَّذَانِ یَاْتِیٰنِھَا منکم فَاٰذُوْھُمَا. تم میں سے جو دو مرد بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان دونوں کو سزا دو۔

ابو مسلم اصفہانی کے نزدیک یہ آیت جرم لواطت کے متعلق ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک لواطت میں سزا نہیں دی جائے گی تعزیر کی سزا ہوگی یا اسے قید خانہ میں ڈالا جائے۔ جب تک کہ وہ توبہ نہ کرے امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک وہ حد کی سزا کا مستوجب ہوگا۔ اگر شادی شدہ ہے تو سنگسار کیا جائے اگر شادی شدہ نہیں تو کوڑے لگائے جائیں۔ اگر اس نے لواطت کا فعل اپنے غلام یا لونڈی یا اپنی بیوی سے کیا ہے تو اس پر اجماع ہے کہ اسے حد کی سزا نہیں ہوگی۔ اگر مرتکب لواطت کا عادی ہے تو امام اسے قتل کردے۔ مرتکب محصن ہو یا غیر محصن عربی عبارت یہ ہے:

لووطی امراۃ فی دبرھا اولا ط بغلام لم یحد عند ابی حنیفۃ و یعزرو یورع فی السجن حتی یتوب و عندھما یحدحد الزنافیجلد ان لم یکن محصنًا ویرجم ان کانَ محصنًا ولو فعل ھذا لعبدہ او امتہ او زوجتہٖ بنکاح صحیح او فاسد لا یحد اجماعاً کذافی الکافی ولو اعتاد اللواطۃ یَقْتُلُ الامام محصنا کان او غیر محصن کذافی فتح القدیر. (کنز العمال جلد۳ صفحہ۹۹)

کنز العمال کے مذکورہ حوالہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لواطت کے بارے میں تین نظریات ہیں۔ ۱۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہم جنسی کی سزا تعزیر ہے۔ اصلاح کے لیے قید میں ڈال دیا جائے۔ امام یوسف اور محمد کے نزدیک ہم جنسی کی سزا حد زنا کی طرح ہے۔ صاحب کافی کا قول ہے کہ اگر مجرم عادی ہو تو امام اس کو قتل کردے خواہ وہ مومن ہے یا غیر مومن صاحب فتح قدیر کا بھی یہی مسلک ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ سب سے پہلے لواطت کا مجرم حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں لایا گیا حضرت عمرؓ نے نوجوانانِ قریش کو حکم دیا کہ اس سے ہم نشینی ترک کردو۔

قرآن مجید کا لفظ فَاٰذُوْھُمَا (دونوں کو سزا دو) عام ہے۔ کسی قسم کی سزا تجویز نہیں کی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ حالات کے مطابق حاکم اس جرم کی سزا تجویز کرسکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ میں جوں جوں یہ جرم ترقی کرتا چلا گیا سزا سخت ہوتی چلی گئی ہے۔

حمادیہ میں ہے۔ اگر مرد مرد کے ساتھ یا مرد عورت کے ساتھ یا عورت عورت کے ساتھ یا مرد خواجہ سرا یا مخنث یا نامرد یا لڑکے کے ساتھ چپٹ بازی کرے تو تعزیر واجب ہوتی ہے۔ اس میں حد نہیں ہے۔

دوسری قسم

دیوانی قانون

دیوانی معاملات کے لیے پانچ امور کا ہونا ضروری ہے:

۱۔ **معاہدات:** فریقین میں معاہدہ ہوتا ہے مثلاً بیع کا، رہن کا، حوالہ کا، کفالہ کا، ضمانت وغیرہ کا۔

۲۔ **امر دعویٰ:** جب کسی ایک فریق کی طرف سے معاہدہ کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو عدالت میں دعویٰ دائر کیا جاتا ہے۔

۳۔ **جواب دعویٰ:** عدالت میں مدعا علیہ دعویٰ کا جواب دیتا ہے۔

۴۔ **شہادت:** مقدمات کا دارومدار شہادت پر ہے۔ فریقین اپنے اپنے حق میں شہادتیں پیش کرتے ہیں۔

۵۔ **فیصلہ:** قاضی دعویٰ جواب دعویٰ اور شہادتیں سن کر فیصلہ کرتا ہے۔

امر اوّل کے مطابق قرآن مجید میں آتا ہے کہ جب کوئی معاملہ کرو تو اس کو ضبط تحریر میں لے آیا کرو اور دستاویز پر گواہوں کی شہادت بھی لے لیا کرو۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ وَ لْیَكْتُبْ بَّیْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ وَ لَا یَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ یَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْیَكْتُبْ وَ لْیُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ وَ لْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَ لَا یَبْخَسْ مِنْهُ شَیْــٴًـا فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ وَ اسْتَشْهِدُوْا شَهِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ یَكُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى وَ لَا یَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا وَ لَا تَسْــٴَـمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِیْرًا اَوْ كَبِیْرًا اِلٰۤى اَجَلِهٖ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا. (البقرہ۲:۲۸۲)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم آپس میں مقررہ وقت کے لیے قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لو اور چاہیے کہ تمھارے درمیان لکھنے والا عدل کے ساتھ لکھے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے۔ جیسا اللہ نے اسے سکھایا ضرور لکھ دے اور چاہیے کہ وہ جس پر حق ہے لکھائے اور وہ اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرے اور اس سے کچھ کمی نہ کرے پھر اگر وہ شخص جس پر حق ہے کم عقل یا ضعیف ہو یا لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوائے اور دو گواہ اپنے مردوں میں سے گواہی کے لیے بلا لیا کرو۔ پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے ہوں جن کو تم پسند کرو تاکہ اگر ایک بھول جائے تو ایک ان دونوں میں سے دوسری کو یاد دلائے اور گواہ جب بلائے جائیں انکار نہ کریں اور اس کے وقت تک اسے لکھنے میں کاہلی نہ کرو تھوڑا ہو یا بہت یہ اللہ کے نزدیک بہت انصاف کی بات ہے اور گواہی کو بہت مضبوط کرنے والی ہے اور اس سے بہت قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو۔

معاہدہ کی پابندی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۳۴) عہد پورا کرو یقیناً عہد کے متعلق پوچھا جائے گا۔

وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْكِیْدِهَا. (النحل ۱۶:۹۱) عہد کو پکا کرنے کے بعد مت توڑو۔

امر دوم کے متعلق ارشاد الٰہی ہے:

وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (البقرہ۲:۱۸۸)

اور اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ اور نہ ان کے ذریعہ حاکموں تک پہنچو تاکہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ گناہ کے ساتھ کھا جاؤ۔ حالانکہ تم جانتے ہو۔

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا ہے کہ جو لوگ جھوٹے دعوے دائر کرتے ہیں وہ گنہگار ہیں۔

امر سوم کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے۔ لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَ لَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ. (حم سجدہ ۴۱:۳۴) اور نیکی اور بدی برابر نہیں بدی کو بہت اچھے طریق سے دور کر۔ پھر تو دیکھے گا کہ وہ شخص کہ تجھ میں اور اس میں دشمنی ہے گویا وہ دل سوز دوست ہے۔

اس آیت کریمہ میں جواب دعویٰ کے متعلق نہایت ہی عمدہ اصول وضع کر دیا ہے وہ یہ کہ جواب دعویٰ کے لیے نیک راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

امر چہارم کے متعلق ارشاد الٰہی ہے: وَ اَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ. (الطلاق ۶۵:۲) گواہی کو اللہ کے لیے درست ادا کرو۔

وَ لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَ مَنْ یَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ. (البقرہ۲:۲۸۳) اور گواہی نہ چھپاؤ اور جو شخص چھپاتا ہے یقیناً اس کا دل گنہگار ہے اور اللہ تمھارے اعمال کو خوب جانتا ہے۔

امر پنجم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ. (النساء۴:۵۸) جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل و انصاف کے ساتھ کرو۔

دیوانی قوانین

طوالت سے بچنے کے لیے دیوانی قوانین کی فہرست حوالوں کے ساتھ درج کر دی جاتی ہے۔

لین دین کے قوانین

۱۔ قرضہ جات ضبط تحریر میں لائے جائیں۔ بقرہ۲:۲۸۲

۲۔	دستاویز پر گواہیاں	بقرہ۲:۲۸۲
۳۔	گواہوں کا فرض	بقرہ۲:۲۸۲
۴۔	گواہ اور کاتب کو تنگ نہ کیا جائے۔	بقرہ۲:۲۸۳
۵۔	شہادت نہ چھپائی جائے	بقرہ۲:۲۸۳
۶۔	رہن	بقرہ۲:۲۸۳
۷۔	وصیت کے احکام	بقرہ۲:۱۸۰۔ مائدہ ۵:۱۰۶
	وقف کے احکام	بخاری کتاب الوصایا باب ۲۹ الوقف لِلْغَنِی والفقیر والضعیف۔

معاشرہ کے متعلق قوانین

منگنی کے احکام	بقرہ۲:۲۳۵
نکاح کی عمر	النساء۴:۶
حق مہر	النساء۴:۶، النساء۴:۴، النساء۴:۲۰، ۲۱:۲۳، ۲۴، ۲۵، مائدہ ۵:۵

شغار یعنی باہمی تبادلہ کی شادی: عرب میں یہ رواج تھا کہ ایک شخص اپنی لڑکی یا بہن یا وہ جس کی تولیت اس کے سپرد ہے۔ کسی دوسرے کے نکاح میں دے دیتا اور اس کے بدلہ میں اس کی بیٹی یا بہن وغیرہ سے نکاح کرتا، دونوں فریق مہر نہ دیتے تھے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس نکاح کو ناجائز قرار دیا ہے۔

نکاح کا اعلان	النساء۴:۲۴، ۲۵، مائدہ ۵:۵
نکاح میں ولی یا سرپرست	اس بارہ میں آئمہ فقہا کا اختلاف ہے فقہ حنفی بغیر ولی کے نکاح جائز قرار دیتا ہے (ہدایہ جلد ۱ صفحہ ۲۹۳) شیعوں کا بھی یہ نقطہ نگاہ ہے (محمڈن لا امیر علی) امام مالک اور امام شافعی دونوں کا یہ مسلک ہے کہ ولی کی اجازت ضروری ہے۔
زوجین کے مساوی حقوق ہیں	البقرہ۲:۱۷۳
مرد کو کچھ برتری حاصل ہے۔	البقرہ۲:۱۷۳، النساء۴:۳۴
برتری کی وجہ	النساء۴:۳۴
محرمات نکاح	النساء۴:۲۳
کثیر الازدواجی	النساء۴:۳
اگر میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہو جائے تو ان کے درمیان صلح کرانی چاہیے۔	النساء۴:۳۵
طلاق	النساء۴:۳۵
طلاق کیسے دی جائے (طلاق طہر میں دی جائے)	بقرہ۲:۲۲۲
ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ ابن عمر نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دی ہے تو آپ نے اس طلاق کو ناجائز قرار دیا۔	البقرہ ۲۵:۲۲۸، البقرہ۲:۲۳۴ الطلاق: ۲۸
طلاق منسوخ ہو سکتی ہے۔	البقرہ۲:۲۲۸
عدت گزر جانے کے بعد دوبارہ نکاح	البقرہ۲:۲۳۲

طلاق بائن، تیسری طلاق کے بعد نکاح حرام ہے۔ ہاں صرف ایک صورت ہے کہ وہ عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح کرے، اور وہ بھی ناکام ثابت ہو اور خاوند طلاق دے دے، تب پہلا خاوند شادی کر سکتا ہے۔	البقرہ۲:۲۳۰
ایلاء	سورہ بقرہ۲:۲۲۶،۲۲۷
ظہار	المجادلہ۱:۴
لعان	النور۲۴:۶_۹
خلع	البقرہ۲:۲۲۹
متبنیٰ کے امتناع کا حکم	احزاب۳۳:۴،۵
میراث وترکہ	النساء۴:۷
تقسیم قرض اور وصیت کی ادائیگی کے بعد ہو	النساء۴:۷
مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر	النساء۴:۱۱
لڑکے اور لڑکی کا حصہ	النساء۴:۱۱
صرف لڑکیاں وارث ہوں تو کتنا حصہ	النساء۴:۱۱
با اولاد میت کے ماں باپ کا حصہ	النساء۴:۱۱
بے اولاد میت کے ماں باپ کا حصہ	النساء۴:۱۱
میت کے بہن بھائی ہوں تو ماں کا حصہ	النساء۴:۱۱
اولاد نہ ہو تو شوہر کا حصہ	النساء۴:۱۲
اولاد ہو تو شوہر کا حصہ	النساء۴:۱۳
اولاد نہ ہو تو بیوی کا حصہ	النساء۴:۱۳
اولاد ہو تو بیوی کا حصہ	النساء۴:۱۳
ایک بہن یا بھائی ہو تو ہر ایک کا حصہ	النساء۴:۱۲
ایک سے زیادہ ہوں تو کتنا حصہ	النساء۴:۱۲
سگی بہن کا حصہ	النساء۴:۱۷۶
دو بہنیں وارث ہوں تو کتنا حصہ	النساء۴:۱۷۶
کئی بہن بھائی ہوں تو مرد کا حصہ	النساء۴:۱۷۶
یتیم کے متعلق احکام ان کے مال نہ کھاؤ	الانعام:۱۵۲
ان کے اچھے مال سے برا مال نہ بدل لو	النساء۴:۲
رہائش اور مال مشترک رکھ سکتے ہو	البقرہ۴:۲۲۰
مال بقدر ضرورت خرچ کرو	النساء۴:۶
مال دار ان کے مال سے حق الخدمت نہ لے	النساء۴:۶
مفلس حق الخدمت لے سکتا ہے	النساء۴:۶
ناسمجھی کے زمانہ تک مال ان کو نہ دو	النساء۴:۵
عقل وشعور آنے کے بعد مال ان کے حوالے کر دو	النساء۴:۶
مال گواہوں کی موجودگی میں دو	النساء۴:۶

اعضائے حکومت (مقنّنہ، عاملہ، عدلیہ)

مقنّنہ (مجلس وضع قوانین)

(بائی لاز)

حکومت کے تین اہم شعبے ہیں:

ا۔ (مجلس وضع قوانین) مقننہ

ب۔ عاملہ اور

ج۔ عدلیہ

ان میں مقننہ یا مجلس قانون ساز (Legislature) سب سے اہم ہے۔ ہر حکومت کو قوانین اور قواعد وضوابط بنانے پڑتے ہیں۔ تا کہ وہ شہریوں اور عمّال کے لیے ایسی راہیں متعین کر دیں جن پر چل کر قوم اور ملک کے فلاحی کام انجام دے سکیں۔ دستور کے بغیر کسی حکومت کا نظام چل ہی نہیں سکتا۔

طلوع اسلام کے وقت قوانین کا سرچشمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات تھی۔ آپ کی وفات کے بعد خلفائے راشدین کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی قومی یا انفرادی مسئلہ پیش آتا تو صاحب الرائے صحابہ کو بلاتے' ان کے سامنے مسئلہ پیش کرتے تو وہ خلیفہ کے فرض قانون سازی میں قانونی مشیر ہوتے اور ضمنی قوانین (بائی لاز) وضع کرتے۔

ارکان مجلس وضع ضمنی قوانین کا انتخاب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفاء راشدین کے طرز عمل سے یہ بات ثابت ہے کہ مجلس کی تشکیل انتخاب (Election) اور چناؤ (Selection) دونوں طرح سے ہوتی تھی۔

وفد ہوازن کے واقعہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین اور انصار سے فرمایا کہ اپنے نمائندے منتخب کرے۔ ان کے ذریعہ اپنی مرضی سے مجھے مطلع کرو۔ اس طرح نمائندوں کا انتخاب مجلس قانون ساز کے لیے سند ہے۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں جو وفود آتے تھے وہ عوام کے ہی منتخب شدہ نمائندے ہوتے تھے۔

ان تاریخی واقعات سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ارکان مجلس کا انتخاب عوام کی رائے سے جائز ہے۔

مجلس قانون ساز کے فرائض وحقوق

فرائض

ا۔ کتاب وسنت اور تعامل صحابہ کی روشنی میں حسب ضرورت ایسے قوانین وضع کریں جو قوم اور ملک کی فلاح کے ضامن ہوں۔

۲۔ جو بھی قانون وضع کرنا ہو۔ مفاد عامہ وریاست کو مدنظر رکھ کر وضع کیا جائے اس پر آزادانہ غور وفکر ہو۔

۳۔ خلیفہ (سربراہ) کے افعال وکردار کی کڑی نگرانی کرے۔ اگر خلیفہ جادہ مستقیم سے ہٹنے لگے تو اس کو راہ ہدایت پر آنے کا مطالبہ کرے۔

۴۔ اگر خلیفہ (سربراہ) راہ ہدایت پر نہیں آتا تو بوقت ضرورت اس کو الگ کر دے۔

حقوق

ا۔ مجلس کے ہر رکن کو خلیفہ (سربراہ) اور دیگر عمّال حکومت کے افعال اور پالیسی پر تنقید کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

۲۔ اگر خلیفہ (سربراہ) مجلس کے مشورہ کے بغیر کوئی قانون نافذ کرنا چاہے تو مجلس کے ہر رکن کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خلیفہ (سربراہ) سے مشاورت کا مطالبہ کرے۔

۳۔ اگر مجلس عوام کی رائے سے ایک میعاد معینہ کے لیے وجود میں آئی ہے تو خلیفہ (سربراہ) کو کسی قسم کا یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مجلس کو برخاست کرے۔ ہاں اس میعاد کے گزرنے کے بعد وہ مجلس خود بخود برخاست ہو جائے گی۔

۴۔ اراکین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بیت المال کے حسابات کی جانچ پڑتال کرنے کے لیے کمیشن مقرر کریں یا خلیفہ (سربراہ) سے حساب دینے کا مطالبہ کریں۔

مجلس کی صدارت: خلفائے راشدین کی سنت سے یہ بات ثابت ہے کہ خلفائے راشدین خود صدارت فرمایا کرتے تھے لیکن یہ مسئلہ حالات اور زمانہ کے تقاضوں سے تعلق رکھتا ہے۔

قانون سازی کا طریقہ

۱۔ مسودہ قانون یا تو حکومت کی طرف سے پیش ہوگا یا مجلس کے ارکان کی طرف سے پیش ہوگا۔

۲۔ ہر رکن غیر جانب داری اور خلوص سے اس تجویز پر غور وفکر کرے گا۔

۳۔ مجلس کے ہر رکن کو پیش کردہ تجویز پر تقریر کرنے کا حق حاصل ہے خواہ وہ حکومت کے خلاف کرے یا حکومت کی موافقت میں۔

۴۔ مجلس اگر ضرورت سمجھے تو اہم مسائل کے بارہ میں ارکان مجلس کے علاوہ دوسرے صاحب الرائے اصحاب سے بھی رائے لے سکتی ہے۔

۵۔ مخصوص مسائل پر غور وخوض کرنے کے لیے کمیٹیاں بھی بنائی جا سکتی ہیں۔

۶۔ عوام کی مشکلات اور مصائب خلیفہ (سربراہ) یا قائم مقام خلیفہ تک پہنچانا اس مجلس کے دائرہ عمل میں شامل ہے۔

۷۔ اگر خلیفہ (سربراہ) یا عمال اسلام کے کسی حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو اس مجلس کا یہ فرض ہے کہ وہ خلیفہ یا عمال سے جادہ ہدایت پر چلنے کا مطالبہ کرے۔

۸۔ ضمنی قانون کثرت رائے سے منظور کیا جائے گا۔

۹۔ کوئی ضمنی قانون اسلام کی روح کے منافی منظور نہیں ہوگا۔

قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَادُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ. (المجادلہ ۵۸:۲۰) اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں۔ وہ ذلیل ترین لوگوں میں شامل ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ. (المائدہ ۵:۴۴) اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں تو ایسے لوگ کافر ہیں۔

عاملہ یا انتظامیہ

حکومت کا اہم صیغہ (Organ) عاملہ یا انتظامیہ (Exective) ہے۔ اس کا کام ملک میں قوانین کو نفاذ کرنا اور مقننہ اور عدلیہ کے احکام کو عملی جامہ پہنانا ہے۔

لفظ عاملہ دو معنوں پر مشتمل ہے۔ وسیع معنی کے اعتبار سے اس جماعت کو کہتے ہیں جو حکومت کے تمام ادنیٰ اور اعلیٰ حکام پر مشتمل ہو۔ اس صورت میں حکومت کے تمام ملازمین جو انتظامی امور کی دیکھ بھال اور نگرانی کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر عاملہ یا انتظامیہ (Exective) کہلاتے ہیں۔ گلکرائسٹ کہتا ہے:

"وسیع معنی میں عاملہ میں حکومت کے تمام حکام شامل ہیں۔ سوائے ان حکام کے جو قانون بناتے ہیں یا اس کی تشریح کرتے ہیں۔"

محدود معنی کے اعتبار سے عاملہ سے مراد رئیس مملکت ہے۔ مثلاً شاہ انگلستان۔

عاملہ کی تنظیم کے اصول: عاملہ کی تنظیم کے چند اصول ہیں۔ انہی اصولوں پر اس کی کامیابی کا دار و مدار ہے۔ وہ اصول حسب ذیل ہیں:

۱۔ عاملہ کی تنظیم اس طرح کی جائے جس سے عاملہ میں اتحاد یک جہتی ایک دوسرے پر اعتماد اور حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ عاملہ کا اہم فرض پاس شدہ قوانین کا نفاذ کرنا ہے۔ اگر اختیارات اراکین مجلس عاملہ میں برابر تقسیم کر دیے جائیں تو بحث ومباحثہ میں کافی وقت صرف ہوگا اور اراکین میں یک جہتی اور اتحاد کا رشتہ ٹوٹ جانے کا قوی احتمال ہے۔ اس وجہ سے اختیارات کا سرچشمہ ایک ہو۔ پھر کام کی آسانی کے لیے کچھ اختیارات دوسرے عمال کو دے دیے جائیں تاکہ وہ خوش اسلوبی سے کام سرانجام دے سکیں۔ عہد نبوی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

ذات کو تمام اختیارات کا مرکز تھی۔ لیکن اس کے باوجود اختیارات عمال اور کارندوں میں تقسیم کر دیے گئے تھے۔ مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے مختلف اصحاب مقرر کیے گئے۔ زکوٰۃ اور دیگر ذرائع آمدن کی وصولی کے لیے عامل مقرر کیے گئے بعض مہمات پر صحابہ سے اہل اور مستحق شخص کو متعین کیا جاتا تھا وغیرہ۔ آپ کی وفات کے بعد خلفاء راشدین کا دور تھا۔ کام کی سہولت کے لیے انھوں نے عمال کو اختیارات سونپ دیے تھے۔

اسلام میں خلیفہ کی ذات بہت اہم ہے لیکن خلیفہ کی ذات قانون سے بالا نہیں ہے۔ اس کو قانون کے دائرہ میں رہ کر ہی اپنے اختیارات استعمال کرنے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ. (النساء ۴:۵۹) اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے صاحب امر (حاکم) کی اطاعت کرو اور اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ۔

اس آیت کریمہ میں اولی الامر (حاکم) کو اختیارات کا سرچشمہ قرار دیا ہے ہاں اگر عوام یہ سمجھیں کہ اولی الامر (خلیفہ) اپنے اختیارات سے تجاوز کر رہا ہے اور جھگڑے کی صورت پیدا ہو جائے تو اس جھگڑے کو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی روشنی میں دور کیا جائے۔ اللہ اور رسول کے الفاظ قانون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلام قانون کی بالادستی کا حامی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَادُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ فِی الْاَذَلِّیْنَ. (المجادلہ ۵۸:۲۰) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں۔ وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں۔

اس وجہ سے جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا: فان انا احسنت فاعینونی وان انازغت فقومونی. (کتاب الاموال لابی عبیدہ صفحہ ۳۶۶) اگر میں نیکی کروں یعنی شریعت محمدی کا پیروکار رہوں تو میری مدد کرنا اگر کجی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو۔

اسلام میں امیر کا منصب بڑی اہمیت کا حامل ہے امیر کے تقرر پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس کو بھی دستور کی حدود کے اندر ہی کام کرنا ہوگا۔ اگر وہ ان حدود کو پھاندنے کی کوشش کرے تو عوام کا فرض ہے کہ اس کو جادہ صواب پر لے آئیں اگر پھر بھی دستور کو ردی کے چار ورق سمجھتا ہو اور اپنے آپ کو دستور کے مطابق نہیں ڈھالتا اور اپنی مرضی کے مطابق دستور میں تبدیلی لانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کو اس کے عہدہ سے الگ کر دیں۔

۲۔ عمال کو مرکز کی طرف سے اتنے اختیارات ضرور ملنے چاہئیں کہ وہ احسن طریق پر فرائض سرانجام دے سکیں۔ اگر مجلس عاملہ کو اختیارات حاصل نہیں تو سلطنت کے امور خوش اسلوبی سے انجام نہیں دے سکے گی۔ لیکن اتنے بھی اختیارات نہیں دے دینے چاہئیں کہ وہ عوام پر ظلم کرنا شروع کر دیں۔

۳۔ عاملہ کی میعاد کم سے کم اتنی ہونی چاہیے کہ وہ اس عرصہ میں حکومت کے انتظام میں پوری دل چسپی لے سکے اور اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکے۔

۴۔ امیر (سربراہ صفت) کا انتخاب عوام کی کثرت رائے سے ہونا چاہیے۔ انتخاب صاف شفاف ہونا چاہیے بغیر انتخاب کے کسی اندرونی یا بیرونی طاقت کے ذریعہ حکومت پر قبضہ کرنا ناجائز اور حرام ہے جیسے کہ سورۃ النساء کی آیت ۵۸ میں اولی الامر مِنْكُمْ کے الفاظ آئے ہیں کہ امیر تمہی میں سے ہونا چاہیے یعنی عوام کی مرضی سے امیر کا دورانیہ حکومت مقرر ہونا چاہیے۔

سرکاری ملازمین کی ذمہ داریاں اور اوصاف

اسلام میں سرکاری مناصب کا تصور

اسلام مناصب کو ایک امانت قرار دیتا ہے اور یہ امانت اس کے سپرد کی جائے جو اس کے اہل ہوں۔ قرآن مجید میں آتا ہے:
اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَهْلِهَا. (النساء ۴:۵۸)

حدیث اور تاریخی آثار سے اس امر کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے بھی حکومت کا کام سپرد کیا جائے۔ آپ نے جواب دیا۔ انها امانة. اے ابوذرؓ یہ امانت ہے۔ (کتاب الاموال امام ابوعبید قاسم بن سلام ص ۴)

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں جو شخص حکومت کی ذمہ داریوں کو مناسب صورت میں تقسیم نہیں کرتا وہ اللہ، رسول اور مسلمانوں کے حق میں اور ان کی امانت میں خیانت کرتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۴،۵)

لہٰذا اسلامی نقطہ نگاہ سے سرکاری مناصب حصول جاہ اور کسب دنیا کے لیے نہیں ہوتے جو شخص جاہ وحشمت اور کسب دنیا کے لیے خواہش کرتا ہے تو وہ اس عہدہ کا اہل نہیں۔ خلیفہ کو چاہیے کہ وہ اس قسم کے آدمی کو وہ عہدہ نہ دے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں قَالَ دَخَلْتُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَا وَرَجُلَانِ مِنْ بَنِیْ عَمِّیْ فَقَالَ اَحَدُهُمَا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَمِّرْنَا عَلٰی بَعْضِ مَا وَلَّاكَ اللّٰهُ تَعَالٰی وَقَالَ الْاٰخَرُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَقَالَ اِنَّا وَاللّٰهِ لَا نُوَلِّیْ هٰذَا العمل اَحَداً اَسْئَلَهٗ اَوْ احداً حَرَصَ عَلَیْهِ (تیسیر الوصول) کہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میرے ساتھ میرے دو

چچیرے بھائی بھی تھے تو ان میں سے ایک نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ ہم کو کسی ملک کا حاکم بنا دیجئے۔ ان ممالک میں سے جو خدا نے آپ کو دیے ہیں اور دوسرے نے بھی اسی خواہش کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا خدا کی قسم ہم ایسے شخص کو حاکم نہیں مقرر کرتے جو اس کی درخواست کرے یا اس کی حرص کرے۔ (تیسیر الوصول)

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ سَمُرَةَ لَا تَسْئَلِ الْاِمَارَةَ فَاِنَّکَ اِنْ اُعْطِيْتَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْئَلَةٍ اُعِنْتَ عَلَيْهَا وَاِنْ اُعْطِيْتَهَا عَنْ مَسْئَلَةٍ وُكِلْتَ عَلَيْهَا. (بخاری ومسلم باب الامارۃ)

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن سمرۃ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے عبدالرحمٰن تم کبھی امارت کی خواہش نہ کرنا اس لیے کہ اگر تم کو بغیر خواہش اور طلب کے امیر بنا دیا گیا تو اللہ کی جانب سے تمہاری مدد اور اعانت کی جائے گی اور تمہاری درخواست پر تم کو امارت دی گئی تو اس کا سارا بوجھ تم ہی پر ڈال دیا جائے گا۔

ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ مجھے کوئی خدمت نہیں دیتے تو آپ نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر فرمایا۔ اے ابوذرؓ! تم ایک ناتواں آدمی ہو اور یہ ایک امانت ہے اور اس سے قیامت کے دن بجز شرمندگی اور پشیمانی کے اور کچھ حاصل نہیں۔ بجز اس شخص کے جو اس کو عمدہ طور پر انجام دے اور اس کے متعلق تمام حقوق کو ادا کرے۔ (مسلم اور ابوداؤد اس کے راوی ہیں)

اور دوسری روایت میں یہ مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ابوذرؓ! میں تم کو ناتواں پاتا ہوں اور میں تمہارے لیے وہی بات پسند کرتا ہوں جو میں اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔ دو آدمیوں پر بھی حاکم مت بنو اور یتیم کے مال کے متولی مت بنو اور ابوداؤد کی ایک روایت میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ عرافت ایک ضروری چیز ہے اور لوگوں کو عریف کی سخت ضرورت ہے لیکن عریف لوگ دوزخ میں ہوں گے۔ تیسیر الوصول)

سرکاری مناصب پر تقرری کے لیے الامثل فالامثل (خوب سے خوب تر) کا اصول ہونا چاہیے۔ یعنی ان لوگوں کی تقرری کی جائے جو معاشرہ میں بہترین لوگ ہوں۔ ایک قول ہے جس نے مسلمانوں کے کسی گروہ کا ایسے شخص کو قائد بنا دیا کہ اس گروہ میں اس سے زیادہ بہتر شخص موجود ہے اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے اور عام مسلمانوں سے غداری کی۔ (الحسبۃ فی الاسلام ابن تیمیہ ص ۶)

کارکنوں کی ذمہ داریاں اور اوصاف

تمسک بالکتاب والسنۃ: اسلامی حکومت کا تمام نظام کتاب اللہ وسنت رسولؐ کے گرد گھومتا ہے۔ اس وجہ سے اسلامی حکومت کے ہر رکن کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام فیصلوں میں قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سامنے رکھے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ. (مائدہ ۵:۴۴) اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو ایسے لوگ کافر ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِکَ فِی الْاَذَلِّيْنَ. (المجادلہ ۵۸:۲۰) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں۔

وفات کے قریب مسلمانوں کو ہدایت فرمائی: اِنِّیْ تَرَکْتُ فِيْکُمْ اَمْرَيْنِ اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوْا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِیْ. (بخاری) یعنی میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں۔ جب تک تم انھیں پکڑے رکھو گے گمراہ نہ ہو گے۔ وہ اللہ کی کتاب اور میری سنت ہے۔

عمل

وہ حکام اسلامی نظام کی مشینری کے اچھے پرزے نہیں بن سکتے جو اپنے اعمال وکردار میں حسن وخوبصورتی نہیں رکھتے۔ معاشرہ کو درست نہیں رکھتے معاشرہ کو درست رکھنے کے لیے حکام کا نیک نمونہ نہایت ضروری ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ. (الصف ۶۱:۲) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: ان الناس لا یزالون مستقیمین ما استقامت لھم ائمتھم و ھداتھم. لوگ اس وقت تک سیدھی راہ پر قائم رہیں گے جب تک ان کے حکام اور راہنما سیدھے راستہ پر رہیں گے۔

حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کو فرماتے ہیں: انک عففت فعفت رعیتک ولو رتعت لرتعت. (الفاروق عمر مصنفہ محمد حسین ہیکل) آپ خود دیانت دار

ہیں۔ اس لیے آپ کی رعایا بھی دیانت دار ہے۔ اگر آپ خود بددیانت ہوتے تو لوگ بھی بددیانت بن جاتے۔

عدل اسلامی حکومت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اس وجہ سے حکام کا عادل ہونا بہت ضروری ہے۔ جس حکومت کی رعایا عدل و انصاف سے محروم ہے۔ وہ حکومت کبھی بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کی تباہی کے ایام قریب ہوتے ہیں۔

قرآن مجید نے عدل قائم کرنے پر بہت زور دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ. (النساء۴:۵۸) اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کا فیصلہ کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا سات شخصوں کو خدا اپنے سایہ میں جگہ دے گا جن میں ایک شخص امام عادل ہوگا۔'' (بخاری)

حضرت ابوبکرؓ اپنی حکومت کا بنیادی مقصد ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں: ان اقواکم عندی الضعیف حتی اخذله بحقه وان اضعفکم عندی القوی حتی اخذ منه الحق. کتاب الاموال لابی عبید صفحہ ۳۶۶) یعنی تمھارے زبردست لوگ میرے نزدیک اس وقت تک کمزور ہیں جب تک میں ان سے ان پر واجب شدہ حق نہ لے لوں اور تمھارے کمزور لوگ میرے نزدیک اس وقت طاقت ور ہیں۔ جب تک کہ میں ان کا غصب شدہ حق واپس نہ دلا دوں۔

عوام کی خیرخواہی اور ان پر شفقت

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

مَامِنْ عَبْدٍ اسْتَرْعَاهُ اللّٰهُ رَعِيَّةً فَلَمْ يَحُطْهَا بِنَصِيحَةٍ إِلَّا لَمْ يَجِدْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ (بخاری ۹۴:۸) کوئی شخص نہیں جسے اللہ کی رعیت کا حاکم بنائے اور وہ خیر خواہی کے ساتھ اس کی نگہبانی نہ کرے مگر وہ جنت کی خوشبو نہ پائے گا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیک اور مشفق حاکم کے حق میں دعا اور بدخواہ حاکم کے بارے میں بددعا کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اللهم من ولی من امر امتی شیئا فشق علیهم فاشقق علیه ومن ولی من امرامتی شیئا فرفق بهم فارفق به. (مسلم) اے اللہ جو شخص میری امت کے لوگوں کے کسی معاملہ کا ذمہ دار بنایا جائے اور وہ ان کو مشقت میں ڈالے تو تُو بھی اسے مشقت میں ڈال اور جو ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے تو تُو بھی اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کر۔

نرمی یا بردباری: نرمی اور بردباری ایسا خلق ہے جو حاکم کو عوام کی نظر میں محبوب بنا دیتا ہے۔ اللہ کی صفت حلیم (بردبار) ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے: إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُنِيبٌ. ہود ۱۱:۷۵) یقیناً ابراہیمؑ بردبار نرم دل اللہ کی طرف رجوع کرنے والا تھا۔

اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق فرماتا ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْكُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ. (ال عمران ۳:۱۵۹) سو اللہ کی رحمت سے تو ان کے لیے نرم ہے اور اگر تو سخت کلام سخت دل ہوتا تو تیرے اردگرد سے بکھر جاتے۔ پس ان کو معاف کر اور ان کے لیے بخشش مانگ۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے:

''رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی بہتری چاہتا ہے تو ان پر سنجیدہ اور بردبار لوگوں کو حاکم بناتا ہے اور ان کا مال فیاض لوگوں کی تحویل میں دیتا ہے اور جب کسی قوم کو آزمائش میں مبتلا کرتا ہے تو ان پر سفیہوں اور اجڈھوں کو مسلط کر دیتا ہے اور ان کا مال بخیلوں کے قبضہ میں دے دیتا ہے۔ خبردار! جو شخص میری امت میں سے کسی منصب پر مامور ہوا اور اس نے لوگوں کی ضروریات پوری کرنے میں نرمی سے کام لیا اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے دن اس کے ساتھ نرمی برتے گا اور جو شخص لوگوں کی ضروریات کے درمیان دربان کی دیوار کھڑی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے دن اس سے حجاب کرے گا۔''

حضرت عمرؓ نے خلیفہ ہونے کے بعد یہ دعا فرمائی:

''اے اللہ میں سخت دل ہوں مجھے نرم کر دے میں کمزور ہوں مجھے مضبوط کر دے میں بخیل ہوں مجھے سخی کر دے۔''

تنقید کی حوصلہ افزائی: اسلامی حکومت کے عمال کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نکتہ چینی کی حوصلہ افزائی کریں تاکہ ان کی کمزوریاں اور خامیاں کھل کر ان

کے سامنے آ جائیں۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ حکام اپنی اصلاح کی طرف توجہ کریں گے۔ دوم عوام کے اندر محاسبہ کرنے کی جرأت پیدا ہو جائے گی۔ سوم عوام اور حکام کے درمیان ایک رابطہ قائم رہے گا۔ چہارم حکام کج روی سے بچے رہیں گے۔ پنجم قانون شکنی کا دروازہ مسدود ہو جائے گا۔

حضرت ابوبکرؓ نے جو سب سے پہلا خطبہ دیا وہ یہ تھا: فان انا احسنت فاعینونی وان انازغت فقومونی. پس اگر میں نیکی کروں تو میری مدد کرو اور اگر کجی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو۔

صحابہ کرام نے جواب دیا: ''ہم نیزوں کی انیوں سے سیدھا کر دیں گے۔''

حضرت عمرؓ کے عہد کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک بدو نے اس وقت اٹھ کر اعتراض کیا جب حضرت عمرؓ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے:

''حضرت حسن بصری سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے کہا اے عمرؓ! اللہ سے ڈرو۔ اس جملہ کو کئی بار دہرایا، ایک دوسرے شخص نے اس کو ٹوکا کہ اب بس کرو۔ بہت ہو چکا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ان کو کہنے دو کہ اگر یہ ہم کو یہ باتیں نہ کہیں تو ان میں کوئی خوبی نہیں اور اگر ہم ان کی نصیحتوں کو قبول نہ کریں تو ہم میں کوئی خوبی نہیں۔ (کتاب الخراج صفحہ ۷)

ایک دفعہ عوام کے حقوق و فرائض بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''اور تم میرے نفس کے مقابل میں میری مدد اس طرح کر سکتے ہو کہ مجھے بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔ نیز خدا نے تمہاری جو ذمہ داری مجھ پر ڈالی ہے۔ اس کے بارہ میں میری خیر خواہی کرتے رہو۔'' (الفاروق عمرؓ تالیف محمد حسنین ہیکل صفحہ ۹۲)

غصہ سے احتراز: قرآن مجید میں آتا ہے: وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ. (آل عمران ۳:۱۳۴) جو غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں اور اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

''ایک افسر اور حاکم کی بردباری سے زیادہ اللہ کو کسی کی بھی بردباری اور نرمی پسند نہیں ہے اور نہ اس کی بردباری اور نرمی سے زیادہ کسی کی بردباری اور نرمی کا فائدہ وسیع اور عام ہے اسی طرح ایک حاکم اور افسر کی طیش مزاجی اور جہالت سے زیادہ اللہ کے نزدیک کسی کی طیش مزاجی اور جہالت مبغوض نہیں ہے اور نہ اس کی طیش مزاجی اور جہالت سے زیادہ کسی کی جہالت اور طیش مزاجی کا ضرر عام ہے۔ جو شخص لوگوں کے درمیان سلامتی کی روش اختیار کرتا ہے وہ اوپر (اللہ) سے سلامتی اور عافیت کا انعام پاتا ہے۔'' (کتاب الخراج صفحہ ۷)

باہمی اعتماد: دنیا کے تمام کام باہمی اعتماد سے چلتے ہیں۔ اگر ایک دوسرے کا اعتماد اٹھ جائے تو معاشرتی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ اس وجہ سے سرکاری ملازمین کے لیے باہمی اعتماد بہت ضروری ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ. (البقرہ ۲:۲۸۳) اگر تم میں سے ایک شخص دوسرے کا اعتماد کرتا ہے تو جس پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ اس اعتماد کو نبھائے اور اس امانت کو ادا کرے۔

سازشوں سے احتراز: ملازمین کو ایک دوسرے کے خلاف سازشیں نہیں کرنی چاہییں۔ اس سے محبت، الفت اور اتحاد کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ. (فاطر ۳۵:۴۳) بری تدبیر (سازش) کا وبال صرف اس کے کرنے والے ہی پر پڑتا ہے۔

باہمی تعاون: نظم و نسق صرف باہمی تعاون سے ہی چل سکتا ہے۔ حکام حکومت کی مشینری کے کل پرزے ہوتے ہیں اگر ان کے درمیان باہمی تعاون کا رشتہ ختم ہو جائے تو حکومت کی مشینری بالکل جامد ہو جائے گی اور نظام حکومت معطل ہو کر رہ جائے گا۔ اس وجہ سے حکام کا باہمی تعاون از حد ضروری ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى. (مائدہ ۵:۲) نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے سے تعاون کرو۔

عوام کی خبر گیری: حکومت کا اہم مقصد ہی عوام کی خبر گیری اور ان کے دکھ درد کو دور کرنا ہے۔ اگر کوئی حکومت اس مقصد میں ناکام رہتی ہے تو وہ عوام کی حکومت نہیں۔ اسلامی حکومت کے حکام کا اہم فرض یہ ہے کہ وہ عوام کے حالات معلوم کرتے رہیں اور ان کے مصائب اور دکھ درد کو دور کرتے رہیں۔

۱۔ حضرت عمرؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک رات آپ اپنے غلام اسلم کو ساتھ لے کر مدینہ سے باہر نکل گئے ایک خیمہ دیکھا تو ادھر کا رخ کیا قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ ایک عورت درد زہ میں مبتلا ہے اور تکلیف سے تڑپ رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس سے حال دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ میں ایک بدوی عورت ہوں اور میرے پاس اس وقت کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو اس موقع پر کام آ سکے۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر واپس گھر آئے اور اپنی بیوی

ام کلثوم بنت ابی طالب سے فرمایا اللہ کی مہربانی سے ثواب حاصل کرنے کا ایک عمدہ موقع ہاتھ آ گیا ہے کیا اس کے لیے تیار ہو۔ اس کے بعد واقعہ بیان کیا وہ اس خدمت کے لیے فوراً تیار ہو گئیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنی پیٹھ پر آٹے کی بوری لاد دی اور کچھ روغن ساتھ لیا اور ام کلثوم نے وہ ضروری چیزیں بھی ساتھ لیں جو ولادت کے سلسلہ میں کام آتی ہیں اور میاں بیوی اس بدو کے خیمہ کے پاس پہنچ گئے۔ ام کلثوم خیمہ کے اندر چلی گئیں اور حضرت عمرؓ خیمہ کے باہر بیٹھ کر بدو سے باتیں کرنے لگے۔ غریب بدو کو کچھ علم نہیں کہ وہ کس سے باتیں کر رہا ہے۔ اتنے میں اندر سے حضرت ام کلثوم نے فرمایا کہ امیر المومنین اپنے ساتھی کو فرزند کی بشارت سنا دیجئے۔ اب بدو کو یہ علم ہوا کہ یہ امیر المومنین ہیں وہ حیران رہ گیا اور معذرت کرنے لگا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو تشفی دی اور ضرورت کی چیزیں دے کر وہاں سے رخصت ہوئے۔

۲۔ ایک روز رات کو گشت میں حضرت عمرؓ نے کسی بچہ کے رونے کی آواز سنی۔ اس کی ماں کو مخاطب کر کے فرمایا اے عورت اللہ سے ڈر اور اس بچہ سے اچھا سلوک کر۔ تھوڑی دیر کے بعد اس بچہ کے رونے کی آواز دوبارہ آئی۔ پھر عورت سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ رات کے آخری حصہ میں بچہ پھر روتا ہوا سنائی دیا۔ اب کے حضرت عمرؓ نے قریب ہو کر غصہ کے ساتھ فرمایا تو کتنی بُری ماں ہے تیرا بچہ رات بھر روتا رہا۔ عورت نے جواب دیا میں اس کا دودھ چھڑا رہی ہوں، مگر یہ مانتا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا تو اس کا دودھ کیوں چھڑا رہی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ دودھ اس لیے چھڑا رہی ہوں کہ جب تک بچہ دودھ نہیں چھوڑتا اس وقت تک عمرؓ اس کا وظیفہ مقرر نہیں کرتا؟ دریافت فرمایا کہ تیرے بچے کی عمر کیا ہے؟ اس نے کہا اتنے مہینے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا تیرا برا ہو اس قدر جلدی نہ کر۔ اس کے بعد صبح کی نماز سے فارغ ہو کر مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوئے اور آبدیدہ ہو کر فرمایا عمرؓ کا برا ہو کہ اس نے مسلمانوں کے کتنے بچوں کو ہلاک کیا۔ اس کے بعد فوراً آپ نے منادی کرا دی کہ لوگ اپنے بچوں کے دودھ چھڑانے میں جلدی نہ کریں اب ہر بچہ کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر میں زندہ رہا تو تمام ملک کا دورہ کروں گا اور رعایا کے حالات معلوم کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ لوگوں کی بعض ضروریات ایسی ہیں جو مجھ تک پہنچ نہیں پاتیں لوگ خود مجھ تک آ نہیں سکتے اور عمال ان کی ضروریات کو میرے علم میں نہیں لاتے۔ (شرح نہج البلاغہ ابن ابی حدید)

سرکاری مال کی حفاظت: حکام سرکاری مال کے محافظ و نگران ہوتے ہیں۔ ان کا اہم فریضہ ہے کہ وہ سرکاری مال کی حفاظت کریں مشہور روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ بھاگے ہوئے مدینہ سے چلے جا رہے ہیں۔ حضرت علیؓ ملے اور دریافت فرمایا امیر المومنین اس دھوپ میں کہاں بھاگے جا رہے ہیں؟ فرمایا بیت المال کا ایک اونٹ کھو گیا ہے اس کو تلاش کرنے جا رہا ہوں۔ حضرت علیؓ نے یہ سن کر فرمایا: قد تعبت الخلفاء بعدک. آپ نے اپنے بعد آنے والوں کو تھکا دیا۔

امیر اور مامور میں مساوات: اسلام انسانی مساوات کا علمبردار ہے اور کسی امیر کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے تئیں دوسروں سے بڑا خیال کرے اور دوسروں پر ترجیح دے۔ تاریخ اسلام کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ فتوحات عراق کے سلسلہ میں ایک جگہ مقامی باشندوں نے فوج کے قائد حضرت ابو عبیدہؓ کی خدمت میں خاص کھانا بطور تحفہ بھیجا اور یہ کہلایا کہ یہ خاص ہدیہ صرف آپ کے لیے ہے۔ انھوں نے دریافت کیا کہ تم نے تمام فوج کی اس قسم کی ضیافت کی ہے۔ انھوں نے جواب دیا نہیں۔ یہ سن کر حضرت ابو عبیدہؓ نے ان کی ضیافت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا: لا حاجة لنا فيه بئس المرء ابو عبيده ان صحب قوماً من بلادهم واهرقوا دماء هم دونه او لم يهريقوها. فاستأثر عليهم بشيء يصيبه لا والله لاياكل مما افاء الله عليهم الامثل ما ياكل اوساطهم. (الفاروق عمر تالیف محمد حسین ہیکل جلد ۲ ص ۱۱۲) یعنی ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ابو عبیدہؓ سے زیادہ برا آدمی کون ہو سکتا ہے جو قوم کے لوگوں کو ان کے وطن سے لے کر آئے اور وہ اس کے حکم پر اپنا خون بہائیں یا نہ بہائیں اور جب مال غنیمت ہاتھ آئے تو وہ کسی چیز میں ان کے اوپر اپنے آپ کو ترجیح دے۔ خدا کی قسم یہ بندہ خدا کے اس بخشے ہوئے مال میں سے صرف وہی کھائے گا جو دوسرے لوگ کھائیں گے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ. الحجرات ۴۹:۱۰) کہ مومن بھائی بھائی ہیں۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ. (لقمان ۳۱:۱۸) اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور نہ زمین میں اکڑتا ہوا چل۔ اللہ تعالیٰ کسی خود پسند شیخی خورے کو پسند نہیں کرتا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا (بخاری) تم اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جاؤ۔

اِنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ اِخْوَةٌ. (احمد، ابو داؤد) کہ انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ حج کے موقعہ پر تمام عمال کو جمع کیا اور عام لوگوں سے دریافت کیا کہ تم میں سے کسی کو کسی عامل کے خلاف شکایت ہے۔ راوی کہتا ہے کہ اتنے مجمع میں سے صرف ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس نے شکایت کی کہ امیر المومنین! آپ کے عامل نے مجھے سو کوڑے مارے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسے اجازت دی کہ وہ عامل سے اپنا بدلہ لے لے یہ سن کر حضرت عمرو بن العاص بولے کہ امیر المومنین اگر آپ نے حکام کے خلاف شکایت سننے کا دروازہ کھول دیا تو ان کے لیے یہ چیز ناگوار ہوگی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی بات نہ مانی اور فرمایا کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی ذات کو قصاص کے لیے پیش فرماتے دیکھا تو ان لوگوں سے کیوں کر قصاص نہ دلواؤں۔ بالآخر مدعی نے خود ہی دو سو دینار لے کر قصاص معاف کر دیا۔

اقربا نوازی سے احتراز: اپنے عہدے سے ناجائز طور پر فائدہ اٹھا کر اقرباء نوازی حکام کی بدترین خصلت ہے وہ حاکم نہ تو اللہ کے ہاں سرخرو ہو سکتا ہے اور نہ عوام میں پسندیدہ نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے جو حکومت کے خرچ پر اقرباء نوازی کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے بعد میں ہونے والے جانشین کے انتخاب کے لیے جو مجلس شوریٰ تشکیل کی اس کے ارکان کو سب سے پہلے یہ ہدایت فرمائی کہ وہ خلیفہ بن جانے کے بعد اپنے اقربا کو دوسرے مسلمانوں کی گردنوں پر سوار نہ کر دیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

انشدک اللّٰہ یا علی ان ولیت من امور الناس شیئًا ان تحمل بنی ھاشم علی رقاب الناس انشدک اللّٰہ یا عثمان ان ولیت من امور الناس شیئا ان تحمل بنی معیط علی رقاب الناس انشدک اللّٰہ یا سعدان ولیت من امور الناس شیئا ان تحمل اقاربک علی رقاب الناس. اے علیؓ میں تجھے اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کے معاملہ میں کوئی ذمہ داری تم پر ڈال دی جائے تو تم بنی ہاشم کو لوگوں کی گردنوں پر سوار کرنے کی کوشش نہ کرنا اور اے عثمانؓ میں تجھے اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں۔ اگر تیرے ہاتھ میں مسلمانوں کے امور کی باگ ڈور آ جائے تو تم بنی معیط کو لوگوں کی گردنوں پر لادنے کی کوشش نہ کرنا اور اے سعد میں اللہ کا واسطہ دے کر یہ کہتا ہوں۔ اگر تم مسلمانوں کے امیر بنا دیے جاؤ تو اپنے اقرباء کو لوگوں کی گردن پر لادنے کی کوشش نہ کرنا۔

حاجب (دربان) سے احتراز: حکام حکومت کو یہ چاہیے کہ وہ عوام کی مشکلات سننے کے لیے ہر وقت اپنے دروازے کھلے رکھیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: عَنْ عَمرِو بنْ مُرَّةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَامِنْ اِمَامٍ يُغْلِقُ بَابَهٗ دُوْنَ ذَوِى الْحَاجَةِ وَالْخَلَّةِ وَالْمَسْكَنَةِ اِلَّا اَغْلَقَ اللّٰهُ اَبْوَابَ السَّمَاءِ دُوْنَ خَلَّتِهٖ وَحَاجَتِهٖ وَمَسْكَنَتِهٖ. (ترمذی) یعنی عمر بن مرہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا کہ جو امیر ضرورت مندوں، حاجت مندوں اور مسکینوں کے لیے اپنے دروازے بند رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت اور حاجت کے دن اس کے لیے آسمان کے دروازے بند کر دے گا۔

حضرت عمر سے روایت ہے کہ جس وقت وہ اپنے عاملوں کو بھیجتے تو ان پر یہ شرط لگاتے کہ وہ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوں اور میدہ نہ کھائیں اور باریک کپڑا نہ پہنیں اور لوگوں کی حاجتوں کے وقت اپنے دروازے بند نہ کریں۔ پس اگر تم ان باتوں میں سے بات کرو گے تو تم سزا کے مستحق ہو گے۔ (مشکوٰۃ ۱/۱۷ بروایت بیہقی)

ہدیے اور تحفے قبول کرنے سے احتراز: سرکاری حکام کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ عوام سے ہدیے قبول کریں کیونکہ رشوت پیش کرنے اور قبول کرنے کے لیے ایک چور دروازہ ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

هَدَايَا الْعُمَّالِ غُلُوْلٌ. (احمد معجم اوسط للطبرانی) عمال کا ہدیہ قبول کرنا خیانت ہے۔

بخاری، مسلم اور ابو داؤد تینوں کتب احادیث میں یہ روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبیلہ ازد پر ایک صاحب کو تحصیل دار مقرر کیا۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر واپس آیا تو حساب دیتے ہوئے کہا کہ یہ بیت المال کا حصہ ہے اور یہ مجھے تحفہ کے طور پر ملا ہے۔ اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ دیا اور فرمایا بعض لوگوں کو محصل کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے اور جب وہ کام سے فارغ ہو کر واپس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ حصہ بیت المال کا ہے اور یہ مجھے ہدیہ کے طور پر ملا ہے اگر یہ بات صحیح ہے تو وہ اپنے گھروں میں کیوں نہ بیٹھے رہے اور وہیں ان کے پاس ہدیے آ جاتے۔

رشوت لینے سے احتراز: رشوت انسان کو حق اور عدل کی راہ سے بہت دور لے جاتی ہے۔ ظلم اور بے انصافی کے دروازے کھولتی ہے۔ اس وجہ سے اسلام رشوت لینے سے منع فرماتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اَلرَّاشِىْ وَالْمُرْتَشِىْ كِلَاهُمَا فِى النَّارِ. یعنی رشوت دینے اور رشوت لینے والا دونوں دوزخی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الرَّاشِىْ وَالْمُرْتَشِىْ فِى الْحُكْمِ. (احمد، ابوداؤد،

ترمذی) یعنی فیصلوں میں رشوت دینے اور لینے والے پر خدا کی لعنت ہے۔

حضرت ثوبان سے روایت ہے۔

اَلرَّاشِي وَالْمُرْتَشِي وَالرَّائِشِي يَعْنِي الَّذِي يَمْشِي بَيْنَهُمَا. (رواہ احمد) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رشوت دینے والے رشوت لینے والے اور رشوت دلانے والے یعنی اس شخص پر جو بیچ میں دلالی کرتا ہے لعنت کی ہے۔

جھوٹ نہ بولے: جھوٹ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے اس ام الآثام سے بچنے کی بار بار تلقین کی ہے۔ اسلامی حکومت کے کارکن کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ جھوٹ نہ بولے اور صداقت کو اپنا شعار بنائے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ. (الحج ۲۲:۳۰) جھوٹ بات سے بچو۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ. (البقرہ ۲:۴۲) اور سچ کو جھوٹ کے ساتھ نہ ملاؤ۔

ثابت قدمی: حاکم کو ثابت قدم، مستقل مزاج اور بلند ہمت ہونا چاہیے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَاصْبِرْ عَلٰى مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ. (لقمان ۳۱:۱۷) اور جو کچھ تم پر مصیبت آئے اس پر صبر کر یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

ذاتی کاروبار کی ممانعت: اسلامی حکومت میں کسی ملازم کو ذاتی کاروبار کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ کارکن اپنے فرائض سے غافل رہے گا اور اس کی توجہ اپنی تجارت کی طرف لگی رہے گی۔ دوم: طبعی طور پر اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھائے گا۔ حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق مذکور ہے کہ ان کے پاس بہت مال و دولت جمع ہو گئی۔ یہاں تک کہ ان کے پاس گھوڑوں کی کئی نسلیں جمع ہو گئیں اور ان کی منتشر اراضیات یک جا ہو گئیں اور تجارت خوب چمک اٹھی۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا حضرت! اس مال میں سے آپ اپنا رأس المال اور اپنی تنخواہ رکھ لیں اور باقی ساری دولت بیت المال میں جمع کرا دیجئے۔ (الادارۃ اسلامیہ کرد علی)

سرخ فیتے کا استیصال: حضرت عمرؓ اپنے کوفہ کے عامل کو لکھتے ہیں:

> ''میرا خیال ہے کہ اگر میں تجھے لکھوں کہ فلاں آدمی کو ایک بکری دے تو تو مجھے لکھے گا کہ نر ہو یا مادہ۔ اگر میں لکھوں کہ کوئی ایک دے دے تو تو پھر یہ پوچھے گا کہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ اگر میں جواب دوں کوئی ایک ہو تو پھر خط لکھ بھیجے گا کہ بھیڑ ہو یا بکری۔ جب میں نے ایک بار لکھ دیا کہ ایسا کر تو اپنی صواب دید پر اس کی تعمیل کر میری طرف بار بار رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔''

دین کی تعلیم: اسلامی حکومت کا اصل مقصد دین اسلام کی اشاعت کرنا اور تعلیم دینا ہے۔ اس وجہ سے اسلامی حکومت کے عمال کا صرف یہ فرض نہیں ہے کہ وہ دفتری کاموں میں ہی مقید ہو کر رہ جائیں بلکہ ان کا ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کو دین اسلام سکھائیں۔

حضرت عمرؓ نے ایک خطبہ میں فرمایا: اللّٰهُمَّ انی اشهدک علی امراء الامصار فانی انما بعثتهم لیعلموا الناس دینهم وسنة نبیهم و یعدلوا علیهم و یقسموا فیئهُمْ بینهم و یرفعوا الی ما اشکل علیهم من امرهم. اے اللہ میں تجھ کو اپنے عمال پر گواہ ٹھہراتا ہوں۔ میں نے ان کو صرف اس لیے مقرر کیا ہے کہ وہ لوگوں کو ان کا دین اور ان کے نبی کی سنت سکھائیں اور ان کے اندر عدل قائم کریں اور فئی تقسیم کریں اور اگر ان کو کوئی مشکل پیش آ جائے تو میرے سامنے پیش کر دیں۔

اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے اغراض بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ. (آل عمران ۳:۱۶۴) رسول انھیں خدا کی آیات پڑھ کر سناتا ہے ان کو گناہوں کی میل سے پاک صاف کرتا ہے انھیں کتاب سکھاتا ہے اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی ایک غرض تعلیم دین اسلام ہے۔ اس وجہ سے اسلامی حکومت کے ہر کارکن پر یہ فرض ہے کہ لوگوں کو دین اسلام سکھائے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عمال کو جو نامہ مبارک (ابن ہشام جلد ۴ صفحہ ۲۴۱) لکھے تھے ان میں بھی عمال کو دین کی تعلیم دینے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

عدلیہ

حکومت کا تیسرا صیغہ عدلیہ (قضا) (Judiciary) ہے۔ قضا اس فیصلے کو کہتے ہیں جو بااختیار ادارے کی طرف بطور حکم فیصل صادر ہو۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: ''قضا ایک فرض اور محکم ذمہ داری ہے اور ایک قانون ہے واجب العمل (المبسوط السرخسی ج ۱۶ ص ۶۰) ابن ہمام حنفی فرماتے ہیں۔ قضا وہ ادارہ ہے جو نزاعی مقدمات کا فیصلہ دیتا ہے۔'' (فتح القدیر جلد ۶ صفحہ ۳۵۶)

محمود بن محمد بن عرنوس فرماتے ہیں۔ حکومت کے مقرر کردہ بااختیار ادارے کی طرف سے کتاب و سنت اور احکام شرعیہ کی روشنی میں لوگوں کے تنازعات کا تصفیہ کرنے اور مقدمات کے فیصلے کرنے کا نام قضا ہے۔ (تاریخ القضاء فی الاسلام)

اس صیغہ کا یہ کام ہوتا ہے کہ صیغہ مقننہ نے جو قوانین بنائے ہیں اور انتظامیہ نے جو قوانین بنائے ہیں اگر ان کی کوئی شخص خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے سزا دی جائے اور عدل قائم کرے۔ عدلیہ (قضا) کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ دیکھے کہ آیا قانون پر صحیح معنوں میں عمل ہوتا ہے یا نہیں اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا ملی ہے یا کہ نہیں۔

اسلام بلاتفریق مذہب وملت عدل و انصاف کو حکومت کا اہم فرض قرار دیتا ہے اور اسی پر سوسائٹی اور حکومت کی بقا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ. (الحدید ۵۷:۲۵) اور ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور عدل و انصاف کے احکام اتارے تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ. (النساء ۴:۵۸) اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کا فیصلہ کرو۔

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی. (الانعام ۶:۱۵۲) اور جب تم بات کہو تو انصاف سے کام لو چاہے وہ تمہارا قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ. (نحل ۱۶:۹۰) یقیناً اللہ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی. (المائدہ ۵:۸) عدل قائم کرو کیونکہ وہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عادل کی بڑی فضیلت بیان کی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا۔ سات شخصوں کو خدا اپنے سایہ میں جگہ دے گا جن میں سے ایک امام عادل ہوگا۔ (بخاری)

محاکم عدلیہ

عدالت عالیہ مرافعہ: اسلامی ریاست کی سب سے بڑی عدالت مرافعہ ہے۔ اس عدالت کا قاضی اکبر امام ہوتا ہے۔

اس عدالت کا ذکر قرآن مجید میں واضح ہے: ارشاد الٰہی ہے: یَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ. (ص ۳۸:۲۶) اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں حاکم بنایا ہے سو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر۔

فَاحْکُمْ بَیْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَکَ مِنَ الْحَقِّ. (المائدہ ۵:۴۸) اے رسولؐ! ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتارا ہے اور اس کو چھوڑ کر جو تیرے پاس حق آیا ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔

ایک اعرابی کا قول ہے۔ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اقْضِ بَیْنَنَا الخ. (عمدۃ القاری عینی جلد ۱۱ صفحہ ۴۱۹) اے رسول اللہؐ ہمارے درمیان فیصلہ کرو۔

خلفائے راشدین کے عہد میں خلفاء مقدمات کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔

مصنف المبسوط رقم طراز ہیں: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ یَقْضِیْ وَالْخُلَفَاءُ بَعْدَهٗ. پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فیصلے کیا کرتے تھے بعدہٗ آپ کے خلفاء۔ (المبسوط جلد ۱۶ صفحہ ۸۶)

مصنف عمدۃ القاری لکھتا ہے: اَوْلَی النَّاسِ بِالْقَضَاءِ الْخَلِیْفَةُ. (عمدۃ القاری عینی جلد ۶ صفحہ ۱۱) سب لوگوں سے زیادہ حق دار فیصلہ کرنے کا خلیفہ ہوتا ہے۔

۲۔ عدالت عالیہ وزارت عدل: صیغہ عدل کا وزیر اس عدالت کا جج ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں وزارت عدل کا قلمدان حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں تھا۔ سنن کبریٰ بیہقی میں لکھا ہے لما ولی ابوبکر ولی عمر القضاء. سنن کبریٰ بیہقی جلد ۱۰ صفحہ ۶۵) جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے قضاء کی وزارت حضرت عمرؓ کے سپرد کی۔

جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو اس عہدہ پر عبداللہؓ بن مسعود کو مقرر فرمایا تھا۔ (ایضاً) دور عباسیہ میں ''محکمہ عدلیہ کی مطلق العنان وزارت قاضی ابو یوسفؒ کے حوالے کی گئی تھی (امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی از مولانا مناظر احسن گیلانی صفحہ ۳۴۸) قاضی یحییٰ بن اکثم مامون کے زمانے میں اس کے قاضی القضاۃ اور وزیر تھے۔ (تاریخ القضاۃ فی الاسلام از محمد بن محمود بن عرنوس صفحہ ۹۸)

۳۔ یہ عدالت صوبہ کی سب سے بڑی اور آخری عدالت ہوتی ہے۔

عہد فاروقی میں شریح بن الحارث بصرہ کی عدالت عالیہ کے قاضی تھے۔ (عمدۃ القاری جلد ۱۱ صفحہ ۳۹۷)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ عہد فاروقی میں بصرہ کی عدالت عالیہ کے قاضی تھے۔ (المبسوط السرخسی جلد ۱۶ صفحہ ۲۰)

عہد فاروقی میں امیر معاویہؓ شام کے صوبہ کے قاضی تھے۔ (سنن کبریٰ بیہقی جلد ۱۰ صفحہ ۶۵)

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے عہد خلافت میں ولایت بصرہ کی عدالت عالیہ کے قاضی موسیٰ بن انس تابعی تھے۔ (عمدۃ القاری جلد ۱۱ صفحہ ۳۸۷)

۴۔ عدالت فوق العادہ (اسپیشل ٹریبونل) یہ عدالت خاص حالات میں خاص معاملات کے متعلق قائم ہوتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں اس قسم کی عدالتوں کی مثالیں موجود ہیں۔ سنن کبریٰ بیہقی میں لکھا ہے۔

بعث رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم العمال والقضاۃ و کذلک الخلفاء بعدہ. یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمال اور قاضی بھیجے اس طرح آپ کی وفات کے بعد خلفاء نے بھی۔ (عمدۃ القاری جلد ۱۱ صفحہ ۳۹۱)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں ابوعبیدہؓ بن الجراح نجران کی عدالت کے قاضی مقرر ہوئے۔ اس طرح حضرت علیؓ حضرت معاذ بن جبلؓ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ عدالت یمن کے قاضی مقرر ہوئے تھے۔

ابتدائی عدالتیں

۱۔ عدالت صلح۔

۲۔ عدالت اصلاح بین الناس۔

۳۔ عدالت تحکیم۔

۴۔ عدالت حاکمہ ابتدائیہ۔

۱۔ عدالت صلح: قاضی عہدہ کے اعتبار سے اس امر پر مامور کیا جاتا ہے کہ وہ سب سے پہلے مقدمہ کے فریقین کو صلح کی طرف مائل کرے۔

۲۔ عدالت اصلاح بین الناس: قانونی دعاوی سننے کے بعد جب عدالت فریقین میں صلح کرانے میں ناکام ہو جاتی ہے تو پھر یہ عدالت نزاعی مقدمات کو مصالحت کے اصول پر فیصلہ کرتی ہے۔ اس مقصد میں قانون سے پورا کام لیتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ. (الحجرات ۴۹:۹) پس ان کے درمیان عدل سے صلح کرا دو۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ. (الحجرات ۴۹:۱۰) مومن بھائی بھائی ہیں سو اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو۔

۳۔ عدالت تحکیم: (ثالثی) یہ عدالت فریقین کی مرضی کے مطابق ثالث مقرر کرتی ہے۔ پھر وہ ثالث فریقین کا دعویٰ اور جواب دعویٰ سن کر فیصلہ کر دیتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَا اِصْلَاحًا. (النساء ۴:۳۵) ایک ثالث خاوند کی طرف سے مقرر کرو اور ایک ثالث عورت کی جانب سے اگر یہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ اور حضرت ابی بن ابی کعبؓ کا مقدمہ حضرت زیدؓ بن ثابت کی عدالت تحکیم میں پیش ہوا تھا۔ (المبسوط للسرخسی جلد ۱۶ صفحہ ۸۳)

۴۔ عدالت حاکمہ ابتدائیہ: مقدمہ کی قانونی سماعت کرنے والی پہلی عدالت ہے۔

عدالت حاکم مصر: ہر ضلع میں اس قسم کی عدالت ہوتی ہے۔ شدید سزاؤں کے مقدمات کے فیصلے صرف اسی عدالت میں ہوتے ہیں۔ ابتدائی عدالت ان کا

فیصلہ نہیں کر سکتی۔

یہ وہ عدالت کی قسمیں ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور سے ثابت ہیں۔ زمانے کے نئے تقاضوں کے مطابق عدالتوں کا ڈھانچہ بدلہ جا سکتا ہے۔ لیکن عدالت کی رو سے انصاف ہر حالت میں برقرار رہنا چاہیے۔ اگر کسی نظام عدالت سے عدل و انصاف قائم نہ ہو رہا ہو تو وہ نظام قرآن کی رو سے باطل ہوگا۔

شہادت سے رجوع: اگر گواہ اپنی گواہی سے پھر جائے تو اس کی شہادت کا شرعی اثر زائل ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ بیان عدالت میں ہونا چاہیے۔

قضاۃ کے تقرر کے اختیارات اور طریقہ

اسلامی قانون میں قاضی کے تقرر کے اختیارات خلیفہ (سربراہ مملکت) کو حاصل ہیں چاہے وہ خود کرے یا اپنے کسی نائب کے ذریعہ سے اس تقرر کو عمل میں لائے۔

حضرت عمرؓ نے مصر کے قضاۃ کے تقرر کے اختیارات مصر کے گورنر حضرت عمروؓ بن العاص کو سونپ دیے تھے۔

خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں قاضیوں کے نصب وعزل کے تمام اختیارات قاضی القضاۃ حضرت امام ابو یوسف کے ہاتھ میں تھے۔

قاضی کی نامزدگی پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے علامہ ماوردی لکھتے ہیں اور تمام عہدوں کی طرح قضاۃ کے تقرر کی بھی دو صورتیں ہیں۔ اگر نامزدگی بالمشافہ ہو رہی ہے تو نامزدگی زبانی الفاظ سے ہوگی اور غیر موجودگی میں خط و کتابت کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے۔ اعلان تقرر میں صریح الفاظ بھی استعمال ہونے چاہئیں۔ نامزدگی میں یہ ضروری ہے کہ صدر مملکت قاضی سے دستور اور قانون کی وفاداری کا حلف لے اور اس میں اس کے اختیارات اور فرائض کی وضاحت بھی ضروری ہے۔

ججوں (قاضیوں) کا تقرر بھی ہر ملک اپنے حالات کے پیش نظر کر سکتا ہے لیکن جس کے ہاتھ میں بھی جج کا تقرر ہو وہ میرٹ پر کرے کیونکہ عدالتی انصاف سے ہی ملک میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔

عدلیہ کی آزادی

قاضی فیصلہ جات کرنے میں بالکل آزاد ہے خلیفہ یا کسی اور بااثر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسے کسی فیصلے پر مجبور کرے بلکہ وہ اسے کسی مقدمہ کی دوبارہ سماعت کے لیے بھی مجبور نہیں کر سکتا۔

القاضی اذا قضی فی حادثة فی الحق ثم امر السلطان ان یسمع هذه الحادثة ثانیا بمشهد من العلماء لا یفترض علی القاضی ذلک۔ (باب خامس کتاب اداب القاضی) قاضی جب کسی مقدمہ میں کوئی فیصلہ کر چکے اس کے بعد سلطان اسے حکم دے کہ وہ اس مقدمہ کی دوبارہ سماعت علماء کے سامنے کرے تو اس حکم کا ماننا قاضی کے لیے ضروری نہیں۔

اسلامی حکومت میں قاضی اپنے دائرہ اختیارات میں یہاں تک آزاد ہے کہ وہ خلیفہ کو اپنی عدالت میں بلا سکتا ہے اور اس کے خلاف قاضی کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا جا سکتا ہے اور خلیفہ بلاچون و چرا عدالت میں حاضر ہوگا۔

قاضی کی شرائط

۱۔ مسلمان ہو: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا. یعنی اللہ نے مسلمانوں پر کافروں کو کوئی اختیار نہیں دیا اس کی وجہ یہ ہے کہ قاضی شریعت اسلامی کے تحت فیصلے کرنے کا پابند ہے۔ اس لیے یہ بات واضح ہے کہ شریعت اسلامی سے دلچسپی صرف مسلمانوں کو ہی ہو سکتی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ غیر مسلم اپنے ہم مشربوں کے فیصلے کر سکتے ہیں۔ دور حاضر میں امام ابوحنیفہ کا مسلک ہی زیادہ وقیع ہے۔ کہ غیر مسلم کو جج بنایا جا سکتا ہے۔ اگر ان کو کلیدی قسم کے مقدمے نہ دیئے جائیں تو ان میں احساس محرومی پیدا ہوگا جو ملکی استحکام کے لیے ضرر رساں ہے۔

۔ مرد ہو بالغ ہو: نابالغ پر کوئی حکم واجب نہیں ہے۔ عورتیں قاضی نہیں ہو سکتیں۔ احناف کے نزدیک عورتیں بھی قاضی بن سکتی ہیں چونکہ ماوردی شافعی مذہب کا فقیہ ہے اس وجہ سے امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق عورتوں کے عہدۂ قضاء پر فائز ہونے کو ناجائز قرار دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے احناف کا مذہب زیادہ قرین قیاس ہے اگر کوئی عورت علمی شرائط پوری کرتی ہے اس کو قاضی بنانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کہ عورت کو جج بنانے میں کوئی قباحت نہیں اور احناف کا مسلک زیادہ درست ہے۔

۳۔ ذہین و فطین ہو: معاملات کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

۴۔ عادل ہو: عدالت سے مراد یہ ہے کہ وہ صادق القول امین پاک دامن اور پرہیزگار شبہات سے محفوظ و مصئون خوشی و ناخوشی کی حالت میں یکساں قابل اعتماد ہو۔

۵۔ قاضی کی قوت سامعہ اور قوت باصرہ میں کسی قسم کا نقص نہ ہو تاکہ مقدمہ کی ساعت میں خلل واقع نہ ہو۔

۶۔ قاضی مجتہد اور اصول شرعیہ سے واقف ہو تاکہ مقدمات کا کتاب الٰہیہ اور سنت رسول کی روشنی میں فیصلے کر سکے۔

۷۔ آزاد ہو۔

۸۔ حرص اور لالچ سے نفرت کرنے والا ہو۔

قاضی کے اوصاف' عدالت کے آداب وضوابط

۱۔ قاضی عدالت کے فرائض اس یقین کامل کے ساتھ انجام دے کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔

۲۔ عدالت کا کام وقار کے ساتھ کرنا چاہیے السرخسی رقم طراز ہیں۔

فلمجالس القضاء من المهابة والحشمة. (المبسوط جلد ۱۶ صفحہ ۶۶، ۶۷) عدالت کے لیے وقار لازمی ہے۔

۳۔ فریقین میں برابر کا معاملہ کرے کسی ایک فریق کو کسی رنگ میں بھی دوسرے فریق پر فوقیت نہ دے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: **سَوِّی بین الخصمین فی لحظک ولفظک.** یعنی حرکات وسکنات اور گفتگو میں فریقین کے ساتھ برابر کا سلوک کرو۔

۴۔ قاضی کو غرباء اور باہر سے آنے والوں کے مقدمات کی ساعت پہلے کرنی چاہیے۔

۵۔ مقدمات کے فیصلے تنہائی میں نہ کرے۔ اس سے بدگمانیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

۶۔ قاضی عدالت میں نہ خود کسی کو سلام کرے اور نہ کوئی دوسرا اس کو سلام کرے۔

۷۔ تحفے قبول نہ کرے' فقہاء فرماتے ہیں:

''حاکم عدالت کسی کا تحفہ قبول نہ کرے سوائے اس رشتہ دار یا دوست کے جو اہل مقدمہ میں سے نہ ہو اور شروع سے اس کی عادت تحفہ بھیجنے کی ہو۔''

۸۔ قاضی کو غصہ کے عالم میں عدالت کا کام نہیں کرنا چاہیے۔ ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''کوئی حاکم دو آدمیوں کے معاملہ میں غصہ کی حالت میں فیصلہ نہ دے۔'' (فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۱۱۷)

۹۔ عورتوں اور مردوں کی ساعت الگ الگ ہونی چاہیے۔ مصنف المبسوط لکھتے ہیں۔

للقاضی ان یقدم النساء. (المبسوط جلد ۱۶ صفحہ ۸۰) یعنی قاضی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ عورتوں کو مقدم رکھے۔

۱۰۔ فریقین کو قاضی کے سامنے بیٹھنا چاہیے۔ ابو داؤد نے عبداللہؓ بن زبیر سے روایت کی ہے۔ **قضی رسول الله صلی الله علیه وسلم ان الخصمین یقعد ان بین یدی الحاکم.**

۱۱۔ قاضی فریقین میں سے کسی ایک فریق کو گھر یا تنہائی میں ملنے یا گفتگو کرنے کی اجازت نہ دے۔

۱۲۔ قاضی صرف ظاہری حالت کے مطابق فیصلہ دے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ **امرت ان احکم بالظاهر والله یتولی السرائر** یعنی مجھے صرف ظاہری حالت کے مطابق فیصلہ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ بھیدوں اور اندرونی حالات کا علم صرف اللہ کو ہے۔

۱۳۔ عدالت میں رویہ نرم رکھنا چاہیے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذؓ بن جبل کو ہدایت فرمائی۔ **یسرا ولا تنفرا.** (عمدۃ القاری جلد ۱۱ صفحہ ۲۰۴)

۱۴۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں کے بیانات پوری توجہ کے ساتھ سن کر فیصلہ کرنا چاہیے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ کو یمن بھیجتے ہوئے نصیحت فرمائی۔ **فاذا جلس بین یدک الخصمان فلا تقضی حتی تسمع کلام الاخر کما سمعت کلام الاول فانه احری ان یتبین**

لک وجه القضاء. یعنی جب تیرے سامنے فریقین بیٹھ جائیں تو اس وقت تک فیصلہ نہ کرنا جب تک پہلے فریق کی طرح دوسرے فریق کا بیان بھی نہ سن لے کیونکہ صحیح فیصلہ کرنے کے لیے یہی طریقہ مناسب ہے۔

۱۵۔ قاضی مقدمہ کی پیشی اور شہادتیں گزارنے کے لیے ایک تاریخ مقرر کر دے اگر تاریخ مقرر پر مدعی گواہ نہ لائے تو اس کے خلاف فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انصاف کا یہ تقاضا ہے کہ مدعی سے دریافت کر لیا جائے کہ گواہ کیوں حاضر نہیں ہوئے اگر وجوہ معقول ہوں تو دوبارہ گواہ پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔

۱۶۔ قاضی گواہ سے دریافت کرے کہ وہ کیا گواہی دینا چاہتا ہے اور کسی گواہ پر قاضی اثر نہ ڈالے۔

۱۷۔ قاضی ہمیشہ عدل پر ثابت قدم رہے۔ کسی حالت میں بھی اس کا پاؤں نہ ڈگمگائے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ. (النساء۴:۵۸) اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کا فیصلہ کرو۔

۱۸۔ قاضی کو فیصلہ تردد کی حالات میں نہیں کرنا چاہیے۔ کہیں شبہہ کے مواقع آ جائیں تو فیصلہ میں توقف کرے خوب غور و فکر کرے اگر قاضی کو انصاف میں شک کا خیال گزرے تو وہ مقدمہ کسی دوسری عدالت میں بھیج دے۔

۱۹۔ قاضی جنبہ داری اور اقرباء پروری سے کام نہ کرے۔ ارشاد الٰہی ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا. النساء۴:۱۳۵) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو انصاف پر قائم ہونے والے اللہ کے لیے گواہی دینے والے رہو۔ گو معاملہ تمہاری اپنی ذات یا ماں باپ اور قریبوں کے خلاف ہو۔ اگر کوئی امیر ہو یا غریب تو اللہ دونوں کا تمہاری نسبت زیادہ خیر خواہ ہے سو تم خواہش کی پیروی نہ کرو تاکہ عدل کر سکو اور اگر تم پیچ دار بات کرو یا (حق سے) اعراض کرو تو یقیناً جو تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى. (انعام ۶:۱۵۲) اور جب تم مقدمہ کا فیصلہ کرو تو انصاف سے کرو خواہ قریبی رشتہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

۲۰۔ قاضی سزا اس وقت تک نہ دے جب تک کہ اس کو حتمی یقین نہ ہو جائے کہ گواہیاں ہر لحاظ سے شک و شبہ اور جھوٹ سے خالی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"جب تک کسی شخص کے خلاف ایسے آدمی گواہی نہ دیں گے جن کی دیانت اور عدالت ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہو اس وقت تک اس پر کوئی تعزیر قائم نہ کی جائے گی۔

۲۱۔ قاضی کی تنخواہ مقرر ہونی چاہیے تاکہ وہ رشوت لینے پر مجبور نہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے عامل مصر کو لکھا کہ جب تم کسی شخص کو قضا کا عہدہ تفویض کرو تو اس کی تنخواہ مقرر کرو تاکہ اس کے اخراجات زندگی اسے رشوت لینے پر مجبور نہ کریں۔

۲۲۔ تمام فیصلے حق اور انصاف کے مطابق ہوں جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ. (المائدہ ۵:۴۸) پس تو لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے کر اور اس قانون حق کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ فِى الْاَذَلِّيْنَ. (المجادلہ ۵۸:۲۰) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین (حق اور انصاف) کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں۔

قاضی کے اختیارات و فرائض

تاریخ اسلامی میں فیصل تنازعات و مقدمات کے علاوہ خلفاء و امراء نے قاضی کو کچھ مزید بھی اختیارات دے رکھے تھے۔ علامہ ابوالحسن ماوردی نے انھیں دس شقوں میں تقسیم کیا ہے جن کی تلخیص بیان کی جاتی ہے۔

۱۔ تنازعات کے فیصلے کرنا۔

۲۔ جب کسی شخص کا حق اقرار یا گواہی کے ذریعہ مدعا علیہ پر ثابت ہو جائے اسے اس کا حق دلوانا۔

۳۔ نابالغ بچوں اور مرفوع القلم لوگوں کے اموال کی حفاظت کرنا۔ اسی طرح دیوالیہ اور سفیہ لوگوں کے معاملات و تصرفات پر پابندی عائد کرنا تاکہ وہ اپنی سفاہت کی وجہ سے مستحقین کے حقوق کو برباد نہ کر دیں۔ لاوارث اور غیر موجود لوگوں کے اموال کی حفاظت کرنا قاضی کے فرائض میں شامل ہے۔

۴۔ اموال یتامیٰ کی حفاظت کرنا۔

۵۔ اوقاف کی نگرانی۔

۶۔ وصایا کا نفاذ ان کی شرائط کے مطابق۔

۷۔ بیوہ عورتوں کے ولی نہ ہوں تو ان کے نکاح کے بارے میں کفو کی نگرانی کرنا۔

۸۔ حدود جاری کرنا۔

۹۔ راستوں اور مکانات کے بارے میں ناجائز' فضول اور غیر قانونی تعمیرات کی نگرانی کرنا۔

۱۰۔ گواہوں اور امینوں کی منظوری دینا' نائبوں کو مقرر کرنا' قوی اور ضعیف' معزز اور وضیع کے درمیان عدل و مساوات قائم کرنا۔

ضابطہ شہادت

عدالت میں اثبات دعویٰ کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ حدیث میں آتا ہے۔ لَوْیُعْطَی النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ لَادَّعٰی نَاسٌ دِمَاءَ رِجَالٍ وَاَمْوَالَهُمْ. (مسلم) یعنی اگر لوگوں کے دعویٰ کے مطابق ہی فیصلے کر دیے جائیں تو عدالتوں میں خون اور مال کے بہت سے دعویٰ دائر کر دیے جائیں گے۔ پس عدالت میں دعویٰ کو ثابت کرنا اس لیے ضروری ٹھہرتا ہے کہ لوگ بے بنیاد دعاوی عدالتوں میں نہ کرنے شروع کر دیں۔

پس اثبات دعویٰ کا یہ مطلب ہے کہ دلیل و براہین کے ذریعہ دعویٰ کو حد یقین تک پہنچا دیا ہے۔

اثبات دعویٰ کے لیے حسب ذیل ذرائع و وسائل ہیں:

ا۔ بینہ: بینہ سے مراد ہر وہ ذریعہ اور وسیلہ ہے جس کے ذریعہ حق اور باطل میں تمیز ہو جائے اور حق کھل کر سامنے آ جائے۔ ابو داؤد کی ایک روایت میں ہے۔ اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِي وَالْيَمِيْنُ عَلَى الْمُدَّعٰى عَلَيْهِ. یعنی اثبات دعویٰ کے لیے مدعی گواہ لائے او' مدعاعلیہ پر حلف فرض ہے۔ گواہ کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ ہدایت ہے کہ جب گواہ واقعہ کو سورج کی طرح روشن دیکھے تو شہادت دے۔ ورنہ نہ دے۔

۲۔ یمین (قسم): مدعی اگر مدعی علیہ کے الزام سے انکار کرتا ہے تو اس سے حلف لیا جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَوْيُعْطَى النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ لَادَّعٰی نَاسٌ دِمَاءَ رِجَالٍ وَاَمْوَالَهُمْ وَلٰكِنَّ الْبَيِّنَةَ عَلَى الْمُدَّعِي وَالْيَمِيْنُ عَلَى الْمُدَّعٰى عَلَيْهِ. اگر لوگوں کے حقوق محض دعویٰ کی بناء پر دے دیے جائیں تو بہت سے لوگ لوگوں کے خون اور مال کے مدعی ہو جائیں اس لیے مدعی اثبات دعویٰ کے لیے گواہ لائے اور مدعی علیہ انکار کی صورت میں حلف اٹھائے۔

کتب احادیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حلف کے الفاظ بھی مروی ہیں۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ آپ نے ایک آدمی سے فرمایا: احلف باللّٰہ الذی لا الہ الا ھو مالہ عندک شیء. یعنی تو حلف اٹھا کہ اللہ کی قسم جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اس کی کوئی چیز میرے پاس نہیں ہے۔

۳۔ قیافہ شناسی: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیافہ شناسی کی شہادت کو اعتبار کا درجہ دیا تھا۔ معتبر روایت ہے کہ حضرت اسامہؓ اور حضرت زیدؓ دونوں ایک چادر میں سوئے ہوئے تھے اور پاؤں کھلے تھے۔ آپ نے پاؤں کو دیکھ کر فرمایا یہ دونوں باپ بیٹا ہیں۔

حضرت اسامہ کالے رنگ کے تھے اور حضرت زید سفید رنگ کے تھے اس لیے لوگوں کو ان کے نسب میں شک تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیافہ سے اس اشتباہ کو رفع کر دیا۔

قیافہ شناسی کا فن عرب میں بہت رائج تھا ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ قیافہ شناسی صرف پاؤں کے نشان دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ گزرنے والا مرد ہے یا کہ عورت۔

۴۔ فراست: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بعض ایسے مقدمات بھی منقول ہیں جن میں آپ نے صرف فراست اور قرائن کی بناء پر فیصلہ صادر فرما دیا۔

۵۔ قسامت: قسامت کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی جگہ کوئی لاش ملے اور اس کے قاتل کا پتہ نہ چلے تو اس جگہ کے کچھ لوگوں سے اس کے بارے میں بریت کی قسم لی جائے۔

مسلم اور بخاری میں روایت ہے کہ ایک انصاری عبداللہ بن سہیل اور اس کا چچا زاد بھائی محیصہ بن مسعود خیبر گئے اور ان ایام میں خیبر کے یہود اور مسلمانوں کے درمیان صلح تھی۔ یہ دونوں اصحاب کسی ضرورت کے تحت ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ اتنے میں عبداللہ بن سہیل کو کسی نے قتل کر کے ایک

کنویں میں پھینک دیا۔ چنانچہ خیبر کے یہود پر اس قتل کا الزام لگایا گیا مقتول کے بھائی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کیا۔ آپ نے ان لوگوں سے فرمایا کیا تم قسم کھا کر کہہ سکتے ہو کہ فی الواقع یہود نے عبداللہ کو قتل کیا ہے انھوں نے کہا ہم کیوں کر قسم کھا سکتے ہیں جب کہ قتل ہمارے سامنے نہیں ہوا۔ اس پر آپ نے فرمایا تو پھر یہود میں سے پچاس اشخاص حلف اٹھائیں گے۔ انھوں نے کہا یا رسول اللہ! وہ تو مسلمان نہیں ہیں ہم ان کی قسم کیسے قبول کر لیں۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زکوٰۃ کے اونٹوں میں سے سو اونٹ دیت کے طور پر ان کو دیے۔

۶۔ قرعہ اندازی: بعض صورتوں میں قرعہ اندازی سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فیصلے صادر فرمائے۔ ایک مرتبہ ایک سواری کے جانور پر دو آدمیوں نے اپنا دعویٰ کیا اس پر آپ نے حکم دیا کہ قرعہ ڈال کر معلوم کیا جائے کہ کون حلف اٹھائے۔

اثبات دعویٰ کے یہ ذرائع اور وسائل اپنے اپنے موقع محل پر استعمال کیے جائیں گے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص کسی کو قتل کر دے قاضی کے سامنے مقدمہ پیش ہو تو قاضی قرعہ اندازی شروع کر دے۔ آیا اس نے قتل کیا ہے یا کہ نہیں۔

گواہ کے قانونی اوصاف

عادل ہونا: قانون کی نظر میں گواہ کے چند اوصاف ہیں۔ جن کا ہونا بہت ضروری ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِنْكُمْ یعنی اپنے میں سے دو عادل گواہ بناؤ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: لَا تَجُوْزُ شَهَادَةُ خَائِنٍ وَلَا خَائِنَةٍ وَلَا زَانٍ وَلَا زَانِیَةٍ وَلَاذِیْ غِمْرٍ عَلٰی اَخِیْهِ۔ (ابوداؤد) یعنی خائن اور خائنہ اور زانی اور زانیہ کی شہادت جائز نہیں ہے اور نہ اس شخص کی شہادت ایسے شخص کے حق میں جائز ہے جس سے اس کی عداوت ہے۔

اس طرح ترمذی میں روایت ہے کہ جس شخص کو کوئی حد لگ چکی ہے یا جو شخص پہلے کسی گواہی میں جھوٹا ثابت ہو چکا ہے۔ ان کی شہادت درجہ اعتبار تک نہیں پہنچتی اور اس طرح گھر والوں کے حق میں ان کے نوکروں وغیرہ کی گواہی بھی درست نہیں اور نہ کسی ایسے رشتہ دار یا دوست کی گواہی جائز ہوگی جس کے متعلق یہ گمان ہو کہ وہ جانبداری سے کام لے گا۔

ہدایہ جلد ثالث میں لکھا ہے۔

''باپ کے حق میں بیٹے کی گواہی' بیٹے کے حق میں باپ کی گواہی' بیوی کی گواہی خاوند کے حق میں اور خاوند کی گواہی بیوی کے حق میں' غلام کی شہادت آقا کے حق میں اور اجیر کی گواہی مستاجر کے متعلق قبول نہیں کی جائے گی۔''

جو لوگ کسی مسلمان پر زنا کا الزام لگا کر ثابت نہیں کر سکے تو ان کی گواہی معتبر نہیں ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ۔ (النور ۲۴:۴) اور ان کی گواہی قبول نہ کرو اور وہی فاسق ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے تہمت اور زنا کے حکم میں دوسرے کبائر بھی شامل کیے ہیں۔ ان کے مرتکب کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی اسلام نے گواہی کے لیے عقل' بلوغت' قوت حافظہ' گویائی' عدالت اور غیر متہم ہونے کی شرائط عائد کی ہیں۔

شہادت کی اقسام

۱۔ تواتر: وہ لسانی شہادت ہوتی ہے جب دعویٰ کے اثبات کے لیے اتنے آدمی گواہی دیں۔ جن کی نسبت عقل یہ باور نہ کر سکے کہ ان سب نے مل کر غلط بیانی سے کام لیا ہے۔

۲۔ احاد: جو شہادت اس قسم کے تواتر سے خالی ہو۔

۳۔ اقرار: جب مدعیٰ علیہ اس دعویٰ کی نسبت جو اس کے خلاف کیا گیا ہے جو اس کی شہادت اور تصدیق کر دے تو یہ عمل اقرار کے نام سے موسوم ہونے لگے گا۔

دستاویزی شہادت: عدالت میں دستاویزی شہادت بھی قابل قبول ہے لیکن اس شہادت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جعل کے شبہ سے خالی ہو۔

اسلامی مملکت کے اوصاف

پہلا وصف حکومت الٰہیہ کا قیام: اسلامی حکومت کا پہلا وصف دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہے۔ قرآن مجید میں خدا کی حکومت کو حکم کے لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ. (یوسف ۱۲:۴۰) حکم دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہی حاصل ہے۔

لَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِہٖۤ اَحَدًا. یعنی خدا کی حکومت میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔

فَالۡحُکۡمُ لِلّٰہِ الۡعَلِیِّ الۡکَبِیۡرِ. (المومن ۴۰:۱۲) یعنی حکومت کا منصب صرف اللہ تعالیٰ کے ہی لیے ہے جو بلند اور بڑا ہے۔

خدا کی حکومت اس دنیا میں کس طرح قائم ہوسکتی ہے۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں دیتا ہے کہ اس کے نازل کردہ قانون کو دنیا میں نافذ کیا جائے۔

ارشاد الٰہی ہے: فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الۡحَقِّ. (المائدہ ۵۰:۴۸) سو ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتارا ہے اور اس کو چھوڑ کر جو تیرے پاس حق آیا ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحَآدُّوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗۤ اُولٰٓئِکَ فِی الۡاَذَلِّیۡنَ. (المجادلہ ۵۸:۲۰) جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں۔

لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ. (الحدید ۵۷:۲۵) ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتارا تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ. (المائدہ ۵۰:۴۵) اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں پس وہ ظالم ہیں۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ. (النساء ۴:۵۹)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اور اپنے میں سے صاحب امر کی اطاعت کرو پھر اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان لائے ہو۔

اس آیت کریمہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ضروری ہے۔

۲۔ صاحب امر کی اطاعت اس وقت ضروری ہے جب وہ اللہ اور رسول کی اطاعت کے تابع ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

لَا طَاعَةَ فِي مَعْصِيَةٍ إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ. (بخاری ۶۴:۶۱) معصیت میں کوئی فرمانبرداری نہیں اطاعت صرف معروف میں ہے۔

عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فِيْمَا أَحَبَّ وَكَرِهَ إِلَّا أَنْ يُؤْمَرَ بِمَعْصِيَةٍ فَإِنْ أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ. (بخاری مسلم باب الجہاد) ہر مسلمان مرد پر سمع و طاعت لازم ہے۔ خواہ رضا مندی سے کرے یا ناپسندیدگی سے تاوقتیکہ اس کو گناہ کا حکم نہ دیا جائے پھر اگر گناہ کا حکم دیا جائے تو نہ سمع ہے اور نہ اطاعت۔

لَا طَاعَةَ الْمَخْلُوْقِ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ. یعنی خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں ہے۔

جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نائب ہونے کی حیثیت سے مسجد نبوی میں تمام لوگوں کے سامنے اس امر کا اقرار کیا۔ ایھا الناس انما انا متبع ولست بمبتدع فان انا احسنت فاعینونی وان انازعت فقومونی. (کتاب الاموال لابی عبید صفحہ ۳۶۶) اے لوگو! میں احکام اسلام کا پیرو ہوں اور کسی بدعت کا موجد نہیں ہوں۔ اگر احکام اسلامی کے مطابق زندگی بسر کروں تو میری مدد کرو اگر کجی اختیار کروں تو سیدھا کرو۔

صحابہ کرام نے جواب دیا اگر آپ نے اسلامی احکام سے ہٹ کر کوئی اور راہ اختیار کی تو ہم نیزوں کی انیوں سے آپ کو سیدھا کریں گے۔

حضرت سلمانؓ فرماتے ہیں: ان الخلیفة هو الذی یقضی بکتاب الله ویشفق علی الرعیة شفقة الرجل علی اهله فقال کعب الاحبار صدق. (الاسلام والحضارۃ العربیۃ جلد۲ صفحہ ۱۳۱) خلیفہ وہ ہوتا ہے جو قرآن کے مطابق فیصلہ کرے اور رعیت پر اس طرح شفقت کرے جس طرح ایک شخص اپنے اہل وعیال پر شفقت کرتا ہے۔ کعب احبار نے سنا تو کہا سلمان نے سچ کہا ہے۔

دوسرا وصف اتحاد نسل انسانی کی علمبردار: اسلامی حکومت نسل انسان کے اتحاد کی علمبردار ہے۔

اسلام تمام انسانوں کو ایک اصل کی شاخیں قرار دیتا ہے۔ یہ وہ عظیم الشان پیغام ہے جو ایک امی نبی نے دنیا کو دیا۔ نسل انسانی کی وحدت کا تصور تہذیب انسانی پر وہ احسان ہے جس کی نظیر دوسرے کسی نبی یا کسی انسان کی تعلیم میں نہیں ملتی۔ یہ اتنا بلند نظریہ ہے جو بغیر خدا کی وحی کے انسان کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ ارشاد الٰہی ہے:

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً. (النساء ۴:۱) اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا. (یونس ۱۰:۱۹) اور سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰی عِیَالِهٖ. (بیہقی کتاب الایمان) ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو اللہ کی مخلوق سے محبت کرتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَیْءٍ اِنِّیْ اَشْهَدُ اِنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ اِخْوَةٌ. (مسند احمد۔ ابوداؤد) ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار میں گواہی دیتا ہے کہ انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنَ. (المومنون ۲۳:۵۲) یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔ سو میرا تقویٰ کرو۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ. (الحجرات ۴۹:۱۰) مومن بھائی بھائی ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اَلْجَمَاعَةُ رَحْمَةٌ وَالْفِرْقَةُ عَذَابٌ. (کنوز الحقایق حرف الجیم) جماعت رحمت ہے اور متفرق ہونا عذاب ہے۔

تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ فِیْ تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَكٰی عُضْوٌ تَدَاعٰی لَهٗ سَائِرُ جَسَدِهٖ بِالسَّهْرِ وَالْحُمّٰی. (بخاری کتاب الاداب) تو مومنین کو ایک دوسرے سے رحم اور محبت اور مہربانی میں ایسا دیکھے گا جیسا کہ بدن میں ایک عضو بیمار ہو جائے تو سارے اعضاء بخار اور بیداری میں اس کے شریک ہوں۔

اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْیَانِ یَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضًا ثُمَّ شَبَّكَ بَیْنَ اَصَابِعِهٖ. (بخاری کتاب الاداب) ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایسا ہے جیسا کہ ایک عمارت کا ایک جز دوسرے جز کو قوت دیتا ہے پھر اپنی انگلیوں کو ملا کر مثال دی کہ اس طرح:

اِنَّمَا اَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ الْاِخْتِلَافُ. (کنوز الحقایق صرف الہمزہ) اگلے لوگوں کو اختلاف نے تباہ کیا۔

تیسرا وصف مساوات: مساوات سے یہ مطلب لینا کہ تمام لوگ ہر لحاظ سے برابر ہیں صحیح نہیں۔ مکمل مساوات ایک غلط بات ہے۔

ہر فرد دوسرے فرد سے قد و قامت، رنگ و روپ، ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے اعتبار سے جدا ہے۔ اس اختلاف کے دو سبب ہیں:

۱۔ پیدائشی سبب اور ۲۔ ماحول کا اثر

پیدائش کے وقت ہر فرد مختلف استعدادوں اور قوتوں کا مالک ہوتا ہے بعض ذہین وفطین ہوتے ہیں اور بعض غبی، بعض جسمانی طور پر مضبوط اور توانا ہوتے ہیں اور بعض نحیف اور لاغر یعنی اختلاف انسان کی ترقی اور زندگی کی رونق کا سبب ہے۔

ماحول کا اثر: انسان کی ذہنی اور جسمانی ترقی ماحول کے زیر اثر ہے اگر کسی کو صحت مند ماحول میسر آ جائے تو وہ دنیا میں ترقی حاصل کر لیتا ہے۔ اگر خراب میسر آ جائے تو اس کی تمام فطری صلاحیتیں اور استعدادیں نشوونما پانے سے رک جاتی ہیں جس طرح ایک بیج ہوتا ہے۔ اس میں پودے کے تمام اجزاء پنہاں ہیں جب اس بیج کو صحیح ماحول میسر آ جاتا ہے تو اس کی مخفی استعدادیں ظاہر ہو جاتی ہیں اور وہ پودے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اگر بیج کو صحیح ماحول میسر نہ آئے تو اس کی تمام مخفی استعدادیں ضائع ہو جاتی ہیں۔

اس مختصر سی بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا میں تمام انسان نہ تو ایک دوسرے کے برابر ہو سکتے ہیں اور نہ ہیں۔ علم تمدن میں مساوات کا صرف مفہوم یہ ہے کہ ہر فرد کو سیاسی' سماجی' قانونی اور اخلاقی طور پر بغیر امتیاز رنگ و نسل اور بلا تفریق دین و مذہب مساوی حقوق حاصل ہیں۔

سماجی مساوات: اسلامی حکومت میں تمام انسان سماجی لحاظ سے برابر ہوتے ہیں۔

اسلام تمام بنی آدم کو ایک ہی اصل کی مختلف شاخیں قرار دیتا ہے اور پیدائشی طور پر کسی کو ایک دوسرے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ گورا ہو کالا ہو۔ مشرق کا رہنے والا ہو' مغرب کا رہنے والا ہو۔ کسی قوم کسی نسل کسی علاقے کا رہنے والا ہو۔ سب بحیثیت انسان برابر ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً. (النساء ۴:۱) اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس ۱۰:۱۹) اور سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات ۴۹:۱۰) مومن بھائی بھائی ہیں۔

حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: قَدْ اَذْهَبَ اللّٰهُ عَنْكُمْ عَيْبَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَفَخْرَهَا بِالْاٰبَاءِ اِنَّمَا هُوَ مُؤْمِنٌ تَقِيٌّ وَفَاجِرٌ شَقِيٌّ وَالنَّاسُ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ. (ترمذی جلد ۲ ابواب المناقب) یعنی اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ تم میں سے جاہلیت والے تکبر اور اباؤ اجداد پر تفاخر کو دور کر دیا ہے۔ کیونکہ اصول صرف یہ ہے کہ ایک شخص نیک عمل کرنے والا اور خدا کو ماننے والا ہوتا ہے اور دوسرا بدعمل اور بدبخت اور سب لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوا تھا۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ اِنِّيْ اَشْهَدُ اِنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ اِخْوَةٌ. (احمد، ابوداؤد) اے ہمارے رب ہر چیز کے پالنے والے میں گواہی دیتا ہوں کہ انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے مشہور خطبے میں فرمایا:

اَيُّهَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ اَلَا لَافَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى. (مسند احمد) لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر' عجمی کو عربی پر' سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

عرب کے اعلیٰ طبقہ کے لوگ ادنیٰ طبقہ کے لوگوں سے تعاون کرنا عار سمجھتے تھے۔ اسلام نے اس مصنوعی تفریق کو بھی ختم کر دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی خالہ زاد بہن کی شادی اپنے غلام حضرت زیدؓ بن حارثہؓ کے ساتھ کر دی۔

اگر کسی نے معاشرہ میں جائز ذرائع سے ترقی کی ہے تو اسلام اس کی بڑائی اور ترقی کو بنظر استحسان دیکھتا ہے اور دوسروں کو یہ تلقین کرتا ہے کہ اس کی عزت کی جائے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اَنْزِلُوا النَّاسَ عَلٰى مَنَازِلِهِمْ. (ابوداؤد جلد ۲ کتاب الاداب) یعنی لوگوں کو ان کے مراتب اور مدارج کے لحاظ سے جگہ دو۔

جو لوگ دینی یا دنیوی فضیلت کی وجہ سے بڑائی حاصل کر لیں تو ان کا احترام کیا جائے۔ بنو قریظہ کے فیصلہ کے لیے جب سعدؓ بن معاذ جو قبیلہ اوس کے رئیس تھے تشریف لائے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھ کر صحابہ سے فرمایا:

قُوْمُوْا اِلٰى سَيِّدِكُمْ. (بخاری ابواب المناقب) یعنی اپنے رئیس کے احترام کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو موسیٰؑ کو تاکید فرمائی کہ بات کرتے وقت فرعون کے مرتبے کی وجہ سے نرمی اور ادب کے طریق پر گفتگو کرنا۔ ارشاد الٰہی ہے: فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا. (طٰہٰ ۲۰:۴۴) سو اسے نرم بات کہو۔

قانونی مساوات: یہ جزوی امتیاز صرف معاشرتی اور تمدنی معاملات میں ہے لیکن عدالتی معاملات میں اسلام نے ہر فرد کے درمیان ہر لحاظ سے ترازو کو برابر رکھا ہے۔ قانون کی نظر میں بڑے سے بڑا آدمی اور چھوٹے سے چھوٹا آدمی برابر ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اَقِيْمُوْا حُدُوْدَ اللّٰهِ فِي الْقَرِيْبِ وَالْبَعِيْدِ وَلَا يَاْخُذُكُمْ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ. (مشکوٰۃ کتاب الحدود صفحہ ۳۱۳) اللہ کی حدیں بلا تمیز دور و نزدیک سب پر جاری کرو اور کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہ کرو۔

عہد نبوی میں ایک اونچے خاندان کی عورت نے چوری کا ارتکاب کیا۔ کچھ لوگوں کو خیال آیا کہ اس کو سزا ہوگئی تو جگ ہنسائی ہوگی۔ حضرت اسامہؓ کو آمادہ کیا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جا کر عورت کو چھوڑ دینے کی سفارش کریں۔ جب اسامہؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں گئے اور اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے لب کشائی کی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **انما ھلک من کان قبلکم امم کانوا یقیمون الحد علی الوضیع و یترکون الشریف والذی نفسی بیدہ لوفاطمۃ فعلت ذلک لقطعت یدھا.** (بخاری اقامۃ الحد علی الوضیع والشریف) تم سے پہلے والے اس وجہ سے ہلاک ہوئے کہ وہ سزا نیچ لوگوں کو دیتے اور بڑوں کو چھوڑ دیتے تھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کا ارتکاب کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ غسان کے فرماں روا جبلہ بن ایہم نے جو دائرہ اسلام میں داخل ہو چکا تھا طواف کعبہ کے وقت کسی بدو کو تھپڑ مار دیا۔ حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا:

''جبلہ! اگر تم نے ایسی حرکت کی ہے تو خدا کی قسم تم سے اس کا بدلہ لیا جائے گا۔''

جس پر جبلہ بھاگ گیا اور مرتد ہوگیا۔

حضرت ابوبکرؓ جب عہدۂ خلافت پر متمکن ہوئے تو آپ نے سب سے پہلے خطبہ میں قانونی مساوات کا ذکر کیا۔ فرمایا: **الضعیف فیکم قوی عندی حتی اریح علیه حقه ان شاء اللّٰه والقوی فیکم ضعیف عندی حتی اخذ الحق منه.** (ابن ہشام ابن سقیفہ بنی ساعدۃ) یعنی تم میں سے کمزور ترین شخص میرے نزدیک قوی ہوگا۔ جب تک کہ میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں اور تم میں سے قوی ترین شخص میرے نزدیک کمزور ہوگا۔ جب تک میں اس سے دوسرے کا حق نہ لے لوں۔

اس عہد جمہوریت میں کسی ملک کے اندر عدلیہ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ سربراہ مملکت کو مدعا علیہ کی حیثیت سے طلب کر سکے لیکن اسلام میں صرف قانون کو ہی بالادستی حاصل ہے۔ عدالت سربراہ مملکت کو طلب کر سکتی ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلام میں ایسی روشن مثالیں موجود ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں کسی سے گھوڑا خریدا۔ سودا پکا ہو چکنے کے بعد اس پر سوار ہو گئے۔ گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اور زخمی ہوگیا۔ حضرت عمرؓ نے گھوڑا واپس کرنا چاہا۔ مالک نے قیمت واپس کرنے، اور گھوڑا واپس لینے سے انکار کر دیا۔ دونوں مدعی اور مدعا علیہ کی حیثیت سے قاضی شریح کی عدالت میں حاضر ہوئے۔ قاضی شریح نے دعویٰ اور جواب دعویٰ سننے کے بعد حضرت امیر المؤمنین سے خطاب کیا:

''جو چیز آپ خرید چکے وہ اب آپ کی ہے اور اگر واپس کرنا ہی ہے تو اس حالت میں واپس کیجئے جیسی خریداری سے پہلے تھی۔''

حضرت معاذ بن جبلؓ ایک دفعہ سفیر بن کر قیصر روم کے دربار میں تشریف لے گئے اور ایک موقعہ پر فرمایا:

''ہمارا سردار ہم میں کا ایک فرد ہے۔ اگر ہمارے مذہب کی کتاب اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ کی پیروی کرے تو ہم اس کو اپنا سردار باقی رکھیں گے اور اگر ان کے سوا وہ کسی اور چیز پر عمل کرے تو ہم اس کو معزول کر دیں گے اگر وہ چوری کرے تو ہاتھ کاٹیں گے اور اگر زنا کرے تو سنگسار کریں گے اور اگر وہ کسی کو گالی دے گا تو وہ بھی اسی طرح گالی دے اگر وہ کسی کو زخمی کرے تو اس کے بدلے میں اس کو زخم پہنچایا جائے گا۔ وہ ہم سب سے چھپ کر پردہ میں نہیں بیٹھتا وہ ہم سے غرور نہیں کرتا مال غنیمت میں اپنے کو ہم پر ترجیح نہیں دے سکتا وہ ہم میں ایک معمولی آدمی کا رتبہ رکھتا ہے۔'' (آئینہ حقیقت نما صفحہ ۲۴)

سیاسی مساوات: سیاسی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص بلا امتیاز مذہب وملت، رنگ ونسل ملک کے نظام میں حصہ لے سکتا ہے اور ہر ایک کو ترقی کرنے کے برابر کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

جو شخص قرآن اور حدیث پر نظر رکھتا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ اسلامی حکومت کی باگ ڈور صرف فرد واحد کے ہاتھ میں نہیں ہوتی بلکہ نظام حکومت میں ہر فرد کو مساوی حق حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ حکومت کے معاملات میں باہمی مشورہ کیا کریں۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ. (الشوریٰ ۴۲:۳۸) یعنی ان کا کام آپس میں مشورہ سے ہوتا ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ. (آل عمران ۳:۱۵۸) معاملات میں ان کا مشورہ لے۔ پھر جب پختہ ارادہ کرے تو اللہ پر بھروسہ کر اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے: مَاتَشَاوَرَ قَوْمٌ اِلَّا هُدُوْا. (کنوز الحقائق حدیث صفحہ ۸۷، طبرانی) یعنی جس قوم نے باہمی مشورہ کیا اس قوم نے فلاح پائی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معاملات حکومت میں صحابہ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو سب سے پہلا خطبہ سیاسی مساوات پر دیا۔ انھوں نے فرمایا اور ''میں تمہارا سردار بنایا گیا ہوں۔ حالانکہ میں سب سے اچھا نہیں ہوں اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر میں برائی کے راستہ پر چلوں تو مجھے سیدھا کر دو۔''

جب حضرت عمرؓ مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو انھوں نے فرمایا:

''اگر تم میں سے کوئی مجھ میں کجی دیکھے تو اسے ٹھیک کر دے۔''

ایک اعرابی اٹھا اور کہا:

''خدا کی قسم اگر ہم نے تم میں کجی دیکھی تو ہم اسے اپنی تلوار سے سیدھا کر دیں گے۔''

اسلام نظام حکومت کو امانت قرار دیتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ یہ امانت بلا امتیاز رنگ ونسل انہی لوگوں کے ہاتھ میں دی جائے جو اس کے اہل ہیں۔

ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰى اَهْلِهَا. (النساء۴:۵۸) اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ عنان حکومت انہی لوگوں کے ہاتھ میں دو جو اس کے اہل ہیں۔

اقتصادی مساوات: اسلام کا اقتصادی نظام عدل و انصاف پر مبنی ہے نہ تو وہ مغربی ممالک کی جیسی سرمایہ داری کا موید ہے اور نہ اشتراکی ممالک کی جیسی اشتمالیت کا۔ سرمایہ داری نظام میں دولت صرف چند ہاتھوں میں سمٹ کر آ جاتی ہے۔ اشتراکی نظام سرمایہ داروں کا گلا گھونٹ کر زبردستی ان سے مال و دولت چھین لیتا ہے اس کے برعکس اسلام جائز طریقوں سے دولت کمانے کی ترغیب دیتا ہے اور دولت کو صرف چند ہاتھوں میں جمع نہیں ہونے دیتا۔ ذاتی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے لیکن اجتماعی مفاد کو نظر انداز بھی نہیں کرتا اور اجتماعی مفاد کی خاطر اپنی ضرورت سے زائد دولت کو خرچ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ. (البقرہ۲:۲۱۹) وہ تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کرتے ہیں کہہ جو ضرورت سے زائد ہے۔ گویا اسلام کا اقتصادی نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت کا ایک حسین امتزاج ہے۔

اسلام میں تصور ملکیت: تمام معاشی دولت کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اللہ کی یہ ملکیت انسان کے پاس امانت ہے تاکہ وہ اس سے اللہ تعالیٰ کے منشاء کے مطابق فائدہ اٹھائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ اور مخلوق کے فائدہ کے لیے زمین بنائی ہے۔ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ہم نے تم کو زمین پر آباد کیا اور اس میں تمھارے لیے معیشت کے سامان رکھ دیے ہیں۔ وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ کے ہیں۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ زمین پر جو کچھ ہے وہ سب اجتماعی فائدہ کے لیے ہے جو بھی اجتماعی فائدے کو نظر انداز کر کے دولت جمع کرے گا۔ وہ اللہ کا مجرم ہوگا۔

کسب کی آزادی: فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ. الجمعہ۴:۵۸) خدا کے فضل (رزق) کی تلاش کے لیے زمین میں پھیل جاؤ۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ. (النساء۴:۳۲) مردوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ يَّرَى الْعَبْدَ مُحْتَرِفًا (طبرانی بحوالہ کنوز الحقائق) اللہ اپنے بندہ کو کوئی پیشہ کرتے ہوئے دیکھنا پسند کرتا ہے۔

اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ. (بخاری، مسلم) عمل کرو ہر شخص کے لیے وہ کام آسان ہے۔ جس کی وہ صلاحیت رکھتا ہے۔

اِجْمَلُوْا فِي طَلَبِ الدُّنْيَا فَاِنَّ كُلًّا مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ. (ابن ماجہ باب الاقتصاد فی طلب المعیشۃ) دنیا کی طلب اپنی صلاحیت کے مطابق کرو اس لیے کہ جس کے لیے آدمی پیدا کیا گیا ہے وہ ضرور اس کو ملے گا۔

اسلام نے جہاں کسب کی آزادی دی ہے وہاں کاسب پر وہ تمام پابندیاں بھی لگا دی ہیں جو ناجائز کمانے سے روکتی ہیں۔

چوتھا وصف، حریت: آزادی کا عام مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ ہر فرد اپنے دائرہ عمل میں آزاد ہو اور اس کے کسی کام پر کوئی قدغن نہ لگائی جائے۔ جس طرح وہ چاہے کام کرے۔ اسی کا نام (Absence of kestrant) ہے۔ یہ مفہوم مطلق العنانی سے مترادف ہے اور جمہوریت کی نفی کرتا ہے۔ اگر ہر شخص کو اس کے دائرہ عمل میں آزادی بخش دی جائے تو وہ آزادی نہیں ہوگی بلکہ طوائف الملوکی (Anarchy) ہوگی۔

آزادی کا ایک مفہوم لاسکی نے بیان کیا ہے وہ کہتا ہے کہ:

''آزادی سے مراد ایسی فضا ہے۔ جس میں افراد کو اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کا مناسب موقع ملے۔''

جان اسٹورٹ مل اپنی کتاب (On Libert) میں آزادی کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:
عوام کے افعال کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول:۔یعنی وہ افعال جن کا تعلق صرف انسان کی ذات سے ہے اور ان کا کوئی اثر دوسروں پر نہیں پڑتا۔
دوم: یعنی وہ افعال جن کا تعلق دوسروں کے ساتھ ہے اور ان کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے۔
جان اسٹورٹ مل کی رائے میں عوام کے افعال پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کی جائے جن کا تعلق فاعل کی ذات سے ہو۔ جن افعال کا تعلق دوسروں کے ساتھ ہو۔ ان پر پابندی عائد کرنا ضروری ہے۔ اگر پابندی عائد نہ کی گئی تو معاشرہ میں بدامنی پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح آزادی محض عدم مداخلت کا نام نہیں ہے اور نہ اس کا یہ مفہوم ہے کہ لوگوں پر اس قدر پابندیاں عائد کر دی جائیں کہ ان کے کاموں میں بھی رکاوٹیں پیدا ہو جائیں بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ملک میں ایسے مواقع موجود ہوں جن کے ذریعہ ہر شخص کو اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانے کا پورا پورا موقع مل جائے۔

اسلام کا اعلان آزادی: مفکرین نے آزادی کے مفہوم کو متعین کرنے میں افراط اور تفریط کی راہ اختیار کی ہے۔ اسلام نے جو دین فطرت ہے راہ اعتدال اختیار کر کے آزادی کی صحیح حدود متعین کی ہیں۔ اسلام انسان کو ان افعال میں بھی بے لگام نہیں چھوڑتا جن کا دوسروں پر اثر نہیں پڑتا۔ اسلام ان تمام افعال پر پابندی عائد کرتا ہے جو انسان کی اپنی ذات اور دوسروں کے لیے نقصان دہ ہوں کیونکہ معاشرہ اور فرد کا باہمی تعلق نہایت ہی گہرا ہے۔ جب فرد کی صحیح نشوونما نہیں ہوگی تو معاشرہ میں لازماً بگاڑ پیدا ہوگا اس وجہ سے جہاں اسلام انسان کے ان افعال پر پابندی لگاتا ہے جو دوسروں کو نقصان دیں وہاں ان افعال سے بھی روکتا ہے جو انسان کی اپنی ذات کو مجروح کریں۔ ارشاد الٰہی ہے: وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ. (آل عمران ۳:۱۳۵) اور وہ جس وقت کوئی برا کام کرتے ہیں اور اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھتے ہیں۔ اللہ کو یاد کرتے ہیں پھر اپنے قصوروں کے لیے بخشش مانگتے ہیں۔
"فَاحِشَة" سے مراد وہ افعال قبیحہ ہیں جو دوسروں پر اثر انداز ہوں اور ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ سے مراد وہ افعال جن کا تعلق فاعل کی اپنی ذات سے ہو اور اس کی شخصیت کو مجروح کرنے والے ہوں۔
دوسری جگہ آتا ہے۔ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ. (البقرہ ۲:۱۶۸، ۱۶۹) شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو وہ یقیناً تم کو برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔
"سوء" سے مراد وہ افعال ہیں جو انسان کی اپنی ذات سے تعلق رکھتے ہوں اور اس کی ذات کے لیے نقصان دہ ہوں۔
"فحشاء" سے مراد وہ برے افعال ہیں جو دوسروں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔
اسلام نے دونوں قسم کے افعال کو شیطان کی طرف منسوب کیا ہے اور ان سے باز رہنے کی تلقین کی ہے۔
اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے انسان کی گردن کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دی ہے اور ہر قسم کی آزادی کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔
وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ. اور وہ انسانوں کی گردنوں کو ہر قسم کی غلامی کے طوق اور پھندے سے نجات دیتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں باریک سے باریک قسم کی غلامی سے آزادی کا اعلان کیا ہے۔
قرآن مجید کا یہ اعلان اس وقت ہوا جب کہ دنیا آزادی حقوق کے نام سے بھی ناواقف تھی۔ یہ وہ پہلی آواز ہے جو عرب کے ریگستان سے اٹھی اور دنیا کے چاروں گوشوں میں گونج اٹھی۔ آج اسی آسمانی آواز سے متاثر ہو کر مفکرین آزادی آزادی پکار رہے ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی انجمن "اقوام متحدہ" نے انسانی حقوق کا عالمی منشور شائع کیا تو اس میں یہ اعلان کیا کہ (دفعہ ۳) ہر شخص کو اپنی جان کی آزادی اور ذاتی تحفظ کا حق ہے۔ دفعہ ۴' کوئی شخص غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جائے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی چاہے اس کی کوئی شکل بھی ہو۔ ممنوع قرار دی جائے گی۔
دفعہ ۱۸' ہر انسان کو آزادی فکر' آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے اور پبلک میں نجی طور پر تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل جل کر عقیدے کی تبلیغ عمل عبادت اور مذہبی رسمیں پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔
دفعہ ۱۹، ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی رائے قائم کرے اور جس ذریعے سے چاہے بغیر ملکی سرحدوں کا خیال کیے علم اور خیالات کی تلاش کرے انھیں حاصل کرے اور ان کی تبلیغ کرے۔
دفعہ ۲۹ (۲) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا۔ جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے یا جمہوری نظام میں اخلاق امن عامہ اور فلاح و بہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد

کیے گئے ہیں۔"

عالمی منشور کی یہ دفعات دراصل اس آسمانی آواز کی بازگشت ہیں جو آج سے چودہ سو سال پیشتر ایک بے آب و گیاہ وادی سے اٹھی۔ جب دنیا غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس تاریک دور میں ایک امی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر قسم کی غلامی سے مخلوق خدا کو آزاد کر کے کامل حریت کا سبق پڑھایا جن میں سے چند مشتے نمونہ از خروارے مجملاً بیان کرتا ہوں۔

سیاسی آزادی (سیاسی غلامی سے نجات)

دنیا میں ہزار ہا سال سے بادشاہ کی مطلق العنانی کا تصور چلا آ رہا تھا۔ اس کا ہر حکم قانون تصور کیا جاتا تھا اور وہ خود کسی قانون کے ماتحت نہیں ہوتا تھا اس طرح بادشاہ ظلم و استبداد کا مرقع اور رعایا غلامی کی بدترین تصویر بنی ہوئی تھی۔ اسلام نے نسل انسانی کو اس غلامی کی لعنت سے نجات دلائی۔ قانون کی بالادستی کو قائم کیا۔ حاکم اور عوام دونوں کو قانون کی نظر میں برابر قرار دیا جس طرح ایک عام آدمی قانون شکنی کی وجہ سے قابل مواخذہ ہے۔ اس طرح اگر حاکم قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ وہ بھی سزا کا مستحق ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء ۴: ۵۹) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہیں پھر اگر تم میں کسی چیز میں باہم اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول ؐ کی طرف پھیر دو۔ یعنی قانون کی طرف۔ یہاں اللہ اور رسول ؐ قائم مقام قانون کے ہیں۔ کیونکہ قانون شریعت کا ماخذ اللہ اور رسول ؐ ہی ہیں۔

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا ہے کہ قانون کی حکومت سب پر حاوی ہے۔ خواہ کوئی صاحب امر ہو یا عام رعایا۔ کسی کی گردن قانون کے جوئے سے باہر نہیں۔

تمدنی آزادی (تمدنی غلامی سے آزادی): اسلام سے قبل ہر ایک قوم اپنی آبائی تقلید کی غلامی میں پھنسی ہوئی تھی۔ جس سے تمام علمی، اخلاقی، ذہنی ترقیاں مسدود ہو چکی تھیں۔ قرآن مجید نے آبائی تقلید اور سوسائٹی کے رسم و رواج سے نجات دلانے کے لیے فرمایا: اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ. یعنی کیا اگر ان کے آباؤ اجداد نہ کچھ عقل رکھتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں۔ اس آیت کریمہ میں بیان فرمایا ہے کہ ضروری نہیں کہ باپ دادا جو کریں وہ صحیح ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ باپ دادا غلطی پر ہوں اس وجہ سے آباؤ اجداد کی پیروی کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ آیا ان کے باپ دادا کہیں غلطی پر تو نہ تھے۔ غرض کہ قرآن مجید نے آبائی کورانہ تقلید اور سوسائٹی کے رسم و رواج کی غلامی سے نجات دلا کر علمی اخلاقی اور ذہنی ترقیات کی راہ کھول دی ہے۔ اسی راستہ پر چل کر انسان تہذیب نو کی عمارت تعمیر کر سکتا ہے۔

معاشرتی آزادی (معاشرتی غلامی سے نجات): اسلام سے قبل عورت گھر میں ایک غلام کی حیثیت رکھتی تھی۔ تمام معاشرتی حقوق سے محروم تھی۔ وہ محض مرد کے رحم و کرم پر زندگی کے ایام گزارتی تھی۔ اسلام نے عورت کو اس غلامی سے نجات دلائی اور عورت کی معاشرتی حیثیت میں ایک زبردست انقلاب برپا کیا۔ سب سے پہلے اسلام نے انسان ہونے کے لحاظ سے عورت کو مرد کے ساتھ مساوی حیثیت دی اور ان دونوں کو ایک ہی اصل کی دو شاخیں قرار دیا۔ ارشاد الٰہی ہے: يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا. (نساء ۴:۱) اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو۔ جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں اور اللہ کے حقوق کی جس کے ذریعہ سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رحموں کی نگہداشت کرو اللہ تم پر نگہبان ہے۔

اسلام نے عورت کے بیٹی ہونے کی حیثیت سے، بیوی ہونے کی حیثیت سے، ماں ہونے کی حیثیت سے علیحدہ علیحدہ حقوق مقرر کر دیے ہیں تاکہ عورت معاشرہ میں معزز فرد کی حیثیت سے زندگی بسر کرے۔ اسی طرح اسلام نے معاشرے کے تمام اعضاء کے حقوق و فرائض متعین کر دیے ہیں۔ اس طرح حقوق و فرائض کے د.ٖرہ میں تمام اراکین معاشرے آزاد ہیں۔

اقتصادی آزادی (اقتصادی غلامی سے آزادی): اسلام سے قبل مزدور سرمایہ داروں کی غلامی کی زنجیروں میں بری طرح جکڑے ہوئے تھے وہ غلامی کی مضبوط زنجیر سود در سود تھی۔ اسلام نے سود کو حرام قرار دے کر مزدوروں کو سرمایہ داروں کے چنگل سے نجات دی اس کے ساتھ ان کے ساتھ برادرانہ سلوک کی تعلیم دی۔ قرآن مجید میں آتا ہے: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً. (آل عمران ۳:۱۳۰) اے ایمان والو! تم بڑھا بڑھا کر سود

نہ کھاؤ۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰو. (البقرہ۲:۲۷۵) اور اللہ نے خرید و فروخت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔

مزدوروں اور غرباء کی حالت سدھارنے کے لیے امراء پر زکوٰۃ اور صدقات فرض کر دیے تاکہ سرمایہ داروں کا سرمایہ حد سے زیادہ نہ بڑھنے پائے اور غرباء کی محبت ان کے دلوں میں پیدا ہو جائے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ. (البقرہ۲:۴۳) اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (التوبہ۹:۱۰۳) ان کے مال سے زکوٰۃ لے تاکہ تو انھیں پاک اور صاف کرے۔

وَفِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریت ۵۱:۱۹) ان کے مالوں میں سوالی اور نہ مانگنے والے محتاج کا حق ہے۔

اسلام نے سود کے علاوہ ان تمام ذرائع کو بھی ناجائز قرار دے دیا جو افادہ عامہ کے لیے نقصان دہ تھے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ. (النساء۴:۲۹) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ بجز اس کے کہ وہ مال تجارت ہو اور باہمی رضا مندی پر مبنی ہو۔

جہالت کی غلامی سے نجات: اسلام سے قبل جہالت کی وجہ سے لوگ اوہام باطلہ کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے۔ اسلام نے تمام اوہام باطلہ اور جاہلانہ رسم و رواج کو ملیا میٹ کر کے انسان کی عقل کو جہالت کی غلامی سے نجات بخشی اور انسان کو علم کی ترغیب دی۔ اسلام نے انسان کو بتایا کہ اس کو تمام مخلوق پر حتیٰ کہ ملائکہ پر بھی علم کی وجہ سے فضیلت حاصل ہے جیسا کہ سورۃ بقرہ کے آغاز میں ہی قصہ آدم بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ. (البقرہ ۲:۳۱،۳۲) اور آدم کو سب نام سکھائے پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ مجھے ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ انھوں نے کہا تو پاک ہے ہمیں کوئی علم نہیں مگر وہی جو تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ بے شک تو علم والا حکمت والا ہے۔

اس آیت میں بنی آدم کو یہ تعلیم دی ہے کہ اس کی خلافت علم پر مبنی ہے۔ حصول علم کے ساتھ ہی اس کی ترقی وابستہ ہے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ. (الزمر ۳۹:۹) کہہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں۔

مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۷۲) جو اس دنیا میں اندھا رہا اور اس نے اپنی عقل و خرد سے کام نہ لیا تو وہ یقیناً آخرت میں اندھا ہی رہے گا اور راستہ سے بھٹکا ہوا ہوگا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ (سنن ابن ماجہ باب فضل العلماء) ہر مسلمان پر علم حاصل کرنا واجب ہے۔

تَفَكُّرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِّنْ عِبَادَةِ سَبْعِيْنَ سَنَةٍ. (کنوز الحقائق حرف التاء) ایک گھڑی فکر کرنا ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

آزادی سکونت: قرآن مجید میں آتا ہے: قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ. (العنکبوت ۲۹:۲۰) کہہ زمین میں چلو پھر دیکھو کس طرح اس نے پہلی بار پیدا کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: كُوْنُوْا حَيْثُ شِئْتُمْ وَبَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَنْ لَا تَفْسِكُوْا دَمًا وَلَا تَقْطَعُوْا سَبِيْلًا وَلَا تَظْلِمُوْا اَحَدًا. (نیل الاوطار جلد ۷ صفحہ ۱۳۹) تم جہاں چاہو رہو اور ہمارے اور تمھارے درمیان شرط یہ ہے کہ نہ تم خون ریزی کرو اور نہ تم رہزنی کرو اور نہ کسی پر ظلم کرو۔

فکر و عقیدہ کی آزادی: اسلام ہی وہ دین ہے جس نے حریت اعتقاد کو تسلیم کیا ہے اور ہر فرد کو یہ آزادی بخشی ہے کہ وہ اپنی عقل و فکر سے جو عقیدہ چاہے اختیار کرے۔ ارشاد الٰہی ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ. (البقرہ۲:۲۵۶) یعنی دین میں کوئی زبردستی منوانا نہیں، ہدایت کی راہ گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ. (الروم ۳۰:۴۴) جو کفر کرتا ہے تو اس کا وبال کفر اسی پر ہے اور جو کوئی نیک عمل کرتا ہے تو وہ اپنی ہی جان کے لیے سامان کرتے ہیں۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ کفر اور غلط عقیدہ کی سزا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کسی انسان کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ غلط عقیدہ کی وجہ سے کسی کو سزا دے۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ کیا تو لوگوں کو مجبور کر سکتا ہے کہ مومن ہو جائیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ. (الکافرون ۱۰۹: ۶) تمھارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔

داعی اور مبلغ اپنے عقیدہ کو منوانے کے لیے صرف تذکیر اور موعظہ حسنہ سے کام لے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرماتا ہے: فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ. پس تم یاد دلاؤ، تم صرف یاد دلانے والے ہو تمھیں ان لوگوں پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔

رائے کی آزادی: اسلام نے رائے کے اظہار کرنے پر کسی قسم کی قدغن نہیں لگائی۔ خواہ دینی ہو یا غیر دینی۔ غیر دینی امور کے متعلق رائے کے اظہار کرنے کے لیے کسی قسم کی شرط نہیں لگائی۔ ہاں دینی امور کے متعلق فساد فی الدین کے خوف سے مجتہد کے لیے یہ شرط لگا دی ہے کہ اجتہاد قرآن مجید اور سنت رسول کے مخالف نہ ہو۔ چنانچہ اسلام نے قیاس کو مصادر تشریع میں سے ایک مصدر قرار دیا ہے۔

جیسا کہ حضرت معاذ بن جبلؓ سے ایک حدیث مروی ہے کہ جب مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمن بھیجا تو فرمایا اگر تمھارے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہو جائے تو کس طرح فیصلہ کرو گے انھوں نے کہا۔ جو کتاب اللہ میں ہے اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ ہو۔ انھوں نے کہا جو اللہ کے رسول نے فیصلہ کیا ہو اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا وہ قضیہ ایسا ہو جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی فیصلہ نہ دیا ہو تب کیا کرو گے تو انھوں نے فرمایا اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوتاہی نہ کروں گا۔ (ابوداؤد والترمذی)

ایک اور حدیث ہے جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''ہر مجتہد کو اجر ملتا ہے۔ اگر اس نے اجتہاد میں غلطی کی تو اسے ایک اجر ملے گا۔ اگر اس نے صحیح اجتہاد کیا تو اسے دو اجر ملیں گے۔''

غیر دینی امور کے متعلق صحابہ کا اپنی رائے کے اظہار کرنے کے واقعات رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں بے شمار ہیں۔ ایک غزوہ میں آپ نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ فلاں فلاں جگہ پر اتریں۔ ایک صحابی نے آپ سے دریافت کیا۔ یہ فیصلہ وحی سے کیا ہے یا اپنی رائے سے۔ آپ نے فرمایا یہ میری ذاتی رائے ہے۔ صحابی نے عرض کیا تو یہ اتارنے کی جگہ مناسب نہیں اس کی بجائے فلاں منزل مناسب ہوگی۔ چنانچہ اسی رائے پر عمل کیا گیا۔

اسلامی سلطنت کا سب سے اہم وصف انسان کی آزادی کا ہر پہلو محفوظ رکھنا ہے۔

پانچواں وصف، شوریٰ: حضرت امام راغب ''شوریٰ'' کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شوریٰ کا مفہوم آراء کا حاصل کرنا ہے اس کے لیے پہلے دو سمتیں متعین ہوتی ہیں۔ ایک سمت رائے لینے والے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف رائے دینے والے۔ ایک سمت اپنی ذمہ داریوں کے دائرہ میں مہم معاملات سے دو چار ہیں۔ ایسی حالت میں ایک سمت کے اصحاب دوسری سمت کے لوگوں سے رائے طلب کرتے ہیں اور سلامتی و کامیابی کے لیے ایک فیصلہ پر پہنچ جاتے ہیں پس اسی کا نام شوریٰ ہے۔'' مفردات القرآن لفظ شوریٰ جلد ۲ صفحہ ۲۴۵)

علامہ قاضی ثناء اللہؒ پانی پتی شوریٰ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''شوریٰ کی روح یہ ہے کہ جماعت کے افراد میں سے ہر فرد اپنے علم اور قابلیت کے مطابق اپنی آراء اور خیالات پیش کر دیتا ہے ایک دوسرے کے نظریات آپس میں ملتے ہیں اور اس سے ایک اچھا فیصلہ ہاتھ آ جاتا ہے۔'' (تفسیر مظہری آل عمران جلد ۲ صفحہ ۱۶۲)

شوریٰ کی اہمیت از روئے قرآن مجید: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ. (آل عمران ۳: ۱۵۸) (دنیاوی) معاملات میں ان کا مشورہ لے۔

دوسری جگہ مسلمانوں کے اجتماعی تعامل کے متعلق آتا ہے: وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (الشوریٰ ۴۲: ۳۸) اور ان کا کام آپس میں مشورہ سے ہوتا ہے۔

شوریٰ کی اہمیت از روئے حدیث: مَاشَاوَرَ قَوْمٌ إِلَّا هُدُوا. (طبرانی، کنز الحقائق حدیث ۸۷) جس قوم نے باہمی مشورہ کیا اس قوم نے فلاح پائی۔

حضرت عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ جب شوریٰ کا حکم آیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگرچہ اللہ اور اس کا رسولؐ شوریٰ سے بے نیاز ہیں مگر شوریٰ کا یہ حکم اس لیے ہے تاکہ امت کے لیے رحمت ہو۔ اس کے بعد امت کا جو فرد رائے اور مشورہ طلب کرے گا کبھی اعلیٰ درجہ کی راہنمائی سے محروم نہ ہوگا اور جو شوریٰ کو ترک کرے گا وہ کبھی غلط راہ سے نہ نکلے گا۔ (بیہقی شعب الایمان عن ابن عباس)

حضرت عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اگر ہم کوئی چیز کتاب و سنت میں نہ پائیں تو کیا کریں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قانون جاننے والے عبادت گزاروں سے مشورہ کرو۔ پھر یہ ہدایت فرمائی۔ لَا تَمْضُوا فِيهِ رَأْيَ خَاصَّةٍ یعنی ایسے موقعہ پر کسی شخص کی انفرادی رائے کو نافذ نہ کرنا (اعلام الموقعین جلد ۱ صفحہ ۵۴)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے مَارَأَيْتُ اَحَداً اَكْثَرَ مَشْوَرَةً لِاَصْحَابِهِ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ یعنی میں نے کسی شخص کو نہیں دیکھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر اپنے اصحاب سے مشورہ کرتا ہو۔

بزرگانِ دین کی نظر میں شوریٰ کی اہمیت: ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ:

"رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قانون شوریٰ پر عامل تھے تم بھی اس پر عمل کرنا"۔ (تفسیر مظہری جلد ۲ صفحہ ۱۶۱)

سقیفہ کے شوریٰ میں حضرت عمرؓ نے عوام کو یہ فرمایا فَمَنْ بَايَعَ عَنْ غَيْرِ مَشْوَرَةِ الْمُسْلِمِيْنَ فَاِنَّهُ لَا بَيْعَةَ لَهٗ (سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۷۳) اگر مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کو خلیفہ بنایا گیا تو یہ فیصلہ کالعدم ہوگا۔

خلفائے راشدین کا یہی تعامل تھا کہ جب کوئی اہم مسئلہ پیش آتا تو لوگوں کو مسجد میں جمع کیا جاتا اور ان کے سامنے پیش آمدہ مسئلہ رکھ دیا جاتا تو ان سے رائے طلب کی جاتی۔ کثرت رائے سے جو طے ہوتا وہی فیصلہ نافذ کر دیا جاتا تھا۔

علامہ شوکانی" یمانی لکھتے ہیں کہ:

"مسلمان اجتماعی نظم کے ساتھ شوریٰ سے کام لیتے تھے جلد بازی اور مطلق العنانی کے ساتھ انفرادی رائے سے کام لینا ان کی روایات میں داخل نہیں ہے۔" (فتح القدیر جلد ۴ صفحہ ۵۲۶)

ابن خور بنداد لکھتا ہے کہ:

"امیر حکومت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ قانون شوریٰ سے قوت حاصل کرے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ امیر حکومت کسی معاملہ میں اتنی واقفیت اور مہارت نہ رکھتا ہو۔ جس قدر معاشرہ کے دوسرے افراد رکھتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی قوم پر صورتِ حال مشکلات سے پُر ہو جائے دونوں صورتوں میں شوریٰ کا انعقاد اور ماہرین علم وفن کی رائے لینا ضروری ہے۔ جنگی معاملات میں فوج کے کمانڈروں سے مصالح عامہ کے سلسلہ میں عوام کے نمائندوں سے مملکت کے نظم اور تعمیر وترقی کے معاملہ میں اوّل درجہ کے مدبروں، دفتری حکام، انتظامی افسروں اور وزیروں سے شوریٰ میں رائے لینی چاہیے۔" (فتح القدیر جلد ۱ صفحہ ۳۶۰)

چھٹا وصف، عدل: عدل کے لغوی معنی ہیں دو حصوں کو اس طرح تقسیم کرنا کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا بھر بھی کمی بیشی نہ ہو۔

اسلامی اصطلاح میں عدل کی تعریف سیّد شریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"عدل افراط اور تفریط کے درمیان ایک نقطہ مساوات ہے جو اطراف کو برابر رکھتا ہے اور حق پر آ کر رُک جاتا ہے۔"

عدل کی تین قسمیں ہیں:

ا۔ سماجی عدل: یعنی وہ عدل جس کا اثر سوسائٹی پر پڑتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ. النساء ۴:۳)

اور اگر تمہیں خوف ہو کہ عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی یا جس کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں۔

یہ آیت تعدد ازدواج سے متعلق ہے جس میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص ایک سے زائد بیویوں کے مابین عدل وانصاف قائم نہ رکھ سکتا ہو تو وہ ایک ہی بیوی سے شادی کرے کیونکہ عائلی زندگی کے امن کا دار و مدار عدل وانصاف پر ہے۔

یتامیٰ کے حقوق کو عام طور پر پامال کر دیا جاتا ہے اس وجہ سے یتیموں کے حقوق کی حفاظت کے متعلق فرمایا:

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ. (النساء ۴:۱۲۷) یہ کہ یتیموں کے معاملہ میں عدل پر قائم رہو۔

۲۔ قانونی عدل: قانونی عدل سے مراد یہ ہے کہ عدالتی کاروبار کے ہر پہلو میں عدل وانصاف کو برقرار رکھا جاتا ہے۔

تحریر و دستاویز کے متعلق حکم: وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ (البقرہ ۲:۲۸۲) اور تمہاری باہمی قرارداد کو کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ. (البقرہ ۲:۲۸۲) پھر جس شخص پر حق ہے (جس کے ذمہ قرض ہے) کم عقل یا ضعیف ہو یا لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی انصاف سے لکھوائے۔

شہادت کے حکم کے متعلق: شہادت دیتے وقت عموماً لوگ جنبہ داری سے کام لے جاتے ہیں۔ اسلام اس حالت میں بھی عدل وانصاف پر قائم رہنے کی تعلیم دیتا ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے: وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى. (انعام ۶:۱۵۲) اور جب تم کہو تو عدل کی بات کہو خواہ وہ کسی رشتے دار کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

عدل سے تصفیہ کرنے کے متعلق حکم: فریقین کے درمیان انصاف کرنے کے بارہ میں قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ. (الحجرات ۴۹:۹) اور اگر مومنوں میں سے دو گروہ جنگ کریں تو ان میں صلح کرا دو۔ پس اگر ایک دوسرے پر زیادتی کرتا ہے تو اس سے جنگ کرو جو زیادتی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کر لے پس اگر وہ رجوع کرے تو ان کے درمیان عدل سے صلح کرا دو اور انصاف کرو کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ. (النساء ۴:۵۸) اور جب لوگوں میں فیصلہ کیا کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى (البقرہ ۲:۱۷۸) آزاد کا بدلہ آزاد سے غلام کا بدلہ غلام سے اور عورت کا بدلہ عورت سے لیا جائے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ قانون کی نظر میں سب لوگ یکساں ہیں۔ عہد نبوی کا مشہور واقعہ ہے کہ قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی۔ قریش کو یہ بات ناگوار گزری کہ ان کے قبیلہ کی کسی عورت کو سزا ملے۔ چنانچہ انھوں نے حضرت اسامہؓ سے کہا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جا کر سفارش کریں۔ جونہی حضرت اسامہؓ نے اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے زبان کھولی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ متغیر ہوگیا اور لوگوں کو بلا کر ایک بلیغ خطبہ دیا فرمایا: اِنَّمَا هَلَكَ الَّذِيْنَ قَبْلَكُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُقِيْمُوْنَ الْحَدَّ عَلَى الْوَضِيْعِ وَيَتْرُكُوْنَ الشَّرِيْفَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ فَاطِمَةُ فَعَلَتْ ذٰلِكَ لَقَطَعْتُ يَدَهَا. (بخاری کتاب الحدود باب اقامۃ الحدود علی الشریف والوضیع) بے شک تم سے پہلے وہ قومیں ہلاک ہو گئیں جو کمزور پر حد قائم کرتے تھے۔ بڑے آدمی کو چھوڑ دیتے تھے خدا کی قسم اگر فاطمہ (میری بیٹی) بھی ایسا کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

اقتصادی عدل: اقتصادی عدل سے مراد وہ لائحہ عمل ہے جس کے تحت ملک کے ہر فرد کو قومی دولت سے برابر کا استفادہ کرنے کا موقعہ میسر ہو اور ایسے اصول وضع کر دیے جائیں جن کی وجہ سے دولت چند ہاتھوں میں جمع نہ ہو سکے۔

اسلام نے دنیا اور مافیہا کی ہر چیز کو اللہ کی امانت قرار دیا ہے۔ ملکیت انسان کے پاس امانت ہے تاکہ وہ اس سے اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت فائدہ اٹھائے۔

ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ زمین اللہ کی ہے وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ اور زمین مخلوق کے فائدہ کے لیے بنائی ہے: وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ اور ہم نے تم کو زمین پر آباد کیا اور اس میں تمھارے لیے معیشت کے سامان رکھ دیے۔

وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان خزانوں سے ہر شخص کو فائدہ حاصل کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ ۶۲:۱۰) خدا کے فضل (رزق) کی تلاش کے لیے زمین میں پھیل جاؤ۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء ۴:۳۲) مردوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ. (بخاری ومسلم بحوالہ کنوز الحقائق) عمل کرو ہر شخص کے لیے وہ کام آسان ہے جس کی وہ صلاحیت رکھتا ہے۔

اَجْمِلُوْا فِيْ طَلَبِ الدُّنْيَا فَاِنَّ كُلًّا مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ. (ابن ماجہ باب الاقتصاد فی طلب المعیشۃ) دنیا کی طلب اپنی صلاحیت کے مطابق کرو اس لیے کہ جس کے لیے آدمی پیدا کیا گیا ہے وہ ضرور اس کو ملے گا۔

جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت میں بھی دوسری مخلوق کا حصہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ. (الذریت ۵۱:۱۹) اور ان کے مالوں میں سوالی اور نہ مانگنے والے محتاج کا حق ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ ۲:۲۱۹) وہ تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ دیجیے جو کچھ ضروریات اور حاجات سے زیادہ ہو وہ غرباء کی حالت سدھارنے کے لیے خرچ کریں۔

اسلام جائز ذرائع سے دولت کمانے کی تو اجازت دیتا ہے لیکن باطل اور ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

ارشاد الٰہی ہے: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (النساء ۴:۲۹) اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ۔

اسلام نے صرف ناجائز ذرائع سے دولت کمانا ہی منع نہیں فرمایا بلکہ جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کو بھی جمع کر رکھنا اور بازار میں نہ لانا بھی ناجائز ٹھہرایا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ. (التوبہ ۹:۳۴) اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک عذاب کی خبر دے دے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اَلْمُحْتَكِرُ مَلْعُوْنٌ (ابن ماجہ، باب الحکرۃ والجلب) ذخیرہ اندوزی کرنے والا ملعون ہے۔

ساتواں وصف، امن و دفع شر: اسلامی ریاست کا ایک وصف ظلم وفساد کو دور کر کے دنیا میں امن کا قیام ہے۔ یہ وصف اسلام کے نام کے اندر ہی مضمر ہے۔ اسلام کے لغوی معنی صلح کے اندر داخل ہونا ہیں۔ مسلم وہ ہے جو خدا اور اس کے بندوں سے صلح کرے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (البقرہ ۲:۲۰۸) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم سارے کے سارے سلامتی کے ساتھ دائرہ اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (الانفال ۸:۶۱) اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تو بھی جھک جا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسلام کی حقیقت کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: اَلتَّعْظِيْمُ لِاَمْرِ اللّٰهِ وَالشَّفَقَةُ عَلٰى عِيَالِ اللّٰهِ. (بیہقی کتاب الایمان) اللہ کے احکام کی تعظیم کرنا اور اللہ کی مخلوق سے محبت کرنا۔

انسانوں سے محبت کرنے کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ. (بیہقی کتاب الایمان) ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو اللہ کی مخلوق سے زیادہ محبت کرتا ہے۔

امن کا فروغ ہی طاغوتی طاقتوں کو دبانے سے ہے۔ اس کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے: قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (البقرہ ۲:۱۹۳) (ان طاغوتی طاقتوں سے) جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو۔ پھر اگر طاغوتی طاقتیں رک جائیں تو سزا ظالموں کے سوا اور کسی کے لیے نہیں۔

اگر طاغوتی طاقتوں کو زیر نہ کیا جائے تو دنیا ظلم وفساد سے بھر جائے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اگر اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کے ذریعہ طاغوتی طاقتوں کو دفع نہ کرتا تو آسمان اور زمین کا تمام نظام برباد ہو جاتا۔

ترمذی میں ایک روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کو ظلم سے منع نہ کریں تو ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو عذاب میں مبتلا کر دے۔

آٹھواں وصف، رواداری: جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اسلام وحدت انسانی کا پیغام لے کر آیا ہے۔ اس پیغام کو فروغ اور تقویت دینے کے لیے اسلام مذہبی اور سیاسی رواداری کی تعلیم دیتا ہے یہی تعلیم امن عالم کی ضامن ہے۔

مذہبی رواداری: اسلام دوسرے مذاہب کے متعلق یہ تعلیم دیتا ہے کہ تمام آسمانی مذاہب خدا کی طرف سے ہیں اور ان کے بانیوں اور کتب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس وقت تک مسلمان دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوسکتا جب تک کہ پہلی کتب اور رسولوں پر ایمان نہیں لاتا۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (البقرہ ۲:۴) اور جو ایمان لائے ہیں اس پر جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا۔ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (البقرہ ۲:۱۳۶) تم کہو۔ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور اس پر جو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور اس کی اولاد کی طرف اتارا گیا اور اس پر جو نبیوں کو اپنے رب کی طرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ. (البقرہ ۲:۲۸۵) رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب سے اس کی طرف اتارا گیا اور مومن بھی سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان

لاتے ہیں۔ ہم اس کے رسولوں میں سے کسی میں کچھ تفرقہ نہیں کرتے۔

قرآن مجید کی واضح تعلیم ہے کہ تمام قوموں میں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر ۲۴:۳۵) اور کوئی قوم نہیں مگر اس میں ڈرانے والا گزر چکا ہے۔

سیاسی رواداری: وَاِنْ اَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ. (التوبہ ۹:۶) اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دو۔

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (الممتحنہ ۶۰:۸) اللہ تمھیں ان سے نہیں روکتا جنھوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں کی اور تمھیں اپنے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان سے احسان کرو اور ان سے انصاف کرو۔ اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے۔

وفد (نجران) علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخلوا علیہ مسجدہ بعد العصر فحانت صلاتھم فقاموا یصلون فی مسجدہ فاراد الناس منعھم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعوھم فاستقبلوا المشرق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عصر کے وقت نجران کا وفد آیا۔ آپ نے اس کو مسجد میں جگہ دی۔ ان کی نماز کا وقت آیا تو مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ لوگوں نے ان کو منع کرنا چاہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو روک دیا۔ پھر وہ مشرق کی طرف منہ کر کے عبادت کرنے لگے۔ (زاد المعاد فی ہدی خیر العباد)

نواں وصف، فلاحی ریاست: اسلامی ریاست کا دوسرا نام ہی فلاحی ریاست ہے کیونکہ اسلامی ریاست ہی ایک ایسا روحانی اور مادی نظام ہے۔ جس میں انسان کی روح اور مادی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ آج دنیا میں فلاحی ریاست کے تصور کو مغربی تصور سمجھا جاتا ہے اور اس کا سہرا مغربی مفکرین کے سر پر سجایا جاتا ہے۔ جب کہ فلاحی ریاست کا تصور سب سے پہلے اسلام نے دیا پھر اس تصور کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین نے عملی جامہ پہنایا۔

فلاحی ریاست: فلاحی ریاست ایک ایسا ملک ہوتا ہے۔ جس میں تمام لوگ خوش حال ہوں سب کی بنیادی ضروریات آسانی سے پوری ہوں اور سب کو بنیادی انسانی حقوق حاصل ہوں اور ریاست میں مساوات عدل و انصاف مذہبی آزادی، احترام انسانیت اور احتساب و قانونی تحفظ حاصل ہو۔ ریاست ملک سے غربت فقر و فاقہ بے روزگاری جہالت رشوت منشیات جرائم سمگلنگ اور کلاشنکوف کلچر وغیرہ کا عملاً خاتمہ کر دے شہریوں کو جان، مال، نسل، عقل اور دین کی حفاظت کی ضمانت دے اس کے شہری امن و عافیت سے باعزت زندگی گزار سکیں۔ تمام شہری محنتی اور ایمان دار ہوں۔ نیکی کے کاموں میں تعاون کریں اور برائی کے خلاف جہاد میں سرگرم رہتے ہوں۔ فلاحی ریاست اور حقوق انسانی لازم ملزوم ہیں۔

حقوق انسانی

۱۔ جان و مال آبرو کی حفاظت　　۲۔ ذاتی ملکیت کا حق
۳۔ انسانی عزت و وقار کا حق　　۴۔ حق خلوت
۵۔ اختلاف رائے کی آزادی　　۶۔ مذہب اور عقیدہ کا حق
۷۔ مذہبی رواداری کا حق　　۸۔ ہجرت کا حق
۹۔ پناہ لینے کا حق　　۱۰۔ حصول تعلیم کا حق
۱۱۔ آزادی سکونت کا حق　　۱۲۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق
۱۳۔ ملکیت کا حق　　۱۴۔ قانونی حق (قانون مساوات)
۱۵۔ حکومت میں شرکت کا حق　　۱۶۔ تشکیل حکومت میں شرکت
۱۷۔ یتامیٰ، غرباء، فقراء، محتاجوں مساکین اور بیوگان کی ضروریات کو پورا کرنا ہے۔
۱۸۔ تقریر تحریر اور آزادی اظہار کی آزادی
۱۹۔ معاشرہ میں امن و امان
۲۰۔ معاشی استحصال کا خاتمہ (سود سٹہ بازی، جوا اور دیگر ناجائز کاروبار کی روک تھام)

۲۱۔ مناصب جلیلہ پر اہل افراد کی تقرری
۲۲۔ بیروزگاری کا خاتمہ' اور سب افراد کے لیے روزگار کے مواقع یکساں ہونے چاہئیں۔
۲۳۔ غیر مسلموں کے مذہبی' سیاسی' معاشرتی اور معاشی حقوق کا تحفظ۔
۲۴۔ کردار کی تعمیر سازی: (رشوت' چور بازاری' قحبہ گری' ڈاکہ زنی' اغوا' قتل و غارت گری فحاشی جھوٹ عریانی' ظلم شراب خوری اور دیگر نشہ آور اشیاء کا استعمال بے پردگی وغیرہ کا خاتمہ)

اسلامی فلاحی حکومت مذکورہ تمام حقوق کی بجا آوری کو اپنا فرض قرار دیتی ہے۔
نوٹ: ریاست کے ذرائع آمدن پر بحث اسلام کے معاشی نظام میں آئے گی۔

اسلامی مملکت کی خارجہ پالیسی کے اصول

پہلا اصول: اسلامی حکومت اس بات کا خیال رکھے کہ غیر مسلم حکومت سے اس قسم کے معاہدات نہ کرے جس سے کسی دوسری اسلامی ریاست کے مفادات مجروح ہوتے ہوں۔ لَا يَتَّخِذُوا الْمُؤْمِنِيْنَ الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (آل عمران ۳:۲۸) اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا ہمدرد اور دوست نہ بناؤ۔ اگر کوئی غیر مسلم حکومت کسی اسلامی حکومت پر حملہ کرے تو دنیا کے تمام اسلامی ممالک کا فرض ہے کہ وہ اسلامی حکومت کی مدد کریں۔

دوسرا اصول: اسلامی حکومت کے تمام معاملات صلح اور امن پر طے ہونے چاہئیں۔ کیونکہ اسلام صلح اور امن کا پیغام لے کر آیا ہے۔ اسلامی حکومت کی خارجہ پالیسی میں ہر رنگ میں امن کی روح قائم رہنی چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا. (الانفال ۸:۶۱) اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ۔

امن قائم کرنے کے اصول

۱۔ حق کی معاونت: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. یعنی ایک دوسرے کی نیک کام اور پرہیزگاری پر امداد کرو اور گناہ اور ظلم پر مدد نہ کرو۔

۲۔ اگر دنیا کی بڑی طاقتیں اس اصول پر عمل کریں کہ وہ حق وصداقت میں تعاون کریں اور برائی اور باطل میں ترک تعاون کی راہ اختیار کریں تو دنیا میں امن قائم ہو جائے گا۔ دنیا میں فساد کی صرف وجہ یہ ہے کہ بڑی بڑی حکومتیں باطل کا ساتھ دیتی ہیں۔

۳۔ محاربین کے درمیان عدل سے صلح کرانا: وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (الحجرات ۴۹:۹،۱۰) اور اگر مومنوں میں سے دو گروہ جنگ کریں تو ان میں صلح کرا دو۔ پس اگر ایک دوسرے پر زیادتی کرتا ہے تو اس سے جنگ کرو جو زیادتی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے۔ پس اگر وہ رجوع کرے تو ان کے درمیان عدل سے صلح کرا دو اور انصاف کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔
اس آیت کریمہ میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اگر دو ملکوں کے درمیان ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن سے لڑائی کا اندیشہ ہو یا لڑائی شروع ہو گئی ہو تو حکومتوں کا یہ فرض ہے کہ وجہ فساد دریافت کر کے متحارب فریقین کے درمیان صلح کرا دیں۔

۴۔ اگر کوئی فریق صلح کی طرف مائل نہیں ہوتا' دنیا کے امن کو برباد کرنے پر تلا ہوا ہے تو زیادتی کرنے والے فریق کے خلاف تمام دنیا کی طاقتیں اعلان جنگ کر دیں اور اس وقت تک جنگ جاری رکھیں جب تک زیادتی کرنے والا فریق حق کی طرف لوٹ نہیں آتا۔
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کو ان الفاظ میں بیان فرمایا: اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا. یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

صحابہ کرام نے پوچھا۔ ظالم کی مدد کس طرح کریں۔ فرمایا ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کا ہاتھ ظلم سے روک لو۔
صلح کرانے کا یہ سنہری اصول بتایا کہ متحارب فریقین کے درمیان صلح کراتے وقت عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہیے۔

تیسرا اصول: اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی ایک عالمی انسانی برادری قائم کرنے والی ہو اور تمام اقوام عالم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے والی ہو۔ کیونکہ اسلام نسل انسانی کی وحدت کا پیغام لے کر آیا ہے۔
ارشاد الٰہی ہے:
كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس ۱۰:۱۹) سب لوگ ایک ہی امت ہیں لیکن وہ اس میں جھگڑتے ہیں۔

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (النساء ۱:۴) اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک اصل سے پیدا کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَرَبُّ كُلِّ شَىْءٍ اِنِّىْ اَشْهَدُ اِنَّ الْعِبَادَ كُلُّهُمْ اِخْوَةٌ. (احمد، ابوداؤد) اے ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار میں گواہی دیتا ہوں کہ انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

تَوَاخَوا فِى اللّٰهِ اَخَوَيْنِ اَخَوَيْنِ. (کنوز الحقائق حرف التاء) اللہ کی رضا کے لیے دو دو بھائی ہو جاؤ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین بنا کر بھیجنے میں یہی راز مضمر ہے کہ دنیا کی تمام قوموں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔

چوتھا اصول: اسلامی حکومت عہد و پیمان کا احترام کرنے والی ہو۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَوْفُوا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلاً (بنی اسرائیل ۳۴:۱۷) عہد پورا کرو یقیناً عہد کے متعلق پوچھا جائے گا۔ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ. (مائدہ ۱:۵) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! اپنے معاہدے پورے کرو۔

نقض عہد کے متعلق ارشاد الٰہی ہے: وَلاَ تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا (النحل ۹۱:۱۶) (قسموں) عہد کو پکا کرنے کے بعد مت توڑو۔

وَلاَ تَكُوْنُوْا كَالَّتِىْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلاً بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِىَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ. (النحل ۹۲:۱۶) اور اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے محنت کر کے کاتا ہوا سوت ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد کا موجب بنا لیتے ہو۔ اس لیے کہ ایک جماعت دوسری جماعت سے بڑھ کر ہو۔

نقض معاہدہ کے لیے اسلام نے صرف دو صورتیں قرار دی ہیں:

۱۔ فریق ثانی معاہدہ کو پورا کرنے میں کوتاہی برت رہا ہے۔ اس وقت اسلام یہ اجازت دیتا ہے کہ معاہد قوم کو فوراً اطلاع دے دی جائے کہ اب معاہدہ نہیں رہا۔

ارشاد الٰہی ہے: اَمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ اِنَّ اللّٰهَ لاَيُحِبُّ الْخَائِنِيْنَ (الانفال ۵۸:۸) اگر تجھے قوم کی دغا بازی کا خوف ہو تو ان کے عہد برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے اللہ دغا بازوں سے محبت نہیں کرتا۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اسلام بدعہدی سے روکتا ہے۔ ہاں اگر قوم کی خیانت کا علم ہو جائے تو ان کو برابری کا موقعہ دے کر معاہدہ سے دست برداری کر لی جائے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان كان بينه و بين قوم عهد فلا يحلّن عقده حتى امدها اوينبذ اليهم على سواء. یعنی اگر کسی کا دوسری قوم سے معاہدہ ہوا ہے چاہئے کہ معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے عہد کو نہ کھولے۔ یہ نہیں تو ان کا عہد برابری کو ملحوظ رکھ کر ان کی طرف کرے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ معاہدہ خاص حالات کے تحت کیا گیا ہو پھر کسی دوسری حالت میں اس معاہدہ کو قائم رکھنا باعث مضرت ہو۔ اس معاہدہ سے اس صورت میں معاہدہ فسخ کیا جا سکتا ہے اور اطلاع معاہد قوم تک دینا ضروری ہے۔

ارشاد الٰہی ہے:

اَذَانٌ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِئٌ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ (التوبہ ۳:۹) اور یہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کو حج اکبر کے دن اطلاع ہے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بیزار ہے۔

۱۔ معاہدہ فریقین کی رضا مندی سے ہوا ہو۔

۲۔ معاہدہ ایک دستاویز میں غیر مبہم الفاظ میں لکھا جائے جس میں فریقین کے حقوق و فرائض شرائط وغیرہ متعین کر دیے جائیں۔

پانچواں اصول: خارجہ پالیسی بین الاقوامی عدل پر مبنی ہو۔ ارشاد الٰہی ہے: يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَلاَّ تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى. (المائدہ ۸:۵) اے ایمان والو! اللہ کے نام پر انصاف کے ساتھ گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ کسی قوم کی دشمنی تم کو اس امر پر نہ اکسائے کہ عدل کا دامن چھوڑ دو تم انصاف کرو انصاف کرو یہ بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

چھٹا اصول: جنگ کے متعلق یہ ہے کہ جارح قوم کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے کیونکہ اگر مدافعت نہ کی جائے تو امن برباد ہو جاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَقَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُوْا (البقرہ ۱۹۰:۲) اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور حد سے نہ بڑھو۔

جنگ کی حد بیان کر دی کہ وہ زیادتی کے جذبے سے پاک ہو۔ محض مدافعت اور بدلہ مقصود ہو۔ ارشاد الٰہی ہے: جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا. (الشوریٰ ۴۲:۴۰) بدی کا بدلہ اس کی مثل سزا ہے۔

ساتواں اصول: قرآن مجید نے مسلمانوں کو "امت مسلمہ" کے خطاب سے نوازا ہے ارشاد الٰہی ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ ۲:۱۴۳) اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم سارے لوگوں کے پیش رو بنو اور رسولؐ تمہارا پیش رو ہے۔ اس آیت کریمہ میں اسلامی حکومت کی خارجہ پالیسی کا ایک اصول مقرر کیا ہے۔ وہ یہ جو سچائی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہے اسے لوگوں تک پہنچائیں۔ یعنی اسلامی حکومت اسلام کی مبلغ ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کوئی ایسا رویہ اختیار نہیں کر سکتی جو اسلام کی تعلیم کے منافی ہو۔

آٹھواں اصول: اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی اپنی سرحدوں کی حفاظت پر مبنی ہوتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود مدنی ریاست کی سرحدوں کی حفاظت پر بہت توجہ دی۔ جارح قوم سے پوری طاقت سے مقابلہ کیا۔ سرحدوں کی حفاظت کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا (ال عمران ۳:۲۰۰) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو صبر کرو اور مقابلہ میں بڑھ کر صبر دکھاؤ اور (سرحدوں کی) محافظت کرو اس آیت میں یہ بیان کیا ہے کہ اسلامی حکومت کو ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔

دوسری جگہ آتا ہے: قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (بقرہ ۲:۱۹۰) اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور حد سے نہ بڑھو۔

نواں اصول: اسلامی ریاست سفیروں اور قاصدوں کی جان کے تحفظ کی ضمانت دیتی ہے۔ اگر کوئی دوسرا حکمران اس اصول کی خلاف ورزی کرے تو اس کے خلاف جہاد کیا جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حضرت حارث بن عمر ازدی کو بلقاء کے حاکم نے شہید کر ڈالا تو آپ نے ان کا انتقام لینے کے لیے تین ہزار کا لشکر روانہ فرمایا۔ غزوہ موتہ اسی سلسلہ میں پیش آیا۔

دسواں اصول: اسلامی ریاست کا حفاظت خود مختاری اور سرحدوں کی سالمیت کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ بیرونی دشمن کو اپنے ملک میں گھسنے کا موقع دینے کے بجائے آگے بڑھ کر سرحد پر اس کا مقابلہ کرنے کا طریقہ اختیار کرے۔ رسول کریم ﷺ کے دور میں تبوک کا پُر صعوبت سفر اسی مقصد کے لیے تھا۔

خلفاء راشدین کے دور میں ایران شام وغیرہ کی حکومتیں مدنی ریاست کے لیے مستقل خطرہ بنی ہوئی تھیں۔ سرحدوں پر عربی قبائل کو اکساتی رہتی تھیں۔ خلفاء نے آگے بڑھ کر دشمنوں کے ملک میں داخل ہو کر ان کا مقابلہ کیا اور شکست دی۔

شام سے متصل عرب علاقوں (دومتہ الجندل۔ ایلہ۔ جربا اور اذرح) سے رومیوں کے اثر و رسوخ اور غلبہ کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح یمن، عمان اور بحرین کو مجوسی ایران سے نجات دلائی۔

گیارھواں اصول: اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی احترام انسانیت اور مظلوموں کی دست گیری پر مبنی ہے اسلام اسلامی ریاست پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ جہاں انسانیت کی ذلت ہو رہی ہو۔ عوام مظلومیت کا شکار ہوں تو ان کی مدد کی جائے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (النساء ۴:۷۵) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے راستہ میں جنگ نہیں کرتے اور کمزور مردوں اور عورتوں اور بچوں کے لیے جو کہتے ہیں۔ اے ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی دوست بنا ہمارا کوئی مددگار اور معاون بنا۔

دفاعی پالیسی کے اصول

اندرونی امن و یک جہتی پیدا کرنا: جب ہم رسول کریم ﷺ کی سیاسی زندگی پر نظر دوڑائیں تو ایک مسلم ریاست کو دفاعی پالیسی کے سنہری اصول مل جاتے ہیں۔

پہلا اصول جو سامنے آتا ہے وہ ہے اندرونی امن اور یک جہتی۔ جب رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام ہجرت کر کے مدینہ آئے تو رسول کریم ﷺ ایک چھوٹی سی مملکت کے سربراہ مقرر کر دیے گئے تو اہل مکہ نے مدینہ والوں کو لکھا کہ ہمارے دشمن (حضرت محمد ﷺ) کو یا تو جان سے مار ڈالو یا انھیں مدینہ سے نکال دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ہم مدینہ پر حملہ کر کے تمھیں تباہ و برباد کر دیں گے۔ یہ فوجی حملے کی کھلی دھمکی تھی۔ اب رسول کریم ﷺ پر بحیثیت سربراہ عوام کی جان و مال کی حفاظت اور سرحدوں کی حفاظت لازم آ گئی تو آپ ﷺ نے سب سے پہلے ملکی دفاع کی خاطر اندرونی امن و یک جہتی کی طرف توجہ فرمائی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے انصار اور مہاجرین کی مغائرت ختم کرنے کے لیے ان دونوں گروہوں کے درمیان مواخات قائم کی۔ اس طرح مسلمان یک جان ہو گئے۔

مدینہ مختلف قبائل میں بٹا ہوا تھا ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ جب کوئی ایک قبیلہ دوسرے پر حملہ کرتا تو تمام قبائل غیر جانبدار رہتے تھے۔ اس طرح مدینہ کی زمین فساد اور لڑائی جھگڑے کا گھر تھی تو آپ ﷺ نے مدینہ کے تمام قبائل (غیر مسلم) کے ساتھ ایک میثاق قائم کیا جو میثاق مدینہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ میثاق اس چھوٹی سی سلطنت کا ایک تحریری آئین تھا۔ اس میثاق کے تحت یہ قرار پایا کہ اگر کوئی باہر سے حملہ آور ہو تو سب قبائل کی یہ ذمہ داری ہوگی۔ اکٹھے مل کر دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ اس طرح رسول کریم ﷺ نے تمام فریقوں اور قبائل کے حقوق و فرائض متعین کرائے۔ کسی ریاست میں اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک دستور پر اس کی روح کے مطابق عمل نہ ہو اور عدل و انصاف کو فروغ نہ دیا جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مدنی ریاست میں عدل و انصاف کو فروغ دیا، چھوٹے بڑے کو عدل و انصاف کی نظر میں برابر قرار دیا۔ ارشاد الٰہی ہے "کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو یہ تقویٰ کے قریب ہے۔ (مائدہ ۸:۵)

اس طرح یک جہتی کے لیے کسی مملکت میں شورائیت (جمہوریت) کا ہونا بھی ضروری ہے تو آپ ﷺ نے حکم خداوندی کے تحت وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۱۵۸:۳) (اے رسول! ریاستی امور میں ان (عوام) سے مشورہ لیتے رہو چنانچہ رسول کریم ﷺ کے سامنے کوئی ریاستی معاملہ آتا تو آپ اس کو مشورہ سے طے فرماتے۔ سو دشمن کے حملوں کو روکنے کے لیے سب سے پہلے آپ ﷺ نے مدینہ کے اندر امن و یک جہتی کو فروغ دیا۔ دفاع کے لیے سب سے بہتر ہتھیار اندرونی امن اور یک جہتی کے سوا اور کوئی نہیں۔

دور حاضر میں بعض ریاستیں وفاقی ہیں۔ کئی کئی صوبوں میں منقسم ہیں۔ سو صوبوں میں یک جہتی پیدا کرنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ آئین میں صوبوں کو صوبائی خود مختاری دی جائے۔ بعض اوقات خود مختاری کا جھگڑا اتنا شدید ہو جاتا ہے ملک ٹوٹ جاتا ہے۔ صوبائی خود مختاری تمام صوبوں کی مشاورت سے طے ہونی چاہیے تاکہ ملک کے اندر امن اور یک جہتی کی فضا قائم ہو۔

اندرونی امن اور یک جہتی کے لیے طبقاتی تقسیم بھی زہر قاتل ہے۔ طبقاتی تقسیم کی کئی شکلیں ہیں۔ فرقہ وارانہ مذہبی گروہ بندی۔ اصولوں سے ہٹ کر فروعات پر لڑائی جھگڑے کرتے رہنا اور ایک دوسرے کو دہشت گردی سے نقصان پہنچانا۔ تقسیم دولت کی بناء پر امارت اور غربت میں لوگوں کا تقسیم ہونا۔ یہ تقسیم یک جہتی کے لیے بہت ہی خطرناک بیماری ہے۔ یہی تقسیم معاشرہ میں بغاوت کے شعلے بھڑکاتی ہے۔ رسول کریم ﷺ نے تقسیم دولت کے ایسے اصول مقرر کر دیے۔ جن کی وجہ سے دولت کا بہاؤ ہر طرف پھیل جاتا اور دولت چند افراد کے ہاتھوں مرتکز نہ ہونے پاتی اس طرح امارت اور غربت کا امتیاز مٹ جاتا۔

۲۔ خارجہ پالیسی: دفاع کا تعلق خارجہ پالیسی سے بھی ہے۔ خارجہ پالیسی کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ ہمسایہ ممالک سے برادرانہ تعلقات ہوں۔ رسول کریم ﷺ جب اندرونی امن و یک جہتی قائم کرنے سے فارغ ہوئے تو آپ نے خارجہ پالیسی کی طرف توجہ دی۔ آپ ﷺ کی خارجہ پالیسی کا اہم جزو مدینہ کے اردگرد قبائل سے دوستانہ معاہدے تھے۔ آپ نے مدینہ کے چاروں اطراف میں قبائل سے دفاعی معاہدے کیے کہ اگر کوئی ان پر حملہ آور ہوگا تو مدنی

ریاست ان کی مدد کرے گی۔ اگر مدنی ریاست پر کوئی حملہ آور ہو تو قبائل مدنی ریاست کے دفاع میں شریک ہوں گے۔ اس قسم کے معاہدے تاریخ میں محفوظ ہیں۔

دفاعی معاہدے ایک مسلم حکمران کے لیے مشعل راہ ہیں کہ ہمسایہ ممالک کے ساتھ تعلقات برادرانہ ہوں۔ اگر ہو سکے تو ان سے دفاعی معاہدے بھی کر لیے جائیں تا کہ اپنے دشمن کی جنگی کاروائیوں سے محفوظ رہ سکیں۔

اس دور میں مسلم ریاستوں کی حفاظت اور دفاع کے لیے بہت ضروری ہے کہ تمام مسلم ریاستیں ایک دفاعی میثاق میں منسلک ہو جائیں۔ اب دیکھنے میں آیا ہے کہ دشمن ایک ایک کر کے مسلم ریاستوں پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ تمام مسلم ریاستیں بے بسی کی حالت میں دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں تک بے بس ہیں۔ احتجاج تک نہیں کر سکتیں۔ احتجاج تو ایک طرف رہا۔ اگر استعمار پسند اور دہشت گرد سپر طاقت نے کسی مسلم ملک پر حملہ کرنا ہو تو اس کے ہمسایہ ملک کے حکمران کو یہ دھمکی دی جاتی ہے کہ تعاون نہ کیا تو تمہارا ملک خاک کا ڈھیر بنا دیا جائے گا۔ تو مسلمان حکمران دھمکی سے خائف ہو کر ہر ناجائز حکم کو ماننے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

معلومات کا حصول: ملکی دفاع کے لیے دشمن کے متعلق صحیح معلومات کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ دشمن کی معلومات حاصل کرنے سے متوقع نتائج کے حصول کے لیے صحیح نقشہ اور سٹریجڈی تیار کی جا سکتی۔ اس اصول کے پیش نظر رسول کریم ﷺ مختلف طریقوں سے معلومات حاصل کرتے تھے۔

۱۔ جنگی طلایہ گرد دستوں کے ذریعہ

۲۔ جاسوسوں کے واسطہ سے

۳۔ شخصی اطلاعات سے

۴۔ قیدیوں سے

۵۔ عقل مندوں سے مشورہ حاصل کرنے کے ذریعہ

گشتی دستوں کی ترتیب: دشمن کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے آپ نے گشتی دستوں کو ترتیب دیا ایک تو یہ دستے دشمن کی نقل و حرکت سے مرکز کو مطلع کرتے۔ دوم گشتی دستوں کے ذریعہ معاہدات بھی کیے۔ مثال کے طور پر صفر ۲ ہجری غزوہ ابوا کے دوران عمرو بن مخشی الضمری کے ساتھ غیر جانب دار رہنے کا معاہدہ کیا۔ اسی طرح جمادی الاخر ۲ ہجری میں غزوہ ذو العشیر ہ کے دوران بنی مدلج اور بنی ضمرہ کے ساتھ دوستانہ معاہدہ طے پایا۔ سوم ان گشتی طلایا نے قبائل پر مسلمانوں کی دھاک بٹھا دی۔ چہارم دشمن کے ان دستوں کے عزائم خاک میں ملا دیے جو مسلم بستیوں پر حملہ آور ہوتے مثلاً کفار مکہ نے ہجرت کے پہلے سال ہی دو لشکر روانہ کیے پہلا لشکر ۳۰۰ افراد پر مشتمل تھا، ابوجہل کی قیادت میں ماہ رمضان میں مدینہ کے خلاف روانہ ہوا۔ رسول کریم ﷺ نے امیر حمزہ کی قیادت میں تیس افراد کا گشتی دستہ روانہ کیا مسلمانوں کو باخبر پا کر ابوجہل بغیر لڑے واپس چلا گیا۔ دوسرا لشکر شوال ۱ ھ میں ابوسفیان کی قیادت میں مدینہ کے خلاف آیا۔ مگر مسلمانوں کو چوکنا پا کر واپس چلا گیا۔ پنجم ان گشتی دستوں کی تربیت نے مسلمانوں کے اندر عسکری استعداد کو بڑھا دیا۔ عسکری قیادت کی تربیت پائی اور مدینہ سے دور دراز علاقوں تک واقفیت حاصل کر لی جو دفاع کے لیے ضروری تھی۔

امور ادار یہ: کوئی جنگ امور ادار یہ کا اہتمام کیے بغیر جیتی نہیں جا سکتی۔ رسول کریم ﷺ نے ہمیشہ امور ادار یہ کا خصوصی اہتمام کیا۔ تمام مسلمانوں نے مجاہدین کے سامان حرب میں تعاون کیا۔ مثلاً خورد و نوش کا سامان، نقل و حمل کے لحاظ سے اسلحہ جنگ مہیا کرنا وغیرہ۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاَعِدُّوْا مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ (الانفال ۸:۶۰) ان (دشمن) کے مقابلہ کے لیے جتنی قوت تم فراہم کر سکو اور گھوڑے بھی پالو۔

جب بھی لشکر کی روانگی کا وقت آتا رسول اکرم ﷺ صحابہ سے مالی قربانی کا مطالبہ کرتے تو صحابہ اپنے اپنے گھر کا مال و متاع حضورؐ کے قدموں میں رکھ دیتے حضرت ابوبکرؓ نے اپنا تمام مال خدا کی راہ میں خرچ کر دیا حضرت عمرؓ نے نصف مال۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ نے غزوہ تبوک میں بہ نسبت دوسرے غزوات کے بہت زیادہ مال خرچ کیا۔ گویا لڑائی صرف فوج ہی نہیں لڑتی بلکہ ریاست کے تمام لوگ کسی نہ کسی طرح لڑائی میں مشغول ہوتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے تمام مسلمانوں کو کسی نہ کسی شکل میں شامل کیا رسول کریم ﷺ غزوات میں مشورہ کرتے۔ صحابہ کی رائے کو وزن دیتے بعض اوقات صحابہ کی رائے آپ ﷺ کی رائے کے خلاف بھی ہوتی کثرت رائے کی بناء پر اس پر عمل پیرا ہوتے جیسے کہ آپ نے عملی طور پر غزوہ احد میں کر کے دکھایا۔

سپہ سالار اور سپاہ کا باہمی تعلق جنگوں میں بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اگر سپاہ سالار کی بدکلامی برے رویے اور متکبرانہ طرز حیات کی وجہ سے نفرت کرتے ہوں اور ان کے دل جرنیل کی محبت سے خالی ہوں تو وہ جرنیل کی خاطر جان قربان کرنے سے گریز کریں گے۔ اس کے برعکس اگر سپاہ اور جرنیل کے دل ایک دوسرے کی محبت سے معمور ہوں تو سپاہ سپہ سالار کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ اس اصول کے تحت جو محبت اور پیار رسول کریم ﷺ کو صحابہ سے تھا۔ اس کی مثال نہیں تھی۔ اسی طرح صحابہ کے دلوں میں جو قربانی کا جذبہ رسول کریم ﷺ کے متعلق پایا جاتا تھا۔ اس کی بھی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ باہمی محبتوں

اور قلبی لگاؤ نے خاک نشینوں کو تخت نشین کر دیا۔

مختلف لڑائیوں میں مختلف حکمت عملی: رسول کریم ﷺ ہر لڑائی میں حالات اور دوران جنگ محل وقوع دیکھ کر فوج کی صف بندی اختیار کرتے تھے۔ وہ صف بندی حضور ﷺ کی فنون حرب میں مہارت پر دلالت کرتی ہے۔ بہترین صف بندی نے مسلمانوں کو قلیل تعداد ہونے کے باوجود فتح دی۔

سامان حرب کی تیاری: قرآن مجید نے دشمن کے مقابل میں سامان حرب کی تیاری کا واضح حکم دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ **وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ** (الانفال ۸:۶۰) اور تم ان کے لیے تیاری کرو جو کچھ کر سکتے ہو قوت اور سرحدوں پر گھوڑے باندھنے سے تم اس کے ذریعہ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو ڈراؤ۔

رسول کریم ﷺ کے عہد مسعود میں ہم دیکھتے ہیں۔ اپنے تمام وسائل سامان حرب مہیا کرنے میں صرف کرتے تھے۔ حتیٰ کہ تاریخ بتاتی ہے اس دور کا جدید ترین ہتھیار منجنیق بھی استعمال کیا گیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ فتوحات کے دور میں مسلم فوج جدید ترین ہتھیاروں سے لیس ہوتی تھی جب مسلمانوں نے جدید ترین ہتھیار تیار کرنے میں غفلت سے کام لیا تو ادبار کی اتھاہ گہرائیوں میں گر گئے۔ دور حاضر کے مسلمان حکمرانوں کے لیے، رسول کریم ﷺ کا دور مشعل راہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو فوج کو جدید ترین اسلحہ سے لیس کریں۔ جدید ترین اسلحہ کی تیاری کے لیے سائنس کے علم میں دسترس حاصل کرنا ضروری ہے اس دور میں جدید ترین اسلحہ اور سائنس لازم و ملزوم ہیں۔ دور حاضر میں مسلمانوں کی اپنے دشمن کے مقابل ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ مسلمان اسلحہ سازی میں جدید ترین اسلحہ سازی میں ترقی یافتہ ممالک سے بہت پیچھے ہیں۔

فوج کا انتظامیہ کے ماتحت ہونا: اسلام نے فوجی شعبہ کو انتظامیہ کے ماتحت رکھا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ **اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ.** اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور صاحب امر (حاکم) کی اطاعت کرو اگر کسی چیز میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔

رسول کریم ﷺ نبی تھے۔ اس لیے غزوات میں آپ ﷺ ہی سپہ سالاری کے فرائض انجام دیتے تھے آپ کے بعد خلفاء راشدین کے دور میں فوج انتظامیہ کے تحت تھی۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے کسی حکمت کے تحت حضرت خالد بن ولید کو سپہ سالاری سے الگ کر دیا تو وہ طوعاً و کرہاً اپنے منصب سے الگ ہو گئے اور مدینہ آ کر خلیفہ کے سامنے حاضری دی۔ خلفائے راشدین کے دور میں ترقی مسلمانوں کی حربی فتوحات کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ فوج انتظامیہ کے ماتحت تھی۔ صاحب امر کی طرف سے جو حکم ملتا تھا اس کو بجا لاتی۔ اس کے برعکس جب بنو عباس کے تنزل کے دور میں ترک فوج منہ زور ہو گئی اور خلفاء پر حاوی ہو گئی تو عظیم اسلامی سلطنت کا انجام سقوط بغداد نکلا۔ دوسری مسلم سلطنتوں کے زوال کا ایک بڑا سبب فوجی حکمرانوں کی سرکشی اور اپنے حدود سے تجاوز تھا۔ ہمارے قریب کے دور میں سقوط ڈھاکہ محض فوجی جرنیل کا اپنی حدود سے تجاوز ہے۔ جب بھی فوج اپنے آپ کو انتظامی معاملات میں الجھائے گی تو اس کی حربی استعداد میں کمی آتی جائے گی جو میدان جنگ میں شکست کا باعث بنتی ہے۔

باب ۸

اسلام کا اقتصادی نظام

نفس مضمون

ہر علم کا ایک مرکزی محور ہوتا ہے جس کے اردگرد اس علم کا تانا بانا بُنا جاتا ہے اور وہی محور اس علم کا نفس مضمون ہوتا ہے۔ معاشیات کا نفس مضمون جیسا کہ لفظ معاشیات سے ظاہر ہے انسانی زندگی کے مالی مسائل سے تعلق رکھتا ہے یہ علم اس امر سے بحث کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ وسائل سے اپنی مادی خواہشات کو کس طرح پورا کرنا ہے۔ گویا علم معاشیات انسانی فلاح کا ضامن ہے۔

کسی علم کے نفس مضمون کو جاننا اس وجہ سے ضروری ہے تاکہ قاری کے لیے اس علم کے مباحث کا سمجھنا آسان ہو جائے۔

معاشیات کے معنی

معاشیات کے معنی ہیں روٹی سے متعلق مسائل۔ عیش روٹی (گندم) کو کہتے ہیں۔

اقتصاد کے معنی: عربی لغت میں قصد اور اقتصاد میانہ روی اور اچھے چلن کا نام ہے لیکن اصطلاحی لحاظ سے انسان کی ضروریات و احتیاجات کو پورا کرنے کے لیے محنت و سعی اور تعاون اور اشتراک سے ذرائع پیداوار تلاش کرنے اور مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کا نام ہے۔

چونکہ معاشیات کا تعلق انسانی زندگی کی احتیاجات سے ہے۔ اس لیے علم معاشیات اس وقت سے کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے جب سے انسان پیدا ہوا ہے۔ انسان کو طبعی طور پر بھوک مٹانے اور زندگی برقرار رکھنے کے لیے روٹی کی ضرورت تھی۔ تو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے زمین سے روزی تلاش کی۔ بارش، آندھی، گرمی، سردی اور دیگر سماوی آفات سے بچنے کے لیے کوئی پناہ درکار تھی۔ اس کے لیے غاریں تلاش کیں۔ پھر مکان تعمیر کیے۔ اس طرح اپنے تنگ کو ڈھانپنے کے لیے ستر کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے، آبادی بڑھتی چلی گئی۔ ذرائع پیداوار انسانوں کی زیر ملکیت آتے چلے گئے اور تقسیم در تقسیم ہو کر کئی ہاتھوں میں بٹ گئے۔ اس طرح ذرائع پیداوار محدود ہوتے چلے گئے۔ انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پیداوار کے بڑھانے کے لیے مختلف طریقے تلاش کیے جانے لگے۔ اس طرح معیشت ایک علم کا رنگ اختیار کرتی چلی گئی۔ ماہرین معاشیات پیدا ہونے لگے۔ ان ماہرین نے اپنے اپنے دور کے حالات کے مطابق علم معاشیات کی مختلف تعریفیں کیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اتنی مختلف الفاظ میں تعریفیں اختراع ہوئیں کہ علم معاشیات ان تعریفوں کے بوجھ تلے ہی دب گیا۔ بہرحال علم معاشیات میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی پہلے ماہرین نے معاشیات کو صرف مالی امور تک محدود رکھا۔ بعد کے ماہرین نے معاشیات کو انسان کی فلاح کا ذریعہ قرار دیا۔ چونکہ تعریف کیے بغیر ہم علم معاشیات کی کہنہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ لہٰذا مختلف ادوار میں مختلف ماہرین نے مسئلہ معیشت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے صرف چند ایک ماہرین کی تعریفات درج کی جاتی ہیں کیونکہ کسی علم کی کہنہ تک پہنچنے کے لیے تعریف کا جاننا ضروری ہے۔

علم معاشیات کی تعریفات: علامہ ابن خلدون اپنی مشہور کتاب مقدمہ میں معاشیات کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''معاش رزق ڈھونڈنے اور اسے حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کا نام ہے۔''[1]

الحریری نے ''المعاش'' کی تعریف یوں کی ہے۔

''معاش سے مراد یہ ہے کہ انسان تجارت، زراعت اور صنعت کے ذریعے اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرے۔''[2]

آدم سمتھ جس کو معاشیات کا بانی اور باپ کہا جاتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں ''معاشیات دولت کے حاصل کرنے اور خرچ کرنے کے اصول کا علم ہے۔''

---

[1] ابن خلدون مقدمہ (ترجمہ) جلد دوم ص ۲۵۷۔

[2] Rafique Ahmad "The origin of Economics and the muslims. A prelimanrary study P 40.

والرس (Walrus) چیپ مین (Chapman) فاسٹ (Fawcet) ایلے (Elley) این ڈبلیو سینئر (N.W.Senior) جان ایس مل (J.S.Mill) مالتھس (Malthus) ڈیوڈ ریکارڈو (Ricardo) نے بھی معاشیات کو دولت کا علم قرار دیا ہے۔

اسلام کی رو سے معاشیات کی تعریف: اسلام میں زندگی کے تمام شعبے خواہ ان کا تعلق عقائد سے ہو یا عبادات سے خواہ اخلاقیات سے ہو خواہ سیاسیات سے خواہ عمرانیات سے اور خواہ معاشیات سے، ان کا باہم گہرا ربط ہے۔ اس لیے جب اسلام کی رو سے علم معاشیات کی تعریف کی جائے گی تو تمام پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ میرے نزدیک اسلام کی رو سے معاشیات کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے۔

''علم معاشیات زندگی کا وہ مالی شعبہ ہے جو قرآن اور حدیث کی ہدایت کے مطابق فلاح و بہبود انسانی کے لیے منضبط ہوتا ہے۔''

اسی طرح حسن الزمان اسلامی معاشیات کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔ ''اسلامی معاشیات وہ علم ہے جس میں شریعت کے اصولوں کا اطلاق ہوتا ہے جو بے انصافی کے ذریعہ مادی وسائل کے حصول کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور جو مادی وسائل کے تصرف کو اس طرح منضبط کرتے ہیں کہ وہ انسان کو تسکین بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ اس قابل بنائیں کہ وہ ان فرائض کی ادائیگی کریں جو اللہ تعالیٰ اور جماعت نے ان پر عائد کیے ہیں۔[1]

محمد اکرم خان کی تعریف: ''معاشیات اسلام کا مقصد انسانی فلاح کا مطالعہ کرنا جو کہ زمینی وسائل کو منظم کرنے، حصہ لینے اور باہمی تعاون سے حاصل ہوتی ہے۔[2]

مذکورہ تعریفات یہ بتاتی ہیں کہ اسلام نے کسب دولت کے اصول اور قوانین وضع کیے ہیں ان اصولوں کی روشنی میں ہی کسب دولت ہوگی۔ اسی طرح صرف دولت کا ایک ضابطہ دیا ہے اس کے مطابق ہی دولت خرچ کی جاتی ہے اور کسب اور صرف کے اسلامی اصول انسانی فلاح کا ذریعہ ہیں۔ ان اصولوں سے ہٹ کر جو بھی کسب اور صرف کرے گا۔ وہ ناجائز اور باطل کے ضمن میں آئے گا۔ وہ انسانی فلاح کے لیے سم قاتل ہوگا۔ یہی وجہ ہے قرآن مجید میں اس مال و دولت کے لیے ''حسنہ'' اور ''فضل'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو جائز طریقہ سے کمایا ہے اور اس مال و دولت کے علاوہ جو اسلام کی تعلیم کے خلاف کمایا اور خرچ کیا جاتا ہے۔ وہ باعث ہلاکت قرار دیا ہے۔

---

1. Journal of research in Islamic Economics vol-1 , No-2 1984.
2. Muhammad Akram Khan, Defination and Nature of Islamic Economics Journal of research in Islamic Economics vol-1, No-2 1984.

اسلام کا معاشی تصور

(انفرادی ملکیت)

انفرادی جائیداد: اصولی طور پر اسلام کائنات کی ہر چیز کو اللہ کی ملکیت قرار دیتا ہے اور اس میں تمام انسانوں کو برابر کا سہیم قرار دیتا ہے۔ ہر شخص خدا کی پیدا کردہ اشیاء کو حاصل کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کا مجاز ہے۔ گویا کائنات کی کوئی شے فی حد ذاتہٖ کسی کی مملوکہ نہیں ہے بلکہ ہر شے لوگوں کے درمیان مشترکہ مملوکہ ہے اور ہر ایک کو ان سے انتفاع کا موقع دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَکُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَ اِلَیْهِ النُّشُوْرُ (الملک ۶۷:۱۵) وہی ہے جس نے زمین کو تمھارے ماتحت کر دیا۔ سو اس کی اطراف میں چلو اور اس کے دیے سے کھاؤ اور اس کی طرف موت کے بعد اٹھ کر جانا ہے۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (البقرہ ۲:۲۹) وہی ہے جس نے سب کچھ جو زمین میں ہے تمھارے لیے پیدا کیا۔

وَلَقَدْ مَکَّنّٰکُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَکُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ (الاعراف ۷:۱۰) اور یقیناً ہم نے زمین میں تمہارا ٹھکانا بنایا ہے اور تمھارے لیے اس کے اندر روزی کے سامان رکھے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ (الرعد ۱۳:۳) اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور ہر قسم کے پھلوں سے اس میں دو دو (یعنی) جوڑے بنائے۔

وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَکَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَا اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (حم السجدہ ۴۱:۱۰) اور اس میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس میں برکت دی اور اس کی خوراکوں کا اندازہ کیا یہ چار دن میں کیا مانگنے والوں کے لیے سب کچھ ٹھیک کر رہا ہے۔

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ (الواقعہ ۵۶:۶۳، ۶۴) کیا تم نے دیکھا جو تم بوتے ہو کیا تم اسے اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں۔

اسلام ایک فطری اور سلامتی کا دین ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی بالاتر ملکیت کے ماتحت جائز اور ناجائز حدود مقرر کر کے رفع نزاع اور حصول انتفاع کے لیے ذاتی ملکیت کو تسلیم کیا ہے۔ اصولِ اشتراک کے بیان کرنے میں اسلام نے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ تمام اشیاء کا حقیقی مالک تو اللہ کو ہی سمجھو لیکن چند پابندیوں کے ساتھ جو حقوق ملکیت اللہ تعالیٰ نے تمھیں بخشے ہیں ان کو پورا کرو اگر تم نے ان پابندیوں کو پورا نہ کیا تو وہ ذاتی ملکیت تمھارے لیے خسران کا موجب بنے گی۔

ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (ال عمران ۳:۱۸۵) اور دنیا کی زندگی نرا دھوکے کا سامان ہے۔

وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَةٌ وَّ اَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ (الانفال ۸:۲۸) اور جان لو کہ تمھارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش ہے اور یہ کہ اللہ کے پاس بھاری اجر ہے۔

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِیْنَ وَالْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَیْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ (ال عمران ۳:۱۴) لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت جیسے عورتوں اور بیٹوں اور ڈھیروں ڈھیر سونے اور چاندی اور پلے ہوئے گھوڑوں اور مویشی اور کھیتی سے بھلی معلوم ہوتی ہے یہ اس دنیاوی زندگی کا سامان ہے اور اللہ کے پاس لوٹ کر جانے کی اچھی جگہ ہے۔

وَمَاۤ اَمْوَالُکُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُکُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُکُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰۤی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا (سباء ۳۴:۳۷) اور نہ تمھارے مال اور نہ تمہاری اولاد وہ چیز ہے جو مرتبہ میں تمھیں ہمارے قریب کرے مگر جو ایمان لاتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے تو ان کے لیے ان کے عمل کا دو چند اجر ہے۔

مال و دولت کی مدح: وہ دولت جو اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر کمائی جائے وہ سب کے لیے زینت، رحمت اور فضل ہوگی۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلاً (الکہف ۱۸:۴۶) مال اور بیٹے دنیا کی زندگی کی زینت ہیں اور باقی رہنے والے اچھے عمل تیرے رب کے نزدیک بدلے میں بہتر ہیں اور امید کے لحاظ سے بھی بہت اچھے ہیں۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً (الکہف ۱۸:۷) اور جو کچھ زمین پر ہے ہم نے اسے اس لیے زینت بنایا ہے تاکہ انھیں آزمائیں کہ کون ان میں سے بہترین عمل کرنے والا ہے۔

وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ ۶۲:۱۰) اللہ کے فضل کی تلاش کرو۔

وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ اِنْ شَاءَ (توبہ ۹:۲۸) اگر تم کو مفلسی کا ڈر ہو تو اللہ اگر چاہے تم کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔

متذکرہ بالا بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اگر دولت اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ احکام کے تحت کمائی جائے تو وہ کمانے والے کے لیے فضل ہے اور اگر خدا کے احکام کو توڑ کر ناجائز ذرائع سے کمائی جائے تو وہ دولت دنیا اور آخرت میں گھاٹے کا موجب ہوگی۔

انفرادی ملکیت: قرآن مجید میں ایسی بہت سی آیات ہیں جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے افراد کے لیے ملکیت کا حق تسلیم کیا ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا لِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء ۴:۳۲) مردوں کا وہ حصہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کا وہ حصہ جو وہ کمائیں۔

وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا (النور ۲۴:۳۳) اور تم اسے سونے کا ڈھیر دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ نہ لو۔

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ (البقرہ ۲:۲۷۹) اگر تم توبہ کر لو تو تمھارے لیے اصل مال ہیں۔

وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْ اٰتٰكُمْ (النور ۲۴:۳۳) اور ان کو اللہ کے مال سے جو اس نے تمھیں دیا کچھ دو۔

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا (احزاب ۳۳:۲۷) اور تمھیں ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا وارث بنایا اور ایسی زمین کا بھی جس پر تم نے قدم نہیں رکھا۔

وَلَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرہ ۲:۱۸۸) اور اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ اور نہ ان کے ذریعہ حاکموں تک پہنچو تاکہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ گناہ کے ساتھ کھا جاؤ حالانکہ تم جانتے ہو۔

وَاَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (البقرہ ۲:۲۶۷) اور ان اچھی چیزوں سے خرچ کرو جو تم کماتے ہو اور اس سے جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالا ہے۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ (النساء ۴:۲) اور یتیموں کو ان کے مال دو اور اچھی چیزوں کو ردی سے نہ بدلو۔

فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (معارج ۷۰:۲۴) اور وہ جن کے مالوں میں ایک مقرر حق ہے سوال کرنے والے اور محروم کے لیے۔

رسول کریم ﷺ کے متعدد ارشادات سے بھی انفرادی حق ملکیت ثابت ہے۔ ان دماء کم واموالکم و اعراضکم حرام کحرمة یومکم هذا (بخاری کتاب الحج) تمھاری جانیں اور تمھارے مال اور تمھاری آبروئیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت (یعنی حج کے دن کی)

مالک کو اپنے مال کی حفاظت کا حق ہے جو اس کی حفاظت کرتا ہوا مرتا ہے۔ شریعت اسلامی کی نگاہ میں وہ شہید ہے۔

عن عبداللہ بن عمر وقال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول من قتل دون ماله فهو شهید (بخاری ابواب الظالم والقصاص باب من قتل دون ماله) حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتا ہوا مارا گیا وہ شہید ہے۔

عن ابی هریرة قال جاء رجل الی رسول اللہ ﷺ فقال یارسول اللہ ارائیت ان جاء رجل یرید اخذ مالی قال فلا تعطه مالک قال ارائیت ان قاتلنی قال قاتلهٔ قال ارائیت ان قتلنی قال فانت شهید قال ارائیت ان قتلتهٔ قال هو فی النار (مسلم کتاب الایمان باب الدلیل علی ان من قصد اخذ مال غیره بغیر حق کان القاصد مهدور الدم فی حقه الخ) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول آپ ﷺ کی کیا رائے ہے اگر میرے پاس کوئی آدمی میرا مال چھیننے کے ارادہ سے آئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تو تم اس کو اپنا مال نہ دو اس نے کہا کہ اگر وہ مجھ سے لڑائی کرے تو آپ ﷺ کا کیا خیال ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم بھی اس سے لڑائی کرو اس نے کہا کہ اگر وہ مجھے قتل

کر دے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تو تم شہید ہو اس نے کہا اگر میں اسے قتل کر دوں تو آپ کا خیال ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ دوزخ کی آگ میں جائے گا۔
رسول کریم ﷺ نے کسی شخص کی مملوکہ زمین پر غاصبانہ قبضہ کو بدترین جرم قرار دیا ہے جس سے انفرادی حق ملکیت ثابت ہو جاتا ہے۔ اگر زمین کا کوئی مالک ہی نہ ہو تو غاصبانہ قبضہ چہ معنی دارد فرمایا من اخذ من الارض شیئا بغیر حقہ خسف یوم القیامہ الی سبع ارضین (بخاری کتاب المظالم والقصاص) جس نے بغیر حق کے کسی کی تھوڑی سی زمین پر قبضہ کر لیا۔ اسے قیامت کے دن ساتوں زمینوں تک دھنسا دیا جائے گا۔
من ظلم من الارض شیئا طوقہ من سبع ارضین (بخاری کتاب المظالم والقصاص) جس نے تھوڑی سی زمین پر قبضہ کر لیا اسے سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔

انفرادی ملکیت اور آزادی: معاشی آزادی کے متعلق چار نظریے ہیں۔ ایک نظریہ تو سرمایہ دارانہ ہے جس کی رو سے اکتساب دولت اور تصرف دولت پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں۔ ہر فرد آزاد ہے جو چاہے کاروبار کرے اور نفع اندوزی کے لیے جو چاہے طریقے اختیار کرے اور اسی طرح تصرف دولت کے لیے بھی ہر قسم کی پابندی اور قید سے آزاد ہے۔

دوسرا نظریہ اشتراکی ہے جس کی رو سے کوئی فرد بھی ذاتی ملکیت رکھنے میں آزاد نہیں۔ تمام پیدائش دولت کے وسائل حکومت کے قبضے میں ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ محنت کا وسیلہ بھی۔ جو فرد محنت کرتا ہے۔ اس کا ثمر حکومت لے لیتی ہے اور حکومت اس فرد کی ضروریات اور احتیاجات کو پورا کرتی ہے۔ اس طرح تمام افراد حکومت میں مدغم ہو جاتے ہیں اور ان کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اشتراکی نظام میں حکومت ہی مختار کل ہے اور رعایا اس کی غلام اور خادم تو بے جا نہ ہوگا۔ اس نظام میں تنقید، شکایت استغاثے وغیرہ کے تمام دروازے مسدود کر دیے جاتے ہیں۔ ہر فرد کو وہی کام سرانجام دینا ہوتا ہے جو حکومت چاہتی ہے۔

تیسرا نظریہ فاشزم کا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے وسائل معیشت پر شخصی تصرف تو رہتا ہے لیکن اجتماعی مفاد کی خاطر اس شخص کے تصرف پر حکومت کا زبردست کنٹرول ہوتا ہے۔ جس طرح اشتراکی نظام میں افراد جماعت میں گم ہو جاتے ہیں اسی طرح اس نظام میں بھی افراد جماعت میں اپنی حیثیت گم کر دیتے ہیں۔

چوتھا نظریہ اسلام کا ہے اور وہی طبعی اور فطری نظریہ ہے اس میں فرد اور جماعت کی ترقی مضمر ہے۔ اور یہی وہ نظریہ ہے جو تمام خوبیوں کا حامل اور ہر قسم کے عیوب سے مبرا ہے وہ نظریہ یہ ہے۔

اسلام ذاتی ملکیت کا قائل ہے لیکن فطری تقاضے کے مطابق دولت کا وہ حصہ جس کی پیدائش میں انسان کی ذاتی سعی اور اس کے عمل کا دخل ہوتا ہے۔ جیسے صنعت وحرفت زراعت اور تجارت وغیرہ وہ انسان کی ذاتی ملکیت تصور کیا جاتا ہے۔ پھر اکتساب دولت کے ذرائع ووسائل پر پابندیاں لگاتا ہے۔ جو مال جائز طریقہ سے کمایا جائے اس پر بھی حقوق وفرائض عائد کر کے اہل حقوق تک اس مال کے پہنچانے کا حکم دیتا ہے۔ اس طرح اسلام نے کسب مال اور تصرف مال کے لیے حدود مقرر کر دی ہیں۔ ان حدود کے اندر اس کو آزادی حاصل ہے۔ اس آزادی کو سلب کر لینے کا کسی کو حق حاصل نہیں ہے۔ اسی طرح انسان کو یہ اختیار نہیں ہے جو اسلام نے حدود مقرر کی ہیں۔ ان سے تجاوز کرے۔ روزی کمانے کے حلال اور حرام طریقے وضع کرنا خدا کا اختیار ہے۔ اگر کوئی روزی کمانے والا اللہ کی حدود کو پھاند کر اپنی تجوریاں بھر لیتا ہے اور گناہوں کی جگہ پر دولت خرچ کرتا ہے تو وہ خدا کا باغی ہے اللہ تعالیٰ نے قوم مدین کی اس بات پر مذمت کی ہے وہ لوگ اکتساب اور تصرف کے معاملہ میں آزادی کے مدعی تھے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (ہود ۱۱:۸۷) انھوں نے کہا اے شعیب کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم اسے چھوڑ دیں جس کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے یا اپنے مالوں میں جس طرح چاہئیں وہ نہ کر سکیں۔

اکتساب دولت اور تصرف دولت کی کیا حدود ہیں ان کا ذکر بعد میں آئے گا۔

ذاتی ملکیت کے شرعی ذرائع

ذاتی ملکیت کے شرعی ذرائع دو قسم کے ہیں مادی ذرائع اور غیر مادی ذرائع جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مادی ذرائع: ۱۔ تجارت ۲۔ صنعت وحرفت ۳۔ زراعت ۴۔ احیائے موات (افتادہ زمینوں کو آباد کرنا) ۵۔ اقطاع (عطیات) ۶۔ شکار ۷۔ جہاد (مال غنیمت) ۸۔ ورثہ ۹۔ ہبہ ۱۰۔ وصیت ۱۱۔ بیت المال سے مالی امداد ۱۲۔ (دفینہ) غیر مادی ذریعہ ۱۳۔ محنت (بعد میں بحث آئے گی)

تجارت: تجارت ذاتی ملکیت کے شرعی ذرائع میں سے ایک اہم ذریعہ ہے۔ فقہاء امت فرماتے ہیں۔ فالبیع والشراء من اکبر الوسائل الباعثة علی

العمل فی هذا الحیوٰۃ الدنیا واجل اسباب الحضارۃ والعمران (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ص۲۰۲) تجارت اس دنیا میں معاشی وسائل میں سے سب سے بڑا وسیلہ ہے اور حضارت اور تمدن کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب۔

تجارت کی ترغیب: اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار تجارت کی ترغیب دی ہے اور اس کے فضائل بیان کیے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ (الجمعہ ۶۲:۱۰) جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (مال تجارت) تلاش کرو۔

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ باہر سے تجارتی قافلہ آ گیا لوگوں کو علم ہوا تو سب لوگ قافلہ کی طرف خرید وفروخت کے لیے بھاگ گئے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اس آیت کریم میں مسلمانوں کو یہ تعلیم دی ہے جمعہ پڑھ کر کاروبار میں لگ جانا جائز ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ (النساء ۴:۲۹) اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے مالوں کو آپس میں ناحق کے ساتھ مت کھاؤ سوائے اس کے کہ تمہاری باہمی رضامندی سے تجارت ہو۔

وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ (المزمل ۷۳:۲۰) اور جو زمین میں سفر کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل (معاش) کو تلاش کرتے ہوں گے۔

وَیَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرِضْوَانًا (المائدہ ۵:۲) وہ اپنے رب سے فضل (بذریعہ تجارت) اور خوشنودی چاہتے ہیں۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ (بقرہ:) اے لوگو جو ایمان لائے ہو خرچ کرو ان پاک چیزوں سے جو تم نے کمائی ہیں۔

مفسر قرآن حضرت مجاہد تابعی نے ماکسبتم کی تفسیر میں کسب سے مراد تجارت لی ہے۔ (بیہقی کتاب البیوع ج ۵)

وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (بقرہ ۲:۲۷۵) اور اللہ نے خرید وفروخت کو حلال کیا ہے اور سودی کاروبار کو حرام کیا ہے۔

بحری تجارت کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ وَتَرَی الْفُلْکَ فِیْہِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ (فاطر ۳۵:۱۲) اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ اسے پھاڑتی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو۔

رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ (النور ۲۴:۳۷) ایسے لوگ جنھیں نہ تجارت اور نہ خرید وفروخت اللہ کے ذکر سے غافل کرتی ہے۔

وَاَوْفُوا الْکَیْلَ اِذَا کِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ (بنی اسرائیل ۱۷:۳۵) جب تم تول کرو تو پورا تولو اور صحیح ترازو سے وزن کرو۔

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ (النساء ۴:۳۲) مردوں کے لیے حصہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کے لیے حصہ ہے جو وہ کمائیں۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشھداء (بیہقی کتاب البیوع وترمذی ۴/۱۳) سچے اور امانت دار تاجر قیامت کے دن نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوں گے۔

رسول کریم ﷺ سے پوچھا گیا اچھا ذریعہ معاش کون سا ہے۔ آپ نے جواب دیا پاک صاف تجارت تسعۃ اعشار الرزق فی التجارۃ (بیہقی کتاب البیوع ج ۵ وکنز العمال) روزی کا ۹/۱۰ حصہ تجارت میں ہے۔

قال قتادۃ کان القوم یتبایعون و یتجرون ولکنھم اذا نابھم حق من حقوق اللّٰہ لَمْ تلھھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللّٰہ حتی یؤدوہ الی اللّٰہ (بخاری ۳۴:۸) قتادہ کہتے ہیں کہ لوگ خرید وفروخت اور تجارت کرتے تھے لیکن جب ان کے سامنے خدا کے حقوق میں کوئی حق آ جاتا تو انھیں تجارت اور لین دین خدا کے ذکر سے غافل نہ کرتا تھا یہاں تک کہ وہ خدا کے حق کو ادا کر دے۔

لولا ھذہ البیوع لصرتم عالۃ علی الناس (کنز العمال) اگر تجارت نہ ہوتی تو تم دوسروں کے لیے وبال جان بن جاتے۔

عن ابی ھریرہ ان رسول اللّٰہ قال والذی نفسی بیدہ لان یاخذ احدکم حبلہ فیحتطب علی ظاھرہٖ خیرٌ لہ من ان یاتی رجلاً فیسئالہ اعطاہ او منعہ (بخاری کتاب الزکوٰۃ) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یہ بات کہ تم میں سے کوئی شخص رسی میں باندھ کر لکڑیوں کا گٹھا اپنی پیٹھ پر لاد کر لائے تو اس کے لیے اس سے بہتر ہے کہ کسی شخص کے پاس جا کر سوال کرے اور وہ اس کو دے یا نہ دے۔

البدایہ والنہایہ میں ہے کہ رسول کریم ﷺ نے نبوت سے قبل بارہ سال تجارت کی۔ آپ ﷺ کا مال شام، یمن، حساء، بحرین، کویت اور مسقط وغیرہ

کی منڈیوں میں جاتا تھا۔ تجارت کے سلسلہ میں دو مرتبہ ملک شام کی طرف سفر اختیار کیا۔ ابو داؤد میں ہے کہ حضرت سائب فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ قبل از اعلان نبوت میرے شریک تجارت تھے۔ معاملہ ہمیشہ نہایت صاف رہا۔ (ابوداؤد)

اسی طرح بعد نبوت بحرین سے وفد عبدالقیس آیا تو آپ ﷺ نے اس سے اپنی تجارت کا حال بیان کیا کہ میرا مال تمہاری منڈیوں میں جایا کرتا تھا۔ (تاریخ ابن جریر طبری)

حضرت ابوبکر صدیق خلافت سے قبل کپڑوں کی تجارت کیا کرتے تھے۔ خلافت کے بعد بھی کچھ عرصہ تجارت میں مشغول رہے۔ جب صحابہ کرام نے بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا۔ تب آپ نے یہ پیشہ چھوڑا۔ حضرت عمرؓ بھی تجارت کیا کرتے تھے آپ کا تجارتی کاروبار دیگر ممالک کی منڈیوں میں بکتا تھا۔ حضرت عثمان کے متعلق بھی کتب تاریخ میں بکثرت شواہد ملتے ہیں۔ (اسد الغابہ)

حضرت زبیر کا بھی ذریعہ معاش تجارت ہی تھا۔ (استیعاب ج ۱ ص ۲۰۸)

حضرت طلحہؓ بھی تجارت کیا کرتے تھے۔ آپ تجارتی سفر میں ہی تھے کہ رسول کریم ﷺ کے دعوئ نبوت کی خبر سنی جب آپ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور مدینہ میں اپنا مسکن بنایا تو علاوہ تجارت کے زراعت کا مشغلہ جاری رکھا اس میں اس قدر ترقی ہوئی کہ ساڑھے تین ہزار روپے روزانہ آمدنی ہو گئی۔ (طبقات ابن سعد قسم اول جز و ثالث ص ۱۵۸)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف شروع سے ہی تجارت کرتے تھے۔ جب اسلام لائے اور ہجرت کی تو رسول کریم ﷺ نے سعد بن ربیع انصاری سے ان کی مواخات کرا دی۔ مواخات کے بعد حضرت سعد نے ان کو اپنا نصف مال دینا چاہا لیکن آپ نے اس کو شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا اور کہا مجھے کسی بازار کا راستہ بتا دو میں تجارت کر کے اپنے لیے روزی پیدا کر لوں گا چنانچہ انھوں نے بنو قینقاع کے بازار میں دودھ اور پنیر بیچنا شروع کر دیا۔ جس سے تھوڑے ہی عرصہ میں اس قدر نفع ہوا کہ وہ اپنے اخراجات خود برداشت کرنے لگے۔ (بخاری)

حضرت عبداللہ بن عمر اونٹوں کی تجارت کیا کرتے۔ اپنے اونٹوں کو مقام بقیع میں لے جاتے وہاں فروخت کر کے اپنی روزی پیدا کرتے تھے۔ (ابن ماجہ)

حضرت عطا (تیمی) کی تجارت اس قدر پھیلی ہوئی تھی کہ ان کا مال تجارت ممالک غیر میں جایا کرتا تھا۔ آپ کا سامان قیمتی اور اعلیٰ ہوا کرتا تھا۔ ایک بار ان کی دکان پر ایک ریشمین جوڑا فروخت کرنے کے لیے لایا گیا۔ تو حضرت عمرؓ نے دیکھ کر رسول کریم ﷺ سے کہا۔ اس کو اپنے واسطے خرید لیجئے اور وفود کی آمد پر زیب تن فرمایا کریں۔ (مسلم کتاب اللباس)

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ مشہور مہاجر صحابی تھے۔ ان کا پیشہ طباخی تھا۔ اسی سے اہل و عیال کی پرورش کیا کرتے تھے۔ آپ نے مدینہ میں ایک کھانے کی دکان کھول رکھی تھی۔ جس سے آپ کو بہت نفع ہوا۔ مرتے وقت چار ہزار دینار نقد اور بہت سے مکانات چھوڑے۔ (طبقات ابن سعد ص ۸۰)

حضرت عمرؓ نے ایران، شام اور مصر کی فتوحات کے بعد مسلمانوں کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کرنا چاہا۔ اس پر حضرت ابوسفیان نے کہا۔ ادیوان مثل دیوان بنی الاصفر فالکلوا علی الدیوان و ترکوا التجارۃ (فتوح البلدان بلازری ص ۴۶۳) کیا رومیوں کی طرح ہمارے نام بھی رجسٹر میں درج ہوں گے۔ اگر آپ نے لوگوں کے وظائف مقرر کر دیے تو وہ اس کے عادی ہو جائیں گے اور تجارت چھوڑ دیں گے۔

تجارت کے اصول

۱۔ تجارتی معاملہ میں فریقین کی باہمی رضامندی ضروری ہے۔ اضطراری رضا معتبر نہیں ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (النساء ۴:۲۹) اے لوگوں جو ایمان لائے مالوں کو آپس میں ناحق کے ساتھ مت کھاؤ۔ سوائے اس کے کہ تمہاری باہمی رضامندی سے تجارت ہو۔

نھی رسول اللہ ﷺ عن بیع المضطر (ابوداؤد ابواب البیوع) رسول کریم ﷺ نے مجبوری اور زبردستی کی بیع کو ناجائز قرار دیا ہے۔

۲۔ بائع کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ مشتری کو مبیع کے عیب سے آگاہ کر دے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ ۵:۲) نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ فان صدقا و بینا بورک لھما فی بیعھما وان کتما و کذبا محقت برکۃ بیعھما (بخاری کتاب البیوع ۳۴:۱۹) اگر دونوں سچ بولیں اور عیب وغیرہ ظاہر کر دیں تو انھیں ان کی بیع میں برکت دی جائے گی اور اگر وہ جھوٹ بولیں گے یا عیب پوشی کریں

گے تو بیع کی برکت مٹا دی جائے گی۔
فقہا کہتے ہیں۔ والبیع المبرور هو البیع الذی یبرّ فیه صاحبه فلم یغش ولم یعص الله فیه (کتاب الفقہ علی الاربع الجز الثانی ص ۲۰۲) بیع مبرور وہ بیع ہے جس میں فریقین ایک دوسرے سے اچھائی اور بھلائی کا معاملہ کریں یعنی نہ اس میں دھوکا ہو نہ خیانت اور نہ خدا کی نافرمانی لازم آتی ہو۔
رسول کریم ﷺ کے متعلق روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عدا ابن خالد کو یہ تحریر دی تھی جس کے ذریعہ محمد اللہ کے رسول نے عدا ابن خالد سے خریداری کی ہے۔ یہ ایک مسلمان کی خرید و فروخت دوسرے مسلمان سے ہے اس میں نہ کوئی دھوکا ہے اور نہ ہی کوئی قباحت (بخاری کتاب البیوع)

۳۔ اہل معاملہ کی سوجھ بوجھ رکھتے ہوں۔ یعنی فریقین میں سے کوئی بھی بچہ مجنون وغیرہ نہ ہو۔
رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ رفع القلم عن ثلثة عن المجنون المغلوب حتی یبرء وعن النائم حتی استیقظ عن الصبی حتی یحتلم (ابوداؤد) تینوں شخصوں پر تکلیف شرعی عائد نہیں ہوتی مجنوں پر حتیٰ کہ وہ ٹھیک ہو جائے سوئے والے پر حتیٰ کہ وہ جاگ اٹھے بچے پر حتیٰ کہ بالغ ہو جائے۔

۴۔ ماپ تول بالکل صحیح ہو۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ (الانعام ۶:۱۵۲) ماپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو۔
وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (المطففین ۱......۳) کمی کرنے والوں کے لیے تباہی ہے جو جب لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں تو پورا کر لیتے ہیں اور جب انھیں ماپ یا تول کر دیتے ہیں تو کم کر دیے جاتے ہیں۔

۵۔ تاجر خریداروں کو ترغیب دلانے کے لیے عموماً قسمیں کھاتے ہیں رسول کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ اَلْحَلِفُ مَنْفِقَةٌ لِلسِّلْعَةِ مُمْحِقَةٌ لِلْبَرَكَةِ (بخاری و مسلم کتاب البیوع ۳۴:۲۶) قسم مال تجارت کے بکنے کا باعث تو ہے لیکن اس کے ساتھ برکت مٹ جاتی ہے۔

۶۔ جن چیزوں کا کھانا پینا حرام ہے ان کی خرید و فروخت بھی حرام ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ (المائدہ ۵:۹۰) شراب، جوا، بت اور قسمت کے تیر سب پلید ہیں اور شیطانی کاموں میں سے ہیں پس ان سے بچو۔
رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ لا یحل ثمن شیء لا یحل اکلهٗ و شربه (اخرجه دارالقطنی عن تمیم الداری) یعنی کسی ایسی چیز کی قیمت لینا جس کا کھانا اور پینا حرام ہے جائز نہیں ہے۔
سوء الکسب اجرة الزمارة و ثمن الکلب یعنی گانے بجانے اور کتے کی قیمت سب سے برا کسب ہے۔
فرمایا حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ وَالْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيْرِ وَالْاَصْنَامِ (بخاری ۳۴:۱۱۲) اللہ تعالیٰ نے شراب مردار خنزیر اور بتوں کی بیع حرام کر دی ہے۔

۷۔ جب لین دین نقد نہ ہو بلکہ ادھار ہو تو اس کو لکھ لینا چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ (البقرہ ۲:۲۸۲) اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب آپس میں مقررہ وقت کے لیے قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لو۔

۸۔ وہ معاملات جن میں متعاقدین کے بیع و شرا ہو جانے کے باوجود جھگڑے کی صورت باقی رہے اور کسی ایک فریق کو نقصان ہونے کا اندیشہ ہو۔

صنعت و حرفت

ذرائع معیشت میں سے صنعت و حرفت کا ایک اہم شعبہ ہے۔ ملک اور تمدن کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے جو وسیلہ تجارت کا ایک اہم حصہ ہے اور تجارت کی ترقی کا دار و مدار اسی کی ترقی پر ہے گویا صنعت و حرفت اور تجارت لازم ملزوم ہیں۔ جب کسی ملک میں صنعت و حرفت ترقی کرے گی۔ وہاں لازمی طور پر تجارت کو فروغ ہوگا۔

اسلام نے صنعت و حرفت کے فروغ کی طرف بہت ترغیب دی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے کہ داؤد علیہ السلام زرہیں بناتے تھے۔ ارشاد الٰہی ہے۔
وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ (الانبیاء ۲۱:۸۰) اور ہم نے اسے تمہارے لیے زرہ بنانی سکھائی تاکہ تمہاری لڑائی میں تمہاری حفاظت کرے۔
وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِى السَّرْدِ (السباء ۳۴:۱۰، ۱۱) اور ہم نے اس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا کہ فراخ زرہیں بنا اور ان کے بنانے میں نگاہ رکھ۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔

کان داؤد زرّاً او کان ادم حراثا و کان نوح نجارًا و کان ادریس خیاطا و موسٰی راعیاً (فتح الباری جلد۴ کتاب البیوع) یعنی داؤد علیہ السلام زرہ بناتے تھے اور آدم علیہ السلام کاشتکاری کرتے تھے اور نوح علیہ السلام بڑھئی کا کام کرتے تھے اور حضرت ادریس علیہ السلام درزی کا پیشہ کرتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بکریاں چرانے کا کام کرتے تھے۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ ان نبی اللہ داؤد علیہ السلام کان یاکل من عمل یدہٖ (بخاری کتاب البیوع وبیہقی فی شعب الایمان) اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا کرتے تھے۔

ابن عمرؓ رفعہ ان اللّٰہ یحب المومن المحترف (کبیر اوسط) ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ بے شک اللہ ہنر مند مومن کو دوست رکھتا ہے۔

ان اللّٰہ یحب ان یری العبد محترفا (طبرانی بحوالہ کنوز الحقائق) اللہ اپنے بندہ کو کوئی پیشہ کرتے ہوئے دیکھنا پسند کرتا ہے۔

نعم العون المغزل للمراۃ علی الجلوس فی بیتھا (کنوز الحقائق کتاب فردوس) عورت کو گھر بیٹھنے کے عوض چرخہ کا تنا اچھی کمائی کا ذریعہ ہے۔

صحابہ کرام نے اسلام لانے کے بعد صنعت وحرفت کی طرف توجہ کی...... ابوبکر کا مدینہ منورہ کے مقام سلح میں کپڑے کا کارخانہ تھا۔ اس طرح انصار نے یہود سے صنعت کا کام سیکھا اور کپڑا بافی، رنگ سازی تلواریں بنانا اور آلات حرب کی صنعت کو فروغ دیا۔ (الاسلام والحضارۃ العربیہ جلد۲)

اسلام نے عوام کی بھلائی کے لیے درآمد اور برآمد پر پابندیاں عائد کیں تاکہ عوام تک سستی چیزیں پہنچیں۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں شام اور عراق کے گورنروں نے اطلاع دی کہ یہود اور نصاریٰ کے ممالک میں مسلمان تاجر مال لے کر جاتے ہیں تو وہ ٹیکس عائد کرتے ہیں تو حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ اگر غیر ممالک کا مال تجارت ہمارے علاقوں میں آئے تو اسی حساب سے ان سے بھی محصول لیا جائے۔

کان یاخذ من المسلمین الزکوۃ ومن اھل الحرب العشر تاما لانھم کانوا یاخذون من تجار المسلمین مثلہ اذا قدموا بلادھم (کتاب الاموال لابی عبیدہ ص ۵۳۱) مسلمانوں سے زکوٰۃ لیتے تھے۔ اہل حرب حکومتوں سے عشر لیا کرتے تھے کیونکہ جب مسلمان تاجر ان کے ملکوں میں جاتے تھے تو اسی طرح کا محصول وہ ان سے وصول کرتی تھیں۔

اس کے باوجود حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ تھا کہ غیر مسلم تاجروں سے سامان تجارت ہر سال میں صرف ایک دفعہ ٹیکس وصول کیا جائے خواہ وہ سال میں کئی دفعہ سامان تجارت لے کر اسلامی علاقہ میں آئیں۔

یہ فیصلہ محض عوام کی بھلائی اور بہتری کے لیے تھا دور حاضر میں عوام کی بھلائی کو نظر انداز کر کے درآمدات پر اتنا بھاری ٹیکس عائد کر دیا جاتا ہے جس سے اشیاء مہنگی ہو جاتی ہیں اور عوام کو مہنگے داموں خریدنا پڑتی ہیں۔

فقہاء عظام نے صنعت وحرفت کو اس کی اہمیت کے پیش نظر مسلمانوں پر فرض کفایہ کہا ہے۔

من فروض الکفایۃ الحرف والصنایع ومایتم بہ المعاش (المنہاج ج ۷ ص ۱۹۴) صنعت وحرفت کے ذریعہ روزی کی تکمیل انسان پر فرض کفایہ ہے۔

زراعت

زراعت مدنی زندگی کا ایک اہم جز ہے اس کے بغیر زندگی کی تمام رعنائیاں اور خوشیاں مفقود ہو جاتی ہیں کیونکہ تجارت اور صنعت وحرفت کا دار ومدار بھی زراعت پر ہے۔ قرآن مجید میں ذرائع معیشت میں زراعت کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَفَرَاَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ (الواقعہ ۵۶: ۶۳، ۶۴) کیا تم نے دیکھا جو تم بوتے ہو کیا تم اسے اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ (الاعراف ۷: ۱۰) اور یقیناً ہم نے زمین میں تمہارا ٹھکانا بنایا اور تمہارے لیے اس کے اندر روزی کے سامان رکھے۔ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ (طٰہٰ ۲۰: ۵۳، ۵۴) وہ جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا اور تمہارے لیے اس میں راستے چلائے اور بادل سے پانی اتارا۔ پھر ہم نے اس کے ساتھ مختلف اقسام کے نباتات پیدا کیے تم خود بھی کھاؤ اور اپنے چوپایوں کو بھی چراؤ۔

فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖۤ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا حَبًّا وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا وَّ زَیْتُوْنًا وَّنَخْلًا وَّ حَدَآىِٕقَ غُلْبًا وَّفَاكِهَةً وَّ اَبًّا مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (عبس ۸۰: ۲۴، ۳۱) پس انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے کی طرف دیکھے۔ پہلے ہم خوب پانی برساتے ہیں۔ پھر ہم زمین شق کرتے ہوئے پھاڑتے ہیں۔ پھر ہم اس میں غلہ اگاتے ہیں اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجور اور گھنے باغ اور پھل اور چارہ تمہارے لیے اور تمہارے

چار پاؤں کے لیے سامان۔
رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ اُطْلُبُوْا الرزق فی خبایا الارض (مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ج ۴) رزق کو زمین کی پہنائیوں میں تلاش کرو۔
امام سرخسی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس ارشاد سے مراد زراعت کا عمل ہے۔
امام سرخسی نقل فرماتے ہیں وازدرع رسول اللہ ﷺ بالجرف کہ رسول کریم ﷺ نے جرف میں خود کاشت کی ہے۔
عن انس رضی اللہ تعالیٰ قال رسول اللہ ﷺ مامن مسلم یغرس غرسًا او یزرع زرعًا فیاکل منه طیرٌ او انسان او بهیمة الا کان له به صدقة. (بخاری کتاب ماجاء فی الحرث، مسلم)
شیخ بدرالدین عینی کی تصریح کے مطابق زراعت ایسا عمل ہے کاشت کرنے والے کی نیت کے بغیر بھی اس کو ثواب ملتا ہے کیونکہ اس سے مخلوق خدا کو فائدہ پہنچتا ہے۔ (عینی شرح بخاری جلد ۵ نمبر ۷۶)
رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔
عَمِّرُوْا بلادی فعاش فیها عبادی. (مبسوط ج ۲۳ کتاب المزارعۃ) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میری بستیوں کو آباد کرو تاکہ اس میں میرے بندے زندگی بسر کریں۔ اس لیے امام سرخسیؒ فرماتے ہیں کہ بعض علماء حنفیہ نے زراعت کو صنعت اور تجارت سے افضل قرار دیا ہے کیونکہ زراعت میں نفع عام ہے۔
حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی زراعت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
فانهم ان کان اکثرهم مکتسبین بالصناعات وسیاسة البلدة والقلیل مکتسبین بالرعی والزراعة فسدمالهم فی الدنیا الخ اگر ملک کے باشندوں کی اکثریت صنعت وحرفت اور ملکی سیاست میں مصروف رہے اور زراعت اور مویشیوں کی حفاظت اور پرورش کی طرف بہت تھوڑے لوگ مشغول ہوں تو ان کی دنیوی حالت خراب ہو جائے گی۔
علامہ عبدالرحمٰن جزائری فرماتے ہیں۔ اما الزرع فی ذاته سواءٌ کان مشارکة اولا فهو فرض کفایة لاحتیاج الانسان والحیوان اِلَیْهِ. لیکن زراعت خواہ شرکت سے کی جائے یا بغیر شرکت کے وہ ہر انسان پر فرض کفایہ ہے اس لیے کہ انسان اور حیوان سب ہی اس کے محتاج ہیں۔

احیائے موات

احیائے موات (افتادہ زمینوں کو آباد کرنا)
مجلۃ الاحکام العدلیہ میں احیائے موات کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔
"ایسی زمینیں جو نہ کسی کی مِلک میں ہوں اور نہ کسی شہر یا گاؤں کے باشندے انھیں چراگاہ کے طور پر یا ایندھن حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہوں اور جو آبادی کی آخری حد سے کم از کم اتنے فاصلے پر واقع ہوں کہ ایک بلند آواز آدمی اگر وہاں کھڑا ہو کر پوری قوت سے چلائے تو بھی وہاں نہ سنائی دے"۔[1]
فقہاء کے نزدیک وہ زمینیں بھی موات نہیں ہیں جن میں ایسی چیزیں پائی جاتی ہوں۔ جن کی عوام کو ضرورت ہوتی ہے مثلاً نمک تیل تارکول وغیرہ۔
افتادہ زمینوں کو جو شخص ریاست کی منظوری کے ساتھ تین سال کے اندر اندر کارآمد بنالیتا ہے۔ وہ اس کی متصور ہوگی۔ تین سال کی مدت اس بات کو معلوم کرنے کے لیے ہے کہ آیا قبضہ کرنے والا اس زمین کے آباد کرنے پر قادر ہے یا کہ نہیں اتنے عرصہ میں زمین حاصل کرنے والا اس کو آباد نہیں کر سکتا تو وہ افتادہ زمین دوبارہ ریاست کی طرف لوٹ آئے گی۔
ریاست کی اجازت حاصل کرنا اس وجہ سے ضروری ہے تاکہ متعدد افراد ایک ہی قطعہ زمین پر قبضہ کی خواہش سے آپس میں نہ جھگڑ پڑیں اور سوسائٹی میں بدامنی پیدا نہ ہو۔
افتادہ زمینوں کی آبادکاری بھی زراعت کا اہم جز ہے چونکہ افتادہ زمین حکومت کی طرف سے بعض شرائط کے ساتھ محض آبادکاری کے لیے ملتی ہے۔ اس وجہ سے زراعت سے الگ اس کو ایک وسیلہ معیشت قرار دیا گیا ہے۔

---

[1] مجلۃ الاحکام العدلیہ دفعہ ۱۲۷۰ بحوالہ اسلام کا نظریہ ملکیت حصہ اول از ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی ص ۱۴۳،۱۴۲۔

اقطاع (عطیات)

ایسی لاوارث زمینیں جو بیت المال کی مِلک ہوں اور امام نے کسی کو ملکی خدمت یا کسی نمایاں کارنامہ کے صلہ میں دے دی ہو۔ رسول کریم ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو زمینیں عطا فرمائی تھیں۔ آپ ﷺ کے بعد خلفاء بھی بطور عطیہ زمینیں دیتے رہے ہیں۔

افتادہ زمینیں اور عطیات دینے کے احکام کا تفصیلاً ذکر بعد میں آئے گا۔ یہاں صرف انفرادی ملکیت کے وسائل پر بحث ہو رہی ہے۔

شکار

قدیم زمانہ سے شکار خواہ بری ہو یا بحری بنی نوع انسان کے لیے ذریعہ معاش چلا آ رہا ہے۔ اب یہ ہر ملک میں دولت حاصل کرنے کا ذریعہ بنا ہوا ہے اس لیے جنگل یا دریا، سمندر سے حاصل کردہ چیزیں ابتدائی قبضہ کے ذریعے انفرادی ملکیت میں لائی جا سکتی ہیں۔ علماء کے نزدیک مباح عام میں شامل ہیں۔ ہر مباح عام چیز کی طرح قبضہ کے ذریعے ذاتی ملکیت بنائی جا سکتی ہے۔ یہ ذریعہ بھی تجارت کا ایک حصہ ہے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے۔ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّا اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ. (المائدہ ۵:۴) اور وہ جو تم شکاری جانوروں کو شکار کی تعلیم دیتے ہوئے سکھاؤ تم ان کو سکھاتے ہو اس علم سے جو اللہ نے تمھیں سکھایا سو جس کو وہ تمھارے لیے پکڑ رکھیں اس سے کھالو۔

اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ (المائدہ ۵:۹۶) اور تمھارے لیے دریا کا شکار اور اس کا کھانا حلال کیا گیا ہے تمھارے لیے اور مسافروں کے لیے سامان ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (الجاثیہ ۴۵:۱۲) اللہ وہ ہے جس نے سمندر تمھارے کام میں لگایا ہے تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کا فضل (ذریعہ معاش) تلاش کرو۔

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ (الرحمٰن ۵۵:۲۲) ان دونوں سمندروں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (النحل ۱۶:۱۴) وہی ہے جس نے سمندر کو کام میں لگا رکھا ہے تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے موتیوں کے زیور نکالو جنھیں تم پہنتے ہو اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے اسے پھاڑتی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اس کا فضل طلب کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔

وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا

(المائدہ ۵:۲) اور جس وقت تم احرام سے باہر آ جاؤ تو شکار کرو۔

مال غنیمت

جہاد میں جو مال غنیمت حاصل ہوتا ہے اس سے بھی ملکیت وجود میں آتی ہے۔ اس مال کا ۴/۵ حصہ مجاہدین کا حق ہے اور ۱/۵ حصہ اللہ اور اس کے رسول کا۔

ارشاد الٰہی ہے۔ وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ (الانفال ۸:۴۱) اور جان لو کہ جو چیز تم فتح پا کر حاصل کرو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور قریبیوں کے لیے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے۔

اللہ کے لیے ہونے سے مراد یہ ہے وہ بیت المال میں داخل ہو۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ من قتل قتيلا له عليه بينة فسلبه له (بخاری ومسلم) جو کسی مشرک کو قتل کرے تو اس کی سلب اسی مجاہد کی ملکیت قرار پائے گی۔ بشرطیکہ وہ گواہی پیش کرے۔

ورثہ

مال اور جائیداد کے حصول کا ایک ذریعہ ورثہ ہے۔ متوفی جو ترکہ اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے وہ ورثہ ورثا میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اسلام نے ہر وارث کے لیے حصہ مقرر کر دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَالَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ

عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدًا (النساء ۴:۳۳) جو کچھ ترکہ ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جائیں تو ان میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے حق دار ٹھہرا دیے ہیں اور جن عورتوں سے تمہارا نکاح ہو چکا ہے پس چاہیے کہ جو کچھ جس کا حصہ ہے اس کو دے دیا جائے اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھنے والا ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَکَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَکَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ کَثُرَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا. (النساء ۴:۷) مردوں کے لیے اس سے ایک حصہ ہے جو ان کے والدین اور قریبی رشتے دار چھوڑیں اور عورتوں کے لیے ایک حصہ ہے جو ان کے والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑیں خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت ایک مقررہ ہے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فھو لاولی رجل ذکر (بخاری کتاب الفرائض باب میراث ابن لابن) مقررہ حصص ان کو دو جو ان کے حق دار ہیں اور جو باقی بچے وہ قریب کے مرد کو ملنا چاہیے۔

عَنْ ابن عباس رضی اللہ عنھما عن النبی ﷺ قال اقسموا المال بین اھل الفرائض علی کتاب اللہ (مسلم و ابوداؤد) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن) کے مطابق اپنا مال ان لوگوں میں تقسیم کرو جن کا حق مقرر کر دیا گیا ہے۔

ہبہ

ہبہ کے ایک خاص معنی ہیں تملیک بلاعوض یا بغیر کسی قسم کے معاوضہ کے کسی کو کسی چیز کا مالک بنانا۔ وسیع معنی کے لحاظ سے قرض معاف کر دینے یا صدقہ کو کہا جاتا۔

دولت کے حصول کا ایک ذریعہ ہبہ ہے جائیداد کے مالک کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی جائیداد کو کسی دوسرے کے حق میں ہبہ کر دے۔ ہبہ ایک بیٹے کے حق میں کرنے کی اجازت ہے لیکن رسول کریم ﷺ نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ ایسے ہبہ دوسرے بیٹوں کے حق میں ہونے چاہئیں۔

عن النعمان بن بشیر بقول اعطانی ابی عطیة فقالت عمرةُ بنت رواحة لاارضی حتی تُشهد رسولَ اللہ ﷺ فاتی رسولَ اللہ ﷺ فقال انی اعطیت ابنی من عمرة بنت رواحة عطیة فامرتنی ان اُشهدک یارسول اللہ قال اَعْطَیْتَ سائرَ ولدک مثل ھذا قال لاقال فاتقوا اللہ واعدلوا بین اولادِکم فرجع فرد عطیتهٔ. (بخاری کتاب الھبہ ۱۳:۵۱) نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ میرے باپ نے مجھے بطور ہبہ کچھ دیا تو عمرہ بنت رواحہ (نعمان کی ماں) نے کہا کہ میں پسند نہیں کرتی یہاں تک کہ رسول کریم ﷺ کو گواہ بناؤ وہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں نے اپنے بیٹے کو جو عمرہ بنت رواحہ سے ہے کچھ دیا ہے تو یارسول اللہ عمرہ نے مجھے کہا ہے کہ میں آپ کو گواہ بنا لوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اپنے باقی بیٹوں کو بھی تو نے اسی طرح دیا ہے عرض کیا نہیں فرمایا اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد میں انصاف کرو۔ سو وہ لوٹے اور اپنا عطیہ واپس کر لے۔

قالت اَسماء للقاسم ابن محمد و ابن ابی عتیق ورثت عن اختی عائشة بالغابة وقد اعطانی به معاویة مائة الف فھو لکما (بخاری ۲۲:۵۱) حضرت اسماء نے قاسم اور ابن ابی عتیق سے کہا کہ مجھے اپنی بہن حضرت عائشہ کا غابہ سے کچھ ترکہ ملا ہے اور حضرت معاویہ اس کے بدلے مجھے ایک لاکھ درہم دیتے تھے وہ تم دونوں کا ہوا۔

قاسم اسماء کا بھتیجا تھا اور ابن ابی عتیق بھتیجے کا بیٹا ہبہ مشترکہ طور پر کیا۔ اس لیے ایک جائیداد کا کئی آدمیوں کے نام ہبہ کرنا جائز ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہبہ انسان جس قدر چاہے کر سکتا ہے۔

خاوند اپنی بیوی کے حق میں ہبہ کر سکتا ہے اور بیوی اپنے خاوند کے حق میں ہبہ کر سکتی ہے۔ شوہر کے علاوہ بیوی دوسرے لوگوں کے نام بھی ہبہ کر سکتی ہے۔ (بخاری کتاب الھبہ باب ھبہ الرجل لامراته و باب ھبہ المراة نغیره)

جب ہبہ لینے والے نے اس کو قبول کر لیا ہو تو دینے والا اس کو واپس لینے کا مجاز نہیں۔

وصیت

صاحب جائیداد اپنی وفات کے بعد دوسروں کو جائز ورثاء کے علاوہ اپنے مال میں سے دینے کا مجاز ہے۔ اس طرح جس کے حق میں وصیت کی گئی ہے وہ اس جائیداد کے مقررہ حصہ کا مالک بن جاتا ہے۔ قرآن مجید نے امراء کے لیے وصیت کرنا فرض قرار دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ

اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَکَ خَیْرًا نِ الْوَصِیَّةُ لِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ (البقرہ ۲:۱۸۰) جب تم میں سے کسی پر موت آ موجود ہو عمدگی کے ساتھ وصیت کرنا ضروری ٹھہرایا گیا ہے۔ اگر وہ بہت سا مال ماں باپ کے لیے اور قریبیوں کے لیے چھوڑے یہ متقیوں پر لازم ہے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ ماحق امریءِ مسلم له شي یوصی فیه یبیت لیلتین الا وصیته مکتوبة عنده. (بخاری کتاب الوصایا) ایسے مسلمان شخص کو مناسب نہیں جس کا کوئی مال ہو جس میں اس پر وصیت کرنا ضروری ہو کہ وہ دو راتیں گزارے مگر اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہونی چاہیے۔

اسلام نے وصیت کے لیے چند اصول مقرر کیے جو ان اصولوں کے خلاف ہوگی وہ ناقابل عمل قرار پائے گی۔

پہلا اصول: ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت نہیں کی جا سکتی۔

دوسرا اصول: وارث کے حق میں کوئی وصیت نہیں کی جا سکتی۔

تیسرا اصول: متوفی نے ورثاء کے لیے کافی دولت چھوڑی ہو۔

عن عامر بن سعد بن ابی وقاصؓ عن ابیه قال مرضت عام الفتح مرض اشفیت منه علی الموت فاتانی رسول اللہ ﷺ یعودنی فقلت یارسول اللہ ان لی مالاً کثیراً ولیس یرثنی الا ابنتی فاوصی بما لی کلهٗ قال لا قلت فثلثی مالی قال لاقلت فالشطر قال لا قلت فالثلث قال الثلث والثلث کثیرا انک ان تذر ورثتک اغنیاء خیر من ان تذرهم عالة یتکففون الناس. (ترمذی ابواب الفرائض) عامر بن سعد بن ابی وقاص سے اس نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا میں فتح مکہ کے سال ایسا بیمار ہوا کہ مجھے اپنے مرنے کا خوف پیدا ہوگیا۔ سو میرے پاس رسول کریم ﷺ عیادت کے لیے آئے۔ بس میں نے کہا یارسول اللہ ﷺ میرے پاس بہت مال ہے اور سوائے ایک بیٹی کے اور کوئی وارث نہیں کیا میں اپنے تمام مال کی وصیت کر دوں آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ میں نے کہا دو تہائی کی وصیت کر دوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں میں نے کہا نصف مال کی فرمایا نہیں۔ میں نے کہا تہائی مال کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا تہائی کی اور تہائی ہی بہت ہے۔ اگر تو اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑے تو بہتر ہے اس سے ان کو محتاج چھوڑے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہتھیلی پھیلائیں۔

بیت المال سے مالی امداد

مملکت میں کئی ایسے افراد ہوتے ہیں جن کی بقائے حیات اور ضروریات کی تکمیل کے لیے بیت المال سے امداد ضروری ہے۔ یہ امداد انفرادی ملکیت کا ایک وسیلہ ہے۔ قرآن مجید میں ایسے لوگوں کی امداد کا ذکر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِیْلِ (توبہ:۶۰) زکوٰۃ صرف ناداروں کے لیے ہے اور مسکینوں اور اس کے کارکنوں کے لیے اور جن کے دل مائل کرنا ہے اور غلاموں کے آزاد کرنے اور قرض داروں کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے۔

رکاز (دفینہ): دفینہ سے جو کچھ ملتا ہے اس کا ۴/۵ حصہ نکالنے والے کی مِلک قرار پاتا ہے اور ۱/۵ حصہ بیت المال کا۔

رکاز کیا ہے؟ اور اس کے دوسرے شرعی احکام کے متعلق بحث بعد میں آئے گی۔

انفرادی حصول حقوق ملکیت کے شرعی حدود و قیود

پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ اسلام نے جو ملکیت کا تصور دیا ہے اس کی رو سے کائنات کی ہر چیز اصلاً اللہ کی ملکیت ہے۔ رفع نزاع اور حصول انتفاع کے لیے اللہ تعالیٰ نے ملکیت کے حقوق انسان کو منتقل کیے ہیں۔ وہ اشیاء کا مالک تو بن جاتا ہے لیکن وہ حقوق اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے مصالح کے پابند ہوتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْهِ. (الحدید ۵۷:۷) اور اس سے خرچ کرو جس میں اس نے تمھیں اپنا نائب بنایا ہے۔ وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اٰتٰکُمْ (النور ۲۴:۳۳) اور ان کو اللہ کے مال سے دو جو اس نے تمھیں دیا ہے۔ یہ دونوں آیات ظاہر کرتی ہیں کہ کائنات کی ہر چیز کا مالک دراصل اللہ تعالیٰ ہے اور اس نے نیابةً اس میں تصرف کا حق دیا ہے۔

جب حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہوا اور انسان اس کا نائب تو حدود و قیود مقرر کرنے کا حق بھی اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے۔ قرآن مجید میں عرب کی ایک قدیم قوم مدین کی اس بات پر مذمت کی گئی ہے کہ وہ اپنی دولت کے معاملہ میں اپنے آپ کو مختار کل سمجھتی تھی اور اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ پابندیوں کو ناجائز قرار دیتی

تھی۔ ارشاد الٰہی ہے۔ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَايَعْبُدُ اٰبَآءُ نَا اَوْاَنْ نَّفْعَلَ فِي اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (ھود ۱۱:۸۷) انھوں نے کہا اے شعیب کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم اسے چھوڑ دیں جس کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے یا اپنے مالوں میں جس طرح چاہیں نہ کریں۔

حرام اور حلال کے پیمانے انسان مقرر نہیں کرسکتا بلکہ اللہ تعالیٰ ہی حقیقی مالک ہونے کی حیثیت سے اختیار رکھتا ہے۔قرآن مجید نے اس بات کو کذب قرار دیا ہے کہ انسان خود ہی کسی چیز کو حلال اور کسی کو حرام قرار دے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ. (النحل ۱۶:۱۱۶) اور اسے جو تمہاری زبانیں جھوٹ بیان کردیتی ہیں نہ کہا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام۔

شرعی پابندیاں: اسلام نے دولت کمانے کے وہ تمام طریقے ناجائز اور حرام قرار دے دیے ہیں جن سے دوسرے افراد یا سماج کو نقصان پہنچتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (النساء ۲:۲۹) اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے مالوں کو آپس میں ناحق کے ساتھ مت کھاؤ۔

حصول دولت کے ناجائز ذرائع

ربا (سود)

ربا کے لغوی اور اصطلاحی معنی: ربا الشئ کے معنی ہیں ایک چیز بڑھ گئی اور اس نے ترقی کی۔ قرآن مجید میں سبزی کے بڑھنے پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ (الحج ۲۲:۵) اور تو زمین کو بے حس (عدم نمو والی) دیکھتا ہے۔ پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ لہلاتی اور ابھرتی ہے۔

ایسا ہی مال کے بڑھنے پر استعمال ہوا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ رِبًا لِيَرْبُوَا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوا عِنْدَ اللَّهِ (الروم ۳۰:۳۹) اور جو تم سود پر دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں جا کر بڑھتا ہے اور وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا۔

ربٰو راس المال پر بڑھوتی کا نام ہے لیکن شریعت میں ایسی بڑھوتی کو ربا کہتے ہیں جو بغیر کسی مالی معاوضہ کے حاصل کی جائے۔

الربا فی اللغة الزیادة و المراد فی الایة کل زیادة لا یقابلها عوض (احکام القرآن ج ۳ ص ۱۰۳) ربو ہر ایسی زیادتی کا نام ہے جس کے مقابلے میں مال کا عوض نہ ہو اس تعریف میں وہ تمام صورتیں داخل ہیں جن میں کوئی زیادتی بلا معاوضہ کی جائے۔

امام رازی فرماتے ہیں۔ ''لفظ ربٰو کے معنی زیادتی کے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر قسم کی زیادتی حرام ہے بلکہ ربا کی جو حرمت ہے وہ ایک خاص قسم کا معاہدہ ہے جو عربوں میں ''ربٰو'' کے نام سے مشہور تھا۔ (التفسیر الکبیر ج ۷ ص ۹۱)

امام جصاص ارشاد فرماتے ہیں۔ هو القرض المشروط فیه الاجل و زیاده مال علی المستقرض کہ ربا وہ قرض ہے جو کسی وقت تک کے لیے اس شرط پر دیا جائے کہ قرض دار اس کو راس المال پر (مقررہ) زائد رقم ادا کرے گا۔

لسان العرب میں ہے۔ الربا ربوان والحرام کل قرض یوخذ به اکثر منه او یجر به منفعته ربا کی دو اقسام ہیں اور ہر قرض حرام ہے کہ جس کے ساتھ اس سے زیادہ لیا جائے۔ یا اس کے ساتھ منافع کھینچا جائے۔

ربا کی تعریف ایک حدیث میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ منفعة فَهُوَ ربوا یعنی جو قرض کچھ نفع کمائے وہ ربٰو ہے۔

جاہلیت کا سود

رسول کریم ﷺ کی بعثت سے قبل سود لینے کے مختلف طریقے رائج تھے امراء ضرورت مندوں کو نقد قرض دیتے اور مدت مقرر کر کے راس المال پر سود لگا دیتے تھے۔

ربا الجاهلیة الذی نهی عنه ذالک انهم کانوا یسلفون بالزیادة فینظرون فکانوا یقولون انظر فی ازدک وهذا هو الذی عناه بقوله فی حجة الوداع ان ربا الجاهلیة موضوعٌ (بدایۃ المجتہدین ابن رشد مالکی) ربا الجاہلیۃ جس سے قرآن میں منع کیا گیا ہے یہ ہے کہ لوگ قرض پر کچھ بڑھوتی کی شرط عائد کر کے قرض دیا کرتے تھے پھر میعاد متعینہ پر مزید مہلت دے کر مزید سود لگا دیتے تھے یہی وہ ربا ہے جس کو رسول کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں باطل قرار دیا تھا۔

قتادہ کہتے ہیں کہ جاہلیت کا ربٰو یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے سے ایک وقت مقرر کے لیے خرید و فروخت کا معاملہ کرتا ہے جب وہ وقت آ جاتا اور رقم ادا نہ ہوتی تو رقم بڑھا دی جاتی اور مہلت دے دی جاتی۔

مجاہد کہتے ہیں کہ جاہلیت کا ربٰو یہ ہے کہ ایک شخص کا دوسرے پر قرض ہوتا تو وہ کہتا کہ تم اس قدر راس المال میں بڑھا لو اور ادائیگی میں مہلت دے

دو ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ جاہلیت کے دور میں لوگ ایک دوسرے سے قرض لیتے اور باہم یہ طے کرتے کہ اتنی مدت میں اتنی رقم اصل مال سے زیادہ ادا کی جائے گی۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ اہل جاہلیت کا یہ طریقہ تھا کہ وہ ایک مقررہ مدت کے لیے روپیہ دیتے اور اس سے ماہ بماہ ایک مقررہ رقم بطور سود کے وصول کرتے اگر وہ مدت ختم ہو جاتی تو ادائیگی کا مطالبہ کرتے اگر ادائیگی نہ ہو سکتی تو مزید مہلت دی جاتی اور سود میں بھی اضافہ کر دیا جاتا۔

ایک صورت یہ بھی تھی کہ کوئی چیز رہن رکھ کر اس کے عوض قرض دیتے اور اگر مقررہ مدت میں قرض دار قرض ادا نہ کر سکتا تو روپیہ پر سود لگا دیتے اور چیز کی قیمت کم سے کم لگا کر اس کو خرید کر لیتے۔

مذکورہ حوالہ جات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عرب میں ربا ایک مخصوص مالی معاملہ نزول قرآن سے قبل متعارف تھا۔ وہ یہ کہ قرض دے کر اس پر کوئی نفع لیا جائے عرب اسی کو ربا کہتے تھے اور اسی کو قرآن مجید نے حرام قرار دیا اور رسول کریم ﷺ نے اسی کو باطل قرار دیا تھا۔

تفسیر قرطبی میں ہے۔ **وذالک ان العرب لا تعرف ربا الا ذالک. فحرم سبحانه ذالک وردّ علیهم بقوله و احلّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وحرم الربٰو وهذا الربا هو الذی نسخه** رسول اللہ ﷺ **بقوله یوم عرفة الا ان کل ربا موضوع.** عرب اس (طریقہ مالی) کو ربا کے نام سے جانتے تھے پس اللہ سبحان تعالیٰ نے اس کو حرام قرار دیا اور ان کے قول کو رد کیا ہے۔ فرمایا "اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰو" (اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے ربو کو حرام) یہی وہ ربا کی ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے عرفات کے دن منسوخ فرمایا اور فرمایا خبردار ہر قسم کا ربو باطل ہے۔

ربوا کی اقسام: ربا النسیئة. اس کے اور بھی نام ہیں ربا القرآن (جس کی حرمت قرآن مجید میں آئی ہے) ربا الدیون (جو مالی معاملہ قرض کے متعلق ہو) ربا الجاهلیة (جس کا رواج زمانہ جاہلیت میں تھا)

علامہ جصاص نے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ "قرض وہ معاملہ ہے۔ جس میں ایک مخصوص مدت ادائی قرض دار پر مال کی کوئی زیادتی معین کر لی گئی ہو۔ (بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۱۰ص۱۷۰)

مذکورہ تعریف کی رو سے قرض پر یہ وہ معین ادائیگی ہے جو قرض دار معین مدت کی شرط پر ادا کرتا ہے۔

ربا الفضل: ربا الفضل کو ربا السنة بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کی حرمت احادیث میں بیان ہوئی ہے۔ ربا الفضل اس بڑھوتی کو کہتے ہیں جو "ایک ہی جنس کی دو چیزوں کے بغیر کسی مہلت یا تاخیر کے، دست بدست تبادلے کی صورت میں کی جائے" اسے ربا البیوع کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ یہ صرف نقود یا اجناس کی دست بدست بیع سے متعلق ہے۔

عن عبادة بن الصامت قال قال رسول اللہ ﷺ الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثلٍ سواءٍ بسواءٍ یداً بیدٍ فاذا اختلف هذه الاصناف فبیعوا کیف شئتم اذا کان یداً بیدٍ (صحیح مسلم کتاب المساقاة) حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا سونے کی بیع سونے کے بدلے اور چاندی کی چاندی کے بدلے اور گیہوں کی گیہوں کے بدلے اور جو کی جو کے بدلے اور کھجوروں کی کھجوروں کے بدلے اور نمک کی نمک کے بدلے یکساں اور برابر اور دست بدست ہونی چاہیے اور جب اجناس مختلف ہوں۔ جس طرح چاہو فروخت کرو بشرطیکہ لین دین دست بدست ہو۔

قرآن مجید میں ربا کی حرمت: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (ال عمران ۳:۱۳۰) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو بڑھا بڑھا کر سود نہ کھاؤ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

عرب میں یہ رواج تھا کہ جب قرضہ کی میعاد ختم ہو جاتی تو قرض دار قرض ادا نہ کر سکتا تو سود کو راس المال میں بڑھا کر پھر از سر نو اس پر سود لگایا جاتا اور یوں قلیل المیعاد میں مدیوں ایک بھاری رقم کے بوجھ تلے دب جاتا۔

اسلام نے اس رواج کو ختم کیا۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ سود در سود نہ کھاؤ اور تھوڑا سا کھا لو۔

حرمت سود کے اعلان کے ساتھ یہ بھی اعلان کر دیا کہ واجب الادا سودی رقم نہ لی جائے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (البقرہ ۲:۲۷۸، ۲۷۹) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی کے لیے خبردار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے

لیے تمہارے اصل مال میں نہ تم نقصان پہنچاؤ اور نہ تمہیں نقصان پہنچایا جائے۔

پھر فرمایا۔ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰو وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ o وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ (البقرہ ۲:۲۷۶) اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکر گزار گنہگار کو پسند نہیں کرتا۔

پھر فرمایا۔ وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰو وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَاَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (النساء ۴:۱۶۱)

پھر فرمایا۔ وَمَا اٰتَيْتُمْ مِنْ رِّبًا لِيَرْبُوْا فِي اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ (الروم ۳۰:۳۹) جو تم سود پر دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں جا کر بڑھتا رہے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا۔

پھر فرمایا۔ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰو لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَالِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰو o وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰو. (البقرہ ۲:۲۷۵) جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ کھڑے نہیں ہوں گے مگر اس طرح جیسے وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا بنا دیا ہو۔ یہ اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ خرید و فروخت بھی سود ہی کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے خرید و فروخت کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا ہے۔

حدیث میں حرمت سود: عن جابر قال لعن رسول اللہ ﷺ لکل الربوا و موکلہ و کاتبہ و شاھدیہ وقال ھم سواءٌ (مسلم) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے پر، کھلانے والے پر، لکھنے والے پر اور گواہی کرنے والوں پر لعنت کی۔

پھر فرمایا خدا کے نزدیک سب برابر ہیں۔

معراج کی رات میں جو مناظر دیکھے ان میں ایک منظر سود خور کے عذاب کا بھی تھا۔ حضرت سمرہ بن جندب سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے رات کو دیکھا کہ دو شخص میرے پاس آئے اور مجھے ارض مقدس کی طرف لے گئے۔ ہم چلتے گئے یہاں تک کہ ہم خون کے ایک دریا پر پہنچے جس میں ایک شخص کھڑا تھا اور کنارے پر دوسرا شخص تھا۔ جس کے پاس بہت سے پتھر تھے جو شخص دریا میں تھا باہر نکلنے کے ارادے سے کنارے کی طرف آیا تو کنارے پر کھڑے شخص نے ایک پتھر اس کے منہ پر مارا اور اس کو واپس لوٹا دیا۔ اس طرح جب بھی وہ شخص نکلنے کے لیے کنارے کی طرف آتا تو کنارے والا شخص اس کے منہ پر پتھر مارتا وہ پھر لوٹ جاتا۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے جس کو میں نے خون کے دریا میں دیکھا ہے جواب ملا یہ سود خور ہے۔ (بخاری)

مسند احمد کی روایت ہے (رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں لیلۃ المعراج کو) ہم ایسے لوگوں کے قریب پہنچے جن کے پیٹ مکانوں کی طرح تھے اور ان کے اندر سانپ تھے جو باہر سے دیکھے جاتے تھے میں نے پوچھا اے جبرئیل وہ کون لوگ ہیں اس نے کہا یہ سود خور ہیں۔

دونوں روایات کے مضمون کے اختلاف میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ پہلی روایت میں ان سود خوروں کا ذکر ہے جنھوں نے سود کا مال جمع کیا ہو۔ لیکن کھایا نہ ہو۔ دوسری روایت میں ایسے سود خوروں کا ذکر ہے۔ جنھوں نے سود کھایا ہو۔ پہلی مثال میں سود لینے کے جرم کی سزا خون کے دریا کی شکل میں ہے گویا سود خور نے لوگوں کے خون پسینہ کا کمایا ہوا مال بلا معاوضہ جمع کیا گویا وہ دوسروں کا خون جمع کرتا ہے اس وجہ سے اس کو خون کے دریا میں دکھایا گیا۔ دوسری مثال میں سود خور لوگوں کا مال کھاتا ہے اس کی سزا پیٹ کے اندر سانپوں کے جمع ہونے اور ڈسنے کی شکل میں ہے چونکہ سود خور بلا معاوضہ دوسروں کا مال لے کر ان کو ایسی تکلیف دیتا ہے جیسے سانپ کے ڈسنے سے پہنچتی ہے اس وجہ سے اس کو سزا اسی مناسبت سے ملی ہے۔

عن ابی ھریرہ عن النبی ﷺ قال اربع حق علی اللہ ان لا یدخلھم الجنۃ ولا یذیقھم نعیمھا مدمن الخمر واکل الربا واکل مال الیتم بغیر حق والعاق لوالدیہ (رواہ الحاکم) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ چار ایسے اشخاص ہیں کہ اللہ نے ان کے متعلق اپنے اوپر لازم کر لیا۔ وہ ان کو جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ اور اس کی نعمتیں انھیں نہیں چکھائے گا۔ ایک عادی شراب نوش، دوم سود خور، سوم یتیم کا ناحق مال کھانے والا، چہارم والدین کا نافرمان۔

عن ابی ھریرہ قال قال رسول اللہ ﷺ اجتنبوا السبع الموبقات قالوا یارسول اللہ وماھن؟ قال الشرک باللہ والسحر وقتل النفس التی حرم اللہ الا بالحق اکل الربا واکل مال الیتیم والتولی یوم الزحف وقذف المحصنات الغافلات (بخاری و مسلم) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ وہ سات گناہ کیا ہیں آپ نے فرمایا اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور جادو کرنا اور ناحق کسی آدمی کو قتل کرنا اور سود کھانا اور یتیم کا مال کھانا (جہاد میں) دشمن سے گھمسان لڑائی کے وقت اسلامی لشکر کو چھوڑ کر بھاگ جانا۔ معصوم اور غافل عورتوں پر تہمت لگانا۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ الربوا سبعون جزاء الیسرھا ان ینکح الرجل امۃ (ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان) حضرت

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سودخوری کے ستر حصے ہیں ان میں سے ادنیٰ اور معمولی ایسا ہے جیسے اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنا۔

وَعَنْ عَمْرِو بن العاص قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول مامن قوم یظھر فیھم الربا الا اخذوا بالسنة ومامن قوم یظھر فیھم الرشا الا اخذوا بالرعب (رواہ احمد) حضرت عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا جس قوم میں سود پھیل جائے وہ یقیناً قحط سالی میں مبتلا ہو جاتی ہے اور جس قوم میں رشوت پھیل جائے وہ مرعوبیت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔

تجارتی سود: پہلے ربا الفضل کا ذکر کیا جا چکا ہے یہ ایک تجارتی سود ہے رسول کریم ﷺ نے تفہیم الٰہی سے عرب میں رائج شدہ سود میں وسعت پیدا کی ہے وہ یہ کہ تجارتی کاروبار کی بعض اقسام کو ربوٰ میں شامل کیا ہے حدیث میں آتا ہے۔ عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ ﷺ الذھب بالذھب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثلٍ یداً بیدٍ فمن زاد او استزاد فقد اربی الاخذ والمعطی فیه سواء (مسلم) حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سونا سونے کے عوض اور چاندی چاندی کے عوض اور گیہوں گیہوں کے عوض اور جو جو کے عوض اور نمک نمک کے عوض دست بدست برابر برابر اور ہاتھ در ہاتھ (نقد) ہونا چاہیے (ناپ اور تول میں مساوی ہوں اور ادھار بھی نہ ہو۔ جس شخص نے زیادہ دیا یا زیادہ طلب کیا تو اس نے سودی کاروبار کیا لینے والا اور دینے والا دونوں برابر ہیں۔

اس حدیث میں مختلف تجارتوں میں سود کی مختلف صورتوں سے بچنے کی تعلیم دی گئی ہے مثلاً کسی شخص کو سونا اس شرط پر دیا جائے کہ جو کچھ مدت کے بعد اس سونے کی زیادہ مقدار ادا کرے گا۔ یا گندم اس شرط پر دی جائے کہ وہ زیادہ گندم واپس کرے گا۔ یہ درحقیقت سودی کاروبار ہے گو اس کو ظاہراً تجارت کی شکل دی گئی ہے۔ ہاں اگر مقروض اپنی مرضی سے قرض خواہ کو زیادہ دے دے تو وہ سود نہیں ہوگا رسول کریم ﷺ نے کسی شخص کو ادا کرنا تھا جب آنحضرت ﷺ نے ادائیگی کی تو قرض خواہ کو زیادہ دیا وہ ایک قسم کا شکر گزاری کا عطیہ ہے جو مقروض بطیب خاطر دیتا ہے۔

ایک اہم نکتہ: دور حاضر میں بعض دانشور سودی قرض کی دو شکلیں قرض صرفی اور قرض پیداواری قرار دے کر قرض پیداواری کو جائز دے رہے ہیں۔ ان کے نزدیک رسول کریم ﷺ کی بعثت سے قبل صرف قرض صرفی رائج تھا۔ قرض پیداواری نہیں چونکہ قرض پیداواری ملک کی معیشت کو بڑھانے کا ایک اہم جزء ہے۔ اس لیے یہ شکل جائز ہے۔ قرآن مجید اور احادیث کے مطالعہ سے ایک عام قاری پر واضح ہو جاتا ہے کہ جس فضا میں سود کو حرام قرار دیا گیا ہے اور جس شدت کے ساتھ حرمت بیان کی گئی ہے۔ اس میں ہر قسم کی حرمت شامل ہے۔ کوئی استثنائی صورت بیان نہیں کی گئی۔ سود، سود ہی ہے خواہ کسی شکل میں ہو۔ سود معاشرہ میں عدم مساوات اور جبر و ظلم پیدا کرتا ہے۔ پیدواری قرض کے سود کا بوجھ عوام پر ہی پڑتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کپڑے کا کارخانہ لگاتا ہے تو کارخانہ لگانے والا بنک کے سود پر قرض لے گا۔ جب کارخانہ تیار ہو جاتا ہے تو کارخانہ چلانے کے لیے خام مال کے لیے سود پر قرض لینا پڑے گا۔ تو کپڑا تیار ہو جاتا ہے تو کارخانہ سے بڑی مقدار میں کپڑا خریدنے والے اپنے کاروبار کے لیے سود پر قرضہ لیں گے۔ اس طرح سود کے قرضے کا جال وسیع ہوتا جائے گا۔ آخرکار ہر پارٹی کے سود کا بوجھ صارف پر پڑے گا۔ اس طرح اشیاء صارفین تک مہنگے داموں پہنچیں گی۔

تجارت کے نفع اور ربو میں فرق: نفع اور ربا (سود) میں نمایاں فرق ہے نفع کا دار و مدار بیع و شرا پر ہوتا ہے اور متعاقدین کے مابین تعاون اور حقیقی رضا کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ربا وہ زیادتی اور بڑھوتری ہے جو بغیر کسی مالی معاوضہ کے حاصل ہوتی ہے اور طرفین کی رضا اور باہمی تعاون مفقود ہوتا ہے۔ قرض دار محض مجبوری کے تحت سرمایہ دار سے مال لیتا ہے اور اپنی ضرورت کو پورا کرتا ہے بیع و شراء کے ذریعہ حاصل کرنے سے محنت کرنی پڑتی ہے اور سود میں محنت نہیں کرنی پڑتی۔

حرمت سود کی وجوہ

اخلاقی گراوٹ: سود اخلاقی گراوٹ کا سبب ہے جبکہ اسلام انسان کو اخلاق کے زیور سے آراستہ کرنا چاہتا ہے تمام فلاسفر اس بات پر متفق ہیں کہ اخلاق حسنہ ہی معاشرتی زندگی کو حسن بخشتے ہیں اور اخلاق سیئہ عمرانی زندگی کا حلیہ بگاڑ دیتے ہیں۔

سود اخلاق سیئہ کا سرچشمہ ہے جس سے حرص، لالچ، دناءت، تنگ قلبی انسان دشمنی کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِىْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ (البقرہ ۲:۲۷۵) جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ کھڑے نہیں ہوں گے مگر اس طرح جیسے وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر بچھاڑ دیا ہے۔

اس آیت کریمہ میں سود خور کی ذہنی حالت بیان کی گئی ہے وہ مال و دولت کی محبت میں دیوانہ ہو جاتا ہے گویا دولت اس کی دیوی ہے اس کے سامنے سرنگوں رہتا ہے اس دیوانگی اور سجدہ ریزی کی وجہ سے شرف انسانیت سے گر جاتا ہے۔ یہ الفاظ مبنی برحقیقت ہیں کہ سود خور مواساۃ انسانی کی اعلیٰ صفت سے عاری ہو جاتا ہے اس کا ایک ہی محور اور مطاف ہوتا ہے وہ دولت ہے۔ اس کے اردگرد گھومتا ہے اس کی پوجا کرتا ہے، سود خور خود غرضی میں یہاں تک ترقی کر جاتا ہے کہ وہ اپنے مقروض کو فاقہ کشی تک پہنچانے سے بھی تامل نہیں کرتا۔

محنت کی بے توقیری: معاشیات کی اصطلاح کے مطابق پیدائش دولت کا سب سے اہم عامل پیدائش دولت محنت ہے۔ اسلام نے اس عامل پیدائش دولت پر بہت زور دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰیؕ وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰیۖ ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰیۙ (النجم ۵۳: ۳۹......۴۱) اور انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہ جو وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ (البلد ۹۰: ۴) یقیناً ہم نے انسان کو مشقت کے لیے پیدا کیا ہے۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ من جد وجد ولکل مجتھدٍ نصیب الصحۃ تمنع الرزق (المدینہ والاسلام فرید وجدی) جو شخص کوشش کرے گا اس کو اس کی محنت کا صلہ مل جائے گا۔ ہر کوشش کرنے والے کو کچھ نہ کچھ ملتا ہی ہے۔

سود خوری جذبہ محنت کو مفلوج کر دیتی ہے اور انسان کو مفت خوری کا عادی بنا دیتی ہے سرمایہ دار گھر بیٹھے سرمایہ سود پر دے کر لاکھوں روپے حاصل کر لیتا ہے۔ حضرت امام رازی لکھتے ہیں۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سود کو صرف اس وجہ سے حرام کیا ہے کہ یہ سود لوگوں کو روزی کمانے کے (جائز اور فطری) ذرائع میں مشغول ہونے سے روک دیتا ہے اس لیے جب (مثلاً) ایک درہم کے مالک کو سودی لین دین کے ذریعہ (بے محنت و مشقت) دو درہم نقد، ادھار حاصل کرنے کی قدرت میسر آ جاتی ہے تو فطری ذرائع معاش سے روزی کمانے کی اس کی نظر میں کوئی وقعت باقی نہیں رہتی پھر وہ روزی کمانے کی مشقت اٹھانے کی تجارت یا محنت طلب و دشوار صنعت و حرفت اختیار کرنے کی دردسری مول لینے اور مشقت اٹھانے کے پاس بھی نہیں پھٹکتا اور اس فرار وگریز کے نتیجہ میں مخلوق کا معاشی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اس لیے وہ معاشی اور تمدنی نظام کا زراعت وتجارت، صنعت و حرفت (جیسے محنت طلب کاموں) اور معاشی تعمیر و ترقی کے (فروغ) سے ہی وابستہ ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۲)

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب محنت کا عنصر انسانی زندگی سے خارج کر دیا جائے تو انسانی زندگی کا بہاؤ ہی رک جائے گا۔ زندگی جامد ہو کر رہ جائے گی۔ زندگی کے ہر شعبہ میں جو ترقی نظر آتی ہے وہ محنت ہی کی بدولت ہے۔

طبقاتی کشمکش: سود کی وجہ سے سرمایہ دار امیر سے امیر تر ہوتا چلا جاتا ہے اور سرمایہ چند ہاتھوں میں اکٹھا ہو جاتا ہے جب سرمایہ ایک دفعہ کسی کے ہاتھ میں آ جاتا ہے تو سرمایہ داری نظام میں کوئی ایسا اصول نہیں ہے جس سے سرمایہ محنت کشوں کی طرف لوٹایا جا سکے۔ اس وجہ سے محنت کش غریب سے غریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مزدور اپنے افلاس سے تنگ آ کر سرمایہ داروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور معاشرتی امن برباد ہو جاتا ہے۔ فاشزم کمیونزم تحریکیں وغیرہ اس سرمایہ داری کا ردعمل تھیں۔ اس کشمکش کو دور کرنے کے لیے اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔

اکتناز: سرمایہ دار شرح سود کو بڑھانے کے لیے سرمایہ کا ایک بڑا حصہ روک لیتا ہے۔ جس وجہ سے ضرورت مند مجبور ہوتا ہے کہ وہ زیادہ شرح سود سے قرض لے کر اپنا کاروبار چلائے۔ بعض اوقات کاروبار میں ایسے مواقع بھی آ جاتے ہیں کہ تاجر اپنے کاروبار کو خسارے سے بچانے کے لیے شرح سود پر قرض لینے پر مجبور ہوتا ہے سرمایہ دار اس قسم کے مواقع کی تاک میں ہوتا ہے۔ جونہی کسی صنعت کار کو اس قسم کی تجارتی نازک حالت میں دیکھتے ہیں وہ سرمایہ کو روک لیتے ہیں۔ صنعت کار مجبوراً زیادہ سے زیادہ شرح سود پر قرض لینے پر مجبور ہو جاتا ہے جب صنعت کار زیادہ شرح پر قرض لے گا تو مجبوراً اشیاء کی قیمتیں زیادہ مقرر کرے گا۔ اس طرح بھاری شرح سود کا اثر غریب عوام پر پڑے گا۔ اس سے ملکی تجارت و صنعت کو نقصان پہنچتا ہے اور عوام کی معاشی حالت بھی خراب ہو جاتی ہے گویا سود اور اکتناز دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اسلام نے جہاں سود لینے سے منع کیا ہے اس کے ساتھ ہی اکتناز کرنے والے کے لیے عذاب عظیم کی خبر دی ہے۔

کاروباری چکر (Trade cycle): سرمایہ دار تاجر کو سرمایہ دیتے وقت یہ اندازہ لگاتا ہے کہ اس کو کاروبار میں کتنا نفع ہوگا۔ اس نسبت سے سرمایہ دار سود کی شرح بڑھانے کی کوشش کرتا ہے بعض اوقات منافع کا اندازہ لگانے میں مبالغہ بھی کر جاتا ہے اور تاجر خسارے سے خائف ہو کر بھاری شرح پر قرض لینے سے رک جاتا ہے اس طرح دائن اور مدیون اس تذبذب سے سرمایہ بیکار پڑا رہتا ہے۔ آخرکار سرمایہ دار مجبوراً شرح کم کر دیتا ہے اور سرمایہ بازار میں آنا شروع ہو جاتا

ہے۔ یہی وہ تجارتی چکر ہے جس سے سرمایہ دار اور تاجر پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں یہ تجارتی چکر دائن، مدیون اور صارف تینوں کے لیے نقصان دہ ہے۔

غلط سرمایہ لگانا: بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک تاجر کسی سرمایہ دار سے بھاری شرح پر قرض لیتا ہے۔ اپنے سرمایہ کو خسارے سے بچانے کے لیے اس کاروبار میں سرمایہ لگاتا ہے جو اخلاق سوز اور شرعی اعتبار سے ناجائز ہوتا ہے۔ اس کو یہ امید ہوتی ہے کہ اس کاروبار میں اس کو زیادہ نفع ہوگا۔ سود کی اس بھاری شرح کی وجہ سے تاجر نے ملکی مفاد کو پس پشت ڈال کر محض خود غرضی کی بناء پر غلط کاروبار میں سرمایہ لگایا ہے۔ سمگلنگ، بلیک مارکیٹنگ، احتکار قسم کے ناجائز حربے غلط سرمایہ کاری کی وجہ سے فروغ پاتے ہیں۔

جنگ: اگر دنیا کی تاریخ کا بنظر عمیق مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ دنیا میں جنگوں کا سلسلہ سودی روپیہ کی وجہ سے ہے۔ یہی وجہ ہے قرآن مجید میں جنگ[1] کے ذکر کے ساتھ ہی حرمت سود کا ذکر کیا ہے چنانچہ بعض مفسرین نے بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان اکثر اموال المشرکین کانت اجتمعت من الربا و کانوا ینفقون تلک اموال علی العساکر یعنی اکثر مال مشرکوں کے سود سے جمع ہوئے تھے اور یہی جمع شدہ مال وہ لشکروں پر صرف کرتے تھے۔ جب کسی حکومت کو سود پر کثرت سے روپیہ ملتا ہے تو وہ بغیر ضرورت اور بغیر قوم کی خواہش کے جنگ کا صور پھونک دیتی ہے اور تمام قوم جنگ کی آگ کے لپیٹ میں آ جاتی ہے اگر سود کو ختم کر دیا جائے تو کوئی حکومت بھی اس وقت تک جنگ نہیں کرے گی جب تک اس کا وجود معرض خطر میں نہ ہو۔ اس وقت تمام قوم اپنا مال اور اپنی طاقت جنگ میں لگائے گی۔ اگر قوم اپنا مال اور طاقت لگانے کے لیے تیار نہ ہوگی نہ حکومت کو یہ جرأت پیدا ہوگی وہ قوم کی خواہش کے بغیر جنگ چھیڑ دے۔ یہ حرمت سود جنگوں کے انسداد اور قیام امن کا ایک ذریعہ ہے۔

اللہ سے انحراف: سود خور اپنے تئیں رب سمجھتا ہے اور خدا کے حق ملکیت کی نفی کرتا ہے یہ خیال سود خور کو اللہ اور معاشرے کا باغی بنا دیتا ہے۔ نہ وہ حقوق اللہ کی پروا کرتا ہے اور نہ حقوق العباد کی۔ اس کو صرف ایک ہی فکر دامنگیر ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ کس طرح وہ اپنا خزانہ لوگوں کے خون چوس کر بھرے اس کا معبود صرف دولت ہوتی ہے اس کے حصول کے لیے دن رات حرص و لالچ کی تیرہ و تار وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے یہ وہ افراد ہیں جن کا دائرہ سود انفرادی قومی اور بین الاقوامی سطح پر پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ وہ افراد کو بھی قرضے دیتے ہیں۔ حکومتوں کو بھی قرضے دیتے ہیں اور اپنے ملک سے باہر بھی قرضے دیتے ہیں۔ انفرادی زندگی سے لے کر بین الاقوامی زندگی تک سود خور چھائے ہوئے ہوتے ہیں اس سے ایک ایسا نظام جنم لیتا ہے جو انسانیت کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔

بین الاقوامی مصائب و آلام: ایک زمانہ تھا جب قرضے سود پر صرف انفرادی اور ملکی سطح پر دیے جاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا ایک عالمگیر برادری کے دائرہ میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ دور حاضر میں دنیا کی تمام اقوام ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئی ہیں۔ رسل و رسائل نے ہر قوم کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا ہے اور ہر ملک کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے دوسرے ملک کی مدد ضرور ہوتی ہے ترقی پذیر ممالک اپنے تعمیری منصوبوں کی تکمیل کے لیے بیرونی حکومتوں یا بین الاقوامی بازار زر کے ساہوکاروں سے سود پر قرض لیتے ہیں۔ تاکہ ان کے وسائل جلد ترقی کر جائیں اور ملک ترقی کی شاہراہ پر چل پڑے ان بیرونی قرضوں سے ترقی پذیر ملک کی معاشی حالت تباہ و برباد ہو جاتی ہے ہر سال قرض خواہ ملک کو سود کی ایک بھاری رقم ادا کرنے کے لیے عوام پر بھاری ٹیکس عائد کیے جاتے ہیں اس کے دو نتیجے نکلتے ہیں ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ترقی پذیر ملک کے عوام میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی ہے عوام حکومت اور سرمایہ داروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک خونی انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے قرض دار اور قرض خواہ ممالک کے مابین عداوت اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے اور نوبت لڑائی تک پہنچ جاتی ہے۔

غلامی کا ذریعہ: قرض کی وجہ سے ترقی پذیر ممالک اپنی آزادی کو کھو بیٹھتے ہیں۔ ترقی یافتہ ملک ترقی پذیر ممالک کو اپنے قرضوں کے جال میں پھنسانے کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے بڑی طاقتوں کے درمیان حسد اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ بڑی طاقتیں کمزور ملک میں اپنا سرمایہ لگانے کے لیے سازشوں کا ایک جال بچھا دیتی ہیں اور کمزور ملک ان سازشوں کے جال سے رہائی حاصل نہیں کر پاتے۔ اب ترقی پذیر ملک ترقی کرنے کی بجائے تنزل کی طرف جا رہے ہیں اور اقتصادی اور سیاسی آزادی کھو بیٹھتے ہیں۔ اب تو بعض ترقی پذیر ملکوں کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ ان کے ہوائی اڈے قرض خواہ ملک کے قبضے میں ہیں اور اپنے ''رب'' طاقت ور ملک کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھا نہیں سکتے۔ فون پر حکم ہوتا ہے حکمران فوراً ''ہاں'' کر کے اس حکم پر عمل کرتے ہیں۔ گویا سود نے ان ممالک کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔

---

[1] سورۃ آل عمران میں غزوہ احد اور غزوہ احزاب کے ذکر کے بعد حرمت سود کا ذکر ہے۔

شرعاً ناجائز بیوع

سرمایہ دارانہ نظام میں صاحب سرمایہ کسب اور تصرف میں بے محابا آزاد ہے۔ جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا امریکانہ میں سرمایہ داری کی تعریف میں مقالہ نگار لکھتا ہے۔

''سرمایہ دارانہ معیشت معاشی نظام کی ایک ایسی قسم ہے جس میں سرمایہ نجی ملکیت ہوتا ہے اور سرمایہ کار اپنے معاشی کاروبار کی بدولت حصول نفع کے لیے اسے جس طرح چاہیں استعمال میں لانے کے لیے آزاد ہوتے ہیں۔ (Encyclopedia Americana vol 5 P.599)

اسی طرح ملک کے تصرف اور انتقال کے بارے میں ایک مشہور مغربی محقق اور ماہر قانون جان اسٹن رقمطراز ہے۔

اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے یہ کسی متعین شے پر ایک حق کی نشان دہی کرتا ہے جو استعمال کے اعتبار سے غیر محدود تصرف اور انتقال کے اعتبار سے بے قید ہے۔ (Lectures on Jurispsrudence vol 11 P.790.)

مذکورہ تعریفات کی رو سے صاحب سرمایہ حصول نفع کے لیے جس طرح چاہے اپنا سرمایہ لگائے اسی طرح اپنی ملک میں تصرف اور انتقال کے لیے کلی طور پر آزاد ہے چاہے اپنا مال فروخت کرنے کے لیے منڈی میں لائے، چاہے اپنے پاس رکھے، چاہے ضائع کر دے۔

اسلام کسی مالک کو حصول نفع اور تصریف کی اجازت نہیں دیتا جو متعاقدین اور مصالح عامہ کے لیے ضرر رساں ہو۔ اسلام نے جہاں تجارت کی ترغیب دی ہے وہاں ایسی بیوع کو ناجائز قرار دیا ہے جو بائع اور مشتری دونوں کے لیے نقصان دہ ہیں۔

۱۔ دھوکہ کی بیع: حضرت ابن عمر فرماتے ہیں۔ نھی رسول اللّٰہ ﷺ عن بیع الغرر رسول اللہ ﷺ نے دھوکے کی بیع سے منع فرمایا۔

فرمایا لَیسَ منا من غش فی البیع والشراء جس نے خرید وفروخت میں دھوکہ بازی کی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

ان رسول اللّٰہ ﷺ مر علی صبرۃ من طعام فادخل یدہ فیھا فنالت اصابعہ بللاً فقال ماھذا یاصاحب الطعام؟ قال اصابتہ السماء یارسول اللّٰہ قال افلا جعلتہ فوق الطعام کی یراہ الناس؟ من غش فلیس منی (مسلم) رسول کریم ﷺ کا بازار میں غلہ کے ڈھیر پر گزر ہوا آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اس میں داخل کیا۔ آپ کی انگلیوں کو نمی محسوس ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''اے غلہ فروش! یہ نمی کیسی ہے؟'' اس نے عرض کیا ''یارسول اللہ ﷺ یہ نمی بارش کی وجہ سے پہنچی ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر تو نے اس کو غلہ کے اوپر کیوں نہ کر دی تا کہ لوگ اس کو دیکھ سکیں جو دھوکہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔

طبرانی نے معجم کبیر اور معجم صغیر میں یہی واقعہ حضرت ابن سعودؓ سے روایت کیا ہے اس کے آخر میں ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے والمکر والخداع فی النار یعنی اس طرح کا مکر وفریب کا انجام جہنم ہے۔ واللہ بن الاسقع سے روایت ہے سمعت رسول اللّٰہ ﷺ یقول من باع عیبا ولم ینبہ لم یزل فی مقت اللّٰہ او لم تزل الملئکۃ تلعنہ (ابن ماجہ) میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے کوئی عیب دار چیز کسی کے ہاتھ فروخت کی اور خریدار کو وہ عیب بتلایا نہیں دیا تو اس پر ہمیشہ خدا کا غضب رہے گا یا آپ نے فرمایا کہ اللہ کے فرشتے ہمیشہ اس پر لعنت کرتے رہیں گے۔

۲۔ ناجائز شرط: بیع وشراء میں ایسی شرط عائد کر دی گئی ہو جو معاملہ کا جز نہیں اور متعاقدین میں سے کسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ نھی رسول اللّٰہ ﷺ عن بیع شرط (معجم الاوسط للطبرانی) رسول اللہ ﷺ نے بیع کے ساتھ ایسی شرط لگانے سے منع فرمایا جو اس کا جزء نہیں ہے۔

۳۔ بیع پر بیع منع ہے: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ ولایبیع الرجل علی بیع اخیہ ولا یسوم علی سوم اخیہ (بخاری کتاب البیع اخیہ ۵۸:۳۴) کوئی شخص اپنے بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے۔ نہ اپنے بھائی کی قیمت کرنے پر قیمت کرے۔

یہ ایک لمبی حدیث ہے اس کا ایک ٹکڑا جو بیع سے متعلق ہے لکھ دیا ہے۔ بیع وشراء میں معاملہ یوں ہے کہ بائع ایک چیز بیع کرنے پر راضی ہو گیا مشتری خریدنے پر رضا مند ہو گیا قیمت طے ہو گئی صرف ابھی باہمی تبادلہ باقی ہے۔ تو اس وقت کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ بیچنے والے کے ساتھ زیادہ قیمت لگا کر پہلے خریدار کے معاملہ کو خراب کر دے۔ ہاں فریقین میں قیمت طے نہیں ہوئی اور ایک فریق اٹھ کر چلا گیا ہو تو پھر تیسرا آدمی خرید کی پیشکش کر سکتا ہے۔

۴۔ **تناجش کی ممانعت:** اسلامی ضابطہ تجارت میں تناجش بھی منع ہے۔ تناجش یہ ہے کہ ایک آدمی کوئی چیز خریدنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ محض مشتری کو دھوکہ دینے کے لیے اس چیز کی قیمت بڑھا کر بیان کر دیتا ہے عموماً منڈیوں میں ہوتا ہے کہ محض بائع کو فائدہ پہنچانے کے لیے اس چیز کی قیمت زیادہ لگا دیتا ہے تا کہ خریدار اس لگائی ہوئی قیمت سے زیادہ قیمت دے۔ حدیث میں آتا ہے۔ ان رسول اللہ ﷺ نھی عن النجش (صحیح بخاری، مسلم، نسائی) رسول اللہ ﷺ نے قیمت چڑھانے سے منع فرمایا۔

ایک اور حدیث میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا و لا تناجشوا (بخاری کتاب البیوع ۵۸:۳۴) دھوکا دینے کے لیے قیمت نہ بڑھاؤ۔

فرمایا الناجش اکل الربا خائن (بخاری کتاب البیوع) ناجش سود خور خیانت کرنے والا ہے۔

بیع حبل الحبلہ سے ممانعت: حدیث میں آتا ہے۔ عن عبداللہ بن عمر ان رسول اللہ ﷺ نھی عن بیع حبل الحبلہ و کان بیعا یتبایعہ اھل الجاھلیۃ کان الرجل یبتاع الجز ورالی ان تنتج الناقۃ ثم تنتج التی فی بطنھا (بخاری کتاب البیوع) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حمل کے حمل کی بیع سے منع فرمایا اور (حضرت عبداللہ بن عمر اس کی تفسیر کرتے ہیں) اور یہ ایک بیع تھی۔ جسے اہل جاہلیت کرتے تھے۔ ایک شخص اونٹ کو خرید لیتا (قیمت اس وقت دے گا) جبکہ اونٹنی جنے پھر وہ جنے جو اس کے پیٹ میں ہے۔

ایک تو حبل الحبلہ کی تفسیر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بیان کر دی ہے کہ ادائے قیمت کی میعاد یہ ہوگی کہ یہ خرید کی ہوئی اونٹنی جنے پھر اس کی بچی بڑی ہو کر جنے گی تو اس خرید کی ہوئی اونٹنی کی قیمت ادا کی جائے گی۔ ممکن ہے یہ واقعہ ہی نہ ہو اور بچی سے بچی پیدا ہونے کی نوبت ہی نہ آئے۔ گویا قیمت ادا ہی نہ ہوگی۔

ایک تفسیر یہ ہے اونٹنی کے پیٹ میں جو حمل ہے اس کا بچہ پیدا ہو۔ تو وہ دیا جائے گا۔

یہ معدوم کی بیع ہے جس کا موجود ہونا مشکوک ہے اور پہلی تفسیر میں موجود کی بیع کی ہے لیکن ادائے قیمت کی میعاد یقینی نہیں دونوں بیوع منع ہیں کیونکہ دونوں میں دھوکا ہے۔

ملامسہ: عن ابی ھریرہ ان رسول اللہ ﷺ نھی عن بیع الملامسہ والمنابذۃ (بخاری کتاب البیوع، مسلم، موطا امام مالک) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع ملامسہ اور بیع منابذہ سے منع فرمایا۔

بیع ملامسہ یہ ہے کہ خریدار بغیر دیکھنے کے کپڑے کو ہاتھ لگائے تو وہ بیع مکمل سمجھی جائے۔

بیع منابذہ: مذکورہ حدیث میں بیع منابذہ سے بھی منع کیا گیا ہے بیع منابذہ یہ ہے ایک شخص اپنا کپڑا خریدار کی طرف پھینک دے اور وہ بیع مکمل سمجھی جائے۔ پیشتر اس کے کہ اس کا خریدار الٹا پلٹا کر اچھی طرح دیکھے۔

دونوں صورتوں میں خریدار اندھیرے میں ہوتا ہے کہ جو مال وہ خرید رہا ہے آیا عیب دار ہے یا صحیح ہے دوم خریدار کو بیع کے فسخ کرنے کا اختیار نہیں رہتا۔ حالانکہ اسلام میں متعاقدین کو جب تک مجلس خرید میں بیٹھے ہوئے ہیں بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے۔ دونوں بیوع دھوکے پر مبنی ہیں۔ لہٰذا اسلام دونوں کو ناجائز قرار دیتا ہے۔

بیع الحصاۃ: نھی رسول اللہ ﷺ عن بیع الحصاۃ وعن بیع الغرر رسول کریم ﷺ نے کنکری اور دھوکے کی خرید و فروخت سے منع فرمایا۔ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ بائع مشتری کو یوں کہے کہ میں تیرے ہاتھ وہ کپڑے بیچوں گا جن پر کنکری پڑے جس کو میں پھینکتا ہوں۔ یا یہاں سے لے کر جہاں تک یہ کنکری جائے وہ اسباب میں نے تیرے ہاتھ بیچ دیا۔ اس میں دھوکا ہے خریدار نے کوئی دیکھ بھال نہیں کی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جب تک میں کنکری پھینکوں تجھے اختیار ہے اس کے بعد مجھے کوئی اختیار نہیں۔

تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ خود کنکری پھینکنا بیع قرار پائے جب میں اس کپڑے پر کنکری ماروں تو اتنے میں بک جائے گا۔

بیع محفلۃ و مصراۃ: یہ بیع دودھ دینے والے جانوروں کے تھنوں میں فروخت کے وقت دودھ روک رکھنا ہے تا کہ دودھ زیادہ معلوم ہو اور خریدار سے زیادہ رقم وصول کرے۔ حدیث میں آتا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا لا تصروا الابل والغنم (بخاری کتاب البیوع) اونٹنیوں اور بکریوں کا دودھ بند نہ رکھا کرو۔

جو خریدار ایسا جانور خرید لیتا ہے تو اسلام نے اس کو دو اختیار دیے ہیں۔ ان شاء امسک و ان شاء ردھا و صاع تمر (بخاری کتاب البیوع

ترمذی) تو چاہے اسے رکھ لے اور اگر چاہے تو اس کو کھجور کے ایک صاع کے ساتھ بائع کو واپس کر دے۔

جو چیز اپنے پاس نہ ہو اس کی بیع نہ کی جائے: عہد جاہلیت میں ایسا ہوتا تھا دور حاضر میں بھی ہے کہ چیز پاس نہیں ہوتی تاجر خریدار سے سودا کر لیتا ہے کہ کہیں سے مطلوبہ چیز خرید کر اس کو دے دوں گا۔ رسول کریم ﷺ نے اس قسم کی بیع سے منع فرمایا ہے کیونکہ امکان ہے کہ وہ چیز فراہم نہ ہو سکے یا فراہم ہو جائے بھی تو خریدار کو پسند نہ ہو تو فریقین میں نزاع ہو سکتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔ عن حکیم بن حزام قال نہانی رسول اللّٰہ ﷺ ان ابیع مالیس عندی (بخاری کتاب البیوع و مسلم) حکیم حزام سے روایت ہے کہ رسول اللّٰہ ﷺ نے مجھے اس سے منع فرمایا کہ جو چیز میرے پاس موجود نہیں میں اس کو فروخت کروں۔

حکیم بن حزام ایک دولت مند تاجر تھے۔ سنن نسائی اور سنن ابی داؤد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ بعض اوقات ایک خریدار میرے پاس آتا ہے ایسی چیز طلب کر لیتا ہے جو میرے پاس نہیں ہوتی تو میں اس سے معاملہ کر لیتا ہوں اور منڈی سے وہ چیز خرید کر اس کو دے دیتا ہوں تو آپ نے فرمایا جو چیز تمھارے پاس نہیں اس کی بیع نہ کرو۔

خریدی ہوئی چیز اٹھانے سے پہلے اس کو فروخت نہ کیا جائے: آپ ﷺ نے فرمایا من ابتاع طعامًا فلا یبعه حتی یستوفیه (ابوداؤد) جو شخص غلہ خریدے تو جب تک اس کو اپنے قبضے میں نہ لے لے اس وقت تک کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کرے۔

اس حدیث میں طعام کا ذکر ہے لیکن تمام اموال منقولہ کی خرید و فروخت اس میں شامل ہے۔

مضطر (ضرورت مند) کی بیع: اضطرار دو طرح کا ہے کہ کوئی شخص فقر و فاقہ یا کسی حادثہ کی وجہ سے اپنی کوئی چیز بیچنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے وہ بھی مضطر ہے اسی طرح کوئی شخص بڑی مجبوری کی وجہ سے اپنی ضرورت پورا کرنے کے لیے کوئی چیز خرید کرنا چاہتا ہے یہ دونوں اضطراری کی حالتیں ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے دونوں حالتوں میں اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے سے منع فرمایا ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔ عن علی قال نھی رسول اللّٰہ ﷺ عن بیع المضطر (ابوداؤد) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مضطر کی خرید و فروخت سے منع فرمایا۔

اس حدیث سے اسلامی معاشیات کی روح کا علم ہو جاتا ہے کہ کسب کے ساتھ اخلاقیات کے دامن کو نہیں چھوڑا۔ مجبور کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے سے روکا ہے۔ اسی پہلو کی وجہ سے اسلام کے اقتصادی نظام کو دوسرے اقتصادی نظاموں سے بہتری ہے۔

پھلوں کی بیع پختگی سے پہلے ناجائز ہے: پھلوں کی پختگی سے قبل متعاقدین کو نقصان کے اندیشے سے رسول کریم ﷺ نے ناجائز قرار دی ہے۔ حدیث میں آتا ہے نھی عن بیع الثمر حتی یبدو صلاحه. (بخاری کتاب البیوع) میوہ بیچنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ اس کی پختگی ظاہر ہو جائے۔

وفی روایة لمسلم نھی عن بیع النخل حتی تزھو وعن السنبل حتی تبیض ویامن العاھة رسول کریم ﷺ نے پھلوں کی بیع سے منع فرمایا یہاں تک کہ ان میں پختگی آ جائے۔ کھیت کے بالوں کی بیع سے جب تک ان پر سفیدی نہ آ جائے اور تباہی کا خطرہ نہ رہے۔

عن انس نھی رسول اللّٰہ ﷺ عن بیع الثمار حتی تزھی قیل وما تزھی؟ قال حتی یحمر وقال ارأیت اذا منع اللّٰہ الثمرة بمایاخذ احدکم مال اخیه. (صحیح بخاری کتاب البیوع و مسلم) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پھلوں کی بیع سے منع فرمایا یہاں تک کہ ان پر رونق آ جائے۔ عرض کیا گیا رونق (تزھی) کیا ہے فرمایا یہاں تک کہ سرخ ہو جائے۔ فرمایا کہ بتاؤ اگر اللہ تعالیٰ پھل عطا نہ فرمائے (پھل تباہ ہو جائے) تو بیچنے والا کسی چیز کے عوض میں (خریدنے والے) اپنے بھائی سے مال وصول کرے گا۔

جیسا کہ آج کل ہوتا ہے کہ باغات پھل کی پختگی سے قبل ہی بیچ دیے جاتے ہیں۔ عرب میں بھی ایسا تھا۔ رسول کریم ﷺ نے ممانعت فرما دی کیونکہ اس میں آسمانی آفت سے پھل کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے تو مشتری کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور بائع اور مشتری کے مابین ایک نزاع پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لیے رسول کریم ﷺ نے ایسی خرید و فروخت سے منع فرما دیا جو معاشرہ میں خرابی کا باعث بن جائے۔

علماء نے لکھا ہے اگر آسمانی آفت کی وجہ سے باغ کے پھل کو بہت نقصان پہنچا ہے اور مشتری اس آفت کی وجہ سے نقصان میں جا رہا ہے تو بائع قیمت میں تخفیف کر دے یا بالکل قیمت ختم کر دے۔

باغ کو چند سالوں کے لیے ٹھیکے پر دینے سے ممانعت: رسول کریم ﷺ نے صرف پھلوں میں پختگی آنے سے پہلے بیچنے سے ہی منع نہیں فرمایا بلکہ چند سالوں کے لیے باغ یا کھیت کو ٹھیکے پر دینے سے بھی منع فرمایا کیونکہ ٹھیکے پر دینے سے بھی احتمال ہے کہ کسی سال پھل وغیرہ کو کسی ناگہانی آسمانی آفت کی

وجہ سے نقصان پہنچ جائے اور مشتری خسارے میں چلا جائے۔ حدیث میں آتا ہے نهى رسول اللهﷺ عن بيع السنين وامر بوضع الجوائع رسول کریم ﷺ نے منع فرمایا کہ (باغ) کو چند سالوں کے لیے فروخت کیا جائے آپ نے حکم دیا ناگہانی آفات کے نقصان کو وضع کر دیا جائے۔

اسی مضمون کی ایک اور حدیث ہے۔ قال رسول اللهﷺ لو بعت من اخيك ثمراً فاصابته جائعة فلا يحل لك ان تاخذ منه شيئًا بم تاخذ مال اخيك بغير حق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تو اپنے بھائی کے ہاتھ پھل بیچے پھر اس پر کوئی (آسمانی) آفت آ جائے۔ (جس سے پھل تلف ہو جائے) تو اب تیرے لیے اس سے لینا جائز نہیں تو کس چیز کے بدلے اپنے بھائی کا مال لے گا کیا ناحق لے گا۔

مفلس خریدار کو چھوٹ: حدیث میں آتا ہے اصيب رجل في عهد رسول اللهﷺ في ثمارابتا عها فكثره دينه فقال رسول اللهﷺ تصدقوا عليه فتصدق الناس عليه فلم يبلغ ذالك وفاء دينه فقال رسول اللهﷺ لغرماه خذوا وجدتم وليس لكم الا ذالك ایک شخص نے رسول کریم ﷺ کے عہد میں پھل خریدا اس پر (پھل کو نقصان پہنچنے کی وجہ سے) قرض بہت ہو گیا آپ ﷺ نے فرمایا اس کو صدقہ دو لوگوں نے اسے صدقہ دیا تب بھی اس کا قرضہ پورا نہ ہوا تو آپ ﷺ نے اس کے قرض خواہوں سے فرمایا اب جو کچھ مل گیا ہے لے لو۔ اب (مزید) کچھ نہیں ملے گا۔

شہری کا دیہاتی سے سامان منڈی آنے سے پہلے خرید کی ممانعت: شہر کے لوگ نسبتاً دیہاتوں سے زیادہ چالاک اور بازار کی قیمتوں سے واقف ہوتے ہیں اور دیہاتیوں کو دھوکا دے سکتے ہیں تو آپ نے اس تجارت سے منع فرما دیا۔ حدیث میں آتا ہے۔ نهى رسول اللهﷺ ان يبيع حاضرٌ لباد ولا تناجشوا ولا يبيع الرجل على بيع اخيه (بخاری کتاب البیوع) رسول کریم ﷺ نے منع فرمایا کہ شہری دیہاتی کا مال بیچے اور دھوکہ دینے کے لیے قیمت نہ بڑھاؤ اور کوئی شخص اپنے بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے۔

بیع حاضر للبادی کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ کسی تاجر کا مال شہر میں موجود ہے۔ مگر وہ بے جا نفع اٹھانے کے لیے شہر والوں کی ضرورت کے باوجود ان کے پاس نہیں بیچتا۔ بلکہ زیادہ نفع کے حصول کے لیے دیہاتیوں میں مال فروخت کرتا ہے ایک اور مفہوم یہ بھی پایا جاتا ہے کہ شہری، دیہاتی کے مال کی دلالی نہ کرے۔

تجارتی قافلہ سے منڈی میں آنے سے پہلے ہی سامان تجارت خریدنے کی ممانعت: دور جاہلیت اور عہد رسول کریم ﷺ میں تاجر تجارتی قافلہ سے شہر میں پہنچنے سے پہلے ہی سامان تجارت خرید لیتے تھے۔ تلقی الرکبان کی دو وجوہ تھیں۔ ایک احتکار دوم تجارتی قافلہ کی منڈی کے بھاؤ کی عدم واقفیت کی وجہ سے سامان تجارت کو سستے داموں خریدنا دونوں باتیں اسلام کی تجارتی پاکیزہ روح کے منافی ہیں اس لیے آپ نے منع فرمایا۔

نهى رسول اللهﷺ تلقى الركبان (بخاری کتاب البیوع) رسول کریم ﷺ نے شہر سے نکل کر باہر قافلے کے سواروں سے ملنے کی ممانعت فرمائی۔

حرام چیزوں کی خرید وفروخت کی ممانعت: عن جابر بن عبدالله انه سمع رسول اللهﷺ يقول عام الفتح وهو بمكة ان الله ورسوله حرم بيع الخمر والميتة والخنزير والاصنام (بخاری کتاب البیوع) جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فتح مکہ کے دن رسول کریم ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا یقیناً اللہ اور اس کے رسول نے شراب، مردار، سؤر اور بتوں کا بیچنا حرام کر دیا ہے۔

ایک اور حدیث ہے۔ ان رسول اللهﷺ نهى عن ثمن الكلب ومهر البغى وحلوان الكاهن (......) رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت بدکاری کی اجرت اور کاہنوں کی اجرت سے منع فرمایا۔

انفرادی ملکیت کی حد بندی

زمین اور انفرادی حد ملکیت: جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلام انفرادی ملکیت کو جائز قرار دیتا ہے لیکن شرائط اور قیود کے ساتھ۔ یہی شرائط اور قیود معاشی نظام میں اعتدال اور توازن قائم رکھتی ہیں۔ ان قیود اور شرائط کے فقدان کے ساتھ ہی معاشی نظام میں راہ فساد کھلتی ہے کہ اسلام نے زمین کی انفرادی ملکیت کو کس حد تک تسلیم کیا ہے۔

اسلام ایک فطری اور ابدی دین ہے جو زمان اور مکان کی قیود سے بالاتر ہے۔ اس میں زندگی کے تمام شعبوں کے متعلق اصولی تعلیم موجود ہے۔ زمانہ کے حالات اور تقاضے کے مطابق زندگی کے مسائل کو اصولی تعلیم کی روشنی میں حل کیا جا سکتا ہے۔ اسلام نے انفرادی ملکیت کی کوئی حد مقرر نہیں کی اور یہی حکیم و خبیر اللہ کی طرف سے نازل ہونے کی دلیل ہے۔ اگر یہ کتاب کسی انسان کے ذہن کی پیداوار ہوتی تو زمانہ کے حالات اور تقاضے کے مطابق کسی زرعی نظام کے بیان کی مرتکب ہو جاتی۔ اور ابدی رہنمائی کی کتاب نہ رہتی اور حالات کے بعد اس کی تعلیم بیکار ہو جاتی۔

اسلام نے زمین کا ایک خاص مقصد بیان کیا ہے۔ اس مقصد کے تحت انفرادی ملکیت کی زمانہ اور حالات کے پیش نظر حد بندی کی جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں سورۃ رحمٰن میں زمین کا مقصد ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّ النَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ وَ الْحَبُّ ذُوالْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ فَبِاَيِّ الاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ. (الرحمٰن ۵۵:۱۰.....۱۳) اور زمین کو مخلوق کے لیے رکھا ہے اور اس میں پھل ہے اور گابھوں والی کھجوریں اور بھس والا دانہ اور خوشبودار پھول تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

ان آیات کریمہ میں زمین کا مقصد وحید یہ بیان کیا ہے کہ وہ مخلوق کے لیے اناج پھل پھول وغیرہ پیدا کرے۔ اس اصول کی روشنی میں زمانہ کے تقاضا کے مطابق زرعی نظام قائم کیا جائے گا۔

جاگیرداری اور اسلام

بعض علماء نے جاگیرداری نظام کو جائز قرار دیا ہے اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ حضرت امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فتح عراق کے بعد کسریٰ اور اس کے خاندان اور ان لوگوں کی زمینیں جو جنگ میں مارے گئے تھے ان مجاہدین کو دے دیں جو خدمات اسلامی میں ممتاز تھے۔

اگر یہ علماء قطعیہ کی تعریف اور عہد رسول اور خلافت کے اقطاع کی صحیح شکل سے واقف ہوتے تو وہ کبھی بھی موجودہ جاگیرداری کے نظام کو جائز قرار نہ دیتے۔

تعریف: "مفاد عامہ کی خاطر غیر آباد زمین کو آباد کاری کے لیے کسی کو دینا اور موقع ضرورت اور مصلحت کے مطابق اس سے سرکاری ٹیکس وصول کرنا۔"

علامہ انور کاشمیری فیض الباری میں قطیعہ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

الاقطاع اعطاء الارض للاحياء سواءً وجب عليه فيه العشراو الخراج (ج ۳ ص ۳۰۸) اقطاع کسی کو آباد کاری کے لیے زمین دینا خواہ اس میں عشر واجب ہو یا خراج۔

علامہ بدرالدین عینی شارح بخاری فرماتے ہیں۔

قطائع قطیعہ کی جمع ہے۔ خلیفہ کے قطائع دینے کی یہ صورت ہے۔ جس شخص میں وہ صلاحیت دیکھے اللہ کے اموال میں سے کچھ حصہ خلافت کی جانب سے اس کو عطا کر دے۔ اکثر اس لفظ کا استعمال اراضی کے بارے میں آتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔

۱۔ یا تو زمین کی ذات اور منفعت دونوں کا مالک بنا دیا جاتا ہے۔

۲۔ یا صرف زمین کی منفعت کا مالک بنا دیا جاتا تھا۔ ذات کا نہیں۔ (عمدۃ القاری ج ۶ ص ۳۶)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔

وللسلطان اقطاعه علی الملک و کذا علی عدمه. (مسوی ص ۴۰۵)

خلیفہ کو قطائع دینا جائز ہے چاہے وہ زمین کا مالک بنا دے اور چاہے مالک نہ بنائے۔ صرف نفع اٹھانے کے لیے دے۔

احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ تین قسم کی اراضی حکومت کی جانب سے لوگوں کو بطور قطیعہ دی جاتی تھیں۔

۱۔ بنجر زمینیں جو ویرانی اور سختی کی وجہ سے غیر مزروعہ چلی آتی تھیں۔ ایسی زمینوں کو آباد کرنے کے لیے خلافت نے لوگوں میں تقسیم کر دیا چنانچہ نقیع میں جو زمین حضرت زبیر کو دی گئی تھی وہ غیر مزروعہ اور غیر آباد تھی۔ (الاحکام السلطانیہ ماوردی ص ۱۸۳)

۲۔ افتادہ زمین: جو قابل کاشت ہوتی تھیں۔ لیکن کسی وجہ سے آباد نہ ہوتی تھیں۔ حضرت بلال بن حارث کو رسول کریم ﷺ نے وادی عقیق اسی زمین سے دی تھی۔ (الاموال لابی عبید ص ۳۸۲)

۳۔ خالصہ زمین: اس میں مفتوحہ علاقوں کی وہ تمام اراضیات شامل ہوتی تھیں جو خلافت کے لیے خالصہ قرار دی جاتی تھیں۔ ایسی اراضیات کی کئی اقسام تھیں۔

(الف) جن اراضی کے مالک جنگ میں مارے جاتے تھے۔

(ب) یا بھاگ جاتے تھے۔

(ج) شاہی جاگیریں جو صرف بادشاہ کے صرف خاص کے لیے خالصہ ہوتی تھیں۔

(د) شاہی خاندان اور افسران کی زمینیں۔

(ہ) ترائی جھیلیں جھاڑیاں وغیرہ۔

یہ اور اس قسم کی تمام وہ اراضیات جن پر چند افراد قابض ہوتے تھے اور عیش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اسلامی فتح کے بعد ان کا کوئی مالک اور آباد کرنے والا نہ رہ جاتا تھا۔ ایسی تمام اراضیات خلافت کے لیے خالصہ ہو کر مفاد عامہ کے لیے وقف ہو جاتی تھیں۔ (الاموال ص ۲۸۲ والخراج ص ۵۷، ۵۸)

قاضی امام ابو یوسف فرماتے ہیں۔

وذالک بمنزلة المال الذی لم یکن لاحد ولا فی یداحد. (الخراج ص ۵۸)

ایسی زمین اس مال جیسی ہوتی جو نہ کسی کا ہو اور نہ کسی کے قبضہ میں ہو۔

اس تمام بحث سے یہ بات نمایاں طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ عہد رسالت اور خلافت میں انہی زمینوں میں سے قطائع لوگوں کو دی جائیں جو غیر آباد ہوتیں۔ کسی کے قبضہ نہ ہوتیں اور ان کے آباد کرنے سے ملک کی معاشی حالت بہتر ہوتی اور ایسی زمین نہ ہوتی تھی۔ جس سے مفاد عامہ وابستہ ہوتا مثلاً چراگاہ جنگل وغیرہ۔ نہ ایسی زمین ہوتی جس کے عطا کرنے سے کسی دوسرے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا۔

قطائع کن لوگوں کو دیے جاتے تھے۔

عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں حسب ذیل لوگوں کو قطائع دیے۔

۱۔ جو زمین کو آباد کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

۲۔ جو مفادِ عامہ کی خدمت پر مامور ہوتے تھے۔

۳۔ جن کے سپرد ملک اور قوم کا دفاع ہوتا تھا۔

۴۔ نو مسلموں کو تالیف قلوب کے لیے قطائع دیے جاتے تھے۔

علامہ مقریزی فرماتے ہیں۔

قداقطع رسول الله وتالف علی الاسلام اقواما واقطع الخلفاء من رآؤ آنّ فی اقطاعه صلاحًا. (الخطط للمقریزی ج ۲ ص ۱۵۳)

رسول کریم ﷺ اور آپ کے خلفاء انہی لوگوں کو قطائع دیتے تھے جن کے دینے میں ملک کی بھلائی ہوتی تھی اور تالیف قلوب مقصود ہوتی تھی۔

اقطاع دینے کے اغراض و مقاصد

۱۔ رسول کریم ﷺ اور زمانہ خلافت میں ویران اور افتادہ زمینیں کثرت سے تھیں ان کو آباد کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ لوگوں میں تقسیم کی جاتیں۔

۲۔ رسول کریم ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت تک فوجیوں اور دوسرے عمال کی تنخواہیں مقرر نہ تھیں ان کی گزران کے لیے ضروری تھا کہ ان کو اقطاع دیے جاتے۔

۳۔ ملک کی معیشت کی بہتری زرعی پیداواری کے بڑھنے میں مضمر ہے۔ اس وجہ سے اسلامی حکومت نے پیداوار کو بڑھانے کے لیے مختلف افراد میں قطائع تقسیم کر دیے۔

حضرت امام ابو یوسف فرماتے ہیں۔

میرے خیال میں غیر مملوکہ اور غیر آباد زمینوں کو بے کار چھوڑ رکھنے کی بجائے امام کو چاہیے کہ انھیں بطور جاگیر مختلف افراد کو دے دے اس طرح ہمارے علاقے زیادہ آباد اور خوشحال ہو جائیں گے اور خراج میں بھی اضافہ ہوگا۔ (اسلام کا نظام محاصل ترجمہ کتاب الخراج ص ۲۴۵ امام ابو یوسف)

قطائع پر خلافت کے اختیارات: قطائع پر خلافت کے اختیارات باقی رہتے تھے، جس غرض کے لیے کسی کو قطیعہ دیا جاتا تھا۔ اگر وہ غرض پوری نہ ہوتی تو خلافت اس شخص سے جاگیر واپس لے لیتی تھی۔ اسی بناء پر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا۔ لنا رقاب الارض یعنی زمین ہماری (خلافت) کی ہے۔ (الاموال ص ۲۷۹)

حضرت علیؓ نے ایک شخص سے اس کے اسلام قبول کرنے کے بعد فرمایا۔ اِنّ ارضک فھی لنا. بے شک تری زمین ہماری (خلافت کی) ہے۔

(احکام القرآن ج ۳ ص ۳۲)

ابوبکر جصاص فرماتے ہیں۔

ہر وہ زمین جس کی آبادکاری سے لوگ درماندہ اور عاجز رہیں اور حقوق عامہ جو زمین سے متعلق ہیں پامال ہونے لگیں تو اس کے انتظام و انصرام کے بارے میں خلافت کو پورا اختیار حاصل ہے۔ (احکام القرآن ج ۳ ص ۵۳۲)

حضرت امام ابو یوسف فرماتے ہیں۔

ولا یخرج من یدہ من ذالک شیئا الا بحق یجب له علیه فیاخذہ بذلک الذی وجب علیه. (الخراج ص ۶۰)

خلافت بلاوجہ لوگوں سے قطائع واپس نہ لے۔ البتہ اگر حقوق کی ادائیگی نہ ہو رہی ہو تو قطائع لے لینے کا پورا اختیار حاصل ہے۔

رسول کریم ﷺ نے حضرت بلالؓ بن حارث مزنی کو جاگیر کا ایک بڑا ٹکڑا عطا فرمایا۔ یہ جاگیر اتنی بڑی تھی کہ حضرت بلالؓ اس کے بیشتر حصے کو آباد نہ کر سکے۔ جب حضرت عمرؓ کا عہد آیا تو حضرت بلالؓ کو بلوایا اور کہا کہ رسول کریم ﷺ نے تم کو قطعیہ دیا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ مگر اتنی بڑی جاگیر کو تم آباد کرنے سے معذور ہو۔ لہٰذا بقدر ضرورت رکھ لو اور باقی خلافت کو واپس کر دو تاکہ ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کروں تو حضرت بلالؓ بن حارث نے جواب دیا۔

لا افعل واللّٰہ شیئا اقطعنیه رسول اللّٰہ ﷺ فقال عمر واللّٰہ لتفعلن فاخذمنھا ماعجز عن عمارته قسمه بین المسلمین.

(کتاب الاموال لابی عبیدہ ص ۲۹۰)

خدا کی قسم میں اس جاگیر میں سے کوئی حصہ بھی واپس نہیں کروں گا جو رسول کریم ﷺ نے عطا فرمائی تھی۔ حضرت عمرؓ نے کہا خدا کی قسم تم کو کرنا ہی پڑے گا اور جس قدر وہ اراضی آباد نہ کر سکے تھے اس کو حضرت عمرؓ نے ان سے واپس لے کر مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔

قوم بجیلہ کی زمینیں حضرت عمرؓ نے واپس لے لیں: خالصہ کی زمین کا ایک حصہ حضرت عمرؓ نے قوم بجیلہ کو دے دیا۔ دو تین سال تک اس سے فائدہ اٹھاتے رہے لیکن جب خلافت نے مفاد عامہ کے پیش نظر زمینوں کو واپس لینا چاہا تو بغیر کسی تذبذب اور پس و پیش قوم بجیلہ نے خلافت کے حوالے کر دیں۔ اس کی تفصیل یوں ہے۔

قیس بن حازم کہتے ہیں۔ جنگ قادسیہ کے دن اسلامی فوج میں قوم بجیلہ کے لوگ چوتھائی تھے حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو سواد کا چوتھائی حصہ دے دیا۔ دو یا تین سال تک وہ اس زمین پر قابض رہے۔ ایک مرتبہ کسی ضرورت سے اسی قبیلہ کے چند افراد عمار بن یاسر اور جریر وغیرہ حضرت عمرؓ کے پاس تشریف لائے تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ لوگ اس زمین کو عام مفاد خلق کے لیے خلافت کے حوالہ کر دیں۔ اس پر ان لوگوں نے حکم کی تعمیل کی اور زمین خلافت کے حوالے کر دی اس کے بعد حضرت عمرؓ نے سرکاری خزانہ سے جریر کو اسی دینار عطا فرمائے۔ (الاموال ص ۶۱، ۶۲ والخراج یحییٰ ص ۴۵، ۴۶)

جب اس بات کا علم قوم بجیلہ کی ایک عورت "ام کرز" کو ہوا تو اس نے اپنے حصہ کی زمین واپس کرنے میں لیت و لعل کیا حضرت عمرؓ کے پاس آ کر درخواست کی۔ "اے امیر المومنین میرے والد فوت ہو گئے ہیں۔ سواد کی زمین میں اس کا بھی حصہ تھا (جو مجھے ترکہ میں ملا ہے) میں اس کو واپس نہیں کروں گی۔ حضرت عمرؓ نے کہا اے ام کرز تیری قوم نے واپس کر دی ہے جبکہ تجھے علم ہے۔ اس نے جوابا کہا قوم نے جو کچھ کیا ہے مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں تو اس وقت تک واپس نہیں کروں گی جب تک کہ آپ مجھے ایک سدھائی ہوئی اونٹنی نہ دیں جس پر سرخ رنگ کی چادر ہو اور سونے سے میرا ہاتھ بھر دیں۔ حضرت عمرؓ نے ایسا ہی کیا جو نقدی اس کو دی تھی وہ تقریباً اسی دینار تھی۔ (الاموال ص ۶۱، ۶۲۔ الخراج یحییٰ ص ۴۵، ۴۶)

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ اور خلفاء راشدین نے مفادِ عامہ کے پیش نظر زرعی معاشی ترقی کے لیے لوگوں کو قطائع دیے تھے اور ان پر خلافت کا پورا اختیار تھا۔ جن لوگوں نے زمینوں کو آباد نہ کیا ان سے زمینیں واپس لے لیں اور دوسرے لوگوں میں تقسیم کر دیں۔

بجیلہ قوم سے زمین واپس لینے کے واقعہ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ صاحب زمین کی رضامندی ضروری ہے۔ ابوبکر جصاص قوم بجیلہ کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد رقمطراز ہیں۔

اس واقعہ میں ان کی رضامندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ حضرت عمرؓ نے واضح طور پر غیر مبہم الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ زمین کو واپس کیے بغیر کوئی چارہ نہیں اس میں لوگوں کی بہبود ہے۔ باقی رہا ام کرز کا معاملہ تو اس کو حضرت عمرؓ نے بیت المال سے بطور امداد رقم دی تھی۔ ویسے بھی خلیفہ کو اختیار تھا کہ عورت کے قبضہ سے زمین واپس لیے بغیر بیت المال سے اس کو عطیہ دیتے۔ (احکام القرآن ج ۳ ص ۵۳۱، ۵۳۳)

دورِ خیر کے قطائع اور موجودہ جاگیرداری نظام: دورِ خیر کے قطائع اور موجودہ جاگیرداری نظام کے درمیان کوئی مطابقت نہیں۔ اس دور کے قطائع کے پیش نظر اس دور کے جاگیرداری نظام کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا ایک تو وجہ یہ ہے کہ اس دور میں قطائع دینے والا امام عادل تھا۔ ہمارے دور کی جاگیرداری کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جو انگریزوں نے ان لوگوں کو دیں جنھوں نے اپنے ملک کے خلاف برطانیہ حکومت کی وفاداری کا ثبوت دیا تھا۔ کچھ جاگیریں سکھوں کے عہد حکومت کی یادگار ہیں اور کچھ مغلیہ دور کی۔ دوم پھر یہ جاگیریں زرعی پیداوار بڑھانے ملک کو خوش حال کرنے کے لیے نہیں دی گئی تھیں۔ یہ محض افراد کو خوش حال کرنے اور ان کا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے دی گئی تھیں۔ سوم یہ تالیف قلوب کے لیے نہیں دی گئی تھیں بلکہ برطانوی اقتدار کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لیے دی گئی تھیں۔ چہارم یہ جاگیریں مفادِ عامہ کے پیش نظر نہیں دی گئی تھیں بلکہ مفادِ عامہ کو نقصان پہنچا کر مخصوص افراد کو خوش کرنے کے لیے دی گئی تھیں۔

یہ وہ وجوہ ہیں جن کی بناء پر موجودہ جاگیرداری نظام باطل ہے۔ اس کے شرعی وجوہ حسب ذیل ہیں۔

اجارہ داری: اسلام اجارہ داری کے خلاف ہے۔ جاگیرداری چند آدمیوں کا زمین کے ایک وسیع رقبہ پر قبضے کا نام ہے۔ اس سے تمام زرعی پیداوار چند ہاتھوں میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور اشیاءِ خوردنی کو گراں سے گراں تر قیمتوں پر فروخت کرنے کے مالک بن جاتے ہیں۔ عوام کی تمام دولت ان کے قبضہ میں آ جاتی ہے جس سے معاشرہ میں اقتصادی توازن برباد ہو جاتا ہے۔

اخوت کے منافی ہے: اسلام اخوت کا پیغام لے کر آیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات ۴۹:۱۰) مومن بھائی بھائی ہیں۔
وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا
(آل عمران ۳:۱۰۳) سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ نہ کرو اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب تم باہم دشمن تھے۔ پھر اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی ہو گئے۔

اسلام کے اس اصول کی روشنی میں ہر وہ نظام جو طبقاتی جنگ کو جنم دے گا وہ غیر اسلامی ہوگا۔

موجودہ جاگیرداری نظام نے طبقاتی جنگ کے شعلے بھڑکائے ہیں۔ اس وجہ سے یہ نظام اسلامی نہیں ہو سکتا۔

معاشی مساوات کے منافی ہے: اسلام میں معاشی مساوات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر ایک فرد کے پاس برابر برابر دولت ہو۔ اس قسم کی مساوات حیات اجتماعی کے برخلاف ہے۔ اجتماعی نظام اس وقت چلے گا جب سوسائٹی میں مزدور بھی ہوں۔ مالک بھی ہوں۔ کم رتبے کے لوگ بھی ہوں اور اعلیٰ رتبہ کے لوگ بھی ہوں۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ہر شخص مختلف استعدادیں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ انہی استعدادوں اور قابلیتوں کی بناء پر ترقی کرتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔
نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا. (الزخرف ۴۳:۳۲) ہم

نے ان کے درمیان ان کی دنیا کی زندگی میں دنیا کی روزی تقسیم کی ہے اور ایک دوسرے پر درجے بلند کیے ہیں تا کہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے۔

لہٰذا اسلام میں معاشی مساوات کا یہ مطلب ہے کہ تمام افراد کو ذرائع پیداوار میں حق انتفاع برابر سب کو حاصل ہو۔ اگر کوئی حکومت کسی فرد کو زمین کا ایک وسیع رقبہ دے دیتی ہے اور وہ بغیر محنت کے لاکھوں روپے حاصل کرے تو اسلام اس کو ناجائز قرار دیتا ہے۔

قَدَّرَ فِيهَا اَقْوَاتَهَا فِيْ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ o سَوَآءً لِلسَّائِلِيْنَ (حٰمٓ السجدہ ۴۱:۱۰) اور اس کی خوراکوں کا اس میں اندازہ کیا۔ یہ چار دن میں کیا مانگنے والوں کے لیے برابر کا حصہ ہے۔

اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زمین سب میں برابر تقسیم کر دی جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ انتفاع کا سب کو برابر حق دیا جائے۔ اب جو فرد انتفاع کے لیے اپنا حق استعمال نہیں کرتا اور زمین پر محنت نہیں کرتا تو وہ زمین کا سائل نہیں ہوگا۔ سائل وہ ہوگا جو دن رات ایک کر کے محنت کرتا ہے۔ پس جاگیرداری نظام سے معاشرہ کا ایک بہت بڑا طبقہ حق انتفاع سے محروم ہو جاتا ہے جو اسلامی معاشی مساوات کے سراسر منافی ہے۔ لہٰذا جاگیرداری نظام ناجائز اور باطل ہے۔

کساد بازاری: جدید اقتصادی نظریہ کی رو سے معیشت میں کساد بازاری پیدا کرنے کے دو عوامل ہیں۔ ایک سود اور دوسرا کرایہ پر دی جانے والی اراضیات، کرایہ پر دی جانے والی فالتو زمین اتنی ہی اقتصادی لحاظ سے نقصان دہ ہیں جتنا سود۔ اگر اسلام سود حرام قرار دیتا ہے تو جاگیرداری نظام بھی ممنوع قرار دیا جانا چاہیے۔

آج سے چودہ سو سال قبل رسولِ کریم ﷺ نے سود اور فالتو زمین کو کرایہ پر دینے سے منع فرمایا۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے۔ کچھ صحابہ کے پاس فالتو زمینیں تھیں۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ زمین ہو۔ اسے وہ خود کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو بخش دے یا اپنی زمین کو روکے رکھے۔ (بخاری و مسلم)

کیا حکومت جاگیرداروں سے زمین لے سکتی ہے؟: جب یہ ثابت ہو گیا کہ موجودہ جاگیرداری نظام باطل ہے تو اس کو توڑنا حکومت پر فرض ہے۔ اس کی نظیر تاریخ اسلامی میں موجود ہے۔ بنی امیہ کے امراء نے اپنے عہد حکومت میں غیر مسلموں کی زمینیں شاہی خاندان میں جاگیر کے طور پر تقسیم کر دی تھیں۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز کا عہد آیا تو انھوں نے ایسی تمام زمینیں شاہی خاندان کے افراد سے لے کر اصل مالکوں کے حوالے کر دیں۔

ہمارا جاگیرداری نظام تو سراسر فساد اور ظلم پر مبنی ہے۔ خلفاء راشدین نے تو ان افراد سے زمینیں واپس لے لیں جو آباد نہیں کر سکے تھے۔

ہمارا جاگیرداری نظام صرف معاشی مسئلہ ہی نہیں بلکہ معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی بھی ہے۔ جاگیرداری نظام نے معاشرہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ان کے درمیان طبقاتی جنگ جاری ہے۔ جاگیردار دولت کے نشہ میں چور ہیں اور ہر قسم کی برائی کے مرتکب ہیں۔ مزارعین کی جان مال اور عزت ان کے ہاتھوں محفوظ نہیں۔ اپنے ظلم و جور کے بدنتائج سے بچنے کے لیے ملکی سیاست پر غالب ہیں۔ روپے کے بل بوتے پر انتخاب جیتتے ہیں۔ اسمبلیوں میں جا کر سرمایہ دار طبقے کے حقوق کی نگہداشت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ملک میں غریب طبقہ میں بے چینی زیادہ پائی جاتی ہے۔ ان تمام برائیوں سے بچنے کا صرف ایک طریقہ ہے وہ یہ کہ جاگیرداری نظام کو ختم کر دیا جائے۔

مزارعت

مزارعت کے معنی یہ ہے کہ زمین کو کرایہ پر دینا اس کی پیداوار کے ایک حصہ پر۔

مزارعت کے جواز اور عدم جواز پر اختلاف پایا جاتا ہے کچھ احادیث عدم جواز پر دلالت کرتی ہیں اور کچھ جواز پر۔ پہلے دونوں قسم کی احادیث درج کی جاتی ہیں۔ بعدازاں تطبیق کی جائے گی۔

عدم جواز کی احادیث: عن رافع بن خدیج قال نهانا رسول الله ﷺ عن امر کان لنا نافعًا اذا کانت لاحدنا ارض ان یعطها ببعض خراجها او بدراهم وقال اذکانت لاحدکم ارض فلیمنحها اخاه او یزرعها. (ترمذی باب الزکوٰۃ و بخاری باب المزارعۃ) حضرت رافع بن خدیج سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ہم کو ایک ایسے کام سے روک دیا جو ہمارے لیے نفع بخش تھا وہ یہ کہ ہم میں سے کسی شخص کے پاس زمین ہو تو وہ اس کو نہ بٹائی پر دے اور نہ نقد لگان پر اور فرمایا اگر تم میں سے جس کے پاس زمین ہو یا تو وہ اپنے بھائی کو مفت دے دے یا خود کاشت کرے۔

حضرت رافع ؓ کی ایک اور حدیث ہے۔

نهانا ان نحاقل بالارض فنکرها علی الثلث والربع والطعام المسمّٰی وامر رب الارض ان یزرعها اویُزرعها وکره کرائها وما سوی ذالک. (مسلم) رسول کریم ﷺ نے ہم کو زمینوں میں مزارعت کا معاملہ کرنے سے منع فرمایا کہ ہم تہائی اور چوتھائی اور مقرر مقدار غلہ کے عوض کرایہ پر دیں اور آپ ﷺ نے حکم دیا کہ مالک زمین یا تو خود کاشت کرے یا دوسرے کو کاشت کرنے کے لیے دے دے اور آپ ﷺ نے زمین کے کرایہ کو اور اس کے سوا دوسری صورتوں کو ناپسند فرمایا۔

ایک اور حدیث میں حضرت رافع اپنے چچا ظہیر بن رافع کے حوالہ سے بتاتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے پوچھا کہ تم لوگ اپنی کھیتی باڑی کا معاملہ کس طرح کرتے ہو؟ تو ظہیر نے تفصیل بتائی اس پر آپ ﷺ نے فرمایا۔ فلا تفعلوا اِزرعوها او اَزرعوها او امسکوها (مسلم، بخاری، ابن ماجہ) ایسا نہ کرو یا تو خود زراعت کرو یا دوسروں کو زراعت کے لیے دے دو یا اپنی زمینوں سے دست بردار ہو جاؤ۔ حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت ہے۔ نهی رسول الله ﷺ عن کراء الارض (مسلم) رسول اللہ ﷺ نے زمین کرایے پر کاشت کرانے سے منع فرمایا۔

نهی رسول الله ﷺ ان یوخذ للارض اجرٌ وحظٌ (مسلم) رسول اللہ ﷺ نے زمین اجرت پر یا پیداوار کے کسی حصے پر کاشت کے لیے دینے سے منع فرمایا ہے۔

من کانت له ارض فلیزرعها فان لم یزرعها فلیزرعها اخاه (مسلم و ابن ماجہ) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے پاس کوئی زمین ہو تو اسے خود کاشت کرے اور اگر خود کاشت نہ کرتا ہو تو اپنے کسی بھائی کو دے دے کہ وہ کاشت کرے۔

ایک اور روایت ہے من کانت له فضل ارض فلیزرعها اخاه فان ابی فلیمسک ارضه (مسلم و ابن ماجہ) جس کے پاس خود کاشتی سے زائد زمین ہو تو کسی بھائی کو دے دے اور اگر زمین دینے پر آمادہ نہ ہو تو اس کو اپنی زمین چھوڑنی پڑے گی۔

ابن حبان (م ۹۶۵) نے اپنی مسند کے ساتھ لکھا ہے کہ عن جابر قال سمعت رسول الله ﷺ یقول من لم یذر المخابره فلیاذن بحرب من الله ورسوله قلت لجابر حدیث فی الصحیح غیر هذا. جابر سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص بٹائی پر کاشت کرانے سے باز نہیں آتا۔ پس وہ جان لے کہ اس کی اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی ہو گئی ہے۔ (ابوداؤد، سنن ابی داؤد مع حاشیہ عون المعبود جلد ۳ ص ۲۷۲ ۔ موارد الظمان الی زوائد لابن حبان ص ۲۷۷ حدیث ۱۱۳۴)

ینهی عن المزابنة المحاقلة (مسلم) رسول اللہ ﷺ نے کھجور کے بدلے ثمرہ بیچنے اور زمین کو کرایہ پر کاشت کرانے سے منع فرمایا۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ نهی عن المحاقلة والمزابنة یعنی رسول اللہ ﷺ نے کرایہ پر زمین دینے سے اور کھجور کے بدلے ثمرہ بیچنے سے منع فرمایا۔ (مسلم و ترمذی)

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے۔ نھی رسول اللّٰہ ﷺ عن المزابنة والمحاقلة (مسلم و ابن ماجہ) رسول اللہ ﷺ نے کھجور کے بدلے ثمرہ کی فروخت اور کرائے پر کاشت کرانے سے منع فرمایا۔ حماد بن مسلمة نا عمرو بن دینار قال سمعت عبداللّٰہ بن عمر بن الخطاب یقول نھی رسول اللّٰہ ﷺ عن کراء الارض حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زمین کو کرایہ پر دینے سے منع فرمایا۔

ثابت بن ضحاک سے روایت ہے۔ نھی عن المزارعة (مسلم) رسول اللہ ﷺ نے مزارعت سے منع فرمایا۔

زید بن ثابت سے روایت ہے۔ نھی رسول اللّٰہ ﷺ عن المخابرة قلت وما المخابرہ؟ قال ان تاخذ الارض بنصف او ثلث او ربع (ابو داؤد) رسول اللہ ﷺ نے مخابرہ سے منع فرمایا۔ راوی نے حضرت زید بن ثابت سے پوچھا کہ مخابرہ کیا ہے؟ حضرت زید نے جواب دیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم آدھی یا تہائی یا چوتھائی پیداوار کے عوض زمین لو۔

مذکورہ احادیث پر نظر دوڑانے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زمین کو کرایہ پر نہ دینے کے راوی بڑے قد آور اور ثقہ اور راسخ فی العلم ہیں ان کی روایات کو اتنی آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔

جواز مزارعت کی احادیث: عن ابن عمر ان رسول اللّٰہ ﷺ اعطی خیبر الیھود علی ان یعملوھا ویزرعوھا ولھم شطرھا خرج منھا (بخاری باب المزارعۃ) حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہود کو خیبر کی زمین اس شرط پر دی کہ وہ اس میں کاشت کریں جو پیداوار ہو وہ نصف بٹائی پر ہو۔

عن سعد بن ابی وقاص ان المزارع فی زمن النبی ﷺ کانوا یکرون مزرعھم (ابوداؤد و نسائی) حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ مالکان زمین نبی کریم ﷺ کے عہد میں اپنی زمینوں کو کرایہ پر دیا کرتے تھے۔

قیس بن مسلم کی روایت ہے کہ مدینہ کے مہاجرین کا ایک خاندان بھی نہیں تھا جو تیسرے یا چوتھے حصے کی بٹائی پر زراعت نہ کرتا تھا۔ حضرت علیؓ اور سعد بن مالک، عبداللہ بن سعود، عمر بن عبدالعزیز، قاسم، عروہ بن زبیر، حضرت ابوبکر، عمر اور علی کی اولاد اور ابن سیرین بٹائی پر زمینیں دیتے تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن اسود کہتے ہیں کہ میں عبدالرحمٰن بن یزید کے ساتھ مل کر یہ کام کیا کرتا تھا۔ (بخاری باب المزارع)

خالد یمنی، طاؤس کی زبانی یہ روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا حضرت معاذ گورنر مقرر ہو کر یمن آئے اور آپ زمین تیسرے یا چوتھے حصے پر بٹائی پر لوگوں کو دیا کرتے تھے۔ ہم بھی اسی طرح بٹائی پر لوگوں کو آج تک دیتے ہیں۔ (المبسوط ج ۳ کتاب المزارعۃ)

ابن ابی شیبہ کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا۔

لاباس بالمزارعة بالنصف (کنز العمال) نصف نصف کی بٹائی کر لینے پر کوئی حرج نہیں۔

حضرت ابوجعفر (امام محمد باقر) کی روایت ہے۔ کان ابوبکر یعطی الارض علی الشطر حضرت ابوبکر اپنی زمین نصف نصف کی بٹائی پر زراعت پر دیتے تھے۔

موسیٰ بن طلحہؓ کی روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ نے عبداللہ بن مسعود، عمارہ بن یاسر، خباب بن ارت اور سعدؓ بن مالک کو زمینیں عطا کی تھیں۔ ان میں سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور سعدؓ بن مالک اپنی زمینیں تہائی اور چوتھائی پیداوار کی بٹائی پر کاشت کے لیے دیتے تھے۔ (کتاب الخراج لابی یوسف)

تطبیق:۔ ان احادیث کے ظاہری تضاد اور تخالف کی وجہ سے فقہاء کے ایک گروہ نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ اسلام میں مزارعت قطعی ناجائز ہے اگر عدم جواز والی احادیث پر بنظر تعمق تفحص کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے مزارعت بالکل حرام قرار نہیں دی بلکہ مزارعت کی بعض صورتوں سے منع فرمایا وہ حسب ذیل ہیں۔

اوّل: بعض روایات جن میں مزارعت کو ناجائز قرار دیا ہے۔ وہ جاہلی دستور ہے۔ جس میں یہ طے کر لیا جاتا تھا کہ زمین کے فلاں حصہ کی پیداوار مالک کی ہوگی اور فلاں حصہ کی پیداوار کاشت کار کی۔ حضرت رافع بن خدیج کی روایت ہے۔ عن رافع بن خدیج قال حدثنی عمی انھم کانوا یکرون الارض علی عھد النبی ﷺ بما ینبت علی الاربعاء اوشی یستثنیه صاحب الارض فنھی النبی ﷺ من ذالک (کنز العمال) رافع بن خدیج سے روایت ہے کہ ہم سے ہمارے چچا نے فرمایا کہ وہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں زمین کو اس شرط پر کرایہ پر دیا کرتے تھے کہ نہر کے قریب زمین کی پیداوار ہماری ہوگی یا کوئی اور استثنائی شرط کر لیتے جب رسول کریم ﷺ کو علم ہوا تو آپ ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمادیا۔

مزارعت کا یہ جاہلی دستور اپنے ساتھ چند قباحتوں کا حامل تھا اس وجہ سے رسول کریم ﷺ نے اس طریقہ مزارعت سے منع فرمایا وہ قباحتیں حسب ذیل ہیں۔

(الف) اقتصادی معاملات باہمی تعاون کے اصول پر طے ہونے چاہئیں یہ معاملہ سراسر ظلم اور زیادتی پر محمول تھا ارشاد الٰہی ہے۔ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى یعنی نیکی اور تقویٰ پر تعاون ہونا چاہیے۔ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ گناہ اور زیادتی پر تعاون نہیں ہونا چاہیے۔ اس طرح رسول کریم ﷺ نے لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ یعنی نہ خود کو نقصان پہنچانا جائز ہے اور نہ کسی دوسرے کو۔
چونکہ یہ طریقہ مزارعت ایک فریق کی صریحاً حق تلفی پر مبنی تھا۔ اس وجہ سے رسول کریم ﷺ نے منع فرما دیا۔

(ب) یہ شرط باطل اور مقتضائے عقد کے خلاف تھی کیونکہ کاشتکار تمام زمین میں یکساں محنت کرتا تھا تو پھر اس کو ایک حصہ کی پیداوار سے کیوں محروم کر دیا جائے۔

(ج) یہ جوا کی ایک شکل ہے کیونکہ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ کس حصہ زمین میں پیداوار اچھی ہوگی یا کس میں خراب۔

(د) اس قسم کی شرائط سے عموماً جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں جو خاندانوں کی بربادی کا باعث بن جاتے ہیں۔

دوم: عدم جواز کی روایات اس بات پر محمول ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں بعض قیود اور شرائط کی وجہ سے بہت جھگڑے پیدا ہو گئے تو آپ نے مصلحتاً ایک خاص وقت کے لیے مزارعت کی بجائے زر نقدی پر زمین دینے کا ارشاد فرما دیا۔

حضرت زید بن ثابت کو جب یہ خبر پہنچی کہ رافع بن خدیج مزارعت سے منع کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا۔
''اللہ تعالیٰ رافع کی مغفرت کرے اللہ کی قسم میں اس حدیث کو ان سے بہتر سمجھتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں انصار کے دو شخص آئے ان کے درمیان مزارعت پر جھگڑا تھا اور نوبت ایک دوسرے کو قتل کرنے تک پہنچ گئی تھی۔ (قد اقتتلا) تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا ان کان شانکم فلا تکروا المزارع یعنی تمہاری یہ حالت ہے تو مزارعت کا معاملہ نہ کرو (ابوداؤد)

حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ زمیندار اپنی زمین اسی پیداوار کے بدلے جو نہروں کے قریب ہوتی تھی دیا کرتے تھے۔ وہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں آتے اور مزارعت کے بارہ میں جھگڑتے تو آپ ﷺ نے فرمایا اس شرط پر مزارعت نہ کیا کرو بلکہ سونا چاندی کے عوض دیا کرو۔ (سنن نسائی)

یہ روایت ظاہر کرتی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے مزارعت کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ محض جھگڑوں کی کثرت کی وجہ سے یہ فرما دیا کہ آئندہ مزارعت کی بجائے زر نقد پر زمین کرایہ پر دی جائے۔

دوسری اہم بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے یہ جواز ان لوگوں کے لیے جو محض زمین دار ہیں جو قطعہ ارض ان کے لیے ذریعہ معاش ہے یہ جواز جاگیرداری پر لاگو نہیں۔ بعض علماء نے مزارعت کے جواز کی روایات کو عمومیت کا رنگ دے کر جاگیرداروں کی مزارعت کو بھی جائز قرار دے دیتے ہیں جو سراسر اسلامی معیشت کی روح کے منافی ہے۔

جاگیرداری ختم کرنے کے لیے: بعض لوگوں کے پاس فالتو زمینیں تھیں اور معاشرہ میں محتاج اور ضرورت مند افراد بھی تھے جو دوسروں کی زمینیں مزارعت پر لیتے اور ان کی ضروریات پوری نہ ہوتیں تو رسول کریم ﷺ نے فالتو زمینوں کو مزارعت پر دینے سے منع فرمایا کیونکہ یہ بات اسلامی اخوت کے منافی تھی۔ ایک شخص تو گھر بیٹھے عیش و عشرت سے زندگی بسر کرے تو دوسرا شخص دن رات کام کرنے کے باوجود نانِ جویں کا محتاج ہو۔

رسول کریم ﷺ اور خلفاء راشدین کے عہد میں سب سے بڑا زمین دار گھرانا رافع بن خدیج کا تھا وہ اپنی فالتو زمینیں مزارعت پر صحابہ کرام کو دیتے تو رسول کریم ﷺ نے ممانعت فرما دی اور تاکید کر دی کہ اگر کسی کے پاس زمین ہو تو وہ خود کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو بغیر کسی معاوضے کے دے دے۔

حضرت رافع بن خدیج سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ ایک انصاری کی زمین پر گزرے وہ اپنی مفلسی کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا زمین کس کی ہے اس نے بتایا کہ یہ فلاں شخص کی ہے اس نے مجھے اجرت پر دی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کاش وہ اپنے بھائی کو بلا عوض دے دیتا۔ حضرت رافع اپنے اہل قبیلہ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ رسول کریم ﷺ نے تمھیں ایک ایسی چیز سے روک دیا ہے جو تمھارے لیے نفع بخش ہے اور رسول کریم ﷺ کے فرمان کی تعمیل اس سے بھی زیادہ نافع ہے۔ (سنن نسائی)

رسول کریم ﷺ نے یہ ممانعت اس شخص کے لیے کی ہے جس کے پاس فالتو زمین ہے اور خود کاشت کاری سے بچی ہوئی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی احادیث عدم جواز پر بحث کرتے ہوئے نہایت اختصار کے ساتھ مندرجہ بالا تینوں امور کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔

صحابہ کے بعد اکابرین تابعین مزارعت کا معاملہ کرتے تھے۔ مزارعت کے جواز کی دلیل اہل خیبر سے معاملہ کی حدیث ہے اور مزارعت کی ممانعت کی احادیث یا تو ایسی مزارعت پر محمول ہیں۔ جن میں نہروں کے کناروں کی پیداوار یا کسی معین قطعہ کی پیداوار طے کر لی جائے جیسا کہ رافع نے فرمایا یا تنزیہہ و ارشاد پر جیسا کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا یا اس پر محمول ہیں کہ مزارعت کی وجہ سے کثرت مناقشات پیدا ہو گئے تھے اس مصلحت کی بناء پر اس سے روک دیا گیا جیسا کہ زید نے بیان فرمایا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

مساقات

مساقات، عربی سہ حرفی مادہ سقی سے مشتق ہے جس کا مطلب پلانا ہے۔ لفظ مساقات باب مفاعلہ ہے۔ یہ باب دو افراد کے لین دین یا مشارکت کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی پانی کی بہم رسانی کے لیے دو افراد کے درمیان کوئی معاملہ طے کرنے کا نام ہے۔ مساقات کے مفہوم میں لفظ استجار میں صرف پانی دینا ہی شامل نہیں بلکہ ان کی دیکھ بھال، کانٹ چھانٹ جڑی بوٹیوں کا اتلاف وغیرہ بھی شامل ہے۔

ہدایہ میں مساقات کی تعریف یہ ہے۔ ھی المعاملة فی الاستجار (الہدایہ کتاب المساقات مرغینانی)

عبدالرحمٰن جزیری نے کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں ان الفاظ میں تعریف کی ہے۔ المساقاة ھی ان یعامل شخص یملک نخلا او عنبًا شخصاً اخر علی ان یباشر ثانیھما النخل او العنب باسقی والتربیة والحفظ ونحو ذالک وله فی نظر عمله جز معین من الثمر الذی یخرج منه و للولی ان ینوب عن الملک القاصر فی ذالک (جلد سوم) یعنی مساقات سے مراد یہ ہے کہ کھجور کے درختوں یا انگور کے باغات کا مالک کسی دوسرے شخص کو دے کہ وہ انھیں سیراب کرے ان کی پرورش کرے حفاظت کرے اور اس قسم کے کام پر لگائے۔ جس کے عوض اسے پھلوں میں سے ایک مقررہ حصہ ملے اور اگر درختوں یا باغات کا مالک اس میں کوتاہی کرے تو اس کا ولی معاہدہ پورا کرے۔

حنبلی فقہاء نے یہ تعریف کی ہے۔

دفع ارض و شجر له ثمر ماکول (کشاف القناع ج ۳ ص ۵۲۳ بہوتی) زمین اور کھائے جانے والے پھل دار درخت (بغرض مساقات) کسی کو دینا۔

مالکی مکتبہ فکر ان الفاظ میں تعریف کرتا ہے۔

ھی عقد علی خدمة شجر وما الحق به بجزء من غلة او بجمیعھا بصیغة و مناسبتھا للقراض ظاھرہ (باب المساقات دسوقی)

مولانا امجد علی بہار شریعت میں ان الفاظ میں تعریف کرتے ہیں۔

باغ یا درخت کسی کو اس لیے دینا کہ اس کی خدمت کرے اور جو کچھ اس سے پیداوار ہوگی اس کا ایک حصہ کام کرنے والے اور ایک حصہ مالک کو دیا جائے گا اس کو مساقات کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا معاملہ بھی ہے۔ (حصہ یازدہم ص ۵۶۳)

مساقات کی شرعی حیثیت: مسئلہ مزارعت کی طرح مساقات کے جواز اور عدم جواز پر علماء اور فقہاء کا اختلاف ہے۔ مساقات کو جائز قرار دینے والوں میں حنفاء متقدمین میں سے امام محمد اور ابو یوسف ہیں۔ اس طرح تینوں ائمہ امام مالک امام شافعی اور امام احمد بھی مساقات کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ان سب کی دلیل وہی ہے جو مزارعت کو جائز قرار دینے میں دیتے ہیں جس کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے اہل خیبر کے ساتھ زمین کا معاملہ نصف پیداوار پر کیا۔ جس میں زرعی اور پھل دونوں شامل تھے۔ عن ابن عمر قال اعطی رسول اللہ ﷺ خیبر بشطر مایخرج من ثمر او زرع (مسلم) اس طرح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ انصار مدینہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمارے کھجور کے باغات اور ہمارے درمیان تقسیم کر دیجئے۔ آپ ﷺ نے انکار کیا پھر انھوں نے کہا کہ وہ محنت کریں اور پھل میں دونوں شریک ہوں۔ اس صورت کو آپ نے منظور فرمایا۔ (بخاری)

ان احادیث سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے حضرت امام ابو یوسف اپنی کتاب ''کتاب الخراج'' میں لکھتے ہیں۔

''میرے علم و اطلاع کی حد تک بہترین مسلک یہی ہے کہ یہ طریقہ درست اور جائز ہے ہم نے ان احادیث کی پیروی کی ہے جو خیبر کی مساقات کے سلسلہ میں رسول کریم ﷺ سے مروی ہیں کیونکہ جو حدیثیں ان کے خلاف پائی جاتی ہیں ان سے یہ احادیث ہماری نظر میں زیادہ قابل اعتماد زیادہ عموم کی

حال اور تعداد میں زیادہ ہیں۔ (ص ۳۱۳) عدم جواز قرار دینے والے فقہاء میں امام ابوحنیفہ ہیں جو باغات اور نخلستانوں میں تہائی یا چوتھائی یا کم وبیش پر اس طرح کا معاملہ کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے اور اس کی بنیاد حضرت رافع کی حدیث کو ٹھہرایا ہے۔

خاکسار نے مزارعت پر بحث کرتے ہوئے دونوں بظاہر متناقض احادیث میں تطبیق دیتے ہوئے لکھا تھا کہ جاگیرداری مزارعت ناجائز ہے۔ جہاں مزارع کا استحصال ہو رہا ہوتا ہے۔ جاگیردار کسلانہ اور تعیشانہ زندگی کا عادی ہو جاتا ہے جس سے معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے پھر یہ دیکھنا بھی پڑتا ہے کہ جاگیر کہاں سے ملی لیکن جو مزارعت تھوڑی ہو۔ مجبوری کی وجہ سے دی جا رہی ہو وہ اس ضمن میں نہیں آتی۔ مساقات بھی مزارعت کی ایک شکل ہے۔ اس لیے مساقات کو اسی شکل میں دیکھنا ہوگا۔ لہٰذا مساقات کے جواز اور عدم جواز کو بھی مزارعت کے جواز اور عدم جواز پر منطبق کرنا ہوگا۔ جس وجہ سے مزارعت کو بعض فقہاء نے ناجائز قرار دیا ہے اسی سبب سے مساقات کو بھی ناجائز قرار دیا ہے۔

اور جن فقہاء نے مزارعت کو جائز قرار دیا ہے اسی سبب سے مساقات کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

لہٰذا جن فقہاء نے مساقات کو جائز قرار دیا ہے۔ اس کی علت اور ہے اور جن فقہاء نے ناجائز قرار دیا ہے۔ اس کی علت اور ہے۔ لہٰذا دونوں فقہاء نے جائز اور ناجائز ہونے کے فتاویٰ مختلف علتوں اور مختلف حالتوں کی بناء پر مختلف دیے ہیں۔

حنفاء، مالکیوں اور حنبلیوں کی کتب میں مختلف احکام درج ہیں۔ قارئین کے فائدے کے لیے چند احکام درج کیے جاتے ہیں مزید معلومات کے لیے کتب فقہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

۱۔ عاقدین بالغ عاقل ہوں۔

۲۔ جو پیداوار ہو وہ دونوں میں مشترک ہو اور اگر فقط ایک کے لیے پیداوار مخصوص کر دی گئی تو عقد فاسد ہے۔

۳۔ ہر ایک کا حصہ مشاع ہو۔ جس کی مقدار معلوم ہو مثلاً نصف یا تہائی یا چوتھائی۔

۴۔ باغ یا درخت عامل کو سپرد کر دینا۔ یعنی مالک کا قبضہ اس پر نہ رہے۔

۵۔ جو درخت مساقاۃ کے طور پر دیے گئے وہ ایسے ہوں کہ عامل کے کام کرنے سے پھل میں نشوونما ہو سکے۔ لیکن اگر پھل تیار ہو چکے ہوں اور صرف انہیں توڑنا باقی ہو تو معاملہ درست نہیں کیونکہ اس وقت پھلوں کو پانی کی ضرورت نہیں۔

۶۔ ضروری ہے ان درختوں اور پودوں کو پانی کی ضرورت ہو۔ اگر پانی کی ضرورت نہیں تو یہ مساقات نہیں کیونکہ مساقات کا مطلب ہی پانی دینا ہے۔

۷۔ زمین میں ایک سال یا اس سے کم عرصے تک رہنے والی سبزیوں اور پھلوں کے بارے مساقات درست ہے بشرطیکہ وہ پہلے سے کاشت شدہ ہوں۔

۸۔ زمین پر ایک سال یا اس سے زائد عرصہ تک رہ کر پیداوار پودوں اور درختوں پر مساقات کا معاملہ درست ہے۔

۹۔ معاملہ مساقات کے لیے ضروری ہے کہ پیڑ تناور ہوں اور معاملہ کرتے وقت پھل آنا متوقع ہو یا ابھی بھور آیا ہو۔ اگر پیڑ اتنا چھوٹا ہو اس پر پھل آنے میں کئی سال درکار ہیں تو معاملہ مساقات درست نہیں۔

۱۰۔ حنابلہ صرف ان پھلوں اور سبزیوں کی مساقات کو جائز قرار دیتے ہیں جو کھائے جاتے ہیں۔ لیکن ایسے درخت جو خود مال متقوم ہوتے ہیں ان کا معاملہ مساقات جائز نہیں۔

۱۱۔ پھل پختہ ہونے سے قبل اگر مدت معاملہ ختم ہو جائے تو اس کا اعتبار نہ ہوگا۔ کیونکہ اصل اعتبار پھل کی پختگی ہے کیونکہ اس سے عامل کی محنت رائیگاں باقی ہے۔ جو عامل کے لیے باعث نقصان ہے۔ یہ شریعت کی روح کے منافی ہے۔

۱۲۔ مساقات کا معاملہ طے ہونے کے بعد اگر باغ کا مالک کوئی اور نکل آیا تو جس سے معاملہ کیا ہے۔ اس کو اتنے دن کی جتنے دن کام کیا ہے اجرت دینا پڑے گی۔

۱۳۔ معاملہ طے ہو جانے کے بعد فریقین میں سے کوئی معاہدہ سے روگردانی کرے تو قانونی چارہ جوئی کی جائے۔

بڑی بڑی صنعتیں

اسلام کے اقتصادی نظام کا بنیادی اصول اجتماعی مصالح پر ہے اگر کوئی کاروبار یا صنعت رفاہ عامہ اور اجتماعی حیات کو مجروح کرنے والا ہو تو اسلامی فقہ کے اصول ''استحسان'' کی رو سے اسلامی حکومت پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ وہ اصلاح حال کے لیے اس کاروبار پر ایسی قیود عائد کرے جن سے اس کاروبار یا صنعت کا

منافع صرف صنعت کاروں کی جیب میں ہی نہ جائے بلکہ عوام بھی اس سے مستفید ہوں۔
صنعت پر ایسے فلاحی ٹیکس لگائے جائیں جن سے عوام کی فلاح و بہبود ہو سکے اور معاشرہ میں طبقاتی تقسیم ختم ہو جائے۔

رکاز: جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ کان سے جو کچھ نکلتا ہے اس کا ۴/۵ حصہ نکالنے والے کی ملک ہوگا اور ۱/۵ حصہ زکوۃ۔ لیکن یہ شرط ضروری ہے کہ وہ دفینہ اسلامی دور سے پہلے کا ہو۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج اص ۶۱۲، ۶۱۳) جن دفینوں پر اسلامی حکومت کی علامت پائی جائے تو وہ لقطہ قرار پائے گا تو اس کو بیت المال میں داخل کیا جائے گا۔ رکاز سے مراد صرف وہ دفینہ مراد ہے جس کا تعلق اجتماعی حیات کی ضروریات سے نہ ہو۔ مثلاً سکے، سونے چاندی کے برتن اسلحہ اور دوسری قیمتی اشیاء، اگر وہ دفینہ ایسی چیزوں پر مشتمل ہے جو افادہ عامہ کے لیے ضروری ہیں اور جن پر انفرادی ملکیت ہو جانے کی وجہ سے افراد تنگی اور تکلیف اٹھائیں ان کو حکومت اپنے قبضہ میں لے گی۔ اس پر تفصیلاً بحث ریاست کی اجتماعی ملکیت کے عنوان کے تحت ہوگی۔

تسعیر: اسلام عام حالات میں تاجروں کے حق میں کوئی مداخلت نہیں کرتا وہ اشیاء کو جس نرخ پر چاہیں بیچیں۔ تاکہ بازار میں رسد اور طلب کا توازن برقرار رہے۔ ہاں اگر تاجر نفع کے حصول کے لیے احتکار شروع کر دیں یا بازار میں رسد کم کرنے کی خاطر مصنوعات کا کچھ حصہ ضائع کر دیں۔ اس طرح رسد اور طلب کا توازن برباد ہو جائے تو اس وقت حکومت کا فرض ہے کہ وہ قیمتیں مقرر کر دے۔

لایسعر حاکم الا اذا تعدی الارباب عن القیمة تعدیا فاحشا فیسعر بمشورة اهل الرای. یعنی حاکم اس وقت تک نرخ مقرر نہ کرے جب تک ارباب نرخ (تاجر) قیمتوں کو بڑھانا شروع نہ کر دیں۔ اس وقت حاکم اہل رائے کے مشورہ سے نرخ مقرر کر دے۔

حضرت امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔
''جب عوام الناس کی ضرورت قیمتوں کی منصفانہ تعین کے بغیر پوری نہ ہو سکتی ہو تو ان کے لیے ایسی قیمتیں مقرر کر دی جائیں گی جو عدل و انصاف پر مبنی ہوں۔ بغیر کسی کی یا زیادتی کے۔'' (درالمختار مع الشامی ج ۵ باب الحظر والاباحۃ)

صاحب ہدایہ کہتے ہیں۔
''سلطان کے لیے مناسب نہیں کہ لوگوں کو متعین قیمتوں کا پابند بنائے نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''قیمت نہ مقرر کرو کیونکہ اللہ ہی قیمت مقرر کرنے والا تنگی پیدا کرنے والا فراخی پیدا کرنے والا رزق عطا کرنے والا ہے۔'' اور اس لیے کہ قیمت (بتانا) عقد بیع کرنے والے کا حق ہے لہٰذا اس کی تعین وہی کر سکتا ہے۔ پس امام کو اس کے حق میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ بجز اس صورت حال کے جبکہ ضرر عامہ کا دفعیہ اس کا متقاضی ہو۔''

بعض علماء کا یہ نظریہ ہے کہ ایک موقعہ پر صحابہ نے رسول کریم ﷺ سے نرخ مقرر کرنے کی درخواست کی تو آپ نے انکار فرمایا۔ اس وجہ سے تسعیر ہر حالت میں ناجائز ہے۔

اصاب الناس سنة فقالوا یارسول اللّٰہ سعرلنا قال لا یسئلنی اللّٰہ عن سنة احدثتها علیکم لایامرنی بها ولکن سلو اللّٰہ من فضله. (الحسبۃ فی الاسلام ص ۷)

لوگ قحط کا شکار ہو گئے تو انھوں نے کہا اے اللہ کے رسول ہمارے لیے نرخ مقرر کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا نہیں اللہ مجھ سے ایسے طریقے کے متعلق پوچھے گا جس کا اس نے مجھے حکم نہ دیا ہو اور میں اپنی طرف سے گھڑ لوں بلکہ تم اللہ کے فضل کے لیے دعا مانگو۔

عن انس قال قال الناس یارسول اللّٰہ غلا السعر سعرلنا فقال رسول اللّٰہ ﷺ ان اللّٰہ هو المسعر القابض الباسط الرازق وانی لارجو ان القی اللّٰہ ولیس احد منکم یطالبنی بمظلمة فی دم ولامال. (جامع ترمذی۔ ابوداؤد کتاب البیوع فی منع الماء، سنن ابن ماجہ۔ مسند دارمی)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ لوگوں نے یہ کہا یارسول اللہ (نرخ گراں ہو گئے ہیں) آپ ہمارے لیے نرخ مقرر کر دیجئے تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ ہی نرخ مقرر کرنے والا، تنگی پیدا کرنے والا، فراخی پیدا کرنے والا اور رزق عطا کرنے والا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ خدا کے سامنے اس حال میں حاضر ہوں کہ تم میں سے کوئی مجھ سے کسی ظلم کا بدلہ طلب کرنے والا نہ ہو جو جان یا مال کے بارے میں لیا گیا ہو۔

یہ اس زمانہ کی احادیث ہیں جب مدینہ میں قحط پڑا تھا اور گرانی کی وجہ یہ تھی کہ غلہ مدینہ میں باہر سے گراں نرخ پر آتا تھا۔ جب غلہ ہی مہنگے داموں تاجر خرید کریں تو ان کو سستے داموں فروخت کرنے کے لیے مجبور کرنا ان پر ظلم ہے۔ اس لیے رسول کریم ﷺ نے نرخ مقرر کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان حالات میں قیمتیں مقرر کرنا صرف تاجروں کے لیے ہی نقصان دہ نہیں بلکہ عوام کے لیے بھی مضر تھیں۔

ان احادیث سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ کسی حالت میں بھی نرخ مقرر نہیں کیے جا سکتے۔
اگر تاجر جائز نفع کی حدود پھاند کر مہنگی چیزیں فروخت کرنا شروع کر دیں تو حکومت مفاد عامہ کے پیش نظر اشیاء کی قیمتیں مقرر کر سکتی ہیں۔

قرآن اور سرمایہ داری

قرآن مجید میں دولت و ثروت کو مدح اور ذم دو صورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ مقام مدح کے لیے مختلف الفاظ مثلاً فضل[1]، حسنہ[2]، طیبہ[3]، زینت[4] اور ذریعہ[5] قیام استعمال کیے ہیں۔ اس کے برعکس مقام ذم کے لیے، متاع[6] الغرور اور فتنہ[7] کے الفاظ، جہاں اللہ تعالیٰ نے دولت کو اچھے رنگ میں بیان کیا ہے۔ وہ دولت ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق کمایا ہے اور اسی کے احکام کے مطابق خرچ کیا ہے۔ اور جس دولت کو ذم کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے وہ ہے جس کا نہ اکتساب احکام خداوندی کے مطابق ہے اور نہ صَرف یہاں اس دولت کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اپنے اندر ذم کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ یہی وہ دولت ہے۔ جو معاشرہ میں فساد کا موجب ہے اسی ذریعہ فساد کو مٹانے کے لیے مختلف زمانوں میں انبیاء علیہم السلام آئے۔ سرمایہ داروں نے ان کی مخالفت کی۔

قرآن مجید نے دولت کے حقوق نہ ادا کرنے والے سرمایہ داروں کے لیے اَلْمَلَاءُ[8] اور مترفین کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

یہی وہ سرمایہ دار ہیں جن کے لیے دولت باعث متاع الغرور اور فتنہ ہے۔

چنانچہ ان انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا جاتا ہے جنھوں نے روحانی معاشرتی انقلاب برپا کرنے کے ساتھ معاشی ناہمواریوں کو دور کر کے اقتصادی انقلاب کا دروازہ کھولا۔

جب دنیا میں اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کی تخلیق کی۔ تو ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے کہا یٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۳۵:۲) اے آدم تو اور تیری بیوی جنت میں رہو اور اس میں سے بافراغت کھاؤ جہاں سے چاہو۔

اس آیت کریمہ میں آدم اور ان کی بیوی کو نسل انسانی کا قائم قرار دے کر یہ وعدہ کیا ہے ان کی جسمانی ضروریات کے لیے بافراغت سامان مہیا کر دیا گیا ہے اس سے استفادہ کریں۔

دوسری جگہ حضرت آدم سے فرمایا اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (طٰهٰ ۱۱۸، ۱۱۹) اے آدم تو اس (زمین) میں نہ بھوکا رہے گا اور نہ ننگا نہ پیاسا رہے گا اور نہ ہی دھوپ میں۔

۱۔ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (۱۶:۱۴)

۲۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ. (۲:۲۰۱)

۳۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ. (۲:۱۷۲)

۴۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ. (۷:۳۱)

۵۔ اَلَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا (۴:۵)

۶۔ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ. (۳:۱۸۵)

۷۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۸:۲۸)

۸۔ اَلْمَلَاءُ. مَلَاَ يَمْلَاُ. مَلْاً کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کو بھر دینا اس لحاظ سے اُلْمَلَا ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کی تجوریاں مال و دولت سے بھری ہوئی ہیں لیکن مصالح عامہ کے لیے خرچ نہیں کرتے۔
مترفین وہ لوگ جو عیش و آرام سے زندگی گزارتے ہیں اور ان کے دلوں سے یاد خدا نکل چکی ہے۔

گویا اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں نسل انسانی کے لیے روٹی کپڑا مکان مہیا کر دیا ہے اور اس سے استفادہ کرے۔ جوں جوں نسل انسانی بڑھتی چلی گئی۔ طاقت وروں نے وسائل پیدائش پر قبضہ کرنا شروع کر دیا اور کمزوروں کو محروم کر دیا گیا۔ اس طرح معاشرہ میں معاشی ناہمواریاں پیدا ہوگئیں اور طبقاتی کشمکش شروع ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے معاشرہ کو پرامن بنانے کے لیے انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے۔ جہاں انھوں نے معاشرہ کی روحانی اور معاشرتی اصلاح کے لیے انقلابی تعلیم دی وہاں معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے کے لیے بھی اصلاحی پروگرام دیا۔ ان انبیاء علیہم السلام میں سے حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ اس دور میں جہاں روحانی معاشرتی برائیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ وہاں معاشی ناانصافیوں کی وجہ سے معاشرہ دوطبقوں سرمایہ دار اور ضعفاء میں بٹ چکا تھا۔ جب حضرت نوح علیہ السلام نے سرمایہ داروں کو ان کی اقتصادی بے اعتدالیوں اور ناانصافیوں اور ظلم و جور سے آگاہ کیا تو انھوں نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا۔ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (سورہ اعراف ۶۰) اس کی قوم کے سرداروں نے کہا ہم یقیناً تجھ کو کھلی گمراہی میں دیکھتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی اصلاحی دعوت پر معاشرہ کے کمزور اور پسے ہوئے لوگوں نے لبیک کہا اور اصلاحی دعوت کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے وعدہ کیا تو بھرے ہوئے سرمایہ دار کب کمزوروں کو عزت کے مقام پر دیکھنا پسند کرتے تھے۔ حضرت نوح سے کہا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ (ہود ۱۱:۲۷) اور ہم نہیں دیکھتے کہ تیری پیروی ان لوگوں نے کی ہے جو ہم میں سے نیچ ہیں اور وہ بھی سرسری نظر سے۔ یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے دور میں معاشرہ دوطبقوں امراء اور ضعفاء میں بٹ چکا تھا۔ جب اصلاحی تحریک پھیلنے لگی ضعفاء حضرت نوح علیہ السلام کے گرد جمع ہونا شروع ہوئے تو سرمایہ داروں نے ضعفاء کے اکٹھ کو اپنے لیے کچھ خطرہ محسوس کرنا شروع کیا تو حضرت نوح علیہ السلام کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ تم اپنے پاس سے ان اراذل اور دھتکارے ہوئے لوگوں کو نکال دے تو حضرت نوح علیہ السلام نے جواب دیا وَمَا اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ (ہود ۱۱:۲۹) میں انھیں نکال نہیں سکتا جو ایمان لائے ہیں وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں میں تمھیں ایک جاہل قوم دیکھتا ہوں۔

سورہ شعراء میں آتا ہے قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَ اتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ (شعراء ۱۱۱) سرمایہ داروں نے کہا کیا ہم تم پر ایمان لائیں اور تیری پیروی کرنے والے رذیل لوگ ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام اس طبقاتی تقسیم کے خلاف تھے۔ اس معاشرہ کو اونچ نیچ سے پاک کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سرمایہ داروں کو ناگوار گزرا اور حضرت نوح علیہ السلام کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ اور آپ نے ان کو بڑا سمجھایا کہ اپنے رویہ میں اصلاح کریں۔ حق کو مانیں غرباء کا حق ادا کریں۔ خط امتیاز کو ختم کریں۔ اپنے سرمایہ کے زعم پر حضرت نوح علیہ السلام سے کہا اے نوح! تو ہم سے جھگڑا۔ اور جھگڑا کافی طول پکڑ گیا ہے۔ جس عذاب کا تو وعدہ دیتا ہے وہ لے آ اگر تو سچوں میں سے ہے۔ (ہود: ۳۲)

حضرت نوح علیہ السلام نے خدا سے دعا کی آخرکار طوفان کی شکل میں عذاب آیا۔ سرمایہ دار پانی کی لہروں کی نذر ہو گئے اور ضعفاء حضرت نوح کے ساتھ کشتی میں سوار ہو جانے کی وجہ سے بچ گئے۔

حضرت ہود علیہ السلام: حضرت ہود علیہ السلام کے دور میں بھی معاشرہ جہاں روحانی اور معاشرتی امراض میں مبتلا تھا وہاں معاشی لحاظ سے بھی۔ معاشرہ دوطبقوں میں تقسیم تھا۔ سرمایہ داروں کی ٹھاٹ بھاٹ اور کروفر اور عالی شان محلات کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ (الفجر ۸۹:۸،۹) (عاد ارم بلند عمارتوں والے کے ساتھ جن کی مثل شہروں میں پیدا نہ ہوئے تھے۔)

حضرت ہود علیہ السلام نے غرباء کے حقوق پامال کرنے اور عالی شان عمارتوں میں رہائش پذیر ہونے پر کڑی تنقید کی۔ فرمایا اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِیْعٍ اٰیَةً تَعْبَثُوْنَ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ (الشعراء ۲۶، ۱۲۸......۱۳۰) کیا تم ہر اونچی جگہ یادگاریں بناتے ہو کہ شاید تم ہمیشہ رہو اور جب تم کسی کو پکڑتے ہو تو سختی سے پکڑتے ہو سو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔

اس آیت کریمہ میں سرمایہ داروں کی دو برائیوں کا ذکر کیا ایک تو اپنی کروفر اور شان و شوکت کے اظہار کے لیے اونچی جگہوں پر عالی شان عمارتیں بناتے اس کام میں اسراف پایا جاتا ہے دوم الفاظ بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ میں ان غرباء پر ظلم و ستم کا اظہار کیا گیا ہے۔

حضرت ہود نے ان کو خدا کی گرفت سے ڈرایا کہ اپنی دولت کی وجہ سے اس گھمنڈ میں نہ پڑو کہ کوئی بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن حضرت ہود کی بات کی طرف توجہ نہ کی بلکہ یہ کہا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ (الشعراء ۲۶: ۱۳۸) کہ ہمیں کوئی تکلیف نہیں دے سکتا۔ خود ہی اس کی وجہ بتا دی۔ قَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (حٰم السجدہ ۱۵) ہم سے بڑھ کر کون قوت ور ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ جب تکبر کی وجہ سے کوئی شخص خدا کی صفت کبریائی میں اپنے آپ کو شامل کر لیتا

ہے تو وہ خدا کی گرفت میں آ جاتا ہے اللہ کی اس سنت کی وجہ سے قوم ہود پکڑی گئی۔ اس کا حال یہ ہے تُدَمِّرُ کُلَّ شَیْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا یُرٰی اِلَّا مَسٰکِنُهُمْ کَذٰلِکَ نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ (الاحقاف ۴۶:۲۵) اپنے رب کے حکم سے ہر چیز تباہ و برباد ہوگئی سو وہ ایسے ہو گئے سوائے ان کے مکانوں کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اس طرح ہم مجرم کو بدلہ دیتے ہیں۔

قوم عاد کی تباہی و بربادی کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَفِی عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ مَاتَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ کَالرَّمِیْمِ (ذاریات ۵۱:۴۱،۴۲) اور عاد (اللہ کی تباہی کا نشان بن گئی) جب ہم نے ان پر تباہ کرنے والی ہوا بھیجی وہ کسی کو نہ چھوڑتی تھی جس پر آتی تھی مگر اسے چورا چورا کر دیتی۔

یہ ہے اس قوم کا برا انجام جو اپنی امارت کے نشہ میں نبی کے انتباہ کی کوئی پرواہ نہیں کرتی اور غرباء پر ظلم کرنے سے باز نہ آتی اور دولت میں تکاثر کی وجہ سے غرباء کا خون چوستی تھی۔

<u>حضرت صالح علیہ السلام:</u> حضرت صالح علیہ السلام قوم ثمود کی طرف مبعوث ہوئے تھے یہ لوگ عرب کے شمال ومشرقی حصہ میں جو مدینہ اور شام کے درمیان واقع ہے آباد تھی۔ اس قوم میں سرمایہ داری نظام رائج تھا جس وجہ سے مرفہ الحال تھی۔ قوم ثمود کا ایک طبقہ نادار تھا۔ اس طرح معاشرہ میں طبقاتی تقسیم تھی۔ اور حضرت صالح علیہ السلام نے قوم ثمود کی دیگر روحانی اور معاشرتی امراض سے آگاہ کیا وہاں ان کے نظام سرمایہ داری پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا وَبَوَّاَکُمْ فِی الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْراً وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُیُوْتًا فَاذْکُرُوْا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ (الاعراف ۷:۷۴) اور تمھیں زمین میں ٹھکانہ دیا تم میدانوں میں محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر کوٹھیاں بناتے ہو۔ سو اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد کرتے ہوئے مت پھرو اللہ تعالیٰ نے معاشرہ میں تفرقہ اور طبقاتی تقسیم کرنے والی سرمایہ داری کو موجب فساد قرار دیا ہے۔

غریب طبقے نے حضرت صالح کے پیغام میں اپنی حیات سمجھی اپنا نجات دہندہ خیال کیا ان پر وہ ایمان لے آئے۔ جب ایمان لانے والوں میں اضافہ ہونا شروع ہوا تو غرباء کو ورغلانے اور ایمان لانے سے روکنے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی۔ وہ ایمان لانے والے غریب لوگوں کے پاس جاتے اور ان سے کہتے۔ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (اعراف ۷:۷۵) سرمایہ داروں نے جنھوں نے اس کی قوم سے تکبر کیا۔ ان سے جو کمزور تھے جو ان میں سے ایمان لائے کہا کیا تم جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کی طرف سے بھیجا گیا ہے بولے جو کچھ اسے دے کر بھیجا گیا ہے اس پر ایمان لانے والے ہیں۔

غرباء نے سرداروں سے واضح الفاظ میں یہ جواب دیا۔ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ (الاعراف ۷:۷۵) انھوں نے کہا کہ ہم حضرت صالح کے پیغام پر ایمان لا چکے ہیں۔

جب سرمایہ دار غرباء کو ایمان لانے سے نہ روک سکے تو انھوں نے حضرت صالح علیہ السلام کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ لیکن وہ اپنے منصوبہ میں ناکام ہو گئے۔ آخر کار طوعاً و کرھا حضرت صالح کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا۔[1] حضرت صالح سے پوچھا تم کیا چاہتے ہو آپ نے فرمایا کہ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم وسائل، پیداوار پر اپنی اجارہ داری ختم کر دو۔ وہ ضعفاء کی مضبوط جتھہ بندی اور طاقت کی وجہ سے حضرت صالح کی بات تسلیم کرنے پر آمادہ ہو گئے تو حضرت صالح نے نشانی کے طور پر کہا کہ "یہ اللہ کی اونٹنی ہے جو تمھارے لیے ایک نشانی ہے یہ اللہ کی زمین میں کھائے پیے اسے کھلا چھوڑ دو اس کو بدنیتی سے ہاتھ نہ لگانا۔ ورنہ تم اللہ کی گرفت میں آ جاؤ گے۔" (الاعراف ۷:۷۳)

اس آیت کریمہ میں نہایت بلیغ انداز میں یہ سمجھایا ہے کہ زمین اللہ کی ہے اس پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے جب حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی چراگاہ اور چشموں میں آنے جانے لگی تو یہ سرمایہ داروں کے مزاج کے خلاف تھا کہ دوسروں کے جانور ان کی چراگاہوں اور چشموں میں چرتے پھریں۔ چنانچہ حضرت صالح کی اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں تو خدا کا غضب بھڑکا۔ تو قوم ثمود کو تباہ و برباد کر دیا۔ ارشاد الٰہی اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ صَیْحَةً وَّاحِدَةً فَکَانُوْا کَهَشِیْمِ الْمُحْتَظِرِ (القمر:۳۱) ہم نے ان پر ایک ہی آواز بھیجی تو وہ اس طرح ہو گئے جیسے ایک باڑ لگانے والے کی روندی ہوئی باڑ ہوتی ہے۔

---

[1] معلوم ہوتا ہے حضرت صالح پر ایمان لانے والے غرباء کی اتنی طاقت بڑھ چکی تھی۔ اس وجہ سے قتل کے منصوبے میں ناکام رہے اور صلح کا ہاتھ بڑھانا پڑا۔

حضرت شعیب علیہ السلام: حضرت شعیب قوم مدین کی ہدایت (روحانی، معاشرتی اور معاشی) کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔ مدین عرب کے شمال و مغربی حصہ میں ایک شہر ہے۔ یہ قوم بھی معاشی لحاظ سے دو طبقوں میں منقسم تھی۔ سرمایہ دار طبقہ غرباء کو مختلف طریقوں سے لوٹتا تھا۔ ایک طریقہ ناپ تول کم کر دینا تھا۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے سرمایہ دار تجار کو اس تجارتی بددیانتی سے روکا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا. (الاعراف ۷:۸۵) سو ماپ اور تول کو پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ کرو۔

اس آیت کریمہ میں تجارتی بددیانتی یعنی ماپ اور تول کم دینے کو فساد فی الارض قرار دیا ہے۔

سرمایہ دار طبقے نے اس خیر خواہانہ نصیحت اور امر نہی کو اپنے مفادات اور تصرف فی التجارۃ میں آزادی کے خلاف سمجھا اور مخالفت پر تل گئے اور حضرت شعیب کو کہا۔ يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ (ہود ۱۱:۸۷) انھوں نے کہا۔ اے شعیب کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم اسے چھوڑ دیں جس کی عبادت ہمارے ابا و اجداد کرتے تھے یا اپنے مالوں میں جس طرح چاہیں نہ کریں بے شک تو بڑا بردبار اور سیدھی راہ پر چلنے والا ہے۔

آیت کے آخری الفاظ ''حلیم'' اور ''رشید'' طنزیہ ہیں کہ تو اپنے آپ کو غربا کا ہمدرد قرار دے کر باوقار، بردبار اور سیدھی راہ دکھانے والا خیال کرتا ہے۔ حقیقت میں یہ ہماری معاشی آزادی پر ڈاکہ ہے اس لیے سرمایہ داروں نے حضرت شعیب کو دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا (اعراف ۷:۸۸) قوم کے متکبر سرمایہ دار لوگوں نے کہا۔ اے شعیب ہم تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو اپنے شہر سے نکال دیں گے (اگر تم شہر بدر ہونا نہیں چاہتے) تو پھر تمھیں ہمارے مذہب کی طرف لوٹ کر آنا ہوگا۔

حضرت شعیب نے جواب دیا قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ (اعراف ۷:۸۸) کہا ہم تمھارے (تجارتی بددیانتی کے طریقوں کو) ناپسند کرتے ہیں۔

حضرت شعیب کو دھمکیاں دینے کے ساتھ مومنین کو بھی دھمکانا ڈرانا شروع کر دیا۔ ارشاد الٰہی ہے وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (اعراف ۷:۹۰) اور اس قوم کے سرداروں نے جو کافر تھے کہا اگر تم نے شعیب کی پیروی کی تو تم یقیناً نقصان اٹھانے والے ہو گے۔

جب قوم مدین اپنے مال و دولت کے زعم میں متکبرانہ نخوت میں انتہا کو پہنچ گئی تو اللہ کا غضب بھڑکا تو ان کو تباہ کر دیا ارشاد الٰہی ہے۔ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ (اعراف ۷:۹۱) سو ان کو زلزلے نے آ پکڑا پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تاریخی مطالعہ کریں تو واضح ہو جاتا ہے یہ دو نظاموں کا ٹکراؤ تھا جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام انسانوں کی ہر قسم کی آزادی کے علمبردار تھے اور فرعون انسانوں کو اپنے پنجہ استبداد میں رکھنے کا حامی تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بے بس مقہور و مجبور قوم بنی اسرائیل تھی اور فرعون کے ساتھ تمام سرمایہ دار (خصوصاً قارون جس کا ذکر قرآن مجید میں آتا ہے) جابرانہ نظام کو قائم رکھنے کے لیے ساتھ دے رہے تھے۔ قرآن مجید نے فرعونی نظام کو زمین میں سرکش قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (القصص ۲۸:۴) فرعون نے ملک میں سرکشی اختیار کی اور اس کے رہنے والوں کو فرقے فرقے بنا رکھا تھا۔ ان میں سے ایک گروہ کو کمزور کرتا جاتا تھا۔ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا تھا اور وہ فساد کرنے والوں میں سے تھا۔

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ فرعون نے اپنی حکومتی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے ملک میں طبقاتی تقسیم پیدا کر دی تھی۔ ایک گروہ وہ تھا جس کے ہاتھ میں تمام وسائل پیداوار تھے۔ اس کے ساتھ حکومت کی سرپرستی بھی تھی دوسرا گروہ محکوم و مقہور تھا۔ اس گروہ میں خصوصاً بنی اسرائیل شامل تھے۔ وہ ہر قسم کے حقوق سے محروم تھے اور غلامانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ غلامی تو خود ایک ذلت اور منکبت ہے لیکن اس کے ساتھ انھیں طرح طرح کے عذاب دیے جاتے تھے۔ قرآن مجید میں آتا ہے يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وہ تمھیں سخت عذاب دیتے تھے۔ لوگوں کو غلامی میں رکھنے کی وجہ سے فساد فی الارض کہا ہے فساد صرف ملک میں بدامنی خلفشار کا نام ہی نہیں بلکہ حقوق انسانی سے محروم کرنے کا نام بھی فساد ہے اس فساد کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اس کے بھائی ہارون علیہ السلام کو فرعون کی طرف ایک مصلح کے رنگ میں بھیجا تاکہ وہ بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلائیں ارشاد الٰہی ہے۔ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ o وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ (القصص ۲۸:۵،۶) اور ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو زمین میں کمزور کیے گئے ہیں اور انھیں امام بنائیں اور انھیں وارث بنائیں اور

انھیں زمین میں طاقت دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو ان سے وہ چیزیں دکھائیں جس سے وہ ڈرتے تھے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت مستمرہ بیان کی ہے کہ جب کوئی قوم مال و دولت کے نشہ میں مخمور ہو کر لوگوں پر معاشرتی اور معاشی غلامی کی ذلت اور مسکنت پھینکتی ہے اور اپنی زمینی طاقت کی وجہ سے خدا بن بیٹھتی ہے اور یہ سمجھنے لگ پڑتی ہے کہ اس کی طاقت کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی غیرت جوش میں آتی ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے جن کی وجہ سے وہ قوم صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ یہاں اس کی مثال فرعون کی بیان کی ہے فرعون کی تباہی کے لیے موسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا جس نے فرعون کے گھر میں پرورش پائی آخرکار وہی فرعون کی تباہی کا سبب بنا۔

اللہ تعالیٰ کا رحم جوش میں آیا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ فرعون کے پاس جائیں اور ان سے کہیں کہ مظلوم اور محکوم طبقہ بنی اسرائیل کو ان کے سپرد کر دے قرآن مجید میں آتا ہے اَنْ اَدُّوْا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ (الدخان: ۱۸) کہ اللہ کے بندوں کو میرے سپرد کر دو میں تمھارے لیے امانت والا رسول ہوں۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (طٰہٰ: ۴۷) بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے۔

جب سرمایہ داروں نے یہ سنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کو بگار سے آزاد کر کے اس کے سپرد کر دے تو وہ فرعون کے پاس اکٹھے ہو گئے اور فرعون سے کہا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰی وَقَوْمَهٗ لِیُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَیَذَرَکَ وَاٰلِهَتَکَ (الاعراف ۷:۱۲۷) اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑتا ہے کہ ملک میں فساد کریں اور وہ تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دے۔

فرعون نے سرمایہ داروں کے جواب میں تہدیدانہ انداز میں کہا۔ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ (الاعراف ۷:۱۲۷) ہم ان کے بیٹوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے اور ہم ان کے اوپر غالب ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی دھمکی سن کر بنی اسرائیل کو کہا۔ اِسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ (اعراف ۷:۱۲۸) اللہ سے مدد طلب کرو اور صبر کرو زمین اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔

آخر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ بنی اسرائیل کو لے کر رات کے اندھیرے میں ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ حکم خداوندی کے تحت حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ ہجرت کر گئے ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْٓ اِنَّکُمْ مُّتَّبَعُوْنَ (شعراء ۵۲) اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ راتوں رات میرے (محکوم) بندوں کو لے جا کیونکہ تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام محکوم اور مظلوم بنی اسرائیل کو لے کر چل دیے اور سرمایہ داری نظام کے خاتمے کے لیے خدا سے دعا مانگی رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِهِمْ (یونس ۱۰:۸۸) اے ہمارے رب ان کے مالوں کو تباہ کر دے۔

جب دریا کے کنارے پہنچے۔ حکمت الٰہی سے مد و جذر سے پیدل چلنے کا رستہ بنا ہوا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور مظلوم بنی اسرائیل تائید ایزدی سے خشک راستہ سے دریا عبور کر گئے جب فرعون اور اس کا لشکر اسی راستہ پر چلا تو راستے میں ہی تھے اترا ہوا پانی پھر چڑھ گیا اور فرعون اور اس کا لشکر دریا کی لہروں میں بہہ گئے۔ مرتے ہوئے فرعون بھی خدا کے نظام ربوبیت پر ایمان لے آیا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اٰمَنْتُ بِرَبِّ مُوْسٰی میں موسیٰ کے رب پر ایمان لے آیا ہوں۔ اس آیت میں رب کا لفظ لا کر یہ بتایا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے ساتھ جھگڑا معاشی ناہمواریوں کا تھا۔ ملک میں فرعون اور حکومت کی سرپرستی سے سرمایہ داروں نے وسائل پیداوار پر قبضہ کر لیا ہوا تھا جس وجہ سے ایک طبقہ نان جویں سے محروم ہو چکا تھا۔ مزید برآں سرمایہ دار مفت بگار بھی لیتے تھے۔ مرتے ہوئے فرعون نے اللہ کی ربوبیت کا اقرار کیا کہ وہی معاشی نظام بہتر ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کا پرتو ہو۔ اسی نظام میں معاشی طبقاتی تقسیم نہیں ہوتی اور ہر شخص ضروریات زندگی سے متمتع ہوتا ہے۔ اس اقرار کے ساتھ اپنی صفت ربوبیت کا انکار کیا۔ جو خدا کی زمین پر ایک رب بنا ہوا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور کا ایک بڑا سرمایہ دار جس کا ذکر قرآن مجید میں آتا ہے اس کا ذکر بھی کرنا ضروری ہے۔

قارون، موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ فرعون کی حکومتی سرپرستی سے اس دور کا بہت بڑا سرمایہ دار تھا۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں کرتا ہے۔ وَاٰتَیْنٰهُ مِنَ الْکُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِی الْقُوَّةِ (القصص ۲۸:۷۶) اور ہم نے اسے اتنے خزانے دیے کہ اس کی کنجیاں ایک طاقت ور جماعت کے لیے اٹھانی مشکل تھیں۔ اس نے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل پر بہت ظلم ڈھائے اس کی قوم نے اس کو بہت سمجھایا کہ اپنی دولت پر مت اترا۔ ناحق ظلم وستم ڈھا کر زمین میں فساد برپا نہ کر۔ لیکن دولت کا نشہ اس پر اس قدر چھایا ہوا تھا وہ ظلم وستم سے باز نہ آیا آخرکار اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق اس کو تباہ و برباد کر دیا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ فَمَا کَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ یَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا کَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِیْنَ

(القصص ۸۱:۲۸) سو ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا تو کوئی گروہ اس کے لیے نہ ہوا جو اللہ کے مقابلہ پر اس کی مدد کرتے اور نہ وہ خود اپنے تئیں بچا سکا۔

رسول کریم ﷺ: یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے اور تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ رسول کریم ﷺ کا بتایا ہوا نظام معیشت سرمایہ داری اصولوں پر مبنی نہیں ہے۔ ایسی تعلیم پیش کی ہے جس میں دولت کے حصول کی آزادی بھی دی ہے لیکن اس کے ساتھ ناجائز ذرائع سے دولت کمانے پر پابندیاں بھی عائد کیں ہیں پھر اس کے ساتھ دولت مند اصحاب کی دولت میں سائلین اور محرومین کا حق بھی قرار دے دیا ہے۔ سائلین اور محرومین کا حق ادا کرنے کے بعد بھی دولت بچ جائے تو اس کے متعلق یہ ارشاد الٰہی ہے۔ يَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ ۲۱۹) وہ مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ جو ضرورت سے زائد ہے وہ خدا کی راہ میں خرچ کر دیں۔

رسول کریم ﷺ کے بتائے ہوئے ضابطہ معیشت کے متعلق اگلے صفحات میں پڑھیں گے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ رسول کریم ﷺ کی سرمایہ دار طبقے نے ہی مخالفت کی تھی۔ ابولہب، ابوجہل، عتبہ، شیبہ وغیرہ سب سرمایہ دار طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ تباہ و برباد ہوئے قرآن مجید میں آتا ہے۔ تَبَّتْ يَدَا اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ مَا اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ. (اللھب ۱۱۱: ۱،۲) ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہوئے وہ بھی ہلاک ہوا۔ اس کا مال جو اس نے کمایا اس کے کسی کام نہ آیا۔ سورۃ ہمزہ ساری کی ساری نظام سرمایہ داری کے خلاف ہے ارشاد الٰہی ہے۔ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ نِ الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗo كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ وَمَا اَدْرٰكَ مَالْحُطَمَةُo نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ (ہمزہ ۱۰۴: ۱،۹) تباہی ہے ہر عیب لگانے والے طعن کرنے والے کے لیے جو مال کو جمع کرتا ہے اور اسے گنتا رہتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ رکھے گا۔ ہرگز نہیں وہ ضرور حطمہ میں پھینکا جائے گا اور تجھے کیا خبر حطمہ کیا ہے اللہ کی جلائی ہوئی آگ ہے جو دلوں پر چڑھتی ہے وہ ان پر لمبے لمبے ستونوں میں بند کر دی گئی ہے۔

مذکورہ آیات میں تمام سرمایہ داروں کو مخاطب کیا گیا ہے کہ جو سرمایہ دار اپنے مال میں سے اللہ اور اس کے بندوں کا حق ادا نہیں کرتے بلکہ مزید دولت بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں وہ تباہی کے گڑھے میں گرائے جائیں گے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ رسول کریم ﷺ کے دور مسعود میں جو سرمایہ دار اپنی دولت کے بل بوتے پر اسلام کی بیخ کنی پر تلے ہوئے تھے وہ ہاویہ میں گرائے گئے۔

ریاست کی اجتماعی ملکیت

اجتماعی ملکیت سے مراد وہ ملکیت ہے جس پر ریاست کا مالکانہ تصرف ہو اور ہر فرد کو اس چیز سے آزادانہ استفادہ کا حق ہو۔ اس قسم کی ملکیت ان اشیاء پر ہوتی ہے۔ جو افادہ عامہ کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اگر ان پر فرد یا افراد کی ملکیت ہو جائے تو عوام تنگی اور تکلیف محسوس کریں گے۔
قرآن مجید میں آتا ہے۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (البقرہ ۲:۲۹) (یعنی اللہ وہ ذات ہے جس نے تمھارے لیے زمین میں تمام چیزیں پیدا کی ہیں۔ اب اس بات کا فیصلہ کہ کون کون سی چیزیں انفرادی ملکیت میں آ سکتی ہیں اور کن اشیاء کو اجتماعی اور قومی ملکیت سمجھنا چاہیے۔ اشیاء کی نوعیت اور شریعت کی ہدایات کو پیش نظر رکھ کر کیا جا سکتا ہے رسول کریم ﷺ نے اصولی ہدایت دیتے ہوئے فرمایا۔ اَلْمُسْلِمُوْنَ شرکاء فی ثلثٍ فِی الماء والکلاء والنار (ابوداؤد کتاب البیوع باب فی منع الماء) یعنی تمام مسلمان تین چیزوں میں شریک ہیں۔ پانی، گھاس اور آگ۔
رسول کریم ﷺ نے اصولی طور پر صرف تین چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ درحقیقت اس حدیث کا منشا یہی ہے کہ قدرتی وسائل پیدائش جو افادہ عام کے لیے ہوں وہ حکومت کی تحویل میں ہوں گے۔

فقہاء کا اختلاف اور صحیح مسلک: فقہاء نے معدنی اشیاء کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ معاون ظاہر جن کے حصول کے لیے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہو۔ وہ متفقہ طور پر انفرادی ملکیت بنائی نہیں جا سکتی۔

معاون باطنہ: یعنی وہ معدنی ذخیرے جو زمین کے اندر چھپے ہوئے ہیں اور ان کے نکالنے میں کافی محنت اور اخراجات کی ضرورت پڑتی ہو۔ مثلاً سونا چاندی وغیرہ کی کانیں، حنفی، شافعی اور حنبلی، فقہاء کی رائے یہ ہے اگر یہ کانیں کسی شخص کی مملوکہ زمین میں پائی جاتی ہیں تو مالک زمین کی یا اس شخص کی مِلک ہوں گی جس کو مالک اراضی نے ان کے نکالنے کی اجازت دی ہے۔ اگر یہ کانیں غیر مملوکہ زمین میں ہیں تو اس شخص کی مِلک ہوں گی جو ان کو دریافت کرے اور نکالے۔ حضرت امام مالک کی یہ رائے ہے کہ زمین کے اندر پائی جانے والی کانیں تمام مسلمانوں کی مِلک ہیں اور ان کی مالک مختار اسلامی ریاست ہے۔ صحیح مسلک حضرت امام مالکؒ کا ہی ہے کہ زمین کے اندر پائی جانے والی تمام کانیں حکومت کی ملک ہوں گی۔

بیت المال

کوئی مملکت بغیر دولت کے قائم نہیں رہ سکتی۔ اصطلاح میں اسلامی حکومت کے خزانہ کا نام بیت المال ہے۔ حکومت کی تمام آمدن جمع ہوتی ہے اور عوام کی بہبود اور مملکت کے دفاع کے لیے اس میں سے صَرف کیا جاتا ہے۔

ذرائع آمدنی

ا۔ زکوٰۃ: اس سالانہ خدائی محصول کا نام ہے جو امراء سے لے کر غرباء کو دیا جائے۔[1] اس کو زکوٰۃ اس وجہ سے کہتے ہیں۔ یہ مال کو بڑھاتی ہے یا اس لیے مال کا دینا تزکیہ نفس کا باعث ہے۔ یہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ زکوٰۃ سے مال اس طرح بڑھتا ہے کہ دولت صرف چند ہاتھوں میں ہی جمع نہیں رہتی بلکہ تمام قوم میں گردش کرتی ہے۔ جس سے بحیثیت مجموعی قوم کی دولت بڑھ جاتی ہے۔

---

[1] رسول کریم ﷺ نے زکوٰۃ کے متعلق فرمایا۔ "توخذ من اغنیاء ھم و تردّ الی فقراء ھم" (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب وجوب الزکوٰۃ) یہ وہ مال ہے جو امراء سے لے کر غربا کو دیا جاتا ہے۔

زکوٰۃ دینے سے دولت کی محبت کی آگ دل سے سرد پڑ جاتی ہے جو کئی گناہوں کا سبب ہوتی ہے اور دل گناہوں کی میل سے پاک صاف رہتا ہے۔
قرآن مجید میں اکثر جگہ جہاں قیامِ نماز کا ذکر آتا ہے۔ ساتھ ہی ادائیگی زکوٰۃ کا حکم ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نماز کی غرض اس وقت تک پوری نہیں ہوتی جب تک مال میں سے غربا کی بہبود کے لیے خرچ نہ کیا جائے۔ زکوٰۃ کا حکم ان سورتوں میں بھی پایا جاتا ہے جو آغاز بعثت میں نازل ہوئی تھیں اور ان سورتوں میں بھی جو آنحضرت ﷺ کی آخری زندگی میں نازل ہوئیں۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا (المزمل ۷۳:۲۰) اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اچھا مال کاٹ کر اللہ کو دو۔

اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ (التوبہ ۹:۱۸) اللہ کی مسجدیں صرف وہی آباد کرتے ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور نماز کو قائم کیا اور زکوٰۃ دی اور اللہ کے سوائے کسی کا خوف نہ کیا۔

انواع زکوٰۃ پانچ ہیں۔

(الف) سونا چاندی: سونا بیس مثقال (ساڑھے سات تولے) اور چاندی دو سو درہم (ساڑھے باون تولے) اور ان پر ایک سال گزر جانے کے بعد ۱/۴۰ حصہ دینا پڑتا ہے۔ نقدی کا نصاب سونے اور چاندی کی طرح ہے۔

(ب) مویشی: ان میں اونٹ، گائے بیل اور بھیڑ بکریاں داخل ہیں۔

یہ ضروری ہے کہ مویشی بار برداری، گھی، دودھ اور افزائش نسل کے لیے پالے گئے ہیں اور سال کی اکثر مدت میں چرتے پھرتے رہے ہوں۔

(ج) سامانِ تجارت: تجارت کا سامان اگر سونے، چاندی کے نصاب تک پہنچ جائے اور اس پر ایک سال کی مدت گزر جائے تو ۱/۴۰ حصہ دینا پڑتا ہے۔

(د) غلہ اور پھل: اگر زمین بارش یا قدرتی چشموں سے سیراب ہوتی ہے تو اس کی پیداوار کا ۱/۱۰ حصہ لیا جاتا ہے۔ جب کنوؤں یا مصنوعی ذرائع سے سیراب ہوتی ہو تو اس کی پیداوار کا ۱/۲۰ حصہ لیا جاتا ہے۔

(س) صدقات: وہ مال جو ذی ثروت اصحاب طوعاً غرباء کی بہبود کے لیے بیت المال کو دیتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی (البقرہ ۲:۲۶۴) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور ستا کر باطل نہ کرو۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ (البقرہ ۲:۲۷۱) اگر تم خیرات کھلے طور پر دو تو کیا ہی اچھی بات ہے اور اگر تم اسے چھپاؤ اور محتاجوں کو دو تو وہ بھی تمھارے لیے اچھا ہے۔

۳۔ خمس: مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ۔

مالِ غنیمت اس مال دولت کو کہا جاتا ہے جو مسلمانوں نے غیر مسلموں سے لڑنے کے بعد حاصل کیا ہو۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ (الانفال ۸:۴۱) اور جان لو کہ جو چیز تم فتح پا کر حاصل کرو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور قریبیوں کے لیے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے۔

اموالِ غنیمت دو طرح کے ہیں۔ (۱) منقولہ اموال (۲) غیر منقولہ جائیداد

اموالِ منقولہ میں خمس (پانچواں حصہ) نکالنے کے بعد باقی چار حصے مجاہدین پر تقسیم کر دیے جاتے ہیں۔ اس تقسیم پر تمام آئمہ مجتہدین متفق ہیں۔
اموالِ غیر منقولہ کے بارہ میں آئمہ مجتہدین کا اختلاف ہے۔ حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔

اموالِ منقولہ کی طرح اموال غیر منقولہ بھی مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور خلیفہ ان کی اجازت کے بغیر تصرف نہیں کر سکتا۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اموال غیر منقولہ میں امام کو اختیار حاصل ہے کہ چاہے مجاہدین میں تقسیم کرے چاہے مفتوحہ زمینوں کو بیت المال کے سپرد کر دے تاکہ ان کی آمدنی ملکی ضروریات پر خرچ کی جا سکے۔

دونوں حکم حالات اور وقت کے تقاضے کے مطابق ٹھیک ہیں۔ اگر حالات تقاضا کرتے ہوں کہ اموال غیر منقولہ مجاہدین میں تقسیم کر دیے جائیں تو

تقسیم کرنا بھی ٹھیک ہے جیسا کہ رسول کریم ﷺ نے بنی قریظہ پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد ان کی زمینیں خمس نکالنے کے بعد مہاجرین میں تقسیم کر دیں اس لیے کہ مہاجرین حاجت مند تھے۔ انصار میں سے صرف تین افراد کو اس میں سے حصہ دیا (۱) سہیل بن حنیف (۲) ابو دجانہ (۳) ارث بن صمہ کیونکہ انصار میں سے یہ حضرات ضرورت مند تھے۔

خیبر فتح ہوا تو اس کی تقسیم آنحضرت ﷺ نے اس طرح فرمائی۔ اس کو چھتیس حصوں میں تقسیم کیا اور ایک ایک حصہ میں سو سو حصہ مقرر کیا۔ پھر اس میں سے نصف یعنی اٹھارہ حصوں کو مجاہدین میں تقسیم کر دیا اور باقی ماندہ اٹھارہ حصوں کو مسلمانوں میں تقسیم نہ کیا بلکہ اس کو دوسری ملکی ضروریات کے لیے محفوظ کر لیا۔ رسول کریم ﷺ کے اس طرزِ عمل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اموال غیر منقولہ مجاہدین میں تقسیم کرنا ضروری نہیں، بلکہ حالات کے مطابق تقسیم کرنا چاہیے۔

رسول کریم ﷺ کے اسی طرزِ عمل کو حضرت عمرؓ نے سامنے رکھ کر عراق وغیرہ کی زمینوں کو مجاہدین میں تقسیم نہیں کیا تھا بلکہ وہاں کی زمینیں ان کے مالکوں کے پاس ہی رہنے دیں اور ان پر خراج مقرر کیا تا کہ اس سے ملکی ضروریات پوری ہو سکیں۔

۴۔ مال رکاز: وہ مال جو دفینوں اور کانوں سے نکلتا ہے۔

اس مال میں خمس (پانچواں حصہ) حکومت کا ہوگا۔ باقی چار حصے اس شخص کو مل جائیں گے جس نے اسے پایا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ ان رسول اللہ ﷺ قال...... فی الرکاز الخمس کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ دفینہ میں اسلامی حکومت کا پانچواں حصہ ہے۔

عشر: ارضی پیداوار کی زکوٰۃ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ یَآیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (البقرہ ۲:۲۶۷) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ خرچ کرو پاکیزہ چیزیں جو تم نے کمائیں اور جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالیں۔

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ (الانعام ۶:۱۴۲) جس دن تم (فصل) کاٹو (اللہ کا) حق ادا کرو۔

رسول کریم ﷺ نے اس کے نصاب کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے۔ قال فیما سقت السماءُ والعیون اَوکان عثریا العشر وما سقی بالنضح نصف العُشر (بخاری کتاب الزکاۃ) فرمایا جس زمین کی آب پاشی بارش اور چشموں سے ہو اس کی پیداوار کا دسواں حصہ دیا جائے گا۔ جس کی پانی کھینچ کر (کنواں وغیرہ سے) کی گئی ہو اس کی پیداوار کا بیسواں حصہ لیا جائے گا۔

یہ فرق صرف محنت اور اخراجات کی وجہ سے ہے۔ جس زمین پر محنت اور اخراجات کم ہیں۔ وہاں دسواں حصہ اور جہاں محنت اور اخراجات زیادہ ہیں وہاں پیداوار کا بیسواں حصہ۔ جیسا کہ حدیث کا متن واضح کرتا ہے زمین بارش سے سیراب ہوتی ہے۔ وہاں قدرتی آب پاشی کی وجہ سے اخراجات کم ہیں۔ زمین کی پیداوار کا دسواں حصہ لیا جائے گا۔ جہاں کنوؤں اور ٹیوب ویلوں سے زمین سیراب کی گئی ہے اخراجات بڑھ گئے ہیں وہاں بیسواں حصہ۔

صاحب ہدایہ مرغینانی لکھتے ہیں لان المونہ تکثر فیہ و تقلی فیما یسقی بالسماء او سیحًا۔ (ہدایہ ج ۱ کتاب الزکاۃ الزروع والثمار)

فصول پر عشر نافذ کرنے کے بارے میں اختلاف ہے حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک کھیتوں کی ہر قسم کی پیداوار پر کم ہو یا زیادہ یا جس قسم کی بھی ہو عشر واجب ہے ان کا استدلال قرآن مجید کی اس آیت سے ہے۔ "وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ" (البقرہ ۲۶۷) (جو کچھ ہم نے تمھارے فائدہ کے لیے زمین سے پیدا کیا ہے عشر ادا کرو) لیکن امام ابویوسف کے نزدیک صرف اسی پیداوار پر واجب ہے جو دو شرطیں پوری کرتی ہو۔ ۱۔ لوگ اس کا ذخیرہ کر سکیں لہٰذا ایسی سبزیات جن کا ذخیرہ نہیں کیا جا سکتا (کھیرا، ککڑی، توری، بینگن، ساگ پات وغیرہ) پر عشر واجب نہیں۔ ۲۔ پیمانے سے ناپ تول کی جا سکیں مثلاً اناج، دالیں وغیرہ (کتاب الخراج ص ۳۰۔ امام ابویوسف الہدایہ ج ۱ کتاب الزکاۃ مرغینانی)

امام شافعی اور امام مالک بھی یہی رائے ہے (الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ ص ۱۱۴ ماوردی)

حضرت امام ابوحنیفہ کی رائے سے اتفاق کرنے والے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، مجاہدؒ، حمادؒ، داودؒ اور ابراہیم نخعی میں، مالکی فقہاء کی ایک نمایاں شخصیت ابن العربی امام ابوحنیفہ کی تائید کرتے ہیں۔

مفاد عامہ کے پیش نظر امام ابوحنیفہ کی رائے زیادہ قرین قیاس اور قوی ہے کیونکہ سبزیات کی بیج سے بھی تو کاشت کار آمدن حاصل کرتا ہے۔

دوم۔ بیت المال میں جتنی زیادہ آمدن ہوگی۔ ملکی معاشی حالت مضبوط ہوگی اور عوام کو فائدہ ہوگا۔

نصاب: امام ابوحنیفہ اور حضرت امام زفر کے نزدیک کھیتوں کی پیداوار پر کوئی نصاب نہیں ہر پیداوار خواہ کم ہو خواہ زیادہ پر عشر واجب ہے۔ امام ابویوسف اور

امام شافعی کے نزدیک جب عشری زمین کی پیداوار پانچ وسق تک پہنچ جائے تب عشر واجب ہے۔ (الاحکام السلطانیہ ماوردی باب ۱۱ ص ۱۱۴۔ موطأ امام مالک کتاب الزکاۃ) بخاری شریف کی ایک حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔ (بخاری کتاب الزکوۃ، موطأ امام مالک کتاب الزکوۃ)

۴۔ فئی: وہ مال ہے جو محارب قوموں سے بغیر جنگ و جدل کے حاصل ہو۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَا اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (الحشر ۵۹:۶) اور اللہ نے اپنے رسول کو ان سے جو مال دلوایا تو تم نے اس پر گھوڑے نہیں دوڑائے اور نہ اونٹ لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے۔ تسلط دے دیتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

فئی کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا۔ ایک حصہ رسول کریم ﷺ کی حیات تک آپ کا ہوتا تھا اور باقی چار حصے آپ کے قرابت داروں، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کو دیے جاتے تھے۔

۴/۵ حصہ حضرت عمرؓ کے ابتدائی دورِ خلافت تک مجاہدین میں اسلحہ جنگ خریدنے کے لیے تقسیم کر دیا جاتا تھا جب اسلحہ فراہم کرنے کا انتظام حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تو یہ مال بیت المال میں داخل کر دیا جاتا تھا۔

۵۔ خراج: وہ سرکاری لگان ہے جو غیر مسلم مفتوحین کی غیر مقبوضہ زمین پر سالانہ عائد ہوتا تھا۔ خراج وصول کرنے کے دو طریقے تھے۔ ایک پیائش کا طریقہ تھا۔ اس میں زمین کی پیائش یا تخمینہ کے بعد نقد یا پیداوار کی ایک خاص مقدار مقرر کر دی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس طریقہ پر خراج مقرر کیا تھا۔

دوسرا طریقہ بٹوارے کا تھا اس میں پیداوار کا ایک معین حصہ مقرر کر دیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں پایا جاتا تھا۔

خراج زمین کی زرخیزی اور وسائل آب پاشی کی سہولتوں کو لحاظ کر کے مقرر کیا جاتا تھا۔

۶۔ جزیہ: جزیہ اس ٹیکس کا نام ہے جو اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر مسلم افراد سے ان کی طے شدہ مرضی کے مطابق لیا جاتا تھا۔ یہ ٹیکس ان کی فوجی خدمت اور ان کی محافظت کے عوض میں لیا جاتا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ جزیہ کی رقم ذمیوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کی جائے۔

جزیہ کی مقدار حسب ذیل تھی۔

۱۔	دولت مندوں سے	۴۸ درہم سالانہ	(بارہ روپے)
۲۔	متوسط طبقہ سے	۲۴ درہم سالانہ	(چھ روپے)
۳۔	ادنیٰ طبقہ سے	۱۲ درہم سالانہ	(تین روپے)

متذکرہ بالا مقدار عام قانونی حیثیت رکھتی ہے لیکن امیر مملکت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اس سے کم مقدار پر بھی اہل الذمہ سے سمجھوتہ کرے۔ اس صورت میں جزیہ کی مقدار کسی صورت میں بھی بڑھائی نہیں جاسکتی۔

صاحب ہدایہ لکھتا ہے۔ لان الموجب هو التراضی فلا یجوز التعدی الی غیر ماوقع علیه الاتفاق چونکہ یہ مقدار باہم رضامندی سے طے پائی ہے۔ اس لیے اس سے تجاوز کرنا جائز نہ ہوگا۔ غرباء، بوڑھوں، غلام، درویش، مذہبی رہنما اور معذور افراد سے جزیہ وصول نہیں کیا جاتا تھا۔

۷۔ عشور: عشور وہ ٹیکس ہے جو ان غیر مسلم تاجروں سے وصول کیا جاتا ہے جو اسلامی ریاست میں تجارت کی غرض سے مال لے کر داخل ہوتے ہیں۔

یہ ٹیکس حضرت عمرؓ کے عہد میں شروع ہوا۔ وہ اس طرح کہ حضرت موسیٰ اشعری نے حضرت عمرؓ بن الخطاب کو لکھا کہ

ہمارے ملک کے مسلمان تاجر جب حربی علاقوں میں جاتے ہیں تو وہ لوگ ان سے دسواں حصہ وصول کرتے ہیں۔

تو حضرت عمرؓ نے انھیں لکھا کہ "تم بھی ان سے اسی طرح وصول کرو جس طرح وہ مسلمان تاجروں سے وصول کرتے ہیں۔

یہ سال میں ایک دفعہ ادا کرنا پڑتا تھا۔

۸۔ کراء الارض: ریاست کی زمینوں کا مقررہ لگان جو کاشتکاروں کی باہمی رضامندی سے وصول کیا جاتا ہے۔ (درمختار ج ۳ ص ۲۵۳ باب العشر والخراج)

۹۔ وقف: وقف وہ جائیداد ہے جو مالک جائیداد خدا کے نام پر بیت المال کے نام پر وقف کر دیتا ہے۔

۱۰۔ ضرائب: وہ مالی امداد جو امراء سے غرباء کے لیے وصول کی جاتی ہے۔ یہ ٹیکس اس وقت امراء پر عائد کیا جاتا ہے۔ جب وہ معاشی قوانین پر عمل نہ کریں اور

امراء دولت جمع کر کے عوام کی غربت کا سبب بن جاتے ہیں تو معاشی توازن قائم رکھنے کے لیے حکومت امراء پر ٹیکس عائد کر دیتی ہے۔

۱۱۔ لقطہ: وہ مال جس کا کوئی مالک نہ مل سکے۔ اس میں گری پڑی چیزوں کے علاوہ وہ تمام اموال شامل ہیں جو کسی کی ملکیت میں رہے ہوں لیکن اب ان کے مالک کا پتہ نہ چلتا ہو۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس مال کے متعلق ایک سال تک اشتہار کا اہتمام کرے۔ اگر مالک نہ ملے تو اس کو غرباء میں تقسیم کر دے۔

رسول کریم ﷺ سے روایت ہے فرمایا لاتحل اللقطة فمن التقط شيئا فليعرفه سنة فان جاء صاحبها فليود عليه وان لم يات فليتصدق.
(بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۱۲) لقطہ حلال نہیں ہے۔ لہٰذا جو کوئی چیز کو اٹھائے اسے چاہیے کہ ایک سال تک اس کا اشتہار کرے۔ اگر اس کا مالک آ جائے تو اس مال کو اس کے حوالے کر دے اور اگر نہ آئے تو اسے خیرات کر دے۔

امام اوزاعی کی رائے ہے کہ لقطہ کے طور پر پایا جانے والا مال کثیر رقم ہے تو اسے بیت المال میں داخل کر دے۔ (بدایۃ المجتہدین ابن رشد ج ۲ ص ۳۰۶)

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ ہر وہ مال جو کسی مسلمان کا ہو لیکن اس کے مالک یا ورثاء کا پتہ نہ چل سکے تو ریاست کی ملکیت میں داخل کر لیا جائے گا۔
(السیاست الشرعیہ فی احوال الراعی والرعیہ ص ۴۰)

۱۲۔ لاوارث ترکے: ایسے تمام ترکے جن کا کوئی شرعی وارث نہ ہو۔ یا وہ مال جس کو مالک نے وصیت کے ذریعہ اس کا حق ملکیت بیت المال کی طرف منتقل کیا ہو۔ اسلامی ریاست کی ملکیت سمجھا جائے گا کیونکہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے...... وانا وارث من لاوارث له ارثه واعقل عنه. (کتاب الاموال ابوعبیدہ ص ۲۲۱) اور جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا وارث میں ہوں میں اس کا ترکہ پاؤں گا اور اس کی طرف سے دیت ادا کروں گا۔

حضرت عمرؓ بھی اسی اصول پر عمل کرتے تھے۔

حضرت عمرو بن العاص نے حضرت عمر ابن الخطاب کو مصر کے ایسے راہبوں کے بارے میں لکھا جو وارث چھوڑے بغیر مر جاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے انھیں جواب دیا کہ جس راہب کے پیچھے اس کی نسل میں کوئی زندہ ہو تو اس کا ترکہ اس کے حوالے کر دیا جائے اور جس کے پیچھے کوئی نہ ہو اس کے مال کو مسلمانوں کے بیت المال میں داخل کر دیا جائے کیونکہ ان کی ولایت مسلمانوں کو پہنچتی ہے۔
(فتوح مصر واخبارھا از ابوالقاسم عبدالرحمان بن عبداللہ بن الحکم ص ۹۰)

قاضی ابویوسف کہتے ہیں۔
"مسلمانوں میں سے جو کوئی بھی لاوارث مر جائے۔ اس کا مال بیت المال کی ملکیت قرار پائے گا۔" (کتاب الخراج ص ۲۳۱)

۱۳۔ کاروبار کے منافع: اسلامی ریاست کو مختلف قسم کے نفع اور کاروبار کرنے کا حق حاصل ہے جو نفع حاصل ہوگا وہ اسلامی ریاست کی ملکیت قرار پائے گا۔

۱۴۔ نشوونمائے ملکیت: اسلامی ریاست کی املاک سے حاصل ہونے والی آمدنی بیت المال میں داخل ہوگی۔ مثلاً درختوں کے پھل، جنگلات، جانوروں کی نسل وغیرہ سے حاصل ہونے والی آمدن ریاست کی ملکیت ہے۔

۱۵۔ النوائب: نوائب سے مراد ہنگامی ٹیکس ہیں جو خاص حالات کی وجہ سے عوام پر عائد کیے جاتے ہیں۔ ہدایہ میں نوائب کی یہ تعریف کی گئی ہے۔

ماینوبه من غیر راتب (باب الکفالہ) وہ مطالبہ زر جو دائم اور مسلسل نہ ہو۔

جب حکومت کو ہنگامی حالات درپیش ہوں۔ خزانہ ملکی ضروریات کا متحمل نہ ہو سکتا ہو۔ ان حالات میں حکومت عوام پر ملکی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ٹیکس عائد کر سکتی ہے لیکن یہ امر لازمی ہے۔ یہ ٹیکس اتنا زیادہ نہ ہو جو لوگوں کی برداشت سے باہر ہو۔ حالات کے مطابق قومی ترقی کے لیے نئے ٹیکس لگائے جا سکتے ہیں۔ وہ تمام ٹیکس "نوائب" کے زمرہ میں آئیں گے۔

تقسیم دولت

کسی اقتصادی نظام کے حسن کا مدار اس کے نظام تقسیم دولت پر ہے اگر تقسیم کی راہیں عوام کی طرف کھلیں گی تو عوام خوش حال ہوں گے۔ اگر تقسیم کی راہیں مخصوص طبقے کی طرف وا ہوں گی تو عوام مفلوک الحال اور خواص مرفہ الحال ہوں گے۔ سرمایہ داری نظام نے تقسیم دولت کی بنیاد افراد پر رکھی ہے تو معاشرہ پر ظلم ہوا ہے اور اشتمالیت نے اجتماع پر بنیاد رکھی ہے تو افراد پر ظلم ہوا ہے صرف اسلام نے ہی تقسیم دولت کا عادلانہ نظام پیش کیا ہے جس نے سرمایہ کار کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے دولت کا بہاؤ عوام کی طرف رکھا ہے جس سے عوام اور سرمایہ کار کے درمیان رشتہ اخوت استوار رہتا ہے۔

تقسیم دولت کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک صورت عمل اور ضرورت کی بناء پر ہے اور دوسری صورت حصول ملکیت کے بعد تقسیم دولت کی مختلف راہیں۔

پہلی صورت کے لحاظ سے اسلام نے اپنے نظام تقسیم میں عمل اور ضرورت دونوں کو سامنے رکھا ہے۔ اسلام انسان کو یہ حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر حصول رزق کی سعی کرے۔ اس کی اس سعی اور عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم:۳۹) انسان کے لیے وہی ہے جو اس نے کوشش کی یعنی انسان کو معاوضہ بمقدار محنت ملتا ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء:۳۲) مردوں کے لیے ان کی کمائی کے موافق حصہ ہے جبکہ عورتوں کے لیے ان کی کمائی سے متعلق حصہ ہے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں اعملوا فكل ميسر لما خلق له. (بخاری و مسلم بحوالہ کنوز الحقائق) عمل کرو ہر شخص کے لیے وہ کام آسان ہے جس کی وہ صلاحیت رکھتا ہے۔

فرمایا اسعوا فان الله كتب عليكم السعى. (مسند امام احمد کنوز الحقائق) کوشش کرو کیونکہ اللہ نے تم پر کوشش کرنی فرض کی ہے۔

فرمایا اجملوا فى طلب الدنيا فان كلا ميسر لما خلق له. (ابن ماجہ باب الاقتصاد فی طلب المعیشۃ) دنیا کی طلب اپنی صلاحیت کے مطابق کرو اس لیے کہ جس لیے آدمی پیدا کیا گیا ہے وہ ضرور اس کو ملے گا۔

رسول کریم ﷺ مزدور کی اجرت کی ادائیگی کے متعلق فرماتے ہیں۔ اَعْطُوْا الاجير اَجْرَهٗ قبل اَنْ يجف عرقه. (ابن ماجہ کتاب الاجارہ) مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔

حدیث میں آتا ہے۔ ان رسول الله نهى عن استجار الاجير حتى يبين له اجره. (البیہقی کتاب الاجارہ) رسول کریم ﷺ نے ممانعت فرمائی کہ مزدور اور اجیر کو اس کی اجرت طے کیے بغیر کام پر لگایا جائے۔

حدیث قدسی ہے۔ قال رسول الله ﷺ قال الله عزوجل ثلثة انا خصمهم يوم القيمة ومن كنت خصمه خصمته...... وبرجل استاجر اجيراً استوفى منه ولم يوفه. (بیہقی کتاب الاجارہ) رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے تین قسم کے انسان ایسے ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑوں گا اور جس سے میں جھگڑوں گا اس کو مغلوب ہی کر کے چھوڑوں گا...... ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو مزدور سے کام تو پوری طرح لیتا ہے اور اس کے مناسب اس کی مزدوری نہیں دیتا۔

فرمایا (وہ مزدور) تمھارے بھائی ہیں۔ ان کو خدا نے تمھارے ماتحت کیا ہے پس جس کے ماتحت خدا نے بھائی کو کیا ہے اس کو چاہیے کہ وہ جو خود کھائے وہی اس کو کھلائے جو خود پہنے وہی اس کو پہنائے اور جو کام اس کی طاقت سے باہر ہو اس کی اسے تکلیف نہ دے اور اگر اسے تکلیف دے پھر اس کی مدد کرے۔ (بخاری کتاب الایمان)

اشتمالی نظام اقتصاد میں عامل کے عمل کے نتائج سماج کی ملکیت ہیں۔ عامل کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔ معاشرہ ان کی ضرورت کے مطابق ان کو دے گا جبکہ سرمایہ دارانہ نظام اقتصاد میں اجیر کا استحصال ہے۔ یعنی اجرت کم۔ کام زیادہ۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا نظام ہے جس کی رو سے اجیر کو اس کی مزدوری کا صلہ نہ صرف پورا ملتا ہے بلکہ وہ آجر کا بھائی ہوتا ہے اور اس کی تمام ضروریات کا محافظ ہوتا ہے۔

تقسیم دولت کا دوسرا عنصر ضرورت ہے۔ ضرورت کے لحاظ سے معاشرہ دو حصوں میں منقسم ہے ایک وہ لوگ ہیں جو اپنی فکری اور فطری صلاحیتوں کی

بناء پر اپنی معیشت کے حصول کے لیے پوری پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کو ان کی محنت کا پورا پورا بدلہ دیا جاتا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى یعنی انسان کے لیے وہی ہے جو اس نے کمایا۔

ایک طبقہ وہ ہے جو بدنی اور ذہنی کمزوری کی وجہ سے کسی کام کے کرنے سے عاجز ہیں۔ صرف اسلام کا ہی ایک ایسا نظام اقتصاد ہے جس نے ان کے سہارے اور ربوبیت کا بندوبست کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات:۱۹) یعنی ان کے مالوں میں سوالیوں اور محروموں کا حصہ ہے۔

اسلام کی رو سے معاشرہ (اسلامی حکومت) کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان محتاجوں کی ضرورت کو پورا کرے۔

رسول کریم ﷺ نے ذمہ داری کو پورا نہ کرنے والے کے متعلق ایک حدیث قدسی میں فرمایا۔ (قیامت کے دن ایسا ہوگا کہ خدا ایک انسان سے کہے گا) اے ابن آدم! میں بیمار ہوگیا تھا مگر تو نے میری بیمار پرسی نہ کی بندہ متعجب ہو کر کہے گا بھلا ایسا کیوں کر ہوسکتا ہے اور تُو تو تمام جہانوں کا رب ہے۔ خدا فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوگیا تھا اور تو نے اس کی خبر نہیں لی تھی۔ اگر تو اس کی بیمار پرسی کے لیے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اسی طرح خدا فرمائے گا اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہیں کھلایا بندہ عرض کرے گا بھلا ایسے کیسے ہوسکتا ہے۔ میں تجھے کھلاتا۔ آپ تو خود تمام جہانوں کو کھلانے والے تھے خدا فرمائے گا! کیا تجھے یاد نہیں کہ فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے کھلانے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر تُو اسے کھانا کھلاتا تو تو اسے میرے پاس پاتا۔ ایسے ہی خدا فرمائے گا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا مگر تُو نے مجھے پانی نہیں پلایا بندہ عرض کرے گا تُو تو خود پروردگار عالم ہے۔ خدا فرمائے گا میرے فلاں پیاسے بندہ نے تجھ سے پانی مانگا لیکن تو نے اسے نہیں پلایا اگر تو اسے پانی پلا دیتا تو تو اسے میرے پاس پاتا۔"

(مسلم عن ابی ہریرہ)

یہ حدیث واضح کرتی ہے اسلام کا ہی ایک ایسا نظام اقتصاد ہے جو ہر قسم کے معذور اشخاص کی ربوبیت کے لیے ذمہ داری معاشرہ پر ڈالتا ہے اور اگر معاشرہ اس ذمہ داری کو ادا نہیں کرتا تو خدا کے نزدیک قابل مواخذہ ہے۔

تقسیم دولت کی راہیں

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تقسیم دولت کے لیے ایک طریقہ انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنا) بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کے آغاز میں ہی متقی کی علامات میں سے ایک علامت یہ بیان کی ہے۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ. (بقرہ۲:۳) جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (بقرہ۲:۱۹۵) اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں ڈالو۔

ارشاد الٰہی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۝ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. (بقرہ۲:۲۵۴) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اس میں سے جو ہم نے تم کو دیا ہے خرچ کرو اس سے پہلے کہ وہ دن آ جائے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی اور نہ ہی سفارش کام آئے گی اور کافر ہی ظالم ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ. (بقرہ۲:۲۶۷) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ان اچھی چیزوں سے خرچ کرو جو تم کماتے ہو۔

يَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ. (بقرہ۲:۲۱۹) وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ دو جو ضرورت سے زائد ہے۔ (وہ ذیل کی راہ میں خرچ کر دیجئے)

انفاق کی دو اقسام ہیں۔

۱۔ لازمی (زکوٰۃ)۔ ۲۔ طوعی خیرات

زکوٰۃ کے معنی اس کی حقیقت اور اس کی اہمیت

زکوٰۃ کا لفظ زکا سے مشتق ہے۔ کھیتی میں نمو آنے یا اس کے بڑھنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اسے زکوٰۃ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس سے قومی مال بڑھتا ہے یا اس سے تزکیہ نفس ہوتا ہے اسلامی اصطلاح میں زکوٰۃ وہ مال ہے جو نصاب کے تحت امراء سے لیا جاتا ہے اور سورۃ توبہ کی آیت ۶۰ کی رو سے حاجت

مندوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں زکوٰۃ کے لیے دو اور الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ (۱) صدقہ (۲) انفاق فی سبیل اللہ صدقہ صدق سے مشتق ہے۔ جس کے معنی سچائی اور خلوص کے ہیں۔ گویا زکوٰۃ کو صدقہ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ معطی کے ایمان میں سچائی اور خلوص کی چمک پیدا کرتی ہے۔ جس سے اس کا باطن روشن ہو جاتا ہے۔ دوم۔ صدقہ کا لفظ معطی کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ اپنا مال خلوص اور صدق دل سے دے دے۔

انفاق فی سبیل اللہ کے الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ غرباء اور محتاجوں کو دینا گویا اللہ تعالیٰ کو دینا ہے۔

حقیقت زکوٰۃ: اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے اور اس کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے تا کہ وہ اللہ کی صفات کو ظلی طور پر ظاہر کرے۔

اللہ تعالیٰ کی اَن گنت صفات میں سے ایک صفت ربوبیت ہے۔ یہ صفت انسان سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق صفت ربوبیت کا اظہار کرے اسلام نے وہ اظہار زکوٰۃ خیرات اور صدقات کی صورت میں بیان کیا ہے۔ زکوٰۃ دراصل اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کا ظلی طور پر اظہار ہے۔

اہمیت: قرآن مجید نے اقامت صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا ذکر کیا ہے۔ جس میں یہ حکمت بالغہ ہے کہ انسان اس وقت تک صحیح تربیت یافتہ نہیں کہلا سکتا۔ جب تک وہ اللہ تعالیٰ کے حضور جھکنے کے ساتھ ساتھ مخلوق الٰہی کی خدمت بجا نہیں لاتا۔ یہ دونوں پہلو ہی تکمیل انسانیت کے لیے ضروری ہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (البقرہ ۲:۴۳) یعنی نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ فَاِنْ تَابُوا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ (توبہ ۹:۱۱) اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں۔ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْحَکِیْمِ هُدًی وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِیْنَo الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ. (سورۃ لقمٰن ۳۱:۲......۴) یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں۔ نیکی کرنے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَo الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ (بقرہ ۲-۳) یہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ پرہیزگاروں کے لیے ہدایت کا موجب ہے پرہیزگار وہ ہیں جو غیب پر ایمان لاتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں اور جو ہم نے ان کو دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال سے خرچ نہ کرنے والوں کے لیے قرآن مجید اور حدیث میں سخت تہدید بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے۔ وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ. یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُکْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ. (توبہ ۹:۳۴،۳۵) یعنی جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک عذاب کی خبر دے جس دن اس مال کو جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا۔ پھر اس کے ساتھ ان کی پیشانیوں اور ان کے پہلوؤں اور ان کی پیٹھوں پر داغ لگایا جائے گا۔ یہ وہ مال ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔ سو اس کا مزا چکھو جو تم جمع کرتے تھے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَیْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ. (۳:۱۸۰) اور وہ لوگ جو اس میں سے بخل کرتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دیا یہ خیال نہ کریں کہ یہ ان کے لیے اچھا ہے بلکہ وہ ان کے لیے برا ہے۔ قیامت کے دن وہی ان کے گلے کا طوق بنایا جائے گا۔ جس میں وہ بخل کرتے ہیں۔

رسول کریم ﷺ زکوٰۃ نادہندگان کے متعلق فرماتے ہیں۔ مُثِّل له یوم القیمة شجاعًا اَقْرَعَ لَهٗ زبیبتان یطوقه یوم القیمه ثم یاخذبلهزمتیه (یعنی شدقیه) ثم یقول انا مالک انا کنزک ثم تلا وَیَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ الایة (بخاری کتاب الزکوٰۃ، موطا امام مالک کتاب الزکوٰۃ) (وہ دولت) قیامت کے دن اس آدمی کے سامنے ایسے زہریلے ناگ کی شکل میں آئے گی۔ اس کے سر کے بال جھڑ گئے ہوں گے اور اس کی آنکھوں کے اوپر سفید نقطے ہوں۔ پھر وہ سانپ گلے کا ہار بنا دیا جائے گا۔ پھر اس کی دونوں باچھیں پکڑے گا اور کہے گا کہ میں تیری دولت ہوں اور میں ترا خزانہ ہوں۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ الخ.

حدیث میں آتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ اِفْتَرَضَ عَلَیْهِمْ صَدَقَةً تُوْخَذُ مِنْ اَغْنِیَائِهِمْ فَتُرَدُّ فِیْ فُقَرَآئِهِمْ (بخاری ۱:۲۴) کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر صدقہ (زکوٰۃ) فرض کیا ہے کہ وہ ان کے امراء سے وصول کر کے غرباء میں تقسیم کیا جائے۔

قرآن مجید کی آیات یہ ظاہر کرتی ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام نے نماز اور زکوٰۃ کو اپنی اپنی امتوں کے لیے فرض قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم

علیہ السلام اور ان کی نسل کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ (سورۃ الانبیاء ۲۱:۷۳) اور ہم نے انھیں امام بنایا وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے اور ہم نے ان کی طرف نیکیوں کے کرنے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی اور وہ ہماری عبادت کرنے والے تھے۔

موسوی شریعت میں اس کا حکم ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (مائدہ ۵:۱۲) اور اللہ تعالیٰ نے کہا میں تمھارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ اور ان کی مدد کرو اور اچھا مال اللہ کو کاٹ کر دو گے تو میں ضرور تمہاری برائیاں تم سے دور کر دوں گا اور ضرور تم کو باغوں میں داخل کروں گا۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ پس جو کوئی تم میں سے اس کے بعد انکار کرے۔ وہ یقیناً سیدھے راستہ سے بھٹک گیا ہے۔ تورات میں زکوٰۃ کا حکم خروج ۲۳: ۱۰، ۱۱ میں ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا (مریم ۱۹:۳۱) اور مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب تک میں زندہ ہوں۔

انجیل لوقا (۱۸:......۱۰) اور ۲۱ ویں باب کی پہلی آیت متی ۱۹۔۲۴۔ متی ۱۷۔۲۴ میں زکوٰۃ ادا کرنے کی تعلیم ہے۔

زکوٰۃ کن اموال پر فرض ہے: سونا، چاندی، نقدی خواہ سکے کی شکل میں ہو یا نوٹ ہوں۔ مال تجارت پر اور ان جانوروں پر جو سال کا اکثر حصہ چر کر اپنا پیٹ پالتے ہیں اور زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ فرض ہے۔ زمین اور سکنی مکان استعمال کی جانے والی چیزیں جواہرات، ترکاری، سبزیاں، پھل وغیرہ پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

اسلام نے نہایت ہی حکمت بالغہ سے ان اشیاء پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو کچھ عرصہ تک محفوظ رہ سکتی ہیں اور ان سے اور ان میں ترقی ونشوونما کی صلاحیت موجود ہو جو اشیاء زیادہ عرصہ محفوظ نہ رہ سکتی ہوں اور ان میں ترقی اور نشوونما کی صلاحیت بھی موجود نہ ہو۔ ان پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

نصاب زکوٰۃ: مختلف مالوں کا نصاب زکوٰۃ مختلف ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

چاندی کی صورت میں ۲۰۰ درہم یا ۲/۱ ۵۲ تولے تقریباً ۲۱ اونس

سونے کی صورت میں ۲۰ مثقال یا ساڑھے سات تولے تقریباً ۳ اونس

نقدی اور مال تجارت کی صورت میں قیمت کا شمار اور نصاب چاندی کے معیار پر ہوگا۔

زیورات اگر چاندی کے ہیں تو چاندی کا نصاب اگر سونے کے زیور ہیں تو سونے کا نصاب ہوگا۔

حیوانات کی صورت میں نصاب اونٹوں کے لیے پانچ، بیلوں اور گائیوں کے لیے تیس اور بکریوں کے لیے چالیس ہے۔

زمین: زمین کی دو قسمیں ہیں۔ وہ زمین جو بارش یا قدرتی چشموں سے سیراب ہوتی ہے تو حکومت اس کی پیداوار کا دسواں حصہ لے گی۔ جب زمین کنوؤں یا مصنوعی ذرائع سے سیراب ہوتی ہو تو اس سے پیداوار کا بیسواں حصہ لیا جاتا ہے۔

رکاز (دفینہ): اسلامی تعلیم کی رو سے اگر کسی کو دفینہ مل جائے تو حکومت اس کے پانچویں حصہ کی مالک ہوگی۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ ان رسول اللہ ﷺ قال...... فی الرکاز الخمس. کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا...... کہ دفینہ میں اسلامی حکومت کا پانچواں حصہ ہے۔

مصارف زکوٰۃ: اسلام دولت اور وسائل دولت دونوں کو اللہ تعالیٰ کی ملک قرار دیتا ہے۔ انسان اس دولت کا امین ہے اس لیے انسان احکام شریعت کے مطابق ہی اس میں تصرف کر سکتا ہے۔ اگر احکام شریعت کے خلاف تصرف کرے گا تو وہ اسلام کی نظر میں خائن ہوگا۔ حکومت بھی اسی قاعدہ کے تحت امین ہے اس کی جو آمدنی ہے۔ وہ احکام الٰہی کے مطابق ہی صرف ہوگی۔ بعض تصرفات تو قرآن نے واضح طور پر بیان کر دیے ہیں۔ بعض کی وضاحت نہیں امیر مملکت کو اختیار حاصل ہے کہ حالات کے مطابق مسلمانوں اور ملک کی بہبود کے لیے خرچ کرے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ. (توبہ ۹:۶۰) زکوٰۃ ناداروں کے لیے ہے اور مسکینوں اور اس کے کارکنوں کے لیے اور ان کے لیے جن کی تالیف

قلب ضروری ہے اور غلاموں کے آزاد کرنے اور قرض داروں کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے یہ اللہ کی طرف سے ضروری ٹھہرایا گیا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

مصارف زکوٰۃ کی تفصیل باب عبادت میں زیر عنوان زکوٰۃ میں بیان کی جا چکی ہے۔

زکوٰۃ کی وصولی اور ادائیگی کا مسئلہ: اسلامی حکومت کی موجودگی میں کوئی ادارہ زکوٰۃ وصول کر کے عامۃ الناس کی بھلائی پر خرچ نہیں کر سکتا۔ زکوٰۃ صرف حکومت وصول کر سکتی ہے۔ عہد نبوی میں زکوٰۃ بیت المال میں جمع ہوتی تھی اور آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جب مسلمان عرب قبائل نے حکومت کو زکوٰۃ دینے سے انکار کیا اور اس مالیاتی نظام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تو خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ نے ان لوگوں کو حکومت کا باغی قرار دے کر ان کے خلاف اعلان جہاد کیا اور اس وقت تک ان کی سرکوبی کی جب تک انھوں نے زکوٰۃ بیت المال میں بھیجنی شروع نہ کر دی۔

جب حضرت عثمانؓ شہید ہو گئے تو مسلمان حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہ کی حمایت میں دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ اس انتشار اور سیاسی عدم استحکام کے زمانہ میں صحابہ کرام کے درمیان یہ سوال اٹھا کہ زکوٰۃ کس کو دی جائے۔ اہل مدینہ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے اس بارے میں استفسار کیا تو انھوں نے یہ فتویٰ دیا۔ مسلمانوں کی حکومت کیسی ہو۔ زکوٰۃ بہرحال حکومت کو ادا کی جائے گی۔

اہل حجاز کے لیے ایک عملی دشواری یہ تھی کہ حجاز پر کبھی حامیان معاویہؓ غالب آ جاتے اور کبھی شیعان علیؓ اور دونوں حکومتیں ایک دوسرے کو باغی سمجھتی تھیں۔ ایسی حکومتوں میں سے کس کو زکوٰۃ ادا کی جائے۔

جب یہ مسئلہ دوبارہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے سامنے پیش ہوا تو انھوں نے جواب دیا کہ "جو غالب آ جائے اسے زکوٰۃ دے دو۔"

(ابوعبیدہ کتاب الاموال ج ۲ ص ۳۴۹)

ایک دفعہ ربیع بن معید نے اس فتنے کے دور میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے دریافت کیا کہ وہ اپنے زیر نگرانی یتیموں کے مال کی زکوٰۃ اپنے ضرورت مند عم زاد بھائیوں کو دے دوں۔ تو آپ نے فرمایا "زکوٰۃ صرف حکومت کا حق ہے۔ اسے اہل حکومت کے حوالے کر دو۔" (ابوعبیدہ کتاب الاموال ج ۲ ص ۳۴۳)

غرضیکہ مسلمانوں کا اس امر پر اجماع ہے کہ زکوٰۃ صرف اسلامی حکومت کو ادا کرنی چاہیے زکوٰۃ کی وصولی کا اور کوئی حق نہیں رکھتا۔

زکوٰۃ کو انفرادی طور پر جمع کرنے اور خرچ کرنے کا رواج سقوط بغداد کے بعد ہوا۔ جب مسلمانوں کا سیاسی شیرازہ منتشر ہو گیا تو مسلمانوں نے غیر مسلم حکومتوں کو زکوٰۃ دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے بعد زکوٰۃ کی وصولی حکومتوں کے ہاتھ نہیں آئی۔ یہی وجہ ہے اسلامی حکومتوں کی معاشی حالت درست نہیں ہوتی۔ اگر اسلامی حکومتیں زکوٰۃ کی وصولی اپنے ہاتھ میں لے لیں تو ہر اسلامی حکومت اپنے ملک سے غربت اور افلاس کو ختم کر سکتی ہے۔

طوعی انفاق

(الف) صدقات: لازمی انفاق (زکوٰۃ) کے علاوہ محتاجوں اور ضرورت مندوں پر خرچ کرنا طوعی انفاق کہلاتا ہے۔ جس کی تاکید قرآن اور حدیث میں بہت بیان ہوئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ ۲:۲۷۴) وہ لوگ جو اپنا مال دن رات پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں پس ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے اور ان پر نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً (فاطر ۳۵:۲۹) اس سے جو ہم نے انھیں دیا چھپ کر اور اعلانیہ خرچ کرتے ہیں۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ ۲:۲۱۹) وہ تجھ سے سوال کرتے ہیں کیا خرچ کریں کہہ دیجیے جو کچھ ضرورت سے زائد ہو خرچ کرو۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکٰوةِ ثُمَّ تَلَا لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ الآیۃ (مشکوٰۃ ۶:۶ بروایت ترمذی) زکوٰۃ کے علاوہ مال میں حق ہے پھر یہ آیت پڑھی "یہ نیکی نہیں کہ تم اپنے مونہوں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو آخر آیت تک)

پس زکوٰۃ اور خیرات دو الگ الگ چیزیں ہیں مذکورہ حدیث واضح کرتی ہے کہ ہر انسان کے مال میں دوسروں کے دو حق ہیں۔ ایک حق زکوٰۃ ہے جو حکومت کے زیر اہتمام جمع کی جاتی ہے اور توبہ کی آیت نمبر ۶۰ کے تحت خرچ کیا جاتا ہے۔ خیرات (طوعی انفاق) انسان اپنے طور پر اقرباء، مساکین، یتامی، بیواؤں اور دیگر حاجت مندوں پر خرچ کرتا ہے۔

مختلف حاجت مند طبقوں پر خرچ کرنے کے متعلق قرآن اور حدیث میں تاکید ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ (۲:۱۷۷) لیکن بڑا نیک وہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت کے لیے قریبیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوالیوں کو اور غلاموں کے آزاد کرنے میں مال دے اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ اس آیت کریمہ میں دونوں قسم کے انفاق لازمی اور طوعی کا ذکر کیا ہے۔ طوعی انفاق کی مدات بھی بیان کر دی ہیں۔

ایک اور موقع پر فرمایا۔ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (البقرہ۲:۲۱۵) کہو جو کچھ بھی اچھے مال سے خرچ کرو وہ ماں باپ اور قریبیوں اور یتامی اور مساکین اور مسافر کے لیے ہے۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ (الروم:۳۸) پس تو اقربا اور محتاج اور مسافر کو دے۔

حدیث میں آتا ہے عن ابی موسٰی عن النبی ﷺ قال علی مسلم صدقۃ فقالوا یانبی اللہ فمن لم یجد فقال یعمل بیدہ فینفع نفسہ ویتصدق قالوا فان لم یجد قال یعین ذا الحاجۃ الملھوف قالوا فان لم یجد قال فلیعمل بالمعروف ولیمسک عن الشر فانھا لہٗ صدقۃ (بخاری ۲۴:۳۱) ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہر مسلمان پر صدقہ لازم ہے لوگوں نے عرض کیا اے اللہ کے نبی جس کے پاس مال نہ ہو۔ فرمایا اپنے ہاتھ سے مزدوری کرے اپنے آپ کو بھی فائدہ پہنچائے اور صدقہ بھی دے اور انھوں نے عرض کیا اگر یہ نہ ملے فرمایا حاجت مند مصیبت زدہ کی امداد کرے انھوں نے عرض کیا (اگر یہ بھی) نہ ہو سکے فرمایا نیک کام کرے اور برائی سے بچا رہے یہی اس کے لیے صدقہ ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ قال اللہ تعالیٰ انفق یا ابن ادم اُنْفِقْ عَلَيْكَ (بخاری و مسلم) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے آدم (میرے ضرورت مند بندوں) پر خرچ کر۔ میں (اپنے خزانہ سے) تجھ کو دیتا رہوں گا۔

عن اسماء قالت قال رسول اللہ ﷺ انفقی ولا تحصی فیُحصی اللہ علیک ولا توعی فیوعی اللہُ علیک ارضخی ما استطعت (بخاری و مسلم) حضرت اسماء سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خرچ کرو اور گنومت (اگر تم گنو گے) یعنی حساب کتاب کر کے دو گے تو اللہ تعالیٰ بھی تمھیں حساب سے ہی دے گا۔ (دولت) بند کر کے نہ رکھو۔ بس اللہ بھی تجھ پر (اپنی نعمت و مال) بند کر دے گا جس کی بھی تم طاقت رکھتے ہو کشادہ دستی سے دو۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ مانقصت صدقۃ من مال (مسلم) صدقہ سے مال میں کمی نہیں آتی۔

عن مرثد بن عبداللہ قال حدثنی بعض اصحاب رسول اللہ ﷺ انہ سمع رسول اللہ ﷺ یقول ان ظل المومن یوم القیمۃ صدقتہٗ (احمد) مرثد بن عبداللہ (تابعی) بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ کے بعض اصحاب نے بیان کیا کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ بات سنی ہے کہ قیامت کے دن مومن پر اس کے صدقہ کا سایہ ہوگا۔

فرمایا۔ ان الصدقۃ لتطفی غضب الرب وتدفع میتۃ السوء (ترمذی) صدقہ اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور بری موت کو دور کرتا ہے۔

جیسا کہ پہلے اس باب کے آغاز میں مسلم کی حدیث درج کی ہے کہ صاحب استطاعت ہوتے ہوئے ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا نہ کرنا اللہ کی ناراضی کا موجب ہے۔

رسول کریم ﷺ اپنے متعلق طوعی انفاق کی کیفیت ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔ اگر احد پہاڑ بھی میرے لیے سونا بن جائے تو میری خوشی اس میں ہوگی کہ میں اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دوں اور تین راتیں بھی گزرنے نہ پائیں اس میں ایک دینار یا ایک درہم بھی میرے پاس رہ جائے۔ سوائے اس کے کہ اگر میرے ذمہ کوئی قرض ہو تو اسے ادا کرنے کے لیے بچا لوں۔ (بخاری)

صدقات پر کتنا خرچ کیا جائے: جس طرح رسول کریم ﷺ نے زکوٰۃ کی حد مقرر کی ہے اسی طرح طوعی انفاق کی بھی حد مقرر کر دی ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔ وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ۲:۲۱۹) اور اے محمد! وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں (کار خیر میں) کہہ دیجیے جو کچھ ضرورت سے زائد ہے۔

اسلام نے طوعی انفاق میں اسراف اور تبذیر سے روکا ہے اور میانہ روی اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (الفرقان:۶۷) وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو اسراف سے کام نہیں لیتے اور تنگی بھی نہیں کرتے (اگر خرچ

کرنے کا موقعہ ہو تو خرچ نہیں کرتے) بلکہ وہ دونوں حالتوں کے بین بین اعتدال پر رہتے ہیں۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلَى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَحْسُوْرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۲۹) اور اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے باندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اسے حد سے زیادہ کھول دے ورنہ ملامت کیا ہوا اور ماندہ ہو کر بیٹھ رہے گا۔

جابر بن عبداللہ انصاری روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص انڈے برابر سونا لے کر آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ سونا میں نے ایک کان میں پایا ہے آپ اس کو لیجئے یہ صدقہ ہے اس کے سوا میرے پاس کچھ مال نہیں ہے رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ وہ پھر پیچھے سے آیا رسول اللہ ﷺ نے وہ سونا لے کر پھینک دیا اگر وہ اس کو لگتا تو زخمی کر دیتا یا چوٹ آ جاتی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ایک تم میں سے اپنا سب مال لے کر آتا ہے اور کہتا ہے یہ صدقہ ہے پھر بیٹھ کر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ بہتر صدقہ وہ ہے جس کا مالک صدقہ دے کر بھی مال دار رہے۔ (سنن ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ)

فرمایا انما الصدقة عن ظهر غنى (کنوز الحقائق) صدقہ اس وقت دینا چاہیے کہ خود بعد صدقہ غنی رہے۔

ان شئت حبست اصلها وتصدقت (کنوز الحقائق) اگر تو چاہے اس کے اصل کو محفوظ رکھ اور اس کے حاصلات کو صدقہ کر۔

صدقات سے گریز کرنے والوں کے متعلق: اسلام نے صرف طوعی انفاق (صدقات) کی ہی تعلیم نہیں دی بلکہ صدقات سے گریز کرنے والوں کے متعلق تہدید بھی کی ہے کیونکہ ضرورت مند پر خرچ نہ کرنا جذبہ اخوت اور ایثار اور تعاون کے خلاف ہے۔ جن پر اسلامی معیشت کی اساس ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَأَنْفِقُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرہ ۲:۱۹۵) اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں نہ ڈالو۔

اس آیت میں انفاق سے گریز کو ہلاکت کا موجب قرار دیا گیا ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران ۳:۹۱) تم ہرگز بھلائی نہ پا سکو گے جب تک کہ اس شے میں سے خرچ نہ کرو جس کو تم پسند کرتے ہو۔

نِ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهٗ أَخْلَدَهٗ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ (الھمزہ: ۲ تا ۴) جو مال کو جمع کرتا ہے اور اسے شمار میں لاتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس ہمیشہ رہے گا ہرگز نہیں وہ حطمہ (اللہ کی جلائی ہوئی آگ) میں ڈالا جائے گا۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيْلًا (قصص ۲۸:۵۸) بہت سی بستیاں ہم نے ہلاک کیں جو اپنی (وافر) روزی کے سامان پر گھمنڈ کرتی تھیں سو یہ ان کے مکانات ہیں جو ان کے بعد آباد نہیں ہوئے مگر بہت کم اور ہم ہی وارث ہیں۔

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے جن لوگوں کو روزی کا سامان زیادہ مل گیا ہے۔ وہ اس پر اترانا شروع کر دیتے ہیں اس کو اپنی طاقت اور عقل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور دوسرے حاجت مندوں کو دینے سے گریز کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان گریز کرنے والوں کو تنبیہ کر رہا ہے۔ ان کا غرباء کو نہ دینا ان کی ہلاکت کا ذریعہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ (التوبۃ: ۳۴) اور جو لوگ سونے چاندی کا خزانہ کرتے ہیں اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو خبر کر دو کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ ليس المومن بالذى يشبع وجاره جائع الى جنبه وهو يعلم (رواہ البزار والطبرانی فی الکبیر) ایسا شخص مجھ پر ایمان نہیں لایا جو خود تو سیر ہو کر سوئے اور اس کے پہلو میں اس کا پڑوسی بھوکا رہے جبکہ وہ جانتا ہے۔

قریب قریب انہی الفاظ میں امام بخاری نے "الادب المفرد" میں بیہقی نے "شعب الادب" اور حاکم نے مستدرک میں یہ مضمون بیان کیا ہے۔

فرمایا "قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک انسان سے پوچھے گا۔ اے ابن آدم! میں بیمار ہو گیا تھا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی۔ بندہ حیران ہو کر کہے گا بھلا ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے اور تُو تو رب العالمین ہے۔ خدا فرمائے گا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہو گیا تھا اور تُو نے اس کی بیمار پرسی نہ کی۔ اگر تو اس کی بیمار پرسی کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اسی طرح خدا فرمائے گا اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تُو نے نہیں کھلایا بندہ عرض کرے گا بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے میں تجھے کیسے کھلاتا تُو خود رب العالمین ہے خدا فرمائے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ فلاں میرے بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے

کھلانے سے انکار کر دیا تھا اگر تُو اسے کھانا کھلاتا تو تُو اسے میرے پاس پاتا۔ ایسے ہی خدا فرمائے گا اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا مگر تُو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ بندہ عرض کرے گا بھلا ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ تجھے پیاس لگے تُو تو خود پروردگار عالم ہے۔ خدا فرمائے گا میرے فلاں پیاسے بندہ نے تجھ سے پانی مانگا لیکن تو نے اسے پانی نہیں پلایا اگر تو اسے پانی پلا دیتا تو اسے میرے پاس پاتا۔ (مسلم عن ابی ہریرہ)

حدیث میں آتا ہے۔ **قال رجل یارسول اللہ ای صدقة اعظم اجراً قال ان تصدق وانت صحیح شجیع تخشی الفقر وتامل الغنی ولا تمھل حتی اذا بلغت الحلقوم قلت لفلان کذا ولفلان کذا وقد کان لفلان** (بخاری ومسلم) ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ کس صدقہ کا ثواب زیادہ ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ زیادہ ثواب کی صورت یہ ہے کہ تم ایسی حالت میں صدقہ کرو جبکہ تم تندرست ہو اور دولت چاہتے ہو۔ اپنے پاس رکھنے کی خواہش ہے۔ اس حالت میں تمھیں فقر کا خوف ہو۔ دولت مندی کی آرزو ہو۔ (ایسی حالت میں صدقہ کا ثواب زیادہ ہے) اور ایسا نہ ہونا چاہیے کہ تم ٹالتے رہو۔ یہاں تک کہ موت کا وقت آ جائے تو تم کہو کہ اتنا فلاں کو اور اتنا فلاں کو (اب تمہارا مال) فلاں فلاں کا ہو جائے گا۔

عن اسماء قالت قلت یارسول اللہ ﷺ مالی مال الا ما ادخل علی الزبیر فاتصدق قال تصدقی ولا توعی فیوعی علیک. (بخاری) اسماء سے روایت ہے کہا میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میرا کوئی مال نہیں سوائے اس کے جو زبیر مجھے دیتے ہیں تو کیا میں صدقہ دوں فرمایا صدقہ دے اور اللہ کے رستے میں خرچ کرنے کو بند نہ کرو۔ ورنہ تجھ سے بند کر دیا جائے گا۔ (بخاری)

عن ابی امامة قال قال رسول اللہ ﷺ یا ابن ادم ان تبذل الخیر خیرٌ لک وان تمسکه شرٌ لکَ وَلَا تلام علی کفاف وابدءْ بمن تعول (مسلم) حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابن آدم (اللہ کی دی ہوئی دولت) خرچ کر۔ وہ تیرے لیے بہتر ہے اگر تو نے روک لیا۔ (تو تیرا یہ روکنا) تیرے لیے باعث برائی ہے ہاں گزارے کے بقدر رکھنا کوئی ملامت نہیں۔ سب سے پہلے ان پر خرچ کرو جن کی تم پر ذمہ داری ہے۔

عن ابی ذر قال انتھیت الی النبی ﷺ وھو جالسٌ فی ظل الکعبة فلما ارانی قال ھم الاخسرون ورب الکعبه فقلت فداک ابی وامی من ھم قال ھم الاکثرون اموالاً الامن قال ھکذا وھکذا وھکذا من بین یدیه ومن خلفه وعن یمینه وعن شماله وقلیل ماھم. (بخاری و مسلم) حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ میں ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ اس وقت کعبہ کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے جب مجھے دیکھا تو فرمایا رب کعبہ کی قسم! وہ لوگ بڑے گھاٹے میں ہیں؟ میں نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں کون لوگ ہیں جو بڑے گھاٹے میں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا وہ لوگ جو بڑے دولت مند اور سرمایہ دار ہیں ان میں سے وہی لوگ گھاٹے سے محفوظ ہیں جو اپنے آگے پیچھے اور دائیں بائیں اپنی دولت کشادہ دستی سے خرچ کرتے ہیں۔ مگر دولت مندوں میں ایسے بندے بہت کم ہیں۔

عشر (زمین کی زکوٰۃ): عشر کے لغوی معنی ہیں دسواں حصہ۔ لیکن اصطلاح میں اس سے مراد پیداوار کی زکوٰۃ ہے وہ اراضیات جو بارش سے سیراب ہوتی ہوں چونکہ اس کی پیداوار میں محنت کا حاصل نسبتہً کم ہوتا ہے اس کی شرح ۱۰ (دس) فیصد رکھی گئی ہے اور وہ زمین جو محنت سے سیراب ہوتی ہو تو کل پیداوار کا بیسواں حصہ بیت المال میں جائے گا۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (۲:۲۶۷) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ان اچھی چیزوں سے خرچ کرو جو تم کماتے ہو اور اس سے جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالا۔

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ (۶:۱۴۱) اس کے کاٹنے کے دن اس کا حق دو۔

مفسرین کا اس پر اتفاق ہے اس سے مراد پیداوار کی زکوٰۃ (عشر) ہے۔

عشری اراضیات کی دو اقسام ہیں۔

(الف) غیر عشری: ایسی زمین جسے نہری یا ٹیوب ویل کا پانی لگا کر اور ہل جوت کر محنت کر کے فصل حاصل کی جائے اس میں نصف عشر یعنی بیسواں حصہ ہے۔

(ب) عشری زمین: ایسی زمین جو بارش یا چشمے کے پانی سے سیراب ہوتی ہے اس کو عشری زمین کہتے ہیں۔ ان میں عشر (دسواں حصہ) ہے۔

رسول اکریم ﷺ فرماتے ہیں۔ "**فیما سقت السماء والعیون اوکان عشر یا العشر وما سقی بالنضح نصف العشر**" (بخاری کتاب الزکوٰۃ) جو زمین بارش سے سیراب ہوتی ہو یا چشمے کا پانی دیں یا وہ عشری زمین ہو (تر و تازہ ہو یا نیچے سے طراوت حاصل کرے) اس میں دسواں حصہ ہے اور جس زمین کو کنوئیں وغیرہ سے سیراب کیا جائے تو اس میں نصف عشر (بیسواں) ہے۔

امام ابو یوسف اپنی کتاب ''کتاب الخراج'' میں ایک حدیث بیان کرتے ہیں۔ ''ان رسول اللہ ﷺ قال فیما سقت السماء العشر وما سقی بالرشاء نصف العشر'' (ص ۵۴) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس زمین کو بارش سیراب کرتی ہو اس کی پیداوار کا دسواں حصہ اور جس زمین کی آب پاشی پانی کھینچ کر کی گئی ہو اس کی پیداوار کا بیسواں حصہ۔

نصاب عشر: امام ابو حنیفہؒ اور امام زفرؒ کے نزدیک کھیتوں کی پیداوار کا کوئی نصاب نہیں اور ہر پیداوار خواہ تھوڑی ہو یا زیادہ پر عشر واجب ہے جبکہ امام ابو یوسف اور امام شافعی کے نزدیک عشری زمین کی پیداوار پانچ وسق یعنی ۳۰ من (۱۲۰۰ کلو گرام) تک پہنچ جائے تو عشر واجب ہے لیکن سبزیوں وغیرہ میں عشر نہیں پھلوں میں کھجور اور انگور اور سیب وغیرہ اور اجناس میں سے ہر ایک جنس جو ذخیرہ کے طور پر رکھی جائے جیسے گندم، مکئی، جوار، باجرہ، جو، مسور، ماش، لوبیا، گنا اور کپاس وغیرہ میں عشر ہے۔

عشر میں سال گزرنے کی قید نہیں ہے بلکہ جن اراضیات میں سال کے اندر دو بار کاشت کی جاتی ہے ان میں ہر فصل پر عشر واجب ہے۔
عشر کے مصارف بھی وہی ہیں جو زکوٰۃ کے مصارف ہیں۔

وراثت: اسلام عدل اجتماعی کی تعلیم دیتا ہے۔ پھر عدل اجتماعی قائم کرنے کے لیے مختلف طریقے بیان کیے ہیں اور وہ ایسے طریقے ہیں جن سے دولت چند ہاتھوں سے نکل کر بہتوں کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے ان طریقوں میں سے ایک طریقہ وراثت ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (الحشر:۷) تاکہ دولت تم میں سے امراء کے اندر نہ پھرتی رہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۰

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۰ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ.

(النساء۴:۱۱،۱۲) اللہ تمہاری اولاد کے متعلق تمھیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر ہو۔ پھر اگر (اولاد میں) دو یا اس سے زیادہ عورتیں ہوں تو ان کے لیے اس کی دو تہائی ہے جو (مال) چھوڑا اور اگر ایک ہو تو اس کے لیے نصف ہے اور اس کے ماں باپ کے لیے دونوں میں سے ہر ایک کے لیے اس کا چھٹا حصہ ہے جو (مال) چھوڑا ہے اگر اس کی اولاد ہو لیکن اگر اس کی اولاد نہ ہو اور اس کے ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کے لیے تیسرا حصہ ہے اور اگر اس کے بھائی ہوں تو اس کی ماں کے لیے چھٹا حصہ ہے وصیت کی ادائیگی کے بعد جو اس نے کی ہو یا قرضہ کے اور تمھارے لیے اس کا نصف ہے جو تمہاری بیویاں چھوڑیں اگر ان کی اولاد نہ ہو اور ان کی اولاد ہو تو تمھارے لیے اس کا چوتھا حصہ ہے جو انھوں نے چھوڑا ہے۔ وصیت کی (ادائیگی) کے بعد جو انھوں نے کی ہو یا قرضہ کے اور ان کے لیے اس کا چوتھا حصہ ہے جو تم نے چھوڑا اگر تمہاری اولاد نہ ہو اور اگر تمہاری اولاد ہو۔ تو ان کے لیے اس کا آٹھواں حصہ ہے جو تم نے چھوڑا وصیت کی ادائیگی کے بعد جو تم نے کی ہو یا قرضہ کے اور اگر کسی مرد یا عورت جس کی میراث لی جاتی ہے۔ کلالہ ہو اور اس کا بھائی یا بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے اور اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو وہ تہائی میں شریک ہیں وصیت کی ادائیگی کے بعد جو کی گئی ہے یا قرضہ کے۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا.

(النساء۴:۳۳) اور جو کچھ ترکہ ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جائیں تو ان میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے قریبی وارث بنائے ہیں۔ نیز جن سے (عورتوں سے) تمہارا عہد و پیمان (نکاح) ہو چکا ہے پس چاہیے کہ جو کچھ جس کا حصہ ہو اس کے حوالے کر دو اور ہر چیز پر گواہ ہے۔

مذکورہ آیات سے حسب ذیل احکام نکلتے ہیں۔

مرنے والے کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے اس کے ترکے میں سے وہ ادا کیا جائے گا۔ پھر کوئی وصیت اگر اس نے کی ہو تو پوری کی جائے گی اس کے بعد وراثت تقسیم ہوگی۔

وارث کے حق میں وصیت نہیں ہو سکتی حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا حجۃ الوداع کے سال اپنے خطبہ میں فرماتے

تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے پس وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔ (مشکوۃ ۲:۲۰ بروایت ابی داؤد)
اور کوئی کافر کسی مسلمان کا اور نہ مسلمان کسی کافر کا وارث ہو سکتا ہے۔ والدین اور بیوی یا شوہر کا حصہ دینے کے بعد، ترکہ کے وارث میت کی اولاد ہے۔ مرنے والے نے کوئی لڑکا نہ چھوڑا ہو۔ اور اس کی اولاد میں دو یا دو سے زائد لڑکیاں ہی ہوں تو انھیں بچے ہوئے ترکے کا دو تہائی دیا جائے گا۔ ایک ہی لڑکی ہو تو وہ اس کے نصف کا حق دار ہوگی۔ میت کی اولاد میں صرف لڑکے ہی ہوں تو یہ سارا مال ان میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اولاد میں لڑکے لڑکیاں دونوں ہوں تو ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا۔ اس صورت میں بھی سارا مال انہی میں تقسیم ہوگا۔
اولاد کی غیر موجودگی میں میت کے بھائی، بہن اولاد کے قائم مقام ہیں۔ والدین اور بیوی یا شوہر موجود ہوں تو ان کا حصہ دینے کے بعد میت کے وارث یہی ہوں گے۔ مرد اور عورت کے لیے ان کے حصے اور ان میں تقسیم وراثت کا طریقہ وہی ہے جو اولاد کے لیے اوپر بیان ہوا۔
میت کی اولاد یا اولاد نہ ہو اور بہن بھائی ہوں تو والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ دیا جائے گا۔ بھائی بہن بھی نہ ہوں تو بیوی یا شوہر کا حصہ دینے کے بعد باقی ترکے کا ایک تہائی ماں کو ملے گا اور دو تہائی کا حق دار میت کا والد ہوگا اگر میاں بیوی میں کوئی نہ ہو تو سارا ترکہ اسی اصول کے مطابق والدین میں تقسیم کر دیا جائے گا۔
مرنے والا مرد ہو اور اس کی اولاد ہو تو اس کی بیوی کو ترکے کا آٹھواں حصہ ملے گا۔ اس کی اولاد نہ ہو تو وہ ایک چوتھائی ترکے کی حق دار ہوگی میت عورت ہو تو اس کی اولاد نہ ہو تو نصف ترکہ اس کے شوہر کا ہے اگر اس کی اولاد ہو تو شوہر کو چوتھائی ترکہ ملے گا۔
ان دونوں کے علاوہ یا ان کے بعد یا ان کی عدم موجودگی میں مرنے والا اگر چاہے تو والدین اور اولاد کے سوا دور و نزدیک کسی رشتے دار کو ترکے کا وارث بنا سکتا ہے جس رشتہ دار کو وارث بنایا گیا ہو اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو چھٹا حصہ اور ایک سے زیادہ بہن بھائی ہوں تو ایک تہائی انھیں دینے کے بعد باقی ۵/۶ یا دو تہائی اسے ملے گا۔

<u>وصیت:</u> تقسیم دولت کا ایک ذریعہ وصیت ہے۔ یہ ایک خاص اقرار ہے جس کی تنفیذ بعد موت ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا نِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ٥ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ٥ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَاسَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهُ٥ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ٥ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (البقرہ۲:۱۸۰ تا ۱۸۲)
(اے مسلمانو!) تم پر جب تم میں سے کسی پر موت کا وقت قریب آ جائے عمدگی کے ساتھ وصیت کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اگر وہ بہت سا مال ماں باپ کے لیے اور اقربا کے لیے چھوڑے یہ متقیوں پر لازم ہے۔ پھر جو کوئی اس کے بعد جو اس نے سن لیا ہے اسے بدل دے تو اس کا گناہ انہی پر ہے جو اسے بدلتے ہیں۔ اللہ سننے والا جاننے والا ہے مگر جسے وصیت کرنے والے کی طرف سے طرفداری یا گناہ کا خوف ہو پھر وہ ان کے درمیان صلح کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔
آیت نمبر ۱۸۰ میں لفظ خیر آیا ہے جس کے معنی مال کثیر کے ہوتے ہیں۔ جب متوفی اپنے پیچھے والدین اور اقرباء کے لیے مال کثیر چھوڑے تو پھر قومی مذہبی اور فلاحی کاموں کے لیے وصیت کر دے۔ رسول کریم ﷺ نے اس کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کی ہے۔ ماحق امرىءٍ مسلم له شىءٌ يُوْصى فيه يبيت ليلتين إلّا وصيتُهٗ مكتوبة عنده (بخاری ۱:۵۵) ایسے مسلمان کو جس کے پاس مال ہو جس میں اس پر وصیت کرنا ضروری ہو یہ مناسب نہیں کہ دو راتیں گزارے مگر اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہونی چاہیے۔
قرآن مجید کی آیت میں كُتِبَ کا لفظ آیا ہے جو عموماً فرضیت اور وجوب کے لیے آتا ہے اور حدیث میں بھی اسے حق لازم قرار دیا ہے کہ ذی استطاعت پر وصیت واجب ہے۔ اس سے وصیت کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔
وصیت ورثا کے لیے نہیں ہوتی کیونکہ قرآن مجید میں ورثا کے حصص مقرر ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ إنَّ الله قد اعطى كُلَّ ذى حق حقهٗ فلا وصية لوارثٍ (مسند احمد) اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کا حق دے دیا ہے اب کسی وارث کے لیے وصیت نہیں۔
فرمایا: اَلاِضرَار فى الوصية من الكبائر. نقصان پہنچانے کے لیے وصیت کرنا بڑا گناہ ہے۔ فرمایا: "وليس لقاتلٍ وصيةٌ" قاتل کے لیے وصیت درست نہیں۔
سب سے اہم شرط وصیت کے لیے یہ ہے کہ وصیت کرنے والا مقروض نہ ہو۔ قرض کی ادائیگی کے بعد وصیت ہوگی کیونکہ رسول کریم ﷺ نے

فرمان کے مطابق قرض، وصیت اور وراثت دونوں پر مقدم ہے۔

اسلام دین فطرت ہے۔ اس کا کوئی حکم بھی فطرت کے خلاف نہیں۔ اس لیے وصیت بھی ان لوگوں کے لیے ضروری قرار دی ہے جو اپنے پیچھے مالِ کثیر چھوڑے جا رہے ہیں۔ ایسے شخص کو وصیت کرنا جائز نہیں۔ جس سے پسماندگان غربت کا شکار ہو جائیں جیسا کہ آپ ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو فرمایا اِنَّکَ اَنْ تذر ورثتک اغنیاء خیرٌ من ان تذرهم عالة یتکففُوْنَ النَّاسَ (بخاری ۲۳: ۳۶) تو اپنے وارثوں کو غنی چھوڑے تو اس سے بہتر ہے کہ ان کو محتاج چھوڑے اور وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ رسول کریم ﷺ نے اس حدیث میں سعد بن ابی وقاصؓ سے فرمایا۔ الثلث والثلث کبیر او کثیرٌ (بخاری ۲۳: ۳۶) ایک تہائی اور ایک تہائی بھی بہت ہے۔

اس حدیث میں خیراتی وصیت کو ایک تہائی مال تک محدود کر دیا تا کہ ورثا کے لیے بھی مال رہ جائے۔

وقف: وقف کے لغوی معنی روکنے کے ہیں۔ لیکن فقہی اصطلاح میں جو اشیاء منقولہ یا غیر منقولہ ذاتی ملکیت سے نکال کر فی سبیل اللہ دے دی جائیں وقف کہلاتا ہے۔

وقف نہ فروخت ہو سکتا ہے اور نہ ہبہ ہو سکتا ہے۔ اور نہ ورثاء میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ اس کی آمدن وقف کرنے والے شخص کی منشا و ہدایت کے مطابق مصارف خیر میں لائی جائے گی اور وقف کرنے والا شخص اپنے مالکانہ حقوق سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو جاتا ہے۔

وقف کا تصور زمانہ جاہلیت میں عربوں میں نہیں تھا۔ رسول کریم ﷺ نے ہی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق اس کا رواج کیا۔ اب تو یہ تصور تمام دنیا میں پایا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى (الیل ۹۲: ۵) سو جو دیتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے اور اچھی بات کی تصدیق کرتا ہے تو ہم اسے آسانی کی طرف چلائیں گے۔

کتب تفاسیر میں ہے کہ جب یہ آیات "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" (تم ہرگز نیکی نہ پا سکو گے جب تک اس میں سے خرچ نہ کرو جس کو تم محبوب رکھتے ہو) "مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا" (کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے) نازل ہوئیں تو حضرت طلحہؓ نبی کریم ﷺ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے یارسول اللہ! میرا فلاں باغ مجھے بہت عزیز ہے وہ خدا کے لیے دیتا ہوں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "اجعله فی فقراء قومک" اس کو اپنی قوم کے فقراء کے لیے وقف کر دو۔

اسی طرح عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ میرے والد حضرت عمرؓ کو خیبر میں ایک قطعہ زمین ملی، تو وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ مجھے خیبر میں ایک قطعہ زمین ملی ہے اس سے بہتر کوئی جائیداد میں نے نہیں پائی۔ آپ ﷺ اس کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم چاہو تو اصل زمین کو محفوظ (یعنی وقف) کر دو اور اس کی پیداوار کو صدقہ قرار دے دو۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس کو اسی طرح وقف کر دیا اور یہ طے فرما دیا کہ یہ زمین نہ بیچی جائے نہ ہبہ کی جائے نہ اس میں وراثت جاری ہو اور اس کی آمدن فقراء، مساکین، اہل قرابت، غلاموں کو آزاد کرانے کی مد میں، جہاد میں اور مسافروں اور مہمانوں کی خدمت میں خرچ کی جائے جو شخص اس کا متولی ہو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اس کے دستور کے مطابق کھائے اور کھلائے اور وہ مال بننے والا نہ ہو۔ (بخاری ۵۴: ۱۹) حضرت سعد بن عبادہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے تو کون سا صدقہ زیادہ بہتر ہے آپ ﷺ نے فرمایا پانی یعنی (کہیں کنواں کا کھدوا دینا اسی کو وقف کر دینا) چنانچہ انھوں نے ایک کنواں کھدوایا اور کہا یہ میری والدہ ام سعد کے لیے ہے۔

اس طرح حضرت عثمانؓ کے بھی رسول کریم ﷺ کی اپیل پر بئیر رومہ مسلمانوں کے لیے وقف کیا اسی طرح زمین خرید کر مسجد نبوی کی تعمیر کے لیے وقف کی۔

رسول کریم ﷺ اور خلفاء راشدین کے مبارک عہود کے بعد بھی مسلمان امراء نے دل کھول کر مختلف ضرورتوں کے پیش نظر اپنی جائیدادوں سے کچھ حصے وقف کیے۔ ان اوقاف سے مساجد، سرائیں، ہسپتال، یتیم خانوں، مفلوک الحال لوگوں کی ضروریات اور مدارس کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ دور حاضر میں مسلمان ممالک میں وقف کرنے کا رواج بہت کم ہے اسی وجہ سے مسلمان ممالک میں معاشی مسائل حل نہیں ہوتے۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم نے معاشرہ کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک مخصوص اور قلیل طبقہ دولت کے تمام ذرائع پیدائش پر قابض ہے اور ایک بڑا طبقہ نان جویں کا محتاج ہے۔ اگر مسلمان امراء

رسول کریم ﷺ کے جاری کردہ ادارہ وقف کو زندہ کرلیں تو بے شمار معاشی ضرورتیں پوری ہو جائیں گی اور معاشرہ سے معاشی ناہمواریاں ختم ہو جائیں گی۔

ہبہ: ہبہ، وہب سے ہے۔ جس کے معنی ہیں دینا۔ لیکن فقہ کی اصطلاح میں "تملیک بلا عوض" (بغیر کسی قسم کے معاوضہ کے کسی کو کسی چیز کا مالک بنانا) ہے۔
ہبہ عام معنی کی رو سے اسے بھی کہتے ہیں کہ کسی پر قرض ہو یا دین اسے معاف کر دیا جائے اور صدقہ کو بھی کہتے ہیں اور ہدیہ کو بھی۔ امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں ہبہ عام معنوں میں استعمال کیا ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ دولت ایک ہاتھ سے نکل کر دوسروں کے ہاتھوں میں جائے۔
رسول کریم ﷺ نے ہبہ کرنے کے بعد رجوع کو ناپسند قرار دیا ہے۔ لیکن والدین اولاد کو ہبہ کر کے رجوع کر سکتے ہیں جیسا کہ حدیث سے واضح فرمایا "لایحل لرجل مسلم ان یعطی العطیة ثم یرجع فیها الا الوالد فیما یعطی ولده" (مسند احمد، ترمذی) کسی مسلمان مرد کے لیے یہ بات حلال نہیں کہ عطیہ (ہدیہ) دے پھر واپس لے لیکن والد جو اپنی اولاد کو دے رجوع کر سکتا ہے۔
اگر والدین اولاد میں سے کسی ایک بچے کو کوئی چیز ہبہ کرنا چاہے تو یہ جائز نہیں۔ رسول کریم ﷺ کی تعلیم کی رو سے تمام بچوں میں ہبہ کرتے وقت مساوات برتنی چاہئے اگر مساوات کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو ایک اولاد میں باہم نفرت پیدا ہو جائے گی۔ دوم تقسیم دولت کی روح کے بھی منافی ہے حدیث شریف میں ہے۔ "حضرت نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ اس کے والد اس کو رسول کریم ﷺ کے پاس لے گئے اور عرض کیا کہ میں نے اپنا غلام اپنے بیٹے (نعمان) کو بخش دیا ہے تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کیا تو نے اپنی اولاد میں سے ہر ایک کو اتنی چیز بخشی ہے۔" میرے والد نے کہا "نہیں۔" اس پر آپ ﷺ نے فرمایا "تب تم اس کو واپس لے لو۔"
اسلام سے پہلے یہ رواج تھا کہ کسی کو کوئی چیز دیتے وقت یہ کہہ دیتے اَعْمَرْ تُكَهَا یعنی میں نے یہ عمر بھر کے لیے تجھے دے دیا تو اگر کوئی شرط ساتھ نہ ہوتی تو جب وہ شخص جس کے نام پر وہ چیز ہبہ کی گئی ہے۔ مر جاتا تو وہ چیز دینے والے کو یا اس کے ورثاء کو مل جاتی۔ رسول کریم ﷺ نے اس قسم کے ہبہ کو ناپسند کیا ہے اور یہ فیصلہ دیا "حضرت جابر سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عمریٰ کے بارہ میں فیصلہ کیا کہ وہ اس کے لیے ہے جسے ہبہ کیا جائے۔ (بخاری ۳۲:۵۱) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے عمریٰ کو ایسی صورت میں جائز قرار دیا ہے کہ وہ چیز ہمیشہ کے لیے اس کی ہو جائے جسے دی گئی ہے۔
ایک اور قسم کا ہبہ رقبیٰ کہلاتا ہے۔ یعنی اگر دینے والا پہلے مر جائے تو جسے دیا گیا ہے اس کا ہو گیا اور اگر جسے دیا گیا وہ پہلے مر جائے تو وہ دینے والے کا ہو گیا گویا ہر ایک دوسرے کی موت کا انتظار کرتا تھا اسلام نے اسے بھی ناجائز قرار دیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا لَا تُرْقِبُوْا وَلَا تُعْمِرُوْا فَمَنْ اُرْقِبَ شَیْئًا اَوْ اُعْمِرَ شَیْئًا فَهُوَ لِوَرَثَتِهٖ (ابوداود، نسائی) نہ رقبیٰ کرو اور نہ عمریٰ کرو کیونکہ جب کوئی چیز رقبیٰ کرے یا عمریٰ کرے تو یہ اس کے وارثوں کے لیے ہے۔

کفارات: غرباء تک دولت کو پہنچانے کا ایک ذریعہ کفارات ہیں کوئی شخص بلا عمد کسی مسلمان کو قتل کر دے یا قسم کھا کر اسے توڑ دے رمضان کے مہینے میں روزہ رکھ کر توڑ دے یا اپنی بیوی سے ظہار کرے تو ان صورتوں میں مال کا ایک حصہ غرباء کے لیے خرچ کرنا ضروری قرار دیا ہے۔

صدقۃ الفطر: عیدالفطر کے موقع پر صاحب نصاب لوگوں پر محتاجوں کے لیے صدقۃ الفطر دینا واجب قرار دیا گیا ہے۔ نماز عید کو جانے سے پہلے فی کس پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ضرورت مندوں پر خرچ کریں۔ یہ رقم صرف اپنی طرف سے نہیں بلکہ گھر کے ہر فرد کی طرف سے نکالی جاتی ہے۔

نفقات: اسلام نے ہر انسان پر کچھ ذمہ داریاں عائد کی ہیں وہ اپنے اقرباء کی معاشی کفالت کرے۔ بعض ذمہ داریاں تو وہ ہیں جو واجب ہیں مثلاً بیوی اولاد والدین کی کفالت کرنا بعض ذمہ داریاں معاشی خوش حالی کے ساتھ مشروط ہیں کہ اپنے خاندان کے دور کے نادار رشتے داروں کی ضروریات کو پورا کیا جائے۔

عفو (ضرورت سے زائد خرچ کرنا) اسلام کا ایک انقلابی قدم

عفو (زائد از ضرورت) مال کی تقسیم اقتصادی شعبہ میں ایک انقلاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کی مثال دنیا کے دوسرے کسی معاشی شعبہ میں نہیں ملتی۔ قرآن مجید کی رو سے عفو (مال) صاحب ثروت کی ملکیت نہیں رہتا بلکہ یہ دولت حکومت کی ہو جاتی ہے تاکہ ملک کے حاجت مندوں کی بھلائی پر خرچ کیا جا سکے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے فلاحی ریاست کا تصور اسلام نے دیا۔
ابن حزم نے اپنے واسطے سے رسول کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ ان رسول اللہ ﷺ قال من كان له فضل ظهر فليعد به على من لاظهر له ومن كان فضل من زاد فليعد به على من لازاد له قال فذكر من اصناف المال ماذكر حتى راينا انه لاحق لاحد عنا فى فضل. یعنی

ابوسعید خدریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے کہ جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ سواری ہو وہ زائد سواری کو اس کو دے دے جس کے پاس سواری نہیں ہے اور جس کے پاس اپنی ضرورت سے زائد خوراک ہو وہ زائد خوراک ان کو دے دے جن کے پاس خوراک نہیں ہے۔ (ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں) کہ اس کے بعد رسول کریم ﷺ نے دولت اور ذخیرے کی تمام اقسام کی تفصیل بتا دی جسے سن کر ہمیں یقین ہو گیا کہ زائد مال پر ہمارا کوئی حق نہیں رہا۔ (المحلی ۶/۱۵۸)

امام صاحب اس حدیث سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ''راینا'' کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تمام صحابہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ ''ضرورت سے زیادہ مال کسی کی ملکیت میں نہیں رہتا اور امام صاحب خود بھی اس حدیث کے وسیع مفہوم پر ایمان رکھتے ہیں۔'' (المحلی ۶/۱۵۸/۳ تا ۴)

حضرت عمرؓ کا فرمان: قال عمر بن الخطاب لو استقبلت من امری ما استدبرت لاخذت فضول اموال الاغنیاء فقسمتها علی فقراء المهاجرین. یعنی مجھے (عمر) پہلے ہی اس امر کا علم ہو جاتا جو بعد کو ہوا تو میں اغنیاء کی زائد دولت چھین کر نادار مہاجروں میں تقسیم کر دیتا۔ (المحلی ۶/۱۵۸/۷ تا ۱۰)

امام ابن حزم حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ اور تین سو جلیل القدر صحابہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وصح عن ابی عبیده بن الجراح وثلثماة من الصحابة ان زادهم فی فامرهم ابوعبیده فجمعوا اوزاد هم فی مزودین وجعل بقوتهم ایاها علی السواء فهذا اجماع مقطوع من الصحابة لا مخالف لهم منهم. ایک (خشک سالی کی وجہ سے) غلہ کی قلت ہو گئی جس پر ابوعبیدہؓ نے سب کو حکم دے دیا کہ جتنا کچھ غلہ کسی کے پاس ہے اسے حکومت کے دو غلہ سٹاکوں میں جمع کر دے۔ اس کے بعد غلہ سٹاکوں سے ہر ایک فرد کو مساوی طور پر غلہ مہیا کیا جاتا تھا۔ اس واقع کو نقل کرنے کے بعد حضرت امام ابن حزم لکھتے ہیں یہ صحابہ کا قطعی اجماع ہے جس پر کسی ایک شخص نے بھی اختلاف نہیں کیا۔

قرآن مجید میں فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (ان کے مالوں میں سائلین اور محرومین کا حق ہے) کے الفاظ میں بیان کیا ہے اس لیے بعض مسلم مفکرین نے یہ کہا کہ اگر کوئی سرمایہ دار اپنے اس حق کو ادا نہیں کرتا تو وہ باغی ہے۔ محتاج کو یہ حق حاصل ہے کہ سرمایہ دار سے اپنا حق چھین لے۔ ابن حزمؒ فرماتے ہیں۔ ویقولون من عطش فخاف الموت ففرض علیه ان یاخذ الماء حیث وجده وان یقاتل علیه (المحلی ۶/۱۵۹/۱۲ تا ۱۳) فقیہ کہتے ہیں کہ پیاس کی وجہ سے جس کی موت یقینی ہو جائے تو اس کا فرض ہے کہ جہاں سے پانی ملے اسے حاصل کرے خواہ اس کی مقاتلہ تک نوبت کیوں نہ آ جائے۔

امام ابن حزم المحلی ۶/۱۵۹/ ۱۴ تا ۱۶ میں مزید وضاحت کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں اگر فقہاء کے نزدیک پیاس کی صورت میں دوسرے سے مقاتلہ کی اجازت ہے تو بھوک اور تن ڈھانپنے کے لیے سرمایہ داروں سے لڑنے کی اجازت کیوں نہیں۔ کیا اس تفریق کے لیے فقہاء کے پاس اجماع صحابہ قرآن سنت اور قیاس کی کوئی سند ہے؟ آپ ﷺ فرماتے ہیں یقیناً تمام بنیادی ماخذ اس تفریق کے مخالف ہیں۔

حضرت امام ابن حزمؒ ضروریات زندگی کے پورے نہ ہونے کی وجہ سے مضطر شخص کے متعلق فرماتے ہیں۔ وله ان یقاتل علی ذالک فان قتل فعلی قاتله القود وان قتل المانع فالی لعنة الله لانه ینع حقًا وهو طائفة باغیة یعنی بھوک اور پیاس سے مضطر شخص کو اجازت ہے کہ غذا کے حصول کے لیے مالدار سے دست و گریبان ہو اب اگر اس راہ میں وہ قتل ہو جائے تو صاحب مال سے قصاص لیا جائے گا۔ لیکن اگر مالدار (مضطر کے ہاتھوں) مارا جائے تو کوئی قصاص نہیں۔ اس پر خدا کی لعنت۔ (المحلی ۶/۱۵۹/ ۲۰ تا ۲۲)

امام صاحب نے سورہ حجرات کی آیت ۹ فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي (یعنی ایک فریق جب دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے باغی کو قتل کر دیا جائے) کی رو سے صاحب مال غرباء کا حق ادا نہ کرنے والے کو باغی قرار دیا ہے۔ کیونکہ حق ادا نہ کرنے کی پہل مالدار نے کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ مانع الحق باغ علی اخیه الذی له الحق وبهذا قاتل ابوبکر مانع الزکوة وبالله تعالی التوفیق. (المحلی ۶/۱۵۶/ ۲۲ تا ۲۵) یعنی جس شخص نے اپنے غریب بھائی کا حق مارا وہی باغی ہے (اس قرآنی حکم کو مدنظر رکھ کر) حضرت ابوبکرؓ نے زکوٰۃ روکنے والوں سے لڑائی کی تھی۔ اللہ کی توفیق سے ایسا ہونا چاہیے۔

مضطر مالدار سے الجھنے اور دست و گریبان ہی کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب اسلامی حکومت حاجت مندوں کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے مالداروں سے ''عفو'' وصول کرنے کا کوئی بندوبست نہیں کرتی تو اس وقت فقہاء کے نزدیک اضطراری حالت میں مال داروں سے الجھنے کی اجازت ہے۔ اسلام دولت مندوں کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے مال پر سانپ بن کر بیٹھ جائیں اور غرباء کے حقوق کو پس پشت ڈال دیں۔

اسلام اور تقسیم دولت (۲)

منافع (Profit): اسلام کے سوا کوئی ایسا اقتصادی نظام نہیں ہے جو نفع کی حدود کا تعین کرے اور ناجائز حصول نفع پر پابندیاں لگاتا ہو۔ سرمایہ دارانہ نظام میں تو ناجائز حصول نفع پر بھی پابندیاں عائد کرنا ہی سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہے۔

منافع کی تعریف

''منافع قومی آمدنی کا وہ حصہ ہوتا ہے جو نفع ونقصان کی ذمہ داری قبول کرنے والے سرمایہ کے مالک کو ادا کیا جاتا ہے۔

"The share of the National Income which is given to risk capital for the services in the process of production is called profit."

نفع کی حد: اسلام نے نفع کی کوئی حد مقرر تو نہیں کی لیکن کچھ معاشی اخلاقی اقدار تقویٰ، احسان، عدل، اخوت، مساوات اور لاضرر ولاضرار مقرر کر دی ہیں کہ کوئی سرمایہ کار ان اقدار کے پیش نظر نفع کی اس حد تک نہیں بڑھ سکتا جو ان اخلاقی اقدار کی روح کے منافی ہو۔

جب اسلامی تاریخ کا مطالعہ کریں تو مسلمان تجار کی مثالیں سامنے آتی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح مسلمان تجار نے نفع کے لیے اسلامی اقدار کو سامنے رکھا۔

امام غزالیؒ نے اپنی تصنیف کیمیائے سعادت میں کاروبار اور باہمی لین دین میں احسان کی مختلف صورتوں پر بحث کی ہے اس کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ زیادہ نفع حاصل کرنا جائز نہ سمجھا جائے۔ خواہ مشتری اپنی ضرورت کی بناء پر زیادہ قیمت دینے پر رضامند ہو۔ حضرت سری السقطیؒ دکان پر بیٹھتے تھے۔ وہ پانچ درہم فیصد سے زیادہ نفع کو جائز نہ سمجھتے تھے ایک دفعہ انھوں نے ساٹھ دینار کے بادام خریدے بعد میں باداموں کا نرخ بڑھ گیا۔ دلال نے ان سے فروخت کے لیے طلب کیے فرمایا تریسٹھ دینار میں فروخت کر دوں گا۔ اس نے کہا۔ ان کا بھاؤ تو ان دنوں نوے دینار ہو رہا ہے فرمایا ''ہوگا'' لیکن میں نے عہد کر رکھا ہے کہ پانچ فیصد منافع سے زیادہ پر کبھی بھی کوئی چیز فروخت نہیں کروں گا۔ اس لیے اپنے عہد سے روگردانی کیوں کروں حضرت محمد بن المنکدر کپڑا فروخت کرتے تھے۔ ایک دن ان کی عدم موجودگی میں ان کے شاگرد نے پانچ دینار والا کپڑا ایک اعرابی کے ہاتھ دس دینار میں بیچ ڈالا آپ جب واپس آئے تو حقیقت حال سے آگاہ ہوئے۔ تو اسی وقت اعرابی کی تلاش میں نکل پڑے بڑی تلاش کے بعد اعرابی مل گیا۔ فرمایا وہ کپڑا جو تم نے میری دکان سے خریدا ہے وہ پانچ دینار سے زیادہ کا نہیں ہے اعرابی نے کہا۔ ٹھیک ہی ہے۔ لیکن میں نے اپنی مرضی رضا و رغبت سے خریدا ہے۔ آپ نے فرمایا تم نے اپنی رضامندی سے خریدا ہے لیکن میں جو چیز اپنے لیے پسند نہیں کرتا اسے کسی مسلمان بھائی کے لیے بھی پسند نہیں کرتا۔ پس یا تو بیع فسخ کر دو یا پانچ دینار مجھ سے واپس لے لو یا پھر میرے ساتھ دکان تک چلو تاکہ میں تمھیں وہ کپڑا دوں جس کی قیمت واقعی دس دینار ہے اعرابی نے پانچ دینار واپس لے لیے۔

مسلمان تجار سلف کی یہ عادت تھی کہ نفع کم لیتے تھے اور معاملہ زیادہ کرتے تھے حضرت علیؓ کوفہ کے بازار میں پھر کر فرمایا کرتے تھے۔ ''اے لوگو! تھوڑے منافع کو رد نہ کرو کہ زیادہ منافع سے محروم نہ ہو جاؤ'' حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے لوگوں نے دریافت کیا، کہ آپ کی دولت مندی کا راز کیا ہے فرمایا ''میں نے تھوڑے نفع کو کبھی رد نہیں کیا۔''

اسلام نے جہاں منافع حاصل کرنے کے لیے اخلاقی اقدار کی تعلیم دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی منافع کے ناجائز ذرائع کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ وہ یہ ہیں جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ ۱۔ احتکار (اشیاء کی قیمتوں کو بڑھانے کے لیے روک رکھنا تاکہ زیادہ نفع حاصل کیا جائے) ۲۔ اتلاف مال (اشیاء کا ضائع کر دینا تاکہ منڈیوں میں اشیاء کی رسد کم ہو جائے اور قیمتیں بڑھ جائیں) ۳۔ تجنیس اشیاء (زیادہ نفع کے حصول کے لیے معیار کا گرا دینا) ۴۔ اجارہ داری (ایک یا چند تاجر مل کر کسی شے صرف پر قبضہ کر لیتے ہیں پھر اس شے کو مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں) ۵۔ بد دیانتی۔ وغیرہ

لگان: زرعی زمین کے کرایہ کو لگان کہا جاتا ہے جس طرح ضرورت سے زائد مکانات اور پلازے تعمیر کر کے ضرورت مندوں کو کرایہ پر دینا ناجائز ہے۔ اسی طرح زائد از ضرورت زمین کو محض اپنی خوش حالی کی خاطر لگان پر دینا بھی از روئے اسلام ناجائز ہے۔ اسلام کی معاشی پالیسی یہ ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں نہ رہے بلکہ گردش بدولت پر زور دیا ہے تاکہ تمام لوگ گردش دولت کی وجہ سے مستفید ہوسکیں۔

اسلام نے جاگیرداری نظام کے لگان کو قطعی طور پر ممنوع اور ناجائز قرار دیا ہے کیونکہ اسلام میں جاگیرداری نظام حرام ہے خصوصاً اس قسم کا جاگیرداری نظام جو پاکستان میں ہے۔ اس موضوع پر ہندوستان اور پاکستان کے علماء نے بہت کچھ لکھا ہے۔ مزید مطالعہ کے لیے قاری کو کتب زمینداری، جاگیرداری اور اسلام مصنفہ رحمت اللہ طارق، اشاعتی ادارہ البیان چوک انارکلی لاہور، مسئلہ زمین اور اسلام مصنفہ شیخ محمود احمد ایم اے پرنسپل گورنمنٹ کالج راولاکوٹ آزاد کشمیر، اشاعتی ادارہ، ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور، اسلام کا اقتصادی نظام مصنفہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اشاعتی ادارہ مکتبہ اقرا سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور اور عربی کی ایک مشہور کتاب المحلی مصنفہ ابن حزم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

لگان کے ناجائز ہونے کے متعلق حضرت رافع بن خدیجؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت ثابت بن ضحاکؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے احادیث مروی ہیں۔

مدینہ میں زمینداری کے لحاظ سے رافع بن خدیجؓ کا سب سے بڑا خاندان تھا۔ اس خاندان کو بٹائی پر زمین کو کاشتکاری پر دینے سے منع فرمایا۔

حافظ ابوبکر محمد بن موسیٰ (الحازمی) اپنی سند کے ساتھ رقمطراز ہیں کہ:

سلیمان بن یسار نے رافع بن خدیجؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس کے پاس کوئی زمین ہو اسے چاہیے کہ یا تو خود کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو زراعت کے لیے دے دے۔ مگر لگان پر نہ دے نہ تہائی پیداوار پر نہ چوتھائی نہ ایک مقررہ مقدار پر (کتاب الاعتبار ص ۱۳۵) حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے نھی رسول اللہ ﷺ کراء الارض رسول اللہ ﷺ نے کرائے (لگان) پر زمین دینے سے منع فرمایا۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے۔ نھی رسول اللہ ﷺ ان یوخذ الارض اجرٌ وحظٌ (مسلم) رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا کہ زمین اجرت پر یا پیداوار کے کسی حصے پر کاشت کے لیے دی جائے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے۔ نھی رسول اللہ ﷺ عن المزابنة والمحاقلة (مسلم، ابن ماجہ) یعنی رسول اللہ ﷺ نے کھجور کے بدلے ثمرہ کی فروخت اور کاشت کرانے کے لیے بٹائی سے منع فرمادیا۔

عن حماد بن سلمة حدثنا عمرو بن دینار قال سمعت عبداللہ بن عمر بن الخطاب یقول نھی رسول اللہ ﷺ عن کراء الارض (المحلی ۸/۲۱۲/۱۱ تا ۱۳) حماد بن سلمہ سے روایت ہے کہ ہم سے عمرو بن دینارؒ نے بیان کیا کہ میں نے عبداللہ بن عمرؓ بن خطاب سے سنا کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے زمین کے کرائے (لگان) سے منع فرمایا تھا۔

لگان پر کاشت کرانے کی ممانعت کی احادیث عہد رسول ﷺ میں ہی مشہور تھیں۔ ابن حزم لکھتے ہیں۔ فھو نقل تواتر موجب للعلم الیقین فاخذ بھذا طائفة من السلف لگان پر کاشت کرانے کی ممانعت رسول اللہ ﷺ سے تواتر سے مروی ہے۔ علم یقین کا موجب ہیں سلف کی ایک جماعت نے ان پر متواتر احادیث کو بنیاد بنا کر لگان پر کاشت کرانے کو ممنوع قرار دیا ہے۔ (المحلی ۸/۲۱۲/۱۶)

امام ابو یوسفؒ، امام اعظمؒ کا لگان کے متعلق نظریہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اذا اعطی الرجل الرجل ارضا مزارعة بالنصف او الثلث او الربع او اعطی نخلا او شجراً معاملة بالنصف او الاقل من ذالک او اکثر فان ابا حنیفة کان یقول ھذا کله باطل (اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلیٰ) یعنی اگر ایک آدمی کسی آدمی کو نصف یا تہائی یا چوتھائی پر زمین بٹائی پر دے یا باغ یا درخت کا نصف یا اس سے کم یا زیادہ پر معاملہ کرے۔ یہ ساری صورتیں ناجائز ہیں۔ مزارعت پر بحث کرتے ہوئے یہ بیان کیا تھا کہ حدیث کے دفتر سے مزارعت کے ناجائز ہونے کی بھی احادیث ملتی ہیں پھر وہاں مزارعت کے جائز ہونے کی بھی احادیث ملتی ہیں پھر وہاں مزارعت کے جائز اور ناجائز ہونے میں تطبیق بھی کی تھی۔ یہی حالت لگان کے جائز اور ناجائز ہونے میں ہے۔ کتب احادیث میں ایسی بھی روایت بھی ہیں جو لگان کو جائز قرار دیتی ہیں۔ قیس بن مسلم حضرت ابوجعفر (امام محمد باقر) سے روایت کرتے ہیں کہ مہاجرین کا کوئی گھرانہ ایسا نہ تھا۔ جو تہائی یا چوتھائی حصہ پیداوار کے عوض کاشت نہ کرتا ہو۔ امام بخاری نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد پھر اس تائید میں مزید نظائر کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ بٹائی پر حضرت علی حضرت سعد بن مالک اور حضرت عبداللہ بن مسعود نے معاملہ کیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز اور قاسم اور عروہ نے بھی کیا۔ اسی طرح آل ابوبکر، آل علی، آل عمر سب بٹائی کاشت کراتے تھے۔ حضرت عمرؓ اس شرط پر بٹائی پر دیتے تھے۔ اگر ''عمر اپنے پاس سے بیج دے گا تو آدھی پیداوار لے گا اور

اگر کاشت کار اپنا بیج لائیں تو ان کا حصہ اتنا ہوگا (بخاری باب المزارعۃ بالشطر ونحوہ)

حضرت ابوبکرؓ کے متعلق آتا ہے کان ابوبکر یعطی الارض علی الشطر (طحاوی) حضرت ابوبکرؓ اپنی زمین نصف نصف کی بٹائی پر کاشتکاری کے لیے دیتے تھے۔

ابن ابی شیبہ نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ:

لاباس المزارعۃ بالنصف (کنزالعمال) نصف نصف کی بٹائی پر زمین کاشت کے لیے دینے میں کوئی حرج نہیں۔

رسول کریم ﷺ نے بٹائی پر کاشتکاری کے لیے زمین دینے سے اس گھرانے یا لوگوں کو منع فرمایا تھا جو مدینہ میں سب سے زیادہ زمین کے مالک تھے یعنی اس دور کے جاگیردار تھے۔ ان لوگوں کا بٹائی پر زمین کاشت کاری کے لیے دینا اسلامی نظام اقتصاد کی روح کے منافی تھا۔ اگر کوئی قاری پاکستان کے بڑے بڑے جاگیرداروں کا نظام لگان دیکھے تو اس پر صاف کھل جائے گا کہ رسول کریم ﷺ نے کس قسم کی بٹائی کو ناجائز قرار دیا ہے۔ پاکستان کے نظام جاگیرداری سے ملتا جلتا نظام زمین داری حضرت رافع بن خدیج کے گھرانہ میں تھا۔ اس گھرانے (رسول کریم ﷺ کے دور کا جاگیردار گھرانہ) کو منع فرمایا۔ لیکن جن لوگوں کی تھوڑی زمینیں تھیں کسی مجبوری سے خود بھی کاشتکاری نہیں کر سکتے تھے ان کو بٹائی پر زمین دینے سے نہیں روکا۔ جاگیرداری نظام میں زمین بٹائی پر دینا احسان، اخوت اور عدل اور مساوات کے منافی ہے اس لیے آپ نے اس قسم کی بٹائی پر کاشتکاری کے لیے دینا ممنوع قرار دیا ہے۔ بٹائی کی دوسری شکل کو جائز قرار دیا۔ یہ صورت احسان اخوت اور عدل کے منافی نہیں۔

رسول کریم ﷺ کا یہ حکم حکمت اور موقع محل کے مطابق ہوتا تھا۔ مثلاً رسول کریم ﷺ سے ایک بوڑھے آدمی نے روزہ میں بھوسہ لینے کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا کوئی مضائقہ نہیں۔ ایک نوجوان نے پوچھا تو آپ ﷺ نے منع فرما دیا۔ دونوں فتاویٰ حکمت اور دانائی پر مبنی تھے اور موقع محل کے مطابق بوڑھے آدمی کی طبیعت میں بھوسہ لینے سے اشتعال پیدا ہونے کا احتمال نہیں ہے۔ اس لیے آپ نے بوڑھے کو بھوسہ لینے سے نہیں روکا جبکہ جوان آدمی کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہونے کا قوی امکان تھا۔ اس لیے نوجوان کو روک دیا۔ یہی حال بٹائی پر زمین کاشت دینے کا معاملہ ہے۔ رسول کریم ﷺ نے پاکستانی طرز کی جاگیرداری نظام کی بٹائی کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے۔

ہمارے علماء نے افراط اور تفریط کا راستہ اختیار کیا ہے۔ بعض علماء نے بٹائی کی ہر شکل کو جائز قرار دیا ہے جبکہ بعض نے ہر شکل کو ناجائز۔

جو بٹائی کی شکل جائز ہے اس میں بھی اخلاقی اقدار عدل، احسان اور اخوت کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

اجارہ: اجارہ، اجر سے ہے جس کے معنی ہیں جو عمل کے بدلہ سے لوٹ کر آتا ہے دنیوی ہو یا اخروی۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ (یونس ۱۰:۷۲) میرا اجر صرف اللہ پر ہے۔ اٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْیَا (العنکبوت ۲۹:۲۷) ہم نے اسے دنیا میں اس کا اجر دیا۔

فقہ کی اصطلاح میں کسی شے کے نفع کے عوض کے مقابل کسی شخص کو مالک کر دینا اجارہ ہے جسمانی یا ذہنی عمل کا بدلہ، ٹھیکہ اور نوکری یہ سب اجارہ کی مختلف شکلیں ہیں۔

اجارہ کی ایک شکل "مکان وغیرہ کی کرایہ داری" سے متعلق بحث کی جا چکی ہے۔ اجارہ مکان کے جواز میں کوئی صحیح حدیث نہیں پائی جاتی۔ یہ شکل اسلام کے معاشی تعلیم کی روح کے منافی ہے کیونکہ اس شکل سے دولت کا بہاؤ مخصوص طبقہ کی طرف ہو جاتا ہے۔ دوم اسلامی اقدار اخوت اور تعاون کے بھی خلاف ہے۔ یہاں اجارہ کی اس شکل کا ذکر کیا جائے گا جو کسی کے عمل کے نتیجہ میں ملتا ہے۔ قرآن مجید نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ قَالَتْ اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْکَ لِیَجْزِیَکَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا (القصص ۲۸:۲۵) کہنے لگی میرا باپ تجھے بلاتا ہے تاکہ تجھے اس کی اجرت بدلہ میں دے جو تو نے ہمارے لیے پانی پلایا۔

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا یٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ (القصص ۲۸:۲۶) دونوں (لڑکیوں) میں سے ایک نے کہا اے میرے باپ اسے نوکر رکھ لے بہترین نوکر جو تو رکھنا چاہتے ہو مضبوط اور امین ہے۔ قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ (۲۸:۲۷) اس (حضرت شعیبؑ) نے کہا میں چاہتا ہوں کہ اپنی بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تجھ سے کر دوں اس شرط پر کہ تو آٹھ سال تک میری نوکری کرے۔

حدیث میں مزدوری کے اجارے کا جواز: حدیثوں میں مزدوری کے اجارے کے جواز میں بہت احادیث پائی جاتی ہیں۔

۱۔ عن ابی ھریرہ عن النبی ﷺ قال مابعث اللہ نبیًا الا رعیٰ الغنم فقال اصحابہ وانت؟ فقال نعم کنت ارعاھا علی قراریط لاھل

مکہ (بخاری شریف) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں فرمایا اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ صحابہ نے عرض کیا کہ آپ ﷺ نے بھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''ہاں'' میں نے بھی چند قیراط پر مکہ والوں کی بکریاں چرائی تھیں۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اجرت پر مزدوری جائز ہے۔

عن جابرؓ قال قال رسول اللہ ﷺ اجرت نفسی من خدیجة سفرتین بقلوص (امام بیہقی، السنن الکبریٰ ج ۶ ص ۱۱۸) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے اجرت پر خدیجہؓ کے لیے دو تجارتی سفر ایک جوان اونٹنی کے بدلے کیے۔

عن عائشةؓ قالت استاجر رسول اللہ ﷺ وابوبکر رجلاً من نبی الدیل ھادیًا خریتا...... وھو دین کفار قریش فامناہ فدفعا الیہ راحلتیھما و واعدہ غار ثور بعد ثلاث لیالٍ فاتاھما براحلتیھما صبیحة لیال ثلاث فارتحلا وانطلق معھما عامر بن فھیرة والدلیل الدیلی فاخذھم طریق الساحل (صحیح بخاری جلد اول ص ۳۰۱) حضرت عائشہؓ نے روایت کرتے ہوئے فرمایا ہجرت کے موقع پر رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ نے بنی دیل کے ایک آدمی کو اجرت پر لیا وہ راستوں کا خوب ماہر تھا۔ باوجود یکہ وہ کفار قریش کے دین پر تھا۔ ہم نے اس پر بھروسہ کیا۔ آپ ﷺ نے اسے اپنی دو سواریاں دیں اور وعدہ لیا کہ وہ تین دن کے بعد ان کو غار ثور پر لے آئے گا۔ چنانچہ وہ تیسرے روز صبح کے وقت دونوں سواریاں لے کر آ گیا آپ دونوں ان پر سوار ہو کر چل پڑے۔ اور آپ ﷺ کے ساتھ عامر بن فہیرہ اور دوسرا راہبر دیلی تھا۔ وہ ان کو ساحل سمندر کے راستہ سے لے گیا۔

عن ابن عباس قال احتجم النبی ﷺ واعطی الحجام اجرہ (بخاری صحیح حصہ اول صفحہ ۳۰۴) حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے پچھنی لگوائی اور حجام کو اس کی اجرت ادا فرمائی۔

اجرت کے ادا کرنے کا حکم

پوری اجرت ادا کرنا: رسول کریم ﷺ نے جہاں اجرت پر مزدور رکھنے کو جائز قرار دیا ہے وہاں اجیر کے حقوق بھی بیان کیے ہیں۔

قال رسول اللہ اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ (بخاری و مسلم) رسول کریم ﷺ نے فرمایا مزدور کی مزدوری اس کے پسینے کے خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔

عن ابی ھریرہؓ عن النبی ﷺ قال قال اللہ ثلاثة انا خصمھم یوم القیامه رجل اعطی بی ثم غدر ورجل باع حراً فاکل ثمنہ و رجل استاجر اجیراً فاستوفی منہ ولم یعطہ اجرہ (صحیح بخاری جلد اول ۱۰۶:۳۴) حضرت ابوہریرہؓ نے رسول کریم ﷺ سے روایت بیان کی ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے تین آدمی ایسے ہیں جن سے میں جھگڑوں گا ایک وہ جس نے میرے نام سے عہد کیا اور پھر اسے توڑ دیا دوسرا وہ جس نے کسی آزاد شخص کو بیچ کر اس کی ثمن کھائی اور تیسرا وہ جس نے اجیر سے کام تو پورا پورا لیا لیکن اس کو اس کی اجرت نہ دی۔

عن ابی ھریرہ ان رسول اللہ ﷺ قال مطل الغنی ظلم (بیہقی کتاب الاجارہ جلد ۶ ص ۱۲) رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ مالدار کا دوسرے کی ادائے حق میں تاخیر کرنا ظلم ہے۔

اجرت اور مدت کا تعین: اسلام نے اجیر کو کام پر لگانے سے پہلے اس کی اجرت کا تعین ضروری قرار دیا ہے۔ عن ابی ھریرہ عن النبی ﷺ قال من استاجر اجیراً فلیعلمہ اجرہ (السنن الکبریٰ) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی سے اجرت پر کام کرائے واضح طور پر اس کی اجرت بتا دے۔

عن ابی سعید الخدریؓ ان رسول اللہ ﷺ نھی عن استجار الاجیر حتی یبین لہ اجرہ (بیہقی کتاب الاجارہ) ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اجیر کو اس کی اجرت طے کیے بغیر کام پر لگانے سے منع فرمایا۔

انی لست استعمل احداً حتی اشارطہ (کتاب فردوس دیلمی کنز الحقائق) میں کسی کو کسی کام پر بغیر معاہدہ کے مقرر نہیں کرتا۔

مذکورہ احادیث میں اجیر کی اجرت اور کام کے میعاد کا تعین اور کام کی نوعیت کی وضاحت کر لینا ضروری ہے۔

طاقت سے زیادہ کام نہ دیا جائے: فرمایا ویکلفہ من العمل ما یغلبہ فان کلفہ مایغلبہ فلیعنہ علیہ (بخاری کتاب الایمان) اور جو کام اس کی طاقت سے باہر ہو اس کی اسے تکلیف نہ دے اور اگر تکلیف دے تو پھر اس کی مدد کر۔

مزدور کو بونس دینا: اسلام نے جہاں مزدور کو اس کی مزدوری پوری دینا ضروری قرار دیا ہے بلکہ پوری مزدوری نہ ادا کرنے والا سرمایہ دار قابل مواخذہ ہے۔ وہاں مزدوری کے ساتھ دیگر مراعات دینا بھی ضروری قرار دیا ہے۔ فرمایا **هم اخوانكم جعلهم الله تحت ايديكم فمن جعل الله اخاه تحت يده فليطعمه مما ياكل وليلبسه مما يلبس** (بخاری کتاب الایمان) وہ مزدور تمھارے بھائی ہیں ان کو خدا نے تمھارے ماتحت کیا ہے پس جس کے ماتحت خدا نے اس کے بھائی کو رکھا ہے اس کو چاہیے کہ وہ جو خود کھائے وہی اس کو بھی کھلائے جو خود پہنے وہی اس کو پہنائے۔

موجودہ دور جو مزدور کو اپنے جیسا کھلانے اور پہنانے کا ذکر کیا ہے وہ بونس کے زمرہ میں آتا ہے۔ حدیث کی روح اس طرح اشارہ کرتی ہے کہ اگر مزدور کی متعینہ مزدوری کے ساتھ اس کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو وہ مزید مراعات دے کر اس کی کھانے پہننے کی ضروریات کو پورا کیا جائے۔

ایک اور حدیث ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ **اعطوا العامل من عمله فان عامل الله لايخيب** (مسند احمد حنبل) کام کرنے والے کو اس کے کام میں سے حصہ دو کیونکہ خدا کا عامل نامراد نہیں کیا جا سکتا۔

عن ابی هريرة عن النبی ﷺ قال اذا اتی احدكم خادمه بطعامه فان لم يجلسه معه فلينا وله اكلة او اكلتين او لقمة او لقمتين فانه ولی حره و علاجه (بخاری کتاب الاطعمۃ) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب تمہارا خادم کھانا لائے تو اگر خادم کو اپنے ساتھ نہ بٹھائے تو چاہیے کہ اسے ایک لقمہ یا دو لقمے، ایک نوالہ یا دو نوالے دے دے کیونکہ اس نے گرمی کی شدت برداشت کی ہے اور اس کو پکایا ہے۔

اسلام نے تنخواہ یا اجرت کا معیار بھی مقرر کر دیا ہے کہ اس سے مزدور کے کنبہ کی بنیادی ضروریات پوری کی جا سکیں مثلاً خوراک، لباس اور مکان اور اضافی ضروریات مثلاً علاج اور تعلیم وغیرہ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ابن آدم کا بنیادی حق یہ ہے کہ اس کے لیے ایک گھر ہو جس میں وہ رہائش پذیر ہو سکے۔ کپڑا ہو جس سے وہ اپنے جسم کو ڈھانپ سکے اور کھانے کے لیے روٹی اور پینے کے لیے پانی ہو۔" (ترمذی)

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ تنخواہ یا اجرت اتنی ہونی چاہیے جس سے اس کی بنیادی احتیاجات پوری ہو سکیں۔ اگر حکومت اپنے ملازمین[1] کو ان کی ضروریات کے مطابق تنخواہیں نہیں دیتی یا کارخانہ دار اپنے مزدوروں کی احتیاجات کو پورا نہیں کرتے تو اسلامی معاشی تعلیم کی روح کے منافی ہے تو آجر ان کی حق تلفی کرتا ہے۔ وہ خدا کے غضب کا مستوجب ہے۔

تعین کے لحاظ سے اجرت کی اقسام: ۱۔ طریق ادائیگی کی بناء پر۔ ۲۔ عام اصولوں کی بناء پر۔ ۳۔ شکل وصورت کی بناء پر۔

طریق ادائیگی کی بناء پر اجرت کی مندرجہ ذیل دو اقسام ہیں۔

(الف) اجرت بلحاظ وقت: اس سے مراد وہ اجرت ہے جو مزدور کو کام کرنے کے وقت کے لحاظ سے دی جاتی ہے یعنی مزدور جتنے دن اور جتنے گھنٹے کام کرے انھیں شمار کر کے اس کا معاوضہ دے دیا جائے مثلاً یومیہ اجرت، ہفتہ وار اجرت یا ماہوار اجرت۔

(ب) اجرت بلحاظ کام: جب مزدور کو اس اجرت کے کام کے حساب سے دی جائے تو اسے اجرت بلحاظ کام کہتے ہیں اگر کام زیادہ ہے تو زیادہ اجرت اور اگر کام کم ہو تو کم اجرت دی جاتی ہے گویا اجرت ادا کرتے وقت مزدور کے کام کی مقدار کو مدنظر رکھا جاتا ہے مثلاً درزی ایک شخص کپڑے سلائی کے لیے اجرت پر رکھتا ہے تو ایک جوڑے کی سلائی کی مزدوری مقرر کر کے درزی سے کہتا ہے کہ جتنے جوڑے وقت مقررہ میں سی لے گا۔ اس کے مطابق اس کو اجرت دے دی جائے گی۔

۲۔ عام اصولوں کی بناء پر اجرت: عام اصولوں کی بناء پر اجرت کی دو قسمیں ہیں۔

(الف) اوسط اجرت: اس سے مراد ایسی اجرت ہے جو اوسط شرح سے کسی کاروبار یا کارخانے میں مزدوروں کو ادا کی جاتی ہے۔ اسے فارمولہ کے تحت اجرت اس طرح ادا ہوگی۔

$$\text{اوسط اجرت} = \frac{\text{کل اجرت}}{\text{مزدوروں کی تعداد}}$$

[1] گورنمنٹ ملازمین بھی اجیر کے زمرہ میں آتے ہیں۔

اس طریقہ کار میں ایک مزدور کی اجرت مقرر نہیں کی جاتی بلکہ کل اجرت مقرر کر لی جاتی ہے پھر مزدوروں کے سپرد کام کر دیا جاتا ہے۔ جب کام ختم ہو جاتا ہے تو وہ اجرت تمام مزدوروں میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ مثلاً ایک کاروبار میں کل اجرت ایک لاکھ روپے ہے مزدوروں کی تعداد ایک ہزار ہے تو اوسط اجرت ۱۰۰۰۰۰ ÷ ۱۰۰۰ یعنی ۱۰۰ روپے ہوگی۔

(ب) نسبتی اجرت: اگر مختلف پیشوں میں یا ایک ہی پیشہ میں کام کرنے والے مزدوروں کو ان کی تعلیم اور فنی مہارت کی بناء پر مختلف اجرت ادا کی جائے تو اسے نسبتی اجرت کہتے ہیں۔

۳۔ شکل وصورت کی بناء پر اجرت: اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔

(الف) ظاہری اجرت یا اجرت متعارفہ: یہ وہ ادائیگی اجرت ہے جو ایک مزدور کو اس کی محنت کے عوض زر کی صورت میں دی جاتی ہے۔ مثلاً اگر ایک مزدور کو ۲۰۰ روپے روزانہ ملتے ہیں تو یہ رقم اس کو ظاہری اجرت یا اجرت متعارفہ ہوگی۔ اس اجرت کو زری اجرت بھی کہا جاتا ہے۔

(ب) حقیقی اجرت: اس سے مراد اشیاء وخدمات کی وہ مجموعی مقدار ہے جو کسی مزدور کو اس کی خدمات کے صلہ میں حاصل ہوتی ہے اس میں عموماً تنخواہ کے علاوہ دوسری مراعات بھی شامل ہیں۔ مثلاً رہائشی مکان، مفت طبی امداد اور اردی وغیرہ۔

حقیقی اجرت میں ظاہری اجرت اور دیگر مراعات شامل ہیں۔

اسلام کی معاشی تعلیم کی رو سے مزدوروں کی اجرت کا معیار، اجرت حقیقی ہے۔ یعنی ہر مزدور کو اتنی اجرت دی جائے۔ جس سے اس کی تمام بنیادی ضروریات پوری ہوسکیں۔

مزدوروں کے فرائض: اسلام نے جہاں آجروں پر مزدوروں کی بنیادی ضروریات پوری کرنا ضروری قرار دیا ہے وہاں اجیروں کے بھی فرائض مقرر کیے ہیں۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ (القصص ۲۶:۲۸) بہترین نوکر وہ ہوتا ہے جو قوی اور امین ہو۔

گویا مزدور کا امین ہونا ضروری ہے جو کام اس کے سپرد کیا گیا ہے اس کو باحسن طریق انجام دے یا جو چیز اس کے سپرد کی گئی ہے اس کی حفاظت کرے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔

الخازن الامین الذی یودی ما امر به طیبه نفسه احد المصدقین (بخاری) امانت دار خزانچی جو اپنے مالک کی دی ہوئی رقم سے خوشی سے ادا کرے اس کو بھی صدقہ کا ثواب ملے گا۔

اجیر کی اقسام: اجیر کی دو اقسام ہیں۔ اجیر خاص اور اجیر مشترک۔

(الف) اجیر خاص: اس سے مراد وہ شخص ہے جس کو مستاجر نے کسی خاص اجرت پر اور متعینہ وقت کے لیے رکھا ہو۔ جیسے نوکر یا خادم۔

(ب) اجیر مشترک: یہ کسی ایک شخص کے لیے کام کرنے کا پابند نہیں ہوتا۔ جو شخص اس کو اُجرت پر رکھ لے تو وہ کام انجام دینے پر اجرت کا مستحق ٹھہرے گا مثلاً سٹیشن پر ایک قلی ہے۔ جب کوئی شخص اس سے کام لے گا۔ تب وہ مزدوری کا حق دار ہوگا۔ وہ کسی ایک شخص کا اجیر نہیں ہوتا جو بھی اس سے کام لے گا وہ اسی کا اجیر ہوگا۔ اگر اس کو خاص مدت یا خاص مقام کے لیے پابند کیا گیا ہے تو وہ اس دوران کوئی دوسرا کام نہیں کر سکتا۔

اجارہ کی شرائط: ۱۔ عاقل ہونا۔ ۲۔ ملک و ولایت اجارہ کرنے والا مالک یا ولی ہو۔ اجارہ کرنے کا اسے اختیار حاصل ہو۔ ۳۔ مستاجر کو وہ چیز سپرد کر دینا جب کہ اس چیز کے منافع پر اجارہ ہوا ہو۔ ۴۔ اجرت کا معلوم ہونا۔ ۵۔ منفعت کا معلوم ہونا تاکہ جھگڑے کا احتمال نہ رہے۔ ۶۔ جہاں اجارہ کا تعلق مدت سے ہے تو مدت کا تعین کرنا ضروری ہے۔ مثلاً مکان کرایہ پر لیا تو یہ طے کرنا ضروری ہے کہ اتنے عرصے کے لیے لیا۔ ۷۔ جانور کرایہ پر لیا تو وضاحت ضروری ہے کہ کس کام کے لیے لیا گیا ہے اور کتنے وقت کے لیے لیا گیا ہے اور کس قسم کا کام لیا جائے گا۔ صرف سواری کے لیے یا بوجھ لادنے کے لیے۔ ۸۔ وہ کام ایسا ہو کہ اس کا پورا کرنا قدرت میں ہو۔ مثلاً غلام کو اجارہ پر دیا وہ بھاگا ہوا ہے یا شرعاً غیر مقدور ہو مثلاً کسی گناہ کے ارتکاب پر اجارہ۔ یہ دونوں اجارے صحیح نہیں۔ ۹۔ وہ عمل جس کے لیے اجارہ کیا ہو اس شخص پر واجب نہ ہو۔ ۱۰۔ منفعت مقصود ہو۔ ۱۱۔ اجارہ میں ایسی شرط نہ ہو جو مقتضائے عقد کے خلاف ہو۔

اجارہ کا فاسد ہونا: جو شرائط مقتضائے عقد کے خلاف ہیں ان سے عقد اجارہ فاسد ہو جاتا ہے لہٰذا جو شرائط بیع کو فاسد کرتی ہیں اجارہ کو بھی فاسد کرتی ہیں کیونکہ اجارہ بھی ایک قسم کا بیع ہے مثلاً مجنوں، فاتر العقل نے یا بچے نے جس میں قوت تمیز نہیں معاملہ کیا تو یہ معاملہ باطل ہوگا۔ اس طرح جہالت سے بھی اجارہ فاسد ہو جائے گا یعنی جو چیز اجرت پر دی جائے وہ مجہول یا منفعت کی مقدار مجہول ہو۔ یعنی مدت بیان نہیں ہوئی مثلاً مکان کتنے دنوں کے لیے کرایہ دیا یا اجرت مجہول ہو یعنی یہ بیان نہیں کیا کہ کرایہ کیا ہوگا یا کام مجہول ہو۔ یہ نہیں بیان کیا گیا کہ اس سے کیا کام لیا جائے گا۔ مثلاً جانور میں یہ بیان نہیں کیا گیا کہ یہ بار برداری کے لیے ہے یا سواری کے لیے (فتاویٰ عالمگیری) کوئی جانور اس شرط پر لیا کہ اس کو دانہ گھاس وغیرہ مستاجر دے گا یہ اجارہ فاسد ہے جانور کا چارہ وغیرہ مالک کے ذمہ ہے اور مستاجر کے ذمہ کرنا مقتضائے عقد کے خلاف ہے۔ اس طرح مکان کرایہ پر دیا اور یہ شرط رکھ دی کہ اس کی مرمت مستاجر کے ذمہ ہے یا مکان کا ٹیکس مستاجر کے ذمہ ہے یہ اجارہ فاسد ہوگا۔ (درمختار[1])

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے کتب بہار شریعت، ہدایہ، فتاویٰ عالمگیری، درمختار، بحرالرائق۔

محنت

علم معاشیات میں جس طرح زراعت صناعت اور تجارت پیدائش دولت کا ایک وسیلہ اور ذریعہ ہیں۔ اسی طرح محنت بھی ایک وسیلہ ہے۔ اسلام میں محنت سے مراد انسانی فعل ہے۔ خواہ اعضاء و جوارح کا ہو یا ذہن قلب کا۔ اسلام میں جس طرح متقوم یعنی کوئی قیمت والی شے ہے اسی طرح انسان کے افعال بھی متقوم یعنی قیمت والی شے ہیں۔

تمدنی زندگی کا دار و مدار ہی انسان کے افعال پر ہے۔ اگر ایک شخص اپنے سرمایہ سے ایک کارخانہ نصب کر لیتا ہے تو پیدائش دولت کے لیے مزدوروں کا محتاج ہے۔ سرمایہ دار تنہا تو کارخانہ کے تمام کام سرانجام نہیں دے سکتا۔ ہر قدم پر دوسرے لوگوں کا محتاج ہوگا۔ اگر کارخانہ میں مزدوروں کی محنت شامل نہ ہو تو تمام کارخانہ بند ہو جائے گا۔ لہٰذا معلوم ہوا محنت پیدائش دولت کا ایک اہم وسیلہ ہے جس کے بغیر دنیا کے تمام کاروبار ختم ہو جاتے ہیں اور دنیا کی علمی ثقافتی تمدنی زندگی ماند پڑ جاتی ہے۔ علماء معاشیات جسمانی مشقت کرنے والوں کو مزدور کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ دماغی محنت کرنے والوں کو ملازمین کے لفظ سے اور اہل حرفہ اور ماہرین فن اپنی اپنی فنی مہارت کی وجہ سے الگ الگ ناموں سے یاد کیے جاتے ہیں۔ مثلاً طبیب، وکیل، حجام وغیرہ۔

فقہ اسلامی کی اصطلاح میں پہلی قسم کے کام کرنے والوں کو اجیر خاص کہتے ہیں۔ یعنی ایسا اجارہ پر کام کرنے والا جو ایک وقت میں ایک ہی آجر کا کام کرتا ہے۔ دوسری قسم کے کام کرنے والوں کو اجیر مشترک یا اجیر عام کہتے ہیں جیسے اہل حرفہ میں دھوبی، حجام، موچی وغیرہ اور اہل فن میں طبیب وغیرہ۔

اسلام نے اس ہمہ گیر ذریعہ پیدائش دولت یعنی محنت کو بہت اہمیت دی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی (النجم ۵۳:۳۹......۴۱) اور انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہی جو وہ کوشش کرتا ہے اور کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی۔ پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اِنَّ سَعْیَكُمْ لَشَتّٰی (الیل ۹۲:۴) بے شک تمہاری کوشش الگ الگ ہے۔

وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ لِّسَعْیِهَا رَاضِیَةٌ (الغاشیہ ۸۸:۸،۹) کچھ منہ اس دن تر و تازہ ہوں گے اپنی کوشش کی وجہ سے راضی ہوں گے۔

اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْیُكُمْ مَّشْكُوْرًا (الدھر ۷۶:۲۲) یہ تمہارا بدلہ ہے اور تمہاری کوشش کی قدر ہوگی۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ (الانعام ۶:۱۳۲) اور سب کے لیے درجے ہیں اس کے مطابق جو انھوں نے عمل کیے اور تیرا رب اس سے بے خبر نہیں جو وہ کرتے ہیں۔

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ. (الجمعہ ۶۲:۱۰) پس جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (دولت) تلاش کرو۔

وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ. (المزمل ۷۳:۲۰) اور جو زمین میں سفر کریں گے۔ اللہ کے فضل (روزی) کو تلاش کر لیں گے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔

من جد وجد ولكل مجتهد نصيب الصحة تمتع الرزق. (المدینۃ والاسلام فرید وجدی) جو شخص کوشش کرے گا اس کی کوشش کا پھل ملے گا۔ اور ہر کوشش کرنے والے کو کچھ نہ کچھ ملتا ہے۔ اعملو فكل ميسر لما خلق له. (بخاری و مسلم بحوالہ کنوز الحقائق) عمل کرو ہر شخص کے لیے وہ کام آسان ہے جس کی وہ صلاحیت رکھتا ہو۔

اسعو فان الله كتب عليكم السعي. (مسند امام احمد کنوز الحقائق) کوشش کر کہ اللہ نے تم پر کوشش کرنا فرض کی ہے۔

اجملوا في طلب الدنيا فان كلاميسر لما خلق له. (ابن ماجہ باب الاقتصاد فی طلب المعیشۃ) دنیا کی طلب اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کرو اس لیے کہ جس کے لیے کوئی پیدا کیا گیا ہے وہ اس کو ضرور ملے گا۔

اعمل لدنیاک کانت تعیش ابداً و اعمل لاخرتک کانت تموت غداً. (المدینۃ والاسلام) دنیا کے کاموں میں ایسی کوشش کرو گویا تم ہمیشہ زندہ رہو گے اور آخرت کے لیے اس طرح عمل کرو گویا کہ تم کل ہی مر جاؤ گے۔

طلب کسب الحلال فریضة بعد الفریضه. (کنز العمال) حلال روزی کا طلب کرنا اللہ کے فریضہ عبادت کے بعد سے بڑا فرض ہے۔

اذا صلیتم الفجر فلا تناموا عن طلب ارزاقکم. (کنز العمال ج ۳ مشکوٰۃ کتاب البیوع) فجر کی نماز پڑھ لوتو اپنے رزق کی کوشش کیے بغیر آرام کا نام نہ لو۔

اطلبوا الرزق فی خبایا الارض. (طبرانی فی الاوسط و کنز العمال ج ۲) روزی کو زمین کے پوشیدہ خزانوں میں تلاش کرو۔

من سعی علی والدیه فهو فی سبیل الله ومن سعی علی عیاله فهو فی سبیل الله ومن سعی علی نفسه لیعفها هو فی سبیل الله ومن سعی علی التکاثر فهو فی سبیل الشیطان. (بیہقی طبرانی صغیر) جو والدین کے لیے محنت کرتا ہے وہ اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے جو اہل وعیال کے لیے محنت کرتا ہے وہ بھی اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے اور جو اپنے نفس کو فقر و فاقہ سے بچانے کے لیے کام کرتا ہے وہ بھی اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے اور جو سرمایہ دار بننے کے لیے محنت کرتا ہے وہ شیطان کی راہ میں کام کرتا ہے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔ لایقعد احدکم عن طلب الرزق. (احیاء العلوم ج ۲ ص ۵۷) تم میں سے کوئی شخص بھی طلب رزق کی تلاش میں ست ہو کر نہ بیٹھ جائے۔

سید مرتضٰی زبیدی شرح احیاء العلوم میں حضرت عمرؓ کے اس قول کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ای لابد للعبد من حرکة ومباشرة بسبب من اسباب یتصل به طریق الوصول الی الرزق. (اتحاف السادہ ج ۵ ص ۲۱۷) یعنی ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ روزی کے جائز اسباب میں سے کسی سبب اور وسیلہ کو ضرور اختیار کرے جس سے وہ روزی کو حاصل کر سکے۔

محنت کے معاوضہ کا مسئلہ: اس دور میں محنت کی اجرت کے متعلق دو نظریے ہیں۔ سرمایہ داری نظریہ اور اشتراکی نظریہ، سرمایہ داری نظام معیشت کی بنیاد ہی بے لگام انفرادی ملکیت پر ہے۔ سرمایہ دار محنت کی اجرتیں من مانے طریقہ پر متعین کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اس نظام میں آجر اور اجیر کے درمیان ایک مستقل جھگڑا رہتا ہے۔ آئے دن ہڑتالیں اور کارخانوں میں آتش زنی کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔

اس کے برعکس اشتراکی نظام میں محنت کی اجرت کی مالک اسٹیٹ ہے۔ ملک کے تمام افراد محنت کرتے ہیں اور حکومت تمام افراد کی ضروریات کے مطابق ان کے اخراجات کی کفیل ہوتی ہے۔ اس نظام میں تمام محنت کش حکومت کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان دونوں نظریوں کے خلاف اسلام نے محنت کی اجرت کے مسئلہ کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے حل کیا ہے اسلام اگرچہ آجر اور اجیر کے درمیان رسد اور طلب کے نظام کو کسی حد تک تسلیم کرتا ہے لیکن ان کا تعلق رسمی نہیں ہے بلکہ اخوت پر مبنی ہے۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ ان اخوانکم خولکم جعلهم الله تحت ایدیکم فمن کان اخوه تحت یده فلیطعمه مما یاکل ولیلبسه مما یلبس ولا تکلفوهم مایغلبهم فان کلفتموهم مایغلبهم فاعینوهم. (صحیح بخاری کتاب العتیق ج ۱) اور تمہارے بھائی تمہارے خادم ہیں۔ جنھیں اللہ نے تمہارے زیردست کر رکھا ہے۔ لہٰذا جس کا بھائی اس کے ماتحت ہو۔ اسے چاہیے کہ وہ جو کھائے اس میں سے اس کو بھی کھلائے اور جو خود پہنتا ہے اسی میں سے اس کو بھی پہنائے اور ان پر کسی قسم کا بوجھ نہ ڈالو۔ جو ان کی طاقت سے باہر ہو۔ اگر ان کے ذمے ایسا کام کر دیتے ہو تو ان کی مدد کرو۔

وفات سے قبل آپ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے۔ الصلوٰة وما ملکت ایمانکم. (ابن ماجہ جمع الفوائد جلد اوّل ص ۲۶۴) نماز کو باقاعدہ پڑھو اور زیردست لوگوں کے حقوق کی نگہداشت رکھو۔

مزدور کی محنت کا معاوضہ دینے کے متعلق رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ اعطو الاجیره اجره قبل ان یجف عرقه. (ابن ماجہ طبرانی عن ابن عمر جمع الفوائد جلد اوّل ص ۲۵۶) مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو۔

ثلاثة انا خصمهم یوم القیامة رجل اعطی بی ثم غدر و رجل باع حرًا فاکل ثمنهٗ رجل استاجرا جیراً فاستوفی عنه ولم یعطه اجره. (صحیح بخاری کتاب الاجارہ جلد اوّل) تین آدمیوں سے قیامت کے دن خود لڑوں گا اوّل وہ جس نے میرے نام سے عہد کر کے عہد شکنی کی۔ دوم وہ شخص جس نے آزاد شخص کو فروخت کر کے اس کی قیمت کھائی تیسرے وہ شخص جس نے کام پر مزدور لگایا اور اس سے پورا کام لیا اور مزدوری نہ دی۔

ان احادیث کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو محنت کی اجرت کے مسئلہ کو خوش اسلوبی سے حل کرتا ہے۔

عن ابی سعید الخدری ان رسول الله ﷺ نهی عن استجار الاجیر حتی یبین له اجره. (بیہقی کتاب الاجارہ) رسول کریم ﷺ نے ممانعت فرمائی کہ مزدور اور اجیر کو اس کی اجرت طے کیے بغیر کام پر لگایا جائے۔

عقد (معاہدہ): مزدور آجر کے جس کام کے کرنے کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لیتا ہے اس کو فقہ اسلامی میں عقد (معاہدہ) کہا جاتا ہے۔ جس کی پابندی کرنا آجیر پر ضروری ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ. (مائدہ ۵:۱) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ اپنے معاہدوں کو پورا کرو۔

اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ. (القصص ۲۸:۲۶) بہترین نوکر جو تو رکھنا چاہتے ہو مضبوط امین ہے۔

فَلَمَّا کَلَّمَہٗ قَالَ اِنَّکَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَکِیْنٌ اَمِیْنٌ قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ. (یوسف ۱۲:۵۴، ۵۵) پس جب اس سے گفتگو کی کہ آج تو ہمارے ہاں صاحب مرتبہ امین ہے۔ یوسف نے کہا مجھے مال کے خزانوں پر مقرر کر دو میں نگہبان خبردار ہوں۔

ارشاد الٰہی ہے۔ وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ. (المطففین ۸۳:۱.....۳) کمی کرنے والوں کے لیے تباہی ہے جو جب لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں تو پورا کر لیتے ہیں اور جب انھیں ماپ یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔

فقہاء اسلام نے تطفیف (ناپ تول کم کرنا) کرنے والوں میں ان مزدوروں کو بھی شامل کیا ہے جو اجرت تو پوری لیتے ہیں لیکن کام دلجمعی اور پوری توجہ سے سرانجام نہیں دیتے۔ وَاَوْفُوْا بِالْعَھْدِ اِنَّ الْعَھْدَ کَانَ مَسْئُوْلاً. (بنی اسرائیل: ۳۴) اور عہد پورا کرو اور ہر عہد کے متعلق پوچھا جائے گا۔

وَاَوْفُوْا بِعَھْدِ اللّٰہِ اِذَا عٰھَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْکِیْدِھَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰہَ عَلَیْکُمْ کَفِیْلاً اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ. (النحل: ۹۱) اور اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرو جب تم عہد کر لو اور قسموں کو ان کے پکا کرنے کے بعد مت توڑو اور تم اللہ تعالیٰ کو اپنا ضامن کر چکے ہو۔ اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔

اسلام نے جہاں آجر کو اجیر کی محنت کا معاوضہ بہتر طور پر دینے کا حکم دیا ہے اسی طرح مزدور پر بھی یہ لازم کر دیا ہے کہ وہ کام کو دیانتداری سے سرانجام دے۔

صرف دولت

اقتصادی نظام میں صرف دولت اہم باب ہے اور یہ ایک ایسا محور ہے۔ جس کے اردگرد پیدائش دولت، تبادلہ دولت اور تقسیم دولت گھومتے نظر آتے ہیں اگر صرف دولت نہ ہو تو باقی شعبہ ہائے معیشت بے کار اور بے معنی نظر آتے ہیں۔ صرف دولت ہی عمرانی زندگی کو خوشگواری اور رعنائی بخشتی ہے انفرادی اور اجتماعی زندگی صرف دولت سے ہی وابستہ ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں مالک کو اپنی ملکیت پر بے قید اور غیر محدود حقوق حاصل ہیں۔ مشہور ماہر قانون جان اسٹن نے ملکیت یا (Dominium) کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

''اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے یہ کسی متعین شے پر ایک حق کی نشان دہی کرتا ہے جو استعمال کے اعتبار سے غیر محدود اور تصرف و انتقال کے اعتبار سے بے قید ہے۔''[1]

یہ تعریف ظاہر کرتی ہے سرمایہ دارانہ نظام میں مالک تصرف دولت میں بے قید اختیارات کا مالک ہے۔

اس طرح دوسرے مغربی علماء قانون کے نزدیک حق ملکیت کا اصل جوہر دوسروں کو اپنی مِلک پر مالکانہ حقوق سے محروم رکھنے کا قانونی حق ہے۔[2]

لیکن اسلام میں مالک اپنی مِلک میں نیابۃً تصرف کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اسلام کی رو سے حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے ارشاد الٰہی ہے۔ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ. (الحدید ۵۷:۷) اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ اور اس سے خرچ کرو جس میں اس نے تمھیں اپنا نائب بنایا ہے۔

گویا مومنین کے مال کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ انسان صرف بطور نائب یا امین ہے۔ اس لیے انسان اپنے مال کو اسی انداز میں خرچ کرے گا جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اسلام نے حلال و حرام واضح کر دیے ہیں۔ انہی حدود میں رہ کر زندگی بسر کر سکتا ہے۔ جب بھی حلال و حرام کی حدود کو توڑا جائے گا تو ملک میں نظام معیشت بگڑ جائے گا۔ اس لیے نظام معیشت کو صحیح خطوط پر رکھنے کے لیے حلال و حرام کی قیود برقرار رکھنا ہوگا۔ جب بھی نظام معیشت میں فساد اور بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو اس فساد کے پیچھے حلال و حرام کی قیود کو توڑنا ہوتا ہے جو لوگ خدا کی تعلیمات حلت و حرمت کو چھوڑ کر محض اپنے جی سے حلال و حرام ٹھہراتے ہیں۔ اس کو شیطان کی راہ قرار دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ. (بقرہ ۲:۱۶۸) شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔

گویا خدا کے حکم تحریم و تحلیل پر عمل نہ کرنا شرک ہے اس وجہ سے قرآن مجید میں شرک اور تحریم و تحلیل کا مضمون مختلف مقامات پر ایک ساتھ بیان ہوا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ. (النحل ۱۶:۳۵) اور جو شرک کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی چیز کی عبادت نہ کرتے۔ نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے حکم کے سوائے کوئی چیز حرام ٹھہراتے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ. (الانعام ۶:۱۴۸) جنھوں نے شرک کیا اب وہ کہیں گے اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام کرتے۔

معلوم ہوا شرک اور تحلیل و تحریم دونوں ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔

تحلیل و تحریم کے احکام: حلت و حرمت کی تعلیم انسان کی تمام زندگی پر حاوی ہے۔ یہاں صرف اسی حلت و حرمت کا ذکر کیا جائے گا۔ جس کا تعلق انسان کی اقتصادی زندگی سے ہے۔ اسلام نے صرف دولت کا حکم انہی اشیاء پر دیا ہے جو حلال اور طیب ہوں ارشاد الٰہی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ. (بقرہ ۲:۱۶۸) اے لوگو! اس سے جو زمین میں ہے حلال اور پاکیزہ کھاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

---

[1] Johen Austin: lectures on Jurisprudence vol 11 P 790.

[2] Encyclopaedia Americana Article on property vol XXII P 660.

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا. (مائدہ ۵:۸۸) اس سے جو اللہ نے تم کو دیا حلال اور ستھری چیزیں کھاؤ۔

صرف دولت کے اصول: اسلام نے صرف دولت کے چند سنہری اصول بیان کیے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ مال ان مقاصد پر صرف کیا جائے۔ جو معاشرہ کے لیے کسی افادیت کا حامل ہو مثلاً ملکی دفاع کے لیے حکومت کو مال کی ضرورت پڑ گئی ہے تو عوام پر یہ لازم ہے کہ وہ دل کھول کر خرچ کریں۔ رسول کریم ﷺ کے عہد میں جنگ تبوک کے موقع پر مال کی ضرورت پڑی تھی تو رسول کریم ﷺ نے اپیل کی تو صحابہ نے دل کھول کر حصہ لیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے گھر کا سارا سامان حضور کی خدمت میں پیش کر دیا حضرت عمرؓ نے گھر کا آدھا اثاثہ پیش کیا۔ اس طرح ملک میں قحط پڑ جائے یا کوئی اور بلائے ناگہانی آ جائے تو ایسے مواقع پر بھی معاشرتی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے امراء کو دل کھول کر حصہ لینا چاہیے۔ اس طرح غریب اقرباء، مساکین، ابن سبیل (مسافر) وغیرہ پر خرچ کیا جائے۔

اسلام نے صرف دولت کا ایک اصول یہ وضع کیا ہے کہ صرف دولت سے انسان کے اخلاق پر بداثر نہ پڑے اس لیے اسلام نے بعض ماکولات مشروبات اور ملبوسات کو ناجائز قرار دیا ہے۔ ماکولات میں سور کا گوشت، خون، مردہ جانوروں کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر ذبیحہ کو حرام قرار دیا ہے۔ مشروبات میں سے نشہ آور چیزوں کو اور ملبوسات میں سے ریشمی کپڑے کو حرام قرار دیا ہے۔

انہی اصولوں میں سے ایک اصول اعتدال پسندی ہے ہر صاحب مال کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اپنے مال کے سلسلہ میں نہ تو بخل سے کام لے اور نہ اسراف اور تبذیر سے۔ بلکہ اعتدال کا راستہ اختیار کرے رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ "خیر الامور اوسطھا" بہترین کام وہ ہیں جن میں میانہ روی ہو۔ فرمایا ماعال من اقتصد جس نے میانہ روی اختیار کی وہ محتاج نہ ہوا۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۲۹) اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اسے حد سے زیادہ کھول دے ورنہ تو ملامت کیا ہوا اور درماندہ ہو کر بیٹھ رہے گا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (الفرقان ۲۵:۶۷) وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو اسراف نہیں کرتے اور نہ تنگی کرتے ہیں۔ ان کا خرچ دونوں حالتوں کے درمیان اعتدال پر رہتا ہے۔

اسلام نے صرف دولت میں اعتدال کی تعلیم دی ہے۔ جس کا اصطلاحی نام "اقتصاد" ہے۔ ایک حدیث میں "اقتصاد" کو نصف معیشت فرمایا گیا ہے۔ (کنز العمال)

اسلام نے صرف دولت کے دو ایسے اخلاقی اصول بھی مقرر کیے ہیں جو کسی نظام معیشت کا نہیں ہیں وہ ہے کسی محتاج پر خرچ کرنے کے بعد نہ اس کو احسان جتایا جائے اور نہ آزار دی جائے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (البقرہ ۲:۲۶۴) اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتانے اور آزار سے باطل نہ کرو۔

دوسرا اخلاقی اصول یہ ہے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہوئے دکھاوے سے کام نہ لیا جائے نہ نمود و نمائش مقصود ہو نہ یہ خواہش ہو کہ لوگ اسے سخی کے نام سے پکاریں گے۔ یہ صرف دولت کی روح کے منافی ہے ارشاد الٰہی ہے۔ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْكٰفِرِيْنَ. (البقرہ ۲:۲۶۴) اور جو شخص احسان اور دل آزاری کے ساتھ مال خرچ کرتا ہے وہ شخص اس شخص کی طرح ہے جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتا سو اس کی مثال اس صاف چٹان کی سی ہے جس پر مٹی ہو پھر اس پر زور کا مینہ برسے اور اسے بالکل صاف کر کے چھوڑ دے اس میں کچھ بھی نہ پا سکیں گے جو کمایا تھا۔ اور اللہ کافروں کو راہ نہیں دکھاتا۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ صرف دولت سے جو معاشرتی اور اقتصادی فوائد حاصل کرنے مقصود ہوتے ہیں وہ دکھاوے سے ضائع ہو جاتے ہیں۔

صرف دولت کا ایک اصول یہ بیان کیا ہے یہ اصول بھی اسلامی معیشت کا خاصہ ہے کہ طیب مال خرچ کیا جائے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ (البقرہ ۲:۲۶۷) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ ان اچھی چیزوں سے خرچ کرو جو تم کماتے ہو، اور اس سے جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالا ہے اور ردی چیزوں کا قصد نہ کرو۔ اس میں سے جو تم خرچ کرتے ہو۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ حلال روزی سے ہی اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہیے۔ چوری، ڈاکہ، ذخیرہ اندوزی، اور بلیک مارکیٹنگ اور دیگر ناجائز ذرائع سے

کمائے ہوئے مال میں سے خرچ اللہ کے ہاں قابل قبول نہیں ہے۔

صرف دولت کی ناجائز صورتیں: اسلام نے حق استعمال وتصرف پر چند قیود عائد کی ہیں۔ اس کو احادیث میں حجر کہا گیا ہے جس کے لفظی معنی ہیں "وہ جو ممنوع ہے۔"

اسراف اور تبذیر کی ممانعت: كُلُوْا وَاشْرِبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ. (اعراف ۷:۳۱) کھاؤ اور پیو اور زیادہ نہ کرو اور وہ زیادتی کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنَ. (بنی اسرائیل ۱۷:۲۶، ۲۷) اور بے جا خرچ کر کے مال ضائع نہ کر۔ بے جا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَحْسُوْرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۲۹) اور اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اسے حد سے زیادہ کھول ورنہ تو ملامت کیا ہوا اور درماندہ ہو کر بیٹھ رہے گا۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا. (الفرقان ۲۵:۶۷) اور وہ جو جب خرچ کرتے ہیں نہ بے جا خرچ کرتے ہیں اور نہ موقع پر تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ ان دو حالتوں کے درمیان اعتدال پر ہے۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ "کھاؤ پیو، پہنو اور صدقہ کرو مگر اس میں اسراف اور گھمنڈ نہ ہو اور ابن عباسؓ نے کہا ہے۔ اسراف اور گھمنڈ سے بچتے ہوئے جو جی چاہے کھاؤ اور جو چاہو پہنو۔ (بخاری کتاب اللباس)

ان من الاسراف ان تاکل ھل ما اشتھیت. (ابن ماجہ ابواب الاطعمہ) یہ بات بھی اسراف میں داخل ہے کہ جس چیز کی بھی خواہش ہو اسے کھا ہی لیا جائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔ حق کے خلاف ہر قسم کے صرف وخرچ کا نام تبذیر ہے اور مجاہد کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص حق کی خاطر سب کچھ خرچ کر دے تو اسراف نہیں ہے اور اگر اپنا تھوڑا سا مال بھی ناحق صرف کر دیا تو یہ تبذیر ہے اور قتادہ کہتے ہیں تبذیر نام ہے مال کو اللہ کی نافرمانی، ناحق اور فساد کے مواقع میں صرف کرنے کا۔

مال کے ضائع کرنے کی ممانعت: بعض اوقات سرمایہ دار قیمتوں میں مصنوعی گرانی پیدا کرنے کے لیے اشیاء کے ذخیروں کے ذخیرے تباہ کر دیتے ہیں۔ اسلام مال کے ضائع کرنے کی سختی سے ممانعت کرتا ہے کیونکہ مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان امین ہے۔ امین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مال کو ضائع کرے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ. (البقرہ ۲:۲۰۵) اور جب حاکم بنتا ہے تو ملک میں کوشش کرتا ہے کہ اس میں فساد ڈالے اور کھیتی اور نسل کو ہلاک کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں دولت کے ضائع کرنے کو فساد سے تعبیر کیا ہے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ ان اللہ کرہ لکم ثلاثاً قیل و قال و اضاعة المال و کثرة السوال. (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب قولہ تعالٰی لا یسئالون الناس الحافاً) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے تین چیزوں کو ناپسند فرمایا ہے۔ قیل وقال کرنا، مال ضائع کرنا اور کثرت سے سوال کرنا۔

ایک اور روایت ہے۔ قال و کان ینھٰی عن قِیلَ و قالَ و کَثْرَةَ السُّوَال و اِضَاعَةَ الْمَالِ وَمَنْعَ وَھَاتْ و عُقُوْقِ الْاُمَّھَاتِ و وَاْدِ الْبَنَاتِ.
(بخاری کتاب الرقاق)

راوی کہتا ہے کہ آپ ﷺ نے قیل وقال کرنے، بہت زیادہ سوالات دریافت کرنے، مال کو ضائع کرنے، خود نہ دینے اور دوسروں سے مانگنے، ماں کی نافرمانی کرنے اور بچیوں کو زندہ درگور کرنے سے منع فرمایا ہے۔

عیش وعشرت کی ممانعت: اسلام نے جہاں اسراف اور تبذیر سے منع کیا ہے وہاں عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے سے بھی روکا ہے اور سادہ زندگی بسر کرنے کی تعلیم دی ہے کیونکہ عیش پرستی کی زندگی اپنے ساتھ بے شمار معائب لاتی ہے۔ اللہ کے ذکر سے روک دیتی ہے۔ انسان کو انسان سے جدا کر دیتی ہے انسان کو محنت جیسے قیمتی جوہر سے محروم کر دیتی ہے اور قوم کی معتدبہ دولت غیر طبعی مانگ پر خرچ ہو جاتی ہے۔ اور ملک میں معاشی بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے یہ وہ موذی

امراض ہیں جس سے سوسائٹی کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ اس وجہ سے اسلام نے عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے سے منع فرمایا ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔ عن معاذ بن جبل ان رسول اللہ ﷺ لما بعث به الی الیمن قال ایاک والتنعم فان عباد اللہ لیسوا المتنعمین. (مشکوٰۃ باب فضل الفقراء)

حضرت معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے جب انھیں یمن بھیجا تو فرمایا۔ خبردار عیش وتنعم کی زندگی بسر کرنے سے بچنا کیونکہ اللہ کے بندے عیش کوش نہیں ہوتے۔

شرار امتی الذین ولدوافی التنعم و غذوابه یاکلون من الطعام الواناً و یلبسون من اللباس الواناً و یرکبون من الدواب الوانا و یتشدقون فی الکلام. (الحاکم المستدرک) میری امت کے بدترین وہ افراد ہیں جو نعمتوں کی آغوش میں پیدا ہوئے اور اسی میں پروان چڑھے اور طرح طرح کے کھانے کھاتے ہیں۔ قسم قسم کے کپڑے پہنتے ہیں۔ قسم قسم کی سواریاں استعمال کرتے ہیں اور بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے آذربائیجان کے والی کے نام خط بھیجا اس میں لکھا۔

ایاکم والتنعم و ذی اھل الشرک و لبوس الحریر. (سیرہ عمر بن الخطاب جمال الدین ابوالفرج ابن الجوزی ص ۱۳۰)

خبردار عیش کوشی سے بچو اور مشرکین کی پوشاک اور ریشمی لباس پہننے سے۔

اسلام نے سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے اور دیباج اور ریشمی کپڑے پہننے سے اسی وجہ سے منع کیا ہے تاکہ انسان عیش وعشرت کی زندگی میں پڑ کر مقصد حیات سے دور نہ جا پڑے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں۔

حرم لباس الحریر والذھب علی ذکور امتی واحل لاناثھم. (ترمذی ابواب اللباس باب ماجاء فی التحریر والذھب للرجال)

میری امت کے مردوں پر ریشمی لباس اور سونے کا استعمال حرام کر دیا گیا ہے اور عورتوں کے لیے جائز ہے۔

لا تلبسوا الحریر ولا الدیباج ولا تشربوا فی انیة ولا الفضة ولا تاکلوا فی صحافھا فانھا لھم فی الدنیا. (مسلم کتاب اللباس والزینہ) ریشم اور دیباج کے کپڑے نہ پہنو۔ سونے اور چاندی کے برتنوں میں پانی نہ پیو اور نہ بڑے بڑے پیالوں میں کھانا کھاؤ۔ یہ سب چیزیں دنیا کی زندگی میں دنیا پرستوں کے لیے ہیں۔

مضرت رساں استعمال ملکیت کی ممانعت: اسلام اخوت اور مودت کا پیغام لے کر آیا ہے وہ کسی صاحب ملک کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنی دولت کو اس طرح استعمال کرے جس سے دوسرے افراد یا سوسائٹی کو نقصان پہنچے۔ حدیث میں آتا ہے۔

عن عبادہ بن الصامت ان رسول اللہ ﷺ قضی ان لا ضرر ولا ضرار. (ابن ماجہ کتاب الاحکام) حضرت عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ نہ خود نقصان اٹھانا ہے اور نہ دوسرے کو نقصان پہنچانا ہے۔

عن ابی بکر الصدیق قال قال رسول اللہ ﷺ ملعون من ضار مومن او مکربه. (ترمذی ابواب البر والصلۃ) حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا وہ شخص ملعون ہے جو کسی مومن کو نقصان پہنچائے یا اس کو دھوکا دے۔

لاضرر ولا ضرار فی الاسلام. (موطا امام مالک ودارقطنی) اسلام میں نہ خود نقصان اٹھانا ہے اور نہ دوسرے کو نقصان پہنچانا ہے۔

فقہا اسلام نے اس اصول کو قانونی شکل میں بیان کیا ہے کہ مالک حسب منشاء اپنی املاک میں تصرف کر سکتا ہے لیکن ایسا تصرف نہیں کر سکتا کہ جس سے اس کے پڑوسی کو نقصان پہنچتا ہو۔

چنانچہ امام فخر الدین زیلعی رقمطراز ہیں۔

''ہر آدمی کو اپنی ملکیت میں حسب منشاء تصرف کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ جب تک اس سے دوسروں کو واضح نقصان نہ پہنچ رہا ہو۔'' (تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ج ۴ ص ۱۹۶)

اپنے اور متعلقین کے گزارہ کے لیے کافی نہ ہونے کی صورت میں خیرات سے ممانعت: مال کا ضیاع صرف تبذیر، اسراف اور مصنوعی گرانی کے لیے تلف کرنے سے ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے اور متعلقین کے گزارے کے لیے کافی نہ ہونے کی صورت میں خیرات کرنے اور نابالغ بچے کے سپرد مال کا انتظام کرنے سے بھی ہوتا ہے۔ اس لیے اسلام نے عسرت والے کو خیرات کرنے سے اور نابالغ بچے کے سپردِ مال کا انتظام و انصرام کرنے سے منع کیا ہے۔

چنانچہ بخاری کے ایک باب کا یہ عنوان ہے۔

لاصدقة الاعن ظھر غنی ومن تصدق وھو محتاج او اھله محتاج او علیه دین الذین احق ان یقضی من الصدقة والعتق والھبة

وهورد عليه ليس له ان يتلف اموال الناس وقال النبی ﷺ من اخذ اموال الناس يريد اتلافها اتلفه الله الا ان يكون (معروفًا) بالصبر فيوثر علی نفسه ولو كان به خصاصة. (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب لا صدقة الاعن ظهر غنی) صدقہ وہی ہے جو غنا کے ہوتے ہوئے دیا جائے اور جو شخص صدقہ دے اور وہ یا اس کے ہاں بچے محتاج ہوں یا اس پر قرضہ ہو تو قرضہ ادا کرنا صدقہ اور غلام کے آزاد کرنے اور ہبہ پر مقدم ہے اور وہ اس پر واپس کر دیا جائے گا۔ اس کا یہ حق نہیں کہ لوگوں کا مال برباد کرے اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے جو لوگوں کا مال لے کر تباہ کرنا چاہے تو اللہ اسے ہلاک کر دے گا ہاں جب صبر کے لیے مشہور ہو تو اگرچہ وہ تنگی کی حالت میں اپنے اوپر محتاج کو مقدم کر سکتا ہے۔

اسلام کی تعلیم کتنی اعلیٰ اور فطرت کے مطابق ہے ایک طرف صدقات پر بہت زور دیا ہے۔ دوسری طرف عسرت والے کو حکم دیا ہے کہ اگر اس کے پاس اپنے لیے اور متعلقین کے گزارہ کے لیے کافی نہیں ہے تو وہ خیرات نہ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ خیرات کر دینے سے وہ خود اور اس کے متعلقین نان ونفقہ کے محتاج ہو جائیں اور دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو جائیں۔ اسلام نے عسرت کی حالت میں صدقہ کرنے کو تضیع مال کہا ہے۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ان الله كره لكم ثلاثا قيل و قال و اضاعة المال و كثرة السوال. (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب قول الله تعالى لا يسئلون الناس الحافا الخ) اللہ تعالیٰ تمھارے لیے تین کام ناپسند کرتا ہے۔ فضول باتیں کرتے رہنا، مال کو تباہ کرنا اور زیادہ مانگنا۔

بخاری میں آتا ہے۔ حضرت کعب بن مالک نے رسول کریم ﷺ سے کہا کہ یارسول اللہ میری توبہ کا ایک جزو یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے صدقہ کرتا ہوا اپنے سارے مال سے الگ ہو جاؤں۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اپنے مال میں سے کچھ اپنے پاس رہنے دے وہ تیرے لیے بہتر ہے۔ حضرت کعب بن مالک نے جواب دیا کہ میں اپنا خیبر کا حصہ اپنے پاس رکھتا ہوں۔

فقہاء وسلف کی بھی یہ رائے ہے۔ اگر کوئی شخص کسی نیک کام میں واجب الادا حقوق کو نظر انداز کر کے حد اعتدال سے زیادہ خرچ کرے تو اس پر حجر عائد کیا جا سکتا ہے۔

<u>فاتر العقل اور نابالغ کو انتظام مال سپرد کرنے کی ممانعت:</u> فاتر العقل اور نابالغ بچوں کے سپرد اموال کا انتظام والصرام کرنے کی بجائے ایک ولی مقرر کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ اپنی ناسمجھی کی وجہ سے اپنے اموال ضائع نہ کر دیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَاْكُلُوْهَا اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا. (النساء۴:۶)

اور یتیموں کا امتحان لیتے رہو۔ یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ تب اگر تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو اور فضول خرچی سے اور جلدی کر کے ان کو کھا نہ جاؤ کہ وہ بڑے ہو جائیں گے۔ اور جو آسودہ ہے چاہیے کہ وہ بچا رہے اور جو حاجت مند ہے وہ مناسب طور پر لے لے۔ پھر جب تم ان کے مال ان کے حوالے کرو تو ان پر گواہ کر لو اور اللہ کافی ہے حساب لینے والا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ **لَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمْ.** (النساء:۵) یعنی تم فاتر العقل لوگوں کو اپنے مال نہ دو۔

بلوغت کی عمر میں فقہاء کا اختلاف ہے حنفی فقہ کی رو سے لڑکوں کی بلوغت کی عمر ۱۸ سال اور لڑکیوں کی عمر ۱۷ سال ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک دونوں صورتوں میں پندرہ سال ہے۔

صحیح مسلک یہ ہے جیسا کہ قرآن مجید میں لفظ رشد سے ظاہر ہے کہ جب بچہ سن تمیز کو پہنچ جائے خواہ پچیس سال پر یا اس سے قبل یا اس کے بعد پہنچے۔ اور اس سے دولت کے ضائع کرنے کا اندیشہ نہ رہے تو مال اس کے حوالے کر دینا چاہیے۔

حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد شیبانی کا یہی مسلک ہے کہ بچہ میں حالت رشد ظاہر ہو۔ خواہ پچیس سال پر ظاہر ہو یا اس سے پہلے یا اس کے بعد ظاہر ہو۔ متعدد فقہاء کا یہ مسلک ہے۔ اگر کوئی شخص عاقل بالغ ہوتے ہوئے اپنی دولت عیش وعشرت میں اڑا رہا ہو تو وہ مقام سفاہت پر ہے۔ اس پر حجر عائد کرنا ضروری ہے۔ حضرت امام شافعی اس مسلک کے حامی ہیں۔ (ہدایہ کتاب الحجر)

ڈاکٹر محمد محمود حجازی کہتے ہیں۔ السفها جمع سفيه والسفه الاضطراب فی العقل والفكر والخلق والمراد به هنا من لايحسن التصرف فی المال. (التفسیر الواضح ص ۱۴۸)

یعنی سفہا، سفیہ کی جمع ہے۔ سفہ عقل، فکر اور خلق میں اضطراب کا نام ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ جو شخص مالی تصرف میں احسن طریق اختیار نہ کرے۔

مذکورہ وضاحت کی روشنی میں سفہاء سے مراد نابالغ، مجنون، مبذر وغیرہ سب لوگ ہیں۔ ان سے مال کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے اس لیے اسلام نے ان پر پابندی لگا دی ہے۔

اسلام میں مالیات کی فراہمی کے طریقے

شراکت: کاروباری اداروں کا دار و مدار مالی وسائل پر ہے۔ جتنا زیادہ سرمایہ ہوگا۔ اتنا ہی کاروبار وسیع ہوتا جائے گا۔ اس لیے مالی وسائل کی فراہمی کے لیے دیگر مالی اداروں کا تعاون بہت ضروری ہے۔ اسلامی معیشت میں مالی وسائل کی فراہمی کے لیے کئی طریقے موجود ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

شراکت، مضاربت، بیع، سلم، بیع مرابحہ، بیع موجل، اجارہ۔

شراکت: شراکت سرمایہ کاری کے زمرہ میں آتا ہے۔ کتب فقہ میں کاروبار میں حصہ داری کے لیے شرکت یا شراکت اصطلاح مستعمل ہے شرکۃ کا مفہوم یہ ہے کہ مال کو باہم خلط ملط کر کے اس طرح ملا دیا جائے کہ شریک کا مال پہچانا نہ جائے۔ اگر اسی مفہوم کو جدید معاشی زبان میں لیا جائے تو اس سے مراد کچھ افراد کی کاروباری شرکت ہے جسے انگریزی لفظ کمپنی (Company) سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ فرق یہ ہوگا کہ کتاب فقہ کے مفہوم میں شراکت سے مراد مال کی شرکت ہے جبکہ کمپنی کے مفہوم میں افراد کی شرکت شامل ہے۔

شراکت کی تعریف: ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کے الفاظ میں "شرکت یہ ہے کہ دو یا دو سے زائد افراد کسی کاروبار میں متعین مالوں کے ساتھ اس معاہدے کے تحت شریک ہوں کہ سب مل کر کاروبار کریں گے اور کاروبار کے نفع و نقصان میں متعین نسبتوں کے شریک ہوں گے۔ (شرکت و مضاربت کے شرعی اصول از ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی ص ۱۹)

احناف کے نزدیک شراکت کی تعریف یہ ہے۔

عبارہ عن عقد بین المتشارکین فی راس المال والربح (رد المختار علی در المختار لشامی) شرکت عبارت ہے اس معاملے سے جو شرکاء میں راس المال اور منافع میں طے پاتا ہے۔

مالکی مکتبہ فکر کے نزدیک

ھی اذن فی التصرف لھما مع انفسھما (حاشیہ علی شرح الکبیر ج ۳ ص ۳۴۸) شراکت سے مراد دونوں شریکوں کے لیے ایک دوسرے کے تصرف کے لیے وہ اجازت ہے جس میں دونوں کے اعمال کا تصرف شامل ہے۔

حنابلہ کے نزدیک

ھی الاجتماع فی استحقاق او تصرف (المغنی لابن قدامہ ج ۵ ص ۱)

جدید دور میں شراکت کی یہ تعریف ہے۔

Partnership is the relation between persons who have agreed the share the profit of bussiness carried on by all or any of them acting or all (section 4 partnership act ix of 1932)

شراکت ان افراد کے درمیان پایا جانے والا رشتہ ہے جو کسی ایسے کاروبار کے منافع میں شریک ہونے پر متفق ہو جائیں جو ان سب کے ذریعے یا ان میں سے کسی ایک ذریعے کو سب کے لیے کام کرے، چلایا جا رہا ہو۔

شراکت کا جواز: رسول کریم ﷺ کی بعثت سے قبل شراکتی تجارت کا رواج تھا۔ آپ ﷺ نے خود بھی شراکت کے کاروبار میں حصہ لیا۔ مکی زندگی میں سائب بن شریک آپ ﷺ کے کاروبار میں شریک تھے۔ کچھ عرصہ بعد ان کی ملاقات رسول کریم ﷺ سے مدینہ میں ہوئی۔ تو شراکت کا دور آنکھوں کے سامنے آ گیا تو آپ ﷺ نے پسندیدگی کے ساتھ ان یادوں کا ذکر فرمایا سائب بن شریک کی خوبیاں بیان کیں۔ (المبسوط، سرخسی جلد ۱۱ ص ۱۵۱)

المبسوط کے حوالہ سے کتب فقہ میں مرقوم ہے کہ قاسم بن محمد سے روایت ہے کہ ہمارا سرمایہ حضرت عائشہ کے پاس جمع تھا۔ آپ لوگوں کو کاروبار کے

لیے یہ سرمایہ مہیا کرتی تھیں۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

انا ثالث الشریکین مالم یخن احدھما صاحبہ فاذا خانہ حرجت من بینھما (جامع الاصول لابن اثیر ج ۲ ص ۱۰۸ ابوداؤد، حاکم، بیہقی)

میں کاروبار کے دو شرکاء میں تیسرا ہوں۔ تاوقتیکہ ایک اپنے دوسرے شریک کے ساتھ خیانت نہ کرے اور اگر وہ خیانت کرے تو میں ان دونوں کے درمیان میں سے نکل جاتا ہوں۔

ایک اور حدیث ہے۔ ید اللہ علی الشریکین مالم یختاونا (المغنی لابن قدامہ ج ۵ ص ۱، ابوداؤد) جب تک دو شرکاء آپس میں ایک دوسرے سے خیانت نہ کریں اللہ کا ہاتھ ان پر رہتا ہے۔

رسول کریم ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اس نے کہا کہ میں بازار میں کاروبار کرتا ہوں اور میرا شریک مسجد میں نماز پڑھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شاید تیرے کاروبار کی برکت اس کے سبب سے ہے۔ (المبسوط)

شراکت کی شرائط

باہمی رضامندی: قرآن مجید کی رو سے باہمی لین دین کے معاملات میں باہمی رضامندی بنیادی شرط ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ۔ (النساء ۴:۲۹) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے مالوں کو آپس میں ناحق کے ساتھ مت کھاؤ سوائے اس کے کہ تمہاری باہمی رضامندی سے تجارت ہو۔

فریقین کا بالغ ہونا: نابالغ کاروبار کی پیچیدگیوں کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اس ناسمجھی کی وجہ سے کاروبار میں نقصان کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے معاہدہ شراکت میں شامل ہونے والوں کے لیے بالغ ہونے کی شرط عائد کی ہے۔

عاقل ہونا: اسلام نے معاہدہ شراکت میں فریقین کا بالغ ہونا ہی ضروری قرار نہیں دیا بلکہ معاملات میں سمجھدار ہونا بھی ضروری قرار دیا ہے۔

نفع کی شرح کا تعین: کاروبار شروع کرنے سے پہلے نفع کی شرحوں کا تعین لازمی ہے تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو۔

نقصان کی ذمہ داری: کاروبار میں نقصان ہونے کی صورت میں فریقین اپنے اپنے سرمایہ کی شرح سے نقصان کو برداشت کریں۔

شراکت میں ارکان کی تعداد

۱۔ ایجاب وقبول ۲۔ سرمایہ ۳۔ نفع یا نقصان

شراکت کی اقسام: حنفیہ کے نزدیک شراکت کی دو اقسام ہیں۔

۱۔ شراکت ملک: اس شراکت میں دو یا زائد افراد کسی شے یا جائیداد میں ملکیت کے حقوق کی وجہ سے شریک ہوتے ہیں۔ یہ شراکت دو طرح سے ہوتی ہے جبری شراکت یعنی جس پر انسان اپنی مرضی سے شراکت نہیں کرتا لیکن کسی قانون یا دستور کے تحت دوسروں کے ساتھ شریک ٹھہرایا جاتا ہے مثلاً وراثت۔

دوسری اختیاری شراکت جس میں افراد اپنی مرضی اور اختیار سے شریک ہوتے ہیں مثلاً دو یا زیادہ اشخاص مل کر اراضی خریدتے ہیں۔ یا مشینری نصب کرتے ہیں۔

۲۔ شراکت عقود: شراکت کی اس قسم میں مختلف افراد ایک دوسرے کے ساتھ معاہدہ (عقد) کر کے شریک ہوتے ہیں۔ اس کی تین اقسام ہیں۔ شراکت مال، شراکت ابدان اور شراکت وجوہ۔ ان میں سے ہر ایک کو دو حصوں شراکت مفاوضہ اور شراکت عنان میں تقسیم کیا گیا ہے۔

شراکت مال: اس شراکت میں دو یا زائد افراد معین مال کے ساتھ منافع کمانے کی غرض سے ایک دوسرے کے ساتھ منافع کی نسبت طے کر کے شریک ہوتے ہیں۔ اس کی دو اقسام ہیں۔

(الف) شرکت المفاوضہ: مفاوضہ تفویض سے مشتق ہے اس کا ایک انگریزی مترادف (Delegation) ہے۔ مفاوضہ کے ایک معنی مساوات بھی ہیں کیونکہ اس نوعیت کے کاروبار میں تمام شرکاء برابر سرمایہ کاری کرتے ہیں اور تمام شرکاء سرمایہ کاری کے بعد معاشی جدوجہد میں مساویانہ طور پر حصہ لیتے ہیں اور اپنے اپنے حصہ کی ذمہ داری لیتے ہیں۔ اس لیے اس شراکت کو شراکت مفاوضہ کہا گیا ہے۔

شرائط: ۱۔ شرکاء کا سرمایہ مساوی ہو۔ ۲۔ ہر شریک دوسرے کا نمائندہ ہو۔ ۳۔ شرکاء عاقل ہوں۔ ۴۔ شرکاء بالغ ہوں۔ ۵۔ آزاد ہوں۔ ۶۔ ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ ۷۔ ہر شریک دوسرے کی ذمہ داری پر اپنے معاملات اور عمل کے لیے جواب دہ ہو۔ ۸۔ نفع و نقصان برابر کے شریک ہوں۔

بلوغت: جب اس شراکت میں یہ طے پایا گیا ہے کہ شرکاء کی ذمہ داریاں اور تصرفات، حقوق و فرائض برابر برابر ہیں تو پھر شرکاء کی اہلیت بھی برابر ہوگی۔ لہٰذا اس قسم میں بچہ نابالغ شریک نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اپنے کاروباری مال میں تصرف کے لیے اپنے ولی کی اجازت کا محتاج ہے اور ہر مالی معاملے میں اپنے ولی کی طرف رجوع کرے گا۔ جس سے کاروبار میں رکاوٹیں حائل ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا شرکت مفاوضہ کی روح اس بات کا تقاضا کرتی ہے اس قسم میں نابالغ کو شریک نہ کیا جائے۔ فقہاء نے شرکت مفاوضہ میں ہر طرح کی مساوات کو شراکت کے لیے لازمی شرط قرار دیا ہے الہدایہ میں آتا ہے۔

شركة المفاوضه فهى ان يشترك الرجلان فيتساويا فى مالهما و تصرفهما و دينهما لانها شركة عامه فى جميع التجارات يفوض كل واحد منهما امرا الشركة الى صاحبه على الطلاق (الهدایہ لمرغینانی کتاب الشرکۃ) شرکت مفاوضہ شراکت کی وہ قسم ہے جس میں دو (یا دو سے زائد) اشخاص اس طرح حصہ دار ہوں کہ ان کو مال میں تصرف کا اختیار ہو اور سب کا دین ایک ہو کیونکہ تمام تجارتی امور میں یہ عمومی شرکت ہے جس میں ہر شریک اپنے تجارتی امور دوسرے کو تفویض کرتا ہے۔

گویا شرکت مفاوضہ میں تمام شرکاء ایک دوسرے کے وکیل (Agent) ہوتے ہیں تو کاروبار کی ترقی کے لیے اپنی اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتے ہیں اگر کاروبار میں نقصان بھی ہو جائے تو تمام شرکاء نقصان میں برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں۔ کوئی شریک بھی صرف اپنی صواب دید پر کوئی کام نہیں کر سکتا۔ باہمی صلاح مشورہ سے کاروباری امور کو انجام دیتے ہوتے ہیں۔

(ب) شراکت عنان: عنان عربی میں باگ کو کہتے ہیں۔ گھر کی چار دیواری کو بھی عنان الدار کہا جاتا ہے اسی طرح آسمان کے جوانب اور اطراف کے لیے اعنان السماء کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ عنان کے محولہ بالا استعمالات میں ''حصار'' کے معنی مشترک ہیں۔ گویا حصار قائم کرنے والی شے کو عنان کہا جاتا ہے شراکت کی اس قسم کو شراکت عنان اس لیے کہا جاتا ہے کہ افراد کو کاروبار میں بعض شرائط سے محصور کر لیا جاتا ہے۔

فقہاء نے شراکت عنان کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔ شراکت عنان میں دو یا زائد افراد ایک دوسرے کے ساتھ شراکت کا معاملہ غیر مساوی بنیادوں پر کر سکتے ہیں۔ تمام شرکاء کی حیثیت ہر معاملے میں برابر نہیں ہوتی۔ ان کے راس المال میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ محنت اور عملی شرکت کے لحاظ سے بھی فرق ہو سکتا ہے۔ اسی طرح منافع کا تعین بھی راس المال کی کمی بیشی کی وجہ سے مختلف ہو سکتا۔ مذہب کا یکساں ہونا بھی ضروری نہیں، بچے اور بڑے کے درمیان شراکت عنان ہو سکتی ہے۔

شراکت عنان میں شراکت مفاوضہ کی طرح ہر شریک اپنے باقی شرکاء کا وکیل (Agent) ہوتا ہے اور کاروبار سے متعلق تمام اعمال کے لیے باقی شرکاء بھی جواب دہ ہوتے ہیں لیکن تمام شرکاء ایک دوسرے کے کفیل (Gaurantor) نہیں ہوتے۔

۳۔ شراکت ابدان یا شراکت اعمال یا شراکت صنائع: اس شراکت میں تمام شرکاء اپنی اپنی فنی مہارت کو بروئے کار لا کر محض کاروباری محنت میں باہم شریک ہوتے ہیں۔ منافع حسب معاہدہ تقسیم ہوگا۔ خواہ کام کا حجم سب کے لیے برابر ہو۔ جیسے سب شرکاء آٹھ آٹھ گھنٹے کام کرنے کے پابند ہیں۔ لیکن منافع برابر تقسیم نہ ہوگا کام کے دوران میں ہونے والا نقصان بھی ان کے نفع کی نسبت سے ہوگا۔ محقق ابن قدامہ فرماتے ہیں۔ شراکت میں نقصان ہر شریک کے سرمائے کے تناسب سے تصور کیا جائے گا۔ (الشرح الکبیر مع المغنی ۵:۱۱۹) امام سرخسی فرماتے ہیں۔ ''اس امر میں کوئی اختلاف موجود نہیں کہ شراکت میں نقصان کی کوئی ایسی نسبت طے کرنا جو سرمائے کے مطابق نہ ہو ایک شرط باطل ہے جس سے معاہدہ فاسد ہوتا ہے۔ (المبسوط)

مثلاً دو بڑھیوں کا اشتراک۔ دو لوہاروں کا اشتراک دو سناروں کا اشتراک، دو مختلف پیشے والوں کے درمیان بھی اشتراک ہو سکتا ہے مثلاً درزی اور رنگ ریز کے درمیان، ایک کپڑا سیتا ہے دوسرا رنگتا ہے اور دونوں کے درمیان اجرت حسب معاہدہ تقسیم ہو جائے گی۔

شرکت الاعمال کو حنفی، مالکی اور حنبلی جائز سمجھتے ہیں۔ جبکہ شافعی اور جعفری ناجائز خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سرمایہ معدوم ہونے کی بناء پر حاصل ہونے والے نفع کی تقسیم مجہول ہے لہٰذا یہ شراکت ناجائز ہے۔

مالکی فقہاء اس کے جائز ہونے کے لیے ایک یہ شرط بھی عائد کرتے ہیں کہ اس میں تمام شرکاء ہم پیشہ ہوں۔ جیسے تمام خیاط، تمام حداد وغیرہ۔ پیشے کا فرق ان کے نزدیک اسی صورت میں درست ہے جب کام کی نوعیت اور کیفیت اس کا تقاضا کرے جیسے جدید دور میں کپڑے تیار کرنے کے لیے چند درزی اور ڈیزائنر مل کر کاروبار شروع کریں۔ ڈیزائنر ڈیزائن تیار کرے اور درزی کپڑے سیئے چونکہ ڈیزائن اور سلائی ایک دوسرے سے متعلق ہیں لہٰذا ان دونوں کی شراکت جائز ہے۔

اسی طرح مالکی فقہاء ایک یہ شرط بھی عائد کرتے ہیں کہ اس طرح کی شراکت ایک ہی جگہ پر ہو۔ اختلاف مکان کے ساتھ شرکت ابدان ختم ہو جاتی ہے۔

موجودہ دور میں اس قسم کی شراکت عام ہو چکی ہے جیسے چند ڈاکٹروں کا مل کر شفاخانہ چلانا، چند اساتذہ کا مل کر ایک سکول یا کالج یا اکیڈمی چلانا۔

۴۔ شراکت وجوہ: وجوہ، وجہ کی جمع ہے اور وجہ عربی میں چہرے کو کہتے ہیں۔ عام اور سادہ مفہوم یہ ہوا چہروں کی شراکت، علم فقہ کی رو سے یہ وہ شراکت مراد ہے جس میں شرکاء کاروبار میں سرمایہ لگانے کے بجائے اپنی ساکھ اور اثر رسوخ (Good will) کو بروئے کار لاتے ہیں اور وہ ادھار مال خرید کر نقد پر فروخت کرتے ہیں اس میں بالعموم منافع برابر تقسیم ہوتے ہیں۔ یہ شراکت امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز ہے جبکہ امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک ناجائز، ان کے خیال میں کاروبار کے لیے اساس سرمایہ ہے عمل یا ساکھ (Good will) کوئی ایسی حسی شے نہیں کہ جس کو منضبط کر کے منافع کی تقسیم کو قابل عمل بنایا جاسکے۔

امام مالک کے نزدیک کاروبار کی اساس سرمایہ ہو سکتا ہے یا عمل۔ دونوں عناصر مل کر یا الگ الگ پیدائشی دولت کا سبب ہوتے ہیں۔ رہی ساکھ اور اثر و رسوخ تو یہ عاملین پیدائش نہیں مرئی ہے نہ حسی۔ اور نہ منضبط ہے کہ جس کی بنیاد پر نفع کی درست تقسیم یقینی ہو اس شراکت میں سے مال اور عمل دونوں معدوم ہیں۔ اس وجہ سے عاملین پیدائش دولت نہ ہونے کے سبب نفع کا تعین ممکن نہیں لہٰذا یہ شراکت امام مالک کے نزدیک ناجائز ہے۔ شراکت وجوہ وہ قسم ہے جس کی سند قرآن اور حدیث میں نہیں ملتی پھر یہ قسم رائج کیونکر ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی قانون میں لچک ہے۔ اس وجہ سے مختلف مکاتب فقہ وجود میں آئے۔ ہر امام نے اپنی قوت اجتہاد سے کام لے کر رائے دی اور معاشرے کے افراد نے کسی ایک امام کی رائے پر عمل کیا۔ اس طرح معاشرے میں مختلف آراء پر عمل کیا جانے لگا۔ مثلاً شراکت وجوہ، امام مالک اور امام شافعی ناجائز قرار دیتے ہیں اور امام ابوحنیفہ جائز، تو بعض کاروباری حضرات نے امام ابوحنیفہ کے فتویٰ پر عمل کر کے اپنی ساکھ اور اثر و رسوخ کی بناء پر منڈی میں کام کرنا شروع کر دیا اس طرح شراکت وجوہ رائج ہوگئی۔

فقہ جعفریہ کی رو سے بھی یہ شراکت ناجائز ہے۔

شرکت کی جدید اقسام: مذکورہ بالا اقسام دوسری تیسری صدی ہجری میں اور بعد ازاں ممالک اسلامیہ میں مروج ہوئی تھیں۔ دور حاضر میں تجارتی حالات بدلنے کی وجہ سے مزید شراکت کی اقسام وجود میں آئی ہیں۔

ا۔ شراکت لامحدود ذمہ داری: پاکستان میں شراکت ایکٹ ۱۹۳۲ء کے تحت شراکت قائم کی جاسکتی ہے جو شراکت عنان کی شکل میں ہے۔ اس قسم میں شرکاء کی ذمہ داری لامحدود ہے۔

۲۔ شراکت محدود ذمہ داری: پاکستان میں اس قسم کی شراکت "کمپنیز" آرڈی نینس ۱۹۸۴ء کے تحت قائم کی جاسکتی ہے اس میں ہر شریک جس قدر سرمایہ کاروبار کے لیے دیتا ہے۔ نقصان کی صورت میں اس پر اس سرمایہ کی نسبت سے مالی بار ڈالا جائے گا۔ اس قسم میں شرکاء کی ذمہ داریاں محدود ہیں یہ شرکت قانونی شخصیت (Legalperson) کی حیثیت رکھتی ہے اور شرکاء کے مختلف حقوق اور فرائض ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ لمیٹڈ لکھا جاتا ہے۔

کوآپریٹو سوسائٹی (انجمن امداد باہمی): یہ شراکت محدود ذمہ دار جیسی شرائط پر مبنی ہوتی ہے اس کے ساتھ شناخت کے لیے کوآپریٹو کا لفظ لگایا جاتا ہے۔

شراکت کے احکام

ا۔ شراکت سے پہلے شرکاء شرائط کاروبار احاطہ تحریر میں لائیں گے۔

۲۔ نفع کی تقسیم شرکاء کے درمیان طے شدہ نسبتوں سے ہوگی۔ کسی شریک کے لیے نفع میں کوئی رقم پہلے سے ہی متعین نہ ہوگی۔ یہ سود کی صورت بن جاتی

ہے جو حرام ہے۔

۳۔ شرکاء کو کاروبار سے پہلے سرمایہ، عملی شمولیت اور فرائض طے کرنا ہوں گے تاکہ دوران کاروبار کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو۔ اگر جھگڑا پیدا بھی ہو جائے تو جج کو معاہدہ کے پیش نظر آسانی سے فیصلہ کر سکے۔

۴۔ معاہدہ کی رو سے مساوی سرمایہ کاری کے باوجود نفع کی نسبتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔

۵۔ نفع کا تعین معاہدہ کی رو سے طے شدہ تاریخ پر راس المال کو الگ کر کے کیا جائے گا جو مال راس المال سے زائد ہے وہ نفع ہے اگر راس المال کم رہ گیا ہے تو نقصان۔

۶۔ اگر کوئی شریک شراکت سے الگ ہونا چاہے تو وہ معاہدہ کے مطابق اپنا سرمایہ لے سکتا ہے۔

نقصان کی ذمہ داری: راس المال گھٹنے کا نام نقصان ہے۔ فقہاء کے نزدیک نقصان، کاروبار کے راس المال میں ہر شریک کی حصہ داری کی نسبت سے تقسیم کیا جائے گا۔ اگر کسی شریک کا سرمایہ نہیں لیکن کسی ہنر کی وجہ سے شریک کاروبار ہوا ہے وہ نقصان میں حصہ دار نہیں ہے۔

شرکاء کے حقوق و فرائض

۱۔ مشترکہ سرمایہ میں سے کوئی شریک دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر نہ قرض دے سکتا ہے۔ نہ لے سکتا ہے۔ قرض لینا یا دینا تمام شرکاء کا باہمی معاملہ ہے کسی ایک کا نہیں کسی ایک شریک کا دیگر شرکاء کے مشورہ کے بغیر قرض لینا اور دینا باعث نزاع ہے۔

۲۔ ہر شریک دوسرے شرکاء کا صرف اس رنگ میں کفیل (ضامن) ہے اگر کسی دوسرے تجارتی ادارہ سے طے شدہ ذمہ داری کے تحت لین دین کرتا ہے تو تمام شرکاء بھی (ادارہ) ذمہ دار ٹھہرائے جائیں گے۔ بصورت دیگر دوسرے شرکاء ذمہ دار نہ ہوں گے۔

۳۔ شراکت میں سب سے اہم ذمہ داری اور فرض دیانت داری ہے جیسا کہ رسول کریم ﷺ کی حدیث قدسی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب دو آدمی کسی کاروبار میں شریک ہوتے ہیں تو تیسرا میں ہوتا ہوں جب کوئی بددیانتی سے کام لیتا ہے تو میں الگ ہو جاتا ہوں۔

شراکت کی مدت

۱۔ ہر شریک معاہدہ شراکت سے کسی وقت بھی الگ ہو سکتا ہے اور شرکاء دو سے زیادہ ہیں تو وہ کاروبار کو جاری رکھ سکتے ہیں۔

۲۔ شراکتی کاروبار ایک معینہ مدت کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ اگر کاروبار میں صرف دو شریک ہیں تو ایک کے مرنے سے شراکت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی وارث شریک کاروبار ہونا چاہے تو کاروبار کو جاری رکھا جا سکتا ہے۔ اگر دو سے زیادہ کاروبار میں شریک ہیں تو مرنے والے کا حصہ نکال کر اس کے ورثاء کو دے دیا جائے اور بقیہ شرکاء کاروبار کو جاری رکھ سکتے ہیں۔

معاہدہ شراکت کی منسوخی

۱۔ فریقین میں سے ایک فریق کاروبار سے الگ ہو جائے۔

۲۔ فریقین میں سے کوئی مر جائے۔

۳۔ ایک یا دونوں فریق کسی مجبوری (مرض، بڑھاپا وغیرہ) کے تحت معاہدہ منسوخ کر سکتے ہیں۔

۴۔ کسی شریک کو اس کے قانونی حق سے محروم کر دیا جائے۔

۵۔ کاروبار کو حکومت اپنی تحویل میں لے لے۔

۶۔ کسی وجہ سے عدالت اس کاروبار پر پابندی لگا دے۔

۷۔ تمام شرکاء اس کاروبار کو ختم کرنا چاہیں۔

نوٹ: دور حاضر میں تجارت نے بہت وسعت اختیار کر لی ہے اس وجہ سے کسی تجارتی کمپنی یا کسی صنعت میں شراکت کے ساتھ کام کرنا جائز ہے کیونکہ متعدد فقہاء کے نزدیک صنعتی کاروبار بھی دوسری انسانی ضروریات کی طرح فرض کفایہ ہے (بحوالہ امام ابن تیمیہ) لہٰذا اس قسم کے تجارتی کاروبار میں شراکت

جائز ہے۔ اسلام نے تجارتی اصول مقرر کر دیے ہیں ان اصولوں پر ہر قسم کے تجارتی کاروبار کو چلایا جا سکتا ہے۔

مضاربت

بظاہر مضاربت شراکت کی ایک شکل ہی نظر آتی ہے۔ اس لیے ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے اسے شرکۃ المضاربۃ کا نام دیا ہے۔ اس لیے انھوں نے اس کا ذکر شرکات کے ذیل میں کیا ہے۔ لیکن عبدالرحمٰن جزیری نے ''کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ'' میں الگ عنوان سے بحث کی ہے۔ مجلۃ الاحکام العدلیہ میں بھی مضاربۃ کا عنوان شرکات کے بعد لایا گیا ہے۔

قدیم فقہاء نے دونوں طریقے اختیار کیے ہیں ابوزکریا یحییٰ بن شرف نووی نے مغنی المحتاج میں اور ابن ہمام نے ''فتح القدیر'' میں یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ چونکہ شراکت اور مضاربت بعض بعض شقوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اس لیے میں بھی شراکت کے بعد مضاربت کا عنوان لایا ہوں۔

مضاربت کی لغوی بحث: کتب فقہ میں مضاربت کے لیے قراض کی اصطلاح بھی مستعمل ہے۔ قراض، قرض سے مشتق ہے جس کے معنی کاٹنے کے ہیں۔ قراض کی تعریف یہ ہے۔

وھو القطع لان المالک یقطع للعامل قطعه من ماله (مغنی المحتاج کتاب القراض۔ لابی زکریا یحییٰ بن شرف نووی) قراض کاٹنے کو کہتے ہیں کیونکہ مالک (سرمایہ کار) اپنے مال کا کچھ حصہ کاٹ کر عامل (کاروبار کرنے والا) کو دے دیتا ہے۔

قراض سے ایک اور لفظ مقارضہ ہے یہ تصور فقہاء حجاز کا ہے لیکن عراق کے فقہاء نے مضاربہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

لغوی بحث: مضاربہ ضرب سے مشتق ہے۔ ضرب کے معنی سفر ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ یعنی جب تم زمین میں سفر کرو۔ چونکہ کاروبار میں سفر کرنے ہوتے ہیں اس لیے اس کا نام مضاربہ رکھ دیا گیا ہے۔

مضاربہ کی تعریف: ھی فی اللغة عبارة ان یدفع شخص مالا للاخر لیستجر فیه علیٰ ان یکون الربح بینهما علی ماشرط والخسارة علی صاحب المال (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد سوم ص ۴۲)

لغت میں مضاربت کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو اس شرط پر مال دے کہ نفع تو بقدر حصہ ان میں تقسیم ہو لیکن نقصان کا ذمہ صرف صاحب مال والا ہو۔

اقسام: مضاربت کی دو اقسام ہیں۔ مضاربت مطلقہ۔ مضاربت مقیدہ۔

مضاربت مطلقہ یہ ہے جس میں زمانہ، مقام، خاص قسم کا کاروبار یا متعین بائع یا مشتری کی کوئی قید نہ ہو۔

اگر کوئی قید لگا دی گئی تو وہ مضاربت مقیدہ ہو جائے گی۔

مثلاً یہ کہہ دیا جائے فلاں وقت اور فلاں مقام پر یہ خاص سامان تجارت خریدنا اور فلاں شہر میں جا کر بیچنا۔ اس طرح جب اس قسم کی شرائط اور قیود عائد کر دی جائیں گی تو وہ مضاربت مقیدہ ہو جائے گی۔

مضاربہ امداد باہمی کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے بہترین طریقہ کاروبار ہے۔ یعنی ایک شخص کا مال ہو اور دوسرے شخص کا ہنر۔ منافع معاہدہ کے مطابق دونوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ بہت سے ایسے صاحب ثروت ہیں جن کے پاس کافی سرمایہ ہے لیکن وہ کاروبار سے ناواقف ہوتے ہیں یا صاحب دولت عورتیں ہیں وہ خود تجارت نہیں کر سکتیں یا بیمار یا بوڑھے ہیں جو تجارتی اسفار کی صعوبتیں برداشت نہیں کر سکتے۔ اس طرح بہت سے نادار اور مفلس ہیں جن کے پاس ہنر تو ہے لیکن دولت نہیں۔ لہٰذا دونوں کے لیے دولت کمانے اور دولت کو گردش میں رکھنے کا بہترین ذریعہ مضاربت ہے۔ یعنی صاحب دولت تحفظ سرمایہ کے اطمینان کے ساتھ سرمایہ صاحب ہنر کے حوالے کر دے۔ اس طرح دونوں فریق سرمایہ سے فائدہ بھی اٹھائیں گے اور دولت بے کار پڑی بھی نہیں رہے گی رسول کریم ﷺ نے دعوئ نبوت سے قبل حضرت خدیجہؓ سے مضاربت پر کاروبار کیا تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔

معاونت باہمی کی چند قسمیں ہیں ایک ان میں سے مضاربت ہے وہ یہ کہ مال ایک شخص کا ہو اور محنت دوسرے شخص کی۔ رضامندی طرفین کی تصریح کے ساتھ نفع دونوں کے درمیان ہو۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ ص ۱۱۶)

اور سعیدیات میں ہے۔

مضاربت لوگوں کی ضروریات کے لیے جائز رکھی گئی۔ اس لیے بعض مالدار کاروبار سے ناواقف اور نابلد ہوتے ہیں اور بعض غریب کاروبار کے ماہر اور مصالح تجارت سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ نیز نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے بھی یہ طریق تجارت جاری تھا۔ آپ ﷺ نے اس کو بہتر سمجھ کر جاری رکھا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس پر عمل کیا اور حضرت عباس کی شرائط مضاربت کو آپ نے پسند فرمایا۔ قرآن عزیز میں بھی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد موجود ہے "ایک اور جماعت ہے جو زمین میں چل پھر کر اللہ کے رزق کو تلاش کرتی ہے یعنی صاحب مال تو مال لگاتے ہیں اور محنت والے اس کے ذریعہ سے ملکوں اور شہروں میں جا کر تجارت کرتے ہیں۔ (سعیدیات حصہ ۲ ص ۱۱۲)

شرائط: راس المال نقد رائج الوقت سکہ کی شکل میں ہو۔ ۲۔ راس المال دینے والا اور لینے والا دونوں عاقل ہوں۔ ۳۔ راس المال معلوم ہو۔ ۴۔ راس المال مضارب کو دے دیا جائے یعنی مضارب کے پورے قبضہ میں آ جائے۔ ۵۔ راس المال عین ہو۔ یعنی متعین ہو۔ قرض نہ ہو۔ جو غیر معین واجب فی الذمہ ہوتا ہے۔ ۶۔ دونوں کے درمیان نفع معاہدہ کی شرط کے مطابق ہوگا اور ہر ایک کا حصہ معلوم ہوگا۔ اگر نفع کا تناسب اور شرح مجہول ہے تو مضاربت فاسد ہے۔ ۷۔ مضارب کے لیے نفع دینا شرط ہو۔ اگر راس المال میں سے کچھ دینا شرط کیا گیا ہے۔ راس المال یا نفع دونوں سے دینا شرط کیا گیا ہے مضاربت فاسد ہو جائے گی (تلخیص بہار شریعت حصہ چودھواں ص ۴۱۷...... ۴۱۸) (مجلۃ الاحکام العدلیہ ص ۳۱۷ تا ۳۱۹ الفقہ علی المذاہب الاربعہ، عبدالرحمٰن الجزیری ص ۸۱۲ تا ۸۳۰)

مضاربت کے احکام

۱۔ مضارب کو مال سپرد کرنے کے بعد اور کاروبار شروع کرنے سے پہلے تک اس سرمایہ کی حیثیت امانت کی ہے اور امانت کی حفاظت مضارب کی ذمہ داری ہے اور جب رب المال اس رقم کو واپس مانگے تو اس کی واپسی بھی مضارب کی ذمہ داری ہے مال ضائع ہو جانے کی صورت میں مضارب پر ضمان (تاوان) نہیں ہوگا۔

۲۔ کاروبار شروع ہو جانے کے بعد مضارب کی حیثیت رب المال کے وکیل کی ہو جائے گی۔

۳۔ کاروبار میں منافع ہونے کی صورت میں مضارب کی حیثیت مالیاتی معاہدہ کے شریک کی ہو جاتی ہے۔ شرکاء کاروبار میں طے شدہ نسبت سے منافع تقسیم ہوگا۔

۴۔ اگر کسی وجہ سے معاہدہ مضاربت منسوخ ہو جائے تو اس صورت میں وہ روزگار معاہدہ روزگار کی شکل اختیار کر جائے گا۔ مضارب، رب المال کا ملازم ہو جائے گا۔ نفع یا نقصان رب المال کا ہوگا اور مضارب کو اجرت ملے گی۔

۵۔ اگر مضارب، معاہدہ مضاربت کی شرائط کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کی حیثیت غاصب اور معاہدہ شکن کی ہوگی اور اس پر راس المال کی واپسی کی ذمہ داری ہے۔

۶۔ اگر معاہدہ مضاربت کی ایک یہ شرط ہو کہ سارا نفع مضارب کو ملے گا۔ تو یہ معاہدہ مضاربت نہیں ہوگا بلکہ مضارب کی حیثیت مقروض کی ہوگی۔ نفع و نقصان کی ذمہ داری بھی اسی مقروض کی ہوگی۔ سرمایہ کے ضائع ہونے کی صورت میں سرمایہ رب المال کو واپسی کی ذمہ داری بھی اسی پر ہوگی۔

۷۔ اگر شرط یہ ہو کہ سارا کا سارا منافع مالک کا ہوگا تو یہ معاملہ عقد البضاعۃ کا ہوگا۔

۸۔ مضاربت مقامی رسم اور رواج اور منڈیوں میں رائج طریق کار کے مطابق چلنا ضروری ہے چاہے یہ شرط ہو یا نہ ہو۔

مضاربت کے ارکان

۱۔ مضاربت ایک معاہدہ کی قسم ہے فقہاء کے نزدیک اس کے ارکان بھی وہی ہیں جو معاہدہ کے ہیں جب رب المال مضارب کو سرمایہ فراہم کر دے تو ایجاب وقبول واقع ہو جاتا ہے لہٰذا احناف کے نزدیک معاہدہ کا صرف ایک ہی (ایجاب وقبول) ہونے کے باعث مضاربت کا معاہدہ مکمل ہو گیا۔ ایجاب وقبول، الفاظ ادا کرنے سے بھی ہو سکتے ہیں اور الفاظ وہی ہوں گے جو مضاربت کا مفہوم ادا کر رہے ہیں (مجلۃ الاحکام العدلیہ دفعہ ۱۴۰۷ء)
جمہور فقہاء کے نزدیک مضاربت کے تین ارکان ہیں۔
اولاً فریقین (سرمایہ کار اور عامل)

ثانیاً معقود علیہ، اس سے مراد وہ شے ہے جس کے بارے میں معاہدہ کیا جا رہا ہو یہاں پر معقود علیہ میں سرمایہ عمل اور منافع تین اجزاء شامل ہیں جن کے بارے میں فریقین معاہدہ کرتے ہیں۔

ثالثاً صیغہ، جو ایجاب اور قبول پر مشتمل ہے۔

شافعی مکتبہ کے نزدیک مضاربت کے پانچ ارکان ہیں۔

۱۔ مال، جو سرمایہ بھی ہوسکتا ہے اور مال تجارت بھی یہ سرمایہ کار کی طرف سے ہوتا ہے۔

۲۔ عمل، اس میں مضارب کی ذہنی اور جسمانی اور تنظیمی محنت شامل ہے۔

۳۔ منافع، اخراجات نکال کر اصل زر کے باقی رہتے ہوئے مال میں اضافہ نفع کہلاتا ہے۔

۴۔ صیغہ، ایجاب وقبول پر مشتمل ہے۔

۵۔ عاقدان، سرمایہ کار اور محنت کش پر مشتمل ہوتے ہیں۔

مضارب کے حقوق وفرائض: ۱۔ مضارب معاہدہ کی تمام شرائط پر پابندی کرے۔ ۲۔ مضارب کسی دوسرے شخص سے بھی مضاربت کا معاملہ کرسکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کو ایسا کرنے سے روک دیا جائے۔ ۳۔ کوئی تیسرا شخص مضارب کو بلا معاوضہ مدد کرسکتا ہے۔ تاکہ کاروبار ترقی کرے۔ ۴۔ اکثر فقہاء کے نزدیک رب المال مضارب کے ساتھ کاروبار میں عملی حصہ نہیں لے سکتا۔ کیونکہ اس طرح مضارب کے اختیارات محدود ہو جاتے ہیں لیکن شافع مکتبہ فکر کے بعض فقہاء کے نزدیک رب المال مضاربت میں عملی حصہ لے سکتا ہے۔ ۵۔ مضارب کو اختیار ہے وہ کاروباری خرید وفروخت کرسکتا ہے۔ اشیاء وغیرہ کو اپنے قبضہ میں رکھ سکتا ہے۔ کسی کے ساتھ رہن کاروبار کرسکتا ہے کسی دوسرے کے ساتھ مضاربت کرسکتا ہے بشرطیکہ اس کو ایسا کرنے سے روک دیا گیا ہو۔ ۶۔ مضارب کو یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی دوسرے کو رب المال کا سرمایہ قرض دے یا کسی کو مفت دے مگر سرمایہ کار کی اجازت سے۔ ۷۔ مضارب کاروبار میں ادھار فروخت کرسکتا ہے الا یہ کہ اس کو صاحب سرمایہ روک دے۔

معاہدہ مضاربت کی مدت

۱۔ سرمایہ کار اور مضارب دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں معاہدہ کو کسی وقت بھی منسوخ کر سکتے ہیں۔

۲۔ مضاربت کا معاہدہ ایک خاص مدت کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے اور لامحدود مدت کے لیے بھی۔

۳۔ معاہدہ مضاربت کی ایک فریق کی موت سے ختم ہو جاتا ہے البتہ دو سے زائد افراد کی صورت میں معاہدہ کو باقی فریق جاری رکھ سکتے ہیں۔

۴۔ معاہدہ مضاربت پہلے سے طے شدہ شرائط پر مسلسل جاری رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً مضاربت کا معاہدہ ایک مقررہ مدت کے لیے کیا گیا اور جو کام شروع کیا تو وہ مقررہ مدت سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ اس صورت میں مضارب سرمایہ کو بقیہ عرصہ کے لیے کسی دوسرے کاروبار میں لگا سکتا ہے البتہ اس صورت میں نفع ونقصان کے حوالہ سے فقہاء میں اختلاف ہے۔

نفع ونقصان کے احکام

۱۔ مضاربت میں نفع معاہدہ شرائط کے تناسب کے مطابق فریقین میں تقسیم ہوگا۔

۲۔ سرمایہ کار کے لیے نفع پہلے متعین کیا جانا ناجائز ہے۔

۳۔ کاروبار میں نفع کے حق دار نفع کے مالک اس وقت قرار پائیں گے جب راس المال رب المال کو مل جائے۔ خواہ اس مالک کا قبضہ سرمایہ پر عملاً ہو یا قانوناً۔

۴۔ نفع راس المال میں اضافے کا باعث ہوگا۔ حقیقی منافع نہ ہونے کی صورت میں مضارب کی محنت کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔

۵۔ اگر کاروبار میں نقصان ہوتا ہے اور راس المال بھی تلف ہو جاتا ہے تو نقصان کا ذمے دار مضارب نہیں ہوگا۔ نقصان کی صورت میں مضارب کی محنت رائیگاں گئی اور رب المال کا سرمایہ۔

۶۔ مسلسل جاری کاروبار میں نقصانات کی تلافی نفع سے کی جاتی رہے گی۔ اگر یہ نقصان نفع سے بڑھ جائے تو پھر راس المال سے پورا کیا جاتا ہے لیکن دونوں صورتوں میں نقصان مضارب سے پورا نہیں کیا جائے گا۔ اگر شرائط میں یہ مذکور ہو کہ اتفاقی نقصان کی صورت میں مضارب تمام نقصان کا یا

اس کا کچھ حصہ پورا کرے گا۔ تو یہ شرط درست نہیں اس لیے مضارب نقصان کی صورت میں رب المال کو کچھ بھی نہ دے تو یہ جائز ہے۔

مضاربت کی شرعی حیثیت میں اختلاف: مضاربت کی شرعی حیثیت کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے جو فقہاء مضاربت کی شرعی حیثیت کو مشکوک گردانتے ہیں ان کا یہ کہنا ہے کہ قرآن اور حدیث میں اس کی کوئی سند نہیں ملتی۔ اس کے برعکس جائز قرار دینے والے فقہاء نے قرآن کی بعض آیات اور کچھ احادیث سے استنباط کیا ہے جبکہ مشکوک گردانتے والے فقہاء نے ان کے استدلال کو تسلیم نہیں کیا اور کہا ہے مضاربت میں کچھ پہلو سود کے مشابہ ہیں۔

مضاربت کو ناجائز قرار دینے والوں میں ایک ابن حزم ہیں۔ ابن حزم کو اسلامی معاشیات میں جو درک حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ فرماتے ہیں کہ فقہ کے ابواب میں سے کوئی باب ایسا نہیں مگر اس کی اصل و دلیل قرآن اور سنت میں موجود ہے جسے بحمد اللہ ہم جانتے ہیں سوائے مضاربت کے ہمیں اس کے لیے قرآن وسنت میں قطعاً کوئی اصل اور دلیل نہیں ملی (نیل الاوطار تالیف علامہ شوکانی جلد پنجم ص ۲۸۴)

امام علامہ زرقانی نے بھی موطا امام مالک کی شرح میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار فرمایا ہے لکھتے ہیں۔

ولا اصل للقراض فی کتاب اللّٰہ وسنۃ الا انہ کان فی الجاھلیۃ فاقرّ فی الاسلام (زرقانی شرح موطا جلد سوم ص ۳۴۶)

مضاربت کے بارے میں اصل اور دلیل قرآن اور سنت میں نہیں ملتی سوائے اس کے یہ (طریقہ کاروبار) دور جاہلیت میں رائج تھا اور اسلام نے اسے برقرار رکھا۔

تجارت اور سود میں واضح فرق ہے تجارت میں سرمایہ کار اپنی ذہنی اور جسمانی استعدادیں خرچ کر کے نفع حاصل کرتا ہے۔ اور کاروبار میں نقصان کا بھی احتمال ہوتا ہے جبکہ سود میں یہ حالت نہیں سرمایہ دار کسی مجبور کو ایک معینہ مدت کے لیے اس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے قرض دیتا ہے اگر وہ مقررہ مدت میں قرض مع سود واپس نہیں کرتا تو قرض خواہ پہلے سود کو اصل زر میں جمع کر کے مزید مہلت دیتا ہے اور سود کی شرح مقرر کر دیتا ہے اس طرح مقروض سود کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ سرمائے کا سارا بہاؤ بغیر کسی محنت اور مشقت کے سرمایہ دار کی طرف ہو جاتا ہے۔ اس قسم کا بہاؤ معاشرہ میں معاشی غیر ہمواریاں پیدا کر دیتا ہے لہٰذا بغیر مشقت اور محنت اور بغیر سرمایہ کے نقصان کے خوف کے جو دولت سرمایہ دار کے پاس آتی ہے وہ سود کے ضمن میں آئے گی۔ مضاربت کو مشتبہ اور مشکوک قرار دینے والے اس کاروبار میں سود کا یہ شائبہ نکالتے ہیں کہ ایک فریق تو اپنی دماغی اور جسمانی محنت سے اس کاروبار کے منافع کے ایک حصہ کا مستحق بنتا ہے جبکہ دوسرا جسمانی طور پر اس میں شریک نہیں ہوتا۔ لیکن نفع کا مستحق ٹھہرتا ہے چونکہ سرمایہ کار کو نفع بغیر ذہنی اور جسمانی مشقت کے ملا ہے لہٰذا یہ شکل ایک حد تک سود کے مشابہ ہے۔

رسول کریم ﷺ نے مشتبہ امور سے بچنے کی تلقین کی ہے اس لیے مضاربت کی شکل میں کاروبار سے پرہیز بہتر ہے۔

محاکمہ: اوّل: تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت خدیجہ کے کاروبار میں شرکت مضاربت کے اصول پر کی تھی۔ یعنی عامل رسول کریم اور سرمایہ کار حضرت خدیجہؓ۔

دوم: علماء اس بات پر بھی متفق ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی بعثت سے قبل مضاربت رائج تھی۔ دعوئ نبوت کے بعد رسول کریم ﷺ نے اس طریقہ کاروبار کو ناجائز قرار نہیں دیا بلکہ قائم رکھا جیسا کہ زرقانی کے حوالہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

سوم: اس کاروبار کے کسی پہلو کو بھی سودی کاروبار کے مشابہہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سرمایہ کار جو سرمایہ مضارب کو مہیا کرتا ہے۔ اس میں نقصان کا بھی احتمال ہے جبکہ سودی کاروبار میں نقصان کا احتمال ہی نہیں۔

چہارم: مضاربت میں سرمائے کا بہاؤ مضارب اور سرمایہ کار دونوں کی طرف ہے جیسا کہ سودی کاروبار میں سرمایہ کا بہاؤ صرف قرض خواہ کی طرف ہوتا ہے مضاربت سے بے روزگاری ختم ہوتی ہے۔ سرمایہ داروں کا سرمایہ گردش میں آتا ہے۔ جس سے نت نئے کاروبار وجود میں آتے ہیں۔

پنجم: مضاربت سرمایہ دار اور اہل ہنر میں باہمی محبت اور ہمدردی کے جذبات بھی پیدا کرتی ہے۔ جب ایک سرمایہ کار تہی دست اہل ہنر کو کاروبار کے لیے سرمایہ دے گا۔ تو اہل ہنر کے دل میں سرمایہ کار کے لیے محبت کے جذبات پیدا ہوں گے۔ اسی طرح سرمایہ کار کے دل میں صاحب ہنر کے لیے اخوت کا جذبہ پیدا ہوگا۔

ششم: سرمایہ کار مضارب کو سرمایہ قرض کے طور پر نہیں دیتا بلکہ امانت کے طور پر دیتا ہے۔ مضارب امین ہوتا ہے۔ حسب شرط یا عند الطلب مضارب کو سرمایہ واپس کرتا ہے جبکہ نقصان کی صورت میں مضارب نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوتا بلکہ سرمایہ کار ہی تمام نقصان برداشت کرتا ہے۔

مضاربت میں سرمایہ کار کے نفع کو ہی سامنے نہیں رکھنا چاہیے بلکہ مضاربت کے تمام ڈھانچے کو سامنے رکھ کر سودی کاروبار اور مضاربت کا موازنہ کرنا چاہیے۔

اسلامی معیشت میں مالیات کی فراہمی کے مزید طریقے

بیع سلم: سلم کے معنی عربی زبان میں سپرد کرنے کے ہوتے ہیں۔ سلمته اليه میں نے اس کو دے دیا۔ (تاج العروس)
فقہ کی اصطلاح میں ''کوئی خاص مال خریدنے کے لیے سونا چاندی (یا رقم) پیشگی ادا کی جائے اس شرط پر کہ فلاں چیز اتنے عرصہ کے بعد موجودہ قیمت سے بہتر طے شدہ قیمت پر حاصل کی جائے گی۔ اس میں قرض (کے طور پر پیشگی دام) دینے والے کا فائدہ پیش نظر ہوتا ہے اس صورت کو سلم کہتے ہیں۔'' (الفقه على المذاهب الاربعة)

اگر یہ صورت ہو کہ بائع کسی مالی مجبوری کے تحت شے فروخت کی قیمت پیشگی لینا چاہتا ہے تو اسلامی معاشی روح کے تحت مشتری کے لیے یہ ناجائز ہے کہ بائع سے اتنی ارزاں چیز خرید کرے۔ جو بازار میں اس ارزاں قیمت خرید کی مثال ہی نہ ملتی ہو۔ یہ عموماً مہاجن ایسا کرتے ہیں اس طرح جائز بیع حرام ہو جاتی ہے۔ اسلام نے اصول لاضرر ولاضرار کے تحت ہر طرح سے نقصان اٹھانے اور نقصان دینے کی ممانعت کر دی ہے۔

شرعی حیثیت: **عن ابن عباس قال قدم النبی ﷺ المدينة وهم يسلفون بالتمر السنتين والثلث فقال من اسلف فی شیءٍ ففی كيل معلوم و وزن معلوم الی اجل معلوم.** (بخاری کتاب البیوع) ابن عباس سے روایت ہے کہا۔ نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے اور لوگ کھجوریں دو اور تین سال کی میعاد پر سلم کیا کرتے تھے۔ تو فرمایا جو کسی چیز میں سلم کرنا چاہے تو معین ماپ اور معین تول میں معین میعاد تک کرے۔

فرمایا۔ **من اسلف فی شیء فليسلف فی كيل معلوم و وزن معلوم الی اجل معلوم.** (ترمذی کتاب البیوع) جب کوئی (بیع) سلف (سلم) (نقد قیمت ادھار سودے کے لیے دے) تو چاہیے کہ اس چیز کا ناپ تول اور مدت ادائیگی طے ہو جائے۔

روایت ہے۔ **ان النبی ﷺ نهى عن بيع ماليس عند الانسان ورخص فی السلم.** (قرطبی: شرح المسلم فی السلم) رسول کریم ﷺ نے ہر ایسی شے کی فروخت سے منع فرمایا جو فروخت کنندہ کے پاس نہ ہو لیکن سلم میں اجازت فرما دی۔

صحابہ کے عمل سے بھی اس کا جواز ملتا ہے۔ صحیح بخاری شریف میں محمد بن ابی مجالد سے روایت ہے کہتے ہیں۔ عبداللہ بن شداد اور ابوہریرہؓ نے مجھے عبداللہ بن ابی اوفیٰ کے پاس بھیجا کہ جا کر ان سے پوچھو کہ نبی کریم ﷺ کے عہد میں صحابہ کرام گیہوں میں سلم کرتے تھے یا نہیں۔ میں نے جا کر پوچھا انھوں نے جواب دیا کہ ہم ملک شام کے کاشتکاروں سے گیہوں اور جو اور منقے میں سلم کرتے تھے۔ جس کا پیمانہ معلوم اور مدت بھی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے کہا ان سے کرتے ہوں گے جن کے پاس اصل مال ہوتا تھا یعنی کھیت یا باغ ہوتا انھوں نے کہا ہم نے نہیں پوچھتے تھے کہ اصل مال اس کے پاس ہے یا نہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہا گندم، جو اور کشمش میں تمام فقہاء بیع سلم کو جائز قرار دیتے ہیں۔

بیع سلم کے ارکان: حنفیہ کے نزدیک بیع کے دو ارکان ہیں۔ ۱۔ ایجاب۔ ۲۔ قبول۔ جبکہ باقی ائمہ کے نزدیک بیع کے چھ ارکان ہیں۔ ۱۔ ایجاب۔ ۲۔ قبول۔ ۳۔ بائع۔ ۴۔ مشتری۔ ۵۔ مال۔ ۶۔ ثمن۔

شرائط سلم: بیع سلم کے درست ہونے کے لیے دو اقسام ہیں۔ ۱۔ شرط عقد یا معاملہ۔ ۲۔ شرائط عوض یا شرائط معاوضہ۔

شرط عقد: شرط عقد صرف ایک ہے معاملہ سلم میں فریقین میں سے کسی کو بھی ''خیار[1] شرط'' نہ ہوگا۔

شرائط عوض یا معاوضہ: شرائط عوض کی سولہ (۱۶) ہیں۔ جن میں سے چھ راس المال (پیشگی رقم) سے تعلق رکھتی ہیں جبکہ دس شرائط مال فروخت سے متعلق۔

---

1. خیار ایک فقہ کی اصطلاح ہے جس کا مطلب عقد بیع کے فریقوں کو یہ حق ہے کہ وہ معاہدہ کو فسخ کر سکیں امام ابوحنیفہ کے نزدیک خیار شرط اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب بیع کے وقت ہی اس کا اظہار و اعلان ہو یا پھر فریقین اس پر رضامند ہوں۔

(الف) شرائط راس المال

۱۔ راس المال کی جنس بتا دی جائے کہ وہ کون سی ہوگی۔
۲۔ راس المال کرنسی ہے تو یہ وضاحت ہو کہ کون سی کرنسی، روپیہ، ڈالر، ریال، درہم اور کوئی شے ہو تو کون سی قسم مثلاً گندم۔ پھر گندم کی کون سی قسم جو چنے وغیرہ۔
۳۔ سونا یا چاندی یا کرنسی کی صفات، بڑھیا، گھٹیا، اوسط درجہ یہ شرائط خاص طور پر سونے چاندی سے تعلق رکھتے تھے جن کے سکے بطور کرنسی رائج تھے۔
۴۔ راس المال کی مقدار کا وضاحت کرنا، اگر راس المال مقداری نوعیت کا نہ ہو تو اشارہ کر دینا ہی کافی ہے۔
۵۔ راس المال اس جگہ ادا کر دی جائے جہاں سے عقد طے ہوا ہے۔ اگر قیمت کی ادائیگی ادھار ہو تو یہ بیع کالعدم ہے۔ اس لیے شریعت نے قرض کے بدلے قرض کی بیع کو ناجائز قرار دیا ہے۔
۶۔ کرنسی (درہم و دینار وغیرہ) خوب جانچے ہوئے ہوں اور مقدار معلوم ہو۔

(ب) شرائط مسلم فیه (مال فروخت سے متعلقہ شرائط)

۱۔ مال فروخت کی جنس معلوم ہو۔
۲۔ مال فروخت کی قسم معلوم ہو۔
۳۔ مال فروخت کی صفات معلوم ہوں۔
۴۔ مال فروخت کی مقدار بیان کی گئی ہو یعنی تولی جانے والی، ماپی جانے والی، یا گنی جانے والی۔
۵۔ مال فروخت کی فراہمی کی مدت معلوم ہو۔
۶۔ مال فروخت بازار میں دست یاب ہو۔ اگر اس مال کی فراہمی فروخت کنندہ کی پہنچ سے باہر ہے تو اس کا سلم درست نہ ہوگی۔
۷۔ بیع سلم میں جس سامان کی فراہمی کا معاملہ کیا جا رہا ہو۔ وہ ایسا ہونا چاہیے جس کی نوعیت اوصاف مقدار تعداد اور خاصیت کا پہلے تعین کیا جا سکے۔
۸۔ جس شے کی فراہمی کے لیے حمل و نقل پر اخراجات آتے ہوں اس کی منتقلی کی جگہ متعین کرنا لازمی ہے۔ بصورت دیگر عقد کی جگہ کو ہی شے کی فراہمی کا مقام تصور کیا جائے گا۔
۹۔ مال فروخت اور راس المال ایک ہی نوعیت اور قسم کی اشیاء نہ ہوں بلکہ الگ الگ ہوں۔ مثلاً سونے کے بدلے سونا، چاندی کے بدلے چاندی، گندم کے بدلے گندم، جو کے بدلے جو۔ کیونکہ ایک ہی جنس کی اشیاء کا مبادلہ برابر برابر تو ہو سکتا ہے ورنہ یہ سودی معاملہ ہو۔
۱۰۔ مال فروخت چار اقسام کا ہے۔ وزن کی جانے والی اشیاء، ماپی جانے والی اشیاء، گنتی میں آنے والی یکساں حجم کی اشیاء، پیمائش کی جانے والی اشیاء لہٰذا جانوروں یا ان کے جسم کے حصوں کی سلم جائز نہیں۔ گٹھروں کے اعتبار سے لکڑی کی بیع درست نہیں۔ اسی طرح عقیق بلور اور بڑے موتیوں کی بیع سلم جائز نہیں۔

عصر حاضر میں بیع سلم سے استفادہ: دور حاضر میں کاروبار ایک پیچیدہ شکل اختیار کر گیا ہے اور اسی طرح سود اس کا لازمہ بن گیا ہے۔ سود پر کاروبار کرنے والے اداروں، کمپنیوں وغیرہ کو انہی کی شرائط کے مطابق کاروبار کرنا ایک مجبوری ہے جو من اضطرّ غیر باغٍ ولا عادٍ کے ضمن میں آئے گا کیونکہ کوئی ملک بھی دوسرے ممالک کے ساتھ کاروبار کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن مسلمان ممالک بیع سلم کی روشنی میں اپنے اپنے ملک کے اندر بیع سلم کو رائج کر سکتے ہیں۔ مثلاً کسی شخص نے کوئی کارخانہ نصب کرنا ہے وہ کسی بنک یا کسی مالی ادارہ سے قرض لینا چاہتا ہے تو بنک یا مالی ادارہ کارخانہ لگانے والے کو قرض اس شرط پر دے کہ جب کارخانہ نصب ہو کر چالو ہو جائے تو قرض کے بدلے تیار مال دے دے بنک یا مالی ادارہ اس مال کو بازار میں فروخت کر کے اپنا قرض لے لے ممکن ہے اس کو نفع بھی ہو۔ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ بنک یا مالی ادارہ کو اپنے دوسرے فرائض کی ادائیگی کے علاوہ تجارتی سرگرمیوں میں آنا پڑے گا۔ اس کا جواب واضح ہے۔ سود کی قباحت سے بچنے اور کاروبار کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے بنکوں یا مالی اداروں کی تنظیم نو کرنا پڑے گی۔ اور ایک تجارتی ونگ بنانا پڑے گا۔ تاکہ قرض کے بدلے میں جو مال آئے تو اس کو منڈی میں فروخت کیا جا سکے۔

ایران میں بنک صنعتی اداروں کو بیع سلم کی شکل میں سرمایہ مہیا کرتے ہیں۔ اور کامیابی سے چل رہے ہیں۔

بیع مرابحہ وتولیہ

لفظ مرابحہ ربح سے مشتق ہے اور باب مفاعلہ ہے جس کے معنی منافع کے ہیں۔

اصطلاح میں مرابحہ سے مراد جو چیز جس قیمت پر خریدی جاتی ہے اور جو کچھ مصارف اس کے متعلق کیے جاتے ہیں ان کو ظاہر کر کے اس پر نفع ایک مقدار بڑھا کر کبھی فروخت کرتے ہیں اس کو مرابحہ کہتے ہیں۔ (بہار شریعت حصہ دوم ص ۲۰۵)

بالفاظ دیگر کوئی چیز خرید کر اس کی سابقہ قیمت پر ایک خاص طے شدہ اور متعین شرح سے اضافہ کے ساتھ فروخت کرنا مرابحہ کہلاتا ہے۔

اگر نفع نہ لیا جائے تو اس کو تولیہ کہتے ہیں جب رسول کریم ﷺ نے ہجرت کا ارادہ فرمایا حضرت ابوبکرؓ نے دو اونٹ خریدے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ایک کا میرے ہاتھ تولیہ کر دو۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے بغیر دام حاضر ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا بغیر دام کے نہیں۔

عبدالرزاق نے سعید بن المسیبؓ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تولیہ و اقالہ و شرکت سب برابر ہیں ان میں کوئی حرج نہیں۔ (کنز العمال)

بیع مرابحہ کی شرائط

۱۔ جو چیز فروخت کی جائے وہ ''شے'' یا سامان ہو۔ نقدی نہ ہو کیونکہ حدیث کی رو سے نقدی کے لین دین میں اضافہ ''سود'' ہے جو حرام ہے۔

۲۔ جو چیز فروخت کی جا رہی ہے وہ فروخت کنندہ کی ملکیت ہونی چاہیے۔

۳۔ چیز کی سابقہ قیمت یا لاگت پہلے سے معلوم یا متعین ہونا ضروری ہے یعنی دوسرے خریدار کو واضح طور پر معلوم ہو کہ پہلے خریدار نے اس چیز کو کتنے میں خریدا یا کتنے مصارف آئے۔

۴۔ نفع کی شرح یا فارمولا پہلے سے معلوم ہو۔

۵۔ مال کی قیمت رائج الوقت سکہ روپیہ، ریال، ڈالر وغیرہ میں ہونا چاہیے۔

۶۔ مرابحہ میں فروخت کنندہ اپنے تمام اخراجات جو شے کے بنانے یا خریدنے کے سلسلہ میں اٹھانے پڑتے ہیں قیمت میں شامل کر سکتا ہے مثلاً کرایہ بار برداری، باردانہ وغیرہ۔

۷۔ بیع مرابحہ میں اگر خریدار کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ خیانت کی گئی ہے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک خریدار کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ شے فروخت کنندہ کو واپس کر دے یا پوری قیمت میں وہ شے لے لے۔ لیکن اگر شے واپس کرنے سے پہلے ہی ضائع ہو جائے یا اس میں کوئی عیب پیدا ہو جائے تو خریدار کو پوری قیمت ادا کرنا ہوگی جبکہ امام ابو یوسف کے نزدیک بیع مرابحہ میں خیانت کی صورت میں خیانت کے بقدر قیمت میں کمی کر دی جائے۔

۸۔ اگر شے کے بدلے شے کا لین دین (بارٹر سسٹم) ہو رہا ہو۔ تو شے کے بدلے میں قیمت کے طور پر جو چیز وصول کی جا رہی ہو وہ اس نوعیت کی ہو کہ اس جیسی چیز کم و بیش اس قیمت میں بازار میں آسانی سے مل جاتی ہو۔

ناجائز بیع مرابحہ

۱۔ سونے چاندی اور ایک ہی قسم کی کرنسی مثلاً روپیہ، روپیہ کے بدلے، ریال، ریال کے بدلے کے سلسلہ میں بیع مرابحہ جائز نہیں۔

۲۔ جس شے یا سامان کی مجموعی مالیت کا اندازہ اور قیمت کا تعین نہ ہو اس کی ممکنہ قیمت کے ایک خاص شرح (فیصد) کے حساب سے نفع طے کرنا جائز نہیں۔

دور حاضر میں بیع مرابحہ سے استفادہ: عصر حاضر میں بیع مرابحہ کی شرائط کو بنیاد بنا کر بین الاقوامی سطح پر اندرون ملک کی مصنوعات اور بیرونی ملک کی مصنوعات کی خرید و فروخت کی جا سکتی ہے۔ اگر بنک اپنے دائرہ کار میں تجارت کے شعبہ کو منظم کر لیں۔ باہر کی مصنوعات مثلاً بھاری مشینری یا دیگر قیمتی اشیاء منگوا کر اپنے ملک کے اندر ضرورت مندوں کو بیع مرابحہ کے اصول کے تحت فروخت کریں تو یہ طریقہ کار سود کا متبادل ہو سکتا ہے۔ اگر خریدار نقد پر شے نہیں خریدتا تو کوئی چیز رہن رکھ کر خرید سکتا ہے اس طرح اندرون ملک میں بھی اسی اصول کے تحت مصنوعات خرید کر دوسروں کو سپلائی کر سکتا ہے۔

الستراتیجیہ لاستثمار فی البنک الاسلامیہ کے موضوع پر ہونے والے سیمینار کے حوالہ سے ایک اندازے کے مطابق غیر سودی بنکاری کے ۸۰ تا ۹۰ فیصد تک مالیاتی اعمال مرابحہ کی بنیاد پر سرانجام پانے والے سرمایہ کاری کے طریقوں کو مختلف نام دیتے ہیں۔ مثلاً پیداوار افزائش پروگرام (Support production) قلیل مدت کی سرمایہ داری (Short term financing) یا معاہدہ خرید وفروخت (Sale and purchase contract) وغیرہ اسی طرح مختلف مدت کے لیے مالی ضروریات اس ذریعہ سے پوری کی جاتی ہیں۔ مثلاً اشیاء صارفین کار، ریفریجریٹر وغیرہ کی خریداری، مکانوں کی خریداری کے لیے سرمایہ کی فراہمی، صنعتی شعبہ کے لیے مشینری آلات اور خام مال کی فراہمی کے لیے سرمایہ کی فراہمی وغیرہ البتہ مرابحہ کا زیادہ استعمال قلیل مدتی تجارت کے لیے سرمایہ کی فراہمی کے لیے ہے۔ (ص ۴۹)

پروانہ قرض (Letter of credit) اور مرابحہ: دوبئی کا اسلامک بنک پروانہ قرض (Letter of Credit) جاری کرنے کے لیے درج ذیل طریقہ اختیار کرتا ہے۔

ایک تاجر بنک کے نام درخواست لکھتا ہے کہ وہ کوئی چیز بیرون ملک سے درآمد کرنا چاہتا ہے بنک تمام ضروری دستاویز اور ضمانتوں کے حصول کے بعد تاجر کے نام پروانہ قرض جاری کرتا ہے اور اس کی نقل برآمد کنندہ اور اس کے بنک کو بھیج دیتا ہے۔ اس معاہدہ میں تاجر بنک کے ساتھ وعدہ خریداری کے معاہدہ پر دستخط کرتا ہے جس میں وہ شے کی خریداری کی قیمت اور دیگر تفصیلات طے کرتا ہے برآمد کنندہ تمام دستاویزات اور مال بنک کے حوالے کرتا ہے مال کی وصولی کے بعد بنک اور تاجر کے درمیان بیع مرابحہ کا معاہدہ طے پاتا ہے اس طرح بنک اور تاجر اس طریقہ کار سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اردن کا اسلامک بنک بھی بیع مرابحہ کی بنیاد پر ایسی اشیاء کی خریداری کے لیے سرمایہ کی فراہمی کرتا ہے جن کو رہن رکھا جا سکتا ہے مثلاً کوئی شخص کار خریدنے کے لیے بنک سے رجوع کرتا ہے تو بنک اور خریدار کے مابین کار کی خریداری کا معاہدہ طے پاتا ہے بنک کار ڈیلر سے کار خریدتا ہے۔ کار کی رجسٹریشن بنک کے نام ہوتی ہے اور قیمت کار ڈیلر وصول کر لیتا ہے۔ اس کے بعد بنک اس کار کو گاہک کے ہاتھ فروخت کرتا ہے اور رجسٹریشن گاہک کے نام منتقل ہو جاتی ہے۔ بیع کا یہ معاہدہ قیمت کے التوا کی بنیاد پر ہوتا ہے بنک ضروری ضمانت حاصل کر لیتا ہے۔ ضمانت میں یہ شق بھی شامل ہو سکتی ہے کہ گاہک بنک کے پاس کار رہن رکھ دے۔ اس طرح بیع مرابحہ کے اصول پر دیگر اشیاء کی خرید وفروخت کی جا سکتی ہے۔ اردنی بنک ایسی اشیاء کے لیے بھی مرابحہ کا طریقہ اختیار کرتا ہے جن کو رہن میں نہیں رکھا جا سکتا۔

اب سودی بنک بھی اس طریقہ سے متاثر ہو کر یہ طریقہ اختیار کر رہے ہیں جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا۔ یہ طریقہ اختیار کرتے جائیں گے۔ سعودی عرب کے سب سے بڑے تجارتی بنک "نیشنل کمرشل بنک نے مرابحہ کے اصول پر ایک بین الاقوامی تجارتی فنڈ قائم کیا ہے۔ پاکستان بھی یہ طریقہ اختیار کر سکتا ہے۔

بیع موجّل

بیع موجّل سے مراد ایسی بیع جس میں قیمت بعد میں ادا کی جائے۔ ادائیگی یک مشت بھی کی جا سکتی ہے اور اقساط میں بھی۔

It is a sale under which the price of item involved is payable on a deffered basis either in lump sum or in instalments. (Report of council of Islamic Ideology page 97)

شرائط

۱۔ شے کی قیمت پہلے سے متعین ہو۔

۲۔ قیمت کی ادائیگی کی تاریخ یا مدت متعین ہو۔

۳۔ یہ بات بھی طے شدہ ہو کہ قیمت یک مشت ادا کی جائے گی یا اقساط میں۔

شرعی احکام: بیع موجل کو درست رکھنے کے لیے حسب ذیل شرعی احکام ہیں۔

۱۔ فروخت کی جانے والی شے بائع (Seller) کی ملکیت ہو اس کے قبضہ میں ہو۔ قبضہ خواہ حقیقی ہو یا حکمی۔

۲۔ بائع کو اختیار ہے کہ وہ مشتری کی کوئی چیز بطور رہن رکھ لے۔

۳۔ بائع شے یا جائیداد پر نفع حاصل کرنے کا حقدار اسی صورت میں ہوگا۔ کہ وہ شے یا جائیداد اس کے ضمان میں ہو نہ کہ کسی اور کے ضمان میں۔

۴۔ بیع موجل کی رو سے یہ ضروری ہے فروخت کی جانے والی شے کا قبضہ فوری طور پر مشتری کو دے دیا جائے۔ بصورت دیگر بیع درست نہیں ہوگی۔

شرعی جواز: فقہاء بیع موجل کے شرعی جواز کی دو دلیلیں دیتے ہیں۔

ایک اس کے عدم جواز کی دلیل شارح سے منقول نہیں اس لیے اشیاء میں اباحت اصلیہ کے اصول کے مطابق یہ جائز ہے۔

دوم رسول کریم ﷺ کی ایک حدیث ہے۔ عن عائشة النبی ﷺ اشتری طعاما من یهودی الی اجل و رهنه درعا من حدید. (بخاری ۱:۲۳)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک یہودی سے اناج ایک میعاد تک کے لیے قرض خریدا اور اس کے پاس اپنی لوہے کی زرہ رہن رکھی۔

بیع موجل کے بارے میں اختلاف ہے ایک طبقہ یہ کہتا ہے کہ جس طرح یہ جائز ہے کہ بائع اور مشتری کے درمیان معاہدہ بیع ہو جائے کہ قیمت ادائیگی فی الفور (On the spot) ہوگی۔ اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ بائع اور مشتری میں یہ طے پا جائے کہ مشتری قیمت کی ادائیگی کچھ عرصہ بعد کرے گا لیکن یہ ضروری ہے کہ ادائیگی کی شرائط متعین کرلی جائیں تاکہ کسی قسم کا جھگڑا پیدا نہ ہو۔ دوسرا طبقہ[1] اس قسم کی بیع کی ربو النسیہ قرار دیتا ہے۔ (ماہنامہ حکمت قرآن لاہور جنوری ۱۹۹۲ء)

ان کے نزدیک بائع ادھار میں مشتری کی مجبوری کے تحت پیشگی مقررہ رقم منافع کے طور پر لے رہا ہے۔ اس پیشگی مقررہ رقم اور سود میں کوئی فرق نہیں کیونکہ ربو النسیہ میں بھی قارض، مقروض سے قرض کے اصل مال پر زائد رقم لے لیتا ہے۔

یہ تو واضح ہے کہ رسول کریم ﷺ نے یہودی سے زرہ گروی رکھ کر کچھ غلہ ادھار لیا تو رسول کریم ﷺ کے عمل سے اس قسم کے معاہدہ سے جواز ملتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بیع موجل مخصوص حالات سے تعلق رکھتی ہے۔ جس میں نہ تو بائع، مشتری کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر زیادہ ثمن وصول کر رہا ہے اور نہ مشتری یہ سمجھتا ہے کہ بائع منڈی کی قیمت سے زائد ثمن وصول کر رہا ہے۔ اس میں ضرر اور ضرار (نقصان دینے اور نقصان اٹھانے) کا کوئی پہلو نہیں۔ جیسا کہ رسول کریم ﷺ نے یہودی سے زرہ دے کر غلہ حاصل کیا۔ یہ بیع موجل جائز ہے۔ اگر تاجر طبقہ ایسا طریقہ ادھار کو مستقل اپنا لیں اور مارکیٹ میں وہ طریقہ رائج کر کے مجبور لوگوں کی جیب پر ڈاکہ مارنا شروع کر دیں اور سودی قرض کی سی حالت پیدا ہو جائے تو یہ وطیرہ اسلام کی معاشی پالیسی کے سراسر منافی ہے۔

مولانا محمد طاسین اس بارے میں کہتے ہیں۔

صاف نظر آتا ہے کہ یہ معاملہ اپنی حقیقت و ماہیت اپنے منشا و مقصد اور اپنے لازمی اثرات و نتائج کے لحاظ سے ربا النسیہ جیسا معاملہ ہے وہ اس طرح کہ اس میں ایک شے جس کی قیمت نقد سے بازار میں عام طور پر مثلاً ایک سو روپے ہوتی ہے جبکہ ایک سال کے ادھار پر وہ ایک سو پچاس روپے میں بیچی جاتی ہے تو اس سے پچاس روپے کا جو اضافہ ہوتا ہے وہ دراصل ایک سال کی مدت و مہلت کا معاوضہ ہوتا ہے نیز جس طرح ربا النسیہ میں مقروض سے قرض کے اصل مال پر زائد لیا جانے والا مال بلاعوض ہوتا ہے اور مقروض کی حق تلفی قرار پاتا ہے۔ اسی طرح زیر بحث معاملہ میں بیچی جانے والی شے کی اصل قیمت پر ادھار کی وجہ سے جو اضافہ ہوتا ہے، بیچنے والے کی طرف سے خریدار کے لیے اس کا کوئی معاوضہ موجود نہیں ہوتا لہٰذا بیچنے والا جو زائد لیتا ہے خریدار کا حق لیتا ہے اور اس کی حق تلفی کرتا ہے نیز جس طرح ربا النسیہ میں قرض دہندہ کا مقصد بغیر کسی دماغی و جسمانی محنت و مشقت کے اور بغیر نقصان برداشت کرنے کی کسی ضمانت کے اپنے سرمائے اور تمول کو بڑھانا ہوتا ہے اسی طرح زیر بحث بیع موجل کے معاملے میں فروخت کنندہ کا مقصد بغیر کسی پیداوار محنت اور عملی جدوجہد کے اور بغیر نقصان برداشت کرنے کی کسی ذمہ داری کے نفع کمانا اور اپنے سرمائے کو بڑھانا ہوتا ہے پھر جس طرح ربا النسیہ کے رواج سے معاشرے میں معاشی عدم توازن اور غیر فطری نشیب و فراز رونما ہوتا ہے اور ملکی دولت چند اغنیاء اور سرمایہ داروں کے درمیان سمٹ کر رہ جاتی ہے اسی طرح زیر بحث معاملہ کے بھی عام رواج سے معاشرے میں ویسی ہی معاشی حالت پیدا ہوتی ہے غرضیکہ وہ تمام اخلاقی، معاشرتی اور معاشی برائیاں جو ربا النسیہ کے عملی رواج سے ظہور میں آتی اور معاشرے کے توازن کو بگاڑتی ہیں اور جن کی وجہ سے اسلام میں ربا النسیہ کو قطعی طور پر حرام اور ممنوع ٹھہرایا ہے۔ وہ سب زیر بحث بیع موجل کے معاملے سے بھی لازماً ظہور میں آتی ہیں لہٰذا اصول قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اس معاملے کا بھی وہ حکم ہونا چاہیے جو معاملہ ربا النسیہ کا ہے یعنی حرام کیونکہ بنیادی طور پر ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ (ماہنامہ حکمت لاہور جنوری ۱۹۹۲ء)

مذکورہ بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ بیع موجل کی شکل ربو النسیہ کی شکل اختیار کر جائے۔ جس سے معاشی توازن بگڑ جائے۔ غرباء کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہو۔ جذبہ اخوت و ہمدردی ختم ہو چکا ہو اور دولت کا بہاؤ مخصوص طبقہ کی طرف ہو جائے۔ جس سے غریب سے غریب تر اور امیر سے امیر تر ہوتا جا رہا ہو تو یہ بیع موجل ربا النسیہ کا لباس پہن لے گی جو قطعی طور پر حرام ہے۔

[1] مولانا محمد طاسین وغیرہ۔

بیع موجل اسلام نے عوام کے فائدہ کے لیے جائز قرار دی ہے کہ اگر وقتی طور پر کسی کے پاس رقم نہیں تو وہ بازار کی قیمت پر ہی ادھار لے لے۔ اس طرح قرض دینے والے کے لیے ثواب بھی ہے اور معاشرے میں جذبہ اخوت بھی بڑھتا ہے اور معاشی رنگ میں دولت معاشرے میں گردش بھی کرتی ہے۔ اور عوام خوش حال ہوتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ایسے عقد جس سے تعاون اور عملی محنت کا فقدان اور مجبوری کا عنصر پایا جاتا ہو۔ اس کو تمدنی حکمتوں کے اعتبار سے باطل قرار دیا ہے۔

فرماتے ہیں۔ ''پس اگر مالی نفع ایسے طریقے پر حاصل کیا جائے کہ اس میں عاقدین کے درمیان تعاون اور عملی محنت کا دخل نہ ہو۔ جیسے قمار یا زبردستی رضامندی کا اس میں دخل ہو جیسے سودی کاروبار۔ تو ان صورتوں میں بلاشبہ مفلس اپنے افلاس کی وجہ سے خود پر ایسی ذمہ داریاں عائد کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جن کا پورا کرنا اس کی قدرت سے باہر ہوتا ہے اور اس کی وہ رضامندی حقیقی رضامندی نہیں ہوتی۔ تو اس قسم کے تمام معاملات رضامندی کے معاملات نہیں کہلائے جاسکتے اور نہ ان کو پاک ذرائع آمدنی کہا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ یہ معاملات تمدنی حکمتوں کے اعتبار سے باطل اور خبیث ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ من ابواب ابتغاء الرزق)

جب بیع موجل عاقدین کے مابین مجبوری اور اکراہ کی وجہ سے وقوع پذیر ہوگی تو حضرت شاہ ولی اللہؒ کی رائے کے مطابق یہ بیع باطل ہوگی۔

کرایہ داری

کرایہ داری کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے بعض علماء کرایہ داری کو اسلامی روح کے منافی سمجھتے ہیں بعض جائز۔

اسلام نے اجتماعی عدل اور اقتصادیات کے اصول مقرر کیے ہیں۔ ان اصولوں پر کرایہ داری کو پیش کر کے جائز اور ناجائز کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

اسلام کا پہلا اصول تسویہ ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِلسَّائِلِينَ (۴۱:۱۰) اور اس کی (ذخیرہ) خوراک کا اس میں اندازہ کیا (یہ) چار دن میں (کیا) مانگنے والوں کے لیے برابر ہے۔ آیت بالا میں یہ بتایا گیا ہے کہ قومی خوراک کے ذخائر میں سب کا برابر کا حصہ ہے کوئی ایک شخص کسی طریقہ سے بھی ان پر قابض نہیں ہوسکتا۔ جبکہ ہر فرد کو قومی ذخائر سے استفادہ کا برابر کا حصہ ہے رسول کریم ﷺ کے عہد مسعود میں تمام دولت ''تسویہ'' کے اصول پر تقسیم ہوتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کے دور میں مال غنیمت اور مال فئے کثرت سے آنے لگا تو آپ نے بھی ''تسویہ'' کے اصول پر لوگوں میں مال تقسیم کیا۔ مساوات کے اس نظام پر اعتراض بھی ہوا کہ اصحاب الاولیت، اصحاب الفضیلت کا لحاظ رکھے بغیر سب کو برابر حصہ دیا گیا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ جنھوں نے پہلے اسلام قبول کیا اور صاحب فضیلت بنے یہ دین سے تعلق رکھتا ہے اس کا اجر اللہ کے پاس ہے۔ تقسیم دولت کا تعلق معاش سے ہے۔ اس میں کسی کو ترجیح نہیں دی جاسکتی کیونکہ سب کی ضروریات برابر ہیں۔ فهذا معاش فالا سوة فيه خير من الاثرة (کتاب الخراج ابویوسف ص ۲۴) چنانچہ آپ کے تمام دور خلافت میں تقسیم تسویہ کے اصول پر ہوئی۔

حضرت عمرؓ نے اصحاب الاولیت کو ترجیح دی۔ اس کے اثرات اور نتائج اچھے نہ نکلے۔ چنانچہ آپ نے اپنی غلطی کا احساس کرلیا اور کہا میں زندہ رہا تو تسویہ کے اصول پر لوگوں میں مال تقسیم کروں گا۔ چنانچہ تسویہ کے اصول پر عمل کرنے سے پہلے ہی شہید کر دیے گئے۔ حضرت عمر عثمانؓ اور حضرت علیؓ مساوات کے قائل تھے۔ جب بھی اس اصول کو چھوڑا گیا۔ ملک میں افراتفری پھیلی۔

قرآن مجید میں مال غنیمت کی تقسیم کا اصول سورہ الانفال کے آیت ۴۲ میں درج ہے۔ اس آیت کی روشنی میں یہ قاعدہ بنایا گیا۔

''لايفضل الخيل بعضها على بعض ولا يفضل الفرس القوى على الفرس الضعيف ولا يفضل الرجل الشجاع التام السلاح على الرجل الجبان الذى لاسلاح معه الا سيفه. (الخراج ابویوسف ص ۱۹) کسی گھڑ سوار کو دوسرے گھڑ سوار پر حصہ غنیمت میں کوئی فضیلت ہے نہ ہی کسی قوی گھڑ سوار کو ضعیف گھڑ سوار پر کوئی فضیلت حاصل ہے اسی طرح کسی مسلح تام بہادر کو کسی کمزور پر کوئی فضیلت حاصل ہے جس کے پاس تلوار کے سوائے کوئی ہتھیار نہیں۔

حضرت عمرؓ کے دور میں جب عراق شام ایران کے علاقے فتح ہوئے تو آپ نے تمام مفتوحہ اراضی بیت المال کی ملکیت قرار دی۔ اس میں یہی اصول کارفرما تھا۔

تسویہ کا اصول اپنانے میں یہ حکمت ہے کہ معاشرہ میں دولت کی بنیاد پر طبقاتی تقسیم پیدا نہ ہو۔ دولت کا بہاؤ مخصوص طبقہ کی طرف نہ ہو۔

جب کرایہ داری پر اس اصول کو منطبق کرتے ہیں تو واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ مکانوں، پلازوں، مارکیٹوں کو کرایہ پر دینے سے اصول تسویہ

مجروح ہوتا ہے۔ دولت کا بہاؤ مخصوص لوگوں کی طرف ہو جاتا ہے۔ جس سے دولت کی بنیاد پر طبقاتی تقسیم ہو جاتی ہے۔

دوسرا اصول وہ ہے جو دنیا میں کسی معاشی نظام میں نہیں پایا جاتا وہ ہے۔ "کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ" (الحشر: ۷) ایسا نہ ہو کہ مال دولت تمھارے اعتبار ہی میں محدود ہو کر رہ جائے۔ اسی اصول کے تحت انفاق فی سبیل اللہ پر زور دیا ہے۔ انفاق دو طرح کا ہے۔ لازمی اور طوعی۔ لازمی میں زکوٰۃ ہے اور طوعی میں خیرات وغیرہ اسی طرح انفاق کی آخری حد بھی مقرر کر دی۔ ارشاد الٰہی ہے۔ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ:۲۱۹) وہ تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ دیجئے جو کچھ ضرورت سے زیادہ ہو۔

مذکورہ اصول میں ایک تو یہ بتایا گیا ہے کہ دولت صرف چند ہاتھوں میں ہی گردش نہیں کرتی رہنی چاہیے۔ پھر دولت کی گردش کے لیے چند اصول مقرر کیے ان میں سے ایک انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ آخر میں انفاق کی یہ حد مقرر کی کہ جو ضرورت سے زائد ہے وہ ریاست کا حق ہے تاکہ دولت کو ریاستی ضروریات پر خرچ کیا جا سکے۔ ریاستی ضروریات میں سے ایک اہم ضرورت غرباء مساکین وغیرہ کی ضروریات زندگی کو پورا کرنا ہے۔

اس اصول کو سامنے رکھا جائے تو مکانوں، پلازوں وغیرہ کی کرایہ داری کا بطلان ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ مکانوں اور پلازوں کی کرایہ داری سے دولت کا بہاؤ مخصوص لوگوں کی طرف ہو جاتا ہے جو اصول "کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ" کی روح کے منافی ہے۔

تیسرا اخلاقی اصول اخوت ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ مومن بھائی بھائی ہیں۔ یہ وہ اسلام کا اصول ہے جس پر معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی نظام کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اسی اصول کی بنیاد پر رسول کریم ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کی اور کرایہ داری اسلام کے اصول اخوت کے بھی منافی ہے۔

اصولی بحث کرنے کے بعد اب ہم دیکھتے ہیں کہ کرایہ داری کی شرعی حیثیت کیا ہے۔

حدیث اور مکانوں کا کرایہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک روز باہر نکلے۔ اور ایک مکان پر ایک بلند قبہ بنا دیکھا۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ صحابہ نے بتایا کہ انصار میں سے فلاں شخص نے یہ قبہ بنایا ہے۔ آپ خاموش ہو گئے اور اس کا اثر اپنے دل میں لے کر چل دیے۔ حتیٰ کہ اس قبے کا بنانے والا شخص جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لوگوں کی موجودگی میں اس نے آپ کو سلام کیا۔ مگر آپ ﷺ نے اس سے اعراض کر لیا۔ اس نے کئی بار ایسا کیا۔ حتیٰ کہ وہ آپ کا غصہ اور اعراض پہچان گیا۔ اس نے اصحاب سے وجہ پوچھی اور کہا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے آپ کو کسی وجہ سے ناراض کر لیا ہے انھوں نے بتایا کہ آپؐ باہر نکلے تھے اور آپ ﷺ نے تمہارا قبہ دیکھا وہ شخص اس وقت سیدھا اپنے قبے کی طرف واپس گیا اور اسے گرا کر زمین کے برابر کر دیا۔ رسول کریم ﷺ پھر ایک روز ادھر سے گزرے آپ ﷺ نے وہ قبہ نہ دیکھا دریافت کیا اسے کیا ہوا ہے لوگوں نے بتایا کہ بنانے والے نے آپ کی ناراضی اور اعراض کی وجہ پوچھی ہم نے اسے بتایا یہ سن کر اس نے اسے گرا دیا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ہر مکان بنانے والے کے لیے وبال ہوگا۔ سوائے اس مکان کے جس کے بغیر چارہ نہ ہو۔ (سنن ابن ماجہ باب فی البناء والخراب ص ۳۱۷ سنن ابو داؤد ج ۲ باب فی البناء ص ۷۱۱)

اس حدیث سے رسول کریم ﷺ کی مدینہ میں تعمیراتی پالیسی واضح ہوتی ہے کہ رہائشی مکان صرف بقدر ضرورت بنانے کی اجازت تھی۔ زائد از ضرورت زمین استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی اور نہ مکانوں پر بیجا خرچ کر کے خوبصورت کرنے کی کیونکہ تبذیر اسلام میں حرام ہے۔

دوم ایک رہائشی مکان سے زائد مکان بنانے کی ممانعت تھی [1]

اس پالیسی کا یہ نتیجہ تھا کہ کوئی مسلمان بغیر گھر کے نہ تھا۔

حضرت خبابؓ نے اپنے مرض کے دوران رسول کریم ﷺ سے یہ حدیث روایت کی۔

ان العبد لیوجر فی نفقتہ کلھا الا فی التراب وقال فی البناء۔ (سنن ابن ماجہ باب فی البناء والخراب ص ۳۱۷)

انسان جو بھی خرچ کرتا ہے اللہ اس کا اجر دیتا ہے۔ سوائے اس مال کے جو ضرورت سے زیادہ زمین خریدنے پر یا مکان بنانے پر خرچ کرتا ہے۔

امام ترمذی کی حدیث ہے۔ النفقۃ کلھا فی سبیل اللّٰہ الا البناء ہر قسم کا جائز خرچ اللہ کی راہ میں تصور ہوگا۔

سوائے (ضرورت سے زائد) مکان تعمیر کیا جائے۔

---

[1] "پاکستان کی اقتصادی حالت ناگفتہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ یہاں کوئی تعمیراتی پالیسی نہیں۔ روساء ایکڑوں، مربعوں میں اپنے محل بناتے ہیں۔ پھر آرائش و زیبائش کے لیے پانی کی طرح روپیہ بہا دیتے ہیں جبکہ پاکستان میں ایسے لوگ بھی رہتے ہیں جن کے پاس سر چھپانے کے لیے چھت تک نہیں یعنی ایک طرف تبذیر دوسری طرف تعمیر یہی ایک وجہ ہے ملک پاکستان کی اقتصادی حالت نہیں سدھرتی اور نہ سدھرے گی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے۔

قال رسول اللّٰہ من بنی فوق مایکفیه کلف ان یحمله یوم القیامه رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص ضرورت سے زائد مکان بنائے قیامت کے دن اسے مجبور کیا جائے کہ وہ اس کو اٹھائے۔

اس حدیث میں ضرورت سے زائد مکان تعمیر کرنے کی شدید وعید ہے۔ اس میں صرف منع ہی نہیں کیا گیا بلکہ خلاف ورزی کرنے والے کے لیے عذاب کی خبر بھی ہے۔

قبلہ ازد نے اسلام قبول کیا اور ان کا ایک وفد رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اپنی تعمیراتی پالیسی بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ ولا تبنوا مالا تسکنون اور تم ایسے مکان نہ بنانا جن میں تمھیں رہنا نہ ہو۔

کرایہ سے ممانعت: جب تعمیراتی پالیسی کے تحت زائد از ضرورت مکان تعمیر ہی نہیں کرنے تو کرایہ پر دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ ﷺ نے صرف زائد از ضرورت مکان بنانے سے ہی منع نہیں فرمایا بلکہ مکانوں کو کرایہ پر دینے سے بھی منع فرمایا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے رسول کریم ﷺ سے یہ حدیث بیان کی ہے۔ "من اکل من اجور بیوت اکلة فانما یاکل فی بطنه نار جهنم." (الارزقی، اخبار مکہ ص ۳۹۱، کتاب الاموال ابوعبیدہ ص ۱۶۸) جس نے مکہ کے مکانوں کا کرایہ کھایا درحقیقت اس نے اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر لی۔

حضرت علقمہ بن نضلہ کی روایت ہے۔ "قال کانت الدور والمساکن علی عهد النبی ﷺ وابی بکر و عمر و عثمان رضی اللّٰہ عنهم ماتکری ولا تباع، ولا تدعی الا السوایب، من احتاج مسکن ومن استغنی اسکن" (امام ابن ماجہ، السنن، باب اجر بیوت مکہ ص ۲۳۱، الازرقی اخبار مکہ ص ۳۹۱، کتاب الاموال ج ۲ ص ۱۳۱) عہد رسالت اور عہد ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم میں مکہ میں ایسے مکان تھے جو قیام گاہیں تھی جن کا کرایہ نہیں لیا جاتا تھا۔

یہ پالیسی صرف مکہ کے لیے ہی نہیں تھی بلکہ یہ تمام ریاست کے علاقوں کے لیے تھی۔ لوگ جس شہر میں جاتے وہاں ریاست کے اپنے تعمیر کردہ مکانات ہوتے مسافر وہاں قیام کرتے اور کرایہ نہ دیتے تھے۔ علامہ ابن حبان نے اپنی کتاب "الثقاة" میں مدینہ منورہ کے مہمان خانے کا تذکرہ کیا ہے جو ۱۷ ہجری میں تعمیر کیا گیا اسی طرح کوفہ، بصرہ، فسطاط اور دیگر شہروں کی حالت ہے۔

مذکورہ بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے مکہ میں مکانوں کی کرایہ داری سے منع فرمایا یہ حکم صرف مکہ کے مکانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام ریاست کے شہروں کے مکانوں پر لاگو ہے۔ مکہ کے مکانوں کا ذکر خصوصاً اس لیے کیا ہے کہ لوگ حج یا عمرہ کے لیے وہاں جاتے تو زائرین کو رہائش درکار ہوتی تھی۔ تو مکہ کے رہنے والوں نے زائرین کو کرایہ پر دینے کے لیے مکان تعمیر کر لیے۔ دیگر شہروں میں ایسی بات نہیں تھی۔ اس لیے رسول کریم ﷺ نے مکہ کے مکانوں کا خصوصاً ذکر کیا اور ریاست کے دیگر شہروں کے مکانوں کا ذکر نہیں کیا۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے جب ایک جگہ کے مکانوں کا کرایہ ناجائز ہے تو دوسری جگہ کے مکانوں کا کرایہ کیوں کر جائز ہوگا۔

کرایہ داری سرمایہ دارانہ ذہن کی عکاسی کرتی ہے اور دولت کا بہاؤ مخصوص طبقے کی طرف ہو جاتا ہے اور العفو کے اصول کے بھی خلاف ہے اس لیے مکان کی کرایہ داری کو ناجائز قرار دیا ہے۔

ہاں اگر کوئی ضعیف ہے کمانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ بیمار ہے اور کوئی ذریعہ آمدن نہیں۔ یا کوئی اور مجبور شخص اپنے گزر اوقات کے لیے کوئی مکان بنا لیتا ہے اور کرایہ پر دے کر اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہے وہ اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اس قسم کے اشخاص کی آمدن سے تقسیم دولت میں کوئی بگاڑ پیدا نہیں ہوتا۔ نہ حکم (العفو) کے خلاف ہے۔ اس قسم کی آمدن "من اضطر غیر باغ ولا عاد ولا اثم علیه" کے تحت آ جائے گی۔

محض دولت کی بڑھوتی کے لیے عالی شان پلازے کرایہ پر دینے کے لیے تعمیر کرنا اسلامی معاشی نظام کی روح کے منافی ہے۔ اسلام اس قسم کے ذریعہ آمدن کی اجازت نہیں دیتا۔ اس سے تقسیم دولت کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور دولت کا بہاؤ مخصوص طبقہ کی طرف ہو جاتا ہے۔

اس کی ایک جائز صورت نکل سکتی ہے وہ یہ کہ مکانات، دکانیں اور مارکیٹیں فروخت کرنے کے لیے تعمیر کی جائیں تو یہ تجارت اسلامی اصول کے تحت آ جائے گی۔

کتب احادیث میں اجارہ مکان کے جواز میں کوئی حدیث نہیں ملتی نہ رسول کریم ﷺ اور خلفاء راشدین کے عہد میں کرایہ داری کا رواج تھا۔ اس لیے کرایہ داری کو ناجائز اشیاء کے زمرہ میں ہی لانا چاہیے اور یہی اسلامی معاشی روح تقاضا کرتی ہے۔

بنک

لفظ بنک کے ماخذ کے متعلق ماہرین کا اختلاف ہے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ بنک کا لفظ اطالوی زبان کے الفاظ Bancus، Banco، Banque سے ماخوذ ہے ان الفاظ کے معنی بنچ کے ہیں۔ زمانہ قدیم میں اٹلی کے یہودی سوداگر زر (Money) کا لین دین کرنے کے لیے بنچ استعمال کرتے تھے۔ جب کسی سوداگر کو کاروبار میں نقصان ہوتا اور وہ اپنے واجبات ادا نہ کرسکتا تو وہ اس بنچ کو توڑ دیتا گویا وہ سوداگر دیوالیہ ہوگیا ہے آج کل بھی بنک دیوالیہ ہو جاتا ہے تو اسے (Bank crupt) کہا جاتا ہے۔

بعض ماہرین لفظ بنک (Bank) جرمن زبان کے لفظ (Back) سے ماخوذ سمجھتے ہیں جس کے معنی ''مشترکہ سرمایہ'' کے ہیں جب جرمن اٹلی کے بہت بڑے حصے پر قابض تھے۔ تو جرمن زبان کے لفظ (Back) کو اطالوی رنگ دے کر (Banko) بنا لیا گیا بعد میں یہ لفظ انگریزی زبان میں بنک (Bank) بن گیا۔

بنک کی تعریف: بنک ایک ایسا ادارہ ہے جو ایسے لوگوں سے امانتیں وصول کرتا ہے جنھیں فی الحال ان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر اس جمع شدہ سرمایہ سے ضرورت مند افراد کو پیدا آور اور غیر پیدا آور کاموں کے لیے قرضے (Loans) دیتا ہے۔ یہ ادارہ کم شرح پر امانتیں وصول کرتا ہے اور زیادہ شرح سود پر قرض دے کر منافع کماتا ہے۔

پروفیسر کراؤتھر کے الفاظ ''بنک قرضوں کا کاروبار کرتا ہے عوام سے امانتیں وصول کرتا ہے اور ضرورت مند افراد کو قرضے فراہم کرتا ہے۔ بنک کے جاری کردہ زر اعتبار کو عام لوگ بلا حیل و حجت قبول کر لیتے ہیں۔ اس لیے بنک زر کی تخلیق بھی کرتا ہے۔

بنک کا ارتقاء: قدیم زمانہ میں لوگوں کی جان و مال ڈاکوؤں سے محفوظ نہیں تھے۔ لہٰذا روپیہ پس انداز کرنا خود مہلک ہوا کرتا تھا یا تو لوگ پس انداز ہی نہیں کرتے تھے۔ جو کرتے تھے وہ زمین میں دفن کر دیتے۔ جس کا علم کنبے کے سربراہ کو ہی ہوتا تھا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ سربراہ دفینہ کی نشان دہی کئے بغیر مر جاتا تو اس طرح وہ دفینہ مٹی کا حصہ بن جاتا۔

ضرورت نے انسان کو سوچنے پر مجبور کیا کہ وہ اپنے میں سے سب سے بہتر متمول اور قابل اعتماد کے پاس اپنی امانتیں جمع کروائیں رفتہ رفتہ یہ مقام سنار نے لے لیا کیونکہ اس کے پاس سونے چاندی کے ذخائر ہوا کرتے تھے اور وہ ان کے تحفظ کے لیے لوہے کے بڑے بڑے صندوق اور ہتھیار بند ملازم بھی رکھا کرتے تھے اس لحاظ سے سنار کا گھر محفوظ ترین جگہ اور سنار قابل اعتماد شخص سمجھا جانے لگا۔ سنار لوگوں سے ان کی امانتیں وصول کر کے رسیدیں لکھ دیا کرتے تھے۔ جن سے بعض اوقات کاروبار بھی کر لیا کرتے تھے۔ قابل اعتماد ہونے کی بناء پر صرافوں کی رسیدات عام لین دین میں قبول کی جانے لگیں۔ یہ رسیدیں زر کاغذی کی قدیم ترین شکل ہے۔ رفتہ رفتہ ساہوکاروں نے اپنے ذاتی لین دین میں اپنے ہی ہاتھ کی لکھی ہوئی رسیدوں کو بطور زر چلایا، اور لوگوں نے ان رسیدوں کو بطور زر قبول کر لیا۔ اس طرح یہ رسیدیں آلہ مبادلہ کے علاوہ قرضوں کی ادائیگیوں اور وصولیوں کے لیے بھی گردش کرنے لگیں۔

چونکہ صرافوں کے پاس لوگوں کی کثیر امانتیں جمع ہوتی تھیں اور انھیں سے بہت کم امانتیں رکھنے والے اپنی امانتیں واپس لینے آتے تھے۔ لہٰذا صرافوں نے ان امانتوں سے ضرورت مند لوگوں کو ادھار دینا شروع کر دیا جس پر قرض خواہ کی ضرورت کی نوعیت کے مطابق شرح سود بھی وصول کیا جاتا۔ قرض دینے کے علاوہ صراف جمع شدہ سرمایہ کو خود کاروبار میں لگا لیا کرتے تھے۔ جوں جوں امانتوں کی مقدار بڑھتی گئی۔ صراف کا کاروبار وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور جب ایک صراف سے وسیع کاروبار سنبھالنا مشکل ہوا تو شراکت کی بنیاد پڑی۔ جس نے بعد میں مشترکہ سرمایہ کی انجمن کی شکل اختیار کر لی۔ تاکہ احتمال نقصان کی ذمہ داری کا بوجھ ایک یا چند افراد پر ڈالنے کی بجائے انجمن پر ڈالی جاسکے۔

سوداگر: صرافوں کے علاوہ سوداگر بھی بنک کے ابتدائی ارتقاء میں شریک تھے۔ چودھویں صدی عیسوی میں یورپ کے بڑے بڑے تجارتی مراکز اٹلی کے شہروں میں تھے۔ اٹلی کے بہت سے یہودی تاجر برطانیہ چلے گئے۔ جہاں انھوں نے زر کو قرض دینے اور اس پر سود وصول کرنے کا کاروبار شروع کیا۔ وہ مالی لحاظ

سے اتنے مضبوط تھے کہ گاہے بگاہے شہنشاہ بھی ان سے قرض لیتے تھے۔ ان تاجروں نے غیر ملکی تجارت میں بھی اہم فرائض سرانجام دیے۔ غیر ممالک میں تاجروں کی ادائیگی کے لیے تحریری اجازت نامے دیے۔ انہی اجازت ناموں نے بعد میں ہنڈی اور بنک ڈرافٹ کی شکل اختیار کر لی۔

مہاجن: بنک کے ابتدائی ارتقاء کی ایک کڑی مہاجن بھی تھے جو ضرورت مند افراد کو ادھار دیتے تھے۔ جب ان کا کاروبار وسیع ہوا تو پھر انھوں نے سرمایہ قرض دینے کے لیے ان لوگوں سے بھی ادھار لینا شروع کر دیا جن کے پاس فالتو رقم ہوتی تھی۔ مہاجن ان کو کم شرح پر سود ادا کرتے تھے اور قرض لینے والے افراد سے زیادہ شرح سود وصول کرتے۔ اس طرح مہاجن نفع کماتے، جدید زمانہ میں بنکوں کے دو بنیادی فرائض یعنی امانتیں وصول کرنا اور قرض دینا مہاجنوں کے کاروبار کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

قرون وسطیٰ تک سودی کاروبار پر یہودی مہاجنوں کی اجارہ داری قائم تھی۔ اس دور میں عیسائی ساہوکاروں نے یہودیوں کی اجارہ داری توڑنے کی کوشش کی مگر انھیں چنداں کامیابی نہ ہوئی کیونکہ مالی امور میں جو دسترس یہودی ساہوکاروں کو حاصل تھی وہ عیسائی ساہوکاروں کو حاصل نہ ہو سکی۔

بنکاری امور میں وینس اور جینوا کے ساہوکاروں کو خاص دسترس حاصل تھی یہی وجہ ہے کہ وہاں کے بنک صحیح معنوں میں جدید بنکاری کے پیشوا ثابت ہوئے۔ وینس کے ساہوکار اپنے امانت داروں کو ان کی امانتوں کی رسیدیں بھی دیا کرتے تھے۔ چودھویں اور پندرھویں صدی میں امانت داروں کو اپنے حسابات میں سے زائد رقم لینے کی اجازت تھی۔ اگرچہ اسے مستحسن نہیں سمجھا جاتا تھا۔

۱۳۵۶ء میں سرکاری بنک قائم کرنے کی تجویز ہوئی جو سرکار کے لیے مفت خدمات سرانجام دیتے تاکہ حکومت کو اپنے مالی امور کے لیے نجی بنکوں کا محتاج نہ ہونا پڑے۔ اس بنک کے اخراجات سرکاری خزانے سے پورے کیے جاتے تھے۔ جنگی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے یہ بنک حکومت کو قرضے بھی دیتا تھا۔ محدود مالی وسائل کی وجہ سے یہ بنک حکومت کے جنگی اخراجات پورے نہ کر سکا۔

بنک آف امسٹرڈم ۱۶۰۹ء میں قائم ہوا...... بنک آف فرانس ۱۸۱۰ء میں قائم کیا گیا۔ یورپ میں مشترکہ سرمایہ کی انجمن کی شکل میں سب سے پہلے بلجیم نے ۱۸۲۲ء میں بنک قائم کیا۔ بنک آف فیڈرلینڈ ۱۸۱۴ء اور بنک آف سویڈن ۱۶۰۸ء میں قائم ہوئے۔ روس میں بنکاری ۱۷۶۸ء میں شروع ہوئی جبکہ کیتھرائن نے ماسکو میں دو بنک قائم کیے۔ روس کا سٹیٹ بنک البتہ ۱۸۶۰ء میں قائم ہوا۔ ہندوستان میں پہلا جائنٹ سٹاک بنک جس کا نام بنک آف ہندوستان تھا۔ ۱۷۷۰ء میں قائم ہوا۔

نظر ثانی بنک کی قسمیں: دور جدید میں تخصیص کار کی وجہ سے بنک کئی قسموں میں منقسم ہو چکے ہیں۔ ہر بنک کسی خاص شعبے میں تخصیص حاصل کر لیتا ہے اور ان کی تقسیم بھی ان ہی مخصوص فرائض کی بناء پر کی جاتی ہے۔ ذیل کی سطور میں اختصار کے ساتھ بنکوں کی قسموں پر بحث کی گئی ہے۔

(۱) تجارتی بنک (Cummercial Bank): تجارتی بنک جائنٹ سٹاک کمپنی (Joint Stok Company) یعنی مشترکہ سرمایہ کی انجمنیں جس کے حصہ داروں کی ذمہ داری محدود ہوتی ہے۔ یعنی نقصان کی صورت میں حصہ دار صرف اپنے حصے (Share) کی مالیت کی حد تک ذمہ دار ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ تجارتی بنک اندرونی اور بیرونی تجارت کو مالیات فراہم کرتے ہیں۔ ملکی اور بدیشی ہنڈیوں پر بٹہ لگاتے ہیں۔ لوگوں سے امانتیں وصول کرتے ہیں اور ضرورت مندوں کو قرضے فراہم کرتے ہیں۔ یہ خود بھی براہ راست نجی کاروبار اور سرکاری تمسکات میں سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ انتقال زر اور قیمتی دھاتوں اور دستاویزات کے تحفظ کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ ملکی قوانین اور مرکزی بنک کے احکامات کے مطابق مدتی اور طلبی امانتوں کا طے شدہ حصہ مرکزی بنک میں جمع کرانے کے پابند ہوتے ہیں۔ یہ اپنی امانتوں سے زیادہ قرض بھی دیتے ہیں جسے تخلیق زر کہا جاتا ہے۔ پاکستان میں ایسے بنکوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن بنکوں کا ادا شدہ سرمایہ ۵ لاکھ یا ۵ لاکھ روپے سے زیادہ ہو انہیں فہرستی بنک (Scheduled Bank) کہا جاتا ہے۔

(۲) صنعتی بنک: یہ بنک صنعتی ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ صنعتوں کو درمیانے اور طویل عرصے کے قرضے فراہم کرتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی صنعتی اور اقتصادی ترقی صنعتی بنکوں کی بھی مرہون منت ہے جن میں جرمنی، برطانیہ، امریکہ اور جاپان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کامیابی کے پیش نظر اقتصادی طور پر پسماندہ ممالک بھی صنعتی ترقی کے لیے ایسے اداروں کا قیام اور فروغ کو خاص اہمیت دے رہے ہیں۔ پاکستان میں بھی صنعتی ترقیاتی بنک اور صنعتی قرضہ اور سرمایہ کاری کی کارپوریشن صنعت کاروں کو طویل اور درمیانے عرصے کے لیے حوصلہ افزا شرائط پر قرضے فراہم کرتی ہے۔ قرضے دینے کے علاوہ یہ بنک صنعت کاروں کو فنی مشاورتی خدمات بھی فراہم کرتا ہے۔

(۳) زرعی بنک: زراعتی بنک کا بنیادی مقصد زرعی انقلاب برپا کرنے کے لیے زراعت پیشہ لوگوں کو آسان شرائط پر قرضے فراہم کرنا ہوتا ہے تاکہ کاشتکار کو قرضے کے حصول میں مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ کاشتکار کو بیج، کیمیائی کھاد، آلات کاشتکاری اور مویشیوں کی خرید کے علاوہ آبپاشی کے لیے ٹیوب ویل کی تنصیب اور سیم وتھور سے متاثرہ زمینوں کو قابل کاشت بنانے کے لیے ایسے آسان اور سستے قرضوں کی ضرورت ہوتی ہے جو عام تجارتی بنک فراہم نہیں کر سکتے لہٰذا خالص زرعی بنک قائم کیے جاتے ہیں۔ پاکستان میں بھی اس مقصد کے لیے زرعی ترقیاتی بنک اور زرعی ترقیاتی کارپوریشن قائم ہے جو زرعی ترقی میں کارہائے نمایاں سرانجام دے رہی ہے۔

(۴) مبادلہ کے بنک: مبادلہ کے بنک غیر ملکی زرمبادلہ کا لین دین کرتے ہیں۔ یہ غیر ملکی ہنڈیوں اور ڈرافٹوں کی خرید وفروخت کرتے ہیں اور اس طرح بین الاقوامی ادائیگیوں کے لیے سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔ آج کل چونکہ اکثر ممالک نے مبادلات خارجہ پر کنٹرول نافذ کیا ہوا ہے اس لیے ہر بنک کو زرمبادلہ کے لین دین کی اجازت نہیں ہوتی۔ مرکزی بنک کی باقاعدہ اجازت سے چند ایک بنکوں کو ہی زرمبادلہ کے لین دین کی اجازت ہوتی ہے۔ پاکستان میں بھی زرمبادلہ پر کنٹرول رائج ہے۔ لہٰذا اسٹیٹ بنک کی اجازت سے چند پاکستانی بنکوں کو مبادلات خارجہ کا لین دین کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

بچت کے بنک: تجارتی بنک اپنے امانت داروں سے امانتیں جمع کرانے اور نکلوانے کے متعلق بڑی سختی سے اپنے ضابطوں پر پابندی کراتے ہیں جن سے چھوٹی چھوٹی بچتیں کرنے والے افراد کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قلیل بچتوں کو پیداواری مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی غرض سے آج کل عام تجارتی بنکوں نے بھی اپنے ہاں چھوٹی بچتوں کے لیے ایک خاص شعبہ قائم کرلیا ہے جہاں امانتداروں کو شرح سود بھی ادا کیا جاتا ہے اگرچہ یہ شرح سود مدتی امانتوں پر ملنے والے شرح سود سے کم ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں بچت کے علیحدہ بنک قائم ہیں۔ پاکستان میں بچت کے بنک پوسٹ آفس میں قائم کیے گئے تھے جہاں بہت ہی قلیل رقم سے حساب کھولا جا سکتا ہے اور ہفتہ میں دومرتبہ امانتیں واپس بھی لی جاسکتی ہیں۔ پاکستان میں ایسے بنکوں کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ ملک کی ۸۵ فیصد آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے۔ جہاں جدید بنکاری کی سہولتیں فراہم نہیں چنانچہ ایسے علاقوں میں عوام کو بچت کی سہولتوں کی فراہمی کے لیے ڈاکخانوں کا وجود بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اب پاکستان میں بھی قومی بچت بنک کام کر رہے ہیں۔

سرمایہ کاری کے بنک: سرمایہ کاری کے بنک عموماً کاروباری تنظیموں کے حصص، کفالتیں اور تمسکات خرید کرانے کے لیے سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ یہ سرمایہ کاری کے علاوہ امانتیں وصول کرنے کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔ امریکہ میں سرمایہ کاری کے بنک کثیر تعداد میں موجود ہیں اور جاپان کی اقتصادی ترقی تو بہت حد تک ایسے اداروں کے فعال کردار کے مرہون منت ہے۔ پاکستان کو بھی اپنی اقتصادی ترقی کے لیے ایسے ہی ادارے کے قیام کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ پاکستان میں صنعتی قرضہ اور سرمایہ کاری کی کارپوریشن کے نام سے ایسا ادارہ قائم کیا گیا ہے۔ الغرض دنیا کے ہر ملک میں سرمایہ کاری کے بنک قائم ہیں۔

صارفین کے بنک: ایسے بنکوں کے قیام کا بنیادی مقصد صارفین کو روزمرہ ضروریات کی خرید کے لیے سستے قرضے فراہم کرنا ہوتا ہے۔ ان قرضوں کی ادائیگی یک مشت یا قسط وار عموماً ماہوار ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے بنک امانتیں وصول کرنے اور قرضہ کی سہولتیں فراہم کرنے کے علاوہ تمسکات اور کفالتوں کی فروخت سے بھی سرمایہ اکٹھا کرتے ہیں۔ اگر صارفین کی قرضوں کی طلب شدید ہو تو بنک دوسرے مالی اداروں سے بھی قرض لے لیتا ہے۔ اس قسم کے بنک امریکہ میں کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں پاکستان میں صارفین کی روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کوئی بنک نہیں۔

رہن بنک: رہن بنک منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد مثلاً مکان، زمین اور قیمتی زیورات وغیرہ رہن رکھ کر ضرورت مند افراد کو قلیل اور درمیانے عرصے کے لیے قرض دیتے ہیں۔ ایسے قرضے عموماً غیر ترقیاتی مقاصد کے لیے دیئے جاتے ہیں۔ پاکستان میں اکثر تجارتی بنک ہی قیمتی اشیاء گروی رکھ کر قرضے دیتے ہیں۔ ان میں نیشنل بنک آف پاکستان خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ لاہور کا ساہوکارہ بنک خاص طور پر اسی مقصد کے لیے قائم کیا گیا تھا۔

امداد باہمی کے بنک: امداد باہمی کا بنک عموماً امداد باہمی کی قرضہ کی انجمنوں (Societies) کو قرض دیتے ہیں۔ جو کاشتکاروں کو کیمیائی کھاد، بیج، آلات کاشتکاری، ٹیوب ویل اور مویشیوں کی خرید کے لیے امداد دیتی ہے۔ پاکستان میں ہر ضلع کے صدر مقام پر ایک مرکزی امداد باہمی کا بنک قائم ہے جو ضلع میں بالواسطہ طور پر کاشتکاروں کی مالی ضرورتوں کی کفالت کا ذمہ دار ہوتا ہے جو مرکزی امداد باہمی کے بنکوں کی نگرانی کے علاوہ ان کی مالی ضروریات کی کفالت کا ذمہ دار ہوتا ہے یہ بنک زرعی ترقی کے علاوہ گھریلو صنعتوں کے قیام اور فروغ کے لیے بھی قرض دیتا ہے۔

مرکزی بنک (State Bank): مرکزی بنک کا کردار ملکی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک طرف ملک کے بنکوں کے لیے محور ہوتا ہے دوسری طرف ریاست کے لیے مالیاتی فرائض ادا کرتا ہے۔

بنکوں کے لیے مرکزی حیثیت

۱۔ مرکزی بنک ملکی بنکوں کے مفادات کے تحفظ اجتماعی مصالح اور ان کے کاروباری اقدامات کو اپنی طے شدہ پالیسیوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے مشورہ دیتا ہے۔

۲۔ ہر بنک ۱۰ فیصد محفوظ سرمایہ میں سے ۵ فیصد مرکزی بنک میں جمع کرائے گا اور یہ فنڈ بطور قرضہ حسنہ ہوگا۔

۳۔ ہر بنک اپنے مضاربت کے حساب دار کے کھاتوں میں سے جو صاحب نصاب ہوں گے۔ اڑھائی فیصد زکوٰۃ کی کٹوتی کر کے مرکزی بنک میں منتقل کرے گا۔ جس کی اطلاع ضلعی کلکٹر زکوٰۃ کو بھی دی جائے گی۔ یہ زکوٰۃ حکومت قرآن مجید کے بتائے ہوئے آٹھ مدات میں خرچ کرے گی۔

۴۔ مرکزی بنک یہ ضابطہ بنائے گا کہ ہر بنک پر یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنے قرض کھاتہ میں جمع شدہ رقم کا ۵۰ فیصد غیر سودی قرض دینے کے لیے آمادہ رہے۔ اس کے صلے میں اس کا اختیار ہوگا کہ وہ کھاتے کا ۴۰ فیصد نفع آور منصوبوں میں لگا سکے اور ۱۰ فیصد نقد زر کے طور پر محفوظ رکھے۔ اس سے سرمایہ کی گردش تیز ہو جائے گی۔ اور ملکی معیشت کو ترقی ہوگی اور رقم بھی بنک کے پاس موجود رہے گی۔

۵۔ مرکزی بنک کا یہ بھی فرض ہوگا کہ وہ تجارتی بنکوں کو زر نقد یا عارضی طور پر کام چلانے کے لیے قرض دے لیکن یہ قرض تجارتی بنک کے قرض دیے ہوئے سرمایوں اور بل آف ایکسچینج یعنی بھنائی ہوئی ہنڈیوں کے عوض دیا جائے گا۔ مثلاً اگر ایک تجارتی بنک کی بھنائی ہوئی ہنڈیوں اور اس کے دیے ہوئے قرضوں کی مقدار ایک کروڑ ہے تو ان کی سند پر مرکزی بنک تجارتی بنک کو پچیس یا تیس لاکھ نقد آسانی سے اور بغیر کسی خطرہ کے قرض دے سکتا ہے۔ اس نقد قرض کا منشا صرف تجارتی بنک پر عوام کی جانب سے نقد مطالبات کو پورا کرنا ہے تاکہ تجارتی بنک کی ساکھ عوام میں قائم رہے۔ تجارتی بنک اس قرض کو اپنے کاروبار کی توسیع میں نہیں لگا سکتا۔ یہ قرض عارضی ہوگا۔

۶۔ مرکزی بنک کسی بنک یا متعلقہ کارخانہ یا مالیاتی ادارہ کے حسابات کسی وقت بھی پڑتال کر سکے گا۔

۷۔ مرکزی بنک ضروری معلومات کی فراہمی، اعداد وشمار کی اشاعت اور بنکوں اور کاروباری اداروں کی معیشت کی مجموعی صورت حال سے باخبر رکھتا ہے۔

۸۔ بنکوں پر کنٹرول رکھنے کے لیے مرکزی بنک عام بنکوں کے ساتھ مشورہ اور تبادلہ خیال جاری رکھے گا تاکہ بنکوں کی مالی پوزیشن مرکزی بنک پر واضح رہے۔

ان ضوابط کے ذریعہ مرکزی بنک عام بنکوں کے کاروبار اور زر کی رسد کو قابو میں رکھے گا۔

ریاست کے لیے مرکزی حیثیت

۱۔ مرکزی بنک حکومت کے مختلف محکموں کے حسابات رکھتا ہے عوام سے حکومت کے ٹیکس وصول کرتا ہے۔

۲۔ حکومت کو ملازمین اور دوسرے اخراجات کے لیے زر نقد مہیا کرتا ہے۔

۳۔ حکومت کے لیے قرضوں اور ادائیگی کا کام کرتا ہے۔

۴۔ حکومت کو غیر ملکی کرنسی مہیا کرتا ہے جو اسے بیرونی تجارت کے لیے درکار ہوتی ہے۔

۵۔ حکومت کو مالی امور کے بارے میں اہم مشورے دیتا ہے۔

۶۔ مرکزی حکومت سونا چاندی کے محفوظ ذخیرہ کے بعوض نوٹ جاری کرتا ہے۔

بنکوں کے فرائض

۱۔ امانتیں وصول کرنا: امانتوں کی وصولی کے بغیر کوئی بنک اپنے فرائض انجام دے ہی نہیں سکتا اور نہ وہ قائم رہ سکتا ہے۔ بنک عوام کی پس انداز کی ہوئی رقم وصول کرتا ہے اور جمع شدہ امانتیں حسب ضرورت چیکوں کے ذریعے واپس بھی نکلوائی جا سکتی ہیں۔ چونکہ امانتوں سے ہی بنک کے کاروبار کو چار چاند لگتے ہیں۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ امانتیں حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرتا ہے اور اپنے امانت داروں کو زیادہ سے زیادہ سہولتوں کی پیش کش کرتا ہے۔ بنک میں

رکھی جانے والی کچھ امانتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں امانت دار بغیر نوٹس کسی وقت بھی بنک سے واپس لے سکتا ہے۔ ایسی امانتوں کو طلبی امانتیں کہا جاتا ہے۔ یہ امانتیں سیّال حالت میں پڑی رہتی ہیں بنک نہ تو انھیں ادھار دے سکتا ہے اور نہ ہی کسی جگہ سرمایہ کاری کر سکتا ہے۔ اس لیے بنک عموماً ان امانتوں پر کوئی سود ادا نہیں کیا کرتا۔ دوسری مدتی امانتیں ہوتی ہیں جو ایک معینہ مدت کے لیے بنک میں رکھی جاتی ہیں۔ اس مدت سے پہلے بلا نوٹس انھیں واپس لینے کا امانت دار کو کوئی اختیار نہیں ہوتا چونکہ بنک کو معینہ مدت تک کے لیے ایسی امانتوں پر اعتماد ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ انھیں بلا حیل و حجت کسی کاروبار میں لگا کر یا قرضدار کو قرض دے کر منافع کماتا ہے۔ طویل مدت کے لیے زیادہ شرح سود دیا جاتا ہے جبکہ قلیل عرصہ کے لیے کم۔

۲۔ قرض دینا: اپنے اور اپنے امانت داروں کے لیے منافع کمانا بنک کے بنیادی مقاصد میں سے ہوتا ہے۔ لہٰذا بنک جمع شدہ امانتوں کا کچھ حصہ امانت داروں کی ضرورتوں کے لیے رکھ کر باقی ضرورت مندوں کو سود پر قرض دے دیتا ہے۔ وہ خود بھی نفع بخش کاروبار میں سرمایہ کاری کرتا ہے۔ امانت داروں کے لیے نقد زر رکھتے وقت بنک بہت احتیاط سے کام لیتا ہے۔ اگر زیادہ رقم سیّال حالت میں رکھی جائے تو بنک کے منافع کمانے کے امکانات محدود ہو جاتے ہیں۔ مگر کم زر نقد بنک کی ساکھ اور اعتماد کو تباہ کرنے کا موجب بھی بن سکتا ہے۔ امانت دار جب بھی رقم واپس لینے آئے تو بلا حیل و حجت رقم ملنی چاہیے۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ بنک امانتوں کو کاروبار میں لگاتا ہے یا نہیں۔ بنک کی جانب سے معمولی سی پس و پیش اس کے دیوالیہ ہو جانے کا موجب بن سکتا ہے۔

قرض دیتے وقت بنک شخصی یا منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کی ضمانت بھی لیتا ہے۔ سونا چاندی، تمسکات اور کفالتوں کی ضمانت پر بھی قرض مل جاتا ہے۔

کچھ قرض بوقت ضرورت واپس بھی طلب کیے جا سکتے ہیں جنھیں طلبی قرضے (Demondloan) کہتے ہیں۔ بعض قرضے ۳۰ سے ۹۰ ایام کے لیے ہوتے ہیں انھیں قلیل عرصہ کے قرضے کہا جاتا ہے بعض قرضے لمبے عرصہ مثلاً ایک سال سے ۲۰ سال تک کے لیے ہوتے ہیں انھیں طویل عرصہ کے قرضے (Long Termloans) کہتے ہیں۔ چونکہ عرصہ کی طوالت کی وجہ سے قرض کی واپسی کے امکانات کم ہو جاتے ہیں اس لیے طویل عرصہ کے قرضوں پر شرح سود زیادہ اور قلیل عرصہ کے قرضوں پر کم شرح سے سود وصول کیا جاتا ہے۔

بنک تخلیق زر بھی کرتا ہے مثلاً ایک شخص ندیم بنک سے ایک لاکھ روپیہ قرض مانگتا ہے بنک ضمانت لے کر اور دیگر امور میں اپنی تسلی کر لینے کے بعد اسے نقدی کی صورت میں ایک لاکھ روپیہ نہیں دے گا۔ بلکہ ندیم کے نام بنک میں ایک فرضی حساب کھول کر اسے پاس بک اور چیک بک دے کر اس رقم میں سے حسب ضرورت رقم نکلوانے کا اختیار دے دے گا۔ اگرچہ قرضدار قرض کی رقم یک مشت نہیں نکلواتا بلکہ تھوڑی تھوڑی کر کے نکلواتا ہے اور رقم کا بیشتر حصہ ایک عرصے تک بنک میں پڑا رہتا ہے۔ اس کے باوجود ندیم کو ایک لاکھ روپے پر ہی سود ادا کرنا پڑے گا۔

بنک اپنے امانت داروں کو ان کی جمع شدہ امانتوں سے زائد رقم کا چیک جاری کرنے کی بھی اجازت دیتا ہے۔ جسے (Over Draft) کہتے ہیں۔ کاروباری افراد اپنی ضرورتیں عموماً اسی طرح پوری کرتے ہیں۔

ہنڈیوں پر بٹہ لگانا: ہنڈیوں پر بٹہ لگانا بھی بنک کے اہم ترین فرائض میں سے ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور جرمنی جیسے ترقی یافتہ ممالک میں اکثر لین دین نقدی کی بجائے آلات اعتبار سے ہوتا ہے۔ ان آلات اعتبار میں ہنڈی ایک اہم ترین آلہ اعتبار ہے۔ جس کے بغیر بین الاقوامی تجارت چل ہی نہیں سکتی۔ برآمد کنندہ اشیاء برآمد کر کے درآمد کنندہ کے نام شے کی مالیت کے متعلق جو حکمنامہ لکھتا ہے۔ اسے بدیشی ہنڈی کہا جاتا ہے۔ جب درآمد کنندہ اس ہنڈی کی پشت پر رقم کی تصدیق کر دیتا ہے تو اس کی حیثیت قانونی دستاویز کی سی ہو جاتی ہے اور یہ قابل بیع و شراء بھی ہو جاتی ہے۔ برآمد کنندہ اس ہنڈی کو ۹۰ ایام تک اپنے پاس رکھتا ہے کیونکہ اس سے پہلے وہ درآمد کنندہ سے رقم کا مطالبہ کرنے کا مجاز نہیں ہوتا لیکن کوئی تاجر بھی کاروباری ضرورتوں کے پیش نظر اپنی رقم کو بلاک نہیں کرتا۔ وہ بنک سے اس پر بٹہ لگوا لیتا ہے۔ بنک مروجہ شرح سود کے مطابق باقی ماندہ مدت یا سود کاٹ کر باقی رقم برآمدی تاجر یا ہنڈی پیش کرنے والے کو ادا کر دیتا ہے گویا بنک نے ہنڈی پیش کرنے والے کو ایک معینہ مدت کے لیے قرض دیا۔ اگر بنک کو بھی کسی وقت پیسے کی ضرورت پڑے تو وہ اس ہنڈی پر مرکزی بنک سے دوبارہ بٹہ لگوا کر اپنی ضرورت پوری کر لیتا ہے۔

انتقالِ زر: بنک زر کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک بحفاظت منتقل کرنے کی سہولتیں فراہم کر کے کمیشن کماتا ہے۔ یہ منتقلی اندرون اور بیرون ملک دونوں میں ہو سکتی ہے۔ ایسی منتقلی سے رقم کے کھو جانے یا ضائع ہونے کا احتمال ختم ہو جاتا ہے۔ کاروباری لوگ عموماً سفر سے پہلے اپنی رقم کسی بنک میں جمع کروا کے وہاں سے ڈرافٹ حاصل کر لیتے ہیں۔ اور اپنی منزل پر پہنچ کر بحفاظت اپنی رقم وصول کر لیتے ہیں۔

دیگر خدمات: بنک اپنے گاہکوں کے لیے مختلف امور میں بطور ایجنٹ بھی کام کرتا ہے۔ وہ اپنے گاہکوں کی تنخواہوں کی وصولی، بیمہ کی قسطوں کی ادائیگی، حصص، تمسکات اور کفالتوں کی فروخت کا کام بھی کرتا ہے وہ ان کا مختار عام اور مالی مشیر بھی ہوسکتا ہے۔ ان کی قیمتی اشیاء مثلاً سونا چاندی، ہیرے، جواہرات کے لیے لاکر کی خدمات مہیا کرتا ہے۔ اندرون اور بیرونی ملک کے لیے سفری چیک جاری کرتا ہے۔ سہولت کے لیے اعتباری مرقع (Letter of Credit) جاری کر کے اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ وہ برآمدی تاجر کو وقت پر رقم کی ادائیگی کا بندوبست کرے گا۔ وہ اپنے گاہکوں کی وصیتوں پر عمل درآمد بھی کراتا ہے۔ ان تمام مفید اور کارآمد خدمات کے عوض بنک اپنے گاہکوں سے معمولی سا معاوضہ وصول کرتا ہے۔

بنک کی اہمیت: دور جدید اقتصادی دور کہلاتا ہے۔ جس میں سرمایہ کا وجود اتنا ہی اہم ہے جتنا انسانی جسم میں خون، خون کی گردش، جسم کو توانا اور صحت مند رکھتی ہے۔ اسی طرح سرمایہ کی گردش معیشت کو جاندار بناتی ہے، سرمایہ کی افزائش نجی بچتوں کی مرہون منت ہے۔ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ پس انداز پر آمادہ کرنا اقتصادی ترقی کے لیے راہیں ہموار کرنے میں ممد ثابت ہوتا ہے۔ سرمایہ میں قومی وسائل کو بروئے کار لا کر قومی دولت کو بڑھایا جاسکتا ہے اور عوام کا معیار زندگی بلند کیا جاسکتا ہے پس اندازی کے علاوہ سرمایہ کاری بھی معاشی خوشحالی کے لیے لازمی ہے۔ سرمایہ کاری سے قومی آمدنی میں اضافہ کے علاوہ بے روزگاری میں بھی کمی واقع ہوتی ہے۔ بنک کا یہی کردار ہے۔ یہ ملک کے گوشے گوشے میں شاخیں کھولتا ہے اور نشر و اشاعت کے ذریعے لوگوں میں پس اندازی کی خواہش اور جذبہ کو ابھارتا ہے۔ لوگوں کی بچتیں آجرین کو پیداواری مقاصد کے لیے فراہم کرتا ہے۔ تاکہ سرمایہ کاری کر کے پیدائش دولت کو تقویت دے سکیں اور روزگار کے مواقع پیدا کرسکیں جس سے بے روزگاری کا سدباب ہوتا ہے۔ اگر بنک کا وجود نہ ہوتا تو لوگ حسب عادت اور حسب ضرورت پس انداز تو کرتے۔ مگر انھیں یہ علم نہ ہوتا کہ وہ اپنی بچتوں کو محفوظ رکھنے کے علاوہ انھیں کس طرح پیداواری مقاصد کے لیے استعمال کرسکتے ہیں۔ اسی طرح سرمایہ کاری کرنے والے تو موجود ہوتے مگر انھیں ان ذرائع کا علم نہ ہوتا۔ جہاں سے آجرین اپنی ضرورت کا سرمایہ حاصل کرسکیں۔ بنک دونوں فریقوں کو اکٹھا کر کے معاشی ترقی کا باعث بنتا ہے۔

اقتصادی ترقی کا انحصار سرمایہ کی فراہمی پر ہے اور بنک سرمایہ کا منبع ہوتا ہے۔ پسماندہ ممالک میں سرمایہ کی قلت کی بڑی وجہ وہاں کا پسماندہ نظام بنکاری ہے جو نہ تو پس اندازی کے جذبہ کو ابھارتا ہے اور نہ آجرین کو سرمایہ کاری کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ ان ممالک میں قومی دولت کو صرف ۵ سے ۷ فیصد تک ہی پس اندازہ کیا جاتا ہے جو اقتصادی ترقی کے لیے بہت ہی کم ہے جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں قومی دولت کا ۲۰ سے ۲۵ فیصد پس انداز کرلیا جاتا ہے۔

بنک صرف سرمایہ ہی فراہم نہیں کرتا بلکہ یہ دھاتی زر کے استعمال میں کفالت بھی کرتا ہے اور تسکیک کے مصارف سے نجات دلاتا ہے۔ آلات اعتبار یعنی چیک، ڈرافٹ، ہنڈی وغیرہ کے استعمال سے دھاتی زر کا استعمال کم ہوجاتا ہے۔

بنک اقتصادی ترقی کے علاوہ معاشی بحران میں متزلزل معاشی نظام کو سہارا دیتا ہے۔ آجرین کو سرمایہ فراہم کر کے انھیں سرمایہ کاری پر آمادہ کرتا ہے جس سے کاروباری سرگرمیاں تیز ہوجاتی ہیں۔ کساد بازاری میں مالی امداد ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ثابت ہوتی ہے اور اس طرح معیشت مکمل بربادی اور تباہی سے بچ جاتی ہے۔

سرمایہ کی نقل پذیری میں بھی بنک کے کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کم منفعت بخش کاروبار سے سرمایہ زیادہ منفعت بخش کاروبار میں منتقل کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اس طرح سرمایہ اپنے بہترین مصرف میں آجاتا ہے۔

بنک بین الاقوامی اور اندرونی تجارت کو سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ بدیشی ہنڈیوں پر بٹہ لگا کر تاجروں کو بوقت ضرورت سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ ملکی سرمایہ کی حفاظت کرتا ہے۔ صنعتی اور تجارتی جدوجہد کو تیز کرتا ہے اور قومی فلاح و بہبود کا باعث بنتا ہے۔ مختصر یہ کہ قومی خوشحالی اور اقتصادی ترقی کے لیے بنک کا وجود ناگزیر ہے کیونکہ یہ ملک کی تجارتی، صنعتی، زرعی اور معاشی ترقی میں کارہائے نمایاں سرانجام دیتا ہے۔

غیر سودی بنک[1]

نظام بنکاری کی اہمیت مسلمہ ہے۔ دور حاضر میں ہر ملک کی مضبوط معیشت کا دار و مدار نظام بنکاری پر ہے۔ لیکن موجودہ نظام بنکاری کی اساس سرمایہ

[1] دور حاضر میں بلاسود معیشت پر تقریباً دوسو سے زائد مطالعاتی جائزے شائع ہوچکے ہیں۔ مسلمان ماہرین اقتصادیات اس موضوع پر خاص توجہ دے رہے ہیں۔ ایک حد تک خاکہ پیش کرچکے ہیں۔ بعض ممالک میں اس خاکہ پر عمل کر کے کامیاب شعبہ بنکاری چلا رہے ہیں۔ اردو میں اس موضوع پر اہم کتب یہ ہیں۔ غیر سودی بنکاری ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور غیر سودی بنکاری مقالہ از پروفیسر خورشید احمد مطبوعہ المصباح شمارہ نمبر ۵۹ اور ۶۰ بلاسود بنکاری محمد اکرم کا حرمت ربا اور غیر سودی مالیاتی نظام ڈاکٹر محمود احمد غازی انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سنٹر اسلام آباد اسلامی بنک و غیر سودی بنک کا مکمل نظام از علامہ السید ذی شان حیدر جوادی، بلاسود بنکاری (عبوری خاکہ) پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر قادری ادارہ منہاج القرآن، جدید اقتصادی مسائل شریعت کی نظر میں البرکہ سیمینار انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد، بلاسود بنکاری از ڈاکٹر دل محمد۔

داری نظام پر ہے جس میں سود جائز ہے۔ جس وجہ سے معاشرے میں وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم ہے۔ اگر نظام بنکاری کی حدود کو بین الاقوامی سطح پر پھیلائیں تو ترقی پذیر ممالک، سرمایہ دار ممالک کے قرضوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اپنی حریت اور خود داری کو بھی قرض خواہ ممالک کو بیچ چکے ہیں۔ دور حاضر میں کسی ملک کو زیر کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی معیشت کو قرضہ کے زیر بار کر کے غلامی کا طوق اس کی گردن پر رکھ دیا جائے۔ مقروض ملک کی دولت کا بڑا حصہ سود کی ادائیگی میں چلا جاتا ہے۔ مزید براں قرض خواہ ملک مقروض ملک کی راہنمائی کے لیے اپنے ماہرین بھی بھیج دیتے ہیں۔ اس ملک کی دولت کا خاصہ حصہ ان کی تنخواہوں میں چلا جاتا ہے۔ وہی ماہرین ترقی پذیر ملک کی معیشت کو چلاتے ہیں جس وقت اسلام نے سود کو حرام قرار دیا تھا اس وقت اس کی ناانصافی اور ظلم صرف ملکی سطح پر تھا۔ اب سود کی ناانصافی اور ظلم بین الاقوامی سطح پھیل چکا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کی دولت کا بہاؤ ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کی طرف ہوگیا ہے۔ جس وجہ سے پسماندہ ملک کی معاشی ترقی رک گئی ہے۔ اس وجہ سے اس دور کا سب سے بڑا اقتصادی مسئلہ سود ہے کہ کسی طرح معیشت کو سود سے پاک کیا جائے۔

اس مسئلہ کے حل کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو تمام اسلامی ممالک، اسلامی بنک قائم کریں جو ضرورت مند اسلامی ملک کو بلاسود قرض دے۔ دوم اسلامی ممالک انہی طریقوں کو اختیار کریں۔ جن پر چل کر پہلے دور کے مسلمانوں نے ترقی کی تھی۔ ان طریقوں میں سے ایک اہم طریقہ مضبوط دفاع ہے اس دور میں مضبوط دفاع کا انحصار جدید ٹیکنالوجی پر ہے اور جدید ٹیکنالوجی کا دار و مدار سائنسی تحقیق پر ہے۔ اس وجہ سے تمام اسلامی ممالک کو ایک مشترکہ سائنسی ریسرچ قائم کرنا چاہیے یا تمام اسلامی ممالک کے سائنس دانوں کے مشترکہ اجلاس ہونے چاہئیں تاکہ ایک دوسرے کی تحقیق سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ یورپ خصوصاً امریکہ تمام اسلامی ممالک کی دولت پر اس لیے قبضہ کرنے کا خواہاں ہے کہ اسلامی ممالک ترقی کے راستہ پر گامزن نہ ہوسکیں اور نہ جدید ٹیکنالوجی تک رسائی حاصل کر سکیں۔ گویا بلاسود بنکاری اور اسلامی ممالک کی سیاسی ترقی باہم مربوط ہیں۔ ہم اندرونی اور بین الاقوامی سطح پر اسی وقت بلاسود بنکاری کا نظام قائم کرسکیں گے جب اسلامی ممالک سیاسی اور دفاعی لحاظ سے مضبوط ہوں گے۔ اسلام میں تمام شعبہ ہائے زندگی باہم مربوط ہوتے ہیں۔ اگر ایک شعبہ کمزور ہوتو اس کے ضعف کا اثر دوسرے شعبوں پر پڑے گا بنو عباس کے آخری دور تنزل میں اسلامی سلطنت سیاسی اور دفاعی لحاظ سے کمزور ہوئی تو اس کمزوری کا اثر تمام شعبوں پر پڑا تھا۔ مسلمان اقتصادی اور علمی لحاظ سے بھی کمزور ہو گئے تھے۔ اور علم کی ہر شاخ کمزور ہوگئی ہے۔ اس لیے سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام کے اہم جز سود کو ختم کرنے کے لیے اسلامی ممالک کا سیاسی لحاظ سے مضبوط ہونا ضروری ہے تبھی جا کر مسلمان ماہرین معاشیات کے خاکہ بلاسود بنکاری میں رنگ بھرا جائے گا۔

خاکہ

بنک کا کاروبار (Business of the Bank): بنک کے کاروبار کی تین اقسام ہوسکتی ہیں۔

ا۔ **بالمعاوضہ خدمات:** موجودہ بنکوں کی طرح بلاسود بنک کام کرنے والے فیس، کمیشن یا معاوضوں کے بدلے خدمات انجام دیں گے جو اسلامی بنکوں کی آمدن کا ذریعہ ہوں گے۔ چند اہم خدمات یہ ہیں۔

(الف) **لاکرز (Lockers):** عوام کی قیمتی اشیاء مثلاً زیورات، دستاویزات اور اسناد وغیرہ لاکرز میں رکھنے کی سہولت اور حفاظت کے بدلے بنک مالکان سے مناسب رقم وصول کریں گے۔

(ب) **رقم کی منتقلی:** بنک اپنے گاہکوں کو ڈرافٹ، سفری چیک، خطوط اعتماد (Letters of Credit) وغیرہ جاری کرنے کے عوض مناسب فیس وصول کرے گا جو بنک کی آمدن کا ذریعہ ہے اس طریقہ کار سے بنک کی لاگت بہت کم ہے اور نفع زیادہ ہوتا ہے۔

(ج) **غیر منقولہ جائیداد کی خرید و فروخت:** بنک غیر منقولہ جائیداد کی بیع و شرا اور قانونی کارروائی میں اپنے گاہکوں کی مدد کے بدلے معاوضے وصول کرے گا یہ بھی بنک کی آمدن کا ذریعہ ہے۔

(د) **تجارتی مال کو وصول کر کے گاہکوں تک پہنچانا:** مال تجارت کو بحری اور ہوائی جہازوں سے نمائندہ کی حیثیت سے چھڑا کر مالکوں تک پہنچانے کی خدمات انجام دے کر بھی بنک فیس وصول کرسکتا ہے۔

(ہ) **مشینری وغیرہ کی خریداری:** بنک کاروباری فریقوں کو کاروبار میں توسیع یا نیا کاروبار شروع کرنے کے لیے مشینری یا دیگر ضروریات

پوری کرنے کے لیے مالی اور ماہرانہ مشورے دے کر معقول معاوضے وصول کرتے ہیں۔

(د) **تجارتی حصص کی خریداری:** بعض تجارتی ادارے سرمایہ جمع کرنے کے لیے کاروبار کے حصص (Shares) بیچنے کے لیے بازار میں شائع (Float) کر دیتے ہیں۔ بنک بھی مضبوط بنیادوں پر قائم تجارتی اداروں کے حصص خرید لیتا ہے۔ جب ان حصص کی قیمت، خرید قیمت سے بڑھ جاتی ہے۔ تو نفع پر اپنے حصے بیچ دیتے ہیں اس سے بنک کافی فائدہ اٹھاتا ہے۔

بلا سود کام کرنے والے بنک کی سرمایہ کاری: بلا سود کام کرنے والے بنک نفع حاصل کرنے کے لیے اپنے سرمایہ کو تین صورتوں میں لگا سکتے ہیں۔

۱۔ شرکت۔ ۲۔ مضاربت۔ ۳۔ حصص کی خریداری۔

شرکت: سرمایہ سے نفع حاصل کرنے کی ایک صورت شراکت ہے بنک کسی کاروباری فریق کے ساتھ اپنے سرمایہ کے ساتھ شامل ہو جائے کاروبار میں بنک اور کاروباری کا سرمایہ شامل ہوگا اور معاہدہ کی شرائط طے ہو جائیں گی۔

۱۔ کاروباری فریق کے ساتھ بنک کی طرف سے تنخواہ دار نمائندے اور ماہرین بھی شامل ہوں گے۔

۲۔ شراکت کے معاہدہ میں کاروبار کی نوعیت اور نفع اور نقصان کی تقسیم وغیرہ کے اصول وضع کیے جائیں گے۔

۳۔ نقصان کی تقسیم فریقین کے سرمایوں کی نسبت سے ہوگی جبکہ نفع کا معاملہ معاہدہ شراکت میں طے کیا جا سکتا ہے کہ کس نسبت سے فریقین حاصل کریں گے۔ کسی ایک فریق کے لیے نفع متعین نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ فریقین معاہدہ شراکت کی مالی ذمہ داری ان کے فراہم کردہ سرمایہ کے برابر محدود ہوگی۔

۵۔ معاہدہ شراکت کے اختتام پر اگر بنک کو اپنا سرمایہ نفع کے ساتھ واپس ملے تو یہ نفع اس کے مجموعی منافع بنک کاری میں شامل ہو جائے گا۔ اگر کسی معاہدہ شرکت میں نقصان اٹھانا پڑے تو یہ نقصان بھی اس کے مجموعی نقصان کے مجموعی حسابات میں ضم ہو جائے گا۔

مثلاً ایک کاروباری شخص ایک کروڑ روپے کا سرمایہ کسی کاروبار میں لگاتا ہے اور ایک کروڑ بنک سے حاصل کرتا ہے۔ معاہدہ شراکت کے ذریعہ کاروبار چلاتا ہے اور ایک لاکھ روپیہ نفع حاصل ہوتا ہے تو کاروباری شخص اور بنک کو پچاس پچاس ہزار معاہدہ شراکت کے مطابق ملیں گے۔

۶۔ مشترکہ کاروبار کی طرف سے طویل المیعاد قرضے حاصل نہیں کیے جائیں گے۔

مضاربت: بلا سود کام کرنے والے بنک کے لیے مضاربت پر سرمایہ کاری بہترین صورت ہے۔ سرمایہ بنک کا ہوگا۔ محنت دوسرے کاروباری فریق کی۔ اگر کاروبار میں نفع ہوتا ہے تو معاہدہ کی شرائط کے مطابق فریقین میں تقسیم ہوگا اگر خسارہ ہوتا ہے تو نقصان کلی طور پر بنک کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اگر مضارب نے بنک کے سرمایہ کے علاوہ اپنا سرمایہ بھی کاروبار میں لگایا ہوا ہے تو یہ صورت شراکت کی ہو جائے گی۔ تو اگر سرمایہ مساوی مساوی ہے تو بنک کو ایک چوتھائی حصہ اور مضارب کو تین چوتھائی حصہ منافع ملے گا۔ البتہ خسارہ فریقین میں برابر ہوگا۔

معاہدہ مضاربت میں کاروبار کی نوعیت، وسعت اور مالی تصرف کی شرائط طے کی جا سکتی ہیں تاکہ فریقین اپنے اپنے حدود سے باہر نہ نکلیں۔

مضاربت میں بھی نفع متعین نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کاروبار میں کل منافع کی صورت میں طے شدہ شرط کے تحت ہی تقسیم ہوگا۔

حصص کی خریداری: آج کل بہت سے کاروباری ادارے سرمایہ، حصص کی فروخت کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔ لوگ ان حصص کو خریدتے ہیں۔ جب حصص کی قیمت، خرید قیمت سے بڑھ جاتی ہے تو بیچ دیتے ہیں۔ بنک بھی اپنے سرمایہ کو کاروباری حصص خریدنے میں لگا سکتا ہے۔ جن جن لوگوں نے حصص خریدے ہیں وہ تمام مشترکہ کاروبار میں ایک شریک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے حصے کی قیمت کو کمپنی کے کل سرمایہ کے ساتھ جو نسبت ہو۔ اسی نسبت سے وہ اس کمپنی کے مالکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ مثلاً کمپنی میں ایک کروڑ روپے کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اس کے حصہ کی قیمت ایک لاکھ روپے ہے تو اس حصہ کا مالک کمپنی کے (۱/۱۰۰۰۰۰۰) کا مالک سمجھا جائے گا۔

کاروبار حصص میں نفع کی تقسیم کا طریقہ کار یہ ہے کہ جس سال نفع ہو وہ تمام حصہ داروں میں مساوی تقسیم ہوتا ہے اگر کسی سال خسارہ ہوا ہے تو وہ خسارہ فوری سرمایہ سے پورا نہیں کیا جاتا بلکہ اگلے سال کے منافع سے منہا کر کے بقیہ نفع تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

کاروباری حصص خریدنے کے لیے وہ بنک بھی شامل ہو سکتے ہیں جو بلا سود کام کر رہے ہیں۔ اس میں کسی قسم کا سود شامل نہیں ہاں کاروباری حصص کی

وہ تمام اقسام جن کے ساتھ سود شامل ہے یا جن میں کم سے کم شرح نفع کی ضمانت دی گئی ہے خارج از بحث ہے۔ یہاں صرف ان حصص کا ذکر ہے جن میں نفع متعین نہیں بلکہ کمپنی کے کاروبار میں نفع ہونے پر دار و مدار ہے۔

مزید سرمایہ کے حصول کے طریقے: پہلے یہ بیان ہوا ہے کہ بنک کن طریقوں سے اپنے فراہم کردہ سرمایہ سے نفع کما کر اپنے حصے داروں میں تقسیم کرتا ہے۔ عوام سے سرمایہ حاصل کرنے کے دو اور بھی ذرائع ہیں۔ ا۔ مضاربت کھاتہ۔ ۲۔ قرض کھاتہ۔

ا۔ مضاربت کھاتہ: بنک عوام کی بچتوں کی صورت میں جو سرمایہ حاصل کرے گا۔ وہ مضاربت کے کھاتہ میں جائے گا۔ بنک عوام سے مضاربت کے اصول پر رقم لے گا اور کاروبار میں لگائے گا۔ بنک ان سے حسب ذیل شرائط طے کرے گا۔

ا۔ بنک اس رقم کو کاروبار میں لگائے گا۔ کل سرمایہ پر جو نفع ہوگا وہ کل سرمایہ پر تقسیم کیا جائے گا۔ اس تقسیم کے نتیجے میں کسی کھاتہ دار کے سرمایہ پر جتنا نفع آئے گا۔ اس کی ایک طے شدہ نسبت بنک کو ملے گی اور باقی نفع کھاتہ داروں کے سرمایہ کی نسبت سے تقسیم کیا جائے گا۔

۲۔ اگر کاروبار میں خسارہ ہو تو مجموعی خسارہ کو کل سرمایہ پر تقسیم کر کے نقصان کی فیصد شرح معلوم کر لی جائے گی۔ ہر کھاتہ دار کے سرمایہ میں اس شرح نقصان کے مطابق کمی کر دی جائے گی۔ خسارہ کھاتہ دار کو اٹھانا پڑے گا۔

۳۔ کسی کھاتہ دار کی مالی ذمہ داری اس کی فراہم کردہ رقم سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اگر بنک نے ان کے فراہم کردہ سرمایہ سے زیادہ وسعت دی ہو تو پھر خسارہ ہو تو کھاتہ دار صرف اپنے سرمائے کی نسبت جتنے نقصان کے ذمہ دار ہوں گے۔ باقی نقصان بنک برداشت کرے گا۔

۴۔ مضاربت کھاتہ میں رقوم متعین مدت کے بغیر بھی جمع کی جا سکتی ہیں اور ایک معین مدت کے لیے (سہ ماہی، نصف سال، سال)

۵۔ اگر رقم معین (سہ ماہی، نصف سال، سال) مدت کے لیے جمع کی گئی ہے تو طے شدہ شرائط کے مطابق بنک ہر کھاتہ دار کو نفع و نقصان کا حساب کر کے مطلع کر دے۔ ہر کھاتے دار کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ معاہدہ ختم کر کے اپنی رقم، مع نفع اور نقصان واپس لے لے یا نفع وصول کر کے اپنا کھاتہ جاری رکھے۔

۶۔ اگر پہلے طے شدہ عرصہ میں کھاتہ دار کو خسارہ ہوا ہے اور معاہدہ بھی جاری رکھنا چاہیں تو آئندہ طے شدہ عرصہ میں ہونے والے نفع میں پہلے اس خسارہ کی تلافی کی جائے گی پھر اگر نفع باقی رہے تو فریقین میں طے شدہ نسبت کے مطابق تقسیم کریں۔

۷۔ کھاتہ دار رقم واپس لینا چاہے تو پہلے عرصہ کے نفع و نقصان کا اندازہ لگا کر رقم نفع و نقصان کے ساتھ واپس کی جا سکتی ہے۔

۸۔ منافع کی صورت میں حصہ داروں کو مضاربت کھاتہ داروں کی نسبت سے زیادہ منافع ملے گا اسی طرح خسارہ بھی حصہ داروں کو مضاربت کھاتہ داروں سے زیادہ اٹھانا پڑے گا۔ کیونکہ بنک کے حصہ داروں نے محنت بھی کرنی ہوتی ہے۔ دوم ان کا اپنا بھی فراہم کردہ سرمایہ ہوتا ہے۔ مضاربت کھاتہ دار محنت میں شریک نہیں ہوتے صرف سرمایہ مہیا کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے حصہ دار محنت اور سرمایہ کی فراہمی کی وجہ سے زیادہ نفع کے حق دار ہوتے ہیں اسی طرح گھاٹے کی شکل میں حصہ داروں کو اپنی محنت کے معاوضہ سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

۹۔ بنک اپنی سالانہ بیلنس شیٹ شائع کرے گا۔ ان حاصل کردہ رقوم سے بنک پہلے سے بیان کردہ طریقوں کے ذریعے سرمایہ کاری کرے گا۔

قرض کھاتہ (Loan account): بنک عوام اور فرموں کو دعوت دے گا کہ وہ اپنی رقوم اور بچتیں حفاظت اور عند الطلب ادائیگی کی سہولت کے لیے قرض دیں۔ بنک یہ ذمہ داری قبول کرے گا۔ وہ عند الطلب قرضوں کو واپس کر دے گا۔ قرض کھاتہ دار چیک کے ذریعہ اپنے کھاتہ سے رقم نکال سکیں گے۔ یا دوسروں کے حق میں منتقل کر سکیں گے۔ بنک ان سہولتوں کی وجہ سے کوئی اجرت نہیں لے گا کیونکہ بنک نے قرض کھاتہ میں مہیا سرمایہ کو کاروبار میں لگایا ہے اور اس سے فائدہ اٹھایا ہے اس وجہ سے قرض کھاتہ کے حساب کتاب رکھنے پر اٹھنے والے اخراجات اس نفع سے پورا کرے گا جو کاروبار سے نفع ہوا ہے۔

قرض کھاتہ کی پوزیشن موجودہ بنکوں میں جاری حسابات (Current account) یا عند الطلب قابل واپسی کھاتہ (Demand deposit) کی سی ہوگی اور اس سے وہی سہولتیں حاصل ہو سکیں گی جو موجودہ بنکوں کے جاری حسابات یا عند الطلب قابل واپسی کھاتوں سے حاصل ہوتی ہے۔ قرض کھاتہ والوں کی رقوم کی واپسی کی ضمانت ملک کے سٹیٹ بنک کی سند سے حاصل ہوگی جو عام بنکوں کی نقدیت (Liquidity) برقرار رکھ کر اور کھاتوں کے بیمہ (Insurance) کی سکیم کے ذریعہ اس ضمانت کو قابل اعتماد بنائے گا۔ بنک کے پاس یہ رقوم امانت کے طور پر نہیں بلکہ قرض کے طور پر ہوں گی۔ جب تک بنک کے پاس ہیں بنک ان سے فائدہ اٹھا سکے گا۔

قرضوں کا اجراء: معاشرہ میں کاروبار کو جاری رکھنے، وسعت دینے کے لیے قرضوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہر دور میں کاروبار کے لیے قرض لیے جاتے تھے۔ دور حاضر میں اس کی پہلے کی نسبت زیادہ ضرورت ہے۔ ماضی کے ادوار میں تو کاروبار مقامی ہوتا تھا۔ موجودہ دور میں تجارت بین الاقوامی شکل اختیار کر گئی ہے اس لیے اب قرضوں کی پہلے کی نسبت زیادہ ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو اسلامی بنک بلاسود قرضے جاری کر کے پورا کر سکتے ہیں۔

قلیل المدت قرضے (Short term loan) لوگ اپنے زر نقد کی حفاظت کے لیے اپنے پاس رکھنے کی بجائے زائد از ضرورت رقوم بنکوں میں جمع کروا دیتے ہیں اور لین دین بھی چیکوں کے ذریعے کرتے ہیں۔ چیکوں کے ذریعہ جو لین دین ہوتا ہے وہ رقم بھی بنکوں میں ہی رہتی ہے صرف کھاتہ بدل جاتا ہے گویا تجارت کا اس قسم کا چکر ہے کہ رقوم بنکوں میں پڑی رہتی ہیں۔ ایک رقم ایک کھاتہ سے نکل کر دوسرے کھاتے میں چلی جاتی ہے۔ بہت تھوڑی رقم صرف گھریلو کاموں کو چلانے کے لیے نکالی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ نئی رقوم بھی بنک میں جمع کرائی جاتی ہیں۔ انہی رقوم کا ایک مخصوص حصہ بنک میں زر نقد کی شکل میں رکھ کر لوگوں کو قرض دیا جاتا ہے۔

بلاسود بنکاری کرنے والا اسلامی بنک بھی قرض کھاتہ میں سے لوگوں کو قلیل مدت کے لیے قرضے دے سکتا ہے۔ بنک قرض کھاتہ میں جمع ہونے والی رقوم کے ایک حصہ کو مضاربت پر لگا کر نفع کما رہا ہوتا ہے۔ اس طرح ایک طرف بنک قرض کھاتہ سے مضاربت پر روپیہ لگا کر نفع کما رہا ہے اور دوسری طرف اسی کھاتہ سے قلیل المدت پر قرضہ ادا کر رہا ہے۔ ایک طرف سے بنک نفع کما رہا ہے دوسری طرف بلاسود قرض دے رہا ہے۔ اس طرح بنک کو کسی طرح بھی خسارہ نہیں ہوتا۔

طویل المدت قرضے (Long term loan) جب بنک کا کاروبار مضاربت کے اصول پر چل رہا ہے۔ اور بنک نفع کما رہا ہے اور لوگوں کا زر نقد قرض کھاتہ میں بھی آ رہا ہے تو بنک میں اتنا سرمایہ ہو جاتا ہے جس سے لوگوں کو طویل مدت کے لیے مضاربت کے اصول پر قرض دیا جا سکتا ہے۔ طویل المدت قرضہ قرض داروں کو مضاربت کے اصول پر دیا جائے گا۔

شرائط قرض: قرض لینے والے کے لیے حسب ذیل شرائط کا حاصل ہونا ضروری ہیں۔

۱۔ قرض دار امین ہو۔ اچھی شہرت کا مالک ہو۔ چار گواہ اس کی امانت داری اور صداقت کی گواہی دیں۔

۲۔ مالی اعتبار سے قرض دار مضبوط ہو۔

۳۔ قلیل المدت قرض کی میعاد تین ماہ سے زائد نہ ہو۔

۴۔ بنک قرض داروں سے قرض کے بالمقابل ضمانت طلب کرے۔ یہ ضمانت جائیداد تیار شدہ مصنوعات، تیار فصل، تجارتی حصص، سندات ملکیت وغیرہ دی جا سکتی ہے۔ بنک شخصی ضمانت پر قرض جاری کر سکتا۔ اگر قرض دار معینہ وقت میں قرض ادا نہ کر سکے تو بنک ضمانت شدہ ملکیتوں کو فروخت کر کے اپنی رقم پوری کر سکے۔

اگر قرض دار دیوالیہ ہو جاتا ہے تو اس شکل میں مرکزی بنک (بیت المال) کے زکوٰۃ فنڈ سے اس قرض کی واپسی کو یقینی بنایا جائے۔ کیونکہ اسلامی نقطہ لحاظ سے اس قسم کے قرض کی ادائیگی حکومت کے ذمہ ہے۔ قرض کی ادائیگی کا ایک یقینی طریقہ یہ بھی ہے کہ قرضہ کو انشورڈ (Insured) کر لیا جائے۔ اس کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ بنک اپنے دیے ہوئے قرضہ کو انشورڈ کرائے اور انشورنس کے تمام اخراجات خود برداشت کرے۔ دوسری شکل یہ ہے بنک قرض مانگنے والے افراد پر یہ شرط عائد کر دے کہ کسی انشورنس کمپنی کی ضمانت دے تو اس شکل میں انشورنس کے تمام اخراجات قرض لینے والے افراد ادا کریں گے۔

قرض کے حساب کتاب پر آنے والے اخراجات: قرض کے حساب کتاب پر بنک کے اخراجات اٹھیں گے۔ ان کو پورا کرنے کے لیے بنک قرض داروں سے معمولی سے چارجز وصول کر سکتا ہے۔ اس کا شرعی جواز یہ ہے کہ شریعت نے قرضوں کے لینے اور دینے پر یہ لازمی قرار دیا ہے کہ ان کو لکھ لیا جائے جو شخص بھی لکھے گا۔ وہ اس کی اجرت لے گا۔ کتابت پر اجرت کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

تخلیق زر کا عمل: بلاسودی بنکاری سے متعلق بحث کرنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلامی حکومت کا یہ وہ مالیاتی ادارہ ہے جس کے ذریعہ سرمایہ عوام

میں نفع کے ساتھ گردش کرتا ہے اور یہی کسی ملک کی خوش حالی کا راز ہے کہ دولت مخصوص افراد کے ہاتھوں میں گردش کرنے کی بجائے عوام میں گردش کرے۔ سرمایہ کی گردش کو تیز کرنے کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں ایک اچھا طریقہ یہ بھی ہے جس سے بنک نیا تخلیق زر بھی کر سکتا ہے اور عوام کو بھی فائدہ ہو سکتا ہے اور ملک کی مجموعی خوش حالی بھی ہو سکتی ہے وہ یہ کہ بنک سرمایہ لگا کر پلازے (دکانیں) مارکیٹیں تعمیر کرے۔ پھر وہ عوام کے ہاتھوں میں نقد یا بالاقساط بیچ دے۔ عوام میں جتنا زیادہ کاروبار پھیلے گا۔ ان کی بچتوں کا سرمایہ بنک میں جمع ہو گا۔ اس طریقہ سے ایک تو عوام میں خوش حالی آئے گی۔ دوم بنک کا تخلیق زر ہو گا۔ بنک ان منصوبوں میں سرمایہ لگائے جن میں عوام کا مفاد مضمر ہو۔ سودی بنک کا سرمایہ مخصوص لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔ رقم عوام کی ہوتی ہے فائدہ مخصوص لوگ اٹھا رہے ہوتے ہیں جس سے معاشرہ میں امارت کے لحاظ سے دو طبقے ہو جاتے ہیں۔ ایک امیر اور دوسرا غریب۔ سود بنکاری کا سب سے بڑا نقصان ہی یہ ہے۔ عوام کا سرمایہ مخصوص ہاتھوں میں چلا جاتا ہے جو اسلامی معاشی پالیسی کی روح کے خلاف ہے۔

❁....❁....❁

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ

سیرت سید البشر ﷺ

حصہ دوم

پروفیسر چودھری غلام رسول چیمہ